Title - HAYAATUN NAZEER .

Creator - Iftikhar Alam Bilgrami .

Publisher - Shamsi Press (Delhi) .

Date - 1912

Pages - 660

Subjects - Nazeer Ahmad - Sawaneh -o- Tanqeed ; Tazkira Musnafeen - Nazeer Ahmad .

7-5-1965

یعنی مولانا سید احمد خاں کی اردو

حیات النذیر
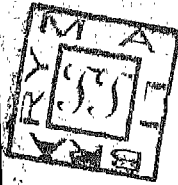
جس میں

شمس العلماء حافظ نذیر احمد خان ایل ایل ڈی۔ او۔ ایل دہلوی

مترجم قرآن مجید و مصنف

مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح محصنات۔ ابن الوقت منتخب الحکایات چند پند صرف صغیر۔ نصاب خسرو۔ مبادی الحکمۃ۔ ایامیٰ۔ رسم الخط۔ مایغنیک فی الصرف رویائے صادقہ۔ اجتہاد۔ الحقوق والفرائض۔ امہات الامہ۔ مطالب القرآن وغیرہ وغیرہ کی زندگی کے حالات اور اُن کی مذہبی۔ قومی۔ اور علمی خدمات مفصل بیان کی گئی ہیں

مرتبہ

خاکسار سید افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی

محمد رحیم بخش کے اہتمام سے

شمسی پریس دہلی میں بحسن خوبی طبع ہوئی

سنہ ۱۹۱۲ء

ملازم شمسی پریس دہلی

محفوظ علی مصلح سنگ دہلوی
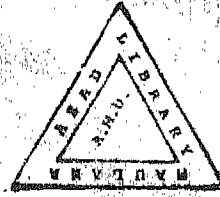
یہ بھی اُردو علم ادب کی ترقی کی علامت ہے کہ مشاہیر ملک و ملت کے حالات پر بہت سی اچھی اچھی کتابیں لکھی گ
ں اور لکھی جارہی ہیں۔ اب تک زیادہ تر اُن قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بلحاظ تقدس و دیگر کارہائے نمایاں
ے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں بجا بجا پائے جاتے ہیں۔ یا اُن کے متعلق مستقل کتا
جود ہیں اور اُن کی عزت و وقعت صدہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ اُن مؤلفین کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ
یاتا ہے۔ البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب میں ادل بدل کرکے اُردو زبان میں پیش کرنے کی زحم
ور گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہے تو ان کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ کیو
وہ لوگ پہلے ہی سے مقبول خاص و عام ہیں۔ مگر ہم عصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلے میں بہت کٹھن
ں تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ا
واری ہے جسے اسی کا دل جانتا ہے جس کو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ دوسرے صدہا شخص ایسے زندہ
ہیں جو اُس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور اُنھوں نے اُس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے۔ اور اُس کے متعل
ں رائے رکھتے ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اُس کی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے ہاتھ میں جانے والی ہے
اس لیے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لیے بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلف حیاۃ النذیر نے ہماری قوم کے
علامہ کا قول نقل کرکے آج کل کے طریقہ تحریر سوانح عمری کو پُرفریب بتایا ہے اور اُس پر زوردار بحث کی ہے۔ لیکن ہم
تے ہیں کہ وہ کونسا ایسا زمانہ تھا جب کہ یہ پُرفریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہم عصر نامور شخص کا

(بشرطیکہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ورنہ اُنھیں اس سے زیادہ دُشواری پیش آتی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھنے والے کو پیش آتی ہی۔ اُنھوں نے اب تک قدمائے کرام کے حالات پر قلم اُٹھایا ہی جنھیں لوگ ایک زمانے سے پوجتے آئے ہیں۔ اور جن کی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہی۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامۂ موصوف کی تالیفات اُس پُرفریب طریقے سے پاک صاف ہیں؟

بات یہ ہی کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اُس کے تعلقات گرد وپیش کے حالات اور قومی و مُلکی معاملات سے تانے بانے کی طرح ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُس کی ذات کو اُن سے جُدا کرنا قریب قریب ناممکن کے ہوتا ہی۔ ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا۔ اِس لیئے سوانح نگار کے فرائض میں داخل ہی کہ وہ اُس شخص کے کریکٹر کو اُن تمام گرد وپیش کے واقعات وحالات کی روشنی میں دکھائے۔ اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اختلافِ رائے ہر زمانے میں اور ہر مُلک میں ہوتا ہی اور علاوہ اِس کے ہم عصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر پھیل جاتی ہیں۔ سوانح نگار کا فرض ہی کہ وہ اُن غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو صحیح اور سچّے واقعات اور اُس کے وسیع تعلّقات اور اصلی خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی رفع کرے اور اپنی رائے اور صحیح قیاس کے اظہار سے دریغ نہ کرے۔ اور محض مخالفوں کے ڈر سے یا اُن کی خوشی کے لیئے یا عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اِس محنت کی داد دیں گے۔ اور اُس کے ممنون ہوں گے۔ اگرچہ بدبین لوگوں کو اِس سے تکلیف ضرور ہوگی۔ نرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کر دینا کافی نہیں ہی۔ اور کوئی سوانح نگار اس طور پر اپنے فرض سے سبک دوش نہیں ہوسکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا اُسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعتِ تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف اُلجھن پیدا ہوتی ہی بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہی اور اس لیئے یہ ضروری ہی کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد وپیش کے حالات کا اثر اُس پر اور اُس کا اثر اُن حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر غلطی وصحت کے اُس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑے گا۔ اُس کی اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑے گا۔ اُس کے برتاؤ اُس کے طرزِ کلام اور طرزِ تحریر اُس کی عام روش اور رجحان کی تلاش کرنی پڑے گی۔ غرض سوانح نگار اس چھان بین۔ کُرید جُستجو اور تلاش کے بعد صحیح قیاس اور رائے قائم کر سکے گا۔ اور اس سے اُس کی اپنی تمیز اور لوگوں کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ اگر سوانح نگار ایسا شخص ہو جو اس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدردان نہیں تو کیا وہ اُس اہم فرض کو ادا کر سکتا ہی؟ مثلاً اگر وہی کتاب جسے علامۂ موصوف نے "ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری" فرمایا ہی خود اُن کو لکھنے کے لیئے دی جاتی تو ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہوتی۔

یہ بحث ممکن ہی کہ بعض حضرات کو گراں گذرے لیکن اِس موقع پر مجھے اِس کی ضرورت اس لیئے پڑی کہ مولوی افتخار عالم صاحب نے ہمارے زمانے کے ایک ایسے نامور شخص کی سوانح عمری لکھی ہی جن کے مخالف بھی بہت سے لوگ موجود ہیں اور جن کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی خاص وعام میں پھیلی ہوئی ہیں میں نہایت مسرت کے ساتھ اِس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ **مؤلف حیاۃ النذیر** نے اِس اہم فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہی اور ممکن ہی کہ بعض کٹ حجّت لوگ اُن کے تصفیئے کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن جب وہ بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو کم سے کم اپنی رائے میں جھوجھکے ضرور ہو جائیں گے

شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فردِ بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اُردو زبان زندہ ہے اُن کا نام بلاشبہہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت۔ استقلال اور قابلیت سے دُنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ایک ادنیٰ طالبِ علم سے اعلیٰ درجے کے فاضل ہو گئے۔ اُن کی زندگی سلف ہلپ (اپنی مدد سے آپ بڑھنے) کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے۔ اُنھوں نے معلّمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلم رہے۔ اُن کی تعلیم اُن کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہے اُن کا بڑا کام اصلاحِ معاشرت (سوشل ریفارم) ہے یعنی یہ کہ دُنیا میں خوش۔ کامیاب اور بے لوث زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہیئے۔ ایک بڑا کمال اُن کی تصانیف میں یہ ہے کہ اُنھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچّی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں اُسی خاندان کے بھَرے تو نہیں کھُل رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے اُردو میں اِس زمانے میں ایسے ایسے باکمال انشا پرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اُردو زبان اور اپنی قوم کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کر کے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے۔ کسی نے دربارِ شاہی کی شان و شوکت یا جنگ کے خوں ریز منظر کا مرقع کھینچا ہے۔ کسی نے قوم کے گزشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کسی نے قومی ادبار و ذلّت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے۔ لیکن روزمرّہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں اُن کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے۔ اور بیان بھی کیسا۔ ایسا پُر لطف ایسا سچّا اور سُلجھا ہوا کہ دل میں کھُب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آ جائیں ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں۔ صحرا بھی ہو۔ دریا بھی ہو۔ آسان ہے۔ لیکن انسانی خصائل یا کسی ایسے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اُوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں۔ بلکہ اُسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھُس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجۂ کمال موجود تھی۔

مولانا کا احسان تعلیمِ نسواں پر بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں حامیانِ تعلیمِ نسواں کی تقریروں۔ لکچروں۔ تحریروں اور قیامِ مدارس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اُن لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اُس کے وسائل بہم پہنچائے۔ مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا اور یہی نہیں بلکہ پڑھنے میں جو مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر مرآۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اُردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے۔ اور اُن کی حیاتِ جاودانی کے لیئے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اِس میں (اور اُن کی دوسری کتابوں میں بھی) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور اُن کے خیالات کو ہو بہو اِس خوبی سے ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو ہو جاتی ہیں۔ یہ بات مرحوم کے سوا اُردو کے کسی دوسرے مصنّف کو حاصل نہیں۔

مولانا اپنی طرزِ تحریر کے آپ موجد تھے۔ اور یہ اُن ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔ اِس میں بڑی بے تکلّفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشا پرداز کو بڑی دقّت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اُس کے دل میں آیا ہے اُسے اُسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے اور اسی لیئے اُسے اکثر اوقات تشبیہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو کبھی ایسی دقّت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کبھی تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیتے اور ایسے ٹھیٹ جاندار اور چسپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے

پھر اُس خیال کے اظہار کے لیے سمجھ میں نہیں آتے۔ زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اُردو انشا پرداز کو نہیں نصیب ہوئی اور یہی وجہ ہی کہ اُن کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا۔ آمد کی یہ کیفیت ہی کہ ایک دریا ہی کہ اُمڈا چلا آتا ہی۔ اُن کی طبیعت قدرتی طور پر پُرزور واقع ہوئی تھی اور یہی زور اُن کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہی۔ جو قوت اور زور ہیں نے اُن کی عبارت میں دیکھا ہی وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ انھیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں۔ وہ اُسی زبان میں سے جسے ہم روزمرّہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لیے بنے ہیں اور پھر اُس پر ظرافت سونے میں سُہاگے کا کام دیتی ہی۔ اُن پر یہ اعتراض کیا گیا ہی اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہی کہ وہ بعض اوقات رکیک اور مبتذل الفاظ استعمال کر جاتے ہیں اس کی وجہ ایک تو وہی ہی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات و استعارات سے کام لینا نہیں جانتے تھے۔ دوسرے طبیعت قدرتًہ واقع ہوئی تھی پُرزور۔ وہ اپنا خیال اُسی زور اور شان کے ساتھ ادا کرنے کے لیے الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جن الفاظ میں اُن کا اصلی خیال صحیح طور سے ادا ہو سکتا تھا اُن کے استعمال میں کبھی نہ چُوکتے تھے۔ اور یہ فعل اُن کا کوئی ارادی نہ تھا۔ بلکہ طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی طبیعت میں آورد نہ تھی بلکہ سراسر آمد تھی۔ علاوہ اسکے آدمی تھے صاف گو اور آزادہ رَو۔ جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اس پر شوخی و ظرافت اُور غضب تھی۔ یہی وجوہ ہیں کہ اُن کی ایک کتاب پر اس قدر شور و غل مچا۔

مرحوم جیسے اعلیٰ درجے کے محرّر تھے ویسے ہی مقرّر بھی تھے۔ لوگ اُن کے لکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں۔ ہم نے خود انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں دیکھا ہی کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہی۔ ہزاروں بندگانِ خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں۔ کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا۔ جب چاہا رُلا دیا۔ آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہنچتی تھی اور اُس میں ایک خداداد اثر تھا۔ شوخی و ظرافت خاص کر اُن کے لکچروں میں دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی ایسا اعلیٰ درجے کا مقرّر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا وہ ساری مجلس پر چھا جاتے تھے اور حاضرینِ مجلس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مسٹر ماریسن کی جو رائے مولف نے لکھّی ہی وہ بالکل صحیح اور بے مُبالغہ ہی۔ انجمن حمایت اسلام۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ مدرسہ طبیّہ دہلی ہمیشہ اُن کے لکچروں کے شرمندۂ احسان رہیں گے۔ اُن کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہی کہ وہ کہیں سے کہیں چلے جاتے تھے۔ یہ اعتراض شاید کسی حد تک صحیح ہی۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ جیسی اُن کی طبیعت اُن کی تحریر اُن کی عبارت اور اُن کے الفاظ اور اُن کی تقریر پُرزور تھی ویسے ہی اُن کا خیال بھی پُرزور تھا اور تخیّل کے پرواز میں دُور تک پہنچ جاتے تھے لیکن اتنی دُور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں جولانیِ طبع انھیں ادھر سے اُدھر ضرور لے جاتی تھی۔ لیکن تاہم مبحث کے آس پاس ہی رہتے تھے۔

ہمارے اس زمانے کے اہلِ قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں۔ انگریزی کے یا عربی کے۔ مگر مرحوم میں جدّت پائی جاتی ہی اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لیے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ اُن کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل

ہے۔ اُن کی اصلِ تصانیف۔ اُن کی جدّت طرازی۔ اُن کے پُرزور تخیل اور مشاہدے کے نتائج ہیں۔ وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دلاویز ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبولِ خاص و عام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جو لوگ اُردو سیکھنا اور اپنے خیالات انگریزی نما اُردو میں نہیں بلکہ ٹھیٹ اُردو میں ادا کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیئے مولانا کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے کیوں کہ اپنے خیال یا مافی الضمیر کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچنا اُن پر ختم ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ اُن کا پورا پورا تتبع کریں کیوں کہ یہ نہ صرف مشکل ہے۔ بلکہ شاید مفید بھی نہ ہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اُن کی تصانیف کے مطالعے سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اِس جدید زمانے میں مسلمانوں میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوئے ہیں خواہ وہ کسی خیال اور رنگ کے ہوں۔ سرسید رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی تک (باستثنائے شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ مرحوم) سب میں زیادہ تر دینی لگاؤ تھا۔ اُن کی تان دین ہی پر ٹوٹتی ہے اور یہی اُن کے خیالات اور اعمال کا مرکز ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ یوں تو اکثر اُن کی تصانیف میں یہ لگاؤ نظر آتا ہے لیکن اُنھوں نے خاص خاص کتابیں مثلاً رویائے صادقہ۔ اجتہاد۔ الحقوق والفرائض۔ اُمہات الاُمّہ لکھ کر اور خاص کر ترجمۂ قرآن مجید سے ایسی عظیم الشان دینی خدمت ادا کی کہ مسلمان اُن کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ مَیں اُن کی دینی خدمت کے متعلق یہاں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ **مؤلفِ حیاۃ النذیر** اِس پر خوب دل کھول کر لکھ چکے ہیں۔ لیکن ترجمۂ قرآن مجید کے متعلق چند الفاظ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس ترجمے کی تمام خوبیوں کا گنوانا تو میری طاقت سے باہر ہے لیکن اس سے بڑھ کر اور کیا خوبی ہوگی کہ ہزارہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اب بلا تکلّف قرآن کے مطالب سمجھنے لگا۔ اور خدا کے احکام خود اُسی کے کلام کے ذریعے سے جاننے لگے۔ اُردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ترجمے کیا تھے الفاظ کے گورکھ دھندے تھے۔ خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اور سمجھ میں آئیں کیوں کر کبھی پڑھی ماردی تھی اور جو طبیعت پر کچھ زور دیکر سمجھے بھی تو وہ لطفِ فصاحت کہاں جس کے لیئے قرآن سارے عالم میں مشہور ہے۔ قرآنِ پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں اِس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصلِ عربی کا زور اور اُس کی شان قائم رہے۔ مولانا چوں کہ عربی اور اُردو کے بے مثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا۔ اِس لیئے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہیئیں۔ مسلسل پڑھتے جایئے سارے مطالب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اِس سے بڑھ کر اور دینی خدمت کیا ہوگی۔ اور یہ صرف دینی خدمت ہی نہیں۔ بلکہ اُردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اب تک بعض لوگ اِس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ سب ترجموں سے افضل ہے۔ اور مرحوم کا ترجمہ اُس سے لگّا نہیں کھاتا۔ اِس میں اب بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ عام مقبولیت نے ثابت کر دیا ہے کہ مرحوم کا ترجمہ ایسا مطالب خیز فصیح اور شگفتہ ہے کہ موجودہ ترجموں میں کوئی اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک بات میں البتہ شاہ صاحب کے ترجمے کو فضیلت ہے اور یہ فضیلت غالباً اُسے ہمیشہ رہے گی۔ وہ یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ کا ترجمہ اُنھوں نے ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ میں کیا ہے کہ اُس سے بہتر ہو نہیں سکتا خصوصاً جہاں کہیں ایسے الفاظ آ گئے ہیں کہ اُن میں اشتراک

معانی کی بحث آپڑی ہے تو اُنھوں نے ہندی کے بھی ایسے ہی لفظ چُن کر رکھے ہیں کہ اُن میں بھی اشتراک کا وہی لطف باقی رہتا ہے اور یہ اُن کی کمال ادبیت کی دلیل ہے۔ مگر اس کا لطف صرف ادیب ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ مطالب قرآن سے اُسے کچھ تعلق نہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ بامحاورہ فصیح اور شگفتہ ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے اس ترجمے کے ضمن میں ایک مزے کی بات اور کہنی ہے جس سے ہماری قوم کے علماء کی حالت کا پتا لگتا ہے۔ مولانا کا ترجمہ شائع ہوتا تھا کہ اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ اُن حضرات کے ترجمے بھی شائع ہونے شروع ہوئے اور اکثر یہ اعتراضات اس نیت سے کئے گئے تھے کہ مولانا کے ترجمے کی طرف سے لوگ بدگمان ہو جائیں اور ہمارا ترجمہ بکنے لگے۔ افسوس اس سے قبل کسی کو ترجمے کی ضرورت کا خیال نہ ہوا اور اب جو مولانا کا ترجمہ شائع ہوا اور اُس کی شہرت ہوئی تو یہ بھی لگے مُونہ چڑانے۔ لیکن مولانا کے ترجمے کے سامنے کسی کو فروغ نہ ہوا۔ ان اعتراضات یا اسی قسم کی تحریرات میں جہاں کہیں مرحوم کا نام آتا تو یہ مولوی مارے جلن کے ان کے نام کے ساتھ کبھی مولوی کا لفظ نہ لکھتے بلکہ ہر جگہ ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے تھے۔ یہ کم ظرفی کی بات نہیں تو کیا ہے تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود عالم۔ حافظ اور مترجم قرآن ہونے کے بھی ان مولویوں کے نزدیک مولوی کہلانے کا مستحق نہیں۔ جن کے علم و فضل کی ساری پونجی مسلمانوں کے ارتداد و کفر کے فتوے لکھنے میں صرف ہوتی ہے۔

بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہم عصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں مولانا بھی آخر عمر میں اس سے نہ بچے۔ امہات الامہ کا شائع ہونا تھا کہ دلی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے۔ اُن کی بن آئی۔ خوب جلے پھپولے پھوڑے۔ مخالفت میں رسالے چھپوائے۔ طرح طرح کے بہتان باندھے کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہو گئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلّی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پونہچا۔

لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا جو اجلاس دلّی میں ہوا اُس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے۔ اُنھوں نے باہم "سکوٹ" کر کے امہات الامہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرا دی تھی منگوائیں اور اپنے سامنے اُن کتابوں کا ڈھیر لگوایا۔ اور اُن میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لیے آگے بڑھ کر مٹّی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کر کے آگ لگا دی۔ اُس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور اُن کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو ایک خوں خوار درندے یا سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانائے مرحوم بھی اُسی آگ میں جھونک دیئے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ مولویوں کا یہ حلقہ زمانۂ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا۔ جنھوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیئے۔ کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیئے۔ گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیئے۔ کتّوں سے پھڑوا دیئے۔ اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس

سنکا سنکا کر مار ڈالے۔ اور اُن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودہ عبرت تھا۔ جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا۔ یہ راکھ اِس قابل تھی کہ اُس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشیوں میں بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آیندہ نسلیں اُسے سامنے رکھ کر اُن علمائے کرام و مصلحانِ ملک و ملت کی ارواحِ پاک پر فاتحہ دلائیں اور اُن کے حق میں دُعائے خیر کریں۔ اِس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اُس آگ سے اپنے نفوسِ مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً اُن کی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی۔ یہ اُن بزرگواروں کا کام ہے جنھوں نے چشمِ بد دُور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

طالبِ علمی کے زمانے میں جب مَیں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کُتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر مُحکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اُس کی تردید کی تو اُس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بُہتان ہے مگر جب مجھے اِس واقعے کی خبر لگی اور خصوصاً جب مَیں نے یہ سُنا کہ علّامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کارِ خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا۔ اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجّب نہیں کہ مسلمانوں نے کُتب خانۂ اسکندریہ جلا دیا ہو۔

اِس واقعے کا ایک بہت بُرا اثر یہ ہوا کہ جب مرحوم کے فرزند رشید نے مدرسۃ العلوم مسلمانان (علی گڑھ) سے اپنے پدرِ بزرگوار کی یادگار قائم کرنے کی درخواست کی اور خود بھی اُس میں معقول امداد دینے کا وعدہ کیا تو کالج کے سنڈیکیٹ نے بڑی ڈھٹائی سے مولویوں کے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ مرحوم کے معتقدات قرار دی۔ جو اُن کے زعمِ شریف میں خلافِ اسلام تھے۔ کوئی ممبرانِ سنڈیکیٹ سے پوچھے کہ تم کسی کے مذہب پر رائے دینے والے کون ہو؟ اور اس معاملے کو مذہب سے تعلق؟ سر ولیم میور اور میکڈانلڈ جیسے لوگوں کی تو یادگار قائم کی جائے۔ اور ایک حافظ عالم۔ مترجم قرآن۔ محسن کالج کی یادگار قائم کرنے میں یہ انکار! اور انکار بھی کیسا ناروا اور شرمناک! خصوصاً جب کہ ارکانِ سنڈیکیٹ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کتاب اُمہات الامہ کو بالاستیعاب پڑھا ہو۔ صرف مولویوں کے خوف سے گھبرا کر یہ فیصلہ کر دیا۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ کارکنانِ کالج میں مداہنت اور بزدلی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو جس غرض سے بانیٔ کالج نے یہ کالج قائم کیا تھا وہ فوت ہو جائے گی اور اُس کا وجود بے سود ثابت ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعد میں اپنے کیے سے پچھتائے اور اُس کی تلافی اِس طرح کی کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے متعلق رزولیوشن پاس کیا۔ غنیمت ہے۔ دیکھیں ہمارے علماء کیا کرتے ہیں۔ تلافی تو خیر وہ کیا کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے خلاف فتویٰ نہ لکھ ماریں۔

مرحوم کے حق میں یہ صریح بے انصافی اور سخت ظلم ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ انصاف پسند صحاب اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور اِس محسنِ مُلک و قوم کی یادگار قائم کرنے میں سعیٔ بلیغ فرمائیں گے ورنہ ہماری قوم پر یہ بڑا دھبّا رہ جائے گا۔

قابل مؤلف نے مرحوم کے کریکٹر کے متعلق مفصّل اور کافی بحث کی ہے۔ اس کے بعد اس پر کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ مرحوم میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی صفت اُن کی معاشرت میں اعتدال اور کفایت شعاری کی تھی جس کی آج کل ہمیں بڑی

ضرورت ہے اور ہماری تمدّنی اصلاح کا بڑا دار و مدار اسی پر ہے۔ لیکن اس سے حاصل؟ کیا عمر بھر کی کفایت شعاری کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ اُس کا سارا مال اولاد باہم تقسیم کر لے؟ کیا اس میں قوم کا کوئی حصّہ نہیں؟ خصوصًا جب کہ اولاد کھاتی پیتی اور مرفّہ الحال ہو۔ ایثار کی تلقین کرنا اَور بات ہے اور اُس پر عمل کرنا اَور۔ کسی شے کا علم عمل کے لیئے کافی نہیں۔ اعمال پر تربیت اور خاص کر ابتدائی تربیت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے الّا ماشاء اللہ۔ البتّہ اِس زمانے میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے جو ہر طرح قابلِ تحسین اور لائق تقلید ہے۔ اُنھوں نے بھی اپنی عمر کفایت شعاری میں بسر کی لیکن اُس کے ساتھ ہی اپنا سارا اندوختہ قوم کی نذر کر دیا۔

گزشتہ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایّام میں ترقیِ اُردو کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا۔ اِس میں علاوہ دیگر تجاویز کے ایک یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ محسنینِ اُردو کی سوانحِ عمریاں لکھی جائیں۔ اس میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اِس کے بعد ہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مولوی افتخار عالم صاحب اِس کام کو کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور حُسنِ اتفاق سے چند ہی روز بعد اُن سے ملاقات بھی ہو گئی تو میں نے اُن کی خدمت میں دلی مبارکباد عرض کی اور اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے بڑا کام کیا اور بڑا احسان کیا ہے۔ اور جس محنت، جاں فشانی اور لگاتار کوشش سے اِس فرض کو انجام دیا ہے وہ اُنھیں کا حصّہ ہے اور حق یہ ہے کہ اُنھوں نے سوانح عمری کا حق ادا کیا ہے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اُنھیں ایسا سوانح نگار ملا جس نے اِس کام کو نہایت ہمدردی، دل سوزی اور صداقت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ طرزِ تحریر بھی فصیح اور شگفتہ ہے۔ بعض جگہ تو مجھے شبہہ ہو جاتا تھا کہ کہیں مرحوم کی عبارت تو نہیں۔ امید ہے کہ پبلک اور خاص کر مرحوم کی تصانیف کے دلدادہ ضرور اس کی قدر کریں گے۔

قابل مصنّف نے اس کتاب کو غالبًا حضرت ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے میجر حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر کے نام معنوَن کیا ہے۔ صاحبزادے صاحب مدرسۃ العلوم مسلمانان (علی گڑھ) میں تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہونہار اور لائق نوجوان ہیں۔ ہمدردی، قدردانی اور فیاضی میں اپنی والدہ ماجدہ کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ اُن کی ذات سے بڑی بڑی توقّعات ہیں۔ اگلے زمانے میں مؤلفین و مصنّفین کو امرا و رؤسا کے درباروں سے ایسے ایسے صلے ملتے تھے کہ وہ عمر بھر کو نہال ہو جاتے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ لائق مؤلف کی جانکاہی اور محنت کی قدر اُن کی لیاقت کے موافق کی جائے گی۔

نقادانِ حیاۃ النذیر کا شکریہ

میں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے تین ریویو حیات النذیر کے ساتھ شائع کرتا ہوں۔ یہ نمونہ دیکھنے کی تقریظیں نہیں ہیں بلکہ تنقیدی تقریظیں ہیں۔ ان تقریظوں میں صرف ایک اعتراض وارد ہی جس کا جواب فٹ نوٹوں میں دے دیا گیا ہی۔ حیات النذیر کے تعلق سے مؤلف کی جو کچھ مدح سرائی فرمائی گئی ہی اُس کو میں حسن ظن یا ہمت افزائی کہوں تو بہت بجا ہوگا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ تاہم اِس قدر افزائی کا شکریہ مجھ پر واجب ہی۔ (خاکسار مؤلف حیات النذیر)

تنقید از شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی (سعدیِ ہند)

حیاۃ النذیر

یعنی سوانح عمری جناب شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد۔ ڈی۔ او۔ ایل مرحوم

مرتبہ

سید افتخار عالم صاحب رئیس مارہرہ ملازم ریاست بھوپال جو جناب
کپتان حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر فرزند اصغر عُلیا حضرت
بیگم صاحبہ بھوپال کے نام نامی سے معنون کی گئی ہی۔

میں مصنف حیاۃ النذیر کی اِس خاص عنایت کا شکریہ تو دل سے ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے مجکو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعے کا حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب پہلے اِس سے کہ چھپ کر بہمہ جہت تیار ہو جائے خاکسار کو عنایت کی ہی۔ ظاہرا مصنف نے حیاۃ النذیر کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کر دی تھی ورنہ اُن کی وفات کے بعد جس کو بہت زمانہ نہیں گزرا ایسی مفصل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا۔ بہرحال مصنف نے اِس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہی کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا میرے نزدیک قوم کا کوئی اہلِ قلم اِس بار سے سبکدوش نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہی اور اپنے جادو اثر لکچروں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہی وہ محتاجِ بیان نہیں ہی۔ خصوصاً قرآن مجید کی خدمت

کے لحاظ سے جو امتیاز اُنھوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہی۔ اُس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کر سکیں گے جب اُن کی وفات پر ایک معتدّ بہ زمانہ گزر جائے گا۔ اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو اُنھوں نے کیا ہی اُس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہی کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اِس قلیل عرصے میں اُس کے گیارہ اڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور کُل اڈیشنوں کی کچھ اُوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں۔ اور اُس کی مانگ یوماً فیوماً زیادہ ہوتی جاتی ہی۔ اِس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہی کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کو اِس وقت سوا سو برس کا عرصہ گزر چکا ہی اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی اِس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گزر چکے تھے۔ اِس عرصے میں اہلِ سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا مگر جب ترجمۂ نذیریہ کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی۔ دفعۃً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمر بستہ ہو گئے اور چند سال کی مدت میں متعدد جدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا۔ شاہ صاحب کے ترجمے سے بسبب اس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمی قرآن کی ابتدائی حالت تھی۔ قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمۂ نذیریہ کی بامحاورہ اُردو اور طرزِ ادائے مطلب کی مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلامِ الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذت اور فائدہ اُٹھانے لگا۔ لیکن اِن ترجموں نے اِس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمۂ نذیریہ کے الفاظ بدل دیئے جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں معلوم ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں۔ یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہی نہ اُن کو پبلک میں وہ ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حُسنِ قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پہنچ سکتا۔ بہرحال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہی اُس کی مفصّل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہی۔ اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کیے جائیں گے۔ مختصر یہ ہی کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیئے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ہی ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہی کہ اکثر صاحبوں نے ترجمۂ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا (ممکن ہی کہ بعض صحیح ہوں) اور اکثر مدعیانِ ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اُٹھایا۔ مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دیتا تو در کنار ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے مُونہ سے نکلتا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔

اب میں مصنفِ حیاۃ النذیر کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت

اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہے۔ باوجودے کہ راقم کی حالت مدت سے مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں۔

اِس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنّف نے جا بجا انتخاب کیئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس جب کہ عام تحریروں کا یہ حال ہے تو جو اقتباسات مصنّف نے خاص توجّہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کیئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ کس قدر دلاویز اور دلکش ہوں گے۔ اِس سے زیادہ ہم مولانا کی طرزِ تحریر کے متعلق اِس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اِس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اُس شخص کو اپنے اسٹائل میں تھی وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سر سید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے اسٹائل میں حاصل تھی۔ اِسی طرح مولانا کے لکچروں پر یہاں اِس سے زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے جو بقول مصنّف مسٹر موریسن بالقابہ نے مولانا کے لکچروں کے متعلق کہا تھا کہ "صدہا برس تک یورپ ایسا اسپیکر نہیں پیدا کر سکتا" اس موقع پر مولانا کی تحریر و تقریر کا ذکر محض بسبیلِ تذکرہ آ گیا ہے۔ کیوں کہ ہمارا اصل مقصد حیاۃ النذیر کی ترتیب اور مصنّف کے اس مہتم بالشان کام پر رائے زنی کرنا ہے۔ ورنہ مولانا کی اعلیٰ لیاقتوں کے بیان کرنے کے لیئے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

حیاۃ النذیر میں مصنّف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی۔ اُن کی طرزِ ماند و بود۔ اُن کے اخلاق و عادات۔ اُن کے اوقات و مشاغل۔ اُن کے اعتقادات اور اُن کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود اُن ہی کی تصنیفات اور تصریحات کی بنا پر کھینچا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالاتِ مذکورہ کے تفحّص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اِس مقصدِ عظیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سچّی بیوگرفی سے جو گراں بہا فائدے آیندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں اُن کے پہنچانے میں تا بہ مقدور کوتاہی یا بخل نہ کیا جائے۔

اِس بیوگرفی کے متعلق ہم ریویو نگاری کا فرض ادا کرنے کی غرض سے مصنّف کی خدمت میں ایک عرض کیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُنھوں نے جس طرح شاید ترجمۂ نذیریہ کی فوقیت ظاہر کرنے کے لیئے اُس کا موازنہ دیگر جدید ترجموں سے کیا ہے۔ اِسی طرح کتاب الحقوق والفرائض مرتّبہ مولانا نذیر احمد کے بعض مقامات کا موازنہ حجۃ اللہ البالغہ کے ہم مضمون مقامات سے کیا ہے اور الحقوق والفرائض کے بیانات کو حجۃ اللہ البالغہ کے بیانات پر ترجیح[1] دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کا یہ بیان[2] مولانا کی نظر سے نہیں گذرا۔ ورنہ ہرگز توقع نہیں کہ وہ مصنّف کو ایسی دلیری کی اجازت دیتے۔

---

[1] یہ ترجیح محاسنِ لٹریچر کی رُو سے نہیں بلکہ مطالب معانی و نکات کی رُو سے ہے ممکن ہے کہ اصل کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں وہ محاسن موجود ہوں جو الحق ترجمہ آیات اللہ الکاملہ میں نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مؤلفِ حیاۃ النذیر اتنا قصوروار نہیں جتنا مترجم حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ اِس گتھی کو علّامہ شبلی نعمانی نے اپنے ریویو میں خوب سُلجھا دیا ہے۔ ع ہے ادب شرط مونہ نہ کھلواؤ۔ (مؤلف حیاۃ النذیر)

[2] مولانا نذیر احمد مرحوم نے حیاۃ النذیر کا کوئی بیان نہیں دیکھا۔ (مؤلف حیاۃ النذیر)

مصنّف نے شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت شمس العلماء مولانا شبلی کے اِس قول کو نہایت تعجب سے دیکھا ہی کہ شاہ صاحب کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی - رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے - اس ریویو میں اتنی گنجایش نہیں ہی کہ شمس العلماء کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کی جائے - لہذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا ست   سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جا ست

تنقید از شمس العلماء مولانا مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ناظم ندوۃ العلماء

ریویو

حیاۃ النذیر

پر

مولانا نذیر احمد مرحوم اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو اُن کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں - مُلک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا - اور مسرّت کی بات ہی کہ یہ ضرورت بوجہِ احسن پوری ہوئی -

مصنّف نے جس تفحّص - استقصا اور سعی و تلاش سے واقعات بہم پونہچائے ہیں وہ اُن ہی کا حصّہ تھا - ایک حیرت انگیز بات یہ ہی کہ مصنّف نے مولانا نذیر احمد کے لٹریچر کا اس قدر تتبع کیا ہی کہ کتاب پر خود مولانا کے لٹریچر کا دھوکا ہوتا ہی -

سوانح نگاری کا آج کل جو طرز ہی وہ ایک قسم کی وکالت[۵۱] کے درجے تک پونہچ گیا ہی اور یہ حُسن ہی یا عیب - لیکن یہ تصنیف بھی اس وصف سے خالی نہیں -

یہ امر بھی تعجّب سے خالی نہیں کہ مصنّف نے فسانۂ مبتلا کا انتخاب ضرورت سے زیادہ[۵۲] کیا ہی -

مجکو اس کتاب کے متعلق اس بات کا نہایت افسوس ہی کہ مصنّف نے مولانا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقابلہ کیا ہی اور وہ اس طرح کہ شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ لے کر مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق و فرائض

---

[۵۱] وکالت کے تو یہ معنی ہیں کہ اپنے موکل کی جا و بے جا طرف داری کی جائے - لیکن مؤلفِ حیاۃ النذیر یقین دلاتا ہی کہ اُس کو مولوی نذیر احمد مرحوم کے کل عیبوں پر عبور نہیں ہی - اگر عبور ہوتا تو وہ ضرور درج کرتا - اس بارے میں جتنا کچھ بھی علم تھا وہ اُس کے لکھنے سے باز نہیں رہا - یعنی اُس نے اپنے زعم میں روشن اور تاریک دونوں رُخ دکھا دیئے ہیں اگر سکنڈ اڈیشن کی نوبت آئی اور مولف کو بھی مولانا کی کمزوریاں معلوم ہو گئیں تو وہ درج کرنے میں ہرگز باک نہ کرے گا - ۱۲ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

[۵۲] فسانۂ مبتلا کا ضرورت سے زیادہ انتخاب ایک خاص وجہ سے کیا گیا ہی - اس نکتے کو ہمارے مکرم مولوی مفتی انوار الحق صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاست بھوپال اپنے ریویو میں خوب سمجھے ہیں ۱۲ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

سے موازنہ کیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے ترجمے سے قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ کرے۔ حجۃ اللہ البالغہ[1] کا اُردو ترجمہ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ اِس درجے کی کتاب ہے کہ مولانا نذیر احمد مرحوم کے لیئے یہ فخر بس کرتا ہے کہ وہ اُس کے دقائق اور محاسن کو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

مولانا نذیر احمد کی فارسی نویسی کی جو مثالیں پیش کی ہیں مجھکو شبہہ ہے کہ وہ اُن کی فارسی انشا پردازی کی نسبت کس قسم کی شہادت[2] دے سکیں گے۔

بہر حال ہم مصنف کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ایک فاضل کی قدردانی کا پورا حق ادا کیا اور وہ خدمت انجام دی جو زبانِ اُردو کی طرف سے ایک فرضِ واجب الادا تھا۔ مصنف نے کتاب کے ڈیڈی کیشن میں بھی حُسنِ انتخاب کی قابلیت ثابت کی ہے۔ جناب صاحب صاحب زادے کپتان حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب اے۔ ڈی۔ سی۔ فرزندِ اصغرِ علیا حضرت فرماں روائے ریاستِ بھوپال کا علمی ذوق اور علم کی قدردانی اِس کی مستحق ہے کہ علمی تصنیفات اُن کے نام سے مُعنون کی جائیں اِس زمانے میں ایسی روسا کی مثالیں بہت کم مل سکتی ہیں۔

[1] اگر آیات اللہ الکاملہ حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ۔ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس کے سوا موازنہ جو کیا گیا ہے وہ اُردو لٹریچر کا موازنہ نہیں ہے بلکہ مطالب و معانی و نکات اور رموز نکتہ فہیوں کا موازنہ ہے۔ مجھکو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مولوی نذیر احمد مرحوم نے جس وقت الحقوق والفرائض لکھنے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت نہ صرف حضرت امام غزالی کی بعض تصانیف اور حضرت شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اُن کے پیشِ نظر تھی بلکہ اَور مصنفین کی کتابیں بھی مطالعہ کی تھیں کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے اِن تصانیف سے استفادہ نہیں کیا ہوگا۔ اگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حضرت امام غزالی کی تصانیف کو پیشِ نظر رکھا ہوگا۔ دنیا میں اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے چلے آئے ہیں۔ حضرت امام غزالی کے چراغ سے شاہ صاحب نے چراغ جلایا اور شاہ صاحب کے چراغ سے مولوی نذیر احمد نے۔ اور یہ بات مُسلّم ہے کہ پہلے چراغ سے دوسرے چراغ میں زیادہ روشنی ہوتی ہے ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ اگر اسی طرح تیسرے چراغ میں پہلے اور دوسرے سے زیادہ روشنی ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے فضلنا بعضکم علی بعض۔ ہاں اگر حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں مولانا نذیر احمد مرحوم کی تصانیف سے زیادہ مُو نکتہ فہیاں فرمائی ہیں اور آیات اللہ الکاملہ اُس کا عُشرِ عشیر نہیں تو علاّمہ شبلی نعمانی سے زیادہ مجھے موازنہ کا افسوس ہے اس لیئے اگر کوئی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کا صحیح ترجمہ کر کے طبع فرمائیں تو اس جرم کی پاداش میں جو بوجہ قصورِ استعداد مجھ سے سرزد ہوا ہے بطورِ کفارہ اپنی بضاعت سے زیادہ پچاس روپیہ امداداً مترجم صاحب کو نذر کروں گا تاکہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

[2] مولوی نذیر احمد کی فارسی انشا پردازی کے متعلق اس سے زیادہ زبردست اَور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ہماری موجودہ مُغلق اور دقیق اور پیچیدہ انشاؤں کے مقابلے میں اُن کی فارسی زیادہ سلیس زیادہ فصیح اور زیادہ دل چسپ ہے اگر حیاۃ النذیر کے سکنڈ ایڈیشن کی نوبت آئی تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی ایسی مثالیں پیش کریں گے جن سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

تقریظ از مولوی مفتی انوارالحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات ریاست بھوپال

ناول کی دلچسپی کی سب سے بڑی تعریف یہ ہی کہ اُسے ایک دفعہ ہاتھ میں لے کر ختم کیئے بغیر چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ **حیاۃ النذیر** اگرچہ ناول نہیں ہی۔ لیکن میرے خیال میں اس لحاظ سے کسی ناول سے کم نہیں۔ اپنی عدیم الفرصتی اور کتاب کی ضخامت سے مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میں اُسے اتنی جلدی دیکھ سکوں گا۔ مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ اِس قدر دلچسپ ہوگی۔ بہرکیف اپنا ذاتی تجربہ تو یہ ہی کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد پھر میں اُسے اخیر تک دیکھے بغیر نہ چھوڑ سکا۔ اور اِس پر میں مصنّف کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی عنایت سے مجھ کو ایسی عمدہ کتاب کے مطالعے کا موقعہ ملا۔ گو اُس کے نفسِ مضمون کے دلچسپ ہونے میں بھی کلام نہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات کتاب میں زیادہ تر حسنِ ادا اور شوخیِ بیان کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہی۔ مصنّف نے مولٰنا نذیر احمد صاحب مرحوم کے حالات لکھنے میں اُن کی طرزِ تحریر کا اس قدر تتبع کیا ہی کہ اُسے کالاصل کر دیا ہی۔ اور اکثر جگہ مصنّف کی عبارت پر مولٰنا کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہی۔ میرے خیال میں مصنّف کے اسلوبِ بیان کی اِس سے بڑھ کر اَور کوئی تعریف نہیں ہوسکتی ہی۔ یہ سب سے بہتر یادگار رہی جو کوئی قوم اپنے سلفِ صالحین کی حسنِ مساعی کے اعتراف میں قائم کرے۔ مصنّف نے یہ کتاب لکھ کر قوم کی طرف سے اہمّ فرض ہی ادا نہیں کیا۔ بلکہ اُردو علم ادب میں بھی ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہی۔ اجتماعِ حالات میں بھی بہت کچھ کوشش کی گئی ہی۔ لیکن چونکہ مصنّف نے مولٰنا کی زندگی ہی میں اِس کا مصالحہ فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اِس لیئے اِس میں چنداں دشواری پیش نہ آئی ہوگی۔ صاحبِ سوانح کی یکطرفانہ مدح سرائی کا نقص ہماری کتبِ سیر میں عام ہی۔ اور یہ کتاب بھی اِس سے مبرّا نہیں ہی۔ یوں تو کون شخص مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات اور احسانات کا انکار کر سکتا ہی۔ جب تک اُردو زبان باقی ہی۔ اُن کی فصاحت و بلاغت اور بے نظیر انشا پردازی کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں مصنّف کے قلم کو صراطِ انصاف سے لغزش ہوگئی ہی۔ مثلاً امہات الامہ پر ریویو کرتے ہوئے مصنّف نے نقلِ کفر کفر نہ باشد کہہ کر اُس فتوے کی نقل کی ہی جو اس کتاب کے بعض مضامین کی وجہ سے چند علما نے مولٰنا کی تکفیر اور کتاب کے سوختنی ہونے کی بابت دیا تھا۔ مصنّف نے خود بھی اُن خاص مقامات کی بابت لکھا ہی کہ "وہ ضرور ایسے فقرے ہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں ہوسکتی"۔ مگر مولٰنا نے مصنّف کے استفسار پر اُن کی بابت صرف یہ کہہ دیا ہی کہ بے شک شوخی ہوگئی ہی"۔ یہ درست ہی۔ لیکن بقولِ غالب مرحوم

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر

میں مانتا ہوں کہ اگرچہ مصنّف نے بھی مولٰنا کی اُن عبارتوں کو بہ نظرِ ناپسندیدگی دیکھا ہی۔ مگر اُنھوں نے فتوے کا ذکر اور علما کا نام اِس طرح لیا ہی۔ جس سے صاف تضحیک اور استہزا کی بو آتی ہی۔ انصاف متقاضی تھا کہ جب ذکر چھیڑا تھا

توکم سے کم اُن مقامات کی نقل تو کر دیتے۔ تاکہ لوگ خود اندازہ کر لیتے کہ علماء کے فتوے صرف بغض و حسد کی وجہ سے تھے یا اُن کی کچھ اَور بھی وجہ تھی۔ اب حیاۃ النذیر کے پڑھنے والے اصل معاملے سے بالکل بے خبر رہیں گے اور تمام الزام بے چارے مولویوں ہی کے سر تھوپیں گے۔ جو بدقسمتی سے پہلے ہی بے جا اور بہ جا کچھ کم بدنام نہیں ہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم اور مولانا نذیر احمد صاحب کے موازنے میں بھی میرے خیال میں مصنف نے تقریباً بالکل یک طرفہ فیصلہ کیا ہے جس سے اُن کی بالغ نظری پر حرف آتا ہے۔ لیکن غالباً اس امر کا ذمہ دار زیادہ تر وہ ترجمہ ہے جس کا مصنف نے مولانا کی کتاب سے مقابلہ کیا ہے۔ اسی طرح موعظۂ حسنہ کے اُردو معلے پر مرجح ہونے کے مسئلے پر بھی بہت کچھ بحث ہو سکتی ہے لیکن بہرکیف یہ اسقام ایسے ہیں جو چنداں وقیع نہیں۔

کتاب کے حصۂ پنجم میں مولانا کی تصانیف و تراجم پر فرداً فرداً ریویو کیا گیا ہے اور ہر ایک میں سے کچھ حصّہ تجزیۃً درج کیا گیا ہے۔ ریویو مختصر ہے اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیوں کہ جن کتابوں کو ملک اور قوم نے قبولیتِ عام کا خلعت دے دیا ہو وہ سب نقّادانِ سخن کی رایوں سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ مگر انتخابِ کلام کچھ عجیب طرح کیا گیا ہے۔ یقیناً مولانا کی سب سے زیادہ مقبول کتابیں توبۃ النصوح ۔ مرآۃ العروس اور بنات النعش ہیں۔ لیکن انتخاب میں سب سے زیادہ حصّہ ابن الوقت اور اُس سے بھی زیادہ فسانۂ مبتلا کو ملا ہے۔ خیر ابن الوقت میں تو مولانا نے ہندوستان کے بہت سے و اہم سوشل مسئلوں پر بحث بھی کی ہے مگر فسانۂ مبتلا کا مضمون یعنی دو بیبیوں کی خرابی اتنا اہم نہیں معلوم ہوتا ہے کہ پچاس صفحے اس کی نذر کیئے جائیں لیکن شاید اس کے پردے میں مصنّف کو اس امر کا اظہار مطلوب تھا کہ خود مولانا[5] مرحوم نے بھی "دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر،، کے اصول کی باین شدّ و مدّ تائید کرنے کے باوجود بھی خود یہی غلطی کی۔ اس سے تو بدرجہا بہتر ہوتا کہ مولانا کی غیر مطبوعہ اور قابلِ قدر علمی کتاب سمٰوات کا زیادہ حصّہ دیا جاتا۔ لیکن شاید یہ اصولِ تجارت کے خلاف ہوتا

[5] جناب نے اس اعتراض کے سوا اپنے کل اعتراضوں کو چوں کہ خود وقیع قرار نہیں دیا ہے۔ اس لیئے غیر وقیع اعتراضوں کو چھوڑ کر صرف اس اعتراض کے متعلق اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ردّ و قدح اور جواب سوال کے جھمیلے میں پڑنے سے تُو تُو مَیں مَیں اور تضیع اوقات کے سوا کچھ نتیجہ نہیں۔ بحث مباحثے سے لوگوں کی طبیعتوں میں اَور اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال میری تو صرف یہ گزارش ہے کہ مولویوں کے نزدیک کسی مسلمان کو کافر بنا دینا شاید لڑکوں کا کھیل ہو مگر میرے نزدیک تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مشکل کام نہیں ہے۔ جناب اس کو خوب جانتے ہیں کہ اگلے زمانے میں بھی ہیسیوں مسلمان کافر بنائے گئے تھے مگر وہی کافر آج رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ جیسے جلیل القدر لقب کے ساتھ یاد کیئے جاتے ہیں۔ جناب کے زمانے میں بھی ایک بے چارہ سید بہت بڑا کافر گذرا ہے لیکن اس انقلاب کو ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی اُس کا کفن بھی میلا نہیں ہونے پایا تھا کہ رحمۃ اللہ علیہ ہو گیا۔ میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اسی طرح یہ نذیر احمد کافر بھی اگر وہ سچّا مسلمان تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ضرور سچّا مسلمان تھا تو جناب دیکھ لیں گے کہ کافر گر مولوی خود یا اُن کے بیٹے پوتے پڑپوتے اُس کافر کو مقدس ائمہ مسلمین کے گروہ میں صدر نشین بنا کر بٹھائیں گے اور رحمۃ اللہ علیہ اور قدس سرہٗ جیسے فقرے اُس کے نام کے ساتھ بڑھائے جائیں گے۔ مرحوم کی زندگی میں لوگوں نے اپنی مونہ زوریوں سے اُس کو ڈرا دھمکا لیا اور کفر کے فتووں سے اُس کا مونہ بند کر دیا مگر اسلام اور کفر کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ۔ زورت ار پیش می رود با ما ✤ با خداوندِ غیب داں نہ رود ✤ (مؤلفِ حیاۃ النذیر)

کیوں کہ اس کا جو حصّہ درج کیا گیا ہی وہ صرف دیداری نمائی و پرہیز می گنی کا مصداق سمجھنا چاہیئے۔

آخر میں مصنف کے اِس حُسنِ انتخاب پر مبارک باد دیتا ہوں۔ جس سے اُنھوں نے اِس کتاب کے تہذیبے میں کام لیا ہی۔ مولانا نذیر احمد ہندوستان میں ایک سچّے اور کامیاب طالب علم کی بے نظیر مثال ہیں۔ حالتِ ناداری و بے پدری میں اُن کی علمی ترقّی۔ اور ترقّی بھی ایسی کہ اُس نے مولانا کو کنجاہ کے منڈول کی مُدرسی سے سرسالارِ جنگِ اول کے صاحب زادے کی اُستادی اور اعلیٰ حضرت نظام مرحوم کی معلمی کے درجے تک پونہچا دیا۔ یہ ایک ایسی مثال ہی جو ہر وقت طالب علم کے پیش نظر رہنی چاہیئے۔ اِس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اِس کے سرورق کا ہمارے طالب علموں کے سرتاج اور ہمارے قومی کالج کے فخرِ عالی جناب صاحب زادے حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر آف بھوپال زادہم اللہ علمًا و فضلًا کے نام نامی و اسم سامی سے مزیّن ہونا نہایت مناسب و بجا ہی۔

بہر کیف مصنف ہر پہلو سے اپنی محنتوں کے بارآور اپنی مساعی کے مشکور ہونے پر مستحقِ تہنیت ہای۔ خدا قوم کو ایسی کتابوں کی قدر کرنے کی توفیق اور اِس کتاب کو خلعتِ قبولیتِ عام عطا فرمائے۔

انوار الحق ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیمات

ریاستِ بھوپال ۴ نومبر ۱۹۱۲ء

ہند گویند نہ دارد شرف از اہل کمال * ہمہ دارد - چو نذیرے ہمہ دانے دارد

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی، ڈی - او - ایل

تاریخ ولادت ۲۳ جمادی الاول سنہ ۱۲۵۲ ہجری مطابق ۶ دسمبر سنہ ۱۸۳۶ع روز سہ شنبہ

تاریخ وفات ۱۵ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۰ ہجری مطابق ۳ مئی سنہ ۱۹۱۲ع روز جمعہ

انڈین پریس الہ آباد

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
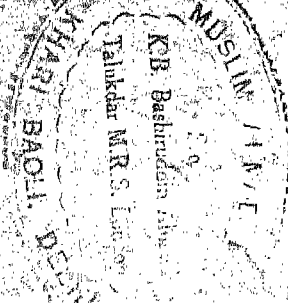
چوں قلم افتد بدست اوّل خدا خواہم نوشت بعد ازاں در پہلوئے او مصطفےٰ خواہم نوشت
ہیچ اولادِ نبی و وصفِ اصحابِ رسول ہر یکے را از سرِ صدق و صفا خواہم نوشت

راقم الحروف کے نزدیک اصنافِ تالیف و تصنیف میں وقائع یا سوانح نگاری جتنا دشوار کام ہے اتنا کوئی دوسرا نہیں۔ دشوار اس لیے نہیں ہے کہ صاحبِ سوانح کے واقعاتِ زندگی بہم نہیں پونہچ سکتے۔ واقعات کا بہم پونہچنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں۔ مشکل ہے صحیح صحیح واقعات کا دست یاب ہونا۔ جب کسی سوانح نگار کو صحیح صحیح واقعات بہم نہیں پونہچ سکتے تو سوانح عمری کیا خاک لکھی جاسکتی ہے اور لوگ اُس سے کیا خاک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ہاں اگر کوئی شخص صحیح صحیح سوانح لکھ سکتا ہے تو وہ خود صاحبِ سوانح ہو سکتا ہے بشرطے کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات میں رنگ آمیزی نہ کرے۔ اور یہ بات انسانی طبائع سے بالکل ناممکن ہے۔ کیوں کہ کوئی شخص فطرۃً نہ اپنی تشہیر کرتا ہے نہ اپنے معائب کا ڈھنڈھورا پیٹنا چاہتا ہے۔ ہمارے اس دعوے کے بطلان میں ممکن ہے کہ وہ چند سوانح عمریاں پیش کی جائیں جو خود صاحبِ سوانح کے قلم سے نکلی ہوئی موجود ہیں۔ مگر قسم کھانے کی بات ہے کہ وہ بھی رنگ آمیزی سے مبرا نہیں۔

توزکِ جہاں گیری کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شہنشاہِ جہاں گیر نے اُس میں اپنی تمام کم زوریاں اور خوبیاں راست راست اور بے کم و کاست بیان کردی ہیں مگر ع ہرگزم باور نمی آید ز روے اعتقاد۔

راقم نے فرضی نام کے ساتھ ایک شخص کی اصلی سوانح عمری دیکھی ہے اور اُس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہے کہ سوانح نگار نے اپنی جبلّت ظاہر کرنے میں ذرا بھی تخلّل کو دخل نہیں دیا۔ مگر وہی فطرۃِ انسانی کے تقاضے سے مجبور

ہو کر یا قانونِ مروجہ کے خوف سے بعض اپنے معائب قصداً سوانح عمری میں درج نہیں کیے تاہم اُس سوانح عمری کے طبع ہونے کے بعد ناظرین جب اُس کا مطالعہ کریں گے تو تمام سوانح عمریوں سے زیادہ دل چسپ۔ زیادہ فائدہ رساں۔ زیادہ نتیجہ خیز اور زیادہ قابلِ تعریف پائیں گے جو اُن کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی سرشت اور خصلت کا وہ ایک سچا فوٹو ہے۔ جہاں اُس نے اپنی سرشتِ بد کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے زیادہ دنیا میں کوئی موذی نہیں اور جہاں اُس نے اپنی سرشتِ نیک کا مذکور کیا ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے بڑھ کر کوئی نیکوکار نہیں۔

اس سے راقم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں ہر انسان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مذکورۂ بالا سوانح عمری میں خود صاحبِ سوانح ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ اُس کا یہ کامل عقیدہ ہے کہ ہر انسان نہ بالکل شیطان ہوتا ہے اور نہ کامل فرشتہ بلکہ کچھ فرشتہ کچھ شیطان۔ اور کبھی بہت کچھ فرشتہ اور کچھ شیطان۔ اور کبھی بہت کچھ شیطان اور کچھ فرشتہ ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونے است　　از ملائک سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں شود کم ازیں　　ور رود سوئے آں شود بہ ازاں

انسانوں کی اِس قسم میں سے پیغمبروں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ قوائے فطری بالاستثنائے احدے کُل انسانوں میں یک ساں ہیں۔ مگر افراط و تفریط اور اعتدالِ قُویٰ کی رُو سے لوگوں کے مدارج متفاوت ہیں مثلاً مبداءِ فیاض نے سب آدمیوں کے دماغوں میں حافظے کی ایک قوّت رکھی ہے۔ لیکن کسی میں وہ قوت ضعیف ہے کسی میں قوی اور کسی میں معتدل۔ اسی پر دوسرے قُویٰ کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔

کسی نے پیغمبروں کے بارے میں کیا اچھی چھچی تُلی مثال بیان کی ہے کہ ایک ثمردار درخت میں ایک ہی قسم کے سیکڑوں پھل لگتے ہیں۔ اُن میں معدودے چند ہر طرح سب پر فوقیت رکھتے ہیں کہ کوئی پھل اُن کی خاص قسم کی لذّت کو نہیں پاتا۔ یہی حال پیغمبروں کا ہے کہ اُن میں بشری خواص تو سب موجود ہوتے ہیں مگر درجۂ اعتدال میں۔ اُن کے قُویٰ میں افراط ہوتی ہے نہ تفریط۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُہَا کی رُو سے وہ انسانِ مکمل ہوتے ہیں اور اسی اعتدالِ قُویٰ کی وجہ سے خدا اُن کو خدمتِ رسالت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔

بہرحال استثنائے بالا کے سوا عام انسانی سرشت جیسی کچھ بھی واقع ہوئی ہے وہ سب جانتے ہیں تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو صاحبِ سوانح اکثر اتنے قصوروار نہیں ہوتے جتنے سوانح نگار ہوتے ہیں۔ سوانح نگاروں میں اکثر یہ عیب بہت دیکھا جاتا ہے کہ وہ نئے نئے قسم کے من گھڑت اوصاف تصنیف کر کے سوانح عمریوں میں لکھتے ہیں۔ بعض مورخین کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ اپنی قوم کے کسی نامور شخص کی سوانح عمری لکھنے بیٹھیں گے تو اُس کے عیبوں کو پسِ پشت ڈال دیں گے اور اگر کہیں صاحبِ سوانح کی بدقسمتی سے اُس کے عیب طشت از بام ہو چکے ہیں تو اُن کو مارے تاویلوں کے اس طرح چھپائیں گے جیسے بلی اپنے غلیظ کو چھپاتی ہے۔ اس قسم کے عیوب بیدردی سے نہیں ہو سکتے

میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں کے مورخین کے قلم میں بھی یہ مرض آ لپٹا ہی۔ وہاں اگر اس کو ہیرو ورشپ[1] سے تعبیر کرتے ہیں تو یہاں اسلاف پرستی سے ؎

اے ہنرہا نہادہ برکفِ دست   عیب ہارا نہفتہ زیرِ بغل

تا چہ خواہی خریدن اے مغرور   روزِ درماندگی بہ سیم و دغل

انھیں حالات کی بنا پر غالباً ہندوستان کا ایک علامہ اور مشہور مورخ مآثرِ رحیمی پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ "اس کتاب (مآثرِ رحیمی) میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہی کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں۔ حالاں کہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہی۔ لیکن اس طریقے کو ہم آج کل کے پُرفریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعوے کرکے سوانح عمری کی بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہی اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کرکے لکھا جاتا ہی تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے۔ یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہی تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہی اس طریقے کی عمدہ مثال ہی۔"

سوانح نگاروں کے متعلق ہماری مذکورۂ بالا رائے دیکھ کر بعض لوگ ہمارا مونہ نوچ لیں گے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اُن کی زبان اور اُن کے قلم کو کس نے پکڑا ہی۔ کیوں کہ ہماری رائے نے ایک طرف سے کل سوانح عمریوں پر پانی پھیر دیا ہی۔ مگر اُسی کے ساتھ ہم کو امید قوی ہی کہ جب اُن کے غصّے کا اُبال بیٹھ جائے گا اور ٹھنڈے دل سے اُس پر غور و خوض فرمائیں گے تو ایک دن خود اُن کی بھی یہی رائے ہو جائے گی۔

بہ خشم ناسزا می گوید از لطفِ گفتارش   گماں دارم کہ حرفِ دل نشینی بعد ازیں گوید

بہر حال اگر مورخین کی راست بیانی کا یہی حال رہا تو واقعاتِ نفس الامری رفتہ رفتہ جھوٹ میں جذب ہو جائیں گے اور پھر کسی کیمیاوی تحلیل سے بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ پھر کوئی کسوٹی ایسی مل سکتی ہی کہ کھرے کو کھوٹے سے الگ کر سکے آخر اس لغویت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ تمام سوانح عمریاں طوطا کہانی کے زمرے میں شامل ہو جائیں گی اور اس صنفِ مفید کا جو مقصود ہی وہ مفقود ہو جائے گا۔

راقم کی اس رائے کو جب اُس کے ایک مخلص دوست مولوی سید مظہر الحسن[2] نے دیکھا تو جواب میں لکھا کہ "درحقیقت مجھے اس خیال سے کامل اتفاق ہی۔ یورپ کے سوانح نگاروں کے متعلق تو ہیرو پرستی کا اعتراف خود آپ نے کیا ہی۔ اور ایشیا کے موجودہ مورخوں کی نسبت میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ اسی رنگ میں اُن کی تصانیف رنگی ہوئی ہیں۔ ہاں اس میں مجھے اس قدر استثنا ضرور کرنا پڑتا ہی کہ اس سے کچھ پہلے مسلمان مورخین نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں اُن میں روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی ہی۔ بہر حال بصورتِ موجودہ آپ کے خیال سے کامل اتفاق ہی۔" عبارتِ مذکورہ کو ختم کرکے ہمارے دوست

[1] نامور پرستی ۱۲ [2] یہ صاحب ریونیو کورٹ ریاست بھوپال میں ملازم ہیں۔ جوان صالح اگر کسی نے نہ دیکھا ہو تو ان کو آکر دیکھ لے ۱۲

نے خط کے ایک گوشے میں عنوانِ مکرر کے تحت میں راقم کو چھیڑنے کے لیئے ایک فقرہ یہ بھی لکھ دیا کہ "آپ کی صداقتِ رائے کے لیئے دُور کیوں جائیں آپ کی حیاۃ النذیر خود موجود ہی"

بہر کیف اس چھیڑ چھاڑ کا جواب تو بعد کو دیا جائے گا لیکن راقم کو اس امر سے بہت مسرت ہوئی کہ اُس کے ایک کنسرویٹیو (جدّۃ ناپسند) دوست نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم اگر راقم کی یہ رائے صحیح ہی تو اس حساب سے کسی کی سوانح عمری بھی قابلِ اعتبار نہیں ٹھیرتی۔ تو کیا فی الواقع دنیا میں جتنی بھی سوانح عمریاں تالیف ہوئی ہیں وہ سب یک قلم غلط ہیں؟ کیا اُن میں صداقت کی بُو بالکل نہیں؟ کیا اُن میں ساقط الاعتبار واقعات درج ہیں؟ اگر ایسا ہی تو دنیائے سوانح عمری میں ضرور کایا پلٹ ہونی چاہیئے اور اس سمندر میں اتنا بڑا طوفان اُٹھنا چاہیئے کہ تمام جہان کی سوانح عمریوں کو دریا بُرد کر دے۔ اور صفحۂ ہستی سے اس بے کار بلکہ مُضر صنف کو مٹا دے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہی اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بالکل صحیح ہی۔ لیکن اگر بے اعتباری کے توہّمات اسی طرح ترقی کرتے رہے تو نہ صرف اقلیمِ سوانح نگاری میں بلکہ دنیا کے کل کاروبار میں ایک آفت برپا ہو جائے گی اور سارا کارخانۂ عالم درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ غرض ہمارے نزدیک اگر مندرجۂ ذیل اصولوں پر وقائع نگار کار بند ہو کر سوانح عمریاں لکھا کریں تو ایک نکتہ چین کو تمام واہموں اور وسوسوں سے نجات مل سکتی ہی۔

(۱) صاحبِ سوانح کے اقوال و اعمال کی تنقید کی جائے۔ یعنی جس واقعے کی اُس سے نسبت دی جائے اُس کے متعلق محققانہ طور پر یہ بات دریافت کرنا کہ اُس نے ایسا کہا اور کیا بھی ہی یا نہیں۔ اگر معتبر ذرائع سے واقعات کی شہادتیں بہم پہنچ جائیں تو اُن پر بلا وسواس اعتبار کر لینا چاہیئے ورنہ نہیں۔

(۲) صاحبِ سوانح کے اقوال و اعمال کو اُس کے دل کا ترجمان معتبر سمجھنا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ وہی کرتا ہو جو کہتا ہو اور جو کرتا ہو وہی کہتا ہو یہ نہ ہو کہ کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ دل اور زبان کا تطابق افعال سے بخوبی ہو سکتا ہی۔

اگر اس طرح کوئی اپنے اقوال و اعمال کی کسوٹی پر اُتر جائے تو پھر اُس کے دلی عقائد کی ٹٹول سے کچھ فائدہ نہیں۔ مثلاً ایک شخص مسلمانوں کی سی وضع رکھتا ہو۔ مسلمانوں کے ساتھ کھان پان ہو۔ مسلمانوں کے سے عقائد رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ شرعِ اسلام جو ظاہر پر حکم کرتی ہی اُس کی رُو سے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ اُس کو غیر مسلم یا کافر ٹھہرائے۔ ایسا شخص ضرور مسلمان سمجھا جائے گا اور وہ ضرور مسلمان ہی **قطعہ**

هر کرا جامه پارسا بینی　　پارسا دان و نیک مرد انگار
ورنه دانی که در نهانش چیست　　محتسب را درونِ خانه چه کار

اِن دونوں اصولوں کے ساتھ ساتھ اگر سوانح نگار خوش قسمتی سے صاحبِ سوانح کی زندگی میں اُس کے حالات قلم بند کر لے تو اُس کو اتنی دقتیں پیش نہیں آ سکتیں جتنی کہ صاحبِ سوانح کے انتقال کے بعد۔ خود صاحبِ سوانح زندہ ہو۔ اُس کے دیکھنے اور برتنے والے زندہ ہوں۔ اُس کے اعمال و اقوال کا سلسلہ جاری ہو تو صحیح صحیح واقعات

کے جمع کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو سکتی ہی۔ کنبے برادری اور محلے ٹولے اور شہر والوں سے آپ کی عادات وخصائل کا ٹھیک ٹھیک پتا چل سکتا ہی۔ راویوں کی دیانت و امانت کا اندازہ کر کے کھوٹے کھرے واقعات الگ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انھیں اصولوں کو مدِنظر رکھ کر فاضل اجل جناب شمس العلما ر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل کی سوانح عمری حیاۃ النذیر تالیف کی ہی۔

راقم الحروف کو اپنے مہربان دوست کی ایک بات کا جواب اور دینا ہی اور وہ یہ ہی کہ اُس نے حیاۃ النذیر میں یورپین مورخین کی طرح صاحبِ سوانح کے عیبوں میں کہیں رنگ آمیزیاں کر کے مینا کاری تو نہیں کی ہی یا اپنی طرف سے فرضی اوصاف گھڑ گھڑ کے تو سوانح عمری میں نہیں ٹھونسے ہیں۔ اس کا جواب راقم کے پاس اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہی کہ حیاۃ النذیر کی تالیف میں نہ کوئی پُر فریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ نہ کسی طمع یا لالچ کی وجہ سے اُس کی تالیف ہوئی ہی نہ حبك الشیٔ یعمی ویصم میں مبتلا ہو کر اُس پر قلم اُٹھایا گیا ہی۔ بلکہ جس چیز نے راقم کو اُبھارا یا اُکسایا ہی وہ یہ ہی کہ صاحبِ سوانح کی کل تصانیف اور مخصوص مذہبی تصانیف نے وہ کام دیا ہی جو ایک پیاسے کو آبِ کوثر کام دے سکتا ہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان میں اور اور لوگوں نے بھی اِس قسم کی اسلامی خدمتیں کی ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی تصانیف تو سا کنانِ ملاءِ اعلیٰ کے سوا اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا بعض کی تصانیف رہ بری کی جگہ رہ زنی کرتی ہیں۔ بعض کی تصانیف سے تسکین کی جگہ اور اضطراب پیدا ہوتا ہی گر بعض تصانیف اِن میں الا ماشاء اللہ بھی ہیں۔ البتہ مولانا کی تصانیف میں یہ ایک خاص صفت ہی کہ وہ قلبِ مشکوک کو قلبِ مطمئن بنا دیتی ہیں۔ اِس کے سوا مولانا کی اور غیر معمولی صفات ایسی ہیں جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں ہی بلکہ سمندر پار بھی اُن کے علم و فضل کا ڈنکا بج رہا ہی۔ غرض صاحبِ سوانح کے اِن احسانات کا معاوضہ اگر کچھ ہو سکتا تھا تو وہ اُسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ راست بیانی کے ساتھ حیاۃ النذیر پبلک میں پیش کر دی جائے۔ خدا کا شکر ہی کہ ایسا ہی ہوا ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

مولانا نذیر احمد فی الواقع اُن بزرگانِ دین میں سے ہیں جو خطابی شمس العلما ر اور رائل ایل ڈی اور ڈی او ایل کے سوا امام الاسلام اور حکیم امتہ ہونے کا فخر رکھتے ہیں۔ اِن کی فضیلت نے نہ صرف ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو روشن کیا ہی۔ بلکہ ہندوستان سے باہر یوروپین ممالک میں بھی اُن کی علمی و عملی شعاعیں دماغوں کو منور کر رہی ہیں۔ اُن کی اسلامی تہذیب اور تمدنی شان و شوکت اور پولٹیکل عظمت اور لٹریری ادب کے درخشاں سیارے ہمیشہ رہ نمائی کا کام دیں گے۔ وہ علوم مشرقیہ کے مہر نیم روز اور علوم مغربیہ کے ماہ نیم ماہ ہیں۔ وہ سلف اسٹڈی[۵] ۔ سلف ہلپ اور سلف میڈ کی زندہ مثال ہیں۔ اُن کی اسلامی حمیت۔ عملی ہم دردی۔ گورنمنٹ کی سچی وفاداری۔ مستقل مزاجی۔ دور بینی۔ ثباتِ عقل ملک اور قوم کو مفید نتائج پر پہنچاتی ہی۔

[۵] سلف اسٹڈی سلف ہلپ اور سلف میڈ کا اردو ترجمہ خود ساختہ و پرداختہ ہو سکتا ہی ۱۲

وہ کبھی اُمورِ خانہ داری میں مراۃ العروس ہیں اور کبھی جنس لطیف کے لئے دلچسپ معلومات بہم پہونچانے میں بنات النعش۔ کبھی خداپرستی اور اصلاحِ خاندان میں توبۃ النصوح۔ کبھی اُلجھی ہوئی باتوں کو سُلجھانے میں مبادی الحکمۃ۔ کبھی علمِ ہیئت میں سمٰوات۔ کبھی صرفِ عربی میں صرفِ صغیر۔ کبھی احکامِ شرعی کے خلاف کثرتِ ازدواج کے نتائج میں محصنات کبھی اظہارِ قبائح وضعِ انگریزی میں مصنفِ ابن الوقت۔ کبھی تطبیقِ فطرۃ واسلام میں رویائے صادقہ۔ کبھی قواعدِ املا میں رسم الخط۔ کبھی بیان بشیر کی تعلیم و تربیت میں موعظۂ حسنہ۔ کبھی مرثیۂ قوم میں اتمامِ حجت۔ کبھی شریعتِ اسلامی اور فرائض انسانی اور دستور العمل زندگی میں الحقوق والفرائض۔ کبھی مقدس اسلام کے معتقدات اور اصولِ اعمال کی دلائلِ عقلیہ وشواہدِ مسلمہ میں اجتہاد۔ کبھی ازالۂ اعتراض تعددِ ازواج آں حضرت میں مصنفِ امہات الامہ۔ کبھی ترغیب وتشویق وتحریصِ قرآن خوانی میں ترجمۃ القرآن۔ کبھی تفسیر وتوضیحِ فرقانِ مجید میں مطالب القرآن۔ کبھی طلاقتِ لسانی اور فصاحت وبلاغتِ اُردو لٹریچر میں مجموعہ لکچر۔ کبھی سحر البیانی میں مجموعۂ نظم بے نظیر۔ کبھی ہمدردی منسر لبینی میں خیر خواہِ بنی انسان۔ کبھی متعصب مولویوں کے کفر کے فتووں سے نہ ڈر کر تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں سرسید کے دست وبازو کبھی انگریزی تعلیم و ترغیب میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز لکچرار۔ کبھی مواعظ و پند دینی میں انجمن حمایت الاسلام کے مقدس واعظ۔ کبھی اجرائے طبِ یونانی کے لئے مدرسۂ طبیہ میں حاذق الملک۔ کبھی سرسید کے خطاب کو صحیح ثابت کرنے میں زندہ دلانِ پنجاب کے سرتاج۔ کبھی لطیفہ سنجی میں ایک زندہ دل۔ کبھی استعمالِ اشیاء اور طرزِ معاشرت میں سودیشی۔ کبھی دولت کے مصرفِ صحیح میں کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ کبھی امدادِ مدرسۃ العلوم میں اسٹریچی ہال اور بورڈنگ کے کتبے۔ کبھی ادبِ انگریزی میں بغیر ڈگری حاصل کئے ہوئے گریجوایٹوں سے بالا بیٹھنے والے۔ کبھی نظمِ عربی واُردو میں مجموعۂ نظم[۱] بے نظیر۔ غرض کبھی وہ ان سب کے مجموعے میں

حیاۃ النذیر ۵

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آخر میں راقم الحروف ناظرین کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اُس نے اپنے کانشنس (مافی الضمیر) کے خلاف کوئی واقعہ حیاۃ النذیر میں درج نہیں کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کو کسی واقعے میں غلط فہمی واقع ہوگئی ہو۔ دیدہ ودانستہ کوئی واقعہ بڑھایا گیا ہے نہ گھٹایا گیا ہے۔ نہ کسی واقعے میں جھوٹی جھوٹی تاویلیں کی گئی ہیں اور نہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ اس کے سوائے راقم نے ایک بڑی جرأت اور بھی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ یوں تو معمولی لوگوں پر بھی نکتہ چینی کرنا اگرچہ وہ نیک نیتی ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو ایک ایسا دشوار کام ہے جس کو عام طور سے ہر شخص جانتا ہے مگر مخصوص اُس شخص کی نکتہ چینی کرنا جس نے برملا ایک مقام پر یہ کہہ دیا ہو کہ "یہی (لاہور) وہ جگہ ہے۔ جہاں توحید کے بارے میں ہر سال کچھ نہ کچھ کہہ جاتا ہوں اور یہی وہ مضمون ہے جس کے صلے میں تمہارے اس شہر سے مجھکو نیچری بھانڈ کا خطاب عطا ہوا تھا یاد ہے یا نہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ اسی مضمون کو میں اور شدّ و مدّ کے ساتھ بیان

---

[۱] مجموعۂ نظم بے نظیر مولانا نذیر احمد صاحب کی کل مطبوعہ وغیر مطبوعہ اُردو وعربی نظموں کا مجموعہ ہے ۱۲

کرتا اور پھر تم سے کوئی پھڑکتا ہوا خطاب لیتا اور عدالت میں مقدمہ دائر کرکے اس کی رجسٹری کراتا" یا مثلاً ایک اور مقام پر کہا تھا کہ "وہ اخباروں کی جیسی ردی حالت ہے ظاہر و آشکارا ہے اور میں نے اس کے شواہد بھی جمع کیے تھے۔ مگر ان دنوں میرے پاس فنڈ کی کوتاہی ہے۔ شواہد پیش کروں تو اخبار والے ضرور گالیاں دیں جیسی ان کی عادت ہے اور گالیاں دیں تو میں ضرور انتقام لوں جیسی میری طبیعت ہے" کتنا دشوار کام ہے۔ لیکن مؤلف حیاۃ النذیر کو صاحب سوانح کے فنڈ سے خوف ہے نہ ان کے انتقام سے۔ کیوں کہ اس نے کسی بدنیتی سے کوئی نکتہ چینی نہیں کی ہے نہ تحقیر و تذلیل کے لیے کوئی افترا پردازی کی ہے اور نہ کوئی بہتان باندھا ہے صاحب سوانح انسان ہیں انسان سے خطا کا ہونا حق الیقین ہے۔ مولانا سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں خطائیں ہوئی ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ ؎

جائے کہ برق عصیاں بر آدم صفی زد — ماراچہ گو نہ زیبد دعوی بے گناہی

کہتے ہیں کہ لوگ کسی ادنیٰ آدمی کو بھی اس کے مونہ پر برا نہیں کہتے۔ لیکن پیٹھ پیچھے بادشاہ کو بھی برا کہنے سے نہیں چوکتے۔ مگر راقم نے اس کے خلاف عمل کیا ہے یعنی بادشاہ (صاحب سوانح) کے عیب اگر کچھ ہیں تو اس کے مونہ (جبین حیاۃ) پر رکھ دیے ہیں۔ بہرحال حیاۃ النذیر میں صاحب سوانح کے تاریک و روشن دونوں رخ دکھا دیے گئے ہیں۔ خوبیوں کی جگہ خوبیاں اور کمزوریوں کی جگہ کمزوریاں بیان کی گئی ہیں۔ ہاں بے ادب اور گستاخ بن کر دل آزاری نہیں کی ہے اور نہ نمک مرچ لگا کر بہ نظر تحقیر بات کا بتنگڑ بنایا ہے ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد — عیب نماید ہنرش در نظر

اور نہ خوبیوں میں اپنے حسن اعتقاد کو سمو کر پیراں نمی پرند مریداں می پرانند پر عمل کرکے مناقب کی کتاب تیار کی ہے۔ ؎

در ہنرے داری و ہفتاد عیب — دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر

بہرحال اس کو تمہید کہیے یا تقریب۔ دیباچہ کہیے یا مقدمہ یا چھوٹا مونہ اور بڑی بات غرض جو کچھ کہیے وہ چند سطریں ہیں جو راقم کے قلم سے ٹپک پڑی ہیں۔

اقرار قصور ایک ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر انسان اس پر کاربند ہو تو اس کو بہت کم خفیف ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا راقم الحروف کو علی رؤس الاشہاد اس امر کے اقرار کرنے میں کچھ حجاب نہیں کرنا چاہیے کہ مولانا نذیر احمد کی لائف لکھنا اس کا کام نہ تھا یہ کام تھا ان بزرگوں کا جو مولانا کے علم و فضل کے ہم مرتبہ ہوں اور ان کو لائف لکھنے کا سلیقہ بھی ہو۔ راقم نے کچھ الٹے سیدھے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان واقعات سے ناظرین کو کچھ فائدہ پہنچے یا صاحب سوانح کی لائف پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ بے شک ابھی صدہا واقعات ایسے ہوں گے جو حیاۃ النذیر میں درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ ترتیب مضامین میں بھی کچھ نہ کچھ بے ربطی ہو گئی ہوگی اور اگرچہ کتاب پر نظر ثانی کی گئی ہے مگر ایک غلط انداز نظر سے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر واقعات کی

بخوبی توضیح نہیں ہو سکی۔ بعض ناظرین کے ذہن میں ایک اعتراض یہ بھی آئے گا کہ مولانا کی تصانیف کے نمونے دے کر کتاب کے حجم کو ناحق بڑھایا ہے بے شک یہ سچ ہے۔لیکن یہ کوئی اعتراض میں اعتراض نہیں ہے کسی کتاب پہ ریویو کیا جائے اور اس کا نمونہ نہ دکھایا جائے تو اس کو ریویو نہیں کہہ سکتے۔ اس کے سوا ممکن ہے کہ اسلوب بیان میں بھی کچھ نقص رہ گیا ہو۔ یا اسی قسم کے کچھ نقص اور بھی ہوں۔ ممکن تھا کہ ان نقائص کو دور کرنے کے لیئے حیاۃ النذیر قبل طبع کسی مشہور مورخ اور انشا پرداز کو بنظر اصلاح دکھا دی جاتی جیسا کہ اکثر لوگ کیا کرتے ہیں۔مگر مؤلف کو اس کا بھی موقع نہیں ملا۔ پس ایسی حالت میں مؤلف داد و تحسین اور صلہ و انعام کی توقع کس مونہ سے کر سکتا ہے۔

راقم اب ان چند سطروں کو دو شکریوں اور ایک شکایت پر ختم کر کے تخفیفِ تصدیع کرتا ہے

اول شکر ہے صاحبِ سوانح کی تصانیف کا جنھوں نے مؤلف کو اتنی گراں بہا امداد دی ہے کہ اگر اُن کا وجود نہ ہوتا تو حیاۃ النذیر کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔

دوسرا شکر ہے اپنے دوست مولوی بشیر الدین احمد کا جنھوں نے حیاۃ النذیر کے مضامین کے متعلق راقم کی اس قدر معاونت کی ہے جتنی کہ جنابِ ممدوح صاحبِ سوانح کے خلف الرشید ہونے کی وجہ سے کر سکتے تھے۔ اگر وہ اس قسم کی امداد نہ کرتے تو کتاب تشنہ رہ جاتی۔

شکوہ ہے خود صاحبِ سوانح کا جنھوں نے باوجود ایک طول طویل مراسلت اور بارہا حاضر باشی اور جائز خوشامد کے راقم کو کچھ مدد نہیں دی۔ جس کا تحریری ثبوت ناظرین کو جناب ممدوح کے اُس خط سے ملے گا جو فوٹو کی صورت میں اُسی جگہ چھپا ہے۔ صاحبِ سوانح اگر راقم کی امداد کرتے تو حیاۃ النذیر سونے میں سہاگہ ہو کر ایک بے نظیر لائف ہوتی۔ غالباً جناب ممدوح نے راقم کو اس قابل ہی نہیں سمجھا ورنہ ؎

عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدؔ سب پر ۔۔۔ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خاکسار سید افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی

ملازم دربار بھوپال

یکم جنوری ۱۹۱۲ء عیسوی

۵۷ عکسی چہرہ ۱۲!

حیاۃ النذیر

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

کوئی اُمت ایسی نہیں (ہوئی) کہ اُس میں (عذابِ خدا سے) کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنہ ۱۸۳۶ء لغایت سنہ ۱۸۵۴ء

ولادت ہندوستان میں بڑی پرانی رسم ہے کہ جب مولود سال کے بارہ ۱۲ مہینے خیر و عافیت سے طے کر لیتا ہے تو اس کے والدین اِس خوشی میں شادیاں رچاتے اور رَت جگے کرتے ہیں۔ سال گرہ کی تقریب کی دعوت دی جاتی ہے۔ مہمان جمع ہوتے ہیں۔ ڈومنیاں دائرے پر مبارک باد کے گیت گاتی ہیں۔ دھوم دھام کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ رنگین کلاوے میں پہلے برس کی گرہ لگائی جاتی ہے۔ بعض جگہ گلے میں ہنسلی پہنا کر اس میں ہر سال چاندی کا گھڑا ہوا ایک چھوٹا سا چاند ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح بعض اللہ آمین اور ارمان چوچلوں کے بچوں کی رسم سال گرہ عنفوانِ شباب تک اور بعض کی بڑھاپے تک جاری رہتی ہے مگر اس ترقی میں ایک تنزل بھی ہے۔ یعنی

غافل تجھے گھڑیال یہ کرتا ہے منادی ۔۔۔ خالق نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

ناظرین میں سے اکثر کو معلوم ہے اور جن کو معلوم نہیں وہ معلوم کر لیں کہ صاحبِ سوانح عمری کا خاندان۔ مولویوں مفتیوں اور مشائخ کا خاندان تھا۔ وہاں اِن مراسم کا کیا ذکر یہ باتیں تو وہاں بدعت میں شامل ہوں گی۔ اگر یہ رسمیں مولانا کے خاندان میں جاری ہوتیں تو کلاوہ کھول کر گرہ شماری یا ہنسلی اُتار کر چھوٹے چھوٹے چاند گن لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر جہاں کلاوے اور

ہنسلی اور چاند کا وجود ہی نہ ہو وہاں کوئی کہا کرے ⁂

ہاں ہندوستان کے بعض خاندانوں میں یہ رواج بھی ہے کہ مولود کا نام تاریخی رکھتے ہیں۔ یا نظم و نثر کے کسی فقرے میں سے تاریخ نکالتے ہیں۔ مگر محمد نذیر احمد یا صرف نذیر احمد کے اعداد بھی حسابی قاعدے کی رو سے اِس رواج کا مولٰنا کے خاندان میں پتہ نہیں دے سکے۔ نام کے سوا کسی مادۂ تاریخ کا بھی باوجود تحقیقات کے پتہ نہیں چلتا ⁂

خاندانی بزرگوں میں کوئی واقفِ کار اس وقت ایسا نہیں جس سے کوئی جا کر پوچھے۔ خدا ہمارے مولانا کی والدہ ماجدہ کو حیّ و قائم رکھے۔ اِن سے کئی مرتبہ کان کے پاس مونھ لے جا کر اور ذرا بلند آواز سے پوچھا گیا کہ مولٰنا کا سالِ ولادت بتائیے۔ جواب میں کچھ اٹکے سے تو دیئے مگر کبر سنی کی وجہ سے وہ اس قدر نا مفہوم ہوتے تھے کہ سالِ ولادت کا ٹھیک پتہ نہ چل سکا۔ اور حساب گڑبڑ ہو کر رہ گیا ⁂

یہاں سے بھی جب تشفی نہ ہوئی تو مولٰنا کے ہم سنوں۔ ہم مکتبوں۔ اور دوستوں کی طرف لوگوں کے دل کی تسکین کے لیئے رجوع کی۔ وہاں ایک بڑے مشہور شخص کا پتہ چلا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب ایک بزرگ مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول مرحوم دہلی کالج کے صاحب زادے تھے۔ ہمارے فاضل مولٰنا اور یہ صاحب ایک زمانے میں ہم مکتب اور ہم سبق تھے۔ انھوں نے مدرسہ دیوبند میں بڑا نام پایا ہے۔ اِن کا تاریخی نام تھا **منظور احمد** بحساب جمل اس نام کے اعداد ۱۲۴۹ھ کے برابر ہیں۔ متعلمی کے زمانے میں جیسا کہ دستور ہے لڑکے آپس میں ایک دوسرے کی عمریں پوچھا ہی کرتے ہیں۔ مولٰنا نے بھی ایک روز مولوی محمد یعقوب صاحب سے پوچھا انھوں نے سالِ ولادت کی جگہ **منظور احمد** بتایا۔ مولٰنا نے حساب لگایا تو خود کو مولوی محمد یعقوب صاحب سے دو برس چھوٹا پایا۔ لڑکپن کی باتیں بھی کیا ہی بھولی بھالی ہوتی ہیں۔ مولٰنا فرمانے لگے "یار کوئی دو برس ہم تم سے چھوٹے ہیں"

اگرچہ مسلمانوں میں جنم پترے کا رواج نہیں لیکن حسنِ اتفاق دیکھیئے کہ جن دنوں ہمارے مولٰنا کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے تو مولانا کے ماتحت "کنجن" نام ایک پنڈت جی تھے۔ وہ جوتش کے بڑے عالم تھے اور اُن سے بڑے بڑے راجہ جنم پتروں کی فرمایش کیا کرتے تھے۔ چوں کہ آدمی تھے صوفی مزاج اس لیئے اُن کے ساتھ مولٰنا کو بھی اُنس ہو گیا۔ غرض پنڈت جی نے ایک روز از خود مولٰنا سے کہا کہ کہیئے تو آپ کا نشٹ[1] جنم پتر بنا دوں۔ مولٰنا ہنس کر چپ ہو گئے۔ پنڈت جی الخاموشی نیم رضا سمجھے۔ پنڈت جی نے کئی مہینے کی محنت سے وہ جنم پترہ بنا کر مولٰنا کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اُس کو اُٹھا کر اپنے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب کے پاس تصدیق کے لیئے بھیجا تو ٹھیک اُترا یعنی ۲۳ رجادی الاولیٰ سنہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۶ دسمبر سنہ ۱۸۳۶ء روز سہ شنبہ۔ پنڈت جی نے مولٰنا صاحب کو پڑھایا[2] بھی تھا ⁂

اب ہم خود مولٰنا کے ارشادات سے آپ کے سنہ ولادت کا پتہ لگاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس طرح یہ مرحلہ بآسانی

---

[1] غالباً گم شدہ جنم پتر کو کہتے ہیں ۱۲

[2] سارسنت چندرکا اور ہتوپدیش۔ یہ دونوں کتابیں جو زبانِ سنسکرت میں ہیں مولٰنا پنڈت جی سے پڑھا کرتے تھے۔ انھیں پنڈت جی مہاراج نے ایک وحشت ناک پیشین گوئی بھی کی تھی جس کا ذکر آگے چل کر ہوگا ۱۲

طے ہو جائے گا۔ مولٰنا اپنی عمر کی نسبت ۱۸۸۱ء میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "میں زمانے کے حال پر نظر کرتا ہوں پھر اپنی طرف دیکھتا ہوں کہ اربعین سے متجاوز ہوا۔ ضعفِ قوی مجکو محسوس ہونے لگا" اور اسی طرح ۱۸۹۵ء میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ ساٹھ برس کی عمر تو میری ہونے آئی۔ ہم نے تو انفلوئنزا کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ اَب یہ حال ہے کہ تمام روے زمین پر انفلوئنزا کا تہلکہ مچا ہوا ہے۔"

اگرچہ یہ شہادتیں ثبوت مدعا کے لیئے کافی ہیں اور ان پر جرح و قدح کرنی بے سود ہے۔ لیکن لوگوں کی بدگمانی کا کیا علاج۔ وہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے قواعد و قوانین میں پنشن کے لیئے عمر کی قید ہے۔ اِس لیئے اکثر عہدہ[1] داروں کو حضرت سعدی کے اِس مشہور چٹکلے "دروغ مصلحۃ آمیز بہ" سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ملازمت کے وقت اپنی عمریں چھپانی پڑتی ہیں بڑے بڑے متدیّن عہدہ داروں کو ایسا کرتے دیکھا ہے کہ پوری تنخواہ میں پنشن کا گھُن جلد نہ لگ جائے۔ اِس رسم کا رواج آج کل انگریزی خوان تعلیم یافتوں میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ اسکول میں نام درج کرائیں گے تو عمر گھٹا کر۔ وہاں دیر میں پنشن لینے کے لیئے۔ اور یہاں دیر تک نوکری کے مستحق رہنے کے لیئے۔ اِسی بنیاد پر لوگ کہتے ہیں کہ مولٰنا نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ یعنی جب ترجمۂ تعزیراتِ ہند کے صلے میں ڈپٹی کلکٹری کے لیئے سرکار میں نقشہ بھیجا گیا تو اُس میں ولادت ۱۲ ستمبر ۱۸۳۳ء درج کرائی۔

اِس میں شک نہیں کہ سرکار میں مولٰنا کی عمر غلط ظاہر ہوئی ہے۔ مگر جس غرض سے لوگ اپنی عمریں گھٹا کر لکھا یا کرتے ہیں یہاں اُس کے برعکس تھا جس وقت ڈپٹی کلکٹری کا نقشہ جانے لگا تو ہمارے مولٰنا لڑکے تھے بے ریش و بروت۔ چنانچہ مسٹر لو سکرٹری بورڈ آف ریونیو نے رول دیکھ کر میر ناصر علی خاں ذوالقدر[2] مرحوم سے جن کی معرفت وہ رول پیش کیا گیا تھا فرمایا کہ "یہ نوعمری یہ لڑکا ڈپٹی کلکٹری کا اہل نہیں"۔ لیکن بعد کو میر ناصر علی خاں صاحب نے رول کی اصلاح کر دی ہوگی یا خود مسٹر لو نے رعایت کی ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ مولٰنا کا منظور احمد صاحب سے یہ فرمانا صحیح تھا کہ "یار کوئی دو برس ہم تم سے چھوٹے ہیں" اور اس سے زیادہ قابلِ وثوق پنڈت جی کا بنایا ہوا جنم پترہ تھا۔ کیونکہ اُس پر ہمارے مولٰنا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب صاد کر چکے تھے۔ بہرکیف اِس وقت ماشاء اللہ چشمِ بد دُور ہمارے شمس العلماء۔ ڈاکٹر۔ مولٰنا مولوی۔ حافظ نذیر احمد صاحب۔ ایل ایل۔ ڈی۔ کی عمر ۶۷ برس کی ہے مصرع صدوسی سال اس کو اُور رکھیو الٰہی خدایا باقی

مولد۔ وطن۔ مسکن

مولٰنا کا مولد ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور جیسے غیر معروف قریے میں ہے لیکن وہ یہاں بہت کم رہے۔ کیوں کہ اُن کے والد مولوی سعادت علی صاحب خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بجنور چلے آئے تھے

---

[1] گلستاں کی پوری کتل یہ ہے "دروغ مصلحۃ آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اِس پر معترض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام خاص صورتوں میں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ حالانکہ جھوٹ بولنے کی اجازت مقولۂ سعدی سے ثابت نہیں ہوتی۔ سعدی کا مطلب یہ ہے کہ دروغ مصلحۃ آمیز راستی فتنہ انگیز سے بہتر ہے یعنی ہیں تو دونوں بُرے مگر دروغ مصلحۃ آمیز کی بُرائی بمقابلہ راستی فتنہ انگیز سے کم ہے ۱۲ (از الحقوق والفرائض)

[2] اِن کو گورنمنٹ سے ذوالقدر کا خطاب تھا۔ جو ترجمہ ہے آنریبل کا۔ اور یہ خطاب ان کو غدر کی خیرخواہی کے صلے میں ملا تھا۔ اِن کے متعلق ایک عجیب بات یہ تھی کہ چار بھائی اور چاروں ڈپٹی کلکٹران کے تعلقات ہمارے مولانا سے جو کچھ تھے اُن کا حال آیندہ ملاحظہ کیجیئے گا ۱۲

اور اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ تو بجنور بقول ہمارے مولنا کے ''بجنور میرا مولد نہیں۔ وطن اقامت نہیں۔ بلکہ وطن اصلی ہے''
یا دوسری جگہ اپنے صاحبزادے کو لکھا ہے ''آخر بجنور کا بھی کچھ حق ہے۔ میں وہیں کا کہلاتا ہوں۔ کیوں کر کانوں کو بہرا اور آنکھوں
کو اندھا کر یوں''۔ لیکن آپ چوں کہ عرصۂ دراز سے مولنا دہلی میں تشریف فرما ہیں اس لئے صاف صاف تو نہیں ہاں اشارۃً
کنایۃً بجنور چھوڑ دلّی کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔ اوّل وہ دلّی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''میں جس بات کو دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ دلّی کو دوسرے بلادِ ہند پر ایک دینی فضیلت ہے۔ یہ امام ہے اور دوسرے
شہر مقتدی۔ یہ مجتہد ہے اور دوسرے شہر مقلد۔ یہ اصل ہے اور دوسرے شہر نقل۔ یہ اسلام کا تنہ ہے اور
دوسرے شہر فروع۔ میں اس کو ہرگز مبالغہ نہیں سمجھتا۔ کہ اسلام کے اعتبار سے جو نسبت مکّے مدینے کو عرب
سے ہے وہی نسبت دلّی کو ہندوستان سے ہے۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

''میں اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اگرچہ دہلی (ہائے دہلی)
جو سیکڑوں برس تمام ہند کا دار السلطنت۔ خلائق اور حاجاتِ خلائق کا مرجع۔ لیاقت اور کمالات کا مرکز
حکومت اور دولت کا منبع رہی اب مضافاتِ لاہور میں سے ہے۔ مگر دہلی والے تو کیوں اپنے تئیں پنجابی سمجھنے
لگے۔ پنجابی بھی ان کو پنجابی نہیں سمجھتے۔ اور وہ پنجابی ہیں بھی نہیں۔ اور ہو سکتے بھی نہیں۔ جغرافیے کی رُو سے
دہلی اور پنجاب کے مواقع مختلف۔ دونوں کے باشندوں کی زبان مختلف۔ وضع مختلف۔ خیر تو غرض یہ ہے
کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اور اس بات کو میں اس غرض سے ظاہر نہیں کرتا کہ خدانخواستہ میں پنجاب
کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنا وطن عزیز ہے۔ مجکو بھی وطن کے ساتھ اُنس ہے اور ہونا
چاہیئے حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

یا مثلاً ایک مقام پر اَور فرماتے ہیں کہ۔

''اگرچہ میں میرٹھ کے نزدیکان بسیط میں سے ہوں یعنی دلّی رہتا ہوں اور میرٹھ دلّی کا ایک محلّہ ہے'' یا مثلاً ''سنہ ۵۷ء
میں ہندوستانیوں نے ایک مرتبہ نادانی کی اُس کا ایسا خمیازہ بھگتا کہ کوئی ہم دلّی والوں کے دل سے پوچھے''

غرض مولنا ریہڑ میں پیدا ہوئے بجنور کو اپنا وطن بنایا وہاں سے دلّی پہنچے۔ اپنا ایں اگرچہ دلّی سے دل اُچاٹ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ
اُس کا اُنس دل میں بیٹھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہیں رہ پڑے۔ اب جو کچھ کہیئے وہ دلّی ہی ہے۔ مولد وہی۔ مسکن وہی۔ وطن وہی۔
پس مولنا کو بجنوری نہیں بلکہ دہلوی کہنا چاہیئے جیسی نسبت میر صاحب فرما گئے ہیں۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم گاہ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے مار کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

دلّی کو کیوں وطن بنایا؟ مولنا کا عقد چوں کہ دہلی میں ہوا تھا۔ اِس تعلق کے وقت اِس بات کا ضرور خیال کیا

ہوگا کہ وطن کیا چیز ہے؟ اور مستقل سکونت کے لیے آدمی کو کسی خاص جگہ کا پابند ہونا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ اور ہے تو میں کون سی جگہ اختیار کروں؟ آخر کار مولنا نے اِن سوالوں کا یہ فیصلہ کیا کہ تمدّن سے مقصودِ اصلی ہے آسایش۔ اور وہ جیسی شہروں میں میسّر آسکتی ہے دیہات میں ممکن نہیں۔ شہروں میں ہر قسم کا آدمی موجود۔ ہر طرح کی چیز مُہیّا۔ بے شک دیہات میں بھی خاص خاص فائدے ہیں جو شہریوں کو نصیب نہیں۔ جیسے آب و ہوا کی عمدگی۔ دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلّف زندگی۔ اُن کی شرافت یعنی غور سے دیکھا جائے تو انسانی فطرت کا رنگ اہلِ دیہات میں زیادہ جھلکتا ہے بہ نسبت اہلِ شہر کے۔ ہیں تو دیہاتی بھی آدم ہی کی اولاد مگر پھر بھی ان لوگوں میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی شہریوں میں۔ مگر ویسے ہی دیہات میں عقلی ترقی کے سامان نہیں۔ شہریوں کے ناشایستہ حالات ردی خیالات دیکھ کر ہمارے مولنا کا دل دیہات کی طرف جُھکتا تھا۔ مگر طالب علمی کا عشق اُن کے پیچھے ایسا لگ گیا تھا کہ یہ شوق بے شہر کے پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ پس مولنا نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ رہوں گا تو شہر میں اور انھوں نے اِسی وجہ سے اپنی تجویز اور رضامندی سے دہلی میں بیاہ کیا۔ دلّی کو مولنا نے اَور شہروں پر برتری دی۔ کیوں کہ بڑا اور بادشاہی شہر ہے۔ مدّتوں دارالسلطنۃ رہا ہے۔ شاہجہاں نے پہلے اِس کا نقشہ جما لیا اس کے بعد لوگوں کو بسنے کا حکم دیا تو اِس کی آبادی بہت ہی خوش قطع واقع ہوئی ہے۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اور چوک۔ یہ تین چیزیں تو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور یوں شہر سے لے کر قطب صاحب تک چھ سات کوس کے گرد میں ایسی ایسی عمارتوں کے بیشمار کھنڈر پڑے ہیں کہ دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ بڑے بڑے باکمال لوگ اِس سرزمین میں ہو گزرے ہیں۔ اور اگرچہ بہار کا موسم نکل گیا مگر ایسا بھی کیا ہے کہ ہوا میں ذراسی بھی مہک نہ ہو۔ زبان جیسی یہاں کی مستند ہے کہیں کی ہو نہیں سکتی۔ لوگوں کی وضع بھی بھلے مانسوں کی سی ہے۔ مونھ پر مقطع ڈاڑھیاں۔ نیچے نیچے انگرکھے۔ تنگ موری کے پاجامے۔ مگر ٹخنے کُھلے ہوئے۔ مسجدیں بکثرت اور سب آباد۔ دین کے اعتبار سے مولنا نے دلّی کو ہندوستان کا مکّہ مدینہ کہا ہے تو بالکل بجا کہا ہے۔ غرض انھیں خیالات نے مولنا کو دلّی کا گرویدہ بنا دیا۔

خاندان اور خاندانی حسب و نسب

خاندان کے متعلق ہم زیادہ لکھنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آدمی کا سب سے بڑا جوہر یہ ہے کہ وہ کسی خاندانِ عالی کا بانی ہو۔ اور یہ جوہر ہمارے مولنا میں نہایت روشن طور پر موجود ہے۔ مگر انسانی کمزوری کی وجہ سے خود بھی اپنی شرافتِ خاندانی کا شجرہ لے کر چشمک کرنے والے ہم چشموں میں استشہاد کے لیے موجود ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"مجکو اِس بات کا فخر حاصل ہے کہ اباً عن جدٍ موروثی مسلمان ہوں اور اپنے نسب نامے میں انقراضِ سلطنتِ دہلی تک بلافصل مشائخ اور مفتی اور علمار کے نام پاتا ہوں"

مگر ہمارے خیال میں مولنا کو اِس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اُن کے شجرے کی کسی شاخ کو وہ سرسبزی حاصل نہیں جو اُن کے قلم کو حاصل ہے۔ پس مولنا کو اِس بارے میں عرفی و جامی کا ہم زبان ہونا چاہیے۔

المنۃ للّٰہ کہ بنازم بہ نسب نیست ۔۔۔ اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را
بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ۔۔۔ کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ناظرین معلوم کریں گے اور اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ جو شرف و اعزاز ہمارے مولنا کو حاصل ہے وہ آج تک اُن کے خاندان میں

کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ انصاف یہ کہتا ہے کہ مولانا نے اپنی خاندانی گم شدہ اور مُردہ عزت و عظمت کو از سرِ نو زندہ کیا ہے ۔
مولانا کو شاید اپنا شجرۂ نسب پیش کرنے کی ضرورت دہلی میں پیش آئی ہوگی۔ ہندوستان میں کیا تمام ممالکِ اسلام میں شادی بیاہ کے وقت شجرۂ نسب پیش کرنے کی رسم قدیم سے جاری ہے۔ دہلی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں یہاں کا دستور ہے کہ جب شادی بیاہ کا پیام بھیجا جاتا ہے تو اس کے ساتھ رقعہ بھیجا جاتا ہے اور اس میں آباء و اجداد کے اسماء گرامی ایک قدیم شجرہ نما طریقے کے ساتھ لکھ کر بھیجے جاتے ہیں تاکہ شرافت و نجابت کا کافی اندازہ ہو۔ شہروں میں جب ذات برادری کی چنداں پابندی نہیں ہے اور اچھا خاصا ستنیجا ہے تو پھر اس چھان بین کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دلّی والوں کے منھ پر یہ رسم ہمارے خیال میں کچھ بہت زیادہ زیب نہیں دیتی اس لیے کہ وہاں تو بقول شخصے شیخ بھی معجونی ہیں اور سید بھی۔ ایسے معجونی حسب و نسب کے لوگوں میں کسی عزت کے موقع پر ہمارے مولانا کا شجرۂ نسب واقعی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہوگا اور اس کا وہ مستحق بھی تھا۔ دیہات میں بالعموم بڑی بو ئی بہت ٹٹولی جاتی ہے۔ تاہم اگر مولانا کے شجرے کا سرسری ریویو کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ددھیالی سلسلے میں کچھ دنوں سجادہ مشیخت کو رواج رہا، پھر محکمۂ افتاء میں فتووں کو مُہر سے زینت ہوئی ہے۔ اخیر میں علم و فضل کو بھی عامۃً شرف حاصل ہوا ہے ۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا نے جو کچھ برتری حاصل کی ہے وہ ضرور اُن کا کسب ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وضع داری۔ شرافت۔ وقار۔ علمناہت خاندانی صفات ہیں متوارث جو بزرگوں سے اُن کی نسلوں میں منتقل ہوتی چلی آتی ہیں اور اس قاعدے سے ہمارے مولانا نے بھی فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ باپ سے بیٹے دادا سے پوتے یا اپنے سارے خاندان سے ہمارے مولانا اچھے ہوں ۔

ددھیال و ننھیال حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے نامور خلفا میں شاہ عبد الغفور اعظم پوری[1] ایک بزرگ تھے ہمارے مولانا انھیں کے خاندان میں ہیں۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔ مولانا نذیر احمد۔ ابن مولوی سعادت علی۔ ابن پیرجی نجابت علی۔ ابن پیرجی فیض اللہ ابن مفتی نصر اللہ۔ ابن شیخ ابو الفضل ملقب بہ پیر فضل۔ ابن شاہ حاتم۔ ابن شاہ مبارک۔ ابن شاہ ابو اسحٰق۔ ابن شاہ عبد الغفور اعظم پوری۔ ان بزرگ کی نسبت شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں۔

"شاہ عبد الغفور اعظم پوری از خلفائے شاہ عبد القدوس گنگوہی ست صاحب کرامات و مقامات بودہ اند۔ روزے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم را در خواب دیدند و آں جناب ایشاں را درودے تعلیم فرمودہ"

کچھ عجب نہیں کہ ہمارے مولانا کو اس پر بڑا ناز ہوگا کہ اُن کا ددھیالی سلسلہ شاہ عبد الغفور اعظم پوری تک منتہی ہوتا ہے جو شاہ عبد القدوس گنگوہی کے مرید اور مرید بھی صاحبِ کرامات و مقامات تھے۔ مگر ہمارے نزدیک کل کرامات و مقامات سے شاہ عبد الغفور صاحب کو اپنی اس کرامت پر بڑا ناز ہونا چاہیے کہ اُن کی اولاد میں مولانا نذیر احمد سا صاحبِ مقامات پیدا ہوا۔
مولانا کے والد مولوی سعادت علی صاحب فارسی میں بڑے قابل تھے۔ عربی بھی اچھی خاصی تھی جتنی کہ فارسی کو درجۂ اعلیٰ پر پہونچانے کے لیے کافی ہو۔ فارسی کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔ سُنا ہے کہ اُن کی خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی چند کتابیں ابھی تک محفوظ ہیں۔ مولوی صاحب موصوف دین دارانہ مصلّے پر ہمیشہ خدا پرستی کیا کرتے تھے۔ وضع داری میں اگلے زمانے کے بزرگ تھے۔ خاص ضلع

[1] اعظم پور تحصیل چاند پور ضلع بجنور میں ایک قصبہ ہے ۱۲

بجنور میں نقلِ وطن کی وجہ بظاہر اس کے سوا اَور کچھ نہ تھی کہ وہاں کے قاضی عبد الغنی صاحب نے اپنی بیٹی شاہ حاکم سے منسوب کی چوں کہ اُن کے سوا قاضی صاحب کے کوئی اَور اولاد نہ تھی جو کل جائداد کا اُن کے بعد انتظام کرتی اس لیے اُنھوں نے اپنے نواسے شیخ ابو الفضل صاحب کو اپنا جانشین قرار دیا۔ یہ وہی ابو الفضل ہیں جن کی نسبت شہنشاہِ اکبر نے خاص طور سے ایک رقعہ تحریر فرمایا تھا جس میں یہ الفاظ تھے "شیخی شیخ ابو الفضل" یہ رقعہ ہمارے مولانا کے ہاں موجود تھا معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ یہ ابو الفضل مولانا کے ہم اجداد میں شیخ ابو الفضل کے پانچ بیٹے ہوئے۔ مگر خود شیخ صاحب پیری و مُریدی کا سلسلہ جاری رکھنے کے باعث پیر فضل کہلائے۔ اور اُن کی نسل پیرزادے۔ ہمارے مولانا جس محلّے میں رہتے تھے وہ اسی وجہ سے پیرزادوں کا محلہ کہلاتا ہے۔ قاضی غلام علی شاہ مولانا نذیر احمد صاحب کے نانا چوں کہ مرفّہ الحال تھے اس لیے اُنھوں نے مولوی سعادت علی صاحب کو خانہ داماد بنا کر رکھا تھا جب قاضی صاحب نے قضا کی تو جائداد کی نسبت جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا کی والدہ اپنی سُسرال میں بجنور جا کر رہنے لگیں۔ اِس وقت ہمارے مولانا کی عمر تقریباً ۴ سال کی ہو گی۔ غرض مولوی سعادت علی صاحب نے بعارضۂ سل و دق بجنور میں انتقال کیا۔ ✤

ہمارے مولانا کے ننھیالی سلسلے میں بھی مسندِ قضا پر عزتِ شاہی تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ شاہ عبد الغفور صاحب سے اتر کر شاہ مبارک اور شیخ ابو الفضل بھی ہیں۔ مگر شیخ مبارک[1] وہ مبارک نہیں جن سے نا مبارک بیٹے پیدا ہوئے اور نہ ابو الفضل[2] وہ ابو الفضل جو مبارک باپ کا نا مبارک بیٹا کہلایا۔ یہ ابو الفضل وہ ابو الفضل ہیں جن کے پانچ بیٹے اور پانچوں کے پانچوں مفتی اور وہ بھی بادشاہی شیخ وقت تو تھے ہی شاید یہ بھی اُن کی کوئی کرامت ہو۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی ننھیال بھی وہی ہے جہاں اُن کا مولد ہے ✤

مولانا نذیر احمد صاحب سے پہلے اُن کے ایک بھائی مولوی علی احمد صاحب پیدا ہو چکے تھے اور اُن کے بعد بھی ایک اَور بھائی ضمیر احمد صاحب پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ہمارے مولانا خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا میں داخل ہیں۔ مولانا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب بڑے ادیب تھے۔ زبانِ عربی میں پوری دست گاہ تھی۔ مولانا کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی دونوں بھائی سررشتۂ تعلیمات میں پہلے پہل ملازم ہوئے۔ قدرتِ خدا کہ ایک نے معراجِ کمال پر ایسی ترقی کی کہ آج آسمانِ علم و فضل میں آفتاب ہو کر چمک رہے ہیں اور ایک باوجود کہ اپنے چھوٹے بھائی سے کسی طرح لیاقت میں کم نہ تھے بلکہ مذہبی پابندی اور تقوے میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے عالمِ گمنامی میں رہے ستائیس برس سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ ایک عرصے تک بریلی کالج میں عربی کے پروفیسر رہے تھے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقۂ بجنور ہو گئے۔ اور آخر کار پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ اور ۱۷ دسمبر ۱۸۹۱ء کو بمقام بجنور انتقال کیا۔ اِن کے تقدّس کی ایک مثال یہ مشہور ہے کہ مرض الموت میں ہمارے مولانا اِن کے پاس بجنور پہنچ گئے تھے۔ مولوی صاحب کی حالت ردی تھی۔ یونانی علاج نے فاقوں کے مارے سارا جسم گھلا ڈالا تھا۔ طاقت بالکل سلب ہو گئی تھی۔ مولانا نے انگریزی علاج شروع کرانا چاہا۔ مگر مولوی علی احمد صاحب نے سخت تنفّر ظاہر کیا کہ انگریزی دواؤں میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے مجھے مرنا منظور مگر انگریزی دوا کھانا منظور نہیں چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ وہ مرتے مر گئے مگر انگریزی دوا نہ پی۔ مولوی صاحب مرحوم ایک جنتی آدمی تھے نہایت نیک نفس اور منکسر المزاج۔ اپنی طرح ساری دنیا کو ایمان دار جانتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ہمیشہ لوگ اُن کو مالی نقصان

---

[1] دربارِ اکبری کا شیخ مبارک جو فیضی اور ابو الفضل کا باپ تھا ۱۲ [2] ابو الفضل شیخ مبارک کا بیٹا کہ دونوں دربارِ اکبری میں بہت بدنام ہیں ۱۲

پونہچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو قرضِ حسن دینے کے خوگر تھے لیکن معلوم ہوا ہے کہ مرتے دم تک ایک حبہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ ہمارے مولنا کو مولوی علی احمد صاحب کی یہ حالت بخوبی معلوم تھی۔ اسی وجہ سے آپ اُن کو ایک معتد بہ رقم ماہوار دیا کرتے تھے۔

مولنا کے ایک چھوٹے بھائی ضمیر احمد صاحب بھی تھے۔ ان کی تعلیم واجبی ہی واجبی تھی۔ ان کی یہ حالت ماں کے لاڈ پیار نے بنائی تھی۔ سب میں چھوٹے ہی تھے۔ چھوٹوں پر علی العموم مائیں مہربان ہوا ہی کرتی ہیں ان پر ایک خاص وجہ سے لاڈ پیار تھا وہ یہ کہ مولنا نذیر احمد صاحب اور مولوی علی احمد صاحب دونوں ماں سے الگ دہلی میں رہتے تھے۔ اگر ضمیر احمد بھی الگ ہو جاتے تو بھلا ماں کا دل کس سے بہلتا غرض یہ تعلیم کی طرف سے بالکل کورے رہے۔ گورکھپور میں انھوں نے اپنی ساری عمر بسر کی دیکھنے میں قوی ہیکل اور خوش رو جوان تھے۔ پہلے کچھ دنوں میونسپلٹی میں نوکر رہے۔ اس کے بعد پولیس کے تھانہ دار ہو گئے لیکن یہ نوکریاں مولنا کے مارے باندھے کی تھیں۔ مولنا جب گورکھپور کی ڈپٹی کلکٹری سے دوسرے ضلع میں بدل گئے تو ان حضرت نے بھی نوکری چھوڑ دی اور گھر جا کر بیٹھ رہے اس کے بعد کچھ دنوں زراعت سے خوشہ چینی کی لیکن وہاں بھی رائی کے برابر جب نفع نہیں ہوا تو اس کو بھی چھوڑ چھاڑ دیا۔ انھوں نے وہیں گورکھپور میں ایک عقد بھی کر لیا تھا۔ سنا ہے کہ اسی عقد نے انھیں بہت سی مضرتیں بھی پہونچائیں۔ ان کی والدہ نے ہر چند وطن میں بلایا مگر نہ آئے آخر ایک مرتبہ ماں کی مامتا نے جوش کھایا اور خود بایں کبرسنی گورکھپور پونہچیں مگر مرحوم نے ٹال دیا اور والدہ کے ساتھ وطن نہ گئے۔ جب ان کی بی بی کا انتقال ہو گیا تو آخر عمر میں بے بلائے بجنور چلے آئے اور ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء کو وہیں انتقال کیا۔ یہ صاحب لاولد گزرے ۔

ہمارے مولانا کے بھائیوں کے سوا تین بہنیں بھی ہوئیں سب سے چھوٹی عالم جوانی میں بہ قیام نگینہ ضلع بجنور اپنی سسرال میں عُسرِ ولادت سے مریں۔ دو اب بقیدِ حیات ہیں۔ دونوں مولنا سے عمر میں چھوٹی ہیں۔ ان دونوں میں بڑی پیرجی صادق علی صاحب مرحوم سے منسوب تھیں۔ ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چار لڑکے حافظ ہیں۔ یہ خود بڑی دین دار شب زندہ دار ہیں حج بھی کر آئی ہیں اکثر حصہ راتوں کا عبادت میں صرف ہوتا ہے قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ انگلی میں کپڑا لپیٹ کر ورق الٹتی ہیں۔ کوئی بیمار پڑا تو اس کی تیمارداری گویا ان کا فرض ہے اور کوئی مرتا ہے تو تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کو ثواب عظیم سمجھتی ہیں ۔

مولنا کی دوسری بہن منشی رفیع الدین صاحب تحصیلدار انسپکٹر سرکار عالی نظام سے منسوب ہیں۔ ان کے بھی کئی لڑکے لڑکیاں ہیں۔ رفیع الدین صاحب کے یہاں بڑی بھاری زمینداری ہے یہ صاحب نگینہ ضلع بجنور میں رہتے ہیں۔

خدا کے فضل سے مولنا کی والدہ بقیدِ حیات ہیں آنکھوں کی بینائی ماشاء اللہ چشم بددور ابھی تک موجود ہے۔ دانت دو ایک باقی ہیں۔ چل پھر بھی سکتی ہیں بلکہ الٹا سیدھا کچھ سی پرو بھی لیتی ہیں۔ ہوش و حواس کبھی درست رہتے ہیں اور کبھی نہیں۔

دس برس نہیں گزرے ہوں گے کہ مولنا کی نانی نے انتقال کیا ان کی بھی مرتے دم تک یہی حالت تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درازیِ عمر بھی اس خاندان کی ایک خصوصیت ہے۔ خدا کرے کہ مولنا کو بھی نصیب ہو ۔

غرض مولنا کی خاندانی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم ہمیشہ ان کے خاندان میں منتہائے شرافت رہا ہے۔ مرد تو مرد عورتیں بھی تعلیم یافتہ اور پابندِ مذہب ہیں۔ مولانا اصل میں شیخ صدیقی ہیں ۔

خاندانی جائداد | سلاطین یورپ سے دور شاہانِ ایشیا اور خصوصاً شاہانِ اسلام کا گویا یہ شیوہ سا ہو گیا تھا کہ اپنے اپنے

دَوْر میں بطور عطیات شاہانہ کسی ملکی یا مذہبی یا کسی دوسری خدمت کے عوض میں کچھ نہ کچھ جاگیریں مرحمت فرمایا کرتے تھے اِس قسم کی کچھ جاپداد مولانا کے خاندان میں بھی تھی جو بوجہ سلسلہ مشائخین بصورت معافی مولانا کے والد کی زندگی تک موجود رہی۔ مولوی سعادت علی صاحب کے قبضے میں حصّہ بخرہ ہوتے ہوتے کوئی ساٹھ ستر بیگہ اراضی معافی عطیہ شاہان دہلی موجود تھی۔ مولوی نصر اللہ خاں[۱] صاحب مرحوم و مغفور اور مولانا نذیر احمد صاحب کے دادا پیرجی نجابت علی صاحب سے حد درجہ الفت تھی۔ مولوی نصر اللہ خاں صاحب اُن دنوں ضلع بجنور ہی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ بڑے مقدّس بزرگ تھے قانوناً مجبور ہو کر پیرجی نجابت علی صاحب کی خاندانی معافی ضبط کر لی۔ مگر جناب پیرجی صاحب سے کہا کہ پیرجی بندوبست قبول کر لو تو میں دو آنے بیگھ جمع لگان باندھ دوں اور کُل معافی کا اِسی طرح بندوبست کر دوں۔ مگر مولانا نذیر احمد صاحب کے دادا قواعد و قوانین گورنمنٹ سے بالکل ناواقف تھے۔ خان صاحب سے صاف دلی اور بڑی سادگی سے فرمایا "بھئی خاں صاحب ہماری معافی تو بادشاہ کی دی ہوئی ہے۔ اور ہم لندن سے معاف کرا کر لائیں گے" آخر ان کے اِس کہنے اور ڈپٹی صاحب کی بات نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل اراضی پر زر مالگزاری قائم ہو گیا۔

جس خاندان میں کے ہمارے مولانا ہیں اُس کے اکثر اراکین میں شائبہ جذب پایا جاتا ہے۔ یہ شاید اُسی کا اثر ہو کہ خاندان میں ایک زمانے تک تعلق درویشی اور پیری مریدی کی وجہ سے جذبِ خفائی مسلسل رہا ہے۔ مولانا نذیر احمد صاحب کے دادا کا ڈپٹی نصر اللہ خاں صاحب کو یہ جواب دینا کہ "بھئی خاں صاحب ہماری معافی تو بادشاہ کی دی ہوئی ہے اور ہم لندن سے معاف کرا کر لائیں گے" اُسی جذب کا اثر تھا۔ مولانا نذیر احمد صاحب کے والد کا اپنے خُسر کے انتقال کے بعد جایداد سے دست بردار ہو کر بجنور چلے آنا بھی اُسی جذب کا نتیجہ تھا۔ خود ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب بھی باایں ہمہ علم و تہذیب اِس اثر سے اپنے تئیں بالکل محفوظ نہ رکھ سکے حیدر آباد دکن کی نوکری سے اُن کا مستعفی ہونا پھر اِسی قسم کی بات نہیں تو اَور کیا ہے ✣

غرض مولانا سعادت علی صاحب نے اِس زمینداری کے ضمن میں چند سال تک کھنڈ سار کے ذریعے سے شکر کی تجارت بھی کی تھی۔ آخر کار اُس سے بھی دل کھٹا ہو گیا اور معلّمی کا عمامہ باندھ کر بعض رؤسا کے لڑکوں کو بسم اللہ کہہ کر پڑھانا شروع کیا۔ معلموں کی تنخواہیں اُن وقتوں میں نقد اور خوراک ملا کر ہوتی تھیں وہی اُن کی ہو گی ✣

بچپن اور عنفوان شباب نہایت جستجو کے بعد بھی مولانا کے بچپن اور شباب کے حالات اس قدر مختصر و مشتباہ ہوئے کہ گویا اُن کا عدم وجود برابر ہے۔ مولوی سعادت علی صاحب مولانا نذیر احمد صاحب کے نانا کے انتقال کے بعد خاص بجنور میں اپنے آبائی مکان میں آکر رہنے لگے۔ اُس وقت مولانا کی عمر کوئی چار برس کی ہو گی عسرۃ اور توکل دو ملازم ان کے ماں اور باپ کے ساتھ آئے تھے۔ کوئی چھوچھو۔ انّا۔ یا دوا۔ مولانا کے لیئے نہیں رکھی گئی۔ وہاں تمام کھلائیوں کا مجموعہ صرف ایک ماں تھیں جنھوں نے اپنی محبت آمیز متبرک گود میں آرام سے سُلایا اور مقدّس ہاتھوں کے جھولے میں چھوٹی چھوٹی پینگوں سے اُن کو جُھلایا۔ اور چونکہ ہمارے مولانا بچپنے میں گدازجسم بھی تھے تعجب نہیں کہ اُن کی والدہ گیند کی طرح اُچھالا بھی کرتی ہوں ✣

مولانا ہونہار اور ہوشیار لڑکوں کی طرح بچپنے میں نہایت چلبلے تھے۔ اُنھوں نے کبھی ایک جگہ بیٹھ کر ایک نشست میں

---

[۱] مولوی نصر اللہ خاں صاحب کا وطن خورجہ ضلع بلند شہر تھا۔ بجنور اور مظفر نگر وغیرہ میں ڈپٹی کلکٹر رہے تھے اور آخر کار سرکار نظام میں صدر تعلقہ دار یعنی صوبہ ہو گئے تھے۔ جن سے تاریخ دکن یادگار ہے ۱۲

پوری حجامت نہیں بنوائی - آدھی بنوائی اور بھاگے - دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہو کر آتے تھے تو وہ آدھی پوری ہوتی تھی اور اسی وجہ سے جا بجا چوٹیں بھی لگا لیا کرتے تھے جس کے نشان اب تک موجود ہیں - بے وضو نماز کا پڑھنا گویا ایک معمولی بات تھی - اکثر ایسا ہوا ہوگا کہ سحری اور افطار کے لالچ میں روزے رکھے ہوں گے اور کچھ عجب نہیں کہ پوشیدہ طور پر توڑے بھی ہوں -

ایک لکچر میں مولانا علی گڑھ کالج اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے ہوئے عام مسلمانوں کے لغو شکوک یا بہانے بیان فرما رہے تھے وہاں یہ بھی فرمایا تھا کہ

"اگر فی الواقع علی گڑھ کالج میں پڑھنے سے مذہب میں فرق آتا ہے تو نفس انگریزی کی وجہ سے آتا ہوگا ورنہ یوں تو وہاں نماز کی بھی تاکید ہے - لڑکوں سے رمضان کے روزے بھی رکھوائے جاتے ہیں - اب یہ شیطانی لشکر نماز کو بے وضو پڑھتا ہو یا سحری اور افطاری کے لالچ سے روزے دار بنتے اور وضو کرتے میں کلیاں پی جاتے ہوں - تو سید احمد خاں اس کو کیا کریں - اور کیوں کر یقین ہے کہ گھروں میں لڑکے ایسا پاجی پن نہیں کرتے - چھوٹی عمر میں میں نے آپ کیا ہے"

غرض اسی قسم کی طفلانہ خوش آیند حرکتیں مولانا رات دن کیا کرتے تھے اُن طفلانہ حرکتوں کی اگر فہرست کہیں مل جاتی تو اُن کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا - برخلاف اِن کے مولوی علی احمد صاحب بچپن ہی سے سلیم المزاج تھے - باپ کے ڈر سے نماز پڑھتے تھے مگر گناغے دار اور روزے بھی رکھتے تھے مگر غیر مسلسل -

عنفوانِ شباب کے ناشزا جلسوں سے مولانا بالکل علیحدہ رہے - کبھی رنگین صحبتوں کا لطف اُٹھایا نہ راگ رنگ کے جلسوں کو گرمایا - کبھی گلستاں کے سبق سے عشق و جوانی کے بوستان میں گل چینی کی نہ دوستوں کی صحبتوں میں بینا بازار کے کوچوں کی خاک چھانی - نو برس کی عمر تک پدر بزرگوار نے بیٹے کی لوحِ دل پر اخلاقِ حسنی کے پھول بوٹوں کی بیل چڑھائی - مولوی نصر اللہ خاں صاحب کی فیضِ صحبت نے ان پھولوں میں خوشبو پیدا کی کہ دماغ معطر ہو کر رہ گیا - دہلی پہنچے تو مسجد کی گداگری اور بعض اُستادوں کی نامہربانی نے اِن پھولوں کو مُرجھانا شروع کر دیا کہ دہلی کالج میں داخل ہوئے - وہاں کی آبیاری نے وہ کام دیا کہ ہمارے مولانا کے خیالات کا چمن سدا بہار ہو گیا - کالج کی تعلیم ختم ہوتے ہی نوکری کی سوجھی +

یہ سب کچھ سہی لیکن ہمارے مولانا زاہد خشک بھی نہیں ہیں اُن کے پہلو میں دل ہے اور دل میں مفہوم حُسن سمجھنے کا کافی مادّہ موجود ہے - حسن صورت کے متعلق مولانا کے مفصّل حالات اگر دیکھنے منظور ہوں تو مُبتلا اور عارف کا مباحثہ حسن صورت پر "فسانۂ مبتلا" میں ملاحظہ فرمایئے "اُمّہات الامّہ" کو دیکھیے "رویائے صادقہ" کا مطالعہ کیجیے اور "الحقوق و الفرائض" حصۂ سوم پڑھیے - ہم اِس بارے میں مولانا کی رائے اگر لکھیں گے تو اُس حصے میں لکھیں گے جہاں ان کے عام حالات اور طبعی خصائل و عادات کا تذکرہ ہے +

تعلیم | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب کی تاریخ زندگی میں صرف اُن کی تعلیم کا حصہ بڑا ہی دلچسپ واقع ہوا ہے جو عجیب و غریب واقعات سے لبریز ہے - اِس حیثیت سے نہیں کہ اُنھوں نے کتابوں کی جگہ کوئی طلسم توڑا تھا - یا ہفت خوان طے کیے تھے بلکہ اس اعتبار سے کہ اُنھوں نے اساتذۂ مستعدی بالغ استعداد اور پوری قوتِ مطالعہ کے ساتھ طالب العلمانہ

طور پر بڑے بحث مباحثے سے کتابیں تمام کی تھیں جس کے بہت سے معرکۃ الآرا مسائل و مباحث اگر یہاں مل جاتے تو ضرور قابلِ نقل تھے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے مولانا کی سوانح عمری میں یہ حصہ معرکۃ الآرا ہے۔ مگر ہم تو یہی کہیں گے۔ ؎

اے شیخ چہ جوئی ز شبِ قدر نشانی　　ہر شب شبِ قدر ست اگر قدر بدانی

مولانا کی زندگی کا ہر حصہ دل چسپ ہے ہر واقعے میں ایک لطف ہے اور ہر لطف میں عجیب قسم کی روحانی لذت ہے جس سے سیری نہیں ہوتی۔ بہرحال مولانا نے انگریزی اُنیسویں صدی کے وسط میں اپنے پدرِ بزرگوار مولوی سعادت علی صاحب سے پُرانے قاعدے کے بموجب غالبًا کیا یقینًا قاعدۂ بغدادی پڑھا ہوگا۔ جب مولانا کو حرف ملانے آ گئے تو مقدس رحل پر اُن کے سامنے قرآن مجید کھولا گیا۔ قرآن مجید بھی باپ نے پڑھایا۔ مگر اُسی پُرانے طریقے پر طوطے کی طرح بے فہم مطلب و معانی۔ ابتدا میں ہمارے مولانا اِس طرح سے قرآن کے پڑھنے کو بے سود جانتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے ابتدا میں اپنے بچّوں کو طوطے کی طرح قرآن مجید نہیں پڑھایا۔ شاید ہمارے مولانا حیدرآباد میں تھے وہاں سے اپنے بیٹے کو ایک خط لکھا ہے اُس میں تحریر فرماتے ہیں

"آج ایک تقریب سے تمھارے بچپن کی دو باتیں یاد آ کر دل کو بڑی ہی خوشی ہوئی اور تاکہ تم کو بھی خوشی ہو یاد دلاتا ہوں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میری عادت تھی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[1] برمی آید زمن احسانے منّتہائے تو بشکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن تم نے پوچھا کہ آبا کھانے کے بعد یہ کیا پڑھا کرتے ہو۔ میں نے کہا خدا نے روزی دی اُس کا شکر کرتا ہوں۔ تم نے کہا مجھ کو بھی سکھا دو۔ میں نے کہا تم عربی فارسی زبانیں نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے میں نے تم کو جیسا کہ دستور ہے پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا کہ تم اُس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا دُہرانا بے فائدہ اور لاحاصل ہے تم اپنی بولی میں ادائے شکر کر لیا کرو۔ تم کچھ ملول ہوئے تو میں نے تھوڑی دیر تامّل کر کے یہ شعر موزوں کر دیا۔

یہ رزقِ طیّب بلا مشقت۔ خدا کی قدرت کا دیکھو جلوا　　گناہ گاروں کو منّ و سلوی کیا عنایت گدھوں کو حلوا

چوں کہ کڑی اچھی تھی تم نے بہت پسند کیا اور چند بار دُہرانے سے یاد ہو گیا۔ مگر بجائے "گدھوں کو حلوا" کے "گدھوں کا حلوا" تمھاری زبان پر چڑھ گیا۔ ہم دونوں وقت کھانے کے بعد بالالتزام یہ شعر پڑھتے اور ہم سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے۔ مدّتوں بعد تم کو غلطی پر تنبیہ ہوا ہنسی تو گئی گزری ہوئی نری شکرگزاری رہ گئی"

لیکن اب مولانا کی رائے بالکل بدل گئی ہے اور اب وہ قرآن مجید کو لڑکپن میں طوطوں کی طرح پڑھنے کو مسلمان بچّوں کے حق میں چند حیثیت سے مفید اور فالِ نیک سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"......... تاہم طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمانوں کے بچّوں کے لیے ضرور ہے کیوں کہ اُردو میں عربی کے الفاظ اِس کثرت سے رواج پا گئے ہیں کہ جس کو عربی نہیں آتی وہ درستی کے ساتھ الفاظِ عربی کو ادا نہیں

[1] خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو کھانا کھلایا۔ اور پانی پلایا۔ اور ہم کو مسلمان پیدا کیا۔ اور ہماری آخری بات یہ ہے کہ سب طرح کی تعریفیں خدا ہی کو زیبا ہیں۔ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے ۱۲

کر سکتا۔ بڑے ہو کر خدا جانے اعصاب دہن میں کچھ اس طرح کی خشونت آجاتی ہے کہ زبان جن حروف کے ادا کرنے کی ابتدا سے خوگر نہیں ہوئی پھر وہ اُس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہوتے .... مسلمانوں کے بچے خدا رسول اور مذہبی باتوں سے کسی قدر آگہی حاصل کرتے ہیں اگر یہ بے سود ہو تو مولود کے کان میں اذان کا دینا اس سے زیادہ بے شود اور فعل عبث ہے مگر خدا تو آوازوں کو نہیں نیتوں کو دیکھتا ہے ...... ما بروں رانہ نگریم و قال را، ما دروں را بنگریم و حال را.. قرآن سے بچوں کی تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مماثلتِ لفظی کے سہارے قرآن کا اُردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ یک کرشمہ دو کار۔

سب سے بڑا فائدہ جو بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہم مطلب قرآن شریف پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ چاہے کوئی اس کو حسنِ عقیدت سمجھے یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مؤدب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ وہ قرآن شریف پڑھنے کے لیے مؤدب بٹھائے جاتے ہیں اور ادب رفتہ رفتہ داخلِ عادت ہو جاتا ہے۔"

"اپنے خیالات تو بچپن میں قرآن پڑھانے کی نسبت یہ ہیں مگر ہم میں سے جو لوگ تمام پرانی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ایسے بہت ہیں اور افسوس بہت ہوتے جاتے ہیں اُنھوں نے تو یہ جدید شیوہ اختیار کیا ہے کہ بچے میں حروف شناسی کا مادہ پیدا ہوا اور اُنھوں نے اس کو اُردو کی پہلی اور دوسری کے سلسلے میں جا لگایا اور بقیۃ العمر اُن کو قرآن مجید پڑھنا نصیب نہیں ہوتا۔"

"تعلیم کے پرانے طریقے کی رو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیے یاد کر لیا کرتے تھے یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقے سے تعلیم پا رہے ہیں مُرُوا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ إِذَا بَلَغُوا سَبْعًا وَاضْرِبُوهُمْ إِذَا بَلَغُوا عَشْرًا[1] سے متجاوز ہو جاتے ہیں اور اُن کو الحمد تک پوری نہیں آتی درود اور التحیات کی کون کہے اور آئے کہاں سے بیچاروں کو اس رستے پر ڈالا ہی نہیں گیا۔"

بہرکیف ہمارے مولانا کی ابتدا میں وہ رائے تھی اور اب یہ رائے ہے۔ بعض لوگ جو گوشِ شنوا نہیں رکھتے اور جن کی آنکھیں سرسری نگاہیں رکھتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی اصلی رائے تو وہی ہے جس کو اُنھوں نے اپنے صاحبزادے کے خط میں ظاہر کیا ہے اور یہ دوسری رائے کوئی رائے نہیں ہے بل کہ ترجمۃ القرآن کا ایک اشتہار ہے جو اس پیرائے میں دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ لوگوں کی ایک بڑی غلطی ہے اور ظُنُّوا الْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا کے برخلاف غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں رائیں اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور درست ہیں پہلی رائے اس لیے ٹھیک ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اور مقصود بالذات مجموعی کام انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کو درست کرنا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ انسان ترقی پا کر دنیوی اور اُخروی اعلیٰ سے اعلیٰ درجات حاصل کرے اور تقرب ذات مقدس الٰہی۔ اور حیاتِ ابدی اور عالم محسوس و غیر محسوس کی غیر محدود سعادت کا تاج اپنے سر پر رکھے اور وہ اپنی ظاہری اور سوشل اور تمدنی حالت کی عظمت و شوکت کے نقارے بجائے۔ اور عزت و عروج اور حسنِ معاشرت کی نیکیوں کو بدرجۂ اتم حاصل کر کے اشرف المخلوقات

---

[1] تمہارے بچے سات برس کے ہوں تو نماز کا حکم دو اور دس برس کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مارو ۱۲۔

کے لقب سے سرفراز ہو۔[1]

پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی غرض و غایت لوگوں کے معتقدات اور اخلاق اور معاملات کی اصلاح اور جہاں کہیں اس میں واقعات گزشتہ کا بیان ہے وہ بھی اسی غرض سے ہے کہ لوگ دوسروں کے حالات سن کر متنبّہ ہوں اور عبرت پکڑیں اور اپنا چال چلن درست کریں

اگر فی الواقع قرآن مجید کے وُرود کا یہی منشا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی منشا ہے تو ہمارے مولٰنا کی پہلی رائے بالکل صحیح ہے کیوں کہ قرآن کو بے سمجھے بوجھے پڑھنا بالکل طوطے کی طرح کا پڑھنا ہے۔ طوطے کو پڑھایا جاتا ہے "میاں مٹھو نبی جی بھیجو" حق اللہ پاک ذات اللہ صحیح تو خدا اور خدا کا رسول۔ تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول" مگر ان فقروں کا مطلب طوطا کچھ نہیں سمجھتا۔ سچ کہا ہے ؎ کچھ نہ سمجھا سوائے ٹیں ٹیں کے۔ ؎ آدمیت اور شئے ہے علم ہے کچھ اور چیز۔ لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا۔ جب طوطے کی طرح لڑکے بھی قرآن مجید کے معنی نہیں سمجھتے تو اس کے اوامر و نواہی کا اثر ان کے دل پر کیا ہوتا ہوگا۔ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ[2] فرض کیجیے ایک عرب نژاد ہندوستان کے کسی جنگل میں پیاسا تڑپ رہا ہو اور دُور دُور تک اس جنگل میں کہیں پانی کا پتہ نہ ہو۔ اتنے میں کوئی جاہل دیہاتی اس طرف سے گزرے اور اس کے پاس کسی ظرف میں ٹھنڈا پانی ہو وہ عربی دیکھ کر ماء ماء یا مویا مویا کہے تو وہ دیہاتی گنوار ان الفاظ کو کیا سمجھ سکتا ہے اور کیا تشنہ عرب کو پانی پلا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک بعینہ یہی حال ہے قرآن مجید کو بے فہم مطلب پڑھانے کا۔

میرے ایک دوست بڑے تند مزاج پٹھان اور معمولی پڑھے لکھے تھے تلاوتِ قرآن مجید کا ان کو بہت شوق تھا میں نے ان سے ایک دن کہا کہ خاں صاحب آپ اگر ترجمے کے ساتھ قرآن مجید پڑھا کریں تو آپ کو بہت فائدہ ہو خالی لفظوں کے پڑھنے سے قرآن مجید کی غرض و غایت ہرگز پوری نہیں ہوتی جس کے لیے وہ نازل ہوا ہے کیوں کہ آپ اس کے معنی نہیں سمجھتے اور جب معنی نہیں سمجھتے تو پڑھنا لاحاصل۔ خاں صاحب نے مارے غصے کے قرآن مجید کو تو کر دیا بند اور لگے مجھ سے کٹ حجتی کرنے۔ آخر یہ ارشاد کیا کہ میں تو ثواب کی غرض سے پڑھتا ہوں میں نے کہا آپ بہت اچھا کرتے ہیں لیکن اگر آپ ترجمہ بھی ساتھ ساتھ پڑھتے رہیں تو آپ کو دوگنا ثواب ہوگا۔ بین السطور ترجمہ موجود ہے اور وہ بھی اَور کسی کا نہیں شاہ عبد القادر صاحب کا یہ کہہ کر میں نے ان سے اپنا پیچھا چھڑایا اور اپنی جگہ پر سوچنے لگا کہ حقیقت میں بے فہم مطلب قرآن مجید پڑھنے سے کوئی فائدہ یا ثواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میں نے عرصہ دراز تک باوجودے کہ بہت کچھ غور و خوض کیا لیکن اس وقت تک تو حصولِ ثواب کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔ قرآن مجید کے پڑھنے سے ثواب حاصل ہونا اور نہ پڑھنے سے محروم رہنا مسلّم لیکن ثواب کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہیں کہ کسی نے بے فہم مطلب ایک پارہ پڑھ لیا اور اس پر گٹھڑی بندھا بندھایا ثواب آسمان سے آ ترپڑا۔ میرے نزدیک ثواب عذاب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اوامر و نواہی کو ہم سمجھیں اور ان پر عمل کریں ان اعمال سے جو کچھ فائدہ ہم کو ہوگا یہی ثواب ہے اور قرآن مجید کے احکام کے خلاف جو عمل ہم سے سرزد ہوں گے اور ان سے جو کچھ نقصان ہم کو پہنچے گا وہی ہمارے لیے انجام کار عذابِ الٰہی ہوگا۔ میرے نزدیک تو

---

[1] وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا۔
اور البتہ ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری میں ان کو (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور عمدہ (عمدہ) چیزیں انھیں (کھانے کو) دیں۔ اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں بہتیروں پر ان کو برتری دی ۱۲

[2] جو (منہ سے لفظوں کے) بڑبڑا لینے کے سوا کتاب (الٰہی کے مطلب) کو (کچھ بھی) نہیں سمجھتے وہ فقط خیالی تُکّے چلایا کرتے ہیں ۱۲

عذاب و ثواب کے یہ معنی ہیں نہ وہ کہ بے فہم مطلب قرآن پڑھ لیا اور آسمان سے ثواب مینہ کی طرح برس پڑا۔

تاہم ہر سمجھ دار اور انجام بین مسلمان کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلمان بچوں کو اگرچہ قرآن کا پڑھانا طوطوں کو پڑھانا ہے لیکن قرآن مجید پڑھ کر ان کو نماز کی عادت پڑتی ہے خواہ وہ اس کے معنی سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں اور خواہ وہ نماز کو ابتدا میں بے وضو ہی ٹرخاتے ہوں ہمارے نزدیک وہ شخص بڑا احمق ہے جو نادان کو دانا کے پاس بیٹھنے سے روکے نادان دانا کے پاس بیٹھے گا۔ تو اَلصُّحْبَةُ تَاثِیْرٌ کی رو سے کچھ نہ کچھ تو دانائی کا حصہ لے ہی نکلے گا ؎ سگ اصحاب کہف روزے چند۔ پئے نیکاں گرفت مردم شد۔

ہمارے نزدیک بعض انگریزی تعلیم یافتوں کا یہ خیال باطل غلط اور تجربے کے خلاف ہے کہ جب لڑکا سمجھ دار ہوگا تو وہ خود بخود قرآن پڑھ لے گا افسوس ہم نے سیکڑوں ایسے انگریزی داں طالب علم دیکھے ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی پڑھنا تو درکنار قرآن کو ہاتھ تک نہیں لگایا لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی رو سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو چھونے کی عادت نہیں ڈلوائی گئی۔ والدین بیچارے اس امید میں بیٹھے تھے کہ بلند اقبال ان شاء اللہ اب صاحب فہم و فراست ہوئے قرآن مجید جو ان کی دینی اور آسمانی کتاب ہے اس کو ضرور پڑھیں گے اور جیسا کہ سمجھنا چاہیئے سمجھیں گے۔ اس کے اوامر و نواہی پر کاربند ہوں گے لیکن صد افسوس ہے کہ اس خیال کے برعکس دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ ہم اس کو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں اکثر ایسے سعادت مند بھی موجود ہیں جن کے کتب خانے کلام مجید سے خالی ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ خیر اگر ہم نے نہیں دیکھا نہ سہی نئے نوجوان تعلیم یافتہ خود اپنے ایمان سے کہہ دیں کہ کتنے ایسے نئے تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر میں ایکبار بھی قرآن مجید کو شروع سے آخر تک سمجھ کر پڑھا ہے یا صرف پڑھا ہے سچ یہ ہے کہ یہ قصور اولاد کا نہیں۔ قصور ہے ماں باپ کا جنھوں نے بنیاد ہی غلط ڈالی ؎ خشت اول چوں نہد معمار کج۔ تا ثریا می رود دیوار کج۔ الغرض بے فہم مطلب قرآن ختم کرنے کے بعد مولانا ایک مکتب میں "ولے برنا بش" بٹھائے گئے ہاتھ میں تختی اور بغل میں وہی خالق باری۔ محمود نامہ۔ کریما۔ مامقیماں دبا کر تشریف لے جاتے تھے۔ اور آگے پیچھے ہل ہل کر ایک خاص لَے میں پڑھتے تھے ؎ مامقیمانِ کوئے دلداریم۔ رخ بدنیا ے دوں نمی آریم۔ مکتب کے پڑھنے کی لَے ہندوستان بھر میں ابھی تک رائج ہے اور جب تک آگے پیچھے کو لڑکا ہلے نہیں وہ آ نہیں سکتی اور نہ اُس لَے میں وہ سُر پیدا ہو سکتے ہیں[۱]۔

غرض اس طرح مولانا کا قیمتی وقت کچھ عرصے تک مکتب میں ضائع ہوتا رہا۔ پدر بزرگوار نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو مکتب سے اٹھا لیا اور فارسی کی متداول کتابیں بیٹے کو خود پڑھائیں۔ انھیں کتابوں میں مینا بازار پنج رقعہ۔ اور سہ نثر ظہوری بھی شامل تھیں۔ جن کو امام بخش صہبائی کی شرحوں کے ساتھ پڑھاتا تھا۔ فارسی کے ساتھ مولوی سعادت علی صاحب نے عربی بھی شروع کرادی تھی ہمارے مولانا نو برس تک برابر اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے جہاں انھوں نے تعلیم سے زیادہ تربیت کے سبق سیکھے یہ پدر بزرگوار ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مولانا اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے شریفوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

باپ کا ارادہ تھا کہ بیٹے کو پرانی وضع کا دیندار مولوی بنائیں۔ مگر ان کی اُس وقت کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی تاہم مولانا

---

[۱] مولانا نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ "اُنھوں (مسلمانوں) نے یا تو کچھ نہ پڑھا ہوگا یا پڑھا ہوگا تو وہی دیسی مکتب میں اور مقدور ہوا تو گھر پر پُرانے کھوسٹ میاں جی سے محمود نامہ کریما۔ یا مامقیماں یا دستور الصبیان اور وہ بھی اُس ناس (؟) سے جس کی نقل تیوروں کے برس اسی کانفرنس کے تھیٹر میں آنریبل سید محمود نے کی تھی۔ ابتدائی تعلیم تو میری بھی اسی طرز پر ہوئی تھی مگر تیجہ سیاہ کرو، آنریبل سید محمود کو تو ایسی یاد رہی کہ نقل کو سن کر اصل کا سماں آنکھوں میں پھر گیا تھا اور مجھ کو ایسی بھولی کہ نقل کا قصد کرتا ہوں تو اُن سُروں میں ادا نہیں ہوتی"

نذیر احمد صاحب کی طبیعت میں شجرِ علم کی جڑ قائم کر دی اور اس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی تھی کہ اگر دوسرے اُستادوں کی مدد نہ بھی پہونچتی تو وہ بغیر سرسبز و شاداب ہوئے رہ نہیں سکتی تھی۔ باپ نے بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ مَنْ جَدَّ وَجَدَ وَمَنْ طَلَبَ غَلَبَ[1] مولوی سعادت علی صاحب مولانا سے فرمایا کرتے تھے کہ "بیٹا! علم شرافت و بزرگی کا منبع ہے" بیٹا جب اس نصیحت پر عامل ہوا تو اب اُس کے کامل ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے۔ بیٹے کی نو برس کی عمر تھی کہ باپ نے اپنی تعلیم سے علیحدہ کر کے مولوی نصر اللہ خاں صاحب کی فیضِ تربیت میں داخل کیا ؛

مولانا کے دوسرے استاد مولوی سعادت علی صاحب کے بعد مولانا کے دوسرے استاد مولوی نصر اللہ خاں صاحب تھے جنھوں نے مولانا کی جدّی جائداد ضبط کر لی تھی یہ صاحب ان دنوں بجنور ہی میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی سعادت علی صاحب مرحوم اور ڈپٹی نصر اللہ خاں صاحب مرحوم سے بجنور ہی میں ملاقات ہوئی۔ مولوی سعادت علی صاحب کبھی کبھی مولوی علی احمد صاحب اور ہمارے مولانا کو بھی ڈپٹی صاحب کے پاس سلام کے لیے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ دونوں بھائی سنّ طفولیت میں پڑھنے لکھنے میں بڑے طاق تھے ڈپٹی صاحب نے دونوں کو ہونہار اور ذہین پایا دل میں خوش ہوئے اور زبان سے تعریف کے ساتھ دعائے علم دی اور التفاتِ خاص فرمانے لگے آخر دونوں کو اپنے حلقۂ درس میں لے لیا ؛

اب ان دونوں بھائیوں کی تعلیم مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے ہونے لگی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب کی بدلی مظفر نگر ہو گئی تو خاں صاحب نے مولانا کے والد سے فرمایا کہ دونوں بچّوں کو میرے ساتھ کر دو خاں صاحب کو شاگرد بنانے اور مرید کرنے کا بڑا شوق تھا غرض مولانا کے والد نے دونوں بھائیوں کو مظفر نگر پہونچا دیا خاں صاحب کے ہاں مریدوں اور شاگردوں کا بڑا جمگھٹا لگا رہتا تھا اُن میں یہ دونوں بھائی بھی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی طبعی شوخی اور ذہانت کی وجہ سے خاں صاحب بہت خوش ہو ہو کر پڑھاتے تھے اور اکثر لوگوں کے سامنے صرفِ عربی کے سوالات پوچھتے صیغے دریافت کرتے اور جواب پا کر اظہارِ مسرّت فرماتے۔ جاڑے کے موسم میں دَورے پر ساتھ لے جاتے اور علم والوں سے صحبت ہوتی تو انھیں دونوں بھائیوں کو پیش کرتے جہاں ڈپٹی صاحب کو شاگرد بنانے اور مرید کرنے کا شوق تھا وہاں یہ بھی تھا کہ اپنی ہی تصنیف کی ہوئی کتابیں پڑھاتے۔ خاں صاحب کے ایک نحوی رسالے کا نام قمقام تھا غرض ہمارے مولانا نے وہاں پانچ برس کے عرصے میں نحو عربی میں شرح ملّا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی اور فلسفے میں میبذی تک پڑھا ؛

اعظم گڑھ میں فتح خاں صاحب مولوی نصر اللہ خاں صاحب کے ماموں تحصیلدار تھے۔ انھیں تحصیلدار صاحب کے ایک پیر و مرشد تھے شاہ عبد العلیم صاحب یہ بزرگ بھی اتفاق سے وہیں اعظم گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ اُنھوں نے مولوی نصر اللہ خاں صاحب کو اپنے پاس بلایا تو خاں صاحب نے ایک ساتھ چھ مہینے کی رخصت لینے کا مصمم قصد کیا اتفاق سے مولوی سعادت علی صاحب مرحوم اپنے صاحبزادوں کو دیکھنے اور خاں صاحب سے ملنے مظفر نگر آئے تو خاں صاحب نے اُن سے فرمایا کہ "اب اپنے بچوں کو دلّی لے جا کر پڑھواؤ۔ اول تو میں اب عدیم الفرصت ہوں اور دوسرے اِن کے پڑھانے کے لیے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور مجھ کو اتنی فرصت نہیں" آخر کار مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں صاحبزادوں کو دلّی لے کر پہونچے اور دونوں کو اپنے ایک اُستاد کے حوالے کیا ؛

[1] جس نے کوشش کی کامیاب ہوا اور جس نے جستجو کی غالب آیا ۱۲

مولٰنا نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا چال چلن اگر باپ کے ہاں وثیقہ تھا تو ڈپٹی صاحب کے ہاں اس کی رجسٹری ہوگئی" اس میں کچھ شک نہیں کہ جس شخص میں جاہ و حشمت حکومت و وجاہت۔ علم و فضل و سیر چشمی۔ علم و تواضع۔ شریعت و طریقت اتنے اوصاف جمع ہوں تو ایسے شخص کے ہاں مولٰنا نذیر احمد صاحب کے چال چلن کے وثیقے پر کیوں کر رجسٹری نہ ہوتی۔

تیسرے اُستاد

اِدھر مولوی نصر اللہ خاں صاحب مشورہ دے کر اعظم گڑھ روانہ ہوئے اُدھر مولوی سعادت علی صاحب اپنے دونوں لڑکوں کو دلّی لے پہنچے مولوی سعادت علی صاحب کو وہاں ایک بزرگ مولوی عبد الخالق[۵۱] صاحب سے تلمذ تھا ان بزرگ کی خدمت میں اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم کی غرض سے پیش کیا مولوی عبد الخالق صاحب نے ان کو پنجابی کٹڑے[۵۲] کی وسیع مسجد میں رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اگلے زمانے میں طالبِ علمی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا اور کثرت سے یہی تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں جہاں علم و فضل کے دریا بہتے تھے وہاں باہر کے لوگ دُور دُور سے طالبِ علمی کے لیے بکثرت جمع ہوتے تھے اُن کی گزر اوقات کی حالت نہایت خراب تھی یہاں تک کہ کتاب بھی مشکل سے مانگے ملتی تھی۔ دس دس بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک سبق میں شریک ہوتے تھے سب کے سب سامع اور ان میں سب سے زیادہ خوش نصیب قاری یہ بات مطبعوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے تھی۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ

"لِکُلِّ شَیْءٍ اٰفَۃٌ وَّلِلْعِلْمِ اٰفَاتٌ[۵۳] کسی کا مقولہ ہے جس کو بچپن میں سُنا کرتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ علم کا حاصل ہونا بہت سی شرطوں پر موقوف ہے۔ سات سُہاگنیں ہوں تو لاڈو کا اُبٹنا پسے یعنی یہ کہ شاگرد کو شوق ہو جی لگا کر پڑھے۔ اُستاد شفیق ہو دل سوزی سے شاگرد کو بتائے سمجھائے۔ دونوں کو ایک وقت مدت تک فراغ خاطر ہو کہ پڑھنے پڑھانے میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو۔ جو کتاب درکار ہو فی الوقت بہم پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ انہی شرائط کا جمع ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔ بہر کیف ہم تو لِلْعِلْمِ اٰفَاتٌ کے یہی معانی سمجھا کرتے تھے اور یہی معانی تھے بھی"

بہر حال جس مسجد میں مولٰنا نذیر احمد صاحب متعلمی کے لیے اُترے تھے یہ اورنگ آبادی مسجد کے نام سے مشہور تھی جس میں سَو سَو طالب علم ہندوستان کے مختلف اطراف سے آکر جمع ہوئے تھے انھیں میں سے بعض ائمۃ المساجد بن جاتے تھے اور بعض میاں جی گری اختیار کر لیتے تھے یہ پیشے مستقل طور پر اختیار نہیں کیے جاتے تھے بل کہ دفع الوقتی اور متعلمانہ زندگی تک محدود ہوتے تھے غرض پنجابی کٹڑے کی مسجد کے طالبِ علموں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس محلے کے ہر ایک گھر سے روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتا اور پیٹ بھر اکرتا۔ بعض اس قسم کے طالبِ علم جو اب اپنے علم اور خدا کے فضل سے برسرِ عروج ہیں ممکن ہے کہ آج وہ اپنی گدا گری کو بھول گئے ہوں یا اس قسم کے طالب علموں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوں لیکن ہمارے مولٰنا نے با ایں ہمہ ثروت و عزت و علم و فضل دربارِ دہلی کی کانفرنس میں پکار کر کہہ دیا۔ "اکثر طالب علم باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے۔ اور

---

۵۱ مولوی عبد الخالق صاحب ایک پنجابی بزرگ تھے آخر عمر میں دمے کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے حلقۂ درس و تدریس سے پہلو تہی کر کے اور مجالسِ وعظ و نصیحت کو خدا حافظ کہہ کر مسجد نشین ہو گئے تھے مگر مطالعۂ کتب کا حد سے زیادہ شغف تھا اور روز و شب کتب بینی میں مصروف رہتے تھے اسی وجہ سے ان کے پاس مختلف علوم کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ انتقال کے بعد یہ سب کتابیں اُن کے ورثہ میں تقسیم ہوئیں جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں۔ ۱۲

۵۲ سنہ ۱۸۴۲ء ۱۲۴۴ھ میں جب کا یہ مذکور ہے پنجابی سوداگر اس میں آباد تھے اب تو یہ محلے کا محلہ ریل میں آگیا ۱۲

۵۳ ہر ایک شے کے لیے ایک آفت ہے اور علم کے لیے بہت سی آفتیں ہیں۔ ۱۲

آپس میں بانٹ کھاتے اور انھیں میں ایک میں بھی تھا"

دوسری جگہ فخراً بیان کیا ہے "یہ لوگ اکثر مسجدوں میں رہتے اور صدقات پر گزران کرتے کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اس کو فخراً بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اسی طرح بسر ہوا ہے"

مولانا نے اس زمانۂ طالب علمی میں ایسی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں کہ طلب صادق ہی اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سردی کے دن اور دلی کی کڑاکے کی سردی اور مسجد کے صحن میں پتھروں کی سلیں بچھی ہوئی اس پر دونوں کہنیاں ٹیک کر جو مطالعہ کرتے تھے تو سردی کی شدت اور سخت فرش ہونے سے کہنیوں میں گہرے گہرے زخم پڑ گئے تھے جن کے نشان اب تک موجود ہیں۔

زمانۂ طالب علمی کا مذہب غرض مولانا نذیر احمد صاحب اورنگ آبادی مسجد میں رہ کر مولوی عبد الخالق صاحب پیش امام شاہی متولی مسجد کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ طالب علموں کی خوش قسمتی سے جن مولویوں کے خاندان کی تولیت میں یہ مسجد تھی اُن میں اختلافِ عقائد کی وجہ سے وہابی اور بدعتی دو گروہ تھے ایک دوسرے کے دشمن اور دونوں کے سرگروہ مولوی عبد الخالق صاحب (جو بعد کو ہمارے مولانا کے دادا خسر ہوئے) اور مولوی حاجی قاسم صاحب تھے جو مولوی عبد الخالق صاحب کے عم زاد بھائی تھے۔ ان دونوں نے طالب علموں کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ مولوی عبد الخالق صاحب اور مولوی حاجی قاسم صاحب میں اختلافِ عقائد بھی تھا اور انھیں میں ایک مولوی صاحب وہابی کہلاتے تھے اور دوسرے حاجی صاحب بدعتی۔ ہمارے مولانا اور ان کے بھائی مولوی عبد الخالق صاحب کے گروہ میں تھے اس وجہ سے نہیں کہ یہ دونوں بھائی بھی وہابی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ مولوی سعادت علی صاحب مرحوم مولوی اسمٰعیل صاحب شہید سرگروہِ طائفہ وہابیہ کے معتقدین میں تھے اور ان کو ان سے تلمذ بھی تھا۔ بہرحال مولوی عبد الخالق صاحب اور مولوی حاجی قاسم صاحب کی تولیت میں یہ مسجد تھی دونوں متولیوں کے طالب علم اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے تھے۔ بعض کہیں لڑکے پڑھا آتے تھے کوئی کسی مسجد کی امامت کر آتے تھے۔ ان طالب علموں کی غالب معاش گداگری تھی۔ کہ دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ان کی روٹی مقرر تھی۔ الغرض مسجد کے طالب علم بھی ان دو گروہوں میں منقسم تھے اور ہر ایک اپنی مخالف پارٹی پر زبان درازیاں کر کے دوزخ شکم میں خوب گرما گرم کھانے بھرا کرتا تھا لیکن ہمارے مولانا نے صلح کل پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ نہ ادھر نہ ادھر بلکہ دونوں طرف یعنی جدھر کچھ ملتا دیکھا اُدھر ہی کے ہو رہے۔ اس لئے جناب مولانا کا مذہب اس زمانے میں مذہب رکابیہ تھا۔ جیسا کہ اکثر طالب علموں کا ہوا کرتا ہے۔

نامہربانیٔ استاد مولانا نذیر احمد صاحب جب مولوی عبد الخالق صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے تو ابتدا میں تھوڑی بہت اچھی تعلیم ہوئی لیکن بہت دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ استاد نے تعلیم و تدریس کی جگہ اپنے خانگی کام لینے شروع کر دیئے۔ ان کاموں کی فہرست اگر دستیاب ہوتی تو ضرور دلچسپ ہوتی۔ مگر مشتے نمونہ از خروارے ایک کام یہ بھی تھا کہ مولوی عبد القادر صاحب[1]

[1] مولوی عبد القادر صاحب کے حالات بہت دلچسپ ہیں یہ بادشاہ کی بہو زینت المحل ولی عہد کی بیوی محمدی بیگم کے استاد تھے اور مسجد اورنگ آبادی کے امام بھی تھے قلعہ اور دربار شاہی میں باریاب تھے۔ مولوی ذی علم اور صاحب اقبال تھے۔ حاجی۔ حافظ۔ اور حکیم تھے۔ گو باقاعدہ مطب نہیں کرتے تھے لیکن فن طب میں عبور کامل تھا۔ اور خاص خاص مرض کا الا اعلاج کیا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے مگر بطور ذریعۂ معاش نہیں نہ بالعموم بلکہ بطور خاص اپنی جان پہچان میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض عملیات مولوی صاحب کے اب تک مشہور ہیں۔ ہمیشہ شاہی کو وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ محمدی بیگم صاحبہ کی زندگی تک ان کو خاندان شاہی سے وظیفہ آتا رہا

مولوی عبدالخالق صاحب کے بیٹے تھے۔ خدا نے اِن کو ایک بیٹی دی تھی جو اُس وقت پانچ برس کی تھی۔ ہمارے مولانا نذیر احمد صاحب اِس لڑکی کو لاڈے لاڈے پھرا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ مسجد میں جو طالب علم کم سن تھے وہ مولویوں کے گھروں میں کام کاج بھی کیا کرتے تھے جیسے بازار کا سودا سلف لا دینا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیے لیے پھرنا وغیرہ وغیرہ ہمارے مولانا اور مولوی علی احمد صاحب دونوں چونکہ کم سن تھے اِس لیے بلا تکلف مولویوں کے زنان خانوں میں آتے جاتے تھے۔ مولویوں کو اپنے طالب علموں کے پڑھنے لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا اور اکثر طالب علم بھی اسی قسم کے تھے اِلّا ما شاء اللہ کہ وہ صرف روٹیوں کے لیے مسجد میں پڑے رہتے تھے غرض ہمارے مولانا کی کم عمری پر خیال کرنا چاہیئے اور ان مولویوں کی بے اعتنائی پر کہ جو کام ایک ماما کا تھا وہ ان سے لیا جاتا تھا ہمارے مولانا اُس وقت کی تضییع اوقات کی بہت شکایت کرتے ہیں اور باوجودے کہ اتنا عرصہ گزر گیا اب بھی وہ خفا نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خفگی اسپیچوں اور لکچروں میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"مجھکو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو خیر ایک بات ہے۔ شکایت تو اِس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ وہ اِس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور اُن سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا معاوضہ اُس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں۔ پس مسجد اُن کے لیئے بھٹیاری کی سرائے تھی اور اُس کا کرایہ مولویوں اور مولوانیوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے میں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹرے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں بدترین وقت تھا اور اگر اُس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہو تو میں دنیا اور دین

(بقیہ صفحہ ۱۷) پنشن ملتی رہی گورنمنٹ انگریزی سے بہ معاوضہ مسجد اورنگ آبادی ان کو معقول معاوضہ بطور انعام مل چکا تھا۔ ایام غدر میں لیسن کی میم کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں اعلیٰ درجے کے خیرخواہ گورنمنٹ خیال کیئے جاتے تھے اور سرکاری دربار میں حاضر باش رہتے تھے۔ دہلی کے اعلیٰ رؤسا میں آپ کا شمار کیا جاتا تھا۔ آدمی بڑے ذی وجاہت تھے تمام شہر ان کو مانتا تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے تاہم سارا کاروبار شادی بیاہ کا یہی سرانجام کرتے تھے کیوں کہ ان کو اس کام میں خاص قسم کا سلیقہ تھا۔ نیں برس ہوئے کہ انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت ان کی زبان پر کلمہ جاری تھا۔ مولوی صاحب رمضان شریف میں بالالتزام تراویح سُنایا کرتے تھے۔ قرآن مجید خوب یاد تھا اور خوش الحان بھی تھے۔ اِن کے حقیقی چھوٹے بھائی مولوی حاجی حافظ عبدالرب صاحب نے وعظ گوئی میں بڑا ملکہ حاصل کیا تھا تمام ہندوستان میں اِن کے وعظ کی دھوم تھی۔ اُنھوں نے سہارنپور میں چندے سے ایک بہت بڑی شان دار مسجد جامع دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر بنوائی ہے۔ یہ صاحب بھی پندرہ سولہ سال ہوئے کہ رخصت ہوئے دونوں بھائی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ کی درگاہ میں مدفون ہیں۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی آل اولاد کا بڑا کنبہ ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب انھیں کے صاحب زادے ہیں جو ڈپٹی کلکٹری کے درجے سے پنشن لے کر اب دہلی کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اِن کے بڑے بھائی مولوی حافظ عبدالواحد صاحب کے بڑے لڑکے حیدرآباد میں مددگار مہتمم بندوبست تھے انھوں نے وہیں انتقال کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی تین لڑکیاں تھیں۔ ایک مولانا کی حرم محترم جنھوں نے ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔ دو لڑکیاں اب بھی زندہ ہیں منجھلی صاحب زادی مولوی احمد حسین صاحب تحصیلدار اسپشنر کی زوجہ ہیں۔ اور چھوٹی صاحب زادی حافظ بھی ہیں۔ قاری بھی حاجی بھی۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں لاولد ہیں اس لیئے اُنھوں نے اپنا آخرت کا رستہ درست کیا گھر میں لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی ہیں جمعہ کے جمعہ وعظ کہتی ہیں۔ رمضان شریف میں محراب بھی سناتی ہیں۔ +

مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کی حالت اِس کے خلاف تھی۔ اِن کی ایک لڑکی تھی وہ شادی ہوتے ہی جوان مر گئی۔ پھر ایک لڑکا ہوا محمد ادریس وہ باپ کے قدم بقدم تھا۔ افضل العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا نواسہ داماد تھا۔ مگر وہ بیچارہ جوان ہیضہ میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مولوی صاحب کی ایک بیوی حکیم شرف الدین خان صاحب کی بہن زندہ تھیں وہ بھی سال گزشتہ میں گزر گئیں۔ اور اِس طرح مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کا ایک شخص باقی نہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۱۲ +

دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ۔"

تضییع اوقات پر ہمارے مولانا جس قدر بھی ناراض ہوں بجا ہے۔ لیکن لڑکی کا لاٹے لاٹے پھرنا کچھ مولویوں اور مولویوں پر احسان کرنا نہ تھا بلکہ ایک طور سے وہ اپنی ہی خدمت تھی۔ ہیں دبے الفاظ میں کیوں کہوں مجھے صاف صاف کہنا چاہیئے کہ ہمارے مولانا بظاہر تو مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحبزادی کو لاوے لاٹے پھرتے تھے مگر بباطن یہ خدمت اپنی اہلیہ کی خدمت تھی کہ بڑے ہونے کے بعد اسی لڑکی سے ہمارے مولانا کا عقد ہوا +

دہلی کالج میں داخل ہونا

جب زمانۂ تعلیم یوں برباد ہونے لگا تو مولانا نذیر احمد صاحب ایک عجیب حسنِ اتفاق سے دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ پنجابی کٹڑے کے طالب علموں کو جمعے کے جمعے چھٹی بھی دی جاتی تھی اس طرح پر کہ صبح سویرے سعادت خاں کی نہر سے گیلی مٹی لائیں اور اُس سے نمازیوں کے استنجے کے ڈھیلے بنائیں اور صحنِ مسجد میں پھیلا دیں آخر میں ایک رپورٹ مولوی صاحب سے کی جاتی تھی کہ اتنے ڈھیلے بنائے۔ اِس کے صلے میں مولوی صاحب خمیری روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے یا بہت خوش ہوئے تو شیرمالوں اور باقرخانیوں کے سوکھے ٹکڑے انعام میں دیتے تھے ایک جمعے کو ایسا اتفاق ہوا کہ ڈھیلے بنانے سے چھٹی ملی تو ہمارے مولانا نمازِ جمعہ کے لیئے نہیں بلکہ شہر میں خدائی خوار گشت لگانے کے لیئے پنجابی کٹڑے سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکوں کی ٹولیاں وردی کی طرح عمامے باندھے ہوئے چلی جا رہی ہیں دہلی میں ایک کالج تھا جہاں سالانہ امتحان کے بعد انعام تقسیم ہوا کرتا تھا اور اسی جلسہ میں طلبہ کے وظائف گھٹائے بڑھائے جاتے تھے اِس کی شہرت وقتِ تقسیمِ انعام سارے شہر میں ہوئی اور خصوصیت کے ساتھ گروہِ طلبہ میں غرض ہمارے مولانا بھی بطور تماشائی کے ایک ٹولی میں جا ملے وہاں جا کر دیکھا کہ امیروں کی سواریاں کھڑی ہیں کالج کے بڑے ہال میں اساتذہ اور طالب علم جمع ہیں انگریز ہیں شہر کے امرا ہیں۔ ہال کے دروازے پر آدمیوں کا ٹھٹ لگا ہوا ہے ۔ لوگوں کی ٹانگوں میں گھُستے گھُستے مولانا بھی ہال کے دروازے پر تو پہنچے اتنے میں پرنسپل صاحب کسی ضرورت سے ہال کے باہر آئے چپراسیوں نے تماشائیوں کو دھکّے دیئے۔ برامدے میں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ سنگ آمد و سخت آمد کے طور پر لوگوں کے ریلے میں مولانا کا پاؤں پھسلا تو مولانا چاروں شانے چت فرش پر گرے اور کھٹاک سے پتھر پر سر لگا معلوم نہیں خون نکلا یا نہیں مگر گومڑا تو ضرور پڑ گیا تھا۔ چوٹ زیادہ آئی تو مولانا رونے لگے مسٹر کارگل پرنسپل کالج نے سمجھا کہ کوئی کالج کا لڑکا ہے مولانا کو روتا دیکھ کر فوراً ہمدردی کے قدموں سے لپکا اور شفقت کے ہاتھوں سے اُٹھا لیا اور دل جوئی کے طور پر کہا تم اپنی جماعت کے لڑکوں میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتے مولانا نے روتے روتے کہا میں مدرسے کا طالب علم نہیں ہوں پرنسپل نے کہا پھر کیوں آئے ہو۔ مولانا نے کہا سیر دیکھنے کو۔ پرنسپل نے کہا پھر تم کون ہو۔ مولانا نے کہا پنجابی کٹڑے کی مسجد میں رہتا ہوں اور طالبِ علم ہوں۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ جواب دیا شرح ملا۔ اور ابوالفضل۔ پرنسپل کو استعجاب ہوا تو مولانا کو ہال کے اندر لے گیا اور جا کر مفتی صدرالدین خاں صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا اور مفتی صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا کہتا ہے کہ میں شرح ملّا اور ابوالفضل پڑھتا ہوں ذرا اس کا امتحان تو لیجیئے کہ یہ اپنے دعوے میں سچا ہے یا یوں ہی جھوٹ موٹ طفلانہ بات کہتا ہے۔ مفتی صاحب بڑے بدمزاج تھے کسی کو علم و فضل میں اپنا ہم پایہ نہیں جانتے تھے۔ اِس کے اور حکومت کے گھمنڈ میں کہ صدر الصدور تھے نیز علم و فضل اور عمر کے لحاظ سے قابلِ ادب تھے اُن کی بدزبانی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ہر ایک سے تُو کر کے خطاب کرتے اور ہمیشہ آنکھیں میچ کر دیتے مولانا کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا اور تُو تڑاق سے گفتگو شروع کی پوچھا تو کیا پڑھتا ہے۔ مولانا نے جواب میں عرض کیا کہ جناب میں نے آپ کا کیا

قصور کیا ہے۔ اس پر پرنسپل اور جو لوگ مفتی صاحب کے قریب بیٹھے تھے سب ہنس پڑے مفتی صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا
اور سامنے کی ایک الماری میں سے شرح ملا نکالی اور مفعول لہ کی بحث اتفاقی طور پر ان سے سنی روکا ٹوکا کہیں نہیں اور نہ معنی
پوچھے مولانا فرّاٹے سے چند سطریں پڑھ گئے پھر انھوں نے ابوالفضل کے دفتر دوم کی ایک جگہ نکال دی اور کہا کہ اس کو پڑھ
مولانا نے وہ بھی پڑھ سنائی۔ مفتی صاحب تو امتحان لے کر کچھ نہ بولے لیکن پرنسپل نے مولانا کی جسمانی اور دماغی ساخت
پر جو نظر ڈالی تو ذہین پایا اور کہا کہ اب تو ایک مہینے کی چھٹی ہوگی ایک مہینے بعد آنا تو تمھارا نام لکھ لیا جائے گا اور چار روپے
مہینہ تم کو وظیفہ ملے گا۔ مولویوں کے زنان خانے کے کاموں سے چوں کہ ہمارے مولانا ڈرے ہوئے تھے اس لیے پرنسپل سے
پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا کام لیں گے۔ پرنسپل نے کہا پڑھنا۔ اس کے بعد مولانا الٹے پاؤں مسجد میں آئے مولوی علی احمد صاحب بڑے
بھائی حوض پر بیٹھے سر دھو رہے تھے مولانا نے اُن سے کہا کہ بھائی میں تو چار روپے کا نوکر ہو گیا انگریزی مدرسے میں طالب علموں
کی بھرتی ہو رہی ہے چلیے میں آپ کو بھی انگریز سے ملا دوں۔ مولوی علی احمد صاحب نے بحث شروع کی مولانا نے کہا دیر ہو رہی ہے
وہیں چلیے آپ کو معلوم ہو جائے گا ابھی اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے بڑے بھائی کو لے کر بے تکلّف ہال میں گھس گئے اور
پرنسپل سے مولوی علی احمد صاحب کی تقریب کی کہ یہ میرے بڑے بھائی ہیں اور مجھ سے بھی زیادہ پڑھے ہوئے ہیں ان کو بھی نوکر رکھ لیجیے۔
پرنسپل نے مولوی علی احمد صاحب سے تو کچھ پوچھا پاچھا نہیں صرف اتنا کہا کہ تم بھی ایک مہینے بعد آنا۔ یہ ہے ابتدا مولانا کے کالج میں
داخل ہونے کی۔ اس واقعے کی خبر جب پنجابی کٹڑے کے مولویوں کو ہوئی تو اُنھوں نے مولانا کو مسجد سے نکال باہر کیا ہمارے مولانا
مسجد سے چلے آئے اور اُسی محلّے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرایہ پر لی وہاں رہنے سہنے لگے آخر کار جنوری ۱۸۴۵ء میں کالج کھلنے
کے بعد اپنا نام داخل کرا لیا۔ مہینہ ختم ہوتے ہی پہلا وظیفہ چار روپے کا ہاتھ آیا پھر ذہن و ذکا کی سفارش سے یہ وظیفہ وقتاً فوقتاً اتنا
بڑھتا رہا کہ جماعت دوم سے جماعت اول تک چار سے چوبیس تک پہنچ گیا۔ اس طرح خدا خدا کر کے مسجد کی گدایانہ زندگی سے مولانا کو
نجات ملی جہاں افسوس کہ بہتیرے طالب علموں کا یہ حال تھا کہ دو دو وقت روٹی کے ٹکڑے کو ترستے تھے اور کوئی سہارا نہیں دیتا
تھا۔ کچھ دنوں تو مولانا کرایے کی کوٹھڑی میں رہے بعد ازاں مولوی غلام حسین صاحب[1] کے ہاں اُٹھ آئے جو مولوی عبدالقادر
صاحب کے دُور کے رشتہ دار تھے۔ مولوی غلام حسین صاحب اور مولوی سعادت علی صاحب سے ایک دوستانہ
خصوصیت بھی تھی۔ مولانا نذیر احمد صاحب ان کو تین روپے ماہانہ کھانے کا دیتے تھے۔ بعدہ ان کی وساطت سے ہمارے مولانا
کی شادی مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی جس کا حال آیندہ آئے گا۔

[1] مولوی غلام حسین صاحب صرف معمولی نوشت و خواند جانتے تھے مگر کہلاتے تھے مولوی صاحب ہی تعویذ گنڈے میں مشہور تھے علاج معالجہ بھی عطائی طور پر کرتے تھے غرض دعا اور دوا دونوں جاری تھیں آدمی بڑے متقی اور پرہیزگار تھے مولوی عبدالقادر صاحب کی منجھلی لڑکی ان کے لڑکے احمد حسین صاحب سے منسوب تھیں۔ جو اب حیدرآباد کی تحصیلداری سے پنشن لے کر خانہ نشین ہیں۔ مولوی غلام حسین مولوی عبدالقادر صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور سب کو "دولھا میرے" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب کے انتقال کے چند سال بعد انھوں نے بھی رحلت کی پہلے ان کا کارخانہ شال بافی اور زردوزی کا تھا مگر وہ خود کام نہیں کرتے تھے مالک کارخانہ تھے۔ کارخانہ جب بگڑ گیا تو صرف دوا و دم اور جھاڑ پھونک پر گزر تھی اس کے سوا آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ارباب توکل میں سے تھے اور اچھی خاصی گزران کرتے تھے ۱۲

باپ کا انتقال اور مولانا کا تحصیلِ علم کے میدان میں سرپٹ دوڑنا۔

بے پدری ایسی سخت مصیبت ہے کہ بعض صورتوں میں مرجانا اس سے بہتر ثابت ہوا ہے اور خیر ایسی صورتیں کثیر الوقوع نہ بھی ہوں تاہم کم عمری میں باپ کے سایہ کا سر پر سے اُٹھ جانا کہ وہ گھر بھر کا سرپرست ہے ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی جس باغ کا مالی جس کھیت کا کاشتکار جس بچے کا باپ نہ ہو اس کے پھولنے پھلنے پنپنے کی کیا اُمید

غرض باپ کی زندگی میں اگرچہ ہمارے مولانا پڑھنے لکھنے سے کبھی بھاگے نہیں مگر یہ بھی نہیں ہوا کہ شوق و محنت سے پڑھا ہو۔ بظاہر اس کے دو سبب تھے پہلی بات تو یہ ہے کہ باپ پر سب ہی ناز کرتے ہیں اور ناز میں جیسا پڑھنا ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ دوسری بات یہ کہ خداداد ذہانت کی وجہ سے تشفی کے لائق یاد کر لئے اور اپنے ہم چشموں کے برابر رہنے کے لیئے زیادہ محنت کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی صرف پڑھتے وقت کتاب دیکھ لیا کرتے تھے اور ایک دفعہ کے دیکھنے سے اچھی طرح سبق یاد ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی کتاب دیکھتے تھے نہ مطالعہ کرتے تھے امتحان کے چند روز قبل سرسری نظر کتابوں پر ڈال لیتے تھے اور امتحان میں کامیاب ہو جاتے تھے مگر جب باپ کی آنکھیں بند ہوئیں تو مختلف جواب دہیوں کے دروازے کھل گئے۔ اُس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور خیال آیا کہ یہ موقع غفلت کا نہیں ہے اپنی خداداد قابلیت کے حسنِ استعمال سے افلاس کے تیرہ و تار آسمان میں ایک آفتاب روشن کر دینا چاہیئے باپ کے انتقال کے وقت بیٹے نے عمر کے تیرہ مرحلے طے کر کے چودھویں سال میں قدم رکھا۔ وہ وقت بیٹے کے لیئے ایک کوہِ مصیبت تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد جو دکھ درد اُٹھانا پڑا اُس کو بیٹا یوں بیان کرتا ہے:

"دو کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا دو ڈھائی برس کی چھٹائی بڑائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑنا حقیقت میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑنا تھا مگر عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ[1] ؎ اَلَا لَا تَیْاَسَنَّ اِذَا الْبَلِیَّہ ٭ فَلِلرَّحْمٰنِ اَلْطَافٌ خَفِیَّہ[2] ٭ والد کا قبل از وقت انتقال تحصیلِ علم کے لیئے کاری تازیانے کا کام کر گیا۔ والد کو رو پیٹ کر واپس آیا تو یہ خیال کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے ڈوبی اور نوٹ ڈوبی کا فیصلہ ہے۔ اِمَّا ھٰذَا اَوْ اِمَّا ذَا کا چناں چہ تحصیلِ علم کے میدان میں یا تو قدم بہ قدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے"

فی الواقع مولوی سعادت علی صاحب کے انتقال کے بعد مولانا نذیر احمد صاحب نے علم کے خمیر سے محنت کی پاؤ روٹی پر توجہ کا مکھن لگا کر کتابوں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ کالج میں علم ادب علم معانی علم فرائض اور ریاضی کی تکمیل کی۔ دیوانِ متنبی۔ قصائد سبعہ معلقہ تاریخ یمینی مقاماتِ حریری اور دیوان حماسہ وغیرہ وغیرہ یہ کتابیں دہلی کالج میں بطور نصاب اسی طرح داخل تھیں جس طرح کہ اب بھی مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں جاری ہیں۔ پوری کتاب کوئی بھی نہیں اور پھر برائے نام سب کتابیں موجود۔ علم ادب اور ریاضی کا زیادہ خیال باقی یوں ہی برائے بیت اور مقدارِ سبق بہت کم۔ یہی حال دہلی کالج کی تعلیم کا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "ایک ہی گاڑی میں بیل گدھے گھوڑے خچر سب ہی جتے ہوئے تھے۔ تاہم بجائے خود مدرسے کی پڑھائی کا ایک انبار تھا"

---

[1] عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو ۱۲

[2] اے مصیبت مند ہرگز نااُمید نہ ہو کیوں کہ خدائے رحمٰن کے پاس مخفی عنایتیں ہیں ۱۲

ہمارے ہاں کی پرانی تعلیم میں ایک طریقہ نہایت خطرناک ہے۔ اگرچہ وہ عام نہیں مگر یہ بھی نہیں کہ صرف خواص سے متعلق ہو یعنی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ہاتھ میں کتاب لیے رہنا طالب علم کی بڑی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ طالب علم جب تک بچے ہوتے ہیں تو ماں باپ ہزار اُن کو باندھ کر بٹھائیں مگر وہ کھیل کود سے باز نہیں آتے اور اس طرح وہ اپنی تندرستی کو صحت کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کو جب دیکھو چونچال اور بحال نظر آئیں گے۔ خیر ان کا ذکر نہیں۔ ذکر ہے اُن طالب علموں کا جن پر کسی کا دباؤ نہیں ہوتا اُن کو از خود شوق ہو جاتا ہے تعلیم کا۔ مگر کس طرح کہ سونا حرام۔ کھانا پینا حرام۔ کھیلنا کودنا حرام۔ دوستوں سے ملنا حرام ہوا خوری حرام۔ غرض کتاب اور مطالعۂ کتاب کے سوا کل کام طالب علم کو اپنے اوپر انہی چیزوں کے حرام کرنے کی اکثر یہ سزا ملتی ہے کہ دماغ مختل ہو جاتا ہے آدمیوں سے اس کو وحشت ہو جاتی ہے گویا وہ اس کا ہم جنس ہی نہیں اگر بخت و اتفاق سے وہ مختل الحواس نہیں بھی ہوتا ہے تو نحافت اور کم زوری کی سزا اُس کو ایسی ملتی ہے کہ عمر بھر پنپنے نہیں پاتا۔ وہ دائم المرض ہو کر زندگی کے دن پورے کرتا ہے ضعفِ جگر سے عاجز کمزوری دماغ کا شاکی جب دیکھو آنکھوں پر عینک یا سرے سے اندھا صراق سے وق ضیق النفس سے تنگ غرض وہ ایک معجونِ امراض ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے مولٰنا بھی شروع شروع اس عام غلطی کے مرض میں مبتلا تھے اور اُنھوں نے بھی دن بھر کتاب رٹتے رہنے کو شرطِ طالب علمی قرار دے رکھا تھا۔ اول تو نصاب مدرسہ ہی کا انبار کیا کم تھا کہ جناب مولٰنا نے خارج از اوقات مدرسہ بعض اساتذۂ وقت سے دو سبق اور شروع کر دیے تاکہ جماعت کی پیروی میں وقت کا نقصان نہ ہو اور یوں دوہری محنت کے ساتھ اُن کی استعداد دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی غرض اُن دنوں کا پڑھنا۔ پڑھنا نہ تھا بلکہ کتابوں کا پھانکنا تھا۔ اس قسم کی تعلیم کے بارے میں مولٰنا نے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "دن کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانِ طالب علمی میں میں کسی ایک رات نیند بھر کر سویا ہوں میں اسکالرشپ ہوتے ہی پیچھے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیے جگا دے میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا تاکہ سو نہ جاؤں مجھ کو کئی قسم کے عطسے[1] اور نسخے معلوم تھے اور اگر میں سمجھتا کہ اس طرح کی طالب العلمی علی گڑھ کے طالب العلموں کے حق میں مفید ہو گی تو یقین جانو میں اُن ٹٹکوں کے بتا دینے میں دریغ نہ کرتا غرض مجھ کو کئی قسم کے عطسے اور نسخے معلوم تھے اور اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً اُسی "آل ورک اینڈ نو پلے"[2] کا یہ نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی آئی ایک زمانے میں شطرنج کھیلا کرتا تھا تو ہمیشہ مائیں کھاتا تھا اور جرو دینے کو بڑی جیت سمجھتا۔ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں یہ غلط خیال ایسا جما ہوا ہے کہ اگر کھیل کو کمپلسری (جبری) نہ کیا جائے تو یہ خالی بیٹھے رہیں اور دوڑ دھوپ کے نام گھر سے پاؤں نہ نکالیں ایسے قدر ناشناسوں سے توقع رکھنی فضول ہے"

مولٰنا نذیر احمد صاحب باپ کے انتقال کے بعد زمانۂ طالب علمی میں مطالعۂ کتب کو جس قدر ضروری چیز سمجھتے تھے اتنا اور کسی چیز کو نہیں اگلے سبق کو اپنی زورِ طبیعت سے آپ نکالتے تھے۔ گھنٹوں کتاب پر سر جھکائے جھکائے اُن کی گردن شل ہو جاتی تھی اور مطالعۂ کتاب کے بعد طبیعت اس قدر خستہ ہو جاتی تھی کہ گویا بڑی بھاری منزل طے کر کے آئے ہیں باوجود اس محنت شاقہ کے اگر کبھی امتحان میں ناکام رہتے تھے تو مولٰنا کو مدتوں ملال رہتا تھا کیوں کہ مولٰنا کا دعویٰ تھا اور بالکل بجا دعویٰ تھا کہ نحن رجال[3] و ھم رجال؟ سبب کیا کہ کوئی اُن سے اچھا ہو۔ غرض مولٰنا اس قسم کی محنت تو کرتے ہی تھے ماسوا اس کے چند طریقے تحصیلِ علم کے ایسے بھی معلوم

[1] وہ دوائیں جن سے چھینک آتی ہے ۱۲ [2] کام ہی کام اور کھیل نہیں ۱۲ [3] ہم بھی آدمی وہ بھی آدمی ۱۲

تھے جو بہت زیادہ مفید اور بکار آمد ہیں مثلاً اگر کوئی قاعدہ یا محاورہ یا کوئی مضمون قابلِ یادداشت آیا ایک نشان خاص حاشیہ کتاب پر کر دیا یا بطور یادداشت ایک کتاب میں لکھ لیا اور اوقاتِ فرصت میں غور کرتے رہے اس میں تو کچھ شک نہیں کہ محنت تو بڑی تھی مگر ویسے ہی اُس کے فائدے بھی ملے مطالعۂ کتب کی بدولت پڑھا ہوا اس طرح ذہن نشین ہو گیا جیسے نقش کالحجر کہ برسوں کے بعد آج اگر خیال کرتے ہیں تو کتاب سامنے کھلی نظر آتی ہے وجہ یہ ہے کہ عربی وہ اس تحقیق سے پڑھتے تھے کہ ہر لفظ کا مادّہ اور ماخذ اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ساری جماعت میں اول یا کم بعض اوقات اُستادؐ[1] پر برتری کرتے بھرتے تھے اس طریقے سے جناب مولنا مشکل سے مشکل سبق فوراً یاد کر لیا کرتے تھے۔ پایداری محنت کی خاص صفت مولنا میں بہت زیادہ تھی اور یہی وہ صفت ہے جس نے اُن کے ہر قسم کے عروج میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بہر حال اس قدر محنت کے بعد اُن کو ایک تمغہ ملا تھا جس کی نسبت مدرسۂ طبیہ دہلی کے پہلے سالانہ جلسے میں ارشاد فرمایا تھا "عمر کے ساری عمر کی تحصیل میں ایک تمغہ نصیب ہوا وہ بھی کورس کی کتاب پر نہیں بلکہ جوابِ مضمون پر۔ تمغہ غدر میں لٹ گیا اُس کا ملنا یاد ہے مضمون فراموش۔ شاید شمس العلماء[2] خان بہادر مولوی ذکاءاللہ کو یاد ہو گا۔ اول تو ان کا حافظہ ماشاءاللہ قوی ہے دوسرے ہم جماعت ہونے سے طالب العلموں میں ایک طرح کا محاسدہ قائم ہو جاتا ہے اور وہ محاسدہ محمود ہے جو شوق کو مشتعل اور مشقت کو ہلکا کرتا ہے تمغہ ملتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے مجھ کو ضرور بُری طرح گھورا ہو گا اور اب بھی باوجودیکہ صاحب ڈپٹی[3] کمشنر بہادر موجود ہیں بُری طرح گھور رہے ہیں۔"

تاریخ اور ریاضی سے نفرت یہ ایک کلیہ سا ہے کہ جن دماغوں میں ادب کی صلاحیت ہے وہ ریاضی سے یقیناً بھاگتے ہیں ہمارے مولنا کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ مولنا ریاضی سے نفرت کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ "اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً اُسی "آل ورک اینڈ نو پلے" کا یہ نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلا کرتا تھا تو ہمیشہ بازیں کھاتا تھا اور زبردینے کو بڑی جیت سمجھتا تھا۔" لیکن ہمارے خیال میں یہ کوئی وجہ معقول نہیں ہے بلکہ حقیقتہً مولنا کا دماغ ریاضی کے لیے موضوع ہی نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم حافظے کی یہ حالت تھی کہ اُقلیدس کو کبھی سبق کے طور پر نہیں پڑھا اور نہ یاد کیا۔ اُستاد کے بیان کو صرف سُن لیتے اور بورڈ کو دیکھ لینے سے پوری شکل مستحفظ۔ انگریزی طریقۂ تعلیم مروجہ ہندوستان کے جتنے نقص بیان کیے جاتے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ متعلّم کے رجحان طبیعت کی ذرا پروا نہیں کی جاتی تین تین چار چار درجن مختلف المذاق لڑکوں کی جماعت بنالی اور سب کو ایک لاٹھی ہانک چلے اور پڑھائی اتنی کہ غذائے نامرغوب کی طرح اوپر تلے ٹھونسی جاتی ہے اور وہ ہضم نہیں ہوتی جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ جس کو اصلی استعداد کہتے ہیں وہ کسی فن میں بھی حاصل نہیں ہوتی ؎

نہ محقق بود نہ دانشمند ۔۔۔ چار پائے برو کتابے چند

---

[1] ان سے مراد مولوی سید محمد صاحب ہیں جو دہلی کالج میں عربی کے مدرس دوم تھے اور مولوی مملوک العلی صاحب کے انتقال کے بعد یہی اُن کی جگہ مدرسِ اوّل ہو گئے تھے ان کی استعداد بہت زبردست تھی۔ لہذا شاگردوں سے دبتے تھے ۱۲

[2] شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب مولنا کے خاص دوستوں میں ہیں۔ اور اس طور کے دوستوں میں ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے "دراّیام جوانی چناں کہ افتد دانی" ۱۲

[3] ڈپٹی کمشنر دہلی سالانہ جلسہ مدرسہ طبیہ دہلی کے صدر انجمن تھے ۱۲

ہاں تو ہمارے مولانا کا رجحان طبیعت ریاضی کی طرف نہ تھا اور نہ صرف ریاضی کی طرف بلکہ تاریخ کی طرف بھی التفات نہ تھا ان کو اِن دونوں علموں سے نفرت اور وحشت سی ہوتی تھی اور اب بھی ہے چناں چہ فرماتے ہیں۔

"میں نے تو کسی طالب العلم کو جغرافیئے اور تاریخ کا شائق نہ پایا جس کو دیکھا روتے جھینکتے ہی دیکھا۔ اور میں دوسروں پر کیا الزام دوں جغرافیئے اور تاریخ کے نام سے خود مجھ کو نفرت ہے" دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"مجھ کو جو ساری عمر سائنس سے گریز رہا اس کے دو سبب ہوئے اول یہ کہ سائنس کے بعض مضامین اُقلیدس جبر و مقابلہ و امثالہا بہت سوچ بچار چاہتے ہیں اسی کا ہو رہے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکے اور انبار تعلیم کے ہوتے کسی ایک کا کیسے ہو رہے پس بہت طالبِ علم اپنی پسند کی ایک چیز لے لیتے ہیں اُسی پر زیادہ توجہ کرتے اور اُسی میں اچھے بھی رہتے ہیں میں نے عربی ادب لیا تھا اور سائنس کو بے وضو ٹرخاتا تھا۔ دوسرا سبب سائنس کی طرف سے بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ انسان کی طبیعت واقع ہوئی ہے کنسرویٹو اور میری طبیعت میں اس کا عنصر زیادہ ہے۔ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا سائنس میں توغل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا۔"

فی الواقع مولانا اقلیدس کے ابتدائی مقالوں کے نئے دعووں اور جبر و مقابلے کی مشکل مساواتوں کو آسانی حل نہیں کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے سائنس مولانا کے لیئے غایلے نامرغوب تھی یا دوسری وجہ یہ بھی ہو کہ اُن کے مذہبی خیالات پر سائنس بے جا حملے کرتا تھا اس وجہ سے اُن کی طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا غالبًا اسی وجہ سے اُنھوں نے بیچارے سائنس کو "موذی" کا خطاب دے رکھا تھا مگر تھا کیا کہ ریاضی وظیفہ دلواتی تھی اس لیئے بقدرِ استحفاظ وظیفہ بادلِ ناخواستہ ان مضامین پر بھی محنت کرتے تھے مگر نہ ایسی کہ جیسی دینیات

نامہربان اُستاد کے پھندے سے بچنا

مولوی سعادت علی صاحب نے جب مولانا کو ریاضی میں بہت کمزور پایا تو اُن کو اس کی بہت فکر ہوئی آخر بیٹے سے ارشاد فرمایا کہ چلو تم کو مولوی قادر علی صاحب[1] کے پاس لے چلوں وہ تم کو اقلیدس وغیرہ بتا دیا کریں گے۔ دہلی کالج میں مولانا کے وطنِ اصلی ضلع بجنور کے بھی بہت سے طالب علم تھے اُن میں سے یہ مولوی قادر علی صاحب بھی تھے یہ منڈاور کے رہنے والے تھے جو بجنور سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہے۔ مگر جن

---

[1] بطور جملہ معترضہ یہ بات بھی اس کے ضمن میں لکھنے کے قابل ہے کہ یہ مولوی قادر علی صاحب رفتہ رفتہ چار صدی ڈپٹی کلکٹری تک پہنچے تھے اور اُن کے منڈاور میں مولانا کی خالہ منشی شہامت علی صاحب کے بھائی کو بیاہی تھیں۔ غرض خاندانی وقعت کے اعتبار سے مولانا کسی طرح مولوی قادر علی صاحب سے ہیٹے نہ تھے۔ اب سُنیئے ایک عجیب اتفاق کہ مولوی قادر علی صاحب تو ڈپٹی کلکٹر تھے اور ہمارے مولانا حیدرآباد میں صدر تعلقہ دار یعنی صوبہ دار۔ ان دونوں مولوی قادر علی صاحب میرٹھ میں چار سو کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولانا حیدرآباد میں سترہ سو کے صوبہ دار۔ مولانا رخصت لے کر حیدرآباد سے دہلی تشریف لائے۔ رخصت ختم ہونے کو تھی کہ سر سالار جنگ وزیر حیدرآباد کا تار پہنچا کہ مسٹر محمود چیف جسٹس سے لڑے ہوئے علی گڑھ میں وکالت کر رہے ہیں اور ہم نے اُن کو ریاست حیدرآباد میں قانونِ مال گزاری بنانے کا حکم دیا ہے تم اُن سے ملتے ہوئے آنا وہ تم سے مصطلحاتِ ریاست دریافت کریں گے اور کچھ حالات پوچھیں گے

چنانچہ مولانا علی گڑھ گئے اور سر سید کے پاس ٹھیرے۔ سر سید نے اپنے کمرے کے پہلو میں مولانا کو ایک کمرہ بتا دیا مولانا اُس میں فروکش ہوئے۔ تیسرے یا چوتھے دن سر سید نے بے وقت مولانا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا نے دروازہ کھولا تو سر سید نے اندر آ کر مولوی قادر علی صاحب کا تار دیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ مولوی نذیر احمد صاحب آپ کے ہاں کب تک ٹھیریں گے میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ تار کے پڑھتے ہی مولانا کو ہنسی آ گئی سر سید نے سبب پوچھا مولانا نے طالب علمی کے وقت کا قصہ بیان کر دیا اور کہا کہ شاید مولوی قادر علی صاحب وہ وقت بھول گئے ورنہ شاید ایسا نہ کرتے ۱۲ منہ

وقتوں کا یہ مذکور ہے کہ وہ سشن جج کے محکمے میں اظہار نویس ہو گئے تھے مگر اجمیری دروازے کے مدرسے میں اپنے انھیں حجروں
میں رہتے تھے جن میں انھوں نے طالب علمی کی تھی۔ غرض مولوی سعادت علی صاحب ہمارے مولانا کو مولوی قادر علی صاحب کے
پاس لے گئے۔ مولوی قادر علی صاحب نے کہا کہ مجکو بہت کم فرصت ہوتی ہے اور میں کوئی وقت مقرر نہیں کرسکتا۔ ہاں اس لڑکے
کو میرے پاس چھوڑ دو میرے پاس رہا کرے مجکو جس وقت فرصت ہوگی میں اس کو بتا دیا کروں گا۔ اصل میں مولوی قادر علی صاحب
کو ایک خدمت گار کی حیثیت جو تھی انھوں نے چاہا کہ مولانا انھیں کے ہاں رہیں اور انھیں کے سر کھائیں اور اُن کی چلمیں بھرا
کریں۔ مولانا کے والد یہ سن کر بہت افسردہ ہوئے اور مولانا کو لے کر چلے آئے۔

غرض یہی عربی ادب تھا جو مولانا کو کالج میں ٹھیرائے ہوئے تھا ورنہ بقول مولانا "اسکالر شپ کے لئے تاریخ و ریاضی کو چار و ناچار دیکھنا
ہی پڑتا تھا ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ لیکن وہ دیکھنا پالے کا سا چھونا تھا اگرچہ بڑی جیت تھی کہ نمبروں کے مجموعے پر پاس اور فیل
کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ خدا عربی کا بھلا کرے کہ وہ ریاضی وغیرہ کی تلافی کرتی رہتی تھی اور نہ ہوتا تو میں کسی طرح جماعت میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

مزاحاً انکساری | مزاح المومنین کا مذاق مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور یہ انسان میں ایک ایسی عمدہ صفت ہے جس کی
تعریف میں بڑے بڑے صوفی رطب اللسان ہیں۔ بہرحال مناسب مقام مولانا کے چند مزاح درج کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "انگریزی پڑھنے سے ایک گر تو معلوم ہوا کہ آدمی ایک زبان کو سلیقے سے حاصل کرلے تو دوسری زبان کے سیکھنے میں
اس کو بڑی سہولت ہوتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ لنگواسٹ (زباں داں) ہونا کچھ بات نہیں مجکو انگریزی کی گرامر کی ٹکنکلٹیز (مصطلحات)
تک معلوم نہیں۔ مگر میں نے عربی کسی زمانے میں اچھی طرح پڑھی تھی اب تو ایسا ذہول ہوگیا ہے کہ مولوی شبلی ایک صیغہ
پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں مگر زمانِ طالب العلمی میں ایک ایک لغت اور ایک ایک محاورے کے لئے کئی کئی سندیں
زبان کی نوک پر تھیں ؎ اگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہ ہوگئے خاک انتہا ہے یہ

یا مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے "جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے عربی حاصل کی تھی اُن میں ایک کم سواد کٹھ ملّا میں بھی ہوں
یا مثلاً:- یہاں ساری عمر عربی "دی اونلی لینگویج" رہی۔ اور آئی تو اتنی ہی آئی کہ یوں تو تنہائی میں شاید صفحے کے صفحے
اپنے دل میں گھڑتا چلا جاؤں مگر جیا ناگسی عرب سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو پہلے ہی جملے میں سٹی بھول جاتی
ہے دو سطری خط قلم برداشتہ نہیں لکھ سکتا۔

یہ سب مولانا کا مذاق یا انکسار ہے ورنہ ہمارے نزدیک تو اُن کا ہمتا نہیں۔ بہرکیف مولانا عربی علم ادب میں اس وقت وہ پایہ
رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں چند کے سوا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا اور جو مقابلہ کرسکتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ہم پلہ ہوں گے
عربی علم ادب سے چوں کہ مولانا کو فطری تعلق ہے اسی وجہ سے وہ ہمیشہ عربی کی زیادہ حمایت کرتے رہے اُن کی کوئی سی بھی
کتاب یا لکچر یا کوئی خط اُٹھا کر دیکھئے تو اُس میں قرآن مجید کی آیتیں۔ احادیث کی عبارتیں اور عربی کتابوں کے اشعار یا فقرے
ضرور نظر آئیں گے۔ بعض لوگ مولانا کی اس طرز پر معترض بھی ہوئے مگر انھوں نے اس کا یہی جواب دیا۔

"ابھی دو منٹ لکچر دیتے ہوئے نہیں گزرے کہ میں لگا عربی بگھارنے۔ یہ وقت مجکو ہر جگہ اور ہمیشہ پیش آتی ہے۔ کیا کیا جائے
کہیں ٹوٹی پھوٹی عربی تو اپنی ساری عمر کا سرمایہ ٹھیری اور لکچر دینے پڑتے ہیں اسلام پر مسلمانوں کی تعلیم پر مسلمانوں کی

انجمنوں پر تو چار و ناچار قرآن و حدیث سے استشہاد کرنا ہوتا ہی اتنا وقت نہیں ملتا کہ پہلے عربی پڑھوں پھر اُس کا ترجمہ کروں۔ اِس پر مجھ کو اسد اللہ خاں غالب یاد آئے کہ وہ بڑے مشکل گو شاعر تھے وہ ابتدا میں فارسی کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پارسی اور پارسی بھی نا آمیختہ بتازی۔ اس پر انوکھے استعارات اچھوتی تشبیہات۔ لفظی تعقیدات۔ تو اُن کا کلام مشکل ہوا ہی چاہے۔ کوئی شخص کہتا تھا کہ ایک مرتبہ اُن ہی کے شعر کے اُن سے معنی پوچھے تو کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا "بھئی اِس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا تھا"۔ اُن کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا اور ریختہ گوئی کو مبتذل اور دوں مرتبہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک ریختہ گو معاصر کی طرف اشارہ کرکے ایک قصیدے میں تعریضاً فرماتے ہیں ع انچہ فخر تست در گفتار آں ننگ من است ٭ لیکن انگریزی عمل داری کی وجہ سے جو انقلاب عظیم واقع ہونے والا تھا اُس کی صبح نمودار ہو چکی تھی اور زمانہ کہہ رہا تھا کہ مرزا صاحب اِس بساط کو تہ کیجیے کہ زبان فارسی نہ تو ہندوستان کی ملکی زبان ہے نہ اس میں علوم ہیں کیوں آپ اس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگلے لوگ کچھ مستقل مزاج بھی زیادہ ہوتے تھے مرزا صاحب زیادہ مدتوں تک اسی فارسی کو پکڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی ضد کیا چلے خاص کر شاعری تو پیٹ بھرے کے مشغلے ہیں۔ اُس وقت جیسا کچھ شاہی دربار تھا وہاں ریختہ ہی کی قدر تھی ناچار مرزا صاحب نے بھی بادلِ ناخواستہ ریختہ کا مونہہ چڑانا شروع کیا۔ میں صرف نمونے کے طور پر اُن کے اُس وقت کے چند شعر پڑھتا ہوں۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے ٭ دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ٭ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام ٭ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

ایک اور تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں قصداً اتفاقی بندشوں کو چھانٹ کر لایا ہوں۔

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا ٭ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا ٭ ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی ٭ میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مرزا صاحب کی شاعری اس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیوں کر اپنی جنتری میں سے لوگوں کو نکالتا ہے وہ مرزا جو ریختہ گوئی کو ننگ سمجھتے تھے آخر آخر اپنی اُردوئے معلّٰی پر فخر کیا کرتے تھے۔ مرزا کے مونھ سے اُردو کے ساتھ معلّٰی کا لفظ فاعتبروا یا اولی الابصار

خیر تو جن دنوں اُن کی مشق زوروں پر تھی اُس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ٭ سن سن کے اسے سخنورانِ کامل ٭ آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ٭ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل ٭

قریب قریب ایسا ہی حال میرا ہے۔ کچھ دوں گا تو عربی ضرور ہوگی۔ سمجھو یا نہ سمجھو۔ مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ کبھی عربی پڑھو تو وہ الٹا چڑھاتے ہیں۔ کیوں جی آج کسی ادنیٰ درجے کے حاکم کا سمن آتا ہے یا کوئی ادنیٰ درجے کا حاکم کسی کے مقدمے میں فیصلہ صادر کرتا ہے تو کوئی تم میں ایسا بے پروا ہے کہ پڑھنا جانتا ہو اور اس کو نہ پڑھے یا پڑھنا نہ جانتا ہو اور اُس کو پڑھوا کر نہ سنے اور سمن اور فیصلے کو بھی جو طے میں ڈالو کبھی تار آجاتا ہے تو اُس کے پڑھنے اور پڑھوانے تک گھر کے سارے کام بند ہو جاتے ہیں۔ ایک پیسے کے کارڈ کی بھی کچھ حقیقت ہے بے پڑھے نہیں رہا جاتا۔ لیکن قرآن احکم الحاکمین کا فرمان تیرہ سو برس کا آیا ہوا رکھا ہے۔ اب اپنی اپنی جگہ سمجھو کس کس نے پڑھا اور کس کس نے پڑھوا کر سنا اور اس پر اسلام کے لمبے چوڑے

دعوے اور بڑے جوش و خروش اور اگر کبھی کسی مسلمان بھائی کا دل جلے ع دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ؟
اور وہ تم کو سختی سے عربی کے پڑھنے کو کہے تو تم اُس کا مونھ کھسوٹنے کو موجود ہو جاؤ۔ اگر عربی کی طرف سے یہی غفلت
رہی تو اَلْحَمْدُ و اَلْحَمْدُ پر لڑا کریں گے اور کوئی اتنا کہنے والا نہ ہوگا کہ صحیح لفظ اَلْحَمْدُ ہے تم بوڑھے طوطے کیا پڑھ سکتے
ہو لیکن اپنی نسلوں کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ اچھا بھائیو! جو تمھاری سمجھ میں آئے سو کرو اپنا کام تو کہہ دینا ہے
وہ بھی اس سبب سے کہ بُلا بُلا کر کہلواتے ہو۔"

بہر حال اگرچہ مولانا کے دماغ کو ریاضی سے قطعی طور پر مغایرت تھی اور اُن کی طبیعت علم ریاضی کو شوق سے قبول نہیں کرتی
تھی اور وہ کڑوی دوا کی طرح دفع مرض کے لئے اِس کو پیا کرتے تھے تاہم وہ ریاضی میں کسی سے ہیٹے بھی نہ تھے بلکہ ہم
نے سنا ہے کہ مولانا کو اقلیدس کی متعدد شکلیں مع دعوے و ثبوت کے اب تک نوک زبان ہیں حساب۔ جبر و مقابلہ علم مثلث
پیمایش ان سب فنوں میں مولانا کو دست گاہ کامل ہے اور ہم نے حیدر آباد کے دوران قیام میں بھی بعض اپنے دوستوں سے سنا ہے کہ مولانا
عہدہ داران بندوبست کو پیمایش تختہ مسطح اور دوربین کا کام رقبہ نکالنا۔ پلاٹ بنانا۔ برت بندی کے کل مسائل اس طرح بتاتے تھے کہ کوئی
بڑے سے بڑا ماہر اِس سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔ دہلی میں مولوی عبدالحامد صاحب خان بہادر آنریری مجسٹریٹ ہم سے ناقل تھے کہ "میں ایک ما تے
میں پیمایش کے کام سے بالکل ناواقف بلکہ متنفر تھا لیکن مولانا نے ایک ہفتے میں پیمایش کا کام نہایت آسانی سے مجھے سکھا دیا اور
مجھے عمر بھر پھر کسی سے اُس کے سیکھنے کی ضرورت نہ پڑی۔"

بہر کیف اس نامناسبتی پر بھی مولانا کے قوت حافظہ کے کرشمے ملاحظہ فرمایئے کہ اِس سن و سال میں بھی کالج کے پڑھے ہوئے سائنس
کے مسئلے اب تک نوک زبان ہیں مولانا کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے سائنس کے مسئلے تمثیلاً اور تاریخ کے واقعات
مثالاً بیان نہ فرمائے ہوں، مثلاً فرماتے ہیں "مکینک (علم جر ثقیل) کا یہ مسئلہ بچپن کا پڑھا ہوا ابھی تک میرے خیال میں ہے کہ جب
برابر کے دو محرک مقابل کے سمتوں سے ایک جسم کو ملانا چاہیں تو دونوں کا اثر ضائع۔ یہ قاعدہ کچھ اِس طرح کا عام ہے کہ فزکس (جسمانیات)
منٹل (ذہنیات) مارل (اخلاق) پولٹیکل (نظم ممالک سیاست مدن) وغیرہ سب ہی جگہ چلتا ہے۔ بنا بر علی ذلک عرب کی ساری بہادری
اور تمام فوجی قوت اکارت تھی۔ جو چاہے اِس کو بخت و اتفاق سمجھے مگر ہم تو ایسی سرزمین اور ایسی سوسائٹی میں پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ
وسلم کے پیدا ہونے کو اٰیَۃٌ مِّنْ اٰیاتِ اللہ اور معجزہ اور خرق عادت ہی مانتے ہیں۔

یا مثلاً دوسری جگہ فرماتے ہیں "اگر کسی مدرسے کا ایک احمق لڑکا ایسی بدیہی بات نہ سمجھے کہ مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے
سے بڑا ہوتا ہے لیکن جب پوچھا جائے تو ماسٹر کے ڈر سے کہہ دیا کرے کہ ہاں ہوتا ہے اس صورت میں ماسٹر قصوروار ہے کہ اُس نے
لڑکوں پر اپنی ہیبت ناجائز حد تک بٹھا رکھی ہے یا لڑکا قصوروار ہے کہ ڈرپوک اور دل کا بودا ہے کہ نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ ہاں سمجھ گیا۔
لیکن اصل مسئلہ کو مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے ہر حالت میں صحیح ہے بعینہ یہی حال ہے اسلام کا کسی نے اِس
کو طوعاً تسلیم کیا تو۔ اور کرہاً تسلیم کیا تو۔ وہ فی حد ذاتہ مذہب صحیح تھا اور ہے اور رہے گا۔"

یا مثلاً "بے شک ہم میں بھی کوئی کوئی بڑے مال دار ہیں۔ کوئی کوئی بڑی سے بڑی خدمت رکھتے ہیں۔ کوئی کوئی صاحب خطاب
ہیں لیکن قوم! یہ کوئی کوئی ہیں کتنے فی صدی بتاؤ تو آسانی سے سب کی سمجھ میں آئے سو میں ایک نہیں آدھا۔ آدھا نہیں

تہائی نہیں چوتھائی۔ نہیں ایک پانچواں حصہ۔ غرض تم اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی کسر بولتے جاؤ اور میں برابر نہیں کرتا رہوں۔ یہاں تک کہ تم کسور اعشاریہ پر اُتر پڑو اور میں اُن میں بھی ایک بڑا لمبا کھنکھیر راچلتا ہوا دیکھ کر کہوں کہ شاید"

یا مثلاً فرماتے ہیں "اگر ایک پتھر اوپر کی طرف کو پھینکا جائے تو وہ پھینکنے والے کی قوت سے ایک حد تک اونچا جائے گا۔ مگر اُس کا اونچا جانا ہی اُس کے گرنے کی دلیل ہے؎ یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے/ زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے۔ اونچا چڑھنے میں پتھر کی رفتار ابتدائی تیز ہوتی پھر بتدریج دھیمی اور مدھم ہوتے ہوتے آخر کار فنا ہو جاتی ہے۔ ای کاش رفتارِ صعودی کے فنا ہوئے پیچھے پتھر کو سکون اور وقوف ہو لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اور ہو نہیں سکتا۔ ریٹری بیوشن یعنی مکافات کے قاعدے سے ضرور ہے کہ پتھر جیسا اونچا چڑھتا تھا ویسا ہی نیچے کو گرے۔ صعود و ہبوط حرکتیں دونوں ہیں فرق اگر ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ حرکتِ صعودی کی ابتدا فاسٹ (تیز) ہوتی ہے اور انتہا سلو (آہستہ) اور حرکتِ ہبوطی کی بالعکس یعنی ابتدا بطی اور انتہا سریع مجھے یاد نہیں۔ مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ حرکت صعودی جس نسبت سے سست اور حرکت ہبوطی جس نسبت سے تیز ہوتی جاتی ہے ہندسہ دانوں نے تحقیق کر کے اعداد میں اُس ٹھیک اندازہ ٹھیرا دیا ہے جس کو شوق ہو اور وہ اس وقت کے مسلمانوں کو نہ ہوا ہے نہ ہوتا ہم جس کو شوق ہو ہمارے شمس العلما رخان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب سے معلوم کر سکتا ہے پتھر کے ہبوط اور صعود پر ہم قومی ترقی اور تنزل کو قیاس کر سکتے ہیں اور اسی غرض سے میں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ورنہ میں کہاں اور کہاں ریاضی کا مسئلہ +

الغرض مولانا کی طالب علمی کے زمانے میں تو بی اے اور ایم اے کے بکھیڑے تھے نہیں ورنہ یہ ڈگریاں بھی علیٰ وجہ الکمال پاس کر لینا اُن کی خداداد قابلیت کے آگے کچھ بات نہ تھی اگرچہ مولانا کی طبیعت کو بمقابلۂ لٹریچر، تاریخ و جغرافیہ، ریاضی سے مناسبت کم تھی تاہم مولانا اس قدر بیگانہ بھی نہ تھے کہ بقدرِ ضرورت اُس کے پاس کرنے میں پس پا رہتے اُن کی طبیعت میں اس قدر استقلال اور توجہ ہے کہ جدھر متوجہ ہوں اُس کام کو پورا کر کے چھوڑیں رغبت اور شوق سے بحث نہیں۔ صرف امتحان ہی کے لالچ کیا کم تھے جو اُن کی طبیعت کو ہر وقت ان علوم کے سیکھنے پر آمادہ کرتے رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مولانا نے بحرِ امتحان میں غوطے لگائے تو پاس کے موتیوں سے اپنا دامن بھر لائے ہیں اور فیل کے بھنور میں نہیں پھنسے مولانا کی ہمت طبع کچھ جوانی ہی کے عالم میں نہ تھی بلکہ جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے اُس وقت بھی اُن کی ہمت اور استقلال کی یہی حالت تھی چنانچہ ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

"گرامر تمہاری بہت خام ہے چاہے مدرسے میں تاکید ہو یا نہ ہو اس کو درست کرو ورنہ بے گرامر زبان کا آنا معلوم اپنے تئیں میرے اوپر قیاس مت کرو۔ برخوردار من میں نے اتنا بھی بے مدد اُستاد کیا تو بہت کیا اور سو بات کی ایک بات تو حاجت ہی تو مجھکو اب کیا ضرورت ہے کہ اپنا سر خالی کروں لیکن اگر آج کوئی یقین کرا دے کہ بی اے کا درجہ حاصل کرنے سے میری تنخواہ چھ سو ہو جائے گی تو خیر اب بھی امتحان دینے کو موجود ہوں۔

مولانا کا عقدِ نکاح | قبل اِس کے کہ مولانا دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوں ایک عجیب حسنِ اتفاق سے اُن کے عقد کا سامان ہو گیا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب ہمارے مولانا مولوی عبد الخالق صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور وہاں پڑھنا پڑھانا تو خاک نہیں ہوا تو اُس وقت کی شکایت کا اظہار جا بجا کیا ہے وہ شکایت یہ تھی کہ بجائے پڑھنے لکھنے کے اُن سے مولوی اور مولویوں اپنی خانہ داری کا کام لیا کرتی تھیں منجملہ اور کاموں کے ہماری مولانا مولوی عبد القادر صاحب کی لڑکی کو کندھے پر لادے لادے پھرا

کرتے تھے ہمارے نزدیک ایک طریقے سے تو مولانا کی یہ شکایت بجا ہے کہ تعلیم کا زمانہ مولویوں نے خانگی کاموں اور سودے سلف میں ضائع کیا لیکن لڑکی کو گود میں لادے لادے پھرنا وقت کا ضائع کرنا تھا مولوی عبدالقادر صاحب کی لڑکی کی خدمت کسی غیر کی خدمت نہ تھی۔ بلکہ در پردہ وہ اپنی اہلیہ کی خدمت تھی اور جب اپنی اہلیہ کی خدمت تھی تو شکایت بالکل بے سود۔ یہی لڑکی آگے چل کر ہمارے مولانا کی بیوی بنی اور عجیب حسن اتفاق سے اس لڑکی کے ساتھ عقد ہوا۔

مولانا چوں کہ کم سن بچے تھے مولویوں کے زنان خانے میں آیا جایا کرتے تھے اور اس سبب سے معمولی طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ جانے بوجھے ہوئے تھے۔ ان کی عادات اور اطوار ذہانت اور متانت ایسی نہ تھی کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے خاندان کو خاص طور پر معطوف نہ کراتی۔ مولوی عبدالقادر صاحب کو مولانا کی ذات خاص کی طرف سے تو اطمینان ہی تھا کچھ سوچا سمجھا نہ تھا لڑکے کو ہونہار پایا تو دل ہی دل میں سوچ لیا ہوگا کہ اگر اس لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے اس عقد کا قصہ نہایت دلچسپ ہے اور وہ یوں ہے کہ پنجابی کٹڑے کی مسجد سے نکل کر مولانا نذیر احمد صاحب کچھ مدت تک کرائے کی کوٹھری میں رہے پھر ایک مولوی غلام حسین صاحب تھے مولوی عبدالخالق صاحب اور اُن کے خاندان کے دور کے رشتے دار تعویذ گنڈے علاج معالجے کے علاوہ اُن کا ایک کارخانہ کارچوب کا بھی تھا مسجد کے قریب ہی اُن کا کارخانہ تھا اور گھر بھی اُن کے بیٹے احمد حسین صاحب جو آخر کو ہمارے مولانا کے ہم زلف ہوئے مولانا سے کچھ فارسی بھی پڑھتے تھے مولوی غلام حسین صاحب نے مولانا سے کہا کہ "تم اکیلے مکان میں رہتے ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ہی کے آس پاس رہنا بھی چاہتے ہو اور تم کو کھانے کی بھی تکلیف ہے اس سے بہتر ہے کہ میرے کارخانے میں آ رہو۔ مجھے کھانے کو دام دے دیا کرو تم کو کارخانے میں ہر طرح کا آرام بھی ملے گا اور احمد حسین بھی ہر وقت تمھارے پاس رہے گا اور اُس کا پڑھنا بھی بخوبی ہوگا۔" مولوی غلام حسین صاحب کے کہنے سے ہمارے مولانا کارخانے میں جا کر رہنے لگے تین روپے مہینہ مولوی غلام حسین صاحب کو کھانے کا دیا کرتے تھے۔ مولانا کو پکی پکائی روٹی دونوں وقت مل جایا کرتی تھی۔ احمد حسین صاحب کے پڑھنے کی وجہ سے مولوی صاحب کے گھر والے ہمارے مولانا کو آسودہ بھی رکھنا چاہتے تھے مگر وہ خود غریب تھے اپنی غریبی کی حد کے اندر اندر پھر بھی تنہائی سے ہمارے مولانا بہتر حالت میں تھے مولوی غلام حسین صاحب کے کارخانے میں چار پانچ کاریگر بھی بیٹھے تھے اور دو تین شاگرد۔ بااینہمہ دالان کے ایک طرف کارچوب ہوتی تھی اور دوسری طرف مولانا کی بیٹھنے کی جگہ تھی جو چار پانچ آدمیوں کے لئے کافی تھی۔ کاریگروں میں برکۃ اللہ اور وجیہ اللہ دو بھائی تھے ان میں سے برکۃ اللہ کی عمر ۲۵ برس سے متجاوز ہو چلی تھی اور وہ مشاطہ کی معرفت اپنی شادی کے رقعے دوڑاتے رہتے تھے مگر کہیں بات جمتی نہ تھی ایک مرتبہ مولانا نے ازراہ شوخ طبعی برکت اللہ کے رقعے میں اپنا نام لکھ دیا۔ فریق ثانی کی طرف سے اس کی تحقیقات ہونے لگی۔ شدہ شدہ مولوی غلام حسین صاحب تک نوبت پہنچی ہمارے مولانا مولوی غلام حسین صاحب کا ادب بھی کرتے تھے کیوں کہ ایک تو وہ بوڑھے آدمی تھے دوسرے مولوی سعادت علی صاحب کے دوست بھی تھے غرض کارخانہ برخاست ہوا تو مولوی غلام حسین صاحب کارخانہ برخاست کر کے اکثر بازار چلے جایا کرتے تھے ایک دن خلاف عادت کارخانہ برخاست کر کے اپنی جگہ بیٹھے رہے ہمارے مولانا بھی اُس وقت اکیلے تھے انھوں نے رقعہ نکال مولانا کے روبرو ڈال دیا اور کہا کہ "برخوردار اگر تم نکاح کرنا چاہتے ہو تو اس کام کو مجھ پر چھوڑ دو میں مناسب جگہ تجویز کردوں گا۔" مولانا رقعہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے کیونکہ وہ ایک ہنسی تھی جو انھوں نے برکت اللہ کے ساتھ کی تھی مارے رعب کے ہمارے مولانا مولوی غلام حسین صاحب سے ہست نیست کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ الخاموشی نیم رضا سمجھے۔ بات

ت وگزشت ہوئی۔ اُدھر برکت اللہ نے بُرا مانا کہ میری بات میں اڑنگے لگاتے ہیں اس شوخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سے اور برکت اللہ سے بگاڑ ہو گیا۔ دعا سلام بات چیت موقوف اس کے دو ڈھائی مہینے بعد پھر ویسا ہی اتفاق ہوا کہ مولوی غلام حسین صاحب کارخانہ برخاست کر کے بیٹھے رہے اور ہمارے مولانا کو اکیلا پاکر کہا کہ "لو میں نے تمھارا نکاح ٹھہرا دیا ہے" مولانا نے بات سُنی کی اَن سُنی کر دی اس بات کو کوئی ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ایک قعب میں مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے کچھ مٹھائی ایک چماری[ل] لائی اور اُس نے وہ قعب مولوی غلام حسین صاحب کو دی۔ مولوی غلام حسین صاحب نے قعب لاکر مولانا کے آگے رکھ دی اور کہا کہ "لو برخوردار تمھاری سسرال سے مٹھائی آئی ہے اُن کے ہاں برادری سے کوئی حصہ آیا ہوگا یہاں کے دستور کے مطابق انھوں نے تمھارا حصہ بھیجا ہے" اب تو مولانا کے کان کھڑے ہوئے مگر اس وقت بھی بہت بیست مولانا نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے تحفے تحائف مولانا کے نام مولوی غلام حسین کے ہاں آتے رہتے تھے اور مولانا کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح چپ چپاتے مولانا کے نکاح کی بخت و پز ہو رہی تھی۔ مولانا نے جب تحصیل علم میں محنت و مشقت کی تو اُن کے علم و فضل اور ذہانت کا سارے شہر میں شہرہ ہو گیا تھا اور باوجودے کہ وہ ابھی طالب علم اور کم سِن تھے لیکن لوگ اُن کو مولانا مولانا کہا کرتے تھے۔

مولوی عبدالخالق صاحب کے [۲] دو بیٹے تھے مولوی عبدالقادر صاحب ہمارے مولانا کے خسر اور مولوی عبدالرب صاحب۔ انھوں نے سہارنپور میں مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے بڑی مشہور مسجد بنوا دی ہے اور وہ اب تک آباد ہے۔ مولوی عبدالخالق صاحب نے پنجابی کٹرے کی مسجد کی امامت اور قلعے کی آسامیاں اور نکاح خوانی اور نمازِ جنازہ یہ خدمتیں اپنے بڑے بیٹے کے سپرد کی تھیں۔ مولوی عبدالرب صاحب وعظ کی مشق کیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالخالق صاحب کے داماد شمس العلماء مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی درس طلبہ اور فتوی لئے بیٹھے تھے ان سب میں اُن دنوں مولوی عبدالقادر صاحب پیش پیش تھے کیوں کہ سب میں بڑے تھے لوگوں کو ہمارے مولانا کے نکاح کا حال معلوم ہوا تو سب نے بہت تعجب کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی عظمت کے لحاظ سے لوگ اور بھی متعجب تھے کہ ایک پردیسی لڑکے (مولانا نذیر احمد) کو مولوی عبدالقادر صاحب نے کیوں کر بیٹی دینے کا ارادہ کر لیا۔ اصل یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب بڑے دور اندیش آدمی تھے انھوں نے دیکھا کہ مولوی عبدالرب نے وعظ لیا ہے اور مولوی نذیر حسین صاحب نے درس و افتا تو انھوں نے ان دونوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو سُبک پایا اور اس سُبکی کی تلافی اس طرح پر سوچی کہ ہمارے مولانا کو اپنا داماد تجویز کیا۔ انھوں نے ہمارے مولانا کی طالب علمی کی شہرت نہ صرف سُنی تھی بلکہ دیکھی تھی اور دو ایک مرتبہ طالب علموں کے ساتھ مولانا کے مناظرے بھی دیکھے تھے اُن کو معلوم تھا کہ یہ لڑکا ہونہار ہے اور اب نہیں تو آگے چل کر یہی ہلال آسمانِ علم پر بدرِ کامل بن کر چمکے گا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ اس لڑکے کو مولوی نذیر حسین صاحب کا مقابل بنا کر مسجد میں بٹھائیں گے۔ مسجد کی چھ محرابیں تھیں ایک میں مولوی عبدالخالق صاحب بیٹھتے تھے دوسری میں مولوی نذیر حسین صاحب تیسری خالی تھی۔

مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی عبدالرب صاحب کو اپنے بہنوئی مولوی سید نذیر حسین صاحب سے ایک طرح کی چشمک بھی تھی تو لوگوں نے مولوی عبدالقادر صاحب کو یہ کہتے بھی سُنا تھا کہ یہ تیسری محراب ان شاء اللہ نذیر احمد سے زیب و رونق پائے گی۔

ل دلی میں قاعدہ ہے کہ وہاں تقریبوں میں یہی قوم حصے بخرے برادری کنبے اور شہر والوں میں تقسیم کرتی ہے۔ غالباً ہندوستان میں اور کہیں ایسا رواج نہیں ہے بعض جگہ جولاہے تقسیم کرتے ہیں اور اکثر مقامات پر حجام ۱۲

مسجد کی تین محرابیں جانب یمین مع حجرہ اُن وہابیوں کی طرف تھیں اور جانب یسار کی تین محرابیں مع حجروں کے حاجی قاسم صاحب کی طرف۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا یہ ارادہ یہ تھا کہ جس طرح اُن کے والد مولوی عبدالخالق صاحب نے اپنے داماد کو مسند درس و افتا پر متمکن کر دیا تھا اسی طرح ہمارے مولانا کو مولوی نذیر حسین صاحب کے مقابلہ میں مولوی بنا کر بٹھاتے۔ مگر کالج میں رہنے سے ہمارے مولانا کی آنکھیں چار ہو گئی تھیں اور ماسوا اس کے ہمارے مولانا مولویت کی دوکان کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔

بہر حال کچھ عرصے تک مولوی غلام حسین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب میں ہمارے مولانا کے نکاح کی بابت کھچڑی پکتی رہی آخر ایک دن ایک درزی فیروزی بانات لے کر مولانا کا قد و قامت ناپنے کے لئے آیا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں دولھا (مولانا نذیر احمد صاحب) کے جوڑے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس وقت ہمارے مولانا کو اس کی خوشی ہوئی کہ مجھ کو بانات کا انگرکھا پہننے کو ملے گا۔ الغرض تمام لوگوں کو مولوی عبدالقادر صاحب کی طرف سے دعوت دی گئی اور ہمارے مولانا سے مولوی غلام حسین صاحب نے کہا کہ تم اپنے مدرسے کے طالب علموں اور اُستادوں کو محفل نکاح میں بلوا دینا۔

بہر کیف کوئی تاریخ مقرر ہوئی اور مولوی صاحب کے مکان میں وقت مقررہ پر محفل عقد منعقد ہوئی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مولانا کا نکاح مفتی صدر الدین خاں صاحب مرحوم نے پڑھایا کہ وہ عمر اور علم اور حکومت اور تموّل اور عزت کی رو سے دلّی بھر میں اول درجے کے شخص تھے گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا اور اس طرح عقد نکاح کی رسم پوری ہوئی۔

اس نکاح کی بجنور میں مطلق خبر نہ تھی چند روز بعد وہاں خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ مولانا کی والدہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ اُن بیوہ کا لڑکا پردیس میں بیاہا جائے اُن کی خوشی یہی تھی کہ بجنور میں بیاہ ہوتا اور یہ ایک نیچرل خواہش تھی مگر مولانا کو دیہات کی عورتوں کی بدسلیقگی اور علم سے بے بہرہ ہونا۔ لباس کا پھوہڑ پن۔ زبان کی کرختگی سب معلوم تھی اَھْلُ الْبَیْتِ اَبْصَرُ مَا فِی الْبَیْتِ مولانا شہر کے تکلفات۔ یہاں کی سلیقہ شعاری زبان کی نفاست دیکھ کر ریجھ گئے تھے۔ مولانا کی والدہ نکاح کی خبر سُن کر دلی چڑھ آئیں اور بہت کچھ روئیں پیٹیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُن کے دل میں یہ سمائی کہ مجھ رنڈیا کے بچے کو بے وارث سمجھ کر دلّی والوں نے چھین لیا اس وجہ سے مولوی عبدالقادر صاحب کی بیوی اور مولانا کی والدہ یعنی سمدھنوں سمدھنوں میں کبھی صفائی نہیں ہوئی۔ اور ہمیشہ کشیدگی رہی اب تک بھی مولانا کی والدہ کو اس کا قلق ہے کہ بجنور کی رونق اور بہار دلّی میں ہے جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ پوتے پوتیاں۔ پڑپوتے پڑپوتیاں اللہ کے دئے سب ہی کچھ ہیں مگر بجنور میں کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ اسی کلفت مولانا کی والدہ ماجدہ کو ہے خود مولانا گنتی کے چند بار بجنور گئے ہیں۔ پوتے پوتیاں مدت العمر میں ایک دو دفعہ کھڑے کھڑے مہمان داخل ہو گئے تو اس سے اُن کی کیا تسکین ہو سکتی ہے ساری چہل پہل شادی بیاہ سب دلی ہی میں ہے اس پر بعض دفعہ وہ جل کر کہہ بیٹھتی ہیں کہ "نذیر احمد ہیرا میرے پیٹ میں پڑا تھا۔ مگر اس سے مجھے کیا لینا میں نے اُس کی یا اُس کی اولاد کی کیا بہار دیکھی میرے کمائی دلّی والوں نے لوٹ لی۔ اس سے بہتر تھا کہ بجائے اس ہیرے کے میرے پیٹ میں پتھر پڑتا مگر میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔" اور یہ اُن کا کہنا ایک حد تک درست اور حق بجانب ہے۔

ایک اقرارنامہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب سے مولوی عبدالقادر صاحب کی بڑی لڑکی کا نکاح ٹھہرتے تو ٹھہر گیا مگر مولانا کے انوکھے مزاج سے مولوی عبدالقادر صاحب کھٹکتے ضرور تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکا بجنور چل دے یا کچھ رنگ لائے

پردیسی کی بیت کا کیا بھروسا اور مولوی عبدالقادر صاحب اگرچہ کھلے الفاظ میں خانہ داماد کہہ کر مولنا کو نہیں رکھ سکتے تھے تاہم اپنا دباؤ ضرور رکھنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے مولنا سے ایک اقرار نامہ نکاح کے وقت لکھوالیا کہ لڑکی کو باہر پردیس میں نہ لے جائیں گے اور حین حیات اس لڑکی کے دوسرا نکاح نہ کریں گے پہلی شرط اپنی مَن سمجھوتی کی تھی ورنہ مولنا کی بیوی کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں مولنا ہی ہوں اور وہ نہ گئی ہوں۔ دوسری شرط بطور حفظ ماتقدم تھی کیوں کہ مسلمانوں میں دو دو چار چار بیویوں کا اس کثرت سے اور ایسی بُری طرح رواج ہو گیا ہے کہ زندگی کا لطف کِرکِرا ہو جاتا ہے اور مولوی صاحب کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ بجنور والے کہیں دوسرا نکاح نہ کرا دیں لیکن یہ اقرار نامہ کاغذ ہی پر رہا۔ پہلی شرط تو متعاقدین کی رضامندی سے ٹوٹی اور دوسری شرط کے توڑنے کے لئے بجنور والے مدت العمر ساعی رہے اور ہر وقت گھات میں لگے رہے اور آخر کار بعد خرابی بصرہ آخر عمر میں اُن لوگوں کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی یعنی یہ کہ مولنا نے کوئی بیس سال ہوئے اپنی والدہ کے اصرار پر اپنے کنبے کی ایک بیوی سے عقد کر لیا۔ مگر وہ بیل منڈھے نہ چڑھی مولنا ڈھونڈھتے تھے دہلی کا سلیقہ بھلا کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ خلاصہ یہ کہ برس دو برس بھی نہ نبھی جب مولنا کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس جمع میں تفریق کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا۔

پہلی بیوی کی نسبت ایک ہنسی کی بات

ہنسی کی بات یہ ہے کہ مولنا جب پنجابی کٹڑے کی مسجد اورنگ آبادی میں رہتے تھے اور مولویوں کے زنان خانوں میں آتے جاتے تھے تو جب یہ لڑکی گھر میں روتی تو مولنا کے حوالے کر دی جاتی کہ اس کو گلی میں لیجا کر بہلا لاؤ۔ مولنا اس کے بہلانے کی کوشش کرتے جب یہ مچلے ہی جاتی تو مولنا اس کو جھنجلا کر بار بھی بیٹھا کرتے۔ نکاح کے بعد مولنا کو اس لڑکی کی خالہ زاد پھوپی سے جو اس لڑکی کی ہم عمر تھیں معلوم ہوا کہ جب مولنا کا نکاح ہونے لگا تو پھوپی نے سہیلی کے رشتے سے مولنا کی اہلیہ سے چُپکے سے کہا کہ تمھیں کچھ معلوم ہے کس سے تمھارا نکاح ہوا۔ انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر پھوپی نے مولنا کا پتہ دیا تو اُن کو مولنا کا مارنا بھی یاد آیا اور اپنی پھوپی سے کہا کہ "کیا اب بھی مجھے مارا کریں گے؟" انھوں نے کہا کہ "نہیں وہ وقت اور تھے اب تو وہ تمھارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔"

بیوی کا نان نفقہ

ذرا اس غیرت اور حمیت کو ملاحظہ فرمائیے کہ نکاح سے پہلے ہمارے مولنا نے یہ شرط کر لی تھی کہ نکاح کے بعد سے اپنے کھانے پینے اور بی بی کے نان نفقے کا میں ذمہ دار ہوں گا۔ اور اس شرط کو اس زور سے پیش کیا تھا کہ اگر منظور نہیں تو میں عین نکاح کے وقت ایجاب و قبول سے انکار کر دوں گا۔ اس پر بڑی ردوکد ہوئی بعض سنجی باز اشخاص نے خیال کیا کہ یہ نمائشی شرط ہے صرف لوگوں کے دکھانے کے لئے ایسی بات کہی جاتی ہے میاں کے پاس ہے کیا جو بیوی کو کھلائیں پہنائیں گے مگر مولوی عبدالقادر صاحب ہمارے مولنا کے تیور سے سمجھ گئے کہ نذیر احمد صاحب غیرت ہی ناچار انھوں نے کہا کہ "نذیر احمد کو الگ گھر کرنے کا مقدور نہیں ہماری بیٹی کو عادت نہیں پس کھانا پینا تو الگ ہو نہیں سکتا اگر وہ اس کو وجوب سمجھتے ہیں تو کھانا پینا ہمارے ساتھ رکھیں خرچ دے دیا کریں بڑی جرح و قدح کے بعد تین روپے ماہانہ ٹھیر گیا۔ یہ وہی تین روپے تھے جو ہمارے مولنا مولوی غلام حسین صاحب کو اکیلے دم کا دیا کرتے تھے۔ ہمارے مولنا نے اپنے دل میں پانچ روپے ٹھیرائے تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب پر جب یہ رقم ظاہر کی گئی تو وہ ناخوش ہونے لگے جب ہمارے مولنا نے یہ دیکھا کہ مزاج میں برہمی پیدا ہو گئی تو چپ ہو گئے۔ لیکن مولنا نذیر احمد صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ تین روپے مہینا دو آدمیوں کے لئے کافی نہیں اور مولوی عبدالقادر صاحب نے رعایۃً یہ رقم قرار دی ہے۔ اُن کی یہ رعایت مولنا کو

ناگوار تھی تو مولنا کیا کرتے کہ اُن کے لیے دستر خوان پر کباب میٹھے چاول پر آٹھے اِس قسم کی چیزیں ہوتی تھیں اور سب ہی جگہ نئے داماد کی خاطر و مدارات ہوا کرتی ہے۔ دستر خوان پر اچھے کھانوں کے علاوہ دال اور چپاتی بھی ہوتی تھی تو مولنا دال چپاتی پر قناعت کرتے اور عمدہ غذا کو ہاتھ نہ لگاتے مولنا سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے صاف کہہ دیا کہ "یہ تین روپے ہیں آدمی ہی دال چپاتی کھا سکتا ہے اور سسرال کی بدولت الوانِ نعمت مجھ سے کھائے نہیں جاتے اور میں اس طرح دھرنا نہ دوں گا نہ مفت کے ٹکڑے توڑوں گا جب تک خدا مجھے اپنے خزانۂ غیب سے فارغ البالی دے" اللہ رے غیرت!

اِس کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ تحریر ہے کہ جس طرح مولنا کو مولوی عبدالقادر صاحب نے عقد کے وقت بانات کا انگرکھا بنوا دیا تھا اُسی طرح دہلی کیا غالبًا تمام ہندوستان کے دستور کے مطابق دولھا کو بھی دلھن کا جوڑا دینا ضرور تھا مگر مولنا اُس مفلسی کے زمانے میں اتنی رقم کہاں سے لاتے کہ دُلہن کا جوڑا بنواتے۔ غرض نہ مولنا کو اُس وقت جوڑا بنوا دینے کا مقدور تھا اور نہ کہیں سے ان کو قرض مل سکتا تھا ہم نے سُنا ہے کہ مولنا نے مولوی عبدالقادر صاحب سے ایک سو روپیہ اس کام کے لیے لیا۔ مگر مصرف یہ نہیں بتایا اور اُن کو اس رقم کا ایک تمسک اسٹامپ پر لکھ دیا تھا جس کے لیے مولنا کو اپنے نام کی ایک مُہر کھدوانی پڑی۔ مولنا چھ روپے ماہوار اُس تمسک کے ادا کیا کرتے تھے اور تین روپے ماہوار خوراک کے ❊

پہلی عید دہلی کا ایک یہ بھی دستور ہے کہ نئے بیاہے ہووں کو پہلی عید پر سسرال کے کنبے کے لوگ عیدی دیا کرتے ہیں۔ مولنا کے لیے اِس رسم کے مطابق بیس یا بائیس روپے جمع ہوئے اتفاق سے اُن دنوں مولنا کے روزمرہ کے کپڑے فرسودہ سے ہو گئے تھے اور عید کے لیے نئے کپڑے بنوانے کی گنجایش نہ تھی تو مولوی عبدالقادر صاحب نے مولنا کی عیدی کے روپے مولنا کی بی بی کے ہاتھ میں دے کر کہلا بھیجا کہ تم عید کے لیے اس روپیہ سے کپڑے بنا لو مولنا نے اپنی بی بی سے کہا کہ یہ روپے ہیں تو میرے نام کے مگر حقیقت میں یہ عیدی تمھاری ہے میری نہیں اس واسطے کہ تمھارے تعلق کی وجہ سے مجھے دی گئی ہے تو تم ان روپوں کو اپنی ضرورت میں صرف کر دیا کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوا لو۔ میں ان روپوں کو اپنے کام میں نہیں لا سکتا۔ مولنا کی بی بی نے وہ روپے اپنے والد کو یہی کہہ کر واپس کر دیے۔ مولوی عبدالقادر صاحب بڑے غصیلے آدمی تھے اُنھوں نے ناخوش ہو کر کہا کہ "میں عید کے دن بچوں کو اپنے ساتھ لے کر عیدگاہ جایا کرتا ہوں اُس نذیر احمد سے کہہ دینا کہ نئے کپڑوں کے بدون اُس کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا" ہمارے مولنا بھی مولوی عبدالقادر صاحب سے مزاج میں کچھ کم نہیں تھے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کیا معقول بات کہلا بھیجی ہے کہ "میں سرے سے عید کی نماز ہی نہیں پڑھوں گا"

ایک اور نقل اُن ایام میں جس عید کا مذکور ہے ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ مولوی عبدالقادر صاحب افطار اور سحری کا بڑا اہتمام کرتے تھے عصر کے وقت سے افطار کا سامان کر چلتے۔ حوضِ قاضی[1] یا باغ کا کنواں اور کئی ایک اور کوئیں جو ٹھنڈے کوئیں مشہور تھے عین وقت پر وہاں سے پانی منگوایا جاتا اور کئی قسم کے شربت تیار ہوتے اور مولوی صاحب اپنے بال بچوں کو بٹھا کر روزہ افطار کرتے ہمارے مولنا روزے کا وقت ٹال کر دردوانہ[2] کے نکیے پاس لب نہر پانی اور املی کی تقیوں سے روزہ افطار کرتے۔ سارے رمضان کبھی مولوی عبدالقادر صاحب کے افطار میں شریک نہیں ہوئے یہ بات اِن لوگوں کو سخت ناگوار تھی۔ اِس پر طرّہ یہ ہوا کہ سحری کے وقت کبھی دودھ اور میٹھے چاول اور کبھی

---

[1] دہلی میں ایک چوراہے پر مشہور حوض ہے یہاں ترکاریاں بکتی ہیں ۱۲ [2] یہ ایک بڑھیا فقیرنی تھی نہر پر تکیے میں اکیلی پڑی رہتی تھی ۱۲

نان پاؤ اور دودھ اور کبھی دودھ جلیبیاں اور سوئیاں مولنا کے لئے سحری کے واسطے بھیجی جاتی تھیں۔ مولنا اکثر عذر کر دیتے کہ شام کا کھانا ہضم نہیں ہوا اور کبھی نرخشک کھا لیتے اور دودھ واپس۔ اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً سسرال کا لحاف نہ اوڑھتے تھے اور اپنی پتلی سی رضائی میں سکڑا کرتے تھے۔ مولنا کی ساس خدا بخشے مولنا کی اس تنک مزاجی سے ناخوش تھیں اور اپنے شوہر سے کہتیں کہ تم نے کیسے اکھل کھرے سے میری بیٹی کو بیاہ دیا۔ مگر مولنا اپنی فطرت سے مجبور تھے غیرت اُن کو اجازت نہ دیتی تھی کہ سسرال کی بدولت اللے تللے اڑائیں۔ ہمارے مولنا کی بیوی بھی ان باتوں سے بہت ہی آزردہ خاطر رہتی تھیں۔ لیکن مولنا ان کو سمجھاتے رہتے تھے کہ تم اس کو میری ناخوشی اور نارضامندی پر محمول نہ کرو خدا اپنی قدرت سے مجھکو فارغ البالی دے گا تو تم دیکھ لوگی کہ میں تم کو کیسا خوش رکھتا ہوں اور یہ تنگ دستی ان شاء اللہ چند روزہ ہے تم کو بیدل نہ ہونا چاہیئے۔" وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں ہمارے مولانا کا مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی کئی مہینے سے مدرّسوں کی تنخواہیں اور طالب علموں کے وظیفے بند تھے۔ اکونٹنٹ اور پرنسپل کے حساب کے متعلق کچھ بحث ہو رہی تھی اور یہاں مولنا کے پاس جو کچھ آمدنی سمجھیے ایک وظیفہ تھا یا چند روپے ماہوار اُوپر کی آمدنی۔

دہلی کالج کی تعلیم سے سبکدوش ہونا اور وہاں کی تعلیم کا شکریہ

مولنا نذیر احمد صاحب نے جو کچھ علم و فضل حاصل کیا اُس کے مقابلہ میں وہ کالج سے بڑھ کر باہر کی تعلیم کے بھی شکرگزار ہیں لیکن یہ شکریہ بھی کالج ہی کی طرف عود کرتا ہے۔ اگر کالج کے وظیفے کا مولنا کو سہارا نہ ہوتا تو وہ کسی طرح یہ شغل جاری نہیں رکھ سکتے تھے اگرچہ کالج نے عربی میں اُن کی کافی مدد نہیں کی اور اگرچہ بے مناسبتی کی وجہ سے انھوں نے سائنس کو شوق سے نہیں پڑھا تاہم بقول اُن کے "معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی، اجتہاد علی البصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں نہ جانوں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال متعصب اکھل کھرا۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا متجسس۔ برخود غلط ۵ ترک دنیا بمردم آموزند ۔ خویشتن سیم و غلہ اندوزند ۔ مسلمانوں کا نادان دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ[1] ۔ وَمَا أَصَابَنِي مِنْ حَسَنَةٍ فِي الدِّينِ أَوْ فِي الدُّنْيَا فَمِنَ الْكَالِجِ[2]۔" بات یہ تھی کہ ابتدا عمر سے ہمارے مولنا کو علمی مذاق نشے کے عمل کی طرح چمٹ گیا تھا۔ اُن کو ہمیشہ تحصیل علم کی جمائیاں آیا کرتی تھیں اور اُس کا خمار بس کتاب کے سوا کسی چیز سے نہیں اُترتا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ہمیشہ کتب بینی فرماتے رہے۔ ملازمت کی حالت میں بھی یہ ذوق اُن کے دل سے نہ گیا پنشن کے بعد چاہیئے تھا کہ بیکار زندگی بسر کرتے مگر اُن سے یہ نہ ہو سکا جس کے شواہد اُن کی وہ کل تصنیفات ہیں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

غرض ہمارے مولنا مولوی نذیر احمد صاحب سنہ ۱۸۴۵ع میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۸۵۳ع میں آٹھ برس ختم کر کے کالج سے باہر گئے اور اس طرح عالم طفلی سے نکل کر عالم کار و بار میں قدم رکھ کر کالج کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا ۔

---

[1] بہرے۔ گونگے۔ اندھے کہ وہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آسکتے ۱۲

[2] مجھکو دین و دنیا کی جو کچھ فائدہ پہنچا کالج کی بدولت پہنچا ۱۲

حصۂ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۸۵۴ء لغایت ۱۸۷۶ء

ملازمت اگرچہ مولنا نذیر احمد صاحب کو ضیقِ معاش کی وجہ سے ملازمت کی طرف جلد متوجہ ہونا پڑا۔ جلد اس سے کہا گیا کہ اُن کا شوقِ تحصیلِ علم ہنوز باقی تھا۔ ورنہ جناب ممدوح نے ٹھیک وقت پر ملازمت کا خیال کیا۔ ہمارے نزدیک ملازمت کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ مولنا کو دہلی کالج سے وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ چناں چہ خود مولنا کہتے ہیں "مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اس کو سلسلۂ ملازمت کا آغاز سمجھا۔" اس حساب سے گویا وہ اول اول چار روپے ماہوار کے وظیفہ خوار ملازم ہوئے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ مولوی سعادت علی صاحب کا انتقال مولنا کے حق میں ایک مصیبت تھا اور خوش قسمتی سے اگر دونوں بھائیوں کے وظیفے کا سہارا نہ ہوتا جو خانہ داری کے مصرف میں بھی آتا تھا تو نہ معلوم آج یہ گوہرِ بے بہا کس حال میں ہوتا۔ آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ ان دو کم سن لڑکوں پر پڑتا تھا کہ دونوں نے اس کو ہمت اور استقلال کے جرِّثقیل میں لٹکا کر اٹھا لیا اور منزلِ مقصود پر آسانی سے پہنچا دیا۔ متعلمی کے زمانے میں مولنا کو ایک رقم جو اُن کی اُس وقت کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ بمجبوری بھی اپنے خاندان کی پرورش کے لیئے دینی پڑتی تھی۔ تو مولنا خارج از اوقاتِ مدرسہ پنجابیوں کے دو تین لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے جن سے چار پانچ روپے مل جایا کرتے تھے اور اسی کے قریب قریب مطبع العلوم[1] سے کیوں کہ مولنا اُس کی عربی کتابوں کی تصحیح کر دیا کرتے تھے اور یوں مفت کے پڑھنے والے تو کالج کی دوم عربی جماعت تک کے طالب علم مولنا کے پاس آیا کرتے تھے۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد وہ پنجابی کٹڑے کی مسجد کی نکبت تو دور ہو گئی تھی مگر فارغ البالی اب بھی نہ تھی۔ اب وہ وقت قریب آتا جاتا تھا کہ مولنا کا تعلق کالج سے منقطع ہو۔ تو کالج میں تراجمِ عربی کا ایک فنڈ تھا کہ عربی کی جماعتِ اول کے طالب علم مطبع العلوم کی عربی کتابوں کے ترجمے کرتے تھے اور اُن کو فی صفحہ کچھ اُجرت مل جایا کرتی تھی۔ اس فنڈ سے بھی ہمارے مولنا ہر مہینے کچھ نہ کچھ جھٹک ہی لیا کرتے تھے۔ ایک اور قسم کی بھی آمدنی مولنا کو ہو جایا کرتی تھی وہ یہ کہ عربی فارسی کے چھوٹے کلاسوں کے مدرس اپنی ضرورتوں کی وجہ سے کالج سے غیر حاضر ہوتے تو درس دینے کے لیئے اُن کی جگہ اول جماعتِ عربی کا کوئی طالب علم بھیجا جاتا اور قواعدِ رخصت کے مطابق غیر حاضر مدرس

---

[1] یہ عربی کالج کا ایک مطبع تھا ۱۲

کی تنخواہ کا ایک جزو اُس طالبِ علم کو ملتا جو غیر حاضر مدرس کی جگہ کام کرتا۔ چناں چہ اکثر اوقات مدرس غیر حاضر ہونے اور بار ہا مولٰنا کا تقرر اُن کی غیر حاضری تک رہتا۔ اِس طریقے سے بھی مولٰنا کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے تاہم توکل کی سی آمدنی تھی اور مولٰنا اپنے مستقبل کے لیے پریشان سے رہا کرتے تھے الغرض تنگ دستی اور فرسودہ حالی کی وجہ سے قبل از ملازمت کبھی کبھی دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا تھا کہ میاں جیوں کی طرح مکتب کے لڑکے لے کر بیٹھ جاؤ اور اِس خیال میں اِس وجہ سے بھی تقویت زیادہ ہوتی تھی کہ مولٰنا میں معلمی کی قابلیت کامل طور پر موجود تھی۔ مگر چوں کہ مکتب کا جما لینا تھا دیر طلب کام اِس لیے ہمت ہار بیٹھے تھے تاہم آغازِ ملازمت مکتب سے نہ سہی اسکول سے ہوا مشہور تو یوں ہے کہ "طفل بہ مکتب نمی رود و لے برندش"۔ مگر مولٰنا کے لیے "معلّم بمکتب نمی رود و لے برندش" ہو گیا۔

دہلی کالج کی تعلیم قریب الختم تھی کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضلع گجرات (پنجاب) میں چھ اسکول پنجاب گورنمنٹ نے کھولے اور دہلی کالج سے مدرس طلب ہوئے۔ دہلی کالج کے اسٹاف میں زیادہ معلّم ہوتے تو بھیجے جاتے۔ ناچار متعلم معلّم تجویز ہوئے۔ کیوں کہ یہ بھی لیاقتِ علم کی وجہ سے معلموں کے برابر پونہچ چکے تھے شدہ شدہ طلبی مدرسین کا حکم ہمارے مولٰنا کے کان میں پونہچا سنتے ہی فوراً دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کوشش و کاوش کرکے مقصد حاصل کرنا چاہیے چناں چہ پرنسپل کے سامنے اُمیدوارانہ حیثیت سے پونہچے اور عرض کی کہ میرا نام بھی منتخب کیا جائے ✦

ضلع گجرات کی ملازمت

اِس کا اصل قصہ یوں ہے کہ مولٰنا کی طالبِ علمی کے آٹھ برس پورے ہونے کو تھے کہ اسی اثنا میں مسٹر رچرڈ ٹمپل جو آخر کو سر رچرڈ ٹمپل اور بمبئی کے گورنر ہو گئے تھے اُن دنوں گجرات کے ڈپٹی کمشنر تھے اُنھوں نے اپنے ضلع میں سررشتۂ تعلیم جاری کرنا چاہا۔ ہندوستان کے بعض اضلاع آگرہ متھرا وغیرہ میں سررشتۂ تعلیم قائم ہو چکا تھا مسٹر ٹمپل نے اِس کی مختصر نقل اپنے ضلع میں کرنی چاہی اور یوں آفتابِ علم کی پہلی کرن پنجاب کے ضلع گجرات پر چمکی۔ اُدھر ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب جو آخر کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالکِ شمال و مغرب (حال ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ) کہلائے جنرل وزیٹر آف ایجوکیشن تھے ٹمپل اور ریڈ میں باخود یا کچھ خط و کتابت ہوئی ہوگی ٹمپل نے ریڈ سے چھ مولوی مانگے دہلی کالج بھی ریڈ صاحب کا ماتحت تھا۔ ریڈ نے دہلی کالج کے پرنسپل کو لکھا کہ پنجاب کے لیے چھ مولوی تیار کرو۔ ہمارے مولٰنا از خود توقع لگائے بیٹھے تھے کہ اُن چھ میں ایک میں ضرور ہوں گا کیونکہ وہ عربی میں اچھے طالب علم سمجھے جاتے تھے امتحانوں میں کبھی اول اور کبھی دوم رہتے تھے اِس کے سوا پرنسپل کو بھی معلوم تھا کہ ہمارے مولٰنا نوکری کے حاجتمند ہیں۔ اِن اسباب سے قطعی اُمید تھی کہ پرنسپل مولٰنا کو ضرور منتخب کرے گا۔ لیکن اس کو نامساعدتِ زمانہ کے سوا اور کیا کہنا چاہیے کہ پرنسپل نے اَور لوگوں کو نامزد کر دیا اور مولٰنا مُونہ تکتے رہ گئے۔ مولٰنا کے شیشۂ دل کو پرنسپل کی اِس ناانصافی نے چورا چورا کر دیا رنج و الم کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ چناں چہ ایک موقع پر ہمارے مولٰنا نے اِس صدمے کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا بھی تھا: "اِس زندگی میں مجھ کو بھی اتفاقِ ناملائم پیش آئے ہیں مگر جس قدر رنج اُس ناکامیابی کا مجھ کو ہوا میں بیان نہیں کر سکتا میں سچ کہتا ہوں کہ اُس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے"[1]

بہر حال منتخب شدہ لوگوں میں ایک مولوی ضیاء الدین[2] صاحب بھی تھے جو دوسری جماعت سے ترقی کرکے ہمارے

[1] یہ اشارہ ہے منتخب نہ ہونے کی طرف ۱۲ [2] مولوی ضیاء الدین صاحب نے بعد میں شمس العلماء خان بہادر ایل ایل ڈی کے خطاب پائے۔ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے عرصے تک پنشن پاتے رہے۔ کوئی دو برس ہوئے حج کو گئے اور مکے شریف میں انتقال فرمایا ۱۲

مولنا کے ساتھ اول جماعت میں شامل ہو گئے تھے مگر عربی میں وہ کبھی مولنا سے بازی نہیں لے جا سکے۔ لیکن وہ دلّی کے رہنے والے تھے اُن کے والد شیخ محمد بخش صاحب خاص دہلی کے تھانے دار تھے اور تھانے دار بھی اُن وقتوں کے تھانے دار شیخ محمد بخش صاحب نے پرنسپل سے مل کر بیٹے کی سفارش کی اور اُن کا انتخاب ہو گیا۔ اِسی نام کے ایک ضیاء الدین صاحب اَور تھے مگر یہ خواجہ ضیاء الدین کے نام سے مشہور تھے اور وہ شیخ ضیاء الدین کے نام سے۔ خواجہ ضیاء الدین صاحب مولوی سید محمد صاحب مدرس اول عربی کے رشتے دار تھے۔ غرض شیخ ضیاء الدین صاحب باپ کی سفارش سے اور خواجہ ضیاء الدین صاحب سید محمد صاحب کی سفارش سے پنجاب کے لئے منتخب ہوئے اور ان کے سوا چار اَور منتخب ہوئے اور ہمارے مولنا منہ تکتے رہ گئے۔ بہر کیف چھ مولویوں کی کھیپ پنجاب کو روانہ ہوئی۔ شیخ ضیاء الدین صاحب نے رستے میں ہیضہ کیا اور دہلی واپس آ گئے۔ اَب پرنسپل نے ہمارے مولنا کو بُلایا اور کہا تم پنجاب جاؤ۔ مولنا جلے ہوئے تو بیٹھے ہی تھے انھوں نے نہایت ترشی سے جواب دیا اور تیسری جماعت کے کسی طالب علم کا نام لے دیا کہ آپ اِس کو بھیج دیجئے۔ یہ کہہ کر مولنا کو پرانا صدمہ یاد آ گیا اور فوراً رو دیئے۔ پرنسپل نے دل جوئی کے رومال سے آنسو پونچھے اور اصرار کیا تو مولنا نے عرض کیا کہ "ضرورت مجکو مجبور کرتی ہے کہ مَیں پنجاب جانا قبول کروں مگر بایں شرط کہ میرا جتنا چڑھا ہوا وظیفہ ہے مجکو دلوا دیجئے کہ وہ میرے زادِ راہ کے کام آئے گا" پرنسپل نے ایسا ہی کیا اور مولنا پنجاب کی تیاری کرنے لگے اِن دنوں بڑے زور کی برسات تھی جیسی سال ہو ستہ ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ مگر ضرورت کے آگے کوئی مشکل خیال میں نہیں آتی تھی مولنا ایک اپنا پردیسی شاگرد اور ہم عمر ساتھ لے ٹٹو کرایہ کر چلتے ہوئے سسرال والوں کو مولنا کے رمضان اور عید کے سلوک اور مدارات سے بدگمانی تو ہو ہی گئی تھی اَب اِن لوگوں نے سمجھا کہ بس اَب یہ لڑکا گیا تو گیا دلّی کی طرف اگر کعبہ بھی ہو تو اِدھر کی طرف کو مونھ کر کے نماز تک نہ پڑھے گا اور زیادہ مایوسی ان لوگوں کو اِس وجہ سے ہوئی کہ مولوی عبد القادر صاحب یہ منصوبے باندھ رہے تھے کہ اب یہ مدرسے سے الگ ہوں گے تو میں مولوی نذیر حسین کے مقابلے میں مسجد کی ایک محراب میں اپنے داماد کو جگہ دوں گا اور اس طرح یہ خاندان کے افتخار کا باعث ہو گا۔

بہر حال مولنا اپنے شاگرد کو ساتھ لے کرایے کے ٹٹو پر دہلی سے پنجاب کو روانہ ہوئے ۲۵ دن کے سفر کے بعد گجرات شاہ دولہ کو پہنچے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملے۔ ہیڈ ماسٹر نے مولنا کا چالیس روپے ماہانہ مقرر کر کے کنجاہ میں تعینات کر دیا۔

صعوبت سفر مولنا کو منظوریِ ملازمت کا پروانہ ملنے کو تو مل گیا لیکن سفر کے پروگرام بنانے میں بڑی دقت پیش آئی ریل ہوتی تو نہ پروگرام کی ضرورت ہوتی نہ سردی و گرمی کی پروا کی جاتی۔ اگرچہ محل داری بدل گئی تھی مگر دشواریاں نہیں بدلی تھیں۔ آنے جانے کی تمام راہیں خراب پڑی تھیں موسم بارش نے اَور بھی دقتیں پیدا کر دی تھیں چناں چہ ایک جگہ مولنا بھی اِن مصیبتوں کا رونا روتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر میں پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ محل داری کو بدلے ہوئے کچھ ایسی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی بھری برسات تھی ندی۔ نالے اور نالے دریا ہو رہے تھے اور دریا سمندر۔ گرینڈ ٹرنک روڈ (شاہ راہ) جاری تھی مگر چونکہ پُل نہیں بننے پائے تھے گویا کہ بند تھی اور اس پر مزید اپنی ناتجربہ کاری ناداری اور بے سامانی۔ غرض وہ جو کتابوں میں سفر کی

ل مدت ہوئی انتقال فرما گئے ہیں۔ ان کا نام قاضی ۔۔۔ تھا ۔۔۔ ضلع کرنال کے رہنے والے تھے ہی مولنا کے رفیق تھے اور مولوی عبد القادر صاحب کا خاکہ ان میں قاضی ۔۔۔ کی بھی خاص ۔۔۔ تھی چناں چہ مرتے دم تک وہ اسی خاندان میں لگے پڑھتے رہے مدتوں مولوی عبد الحامد صاحب کے پاس رہے اب چند سال ہوئے کہ بیچارے قضا کر گئے ۱۲ ۔۔۔ صاحب ۔۔۔ کا وطن ۱۲

نذر منتیں پڑھی تھیں اُن کی تصدیق ہو گئی ۔

الغرض پٹیل صاحب نے گنجاہ میں مولانا کو تعینات کیا وہاں از سرِ نو اُن کو مدرسہ جاری کرنا تھا۔ پنجابیوں اور سکھوں اور کشمیریوں کے لڑکے گھر گھر پھر کر جمع کیے اپنے ہاتھ سے اُن کو الف۔ بے۔ تے کی تختیاں لکھ کر دیں اور درس شروع ہوا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ نہیں بے دے ہیٹھاں ایک بندی لڑکے مولانا کی بولی نہیں سمجھتے اور مولانا لڑکوں کی۔ پوری اجنبیت دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ مولانا یہ حال دیکھ کر اپنی قسمت پر سخت افسوس کرتے اور کہتے تھے کہ "الٰہی اتنا پڑھ لکھ کر بھی حرف شناس منڈے (لڑکے ۱۲) میری تقدیر کے تھے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ مکتب کے لونڈے میاں جی کی عقل چر لیتے ہیں" ۔

دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایک خط کی آمد و شد میں بارہ آنے خرچ ہوتے تھے اور کم سے کم پندرہ دن۔ لیکن جب تنخواہ آتی تھی تو وہ تمام رنجوں کی تلافی کر دیتی تھی ۔

ایک تھے کرنیل دھن راج وہ دیوان مول راج کے کچھ عزیز بھی تھے اور دیوان مول راج وہ جن کا پنجاب کی لڑائیوں میں نام آتا ہے کرنل دھن راج کشمیر میں کسی بڑے عہدے پر تھے اُن کی رانی کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت تھی۔ رانی صاحبہ نے مولانا کو بلا کر کہا کہ میرے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرو۔ مولانا نے کہلا بھیجا کہ بچوں کو یہاں مدرسے میں بھیج دیا کرو رانی صاحبہ نے کہا کہ ہماری عزت کے خلاف ہے مولانا نے کہا تو پھر ڈپٹی کمشنر سے کہہ کر مدرسے کا مدرس اپنے ہاں اٹھوا منگوا لیجیے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر مولانا فرماتے ہیں کہ "اب میں مدرسی میں ذرا خوش حال ہو چلا تھا بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا کرنیل صاحب کے خدمت گار پٹیل کو گھوڑے ٹٹو سواری کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر"۔

مولانا کی طبیعت کے چونکہ یہ بالکل برخلاف تھا کہ خود خوش و خرم اور بآرام رہیں اور اپنی اہلیہ وغیرہ کا کچھ خیال نہ کریں چناں چہ اپنے خاندان کے آرام کا جناب ممدوح نے یہ انتظام کیا کہ اتفاق سے سرکاری خزانے کا خزانچی دہلی کے خزانچی[1] کے منیم (منیب) تھے یعنی نائب مولانا نے اُن کی معرفت یہ انتظام کیا کہ ہر مہینے کے شروع میں اُن کی تنخواہ اُن کے گھر پہنچ جایا کرتی اور یہ انتظام مولانا نے اول ہی مہینے سے کر دیا تھا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب مولانا دہلی سے گجرات روانہ ہونے کو تھے تو اس سے قبل رمضان اور عید کی رسوم میں بعض باتیں سسرال والوں کی خلافِ مرضی مولانا سے صادر ہوئی تھیں جس سے اُن لوگوں کو یقین سا ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا گیا تو گیا۔ اب جو مہینے کے مہینے اِن لوگوں کو تنخواہ ملنے لگی تو اِن سب کو بڑا تعجب ہوا۔ اس موقع پر مولانا کی اہلیہ نے اپنے والدین سے کہا اور سچ کہا "یہ اُن[2] (مولوی نذیر احمد صاحب) کی تنک مزاجیاں جو تم نے دیکھیں وہ اُن کی عسرت کی وجہ سے تھیں"۔ بایں ہمہ مولانا صوبہ پنجاب میں خوش دل نہ تھے وہاں کا قیام اُن کو سخت ناگوار تھا اور بُعدِ وطن کسی قدر دل پر شاق۔ وہاں زیادہ رہنا پسند نہ فرماتے تھے نیا شہر نیا دانہ نیا پانی اور اُس پر طرّہ اجنبیت ع پائے در زنجیر پیش دوستاں ۔ بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں۔ سررشتہ تعلیم ان دنوں محض بے قدر بھی تھا اور مولانا اسی وجہ سے کچہری کی نوکری کی تلاش میں تھے۔ وہاں پنجاب میں اُن کو نوکریاں

---

[1] یہ خزانچی اب تک بنک بنگال دہلی کے خزانچی تھے چار پانچ سال ہوئے اِن کا انتقال ہو گیا ۱۲

[2] ہندوستان میں علی العموم رواج ہے کہ بیبیاں اپنے شوہروں کا نام نہیں لیتی ہیں بلکہ اَور لوگوں سے جب اپنے شوہروں کا ذکر کریں گی تو کہیں گی کہ "اُن کا مزاج بھی بڑا چڑچڑا واقع ہوا ہے" یا "وہ اپنی نوکری سے کل آئیں گے" غائب کی ضمائر استعمال کرتی ہیں نام نہیں لیتیں سو "اُن" بھی اسی قسم کا ہے ۱۲

رہتی تھیں مگر چالیس پچاس کی کوئی بھی نہیں۔ غرض وہ وہاں اتنے گھبرائے کہ دو برس کے اندر ہی اندر پنجاب سے بھاگ کھڑے ہوئے یعنی صوبجاتِ متحدہ میں عرضیوں کے گھوڑے تلاشِ ملازمت کی گاڑی میں جوت کر دوڑانے شروع کر دیئے مگر وہی اپنے ہی محکمے ہیں۔ اور وار تو خالی گئے مگر اجمیر کالج سے سو روپے کی عربی مدرسی پیش کی گئی اور کان پور سے اسی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری۔ استخارے کے طور پر دونوں نوکریوں کے مآل پر فال دیکھی تو ڈپٹی انسپکٹری نکلی جس کو آئندہ کی توقعاتِ ترقی پر قبول و منظور کر لیا۔

کان پور کی ملازمت

اب کنجاہ چھوڑ جناب مولانا دہلی روانہ ہوئے اور وہاں سے سیدھے کان پور پہنچ کر ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے سے ممتاز ہوئے کان پور میں جب مولانا اول بار ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے تو کپتان فلر صاحب انسپکٹر مدارس حلقہ دوم تھے کان پور بھی اُن کے ماتحت تھا وہ اپنے میر منشی مولوی وجیہ الزمان (یا وجیہ الدین) سے مشرقی زبانیں پڑھتے تھے مولوی صاحب تھے بنگالی۔ اور بنگالیوں کی جیسی اُردو ہوتی ہے وہ انسپکٹر صاحب کے پروانوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ ہمارے مولانا کے ہاں سے جو پروانوں کے جواب یا رپورٹیں جاتیں اُن سے میر منشی صاحب کو پتا لگا کہ ڈپٹی انسپکٹر صاحب بہت اچھی اُردو لکھ سکتے ہیں فلر صاحب کو تصنیفات کا بھی بہت شوق تھا تو وہ اپنی تصنیفات میں منشی صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ میر منشی صاحب کی تقریب سے وہ تصنیفات اصلاح کے لیئے ہمارے مولانا کے پاس آنے لگیں۔ اس اعتبار سے مولانا تمام ڈپٹی انسپکٹروں میں سربرآوردہ سمجھے جانے لگے مگر فلر صاحب فوجی آدمی تھے اور کسی قدر غصیلے بھی تھے۔ وہ ایک مرتبہ بتقریب دورہ ضلع کان پور میں آئے مدرسہ بھوگنی پور میں امتحان کا جلسہ منعقد ہوا مولانا نذیر احمد صاحب ان دنوں پان بہت کھایا کرتے تھے۔ ان سے یہ غلطی ہوئی کہ جلسہ امتحان میں پان کی گلوری کلّے میں دبائے شریک ہو گئے۔ فلر صاحب نے اس کا بہت بُرا مانا اور جب وہ امتحان کے بعد اپنے خیمے میں جانے لگے تو مولانا اُن کی مشایعت کے لیئے اُن کے ہمراہ تھے۔ اکیلے ہوتے تو مولانا کو درشت الفاظ میں ملامت کی۔ بھلا مولانا کو اتنی کہاں تاب۔ اگلے ہی دن جھٹ استعفا دے دیا۔ استعفے کا دینا تھا کہ ایک اور سانحۂ عظیم برپا ہوا یعنی ۱۸۵۷ء سالِ غدر دھم سے آ کودا۔ مولانا فرماتے ہیں "جہاں جائے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ کنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ منڈوں کو بیٹھے بیٹھے کراؤ۔ مگر یہاں بھی قریب قریب ہماں آش درکاسہ۔ بچے نہ کراؤ پہاڑے گھٹتے پھروانے میں تو یاراں فراموش کردند کا وقت آ گیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی نوکری اور کیا پڑھنا جینے کے لالے پڑ گئے"۔ غرض فلر کی درشتی پر مولانا استعفا دے ہی چکے تھے انھوں نے بھی ترکی بترکی جواب دیا ہو گا۔ سُنا ہے کہ قبل استعفے کے اُس نے مولانا کی برخاستگی کی رپورٹ کر دی تھی۔ لیکن اس واقعے کے تھوڑے دنوں بعد غدر ہو گیا۔ مولانا کو اپنی برخاستگی کی تفتیش کرنے کی کوئی ضرورت واقع نہ ہوئی اور کان پور سے بھاگ کر دلّی جا کر دم لیا۔ سچ کہا ہے جان بچی لاکھوں پائے۔

مولانا کا ایک بیگم کی جان بچانا

دہلی جا کر ابھی مولانا نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ وہاں ایک اور قضیۂ نامرضیہ پیش آیا یعنی وہی ۱۸۵۷ء کا غدر۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ مولانا کی سسرال جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے مولویوں کے خاندان میں تھی ان میں بعض تو متوسلانِ شاہی تھے اور بعض متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی طبیعت کبھی نادرست ہوتی تو اپنی جگہ ہمارے مولانا کو بھیج دیتے یوں چند بیگموں اور شاہزادوں سے مولانا کی بھی شناسائی ہو گئی تھی۔ بیگموں میں محمدی بیگم اور فخر الملک ولی عہد کی دوسری بیگم اور خود بادشاہ کی بیگم نواب تاج محل کے ساتھ ایک خاص خصوصیت تھی نواب تاج محل

مولانا سے مثنوی نل دمن کا ایک حصہ بھی پڑھا تھا۔ محمدی بیگم مولوی عبدالقادر صاحب کو باپ اور مولانا کی بی بی کو خلیفہ
کہا کرتی تھیں۔ ہوا غدر تو نواب تاج محل نے مولوی عبدالقادر صاحب سے کہا کہ میری چھوٹی بہن کو جو بیرون قلعہ چیلوں کے
کوچے میں رہتی ہیں مع احمال و اثقال قلعے میں لوا لاؤ۔ اس کام کے لیئے شاہی گاؤ خانے سے چھکڑے تعینات ہو گئے
مسجد فتح پوری کے طالب علم اس کام کے سرانجام پر مامور ہوئے۔ دہلی کالج سے پورب کی طرف میگزین تھا۔ تھوڑے سے
فاصلے پر میگزین کے دو حصے تھے ایک حصہ ورک شاپ کہ وہاں اسلحہ وغیرہ بنائے جاتے اور دوسرے حصے میں جو اصل
میگزین تھا ترتیب دے کر سجا دیئے جاتے۔ ورک شاپ اور میگزین کے بیچ میں سڑک تھی اب بھی ہے۔ ورک شاپ تو کھد کھدا کر
ریل میں آ گئی میگزین کی جگہ ڈاکخانہ ہے۔ ایک دن چھوٹی بیگم کے اسباب کی آخری کھیپ قلعے میں پہنچا کر مسجد کے طالب علم
جو اس کام پر مامور تھے مغرب سے پہلے اور شاید تیسرا یا چوتھا روزہ بھی تھا واپس آ رہے تھے اور باوجودے کہ چہل پہل کا وقت
تھا قلعے سے لے کر پنجابی کٹرے تک ایک سناٹا تھا۔ واپسی کی وہی راہ تھی جو ورک شاپ اور میگزین کے بیچ میں تھی۔ میگزین سے
گزر کر کالج کے سامنے تھوڑا سا میدان پڑا تھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ باغی تلنگوں نے انگریز قیدیوں کو جمع کر کے باڑ مار دی ہے غالباً
ہمارے مولانا کے آنے سے تین چار گھنٹے پہلے انگریزوں کی لاشیں جن میں چند میمیں بھی تھیں بے حرمتی کی حالت میں یکجا ہی پڑی
تھیں۔ ہر ایک مردے کا خون نکل کر بہ رہا ہے اور سب کے چہروں پر مردنی کی سفیدی چھائی ہوئی ہے مگر ایک عورت مسن
کہ اس کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی زندہ ہے اس کو اٹھایا وہ زخموں کی وجہ سے بے ہوش تھی اٹھائی گئی تو
بولی "واٹر" محمد منیر اور محمد شعیب دو ولایتی پشاور کی طرف کے رہنے والے تھے اور تیسرے ہمارے مولانا۔ منیر نے چاہا
کہ زخمی میم کا کام تمام کر دیا جائے۔ مولانا نے اور شعیب نے منع کیا۔ اس وقت افطار کا وقت ٹل گیا تھا۔ صلاح یہ ہوئی کہ کہیں سے
اس کو پانی پلانا چاہیئے۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد کے سامنے شیخ رمضانی مولانا کے ایک دوست رہتے تھے ہمارے مولانا نے
شعیب سے کہا تم یہیں کھڑے رہو میں شیخ رمضانی کے ہاں سے پانی لاتا ہوں شیخ رمضانی کے مکان پر مولانا پہنچے تو دروازہ
اندر سے بند۔ پکارا تو شیخ رمضانی نے اندر سے آواز دی کہ تم اس وقت کہاں؟ مولانا نے کہا کہ تم جلدی سے مجھے روزہ افطار
کرنے کے لیئے پانی دے دو۔ شیخ رمضانی نے کہا کہ میں نے اندر سے پتھر اڑا رکھے ہیں دروازہ تو میں کھول نہیں سکتا۔ اچھا
ذرا کی ذرا دم لو میں بانس کے ذریعے سے باہر کی طرف کو لوٹا لٹکائے دیتا ہوں چنانچہ انھوں نے شربت کا لوٹا اوپر سے تخم ریحاں
اور فالودہ پڑا ہوا لٹکایا مولانا لوٹا لے میم کے پاس پہنچے۔ شعیب اور منیر کھڑے ہوئے تھے میم کو اٹھا لوٹے کی ٹونٹی اس کے
مونھ سے لگا دی میم کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش۔ مگر اس نے شربت خوب ڈگڈگا کر پیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بھی کھولیں
شعیب اور منیر اور مولانا کو کھڑا دیکھا تو باغی سمجھ کر ڈری اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آخر شعیب نے اس کو اپنی چڈھی پر لیا اور یہ تینوں میم
سمیت پنجابی کٹرے کی طرف روانہ ہوئے۔ رستے بھر کوئی متنفس نہیں ملا۔ لوگ مارے ڈر کے شیخ رمضانی کی طرح گھروں میں
مغرب سے پہلے بند ہو گئے تھے۔ یہاں مولوی سید نذیر حسین صاحب کا ایک مکان زیر تعمیر تھا اور غدر ہو جانے کی
وجہ سے مدد بند کر دی گئی تھی۔ اس وقت اس کے سوا کچھ نہ سوجھی کہ میم کو اسی ادھورے مکان میں ایک چارپائی پر
لٹا دیا۔ دروازے میں تختے اڑا دیئے اور ہمارے مولانا نے دوڑے دوڑے جا مولوی عبدالقادر صاحب کو خبر دی

اور انھوں نے مولوی نذیر حسین صاحب کو کہ یہی لوگ خاندان میں بڑے تھے شیب منبر اور مولنا تو میم کو مولویوں کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ مسجد میں سیکڑوں جہادی بھرے ہوئے تھے مولویوں نے دو بوڑھے آدمی اپنے اعتبار کے متعین کر دیئے۔ زخموں کا علاج یہ کیا کہ کپڑا بھگو کر زخم پر رکھ دیا اور پانی ٹپکانا شروع کر دیا۔ مولویوں نے میم کے کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیا تھا میم نوجوان لڑکی تھی کوئی ۲۰-۲۲ برس کی عمر ہوگی مولنا نذیر احمد صاحب یا اُن کے ہم سن لڑکوں کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی صرف رازداری کا حکم تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ مولویوں نے زنانے کپڑے بھی میم کو پہنا دیئے تھے اور مولوی عبدالقادر صاحب جو حکیم بھی تھے چپکے چپکے اس کے زخموں کا علاج بھی کرتے رہے۔ بڑا سخت زخم پیٹ کا تھا نہیں معلوم سنگین گھسیڑ دی تھی یا اینچتی ہوئی گولی لگی تھی اوپر کی جلد پھٹ گئی تھی خون کی وجہ سے خوب تمیز نہیں ہوتی تھی۔ یہ عورت مسٹر لیبن کی بی بی تھی اور وہ پرسٹے کے پٹرول تھے میم اپنے باپ سے ملنے دلّی آئی تھی اور وہ مہتمم خزانہ تھے۔ مسٹر لیبن انگریس کے قلعے میں تھے اور اس میم کے دو بچے بھی باپ کے پاس تھے۔ بہر کیف میم کا علاج ہوتا رہا اور اس کے کل زخم اچھے ہو گئے یہ ہندوستانی لباس میں رہا کرتی تھی ہاتھوں میں مہندی لگوا دی چوڑیاں پہنا دیں اور ہندوستانی عورتوں کی طرح اس کی چوٹی بھی گوندھی گئی دونوں مولوی آنکھ بچا کر اس کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے تھے اگرچہ میم پوری آسایش سے رہتی تھی اور دو بوڑھے مولویوں کے سوا کوئی اس کے پاس جانے نہیں پاتا تھا یا ایں ہمہ وہ میم اپنے مستقبل کی فکر سے بہت پریشان رہتی تھی اس نے دہلی کا غدر دیکھا اور اس کو بالکل یقین تھا کہ اس کا شوہر بچوں سمیت آگرے میں ضرور مارا گیا ہوگا اس نے اپنے باپ کو گولی سے ہلاک ہوتے اپنی آنکھوں

سلہ مولوی سید نذیر حسین صاحب کی سوانح عمری حیاۃ بعد المماۃ کے نام سے چھپ گئی ہے۔ اس میں مسز لیبن کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے "عین حالت غدر میں جب کہ ایک ایک بچہ انگریزوں کا دشمن ہو رہا تھا مسز لیبن ایک زخمی میم کو رات کے وقت میاں صاحب اٹھوا کر اپنے گھر لے آئے۔ پناہ دی۔ علاج کیا۔ کھانا دیتے رہے۔ اس وقت اگر ظالم باغیوں کو ذرا سی خبر ہو جاتی تو آپ کے قتل اور خانماں بربادی میں دیر نہ لگتی۔ طرہ اس پر یہ تھا کہ پنجابی کٹرے والی مسجد میں باغی دخل کیے ہوئے تھے۔ مگر ساڑھے تین مہینے تک کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ حویلی کے مکان میں کون آدمی ہیں۔ ساڑھے تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا تب اس نیم جان میم کو جو اب بالکل تن درست اور توانا تھی۔ انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ جس کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو روپیہ ملا۔

اس کے بعد مؤلف حیاۃ بعد المماۃ لکھتے ہیں کہ میاں صاحب (مولوی نذیر حسین صاحب) اس واقعے کو خود اس طرح فرماتے تھے کہ "اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا ملا محمد صدیق پشاوری جو اس وقت مجھ سے اصول فقہ پڑھتا تھا ساتھ تھا۔ مجھ کو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں اس آواز کی جانب بڑھا جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح رو رہی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ میں نے اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت کسی قوم کی عورت اور بچوں کی جان مارنا یا تکلیف دینی حرام ہے۔ تم اپنی جان سے پوری طرح اطمینان رکھو اور اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں اور تمھارے زخم کا علاج اور تیمارداری کریں مگر چوں کہ وہ بہت ڈری ہوئی تھی کہنے لگی کہ اول تو ہم اپنے پاؤں سے چل ہی نہیں سکتے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہم لوگ تم سے کچھ دور پر ٹھیرے ہیں رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس کو ایسے رستے سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور گھر میں جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلوم ہے اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیئے کہ موجب خوشنودی خدا اور رسول ہے۔ اس میم کو میں نے باغیوں کے باہر رہنے کی خبر بھی نہ دی۔ کیوں کہ خبر ہو جانے پر اس کے وہ ساڑھے تین مہینے نہایت ہی تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے۔ فرماتے تھے کہ وہ موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھری میں بند رہتی۔ ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں بیٹھ مگر وہ ڈر سے کوٹھری کے باہر نہ آتی اور اس گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کہ اے اللہ میرا قصور معاف کر"۱۲

سے دیکھا تھا جب وہ اپنی داستانِ غم والم بیان کرتی تھی خود روتی تھی اور دوسروں کو رلاتی تھی تلنگوں نے اُس کے دو بچے ایک لڑکا کوئی آٹھ دس سال کا اور ایک دودھ پیتی لڑکی اُس کے سامنے بہت بے رحمی اور سفاکی سے مار ڈالے۔ لڑکا ڈر کر ماں کو لپٹ گیا اُسے گھسیٹ اُس کا تو سر اڑا دیا اور گود کی بچی کو کھینچ کر اُس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیا۔ اللھم احفظنا۔ غرض اس ہنگامے میں باہر کی خبروں کا آنا جانا بالکل بند تھا۔ ایسی حالت میں مِس کو اِس کے سوا اور کیا خیال آسکتا تھا کہ مولوی لوگ مار یا لونڈی بنا کر رکھیں گے وہ نہایت مایوسی کی حالت میں تھی مگر اُس کے مزاج میں طنطنہ وہی تھا جو ایک قوم فاتح کی لیڈی میں ہونا چاہیئے۔ اب میم کی رہائی کا وقت قریب آتا جاتا تھا اُس نے از خود مولویوں سے کہا کہ "یہ گولہ باری جو رات دن ہوتی رہتی ہے بے شک انگریز مقابلے میں ہوں گے شمال کی طرف سے مقابل کے گولے آتے ہیں میں خیال کرتی ہوں کہ انگریزوں کی چھاؤنی انبالہ انگریز پنجاب سے آ پہنچے اور وہی گولے برسا رہے ہیں تو کسی طرح اتنی بات تحقیق کر دو کہ میرا یہ خیال صحیح ہے یا نہیں۔"

میم کے پناہ دینے میں ایک بڑی مشکل رازداری کی تھی تو مولویوں نے مولانا نذیر احمد صاحب اور شعیب اور تمیز کے سوا جو تھے کسی کو خبر نہیں ہونے دی اور یہ سب کچھ تقاضائے دینداری تھا مسجد میں جہادی بھرے ہوئے تھے اگر کہیں میم کی پناہ دہی ہونے کی ذرا بھی ہوا چھوٹتی تو نہ صرف مولویوں کے گھر بلکہ سارا محلہ باغیوں نے توپوں سے اڑا دیا ہوتا۔ ایک دفعہ کچھ اڑتی پڑتی خبر اڑ گئی تھی کہ مولویوں نے کسی میم کو چھپا رکھا ہے باغی دَرّانے گھر میں گھس پڑے میم کو رات دن کوٹھری میں چھپائے رکھتے تھے اُس وقت جھٹ پٹ اُس پلول کی کوٹھی میں چھپا دیا اور اُوپر سے اُپلے چُن دیئے باغیوں نے اِدھر اُدھر گھر کی تلاشی لی اور چلتے ہوئے رسیدہ بو وبلائے چلے گئے بہر خبر گزشت میم کے تقاضا کرنے سے شعیب اس بات کے واسطے منتخب ہوا کہ وہ رستہ کترا تا ہوا چھاؤنی کی خبر لائے چنانچہ شعیب نے کوئی ایک مہینے کے بعد آکر خبر دی کہ انگریز اور سکھ اور کچھ ولایتی چھاؤنی پر قابض ہیں اور شعیب کو اپنے ہم وطنوں کے ذریعے سے انگریزوں کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے کہ اُنھوں نے حکمتِ عملی سے پنجاب میں بغاوت نہیں ہونے دی اور جو پلٹنیں اور رسالے مشتبہ تھے اُن سے ہتھیار رکھوا لیئے اور جن لوگوں کی وفاداری اور خیر خواہی پر پورا اعتماد تھا اُن کو ساتھ لے کر دہلی کے محاصرے کے لیئے چل کھڑے ہوئے اِدھر باغیوں کو خبر لگی تو اُنھوں نے دہلی کے باہر نکل کر علی پور[1] تک مورچہ بندی کر دی۔ شہر کی فصیل پر توپیں چڑھا دیں شہر سے علی پور تک تین یا چار مورچے تھے سب سے اخیر مورچہ علی پور کا۔ پھر بادلی کی سرائے کا۔ پھر سبزی منڈی کا۔ پھر قدسیہ باغ کا۔

باغیوں کو ایک عجیب طور پر انگریزوں کی آمد کی خبر لگی کہ غدر ہونے کو ہوا تو دہلی کا کوتوال تھا پھوسنگھ وہ دہلی کا رہنے والا تھا اور اُس کا سارا خاندان دہلی میں تھا وہ غدر ہوتے ہی کسی تدبیر سے بھاگ کر پنجاب میں انگریزوں سے جا ملا اب جو دھاوے اور محاصرے کی ٹھہری تو پھوسنگھ رسد رسانی کی خدمت پر مامور ہوا تھا یہ بدنصیب یہاں آیا اور پکڑا گیا اس کے پاس پروانے نکلے اور اب باغیوں کو یقین ہو گیا کہ انگریز چڑھے چلے آ رہے ہیں ورنہ شہر میں افواہ تو یہ تھی کہ انگریزوں کا بیج مارا گیا۔ ایک زمیندار نے آکر یہ خبر دی کہ سڑک پر چار گورے دیکھے اُن کے پاؤں زخمی تھے اور وہ بھیک مانگتے آ رہے تھے اور گڑ گڑا کر کہتے تھے کہ ہمیں کھانے کو دو ہم مسلمان ہوتا ہے اسی طرح میمیں منتیں سماجتیں کرتی تھیں کہ ہم کو مت مارو ہمیں لونڈی بنا کر رکھو ہم مسلمان ہوتے ہیں مگر یہ نالائق کب ماننے والے تھے چُن چُن کر ایک ایک کو سخت بے رحمی سے تہ تیغ کیا۔

[1] علی پور دہلی سے چھ سات میل کے فاصلے پر واقع ہے ٹرنک روڈ پر ۱۲

سنا ہے کہ آدھی رات کے وقت انگریزی فوج میں غل ہوا وہ لوگ بھی علی پور پر ٹھیرنے کو تھے جب معلوم ہوا کہ علی پور پر باغی قابض ہیں تو انھوں نے تین میل پیچھے ہٹ کر پڑاؤ کیا تو باغیوں کے مقدمۃ الجیش نے آواز سن کر جانا کہ انگریز آگے کو بڑھے۔ سنا ہے کہ انگریزوں نے ایک رسالے کے رسالے پر اشتباہ کرکے اُسی رات اُن سے ہتھیار رکھوا لیے اور اُن کی جگہ خیر خواہان بلا اشتباہ کا ایک نیا رسالہ مرتب کیا تھا۔ اور اُن کے سواروں کو سکھا دیا تھا کہ تم لوگ بے دھڑک دین دین کہتے ہوئے باغیوں کے سنٹر میں گھسے چلے جاؤ۔ باغی لوگ اس دھوکے میں آ گئے اور انھوں نے اس مصنوعی رسالے کو اپنے سنٹر میں آنے دیا جب وہ لوگ سنٹر میں داخل ہو گئے تو اُنھوں نے اپنی ساتھ کی توپوں پر بتی رکھ دی۔ یہاں باغیوں میں ارباب نشاط کے جلسے ہو رہے تھے توپوں پر بتی کا رکھنا تھا کہ ڈیر کے کئی ہزار آدمی جو توپوں کی زد میں تھے ہلاک ہو گئے اور پھر بھاگڑ مچی اگر انگریز تعاقب کرتے ہوئے چلے آئیں تو اُسی روز دہلی فتح ہو جاتی بیچ کے مورچے والوں نے علی پور والوں کو بھاگتا دیکھ کر کچھ مقابلہ نہیں کیا۔ مگر انگریزوں نے از خود یہ خیال کہ شہر میں باغی بھرے ہوئے ہیں چھاؤنی ہٹ بیر سے ٹال دیے ورنہ بلا مزاحمت قلعے پر قبضہ کر سکتے تھے یہاں اُن کا کوئی روکنے والا نہ تھا۔ اب طرفین سے گولہ باری شروع ہوئی دن کے وقت نہ تو انگریزی گولوں کی آواز اچھی طرح سنائی دیتی تھی اور نہ گولہ آتا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر رات کو تو انگریزی توپوں کی رنجک تک اچھی خاصی طرح نظر آتی تھی اور گولے بھی لال انگارے کی طرح جلتے ہوئے سوجھ پڑتے تھے۔

مولوی پنجابی کٹرے میں رہتے تھے شہر کی شمالی فصیل کے قریب اور اسی اعتبار سے ہمارے مولانا کا محلہ انگریزوں کے گولوں کی زد پر تھا جنوبی حصے میں شہر کے رہنے والے محفوظ تھے غرض کئی مہینے تک دن رات طرفین سے گولے چلتے رہے میم جو مولانا کی سسرال والوں کی پناہ میں تھی اب وہ بہت گھبرانے لگی اور اُس نے مولویوں سے کہا جس طرح ہو سکے میری چٹھی انگریزوں تک پہنچاؤ مولویوں نے قرآن کی شیرازہ بندی توڑ کر میم کی چٹھی قرآن میں داخل کر دی اور شعیب اُس قرآن کو لے کر انگریزی کیمپ میں پہنچا اور جس طرح میم کی چٹھی لے گیا تھا اُسی طرح اُس کا جواب لایا کیمپ سے میم کو جو پہلی چٹھی آئی تھی اُس کا غالباً یہ مضمون تھا کہ ابھی تک ہم لوگ دشمنوں کے حملوں کو ہٹا رہے ہیں قلعہ شکن توپیں منگوائی گئی ہیں وہ پہنچ جائیں تب ہمارے دھاوے شروع ہوں اُس وقت تک جہاں ہو چپ چاپ بیٹھی رہو۔ جب ہماری طرف کے گولے جامع مسجد کے پار جانے لگیں یا قلعے میں گرنے شروع ہوں تو جاننا کہ توپیں آ پہنچ گئیں تمھارا آدمی سولھویں دن کیمپ میں پہنچا اور اُس کے بیان سے معلوم ہوا کہ اُس کو راہ میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں جن صاحب کے گھر میں تم نے پناہ لی ہے اُن کے تفصیلی حالات اور اُن کے مکان کا پتہ سب تمھارے آدمی سے دریافت کر لیا گیا ہے اُن پر سرکار اور تمامی سرکاری عہدہ داران ملکی و فوجی کی احسان مندی کماحقہ طور پر ظاہر کر دینا اور یقین ہے کہ وہ اُن تمام وعدوں سے جن کا اس وقت کر لینا بہت آسان ہے اس کی بہت زیادہ قدر کریں گے۔" شاید تین یا چار چٹھیوں کی آمد و رفت ہوئی اور انگریزوں کو شعیب کا اعتبار بھی ہو گیا۔ آخر انگریزوں نے شعیب کی زبانی کہلا بھیجا کہ میم کو ہمارے کیمپ میں پہنچا دو اور شاید میم کے نام بھی چٹھی آئی ہو بہر حال ایک دن قرار پایا اور یہ ٹھیری کہ میم کو پھیر کے رستے سے لے جانا تو خطرناک ہے اس میں کئی دن لگیں گے اور ممکن ہے کہیں یہ عورت پہچانی جائے شعیب کوہستانی علاقے کا رہنے والا تھا اُس نے یہ رائے دی کہ شہر کے باہر رات کے وقت میں ایک مقام پر چپ لیٹ جاؤں گا اور میم میری پیٹھ پر چڑھ جائے میں اُس کو ناک کی سیدھ انگریزوں کے سرے کے مورچے پر پہنچا دوں گا۔ گولے ادھر اُدھر آتے جاتے رہیں گے ہم نیچے نیچے صحیح سلامت پہنچ جائیں گے شعیب نے یہ بھی کہا کہ سرے کے مورچے پر مجھے معلوم ہے ولایتی ہی ہیں میں ٹوٹے اُن کے ساتھ پشتو میں باتیں کر لوں گا اور میں اُس انگریز سے

جس کے پاس سے چٹھیاں لانا جاتا تھا کہ ہبھی آیا ہو کہ کیمپ میں ہم کا ہر آنا اس طرح پر ہو گا تو تم مورچے والوں کو خبر کیئے رہو جن دنوں کا یہ واقعہ ہے باغیوں نے شہر کے دروازوں پر بڑی سختی کر رکھی تھی لوگوں کو بڑی مشکل سے باہر جانے اور اندر آنے دیتے تھے۔

مولویوں نے تو یہ کیا تھا کہ شاہی رتھ خانے سے ایک رتھ مانگ کر لائے جو اُن کو آسانی سے مل گئی اور یہاں منفرس ہے کچھ پہلے رتھ میں ہم کو بٹھایا اور اُس میں مولوی عبد القادر صاحب کی بیٹی مولٰنا کی سالی اور مولوی نذیر حسین صاحب کی بیٹی کہ وہ بھی مولٰنا کی سالی ہوئیں اور مولوی عبد القادر صاحب کی خالہ بیوہ اور ۳ یا ۴ بچے سب رتھ میں بھر گئے سب کے بیچ میں ہم دبی جھکی بیٹھ گئی رتھ کے ساتھ شعیب صاحب لاہوری دروازے پر یہ لوگ پونہچے تو پہرے والوں نے پردہ اُٹھا کر تلاشی لینی چاہی اُن سے یہ عذر کیا گیا کہ مولویوں کی بہو بیٹیاں ہیں قدم شریف منتیں اُتارنے جاتی ہیں اور ابھی چھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ کر آئیں گی۔ مولویوں کا نام سُن کر باغیوں نے کاوش نہیں کی اور رتھ کو نکل جانے دیا ؎

جب سے ہم مولویوں کی پناہ میں آئی تھی ہمارے مولٰنا کو اُس تک جانے کی اجازت نہ تھی جس دن کیمپ میں جانے کو ہوئی تو مولٰنا سے زنانے مکان میں ملاقات ہوئی۔ ہم نے مولٰنا کا بہت شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئی لیکن آخر تفصیلی حالات جب سے کہ وہ مولویوں کے زنانے مکان میں آئی تھی مولٰنا کو اپنی اہلیہ سے معلوم ہوتے رہتے تھے ؎

غرض شعیب کے گئے پیچھے کوئی دو ہفتے تک سناٹا رہا۔ آخر وہ دن آیا کہ انگریزوں نے شہر پر دونوں طرف سے حملہ کیا ایک لاہوری دروازے کی طرف سے اور دوسرا کشمیری دروازے کی طرف سے باغی اپنی بے تدبیری سے کشمیری دروازے کا مورچہ خالی چھوڑ کر لاہوری دروازے پر جمع ہو گئے انگریزوں نے کشمیری دروازے پر زور ڈال کر باہر کی طرف سے کچھ آدمی اندر کی طرف کر دیئے کمند لگائی ہو گی یا اَور کوئی عمل کیا ہو گا۔ کو دنے والوں نے پتھر جو آڑ ارکھے تھے ہٹا کر دروازہ کھول دیا اور فوج اندر آ گئی یہی وہ موقع ہے کہ نکلسن[1] صاحب کمانڈنگ افسر جو اس دستہ فوج کے قائد الجیش تھے کسی باغی کی گولی سے زخمی ہوئے زیر ناف گولی لگی اور آخر کو مہلک ثابت ہوئی۔ یہ دستہ کشمیری دروازے سے سیدھا قلعے کو چلا جب پن چکیوں[2] کے قریب پونہچا تو منصور علی خاں کی حویلی[3] کے پیچھے کچھ باغی گھات لگائے بیٹھے تھے جوں ہی یہ دستہ موڑ پر آیا باغیوں نے بندوقیں داغ دیں دستہ منتشر ہو گیا شام ہو گئی تھی جہاں جس کے سینگ سمائے خالی مکانات میں پناہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اب شہر میں لڑائی شروع ہو گئی اور باغی دُشمن کی طرف کو پیچھے ہٹنے شروع ہوئے مولٰنا کا سُسرالی مکان لب سڑک تھا اور ان مولویوں نے بھی چاروں طرف کے کواڑ بند کر کے پتھر آڑ ار کھے تھے کوئی ڈیڑھ پہر رات گئی ہو گی کہ ایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سڑک پر سنائی دی اور ایک سوار کو چلّاتے سُنا کہ "مولویوں کا مکان کون سا ہے" مولویوں میں سے کسی نے کواڑ کے پاس جا کر سوال سے پوچھا کہ "تمہارا کیا مطلب ہے" اُس نے کہا کہ "جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر کچھ رات رہے

---

[1] جنرل نکلسن۔ ان ہی کا بت لارڈ کرزن نے بطور یادگار قدسیہ باغ میں جو بیرون کشمیری دروازہ ہے استادہ کر دیا ہے جن کے ہاتھ میں ایک شمشیر برہنہ ہے اور اُن کی گردن کشمیری دروازے کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ گویا فتح دہلی اور دھاوے کا اشارہ کر رہے ہیں ۱۲

[2] جامع مسجد اور قلعے کے درمیان شمالی حصے میں ایک مقام ہے جہاں نہر کے پانی کے زور سے چکیاں چلا کرتی ہیں ۱۲

[3] پن چکیوں کے قریب ہی یہ حویلی اُن وقتوں میں تھی اب نہیں ہے ۱۲

کابلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں صبح سے پہلے پہلے اس محلے پر دھاوا ہوگا۔"

غرض بڑی بدحواسی سے مولوی مع بال بچوں اور عورتوں کے کوٹھوں کوٹھوں تین کی طرف بھاگے ان میں ہمارے مولانا بھی شریک تھے اس وقت کی پریشانی بیان نہیں کی جاسکتی جتنے منھ اتنی باتیں بعض کی تو یہ رائے تھی کہ کہیں مت جاؤ یہیں گھروں میں بیٹھے رہو اور بعض کی یہ صلاح تھی کہ جب بلی حکم آیا ہے تو نکل جانا چاہیے غرض یہی رائے غالب رہی اور عورتوں نے اپنا زیور اپنے ہاتھوں سے نکال نکال کر صحن میں پھینک دیا اور ململ تن زیب کے دوپٹوں کی جگہ فرش کی چاندنیاں پھاڑ پھاڑ کر اوڑھیں صبح ہوتے ہوتے مولوی لوگ باغ میں پہنچے اب انگریزی گردیں اور ان لوگوں میں صرف ایک سڑک حائل تھی چاہتے تو باغ میں ٹھہرتے مگر ڈر کے مارے سوئی[1] والوں کے محلے میں پہنچے وہاں ان لوگوں کی کچھ رشتہ داری تھی مکان دیکھا کہ خالی ہے چولھے کے پاس لگن میں آٹا گندھا ہوا رکھا ہے توا چڑھا ہے آگ ٹھنڈی پڑی ہے معلوم ہوتا ہے کہ روٹی پکانے کی نوبت نہیں آئی کوئی خطر عاجل پیش آیا کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ خیر مولویوں کا خاندان تو ٹھہرا۔ اور یہ لوگ آگے چل بھی نہیں سکتے تھے۔ عورتیں ساتھ تھیں پردے اور سواری کا کچھ انتظام نہیں عورتوں بے چاریوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ایک ایک پاؤں چھلنی ہو گیا۔ ترکمان دروازہ اس محلے سے قریب ہے اور اندرون دروازہ ایک مسجد ہے نماز عصر کے لیے یہ لوگ مسجد میں گئے تو دیکھا کہ دروازے میں ایک نوجوان سپاہی کھڑا ٹہل رہا ہے وہ قرآن بھی بلند آواز سے پڑھتا جاتا تھا بس اتنی مناسبت مولانست کے لیے کافی تھی۔ اس سپاہی نے مولویوں کا حال سن کر کہا کہ لوگ ناحق ڈر کر بھاگ رہے ہیں ابھی انگریزوں کا تسلط جامع مسجد کی شمالی طرف تک نہیں ہوا جب بھاگنے کا وقت آئے گا میں تم کو خبر کر دوں گا تم شہر بدر ہو جانا شاید تیسرے دن علی الصباح اس نوجوان سپاہی نے آکر کہا کہ رات انگریز جامع مسجد پر آگئے مجھے اس سے معلوم ہوا کہ گولہ اوپر سے برس رہا ہے تو اب تم لوگ نکل جاؤ۔ یہاں تک انگریزوں کے آنے میں بڑا وقفہ ہے اور اگر باغی مقابلہ کر رہے ہیں تو شاید کئی دن لگیں۔ بہرکیف یہ لوگ عرب سرائے[2] پہنچے۔ وہاں بادشاہ بھی ٹھہرے ہوئے تھے ایک دو دن تو امن سے گزرے پھر سنا کہ بادشاہ اور ان کے ملازموں کی دار و گیر شروع ہوئی تو یہ مولویوں کا خاندان سلطان نظام الدین بھاگ گیا۔ شہر کی خلقت وہاں بھی بھری پڑی تھی وہاں سے پاؤں اکھڑے تو مولویوں نے وزیر آباد[3] کا ارادہ کیا رستے میں گوروں کا ایک گارد آتے ہوئے ملا اس نے مولویوں کے گروہ میں سے مردوں کو گرفتار کر لیا اور عورتوں کو چھوڑ دیا اس وقت کی پریشانی اور عورتوں کی واویلا کا کیا پوچھنا ہے صرف ایک کم سن لڑکا حافظ عبدالواجد جو مولوی عبدالقادر صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے عورتوں کے ساتھ تھے باقی کل مرد دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس گرفتاری میں مولوی نذیر حسین صاحب۔ مولوی عبدالقادر صاحب اور ہمارے مولانا۔ اور دو ایک اور آدمی تھے۔ گوروں نے ان لوگوں کو شہر کی کوتوالی میں لاکر حوالات کر دیا اسی طرح بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے اور سب قطار در قطار بٹھائے گئے تھے اور سب کو سلسلہ وار پھانسی دی جاتی تھی۔ وہاں ایک بخشی صاحب ساتھ تھے وہ

[1] سوئی والوں کا محلہ جتنی قبر سے آگے چل کر دائیں ہاتھ کو واقع ہے۔ [2] عرب سرائے بیرون دہلی ہمایوں کے مقبرہ کے متصل واقع ہے۔ [3] دہلی سے پانچ میل ہے۔[4] [5] وزیر آباد دہلی سے چھ سات میل پر واقع ہے ۱۲ ش۔ اس بخشی نے مولویوں کو تو چھڑا دیا۔ لیکن جو شخص ایسا قسی القلب ہو کہ صدہا آدمیوں کو پھانسی دلوا دے اور اس کا دل نہ پسیجے اس نے یہ بات بے فائدہ تو نہ کہی ہوگی کہ یہ لیساطی ہیں۔ اس زمانۂ شورش میں صرف مولوی کہہ دینا پھانسی دینے کے واسطے کافی تھا۔ بعد تسلط عمل داری انگریزی اسی سے مولوی عبدالقادر صاحب کو آزاد پایا کہ لائیے مولوی صاحب کچھ دلوائیے۔ میں نے آپ سب صاحبوں کی جان بچائی [illegible]

نشان دہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں جب ان مولویوں کی باری آئی نہیں معلوم اُس کے دل میں کیا رحم آیا اُس نے کہا کہ یہ سب بے چارے بساطی لوگ ہیں۔ اگر کہیں اُس کے مونہ سے نکل جاتا کہ یہ مولوی ہیں تو پھر یہ سب پھانسی پاتے لیکن زندگی باقی تھی بچ گئے طرفہ یہ کہ لین کی میم نے ایک چٹھی مولویوں کو لکھ دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ جب تم کو کام پڑے یہ دکھا دینا اور وہ چٹھی ہمارے مولٰنا کی پگڑی میں تھی۔ مگر اُس کے دکھانے میں پس و پیش کیا۔ انگریزی تو ان میں سے کوئی پڑھا نہ تھا۔ گمان ہوا خدا جانے اُس نے کیا لکھ دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ شکایت لکھی ہو تو اُلٹے لینے کے دینے پڑجائیں اِس ڈر سے پیش نہ کی گئی ورنہ اگر وہ چٹھی دکھلا دی جاتی تو اتنی زحمت نہ ہوتی اور مفت رہائی ہو جاتی۔

اتفاق سے جس دوکان میں یہ لوگ قید تھے اُس کے کوٹھے پر مسٹر لوئس جو میگزین میں کوئی خدمت رکھتے تھے ٹھیرے ہوئے تھے۔ شام کو ہوا خوری کے لیئے اُترے تو زینے کے قریب ہمارے مولٰنا مولوی نذیر احمد صاحب کھڑے تھے مسٹر لوئس نے غدر سے پہلے ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کی سفارش سے مولٰنا سے کچھ اُردو پڑھی تھی۔ غرض تعارف اچھا تھا زینے سے اُترے تو اُنھوں نے مولٰنا کو پہچانا اور حالات معلوم کرکے اِن سب لوگوں کی حالت پر بہت افسوس کیا۔ ہوا خوری کو تو نہ گئے اور ان سب کو کوٹھے پر لے گئے وہاں چائے پلائی اور کھانا کھلایا اور کماندٹ آفیسر کو لکھ کر راہ داری کا پروانہ دلوا دیا۔

اَب یہ لوگ عورتوں کی جستجو میں پریشان پڑے پھرتے تھے بڑے تجسّس کے بعد یہ پتا لگا کہ مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب واعظ جو مولوی شریف حسین صاحب کے خسر ہوتے تھے عورتوں کو برنالے میں لے گئے جہاں اُن کے کچھ مرید رہتے تھے غرض رہا شدہ مولوی بھی وہیں پہونچے اور وہاں مبتلاے تپ لرزہ ہو گئے۔ اِن میں صرف مولوی عبدالقادر صاحب بچے ہوئے تھے۔ آخر اُنھوں نے یہ مشورہ کیا کہ سرکاری فیل خانے میں کسی فیل بان کے پاس ٹھہریں۔ اِس شخص کا پتہ اُن کو برنالے والوں سے ملا ہوگا کہ فلاں فیل بان یہاں کا بڑا زمیندار ہے اور مولویوں کا معتقد بھی ہے۔ اس شخص نے مولوی عبدالقادر صاحب کی مریدانہ بڑی مدارات کی۔ سرکاری ہاتھی ہر دم مکانات کے لیئے شہر میں بھیجے جاتے تھے مولوی

(بقیہ صفحہ ۴۵) ورنہ میرا ایک ہاتھ بھی آپ سب لوگوں کو جنت الفردوس پہونچا دیتا۔ مولوی عبدالقادر صاحب بہت ہی کھرے مزاج کے آدمی تھے۔ فوراً یہ سُن کر برافروختہ ہو گئے۔ مخبر کو دو یاد لایا تو کچھ نہیں اور اُلٹا اُسے لتاڑا۔ تازہ شورش تھی باغیوں کی تحقیقات ہو رہی تھی۔ سیکڑوں انگریز اور میمیں اور بچے مارے گئے تھے مخبر نے جھٹ جڑ دیا کہ مولوی عبدالقادر نے فلاں انگریز کو مار ڈالا ہے۔ مولوی صاحب فوراً گرفتار ہو گئے۔ کئی مہینے حوالات میں رہے۔ سُنتے ہیں کہ جو سنتے گواہ چشم دید واقعہ قتل کے پیش ہوئے حتی کہ دو میمیں آئیں اُن سے بھی کہلوا دیا کہ ہمارے خاوند کا قاتل یہی مولوی ہے۔ اب کیا باقی تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ اِس کی خبر لین کی میم نے اپنے شوہر کو دی وہ بے چارہ کہیں باہر تھا دوڑا ہوا آیا اور اُس نے کہا یہ کیا غضب ہے۔ اِن ہی مولوی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری میم کی جان بچائی یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ انگریز کے قاتل ہوں۔ غرض یہ انگریز کچہری میں آیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب اس کی صورت نہیں پہچانتے تھے۔ حاکم مجوزہ اور وہ بہت دیر تک کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مولوی صاحب نے سمجھا کہ شاید مجسٹریٹ کی بدلی ہوئی ہے کوئی دوسرا صاحب آیا ہے اور وہ چارج لے رہا ہے۔ لیکن بعد کو وہ اُٹھا اور کہا کہ جاؤ مولوی صاحب کے کپڑے لاؤ۔ وہیں دُھلے ہوئے کپڑے آئے۔ مولوی صاحب کے کپڑے بدلوا اُن کو اس آفت سے نجات دلوائی۔ اور بڑی دھوم دھام سے مولوی صاحب چھوٹ کر اپنے گھر گئے۔

یہ ہے کہ کرتو ڈرا ورنہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ سنا ہے کہ بخشی صاحب نے مولوی صاحب سے پانسو روپئے مانگے تھے اگر مولوی صاحب اُسے کچھ بھی دے دیتے تو اس کشمکش میں نہ پڑتے ۱۲

عبدالقادر صاحب نے عورتوں کے زیورات ایک پٹاری میں بھر کر پنجابی کٹرے کی مسجد کے ایک حجرے میں تہِ زمین دفن کر دیئے تھے تاکہ لوٹنے والوں کو سراغ نہ ملے۔ اُس زیور کے نکالنے کے لیئے مولوی عبدالقادر صاحب فیل بانوں میں مل کر شہر میں آئے۔ کھود کر پٹاری نکالی اور فیل بانوں کے ساتھ شہر کے باہر ہو گئے۔ مولوی لوگ اکثر بھولے بھی ہوتے ہیں اَکْثَرُ اَہْلِ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ، فیل بانوں کی ارادۂ منہی دیکھ کر مولوی عبدالقادر صاحب سب کے سامنے پٹاری کھول بیٹھے اُنھوں نے دیکھا پٹاری میں جھڑا سونا چاندی رات کو زیور نکال پٹاری میں پتھر بھر دیئے مولوی صاحب بند کی بندے کر بڑوالے آئے اُس وقت ہمارے مولانا مسجد کے ایک حجرے میں بخار میں پڑے تھے بچوں کو غل مچاتے سُنا کہ مولوی صاحب زیورات کی پٹاری نکال لائے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سُنا کہ مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبے جا رہے ہیں اس لیئے کہ اُن کو بردلے پہنچ کر معلوم ہوا کہ پٹاری میں پتھر بھرے پڑے ہیں۔ غرض خود مولوی صاحب اور جن عورتوں کا زیور تھا سب کے سب رو دھو کر بیٹھ رہے۔ اِس پٹاری میں زیادہ مالیت ہمارے مولانا کی تھی۔ مولانا کی بی بی کا کل زیور تھا۔ مولانا کا چاندی کا حقہ۔ چاندی کا سرپوش۔ چاندی کی چلم۔ چاندی کا قلم دان وغیرہ۔ اِس قسم کی چیزیں تھیں مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبتے تو کیا اور اُن کو ڈوبنے بھی کون دیتا وہ بے چارے بھی رو دھو کر چپ ہو رہے ہوں

ہمارے مولانا کو معلوم تھا کہ ماسٹر رام چندر تو عیسائی کالج کے ریاضی کے اُستاد انگریزی فوج میں ہیں مولانا اُن سے ملنے کے لیئے وزیر آباد آئے۔ معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب شہر میں آباد ہو گئے ہیں۔ مسٹر لوئس نے مولانا کو پروانۂ راہداری دلوا ہی دیا تھا مولانا اس پروانے کے ذریعے سے شہر میں آئے اور پھر ماسٹر صاحب کی صلاح اور سفارش سے اسی پروانۂ راہداری کی حمایت پر عورتوں کو بھی مولوی لوگ شہر میں لے آئے۔ یہاں لوٹ کا بازار گرم تھا۔ سکھ مسلمانوں کو اور ولایتی ہندوؤں کو لوٹتے تھے

ڈپٹی انسپکٹری مدارس الہ آباد پر مامور ہونا

اتنے میں ہنری اسٹوارٹ ریڈ جو اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات تھے دہلی آکر اُور انگریزوں کے ساتھ قلعے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اُن کے ہیڈ منشی مولوی کریم بخش صاحب سے ماسٹر رام چندر کے کوٹھے پر مولانا سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے مولانا کو ریڈ صاحب تک پہنچا دیا۔ ریڈ صاحب نے حالات سُن کر مولانا کو الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس پر مامور کر دیا۔ مگر کہا کہ تم الہ آباد کو پہنچو گے کیوں کر۔ رستے بھر غدر ہو رہا ہے۔ یوں کرو کہ میں راجہ گوالیار کو اُن کے راج پر مسلط کرنے کے لیئے گوالیار فوج سے کر جا رہا ہوں وہاں سے فرخ آباد، مین پوری، کان پور کا غدر فرو کرتا ہوا الہ آباد پہنچوں گا۔ تم بھی میری فوج کے ساتھ رہو۔"

غرض اس طرح مولانا الہ آباد کو پہنچے۔ صاحب کلکٹر سے ملے اُنھوں نے کہا "ابھی ضلع میں اَمن نہیں۔ مگر تم دور سے آئے ہو اور بمشکل یہاں پہنچے ہو اسی رتبے کے عوض تم کو پچاس روپے ملیں گے۔ یہاں ٹھیرو امن ہوتے پیچھے مدارس کی خبر لینا"

ایک اور آفت کا سامنا

ابھی الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹری کا کام شروع نہیں کیا تھا کہ دہلی میں مولانا کے خاندان پر ایک آفت[1]

---

[1] آفت یہ ٹوٹ پڑی کہ دَورانِ بغاوت میں جنرل بخت خاں نے ان مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مُہریں کرالیں گورنمنٹ برطانیہ کو ان مُہروں کی خبر ہوئی تو بجائے انعام و اکرام و خلعتِ خیر خواہی کے جان بخشی پر اکتفا کیا۔ [illegible] کی خیر خواہی نہ ہوئی ہوتی تو پھانسی میں کیا کسر رہ گئی تھی ۱۲ [illegible] سے بھاگ نکلنے [illegible]

ٹوٹ پڑی۔ مولویوں پر میم لیبن کے معاملے میں لغو اور بے اصل شبہات کیئے گئے اور وہابیانِ پٹنہ کی سازش کے الزام میں مولوی
نذیر حسین صاحب کی خانہ تلاشی ہوئی اور ان کو پکڑ کر لاہور لے گئے اور نیز مولوی عبدالقادر صاحب جھوٹی مخبری پر پکڑے گئے
ان کے چھوٹنے کا حال ہم اسی حصّے کے فٹ نوٹ میں لکھ چکے ہیں۔ غرض ہمارے مولانا یہ سن کر بھاگے ہوئے دہلی آئے
اس وقت میم لیبن نے بڑا کام کیا کہ وہ گڑھی[۲] ہرسرو سے جہاں اس کا شوہر مسٹر لیبن پرمٹ کا پٹرول تھا اپنے شوہر کو ساتھ
لے کر دہلی آئی اور وکالت کرکے مولوی عبدالقادر صاحب کو حوالات سے چھڑایا۔ اسی نے شاید مولویوں سے کہہ دیا تھا کہ
تم نے جو ہماری خیرخواہی کی ہے ہم اس کے صلے میں تم کو سرکار سے انعام دلوائیں گے یہی انعام موعود کے استحقاق میں وجہ
باہمی قرابت کے مولویوں میں اختلاف ہوا۔ اس اختلاف کی زد میں ہمارے مولانا بھی آنے ہی کو تھے مگر اَلْحَقُّ یَعْلُو وَلَا یُعْلٰی۔
نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا۔ مولوی شریف حسین صاحب نے دعویٰ کیا کہ مولوی نذیر احمد صاحب کو جو نوکری
مل گئی ہے وہ میرے باپ مولوی نذیر حسین صاحب کا حق ہے یہ دعویٰ فقط جزوی مشارکت اسمی کی وجہ سے تھا کہ مولانا کا نام نذیر احمد
ہے اور شریف حسین صاحب کے والد کا نام نذیر حسین مگر ایسا لغو دعویٰ پیش رفت ہونے والا نہ تھا۔ اور پیش رفت ہوا بھی نہیں اس میں
کچھ شک نہیں کہ مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب نے مسز لیبن کی جان بچائی لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مولوی
نذیر حسین صاحب مسز لیبن کو کہیں سے اٹھوا کر لائے اور اپنے گھر میں رکھا بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اور منشی
اور شعیب مسز لیبن کو اٹھا کر لائے اور ان تینوں میں بھی ابتدائً سچی ہمدردی اگر کسی نے مسز لیبن سے کی تو وہ ہمارے مولانا
ہیں مسز لیبن کو جب کہ وہ سڑک پر بے ہوش پڑی تھی کس نے اس کی جان کی حفاظت کی؟ منیر کی بے رحمی سے کس نے بچایا؟
پیاس کی بے قراری میں شربت کس نے پلایا؟ اور مولویوں کے گھر میں کس نے لا کر رکھا ہے کوئی شخص جو ہمارے مولانا کے سوا
اور کا نام لینے کی صحیح جرأت کر سکے۔ غرض ان لغو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں میں تا ایں دم صفائی نہیں ہوئی۔

۱؎ وہابیت (بغاوت) کا مقدمہ ۱۸۶۴ء و ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۰ھ و ۱۲۸۱ھ میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں۔ پٹنہ۔ داناپور۔ میرٹھ۔ انبالہ وغیرہ وغیرہ میں چلایا گیا تو بیشتر ماخوذین کے لیے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔ جناب مولوی یحییٰ علی و مولوی احمد اللہ خان صاحبان مہدانوی صادق پوری عظیم آبادی (جنہوں نے انڈمان ہی میں وفات پائی) کے مقدمے کی لپیٹ میں میاں صاحب پر بھی مواخذہ ہوا جو صرف مخبروں کی غلط خبر رسانی اور اہلکاروں کی غلطی پر مبنی تھا اور آپ تا تحقیقات کامل کم و بیش ایک برس تک راولپنڈی کے جیل میں نظر بند رہے۔

دہلی میں جب میاں صاحب کے مکان اور مسجد کی تلاشی ہوئی تو دوسروں کے بھیجے ہوئے خطوط بہ تعداد کثیر بے ٹھکانے دری پر چٹائی پر دری کے نیچے چٹائی کے نیچے چارپائی کے نیچے کتابوں میں پڑے ہوئے پائے گئے۔ پوچھا گیا آپ کے ہاں اس قدر بہ کثرت خطوط کیوں آتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ جو اس کی وجہ بھیجنے والوں سے پوچھنی چاہیئے یا ان خطوط میں دیکھنا چاہیئے میرے خیال میں یہ بات ہے کہ سرکار نے خط کا محصول بہت کم آدھ آنہ رکھا ہے اس لیئے لوگ دو پیسے دے کر خط بھیج دیتے ہیں دیکھیئے اس میں کوئی خط ابھی تک نہیں ہے سب پڑے ہیں۔ خطوط جو پڑھے گئے تو ان میں ان کے سوا اور کیا تھا کہ فتوے کا سوال ذیل میں درج ہے حضور اس کا جواب جلد بھیج دیں فلاں مسئلے میں کیا حکم ہے۔ فلاں کتاب کی فلاں عبارت کا صحیح مطلب کیا ہے فلاں موضوع پر متقدمین کی کبھی کوئی تصنیف ہے۔ فلاں کتاب بھیج دیجیئے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے مضامین تھے۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ نخبۃ الفکر (فن اصول حدیث پر ایک کتاب ہے ۱۲ مؤلف حیاۃ النذیر) بھیج دیجیئے۔ مخبر نے کہا یہی ان لوگوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ میاں صاحب کو بھی جلال آ گیا فرمانے لگے نخبۃ الفکر کیا ہے حق نخبۃ الفکر کیا گولہ بارود۔ پھر مجسٹریٹ سے آپ نے کہا صاحب آپ نے میرا مقدمہ کس جاہل کے سامنے پیش کیا ہے آپ اپنے کسی یورپین یا دیسی عالم سے دریافت کیجیئے کہ نخبۃ الفکر کتاب کا نام ہے یا نہیں اور اس کتاب کا موضوع کیا ہے (از حیاۃ بعد المماۃ) ۱۲

۲؎ گڑھی ہرسرو ضلع گوڑگانوہ میں ایک مقام ہے ۱۲

اگرچہ مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اِس میم کی جان بچائی لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا کہ مولویوں کی خیر خواہی کی کچھ داد نہیں ملی۔ جب دہلی کا قضیۂ غدر ختم ہوا تو پھر مولٰنا الہ آباد کو پہنچے اور وہاں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے اِس موقع پر مولٰنا فرماتے ہیں۔:-

"مگر سررشتۂ تعلیم کی یہ حالت تھی کہ جہاں غدر کی وجہ سے گورنمنٹ کی مشینری کے سارے کیل پرزے ڈھیلے پڑ گئے تھے وہاں سررشتۂ تعلیم گویا نیست و نابود سا ہو گیا تھا۔ غرض اس سررشتے کو سنبھلتے سنبھلتے کئی برس لگے غدر کے دو تین برس بعد سررشتۂ تعلیم تو پنپ گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں کہیں اُس کا ندکور تک نہ تھا۔ وہی "ماپ تول"[1] وہی "بھوگول"[1] یعنی وہی سررشتۂ تعلیم کا ڈپٹی انسپکٹر بن کر دورے میں کہیں لڑکوں کے پہاڑے سنتا پھرتا ہوں اور کہیں دریا اور پہاڑ پوچھتا پھرتا ہوں۔"

انگریزی زبان کا اتفاقیہ سیکھنا

مولوی سعادت علی صاحب مولٰنا نذیر احمد صاحب کے والد باجد جتنے دین دار تھے اُتنے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر بھی تھے۔ ہمارے مولٰنا کو مولوی صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں قصداً انگریزی نہیں پڑھوائی اور مولوی صاحب مرحوم پر کیا منحصر تھا وہ تو ایسے وقت تھے کہ خود سرسید سے بھی پوچھا جاتا تو انگریزی پڑھنے کو کفر نہ بھی بتاتے تو اس کے گناہِ کبیرہ ہونے کے فتوے پر ضرور مہر کر دیتے۔ اگر ایسے وقت میں علماءِ دین اور فقہاءِ شرعِ مبین انگریزی پڑھنے والے مسلمان کا نام دفترِ اسلام سے خارج کر دیتے تھے تو کیا گناہ کرتے تھے۔ غالباً مولٰنا نے اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب کے اِس تعصب کو لاہور کے کسی لکچر میں اس طرح ظاہر فرمایا تھا۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور۔ اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔"

غرض مولٰنا نے کسی اسکول یا کالج میں باقاعدہ سبقاً سبقاً انگریزی نہیں پڑھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولٰنا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور وہاں ایک انگریزی داں مسلمان[2] کے ہاں مقیم تھے میزبان کے رغبت دلانے سے مہمان نے انگریزی شروع کی۔ یہاں تک کہ انگریزی الف لیلیٰ کی حکایتیں شروع کر دیں۔ چوں کہ دورے کی نوکری تھی جو کچھ ہیڈ کوارٹر میں پڑھتے وہ دورے میں یاد کر لیتے۔ رفتہ رفتہ مولٰنا نے اس پائے کی استعداد حاصل کی کہ آج بی اے کی اُن کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ ایک مقام پر اپنی انگریزی تعلیم کی حقیقت ہمارے مولٰنا خود اپنے دست و قلم سے نہایت ہی مناسب الفاظ میں یوں رقم فرماتے ہیں۔

"بارے مساعدتِ توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لیے بس کرتا ہے اور اب علم کی طرف سے میری خاطر جمع ہے۔ جیسے ایک پیاسا چشمۂ آبِ حیات پر بیٹھا ہے۔ اور اُس کا دل سیر ہے جب چاہے گا پی لے گا۔ تصریح اِس

[1] ماپ تول ڈپٹی رام سرن داس کی بنائی ہوئی تین چار ورق کی کتاب ہے جس میں بیگہ بسوہ کا حساب ہے۔ اور "بھوگول" پالا شیو پرشاد کا بنایا ہوا انگریزی کا جغرافیہ
[2] عبداللہ خاں صاحب امین عدالت ۱۲

اِس اجمال کی یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں تو سوسائٹی کے تعصبات نے انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الٰہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا بیٹھک میری اُن کی مشترک تھی۔ ساتھ کے اُٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اُردو کی شُدبُد کے علاوہ مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کر کے میں تو کسی قدر کھٹکا۔ مگر دیکھا تو اُن کو پکا مسلمان پایا۔ غلو کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند باوجودے کہ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے۔ مگر وضع ظاہر طرز ماندو بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ عبداللہ خاں کی وہ ادا جس کو میں نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے جو آگ ملک میں لگائی تھی وہ ابھی تک پڑی سُلگ رہی تھی یعنی دار و گیر جاری تھی۔ تو جو لوگ ناکردہ گناہ دشمنوں کی مخبری پر یا محض اشتباہ پر ماخوذ تھے اُن کے عزیز قریب اُن کی رہائی کے لیے یہاں صدر الٰہ آباد میں آ کر پڑے ہوئے تھے اور اُن کو انگریزی استغاثے اور اپیلیں لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی اور وکیلوں اور بیرسٹروں کی یہ کیفیت کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ تو میں عبداللہ خاں کو دیکھتا تھا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مسلمانوں کی اپیلیں مفت لکھنے اور کوئی کچھ دیتا بھی تو بڑے مضایقے کے ساتھ لیتے۔ اس وقت مسلمانوں کی امداد اور خیر خواہی کا اِس سے بہتر کوئی پیرایہ نہ تھا سب سے پہلے شخص جنھوں نے انگریزی اور انگریزی دانوں کی طرف سے میرے سوءِ ظن کو دُور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر آزما کر میں نے اوّل بار سمجھا کہ انگریزی اور اسلامی عقائد مانعۃ الجمع نہیں۔ عبداللہ خاں مذہبی آدمی تو تھے ہی اکثر مجھ سے قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کے معنی پوچھتے رہتے تھے تو بہ تعلقِ الفاظ ایسی طرح سمجھاتا کہ وہ جلدی سے سمجھ لیتے اور عبارت سے استنباطِ مطلب پر قادر ہو جاتے۔ یوں تو برابر عبداللہ خاں مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لیے کہتے رہتے تھے اب اُنھوں نے میری اتنی ذری سی امداد کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا۔ اور کہا کہ میں تم کو چٹکی بجاتے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میری نوکری تھی دورے کی تو میں کیا کرتا کہ اسمال ٹائپ کی عربین نائٹ (الف لیلہ بخطِ خفی) کے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دَورے میں اُن کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجّوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں انگلش انٹو اُردو ڈکشنری کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا۔ اور یہ صرف چھ مہینے میں۔ اِس طرح پر انگریزی سیکھنے میں مجکو یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کوئی سی بھی زبان باقاعدہ سیکھ لے تو اُس کی مدد سے دوسری زبان کا سیکھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے انگریزی سبقاً سبقاً ترتیب سے نہیں پڑھی اور انگریزی کی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی۔ مگر چوں کہ عربی ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اُس نے انگریزی کو میرے لیے ایسا سہل کر دیا کہ جو مدرسے کے لڑکے برسوں میں کرتے تھے میں نے مہینوں میں کر لیا۔"

غرض عبداللہ خاں صاحب اور ہمارے مولٰنا کی یک جائی نے ایک دوسرے کے شوق میں تحریک اور تحریک کے ساتھ کافی مدد کی۔ مُبادلۂ اعمال بالاعمال کے طور پر جانبین سے تعلیم شروع ہوئی ہمارے مولٰنا کی ملازمت مقامی تو تھی نہیں دورے کی وجہ سے آج یہاں کل وہاں مگر مولٰنا کے شوق نے باوجود دورے کی نوکری کے کام ناغہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ بمدد ڈکشنری اچھی خاصی ترقی کرتے رہے اور وہ اِس طرح کہ اخبار اور خط و کتابت اور تراجم میں جو مضمون لکھا اُس کے محاورات اور طرزِ ادا کو ذہن نشین کر لیا تاکہ اہلِ زبان کی پوری پوری تقلید ہو جایا کرے۔ مولٰنا جب کوئی سبق پڑھا کرتے تو یاد کرتے ہیں اتنی کوشش کرتے کہ اُس کے ماسٹر ہو جاتے۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک خط سے دو پیرگراف نقل کیے جاتے ہیں جو اِس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہر سبق کو کس غور و خوض سے پڑھتے تھے۔ یہ خط مولٰنا نے اپنے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو لکھا تھا جب کہ وہ طالبِ علم تھے۔

"انگریزی میں ایکسینٹ بھی ایک بڑی ضروری چیز ہے جس کی طرف ابھی تم نے مطلق توجہ نہیں کی۔ اِس کے معنی ہیں زور دینا مثلاً لبرلیٹی ایک لفظ ہے اُس میں آر پر زور ہے اس کو پکار کر اور مخاطب کو سُنا کر اور زور دے کر بولنا ہوتا ہے۔ اِسی طرح کل الفاظِ مرکب میں کسی نہ کسی حرف پر ایکسینٹ ضرور ہوتا ہے مخارج حروف میں شاید چنداں دشواری نہیں صرف سی۔ ٹی۔ ایس۔ آر۔ چار حرف قابلِ لحاظ ہیں۔ سی جب کاف کی آواز دیتا ہے تو اُس میں ہائے ہوز کا اشمام کرتے ہیں یعنی اس طرح بولتے ہیں کہ ہ کی بُو پائی جائے۔ کنٹری کو کہتے ہیں۔ کھنٹری لیکن وہ ہ محض خفیف ہوتی ہے اگر صاف ہ لگائی جائے تو غلط۔ یاد رکھو کے اور سی میں فقط اسی اشمام کا فرق ہے کے میں ہ کا اشمام ناروا ہے۔ ٹی کا حال اشمام ہائے ہوز میں سی کا سا ہے ٹائم کو ٹھائم بولیں گے مگر وہی ہائے خفیفہ لگا کر۔ ایس یا تو کبھی کھُلی ز کی طرح بولا جاتا ہے جیسے بوائز اور کبھی ایس کو اس طرح نکالتے ہیں کہ ش کی بو پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایس جو س بولا جاتا ہے وہ بھی اس اشمام ش سے خالی نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ میں اس بات کو تحریر میں ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے انگریزوں کو سُنا ہے کہ سم کو صاف سین سے نہیں بولتے بلکہ ش سے ملا دیتے ہیں۔ تم بطورِ خود اِس پر لحاظ کرو۔ آر کا عجیب حال ہے وہ شروع میں ڈبلیو کے قریب ہے۔ ایک مرتبہ انگریزی اخبار میں پرنس اوف ویلز کی نسبت لکھا تھا کہ لفظ رائل اُن کی زبان سے وائل نکلتا ہے۔

جو آر بیچ میں یا آخر میں ہو تو صرف ایک حرکت ظاہر کی جاتی ہے اور بس مثلاً فرسٹ کو انگریز فرسٹ نہیں کہتے۔ بلکہ پوپلے مونہہ سے فسٹ۔ ہاں اشمام ہائے ہوز میں ٹی اور کیو کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ پرنس کو انگریز پھرنس کہیں گے اور کوارل کو کھوارل۔ ڈی کو فصیح انگریز سختی کے ساتھ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کو ذ کے قریب قریب رکھتے ہیں اور شاید اس میں ہائے ہوز کا اشمام کرتے ہوں اِس وجہ سے دال کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ ٹی ایچ۔ ایک عجیب حرف ہے وہ د اور ز کے بین بین ہے وی میں جو ضغطہ ہے اُس پر لحاظ رکھو۔ اِس کو ہونٹ اور دانت کی مدد سے ادا کرتے ہیں ہندستانی ڈبلیو اور وی میں فرق نہیں کرتے یہ فاحش غلطی ہے"

باوجود اِس قدر واقفیت اور دانست کے خود ہمارے مولٰنا کا لہجہ اور تلفظِ انگریزی یوروپینوں کے مقابلے میں اب تک صحیح نہیں

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مولانا کو کسی یوروپین سے مستقل طور پر انگریزی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ایسا ہوتا تو تلفظ کیا ایسی پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ اس کے سوا یہ بات بھی مانی ہوئی ہے کہ ہندوستانیوں[1] کا تلفظِ انگریزی مثل یوروپینوں کے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا خواہ کیمبرج اور آکسفورڈ ہی میں انھوں نے کیوں نہ تعلیم پائی ہو۔ غرض مولانا مثل انگریزوں کے صحیح تلفظ انگریزی الفاظ کا ادا نہیں کر سکتے اور نہ صرف یوروپین کے تلفظ کے سمجھنے میں وہ قاصر ہیں بلکہ پورا ایرانی کے بعض تلفظ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا مذکور ہے کہ مولانا نظام ریلوے کے دوسرے درجے کی گاڑی میں تھے ایک ایرانی اور اس کی بی بی دونوں کسی اسٹیشن پر سوار ہوئے اور چوں کہ گاڑی کے چلنے میں کوئی دو منٹ باقی رہے ہوں گے کہ دونوں میاں بی بی لپک کر مولانا کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ایک مولانا کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف یہ دونوں انگریزی فیشن کے ایرانی تھے۔ گاڑی چلی تو مولانا نے ایرانی صاحب سے کہا کہ آپ میری جگہ آ بیٹھیے اور بے تکلف آپس میں باتیں کیجیے لیکن انھوں نے نہ مانا دونوں فارسی زبان میں پکار پکار کر باتیں کرتے رہے مگر مولانا اُن کا ایک لفظ نہ سمجھے۔

بات یہ ہے کہ ہر زبان کی گفت گو دو قسم کی ہوتی ہے ایک پڑھے لکھوں کی۔ ایک عوام کی۔ انگریزی فارسی عربی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ جو لوگ ذی علم ہیں اُن کی سب زبانیں سمجھ میں آتی ہیں۔ جو لوگ بازاری زبان بولتے ہیں وہ اہلِ زبان کے سوا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی جیسے انگریزی میں "سلینگ" (بازاری بول چال یا محاورہ جس کو سوقی زبان کہتے ہیں) ہمارے مولانا کتابی انگریزی بولتے ہیں اور وہی ہندوستانیوں کا تلفظ کرتے ہیں۔ اور فارسی اور عربی میں روانی سے گفت و گو کرتے ہیں لیکن نہ بدوی عربی تلفظ کرتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا نہ سولجروں کی انگریزی اور اُن کا تلفظ۔ نہ ایرانیوں کی بازاری فارسی اور اُن کا تلفظ۔ اُن دونوں ایرانی میاں بی بی کی زبان بھی پڑھے لکھے ایرانیوں کی سی زبان نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا اُن کی زبان کا تلفظ نہ سمجھ سکے۔

مولانا کی بعض تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے مسٹر لو سے بھی اپنی انگریزی میں مدد لی تھی ان سے کوئی کتاب تو نہیں پڑھی تھی ہاں خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کیا تھا۔ مولانا کے ساتھ ان کو ایک خاص خصوصیت تھی۔ مسٹر لو سر ولیم میور کے داماد تھے اور جس زمانے میں سر ولیم میور بورڈ کے ممبر اول تھے تو صاحب اُن کے سکرٹری تھے۔ بعد کو بلند شہر کے کلکٹر ہو گئے انھوں نے مولانا کے ساتھ سر ولیم میور کی مدارات دیکھی تھی۔ سارا خاندان سر ولیم میور کے بیٹے اور بیٹیاں اور میم صاحب سب خصوصیت کے ساتھ مولانا سے ملتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مسٹر لو کی ہدایت کے بموجب مولانا اپنے خطوط میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جملے اور ایسے لفظ جو کثیر الاستعمال ہوں لکھا کرتے تھے۔

اعظم گڑھ میں ریورنڈ اسکلٹن صاحب سے مولانا نے انگریزی زبان میں توراۃ بھی پڑھی تھی ہفتے میں صرف دو دن پڑھا کرتے تھے اور وہ بھی صرف ایک ایک گھنٹا۔ توراۃ پڑھنے سے مولانا کبھی کبھی متاثر بھی ہوتے تھے۔ اس سے

---

[1] ہندوستانیوں میں اگر کسی صوبے کے لوگ تلفظِ انگریزی کا خیال کرتے ہیں تو صوبۂ مدراس والے ان کے بعد صوبۂ بنگالہ کے لوگ ان کے بعد تیسرا نمبر ممالک متحدہ آگرہ کا ہے اور چوتھے نمبر میں تلفظ کی مٹی اگر خراب کی جاتی ہے تو وہ صوبۂ پنجاب ہے۔ ہم نے بیسیوں بیرسٹروں کی اسپیچیں سنیں مگر تلفظ کے لحاظ سے وہ بہت خراب تھیں۔ ہاں ایرانیوں کا تلفظ بھی صحیح نہیں ہوتا مگر پیارا اس قدر ہوتا ہے کہ اصل انگریزی تلفظ اس کے آگے مات ہے۔ ہم نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کی اسپیچیں سنی ہیں بس یہ جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

پادری صاحب کو خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ عیسائی ہو جائیں گے۔ کچھ عرصے کے بعد پادری صاحب کی بدلی مرزا پور کو ہو گئی۔ مولٰنا ان کو رخصت کرنے گئے تو پادری صاحب نے فرمایا کہ "مَیں یہ افسوس اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں کہ تم نے ابھی تک اصطباغ نہیں لیا۔" مولٰنا نے عرض کیا کہ "آپ میرے استاد ہیں میں افسوس کے ساتھ آپ کے خیال سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ بائبل پڑھنے سے میرے عقائدِ اسلامی اَور زیادہ مستحکم ہو گئے ہیں۔"

ان پادری صاحب نے اِسلام کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور کہیں کہیں سے مولٰنا کو سنایا بھی تھا۔ جن دنوں انھوں نے رسالہ لکھنا شروع کیا تو مولٰنا نے کہا تھا کہ "آپ کی اسلامی معلومات ناقص و ناتمام ہیں۔ آپ کیا رَدِّ اسلام لکھ سکتے ہیں"۔ تو فرمایا کہ "وَل ہم نے ایک کتاب سُنّیوں کی لیا اور ایک شیعوں کا۔ دونوں نے جو اسلام کی تصویر کھینچی ہے اُس میں اسلام کے دونوں رُخ کالے ہیں اور ہمارے پیٹے بس کرتے ہیں۔" فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَار ؂

غرض مولٰنا کو جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملا اپنے انگریزی کے شوق کو اُنھوں نے جاری رکھا۔ اور اسی شوق نے اُن میں آج یہ لیاقت پیدا کر دی ہے کہ بقول اُن کے "مَیں اپنی انگریزی کو هضمًا للنفس (بطور تواضع و کسرِ نفسی) لعنت پر بھیج کہا۔ ورنہ اسی لعنت بھیج پر مَیں بی اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں۔ مگر بی اے بھی مسلمان بی اے۔ کیوں کہ معلوم ہے انھوں نے بھی منتھی میٹریکس نہ لی ہوگی۔ اور بندہ بھی ہارا ہے تو یہیں ہارا ہے"۔ ؂

ہم مولٰنا کی انگریزی دانی کی نسبت زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے صرف ایک بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر لیاقت سے مراد تعلیم کا وہ اسٹینڈرڈ ہے جس کا امتحان پاس کرنے سے ڈپلوما ملتا یا ڈگری حاصل ہوتی ہے تو بے شک اِس خصوص میں وہ کسی یونیورسٹی کے مڈل ہیں نہ انٹرنس۔ ایف اے ہیں۔ نہ بی اے۔ اور اگر تعلیم کا اسٹینڈرڈ یہ نہیں ہے بلکہ اصلی اور حقیقی اور مضبوط و مستحکم لیاقت کا اسٹینڈرڈ ہے اور فی الواقع یہی ہونا چاہیے تو ہر شخص اس کو جانتا ہے کہ زبانِ انگریزی میں جو جامعیت اور قابلیت اور واقفیت مولٰنا کو حاصل ہے وہ شاذ و نادر ہی کسی میں ہوگی۔ اگر ہمارے گریجویٹ بُرا نہ مانیں تو واقعہ نفس الامری تو یہ ہے کہ بڑے بڑے بی اے۔ اور ایم اے مولٰنا کی لیاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

یہ ظاہر ہے کہ اپنی زبان میں کسی اَور زبان کا ترجمہ کرنا اور اصل مفہوم کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اور لوہے کے چنے چبانا برابر ہے۔ اس قسم کی لیاقت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی قابلیت درکار ہے۔ یہ نعمت خاص خاص ہی لوگوں کو خدا دیتا ہے اور خاص خاص ہی دماغوں میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ بالکل مسلّم ہے کہ مولٰنا نے خواہ انگریزی زبان سے خواہ عربی زبان سے جتنے بھی ترجمے اپنی اُردو زبان میں کیے ہیں وہ قطعی طور پر ترجمے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ مستقل اُردو زبان کی ایک تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک زبان دانی کا معیار اس سے بڑھ کر اَور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ان میں بہت روشن طور پر موجود ہے۔ اِس لیے نتیجہ صحیح یہ نکلا کہ جس اعلیٰ پیمانے کے وہ زبانِ اُردو کے اہلِ زبان ہیں اُسی اعلیٰ پیمانے کے وہ عربی اور انگریزی کے بھی زباں داں ہیں ورنہ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کا زباں داں جیسا کہ زباں دانی کا حق ہے ہو ہی نہیں سکتا۔

غالبًا ناظرین نے صاحبِ قاموس کی حکایت سُنی ہوگی۔

صاحبِ قاموس ذات کا عجمی تھا۔ اس کو بچپن سے زبانِ عربی کی تکمیل کا شوق ہوا۔ جہاں تک عجم میں تحصیل ممکن تھا سیکھ پڑھ لیا

نجد اور تہامہ اور یمن اور شام اور حضارہ اور بادیہ میں برسوں زبان کے پیچھے خاک چھانتا پھرا۔ آخر کار ساری عمر کی تفتیش اور تلاش کے بعد قاموس بنائی تو کیسی بنائی کہ ساری دنیا اُس کی سند پکڑتی ہے۔ زبان دانی کا پردہ خدا کو فاش کرنا تھا۔ عرب کی ایک بی بی سے ملاح کیا رات کے وقت گھر کی لونڈی سے کہتے تھے کہ چراغ گل کر دے رطوطے کی ٹیں ٹیں کہاں جائے اَطْفِئ السِّرَاج کی جگہ فارسی محاورے کے مطابق بے ساختہ اِقْتُلِی السِّرَاج بول اٹھے۔ بی بی تاڑ گئی صبح اٹھ دار القضا میں جا نالش کی۔ خدا جانے بی بی رہی یا گئی مگر میاں کی عربیت کی تو خوب کرکری ہوئی۔

بہرحال ہم آگے چل کر ان شاء اللہ مولانا کے ترجموں کے نمونے دکھائیں گے تاکہ ناظرین کو ہماری رائے کا اندازہ ہو اور یہ جو کبھی کبھی مولانا نے اس قسم کے فقرے اپنے لکچروں میں لکھے ہیں کہ "میں انگریزی کا عطائی[1] ہوں نہ کلاونت[2]" اس سچ میں کچھ انکساری کا جز بھی ملا ہوا ہے ورنہ عام رائے تو یہ ہے کہ استنباطِ مطلب میں جیسی طبیعت مولانا کی لڑتی ہے ویسی بڑے بڑے انگریزی دانوں کی نہیں لڑتی۔

ہمارے خیال میں مولانا اُن انگریزی دانوں میں ہیں جن کی انگریزی کی فصاحت و بلاغت کا لوہا اہلِ یورپ بھی مانتے ہیں۔ چناں چہ ریڈ صاحب تو مولانا کی انگریزی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے پینل کوڈ کے ترجمے میں مولانا کی شرکت کو بے حد مفید سمجھا اور لاٹ صاحب کو سفارش لکھی۔ مولانا کی یہ اعلیٰ درجے کی انگریزی دانی ہی کا طفیل تھا کہ جب ٹرنسلیٹنگ اسٹاف (جماعت مترجمین) کو ڈپٹی کلکٹریاں دینی شروع کیں تو ریڈ صاحب نے نومینیشن رول کے فارم میں مولانا کی انگریزی دانی کی بڑی مدح سرائی کی تھی۔ ورنہ انگریزی اخباروں میں جن کے اڈیٹر انگریز ہیں بابو انہ انگریزی کی ہمیشہ ہنسی اڑائی جاتی ہے اور یہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ انگریزی کلبوں میں اکثر ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کرکے قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

بہرحال اُس وقت بھی مولانا کی انگریزی اسی قابل تھی کہ ریڈ صاحب اُس کی مدح سرائی کریں اور اب تو اور بھی چڑھتے چڑھتے آسمان پر پہنچ گئی ہے۔ اُن کی اتنی لمبی چوڑی شہرت جو چار دانگ ہندوستان بلکہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے وہ اسی انگریزی دانی اور عربی دانی اور فارسی دانی اور اُردو کے اہلِ زبان ہونے کا طفیل تھا۔ ورنہ اُن جیسے عربی اور فارسی داں اور انگریزی داں بہتیرے ہیں اور کوئی بے چاروں کو نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو؟

تلنگی زبان کا سیکھنا مولانا جب ریاستِ نظام میں ملازم تھے تو اُن کی عمر درجۂ توسط سے متجاوز ہو چکی تھی یعنی جوانی کی انتہا اور بڑھاپے کا آغاز تھا لیکن اُس زمانے میں بھی شوقِ تعلیم اور اکتسابِ علم کا سلسلہ جاری تھا۔ چوں کہ وہاں کے صوبۂ شمال کی ملکی زبان تلنگی تھی مولانا نے کئی کتابیں تلنگی کی اس عمر میں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ تلنگی بہت سخت زبان ہے انگریزی سے کچھ کم مشکل نہیں تاہم چند ہی روز میں سمجھنے تو اچھی طرح لگے تھے گو بول نہ سکتے ہوں۔ اب بھی بہ ایں پیرانہ سالی دہلی میں ایک پنڈت سے سنسکرت پڑھا کرتے تھے۔ اللہ رے ہمت اور استقلال۔ ہم لوگوں کو اس علم دوستی سے سبق لینا چاہیے۔

ترجمۂ انکم ٹکس اِدھر مولانا نذیر احمد صاحب کے آسمانِ محنت پر انگریزی زبان کی شفق پھول رہی تھی۔ اُدھر میر

---

[1] عطائی اُس کو کہتے ہیں جس کا پیشہ گانا نہ ہو اور گانا سیکھے ۱۲

[2] کلاونت پکا راگ گانے والے کو کہتے ہیں ۱۲ ۔ یہ روایت سعدی کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے بہرحال کسی پر یہ واقعہ گزرا مگر ہم نے تنبیہ کے خیال سے لکھ دی ۱۲

ناصر علی خاں صاحب ذوالقدر مرحوم نے اُس میں اَور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ یہ صاحب اُن دنوں الٰہ آباد میں اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولٰنا کے حال پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ مولٰنا کو انگریزی کے ذوق میں جو فریفتہ پایا تو محبت کے دل میں شوق سے جگہ دی اور سمجھے کہ یہ ایک غیر معمولی ذہن کا شخص ہے خود بھی چوں کہ بڑے صاحب لیاقت اور قدر شناس تھے اس لیے مولٰنا کو بہت عزیز رکھنے لگے۔

اِسی اثنا میں اول بار انکم ٹکس ایکٹ جاری ہوا۔ سر ولیم میور جو اُن دنوں ریونیو بورڈ کے سینیر ممبر تھے اور بعدہٗ ترقی کی پینگ بڑھا کر صوبۂ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے انھوں نے میر ناصر علی خاں صاحب سے اُس کے اُردو ترجمے کی فرمایش کی۔ وہ یہ معقول عذر پیش کر کے الگ ہو گئے کہ "مجھ کو تو انگریزی آتی نہیں۔ ہاں ایک شخص میری نظر میں ہے اُس کو حاضر کروں گا حضور اُس کا امتحان لے لیں۔ میرے نزدیک اِس ایکٹ کا وہ ترجمہ کر سکے گا اور اچھا کر سکے گا۔"

وہاں تو میر ناصر علی خاں صاحب نے سر ولیم میور سے یہ کہا اور یہاں مولٰنا کو بلا کر فرمایا کہ "میں آپ کا نام لے آیا ہوں اور کل آپ کو میور صاحب کے پاس لے چلوں گا۔" مولٰنا یہ سن کر بہت پریشان ہوئے اور اُن کے ہوش و حواس جاتے رہے اُنھوں نے گھبرا کر میر صاحب سے کہا "آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ میں آج ہی رات کو دورے پر چلا جاتا ہوں"۔ میر صاحب نے فرمایا "کہیں جاؤ وہ جو تمھارے انسپکٹر ہیں بابو شیو پرشاد اُن کے نام حکم جائیگا اور وہ تم کو پکڑ کر بھیج دیں گے"۔ مولٰنا اس ڈر سے کہ کہیں خفت نہ ہو میر صاحب سے بہت دیر تک حجت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میر صاحب اُن پر خفا ہو کر ناخوش ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مولٰنا سنّاٹے کے عالم میں آ گئے اور دل میں کہا کہ واقع میں ناصر علی خاں صاحب نے نادانی کی کہ میرا نام لے دیا۔ آخر کار چُپ چاپ مولٰنا وہاں سے چلے آئے لیکن اِس خیال نے خواب و خور حرام کر دیا۔ چنانچہ مولٰنا اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں ادا فرماتے ہیں

"مجھ کو ساری رات نیند نہیں آئی میں اس خیال میں مستغرق رہا کہ کل "ڈے برندش" ہو گا۔ اور چھوٹتے ہی میور صاحب انگریزی بولیں گے تو میں کیا سمجھوں گا اور کیا جواب دوں گا ضرور اُس احمق بہرے بھنڈ کا سا حال ہونا ہے کہ وہ ایک بیمار کی عیادت کو گیا اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ میں تو تھا ہی اور اس پر بے بصیرت۔ آپ ہی آپ ع دماغ بیہدہ پخت و خیالِ باطل بست۔ کہ میں صاحب سلامت کے بعد مزاج پوچھوں گا تو وہ جیسا دستور ہے کہیں گے کہ ہاں اَب تو کسی قدر تخفیف ہے۔ اس پر میں کہوں گا اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ پھر میں پوچھوں گا کہ کون صاحب معالج ہیں وہ کسی کا نام لیں گے۔ تو میں کہوں گا شَکَرَ اللّٰہُ سَعْیَہٗ پھر بیمار کا دل خوش کرنے کے لیے غسلِ صحت کے لیے پوچھوں گا۔ وہ کوئی دن بتائیں گے۔ میں کہوں گا بَارَکَ اللّٰہُ اور چوں کہ آدابِ عیادت میں یہ بھی ہے کہ بیمار کے پاس حتی الوسع جلسۂ خطیبی سے زیادہ نہ بیٹھے بس اتنی ہی باتیں کر کے رخصت ہو لوں گا۔ لیکن سوچا کچھ اور ہوا کچھ اُس نے مزاج پوچھا تو بیمار نے مَری ہوئی آواز سے کہا۔ کیا پوچھتے ہو ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُس نے اُسی اللّٰھم زد فزد کا اعادہ کیا۔ اُس نے طبیب کو پوچھا تو بیمار نے جل کر کہا عزرائیل اُس نے جواب میں شکر اللّٰہ سعیہٗ سے دعا دی۔ آخر میں اُس نے غسلِ صحت کو دریافت کیا۔ بیمار نے مایوسانہ یہ شعر پڑھا

---

[۱] سننے سے بے نصیب ۱۲ [۲] خدا زیادہ کرے ۱۲ [۳] خدا کرے اُس کی سعی کامیاب ہو ۱۲ [۴] مبارک ہو ۱۲

سے موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو ۔ غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو ۔ یہ احمق عیادت کنندہ تو بارک اللہ کہہ کر رخصت ہوا۔ اور بیمار اور بیمارداروں نے بہت ہی برا مانا۔ ایسے خیالات نے مجھے رات بھر بے چین کر رکھا۔ اگلے دن ابھی نہیں بجے تھے کہ آدمی دوڑا ہوا آیا کہ ڈپٹی صاحب بگھی لیے کھڑے ہیں۔ جانا پڑا۔ مگر رستے بھر مارے غصے کے میں نے ڈپٹی صاحب سے آنکھ تک نہیں ملائی۔ ڈپٹی صاحب مجھے باہر بٹھا آپ اندر چلے گئے بس کوئی چار منٹ گزرے ہوں گے کہ میری طلبی آئی قریب جا کر سلام کیا۔ دیکھا کہ سخت عدیم الفرصت ہیں۔ انگریزی کاغذات کے بہت بنڈل سامنے دھرے ہیں۔ سر جھکائے دیکھ دیکھ کر ان پر پنسل سے کچھ لکھا اور الگ رکھ دیا۔ مجھے سلام کرتے تو کیا دیکھا ہوگا مگر میری آہٹ پا کر اسی طرح جھکے جھکے اردو میں پوچھا کہ "علم کہاں حاصل کیا؟" عرض کیا دلی کالج میں۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ[1] کے جواب میں هِيَ عَصَايَ کے ساتھ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ[2] زیادہ کر دیا تھا۔ اتنا میری زبان سے اور نکلا کہ جب حضور نے غدر سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا۔ تو میں عربی کی اول جماعت میں تھا بلکہ حضور نے مجھ سے تاریخ یمینی کا ایک قصیدہ بھی پڑھوا کر سنا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سر ولیم میور نے میری اس بات کو توجہ سے سنا یا نہ سنا مگر سامنے گزٹ کی نقل پڑی تھی اٹھا کر مجھے دی اور فرمایا کہ یہیں اس کے ایک چیپٹر کا ترجمہ کر کے آج ہی کے دن اسی وقت مجھے دکھا جانا۔ اس کے بعد ڈپٹی صاحب اور میں دونوں رخصت ہوئے۔ غرض مکان پر پہنچنے کے ساتھ میں تو ستو باندھ کر ترجمے کے پیچھے پڑا۔ چھوٹا سا چیپٹر منتخب کیا۔ الفاظ کو ڈکشنری میں دیکھا اور مطالعہ کے زور سے مطلب سمجھا پھر ترجمہ تو منہ کا نوالہ تھا۔ میعاد سے تین دن پہلے میں نے اصل اور ترجمہ ڈپٹی صاحب کے پاس بھیج دیا کہ یہ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ایسے جلد باز کہ اسی وقت میور صاحب پاس لے دوڑے۔ انھوں نے پسند کیا اور فرمایا کہ نذیر احمد ترجمہ کرے اور وقتاً فوقتاً لو صاحب سکرٹری کو دکھاتا رہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ وہ سررشتۂ تعلیم کا ملازم ہے اور اکثر دورے میں رہتا ہے۔ اس پر میور صاحب نے بابو شیو پرشاد صاحب[3] کے نام ایک چٹ لکھ دی کہ "نذیر احمد کو انکم ٹکس ایکٹ کے ترجمے کے لیے اس کے کام سے سبکدوش کرو"

غرض مولانا کی سبکدوشی کے متعلق جب میور صاحب کی چٹ بابو شیو پرشاد صاحب کے نام پہنچی تو وہ ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔ اور چونکہ سر ولیم میور کے دربار تک مولانا کی رسائی سے بوجہ تعصب دلی رنج کیا۔ اور اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو مولانا کو وہ کبھی وہاں درخور نہ ہونے دیتے مگر ان کے لیے حکم حاکم مرگ مفاجات تھا مجبوراً تعمیل ارشاد سر ولیم میور کرنی پڑی۔ جب مولانا کو سکول انسپکٹری سے سبکدوشی کی اطلاع ہوئی تو ان کی جان میں جان آئی اور باطمینانِ خاطر ترجمے کے کام میں مشغول ہو گئے۔

اب ایک دوسرا واقعہ سنیئے کہ بابو شیو پرشاد صاحب نے خفیہ طور پر ترجمے میں شریک ہونے کی کوشش شروع کی۔

---

[1] اے موسیٰ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے ۱۲ [2] وہ میری لاٹھی ہے کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اسی سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ اس سے میرے اور کام بھی نکلتے ہیں ۱۲ [3] گریفتھ صاحب انسپکٹر مدارس تھے اور بنارس کالج کے پرنسپل بھی وہ دورہ کر نہیں سکتے تھے۔ اس سبب بابو شیو پرشاد صاحب ان کے نائب مقرر کر دیئے گئے تھے۔ پانسو روپیہ تنخواہ تھی ۱۲

چوں کہ صاحب لیاقت تھے کامیاب ہو گئے۔ مولانا ترجمے کی سنگ لاخ راہ کو نصف سے زیادہ طے کر چکے تھے کہ جناب بابو صاحب دھم سے کود پڑے اور کود ے بھی تو اس حیثیت سے کودے کہ مولانا کو اپنی ہیٹی دستی میں رکھ کر بقیہ نصف کا ترجمہ کرنے لگے یہ بابو صاحب ہندوؤں میں بڑے متعصب تھے۔ سر سید کے مقابلے میں کونسل کے آنرایبل ممبر بھی ہو گئے تھے۔ راجہ اور سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب بھی تھا۔ سر سید اور راجہ صاحب میں منافست بھی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہتے تھے۔ بابو شیو پرشاد صاحب انگریزی میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے سر ولیم میور کو یہ دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ مذہب عیسائی کو بدل پسند کرتے ہیں۔ اور میور صاحب بھی بڑے متعصب عیسائی تھے اسی وجہ سے میور صاحب بابو صاحب کی حمایت کرتے تھے۔ میور صاحب نے لائف آف محمدؐ۔ لکھی تھی اور سر سید نے اُس کا جواب خطبات احمدیہ میں دیا تھا۔ اس وجہ سے سر سید اور میور صاحب میں ایک طرح کا انقباض تھا۔ بابو صاحب کے حامی سر میور۔ اور سر سید کے سرجان اسٹریچی۔ غرض دونوں کی برابر کی چوٹ تھی۔ دونوں لائق۔ دونوں کے کھونٹے زبردست بابو شیو پرشاد صاحب کو راجہ بنارس سے مالی مدد بھی بہت ملا کرتی تھی۔ لیکن بابو صاحب میں مذہبی تعصب بہت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کل مسلمانوں کی ایک گردن ہو اور میں اُس کو ایک جھٹکے میں اُڑا دوں۔ وہ باتوں باتوں میں اکثر مذہبی تعصب کو ظاہر کر دیا کرتے تھے اور مولانا بے جواب دیے نہیں رہتے تھے یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ مولانا ممدوح نے بابو صاحب کی ماتحتی میں اکیس بیس روپے ماہوار کی انسپکٹری سے تنگ آکر اسّی روپے کی انسپکٹری منظور کر لی تھی۔

غرض بابو صاحب مولانا سے کھٹکتے تھے اور مولانا اُن سے۔ الغرض بابو صاحب نے انگلکس کا ترجمہ مولانا سے چھین لیا اور اُن سے محرری کا کام لینے لگے۔ شروع میں مولانا سے کہہ دیا تھا کہ جو میں بولتا جاؤں لکھتے جاؤ تم ترجمے میں دخل مت دو۔ مولانا نے اپنے غصّے کا اظہار اس طرح پر کیا کہ ترجمہ لکھوانے لکھوانے انھوں نے پوچھا لکھ چکے۔ مولانا نے یہ الفاظ بھی ترجمے میں لکھ دیئے۔ پڑھوا کر سُنا تو بہت بگڑے اور کہا کہ یہ داخل گستاخی ہے مولانا نے یہ الفاظ بھی لکھ دیئے غرض مولانا نے بھی بابو صاحب کو ناک چنے چبوا کر چھوڑا۔

اِس واقعے کے مناسب ایک حکایت یہ بھی ہے کہ ایک بیوی بڑی تیز مزاج اور غصیلی تھیں وہ اپنی چھوکری پر بار بار خفا ہوتیں۔ چھوکری باورچی خانے میں ہوتی تو بیوی دالان میں بیٹھی ہوئی دور سے اُس کو بُرا بھلا کہتیں ایک دن چھوکری نے پیسنے میں کچھ زعفران گرا دی۔ بیوی نے دیکھ پایا تو دالان ہی میں سے غرّائیں کہ مُردار مارے جوتیوں کے سر گنجا کر دوں گی تو چھوکری چپکے سے کہتی کیا ہے کہ مُردار ہو گی تو تیری ماں بہن بیٹا۔ اور مارے گی تو مار کھائے گی بھی۔ غرض جو جو باتیں بیوی کہتیں وہ سب چھوکری دُہرا دیتی مگر بیوی پکار کر اور چھوکری چُپکے سے۔ اسی قسم کی حکایتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عند الشارع غلامی کے مبغوض ہونے کی اصل وجہ یہ ہے غرض ترجمہ انگلکس میں بابو شیو پرشاد بیوی کی جگہ تھے اور ہمارے مولانا چھوکری کی جگہ خلاصہ یہ کہ بابو صاحب کا اُنگلی میں خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا ہمارے مولانا کو ناگوار ہوا۔ اور وہ بد دل سے ہو گئے۔ میر ناصر علی خاں صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے مولانا کو سمجھایا بجھایا۔ اور فرمایا کہ تمھاری محنت و مشقت کو سر ولیم میور اور لو صاحب جان چکے ہیں۔ اور یہ دونوں تم کو بخوبی پہچان چکے ہیں اِن صاحبوں کا اتنا ہی جاننا

تمھارے سپرد بس کرنا ہے" اس کے بعد میر صاحب نے مولنا سے پوچھا "تمھارے ترجمہ کئے ہوئے ہیں بابو صاحب نے تو کچھ تصرف نہیں کیا؟"

مولنا:- ایک نقطے کا بھی نہیں۔

میر صاحب:- بس تو مال میں آنے کی تیاری کرو۔

اِس موقع پر مولنا فرماتے ہیں کہ "یہ کہہ کر میر صاحب نے مجکو شفقت سے زیادہ پاس بُلایا اور خوش ہو ہو کر اَور اَور باتیں کرتے رہے۔ جیسے اُن کو میری آیندہ ترقی کا اذعان تھا۔ بہ ہوٗ مودّۃ اہلِ صفا چہ در رو و چہ در قفا" بہر حال انکم ٹکس کا ترجمہ اِس طرح ختم ہوا کہ آدھے سے زیادہ مولنا نذیر احمد صاحب نے کیا اور آدھے میں مولنا اور بابو صاحب دونوں شریک ہو گئے

میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کے ایک اَور احسان کی مثال

ہمارے مولنا سے اور میر ناصر علی خاں صاحب مرحوم سے اختلاط تو حد درجے کا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مولنا کے خانگی حالات سے بھی بخوبی واقف تھے اور اُن کو معلوم تھا کہ مولنا تنخواہ اور بھتا سب خرچ کر ڈالتے ہیں اور کچھ پس انداز نہیں کرتے۔ اِس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ الہ آباد صدر مقام تھا۔ سب چیزیں گراں مگر میر صاحب بااین ہمہ دل میں ناخوش تھے اور ہمیشہ مولنا پر تاکید کرتے رہتے کہ کچھ نہ کچھ تو بچاتے رہو مگر حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے بچانا ممکن نہ تھا۔ آخر ڈپٹی صاحب ایک چال چلے وہ یہ کہ مولنا کے سارے دفتر کی تنخواہ مولنا کے نام آتی تھی بشمولِ تنخواہِ مدرسین وغیرہ اور ڈپٹی صاحب کو اُس کا وقت معلوم تھا۔ اتفاق سے خزانے کا کام چند روز کے لیے ڈپٹی صاحب سے متعلق ہو گیا سررشتۂ تعلیم کا بِل جو اُن کے ہاں گیا تو رسید دے کر روپیہ آپ لے لیا۔ کئی دن گزرے تو مولنا نے پوچھا کہ حضرت وہ روپیہ کہاں ہے؟ ڈپٹی صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ روپئے کی مجکو ضرورت تھی میں نے لے لیا ہے۔ گاؤں سے آمدنی آئے گی تو دے دوں گا۔ اِدھر ملازمانِ سررشتۂ تعلیم نے مولنا پر تقاضا شروع کیا۔ مدرسین کی عرضیاں آنے لگیں اس پر بھی ڈپٹی صاحب نے کچھ پروا نہ کی۔ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں مولنا کو کس قدر پریشانی ہوئی ہوگی۔ اِدھر ملازمانِ سررشتۂ تعلیم مولنا کی جان کھائے جاتے ہیں۔ اُدھر ڈپٹی صاحب ہیں کہ دینے کا نام نہیں لیتے۔ مولنا کے پاس کوڑی نہیں آخر مہینہ ڈیڑھ مہینہ ٹال کر مولنا نے یہ تدبیر نکالی کہ کتابوں کی بکری کا روپیہ خرچ کر ڈالا۔ کیوں کہ اُس وقت مولنا کی عسرت اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ گھوڑے کی منالی سے پانی گرم کیا جاتا تھا۔ علیٰ ھذا دوسرے اخراجات میں ناگزیر کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی تھی خلاصہ یہ کہ مولنا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل میں تھے۔ اِس واقعے کا اثر مولنا کے دل پر اس قدر پڑا تھا کہ اُن کو ڈپٹی صاحب کی طرف سے بدگمانی سی پیدا ہو چلی تھی۔ ڈپٹی صاحب مولنا کو بُلا بُلا بھیجتے تھے مگر وہ ڈپٹی صاحب کے پاس جانے میں مضایقہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مولنا پرگنہ ساڑھ و سلیم پور ضلع کان پور میں تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ اِس وقت مولنا کو یقین تھا کہ ڈپٹی صاحب اب یہ رقم ضرور واپس دیں گے لیکن ڈپٹی صاحب خبر سے نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہمارے مولنا نے ڈپٹی انسپکٹری کا چارج بھی دے دیا۔ اور روانگی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور بظاہر ڈپٹی صاحب کو مولنا کی تکلیف کا مطلق احساس نہیں جس دن مولنا چلنے کو ہوئے ڈپٹی صاحب نے کہلا بھیجا کہ اسٹیشن تک میں تم کو اپنی بگھی میں پہنچا دوں گا

خدا خدا کرکے وہ وقت بھی آیا تو ڈپٹی صاحب بگھی سے کوئی آدھ گھنٹے پہلے مولنا کے مکان پر آموجود ہوئے اسٹیشن پر پہنچ کر مولنا گاڑی میں بیٹھ بھی لیئے۔ اب گاڑی کوئی تین چار منٹ میں روانہ ہونے والی ہے۔ اس موقع پر ڈپٹی صاحب نے پانسو روپے کا پہاڑی نوٹ سودی جیب سے نکال کر مولنا کے حوالے کیا۔ یہ نوٹ مولنا کے نام کا تھا۔ نوٹ دیتے ہوئے ڈپٹی صاحب نے کہا کہ دیکھو یوں پس انداز کیا کرتے ہیں۔ اس وقت بے اختیار مولنا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ڈپٹی صاحب نے اس طرح مولنا کو نوٹوں کی چاٹ پر لگا دیا۔ پس میر ناصر علی خاں صاحب مرحوم نے مولنا پر یہ چار احسان کیئے (۱) بابو شیو پرشاد کے پنجہ غضب سے نجات دلوائی (۲) سر ولیم میور ممبر بورڈ سے روشناس کرایا (۳) تحصیلداری دلوائی (۴) کفایت شعاری کا سبق سکھایا۔

اس موقع پر میر ناصر علی خاں صاحب کے متعلق ایک روایت بھی قابل ذکر ہے کہ جب مولنا گورکھپور میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر گئے تو وہاں مولوی محمد کریم صاحب اعظم گڑھی بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ہمارے مولنا میر ناصر علی خاں صاحب مرحوم کے احسانات کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے اور میر صاحب کے خطوط بھی مولوی محمد کریم صاحب نے مولنا کے پاس آتے ہوئے دیکھے تھے۔ اعظم گڑھ۔ اور جون پور دونوں ہم سرحد ہیں۔ مولوی محمد کریم صاحب کے مزاج میں حسد اور تعصب کا مادّہ زیادہ تھا۔ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں وہ بھی ہمارے مولنا کے ساتھ شریک تھے اور انھوں نے کلکٹر اور کمشنر سے مولنا کی نسبت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ سر رشتہ تعلیم سے لڑکے پڑھاتے آئے ہیں ان کو ڈپٹی کلکٹری سے کیا نسبت۔ جب مولنا امتحان میں اول رہے تو مولوی محمد کریم صاحب خواہی نخواہی مولنا سے "کوز خود برنج درست" ناخوش ہوگئے۔ ان کو میر ناصر علی خاں صاحب کے ساتھ بھی حسد تھا۔ شاید ہم سرحدی ہونے کی وجہ سے۔ تو جب ہمارے مولنا میر ناصر علی خاں صاحب کا ذکر خیر کرتے ہوتے تو مولوی محمد کریم صاحب کہتے کہ تم کیا اس رافضی بچے کی مالا جپا کرتے ہو تم کو کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ شخص بخت و اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوگیا ہے۔ اس کا باپ مرثیہ خوانی کرتا تھا اور یہی اس کی وجہ معاش تھی۔ ایک دفعہ کا تذکرہ ہے کہ محرم آیا اور اس کا باپ مجالس میں مرثیہ خوانی کے لیئے بلایا جاتا تھا اس نے اپنی زمین میں کچھ جلاہے بسا رکھے تھے کہیں مرثیہ خوانی کے لیئے بلایا جاتا تو ان جلاہوں کو بسورنے کے لیئے اپنے ساتھ لے جاتا کہ جب مرثیہ پڑھوں تو تم سب رونے لگنا۔ ایک دن بہت سے مرثیہ خوانوں کے بعد ان کے پڑھنے کی نوبت آئی۔ دیر ہوگئی تھی زیادہ۔ جلاہے سنبھلے تھے اور وہ بیچارے باہر کے دالان میں بیٹھے تھے ابھی انھوں نے مرثیہ پڑھنا شروع نہیں کیا تھا کہ ایک جلاہے نے سمجھا کہ یہ پڑھ رہے ہیں۔ جلاہا وہیں سے چلا کر بولا کہ "میاں جی روؤں" اس پر مجلس میں قہقہہ اڑا +

ترجمہ پنل کوڈ

یہ امر تسلیم ہے کہ مولنا نذیر احمد صاحب درحقیقت بڑے ذہین تھے مگر اس وقت ان کی انگریزی کا پہیا ایسا چلتا ہوا نہ تھا کہ پنل کوڈ کی ریل میں لگا دیا جاتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ ضرورت بھی بعض اوقات آدمی کو ایسے امور میں بڑی مدد دیتی ہے۔ وہ ضرورت مولنا کو تعزیرات ہند کے ترجمے کی شکل میں پیش آئی عربی استعداد بہت ہی اعلیٰ درجے کی تھی۔ دقیق سے دقیق مطالب پر ان کی نظر بہت جلد پہنچتی تھی حجاب فقط الفاظ کا تھا وہ جب ڈکشنری کے آئینے میں دیکھ کر اٹھا دیتے تھے تو سب سے زیادہ فصاحت کے ساتھ جلوۂ مطلب مولنا کو نظر آتا تھا۔ یہی بھید تھا جس نے مولنا کو باایں قلت استعداد انگریزی ترجمۂ تعزیرات ہند میں آگے چل کر اس قدر مفید ثابت کیا۔ اصل میں یہ عربی دانی کا طفیل تھا کہ مولنا کسی وادی میں نہیں رکتے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یا تو انکم ٹکس ایکٹ کے ترجمے کا نام سن کر مولنا کے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ یا

اُس کے بعد ایسا ہوا کہ کُھلا کہ اُنھوں نے مسٹر تو سے مانگ کر بورڈ کے کئی سرکلر ترجمہ کیے ؂

یہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ مولٰنا نے کسی اسکول یا کالج میں سبقًا سبقًا جیسا کہ دستور ہے انگریزی نہیں پڑھی۔ بلکہ غدر کے بعد جب الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے تو اُنھوں نے کچھ عبداللہ خاں صاحب امینِ عدالت کی ترغیب اور کچھ اپنے ذاتی شوق سے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ دَورے کی نوکری میں پڑھنا وارِدی کا پڑھنا تھا وہی اُنھوں نے کیا یعنی جب ہیڈ کوارٹر میں تشریف لاتے تو امین صاحب سے اتنا پڑھ لیتے کہ واپسی تک دَورے میں اُس کو یاد کر لیں۔ چنانچہ چند روز میں اِس طریقے سے اتنی استعداد ہو گئی کہ رومن کی اسکول ڈکشنری کی مدد سے عبارت کا مطلب سمجھ لیتے تھے مگر بدقت۔ بہرحال مولٰنا کی استعداد رومن اسکول ڈکشنری تک ہی کہ لفٹنٹ گورنر نے پنیل کوڈ کے ترجمے کا قصد کیا اور ایک ٹرنسلیٹنگ اسٹاف نے اُس کا ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ کہ اتنے میں بقول مولٰنا "وائے خدا کو منظور ہوا کہ یہ ذرّہ بے مقدار روشناسِ آفتاب ہو یعنی لفٹنٹ گورنر نذیر احمد کا نوٹس لیں" پنیل کوڈ (تعزیراتِ ہند) کے ترجمے کے متعلق مولٰنا فرماتے ہیں کہ "سر جارج اڈمنسٹن لفٹنٹ گورنر سابق ممالک مغربی و شمالی (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) نے پنیل کوڈ کے ترجمے کو امر مہتم بالشان سمجھ کر اپنے اہتمام خاص میں رکھا اور چوں کہ صاحب ممدوح کو مدتوں طہران میں بہ تقریبِ سفارت رہنے کا اتفاق ہوا تھا ان کو زبان فارسی کی اچھی استعداد تھی کہ فارسی میں بلا تکلف بلا فکرِ اضافت گفتگو کرتے تھے اور غالبًا یہی وجہ واقع ہوئی کہ اُنھوں نے اس ترجمے کو اپنی ذاتِ خاص سے متعلق رکھا کیوں کہ اُس وقت کوئی یوروپین اُن سے بہتر فارسی داں نہ تھا۔ سر جارج اڈمنسٹن نے ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ڈائرکٹر تعلیم کو اس کارِ ستگ میں اپنے ساتھ لیا۔ اور ریڈ صاحب نے منشی عظمت اللہ[1] صاحب کو جو اُن دنوں بریلی کالج میں انگریزی کے مدرس تھے۔ تو یہ قاعدہ تھا کہ منشی عظمت اللہ صاحب ترجمہ کرتے اور ریڈ صاحب کے میر منشی مولوی کریم بخش[2] صاحب اُس کو بہ نظرِ اصلاح دیکھتے۔ کیوں کہ انگریزی منشی عظمت اللہ صاحب کی اچھی تھی اور عربی فارسی مولوی کریم بخش صاحب کی۔ اِس کے بعد خود ریڈ صاحب ترجمے کو بہت احتیاط کے ساتھ سنتے اور اُس میں تصرفات بھی کرتے اور آخر میں ترجمہ لاٹ صاحب کو سنایا جاتا۔"

غرض وہاں پنیل کوڈ کے جسم پر اُردو کا لباس اس طرح پہنایا جا رہا تھا لیکن الفاظ کی قطع و برید میں مقراضِ ترجمہ نارٹیوں کے ہاتھ میں تھی کہ اتنے میں ریڈ صاحب کی چٹھی ہمارے مولٰنا کے نام آئی جس کا مضمون یہ تھا "لاٹ صاحب صرف دو دن الہ آباد

---

[1] مولٰنا نذیر احمد صاحب اِن دِنوں میں بھی بابو شیو پرشاد صاحب کی ماتحتی میں تھے اور بنارس سرکل کے تمام ڈپٹی انسپکٹروں میں بابو صاحب کی مہربانی اور فادر یعنی تعصب کی وجہ سے لیاقت اور کارگزاری کے اعتبار سے ابجد وہی ہوتم اور وہی لسٹ (فہرست) میں سب سے نیچے سمجھے جاتے تھے ۱۲

[2] منشی عظمت اللہ صاحب آخر میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ اب اُن کا انتقال ہو گیا۔ اِن کے بیٹے مولوی حشمت اللہ صاحب ایم اے ہیں جو محمدن کالج کے ٹرسٹی اور ممالک متحدہ میں ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ گورکھپور میں مولٰنا اور منشی عظمت اللہ صاحب دونوں ڈپٹی کلکٹر تھے دونوں رہتے بھی قریب قریب تھے منشی صاحب انگریزی کے بڑے خوش نویس تھے ہمارے مولٰنا کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو انگریزی کی مشق اُنھوں ہی نے کرائی تھی ۱۲

[3] مولوی کریم بخش صاحب بھی بشمس صدری ڈپٹی کلکٹر مرزا پور میں تھے ان کے صاحبزادے مسٹر احمد الدین صاحب لکھنؤ میں افسر ڈاک ہیں۔ یہ ولایت بھی ہو آئے ہیں مولٰنا کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ دہلی میں زیر جامع مسجد رہا کرتے تھے جس زمانے میں مولٰنا ضلع اورئی میں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی کریم بخش صاحب پرگنہ کونچ ضلع مذکور کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بعد پنشن لینے کے گوالیار اسٹیٹ میں ملازم ہو گئے تھے اور وہیں انتقال کیا ۱۲

ٹھہر کر بنارس چلے جائیں گے۔ عظمت اللہ کریم بخش ان کے ساتھ مجھ سے آگے بڑھ جائیں گے۔ میں چند روز ٹھارن ہل صاحب کمشنر کے ہاں الہ آباد ٹھہروں گا۔ تم کچہری کے وقت میں منشی عظمت اللہ کا ترجمہ مجھے سُنا دیا کرنا۔"

چٹھی پاتے ہی مولانا ریڈ صاحب کے حکم کی بجا آوری میں مصروف ہوئے گویا شروع شروع میں اس طرح مولانا نے پنیل کوڈ کے ترجمے کی اُنگلی پکڑی اور رفتہ رفتہ اپنے زور لیاقت سے پونہچا پکڑ لیا۔ وہ اس طرح کہ مولانا روز منشی عظمت اللہ صاحب کا کیا ہوا اور مولوی کریم بخش صاحب کا بنایا ہوا ترجمہ ریڈ صاحب کو سُنا کر چلے آتے۔ ریڈ صاحب ترجمے کی ناہمواری سے جگہ جگہ رُکتے اور کبھی کبھی مترجموں پر ناخوش بھی ہوتے۔ ہمارے مولانا اس وقت تک مترجمین میں شامل نہ تھے صرف ترجمہ سُنا دیا کرتے تھے لیکن اب وہ ایک ترکیب سے مترجمین میں شامل ہوتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

"میں تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ ڈھنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں۔ جب اس کی اٹکل مل گئی تو میں نے بیچ میں سے چار پانچ دن کے سُنانے کی قدر چھوڑا اٹھارویں چیپٹر۔ سے متوکلاً علی اللہ آپ ترجمہ شروع کر دیا دستور یہ تھا کہ برخاست کرنے وقت ریڈ صاحب سکشنوں کو گن لیا کرتے تھے تو فی یوم اکثر سات سکشنوں کا اوسط پڑتا رہتا تھا۔ اٹھارویں باب پر پونہچ کر تو میں نے ہمت کر کے اپنا ترجمہ پڑھا۔ خدا کا کرنا پہلے ہی دن ۱۴ سکشن پاس ہوئے اُٹھتے وقت گنا تو شبہہ پیدا ہوا کہ شاید کچھ سکشن چھوٹ گئے۔ بار بار اُلٹ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نہیں چھوٹا نہیں تو ریڈ صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ تب میں نے دبی زبان سے کہا "یہ ترجمہ میں نے کر لیا تھا کہ دیکھوں کر بھی سکتا ہوں یا نہیں" اس پر ریڈ صاحب کو اَور بھی تعجب ہوا ترجمہ تو مجھ سے لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام ایک چٹھی میرے حوالے کی اور زبانی ہدایت کی کہ آج ہی کی ڈاک میں بنارس پونہچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو وہ تم کو ترجمے میں شریک کر لیں گے اور میں بھی آج سے چوتھے دن لاٹ صاحب کے کیمپ میں ہوں گا۔"

غرض مولانا ریڈ صاحب کی چٹھی لے کر فوراً بنارس پونہچ گئے۔ اور لاٹ صاحب کے کیمپ میں داخل ہوئے لاٹ صاحب کو ریڈ صاحب کا خط دیا تو اُنھوں نے مولانا کو پنیل کوڈ کے ترجمے میں شریک کر لیا جیسا کہ خود مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں "کہ مجھے منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کے ساتھ ثالث الاثانی بنا لیا" پس اس طرح پنیل کوڈ کے ترجمے کو ختم کیا۔"

ترجمہ تعزیرات ہند میں مولانا کی محنت کا کس قدر حصہ ہے ہم اُس کا تعین اور صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اٹھارویں چیپٹر سے مولانا شریک ترجمہ ہوئے اور شریک غالب رہے۔ الفاظ و اصطلاحات کی شان گواہی دیتی ہے کہ مولانا کا منصب کریٹی سائز (نکتہ چینی) کا تھا کہ یہی بڑی چیز ہے۔

تعزیرات ہند ہمارے خیال میں بلا شبہہ دنیائے وکالت کی آسمانی کتاب ہے جس طرح عربی اور فارسی اور اُردو کے اسلامی ادب پر قرآن کا اثر پڑا ہے اسی طرح قانونی ادب پر تعزیرات ہند کا اثر سمجھنا چاہیے۔ پس ہمارے نزدیک غدر کے بعد ہی سے مولانا کی اُردوے معلّٰی نے قانونی دروازے سے ملک سخن پر قبضہ کر لیا۔ تعزیرات ہند کے ترجمے میں مولانا کے جوہر کھلے تو وہ روز بروز چمکتے ہی گئے۔ تعزیرات ہند کے ترجمے کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔

"کمپٹیبل میٹر" پنیل کوڈ میں ایک لفظ تھا اس کے ترجمے میں جتنے بھی مترجمین تھے سب کے سب عاجز تھے اور سب کے سب

لہ چوتھے کے تین بازوؤں میں کا ایک بازو ۱۲

بغلیں جھانکتے تھے ہرچند کوشش کرتے تھے لیکن ترجمے کے لیے کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہمارے مولانا کے سامنے جب
یہ لفظ پیش کیا گیا تو ذرا تامل کر کے مولانا نے فرمایا "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" یہ سُن کر مترجمین دنگ ہو کر رہ گئے۔ اِس
لفظ کا یہی ترجمہ تعزیراتِ ہند میں رکھا گیا اور اس کو ایسی عام مقبولیت نصیب ہوئی کہ اب تمام اخباروں اور کتابوں میں یہ ترجمہ
لکھا جاتا ہے اور جب کبھی کمبسٹیبل میٹر خیال میں آتا ہے تو فوراً "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" یاد آجاتا ہے۔

طبعِ ترجمہ کی خدمات بھی مولانا سے ظہور میں آئی تھیں اور یہ بھی بہ حکمِ گورنمنٹ آپ سے متعلق تھیں۔ لکھنؤ میں منشی
نول کشور صاحب کے ہاں رہ کر ترجمہ چھپوایا۔ انڈکس بنایا اور دفعات کے خلاصے بھی لکھے۔ ترجمہ اور طبعِ ترجمہ میں جو عمدہ
خدمات مولانا سے ظہور میں آئیں اُن کے صلے میں جو منشی عظمت اللہ صاحب اور مولوی کریم بخش صاحب کو دیا گیا وہی ہمارے
مولانا کو بھی مرحمت ہوا۔ یعنی پانچ پانچ سو کی میکیب کی قیمتی گھڑی جس کے ڈھکنے کے اندر مولانا کا نام اور عطیۂ گورنمنٹ ولایت
سے کندہ ہو کر آیا تھا الفاظِ مناسب کے ساتھ ملی اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کر دیے گئے۔ گو ڈپٹی کلکٹری فوراً نہ ملی۔ مگر
تحصیلداری تو کہیں نہیں گئی تھی۔

تحصیلداری اور اُس کا امتحان جب لکھنؤ میں طبعِ ترجمہ سے فارغ ہو کر مولانا الہ آباد واپس آئے اور مسٹر کو کے
سلام کو گئے تو صاحب بولے "تم نے بڑی دیر لگائی۔ کان پور میں ایک تحصیلداری خالی ہونے والی ہے۔ میں نے تمہارے
انتظار میں اُس کو روک رکھا ہے۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ لوگوں کو ملے ہی گی مگر میرے نزدیک پایہ بہ پایہ چڑھنا چاہیے۔ اور میں بھی عنقریب
کلکٹری پر جانے والا ہوں۔" مولانا یہ سُن کر دل میں بہت خوش ہوئے اور کہا کہ نقد را بہ نسیہ گزاشتن کارِ خردمنداں نیست۔
غرض تو صاحب سے کان پور کی تحصیلداری کا حکم لیا اور اُلٹے پاؤں کان پور کو پہنچے یہ مذکور ۱۸۶۱ء کا ہے۔ کان پور پہنچ کر
مولانا کو معلوم ہوا کہ امتحانِ تحصیلداری میں صرف تین چار مہینے باقی ہیں چاہیے تھا کہ مولانا کو ہراس ہوتا۔ مگر محنت و استقلال
کے سامنے اُن کو ذرا خوف نہیں ہوا۔ اگرچہ مولانا تحصیلداری کے کوچے سے نابلد تھے اور یہاں اُن کو عملوں پر وقار قائم رکھ کر
کام سے آگاہی پیدا کرنے اور قانون اور ہدایت نامے اور سرکلر اور دستور العمل اور مثلوں کے دیکھنے میں محنت اور سرگرمی
سے کام کرنے پڑے مگر واہ رے لیاقت اور واہ رے ذہن اور واہ رے حافظے کہ نہ امتحان میں برس روز کا انتظار کرنا پسند فرمایا
نہ مسٹر ایلیٹ[1] انچارج کلکٹر کی رعایت سے استفادہ کیا اور نہ تحصیلداری کے کام کو پس ماندہ ہونے دیا۔ امتحان اور کام دونوں
پر برابر محنت کی اور کامیابی کے ساتھ وہ میدان اس طرح جیتا کہ امتحان دینے والوں میں سب سے اوّل رہے۔

ترجمۂ ضابطۂ فوجداری ترجمے کی چاٹ تو مولانا کو پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ اور اب وہ اس قسم کے کام کو کچھ ایسا وقیع اور
وزنی سمجھتے بھی نہ تھے بھلا جو شخص انکم ٹکس اور پینل کوڈ کے ترجمے کی ڈگریاں پاس کر چکا ہو اُس کی نگاہ میں اور قانون
کیا جچ سکتے ہیں۔ ضابطۂ فوجداری ایکٹ ۲۵ ۱۸۶۱ء کا اُردو ترجمہ گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا حقیقت میں یہ ضابطہ تعزیراتِ ہند کا ضمیمہ تھا
مگر کسی وجہ سے تعزیراتِ ہند کے ساتھ ترجمہ نہ ہو سکا۔ گورنمنٹ گزٹ کے مترجم ان دنوں مسٹر [illegible]

[1] ان دنوں مسٹر ایلیٹ انچارج کلکٹر تھے اُنھوں نے از خود مولانا کو لکھا کہ اگر تم کہو تو میں تمہارا امتحان اگلے سال تک ملتوی کر دوں۔ مگر مولانا نے اُن کی
اِس عنایت سے استفادہ نہیں کیا ۱۲

اپنے طور پر بلالحاظِ تعزیراتِ ہند ضابطے کا ترجمہ گزٹ میں چھپوا دیا تھا۔ لیکن تعزیراتِ ہند اور ضابطے میں خلاف ہوا۔ ایسا دیا
کسی کی نگاہ نہیں پڑی اور پڑی تو ہمارے مولانا کی۔ چناں چہ مولانا نے اپنے پرانے محسن میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کی
معرفت گورنمنٹ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی۔ حق پسند گورنمنٹ نے اِس فروگزاشت کو تسلیم کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کو
ضابطے کا ترجمہ درست کرنا پڑا جو ترجمہ کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔

ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کے متعلق یہ واقعہ بھی قابلِ بیان ہے کہ جب مولانا کا کان پور سے گورکھ پور کو تبادلہ ہوا
تو وہاں اوزلی صاحب کلکٹر تھے مولانا نے اپنی خدمات کے اظہار میں اوزلی صاحب سے یہ بھی کہا تھا کہ "میں نے ضابطۂ
فوجداری کا ترجمہ کیا ہے"۔ یہ بات اُن کے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ اتنے میں کسی انگریزی اخبار میں اوزلی صاحب نے دیکھا کہ میر
ناصر علی خاں صاحب کو ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کے صلے میں سونے کی گھڑی انعام میں ملی۔ اوزلی صاحب نے مولانا سے بُلا کر
کہا کہ "آپ تو اپنے آپ کو ضابطۂ فوجداری کا مترجم بیان کرتے تھے۔ انعامی گھڑی ناصر علی کیوں کر لے گیا"۔ مولانا نے اپنے
دعوے کے ثبوت میں چٹھیاں وغیرہ دکھائی ہوں گی۔ مسٹر اوزلی نے یہ حال سن کر سکرٹری گورنمنٹ مسٹن صاحب کو لکھ مارا۔
وہاں میر ناصر علی خاں صاحب سے شاید باز پرس ہوئی۔ میر ناصر علی خاں کو یہ خیال ہوا کہ شاید مولانا نے تحریک کی ہے آخر وہ مولانا
سے ناخوش ہو کر کشیدہ رہنے لگے۔

غرض نیل کو ڈنے گھڑی اور تحصیلداری دلائی۔ تو ضابطۂ فوجداری سے ڈپٹی کلکٹری ملی۔ دو برس یعنی ۱۸۶۲ء تک ہمارے
مولانا تحصیلدار رہے۔

ڈپٹی کلکٹری اور اُس کا امتحان اور ایک پیشین گوئی

تحصیلداری کے بعد ہمارے مولانا ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کی کرسی پر بٹھا دیئے گئے۔ اور
وہیں کان پور میں ڈپٹی کلکٹری کے متعلق مولوی نصراللہ خاں صاحب نے اُس وقت جب کہ
مولانا اُن سے استفادۂ علم کرتے تھے یہ فرمایا تھا کہ "یہ لڑکا کسی زمانے میں ڈپٹی کلکٹر ہوگا"
ڈپٹی صاحب نے تو ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی۔ مگر خود ہمارے مولانا کو اُس زمانے میں ان باتوں
کا خیال بھی نہ گزرتا ہوگا اور نہ کبھی وہ اپنی آیندہ زندگی کو انجام بینی کی عینک سے دیکھتے ہوں گے۔ جس زمانے میں مولانا اور اُن کے
بھائی مولوی علی احمد صاحب مولوی نصراللہ خاں صاحب سے پڑھتے تھے تو جیسا کہ بچّوں کی عادت ہوتی ہے مولانا اپنے طرح طرح
کے دستخط بنایا کرتے تھے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی لکھا کرتے تھے "یعنی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر"، لوگ کہیں گے کہ یہ تفاؤل تھا یا لڑکپن کی باتیں
تھیں اور ہم کہتے ہیں اگر اس کو الہام کہیے تو کیا بے جا ہے کیوں کہ خدا نے یہ پیشین گوئی پوری کی ورنہ خیال کیجیے کہ کہاں گنجاہ
کی مدرسی اور وہاں سے کان پور کی ڈپٹی انسپکٹری پھر وہاں سے استعفا پھر الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری۔ پھر وہاں انگریزی کا
سیکھنا اور اس طرح انکم ٹکس ایکٹ کا ترجمہ کرنا پھر پنل کوڈ کا ترجمہ کرنا اور پھر کان پور کی تحصیلداری اور پھر ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کی وجہ سے ڈپٹی کلکٹری
جس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں "وہ محنت جو میری قسمت میں لکھی تھی کان پور سے گورکھ پور لے گئی۔ دیکھا کہ ضلع بجا ہے خود

لہ مسٹر مسٹن گورنمنٹ کے مترجم تھے اور تعزیراتِ ہند کا ترجمہ ان کا کارِ منصبی تھا۔ مگر سر جارج ایڈمنسٹن نے جو ترجمہ تعزیراتِ ہند سے ان کو الگ رکھا یہ ان کو
ناگوار ہوا۔ اور اس لیے انھوں نے اپنے اختیار سے بے اجازتِ گورنمنٹ ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ گزٹ میں چھاپ دیا ۱۲

بغلیں جھانکتے تھے
ضلع ہے جس کا ایک ایک پرگنہ آبادی اور مال گزاری اور وسعتِ رقبہ میں بڑے بڑے اضلاع کی ہمسری کرتا ہے۔ اور سَمْلہ بمقدار علم جیسا ضلع بڑا ہے ویسا ہی مال اور فوجداری کا معمولی کام بہت ہے۔ اور بندوبست اس کے علاوہ۔ کثرتِ کار دیکھ کر میں گھبرایا تو سہی مگر ہمت نہیں ہاری۔ رات دن محنت کر کے کام کو امروز بفردا نگزار پر لا ڈالا مرتے کو مارے شاہ مدار۔ کثرتِ کار کے علاوہ ایک نئی ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کی اُور تھی۔ لیکن محنت میں خدا نے بڑی برکت دی۔ دن بھر کام کی اُدھیڑ بُن میں رہا۔ رات کو امتحان کی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ بارے تمام پراوس میں مال و فوجداری دونوں محکموں میں اوّل رہا[1] اور لبقیۃ العمر امتحانوں سے چھٹی ملی۔

امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد مولانا کچھ عرصے تک گورکھپور میں رہے۔ لیکن بندوبست کے کام سے چوں کہ از بس متنفّر تھے اس لیے اکثر یہ چاہا کرتے تھے کہ کسی غیر ضلع میں بدلی ہو جائے۔ بدلی تو ہوئی مگر کام وہی بندوبست کا سپرد ہوا۔ ضلع جالون میں بدلی | گورکھپور سے مولانا کی بدلی جالون کو ہوئی مگر یہاں بھی وہی بندوبست کے جھگڑے اُٹھانے پڑے جس کی تکلیف سے مولانا بہر کیف کہ رسیدیم آسماں بہ راست چڑھا کرتے تھے۔ محکمۂ بندوبست نے مولانا کا ایسا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ایک مرتبہ جل کر اس موقع پر جب کہ سر ولیم میور بمقام آگرہ ڈیوک آف اڈنبرا کی موجودگی میں مولانا کو مرآۃ العروس کی تصنیف کے صلے میں ایک ہزار روپئے نقد اور اپنی جیبِ خاص سے ایک کیمبرج کلاک جس پر الفاظ مناسب کندہ تھے انعام دیا تو مولانا نے اُن کی شان میں عربی کا مدحیہ قصیدہ لکھا۔ اُس میں یہ تین شعر بھی تھے جو بندوبست کے کام سے نفرتِ کلی ظاہر کرتے ہیں:

ولی عمل فی البند وبست ومحنۃ | اکابدھا بالصبر منذ ثمان[2]
فھذا دوائی وامتقعت تلونا | وھذا مشیبی شبت قبل اوان[3]
وفیك رجائی والرجاء معولی | علی ثقۃ بالنجح والتکلان[4]

اس میں کچھ شک نہیں کہ بندوبست کا کام بڑے جھگڑے کا کام ہے گورنمنٹ کے جتنے بھی محکمے ہیں غالباً اُن سے کسی محکمے میں اتنی محنت اور دقّت کا کام نہیں ہے جتنا محکمۂ بندوبست میں ہے لیکن ہمارے مولانا چوں کہ شروع سے محنتی طبیعت اپنے ساتھ لائے تھے اور انھیں فطرۃً محنت سے دلچسپی ہے اس لیے وہ بہت کم ایسے کاموں سے گھبرایا کرتے تھے اُن کی تو یہ حالت تھی کہ بعض اوقات جوشِ وحشت میں سرکاری کاموں کے نفلوں کو بھی فرضوں کی طرح اپنے اوپر لازم و واجب کر لیا کرتے تھے۔ جہاں یہ حالت ہو وہاں فرصت کہاں دم مار سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادھر تحصیلداری ملی اور اُدھر ساتھ ساتھ امتحان دینا پڑا ادھر ڈپٹی کلکٹری ملی اور اُدھر ساتھ ساتھ ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینا پڑا اگر اس کو مولانا کی خوش قسمتی اور زورِ لیاقت کہنا چاہیئے کہ باوجود اس عدیم الفرصتی اور کثرتِ کار کے جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو خدا کے فضل سے پاس ہونے والوں میں اوّل نمبر رہے

[1] اس امتحان میں کئی انگریز بھی شامل تھے ۱۲
[2] اور میں آٹھ برس سے بندوبست میں ہوں اور مجھکو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور میں صبر کے ساتھ مشقّت اٹھاتا ہوں ۱۲
[3] یہ میری صورت ہے کہ میری رنگت متغیر ہو گئی ہے اور میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہوں ۱۲
[4] اور مجھکو آپ سے بڑی اُمید ہے اور اللہ پر مجھکو بھروسہ ہے اور کامیابی کا یقین ۱۲

گورکھپور میں دوبارہ بدلی

ضلع جالون کا بندوبست جس وقت ختم ہوا تو پھر مولانا کو ترقی کے ساتھ گورکھپور بدل دیا گیا۔ گورکھپور کا نام سن کر اول تو مولانا بہت ڈرے۔ مگر اس مرتبہ کام تھوڑا تھا اور رہا بھی تھوڑے دنوں کا۔ مدتوں سے سالانہ رپورٹوں میں شکایت لکھی جا رہی تھی کہ ضلع بندی کے وقت ضلع گورکھپور میں جنگل بہت تھا اس کے بعد سے گرانٹ سسٹم[1] پر جنگل کٹ کٹ کر کاشت ہو گئے۔ نیپال کی ترائی کے لوگوں نے کتنے گانوں بسا لیے۔ حکام اور عمال کو کثرت کار سے رعایا کو صدر کی آمد و شد سے بہت تکلیف ہے اور اتنے لوگوں کی روک تھام بھی مشکل ہے۔ آخر کار ضلع گورکھپور سے کچھ علاقہ کٹ کر ضلع بستی میں قرار پایا۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی تعیناتی اس بار اسی غرض سے ہوئی تھی کہ ضلع بستی کے کاغذات بندوبست علیحدہ کر دیں۔ غرض جب تفریق کاغذات کا کام پورا ہو گیا تو مولانا کی بدلی دوسری جگہ ہو گئی۔

قانون شہادت کے ایک عالمانہ متن کا ترجمہ

گورکھپور میں جیسا سرکاری کام تھوڑا تھا ویسا ہی ایک چھوٹا سا کام مولانا کو تصنیف و تالیف کا بھی مل گیا تھا۔ مولانا کی پہلی آمد میں ایک مہتمم بندوبست مسٹر لیوپورون صاحب بھی تھے۔ مولانا اُن کے ماتحت تو نہ تھے مگر وہ تھے علم دوست۔ دو چار ملاقاتوں میں مولانا پر بڑی مہربانی فرمانے لگے۔ مسٹر لیوپورون صاحب ہمارے مولانا سے عقیدتمندانہ ملتے تھے اور اس عقیدت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ مولانا مسٹر لیوپورون صاحب سے ملنے تشریف لے گئے۔ اس وقت مسٹر لیوپورون صاحب ایک مختصر سے خیمے میں مفتی اسد اللہ خاں صاحب سے جو صدر الصدور بھی تھے درمختار پڑھ رہے تھے جیسے انگریز پڑھا کرتے ہیں ہمارے مولانا کو مسٹر لیوپورون صاحب نے کہلا بھیجا کہ آپ ذرا کی ذرا تشریف رکھیں میں سبق سے فارغ ہو کر آپ کو بلاتا ہوں۔ مولانا خیمے کے باہر بیٹھے ہوئے اُن کا پڑھنا سنتے تھے۔ درمختار والے کا عام اصول ہے کہ وہ ہر باب کے متعلق کچھ نثر لکھتا ہے۔ اور نثر میں ہوتی ہے تعقید۔ مفتی اسد اللہ خاں صاحب کو اور مولویوں کی طرح ادب عربی سے بے مناسبتی سی تھی وہ جس ڈھنگ سے مسٹر لیوپورون صاحب کو سمجھا رہے تھے نثر اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ الغرض مسٹر لیوپورون صاحب سبق پڑھ کر فارغ ہوئے تو ہمارے مولانا کو خیمے میں بلایا۔ مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ میں آپ کا درمختار پڑھنا خیمے کے باہر سے سن رہا تھا اور معلوم ہے کہ آپ درمختار کے نثر کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ مسٹر لیوپورون صاحب نے درمختار کا وہ مقام ہمارے مولانا کو دکھایا اور آپ نے اس کی تعقید وغیرہ کو دور کر کے نہایت آسانی کے ساتھ مسٹر لیوپورون صاحب کو سمجھا دیا۔ مسٹر موصوف نے قانون شہادت پر انگریزی میں ایک عالمانہ متن لکھا اور مولانا سے اُس کے ترجمے کی فرمایش کی۔ رسالہ تھا تو چھوٹا سا مگر تھا بڑا ہی ادق۔ لیوپورون صاحب نے ترجمہ پسند کیا اور منشی نول کشور صاحب کے مطبع میں اس کو چھپوایا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ لیوپورون صاحب نے اس ترجمے کے صلے میں مولانا کو کیا مرحمت فرمایا۔

اعظم گڑھ کی بدلی

گورکھپور سے بدل کر مولانا اعظم گڑھ میں تشریف لائے یہاں کی بدلی تصنیف و تالیف و تراجم کے لحاظ سے جتنی عمدہ تھی اُتنی ہی ملازمت کے لحاظ سے اچھی نہ تھی۔ ہم اس موقع پر مولانا کی دوسری تصنیف و تالیف کا ذکر نہیں کریں گے البتہ ایک ترجمے کا ذکر ہوگا جس کے باعث سے مولانا کے آسمان ملازمت میں خوش اقبالی کا آفتاب چمکا۔ اور سرکاری ملازمت

[1] گورکھپور جنگلی ملک تھا اور اب بھی ہے تو سرکار نے گرانٹ کا قاعدہ جاری کیا تھا کہ قطعات جنگل کی حد بندی کر کے ہلکے لگان پر لوگوں کو دے دیئے جاتے تھے کہ ان کو آباد کریں۔ اس طریقے کو گرانٹ سسٹم کہتے ہیں ۱۲

کی ڈپٹی کلکٹری سے نکل کر ایک ریاست عظمیٰ میں گویا گورنری کی۔ وہ یہ ہے کہ وہیں اعظم گڑھ میں سب سے اخیر اور سب سے زیادہ نتیجہ خیز کتاب گولمنز ہیونز[1] کا ترجمہ کیا۔ یعنی لپوڑون[2] صاحب نے گزٹ میں ایک ہزار روپے کے انعام کا اشتہار دیا کہ جو کوئی عمدہ ترجمہ کرے گا وہ یہ انعام پائے گا۔ اشتہار کے ساتھ مولٰنا نذیر احمد صاحب کو ایک پرائیوٹ خط لکھا کہ میں نے اشتہار تو دیا ہے مگر شروع سے میری نگاہیں تم پر پڑ رہی ہیں۔ یہ خط پا کر مولٰنا نے عذر کیا اور لکھا "میں نے تعلیم نسواں کا سلسلہ لے رکھا ہے اور اس میں مجکو ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور بندوبست میں اس سے زیادہ فرصت نہیں پا سکتا۔"

بندوبست کے کام کا عذر ہمارے مولٰنا نے صرف اس لیے لکھ دیا تھا کہ بندوبست سے علیحدہ کر کے ضلع میں بدل دیئے جائیں۔ مگر لپورون صاحب نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ کوئی ضلع دلواتے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر سے دباؤ ڈلوایا اور اس طرح مجبوراً مولٰنا کو ترجمہ کرنا پڑا۔ مولٰنا فرماتے ہیں "سب ملا کر گیارہ ترجمے ہوئے ان میں محاکمہ کرنے کو لپورون صاحب نے نقادان فن کی کمیٹی بٹھائی کمیٹی نے میرے ترجمے کو سب سے بہتر تو مانا مگر ساتھ ہی یہ پخچر لگا دی کہ آپ ٹو مارک نہیں ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے میرا جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ ممبران کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے۔ اسقام دریافت کرتا ہوں تو اسقام ظاہر نہیں کرتے وہ دن اور آج کا دن میں نے فرمایشی شاعری سے کان امیٹھا"۔ غرض مولٰنا کو جب کمیٹی کی رائے معلوم ہوئی کہ ہزار روپے کی جگہ چار سو انعام تجویز ہوا ہے تو ان کو سخت ناگوار ہوا اور انھوں نے بہت رنج و ملال کیا اس لیے نہیں کہ انعام میں کھنڈت پڑ گئی۔ اور ہزار کی جگہ چار سو تجویز ہوا۔ بلکہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ان کو رنج ہوا کہ لوگوں نے ترجمے میں نکتہ چینیاں تو کیں مگر وہ نکتہ چینیاں مترجم کو بتائی نہیں گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں نکتہ چینیوں کا بہانہ تھا اور اصل میں رشک و حسد لیکن اب صبر کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ مگر یہ صبر ایسا تھا جس کے میٹھے پھل آگے چل کر مولٰنا کو ملے اور وہ اس طرح کہ حیدرآباد کے امیر کبیر[6] علم ہیأۃ کے بڑے عالم تھے۔

۱؎ یہ کتاب انگریزی میں علم ہیأۃ کی ہے اس کے ترجمے کا نام "سماوات" رکھا گیا ہے۔ جو اس وجہ سے نہیں چھپی کہ اس کے نقشے وغیرہ بغیر ولایت کے اس ملک میں نہیں چھپ سکتے اور ہمارے ملک میں علم کی ابھی ایسی چاٹ نہیں کہ لوگ ایسی گراں کتاب خرید سکیں ۱۲ ۲؎ ایچ۔ لی۔ پور۔ ون۔ صاحب اپنی وفات سے پہلے کشمیر کے رزیڈنٹ ہو گئے تھے۔ انھوں نے مولٰنا کو لکھا کہ کسی ذی علم عربی داں کو میرے پاس بھیجو۔ چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ دوں گا۔ مولٰنا نے اپنے بڑے داماد مولٰنا حاجی حافظ سید احمد حسن صاحب سے کہا کہ تم جاؤ۔ کیوں کہ یہ مولوی نذیر حسین صاحب کے شاگرد بڑے محدث اور بڑے فقیہ اور ادیب تھے۔ لیکن ان کو سرے سے انگریزی نوکری ہی سے استکراہ تھا نہ جانا تھا نہ گئے۔ اور مولٰنا کے ساتھ حیدرآباد جا کر چھوٹتے ہی چار سو کے پرنسپل اسسٹنٹ ہوئے اور بعد میں ریونیو بورڈ کے سکرٹری ہو گئے اور آخر کار [illegible] اضلاع میں اول تعلقہ دار کلکٹر ہو کر آٹھ سو ماہوار پانے لگے۔ اب دہلی میں بیٹھے پنشن سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کو تصنیف و تالیف عربی کا بہت شوق ہے ۱۲

۳؎ سنا ہے خدا جانے صحیح یا غلط کہ سر سید اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور منجملہ اور ممبروں کے شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب ممبر کمیٹی کی یہ رائے تھی کہ مولوی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ سب میں بہتر ہے مگر ایک ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے ۱۲ ۴؎ یعنی تکمل ۱۲ ۵؎ مولٰنا کو اپنا یہ عہد ۱۹۰۳ء میں اس طرح توڑنا پڑا کہ لارڈ کرزن کے حکم سے جب مسٹر سٹیفن وہیلر نے ہسٹری آف دی دہلی کورونیشن دربار لکھی تو لارڈ کرزن بہادر نے ہمارے مولٰنا کو لکھا کہ آپ اس تاریخ کا اردو زبان میں ترجمہ کر دیجیے اور آپ کو ایک ہزار روپیہ انعام ملے گا۔ مولٰنا نے تاریخ دربار تاج پوشی کے نام سے ترجمہ تو کر دیا لیکن انعام کے متعلق لکھ بھیجا کہ میں اس کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ ایڈورڈ ہفتم کی ایک وفادار رعایا میں سے ہوں بس یہی انعام میرے لیے کافی ہے کہ میں ایسے بادشاہ کے دربار کا مترجم ہوں ۱۲ ۶؎ نواب رفیع الدین خاں بہادر مرحوم نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء امیر کبیر علم ہندسہ اور علم ہیئت کے بڑے عالم تھے۔ محمدن کالج علی گڑھ میں بغرض تدریس علم ہندسہ و ہیئت انھیں کی یادگار میں ان کے بھتیجوں نے دس ہزار کے صرف سے پرنسپل ہال میں امداد دی ہے جناب ممدوح نے ایک رسالہ اسی علم میں شمسیہ بھی لکھا ہے اور سنا ہے کہ بعض یورپین زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو گئے ہیں ۱۲

لپوروں صاحب نے مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا "کہ ایک ہزار کا انعام مشتہر کرکے گولنسز ہونز کا اردو ترجمہ کرایا ہے اور میں اس کو آپ ٹومارک کرانا چاہتا ہوں اگر آپ امیر کبیر صاحب کو اس کی درستی کی طرف متوجہ فرما سکیں تو میں آپ کا اور امیر کبیر کا بہت ہی ممنون ہوں گا" اس طریقے سے مولانا کا ترجمہ رزیڈنٹ حیدرآباد دکن اور امیر کبیر کی خدمت میں پہونچا۔ امیر کبیر نے بواسطہ سر سالار جنگ بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی عماد الملک بہادر (مستعفی ممبر انڈیا کونسل) کو دیا کہ وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں (ابھی تک ان معاملات کی اطلاع ہمارے مولانا کو مطلق نہیں۔ نہ ان صاحبوں سے کسی قسم کا تعارف) غرض عرصے کے بعد مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا خط مولانا کے نام آیا جس میں لکھا تھا

"آپ کا ترجمہ مجکو سپرد ہوا ہے۔ مجکو اس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں جس نے ترجمے کو اچھا نہیں بتایا ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے اور اس میں کچھ کسر ہے تو اسی قدر کہ آپ ہی اس کی نظر ثانی کریں اور جہاں ضرورت دیکھیں اصلاح کریں اور میں یہی رائے لکھ کر ون صاحب کے پاس بھیج رہا ہوں"

اس خط کو آئے ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ ون صاحب کے مفاجات انتقال کی خبر انگریزی اخباروں میں مشتہر ہوئی۔ یہ خبر پڑھکر مولانا پر سناٹا سا گزر گیا اور سمجھے کہ ون صاحب کے ساتھ ترجمہ بھی مر گیا۔ اب کس کو لکھیں۔ کس سے پوچھیں۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ اس عرصے میں ون صاحب کی بیوہ شوہر کو رو پیٹ کر ولایت چلی گئیں۔ کوئی چھ مہینے بعد انھوں نے مولانا کو لکھا کہ

"گولنسز ہونز کے ترجمے کا حال ون صاحب کے بیان سے زبانی اور ان کے روزنامچے کے پڑھنے سے مجھے بخوبی معلوم ہے اور وہ ترجمہ میرے پاس ہے اور جو سو ترجمے کی نیت کا بھی امانت ہے جو تم کہو سو کروں"

اس کے جواب میں مولانا نے انگریزوں کے اخلاق اور ان کی تہذیب۔ ان کی مروت۔ ان کی وفاداری اور ان کے پاس عہد کی تعریف کرکے ون صاحب کی بیوہ کو تعزیت نامے کے بعد لکھا کہ "روپیہ تو مجھے چاہیئے نہیں ہاں ترجمہ واپس کر دیجئے تو میں ون صاحب کی نشانی اپنے پاس رکھوں گا" جب ترجمہ ولایت سے آ گیا۔ تو مولانا نے اس مراسلت کو مع ترجمہ گورنمنٹ میں پیش کر دیا۔ گورنمنٹ نے مہربانی سے ہزار روپیہ جو کمیٹی نے رکوا دیا تھا اپنی جیب سے مرحمت فرمایا۔

اگرچہ ہم نے انکم ٹکس ایکٹ۔ پنیل کوڈ۔ یا اس کے ضمیمے کے ترجموں کا نمونہ ناظرین کو نہیں دکھایا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ سب قانونی کتابیں ہیں اور اس قدر دائر سائر ہیں کہ تقریباً ہر اردو خواں کی نظر سے کبھی نہ کبھی گزری ہوں گی لیکن "سموات" ایک بیش بہا علمی ترجمہ ہے۔ اور چوں کہ وہ ابھی تک طبع کے سانچے میں نہیں ڈھلا ضرورت ہے کہ اس میں نمونے کے طور پر کچھ ہدیۂ ناظرین کیا جائے۔ گولنسز ہونز کا ترجمہ دیکھ کر ہمارا خیال بالکل بدل گیا اور اب ہم سمجھے کہ اردو میں علمی کتابیں ترجمہ ہونے کی خاص قابلیت ہے۔ بشرطے کہ مترجم ہمارے مولانا جیسی لیاقت کے ہوں۔

فاضل مترجم کو گولنسز ہیونز کے ترجمہ کرنے پر صرف انعام کی طمع اور نام و نمود کی ہوس ہی نے آمادہ نہیں کیا بلکہ انعام کا خیال ایک محرک اور نام و نمود کا تصور محض ایک مؤید تھا۔ فاضل مترجم نے اس ضیق وقت اور عدیم الفرصتی پر کہ جو ان کی ملازمت کو لازم اور ان کی خدمت کے لیے ضروری تھی دو سبب سے اس امر اہم کا بیڑا اٹھایا۔ اول یہ کہ مسٹر

ہنری لیپوروں صاحب جن کے حکم سے یہ گنجِ شائگانِ حکمت وقف تہی دستانِ ہند کیا جانے کو تھا فاضل مترجم صاحب ممدوح کی لیاقت کے معتقد تھے - اُن کے فرمان کی تعمیل اور اُن کے ارشاد کی بجا آوری مولنا پر واجب تھی - دوسرے فاضل مترجم نے جب پہلے پہل اِس کتاب کو دیکھنے کے لیئے اُٹھایا تو اندر سے دل ہچکچاتا تھا - فاضل مترجم سے کتاب کو اُٹھانے تو اُٹھالیا لیکن دل میں سوچتے تھے کہ "میرے ناخنِ ذہن میں اپنے بچی عقدوں کے حل کرنے کا آب ہوتا کہاں کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملوں اور بڈھا طوطا ہو کر حق اللہ پاک ذات اللہ کرنے بیٹھوں - تب غوامضِ ہیاۃ کے سمجھنے کا قصد کروں اور بے سمجھے اگر میں نے ترجمہ کر بھی دیا تو وہ عبارت مطلب خیز کیا خاک ہوگی اور اس صورتِ بے معنی کو سمجھے گا کون - مگر ابتدا کا ولولہ اور شروع کا جوش یہ سمجھاتا تھا کہ آخر اِس کام کو مکتب کے لڑکے تو کر لینے سے رہے - تجھی جیسے بندگانِ خدا اِس میں صرفِ ہمت کریں گے نحنُ رجالٌ وہم رجالٌ - تو اتنا بے دل کیوں ہوتا ہے -

غرض اِسی پس و پیش اور بیم و رجا میں کتاب کو دیکھنا شروع کیا - جوں جوں کتاب نظر سے گزرتی گئی فاضل مترجم کا سیاؤ کھلتا گیا - ایک مہینے سے بھی کم میں بالاستیعاب کتاب کو دیکھ ڈالا - اوّل نظر میں تو چنداں لطف حاصل نہیں ہوا مگر دوسری دفعہ فاضل مترجم نے اِس کتاب کو ایسے شوق سے پڑھا کہ کبھی بوستانِ خیال کو بھی ایسی دلچسپی سے نہیں دیکھا تھا - علمی کتاب میں (اور علمی کتاب میں بھی کیسی علمِ ریاضی کی اور وہ بھی ہیاۃ کی) قصّے کا مزا پایا اور افسانے کا حظ اُٹھایا - اور ترجمہ کرنے میں بھی یہی بات پیشِ نہادِ خاطر رہی کہ حتی الوسع اصل کتاب کی سلاست ہاتھ سے نجانے پائے - اِسی واسطے فاضل مترجم نے اِس کو دہلی کے روزمرّہ میں ترجمہ کیا - ترجمہ دیکھنے سے یہ خیال بالکل باطل ہو گیا کہ اُردو زبان میں علمی تصنیفات یا ترجم کی قابلیت نہیں ہے - بہر حال ذیل میں ابتدائی حصہ بطور نمونے کے درج کیا جاتا ہے ٭

نمونہ "سمٰوات"	بھلا اگر تم سے کوئی یہ سوالات پوچھ بیٹھے ٭

(۱) آسمان کیا چیز ہے ؟

(۲) اور یہ جو ظاہر میں ایک سمندر سا اُمنڈا ہوا معلوم ہوتا ہے اِس کے کنارے کا نام و نشان اِس کی تھاہ کا پتا ٹھکانا

(ع) بتاؤ کدھر ہے - دکھاؤ کہاں ہے ؟

(۳) یہ نقاطِ روشن یعنی بے شمار ستارے جو عالمِ تاریکی کے ایسے قدرتی چراغ ہیں کہ کبھی گُل ہی نہیں ہوتے کیا ہیں ؟

(۴) کیا اِن نور کے دانوں کو یوں ہی اٹکل پچو بے ٹھور بے ٹھکانے بکھیر دیا ہے - اور ان میں ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں - اور یہ تو صرف اسی قدر کہ ہم اِن کو اتفاق سے ایک طرزِ خاص پر یکجا اور مجتمع دیکھتے ہیں ؟

(۵) ہم تو مدّت سے یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ ستاروں کو جنبش نہیں اور گنبدِ بلورینِ فلک میں سنہری کیلوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں مگر اب لوگ کہتے ہیں ستارے چلتے ہیں - تو بتاؤ کہاں چلتے پھرتے ہیں ؟

(۶) عالمِ شہود کے اِس نظام باانتظام میں کُراتِ معلقہ کا ایک بڑا ہی اژدحام معلوم ہوتا ہے - مگر آفتاب اِس میں کس

(۱) یہ ترجمہ فاضل مترجم نے ہماری درخواست پر ہمیں ہبہ فرما دیا ہے ان شاء اللہ تعالی حیاۃ النذیر کی آمدنی سے جو پہلا کام ہوگا وہ یہی ہوگا کہ "سمٰوات" چھپے ۱۲

مقام پر ہے؟ زمین کہاں ہے؟ اور دوسرے ستارے جو ہماری زمین کی طرح سُلطانِ خاور کی اردلی میں دوڑتے ہیں کس جگہ ہیں؟ تو تم کیا جواب دوگے؟

وہ تو کچھ عقلِ انسانی کے لیئے ایک شرف مقدر تھا کہ سب علوم میں پہلے علم ہیأۃ ایجاد ہوگیا ورنہ یہ وہ چوٹی کے مسئلے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں ایجاد کا مادہ کتنا ہی کیوں نہ ہو بے مدد ہیأۃ ان کو حل کرنے کا ارادہ یاوہ سری ہے۔ انسان کو بھی خدا نے عجب قدرت دی ہے باوجودے کہ درماندگی اس درجے کی ہے کہ زمین سے اُڑ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ مگر یہ ذرۂ ناچیز عقل کے زور سے اس ذرا سے تودۂ خاک پر جس کی فراخنائے عالم کے مقابلے میں کچھ بھی ہستی نہیں بیٹھا بیٹھا ایسے آلات ایجاد کرتا ہے۔ جن کے ذریعے سے اس کی قوۃِ نظری ہزار چند زیادہ ہو جاتی ہے۔ فراخیِ عالم کی وسعت کو دریافت کرتا ہے اور جہانِ مرئی کا بیٹھا ناپتا ہے اور کروروں ستاروں کو جو اس میں معمور ہیں شمار کرتا ہے۔ پھر ان ستاروں کی پیچ دار حرکتوں میں غور کر کے جو ستارے زمین سے بہت پاس ہیں اُن کے ابعادِ ثلثہ اور اُن کے فاصلے زمین سے ٹھیک ٹھیک ناپ لیتا ہے۔ اور پھر اُن کی مقدار مادہ تول لیتا ہے۔ ازاں بعد منتشر ستاروں کے گچھوں میں واقعی تعلق دریافت کر کے ظاہری بدنظمی سے ایک قاعدۂ نظم اور انتظام پیدا کرتا ہے اور پھر اسی قدر نہیں بلکہ اپنے خیال کی بلند پروازی سے سوچ کر ایسے اصول استنباط کرتا ہے جن کے مطابق تمام اجرام فلکی ایک انتظام کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور اُس عام قوت کی ماہیت دریافت کرتا ہے جو تمام عالم کو سنبھالے ہوئے ہے

خاک کے پتلے نے دیکھو کیا ہی مچایا ہے شور | فرش سے لے عرش تک کر رہا ہے اپنا زور

سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ رہا | بل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

مگر یہ باتیں کچھ سرسری نہیں ہیں اُس مسلسل محنت کے مزے ہیں جو ہیأۃ داں لوگ پشتوں سے کرتے چلے آتے ہیں اور اُن لوگوں کے ذہن و استقلال کے نتیجے ہیں جنھوں نے دو ہزار برس تک آیاتِ آسمانی میں غور کیا ہے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہیأۃ داں کیلڈیا کے گڈریئے تھے۔ اِس کا یقین ہم کو بالکل اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ بڑے وسیع میدانوں میں رہتے تھے اور اُس ملک میں موسم بھی ایسا معتدل رہا کرتا ہے کہ خاصی طرح کھلے میدانوں میں لوگ راتیں بسر کر سکتے ہیں۔ پس ہمیشہ آسمانِ صاف میں اجرام فلکی کی نشان وار صورتیں اُن کے پیشِ نظر رہا کرتی تھیں اور ایسی حالت میں اُن کو ہیأۃ داں ہونا ہی چاہیئے تھا۔ اور وہ تھے بھی۔ اگر آب و ہوا کی صعوبت اور ہوائے محیط زمین کی مختلف حالتیں جو ہم کو اکثر آسمان کی دید کی مانع ہوا کرتی ہیں نہ ہوں اور شائستہ و مہذب معاشرت و تمدن کے مخمصے بھی فرصت دیں تو ہم سب بھی کیلڈیا کے گڈریوں کی طرح ہیأۃ داں ہو سکتے ہیں۔ آسمان کو دیکھنے سے بادی النظر میں ستارے خاصے الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ مگر دیکھو تو وہ سفید سفید دھندلے بخارات کی طرح جھلکتی ہوئی کیا چیز ہے جو پٹکے کی مانند آسمان کے گرداگرد لپٹی ہوئی ہے۔ اسی کو کہکشاں[1] کہتے ہیں۔ یہ کہکشاں ستاروں کا ایک بادل ہے اور جس قدر نظر اس کے قریب آتی جاتی ہے ستارے اور بھی گچھ پچ معلوم ہوتے جاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر

---

[1] عربی میں کہکشاں کو مجرہ کہتے ہیں اس کا ماخذ لفظ جر ہے جس کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ پس عربی اور فارسی دونوں میں وجہ تسمیہ واحد معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح گھاس کا گٹھا یا لکڑی کے جھاڑ کھینچنے سے زمین پر نشان پڑ جاتے ہیں کہکشاں کی ظاہری صورت اُن سے اشبہ ہے۔ مگر انگریزی اور یونانی میں کہکشاں کا ایک ملکی وے یعنی شیر ہین نام رکھا گیا ہے جس کا ترجمہ لفظی راہِ شیر ہے۔ لیکن میں جوئے شیر تجویز کرتا ہوں ۱۲ (مترجم)

ایسے چھوٹے ہیں کہ آنکھ سے اُن کا امتیاز بدقت ہوتا ہے۔ کہکشاں کی راہ میں ستاروں کا ہجوم یوں آنکھ سے متمیز نہیں ہوتا۔ مگر بڑے پلے کی دوربین کے ذریعے سے دیکھا جائے تو خوب صاف نظر آتا ہے۔ کہکشاں کو کچھ اور مت سمجھو بہت سے بے شمار ستاروں یعنی آفتابوں کا لمبا پتلا کہکشاں ہے اور بس۔ ہم نے ستاروں کو عموماً آفتاب کہا۔ اس واسطے کہ ہم آگے چل کر ثابت کردیں گے کہ روشن سے روشن ستارے سے لے کر مدھم سے مدھم ستارے تک ہر ستارہ ایک آفتاب ہے۔ الغرض یہ کہکشاں جہانوں کا بڑا بھاری انبوہ اور ازدحام عظیم ہے۔ اور اگر یہ مقولہ صحیح ہے کہ جو ستارے کہکشاں کے باہر واقع ہیں وہ بھی اکثر اسی کے ٹکڑے ہیں تو گویا کہکشاں تمام عالم کا لفافہ ہے۔ اور واقع میں یہ لاکھوں آفتابوں کا جتھا متعدد اور جداگانہ گروہوں میں منقسم ہے اور پھر وہ گروہ بھی اور ایسی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہر ٹولی کے حصے میں دو یا تین آفتاب ہیں۔ ان میں ہر ایک ٹولی کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہے اور سب ٹولیاں کتنی دور ہیں اس کا ٹھیک جواب بڑے سے بڑا محاسب بھی نہیں دے سکتا یہاں شمار بے کار ہے۔ اور اعداد قاصر۔

اِس مقام پر ہم ایک بات اور بھی کہے دیتے ہیں جس کو سن کر بہت سے لوگ تعجب کریں گے وہ یہ کہ ہمارا آفتاب بھی اسی کہکشاں کا ایک ستارہ ہے۔ گو یہ امر بخوبی ثابت ہو چکا ہے۔ مگر یہ مقام اس کے بیان کا نہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ موقع مناسب پر مذکور ہوگا۔

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا صرف ایک ابتدائی خاکا عالم شہود کی ساخت کا تھا۔ اگر امعان نظر کے ساتھ اس گنبد فلکی کے ہر طرف دیکھا جائے تو تیز بین آدمی کو جابجا سفید سفید جا بے چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح نظر آئیں گے اور گو یہ ٹکڑے اکثر کہکشاں سے بڑے فاصلوں پر واقع ہیں اور اُس سے صاف جدا اور ممتاز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایسا ہی خیال ہوتا ہے کہ گویا کہکشاں ہی کے ٹکڑے ہیں جو اس سے ٹوٹ کر دور جا پڑے ہیں۔ دوربین سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ایسے بادل کے ٹکڑے ہزاروں ہیں جن کو اصطلاح علم ہیئت میں غشاوہ کہتے ہیں۔ اب ذرا خیال تو کرو کہ یہ ٹکڑے جن میں کا ہر ایک بجائے خود جہانوں کا ایک مجمع ہے ہم سے کس قدر دور ہیں۔ خلائیں ہیں جن کی تھاہ کا کچھ پتا ٹھکانا نہیں۔ یوں ہی اُن کی مسافتیں بیان سے باہر ہیں۔ بڑی تیز دوربین میں دیکھا جائے تو اور بھی بے نہایت معلوم ہوتی ہیں کچھ حد و پایاں نظر نہیں آتا۔ نہ انجام ہے نہ غایت۔ نہ آخر ہے نہ نہایت۔ مگر ہاں لاکھوں آفتابوں کی مشعلیں روشن ہیں۔ قدرتی رصدگاہ یعنی یہی زمین اور یہی آنکھوں کی دوربین جو ہم کو بدو فطرت سے دی گئی ہے اس میں تو اس عالم کی یہ صورت دکھائی دیتی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی۔ لیکن اگر منظور ہے کہ اس کی ترکیب کی نسبت کوئی ٹھکانے کی بات سمجھیے اُس کے اجزا کے حالات میں جو بے انتہا اختلافات ہیں ان کو کامل طور پر جان لیجیے تو مجموع عالم سے قطع نظر کر لینا چاہیے کیونکہ کیا چشم ظاہر اور کیا چشم باطن مجموع عالم کے نظارے میں دونوں خیرگی کرتی ہیں۔ اور ایک بہت چھوٹا سا مجموعہ اختیار کرنا چاہیے جو ہم سے بہت قریب ہو۔ اور قربت کی وجہ سے انسان کا دست رس بھی اس تک متعذر نہ ہو۔ وہ مجموعہ وہ ہے جس کا ایک جزو ہماری زمین بھی ہے۔ اس مجموعہ کا مرکز آفتاب ہے اور وہی منبع نور و حرارت ہے اس کے گرد مختلف فاصلوں پر سو سے زیادہ دوسرے درجے کے اجرام گردش کرتے ہیں جن کو سیارات کہتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اور چھوٹے چھوٹے ستاروں کو بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے گھومتے ہیں جو اقمار کہلاتے ہیں۔ یہ ستارے اور اقمار

بذاتِ خود روشن نہیں ہیں۔ بلکہ نورِ آفتاب اُن پر چمک کر زمین کی طرف منعکس ہوتا ہے۔ اِس سے مثل اور ستاروں کے گنبدِ فلکی میں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اُن کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ بعینہٖ یہی حال خود زمین کا بھی ہے۔ اگر اس کو بھی خلا میں بڑی دور جا کر دیکھا جائے تو یہ بھی چمکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مجموعہ جو ہم نے منتخب کیا ہے اور جس کو نظامِ شمسی کہتے ہیں ایسے اجرام پر مشتمل ہے کہ وہ سب ایک صفتِ خاص میں دوسرے ستاروں سے جن کو ایک مجموعہ قرار دے کر نظامِ فلکی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ممتاز ہیں۔ کیوں کہ اس مجموعے کے باہر جتنے ستارے یا آفتاب ہیں ظاہراً زمین سے لا انتہا دوریوں پر واقع ہیں مگر اس مجموعے کے ستارے چنداں دور نہیں بلکہ ایک اعتبار سے فی الواقع زمین کے قرب و جوار میں ہیں بیانِ مذکورۂ بالا سے بداہتہً دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ستارے گنبدِ فلک میں نقلِ مکان کرتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ستارے ہم سے اتنے دور دراز فاصلوں پر ہیں کہ فی الواقع قعرِ خلا میں اپنی جگہ پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں اسی واسطے ابتداءً ان کو ثوابت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ مگر اب یہ نام متروک ہو گیا ہے۔ کیونکہ بڑی باریک بینی اور مشقّت کے ساتھ ان کے مواقعِ اضافی کو دیکھتے دیکھتے اب یہ بات قرار پائی ہے کہ ان ستاروں کو بھی حقیقتہً ایک حرکت ہے۔ لیکن دوری کی وجہ سے ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ ان کو خاص خاص صورتوں میں منتظم کر کے ہیئت دانوں نے جو مجموعے قرار دیئے ہیں سیکڑوں برس سے اُن میں کچھ بھی تغیر ظاہر نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ جو اجرام ہمارے اِس آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اُن کا اور حال ہے۔ زمین سے قریب تر ہونے کے سبب اُن کی نقل و حرکت وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہتی ہے اور جو ستارہ جس قدر ہم سے قریب تر اُسی قدر ہماری نظروں میں اُس کی رفتار تیز تر۔ اسی واسطے شروع سے اِن کو سیارہ کہا گیا۔ یعنی چلنے والے ستارے اور اب تک اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اور ستاروں پر کیا منحصر ہے ہماری نظر کا یہی خاصہ ہے کہ اگر بڑے وسیع میدان میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو دور کی چیزیں جو اُفق کے قریب ہیں ساکن معلوم ہوں گی۔ اور پاس والی چیزوں میں ذرا بھی کوئی ادھر اُدھر ہو گئی تو فوراً نظر پر چڑھ جائے گی۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر ہم خود متحرک ہوں تو واقعی حرکت اُن ظاہری حرکتوں کے ساتھ نہایت مشتبہ ہو جاتی ہیں جو صرف ہمارے واہمے نے پیدا کر لی ہیں۔ اور اگر منظور ہو کہ جو مسافت ہم نے طے کی ہے اُس کی سمتِ واقعی کا تصورِ صحیح ہم کو حاصل ہو تو حرکاتِ نفس الامری کا امتیاز رکھنا ضرور ہے۔ زمین کی حرکت کو ستاروں کا ظاہر میں متحرک نظر آنا لازم ہے اور یہ ایک بڑا عمدہ ثبوت زمین کی حرکتِ واقعی کا تھا۔ مگر قدیم ہیأت دانوں نے اِسی سے بڑا مغالطہ کھایا۔ اب چند روز ہوئے کہ واقعی حرکتوں کا امتیازِ صحیح کیا گیا ہے۔ نظامِ شمسی کے ہر ایک ستارے کا بیان مفصّل عن قریب آنے والا ہے اور وہاں معلوم ہو جائے گا کہ کیسے کیسے عجیب اختلافات ستاروں کی حالتوں میں ہیں۔ حرکتِ دولابی اور وہ حرکت تو دونوں کی جو مرکزِ مشترک کے گرد ہوتی ہے دو نہ حرکت۔ فاصلہ صورت ابعادِ ثلٰثہ۔ روشنی اور گرمی کی مقدار سب ہی باتوں میں تو اختلاف ہے۔ ہاں تعجب کی بات یہ ہے کہ با ایں ہمہ کل ستاروں میں اصولِ واحد کا عمل درآمد معلوم ہوتا ہے۔ اگر اختلاف مظاہر حیرت انگیز ہے تو وحدتِ انتظام بھی اُس سے کم تعجب خیز نہیں۔ نظامِ شمسی کے کل اجرام میں زیادہ تر تعجب کی بات یہ پائی جاتی ہے کہ یہ بڑے بڑے اجسام اور بڑے بڑے کُرے جن میں سے اکثر ہماری زمین سے کہیں بھاری ہیں اور خود زمین عرصۂ ہستی میں آ دھمکے ہوئے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ نہایت سرعت کے ساتھ خلا میں چل رہے ہیں۔ فرض کرو کہ ہم زمین سے

فلک خلا میں کسی مقام پر چپ چاپ کھڑے ہوئے اِن اجرام کی سیر دیکھ رہے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ دور سے ایک جسمِ نورانی نمایاں ہوا۔ جوں جوں پاس آتا گیا اُس کا قد و قامت نظروں میں بڑھتا گیا۔ اُس کی سطح بیرونی جو لاکھوں کوس کے گرد میں ہے اس تیزی سے اپنے اُوپر گھوم رہی ہے کہ جس نشان کو تاکو ایک سکنڈ میں نو میل طے کر جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کرہ سامنے سے ہو کر گزرا تو کس سرعت کے ساتھ کہ توپ کے گولے کی رفتار سے بھی چوبیس گنے تیز۔ مشتری کو اُس کے مدار میں حرکت کرتا ہوا دیکھو تو یہی کیفیت پاؤ گے۔ وہ تو آفتاب کی کشش اُس پر غالب آتی اور اُس کو روکتی ہے۔ کیونکہ کرۂ مشتری سے کرۂ آفتاب ہزار گونہ ہے ورنہ خدا کی پناہ اِس سناٹے کی رفتار نہیں معلوم مشتری کو عالم شہود میں کہاں کالے کوسوں لے اُڑتی۔ کہ پھر اُس کا پتہ بھی نہ لگتا۔ علمِ ہیأۃ سے صرف یہی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ ستاروں کی یہ عجیب حرکتیں واقعی ہیں یا یہ کہ زیادہ نہیں تو لاکھوں برس سے ستارے اسی طرح چکر میں ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہی سرعتِ رفتار تمام اجرامِ فلکی کے استحکام اور اُن کے ثبات و قیام کا باعث ہے اگر تم کو سیاروں کی حرکتیں سن کر حیرت ہوتی ہے تو نہیں معلوم یہ سن کر تم کیا کہو گے کہ صرف سیارے ہی گردش میں نہیں بلکہ آفتاب بھی اپنے خدم و حشم سمیت ایسے مدار میں گردش کر رہا ہے جس کا حال ابھی تک دریافت نہیں ہوا اور بے شک اس کو بھی کوئی قوتِ انجذاب آفتاب یا آفتابوں کا مجموعہ کھینچ رہا ہے۔ اور تمام ستارے جو بے انتہا فاصلوں کی وجہ سے غیر متحرک نظر آتے ہیں واقع میں وہ بھی مختلف سمتوں میں حرکت کر رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ بات بھی کھل رہے گی کہ ستارے جو ہم کو نہایت سست نظر آتے ہیں واقع میں سست نہیں ہیں۔ ہاں ابھی تک ہم کو صرف یہی تحقیق ہوا ہے کہ نظامِ شمسی کے سیارے سب سے زیادہ سریع السیر ہیں۔ البتہ اب سے لاکھوں برس میں یہ ستارے جن کو ہم ثوابت سمجھے ہوئے ہیں اپنا اپنا دورہ ختم کریں گے۔ اُن کی گردشوں کے زمانے ہمارے برسوں کے شمار کے مقابلے میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو ستاروں کے فاصلے زمین کے ابعادِ ثلثہ کے ساتھ اور جیسا کہ ہمبولٹ صاحب نے سمجھا اُن زمانوں پر نظر کرنے سے عالم ابدی معلوم ہوتا ہے اور اجرامِ فلکی میں غور کرنے سے جیسا کہ بُعد کے غیر متناہی ہونے کا اذعان ہوتا ہے اُس سے زیادہ زمانے کے ابدی ہونے کا ہوتا ہے۔ الغرض علمِ ہیأۃ کے ذریعے سے جو باتیں تحقیق ہوئی ہیں اُن کا نتیجہ مختصر یہ ہے جو بیان ہوا۔ اور علوم جتنے ہیں کیا طبعی کیا مادّی سب کی یہی غرض و غایت ہے کہ انسان اسرارِ قدرت میں غور کرنے کی استعداد بہم پہنچائے۔ اِن علوم سے اجسام کی ترکیبِ عنصری کا حال منکشف ہوتا ہے۔ عناصر کے امتزاجات اور انتقالات میں قدرت کے کھیل نظر آتے ہیں۔ اور اجسام کی ہزاروں مفید اور عجیب خاصیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن علموں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادّہ کیونکر حضیضِ جمادیت سے ترقی کر کے اوجِ نباتی و حیوانی پر پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار انسان بن جاتا ہے جس کے عمدہ ترین خصائص میں کمالِ وہبی ادراک ہے۔ اور جس نے نورِ علم کے ذریعے سے وہ شرف حاصل کیا ہے کہ تمام اجسامِ نامیہ میں سب سے زیادہ اکمل و افضل ہے فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ مگر یہ بات صرف علمِ ہیأۃ ہی میں ہے کہ عالم کو اُس کی عظیم الشان ہیأۃ مجموعی میں جلوہ گر کرتا ہے تمام عالم کی ساخت کا تصور ہم نے ہیأۃ ہی سے حاصل کیا ہے کیوں کہ علمِ ہیأۃ کرتا کیا ہے کہ عالم کے ہزاروں مختلف عناصر کا ایک بڑا ڈھانچا بنا کر سامنے کھڑا کر دیتا ہے تا کہ آدمی اس کو دیکھ کر ایسے ازلی اور ابدی اُصول استنباط کرے جن کی منادی آسمانوں میں پھر رہی ہے۔

اعظم گڑھ میں ریڈ صاحب سے مخالفت اور صفائی۔

ہمارے مولٰنا ابھی اعظم گڑھ ہی میں تھے کہ ریڈ[1] صاحب کو لوگوں نے مولٰنا سے کچھ بدگمان کردیا۔ کچھ جھوٹی شکایتیں کی ہوں گی۔ کچھ چغلی کھائی ہوگی۔ مولٰنا اس واقعے کے متعلق اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ "میرا حال یہ ہے کہ ایک لمحہ میرا دل نہیں لگتا۔ لیکن ریڈ صاحب کو میری غیبت میں لوگوں نے بدگمان کردیا ہے۔ کئی مہینے سے میرے کام کی جانچ پڑتال مخالفانہ ہو رہی ہے اور خود ریڈ صاحب بدمزاج ہو رہے ہیں۔ اِس وجہ سے کہ اُن کو مطابق اُن کی خواہش کے جاتا نہیں پایا۔ ان وجوہ سے میں درخواست رخصت پر آمادہ نہیں کرتا کہ مبادا میرے پیچھے کوئی رخنہ پیدا ہو۔ لیکن جب وقت مجکو معلوم ہوگا کہ اب میرا کام دیکھا جا چکا فوراً رخصت لوں گا۔" دوسری مرتبہ ایک خط میں لکھا۔

"ریڈ صاحب ہمارے نے مخالفت شروع کی تھی۔ جب ادھر سے جواب تُرکی بتُرکی ملا تو شورش فرو ہوگئی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ میرا رخصت لینا ملتوی کیا موقوف رہا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی برس ڈیڑھ برس بدلی بھی نہیں ہو سکتی" تیسری مرتبہ یہ لکھا "ریڈ صاحب کی آتش مزاجی بر سر ترقی ہے۔ پرسوں مجھ سے اُلجھے تھے۔ میں عجیب لااُبالی آدمی ہوں کچھ خبر بھی نہیں ہوتا۔"

پھر ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "اِس وقت ریڈ صاحب کی چٹّھی آئی ہے اُنھوں نے رپورٹ کردی ہے کہ یکم اپریل سے نذیر احمد دوسرے ضلعے میں بھیجا جائے۔ یہاں اِس کی ضرورت باقی نہیں۔ سکندرپور کا کام وآن صاحب کے سپرد ہو اور اُن کی تنخواہ کے علاوہ بھتّہ قائم مقامی دیا جائے۔ اس واسطے کہ وہی ایک عہدہ دار بندوبست ضلع میں رہے گا اور اختیاراتِ مہتمم بندوبست عمل میں لائے گا۔ اس رپورٹ میں وآن صاحب کی بڑی تعریف لکھی ہے اور میری نسبت لکھا ہے کہ اس میں عقل بہت ہے اور کام کرنے کی طاقت بڑی غالباً جس افسر کے ماتحت رہے گا۔ اُس کو

[1] جے۔ آر۔ ریڈ صاحب اعظم گڑھ میں مہتمم بندوبست تھے۔ پھر گورنمنٹ کے سکرٹری ہوگئے۔ پھر کمشنر گڑھوال کمشنری سے پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ ابھی تک زندہ ہیں۔ مولٰنا کے نواسے جو ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پاتے تھے ان سے ملتے رہتے ہیں مولوی بشیر الدین احمد صاحب اور مولوی عبد الحامد صاحب دونوں سے مراسلت بھی رکھتے ہیں۔ ریڈ صاحب آخر کار ممالکِ مغربی وشمالی کے سینیر ممبر آف دی بورڈ آف ریونیو ہوگئے۔ ان کا نمبر لفٹننٹ گورنری کا تھا لیکن سرجان وڈبرن ہوگئے۔ ریڈ صاحب کو یہ بہت ناگوار ہوا۔ اور وہ قبل از وقت پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ ریڈ صاحب کی شکر رنجی مولٰنا سے کسی سرکاری کام کی وجہ سے شاید ہوگی۔ مگر وہ ہمیشہ مولٰنا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ورنہ یوروپین کلکٹروں کے سامنے نیٹو ڈپٹی کلکٹروں کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ اعظم گڑھ کے قیام میں مولٰنا کے لڑکے پر ریڈ صاحب کی خاص مہربانی تھی۔ وہ ہمیشہ ان کو اپنے بنگلے پر بلا بھیجا کرتے تھے کبھی کبھی ان کا سبق بھی سنا کرتے تھے۔ اور اکثر ترجمے کی اصلاح دیا کرتے تھے۔ ریڈ صاحب کو جانوروں کا بہت شوق تھا۔ کبوتر۔ قمریاں۔ اور خرگوش مولٰنا کے لڑکے کو اکثر دیا کرتے تھے۔ اسی محبت سے وہ ہمیشہ ان سے ابھی تک مراسلت رکھتے ہیں جس زمانے میں ریڈ صاحب بریلی کے کلکٹر تھے اور مولٰنا کے صاحبزادے دہلی کالج میں پڑھتے تھے اُنھوں نے براہِ شفقت خاص طور پر اُن کو بریلی بلایا اور وعدہ کیا کہ تم کو میں تحصیلداری دوں گا مگر وقت پر یہ نہ گئے اور اب "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔" وہ ولایت میں ہیں اور یہ ریاستِ نظام میں دوم تعلقہ دار۔ تاہم ریڈ صاحب نے مولوی عبد الحامد صاحب سے جو مولٰنا کے برادرِ نسبتی ہیں بہت سلوک کیا۔ ان کو خان بہادر کا خطاب لوایا بلکہ درجۂ اعلیٰ کی ڈپٹی کلکٹری تک پہنچایا۔ اُنھوں نے مولٰنا کے نواسوں مشرف الحق صاحب اور ڈاکٹر اشرف الحق ایم۔ بی۔ بی۔ سی۔ ایچ دونوں پر جو بزمانِ قیام انگلستان ریڈ صاحب خود رہتے ہیں نگرانی اور تعلیم اور شفقت اور وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی کی ہے۔ اس کے مولٰنا بہت ممنون ہیں ان کا پورا نام جے۔ آر۔ ریڈ ہے اور اسی نام کے ایک مسٹری اسٹوارٹ ریڈ ڈائرکٹر سیالک اکزامنشن تھے جو مولٰنا کی علمی لیاقت کے بہت قدر دان تھے ۱۲

رضا مند کرے گا۔

اُدھر ریڈ صاحب تو مولنا کی بدلی کے فکر میں تھے اور اُنھوں نے رپورٹ بھی کر دی تھی لیکن مولنا کی تقدیر اُن کے لیے ایک اور تدبیر کر رہی تھی۔ گولمنز ہیونیز کا ترجمہ "سموات" جس کا ذکر ہو چکا ہے اُس نے مولنا کی لیاقت کے جھنڈے شہرت کے ساتھ حیدرآباد دکن میں گاڑ دیئے تھے۔ قسمت کی بات ہے کہ جس کتاب کے ترجمے کے صلے نے مترجم کو یوپی قطعی کر دیا ہو وہی حیدرآباد میں عجیب حسنِ اتفاق سے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دلوائے اور خوش قسمتی کا آفتاب چمکائے۔

خلاصہ یہ کہ مولنا سے اور ریڈ صاحب سے اعظم گڑھ میں نہیں بنی۔ مگر جب مولنا سرکاری ملازمت ترک کر کے حیدرآباد گئے تو ریڈ صاحب سے صفائی ہو گئی۔ ریڈ صاحب کو مولنا کی اُس وقت قدر ہوئی جب کہ وہ وہاں سے چلے گئے۔ قدرِ نعمت بعدِ زوال۔ گو ریڈ صاحب کا طرزِ عمل زمانِ قیامِ اعظم گڑھ میں کیسا ہی رہا ہو۔ لیکن وہ مولنا کی لیاقت اور تجربہ کاری اور دیانت داری کے ہمیشہ مداح رہے۔ ریڈ صاحب نوعمر آدمی تھے اور کنوارے یعنی مجرد۔ اِس وجہ سے اُن کے مزاج میں ایک قسم کی جلدی تھی اور اُدھر ہمارے مولنا بھی مزاج کے دھیمے نہ تھے اِن وجوہ سے کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ مگر بعد کے مراسم سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی بہت کچھ خلوص بڑھ گیا۔

ریڈ صاحب کو اُردو سے بہت شوق تھا۔ چنانچہ ہمارے مولنا نے حیدرآباد سے اُن کے نام ایک خط لکھا تھا وہ اُردو ہی زبان میں تھا۔ اُس خط کی نقل ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

مولنا کا ایک خط ریڈ صاحب کے نام

جنابِ عالی میں اپنے دوسرے خطوط میں ان شاء اللہ آپ پر ثابت کر دوں گا کہ میں نے اپنی انگریزی کو جیسی ٹوٹی پھوٹی اعظم گڑھ میں تھی اب تک بھلایا نہیں مگر چوں کہ ابتدائے مفارقت سے جس کو چار برس ہے میرا پہلا عریضہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خیالات کو اپنی زبان میں ادا کروں۔ پیشتر نے آپ کی چٹھی کی نقل دلی سے میرے پاس دورے میں بھیجی اور اُس کے پڑھنے سے وہ پانچ برس آنکھوں میں پھرنے لگے جو آپ کے سایۂ عاطفت میں نہایت خوشی اور اطمینان کے ساتھ اعظم گڑھ میں گزرے۔ اگرچہ مفارقت کو بہت دن ہوئے مگر آپ کی مہربانیاں بھولی نہیں نہ بھولیں گی۔ میرا حال اس ملک میں اُس شخص کا سا ہے جو کبھی ناؤ پر نہ بیٹھا ہو اور دفعتًہ اُس کو طوفان خیز سمندر میں بادبانی جہاز پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑے۔ بشیر کا یہ کہنا کہ میں نے اِس ملک کا رہنا ٹھان لیا ہے صرف اس قدر صحیح ہے کہ اُنھوں نے مجھ کو کبھی کہتے سنا ہو گا مگر یہاں کے حالات کو خود ثبات و قیام نہیں اور اس حالت میں کوئی رائے جم نہیں سکتی۔ تاہم اس سبب سے بھی (لیکن) نہیں کہ میری طبیعت مطلقًا نوکری سے گریز کیا کرتی ہے۔ مجھ کو یہاں صدر تعلقداری کی خدمت سپرد ہے اور یہ انگریزی عملداری کی کمشنری سے بہت ملتی ہوئی ہے۔ تنخواہ وہاں بہت اور اختیارات یہاں۔ مجھ کو تنخواہ کے بارہ سو ملتے ہیں اور یہ تعلق بندوبست دوامی [illegible] یہاں کا روپیہ تین آنے کے قریب انگریزی روپے سے چھوٹا ہے اور چیزوں کا نرخ بھی اکثر گراں۔ اس ملک میں کبھی پارسی مقتدر رہے ہیں کبھی مدراسی اور اِن دنوں ہندیوں کا دور دورہ ہے۔ مگر اس ملک کے لوگ صرف حسد کی وجہ سے ہم لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں انتظام کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ذاتِ نواب کو اس ملک میں حضور یا بندگانِ عالی سے تعبیر کرتے ہیں اور لفظ حضور جو وہاں تعظیمًا بولا جاتا ہے اس کا مرادف یہاں لفظ تقصیر ہے۔ حضور کا سنِ شریف پندرہ برس کا ہے اور اس وقت تک کہ حضور زمامِ سلطنت

اپنے دستِ مبارک میں لیں نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ایجنٹ ہیں۔ ان دونوں میں جو باہمی اختلاف ہے وہ آپ اخبار میں پڑھتے ہوں گے۔ انتظام سلطنت نواب مختار الملک کرتے ہیں۔ باستثنا امورِ عظیمہ جس میں مشاورت امیر کبیر ضرور ہے۔ ملک بہت وسیع ہے مگر اس کا ایک بڑا حصہ جاگیر۔ خود حضور نے جس قدر ملک اپنے واسطے الگ کر لیا ہے وہ صرفِ خاص کہلاتا ہے۔ جاگیرداروں میں سب سے بڑے جاگیردار امیر کبیر ہیں جن کے خاندان میں حضور کی صاحبزادیاں بیاہی جاتی ہیں۔ ان کی جاگیر کو لوگ ساٹھ لاکھ روپے سال کا بیان کرتے ہیں ان سے اتر کر اکثر مسلمان اور بعض ہندو اور جاگیردار ہیں۔ صرفِ خاص اور جاگیرات نکل کر جو ملک بچا وہ دیوانی کہلاتا ہے یعنی متعلق بہ دیوان (وزیر) ؏

حصّہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیدرآباد دکن کی ملازمت اور وہاں کے واقعات

جناب مولٰنا نذیر احمد صاحب نے جس وقت اعظم گڑھ کے قیام میں گولمنز ہیومنز (سموات) کا ترجمہ کیا اور اُس کے انعام ہزار روپیے میں جھگڑا پڑا اور ترجمہ کتاب اصلاح درستی کے لیئے بذریعہ ریزیڈنٹ حیدرآباد امیر کبیر کے پاس بھیجا گیا تو اُس وقت کسی کو کیا خبر تھی کہ ترجمے کی وقعت چپکے چپکے حیدرآباد کے علم دوست اور قدرشناس اُمرار کے دل پر پورا قبضہ کر رہی ہے اور مترجم کی عزت افزائی کا سکہ بٹھا رہی ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ فاضل مترجم کو لیورون صاحب کے مرگ مفاجات نے ایک ہزار روپیے کے انعام سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ مگر بعد کو برٹش گورنمنٹ نے وہ رقم دے کر فاضل مترجم کے آنسو پونچھ دیئے۔ غرض ادھر انگریزی گورنمنٹ نے قدردانی کی اُدھر نظام گورنمنٹ کے وزیر سر سالار جنگ مرحوم نے یہ قدر افزائی کی کہ مولٰنا کو ریاست حیدرآباد کے ایک اہم کام کے لیئے منتخب فرمایا۔

کس شخص کی تحریک سے مولٰنا حیدرآباد گئے

لوگ مشہور کرتے ہیں کہ نواب محسن الملک مرحوم کی تحریک نے مولٰنا کو حیدرآباد پونہچایا۔ لیکن ہمارے نزدیک مولٰنا کے انتخاب میں اصلی تحریک سموات (ترجمۂ گولمنز ہیومنز) سے ہوئی۔ اور ضمناً نواب محسن الملک مرحوم کی تحریک بھی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ سر سید کے متعلق بھی مشہور ہے کہ مولٰنا کی نسبت انھوں نے تحریک کی تھی اور یہ خبر بمقابلہ نواب محسن الملک مرحوم کے زیادہ قرینِ قیاس ہے کیوں کہ ہندوستانیوں کی پہلی کھیپ انھیں کی تحریک سے حیدرآباد پونہچی تھی۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ سموات دیکھ کر خود سر سالار جنگ کے دل میں فاضل مترجم کے طلب کرنے کا تقاضا پیدا ہوا۔ جناب موصوف نے عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سے اِس کتاب کے تعلق سے مولٰنا کا تذکرہ سُنا آدمی تھے بیدار مغز کسی اخبار یا گزٹ میں تصنیف و تالیف پر مولٰنا کے انعامات پانے کا حال معلوم کیا ہوگا۔

غرض اول اول مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے فاضل مترجم کو لکھا کہ "سر سالار جنگ آپ کو بُلانا چاہتے ہیں" (اُسی) کے قریب قریب نواب محسن الملک مرحوم کا ایک خط آیا اور بعد ازاں سر سید مرحوم کی معرفت من جانب سرکار نظام اس مضمون کا خط پونہچا کہ "بالفعل ساڑھے آٹھ سو اور بعد کو ایک ہزار بیس روپیے ماہوار گورنمنٹ برطانیہ کے سکے سے ملے گا" سر سید کو جب یہ خط ملا تو مولٰنا اعظم گڑھ میں چار صدی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سر سید نے مولٰنا کو اِس کی اطلاع دی مولٰنا او سر سید

میں ملازمت حیدرآباد کے متعلق جو خط و کتابت ہوئی اُس کا حال معلوم نہیں۔ ہاں مولانا نے اپنے فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو جو کچھ لکھا تھا وہ یہ ہے "اتنی تنخواہ مجکو سرکارِ انگریزی میں تمام عمر پانے کی توقع نہیں۔ دربارِ حیدرآباد ان دنوں بہت ممدوح ہے۔ اختیارات وسیع۔ عہدہ معزز۔ پس تم لوگ مجتمع ہو کر مشورہ کرو اور اگر اجازت دو تو بالفعل ایک سال کے لیئے رخصت لے کر جاؤں۔ ذرا بمبئی۔ مدراس۔ حیدرآباد وغیرہ کی سیر کروں۔ سِیرُوا فِی الْاَرْضِ۔ انگریزوں کی ہمت پر نظر کرو کس قدر دور کے سفر دریا اختیار کر کے یہاں آتے ہیں اور حیدرآباد تو اپنا دیس ہے۔ سنو بھائی میرا تو جی للچاتا ہے۔ لیکن اب ولولہ دل میں باقی نہیں کہ تم سب کو ناخوش کر کے چلا جاؤں"

حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق اہل وعیال سے مشورہ

غرض کچھ عرصے تک میاں بی بی اور باپ بیٹے میں ملازمتِ حیدرآباد کے متعلق خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اِدھر حیدرآباد سے بھی بہت زور کے ساتھ طلبی ہوئی۔ اُدھر بیٹے نے بھی مجبور کیا تو مولانا لکھتے ہیں کہ "تم حیدرآباد جانے کے متقاضی ہو۔ جب میں تمہاری عمروں میں تھا تو مجکو عرش کی سوجھتی تھی سہ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے اپنا اور آب ٭ لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے اب صرف اتنی گدگدی دل میں ہے کہ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر ابتدائً بارہ سو دیں گے اور اَرْذَلِ عُمر[1] کے لیئے سامان کر دینے کا وعدہ فرمائیں گے تو ان شاء اللّٰہ جاؤں گا۔ لیکن مجکو ایسا احمق مت سمجھو کہ بہت دنیا جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں۔ بشیر! دنیا کو خوب دیکھا۔ غریب محتاج تھا۔ خدا نے مال و غنی کیا۔ اولاد ہوئی۔ حکومت کے مزے اُڑائے۔ نام وری اور شہرت سے بھی بے نصیب نہیں رہا۔ لیکن انجام ان سب بکھیڑوں کا کیا ہے؟ آخر فنا۔ آخر فنا۔ اب خداوند تعالیٰ ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لیئے بھی کروں سہ کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے ٭ واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے ٭

حیدرآباد کی روانگی

بہر حال ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڑھ سے فرلو[2] لے کر دہلی روانہ ہوئے اور وہاں سے اَور اَور مقامات پر ہوتے ہوئے ۲۷ اپریل کو حیدرآباد فرخندہ بنیاد پونہچکر نواب محسن الملک بہادر کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔

دہلی سے روانہ ہونے کے وقت مولانا نے مولوی حاجی احمد حسن[3] صاحب جو مولانا کے بڑے داماد تھے۔ اور مفتی

---

[1] اخیر عمر ۱۲ [2] وہ رخصت جس میں تنخواہ نہیں ملتی ۱۲ [3] مولوی حاجی حافظ سید احمد حسن صاحب دہلوی مولانا کے بڑے خویش ہیں۔ یہ صاحب بڑے محدث اور بڑے فقیہ ہیں مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے ممتاز اور سربرآوردہ شاگردوں میں ہیں۔ چوں کہ مولوی سید نذیر حسین صاحب ہمارے مولانا کے پھوپیا خُسر تھے ان ہی صاحب نے مولانا کی بڑی صاحب زادی کو مولوی احمد حسن صاحب سے منسوب کرایا۔ مسٹر لی پوار ون رزیڈنٹ میسور نے ہمارے مولانا سے خواہش کی تھی کہ کوئی ذی علم مولوی اُن کے پاس بھجوا دیا جائے جسے چار سو روپے ماہوار دیا جائے گا۔ مولانا نے مولوی احمد حسن صاحب کا انتخاب کیا مگر مولوی احمد حسن صاحب نے معلوم نہیں انگریزی نوکری کو کیوں پسند نہیں کیا۔ جب مولانا حیدرآباد جانے لگے تو ان کو ساتھ لے گئے۔ سر سالار جنگ مرحوم نے مولانا کی مددگاری میں مشاہرہ چار سو ماہوار ان کو بھی مقرر کر دیا۔ چوں کہ آدمی ذی استعداد تھے ان کی علمی لیاقت کا ڈنکا بج گیا۔ آگے چل کر وہ مہتمم صدر اول تعلقہ دار ہو گئے۔ اور اب چند سال سے بحصولِ پنشن چار صدی خانہ نشین ہیں۔ یہ صاحب ادیب بھی ہیں کئی کتابیں عربی میں لکھی ہیں سب سے مفید احسن الفوائد اُردو کا ایک حاشیہ ہے جو انھوں نے ایک مترجم قرآن شریف پر چڑھایا ہے۔ چھپ بھی گیا ہے۔ اور اب ایک مبسوط تفسیر کلام مجید کی اُردو میں لکھ رہے ہیں۔ اس تفسیر کا نام احسن التفاسیر ہے۔ اس کے کچھ حصے شائع بھی ہو چکے ہیں ۱۲

رفیع الدین صاحب کو بھی لے لیا تھا بلکہ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل از روانگی حیدرآباد ان دونوں صاحبوں کو حیدرآباد جانے کے لیئے آمادہ کر رکھا تھا۔

تنخواہ کا مقرر ہونا اور دورے کو نکلنا

غرض سر سالار جنگ مرحوم نے مولٰنا کی روز روانگی اعظم گڑھ سے ایک ہزار دو سو چالیس روپے کے حساب سے تنخواہ مقرر کی جس میں ہزار روپیہ تنخواہ کا اور دو سو چالیس بھتّہ دوامی اور مزید براں دہلی سے حیدرآباد تک کا اول درجے کا کرایہ ریل اور دونوں ساتھیوں کا دوسرے درجے کا کرایہ اور دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا خاص مولٰنا ممدوح کی ماتحتی میں نوکر کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ملکِ تلنگانہ کے دو ضلعے تا گر کرنول اور نلگنڈہ جاکر ملاخطہ کیجیئے۔ فیل خانۂ خاص سے ایک ہاتھی ساتھ کر دیا اور اُس کا خرچ اپنے ذمّے رکھا پانچ روپے روز اُس کا خرچ تھا لیکن مولٰنا کبھی فیل نشین نہیں ہوئے مولوی احمد حسن صاحب اور منشی رفیع الدین صاحب اور اور لوگ ہاتھی پر سوار ہو کر مولٰنا کے ساتھ دورے میں رہا کرتے تھے اور مولٰنا خود اپنی اُسی پُرانی سواری پالکی میں سوار ہوتے تھے اول اول مولٰنا حیدرآباد میں تقریبًا ایک ہفتہ مقیم رہے اور اس ایک ہفتے میں دو مرتبہ سر سالار جنگ مرحوم سے مُلاقات ہوئی بعد ازاں دورے میں روانہ ہو گئے۔

مولٰنا جب حیدرآباد پُہنچے تو اُن کے لیئے وہ ایک نئی دنیا تھی۔ وہاں کے ساز و سامان تزک و احتشام دیکھ کر اُن کو خدا یاد آتا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کی حالت کا جب مقابلہ کرتے تھے تو ان دونوں کو اُس کا عشر عشیر بھی نہیں پاتے تھے۔ شہر میں جاکر جب دیکھتے تھے کہ مارے ہجوم کے تل رکھنے کی جگہ نہیں ملتی اور ہجوم بھی قلی مزدوروں اور بھیک منگوں کا ہجوم نہیں بلکہ نوابوں اور سرکاروں کا جن کی اردلی میں پلٹنیں رسالے اور ہاتھی دوڑتے ہیں تو مولٰنا حیرت کے عالم میں رہ جاتے تھے۔ سرکاری محلوں میں جب مولٰنا جاتے تو ہکّا بکّا ہو کر رہ جاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ جب مولٰنا کی نظر بدنظمیِ سلطنت پر پڑتی تھی تو وہ بہت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے ”عمل داری میں اچھا انتظام نہیں اگر خدا نوکروں کو توفیق خیرخواہی دے تو یہ ملک بجائے خود اودھ کا چوگنا ہے اور زمین بعض اطراف میں بلا مبالغہ تین سو روپے بیگہ تک ہے۔ نوکروں کی شوخ چشمی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں۔ جرمانہ کرنے کا قاعدہ نہیں ہے“

مولٰنا دورے میں کیا کرتے تھے

خلاصہ یہ کہ مولٰنا حیدرآباد میں جلسۂ خطبی کر کے دورے کو نکل کھڑے ہوئے گویا سفرِ دہلی و اعظم گڑھ ابھی منقطع نہیں ہوا۔ سر سالار جنگ کا تو حکم یہ تھا کہ تا گر کرنول اور نلگنڈہ دو ضلعے ملکِ تلنگانہ کے جاکر ملاخطہ

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

سلہ منشی رفیع الدین صاحب مولٰنا کے بہنوئی ہیں جس زمانے میں مولٰنا ڈپٹی کلکٹر بند و بست تھے تو اُنھوں نے اپنا سر رشتہ دار مقرر کرا دیا تھا حیدرآباد پُہنچ کر وہ تحصیلدار ہو گئے اور سالہا سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے ان کے حاکم بالا نے قریب ختمِ ملازمت یہ رپورٹ کر دی کہ ضعفِ بصارت ہو گیا ہے اور اب یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے اور یہ اِن کو سوجھتا ہے اس رپورٹ پر وہ علیحدہ کر دیئے گئے۔ یہ صاحب مزاج کے بڑے اکھڑ تھے فورًا وطن چل دیئے۔ اپنی ملازمت کے متعلق کسی قسم کی پیروی کی آخر کار وطن سے طلب کیئے گئے۔ بہت سرسری طور پر آئے اور محکمۂ مال میں حاضر ہوئے۔ ڈنلاپ صاحب بہادر نے جو ریونیو سکرٹری تھے اِن سے پُوچھا کیا تم اندھے ہو گئے ہو؟ دل جلے تو تھے ہی تڑسے جواب دیا کہ خیر میں اندھا ہوں مگر آپ تو خدا کے فضل سے اندھے نہیں۔ یہ جب ایسا نہیں کہ چُھپا رہ سکے یہی میدان یہی چوگان ہیں گو میرا امتحان لے لیا جائے ڈنلاپ صاحب نے اِن سے کچھ پڑھوایا دیکھا تو فرفر ٹے سے پڑھتے ہیں۔ ڈنلاپ صاحب متحیر ہوئے کہ کس طرح ایسی غلط رپورٹ کی گئی اور کہا کہ اچھا تم اپنی خدمت پر واپس جاؤ ہم نے تم کو بحال کر دیا منشی صاحب نے کہا کہ میں ایسی اندھیر نگری میں نوکری نہیں کر سکتا۔ اور اسی طیش میں بجنور چلے گئے اور وہیں خانہ نشین ہیں پنشن کے وہ مستحق تھے اگر چاہتے اور پیروی کرتے تو پنشن مل جاتی مگر وہ کچھ ایسے مستغنی المزاج اور طبیعت کے اکھڑ ہیں کہ آج تک الٹ کر خبر نہ لی ۱۲

فرمائیں لیکن مولانا جب ناگر کرنول کے صدر مقام محبوب نگر میں پہنچے تو ایک انگریزی ضلع کرنول وہاں سے قریب تھا بے اختیار
جی چاہا کہ وہاں کا طرز نظم دیکھیں چنانچہ مولانا تنہا وہاں تشریف لے گئے اور ایک ہفتہ قیام کر کے پلٹ آئے۔ اور پھر مولوی
سید احمد حسن صاحب اور منشی رفیع الدین صاحب کو ساتھ لے کر دورہ کرنا شروع کیا دورے میں مولانا کو یہ بھی حکم ملا تھا کہ کل
کچہریوں کے دفتر اور اضلاع کے محبس بھی دیکھیں۔ عہدہ داروں کے نام احکام جاری ہوئے تھے کہ مولانا کے سامنے
دقیق اور اہم مسائل تصفیہ طلب پیش کرو۔ پس اس اعتبار سے مولانا کا دورہ ایک عزت کے ساتھ تھا اور سب حکام ضلع از کہ تا
مہ مولانا کو اپنا افسر سمجھتے تھے +

مولانا کی فارسی رپورٹیں

مولانا جو کچھ دیکھتے فوراً اس کی اطلاع سرکار میں بھیجتے۔ خدا کی قدرت ان رپورٹوں
نے سر سالار جنگ کے دل پر بڑا عمدہ اثر کیا اور انھوں نے سمجھ لیا کہ مولانا بڑے کام کے آدمی ہیں۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں
"یہ صرف خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم و راہ ملک سے بے خبر زبان سے ناآشنا۔ دستور و رواج
سے ناواقف ہو آنے کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور
میں نے ساری عمر کبھی فارسی نہیں لکھی۔ مجھ کو تو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی
پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی بن پڑی کہ تمام حیدر آباد میں غل مچ گیا اور لوگ لوہا مان گئے +
اگر ہم کو بعض رپورٹیں دستیاب نہ ہوتیں تو ناظرین کو مولانا کی اعلیٰ درجے کی فارسی کی لیاقت کا کیونکر یقین دلا سکتے تھے
مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی مہربانی سے مولانا کے دورے کے زمانے کی چند رپورٹیں اور روبکار ہم نے حرفاً حرفاً پڑھے
ہیں ہمارے نزدیک اگر کل رپورٹیں اور روبکاریں مولوی بشیر الدین احمد صاحب چھپا کر کے چھپوا دیں تو ان سے بہتر انشا
کی کتاب نہیں ہو سکتی۔ آج کل ہندوستان میں جتنی فارسی انشائیں مروج ہیں سب کی سب مولانا کی ان رپورٹوں کے
سامنے ہیچ اور گرد ہیں جو فصاحت و بلاغت اور روانی اور آمد ان کی رپورٹوں اور روبکاروں میں ہے وہ ہماری اچھی سے
اچھی موجودہ انشاؤں میں نہیں ہے۔ مثلاً چند فقرے ملاحظہ ہوں +

فارسی رپورٹوں اور روبکاروں کے چند نمونے

(۱) "وہم تعلقہ داران کہ می کنند بطور سیاحت۔ روزنامچہ کہ می نویسند بطور حکایت۔ دستخطے
کہ می کنند ہم چو زلفِ محبوباں افتاں و خیزاں"
(۲) تعلقہ داران دور بدیری گویند مگر خوب می گویند"
(۳) "و نجا و بنا برایں صدر تعلقہ دار معتبر باین کم سواد یا منشیان بے استعداد مینشیند می کنند و بوجہ نالیاقتی شان تحریف و
تصحیف اصل تجویز میشود۔ آیندہ اگر ایں چنیں امری وقوع شود از سزا درگذر نخواہم کرد"
(۴) رکروہی[1] خراب کردی"
(۵) سالے برانبار پاؤ تنہا دستخط کردن و امید انتظام داشتن دماغ بیہودہ پختن است۔

[1] اس کو انگریزی میں ایجر کہتے ہیں یہ بے قاعدہ لکھی گئی تھی اور جا بجا خراب تھی۔ اس پر یہ پر لطف ریمارک کیا ۱۲ [2] ملک دکن میں رعایا کے پاس فضول غلہ
مال گزاری کی بہیاں رہتی ہیں اسے پاؤتی کہتے ہیں صدر تعلقہ داری کے زمانے میں جب وہ کثرت سے پیش ہوئیں تو یہ ریمارک کیا تھا ۱۲

(۶) "ناگفتہ کہ کارِ جمعبندی پاک وصاف نہ سازند رفتن نہ قرینِ مصلحت است"

(۷) "خاصیت ماکیاں دارد خود نمی خورد و بچگانِ خود را می خوراند"

اب ہم ذیل میں دو چار مکمل روبکاریں درج کرتے ہیں۔ یہ وہی روبکاریں ہیں کہ جن کو سر سالار جنگ مرحوم بقول مرحوم "شہبازہ" حیدرآباد دکن میں جہاں فارسی دفتر تھا جناب مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریرات کا وہ زور شور رہا کہ ان کے روزنامچے اور روبکار۔ اور کیفیتیں اور رپورٹیں اور فیصلے اور تجویزیں مجامع میں اس طرح پڑھی جاتی تھیں جیسے مشاعروں میں غزل۔ سارے دکن میں ایک نواب سر سالار جنگ مرحوم خود مردمی مجسم اور مردم شناس تھے اُن کا یہ حال تھا کہ جناب مولوی مہدی علی صاحب کے نام جو خطوط جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب کے جاتے بالالتزام اُن کو بار بار مزے لے کر پڑھتے اور حسنِ تحریر کی داد دیتے۔

غرض وہ رپورٹیں یہ ہیں—

(۱) دو روز در محبوب نگر تنقیح دفاتر مصروف بودم۔ انبارے دیدم پریشان تر از حواسِ دیوانگاں باستثنائے خزانہ کہ ہنوز بوجہ ضیقِ فرصت تنقیحِ آں باتمام نرسانیدہ ام۔ دفتر ہیچ علاقہ مرتب نیست اگر بر مجموع دفتر نظر کنند باز آ ئے دفتر کہ در کوچکترین اضلاعِ سرکارِ عظمت مدار ممالکِ مغربی و شمالی دیدہ ام جزوے بیش نیست با ایں ہمہ ابتری ہا بداں فراوانی کہ نگفتن نیاید ترتیب کاغذ کارے است بے مفاد۔ لاجرم کسے ایں زحمت بے منفعت نہ پسندد۔ در ہر محکمہ عملہ و کارکناں بقدرِ کفایت مامور اند فاما ہر کسے بیتی طبع دارد۔ ما مردماں در سرکارِ عظمت مدار ہمیں یک دو کس در پیشی دانستیم کہ باختلافِ القاب ایشاں را سررشتہ دار و منشی و مثل خواں گویند۔ لیکن دریں ممالک می بینم کہ چوں حاکمے بر کرسی اجلاس می فرماید اکثر عملہ گردِ او حلقہ کنند و مطابق تقسیم کہ فی مابین شاں معہود است نوبت بہ نوبت کاغذات پیش نمایند۔ چوں از تعددِ شاں پرسشے رفت چندیں نویس برشمرند کہ فالد جواب نویس ست و ولید احکام نویس و حامد صاف نویس و محمود رُوبکار نویس و فلانے تلنگی نویس و آں دیگر مرہٹی نویس وَ کُلُّهُمْ جَرًّا۔ ماحصل انتظام شاں ایں ست کہ اجلاس آباد و سررشتہ خراب و دفتر تباہ۔ غلطی نخستیں کہ ایں جا شیوعِ تمام دارد ایں است کہ کارکنان و کارفرمایان سررشتہ را از دفتر باز نشناسند۔ اہلکاران پیشی کاغذات را فرادی فرادی بر سرِ محافظِ دفتر می اندازند۔ بے خبر از ایں کہ آں بندِ کاغذ بر اسمہ مقدمہ است جداگانہ یا نہ۔ پس بیچارہ محافظِ دفتر دو گونہ مصیبت دارد۔ ترتیبِ مثل و نگہداشتِ آں۔ و چوں پیش از اختتامِ مقدمہ بیشتر حاجت مند بملاحظہ کاغذات متعلقہ جُل اوقات محافظ دفتراں مصروف ست دریہم رسانی ایں گونہ کاغذات برای حاکم مجوز تا ایں طریقہ مسلوک ست وضعِ دفتر چشم نباید داشت ابتری دفاتر ایں ضلع بداں پایہ کہ اگر بسبب از حالاتِ آں نگاشتہ آید بجائے خود دفترے باید۔ کارکنان محافظانِ دفتر کمتر کسے باشد کہ از مفہوم مثل و مقدمہ آگہی داشتہ باشد۔ کیف ما اتفق۔ کاغذ چند لغایت بے تمیزی با یک دگر دوختہ و آں را مثل نام نہادہ تعداد و قطعات نہ از فہرستِ مثل می تواں دریافت و نہ از فہرستِ دفتر۔ کاندریں صورت تمامی کاغذات نامعدود وہ غیر محفوظ اند۔ فہرست ہائے دفتر را اگر ناقص و ناتمام گویم من وجہ ستودہ باشم۔ ایں فہرست نہ خانہ دارد۔ نشانِ سلسلہ۔ عنوان مقدمہ۔ نام موضع و پرگنہ و تعلقہ۔ خلاصہ مضمون مقدمہ۔ تاریخ موصولہ۔ تاریخ حکم اخیر و مضمونِ حکم۔ تاریخ تعمیل حکم۔ تاریخ مرجوعہ محافظ خانہ تعداد و قطعات از ۱۲۸۸ تا

؎ عبدالغفار صاحب ایک دوم تعلقہ دار تھے انھوں نے رخصت مانگی تو ان کی درخواست پر یہ لکھا تھا ۱۲

؎ بمقابلہ ۲ ۱۲۵۵ اور اسی طرح اور ۱۲ ۱۲۵۹ کل ۱۲۶۰ جیسا اتفاق پیش آئے ۱۲ ۔

تا سالِ حال سوائے چار خانہ اولیں کہ دراں ہم خانہ دوم و چہارم را مکرر فہمیدہ اند باقی ہمہ را خالی گذاشتہ علاوہ بریں مثلہائے ایں
ضلع بوجہ اختلاط فارسی و مرہٹی و تلنگی کم تر یک رنگ باشند پس بیشتر مثل واحد را کاغذے چند در فارسی باشند و چندے دیگر
در زبانِ ملکی و تا وقتیکہ ہمگیں کاغذاتِ مختلف الالسنہ بقدرِ تعلق معاملہ یک جا نشوند تکمیلِ مثل صورت نہ بندد۔ لیکن ایں جا کاغذات
تلنگی و مرہٹی را از کاغذاتِ فارسی جدا داشتہ اند۔ و چوں جز طائفہ برہمناں کسے دیگرے آشنائے زبان ملکی کم تر باشد حالت
دفتر تلنگی و مرہٹی دیدنی و شنیدنی نیست۔ بعد از تنقیح دفتر مال متوجہ دفتر عدالت شدم کہ در مدح عہدہ داران ایں علاقہ مبالغہ
می کردند۔ ہمیں کہ فہرست را برکشادم بورطۂ حیرت در افتادم۔ کہ بارِ خدایا کسانے کہ عقلِ شاں از فہمِ عنوانِ فہرستے قاصرست
بدادِ خلق چہ رسند و از ہمیں است کہ بجرمِ ڈاکہ زنی حکمِ حبس دو ماہ دادہ اند۔ و بسرقۂ قبضۂ شمشیرے کہ ببارق بر ور و پیکان راہزن
کردہ بود سالے کامل بند فرمودہ و از مرہتِ سیفِ مسروق متعرض نشدہ۔ مصیبت زدۂ از گرسنگی جاں بلب رسیدہ خوشۂ
چند از کشت جرأت بُرد و بید خوشۂ چند بوئے[2] چند پیش نمودہ باشند کہ بپاداشِ آں جرم و را شش ماہ و فی بعض الصور یک
سال مقید داشتند و ندیدند کہ چہ ہیچ خسارت عائد حال سرکار شدہ۔ الحمد للہ کہ من بندہ حاکم مرافعہ ہستم مرا از کاغذے باید
گفت یکے از صدہا ایں کہ در تمامی فہرست در خانۂ خلاصۂ مضمونِ مقدمہ نوشتہ اند مثل فوجداری فلاں مدعی فلاں مدعا علیہ
گویا نزدِ ایں مردم خلاصۂ جملہ مقدماتِ فوجداری واحد باشد و بس۔ برائے درستی دفاتر مال آں می اندیشم کہ در اولِ کار ہر
محافظ دفتر را دو کس از عملہ معمول مددگاری دہند و تا اختتام ترتیب دفتر ایشاں را از کارہائے دیگر معاف دارند۔ ہر سر
دفترے را کہ مراد از آں حاکم و افسر بلاواسطہ باشد چوں تعلقہ دار و تحصیلدار وغیرہما تاکید بلیغ می باید فرمود کہ سر رشتہ را از
دفتر جدا انگارند جدا دارند و تقسیم کار درمیان عمال بوجہے نمایند کہ زائد از دو سہ کس درستی نمانند بل اگر شخصے واحد باہر السنہ مروجہ باشد
و نظر بر کار مرجوع کار پیشی را سر انجام میتواں داد۔ بداں یک کس قناعت ورزند۔ بکارکنانِ دیگر مددے از مدات کار خاص کردہ
فہرستِ عمال پیشی و اہلمدانِ محکمہ بصراحتِ کارہا کہ ہر واحد اختصاص یافتہ بصدر ارسال دارند۔ ہر اہلمدے فہرست مقدمات
آں مد خاص حسبِ ذیل ترتیب دادہ باشد۔ آغاز و دورانِ مقدمہ تا تکمیل۔ نشانِ سلسلہ وار۔ نام مدعی۔ نام مدعا علیہ۔ خلاصۂ
مقدمہ۔ قسمِ مقدمہ۔ تاریخ دائر شدنِ مقدمہ۔ تاریخ اختتام مقدمہ۔ خلاصۂ حکمِ اخیر۔ تعدادِ قطعات۔ تاریخ ادخال مثل بمحافظ
خانہ۔ رسید محافظ دفتر۔ اہل کار پیشی جملہ کاغذات را بعد تحریر حکم و ثبت شدنِ دستخط حاکم درمیانِ اہلمداں تقسیم نمایند و
ایشاں ہمیں کہ کاغذِ جدیدے کہ بامقدماتِ متدائرۂ سابق تعلق نداشتہ باشد آں را بنائے مقدمہ جداگانہ قرار دادہ شقِ خانۂ اولین
فہرست یک جائے پُر کردہ و فہرستِ مثل با کاغذ مذکور منسلک نمودہ آں را در طبقۂ جداگانہ گزارند۔ و اگر کاغذے یابند کہ بامقدمۂ
متدائرہ تعلق دارد آں را با دیگر کاغذاتِ مقدمہ منسلک داشتہ در فہرستِ مثل داخل سازند و بس۔ و ہمیں عمل کردہ باشند
تا آں مقدمہ من کل الوجوہ انفصال یابد آں وقت باقی خانہ ہائے فہرست یک جائی پُر کردہ اندرون ہفتہ یا در صورت دورہ
اندرونِ دو ہفتہ مثل را با خبر رسید حوالۂ محافظ دفتر سازند۔ الغرض ترتیب مثل و نگہداشت آں تا انفصال بذمۂ اہلمد است
و محافظ دفتر را دراں مداخلے نے۔ لیکن ہر گاہ کہ مثل بعد اختتام بدستِ محافظ دفتر می رسد باید کہ بمقابلہ فہرست منسلکہ مثل شمار

[1] جوار ۱۲ [2] بوتی بمعنے دانگ۔ سعدی فرماتے ہیں۔ دست دراز از پئے یک حبہ سیم ٭ بہ کہ ببرند بدانگے و نیم ۱۲

از کاغذات برگیرد و بر فروگذاشت دستخط وغیرہ نظر کنند اگر نقصے یابند مثل را با اہلمد واپس دہد کہ بعد رفع نقص بیارد ورنہ داخل فہرست
یک جا ساختہ خود نماید۔ مقدمات کہ فی الحال دائر باشند جملہ کاغذات این چنین مقدمات باہلمد سپردہ شوند۔ تعلقداران
وصدر تعلقداران ہنگام دورہ ببینند کہ دفتر بدرستی داشتہ اند یا نہ۔ وچوں بر غلطی وقوف یابند باصلاح بردارند کہ مردمان
این جا از کوچۂ انتظام نابلد۔ لیکن تاہم تربیت پذیر ہستند۔ الزام خرابی دفتر نہ تنہا برگردن محافظان دفتر ست بل خود
تعلقداران وصدر تعلقداران ہم خود را بری الذمہ نتوانند کرد۔ پریشانی دفتر گواہ است کہ گاہے فی زمان من الازمنہ کسے
بر سر این مظلوم خموش نرسیدہ واگر رسیدہ بداد او نرسیدہ۔ ہر آں قدر کہ گفتہ شد بشرط نگرانی سر دست برائے ترتیب دفتر
کافی خواہد بود بل مناسب می نماید کہ دستور العمل محافظ خانہ ہا و سررشتہ ہا منضبط شدہ اجرا یابد۔ روبکار بحیثیت اطلاع
سرکار عالی وبامید صدور احکام مناسب بخدمت معتمد صاحب جناب مدار المہام دام دولتہ ترسیل یابد ۞

(۳) مولانا نے جب ناگر کرنول کے دفتر انعام کا معاینہ فرمایا تو اُس کے متعلق جو کیفیت لکھی تھی وہ یہ ہے۔

دیروز کہ از کرنول[1] واپس آمدہ بناگر کرنول[2] رسیدم بتنقیح دفتر انعام پرداختم۔ کارے ست بے سروپا مشحون از
غلطیہائے فراواں وگوناگوں۔ ہماں کہ از تحقیق انعامات سخن سر کنند ہمیں ہر کو دن نیا در خواہد کرد بایں کہ برائے اجرائے این
چنیں کار بنیادے باید و آں نیست۔ نہ فہرست ہر گونہ جاگیر وانعام ومقطع وسیر سے یومیہ وغیرہ کہ از پٹواریاں گرفتہ باشند کہ بے
این چنیں فہرست در راہ تحقیق گامے فراتر نتواں نہاد۔ از ابتری دفتر انعام این ضلع ناگر کرنول چہ گویم کہ خود فہرست مذکور کہ دفتر
انعام را بجائے بسم اللہ است ندارد۔ از بے ترتیبی کاغذات روزنامچہ ورسیدہا وغیرہ بجز وتشم کہ جز انضباط کار منفعتے ندارد
کاغذات کہ کالبد این دفتر بمنزلہ اعضاء رئیسہ باشند سہ تا فہرست ہستند و بس۔ فہرست مرجوعہ۔ فہرست منفصلہ ونقول
تختہ ہائے منفصلہ چوں بایں سہ رجوع آوردم بے مبالغہ می توانم گفت کہ حرفے ورقمے صحیح نیست۔ فہرست ہا نہ بمقابلہ یک دگر
منطبق اند نہ فی نفسہا درست ومکمل۔ جا بجا سلسلۂ ایشان منقطع نشان ہا است کہ مکرر یا متروک واقع شدہ۔ نقول تختہ ہا از اصل خود
مختلف وبسیار مختلف۔ بر بسیارے از تختہ ہا ثبت ست کہ تختۂ دیگر متعلق انعام فلاں کس برائے این تختہ فرستادہ شد لیکن
آن تختۂ دیگر پیدا نیست وباوجودیکہ این تختہ را ہم داخل فہرست منفصلہ کردہ اند لیکن نشان نتوانستند داد کہ بہ ثبت کدامی
نشان فرستادہ اند۔ درین کہ اندکے از آں بیان کردم اندازہ از کار برگرفتن محال ست کہ چہ قدر بودہ است وچہ قدر باقی ست چار کس
درین دفتر مامور اند وکار کہ ہست سہل وسلیس ست لیکن کس پروائے آں ندارد کہ ساعتے چند مصروف بکار باشد۔ ستوہ
آمدہ ام ازیں تنقیح کہ خون جگر خوردن ست۔ و ونادان خشم در کف افسوس فرو بردن۔ سرزنش وملامت نہ تازیانۂ غفلت این
مردمان ست۔ کہ چوں از پیش من بیروں روند بر روئے یک دگر خندند۔ وتنقیح را بہ تمسخر افسانہ سازند۔ بیقین می دانم کہ تنقیح
بارہا دیدہ اند شوخ چشمی وبے آزرمی پیشہ گرفتہ۔ پس مناسب می دانم کہ بر تمام عملۂ این دفتر کہ ابتری آں ممکن الاصلاح نیست
یک ماہانہ تنخواہ جرمانہ نمایند تا دیگراں عبرت پذیرند۔ وایناں ہم آیندہ خبرے از کارہائے منصبی گیرند۔ تا دیروز درستی

[1] مدراس پریسیڈنسی کا ایک ضلع ہے جو ساحل دریائے تنگ بھدرا پر واقع ہے ۱۲
[2] ممالک محروسہ سرکار عالی نظام کے ایک ضلع کا نام ہے جو اب ضلع محبوب نگر کے نام سے موسوم ہے ۱۳۱۵ھ کا ذکر کر رہے ہیں ۱۲

این دفتر اندیشہ می کردم لیکن چوں بسیارے از مثل ہا بدفتر مہتمم دریافت انعامات بانشان ہائے غلط روان کردند فسادے کہ ہست واصلاح پذیر نیست۔ لیکن باید کہ اکنوں از پٹواریاں فہرست ہر گونہ انعامات گرفتہ بازاز کاغذات جمع بندی فراہم آوردہ کتابے ترتیب دہند وآں را فہرست انعامات تحقیق طلب نام نہند۔ وہم مقدمات مرجوعہ را در فہرستے جدید بہ نمونہ کہ ہست بحروف خانہ دار برقم سالانہ داخل نمودہ سلسلۂ نمبرہائے مرجوعہ منفصلہ وتاریخ در فہرست تحقیق طلب کردہ باشند۔ چوں برائے تنبیہ تحکمہ سزائے جرمانہ کہ تجویز کردہ ام منظور فرمایند۔ عہدہ داران بالادست راہم کہ این گونہ تباہی کار پیش نظر شاں می رود وگاہے متصدی انتظام نشدہ اند لطرز سے کہ مناسب حال شاں باشد برین باید داشت کہ وقتاً فوقتاً از تباہی بدفتر خبر سے گرفتہ باشند۔"

(۱۳) ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

"ہر چند گزرم بہ بیابانے کہ مسکن قوم چھچھواڑہ[1] می باشد اتفاق نیفتاد وبوجہ اشتغال بہ امور دیگر امید نیست کہ در سلسلۂ این سفر کہ از نا مساعدت موسم عن قریب انقطاع پذیر است باین قوم باوجہ گذرین ملاقی شوم۔ فاما در ضمن تحقیقات عامہ از حالات وحکایات این قوم بکمال علوق مستفسر بودہ ام آں چناں بدریافت رسید کہ قریب ہزار تن ازین مرداں دربیابان گودل واَمرآباد بودوباش ورزند وہموارہ از جائے بجائے نقل مکان می کنند ودر حوالی مساکن چندے روزہ جرث ودیگر اجناس بالخصوص سیم ہم بے منت آلات کشاورزی می کارند حالت قوت شاں از پیداوار خودرویۂ بیابان ہست۔ چھچھو گڈھ کہ زیرزمین نشوونما یابد۔ وگلِ مہوہ وخاکستر پوست درخت تمر ہندی وثمر تمر ہندی واقسام شالی خودرو یہ وتیند ویعنی ثمر درخت آبنوس وسیتا پھل[2] وچرونجی وگل وبار درخت بھلاواں فیض روزی رسانِ عالم بداں عموم ست کہ این آدم صورتان وحوش سیرت راہم معطل نگذاشتہ وآب ورزق شاں بر شہد وشکار گماشتہ۔ ای خوشا چھچھوڑاں کہ بشہد شیرین کام وبشکار لذت چشیں سید الطعام می باشند نامرداں کلاہ باعن جاہ خو کردہ بند تمدن ہستیم پنداریم کہ چھچھوڑاں بہ بدحالی می زیند واین پندار بداں ماند کہ طیور ہوا بر ماہیانِ بحر رحمت آرند۔ لیکن نظر بر حقیقۃ الحال معاملہ منعکس ست۔ چھچھوڑاں راشنیدہ ام کہ بمقابلۂ مامرداں توانا تر باشند۔ وپرتر زیند۔ بچگاں بسیار پیدا آرند۔ بیش برین نیست کہ مہتمم جمعیت کوتوالی ضلع ناگر کرنول راخیالے درسر گرفتہ وپئے آں کہ پئے تحقیق حال برود باطلاع سبقت نمودہ۔ واز ذرائع آگہی خویش ہیچ خبر نمی دہد کہ این افسانۂ مصیبت درگوشِ او کہ فرو خواند وچوں از مرگ بے کسی چند ہا بندگانِ خدا شنید خود بر سرِ چنین کس رسید وچہ کرد وچہ دہد۔ من بندہ از کسانے کہ با چھچھوڑاں مزید آگہی ورزید بتحقیق دریافتہ ام کہ این مرداں بحالِ خود خوش می گزارند۔ چھچھو گڈھ نہ چنینے ست کہ برابر وباراں انحصارے داشتہ باشد بل این چیز در زیر تالاب ہا پیدا آید دسالہا بیاوری رطوبت ارضی بالد وافزاید وانبار ہا ازین قسم در تہ زمین مدفون است وکس جز چھچھوڑاں برین گنجینۂ قدرت راہ نیابد۔ ودیگر پیداوار صحرائی کہ غنایان متصرف شاں باشد خود محرز ومحفوظ نیست۔ ونہ کسے مانع ومعترض حال چھچھوڑاں می باشد۔ معہذا ودے چند از درختانِ تمر ہندی بیچہ شمارست کہ متکفل رزق چندیں بودہ باشند۔"

(۱۴) روبکار جہت اطلاع جناب مدار المہام سرکار عالی بخدمت معتمد صاحب علاقہ مالگزاری شرف تبلیغ یابد۔"

---

[1] ایک خانہ بدوش اور صحرائی قوم کا نام ہے ۱۲ [a] گودل اور امرآباد شاید دو پرگنے ہیں۔ ان کے چاروں طرف دو ٹرے بڑے جنگل ہیں ۱۲

[2] آلو یا شکر قند یا زمین قند کے قسم کی چیز ہوتی ہے ۱۲ [b] شریفہ ۱۲ [c] گوشت ۱۲

صباح فردا بعزم تلنگنڈہ ضلع ناگر کرنول راخیر باد گویم حسرتے کہ باخود می برم این کہ ناسورہا دیدم و مرہمی نتوانستم نہاد۔ عقدہاے معضلہ[1] یافتم نیارستم کشاد۔ اصلاحِ مفاسدنہ کارِ روزہا و ماہ ہاست۔ سالہا باید کہ مالکان حل و عقد امور جُل[2] ہمت بریگان یگان علاقہ و صیغہ محصور و مقصور دارند تا کیفیت انتظام ہویدا آید۔ خدمتے کہ برمن بندہ دریں دورہ مسلّم ست بداں ماند کہ طبیبے تشخیص امراض فرماید و بیماراں را بعلل و امراض شان مطلع نماید و پندارد کہ شرائط طبابت بجامی آرد۔ او بزعم خود دل شاد لیکن مریضان بیچارہ بر آئین سابق در فغان و فریاد۔ دو ہفتہ در سرکھوڑہ[3] قیام ورزیدہ خونِ جگر خوردہ ام۔ و اگرچہ در عہدہ داران ضلع و قسمت منسلک نیستم فامّا از طولِ قیام بآں پٹی تعلقے خاص بہم رسانیدہ۔ باران رحمتِ الٰہی باریدن گرفت و زمانِ کشت و کار برسر رسید۔ لیکن ہنوز از انتظامے کہ اندیشیدم خبرے و اثرے پیدا نیست۔ لاجرم کاشتکاران پٹی در انتظار منظوری و نامنظوری انتظام متحیر و معطل نشستہ التماس آں کہ ہراں چہ دریں خصوص کردنی و فرمودنی ست بلا تضیع وقت برروئے کار آوردہ شود مبادا کہ وقت از دست رود و حسرتے باقی ماند“۔

(۵) یا مثلاً ۱۳ جمادی الثانیہ ۱۲۹۵ھ کو ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

آئین اسکیل[4] و آبپاٹی بافضیحت پاکہ دارد داغے است زشت کہ بر ناصیۂ انتظام مالگزاری این ممالک جا کردہ۔ چوں کمی و بیشی اسکیل و آبپاٹی وابستہ وصول مال گزاری می باشد در ضبط اوطان[5] زمین و عطاے اسکیل نقد بجاے آں امداد و اعانت پٹیلان و پٹواریان و دیگر وطن داران در جمع و جبابت[6] خراج امید کردہ باشند۔ لیکن تجربۂ چندیں سال گزشتہ گواہ است کہ نتیجہ نہ بر وفق آرزو و حسب دلخواہ است۔ البتہ در وطن زمین و ایصال مبلغ معلوم از خزانہ عامرہ سرکار تفاوت نسبۂ تا نقد و تفرقہ رنج تاراحت می باشد۔ لیکن ایں نسبت کہ گفتہ شد از مقولۂ اضافت است زمین کہ سالے دوبار بار آرد و رزق رساند بہتر از نقدے کہ سالہا در انتظار رنشاند۔ عاملانے کہ با وجود اختیار کامل و اقتدار مطلق بے باکانہ دستِ خیانت براموال مخزونہ سرکار دراز دارند عقل باور نکند کہ زر نقدے در دست آرند و بحق داران سپارند۔ نہ اظہار تہمت و نہ مبالغہ کہ از زرہائے مرمت و اسکیل و آبپاٹی سہ ربع وقف تاراج است و ربع باقی در یوزہ محتاج۔ ظاہر است کہ انسداد ایں چنیں خیانت عام ممکن نباشد۔ مگر آنکہ عہدہ داران موتمن[7] سالے چند متواتر در روے خود تقسیم فرمودہ باشند تا پابندگاں عادت گیرند۔ و رسانندگاں عبرت پذیرند و رسم بدنہیب[8] و غارت از میاں خیزد۔ لیکن کرا دماغ آن کہ زحمت بر خود گوارا کند لاجرم تقسیم اسکیل و آبپاٹی را قاطبۃً مسدود کردنا و جائے کہ مسدود نکردند درپے آں ہیاشند کہ مسدود کنند۔ تدبیرے کہ ایں تعلقہ داران غیور و نام جو اختیار کردہ اند یادمی دہد ازاں کہ در ممالک سرکار عظمت مدار حاکم ضلعے بود و سفید و سادہ لوح و در حدِ علاقۂ او ہر سال میلۂ عظیمے فراہم آمدے و خرید و فروخت ہر گونہ مال و متاع رار وز بازار بودے۔ وزداں

[4] اسکیل انگریزی لفظ ہے بمعنی پیمانہ۔ سرکار نظام کے دیہات میں زرمال گزاری کے وصول کے لیے ایک عہدہ دار رہتا ہے جسے پٹیل کہتے ہیں اور ان لوگوں کے حقوق وطن وارانہ اور متوارث ہوتے ہیں پٹیل کے علاوہ پٹواری حساب کتاب لکھنے کے واسطے رہتا ہے۔ دونوں وصول مال گزاری کے مشترکا ذمہ دار ہیں اس کے علاوہ پولیس پٹیل بھی رہتا ہے جو گاؤں کے حفظ امن کا نگراں رہتا ہے ان لوگوں کو بطور معاش وصول زرمال گزاری پر فیصدی دس روپیہ[*] ملتا ہے اسی معاش کا نام اسکیل ہے کیونکہ اس کی قرار داد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ۱۲ [5] آبپاٹی پٹی بمعنی ٹکس۔ آبپاٹی اُس ٹکس کو کہتے ہیں کہ جو زرمال گزاری پر فی روپیہ آدھ آنے کے حساب سے رعایا سے وصول کی جاتی ہے یہ حق پٹواری اور پٹیل کا ہوتا ہے ۱۲ [6] جبابت جمع کردن ۱۲ [8] اظہار بمعنی تعریف ۱۲ [7] موتمن بمعنی امین ۱۲ [8] لوٹ مار ۱۲

[1] عقدہاے معضلہ یعنی گرہوں کو کہتے ہیں ۱۲ [3] ایک مقام کا نام ہے ۱۲ [2] چیدہ و خطیر ۱۲

وحرامیاں بر ضعف رائے حاکم بے پروا قوی دل شدند و دست تاراج کشادند تا آنکہ حکایت ہا بہ بلاد و امصار بردند و افسانہا
بہ کاغذ اخبار۔ چوں ایں خبر بحاکم سمبک[1] سر رسید اشتہار درداد کہ آنانکہ قصد میلہ دارند از نقد و جنس جز ناگزیر نیارند کہ حفظ صیانت
را بہتر ازیں تدبیرے نیست۔ الغرض اسکیل و آبیاپٹی رسمے است کہ بابندگاں سالہا بامید وصولش چشم سفید کنند و چوں
بعد انتظار بسیار صلائے تقسیم بگوش خورند بنامے ازاں قناعت کنند۔ پس ایں گونہ رقم را کہ وعدۂ ابلہ فریب بیش نیست نقد نام
نہادن ازاں قبیل ست کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ مایوس از وصول اسکیل پٹیلاں و پٹواریان زمین ہا کاشت کنند و
دائما بقدر اسکیل باقی دارند و تحصیلداراں باطمینانِ آں کہ آخر کار رقم اسکیل جمع و خرچ کردنی ست بر تحصیل ایں گونہ باقیات
متوجہ نشوند۔ و بسیارے از پٹیلاں و پٹواریاں بحیلۂ آں کہ سرکار اسکیل شاں دیر دہد ہر کاشتکاراں علی قدر استطاعتہم تفریق
نمودن اسکیل خود بل فی بعض الاحیان اضعاف آن وصول کنند و وانمایند کہ بوام خواستہ اند۔ بالجملہ چوں بغور کار رسند
آئینِ اسکیل و آبیاپٹی عمل کاغذے بیش نیست و ہر گاہ مستلزم انواع مفاسد می باشد اصلاح فوری از واجبات "

(۶) یا مثلاً جب مولانا صدر تعلقہ دار سمت شمال تھے اس وقت ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

مستعجل بودم بروانگی اندور مگر مخاصمت دوم تعلقہ دار با تحصیلداران سیدک[2] و ٹیکمال[3] نگزاشت کہ شتاب روم۔ دوم تعلقہ دار
با مزاجے دارند ہر کہ درآمیخت و درآویخت شش ہفت کس از تحصیلداراں می توانم شمرد کہ از دست ایشاں بودہ اند شاکی و گلہ مند
کم اختلاطی شیوہ ایست محمود و لیکن نہ ایں قدر کہ پنج سال کامل شخصے حاکم بقعہ باشد و ہیچ کس را از اعالی و ادانی باو رسائی نہ
بلکہ ہر آں کہ بزرگوار تر در نظرِ دوم تعلقہ دار خوار تر۔ مثلاً مشائخ صاحب ٹیکمال۔ نگویم کہ با ایں گروہ چارو ناچار ارادت باید داشت
لیکن سوءِ ظنہ چوں بہ تعصب منجر شد ہر آئینہ حاکم را از جادۂ نصفت[4] بلغزاند۔ چنانچہ در معاملہ مقدمہ نظم و نسق مشائخ صاحب
از دوم تعلقہ دار لغزشہا مشاہدہ شد۔ مدت ہا برحالِ دوم تعلقہ دار تأمل می کردم۔ آخر چوں در خوردم پے بہ اصل مطلب
بردم کہ بجو غلط واقع شدہ اند بہ رنجہ افراط خدمت عالیہ را دوں مرتبت خود می دانند۔ و می گویند کہ تن بقبول ایں خدمت محقر
در ندادم مگر بہ دو شرطے قیام میدک کہ نزدیک است از بلدہ۔ دوم وعدہ ترقی عاجل۔ بجوش آرزوئے ترقی آنچہ یاد می کنند
پاسِ ایں خیال روز افزوں بہ منتہائے غایت رسیدہ۔ خلق خدا مبتلائے آفتِ خشک سالی بود دوم تعلقہ دار صاحب تر و
خشک را مساوی شمردہ رتق[5] و فتق صفاتی را ذاتی می انگارند۔ چوں چشم الصاف پوشند پروائے رفاہِ مردم ندارند۔ چوں
جریب زمین مزروعہ گزشتہ ممنوع برعکس قاعدہ کردند۔ ہمچو معذب ناگہانی بر مہروی نازل شدند بہ الزام ادعاے مصادرہ
نمودند ایں گونہ خود یافتند۔ لاجرم برائے استرضائے حاکم تکثیر جماعت ہمدرداں اضافہ را مضاعف داشتند و جرمانہ ہائے
نامنصفانہ و بے جا۔ در تعلقات بہ مقدارے رسید معتدبہ۔ بہ تمسک ہمیں کار گزاری درخواست ترقی رکفیل حصول خدمت
بیان مجرد۔ ہیچ یک شایستہ اعتبار و اعتماد نیست۔ تکملہ از کربت[6] راہ غربت گرفت و تنازعہ بہ چار سوئے جہاں فاش و پیشکار
و محافظ بہ چار سوئے تعلقہ دویدند۔ اہل دیہ مستطیع و ذی حرمت منصدعہ محتاج بیان نیست تکملہ بر ہم زن عافیتِ خلائق

---

(۱) ضلع کا نام ہے وسط ہند میں اسی نام کی ریاست ہونے سے اس کا نام اب نظام آباد ہو گیا ۱۲ (۲، ۳) ضلع میدک کی دو تحصیلوں کے نام ہیں ۱۲
(۴) عدل و انصاف ۱۲ (۵) بستن و کشادن ۱۲ (۶) اندوہ و غم ۱۲

وعجب تر آنکہ قطع و برید کاغذ بے اطلاع و اجازت این فعل رسنہ است۔ بہ جال[1] اگرچہ تحصیلدار میدک و ٹیکمال مستظہر نمی بودند خدا نیکو کردہ اند کہ دوم تعلقہ دار جہا می کردند تحصیل دار ٹیکمال ایں سال نجات یافت کہ تعلق او بہ اختتام جمع بندی بود منقطع شد مگر وائے بہ بدبختی تحصیلدار میدک کہ تعلقہ او تابع دوم تعلقہ دار است ہیچ پہلو از تخشیع و تذلیل و تفضیح و تکلیف نیست کہ با او عمل نیامدہ باشد۔ اگرچہ کارروائی دوم تعلقہ دار مطوّل و مدلّل کہ فرد منسلک بر صراحت آں مشتمل ست برائے معطلی شاں بر من متقاضی می شد۔ مگر بہ نظر اتمام حجت بر تنبیہ قناعت کردم اگر باز آیند بہتر ورنہ خوسے بدسر انجام بدید"

رپورٹوں اور روبکاروں کا نتیجہ اور سرسالار جنگ کی رائے

غرض ان روبکاروں میں علاوہ شستگی و روانی و عبارت آرائی کے یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ جس صیغے کو مولانا ملاحظہ فرماتے تھے اُس کے جزو کل پر نگاہ تنقید پڑتی تھی۔ آخر کار اس دورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رپورٹ میں مولانا نے نہایت صاف صاف الفاظ میں لکھا کہ اس ملک کی حالت بندوبست کے لائق نہیں۔ اول تو تلنگانہ ویرانہ بہت ہے۔ لاکھوں بیگہ بنجر پڑا ہے۔ آدمی نہیں کہ اُس کو جوتے۔ علاوہ اس کے بندوبست کے لیئے وقت اور روپیہ بہت درکار ہے۔ ایک ضلع کے لیئے سات برس کم سے کم چاہیئیں اور اسی طرح کم سے کم پندرہ لاکھ روپیہ اور سرکار نظام میں اتنا سکت نہیں کہ اتنے بڑے مصارف کی متحمل ہوسکے پس میرے نزدیک سرسری بندوبست و نظری و رواروی پیمایش کر کے کاشتکاروں کے ساتھ دہ سالہ قول کر دیا جائے

مولانا کی یہ رائے سرسالار جنگ مرحوم کے دل میں کھب گئی تھی اور زیادہ اثر کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ناظم بندوبست ہو کر مولانا نے ایسی رائے ظاہر فرمائی کہ جو بظاہر اُن کے مطلب کے خلاف تھی۔ خلاصہ یہ کہ مولانا ابھی نلگنڈہ ہی میں تھے کہ دفعۃً یہ حکم صادر ہوا کہ "تنہا ایک دن کی ڈاک بٹھا کر چلے آؤ۔ سرکار کو تم سے کچھ کہنا ہے" مولانا یہ حکم پاتے ہی گھبرا گئے اور دل میں کہا کہ "الٰہی یہ کیا ماجرا ہے" نلگنڈہ سے حیدرآباد تک خدا معلوم کیا کیا خیالات مولانا کو پریشان کرتے رہے کبھی مرہٹی گھس گھس کے نقشے دل پر جمتے تھے کبھی ہندوستانی ریاستوں کی بے قاعدگی پریشان کرتی تھی۔ مگر باوجود ان تشویشوں کے مولانا کا دل اُس معاہدے سے مضبوط تھا جو مابین سرکار نظام اور ہمارے مولانا کے ہوا تھا اور وہ یہ تھا کہ سرکار نظام مولانا کو برطرف نہیں کر سکتی۔ بندوبست ہو یا نہ ہو تنخواہ ملا کرے گی"

مولانا کی رائے سے نواب محسن الملک کو اختلاف تھا

مولانا نے نیک نیتی سے جو کچھ رائے بندوبست کے متعلق ظاہر کی تھی اُس سے نواب سرسالار جنگ مرحوم کو تو کلی اتفاق تھا۔ لیکن نواب محسن الملک مرحوم کو مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ نواب محسن الملک چاہتے تھے کہ بندوبست ہو اور یہ کام مولانا کے سپرد رہے۔ مگر ہمارے مولانا ایسی غلط رائے کیوں دینے لگے تھے جس سے سرکار نظام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اس کے سوا غلط رائے کا دینا داخل بددیانتی بھی تھا۔ تاہم ہندوستانی ریاست ہونے کی وجہ سے مولانا قطعی طور پر مطمئن بھی نہ تھے۔ مولانا نے عہدہ داران اضلاع کی بے ضابطگیاں اور چوریاں بہت پکڑی تھیں اور نواب سرسالار جنگ کو صاف لکھ دیا تھا کہ لوگوں نے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے۔ مفصلات میں سخت خرابی ہے۔ الغرض مولانا

[1] جال بمعنے دام ۱۲۔

دُور سے پرسے بکہ وتنہا حیدرآباد پہنچے نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو بلا کر فرمایا: "بندوبست کی نسبت آپ کی راے انتظام کے خلاف ہے اور میں آپ کی راے کے ساتھ متفق ہوں۔ پھر سوائے اس کے کہ آپ صدر تعلقہ داری کریں اور کوئی عہدہ آپ کے لائق نہیں۔"

مولٰنا نے عذر کیا کہ

"بندوبست ایک محدود اور منفرد کام ہے اور اُس کی نگرانی چنداں دشوار نہیں۔ لیکن صدر تعلقہ داری میں بڑی جواب دہی اور ذمہ داری ہے اگر میں اس کو اختیار کرلوں تو علاوہ محنت کے چار صدر مدار المہاموں کی ماتحتی ایک عذاب ہے۔ میں اس خدمت سے معاف رکھا جاؤں میں اُسی خدمت کو پسند کرتا ہوں جس کے لیئے بُلایا گیا ہوں"

لیکن نواب سر سالار جنگ بہادر نے بہت اصرار کیا اور خاص مہربانی سے دوسو کا اضافہ بھی منظور فرمایا اس پر بھی مولٰنا نے انکار کیا تو نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا۔

"بارہ سو سے زیادہ کا تو ہمارے ہاں دستور نہیں۔ اگر آپ کو زیادہ دوں تو سب تعلقہ دار فریاد کرنے لگیں گے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ میں آپ کی خاطر سے صدر مددگار یال ایک نیا عہدہ چار سو کا منظور کروں اور آپ اُس پر اپنے کسی عزیز کو نامزد کردیں۔"

جب یہاں تک نوبت پہنچی تو مولٰنا نے زیادہ اصرار کرنا سوء ادب سمجھ کر نواب سر سالار جنگ کا ارشاد قبول کرلیا مگر اس طرح پر کہ اُن کا اصل عہدہ نظامت بندوبست باقی رہے اور ناظم بندوبست و منصرم صدر تعلقہ دار لکھے جائیں۔ مولٰنا نے ناظم بندوبست اور منصرم صدر تعلقہ داری کی قید صرف اِس لیئے لگائی تھی کہ ناظم بندوبست کا بھتہ دوسو چالیس ملے گا اور بارہ سو تنخواہ کے۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب سے رخصت ہو کر مولٰنا پٹن چرو میں[1] ناظم بندوبست یعنی سٹلمنٹ کمشنر اور منصرم تعلقہ دار (یعنی قائم مقام کمشنر قسمت) بن کر تشریف لے گئے۔

حیدرآباد دکن میں تصنیف و تالیف

کثرت کار کی وجہ سے مولٰنا کو اگرچہ وہاں تصنیف و تالیف کا وقت نہیں ملا اور بقول مولٰنا کے وہاں اگر تصنیف و تالیف کا خیال کرتا تو کورنمکی کا مجرم ہوتا۔ تاہم مولٰنا کو تصنیف کا کچھ کام مل ہی گیا۔ غالباً گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اشارہ ہوا تھا کہ آپ اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک بہادر کو اختیارات دینے کا وقت قریب آگیا ہے اُن کو امورِ انتظام ریاست سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ اساتذہ کا اسٹاف تو بہت تھا مگر اُن میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو انتظامات سے واقف ہوتا۔ اِس لیئے کلارک صاحب نے ہمارے مولٰنا کو ٹیچنگ اسٹاف میں لینا چاہا۔ کلارک صاحب کی یہ بات تو ہمیں

[1] یہ بھی بالکل حسنِ اتفاق ہے جب سرکار عالی نظام کے یہاں مولٰنا صدر تعلقہ دار یعنی کمشنر ہوئے تو سمت شمالی کے ہوئے جس کا مستقر پٹن چرو ہے۔ اور یہ وہی مقام ہے جہاں کچھ عرصے پیشتر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور صدر تعلقہ دار رہ چکے تھے۔ اِس طرح شاگرد رشید نے اُستاد کی پوری تقلید کی ڈپٹی کلکٹر بھی ہوئے اور صدر تعلقہ دار بھی۔ ایسا حسن اتفاق بھی کم ہوا ہوگا یہی وجہ ہے کہ مولٰنا نے اپنے زمانِ قیامِ دکن میں خاں صاحب کے صاحبزادے مولوی عبد الملک خاں صاحب اور اُن کے داماد مولوی امیر محمد خاں صاحب کے ساتھ بہت سلوک کیا۔ اور دونوں صاحب (بقیہ آیندہ)

سے نے پیش رفت نہ ہونے دی مگر مولٰنا سے فرمایش کی کہ انتظامات کے متعلق کچھ رسالے لکھ دیجئے آخر مولٰنا نے سر سالار جنگ مرحوم کے ارشاد پر گیارہ رسالے لکھے۔ رسالوں کی تصنیف میں اتنا خیال کر لیا گیا تھا کہ زبان شستہ اور صاف ہو بیان میں شگفتگی ہو۔

اعلیٰحضرت کے لیئے سات رسالے تصنیف کرنا

اسی بنا پر مولٰنا نے سات رسالے لکھے۔ مثلاً مال گزاری۔ عدالت۔ تعلیمات۔ پولیس وغیرہ یہ سب رسالے سُنا ہے کہ حضور کو سبقاً سبقاً پڑھائے گئے۔ حضور کو پڑھانے سے قبل یہ رسالے انگریزی میں ترجمہ ہو کر ریزیڈنٹ کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ ریزیڈنٹ نے ان رسالوں کو پسند کیا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب سر سالار جنگ بہادر مصروف تھے اور آنریبل مسٹر محمود مرحوم اور چند دیگر اکابر ریاست اور بھی شریک تھے کہ مولٰنا کا ایک رسالہ پہنچا۔ نواب سر سالار جنگ بہادر سے صبر نہ ہو سکا اور کھانا تناول کرتے میں رسالے کو دیکھنا شروع کیا اور حاضرین کو مزے لے لے کر سُنایا اور آخر کار فرمایا "کہ مجکو ساری عمر میں رشک ہوا ہے تو مولوی نذیر احمد کے دماغ پر" پس ہمارے مولٰنا کے تمام سرٹیفکیٹوں کا پشتارہ جس میں کئی لفٹنٹ گورنروں کی چٹھیاں بھی ہیں ایک طرف اور ہند کے بسمارک نواب سر سالار جنگ بہادر کا اتنا فرمانا ایک طرف۔

ان ساتوں رسالوں کے چھپنے کے متعلق حیدر آباد میں یہ روایت مشہور ہے کہ کسی امیر نے ان رسالوں کی نقل سر سالار جنگ سے چاہی۔ سر سالار جنگ مرحوم نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ تم کو حضور کی برابری کا خبط ہے۔ مگر مؤلف حیاۃ النذیر کی خوش قسمتی کو دیکھیے کہ اس کو ان ساتوں رسالوں کی اصلی نقل دیکھنے کو مل گئی اور اس نے ان کو اول سے آخر تک نہ اس خبط کی وجہ سے پڑھا جس کا طعنہ سر سالار جنگ بہادر نے کسی امیر کو دیا تھا۔ بلکہ اس خیال سے کہ اعلیٰحضرت حضور نظام خلّد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے طفیل میں ایسے بیش قیمت رسالے دیکھنے کو مل گئے۔ ہاں سر سالار جنگ کے ارشاد کا اتنا ادب اس نے ضرور کیا کہ باوجود اختیار کے اس کی نقل نہیں لی اور بجنسہ اس شخص کو واپس دے دیئے جس نے یہ رسالے مرحمت کیئے تھے۔

ان رسالوں کا اقتباس اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ اصل میں وہ ٹکنیکل رسالے ہیں۔ ناظرین کو اس سے کچھ مفاد نہیں اس کے علاوہ جب وہ پرائیوٹ طور پر حضور نظام کے واسطے خاص کر لکھّے گئے ہیں تو ان کی اشاعت بلا اجازت نامناسب ہے۔

ان رسالوں کی تصنیف کا گورنمنٹ نظام کی طرف سے جو معاوضہ عطا ہوا اس کا تذکرہ مولٰنا کی پنشن میں کیا جائے گا یہاں صرف ایک یہ امر قابل تذکرہ ہے کہ چوں کہ یہ رسالے حضور آصف جاہ نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں بہادر کے لیئے مولٰنا کے دست و قلم سے نکلے ہیں اس لیئے وَکَفٰی بِہٖ فَخْراً۔ اس سے بہتر مولٰنا کے لیئے اور کونسا معاوضہ ہو سکتا ہے۔

سفر مدراس و میسور اپنی سٹلمنٹ کمشنری کے زمانے میں مولٰنا نے مدراس اور میسور کا بھی سفر کیا تھا سیر سپاٹے

(بقیہ صفحہ ۸۷) دم تعلقہ داری کی خدمت تک پہنچے۔ یہ بات پرانے ہی لوگوں میں ہے کہ رتی بھر احسان کو بھی مانیں اور جہاں تک ہو سکے اس کا بدلہ اتاریں ۱۲

سلہ کلارک صاحب حضور نظام کے استاد تھے انھوں نے مولٰنا کو حضور کی اتالیقی میں لینا چاہا مگر ان کی بات پیش رفت نہ ہوئی اب جو مولٰنا کو ایل ایل ڈی کی ڈگری ملی تو کلارک صاحب نے پُرجوش الفاظ میں مبارک باد لکھی اور یہ بھی لکھا کہ آپ کی لیاقت کی قدر بہت دیر بعد ہوئی اب سے پیشتر آپ کو یہ اعزاز ملنا چاہیئے تھا اور کیا اچھا ہوتا کہ میری تحریک کے مطابق آپ جیسا لائق و تجربہ کار شخص حضور نظام کا اتالیق ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں معتدبہ ترقی کی توقع رکھتا ۱۲

کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ طریقۂ بندوبست سے آگہی پیدا کریں۔ غالباً اپریل ۱۸۷۸ء کا ذکر ہے کہ مولانا اول بنگلور میسور پراونس کے دار الحکومت میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک نہایت عمدہ عالی شان مکلّف اور آراستہ مکان میں فروکش ہوئے۔ مولانا کے ساتھ دو انگریز بھی تھے۔ مولانا میسور میں بہت سے انگریزوں سے ملے اور ان سے طریقۂ بندوبست پر گفتگو اور مشورہ کر کے ۲۵ مئی ۱۸۷۸ء کی صبح کو مدراس میں داخل ہوئے۔ سفر مدراس کے اور واقعات تو معلوم نہیں۔ صرف ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ مولانا نے سمندر کی بھی سیر کی تھی لیکن اسی کے ساتھ سمندر کے تموّج سے مولانا کے دل پر بہت ہی خوف طاری ہوا تھا۔ یہاں سفر مدراس کے متعلق ایک واقعہ دعوت کا بھی معلوم ہوا ہے اور چوں کہ وہ قابلِ عبرت ہے اس لیے درج کیا جاتا ہے۔

مدراس میں جس کوٹھی کے بالاخانے پر ہمارے مولانا ٹھیرے ہوئے تھے وہ ایک مشہور سیٹھ اسمٰعیل کی کوٹھی تھی رفتہ رفتہ سیٹھ کے ساتھ مولانا کا تعارف زیادہ ہو گیا۔ سیٹھ نے دعوت کا پیام دیا مولانا فرماتے ہیں کہ۔

"مجکو سدا سے دعوت کی چڑھ ہے ٹالنے کے پیرائے میں انکار کرتا رہا۔ جب چل چلاؤ کا وقت قریب آیا تو سیٹھ نے اِس قدر اصرار کیا کہ انکار کرتے بن نہ پڑا۔ دستر خوان پر خود سیٹھ اور اُن کے اعزّہ و اقارب اور ملازم حتّٰی کہ خدمت گار سب بلا امتیاز شریک ہوئے اور اُنھوں نے میرے خدمت گاروں کو بھی ساتھ بٹھانا چاہا۔ ان کو فی عمرہم برابر بیٹھنے اور ساتھ کھانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بہت پیچھے ہٹتے رکے اور سیٹھ ہیں کہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھسیٹے لیے چلے آتے ہیں تو چار و ناچار مجکو کہنا پڑا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں تو ان کو الگ کھانے دیجیے۔ ایسا ہی ہوا۔ مگر سیٹھوں نے بڑا ہی تعجب کیا کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ کھانے میں آقا اور نوکر کا تفرقہ کرتے ہیں اگرچہ میں اِس رسم کو اپنے ہاں جاری نکر سکا تاہم اس واقعے کو استحسان کے ساتھ اکثر یاد کرتا ہوں"

غرض مولانا مدراس و میسور وغیرہ کے سفر سے واپس آکر پھر اپنے عہدے پر کام کرنے لگے۔ مولانا کی حکومت اور تعزّز کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی قسمت میں مدار المہامی کرتے تھے۔ کیونکہ جو نسبت مدار المہام کو تمام ریاست سے ہے وہی نسبت صدر تعلقہ دار کو اپنی قسمت سے ہوتی ہے یعنی جیسی جامعیت مدار المہام میں ہے ویسی ہی صدر تعلقہ دار میں بھی ہے مگر محدود بہ قسمت ۔

عہدہ دارانِ ریاست حیدر آباد کی ترتیب

ریاست حیدر آباد دکن کے عہدہ داروں کی ترتیب اُس زمانے میں اس طرح پر تھی کہ نواب صاحب (سر سالار جنگ) بمنزلہ لفٹنٹ گورنر بلکہ ہم رتبہ گورنر جنرل تھے۔ جب وہ ولایت تشریف لے گئے تھے تو مراتبِ شاہانہ اُن کے ساتھ برتے گئے تھے اور اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ من حیث الاختیارات بادشاہِ دکن تھے۔ غرض نواب صاحب مدار المہام تھے اور اُن کے ماتحت چار صدر المہام۔ صدر المہام مالگذاری ایک۔ جیسے ہمارے ہاں بورڈ آف رونیو۔ اور صدر المہام کوتوالی دو۔ یعنی انسپکٹر جنرل پولیس۔ اور صدر المہام عدالت یعنی ہائی کورٹ تین۔ اور صدر المہام متفرقات یعنی تعلیمات۔ طبابت ڈاک تعمیرات۔ صفائی وغیرہ چار۔ چوں کہ مولانا صیغۂ مال کے ملازم تھے اس لیے اِن کو مدار المہام اور صدر المہام سے تعلق تھا۔ اُس زمانے میں مولانا کے صدر المہام نواب

مکرم الدولہ بہادر تھے اور نواب محسن الملک مرحوم معتمد علاقۂ مال گزاری تھے یعنی رونیو سکرٹری۔ اور دستور رتن جی پارسی معتمد صدر المہام مال گزاری یعنی سکرٹری ٹو دی بورڈ آف رونیو۔ صدر المہام مال گزاری کے تحت میں صدر تعلقہ دار تھے یعنی کمشنر قسمت جو وہاں صدر تعلقہ سمت کہلاتے تھے سلطنت بھر میں پانچ سمتیں یعنی پانچ قسمتیں تھیں۔

نواب محسن الملک مرحوم تمام انتظامی امور کے سکرٹری یعنی معتمد تھے اور اس تعلق سے ان کو سر سالار جنگ مرحوم کے پاس حاضر ہونے کے مواقع بلاناغہ ملتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کو سر سالار جنگ مرحوم کے مزاج میں مدخل عظیم تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم اگرچہ بڑے مردم شناس اور لیاقت پسند آدمی تھے مگر ساتھ ہی ایک یہ بات بھی ان میں دیکھی جاتی تھی کہ وہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ کوئی لائق آدمی سر سالار جنگ تک پہنچے یا سر سالار جنگ کی نظر میں کوئی وقعت پیدا کرے۔ ان دنوں دو فرقوں کا دَور دَورہ تھا۔ پارسی اور ہندوستانی مگر ہندوستانیوں نے پارسیوں کو بھی مغلوب کر رکھا تھا۔ نواب محسن الملک وزیر کے معتمد مال گزاری تھے۔ اور دستور رتن جی پارسی صدر المہام مال گزاری کے معتمد۔ صدر المہام مال گزاری نواب مکرم الدولہ بہادر تھے نواب سر سالار جنگ مرحوم کے داماد اور بھانجے پس دستور رتن جی بھی بڑے پائے کے عہدے دار تھے۔ نواب محسن الملک دستور رتن جی کو دبائے رکھنا چاہتے تھے اور دستور رتن جی کو صدر المہام پر ناز تھا پس دونوں میں نہفتہ کشمکش رہتی تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم افراطِ ذہانت کی وجہ سے جم کر کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ دفتر کا کام مولوی چراغ علی صاحب مرحوم مددگار معتمد کے ہاتھ میں تھا۔ رپورٹ وغیرہ لکھنی ہوتی تو نواب محسن الملک مرحوم ہمارے مولانا کو بلا لیا کرتے۔ یہ نہیں کہ اُن کو رپورٹ لکھنے کی لیاقت نہ تھی بلکہ افراطِ ذہانت کی وجہ سے وہ پاؤ گھنٹہ بھی جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

دستور رتن جی صاحب بمصداق "سفارشی گھوڑی عراقی کو لات مارتی ہے" ہمارے مولانا پر بھی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے وہ خود تو ایسے بہت ذی علم نہ تھے مگر اُن کے مددگار مولوی علی رضا خاں صاحب مرحوم ایم۔ اے۔ ایک بہت ذی علم شخص تھے اور اُن کے اور مولانا کے فیما بین نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ نوک جھونک والی تحریریں یقیناً بہت دل چسپ اور پُر لطف ہوتی ہوں گی۔ افسوس ہمیں وہ تحریریں دستیاب نہیں ہوئیں اُن تحریروں کے چند فقرے بعض حیدر آبادیوں کی زبانی سُنے گئے ہیں منجملہ اُن کے ایک فقرہ یہ تھا کہ مولانا نے کسی تحریر میں ایک مرتبہ دستور رتن جی کو لکھ دیا کہ "ایں چہ دستورِ ناہنجار ست" اس فقرے میں دستور کا لفظ چبھتا ہوا ہے۔ چند روز تک اسی طرح جنگِ زرگری رہی آخر کار مولانا کا لوہا دستور رتن جی کو بھی ماننا پڑا

گورنمنٹ ہند نے قحط کا ایک کمیشن بٹھایا تھا۔ اس کمیشن کے سکرٹری الیٹ صاحب تھے جو آخر کار بنگال کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے۔ ایک زمانے میں مولانا بطور ضلع کان پور کے تحصیل دار تھے اور الیٹ صاحب قائم مقام کلکٹر۔ انھیں کے وقت میں مولانا نے تحصیل داری کا امتحان دیا تھا۔ مولانا ان سے حیدر آباد کی حالتِ ملازمت میں میسور میں بھی ملے تھے اور وہ ان سے بڑے تپاک سے پیش آئے تھے۔ غرض سوالات کمیشن قحط کے جوابات مولانا کے لکھے ہوئے تھے اور نواب محسن الملک مرحوم کے لکھوائے ہوئے۔ ریاست حیدر آباد کے جوابات گورنمنٹ ہند میں مقبول ہوئے اور سر سالار جنگ کا شکریہ لکھا آیا۔ اسی طرح نواب محسن الملک مرحوم کبھی کبھی مولانا سے علی گڑھ کالج کے حق میں آرٹیکل بھی لکھوایا کرتے تھے

یعنی نواب محسن الملک مولٰنا سے مجملاً ایک بات کہہ دیا کرتے۔ اور مولٰنا اپنے طور پر مطلب کو سلجھا کر قلم بند کر لیتے اس میں شک نہیں کہ نواب محسن الملک بڑے ذہین بڑے وجیہ آدمی تھے۔ لیکن عربیت کے لحاظ سے تو ہمارے مولٰنا نے کبھی اُن کی لیاقت کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا نہیں۔ اگرچہ نواب محسن الملک بہادر دو مرتبہ ولایت ہو آئے تھے۔ بایں ہمہ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اُن سے کوئی انگریز ملنے آیا۔ مولٰنا بھی بیٹھے ہوئے تو مولٰنا کو ترجمان بنا لیتے اور کہتے جاتے۔ اِن سے کہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِن سے کہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مطلب یہ کہ ان کو مولٰنا جتنی بھی انگریزی نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اُن کا اُوڑھنا بچھونا۔ طرز ماندو بود سب انگریزی ہی تھا۔ اِنھوں نے انگریزی سوسائٹی میں ضرور اس قدر وقعت اور رسائی پیدا کر لی تھی کہ ڈچس آف کناٹ نواب محسن الملک مرحوم کی بی بی سے ملنے اُن کے گھر پر آئی تھیں اور آئے دن بھاری بھاری ڈنر ہوا کرتے تھے۔ ہم اس وقت نواب محسن الملک مرحوم کی لائف پر تنقید کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس کا موقع ہے۔ لیکن ہمارے قلم سے جو کچھ اس وقت تک نکل گیا اُس کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم نے بعض اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہمارے مولٰنا کی حیدرآباد میں طلبی اُن کے باعث سے ہوئی تھی۔ ہم نے جہاں تک تحقیق کیا ہے اُس کا ماحصل اُوپر لکھ چکے ہیں اب صرف اتنی بات اور لکھنا چاہتے ہیں کہ نواب محسن الملک مرحوم بڑے فیّاض اور بڑے سیر چشم تھے۔ اور بہتیروں کے ساتھ اُنھوں نے احسان بھی کیئے مگر ہمارے مولٰنا پر اُنھوں نے کوئی خاص احسان نہیں کیا۔ حیدرآباد کو پہنچانے کا احسان اگر ہے تو ترجمہ کو لمنشی ہو تو کا۔ یا نواب سر سالار جنگ بہادر کی قدردانی و مردم شناسی کا÷

مولٰنا کا عہدہ غرض مولٰنا وہاں صدر تعلقہ دار تھے اور اپنی سمت میں کل محکموں کے حاکم۔ اور مولٰنا میں بقدر سمت وہ جامعیت تھی جو ذاتِ نواب صاحب (سر سالار جنگ) میں بقدر وسعتِ سلطنت تھی۔ پس مولٰنا کو کل صدر المہاموں سے تعلق تھا۔ عہدۂ صدر تعلقہ داری گویا ہمارے ہاں کی کمشنری تھی۔ مولٰنا اگر برٹش گورنمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست تھے تو حیدرآباد میں خدا کے فضل سے بمنزلہ کمشنر ڈویژن جو بورڈ آف گورنمنٹ کا تابع ہوتا ہے۔ بہرحال جس عہدے پر ہمارے مولٰنا بہ استحقاق پہنچے تھے اُس کا شکر اُن پر واجب تھا اور چوں کہ وہ ناشکرے نہیں ہیں اِس لیئے اپنے صاحبزادے کو بھی اِس شکریئے میں شریک کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔

"اِن شاء اللہ بہت مواقع ملیں گے نواب صاحب (سر سالار جنگ مدار المہام) کے دل میں جگہ ہونی شرط ہے پھر تو وہ اِس طرح کا سخی دل آدمی ہے کہ جو مانگو سو لو۔ مثل ہندوستانی رئیسوں کے ہمارے نواب صاحب احمق اور لایعقل نہیں ہیں اپنے وقت کا یہ شخص ارسطو اور افلاطون ہے لیکن کریم النفسی اور مروّت اس درجے کی ہے کہ لا اور نہیں اور تو مونھ سے نہیں نکلتا۔ بشیر یہ بڑا عمدہ اصول ہے مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ تم نواب صاحب کے احسانوں پر نظر کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا چونکہ ضرور ہے تم بھی احسانوں سے تمتع کرو پس تم کو نواب صاحب کے حق میں صمیم قلب سے دعا کرنی چاہیئے۔"

انگریزی خدمت سے مولٰنا کا استعفار موعظۂ حسنہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب مولٰنا کے فرزند رشید نے جب تعلیم سے ترکِ تعلق کیا تو اپنے پدر بزرگوار سے ریاستِ

حیدرآباد میں ملازمت کی خواہش کی مولنا کو اگرچہ خود بھی اس کا خیال تھا مگر وہ موقع کی تاک میں تھے۔ ایک مرتبہ نہایت عمدہ موقع مل گیا اور وہ اس طرح کہ مولنا انگریزی گورنمنٹ سے دو برس کی فرلو رخصت لے کر گئے تھے جب رخصت ختم ہونے کو آئی تو مولنا نے نواب محسن الملک مرحوم کے ذریعے سے نواب سر سالار جنگ بہادر تک یہ بات پہنچائی کہ میں رخصت کے ختم ہونے پر ہندوستان واپس جاؤں گا۔ اس اثنا میں نواب سر سالار جنگ بتقریب دورہ گلبرگہ تشریف لے گئے تو مولنا کو بھی بلوا بھیجا۔ ایک رات نواب صاحب (سر سالار جنگ) نواب محسن الملک اور ہمارے مولنا صرف تین آدمی ایک جگہ تھے سر سالار جنگ نے مولنا سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے سنا ہے آپ واپس جانا چاہتے ہیں؟ مولنا نے عرض کیا کہ وہاں کے حکام سے میری شناسائی ہے اُن کے ذریعے سے میں اپنے اعقاب کی فکر کرنی چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ اعقاب کی فہرست دیجئے۔ مولنا نے مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنے فرزند۔ مولوی حافظ حاجی احمد حسن صاحب۔ اور مولوی شرف الحق صاحب اپنے ہر دو داماد کی اسم نویسی پیش کر دی نواب صاحب نے وہ فہرست نواب محسن الملک بہادر کو دی کہ مولوی نذیر احمد صاحب سے پوچھ کر ان لوگوں کو خدمات مناسب پر نامزد کر دو۔ اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ اب کیا عذر ہے۔ مولنا کو کچھ کہتے نہ بن پڑا اور اس طرح مولنا نے انگریزی خدمت سے استعفا دے دیا۔ چاہتے تو انگریزی پنشن محفوظ رکھ سکتے تھے مگر روپیہ بہت بھرنا پڑتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب کے احسانوں کے مقابلے میں انگریزی پنشن کی کچھ پروا نہیں کی وہ احسان یہ تھے کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام ایک سو پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ کار آموزی جاری کر دیا مولنا کے دونوں خویش معقول خدمات پر ہو گئے یعنی مولوی احمد حسن صاحب کو چار سو روپیہ ماہوار کی مددگاری صدر تعلقہ داری ملی۔ اور مولوی شرف الحق صاحب مددگار بندوبست بمشاہرہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار ہو گئے علی ہذا حافظ عبد الواحد صاحب مرحوم جو مولنا کے برادر نسبتی تھے وہ بھی مددگار بندوبست ہو گئے سر سالار جنگ مرحوم کو مولنا کی اس قدر خاطر منظور تھی کہ ان سب عزیزوں کو مولنا ہی کی ماتحتی میں رکھا۔ مولنا کے چلے آنے کے بعد مولوی احمد حسن صاحب نے ضلع کی کلکٹری تک ترقی کی اور اب چار سو ماہوار پنشن پا کر خانہ نشین ہیں۔ مولوی شرف الحق صاحب اب چھ سو پاتے ہیں اور بندوبست میں ہیں۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب درجہ اول کے دوم تعلقہ دار ہیں۔ اور پانسو پاتے ہیں۔

نواب سر سالار جنگ بہادر کے دونوں صاحبزادوں کو کام سکھانا

نواب سر سالار جنگ بہادر کے دل پر ہمارے مولنا کی ہمہ دانی اور تجربے اور لیاقت کا سکہ تو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے دونوں صاحبزادوں کو مولنا کے سپرد کریں تاکہ وہ کام سیکھ کر تجربہ حاصل کریں۔ چناں چہ ایک روز ارشاد فرمایا کہ میرے دونوں لڑکوں کو آپ کچھ کام سکھلایئے۔ اور اس غرض سے نواب میر لائق علی خاں عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب سعادت علی خاں منیر الملک بہادر دونوں صاحبزادوں کو پٹن چرو مستقر صدر تعلقہ داری پر بھیج دیا۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی بھی ان دونوں صاحبزادوں کے ہمرکاب تھے۔ قریب تین ہفتے کے دونوں صاحبزادے وہاں رونق افروز رہے۔ مختلف طریقے سے ان کو عملی طور پر کام بتایا گیا۔ دفتر

کی ترتیب اور کام کا ڈھنگ اور کُل ابتدائی اُصول ذہن نشین کرا دیئے گئے۔ اِس طرح دونوں صاحب زادے مولٰنا کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ آگے چل کر جب بڑے صاحب زادے مدار المہام سلطنت اور چھوٹے صاحب زادے معین المہام مال ہوئے اُس وقت بھی وہ مولٰنا کا خاص ادب کرتے تھے اور اُن کو مولٰنا کے پاس ادب کا بڑا خیال تھا۔

جب دونوں صاحب زادے پٹن چیرو سے کام سیکھ کر واپس آگئے تو نواب سر سالار جنگ مرحوم نے دونوں صاحبوں میں جنرل نولج یعنی واقفیت عامہ میں ایک ممتاز اور غیر معمولی ترقی پائی اور بہت خوش ہوئے ایک روز مولٰنا سے دریافت فرمایا کہ کہیئے ان دونوں لڑکوں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے۔ مولٰنا جو اپنی صاف گوئی اور بے دھڑک اور بے لاگ گفتگو میں ضرب المثل ہیں تڑسے کہہ بیٹھے کہ بڑے صاحب زادے کو خدا لوگوں کے شر و رفتن سے بچائے اور چھوٹے صاحب کی غیر معمولی تیزی اور ذہانت سے خدا لوگوں کو بچائے۔ مطلب یہ تھا کہ بڑے صاحب بھولے بھالے ہیں اور چھوٹے صاحب بہت گہرے ہیں۔ اِس پیشین گوئی کا نتیجہ حرف بہ حرف نہایت صحیح نکلا۔ جیسا کہ واقعات حیدرآباد سے ظاہر ہے۔

نواب فخر الملک بہادر جو اب وزیر عدالت ہیں انھوں نے بھی مولٰنا سے استفادہ کیا ہے۔ اور اب بھی وہ ہمیشہ مولٰنا کو بہت عمدہ الفاظ میں یاد فرماتے ہیں اور ہمیشہ مولٰنا کی خداداد قابلیت کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور فخراً اِس اُستادی اور شاگردی کا ذکر فرماتے رہتے ہیں۔

مولٰنا کا حافظ قرآن ہونا وہیں حیدرآباد کی ملازمت میں مولٰنا پر ایک خیر و برکت اور نازل ہوئی وہ یہ تمام ادیانِ آسمانی میں صرف اہل اسلام ہی کو ابتدا سے یہ گرویدگی رہی ہے کہ وہ اپنی الہامی کتاب قرآن مجید کے حفظ کرنے کو بڑے ثواب کی بات خیال کرتے ہیں۔ اہل عرب جن کی زبان مادری عربی ہے یا دوسرے ممالک کے اہل اسلام عربی داں کو صرف حفظ قرآن میں بہت ثواب ملتا ہو۔ مگر جو عربی زبان سے نا آشنا ہیں اور بے فہم مطلب قرآن مجید کو صرف ثواب کی غرض سے ازبر کرتے ہیں ہمارے نزدیک تو اُن کو کچھ زیادہ ثواب نہیں ملتا۔ کیونکہ بغیر عمل کے ناظرہ اور حفظا دونوں کی ایک حالت ہے بہر حال دونوں کو برابر ثواب ملتا ہو یا نہ ملتا ہو۔ لیکن خدا جس کو توفیق عنایت فرماتا ہے وہ ضرور حفظ قرآن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مولٰنا کو بھی خدا نے حفظِ قرآن کی توفیق مرحمت فرمائی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حفظ قرآن سے مولٰنا نے نہ صرف ثواب ہی حاصل کیا بلکہ جناب ممدوح نے بڑے بڑے دینی و دنیوی کام حفظ قرآن سے لیئے مولٰنا کے ہر لکچر کو اُٹھا کر دیکھیئے۔ ہر تصنیف و تالیف پر نظر ڈالیئے تو اکثر ایسی مفید باتیں معلوم ہوں گی جن کو احکام آلٰہی اور قرآن مجید سے خاص قسم کا تعلق ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولٰنا نے اپنی تصانیف میں قرآن مجید کا اِس قدر استعمال کیا ہے کہ اگر وہ ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو پورا قرآن مجید تیار ہو سکتا ہے حفظ قرآن ہی سے مولٰنا میں یہ قدرت پیدا ہو گئی ہے کہ احکام مذہبی کو وہ نہایت عمدہ طریقے پر سامع یا ناظر کے ذہن نشین کر دیتے ہیں اور قرآن کے تمام اوامر و نواہی کی تشریح اس فصاحت سے کرتے ہیں کہ معمولی و غیر معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو فوراً تسکین ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں مولٰنا کی تصانیف سے اُن لوگوں کو مخصوص ایک فائدہ اور پہونچتا ہے جنھوں نے قرآن مجید کو بالائے طاق رکھدیا ہے وہ یہ کہ جب مولٰنا کی تصانیف میں

جا بجا وہ قرآن کی آیتوں کو دیکھتے ہیں تو مطلب سمجھنے کے لیئے قرآن کی آیتیں ان کو ضرور پڑھنی پڑتی ہیں اور اس طرح سامعین اور ناظرین کے دل میں قرآن مجید اپنا اثر کرتا رہتا ہے اور اُن کو قرآن پڑھنے کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

غرض ہمارے ہاں ہندوستان کے مسلمانوں میں کہیں کہیں یہ دستور ہے کہ خدا جن کے ماں باپ کو توفیق دیتا ہے وہ اپنے بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے ہیں مگر وہی ابتدائی عمر میں تاکہ حفظ میں آسانی ہو اور محنت شاقہ کے اثر کو محسوس کر کے بچے بھاگے نہیں۔ بچے ماں باپ کے شوق سے جبریہ طور پر حفظ قرآن کرتے ہیں مگر یہاں مولنا کی نہ یہ عمر تھی اور نہ جبر جو کچھ سمجھیئے وہ خدا کی توفیق تھی اُسی نے مدد کی اُسی نے شوق دلایا۔ ورنہ عمر کے لحاظ سے بوڑھے طوطے کا وقت گیا تھا ایسے وقت میں قرآن مجید کے تیس پاروں کا برزباں کرنا کوئی موتھ کا نوالہ نہیں تھا۔ بلکہ جس کسی نے اس ثواب کے کمانے کا ایسی عمر میں ارادہ کیا ہو وہی خوب اندازہ کر سکتا ہے کہ اس راہ میں اُس کو کتنی دقتیں پیش آتی ہیں اور یہ لوہے کے چنے کتنی مشکلوں سے چبانے پڑتے ہیں خصوصاً اس زمانے میں جب کہ حفظ کرنے کی عمر باقی نہ رہی ہو۔ الغرض مولنا نے حفظ قرآن کا اُس وقت خیال فرمایا جب کہ اُن کی عمر اس کی متقاضی نہ تھی۔ مگر ہمتِ مرداں کے استقلال اور مددِ خدا کی توفیق سے حفظِ قرآن کے ثواب کی گٹھڑی مولنا نے صرف چھ سات مہینے کے عرصے میں باندھ کر اُٹھا لی وہ اس طرح پر کہ بڑھاپے کے زمانے میں جب کہ وہ حیدرآباد کے صوبۂ شمال کے صدر تعلقہ دار تھے باوجود کثرتِ کار ایک دفعہ دورے کو جاتے وقت حفظِ کلام مجید کا خیال فرمایا۔ جاتے جاتے قرآن شروع کیا چھ مہینے سترہ دن میں دورے سے واپس تشریف لائے تو قرآن مجید کے پورے حافظ۔ کچہری کے وقت دفتر کے کام سے فرصت کم ہوتی تھی بیچ بیچ میں چند منٹ کی فرصت ہوئی تو قرآن مجید دیکھ لیا لیکن بغیر اس کے کہ کارِ سرکار میں کسی طرح کا فتور واقع ہو۔ حفظِ قرآن میں مولنا کو اُن کی لائق اور خدا پرست بی بی صاحبہ مرحومہ سے بہت مدد ملتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مولنا اپنا کل کا یاد کیا ہوا پارہ ایک دفعہ پڑھتے اور بی بی صاحبہ سنا کرتیں ٭

بعض کی نہیں اکثر حفاظ کی یہ رائے ہے کہ متشابہات کا لگنا حافظوں کا ہنر ہے جس طرح دوشالے کا رفو۔ دوشالے پر جتنے رفو ہوں گے اُتنا ہی وہ قیمتی ہوگا۔ خیر ہنر کی تو کوئی بات نہیں۔ انسان کی جہاں اور قوتیں مکمل نہیں وہاں قوت حافظے کی تکمیل بھی اسے عطا نہیں فرمائی گئی کہ وہ زوال پذیر نہ ہو۔ بہر حال عام حافظوں کی طرح زیر زبر کی غلطی تو مولنا سے ممکن نہیں ہاں اُن کے متشابہات کا خاص حال ہے وہ یہ کہ مولنا کو اشتباہ ہوتا ہے مگر الفاظ مترادف میں۔ مثلاً یعلمون۔ یفعلون وامثالہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترتیب آیات توقیفی ہے[1]۔ مولنا کو اکثر یاد نہیں رہتا کہ اس کے بعد کیا مضمون ہے اگر مولنا کو اُردو میں مضمون بتا دیا جائے تو اشتباہ رفع ہو جائے۔ آیات کے بعد سکوت ہوتا ہے کہ اب کیا پڑھیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کہ مولنا کو متشابہات اس لیئے لگتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑھاپے میں کلام اللہ حفظ کیا ہے ٭

---

[1] یعنی جس ترتیب سے جبرئیل علیہ السلام نے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیتیں پڑھیں پیغمبر صاحب نے اُسی ترتیب سے کاتب وحی کو لکھوا دیں اور اُسی ترتیب سے آج تک مصاحف میں نقل ہوتی رہیں ۱۲

عام قاعدے کے بموجب تاوقتیکہ کوئی حافظ رمضان کی تراویح میں قرآن نہ سنائے حافظ ہونے کا اطلاق اُس پر نہیں کرتے مولٰنا جب حافظ ہوئے تھے تو مشیر قیصر میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اِس میں غالباً یہ لکھا تھا کہ ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں حافظ بھی آئے تھے مولٰنا کا امتحانِ حفظ کیا گیا تھا۔ بعض حافظوں نے ہم سے اِس جلسے اور اِس امتحان کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ جلسے میں امتحان دینا اَور بات ہے اور تراویح سُنانا اَور بات۔ حافظ ہونے کی کسوٹی امتحان نہیں بلکہ تراویح ہے خواہ ایک ہی دو دفعہ عمر بھر میں ہو۔ غرض تراویح کی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ ایک چھوڑ تین تین مرتبہ مولٰنا نے تراویح سُنائی ہے۔ اول مرتبہ پٹن چرو میں جہاں مولٰنا کے پیچھے پانچ حافظ ہوتے تھے۔ اور یہیں پر وہ مولٰنا کی بی بی صاحب بیوی صاحب تراویح کے بعد مولٰنا کو ملامت کیا کرتیں اور کہتی تھیں کہ "جس فہم کی غلطیاں تم حفظ قرآن کے وقت کرتے تھے اُن میں کچھ کمی نہیں ہوئی" پھر دلی آکر پہلے برس اپنے گھر قرآن سنایا۔ چند حافظ بطور سامع پیچھے تھے پھر ایک مرتبہ بجنور میں پڑھا۔ یادداشت میں جو نقص شروع میں تھا وہی اب تک ہے۔ ادب کے سبق پڑھاتے ہوتے ہیں۔ تو استشہاد کے لیے قرآن کا لفظ تو یاد آجاتا ہے پوری آیت یاد نہیں آتی اور کوئی پچھلی آیت پڑھوا کر دیکھیے تو مولٰنا پڑھ نہیں سکتے اور اس خصوص میں ہم نے اکثر حافظوں کو عاجز پایا ہے۔ اب تصنیف و تالیف کی وجہ سے اور قلت فرصت کی وجہ سے تلاوت میں بھی کمی ہو گئی ہے۔ تاہم صبح کے وقت اکثر اوقات تھوڑا بہت پڑھ لیا کرتے ہیں مگر ایک خاص حمائل ہے جس میں کہ انھوں نے حفظ کیا تھا۔ علی العموم حافظوں کا ایک ہی قرآن دیکھا گیا ہے کہ اُسی میں وہ آسانی سے آیتیں نکال سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے مولٰنا سے دریافت کیا کہ آپ نے شبینہ بھی سُنایا ہے تو ارشاد فرمایا میں نے کبھی شبینہ نہیں سُنایا۔ میرے نزدیک اس میں کراہت ہے۔ کیونکہ تلاوت قرآن کے متعلق صاف حکم ہے کہ وہ ترتیل سے پڑھا جائے اور ممکن نہیں کہ ایک رات میں سارا قرآن ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے خاص کر تراویح میں اور تراویح بھی وہ جس میں رکوع و سجود اور قیام اور قومہ اعتدال کے ساتھ ہو۔ الغرض مولٰنا جب حافظ ہوئے تو خداوند تعالیٰ کا شکر اُن پر واجب تھا۔ چنانچہ کیا اچھے الفاظ میں جناب ممدوح نے خدا کا شکر ادا کیا ہے وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ [1]

حیدرآباد کی ملازمت میں انقلاب کا پیدا ہونا۔

ملازمت جیسی خس پوش اور کمزور عمارت کی بنیاد کی مثال ارنڈ کی جڑ سے دی گئی ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ لیکن ہمارے نزدیک ریاستوں کی ملازمت کی سرے سے جڑ ہی نہیں اور یہ اُس سے بھی زیادہ سچ ہے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے متعلق ایک جگہ مولٰنا فرماتے ہیں کہ "جو یہاں ہے وہ وہاں (ممالک متحدہ میں) نہیں یعنی عزت و آبرو و بیش قرار تنخواہ اور جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں یعنی قاعدہ قانون اور کامل اطمینان۔ باقی جو وہاں سو یہاں جو یہاں سو وہاں۔ دلی میں برائے نام ایک بادشاہ تھے جن کو لاکھ روپیہ مہینہ پنشن کے طور پر ملتا تھا۔ میں نے یہاں ایک سلطنت دیکھی کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ سالانہ کے جاگیردار ہیں۔ غرض مسلمانوں کی سلطنت کی ایک یادگار ہے" ایک خط میں اپنے صاحبزادے کو لکھا ہے "تم نے کوئی ہندوستانی سرکار دیکھی نہیں۔

[1] اور خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہ رستہ دکھایا اور بے اُس کے رستہ دکھائے ہم ہرگز رستہ نہ دیکھ پاسکتے ۱۲

اور تم یہاں کا طرز انتظام سمجھ نہیں سکتے یہاں آسمان پر چڑھ جانا اور تحت الثریٰ میں گر جانا ایک بات ہے۔ جو لوگ کہ نوکر ہو گئے ہیں اُن میں سے کسی کو نوکر نہیں سمجھنا ہر ایک ملک کے سیکڑوں ہزاروں بڑے بڑے لائق برسوں سے پڑے جھک مارتے پھرتے ہیں کوئی پرسانِ حال نہیں اور چوں کہ یہ ایک بہت بڑی ریاست ہے خلقِ خدا ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑی ہے پھر یہاں کی کل فردلے قیاست ہے۔ وعدہ اور حکم کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی نواب صاحب کی قدردانی اور مولوی مہدی علی صاحب کی مہربانی تھی اور فی الاصل مجھ پر احسان کرنا منظور تھا کہ میرے عزیزوں کو عہدوں پر تامزد کر دیا ورنہ یہاں کون پوچھتا تھا۔ میں نے رخصت کی درخواست کی تھی۔ بڑی حجت کے بعد منظور ہوئی۔ لیکن پھر جو غور کیا تو جانا کچھ مناسب سا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر چند رخصت پر جانے میں میرا ذاتی چنداں نقصان نہیں مگر ساتھ والوں کی بڑی خرابی ہے۔ تم اپنے مطمئن ملک میں رہتے ہو کہ تم یہاں کے حالات مشکل سے سمجھو گے۔ ہندوستانی ریاست ہے اور ہم چند جلیل القدر ہندوستانیوں کا یہ حال ہے کہ در و دیوار دشمن ہو رہا ہے اور وجہ عداوت یہ ہے کہ ہم لوگ بڑے عہدوں پر ہیں اور بڑے اختیار رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں تو کہیں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ساری خلقت یہیں ٹوٹ پڑی ہے خاص کر ہمارے ہم وطن ہی ہمارے دشمن ہیں دیکھ کر جلتے اور بیخ کنی میں لگے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک دم کے لیے بھی نوکری سے جدا ہونا مصلحت نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں ایک دن میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے نہ کہ مہینہ۔ البتہ چھوٹے عہدے والے اور گمنام آدمی بڑے مزے میں ہیں۔ قاعدہ ہے کہ آندھی سے اگر خطر ہے تو بڑے بڑے اونچے درختوں کو نہ جھاڑی اور گھاس کو۔[1]

أَمَا تَرَى الرِّيحَ إِذَا هَبَّتْ عَوَاصِفُهَا ... فَلَيْسَ تَعْصِفُ إِلَّا وَمَا هُوَ الشَّجَرُ

غرض مولٰنا جس انقلاب کے آثار دیکھ رہے تھے اُس کے وجود کا وقت آ گیا۔ آپس کی کشمکش نے بنیادِ ملازمت کو ہلا ڈالا اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بڑے بڑے نامی عہدہ دار تتر بتر ہو گئے۔ سب سے اول مولٰنا کے قدم حیدرآباد کے ایک قحط نے ڈگمگائے۔ وہ قحط کوئی معمولی قحط نہ تھا بلکہ "یاراں فراموش کردند عشق" والا قحط تھا۔ بارانِ رحمت نے ایک ایک بوند پانی کو ترسا رکھا تھا۔ غلے کی گرانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ نرخ گھٹتے گھٹتے ساڑھے تین سیر کا رہ گیا تھا۔ مخلوقِ خدا جان سے بیزار ہو گئی تھی اور بے چارے غریب مفلس و متوسطین کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہاں اُمرا و متمولین اپنا پیٹ بے دردی کے ساتھ تخمہ ہونے کی حد تک بھر لیا کرتے تھے۔ جس سلطنت میں قحط نے ایسا ظلم ڈھایا ہو وہاں انتظامِ ملک میں جتنا اور جس قدر فتور پڑے تھوڑا ہے۔ یہ عالم دیکھ کر مولٰنا گھبرا اُٹھے وحشت زیادہ پریشان کرنے لگی۔ مگر خدا نے رحم فرمایا اور جوشِ رحمت اُبل پڑا لگاتار تین چار پانی خوب ہوئے۔

ہندوستانیوں کا انگریزوں سے تعصب اور اُس کی مثالیں۔

خیر یہ قحط تو ڈھل گیا مگر اُسی کے ساتھ ساتھ سرزمینِ دکن میں حسد کا ایک اور آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا جس کی چنگاریوں نے نظامِ تمدن اور شیرازۂ بندوبست کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ وہ اس طرح کہ دکھنیوں کی نظر میں ہندوستانی خار کی طرح کھٹکتے تھے اور خصوصاً وہ ہندوستانی جو حیدرآباد میں خدماتِ جلیلہ پر ممتاز تھے۔ پس جس ملک کا در و دیوار، زمین و آسمان دشمن ہو رہا ہو ایسے پُر خطر

[1] کیا ہوا کو نہیں دیکھتے کہ جب اُس کے سخت جھونکے آتے ہیں تو بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتے ہیں ۱۲

وقت میں مولانا کا ٹھیرنا کیونکر مناسب ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ افواہیں بھی انگیختہ کی جائیں نگراں سے بڑھ کر ہندوستانیوں کے لیئے مخصوص ایک اور طوفان اُبل پڑا۔ وہ یہ کہ سر سالار جنگ بہادر مرحوم ایک مدت دراز سے عہدۂ وزارت پر ممتاز تھے۔ نواب افضل الدولہ مرحوم جو پچھلے حضور تھے نواب (سر سالار جنگ) سے سخت ناراض رہتے تھے۔ ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ نواب افضل الدولہ مرحوم کو انگریزوں سے نفرت کلّی تھی۔ کیا ممکن تھا کہ دربار میں کوئی انگریزی کپڑا پہن کر جاسکے اس تعصب اور نفرت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اتنا بڑا گھر اور گھڑی گھنٹا ندارد۔ یہاں تک کہ انگریزی کاغذ پر عرضی دینا جرم تھا۔ ریزیڈنٹ سے ہاتھ ملاتے تو گھنٹوں صابن سے ہاتھ دھوتے۔ بگھی فٹن ٹمٹم کا تمام حیدرآباد میں نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن نواب سر سالار جنگ مرحوم بڑے زمانہ شناس تھے انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھ کر انگریزوں کی پالیسی کیجئے کر تہذیب کی تقلید کی۔ کچہریاں بٹھائیں عدالتیں جاری کیں۔ اس پر افضل الدولہ مرحوم اپنے وزیر کے جانی دشمن ہوگئے اور لاکھوں روپیہ منت کر کے فقیروں کو دے دیا۔ بعض پیر جی صاحبوں نے نواب سر سالار جنگ مرحوم پر سیفیاں پڑھوائیں۔ برسوں اس ناخوشی میں گزرے۔ مگر وزیر کو موقوف نہ کرسکے۔ آخر وہ سیفیاں اُلٹی پڑیں۔ یہاں تک کہ انتقال فرمایا۔ ؏

افسوس وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو تعصب کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک نواب افضل الدولہ مرحوم کیا، بلکہ ان جیسے ہزاروں متعصب افضل الدولہ ہندوستان میں موجود تھے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو یہ تعصب ہر قوم مفتوح میں ابتداء سے پایا جاتا ہے جب کوئی دوسری قوم ایک قوم پر مسلط ہوئی ہے تو ابتدا میں قوم فاتح کے تمام ہنر اور تمام صواب ایک عذاب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اسی قسم کی دو ایک مثالیں ان وقتوں کی اور سناتے ہیں۔

(۱) انگریزوں نے کسی ہندوستانی ریاست میں تار برقی لگایا۔ والیِ ریاست نے محلات سے نکلنا چھوڑ دیا کہ گزرگاہ پر انگریزی تار تنا ہوا ہے اس کے نیچے سے گزر ہوگا۔

(۲) ایک رئیس نے سی۔ ایس۔ آئی۔ کا تمغہ ٹامی کتے کے گلے میں باندھ کر انگریزی چھاؤنی کی طرف کو ہانک دیا۔

(۳) مولوی مملوک العلی صاحب ہمارے مولانا کے استاد تھے۔ دہلی کالج میں کوئی شامت کا مارا مسلمان انگریزی خواں مولانا کی جماعت میں آنکلا اور کالج کے مٹکے میں سے پانی پی لیا تو مولوی صاحب نے وہ مٹکا تڑوا دیا۔

(۴) ماسٹر رام چندر مشہور ریاضی داں عیسائی ہمارے مولانا کے استاد نے اسلام کی تردید میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ مولانا سے اس کے ایک باب کا ترجمہ کرایا۔ اس ترجمے کو کہیں مولوی عبد القادر صاحب مرحوم نے دیکھ پایا تو فتویٰ لیئے پھرے کہ اس کا نکاح رہا یا گیا۔

غرض ایک نواب افضل الدولہ مرحوم ہی اس طاعونِ تعصب میں مبتلا نہ تھے بلکہ ہندوستان کا آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا غیر ہندوؤں کا مذہب تو چھوت چھات کا مذہب ہی ہے مسلمانوں پر کیا قہر ٹوٹ پڑا تھا جو ایسی ناشائستہ حرکت کر بیٹھے تھے اور مذہب کو ناحق بدنام کرتے تھے۔ ہم کو ہندو مسلمانوں کی سینکڑوں حکایتیں معلوم ہیں۔ لیکن طوالت کے لحاظ سے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ ؏

خلاصہ یہ کہ نواب محبوب الدولہ بہادر نظام الملک آصف جاہ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ وحشمتہ (جوانب نظام دکن ہیں حضرت غفراں مآب کی وفات کے وقت) کا سن شریف دو سال کا تھا۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم نے کوشش کر کے ان کو تخت نشین کیا۔ وزارت بوجہ صغر سنی حضور۔ ایک عہدۂ مشترک تھا درمیان شمس الامراء اور نواب سر سالار جنگ مرحوم کے لیکن شمس الامراء مرحوم کا انتقال ہو گیا اور شمس الامراء مرحوم کے بھتیجے وقار الامراء امیر کبیر شمس الامراء ہوئے۔ اور ان کے لیئے ولایت سے خلعت وخطاب آیا۔ وقار الامراء مرحوم جانی دشمن تھے نواب سر سالار جنگ کے مشہور ہے کہ کئی مرتبہ نواب وقار الامراء نے نواب سر سالار جنگ مرحوم کے مروا ڈالنے کی تدبیریں کیں۔ مگر سر سالار جنگ بال بال بچ گئے۔ ایک مرتبہ نواب سر سالار جنگ شیر وہاں ہوادار میں سوار تھے۔ ایک شخص نے قرابین میں گولیاں اور پیسے بھر کر مارے۔ کہار مجروح ہوئے اور آئینے ٹوٹ گئے مگر سر سالار جنگ کو گزند نہ پہونچا۔ وقار الامراء بہادر کو اصرار تھا۔ کہ شرکت مدار المہامی میں بھی ہونی چاہیئے۔ جیسے شمس الامراء بہادر مرحوم کو تھی۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم کہتے تھے حضور خود صاحب ہوش ہوتے آپ وزارت میں شرکت کی حاجت نہیں۔ اور اگر وقار الامراء کی شرکت ہوئی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا یہ بھی مشہور تھا کہ انگریز سب وقار الامراء بہادر کے طرفدار تھے۔ کیونکہ نواب سر سالار جنگ بہادر کا انتظام ریاست میں انگریزوں کی مداخلت کو روکتا تھا۔ اور وقار الامراء بہادر نرے ہندوستانی امیر تھے۔

افواہیں سنتے سنتے بہت جلد وہ وقت آ گیا کہ نواب وقار الامراء بہادر کو خلعت نیابت بندگان عالی حضور پر نور ہوا اور فوراً پینتالیس ۴۵ اعتراض نواب مختار الملک سر سالار جنگ پر وارد کیئے گئے۔ ان میں سے ایک یہ کہ تم بار بار ولایت گئے اور سفر ہندوستان کیا۔ اور لاکھوں روپیہ یعنی مجموعی ایک کروڑ سے متجاوز صرف ہوا۔ چوں کہ یہ سفر واسطے منفعت نظام کے نہ تھے بلکہ تمہاری سیر وتفریح ان سفروں کا باعث تھی پس یہ روپیہ خزانۂ عامرہ میں داخل کرو۔ دوسرے ابتدائے وفات نواب آصف جاہ افضل الدولہ مرحوم سے آج تک جمع خرچ سلطنت کا حساب دو۔ تیسرے یہ کہ باوجودے کہ ایک سے ایک لائق آدمی۔ مدراسی۔ پارسی۔ دکنی۔ مرہٹہ۔ وغیرہ موجود ہیں تم نے ہندوستان سے ناواقف لوگوں کو بلا کر بڑے بڑے عہدے دیئے اس کا سبب بیان کرو۔ ورنہ ان کی تنخواہیں واپس کرو۔ چھ آدمیوں کے نام مشہور تھے۔ نواب محسن الملک مرحوم۔ مولوی سید حسین بلگرامی۔ مولوی چراغ علی مرحوم۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب۔ مولوی امین الدین صاحب اور ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب۔

حکومت کے تعلق سے بڑی سخت ذمہ داریاں حاکم پر عائد ہوتی ہیں۔ رعایا کی خبر گیری اور انصاف حاکم کا فرض ہے کہ ہمہ وقت دور و نزدیک ضعیف وقوی ہر فرد رعایا کے جزو کل حالات سے باخبر رہے ایسا نہ ہو کہ کوئی مظلوم اس کے پاس فریاد نہ لا سکے اور اپنی جگہ کلیجہ مسوس کر رہ جائے ؎ آتش سوزاں نہ کند باسپند ✿ آنچہ کند دود دل دردمند ✿ پھر اس درجے کی باخبری سے بھی بڑھ کر انصاف کہ فصل خصومات میں فریقین کی وجاہت۔ وکلاء کی چرب زبانی۔ گواہوں کی غلط بیانی اور عملوں کی رشوت ستانی۔ دوست یا احباب کی سفارش تحریری یا زبانی۔ اپنی اغراض نفسانی کسی بات سے متاثر نہ ہو۔ ہم نے نہایت وثوق سے سنا ہے کہ مولانا اکثر اس قسم کی باتوں سے علیحدہ رہے اور مخصوص انصاف کے خلاف کوئی

جادو اُن پر نہ چل سکا۔

مجلس مال گزاری کی کیفیت

بہرحال سر سالار جنگ مرحوم کے آخری زمانے میں جب انقلاب کی آندھیاں چلنی شروع ہوئیں تو ہمارے مولانا چن چرو کی صدر تعلقہ داری سے بُلا کر مجلس مال گزاری کے ایک ممبر بنا کر حیدرآباد میں بلائے گئے اس مجلس کے اُس زمانے میں تین رکن تھے ایک مولوی دلیل الدین صاحب احترام جنگ۔ دوسرے منشی اکرام اللہ خاں صاحب نواب یار جنگ بہادر تیسرے ہمارے مولانا۔ ان تینوں ارکان ثلثہ کی تنخواہیں سترہ سترہ سو تھیں۔ الغرض اس کیفیت کی وجہ سے مولانا کا قیام اب مستقل طور پر حیدرآباد میں ہو گیا یہ زمانہ نواب میر لائق علی خاں بہادر سر سالار جنگ ثانی فرزند اکبر نواب سر سالار جنگ اوّل کی مدار المہامی کا تھا۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ نواب میر لائق علی خاں بہادر اور نواب میر سعادت علی خاں منیر الملک بہادر معین المہام مال دونوں کو ہمارے مولانا سے تلمذ تھا۔ وہ اُستادی شاگردی اس وقت کام آئی۔ مدار المہام سرکار عالی کے پاس علی التواتر باریابی ہونے لگی۔ بلکہ ہفتے میں دو دن خاص اس کے لیئے مقرر ہوئے کہ ہمارے مولانا مدار المہام کو تعلیم دینے جایا کریں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے دیکھا تو یہ بات اُن کو کھٹکی۔ اور اُنھوں نے پہلے مولوی شرف الحق صاحب اور حافظ عبد الواحد صاحب پر ہاتھ صاف کیا دونوں کو تخفیف میں ڈال دیا۔ مولوی احمد حسن صاحب بھی صوبۂ شرقی کے شکست ہونے سے گھر بیٹھ گئے تھے۔ مولانا کو ایک دم سے اپنے تین عزیزوں کی علیحدگی بہت ناگوار گزری۔ نواب محسن الملک مرحوم نے باوجود مقتدر ہونے کے کوئی مدد نہ کی۔ ان سے کہا بھی گیا۔ مگر اُنھوں نے اِس کان سُنا اور اُس کان اُڑا دیا۔ یہ بنا بگاڑ کی ہوئی اور دلوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سازش کا بازار گرم ہوا۔ مجلس کے تینوں رکنوں میں سو مزاجی شروع ہو گئی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکنے لگے۔ مولانا نے جب یہ انقلاب دیکھا تو فوراً استعفا دے دیا مولانا کا استعفا دینا تھا کہ مجلس مال گزاری کے کل پرزے ڈھیلے پڑ گئے۔ مولانا کی جگہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کرسی نشین ہوئے مگر کب جب کہ اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ سنا ہے کہ یہ مجلس کئی دفعہ ٹوٹی پھوٹی۔ اب اس کی جگہ ریونیو سکریٹریٹ قائم ہے۔

مولانا کا استعفا و پنشن

مجلس مال گزاری کے کام کی خرابی کی شکایت۔ ارکان کے باہمی اختلافات کو خود مولانا نے مدار المہام بہادر سے عرض کیا۔ بعض لوگوں نے پولیٹیکل جوڑ توڑ چلے۔ آخر صلاح یہ ٹھیری کہ چوں کہ مولانا کو کیفیت مجلس پسند نہیں ہے بہتر ہو گا کہ کوئی دوسری خدمت دی جائے مگر مشکل یہ تھی کہ کوئی دوسری خدمت ایسی نہ تھی جس میں سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مل سکے۔ لہٰذا ایک جدید خدمت مشیر مال کی گھڑی گئی جو بے کار محض اور برائے نام تھی۔ مطلب صرف یہ تھا کہ مولانا کو گوشہ نشین بنا کر بٹھا دیا جائے تنخواہ تو پوری ملتی مگر کام کچھ بھی نہ تھا۔ مولانا نے اِس طرح تنخواہ لینا پسند نہیں کیا۔ جس شخص کی ساری عمر کام کرنے گزری ہو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیونکر بیٹھ سکتا تھا۔ مولانا نے اِس اختراعی عہدے سے صاف انکار کر دیا سر سالار جنگ ثانی نے مولانا کی بہت دل جوئی کی اور بہت کچھ سمجھایا مگر مولانا نے ایک نہ مانی اور غصے میں آ کر استعفا دے دیا۔ سر سالار جنگ مرحوم ثانی نے کئی دن تک استعفے کو یوں ہی ڈال رکھا خود بھی مولانا کو سمجھایا اور لوگوں سے بھی کہلوایا جب ہر طرح سر سالار جنگ مجبور ہو گئے تو ناچار استعفا منظور کرنا پڑا۔ استعفے کا منظور ہونا تھا کہ مولانا کبیدہ خاطر ہو کر حیدرآباد سے فوراً بیک بینی و دو گوش نکل کھڑے ہوئے کسی کو

ان کے جانے کی خبر ہوئی کسی کو نہیں۔ گھر کا سامان گھوڑا گاڑی سب پڑا چھوڑ گئے جو بعد میں کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا گیا۔ مولانا نے ایک جگہ حیدرآباد سے اپنے آنے کی نسبت یہ فقرہ لکھا ہے "سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے سبھی اوروں کے پائے ثبات لڑکھڑا گئے تھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا"

مولانا نے جس زمانے میں استعفا دیا تھا اس زمانے میں حسن بن عبداللہ[1] جو آگے چل کر نواب عماد نواز جنگ بہادر کے ملقب ہوئے اکونٹنٹ جنرل تھے ہمارے مولانا کے عہد صدر تعلقداری میں عماد نواز جنگ ان کے ماتحت ضلع بیڑ کے کلکٹر رہ چکے تھے۔ آدمی راست باز اور دیانت دار تھے اور چونکہ عرب کے شریف قبیلے کے تھے ان کی رگوں میں صداقت کا خون دوڑتا تھا وہ مولانا کے چلے آنے سے بہت ملول ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ عام لوگوں کی زبان پر جاری تھا کہ حیدرآباد سے ایک ایسا لائق و فائق آدمی چلا گیا۔ انھیں حسن بن عبداللہ صاحب نے مولانا کی پنشن کی کارروائی کو سلجھایا۔ جو معاہدہ خدمات گورنمنٹ انگریزی سے مستعار لینے کے وقت ہوا تھا اس میں ایک یہ بھی شرط تھی کہ مولانا کی مدت ملازمت گورنمنٹ انگریزی میں بابت پنشن کے وقت محسوب کر لی جائے گی اس کے شامل کرنے کے بعد بھی مدت سی سالہ جو مدت پنشن کے لیے درکار ہے پوری نہیں ہوتی تھی پنشن کو پورا کرنے کے لیے مولانا کے ان رسائل پر لحاظ کیا گیا جو اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی حضرت نظام دکن کے لیے تصنیف فرمائے تھے۔ اگرچہ ان کو لکھے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے مگر ان کے صلے میں دو سو روپے ماہوار کا دوامی انعام منظور ہوا۔ اور اس طرح چھ سو روپیہ ماہوار کی معقول پنشن گورنمنٹ نظام سے مولانا کو گھر بیٹھے مل رہی ہے۔ بہر حال خداوند تعالیٰ نے نہایت نیک نامی سے ملازمت کے دن کاٹ دیئے۔ اس کا مولانا ہمیشہ شکر بجا لایا کرتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خاں بہادر ادام اللہ اقبالہ و خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کو دل سے دعائیں دیا کرتے ہیں۔

[1] حیدرآباد میں بلکہ ہندوستان میں یہ بہت مشہور شخص گزرے ہیں حسن نامی ایک ماہوار رسالہ بھی یہ بزرگ شائع کرتے تھے ۱۲۔

حلیہ | مولانا نذیر احمد صاحب کا قد نہ بہت لمبا ہے نہ چھوٹا۔ بلکہ خیر الامور اوسطہا کی رو سے متوسط ہے۔ بدن دوہرا ہے۔ رنگ کھلا ہوا گندمی۔ چہرہ مصحف اُبھرا ہوا چیچک کے داغوں سے پاک گویا تفسیر فیضی ہے کہ نقطہ ندارد۔ بلند اور چوڑی پیشانی بھویں جدا جدا گھنی۔ آنکھیں بڑی اور رعب دار۔ ناک بلند نتھنوں پر قدرے پھیلی ہوئی۔ ہونٹ پتلے۔ دہانہ متوسط۔ دانت ہموار اور سفید تھے۔ گردن موٹی اور متوسط جس پر کوتہ گردن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ سینہ بہت چوڑا۔ بالوں سے صاف ایسا سینہ جو علم و فضل کا گنجینہ ہے بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ڈاڑھی زنخداں پوش۔ رخساروں پر چھدرے بال۔ مونچھیں بڑی اور بھری ہوئیں۔ ڈاڑھی کو اوائل میں کچھ تصرف کیا کرتے تھے مگر اب نہیں۔ قصر الشوارب کرتے ہیں مگر استرے سے نہیں کبھی کبھی خود چھوٹی سی مقراض سے لبوں کے بال تراش لیتے ہیں۔ اب عرصے سے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے مگر عمداً اعتدال سے قدرتی طور پر بڑھنے نہیں پائی کہ بڑی ڈاڑھی کی تعریف میں شمار کی جائے۔ سر کے بال سنا جاتا ہے کہ آغاز ملازمت کے وقت تھے مگر اب تو ایک زمانے سے ہم چھوٹے چھوٹے دیکھتے ہیں۔ سنا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں سر گھٹا رہتا تھا۔ اب بیچ میں چندوا صاف ہے بال بتدریج اڑ گئے ہیں۔ چندوے کا صاف ہونا بلند اقبالی اور خوش بختی کی نشانی بیان کی جاتی ہے۔ ہاتھ اور پاؤں دونوں بھرے بھرے ہیں۔ ہتھیلیاں چوڑی چوڑی اور پنجے زبردست ہیں۔ پاؤں کا پنجہ بھی چوڑا ہے۔ پیٹھ بھی چوڑی ہے۔ توند نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ ڈیل ڈول ہمیشہ سے گداز رہا جو دبلے اور موٹے کے درمیان میں تھا۔ اب بوجہ پیرانہ سالی اس میں کمی آ گئی ہے۔ بدن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ورزشی تھا اور سنا بھی ہے کہ مدتوں مگدر ہلاتے رہے اس وجہ سے گوشت اب تک لٹکا ہوا نہیں۔ چہرہ بہت رعب دار ہے اور مجموعی حالت سے شرافت اور امارت ٹپکی پڑتی ہے۔ رفتار تیز رہی نہ سست بلکہ میانہ روی ہے جس طرح پہلے مالش چلا کرتے تھے۔ آواز بہت بلند ہے اور اتنی بلند ہے کہ لکچر دیتے وقت بڑے

آڈینس میں بھی اُن کی اسپیچ کا ایک ایک لفظ واضح طور پر سُنائی دیتا ہے۔ آہستہ بات کرتے ہیں تو بھی ایک ایک لفظ سُنائی دیتا ہے دیوار ہم گوش دار د اُن کے پاس نہیں۔ کمرے کے اندر ہوں تو باہر سب باتیں سُنائی دیتی ہیں مشورے میں اور متفرقی عام باتوں میں کچھ فرق نہیں۔ جہیر الصّوت ہیں کریہ الصوت نہیں ہے ایک خوش گوار بلند آواز ہے۔ سر کی بڑائی دکھاتی ہے کہ اُس میں کیسا عمدہ بھیجا ہے اور بھیجے میں کیسے عمارہ ذہنی قوی ہیں۔

وضع ولباس اور طریق بود و باش

جس طرح لوگوں کو بناؤ سنگھار۔ کنگھی۔ چوٹی۔ لباس فاخر عطریات اور پھولوں کا شوق ہوتا ہے ان میں سے مولنا میں ایک بات بھی نہیں۔ انھوں نے نہ کبھی بال پالے نہ کنگھی کی نہ تیل ڈالا۔ سر بن تو اپنی جگہ رہا۔ لمبے بال والوں کو جو ہمیشہ بناؤ سنگھار میں تضیع اوقات کرتے ہیں ان کو بہت ناپسند ہے اپنے بچوں کو کبھی بال بڑھانے یا تیل ڈال کر پٹیاں نہیں جمانے دیں۔ خود فوق البھڑک یا لباس فاخر کبھی نہیں پہنا ہمیشہ صوفیانہ لباس مرغوب طبع رہا۔ برٹش گورنمنٹ کی ملازمت کے زمانے کا لباس ایک بر کے پائجامے۔ گھٹنوں سے نیچے کرتے جن میں گھنڈی دار گریبان دونوں طرف نکلے اور گھنڈیاں لگی ہوئی۔ چوڑی آستینیں اور اچکن یہی قسم کا لباس تھا۔ بندوبست کی ڈپٹی کلکٹری تھی جانچ پڑتال کے لیئے اُن کو اکثر اوقات کھیت کھیت پھرنا پڑتا تھا ہندوستانی جوتی اس رگڑ میں کیا ٹھیرتی ناچار انگریزی بوٹ پہننے لگے تھے مگر دو چار دن کے لیئے دہلی آتے تو گھر میں سے کبھی کے پڑے ہوئے پھٹے پرانے لیتھڑے ڈھونڈ کر پاؤں میں لگا لیتے تب کہیں گھر سے باہر نکلتے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ ان باتوں کو بھی کفر و ارتداد کے درجے تک پونہچا دیتے تھے۔ جب سے حیدر آباد گئے تو لباس میں ذرا تغیر پیدا ہو گیا۔ بر کے پائجاموں کی جگہ تنگ پائچوں کا پائجامہ مگر ٹخنوں پر پڑا ہوا پہننے لگے تھے۔ ٹخنوں سے نیچا تو کبھی بھی نہیں ہوا۔ مگر اب ٹخنوں سے اونچا ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں جیسا وہابی پہنا کرتے ہیں لمبے کرتوں پر بعض اوقات صدری بھی پہنتے ہیں سب کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں۔ بدن میں مڑھے ہوئے کپڑوں سے ہمیشہ متنفر رہے۔ گوٹا۔ کناری۔ لیس یا سلمے ستارے کی ٹوپیاں کبھی اُن کو نہ بھائیں۔ اُس زمانے میں ترکی ٹوپی کا رواج نہ تھا کان پور کی ساخت کی سیاہ لیکے کی سوزنی کی چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ سرکار دربار میں جب جاتے تو سر پر عربی عمامہ اور جُبّہ مستزاد۔ جو حال ٹوپی کا تھا وہی جوتی کا تھا۔ کبھی کامدار جوتی نہیں پہنی وہی سلیم شاہی سادہ نری کی مگر قیمتی اور مضبوط استعمال کیا کرتے تھے۔ کچہری دربار کے وقت صرف انگریزی شو نہ پہن لیتے تھے مگر گھر پر کبھی نہیں پہنتے تھے اور اسی طرح کبھی کف دار کرتا۔ قمیص یا کوٹ پتلون نہیں پہنا۔ حیدر آباد میں اگرچہ فیشن کا بہت چرچا تھا اور نواب محسن الملک مرحوم کا میلان اِس طرف بالخصوص تھا اور مولنا کو ہمیشہ وہ مجبور بھی کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات مولنا کی پرانی روش پر چھیڑتے بھی تھے لیکن انھوں نے اپنی پرانی وضع نہیں چھوڑی۔ تاہم کہنے سُننے سے یا وقتی ضرورت کی وجہ سے ترکی ٹوپی اور کبھی فلٹ کیپ اور شروانی پہننے لگے تھے اور اسی کے ساتھ بوٹ نہیں بلکہ شوز۔ لیکن کالر۔ نک ٹائی۔ برجیز۔ فراک کوٹ۔ اوورکوٹ۔ السٹر وغیرہ وغیرہ کا ان کے پاس گزر نہ تھا اگرچہ ورکوٹ اور السٹر کی جاڑے میں فرغل اور روئی دار کپڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ غرض انگریزی لباس اور طرز سے کچھ دلی نفرت سی تھی۔ لیکن اور لوگوں کی خاطر یا فرنگیانِ طرزِ معاشرتِ یورپ کی وجہ سے قسم قسم کا فرنیچر اور میز کرسی سب کچھ

موجود تھا مگر وہ جب بیٹھتے تو مسند ہی پر تکیہ لگا کر۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں مجبوراً میز کرسی پر اجلاس کرتے تھے اور اسی طرح جب وہ حیدر آباد میں رونیو بورڈ کے ممبر تھے میز کرسی پر اجلاس کرتے تھے۔ وہاں اگر ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ وہاں کا یہی طریقہ تھا لیکن جب تک صدر تعلقہ دار رہے گھر اور دورے میں عادۃً فرش کی نشست رکھتے تھے۔ ملنے ملانے والے وہیں دوڑا تو بیٹھ جاتے تھے کوئی بڑا آدمی آگیا تو بعض وقت اُس کے لیئے کرسی منگا دی اور خود مسند پر بیٹھے رہے یا بلحاظ ضرورت وقتی کبھی خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے مگر بے چین اور منغّص۔ آرام اُن کو فرش ہی کی نشست میں ملتا تھا۔ مولانا نے کبھی انگریزی لباس اور طرز ماندو بود کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ اُس سے متنفر رہے۔ جن لوگوں نے ابن الوقت دیکھی ہے۔ اُن کو مزید شہادت کی کیا ضرورت ہے لباس کے متعلق مولانا کا جو کچھ خیال ہے وہ ضرور قابل قدر ہے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں "باوجودے کہ لباس جزو بدن نہیں پھر بھی اُس کو آدمی کی روحانی اور جسمانی زندگی میں بڑا دخل ہے جسمانی زندگی میں اِس لیئے کہ رفع حرّ و برد کے واسطے لباس کی ضرورت ہے اور روحانی زندگی میں اِس لیئے کہ بعلّت مناہت اور وضع داری کی حد سے گزر کر لوگ لباس میں اسراف نارو اکرنے لگے ہیں اور اسراف کے علاوہ لباس کو اظہار کبر کا ذریعہ قرار دے رکھا ہے اسراف اور اظہار کبر نہ ہو تو لباس میں خوش حالی کا اظہار ایک پیرایہ شکر کا ہے۔ شارع اسلام نے مسلمانوں کے لیئے کسی خاص وضع کی وردی تجویز نہیں کی۔ اور خاص وضع کی وردی کا تجویز کرنا مناسب بلکہ عموم اسلام کے لحاظ سے ممکن بھی نہ تھا۔ یعنی رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کافّۂ انام کی طرف مبعوث ہوئے اور کافّۂ انام تمام روے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور روے زمین پر کہیں خشکی ہے۔ کہیں تری۔ کہیں پہاڑ۔ کہیں جنگل۔ کہیں میدان۔ کہیں سردی۔ کہیں گرمی۔ کہیں دن۔ کہیں رات۔ تو موسموں اور آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کے لباس میں لوگ زندگی بسر کر نہیں سکتے۔ پس یہ بڑا دانشمندانہ اُصول تھا جو اختیار کیا گیا کہ لباس کو لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیا کہ اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے جو چاہیں اور جیسا چاہیں پہنیں اوڑھیں جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو اہلِ عرب نے لباس کی تراش خراش میں کچھ ایسی ترقی کی نہ تھی اُن کا معمولی لباس تھا ایک ردا (چادر) ایک ازار (تہمد) ہاں مردوں کے منہ پر ڈاڑھیاں ہوتی تھیں۔ سر پر عمامے پیروں میں چپّل (چمڑے کی تلیاں تسمے دار) بااین ہمہ پیغمبر صاحب سے شامی جُبّے اور سبتی جوتے کا پہننا بھی ثابت ہے۔ ہاں احادیث میں ٹخنوں سے نیچے ازار کے لٹکانے پر بڑی لتاڑ ہے سو کبر کے لحاظ سے کہ اُن وقتوں کے آوارہ مزاج بانکے چھیلا ایسا کیا کرتے تھے ایک حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ [1] ہے جس پر ان دنوں بڑا غل مچا ہوا ہے۔ لوگوں نے انگرکھا پائجامہ چھوڑ کر کوٹ پتلون اختیار کر لیا ہے اور ایک کوٹ پتلون پر کیا موقوف ہے تمام تر تمدن انگریزوں کا سا ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے۔ اس پرانی وضع پرانے خیال کے مسلمان اتنا تشدد کرتے ہیں کہ فہو منہم سے کفر و ارتداد کا استنباط کرتے ہیں۔ حالانکہ وضع ظاہر کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ انگریزی وضع کی تقلید کرنے والوں کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی خاص وردی مقرر نہیں ہر ملکے و ہر رسمے ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ بے شک ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی خاص وردی مقرر نہیں مگر باوجود اختلافِ اوضاع کے اتنا امتیاز تو ضرور باقی ہے کہ ہندوستانی لباس انگریزی لباس سے صاف پہچان

[1] جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اُن ہی میں سے ہے ۱۲

پڑتا ہے پس اس امتیاز کو مٹا دینا اور رواجی وضع کو ترک کر کے ایسی وضع اختیار کرنا جو اس ملک میں اہل یورپ کے ساتھ خاص ہے۔ اگر آرام و آسایش کے لیئے ہو تو خیر ایک وجہ بھی ہے مگر اس ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے انگریزی لباس الٹا تکلیف دہ ہے اور سوائے تشبّہ کے اور کوئی وجہ اس کے اختیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ اور تشبّہ کی غرض و غایت اس سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی نقل کرنے لالامس عظمتہ و ہیبتہ سے جو فی عین الناس لازمۂ قوم حکمراں ہے حصہ لے ہم قانون فوجداری میں ایک دفعہ پاتے ہیں جس کی رو سے ملازم سرکاری کے ساتھ تشبّہ کرنا جرم فوجداری قرار دیا گیا ہے۔ چوں کہ جرموں کا مدار نیت پر ہے ہم تو انگریزوں کا سا لباس پہننے والے و ملازم سرکاری کے ساتھ تشبّہ کرنے والے کو ایک درجے میں سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں کی نیت ملتی جلتی ہے جرم فوجداری نہ بھی سہی یہ اخلاقی الزام کیا کم ہے کہ انگریزی لباس پہننے والا اظہار قومی کی تذلیل کرتا ہے لیکن اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ کا آہنی قاعدہ اپنا اثر دکھا رہا ہے اور لوگ مجبور ہیں۔

اسی طرح مولانا کھانے پینے میں بھی شروع سے اب تک ہندوستانی طریقے سے کھاتے پیتے ہیں۔ ہاں کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ دوستوں کے اصرار سے یا کسی ڈنر کے موقع پر میز کرسی پر اور چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک مرتبہ جب اول اول میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا تو عجیب واقعہ گزرا اس واقعے کی نسبت مولانا فرماتے ہیں کہ مجھ کو پہلے پہل ایک دوست کے ہاں انگریزوں کی طرح میز پر چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا تو لوگ دہنے ہاتھ میں چھری اور بائیں میں کانٹا لے کر کانٹے سے بوٹی کو رکابی میں دباتے اور دہنے سے کاٹتے اور کانٹے میں بیندھ کر بوٹی کو بائیں ہاتھ سے منہ میں رکھ لیتے میں کن انکھیوں سے دوسروں کے عمل کو دیکھتا اور اسی کی نقل کرتا جاتا تھا تاکہ اناڑی نہ سمجھا جاؤں تاہم ایک یا دو مرتبہ تو ایسا ہوا کہ مہارت تو تھی نہیں بایاں ہاتھ اچھی طرح بوٹی کو نہ دبا سکا اور کانٹے میں بوٹی اچٹ کر غنیمت ہوا کہ میری ہی آنکھ میں لگی۔ دوسری اضطراری بے تمیزی یہ ہوئی کہ آنکھ کی جلدی میں سالن سے بھرے ہوئے چھری کانٹے کو رکابی کے باہر رکھ دیا میز کے کم جلنے دسترخوان میں دھبے پڑ گئے میں دیکھتا تھا کہ خدمتگار تک میری اس حرکت پر منہ پھیر کر ہنس رہے ہیں۔ بارے ایک خدمتگار نے سالن کی دوسری رکابی سامنے لا کر رکھ دی اس مرتبہ میں نے یہ احتیاط کی کہ بڑی بوٹی کو چھوا تک نہیں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کانٹے میں بیندھ کر منہ میں رکھنی شروع کیں۔ اب ایک اور نئی مصیبت پیش آئی کہ بائیں ہاتھ کا نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا بیٹ تو کیا بھرتا۔ خدا خدا کر کے ڈنر تمام ہوا اور میں دیوالی کی کلھیا کی طرح الوان نعمت سے چپا ہوا منہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ انگریزوں میں تو کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کلی کرنے کا دستور نہیں کھانے کو ہاتھ لگایا ہو تو دھوئیں لیکن میں کیونکر منہ نہ دھوتا کہ سارا لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد بارہا متشبہ بالنصاری دوستوں کے ساتھ میز پر چھری کانٹے سے کھانے کا اتفاق ہوا ہے پہلے کی طرح تو نشانہ خطا نہیں کرتا مگر میز اور چھری کانٹے کا پورا پورا ادب سنا ہے کہ محتاج تعلیم و مشق ہے جو شخص کا میز پر اپنی بڑی کٹھری کھیرا ہے۔

چھپے ہوئے اور مُہر شدہ فتووں کے سوا ہمارے ملک کے بعض متعصبین علما اور عوام جہلا کی رائے میں ہر اس قسم کے اکل و شرب داخل مِن تشبّہ ہیں لیکن ہمارے نزدیک لوگوں سے صرف توہمات ہیں وضع ظاہری اور طرز ماند و بود

اور طریقۂ اکل و شرب کو بقول مولنا کے "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ" کے تحت میں سمجھ کر ان چیزوں کو دینیات کے تحت میں آنے ہی نہیں دینا چاہیئے ؎

ما بروں را ننگریم و قال را　　ما دروں را بنگریم و حال را

نواب محسن الملک بہادر مرحوم تو فیشن کے دل دادہ تھے اُن کا کارخانہ سب انگریزی تھا حیدرآباد میں مولنا وہیں قیام کیا کرتے تھے مگر رات دن کرسیوں پر لدا رہنا پڑتا تھا۔ بیش ازیں نیست کہ کوئی کوچ مل جاتا یا میٹرس کا پلنگ۔ اور کھانا وہی اُبلا اور پھیکا بدمزہ ملتا جس سے نہ نیت بھرتی نہ پیٹ۔ انھیں تکلیفوں کی وجہ سے مولنا نے نواب صاحب مرحوم کی کوٹھی میں اپنا ایک کمرہ الگ کر لیا تھا اور اسی کے ساتھ کھانا پینا بھی۔ یہ پاؤں لمبے کرنا چاہیں لیٹنا چاہیں وہاں اس کا ٹھکانا نہیں۔ یہ چپاتیوں اور نمک مرچ کے چٹپٹے کھانے کے خوگر اور وہاں نان پاؤ۔ سوکھے توسٹ اور اُبلے ہوئے سیٹھے آلووں کے سوا دھرا کیا تھا۔ نواب صاحب مرحوم تو کسی نہ کسی طرح وہی کھانا کھا لیتے تھے خواہ پیٹ بھرے یا نہ بھرے کیونکہ مرحوم کو سیکنڈ کی لاج تھی۔ مگر مولنا کے حلق سے اُتر نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرحوم نواب صاحب کے ہاں کسی بڑے انگریز کی دعوت تھی۔ کھانے کے کورس چل رہے تھے۔ مرغی کا روسٹ آیا۔ اُسے جو کاٹا تو کچا خون نکلا۔ مولنا نے تو چھوڑ دیا۔ آنکھوں دیکھتے جیتی مکھی کون نگل سکتا ہے۔ نواب محسن الملک بہادر بھی کتنے ہی صاحب بہادر بنتے مگر فطرۃ کو کیا کر سکتے تھے۔ آخر مسلمان تھے۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آنکھ کھول کر مسلمانوں ہی کو دیکھا اور ساری عمر وہی کھاتے رہے جو مسلمان کھاتے ہیں۔ غرض اُنھوں نے بھی ناک بھوں چڑھا کر ڈش کو واپس کر دیا۔ کھانے کے بعد اُنھوں نے باورچی کو بلایا اور کہا یہ تو نے مرغی کیسی کچی پکائی تھی جس میں سارا خون بہ رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تو بڑے صاحب کے پاس مدتوں رہا ہوں (یعنی رزیڈنٹ کے پاس) صاحب لوگ ایسی ہی مرغی شوق سے کھاتا ہے۔ نواب صاحب تو یہ سُن کر چُپ ہو گئے۔ اگر اُس پر کچھ اعتراض کرتے تو بٹلر سمجھتا کہ صاحب اناڑی اور آخر نیٹو ہے نا ❊

لباس کے ضمن میں اتنی بات اور بھی لکھنے کے قابل ہے کہ مولنا ابھی تک انگریزی وضع کے اُن نوجوانوں سے جو بے ضرورت صاحب بہادر بن کر خواہ مخواہ اینٹھا کرتے ہیں نفرتِ کلّی رکھتے ہیں مولنا کے اِس تنفر کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کے خاندان میں اکثر ممبر باوجود انگریزی دانی کے پُرانی روش پر اب تک چل رہے ہیں اور جن کے مزاج میں انگریزیت سما گئی ہے وہ بھی باہر جو جی چاہے کر لیں مگر جب مولنا کے سامنے آتے ہیں تو اپنے معمولی لباس ہی میں آنا پڑتا ہے ❊

مولنا کی موجودہ قطع وضع

مولنا کی موجودہ وضع جو کچھ ہے وہ یہ ہے۔ تنگ مُہری کا پاجامہ۔ نیچی چولی کی ممی شیروانی کسی قسم کی نرم ٹوپی صرف گھر میں۔ جب کہیں باہر تشریف لے جاتے ہیں تو ترکی یا ایرانی ٹوپی پہن لیتے ہیں دربار میں عربی عمامہ۔ جوتی وہی سادہ سلیم شاہی۔ غرض کپڑوں میں بالکل تکلف نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح رہنے سہنے کا طریقہ بالکل سادہ ہے۔ گھر میں اگر گرمیاں ہوئیں تو صرف پاجامہ پہنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں کبھی کبھی قیلولے کے وقت لنگی بھی باندھ لیتے ہیں۔ کرتا ندارد۔ گرمیوں میں حسب معمول دوپہر کو سقفی پنکھا بھی کھنچتا ہے مگر خس خانے کا انتظام نہیں۔ فرش کوئی تکلف کا نہیں معمولی چاندنی کا فرش ہے۔ کبھی کبھی قالین بھی بچھا دیکھا ہے گرمیوں

میں آئل کلاتھ بھی بچھا دیکھا ہے اسی پر ایک طرف گاؤتکیہ رکھا رہتا ہے مگر کمرے سے ذرا دور ہے میں مولنا کی خدمت میں اکثر گھنٹوں
بیٹھا ہوں مگر یہ کبھی نہیں دیکھا کہ تکیے سے اُنکی پیٹھ لگی ہو۔ کمرے میں ایک طرف سونے کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ مولنا کے
سامنے ایک چھوٹی سی فرشی میز جس کی بلندی ڈیڑھ بالشت کی ہوگی رکھی رہتی ہے اسی پر لکھتے پڑھتے ہیں۔ میں نے
ایک نسخہ گلستاں کا بھی رکھا ہوا دیکھا تھا اور ویسے بیسیوں عربی کی کتابیں چھوٹی چھوٹی میزوں پر غیر مرتب طور پر رکھی ہوئی
دیکھی گئیں۔ وہ حمائل بھی ایک میز پر رکھی ہوئی دیکھی جس میں جناب موصوف نے قرآن شریف حفظ کیا ہے۔ بہت سی کاغذ
کی سادی سلیپں اور کسی زیر تصنیف کے اجزا بھی رکھے ہوئے دیکھے ہیں اور نہ صرف رکھے ہوئے دیکھے ہیں بلکہ تصنیف
کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ برابر لکھتے چلے جاتے ہیں نہ کبھی سوچتے ہوئے دیکھا نہ کہیں قلم رکتے دیکھا۔ صفحے کے صفحے بے
تکلف تصنیف کرتے چلے جاتے ہیں۔ غرض نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ باہر سے اندر کے قطعے میں کسی قدر زیادہ
تکلف ہے کیونکہ وہاں دروں پر پردے بھی پڑے ہوئے ہیں اور سفید چاندنی کا فرش ہے صحن مکان میں چند گملے بھی دیکھے ایک
میں البتہ بیلے کی بیل ہے باقی جلنے اور گملے ہیں اُن میں خشک مسواکیں گڑی ہوئی ہیں معلوم نہیں خود جناب مولنا کا
یہ شوق ہے یا خدمت گاروں نے گملے رکھ دیئے ہیں۔ کچھ کبوتر بھی ہیں مگر جنگلی جو خود بخود آبسے ہیں اور وہ کبوترانِ حرم کی
طرح چھتوں میں رہتے ہیں وہیں اُنھوں نے گھونسلے بنا لیئے ہیں۔ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ ان کے اُڑنے سے ہوا
صاف ہوتی ہے اسی واسطے اِن کو نکالا نہیں جاتا +

ملاقات کا وقت

جس زمانے میں مولنا ملازم تھے تو اوقات کچہری کے سوا ہر وقت اعلیٰ و ادنیٰ سب سے ملا
کرتے تھے کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک نہ تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی بلا روک ٹوک جاکر اپنا عرضِ حال کر سکتا تھا۔ اب
بھی یہی حالت ہے ملاقات کا کوئی وقت مقرر نہیں جس وقت جس کا جی چاہے چلا جائے۔ عادۃً لوگ اطلاع کراتے ہیں۔ مگر
وہاں اس کی حاجت نہیں۔ کارڈ بھیجنا تو درکنار وہاں دروازے پر کوئی دربان تک نہیں کہ کوئی روکے ٹوکے سچ کہا ہے ع
درِ درویش را درباں نباشد۔ جنھیں معلوم ہے کہ اس وقت فلاں مقام پر بیٹھے ہیں وہ وہیں سیدھے بلا تکلف چلے جاتے ہیں۔
اور جو نووارد ہوتے ہیں اُن کو پتا بتا دیا جاتا ہے مگر کسی قسم کی اطلاع نہیں ہوتی۔

دربار تاج پوشی ایڈورڈ ہفتم شہنشاہ ہند کے موقع پر دہلی میں چاروں طرف سے خلائق اُمنڈ آئی تھی۔ جس طرح برسات
میں ندی نالے اُبل پڑتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ دربار دیکھا ہے وہ بخوبی اِس امر سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ شہر اور بیرونِ
شہر میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمیوں کا ایک جنگل معلوم ہوتا تھا۔ مولنا ایک سال ایجوکیشنل کانفرنس میں مدراس
تشریف لے جانے والے تھے ناگاہ اُسی زمانے میں اُن کا ایک کارندہ مر گیا اور اُس کی وجہ سے ہزار ہا روپیہ مولنا کا ڈوب
گیا اِس سبب سے مولنا کی روانگی ملتوی ہو گئی۔ کانفرنس کے لیئے مولنا نے جو نظم لکھی تھی کہ مدراس جاتے ہیں
پالراس جاتے ہیں۔ وہ بھی افسوس ہمارے ہاتھ نہیں لگی۔ سنا ہے کہ بڑی چٹ پٹی نظم تھی۔ غرض اِس دربار کے زمانے
میں ہزار ہا لوگوں کو مولنا کی زیارت نصیب ہوئی جوق جوق لوگ ملنے آتے تھے اُن میں اہلِ مدراس بھی تھے۔ اہلِ مدراس
کو مولنا کی زیارت کا اور بھی شوق تھا کیونکہ وہ مدراس جاتے جاتے رُک گئے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مدراس کی ایک

انفنٹری کے کچھ لوگ جس میں حوالدار جماعہ دار اور عہدہ دار سب شریک تھے مولانا کے مکان پر پہونچے۔ یہ لوگ تعداد میں کوئی پچاس ہوں گے۔ سب کے سب مسلح وردی پہنے ہوئے ایک ساتھ مردانے مکان میں دھڑ دھڑانے گھس گئے اُس وقت مولانا تنہا بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے حقہ سامنے رکھا تھا السلام علیکم کی پچاس آوازوں نے مولانا کی نگاہ کتاب کی طرف سے ہٹائی۔ دیکھا کہ بہت سے مسلح فوجی لوگ ہیں۔ وعلیکم جواب پاکر ایک ایک نے مصافحہ کیا۔

مولانا نے پوچھا:۔ آپ صاحبوں نے کیوں تکلیف کی ؟

فوجی لوگ:۔ آپ کی شہرت۔ نام آوری۔ اور آپ کی تصانیف اور مخصوص ترجمۃ القرآن نے ہم لوگوں کو گرویدہ کیا ہے۔ جس طرح دہلی کے عجائبات اور قابل دید مقامات وارد و صادر کے لیئے دیکھنے کی چیزیں ہیں آپ کی زیارت بھی کم متبرک نہیں بلکہ ہم لوگ اس سے زیادہ متبرک آپ کو سمجھتے ہیں آپ فخر اسلام اور حکیم اُمت ہیں۔ دہلی آکر اگر ہم آپ کی زیارت نہ کرتے تو گویا دہلی آنا ہمارا بے کار تھا۔ اِس لیئے ہم نے یہ جرأت کی اور آپ کی قدم بوسی کو آگئے سوائے اِس کے اور کوئی تمنا یہاں نہیں لائی

مولانا:۔ مجھ جیسے ناکارہ کو کیا دیکھنے آئے ہو۔ میں تو بانگ دہل ہوں جو دور ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے

بوصوت دہل ہوا لم از دور بود ... بہ عیبشہ درم عیب مستور بود

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ ۔

کس قسم کے لوگوں سے مل کر خوش ہوتے ہیں

دنیا کا قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے ہم مشربوں سے مل کر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ذی علم آدمیوں کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ ہوا کرتے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں بہت کم یاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بے تکلفانہ صحبت بہت کم رہا کرتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ مولانا کا بالطبع طالب العلم وضع اشخاص کی طرف زیادہ رجحان ہے اور وہ اس قسم کے لوگوں سے بے تکلف ملتے ہیں کم عمر نوجوانوں سے بھی مل کر خوش ہوتے ہیں خصوصاً وہ جو کسی قدر ترقی تعلیم کے آثار دکھاتے ہیں اور نیچری خیالات کے مطابق ہونہار کہے جا سکتے ہیں ❊

وقت کی پابندی

اگرچہ ہمیشہ سے رہنے سہنے کی طرز پُرانے طریقے پر ہے لیکن وقت کی پابندی انگریزی طریقے پر ہمیشہ سے رہی ہے۔ ملازمت کے زمانے میں یا یوں۔ کیسے کہ پنشن لینے سے قبل وہ ہر کام اپنے وقت مقرر پر کرتے تھے۔ ریل کے سفر کے وقت کچھ دیر پہلے سے اسٹیشن پر جا بیٹھتے۔ بہرحال جس بات کے لیئے جو وقت مقرر کر لیتے حتی المقدور اُس کی ضرور پابندی کرتے کسی کام میں ڈھیل نہ ڈالتے ایک روز حیدرآباد میں نواب افسر الدولہ بہادر کے ہاں جانے کے لیئے نواب اکبر علی صاحب آنے والے تھے گو انتظار میں مولانا گھبرا رہے تھے مگر سنا ہے کہ بار بار گھڑی کھولتے نہیں دیکھا۔ حال آں کہ گھڑی اُن کی جیب میں موجود تھی کچہری آنے جانے میں سختی سے وقت کے پابند تھے۔ نماز روزہ پڑھنا پڑھانا۔ کھانا پینا۔ غرض سب کاموں میں وقت کی پوری پابندی کرتے تھے۔ پنشن لینے کے بعد بھی وقت کی پابندی کا وہی حال ہے نشست کے کمرے میں اب بھی ایک بڑی گھڑی دیوار میں لگی ہے جیب گھڑی نہیں رکھتے۔ انعام والی گھڑی اپنے بیٹے کو دے دی لیکن از بسکہ ہمیشہ مشغول رہتے ہیں قدرتی طور پر کام کرتے کرتے ایک طرح کی پابندی ہوگئی ہے۔ وقت کی پابندی ہمارے خیال میں یہ ہے کہ جب وقت آئے آدمی بے چین

ہو جائے اور جس طرح بارود آگ کی چنگاری پہنچتے ہی بھک سے اُڑ جاتی ہے فوراً وہاں سے اُٹھ جائے یا جہاں جس وقت جانا ہے ٹھیک اُسی وقت پہنچ جائے یا ٹھیک وقت مقررہ پر اپنے کاموں یا اپنے فرائض کو انجام دے۔ اس قسم کی وقت کی پابندی سنا گیا ہے کہ ملازمت کے وقت تک تھی اب خانہ نشین ہونے کے بعد نہ چنداں اُس کی ضرورت ہے نہ ویسا اب اہتمام ہے مگر وہی عادت کی وجہ سے سب کام اپنے اپنے وقت پر ہوتے رہتے ہیں۔ اُٹھنے کے وقت اُٹھتے ہیں۔ کھانے کے وقت کھانا کھاتے ہیں۔ سونے کے وقت سوتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے وقت لکھتے پڑھتے ہیں اور حسب معمول روزانہ نمازِ عصر پڑھنے کے بعد حافظ سراج الدین صاحب کی دوکان پر جاتے ہیں اور سات آٹھ بجے رات کو آتے ہیں +

مہمان داری اور طریق طعام "خورانیدن صد عیب و نہ خورانیدن یک عیب" مولانا نہ صرف اس مَثَل کے قائل ہیں بلکہ عامل بھی ہیں۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مہمان داری کو پسند نہیں کرتے نہ صرف اَوروں کی اپنے ہاں بلکہ اپنی بھی اَوروں کے ہاں دعوت تک سے چڑ ہے۔ بہت ہی مجبوری سے وہ کسی کی دعوت کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سخت مجبوری کی حالت میں دعوت کھاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شائبہ بخل ہے۔ مگر ہمارے نزدیک لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ لوگوں کے اس خیال کو نہایت صحیح طور پر ہم آگے چل کر **صرف دولت** کے عنوان میں مثالیں دے کر غلط ثابت کریں گے۔ بہر حال مولانا کے ہاں مہمان داری کچھ بھی نہیں لیکن اگر کوئی آجائے تو بھوکا بھی نہیں جاتا۔ نہ اُس کے لیئے کوئی خاص آؤ بھگت ہوتی ہے اِکّا دُکّا کوئی مہمان آجاتا ہے۔ یہ بھی ایک اتّفاق کی بات ہے کہ مولانا کے ہاں جو مہمان ہوتے ہیں وہ بھی اُنھیں کے فیشن اور اُنھیں کے مزاج کے ہوتے ہیں۔ شاذو نادر کسی مہمان کے لیئے تکلّف ہوتا ہو تو ہوتا ہو۔ ورنہ سب ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ مولانا نے ایک مرتبہ کے سوا کبھی کسی کو ڈنر دیا ہو یا پکنک ہوا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ برتنوں کے سٹ یا سلور پلیٹ یا چھری کانٹے اور کھانے کی میز کا اُن کے ہاں نام و نشان بھی نہیں۔ جب کبھی دعوت تو کیا کسی کو اگر اپنے ساتھ کھلاتے ہیں تو دسترخوان پر۔ کھانا بھی وہی معمولی۔ اِلّا ایک دفعہ جب کہ سر سالار جنگ اول کے صاحب زادے نواب لائق علی خاں بہادر (عماد السلطنہ سر سالار جنگ ثانی) پٹن چرو مستقر صدر تعلقہ داری پر رونق افروز ہوئے تھے۔ اُن کو انگریزی ڈنر دیا گیا تھا۔ چوں کہ پٹن چرو سے حیدر آباد قریب ہے سب سامان شہر سے منگوا لیا گیا تھا +

غرض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ مولانا مہمان نواز نہیں اور ہم کہتے ہیں کہ وہ مہمان نواز تو ہیں مگر رسم و رواج کی پابندیوں سے ضرور گھبراتے ہیں۔ خام طبع لوگوں کی طرح اُن میں گھلاوٹ اور ملاوٹ فوراً پیدا نہیں ہوتی۔ اِس خاص بات میں ہمارے مولانا کو ڈاکٹر جونسن سے کسی قدر نسبت دی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اِن فضول رسموں سے بہت ہی گھبراتا تھا۔

مولانا ہمیشہ اُبلے ہوئے انڈوں اور چائے کا ناشتہ کرتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک متوسط قدح میں شیر گرم ناشتے کی جگہ پی لیتے ہیں مگر کھانے پینے کا کوئی خاص کمرہ مقرر نہیں ہے وہیں جہاں نشست ہے بلکہ اُسی بالشت سوا بالشت میز پر جہاں لکھتے پڑھتے ہیں ناشتہ۔ کھانا پانی سب وہیں ہوتا ہے۔ چائے کے ساتھ بسکٹ نہیں ہوتے۔ چائے بھی صرف صبح ہی کو پیتے ہیں اور کسی وقت نہیں۔ سب سے زیادہ اہتمام کھانے کے وقت کا پابندی سے ہوتا ہے۔ صبح کو ہلکے ناشتے کے بعد دن کا کھانا بارہ بجے کے قریب کھا لیتے ہیں بغیر طلب آدمی کھانا لے آتا ہے وہی فرشی میز پر چن دیتا ہے پھلکے کو شوربے میں خوب ڈبو کر کھاتے ہیں

اور اسی طرح رات کا آٹھ بجے کے بعد کھاتے ہیں جو کچھ کھانا پینا ہو اِن دونوں وقتوں کے سوا بیچ میں کبھی نہیں کھاتے اور کھاتے ہیں حتی المقدور گوشت روٹی ہی زیادہ مرغوب ہے۔ مختلف اغذیہ سے جو معدے میں گڈ مڈ ہو جائیں پرہیز کرتے ہیں۔ صرف تبدیلِ ذائقہ کے لیے کسی قسم کی بھی ہو تھوڑی مٹھاس بالالتزام چکھ لیتے ہیں۔ کوئی خاص مٹھائی متعین نہیں اور کچھ نہ ہو تو شکر ہی سہی۔

حقہ پان وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ حقّے پان کی عادت پرانی ہے۔ بعض خطوط سے اس کا پتہ بھی چلتا ہے مثلاً ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "ذرا مہربانی فرما کر کم بخت حقّے کو درست کرا رکھیے گا۔ شاید چلتے چلتے تو بات چیت کرنے لگا تھا" ایک جگہ اور لکھا ہے "مجکو جو تکلیف ہے حقّے کی ہے بس کیا جانتا تھا کہ حیدرآباد ایسا نامعقول شہر ہے۔ اچھا تمباکو نہیں۔ حقّہ نہیں۔ نیچہ نہیں تقفلی نہیں۔ بڑی بے حرمتی سے گزرتی ہے۔ اگر آتا ہو تو دو حقّے ایک بدری دوسرا حسب پسند اور چار نیچے۔ دو عمدہ۔ دو معمولی ضرور لانا یا بھیج دینا"

غرض مولنا حقہ پیتے ہیں مگر نہ افیمیوں کی طرح۔ اب تو پان کھاتے دیکھا نہیں مگر جب کبھی کھاتے تھے تو بیگموں کی طرح نہیں کھاتے تھے کہ ہر وقت کلّے کے تلے پان دبا رہے پان میں چونا اور کتھا ملا کر لگایا جاتا تھا کہ مونھ نہ پھٹ جائے۔ الائچی کا التزام نہ تھا کسی نے ڈال دی تو خیر ورنہ نہیں البتہ زردے کی عادت تھی۔ خاصدان میں پان کی گلوریاں بھری رکھی رہتی تھیں۔ مگر بکری کی طرح سے چبانے کے لیے نہیں۔ آئے گئے کے واسطے بے زردے کا پان آیا کرتا تھا۔ اور زردہ کھانے والے کو خاصدان میں سے عطا ہوا کرتا تھا۔ حقّہ صرف ایک ہی رہتا تھا وہ بھی پیچوان یا کلی نہیں بلکہ تقفلی دار حقّہ مگر بڑا جس میں پانی زیادہ آئے اور خوب آواز دے۔ تمباکو البتہ جون پور یا لکھنؤ کا ہوتا تھا جس سے سارا کمرہ مہک اٹھتا تھا۔ مولنا کے ادب کی وجہ سے کوئی شخص اُن کے سامنے حقّہ نہ پیتا تھا ہاں کسی شخص پر عنایتِ خاص ہوئی تو وہ اپنا حقّہ اُس کے آگے کھسکا دیا کرتے تھے پان اور حقّے کی طلب زیادہ نہ تھی مگر مشغلہ ضرور زیادہ تھا۔ طلب نہ ہونا اس وجہ سے کہا گیا کہ دونوں چیزیں سفر ریل میں یا دورے میں چھوٹ جاتی تھیں۔ نہ حقّہ ساتھ جاتا تھا نہ پان دان۔ اب جب سے دانت گر گئے ہیں پان تو یک لخت چھوڑ دیئے ہیں مگر حقّہ جاری ہے صرف اتنا فرق ہے کہ خمیرہ ندارد۔ معمولی سادہ تمباکو پیتے ہیں۔ صبح سویرے اُٹھتے ہی عادۃً ایک چرٹ پی لیا کرتے ہیں وہ بھی پورا نہیں آدھا صبح سویرے آدمیوں کو حقّہ بھرنے کی تکلیف نہیں دیتے۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن حقّے پان کے متعلق مولنا کی جو کچھ رائے ہے وہ اس قدر صائب ہے کہ لکھے بغیر چارہ نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقّے پان تمباکو کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ حال آں کہ یہ سب چیزیں ہم مسلمانوں میں اِس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اب ان ہی کی تواضع مدارات رہ گئی ہے اور غالبًا دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد و زن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقّہ پان تمباکو ماکولات اور مشروبات کی قسم سے ہیں نہیں..... مگر بولتے ہیں حقّے پان تمباکو کو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے..... حقّے پان تمباکو میں حقّے کا تو کچھ قصور نہیں کہ وہ ایک آلہ ہے اور نہ پان کا کہ وہ پتا ہے۔ قصور جو کچھ ہے تمباکو کا ہے تو مولویوں کے جھگڑے میں کون پڑے کوئی اس کو حرام بتاتا ہے کوئی مکروہِ تحریمی کوئی مکروہِ تنزیہی اور بعض اس کی حلّت کے بھی قائل ہیں ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک لت لگا لینے کی تو بات ہی

اور ہی تمباکو کھایا جائے یا پیا جائے یا سونگھا جائے عادت سے پہلے لایعنی تو ضرور ہی اور مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (آدمی کے اسلام کی خوبی سے لایعنی باتوں کا چھوڑ دینا ہی) کی رُو سے تمباکو کا استعمال کسی طرح بھی ہو پرہیزگاری کی شان سے ہی بعید جتنے کا تمباکو ملک میں خرچ ہوتا ہی صوبے صوبے میں یونیورسٹی (دار العلوم) بنا دینے کا تو میں ٹھیکہ لیتا ہوں لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدّی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح پا سکتی ہی۔ مولوی بے چارے حرمت نہیں کفر وارتداد کے فتوے بھی دیں تو تمباکو کا رواج ترک نہیں سکتا کہ اب شرطِ زندگی ہو گیا ہی ❊

سلسلہ رسل ورسائل | جس طرح اس زمانے کے شوقین عمدہ اسٹیشنری۔ مانوگرام۔ چوڑے لفافے اور صدہا قسم کے تکلفات مراسلت میں کرتے ہیں اُن کا یہاں پتا نہیں۔ ماسوای اس کے خط وکتابت سے شوق بھی نہیں۔ نہ شوقیہ نہ اظہارِ خیر وعافیت نہ طلبِ خیر وعافیت۔ معلوم ہوتا ہی کہ مولنا نو نیوز از گڈ نیوز (بے خبری ہی خوش خبری ہی) کے قائل ہیں تاہم جواب طلب اور ضروری خطوط کا ضرور جواب دیتے ہیں۔ بعض اوقات اس میں بھی التزام نہیں اپنے لکھنے پڑھنے کے اوقات میں مراسلت کے لیئے بہت کم وقت صرف کرتے ہیں بلکہ ہفتوں خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی اس لیئے کہہ سکتے ہیں کہ خط وکتابت کا دائرہ بہت تنگ ہی اور جب سے ہاتھ مرتعش ہو گیا ہی یوں کہیئے کہ مراسلت بند ہی اعزہ واقربا کو بھی خط نہیں لکھتے لیکن جب کبھی کوئی ضروری بات لکھنی ہوتی ہی تو دوسرے سے لکھوا دیا کرتے ہیں کوئی محرّر اس کام کے لیئے مخصوص نہیں خط لکھوانے کے وقت جو لکھا پڑھا آدمی موجود ہوتا ہی اُس سے لکھوا دیا کرتے ہیں بعض وقت شاگرد ہوتے ہیں بعض وقت دوست ملاقاتی بعض اوقات اپنا کوئی ملازم۔ انگریزی خطوط کا جواب بھی خود بول کر لکھواتے ہیں مصنف حیاۃ النذیر کو بھی اس کی شکایت ہی کہ اُس نے اپنے بہت سے عریضوں کا جواب نہیں پایا ایک عرصۂ دراز تک اُس نے مسلسل اور متواتر عریضے بھیجے کہ اپنی زندگی کے کچھ نوٹ مرحمت کیجیے لیکن ہمیشہ ٹال ٹال دیا آخر تنگ آ کر اس کے تقاضائے شدید کے بعد خاص اپنے دست وقلم سے بخطِ مرتعش ایک خط لکھا جس کو حیاۃ النذیر کے مصنف نے بطور یادگار او ٹوگراف میں چھپوا کر حیاۃ النذیر میں منضم کر دیا ہی۔

صحت جسمانی | صحت جسمانی ہمیشہ اچھی رہی۔ کیونکہ غذا بہت سادی اور وقت پر کھاتے تھے مشی کی عادت بہت تھی دورے میں پیدل بہت چلا پھرا کرتے تھے مگدر بھی ہلایا کرتے تھے۔ گھوڑے پر بھی سوار ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ضعفِ معدہ اور پیٹھ کے ریاحی درد کی شکایت ہو جایا کرتی تھی مگر معمولی چند روزہ۔ اب تک بفضلہ تعالیٰ صحتِ جسمانی بہت خاصی ہی ہاتھ پاؤں مضبوط ہیں گو اب دانت نہ رہنے سے غذا اچھی طرح نہیں چبائی جاتی ہضم میں فتور۔ اور سقوطِ اشتہا اور اسی کے ساتھ گھٹنوں اور کمر میں درد بہت خفیف ثقلِ سماعت اور رات کو صاف دکھائی نہ دینا۔ چلنے پھرنے میں تکلف یہ سب باتیں عمر کے ساتھ یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہیں "پیری وصد عیب چنیں گفتہ اند" چلنے پھرنے کی حالت میں عصائے پیری سے مدد لیتے ہیں۔ اس سن کہولت میں کم بخت بواسیر نے ستانا شروع کر دیا ہی۔ کمزور ہوتے جاتے ہیں مگر اس کے سوا کوئی شکایت نہیں۔ بغیر عینک کے لکھتے پڑھتے ہیں ❊

صوم وصلوٰۃ اور تلاوتِ قرآن مجید | صبح کی نماز اول وقت جب کہ اندھیرا ہوتا ہی مولنا ہمیشہ سے پڑھتے ہیں اور وہ نماز بڑے حضورِ قلب اور خشوع وخضوع سے پڑھتے ہیں ہم نے اسی نماز میں اُن کو بڑی بڑی سورتیں پڑھتے

سُنا ہو ورنہ اور وقت کی نمازوں میں چھوٹی چھوٹی سورتوں پر اکتفا کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہو کہ حضورِ قلب کی پابندی
کے ساتھ نماز پڑھنے میں لحاس کا کانٹا نہیں چاہتے ایک جگہ مولنا فرماتے ہیں "غیر تو کیا جانے گا خود صاحبِ دل کو اپنی
دل کی چوری کی خبر نہیں ہوتی جس لفافے کو خدا بند رکھنا چاہے کس کی طاقت ہو کہ کھول سکے ؎ عمر بھر مستور رکھا رازِ
دل ۔ قبر میں جا کر لفافہ کھل گیا ۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہو کہ کسی نے اُن سے پوچھا مَا تَقُوْلُ فِیْ یَزِیْدَ
(یزید کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں) آپ سُن کر خاموش ہو رہے یہ خاموشی وہی حضرت موسیٰ کی عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ
فِیْ کِتَابٍ اِن کا حال میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہو کی مرادف تھی ۔ اور حکمِ شرع بھی یہی ہو کہ بالتعیین کسی کو کافر کہنا
درست نہیں مگر حکمِ شرع کو اور صرف حکمِ شرع ہی کو نہیں بلکہ عقل و انصاف کو بھی ماننا ہی کون ہو ۔ اب تو لوگ تعیینِ اسمی
پر بھی قناعت نہیں کرتے ۔ جب تک اُس وہمی مقتدی کی سی تعیین نہ کرلیں جو نماز کی نیت کرتے وقت اِقْتَدَیْتُ بِهٰذَا
الْاِمَامِ (میں اس امام کے پیچھے ہو لیا) کے کہنے پر بس نہ کرکے موئنھ سے امام کی طرف اشارہ بھی کیا کرتا تھا پھر اُس کا وہم
ترقی کرتا گیا تو صف سے نکل کر امام کو چھونے لگا ۔ تو اگر لوگ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح چُپ رہیں یا موسیٰ علیہ السّلام کی
طرح علمِ خدا پر حوالہ کریں تو پھر ہماری ہندوؤں کی ۔ ہماری عیسائیوں کی ۔ ہم میں سُنّی شیعوں کی ۔ مقلدوں غیر مقلدوں کی دو ا لین
ذوالّین کی لڑائیاں کیا ۔ اگر کوئی جنت میں جانا چاہتا ہو تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد ۔ وہ کوئی دنیا کا سا مکان تو ہو نہیں کہ بہت
آدمی جمع ہوں گے تو جگہ گھر جائے گی اُس کی وسعت تو عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (اُس کا پھیلاؤ ہو آسمان و زمین)
سے ظاہر ہوتی ہو اور اگر کوئی جہنّم کی طیاری کر رہا ہو تو اُس کی خوشی آخر جہنّم بے چاری بھی تو هَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ (کیا کچھ اور بھی
ہو) پکار رہی ہو ۔ اُس کی فریاد بھی تو کسی کو سُننی چاہیے ۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے فرائض تو پورے پورے ادا
کر چکے آدمی خالی بیٹھا کیا کرے چلے خدا کا ہاتھ بٹوانے ؎ تو کارِ زمین را نکو ساختی ۔ کہ با آسماں نیز پرداختی ۔ بات یہ ہو
کہ انسان ایسا مخلوق خود غرض ہو کہ اگر اُس کی حاجتیں خدا سے متعلق نہ ہوں تو یہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہ کرے کہ وہ ہو کون اور کدھر
رہتا ہو ۔ ہم جیسی نمازیں پڑھتے ہیں اگر واقع میں پڑھتے بھی ہوں تو انصاف کی بات یہ ہو کہ نہ پڑھنے سے بدتر ہو کیونکہ حکم کا
نہ بجا لانا نافرمانی ہو لیکن اُس کو بُری بھونڈی طرح پر بے دلی ۔ بے توجہی ۔ بے پروائی سے بجا لانا بے ادبی اور گستاخی ۔ جو
بعض صورتوں میں نافرمانی سے زیادہ ناگوار ہوتی ہو ۔ حدیث شریف میں آیا ہو کہ نماز جو بے حضورِ قلب ادا کی جائے وہ اُلٹی پڑھنے والے
کے موئنھ پر ماردی جاتی ہو ۔ وہی دوسرے کے ما فی الضمیر کے جاننے کی مشکل ہو لیکن میں اپنے اوپر قیاس کرکے کہتا ہوں کہ اگر لوگ
ایسی ہی نمازیں پڑھتے ہیں جیسی میں ساری عمر پڑھتا رہا ہوں تو افسوس اِس نماز پر ۔ افسوس اِس کے پڑھنے پر ! افسوس اس کی
مقبولیت کی اُمید پر !! ۔ افسوس اِس کے صلے کی توقع پر !!! ۔ یہ نماز اِس سے زیادہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی جیسے کسی سکول کا
لڑکا سکول کے وقت میں حاضر ہوتا اور پڑھنا لکھنا خاک نہیں ۔ کیا صرف حاضر رہنے سے وہ امتحان پاس کرلے گا ؟ ہرگز نہیں "
غرض مولنا ابتدا میں نماز کے بعد اکثر مشہور دعائیں جو رسالوں کی صورت میں چھپ گئی ہیں پڑھا کرتے تھے ۔ مگر اب وہ سب دعائیں
چھوڑ دی ہیں ۔ حاجت پڑے پر اب صرف قرآنی دعائیں پڑھا کرتے ہیں ۔ نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کرتے ہیں ۔ جماعت کی چنداں قید
نہیں ۔ ہاں مغرب کی نماز باہر جماعت سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ آپ کے باہر رہنے کا وقت ہو جس زمانے میں پنشن لے کر آئے تھے

اُس وقت پنج وقتی نماز اکثر مسجد میں پڑھا کرتے تھے مگر اب کہیں نہیں جاتے اور یہی حالت جمعہ اور عیدین کی نماز کی ہے۔ شاید ہی عیدگاہ میں جا کر کبھی نماز پڑھی ہو گھر میں پڑھتے ہوں تو خبر نہیں۔ نہیں معلوم وہ ایسا کیوں کرتے ہیں بالاخانے کے صحن کے ایک گوشے میں ذرا سا چبوترہ بطور مسجد کے بنا رکھا ہے وہیں اکثر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو مولنا علاوہ آسمانی کتاب ہونے کے علم ادب کی اعلیٰ درجے کی کتاب کے خیال سے بھی مزے لے لے کر پڑھا کرتے ہیں۔ جب تک وہ حافظ نہیں ہوئے تھے جھلے کے جھلے۔ آیتوں کی آیتیں اور رکوع کے رکوع اُن کو ازبر تھے جب حفظ کرنے کا ارادہ کیا تو بالالتزام حرف حرف پڑھا تھا۔ لیکن اب کبھی کسی وقت اِس التزام سے پڑھتے نہیں دیکھا ہاں حافظوں کی طرح اُن کا بھی ایک قرآن (حمائل) ہے جس میں اُنھوں نے قرآن مجید یاد کیا ہے جب کبھی کسی آیت کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اُسی میں دیکھتے ہیں۔

ابتدا میں کلام مجید مع تفسیر بالاستیعاب پڑھا کرتے تھے بلکہ ایک قرآن ایسا بھی موجود ہے جس کے زیر متن اُنھوں نے اپنے قلم خاص سے جا بجا عربی زبان میں تفسیر کے قسم کے نوٹ لکھے تھے۔ اِسی قرآن مجید پر مولنا کے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب کے نوٹ لکھے ہوئے موجود ہیں۔

روزوں کی یہ حالت ہے کہ سِنّ کہولت کی وجہ سے دو چار یا دو ایک رکھ لیئے تو رکھ لیئے ورنہ یہ بھی نہیں یہ سب عمر کا تقاضا ہے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اب وہ معمولی غذا گوشت روٹی بھی بخوبی ہضم نہیں کر سکتے اِس قسم کی غذا تقریبًا چھوٹ گئی ہے دودھ سے پیٹ بھر لیا کرتے ہیں۔ شاید دن بھر میں ایک آدھ پھلکا کھا لیتے ہوں تو کھا لیتے ہوں ورنہ صرف دودھ پر اکتفا کرتے ہیں بھلا ایسا شخص کیا روزے رکھ سکتا ہے ان کا سن نہیں کہ وہ تکلیف مالایطاق اُٹھائیں۔ تاہم روزے کے بارے میں جو کچھ مولنا کی رائے ہے وہ مختصر طور پر یہ ہے کہ "روزے سے مزاج میں عجز و انکساری کی صفت پیدا ہوتی ہے اور روزہ دار کو روزی کی قدر آتی ہے اِس کے علاوہ روزہ جسمانی تندرستی کے لیئے بھی مفید ہے کہ اُس سے ردی رطوبتیں جو اکثر مولد امراض ہوتی ہیں خشک ہو جاتی ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ روزہ دار اُن مصیبت مندوں کی مصیبت کا اندازہ کر سکتا ہے جن کو پیٹ بھر کر روزی میسّر نہیں آتی اور جب دوسروں کی مصیبت کا اندازہ کرے گا تو اُس کی طبیعت میں اُن کی امداد کا بھی تقاضا ضرور پیدا ہوگا۔ اور لوگ روزوں کے دنوں میں توسیع رزق بھی کرتے ہیں اِس سے لوگوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔ روزوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شب کو لوگ تراویح میں قرآن پڑھتے ہیں اور اس سے لوگوں کو قرآن کے حفظ کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اِس ذریعے سے خدا اپنا وعدہ ایفا کرتا ہے جو اُس نے قرآن کے محفوظ رکھنے کی بابت کیا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ روزے کو عبادات میں داخل کرنے سے شارع کی غرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چست و چالاک اور صابر و ضابط قوم بنائے نہ بندۂ شکم اور حریص و طامع کہ تھوڑی دیر بھی بھوک اور پیاس کے ضبط کرنے پر قادر نہ ہوں"۔

میلے ٹھیلے ناچ رنگ کا شوق میلے ٹھیلے ناچ رنگ کا شوق مولنا کو کبھی نہیں رہا۔ البتہ گورمنٹ کی ملازمت کے زمانے میں بعض اوقات کبھی کبھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ وہ ناچ رنگ میں شریک ہو گئے ہیں خاص کر گورکھپور کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں۔ لیکن اپنے ذاتی شوق سے کبھی اس قسم کی محفلیں گرم نہیں کیں۔ تاہم سماع کے دل سے شائق

سلہ

ہیں۔ مولانا کے لکچروں سے پایا جاتا ہے کہ اس قسم کی مجلسوں میں اکثر شریک ہوتے رہے ہیں۔ مولانا سماع کے نہ دل سے شائق ہیں بلکہ وہ اس کو از روئے شرع شریف بھی جائز سمجھتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ "خدا نے انسان کی روح کو رنگ اور بُو اور ذائقے اور آواز اور لمس سے متلذذ ہونے کی صلاحیت دی ہے اور حواس خمسۂ ظاہری ان لذتوں کے حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ ضرورت کے اعتبار سے یہ لذتیں مختلف مدارج کی ہیں یہاں تک کہ بعض شرطِ زندگی ہیں اور بعض شرطِ عافیت کیا خوب کہا ہے۔ ؎

دیدہ شکیبد ز تماشائے باغ بے گل و نسریں بسر آرد دماغ
گر نبود بالش آگندہ پر خواب تواں کرد حجر زیرِ سر
ور نبود دلبرِ ہم خوابہ پیش دست تواں کرد در آغوشِ خویش
ایں شکمِ بے ہنرِ پیچ پیچ صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

اسلامی شریعت کی تعلیم اس اصل پر مبنی ہے کہ انسان کی فطری قوتوں کے تمام سرچشمے جاری رہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ[1] کا یہی مطلب ہے۔ خدا نے یہ قوتیں ضرور کسی مصلحت سے انسان کو عطا فرمائی ہیں فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُو عَنِ الْحِكْمَةِ[2]۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[3] پس ان میں سے کسی قوت کا معدوم کرنا ضرور خلاف مرضی خداوندی ہے مگر ان کا حدِ اعتدال میں رکھنا بھی کارے دارد۔ پھر یہ لذتیں جو حواسِ خمسہ کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہیں۔ فانی اور عارضی ہونے کے علاوہ ادنیٰ درجے کی لذتیں ہیں اور ان نعمتوں میں ذلیل ترین حیوانات بھی شریک انسان ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں شریکِ غالب۔ ان جسمانی لذتوں کے علاوہ جن کو ہم کبھی نعمت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی قوت سے عقلی اور دماغی اور روحانی اعلیٰ درجے کی قوتیں ہیں جن کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ سب سے برتر سب میں برگزیدہ ان تمام اعلیٰ درجے کی مجموعی قوتوں کا نام ہے قوتِ علم۔ ؎

ازل سے جو علمی شرافت ملی ہے اسی سے الٰہی خلافت ملی ہے

ان ادنیٰ اور اعلیٰ درجے کی قوتوں میں ایک خاص طرح کا تعلق ہے کہ ادنیٰ درجے کی قوتیں معتدل حالت میں ہوں تو اعلیٰ درجے کی قوتوں کی تقویت کرتی ہیں ورنہ اُن کے حق میں مرضِ مہلک کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات لحاظ کے قابل اور ہے کہ جن کو اعلیٰ درجے کی قوتوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے ادنیٰ درجے کی لذتیں اُن کو مزے کی معلوم نہیں ہوا کرتیں ایک سچ مچ کا بہادر دشمن پر فتح پانے سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا درگزر سے۔ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ[4]
ع در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست
ایک بخیل کو جمعِ مال سے جو مسرت ہوتی ہے۔ تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا[5] وہ اُس مسرت کے مقابلے میں ہیچ ہے جو ایک سخی کو خرچ کرنے سے ہوتی ہے۔ ؎

---

[1] اسلام میں رہبانیہ نہیں ہے ۱۲ [2] حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ۱۲ [3] اے ہمارے پروردگار تو نے اس (کارخانۂ عالم) کو بے فائدہ (لغو) نہیں بنایا ۱۲ [4] اور غصے کو روک لیتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں ۱۲ [5] تم (مال کے ایسے حریص ہو کہ مُردوں تک کا ترکہ سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو (اور تم کو عبرت نہیں ہوتی) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو ۱۲۔

غنچہ خنداں نہ ہو کیوں ۔ کرکے زر اپنا برباد   کہ اڑانے ہی میں ہیں دولت کے مزے
سجدے میں پاسئے خُم مئے پہ ہی کس لطف سے مست   یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اسی پر تمام لذتوں کو قیاس کرلو غرض انسانی قوتیں دو گروہوں میں منقسم ہیں ۔ ادنیٰ جسمانی ۔ اعلیٰ روحانی جسمانی اور روحانی قوتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ موافقت اور مخالفت کے دونوں پہلو ہیں ۔ مگر ایک گروہ کی قوتیں آپس میں ہمیشہ متحد اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے مستعد رہتی ہیں اندھوں کی قوت سامعہ اور لامسہ عدم البصر کی تلافی کرتی ہے اور بسا اوقات سامعہ باصرہ کا کام دیتی ہے ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یہ مضمون بہت طول چاہتا ہے مگر ہم کو اس جگہ صرف قوت سامعہ پر بحث کرنی ہے ۔ تو حواس خمسہ کی قوتوں میں ہم کو باصرہ اور سامعہ دو قوتیں خطرناک معلوم ہوتی ہیں باصرہ اس لیے کہ اس کا برا استعمال منجر ہوتا ہے بدکاری کی طرف اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ[1] اور اسی لیے مسلمان مردوں کو حکم ہے یَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ[2] اور مسلمان عورتوں کو یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ[3] سامعہ اس لیے کہ وہ باصرہ کی قائم مقامی کرتا ہے ۔ بلکہ باصرہ کے عمل کے لیے تو مواجہہ بھی شرط ہے سامعہ ہندوستان بیٹھے سمندر پار تک کی خبر لیتا ہے ۔ ایک امیر کی نسبت پچھلے دنوں سنا گیا تھا کہ اس نے سرکیشیا کی عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف سن کر ایک مصاحب فرمساق کو سرکیشیا کی لڑکیاں جتنی بھی ملیں لانے کو بہت سا کچھ روپیے دلا کر روانہ کیا مگر وہ وہیں کا ہو رہا ؎

وصف اس پری رخ کا اور پھر بیاں اپنا   ہو گیا رقیب آخر ۔ تھا جو رازداں اپنا

شارع اسلام نے باصرہ پر تو غض بصر کا پہرہ بٹھایا ۔ سامعہ کو نغمہ و سرود کے استماع کی ممانعت کی ۔ اس میں شک نہیں کہ راگ ہر ایک طرح کے جذبے کو ہیجان میں لانے والا ہے جیسے خوشی کے ویسے رنج کے ۔ جیسے حیوانی ویسے روحانی اور یہ بھی مشاہدات اور بدیہیات میں سے ہے کہ آدمی تو آدمی جانور تک راگ سے فطرۃً متاثر ہوتے ہیں ۔ شراب کو سنتے ہیں کہ نشے کی حالت میں عقل تو زائل ہو جاتی ہے ۔ بیہوشی میں طبیعت کے اصلی جوہر اضطراراً کھل پڑتے ہیں ۔ اسد اللہ خاں غالب علیہ الرحمۃ والغفران خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا[4] بڑے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے ۔ مدمن الخمر ہمہ وقت نشے میں چور رہتے ۔ ان کے چوٹی کے اشعار وہ ہوتے تھے جو نشے کی حالت میں کہا کرتے تھے ۔ یہی حال ایک جج کا سنا گیا بلکہ دیکھا ہے جن کے فیصلوں کی ولایت تک دھوم تھی ۔ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہوتا تو اس کے فیصلے کو سرور کے وقت کے لیے اٹھا رکھتے اور جو لکھتے دوسرے اس کو سند گردانتے اور اس سے استشہاد کرتے ۔ چونکہ لوگوں کے خیالات مختلف طرح کے ہیں یہی راگ بعض کے حق میں خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ[5] کا موجب ثابت ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ کی سلطنتیں انہی

---

[1] آنکھیں زنا کا باعث ہوتی ہیں ۱۲ [2] اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۱۲ [3] اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۱۲

[4] غالباً آنریبل سید محمود کی طرف اشارہ ہے ۱۲ ۔

[5] اس نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی یہی کھلا ٹوٹا کہلاتا ہے ۱۲ ۔

خر ستیوں کی نذر ہوئیں۔ اور ابھی حال کا تذکرہ ہے کہ نوے برس سال مولوی محمد حسین صاحب مرحوم الٰہ آبادی[1] حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی تقریب سے اجمیر گئے۔ قوال نے حقانی غزل گائی۔ ان پر ایک حالت خاص طاری ہوئی بدن میں تھرتھری چھوٹی۔ آخر قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی۔ راگ اپنی ذات سے بری چیز نہیں سننے والے اس کو برا بنا دیتے ہیں۔ ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی راگ سُنا۔ اور ان کی موجودگی میں صحابہ نے سُنا۔ اور آپ نے سماع سے منع بھی فرمایا تو اجازت اور منع دو مختلف حیثیتوں سے دونوں بجائے خود درست۔ اب ہم سے کوئی سماع کی حلت اور حرمت کو پوچھے تو ہم کہیں گے استفت قلبک۔ للمؤلف ؎

اِذا کنت اَھلاً لَّہٗ فَاستمع　　وَالّا فدعْ وَاجتنبْ وَامتنعْ

مفہومِ حسن | ہم حصۂ اول حیاۃ النذیر کے عنوان "عنفوانِ شباب" میں مولٰنا کے مفہومِ حسن کے متعلق ایک اشارہ کر آئے ہیں وہاں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر موقع ہوگا تو حصۂ چہارم میں اس کے متعلق کچھ بالتصریح لکھا جائے گا۔ غرض ہم کو یہاں دو باتیں دکھانی ہیں اول یہ کہ حسن کیا چیز ہے دوم یہ کہ ہمارے مولٰنا کی فطرۃ میں مفہوم حسن کا صحیح مادہ موجود ہے۔ اور اس کے حسنِ استعمال کی خداداد قابلیت موجود ہے۔

اس لیے مناسب تھا کہ مولٰنا نے اپنی تصانیف میں جابجا جو حسن کا فلسفہ بیان کیا ہے اس کو نقل کیا جائے۔ لیکن اس میں طوالت کا خوف ہے۔ ناظرین نے "فسانۂ مبتلا"، "رویائے صادقہ" اور "الحقوق والفرائض حصہ سوم" میں حسن کے متعلق مولٰنا کے خیالات پڑھے ہوں گے ہمارے نزدیک ضرورت ہے کہ وہ دوبارہ پڑھے جائیں تا کہ معلومات میں تجدید ہو جائے تاہم حسنِ صورت کے متعلق چند سطری مضمون نقل کیے بغیر ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ اس عنوان کو چھوڑ دیں۔ دل یوں گوارا نہیں کرتا کہ چند متنفس کے سوا اس مضمون کو کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا یہ مضمون ہم نے مولٰنا کی ایک معرکۃ الآرا کتاب "امہات الامہ" سے لیا ہے۔ اِس مختصر مضمون میں حسن اور مفہوم حسن دونوں چیزیں موجود ہیں چناں چہ فرماتے ہیں کہ "وہی اکثر الاحوال تکثیرِ ازدواج کی اصلی محرک حسن پرستی ہوتی ہے اور حسن کا حال یہ ہے کہ ایک ملک کے لوگ اعضائے خاص کی شکل و صورت اور رنگ و وضع کی نسبت ایک قرارداد کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے اعضا کو حسین سمجھیں گے۔ اول تو مذاقِ حسن سب جگہ یکساں نہیں۔ انگریز کرنجی آنکھوں اور بھورے بالوں کے شیدا ہیں۔ ہم سیاہ چور آنکھوں اور کالے بالوں کے

---

[1] مولوی محمد حسین الٰہ آبادی بڑے صاحب دل بزرگ ہو گزرے ہیں ہمارے مولٰنا نے جس حقانی غزل کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا مقطع یہ ہے ؎
گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا　　خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی
یہ جناب قدوسی کی مشہور غزل ہے اسی مقطع کو بار بار گوا رہے تھے۔ اسی میں اُن کی جان [illegible] محمد رحمت اللہ ۱۲

[illegible] ہے تو سن ورنہ آسے چھوڑ اور کنارہ کشتی کر دریا زرہ [illegible]

چینیوں نے ناک کو چہرے کی ہمواری میں خلل انداز سمجھ کر بچوں کی ناک پر کمانیاں چڑھا چڑھا آخر ناک کو مٹا چھوڑا۔ حبش میں کوئی ہمارے ملک کا گیہواں رنگ آدمی جا نکلے تو اُس کو مبروص سمجھ کر اُس کی چھاؤں سے دور بھاگیں۔ حبشیوں کے ہونٹوں کو تو سنا ہو گا "لب زبر نیش تا پرہ بینی رسیدہ ولب زیریں تا زنخداں فرو ہشتہ" اختلاف مذاق پر طرہ یہ کہ ہر شخص کو اپنے مذاق کے مطابق حُسن سے یکساں طور پر ہیجان ہوتا ہے۔ حال آنکہ اعضاء خارجی کے حسن کو کیسا ہی ہو نفس خواہش میں کچھ بھی دخل نہیں مثلاً ہمارے شاعر ناک کی شان میں کہتے ہیں ع آتش حسن سے اک شعلہ سرکش بینی۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر کسی کی ناک اچھی ہے تو وہ اُسی ناک والے کے کام کی ہے وہ بھی اُس صورت میں کہ اُس کی قوت شامہ صحیح ہو۔ نتھنوں کی راہ آمد و شد میں رُکاوٹ نہ ہو کسی غیر کو اُس کی ناک سے کیا تعلق۔ یہ ہے اولادِ آدم کی سمجھ ؎ بر خیالِ نام شان و ننگ شاں ٭ بر خیالِ صلح شان و جنگِ شاں ٭ با ایں ہمہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی کی فطرت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ اوائل عمر میں اُس کی طبیعت جو رنگ پکڑ لیتی ہے وہ تا یہ زیست زائل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق حسن صورت کی طرف فطرۃً مائل ہو گا اور اس میلان میں اُس پر کچھ الزام نہیں۔ غایۃ ما فی الباب یہ میلان نتیجہ ہے اصل قوت کا۔ پس میلان کا بُرا بھلا ہونا موقوف ہے اصل قوت کے حسن یا قبیح ہونے پر اور اصل قوۃ خدا داد یعنی فطری قوت ہے کہ عمر کی ایک حدِ خاص کو پہنچ کر خود بخود ظہور کرتی ہے اور تمام خدا داد اور فطری قوتیں حسن ہیں اس واسطے کہ کسی مصلحت سے خدا نے دی ہیں اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ + لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔

مولٰنا نے حسن کے متعلق یہ نہایت ہی مختصر مضمون لکھا ہے۔ اس سے بہت زیادہ اور بہت واضح اُن کتابوں میں حُسن کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جن کے نام عنوان ہٰذا کے قریب ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں۔ غور کرنے سے حسن کی حقیقت واقعی کھل جاتی ہے۔ یہ جنون نہیں تو کیا ہے کہ ایک ایسی بے ثبات اور جلد فنا ہونے والی صفت پر سارے جہان میں ایک فسادِ عظیم برپا ہے۔ کتابیں اُٹھا کر دیکھئے تو اسی عارضی صفتِ حسن کی بدولت سیکڑوں خونی ندیاں بہتی ہوئی پائیے گا۔ انسان عجیب قسم کا نادان بچہ ہے کہ چند روزہ زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور تجربہ ہونے کے بعد بھی باز نہیں آتا۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو اس کی لت پڑ جاتی ہے اول تو اُن کی نیت کچھ ایسی ڈانوا ڈول ہو جاتی ہے کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور اُن کی رال ٹپکی۔ ایسے لوگ اکثر بد وضع۔ آب رو باختہ۔ لوگوں کی نظروں میں سبک اور کچھ بازاری طور کے آدمی ہوتے ہیں اِن بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ تم ایسی ناپایدار چیز پر کیوں فریفتہ ہو تو کچھ جواب نہیں دیتے۔ جواب نہیں دیتے اِس لیے کہ حُسن پرستی سے ہمیشہ نفس امارہ کی تحریک ہوا کرتی ہے۔ نفسِ امارہ کی کُھلی کھلی تائید کیوں کر کر سکتے ہیں کاش یہ لوگ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کو بھی تلاش کریں۔ مگر وہ اس کو نہیں سمجھتے کہ ؎

حسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بغیر ٭ جن گلوں میں بو نہیں وہ خوشنما کہنے کو ہیں

سلہ حسن جو چیز بنائی خوب ہی بنائی ۱۲ سلہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا ۱۲۔

دنیاداروں کے دماغوں میں ایک خبط یہ بھی سمایا ہوا ہے کہ جو لوگ جوانی سے گذر کر پیری کی سرحد میں قدم رکھتے ہیں وہ بھی ہمیشہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی صورت سے جوانی از سرِ نو عود کر آئے ؎

وقتِ پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

خیر جوانی تو کیا عود کر سکتی ہے مگر جوانی کا رنگ و روغن باقی رکھنے کے لیے بہت سے پوڈر اور خضاب ایجاد ہوئے ہیں۔ ؎

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی　　کالا کرے گا مونھ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

کاٹھی کا کساؤ قائم رکھنے کو چست لباس اور لوہے کے تاروں کے شکنجے ایجاد کیے ہیں۔ دانتوں کے لیے منجنوں اور غراروں کے علاوہ یہ بندش کی ہے کہ ان کو باندھ باندھ کر رکھا ہے لیکن سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں۔ ؎

گرفتم سال را کردی نہاں با موچہ می سازی　　گرفتم موئے را کردی سیہ با روچہ می سازی

جس طرح لوگ کہتے ہیں کہ "ہر ملکے و ہر رسمے" اسی طرح "ہر ملکے و ہر حسنے" کہنا بجا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کے انسان اپنے ہاں کے ہی مفروضہ حسن کے طویلے میں لتنباؤ کرنے سے باز نہیں آتے۔ کوئی ناک پر لٹو ہے کوئی آنکھوں پر کوئی صراحی دار گردن پر اور کوئی موٹی چوڑی آنکھوں پر۔ کوئی کالی زلفوں پر۔ کوئی کمرِ معدوم پر۔ کوئی غنچہ دہنی پر یعنی معیارِ حسن مختلف ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ ؎

حسنِ گندم گوں اگر صائب نیاشد در نظر　(صائب)　رفت بیروں از بہشت جاودانی می کشم

بحسنِ صندلی دل دادہ ام تا بہرہ ور گردد　(عالی)　ندانستم کہ حسنِ صندلینم درد سر گردد

مشک یا ظلمات یا بخت سیاہِ عاشقاں　(نصیر)　یا سوادِ لیل۔ یا موئے سرِ جاناں ست ایں

بہم بستہ مو را بصد پیچ و تاب　(فردوسی)　گرہ دادہ شب را بپیں آفتاب
چو وا کرد آں نافۂ مشک ناب　　شب آمد بپابوسیِ آفتاب

جمع می کردم چو از دیوانِ حسنش منتخب　(حزیں)　مصرعِ کاکل بمضمونِ پریشاں یافتم

کسے کہ تشنہ لبِ یار ہست مے داند　(عرفی)　کہ موجِ آبِ حیاۃ است چینِ پیشانی

یا رب ایں طاق ست یا محراب یا قوسِ قزح　(جامی)　یا ہلالِ عید یا ابروئے ماہ ماست ایں

گردشِ چشمِ سیاہت ہر کرا مجنوں کند　(مخلص کاشی)　دیدۂ آہو شمارد حلقۂ زنجیر را

اگر بینی آں مہ پارہ بینی　(محمد حفیظ اللہ خاں۔ قضا)　بہ بینی صنعتِ خالق بہ بینی

بود گوش از صفا بالائے گردن　(علامہ عبدالجلیل۔ بلگرامی)　بلوریں قیف از مینائے گردن

بر صفحۂ وصفِ عارضِ جاناں نوشتہ ایم　(صائب)　منت خدائے را کہ گلستاں نوشتہ ایم

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ مشتے نمونہ ہم نے لوگوں کے مذاقِ حسن کے متعلق دکھا دیے۔ لوگوں کی فطرت میں تو حسن پرستی کا مادہ خدا داد موجود ہی ہے۔ ہمارے شعراء کا خدا بھلا کرے کہ انھوں نے اس قسم کے شورش انگیز جذبات کو اس کثرت سے شعر و سخن میں قلمبند کیا ہے کہ ہندوستان کا ہر ایک نوخیز ان خیالات کو دیکھ دیکھ کر فرہاد و مجنوں بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ظرافتِ طبع اور برجستہ گوئی

زندہ دلی خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ جس میں یہ نہیں وہ مردہ دل ہے۔ ؎

زندہ دل زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

زندہ دلی کی ایک شاخ ظرافتِ طبع بھی ہے۔ مولانا میں ظرافتِ طبع کا عنصر غالب ہے طبیعت پُر مذاق اور برجستہ گو واقع ہوئی ہے۔ جو لوگ حسنِ ظرافت کو نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی ظرافت حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے شاید اُنھوں نے خاص خاص صحبتوں میں مولانا کی ظرافتیں سُن کر یہ رائے قائم کی ہوگی لیکن اُنھوں نے شاید یہ مصرع نہیں سُنا کہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد" سر سید مرحوم باوجود اس وقار و سنجیدگی کے جب وہ اپنے ہمعمر اور خاص خاص دوستوں میں بیٹھتے اور اُن سے مذاق کرتے تھے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی سر سیّد ہیں جو ملک میں تہذیبِ اخلاق کا عَلَم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اسی طور پر ہمارے مولانا بھی خاص خاص صحبتوں میں اگر ظرافت کی لَے کو بڑھا دیتے ہیں تو اس کو حدِ اعتدال سے متجاوز کہنا نہیں چاہیئے۔ غرض مولانا میں ظرافتِ طبع کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ تقریر و تحریر دونوں میں ظرافتِ طبع کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اُن کی اکثر ظرافتیں دلچسپ ہونے کے علاوہ پُر معنی و نصیحت خیز ہوتی ہیں۔ چند لطائف جو ہم نے اُن کی تصانیف میں دیکھے یا احباب سے سُنے ہیں تمثیل کے طور پر درج کرتے ہیں ؛

(۱) جس زمانے میں مولانا سمتِ شمال (دکن) کے صدر تعلقہ دار تھے اُن کی پیشی میں کاشی راؤ نامی ایک اہلکار رہا کرتا تھا۔ وہ بوجہ مزاج شناسی اور اپنی زود نویسی اور خوش فہمی کے پیش پیش تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یک چشم بھی تھا۔ سر سالار جنگ اوّل نے ایک دفعہ اثنائے ملاقات میں بسبیلِ تذکرہ مولانا سے پوچھا کہ کہیئے آپ کے ڈویژن کا کام کیسے چل رہا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ سارے صوبے کا کام صرف تین آنکھوں پر چلتا ہے۔ سر سالار جنگ متحیّر ہو کر پوچھنے لگے یہ کیونکر۔ مولانا نے جواب دیا کہ دو میری آنکھیں اور ایک میرے اہلکار پیشی کی ؛ (۲) سر سالار جنگ مرحوم نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو چند کام سیکھنے اور کام کرنے کے لیے مولانا کے سپرد کیا تھا اور اسی غرض سے دونوں صاحبزادوں کو چند روز جو مستقر تعلقہ صوبہ دار تھا بھجوا دیا تھا چنانچہ قریب ایک مہینے کے دونوں صاحب زادے وہاں رہے۔ اِن کو مختلف طریقے کام کے بتائے گئے اور عملی تجربہ سکھایا گیا۔ جب دونوں صاحب بلدہ (حیدر آباد) واپس تشریف لے گئے تو سر سالار جنگ نے ایک موقع پر مولانا سے پوچھا کہ کہیئے آپ نے لڑکوں کی نسبت کیا رائے قائم کی۔ مولانا نے کچھ تمہیدی فقروں کے بعد جیسا کہ اُمرا کے سامنے کہنا ضرور ہے۔ عرض کیا کہ "بڑے صاحب[1] زادے کو خدا لوگوں کے شر سے بچائے اور چھوٹے[2] صاحب زادے کے شر سے خدا لوگوں کو بچائے" اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ بڑے صاحب بھولے بھالے ہیں اور چھوٹے صاحب آفت کے پرکالے۔ اور یہ دونوں باتیں آخر کار صحیح نکلیں ؛

(۳) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آئینہ خانے[3] میں ایک بڑا جلسۂ دعوت تھا کسی بڑے بھاری انگریز کی دعوت تھی نواب سر سالار جنگ

[1] یعنی نواب میر لائق علی خاں بہادر عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی مرحوم ۱۲ [2] نواب سعادت علی خاں منیر الملک بہادر مرحوم ۱۲

[3] حیدر آباد میں سر سالار جنگ اول کے محل میں آئینہ خانہ ایک بڑی عمدہ عمارت تھی ۱۲ -

اول میزبان تھے اسٹیٹ کے تمام بڑے بڑے عہدہ دار بھی مدعو تھے۔ مکان کی آراستگی اور فرش وفرنیچر۔ روشنی سامان شاہی تھا۔ تکلفات کا کیا پوچھنا سر سالار جنگ کی ڈیوڑھی جس نے دیکھی ہو وہی اُس کی شان وشوکت کا بخوبی انداز ہ کرسکتا ہے نواب صاحب مہمانوں سے بہ خندہ پیشانی گفت وگو فرما رہے تھے۔ مولٰنا کو یہ شاہی کارخانہ دیکھ کر ایک وجد سا ہو گیا۔ جب تخلیے میں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو مولٰنا نے بے اختیار اس شان وعظمت کی تعریف کی اور اپنا خیال ظاہر کیا کہ ضرور آپ ایسی حالت میں مسرور رہوں گے۔ یہ سُن کر سر سالار جنگ مرحوم نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا مولوی صاحب آپ کو میرا حال معلوم نہیں اور فوراً شروانی کے بٹن کھول کر دکھلایا کہ دیکھو مجھ میں سوائے پوست واستخوان کے کچھ باقی نہیں مولٰنا نے فوراً برجستہ یہ تین مصرعے علی الترتیب پڑھے ع آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش ع جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے ع آناں کہ غنی تر اند محتاج تر اند ٭

(۴) سفر پنجاب میں مولٰنا آنریبل سرسید کے ساتھ تھے واپسی کے وقت لدھیانے میں مشن کی کوٹھی میں قیام ہوا۔ ایک پادری صاحب نے مولٰنا سے اپنے زعم میں اسلام کے نقائص پر صحیح بحث شروع کی سب سے بڑا الزام جنت کی حالت پر لگایا کہ مسلمانوں نے جنت کو بازاری عورتوں کا چکلہ بنا دیا ہے جو خداوند تعالیٰ جَلَّ وعلا شانہٗ کی عظمت وجبروت اور تقدس کے صریح خلاف ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ وہاں ہزاروں حوریں اور غلمان ہوں اور اگر ایسا ہو تو خدا کی خدائی میں فرق آجائے۔ مولٰنا نے ہنس کر جواب دیا کہ یہ تو خبر نہیں کہ وہاں ایسا ہو یا نہ ہو لیکن دنیا میں تو ہم ایسا ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بازاری عورتیں بھی موجود ہیں اور کیا کچھ نہیں ہے اور کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی سب چیزوں کا پیدا کرنے والا وہی ہے تاہم اس کو سب خدا مانتے ہیں۔ کوئی اُس کی خدائی سے روگرداں نہیں ہوا۔ پس اگر وہی خدا مرے بعد جنت میں ایسا کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دنیا میں تو وہ باایں ہمہ سب کائنات کا خدا مانا جائے اور عقبیٰ میں اگر ایسا کرے تو اُس کی شانِ الٰہی میں فرق آجائے۔ جو خدا یہاں ہے وہی وہاں ہے" ٭

(۵) مولٰنا حیدر آباد میں سوء اتفاق سے ایک انگریزی وضع مسلمان کے مہمان ہوئے میزبان کا سارا کارخانہ انگریزی اور ہمارے مولٰنا کا ہندوستانی۔ یہ وضو کیا چاہیں۔ نماز پڑھا چاہیں۔ آرام سے گاؤ تکیہ لگا کر سیدھی کرنی چاہیں وہاں ان آراموں کا موقع کہاں۔ ایک دو گھنٹے کی مہمانی ہو تو ان تکلیفوں کو برداشت کر کے صبر کر لیں۔ کچھ ایسی ہی ضرورت تھی کہ کم سے کم تین روز رہنے کے لیے میزبان نے مہمان کو مجبور کیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مولٰنا اتفاق سے آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ میزبان کے ایک عزیز تشریف لائے اور کُرسی پکڑ کر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مولٰنا حسب عادت معمولی ڈھیلے ڈھالے کرتے اور ایک برکا پائجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ فراک کوٹ۔ پتلون۔ نک ٹائی کالر وغیرہ کچھ نہ تھا ٭

میزبان کے عزیز:۔ مولوی صاحب آپ حیدر آباد آیا کریں جب تو اچھا لباس پہنا کیجئے۔ چلیے آج شام کو میرے ساتھ بیڈم ہال[۱] کی دکان پر۔ آپ کا میشر منٹ دے کر چند سوٹ آپ کے لیے بنوانے کا آرڈر دے کر آؤں ٭

---

[۱] حیدر آباد میں بہت مشہور ایک انگریزی درزی کی دکان ہے ۱۲ اسٹیپ۱ پیمانہ ۱۲ اسٹیپ۱ جوڑے ۱۲

مولانا :- ارے بھئی میں بے چارہ ملّا آدمی مجھے اِس نکتے اور پوزی سے کیا سروکار جس حال میں ہوں بھلا ہوں۔ تم اپنا رستہ لو۔

میزبان کے عزیز پھر بھی طنزاً ہنستے ہی چلے گئے۔

مولانا نے کہا سنو بھائی میرا اُتنا بڑا کنبا ہے اور صرف میں ایک کمانے والا۔ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی کا نہیں۔ میں اَللّے تللّے میں برتنے پر کروں اور کس بھروسے پر گُل چھرّے اُڑاؤں۔ رہے تم تو تمھاری آمدنی کا کوئی حد حساب نہیں۔ تمھارے بہنوئی کمائیں اُن کے سب بھائی کمائیں۔ تم کماؤ۔ تمھارے بھائی کمائیں۔ حتیٰ کہ تمھاری بہنیں کمائیں۔ تم کو یہ خرمستیاں بھا سوجھتی ہیں۔

(۶) سرسالار جنگ ثانی نواب میر لائق علی خاں بہادر مرحوم مغفور نے مولانا سے تعلیم پائی تھی اور وہ مولانا کا بہت ادب کرتے تھے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد جب وہ مدار المہام ہوئے تو مولانا کو حکم دیا کہ آپ مجھے ہفتے میں دو مرتبہ آکر پڑھا جایا کیجئے۔ الامر فوق الادب مولانا جاتے لیکن نواب صاحب اول تو امیر اور پھر مدار المہام۔ گھنٹوں مولانا انتظار میں بیٹھے رہتے۔ آپ بُلاتے ہیں جب بلاتے ہیں۔ کبھی بُلایا کبھی نہیں بلایا۔ کبھی عدیم الفرصتی کا عذر کر دیا۔ کبھی بلایا بھی تو گپ شپ میں وقت کاٹ دیا۔ پڑھنا پڑھانا کام کی بات نہ دارد۔ ایک دو دن مولانا نے صبر کیا لیکن جب پے در پے یہی نوبت ہونے لگی تو مولانا نے عرض کیا "سرکار! آپ نواب بافضالِ الٰہی مدار المہام ہو گئے۔ اِس سے بڑھ کر اَور کیا رتبہ ہو سکتا ہے پھر اب پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ضرورت نہیں اور مجھے فرصت نہیں میں معافی کا خواستگار ہوں"

ہم کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بات نواب صاحب کو ناگوار ہوئی۔ اور پھر حاشیہ برداروں نے نمک مرچ لگا کر اس بات کو یونہی اِن طور پر کہی گئی تھی پولیٹیکل رنگ چڑھا دیا۔

(۷) نواب محسن الملک بہادر مرحوم عربی کے کچھ بہت بڑے عالم نہ تھے معمولی کتب درسیہ اُن کی نکل گئی تھیں اُنھوں نے کتابیں باقاعدہ نہیں پڑھی تھیں بعد کو مطالعے سے اتنی لیاقت بڑھائی جیسا کہ سب کو معلوم ہے مولانا سے اور نواب صاحب مرحوم سے بہت بے تکلفی تھی۔ مولانا کسی وقت اور کسی موقع پر اُن سے نہیں چوکتے تھے۔ بعض وقت ان دونوں صاحبوں کی بے تکلفی میں اَور لوگ بُرا مانتے تھے لیکن نواب محسن الملک بہادر نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ ایک روز وہیں حیدر آباد میں مولویت کا ذکر چل پڑا کسی نے اُسی جلسے میں "مولوی مہدی علی" کہا یہ سُن کر تو مولانا بولے کہ اگر مہدی علی مولوی ہیں تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں[1] ہے۔

(۸) جس وقت سرسالار جنگ ثانی شملے سے لَوٹتے وقت علی گڑھ تشریف لے جا رہے تھے تو نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں نے تار دے کر مولانا کو دہلی سے علی گڑھ بلوایا۔ علی گڑھ تو مولانا گئے نہیں۔ غازی آباد ہی پر جا کر مل لیئے۔ اسپشل ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور سرسالار جنگ مع اسٹاف کے ڈائننگ روم میں خاصہ تناول فرما

[1] چاند خاں ہمارے مولانا کا ایک قدیم ملازم تھا۔ اس کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی اور صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا اِس مناسبت سے اسے مولوی کے لفظ سے مخاطب کیا

مولنا کے مزاج میں غصہ معمول سے زیادہ ہوگیا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جتنے لوگ کھرے اور صاف ہوتے ہیں اُن میں غصہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔ غرض غصہ اپنی حدِ مقرر تو پہنچ گیا ہے لیکن مغلوب الغضب نہیں ہیں۔ غصہ بھی دیرپا نہیں ہے ادھر گرجے اُدھر برسے اِدھر اُبال آیا اُدھر بیٹھ گیا۔ دِل غبار اور کدورت اور کینہ اور بغض اور حسد سے پاک ہے۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ظاہر و باطن یکساں۔ کسی کی کوئی بات ناپسند ہوئی معًا چہرے اور طرزِ کلام سے انقباضِ خاطر ظاہر ہوگیا جب وہ بات گئی گزری ہوئی غصہ بھی ساتھ ہی ساتھ فرو ہوگیا۔ کسی بات کو دل میں رکھ کر میل کا بیل بنانے کی عادت نہیں۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ مولنا کی عادت نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جس کی بات ہوتی ہے اُس کے مونھ پر بلا خوف و خطر کہہ دیتے ہیں چاہے اِس میں کوئی ناراض ہو کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ نہ کسی کی خوشامد یا جھوٹی تعریف کرتے ہیں حتیٰ کہ حکام اور اپنے افسروں کے سامنے بھی وہ بے دھڑک کہہ بیٹھتے تھے۔

جود و سخا اور فراخ حوصلگی مولنا حاتم نہیں کہ اپنی کمائی کو بے موقع اور بے محل لُٹا بیٹھیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہم اُن کو کافرِ نعمت کہتے کیونکہ نعمت کی قدر نہ کرنا عین کفرانِ نعمت ہے۔ اُن کا روپیہ تن آسانی یا رسم و رواج نامشروع کی پابندی یا نام و نمود اور شیخی میں خرچ نہیں ہوتا نہ وہ ایسے لوگوں کو دیتے ہیں جو نا اہل ہوں جن کا کھایا پاپ نہ پُن۔ وہ اپنی ذات پر بھی عالی حوصلگی سے خرچ نہیں کرتے لیکن یہ نہیں کہ تنگی سے بسر کرتے ہوں۔ نہ پُرانے فیشن کا زرّیں لباس پہنتے ہیں نہ نئے فیشن کے سوٹ بوٹ میں رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ اُن کو مُمسک اور بخیل کہا کرتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے کا مولنا کو بُرا نہیں ماننا چاہیئے اس لیے کہ اس زمانے کے لوگوں نے بخل اور اسراف کے صحیح مفہوم ہی کو آج تک نہیں سمجھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں مولنا کی جو قیمتی رائے ہے وہ ناظرین کے سمجھانے کے لیے لکھ دی جائے تاکہ ہمارا خیال بخوبی اُن کے ذہن نشین ہوجائے۔ مولنا فرماتے ہیں کہ

"اسراف اور بخل کا ٹھیک حسّا تو خدا کے ہاں چل کر ہوگا اِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ مگر کوئی شخص اپنے طور پر اپنے خرچ کا احتساب کرنا چاہے تو جانچ کا گُر یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے میں مضایقہ کرنا بخل ہے اور واضح ہو کہ عباد میں سے ایک عبد یہ خود بھی ہے۔ اِس کے نفس کے بھی حقوق ہیں وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا + كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ اول خویش بعدہ درویش۔ یہ بات ہم نے اِس سے جتائی کہ بعضے کنجوس مکھی چوس ہوتے ساتے آپ بھی تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ بھلا اِس خصلت کے آدمی دوسروں کو کیا دیں۔ اِن سے بڑھ کر وہ ہیں کہ کسی کا دینا نہ دیکھ سکیں۔ تقاضائے وقت تو یہ ہے کہ مسلمان بہ نسبت بخل کے اسراف کے بارے میں نصیحت کے زیادہ محتاج ہیں وَبَعْضُ الشَّرِّ اَهْوَنُ مِنْ بَعْضٍ مگر پھر بھی بخل ہے تو خصلت مذموم۔ تو دیکھنا چاہیئے کہ بخل طبیعت میں کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔ بخل پیدا ہوتا ہے دون ہمتی سے۔ نا اُمیدی سے۔ یعنی بخیل آدمی آیندہ کی خوش حالی اور فارغ البالی کی طرف سے نا اُمید ہوکر

اُس کے لیئے ذخیرہ کرتا ہے اور بجائے اِس کے کہ آیندہ کے لیئے کوشش اور تدبیر کرے ہمت ہار بیٹھتا ہے حال آنکہ نقدرا بنسیہ گزاشتن کار خردمنداں نیست سے مزن فال بد کآورد حال بد * مبادا کسی کو زند فال بد * ایک عالم اس خبط میں مبتلا ہو کر اولاد کے لیئے اندوختہ کرتے ہیں۔ یہ نادان دوست درحقیقت ...... اِن کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اولاد کے لیئے بہترین ذخیرہ جو آدمی کر سکتا ہے یہ ہے کہ اولاد کو لائق بنائے۔ اُن کو کوشش کرنا سکھلائے ہم جد مصر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں امیروں کے خاندانوں کو پاتے ہیں کہ تباہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وجہ کیا کہ دولت کا کمانا تو درکنار اولاد کو دولت کی روک تھام کا سلیقہ تک نہیں سکھایا جاتا"۔

اِس مضمون کو سمجھنے کے بعد اب اِس امر کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ مولنٰنا کو جو لوگوں نے بدنام کر رکھا ہے تو اُن کا بدنام کرنا کہاں تک صحیح ہے۔ مولنٰنا اپنی آل اولاد اور کنبے والوں سے فراخ حوصلگی کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتے رہے ایک طرف وہ کنجوس مشہور ہیں یعنی بیہودہ اور لغو رسوم میں روپیہ برباد نہیں کرتے دوسری طرف اُن کے جود و سخا اور فراخ حوصلگی اور سلوک کی یہ حالت ہے کہ ہزارہا روپیہ انھوں نے علی گڈھ کالج اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں باوقاتِ مختلف بطور چندہ دے دیا۔ یعنی اپنی پونجی کے مطابق وہ رفاہِ عام اور قومی کاموں میں فراخ حوصلہ ہیں جس کو ضرورت مند دیکھتے ہیں ظاہر اور پوشیدہ دونوں طرح کی مدد سے دریغ نہیں کرتے مگر پیٹ بھروں کو اور جن کو ضرورت نہیں ہے محض نمایش اور اُن کے خوش کرنے کو البتہ نہیں دیتے۔ خواہ اس میں کوئی حاکم ہو یا اپنا کوئی عزیز قریب ہو یا دوست ہو یا کوئی ہو۔

اپنی والدہ۔ بھائی۔ بہنوں۔ بیٹے بیٹیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔ نہ اتنا دیا کہ وہ لوگ احدی ہو کر بے فکر ہو جائیں نہ ایسا ہاتھ کھینچا کہ اُن کو ضرورت ہو اور وہ تکلیف اٹھائیں بہرحال جس کو جیسی ضرورت ہوئی اُس کی کار برآری ضرور کر دی مگر چادر سے کبھی پاؤں باہر نہیں نکالے اور اس طرح کنبے قبیلے اور دوست احباب میں سے کوئی فرد بشر اُن کے فیضِ کرم اور مالی امداد سے محروم نہیں رہا قومی ہمدردی کی مثالیں اوپر لکھی جا چکی ہیں کنبے قبیلے کی مثالیں اور سنیئے۔

مولنٰنا کی چھوٹی لڑکی یعنی خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ جب وہ حیدر آباد میں تھیں تو اُن کے زیور کا صندوقچے کا صندوقچہ جس میں سات آٹھ ہزار روپیہ کا زیور تھا چوری گیا۔ مولنٰنا اپنی بیٹی کو اس صدمے سے مغموم نہ دیکھ سکے اور اُن کا کل زیور بنوا دیا۔ انھیں مولوی شرف الحق صاحب کے دونوں لڑکے بغرض حصولِ تعلیم ڈاکٹری ولایت چلے گئے اِن میں اتنا سکت کہاں دھرا تھا کہ دونوں لڑکوں کی تعلیم کا خرچ دے سکیں۔ مولنٰنا اُن کی عسرت دیکھ نہ سکے اور ایک لڑکے کی تعلیم کا کل بار اپنے ذمے لے لیا۔ اِسی طرح متعدد مواقع پر بہت کشادہ دلی سے مدد کی ہے جو ممسک سے محال ہے۔ ممسک کی صحیح تعریف یہ ہے کہ نہ خود خورد نہ بکس دہد۔ گندہ کند بہ سگ دہد۔ مولنٰنا کا شمار عقلمند منتظمین میں ہے جن کا اصول ہے۔ چیزے بخور چیزے بدہ۔ چیزے بنہ "نہ مال مفت دل بے رحم مال حرام بود بجائے حرام رفت"۔

بہرکیف مولنٰنا میں انتظام ہے تو موقع کا انتظام ہے۔ دل کھول کر بھی بعض اوقات وہ صرف کرتے ہیں مگر شادی بیاہ کی فضول رسموں میں روپیہ لٹانا انھیں پسند نہیں اور ظاہری ٹیم ٹام اور نام پر مرنے والے ایسے موقعوں پر مولنٰنا کو کنجوس سمجھتے ہیں۔ مولنٰنا نے جب اپنی بیٹیوں کی شادی کی تو اس میں کچھ شک نہیں کہ انھوں نے ٹھاٹ کیا اور فضول جہیز پر روپیہ

نہیں لگایا۔ انھوں نے بے ضرورت برتن دیئے نہ سینکڑوں جوڑے بلکہ اس کی جگہ نقد روپیہ دیا۔ زیور دیا۔ جائیداد دی۔ اور ایسا مستقل سلوک ہے کہ اُس کی آمدنی سے آج تک اُن کی لڑکیاں فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ لیکن مولنا کے سمدھیانے والے شاکی ہیں کہ ابھی تک مولنا کے اس سلوک سے خوش نہیں ہیں۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ کاٹ کباڑ کیوں نہیں دیا۔ بھاری بھرکم جہیز کیوں نہیں دیا اور اسی وجہ سے اُنھوں نے یہ پھبتی اُڑائی کہ "یہ ڈپٹی صاحب کے دل میں بل بند ہو گیا" مگر اُن کے ناعاقبت اندیش سمدھیانے والوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اُن کی لڑکیاں بجائے خود جواہر پارے ہیں۔ ان کے قدم سے گھر منور ہو گیا اب کوئی اُن سے پوچھے کہ یہ جواہر پارے اچھے ہیں یا وہ کاٹ کباڑ۔ لڑکیوں کے لیے سلیقہ شعاری سے بڑھ کر اور کیا جہیز ہو سکتا ہے۔

اسی طرح نواسیوں کے بیاہ برات میں بھی انھوں نے وقت پر لُو دھڑی نہ دی جس کی وجہ سے ساری برادری میں نکو بنے۔ اُنگلیاں اُٹھوائیں۔ لیکن آگے چل کر دو دو تین تین ہزار روپیہ ہر نواسی کو چپکے سے نقد دیا اور اسی طرح ہمیشہ مدد کرتے رہتے ہیں۔ کبھی زیور بنوا دیتے ہیں کبھی ہلکے گہنے کو بھاری کرا دیتے ہیں۔ مولنا کو اس بات کی کچھ پروا نہیں کہ کوئی کیا کہے گا وہ جب مدد کا موقع دیکھتے ہیں تو ضرور مدد کرتے ہیں اور اچھی مدد کرتے ہیں۔ ؎

شہرت نہ بکیں اپنے حق میں کانٹے بوئیں — نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گو بخل یہ لوگ اُن کے نہیں بہتر ہے — اِس سے کہ فضولیوں سے اُن کی روئیں

براحوالِ آں کس بباید گریست — کہ دخلش بود نوزدہ خرج بیست

مادۂ انتقام بظاہر لوگوں کو معلوم ہوتا ہو گا کہ مولنا میں انتقام کا خیال قوی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اُن کا سینہ کدورت کے کینے سے پاک ہے انتقام کا خیال اُن کے دل میں مطلق نہیں لوگوں کو غالباً مولنا کے اس غصہ آمیز ارشاد سے دھوکا ہوا ہو گا جو اُنھوں نے ایک مرتبہ لاہور کے کسی لکچر میں فرمایا تھا۔ کہ

"یہ بھی (لاہور) وہ جگہ ہے جہاں میں توحید کے بارے میں ہر سال کچھ نہ کچھ کہہ جاتا ہوں اور یہی وہ مضمون ہے جس کے صلے میں تمہارے اِسی شہر سے مجکو "نیچری بھانڈ" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ یاد ہے یا نہیں۔ وقت نہیں ہے۔ ورنہ اُسی مضمون کو میں اور شد و مد کے ساتھ پھر بیان کرتا۔ اور پھر تم سے کوئی اور پھڑکتا ہوا سا خطاب لیتا۔ اور عدالت میں مقدمہ دائر کر کے اُس کی رجسٹری کراتا۔ میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں اور جب تک مقدمہ دائر کرنے کے لیے میری جیب میں پیسے ہیں نہیں بلکہ جب تک زندہ ہوں کہا کروں گا کہ ہم مسلمانوں کی ہم ہی موحد کا کلمہ بھرنے والوں کی توحید بھی ویسی ہی ہے اور اسی کے قریب قریب معتزلہ کی ہے جیسی اہل کتاب کی اور جیسی اُن لوگوں کی جن کو ہم مشرک اور بت پرست بتاتے ہیں۔"

بالکل اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔

"وہ بات یہ ہے کہ کانفرنس میں آنے اور بات کرنے کو بھی طبیعت مضائقہ کرتی ہے کیا فائدہ ہے بیہودہ بکواس کرنے سے جب کہ شروع سے آج تک کسی ریزولیوشن کی پوری پوری تعمیل نہیں ہوئی۔ مسلمان کسی صلاح پر کاربند نہیں ہوئے ورنہ میرے دل میں تھا کہ زیادہ نہیں تو اخباروں کے بارے میں میں بھی ایک ریزولیشن پیش کرتا کہ یہ تعلیمی کانفرنس کے

اور اخبار بھی تعلیم کا ایک قومی ذریعہ ہے تو کیوں کانفرنس اُن کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اخباروں کی جیسی ردی حالت ہے وہ ظاہر و آشکارا ہے اور میں نے اِس کے شواہد بھی جمع کیے تھے مگر ان دنوں میرے پاس فنڈ کی کوتاہی ہے۔ شواہد پیش کروں تو اخبار والے ضرور گالیاں دیں جیسی اُن کی عادت ہے اور گالیاں دیں تو میں ضرور انتقام لوں جیسی میری طبیعت ہے"۔

لیکن مولانا کے یہ سب مقولے برائے گفت ہیں ایک بھی ان میں برائے کرد نہیں۔ ؎ کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن ٭ آئینِ ما است سینہ چو آئینہ داشتن ٭ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ کبھی کبھی غصہ بھڑک اُٹھتا ہے وہ بھی ناحق اور ناروا باتوں پر مگر اس قسم کے غصے کا سلسلہ دیرپا نہیں ہے۔ فوراً عفو و درگزر آگے بڑھ کر غصے کی آگ پر پانی ڈال دیتا ہے۔ اور غصہ فوراً ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ اور یہ جو ایک مرتبہ منشی محرم علی صاحب[1] چشتی سے مقدمہ چھڑ گیا حقیقت میں یہ کوئی انتقام نہ تھا۔ بلکہ لوگوں کی درشتی بدزبانی اور اذیتِ ناحق کا سدِّ باب تھا۔ اگر فی الواقع یہ انتقام ہوتا تو مولانا دس ہزار روپیہ خرچ کرکے اور تکلیف مالایطاق برداشت کرکے دو ایک دوستوں[2] کے کہنے سننے سے منشی صاحب کو معافی نہ دیتے۔ منشی محرم علی صاحب چشتی نے اپنے معافی نامے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ ہمارے دعوے کا بیّن ثبوت ہے اور اسی وجہ سے ہم اُس کو بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں۔ ٭

معافی نامہ میں محرم علی چشتی نہایت عاجزانہ طور پر سچے دل سے مولوی نذیر احمد صاحب سے معافی کا ملتجی ہوں۔ مجھے نہایت ہی رنج ہے کہ میں نے اپنی تحریرات میں اُن کی نسبت متعدد سخت الفاظ اور بلا موقع اور نا ملائم اور بے جا فقرے اور گالیاں لکھیں جس کی وجہ سے اُن کو رنج اور تکلیف ہوئی۔ اِن سب کی تلافی جو کچھ مجھ سے ممکن ہے میں سچے دل سے اور نہایت انکسار سے بذریعۂ اس تحریر کے کرتا ہوں اور یقین واثق دلاتا ہوں کہ آیندہ کسی قسم کی بے جا تحریر اُن کی نسبت شائع نہ کروں گا اور نیز صفحہ اول رفیق ہند میں اِس تحریر کو چھاپنے کے علاوہ اخبارات پنجاب میں جن کی تفصیل ۱۹ اپریل ۱۸۹۳ء کے رفیق ہند میں ہے اور جنھوں نے مولوی صاحب کے برخلاف لکھا ہے ایک ایک بار معافی کو مشتہر ہونے کے لیے بھیجدوں گا۔ نیز یہ اقرار ہے کہ میری طرف سے جس قدر استغاثے مولوی صاحب پر دائر ہوئے ہیں اُن سب میں باز دعوی داخل کردوں گا۔ میں نہایت افسوس اُن بے جا دلائل اور لاطائل الفاظ کی نسبت کرتا ہوں جو میں نے اپنی تحریرات میں استعمال کیے۔ مولوی صاحب نے مقدمہ کا خرچہ معاف کردیا ہے۔ راقم محرم علی چشتی ۱۹ جون ۱۸۹۳ء۔ مقام لاہور۔

دستخط انگریزی رام ناتھ مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

---

[1] منشی محرم علی صاحب چشتی اڈیٹر رفیق ہند۔ پنجاب میں ایک مشہور ادیب ہیں۔ اُن کے قلم میں بڑا زور ہے۔ لیکن افسوس بعض اوقات وہ زور بدزبانی تک پہنچ جاتا ہے۔ ؎ گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر ٭ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی ٭ مولانا نے ایک سال لاہور میں "فطرۃ اللہ" ایک لکچر دیا تھا یہی وہ لکچر ہے جس پر منشی صاحب نے ناواجب اعتراض کرتے ہوئے مولانا کو گالیاں دینی شروع کیں۔ تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ منشی صاحب ایک بزرگ ہیں پیر پرست۔ لکچر میں چونکہ توحید پر زیادہ زور دیا گیا ہے ان کو ناگوار ہوا۔ اور اپنے اخبار میں حسرت افسوس الفاظ لکچرار کی نسبت لکھے اور مشتہر کیے اِس پر مولانا نے صلاح و مشورہ کرکے اُن پر مقدمہ دائر کیا۔ آخر منشی صاحب نے جب دیکھا کہ بساط اُلٹی چاہتی ہے اور اُلٹی پھانسی گلے میں پڑنے والی ہے تو مولانا کے دوستوں کی خوشامد شروع کی تاکہ مولانا معاف کردیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۲

[2] خان بہادر برکت علی خان صاحب مرحوم اور مولانا کے دوسرے ذی وجاہت احباب درمیان میں پڑ گئے۔ مولانا تو سہارا ڈھونڈتے ہی تھے ان لوگوں کے کہنے سے منشی صاحب کا قصور معاف کردیا ۱۲

با صاف دل مجادلہ با خویش دشمنی است | ہر کس کشد بر آئینہ خنجر بہ خود کشد
سینہ صافاں را مسخرہ مے کنی ہشیار باش | خندہ بر آئینہ کردن ریش خند خود بود

بہر حال اس معافی نامے کے دیکھنے کے بعد یہ راز بالکل منکشف ہو جاتا ہے کہ اگر درحقیقت مولنا میں مادۂ انتقام ہو تو کہاں کی معافی اور کہاں کے خان بہادر برکت علی خاں مرحوم جس شخص نے دس ہزار روپیہ اس مقدمے میں صرف کیا ہو وہ اس سہل طریقے سے ایک سخت گستاخی کی معافی دیدے اور ایک پیسہ خرچے اور ہرجے کا نہ لے۔ پس ہمارے نزدیک مولنا پر یہ ایک قسم کا اتہام ہے کہ ان میں عنصر انتقام زیادہ ہے۔ ہاں اتنی بات بے شک ہے کہ ناواجب ناروا اور ناحق اغراض کی برداشت بالکل نہیں۔ فوراً طبیعت میں غصے کا ایک ابال اٹھتا ہے اور جب سخت سست الفاظ سے دل کا بخار نکل جاتا ہے تو بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ مولنا ہی کے سینہ کو سینۂ بے کینہ کہہ سکتے ہیں ہم کو سیکڑوں ایسے واقعات معلوم ہیں کہ لوگوں نے ان کو مالی نقصان پونہچائے ہیں اور اب بھی برابر پونہچاتے رہتے ہیں اور نہ صرف مالی نقصان پونہچائے ہیں بلکہ درپئے آب روبھی ہوئے ہیں۔ رفیق ہند کے بعد ایک اَور اخبار میں اشاعت ترجمۃ القرآن کے وقت مولنا کو کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن مولنا صبر و سکون کے ساتھ بیٹھے رہے اور کہتے رہے کہ ع در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست ✣

مولنا کے ملنے والوں میں ایک شخص ہیں جن کی نسبت مولنا کا مقولہ ہے کہ "یہ شخص مجموعۂ تعزیرات ہند کی کل دفعات کا مجموعہ ہے" یعنی یہ صاحب بڑے بدمعاش اور شراب خوار۔ اور جواری اور کیا اور کیا ہیں۔ باوجودے کہ یہ شخص مولنا کا ہزاروں روپیہ کھا چکا ہے مگر اب بھی مولنا کو دھوکا دے دے کر روپیہ لے جاتا ہے پھر نہیں معلوم مولنا کو کیا پٹی پڑھا دیتا ہے کہ اُن کا دل فوراً صاف ہو جاتا ہے۔ ان واقعات کے معلوم ہونے کے بعد کون شخص ہے جو مولنا کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ اُن میں انتقام کا عنصر غالب ہے ✣

حبِّ جاہ یہ تو ہم کیوں کر کہیں کہ مولنا میں حب جاہ نہیں۔ دنیا میں کوئی بندہ لبشر ایسا نہ ہوگا جس میں حبِّ جاہ نہ ہو انسان میں حبِّ جاہ کا ہونا لازمۂ انسانیت ہے اگر انسان میں یہ صفت نہ ہو تو ہم اس کو ناقص الخلقت کہیں گے۔ کون شخص چاہتا ہے کہ ہمارا رتبہ بلند نہ ہو۔ مگر ہاں بلند نظری عالی حوصلگی اور خودداری کے ساتھ حبِّ جاہ ہے۔ جھوٹی خوشامد اور گھس بیٹھ سے انھوں نے حبِّ جاہ کا کبھی خیال نہیں کیا بلکہ وہ ضرورت سے زیادہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ جب ملازم تھے تو اپنے بالادستوں سے بہت کم ملتے تھے۔ بعض نافہم ان کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ اپنی لیاقت پر گھمنڈ ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کوئی پاکیزہ خیال آدمی ذلیل طور پر کسی کی خوشامد نہیں کرے گا۔ ہر شخص کو سلف ریسپکٹ کا خیال رکھنا چاہیئے مولنا کی زندگی پر ہم اول سے آخر تک نظر ڈالتے ہیں تو کہیں بھی ہم کو شائبہ خوشامد نہیں ملتا۔ مولنا نے حیدرآباد کی ملازمت کے لیے کوئی دوا دوش نہیں کی جیسی فی زمانناً لوگ کیا کرتے ہیں۔ وہ خود بخود وہاں بلائے گئے اور گئے تو کس مضائقے اور خودداری کے ساتھ وہاں بھی وہ سب سے الگ تھلگ رہے نہ پولٹیکل سازشوں میں شریک تھے نہ اور کسی قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے تھے جب وہاں سے چلے تو کس بے پروائی سے چلے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ملازمت پر لات مار کر چلے آئے۔ شمس العلماء کا

گھر بیٹھے بن گئے کبھی کسی کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر یا لفٹننٹ گورنر سے مل کر سفارش نہیں کرائی نہ دوڑ دوڑ کے صاحب بہادر کی کوٹھی پر گئے۔ نہ کبھی انھوں نے ڈالیاں نذر کیں تدنوں انھیں دہلی کے حکام نے جانا بھی نہیں کہ یہ کون ہیں نہ وہ گئے۔ نہ آپ جانتے ہیں۔ لوگوں نے پنشن لینے کے بعد بہتیرا ابھارا کہ آپ بے کار ہیں کیوں کر زندگی بسر کریں گے۔ شہر کی آنریری مجسٹریٹی کر لیجئے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ میں حقیقی مجسٹریٹی چھوڑ کر بیگاری آنریری مجسٹریٹی کیا کروں گا علیٰ ہذا اڈنبرا یونیورسٹی کا خطاب ایل ایل ڈی بھی گھر بیٹھے بلا طلب مل گیا۔ مولانا نے اس کے لیئے ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ سر ولیم میور سابق لفٹننٹ گورنر جنھوں نے متعدد کتابوں پر مولانا کو انعام دیا وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے پرنسپل تھے اور مولانا کی لیاقت سے بخوبی واقف تھے انھیں کی تحریک پر مولانا کو یہ خطاب ملا پس مولانا میں حبِّ جاہ تو ہے مگر چاپلوسی اور خوشامد نام کو نہیں ؛

دیانت داری

مولانا جب تک برٹش گورنمنٹ کے سروس میں رہے ایک اعلیٰ درجے کے دیانت دار عہدہ دار مشہور تھے۔ حیدر آباد کی ریاست میں جہاں مشہور ہے کہ چُن چُن ہی وہاں بھی اُن کی دیانت داری کا عام طور پر شہرہ ہے اور ہم کو اچھی طرح علم ہے کہ وہاں بھی وہ جادۂ استقامت سے نہیں ڈگمگائے گو بعض لوگ اس رائے کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ دکن میں کبھی کبھار رشوت لی ہے اور اس طرح چار لاکھ روپیہ یہاں سے لے گئے۔ لوگوں نے ایک یہ بھی غلط روایت مشہور کر رکھی ہے کہ حیدر آباد میں اپنے ایک دوست سے وہ کہتے تھے کہ بھئی میری رشوت خواری کی نسبت لوگ بہت کچھ کہتے ہیں مگر اُس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ پکی عمارت میں کہیں کہیں دس بیس کچی اینٹیں بھی لگ گئی ہیں۔ لیکن یہ سب روایتیں بے بنیاد ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حیدر آباد کی ریاست میں دیانت کی کچھ قدر نہیں اور بد دیانتی کا بازار بہت گرم مشہور ہے حتّیٰ کہ بڑے بڑے یوروپین عہدہ دار بھی لوگوں کی بدگمانی کی چھینٹ میں آ گئے ہیں۔ وہاں کی ملازمت ایک کالک بھری کوٹھری ہے جو شخص گھسا وہ کالا ہوا اس کو ضرور کالک لگے گی مثل مشہور ہے کہ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد بڑے بڑے ٹکسالی دیانت دار جیسے نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین صاحب بھی لوگوں کی بدگمانیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مَا نَجَا اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ مَعًا ۔ مِنْ لِسَانِ الْوَرٰی فَکَیْفَ اَنَا

غرض لوگوں کی عجب حالت ہے کہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکتے ہیں۔ حال آنکہ حیدر آباد میں اس وقت بھی بعض ٹکسالی ایسے دیانت دار ہیں کہ جن کا جواب نہیں۔ مثلاً نواب مقتدر الدولہ بہادر صوبہ دار۔ سید سراج الحسن صاحب۔ امیر نواز جنگ بہادر صوبہ دار وغیرہ وغیرہ اسی طرح ہمارے مولانا بھی دیانت دار رہے۔ البتہ اُن کے بعض عزیزوں نے بے عنوانیاں ضرور کیں جس کی وجہ سے کچھ شک و شبہہ بعض لوگوں کو پیدا ہو گیا۔ لیکن ہم نے جہاں تک تحقیقات کی ہم کو تو یہی معلوم ہوا کہ مولانا بہت راست باز اور ہاتھ کے سچے رہے کبھی اُن کے دامانِ دیانت پر رشوت کا داغ نہیں لگا۔ اس کھرّے مزاج کا آدمی بد دیانت ہو نہیں سکتا۔ بھلا بد دیانت شخص کہیں ایسا جری اور مونھ پھٹ ہو سکتا ہے جو کسی کی لگی لپٹی نہ رکھے بلکہ وہ بزدل شخص ہر کس و ناکس سے دب کر ملنے والا اور خائف ہوگا ؛

جو حکام رشوت ستانی کرتے ہیں اُن کا سلسلہ دستِ غیب چپراسیوں اور نذکوریوں تک پہونچتا ہے۔ ایسے نالائق حاکم اپنے افسرانِ اعلیٰ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اپنے ایک ادنیٰ چپراسی سے کیونکہ وہ چپراسی منشی کے کرتوتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے لیکن ہمارے مولٰنا کی کیا حالت تھی کہ نہ انھوں نے خود کبھی رشوت لی اور نہ اپنے ماتحت افسروں اور عملوں کو بلکہ چپراسیوں تک کو لینے دی ؛

رشوت تو بڑی چیز ہے مولٰنا تو اس بارے میں یہاں تک سخت تھے کہ ایک دن کہیں اتفاق سے اپنے دورے کے زمانے میں اُن کو یہ معلوم ہوگیا کہ حکام ماتحت نے اور حکام ماتحت کے متفذ عملوں نے بطور انعام مولٰنا کے عملے کو حسب قاعدۂ مروجہ انعام میں کچھ زرِ نقد دیا ہے۔ مولٰنا کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو لینے اور دینے والوں کے ساتھ جو سلوک کیے تھے وہ ذیل کے ایک حکم سے معلوم ہوگا۔

برائے اطلاع تمامی عہدہ داراں و عمالِ اضلاعِ سمتِ شمالی۔

ایں صاحب تعلقہ دار بہ کمال تاسف دریافت کردہ است کہ حوالیان و خدمت گاران کہ در دورہ ہمراہ من بودند از اکثر عہدہ داران و عمالِ مفصل بطریقِ انعام مبلغے بہ قدر مقدور ہر یک گرفتہ اند ایں معنی دلیل بد دیانتی گیرندگان و ضعف دہندگان ست و ایں گونہ انعام نیست مگر داخل رشوت و ہر کہ داد و دہش بے جا مضایقہ نفرماید البتہ در اخذ و جبر نہار و اہم تامل نہ نماید۔ آیندہ اگر امثالِ ایں واقعہ مسموع شد از گیرندہ و دہندہ ہر دو مواخذۂ رشوت کردہ خواہد شد۔ ایں حکم را بتمامی ملازمان ابلاغ می باید کرد۔ سلخ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ (دستخط نذیر احمد)

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا | شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق | آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

بے تعصبی و انصاف

میرے خیال میں مولٰنا کے مزاج میں تعصب کا پتہ مطلق نہیں مولٰنا کا مقولہ ہے کہ "مذہب ایک معاملہ ہے خدا اور بندے کے درمیان۔ کسی دوسرے کو کیا حق ہے کہ اس میں دست اندازی کرے۔" اس لیے وہ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ شیعہ۔ سنی سب سے یکساں برتاؤ کرتے رہے۔ مذہبی بے تعصبی کا ذکر حصۂ ششم میں تفصیل سے آئے گا جہاں اُن کے مذہب پر شرح و بسط سے بحث کی جائے گی۔ یہاں دوسرے قسم کی بے تعصبی اور انصاف کا اختصار کے ساتھ حال درج کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مولٰنا کے مزاج میں رعایت مروت اور جھوٹی تعریف نہ کبھی تھی نہ اب ہے۔ اُن کے فیصلے انصاف کا نمونہ ہیں ہٹ دھرمی یا ضد یا اپنی بات کی پچ اُن میں نام کو نہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولوی سلطان محی الدین صاحب تعلقہ دار اندور جو پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کام میں بہت سست تھے اِن کی نسبت سالانہ رپورٹ میں صاف لکھ دیا کہ وہ تعلقہ دار اندور بہیدی کو سیند لیکن تو باقی کو بند مولٰنا کی سفارش اور شکایت بے لوث ہوتی تھی یہ نہیں کہ کسی کی اگر ایک مرتبہ شکایت کی تو پھر سفارش سے پرہیز کیا ہو۔ چناں چہ انھیں کی سستی کام کی شکایت کی اور ان کا تنزل کرا دیا۔ چند ہی دن کے بعد پھر اِن کی سفارش کی جس پر مولٰنا کے مخالفین نے اعتراض کیا اور بڑے معترض دستور رتن جی ایدا صاحب معتمد مال گزاری تھے پہلا علم

شدہ شدہ سر سالار جنگ کے کان تک پہنچا۔ اُنھوں نے مولٰنا سے پوچھا۔ مولٰنا نے عرض کیا کہ دونوں باتیں صحیح ہیں پہلے فی الواقع وہ ایسے ہی کاہل اور سست تھے مگر اب جو میں نے بحالتِ دورہ اُن کا کام دیکھا تو پہلے اور اب میں آسمان و زمین کا فرق پایا۔ پس صرف اس خیال سے کہ میں اُن کی شکایت کر چکا تھا اگر اُن کے کام کی واجبی تعریف نہ کروں تو انصاف کا خون کرنا ہے لہٰذا میں نے اِن کی تکمیل تنخواہ کی سفارش کر دی اور جو سفارش کی ہے وہ درست ہے۔ چنانچہ سر سالار جنگ نے اِس توجیہ کو پسند کیا اور سلطان محی الدین صاحب کی تکمیل تنخواہ کی منظوری دے دی۔

علیٰ ہٰذا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کرشنا بھیم راؤ جیو صاحب اول تعلقہ دار ضلع ایلگندل نے کچھ موقت حسابات بروقت نہ بھیجے تھے۔ مولٰنا نے نہایت سختی سے حکم دیا کہ جب تک وہ تختہ جات نہ آئیں صاحب ضلع اپنی تنخواہ نہ اٹھائیں۔ ممالک دکن میں جہاں رعایت اور مروت اور سفارش کی بھرمار ہے وہاں ایسی سختی سے کس کے کان آشنا تھے مولٰنا نے اس خیال سے کہ کلکٹر ضلع کی تنخواہ روک دی گئی ہے یہ بات نامناسب ہو گی کہ وہ تنخواہ نہ لیں اور میں لوں اخلاقاً خود بھی تنخواہ نہ لی۔ یہ اور تعلقہ دار پر ناز یانہ ہوا کہ صدر تعلقہ دار نے میرے سبب سے خود بھی تنخواہ نہ لی۔ غرض وہ کاغذات آ گئے بات رفت گزشت ہوئی۔ الغرض انصاف کے سامنے وہ کسی کی رتی بھر بھی پروا نہیں کرتے تھے۔

نواب محسن الملک بہادر مرحوم نے اپنے ایک عزیز کو مولٰنا کی مددگاری میں دیا۔ جب کہ مولٰنا بورڈ کے ممبر تھے نواب صاحب کے عزیز دائم المرض تھے اور لیاقت بھی معمولی تھی۔ مولٰنا نے کچھ دن لفظم لشتم اُن کو چلایا مگر وہ چل نہ سکے اُنھوں نے نواب محسن الملک سے شکایت کی۔ مولٰنا نے بھی صاف کہہ دیا کہ میری مددگاری میں ایسے نا اہل کو کیوں دیا۔ نتیجہ اِس کا یہ ہوا کہ نواب محسن الملک بھی کبیدہ خاطر ہو گئے اور اُنھوں نے اِس کا معاوضہ یوں نکالا کہ مولوی شرف الحق صاحب اور مولوی عبدالواحد صاحب دونوں کو ایک ساتھ تخفیف میں ڈال دیا۔ اور یہی بنا بگاڑ اور حیدرآباد سے قطع تعلق کی ہوئی۔

اِسی طرح ایک مرتبہ مولٰنا نے ایک عہدہ دار کی نسبت لکھا "سرے دار دبے دماغ" غرض جس کی جو حالت تھی بلا رو رعایت لکھ دیتے تھے اور جب کہنے پر آتے تو کوئی شخص اُن کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔

وفاداریِ گورنمنٹ ہمارے خیال میں مولٰنا گورنمنٹ برطانیہ کے اعلیٰ درجے کے وفادار اور خیر خواہ ہیں سلطنت انگریزی سے بہتر وہ دنیا میں کسی سلطنت کو نہیں جانتے اسلامی سلطنتوں کا مذکور تو الگ رہا وہ ولایتی سلطنتوں میں بھی کسی کو برطانیہ سلطنت کے مقابلے شمار نہیں کرتے اس سے بڑھ کر اور کیا وفاداری ہو گی۔ مس لیین کا واقعہ ناظرین پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب ہم ذیل میں مولٰنا کے چند خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت لکھتے ہیں اُمید کہ ناظرین مولٰنا کے ان خیالات سے صحیح صحیح نتیجہ ہی نکالیں گے کہ دنیا میں وہ کسی سلطنت کو برٹش گورنمنٹ پر ترجیح نہیں دیتے۔ قبل اس کے کہ مولٰنا کے نمبروار خیالات لکھے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک فقرہ نقل کر دیا جائے تاکہ اس امر کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے کہ برٹش گورنمنٹ کی نسبت جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ خوشامدانہ نہیں ہے بلکہ بالکل آزادانہ ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "بارہ برس ہوئے کہ مجھ کو برٹش گورنمنٹ سے ایک بے تعلقی سی ہے مگر مجھ پر برٹش گورنمنٹ کے حقوق ہیں برٹش گورنمنٹ نے مجھ کو پڑھایا عزت دی۔ نوکری دی میں اُس کی رعیت ہوں وامن و آسایش اور آزادی سے علی وجہ الکمال متمتع۔ باایں ہمہ برٹش گورنمنٹ کا بھاٹ نہ کبھی تھا نہ اب ہوں۔ میں

جانتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں"۔ اب مولانا کے چند خیالات ملاحظہ ہوں۔

(۱) "ہندوستان کی عافیت اسی میں ہے کہ کوئی اجنبی حاکم اس پر مسلط رہے جو نہ ہندو ہو اور نہ مسلمان۔ پس ہو نہ ہو کوئی سلاطینِ یورپ میں سے ہو۔ سلاطینِ یورپ میں کون ہے جس نے سلطنتِ ہندوستان کی طمع نہیں کی۔ فرنچ۔ پورچگیز۔ ڈچ اپنی اپنی جگہ سب نے زور آزمائیاں کیں۔ حضرت شہنشاہِ روس کے خاندان میں تو پیٹر دی گریٹ؎ کے وقت سے یہ مرض نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آتا ہے کہ جس طرح بن پڑے ہندوستان پر قبضہ کیجیے۔ مگر خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز یہاں بادشاہ ہوئے"۔

(۲) "رعایائے ہندوستان میں ہم مسلمانوں سے بھی بڑھ کر کسی قوم کو سلطنت کے پھر حاصل کرنے کی خواہش ہو سکتی ہے۔ ہم سے سلطنت چھینے ہوئے بہت سے بہت تین چار پشتیں ہوئی ہوں گی۔ جب کہ دوسری قوموں کی بیس بیس پچیس پچیس پشتیں غلامی میں گل گئیں۔ ہماری سلطنت کے آثار مدھم پڑ گئے ہیں مگر مٹے نہیں۔ اس کا وہ غل نہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ مگر بھنبھناہٹ سی اب بھی ہے۔ جب کہ دوسری قوموں کے پاس شاہنامے کا ایک افسانہ ہے اور بس۔ مسلمان سلطنت کو اس طرح یاد کرتا ہے جیسے ایک سال کا دودھ چھوٹا ہوا بچہ دودھ کو۔ اس کے مقابلے میں دوسری قوم کا بڈھا پھونس ہے اور اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اس نے بچپن میں دودھ پیا تھا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ با ایں ہمہ ہم بھی سمجھ دار ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جن دنوں ہم کو حکومت حاصل تھی۔ حاصل تھی باستحقاق۔ اب اگر چھن گئی ہے تو چھن بھی گئی ہے باستحقاق۔ اب زمانے کا وہ اگلا سا رنگ نہیں رہا۔ دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ ہم میں سلطنت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں کہ اس کی آرزو کریں۔ زوالِ سلطنت کچھ بچوں کا کھیل نہیں۔ کہ تھی تھی۔ نہیں تو نہیں سہی۔ سلطنت کے مٹ جانے سے قومیں مٹ گئی ہیں۔ گویا سلطنت قومی زندگی تھی۔ شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عمل داری میں ہم کو اپنی سلطنت سے زیادہ آرام و آسایش ہے۔ اب اگر ہم مٹتے ہیں اور مٹنے میں باقی ہی کیا ہے تو اپنی کاہلی اور نااہلی سے"۔

(۳) "ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عمل داری میں آنکھ کھولی ہے خدا اس کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔ تو پہلی عمل داریوں کی بے چینیاں۔ روز کی لوٹ مار۔ ڈاکے۔ بے اطمینانی۔ بدامنی۔ حاکموں کے ڈنڈ۔ چٹی۔ بیگار۔ ہنگامے۔ خانہ جنگیاں۔ قحط۔ وبا دیکھی نہیں۔ اور خدا دکھائے بھی نہیں تو کسی قدر بزرگوں سے سنیں اور بہت کچھ کتابوں میں پڑھیں مجھ کو تو حیرت ہوا کرتی ہے کہ ایسی بدعملیوں میں نسلِ آدم منقطع کیوں نہیں ہو گئی۔ اب چشم بددور ایک عمل داری ہے کہ شیر بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا۔ ایک شاعری خیال تھا یہاں ہر جگہ اور ہمہ وقت یہی ہو رہا ہے۔ جیسا کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی۔ یا دوسرے بلاد میں جو گورنمنٹ سیٹ؎ ہیں ویسا ہی پہاڑ کی کھوہوں میں جنگلوں میں شہروں میں قصبوں میں۔ گاؤں میں آبادی میں۔ ویرانے میں۔ ریل۔ تار برقی۔ ڈاک۔ مدرسے۔ شفاخانے۔ نہریں۔ کلیں۔ انواع و اقسام کے ساز و سامانِ زندگی۔ ہر طور کے انتظام۔ ہر طرح کے بندوبست میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بہتر اور کیا عمل داری ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھتے رہے۔ اترسوں سے پرسوں بہتر تھا۔ پرسوں سے کل۔ کل سے آج۔ اور آج سے ان شاء اللہ آنے والا کل ضرور بہتر ہو گا۔ اور کل سے پرسوں۔ پرسوں سے اترسوں اور اسی طرح

؎ یہ شخص شاہانِ روس میں سب سے بڑا نامور شخص ہے ۱۲ ۱۷۲۵ء دار السلطنت گورنمنٹ ۱۲

برسوں برسوں" (۱۴) ہم انگریزوں کے مستامن ہیں اور ان کی عمل داری میں ہم کو ہر طرح کا امن ہے۔ ہر طرح کی آسائش ہے اور جہاں تک رعایا کو آزادی ہو سکتی ہے آزادی بھی ہے۔ اور مَن لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ کی رو سے ان کی خیر مناتے رہنا بھی ہمارا فرضِ اسلامی ہے"۔

برٹش گورنمنٹ کے انتظامات پر اعتراضات

ممکن ہے کہ ناظرین میں سے کوئی شخص ان وفادارانہ خیالات کو دیکھ کر مولنا کو گورنمنٹ کا بھاٹ اور خوشامدی قرار دے۔ لیکن مندرجۂ ذیل خیالات اس مرضِ وہم کی کافی دوا ہیں۔ ان خیالات میں برٹش گورنمنٹ کے انتظام پر اعتراضات ہیں۔ اس کے مقرر کردہ حکام پر اعتراضات ہیں مگر سب کے سب نیک نیتی اور صلاح و مشورے کے طور پر نہ کہ باغیانہ اور ہیکڑی اور زبردستی کے جیسے ہمارے ملک کے نادان یارانِ وطن اہلِ کانگرس اعتراض کیا کرتے ہیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ لڑتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اعتراضات کو نمبروار لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولنا کا ایک فقرہ طریقۂ اعتراضات اور نکتہ چینی کے متعلق لکھ دیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "برٹش گورنمنٹ انسانی گورنمنٹ ہے اور کون انسان ہے جس سے بھول چوک نہیں ہوتی۔ گورنمنٹ کی نکتہ چینی داخل بدخواہی نہیں مگر نکتہ چینی کے بھی طریقے ہیں...... مگر نیشنل کانگرس کا نیا طریقہ تو کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گورنمنٹ کی مخالفت میں ایک گروہ جمع ہو سوتی بھڑیں جگائی جائیں جو لوگ امن چین سے اپنے اپنے کام دھندوں میں لگے ہیں چونک پڑیں کہ الٰہی کیا آفت نازل ہوئی جس کی وجہ سے یہ تمام کھلبلی مچ رہی ہے"۔ اب نکتہ چینیاں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ سرکار کے بہت سے انتظام اصلاح طلب ہیں جن میں سے ایک بڑا ضروری انتظام لیاقت کے اسٹینڈرڈ کا ٹھیرانا ہے۔ انگریزوں نے اپنی ولایت پر قیاس کر کے صرف یونیورسٹی کی ڈگری کا معیارِ لیاقت ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ ہماری سوسائٹی کو زیر و زبر کر رکھا ہے۔

(۲) میں گورنمنٹ کے کسی انتظام کو اتنا ناقص و قابلِ اعتراض نہیں پاتا جتنا انتظامِ تعلیم کو۔ تمام تعلیم کو گورنمنٹ نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے اور جب رعایا کو آپ اپنی تعلیم کے سنبھالنے کا سلیقہ نہ ہو تو بلاشبہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا انتظام کرے۔ لیکن گورنمنٹ نے جو کچھ اب تک کیا ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ نوکریاں پا گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ خوش بھی ہیں اور اکثر بے معاش پڑے پھرتے ہیں نوکری ملتی نہیں اور سوائے نوکری کے نہ ان سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ ان کو کوئی کام آتا ہے یہ لوگ تعلیم کے بڑے خطرناک نتیجے ہیں۔

(۳) آدمیوں کی طبیعتیں اس قدر مختلف واقع ہوئی ہیں کہ سب کو ایک طرح کی تعلیم دینے سے فائدے کے عوض الٹا نقصان ہوتا ہے اور یہ حال دنیاوی تعلیم کا ہے وہی دینی تعلیم کا بھی ہے۔ ہمارا سررشتۂ تعلیم کیا غلطی کر رہا ہے۔ یہی کہ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتا ہے جس کا پیش رس ہے نیشنل کانگرس۔

(۴) انگریزی عمل داری میں سب خوبیاں ہیں مگر رعایا کے اندرونی حالات سے حکام انگریزی کا ناواقف ہونا بڑا نقص ہے۔ بے شک اس کا انتظام مشکل ہے مگر ایسی ہی مشکلات پر غالب آنے کا معاوضہ ہے سلطنت۔ اور یوں ٹوٹا پھوٹا انتظام کیا پہلے نہ تھا یا اب ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ حکام کو رعایا کے ساتھ اختلاط کا موقع دو۔ ان کو جلد

جلد جلد مت بدلو۔ واقفیت کو لیاقت کا اسٹینڈرڈ بناؤ اور اس کو مدارِ ترقی ٹھیراؤ۔ پھر خانہ جنگیاں اور ہنگامے ہوں تو میرا ذمہ
(۵) گورنمنٹ کے مدرسوں میں کہ وہاں دین و مذہب سے بحث نہیں۔ تربیت کی طرف مطلق توجہ نہیں اور تعلیم بے تربیت
ایسی ہی نامفید ہے جیسے آرمی وِد آوٹ ڈسپلن یعنی بے قواعد کی فوج۔ اور کانگرس نے گورنمنٹ کو تعلیم بے تربیت کے
نتیجے دکھا بھی دیئے۔ تعلیم بے تربیت گورنمنٹ کی غلطی تھی اور اُس کو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

غرض برٹش گورنمنٹ کے انتظامات پر مولانا نے جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ بظاہر طریقہ تعلیم اور نتیجہ تعلیم پر کی
ہیں ممکن ہے کہ بعض حضرات فرمائیں کہ طریقہ تعلیم پر اعتراض کرنا کوئی اعتراض کرنا نہیں ہے یہ تو مکتب کے لونڈے بھی کر سکتے
ہیں۔ ہاں مولانا کو نمک کا محصول گھٹنے کے بارے میں کوئی لیکچر دینا چاہیئے تھا۔ ہتھیار باندھنے کی عام اجازت پر کوئی اسپیچ
دینی چاہیئے تھی۔ ہندوستانیوں کو وائسٹر بنانے کی غرض سے کوئی عرض داشت پیش کرنی چاہیئے تھی۔ انکم ٹیکس
کی موقوفی پر کوئی مضمون لکھا ہوتا اور آخر میں ہندوستانیوں کو کلکٹر۔ کمشنر۔ لفٹنٹ گورنر۔ اور گورنر جنرل بننے کی ترغیب
دے کر کسی پلیٹ فارم پر جمع کر کے علم بغاوت بلند کرنا چاہیئے تھا۔ جب یہ بھی ہو جاتا تو کھڑے کھڑے برٹش گورنمنٹ
کا کان پکڑ کے ہندوستان سے باہر سمندر پار اتر جانے کا مشورہ ہوتا اور مشورہ کیا ہوتا بلکہ علی رؤس الاشہاد کہہ دیا
جاتا کہ آپ لوگ اپنی ولایت کو تشریف لے جایئے یا دنیا میں اور کوئی غیر مہذب اور ناتعلیم یافتہ ملک تلاش کیجیے اور وہاں
جا کر حکومت کیجیے یہاں آپ کا اب کوئی کام نہیں۔ اگر اس پر برٹش گورنمنٹ باز نہ آتی تو معاذ اللہ سب چشل چھوڑ کے جاتے
لیکن یہ طریقہ نہایت نالائق ہے۔ ہندوستان کے تمام ہندوؤں اور مخصوص بنگالی ہندوؤں سے ہماری یہی استدعا ہے کہ وہ اپنی
اس قسم کی ناروا اور ناجائز حرکتوں کو چھوڑیں اور آدمیت اور انسانیت سے اپنی حق طلبی کریں ورنہ سے ترسم نرسی
بہ کعبہ اے اعرابی ÷ کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست ÷

بہر حال ہمارے نزدیک بھی یہ غل غباڑہ ایک بیہودہ اور لغو و لاحاصل ہے۔ ہماری تو یہ رائے ہے کہ صرف تعلیم
مفید پر زور دیا جائے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے جو طالب علم نکلتے ہیں وہ ملک اور قوم اور خود برٹش گورنمنٹ
کے لیئے نامفید ثابت ہوتے ہیں۔ ہماری تو یہ رائے ہے کہ گورنمنٹ کو ایسی تعلیم دینی چاہیئے جس میں تعلیم سے زیادہ
تربیت شامل ہو اور بی اے اور ایم اے کی جگہ یا اس کی جگہ بھی نہ سہی بی اے۔ ایم اے کے بعد۔ انجینئری۔ ڈاکٹری
اگریکلچر۔ باٹنی۔ مکینکس۔ طبعیات۔ جیالوجی۔ جن کے ذریعے سے صنعت اور دستکاری اور ایجاد کی قدرت حاصل
ہوتی ہے سکھائی جائے۔ ہندوستان میں یورپ کی طرح صنعت و حرفت کے اسکول کھول دیئے جائیں اور جتنی ضرورت
کی اشیا باہر سے آتی ہیں وہ ہمارے ہی ملک میں تیار ہوں تو یہ رات دن کی تُو تُو میں میں کیوں ہو۔ امن چین سے
زندگی بسر ہو۔ ہندوستانی تاج برطانیہ کی وفادار رعایا ہوں تاج برطانیہ اپنی وفادار رعایا کی جان و مال کی حفاظت
کرے اور ہر دم ایسے مشغلوں میں اس کو مصروف رکھے جس میں ملک کی بہبودی اور ترقی کے آثار نمایاں ہوں۔
یعنی دن عید اور رات شب برات ہو۔ اگر خدا نخواستہ ایسا نہ ہوا اور تعلیم کا بھی یہی طریقہ رہا جو آج کل ہے تو سمجھ لینا

چاہیے کہ نااہل ہندوستانی گورنمنٹ کو بدنام کریں گے اور جو پھانسیاں پائیں گے یا کالے پانی جائیں گے جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے آیندہ اختیار بدست مختار ع رموز مملکتِ خویش خسروان دانند ؎

قرآن مجید کی ایک آیت سے گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت کا ثبوت

ہم نے بعض سربرآوردہ مسلمانوں کے خیالات کو بغور دیکھا ہے کہ جب کبھی وہ قرآن مجید سے برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کی آیت اقتباس کریں گے تو اسی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ[1] لیکن مولٰنا اس بارے میں اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس آیت سے مسلمان اُولِی الْاَمْرِ مراد ہیں نہ غیر مسلم اُولی الامر۔ چنانچہ اس کے متعلق نہایت ہی دلچسپ بحث کی ہے اور وہ یہ ہے :- یوں تو سارے حقوق چاہے وہ حق اللہ ہوں یا حق العبد ہوں اور ان کے مقابلے کے فرائض اپنی اپنی جگہ سب ہی ضروری ہیں مگر ضرورت ضرورت میں بھی فرق ہے۔ ایک ضرورت تنفّس کی ہے۔ ایک بھوک کی ایک پیاس کی۔ یہی حال حقوق و فرائض کا ہے۔ تو جب وقت تک حقوقِ والدین پیش نظر تھے ہم نے یہی سمجھا کہ بس حقوق العباد میں ان سے بڑھ کر کوئی حق مہتمم بالشان نہیں۔ اب جو حقوق حاکم سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ حقوقِ حاکم مہتمم بالشان ہونے میں حقوق والدین سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ والدین بھی ایک طرح کے حاکم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی حکومت محدود ہوتی ہے اور محدود ہونے کے علاوہ مبنی ہوتی ہے شفقت اور محبت پر اور حاکم کی حکومت وسیع ہوتی ہے اور مبنی ہوتی ہے غلبے اور قوت پر تو اس اعتبار سے والدین اور حاکم کی حکومت میں خاص و عام یا جزو کل کی نسبت ہوئی۔ ہم اس سے پہلے کسی مقام پر لکھ چکے ہیں کہ دنیا میں حکومت کا دستور کیوں کر چلا اور کس غرض سے چلا۔ مختصر یہ ہے کہ آدمی اس طرح کا مخلوق ہے کہ وہ اکیلا سازوسامانِ زندگی بہم نہیں پہنچا سکتا۔ ناچار اس کو اپنے جیسے آدمیوں کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا ہے اور چوں کہ طبیعتیں اور ضرورتیں سب کی قریب قریب یکساں ہیں خود غرضی لوگوں میں لڑائیاں ڈلواتی اور طرح طرح کے فساد کراتی رہتی ہے پس تو حاکم اتنے ہی کام کا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق میں دست اندازی نہ کریں آپس میں لڑیں جھگڑیں نہیں یعنی امن و امان سے اپنے اپنے کام میں لگے رہیں پس لوگوں کا امن و عافیت کے ساتھ زندگی کرنا موقوف ہے اسلوب حکومت کے ٹھیک بیٹھنے پر اور اسلوبِ حکومت کا ٹھیک بیٹھنا موقوف ہے حاکم کے منصف مزاج۔ خدا ترس۔ خیر خواہِ خلائق اور ان صفتوں کے ساتھ باشوکت ہونے پر کہ اپنے احکام کے نافذ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ اور ہاں رعایا کے مطیع و منقاد ہونے پر بھی۔ غرض مصلحتِ انتظام نصب حاکم کی متقاضی ہوئی کہ ایک شخص جماعت کا سردھرا بن کر لوگوں کو اپنے ربط و ضبط میں رکھے۔ حکومت نے کیسے کیسے رنگ بدلے ہیں یہ مقام اس کی تفصیل کا نہیں اتنی سمجھ بھی لوگوں کو کہیں مدّتوں میں جا کر آئی ہوگی کہ کثرت سے وحدت کے منتظم نہیں ہوسکتی مگر اب تو حکومت کے ہر ایک صیغے میں اس قاعدے پر عمل کیا جا رہا ہے۔ مثلاً کاشت کار روپیہ

[1] مسلمانو اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں اُن کا بھی ۱۲۔

زمین دار ہے۔ زمین داروں پر نمبردار ہے۔ نمبرداروں پر ضلع دار۔ پھر تحصیل دار۔ پھر ڈپٹی کمشنر۔ پھر کمشنر۔ پھر فنانشل کمشنر۔ پھر لفٹنٹ گورنر۔ پھر گورنر جنرل۔ پھر بادشاہ۔ دیکھو کثرت سمٹتے سمٹتے کس طرح بادشاہ کی ذات میں جاکر جمع ہو جاتی ہے۔ یہی قاعدہ ہم کو خدا کی وحدانیت کے عقیدے کی طرف کو بھی رہبری کرتا ہے۔ خدا نہ ہو۔ یا ہو اور ایک نہ ہو کئی خدا ہوں تو دنیا کا انتظام ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔[۱]

اب سمجھیے کہ حاکم کیا چیز ہے اور کیوں اُس کا ہونا ضرور ہے۔ حاکم کی جبری اطاعت تو چارو ناچار کرنی ہی پڑتی ہے۔ اِس لیے کہ اُس کے پاس فوج ہے۔ پولیس ہے۔ خزانہ ہے۔ جیل خانہ ہے۔ مگر نہیں ہم مسلمانوں کو خدا رسول نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ اطاعتِ حاکم کا حکم دیا ہے۔ پس اگر ہم مسلمان حاکمِ وقت یعنی انگریزوں کی اطاعت سچی اطاعت نہ کریں تو دنیا کے علاوہ اپنا دین بھی کھو بیٹھیں خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ[۲] لیکن انگریزوں کی اطاعت کے بارے میں حکمِ خدا و رسول کا نشان دینا ذرا غور طلب ہے۔ قرآن میں ڈھونڈنے بیٹھو تو فوراً يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ[۳] پر جاکر نظر جم جاتی ہے کہ بس اس سے زیادہ صریح حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کے اولو الامر ہونے میں تو کچھ کلام نہیں۔ کلام اگر ہے تو مِنْكُمْ میں ہے کہ سیاق و سباق کی رو سے آیت کے مخاطب مسلمان ہیں تو مِنْكُمْ نے حاکم کو خاص کر دیا کہ وہ بھی مسلمان ہو۔ ایک تعلیم کے نہ ہونے نے جس کی اس عمل داری میں سخت ضرورت ہے مسلمانوں سے عقلِ معاش اور عقلِ معاد دونوں عقلیں سلب کر لی ہیں اور اسی وجہ سے وہ بے دولت ہیں۔ ذلیل ہیں خوار ہیں اور پنچوں میں مونھ دکھانے کے قابل نہیں رہے مگر اتنے بھی احمق نہیں ہو گئے کہ دن کو رات کہنے لگیں۔ اور انگریزی عمل داری کی برکتوں اور آسایشوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ قسم کھانے کی بات ہے کہ سارے ہندستان میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک مسلمان بھی الیسا نہ پاؤ گے جو انگریزی عمل داری کو دل سے عزیز نہ رکھتا ہو۔ مگر مذہب کی بات مذہب کے ساتھ ہے۔ سرکار بھی کسی مذہب میں دست اندازی نہیں کرتی۔ ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو خدا اور رسول نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ اطاعتِ حاکم کا حکم دیا ہے تو ہم کو چاہیے کہ اس دعوے کے ثبوت میں خدا اور رسول کا فرمودہ پیش کریں۔ سو اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ سے تو مِنْكُمْ نے مدعا ثابت نہ ہونے دیا۔ اب رہی حدیث تو اُس میں ایسے احکام کثرت سے ملیں گے کہ حاکم کی اطاعت کرو گو وہ تمھاری نظر میں حکومت کا اہل نہ ہو۔ اور ایسا ہوا ہے کہ جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی مصلحتِ خاص سے کسی کم وقعت صحابی کو امیر الجیش بنا دیا ہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابیوں کو اُس کی اطاعت کرنی پڑی ہے۔ اور انھوں نے کی ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر قرآن کے مِنْكُمْ کا

---

[۱] اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے ۱۲

[۲] اِس نے دنیا (بھی) کھوئی اور آخرۃ (بھی) یہ صریح گھاٹا ہے (کہلاتا) ہے ۱۲-

[۳] مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں صاحبِ حکومت ہیں اُن کا بھی ۱۲-

جواب نہیں۔ جہاں کہیں بھی ہے مسلمان افسر، مسلمان حاکم کی اطاعت کا حکم ہے۔ ہماری حالت کے مناسب کہ ہم نصاریٰ کے محکوم ہیں نہ قرآن میں صراحت ہے اور نہ حدیث میں اور کیوں ہونے لگی تھی۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں کہ اسی کے ساتھ قرآن و حدیث دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ اسلام نے جزیرۂ عرب کے خاص خاص مقامات میں رواج پایا تھا۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ جو غیر مذہب والوں کے نرغے میں مذہب کی وجہ سے تکلیف پاتا ہو ہجرت کر کے دار السلام مدینے میں چلا آئے۔ پھر خلفاء رضوان اللہ علیہم کے عہد میں اسلامی سلطنت كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ[1] ہو کر بڑھی اور پھولی پھلی اور اسی زمانے میں فقہ مدوّن ہوئی۔ غرض مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں قرآن سے لے کر فقہی کتابوں تک ہم مسلمانانِ ہند کے مناسبِ حال اطاعتِ حکامِ وقت کے بارے میں احکام نہیں پائے جاتے۔ نہیں پائے جاتے اس لیے کہ لکھے نہیں گئے۔ لکھے نہیں گئے اس لیے کہ ضرورت نہیں پڑی۔ جب اسلامی سلطنت تنزل کے پھیر میں آئی تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[2] اور اس کے علاقوں پر غیر مذہب والے قبضہ کرتے گئے تو جو مسلمان ان مقبوضہ علاقوں میں سکونت پذیر تھے ان کو اپنے مذہب کی خیر منانی پڑی اور لوگ مسائل دار الحرب و ربوٰا اور اطاعتِ حکامِ وقت کی طرف متوجہ ہوئے ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ کسی نے اطاعتِ حکامِ وقت کے بارے میں أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ سے سند پکڑی اور اسی مِنْكُمْ نے اسے روک دیا۔ اور کسی نے اپنے تئیں مستامن بنایا۔ حال آں کہ جن مستامنوں کا قرآن یا حدیث یا فقہ میں مذکور ہے وہ غیر مذہب والے ہیں جو مسلمانوں کی عمل داری میں پناہ گزیں ہوں۔ ہم نے بھی اپنی جگہ اِعمالِ فکر کیا تو اس رستے کو چھوڑ دینا ہی مناسب معلوم ہوا۔ اب حکّامِ وقت کی اطاعت کو ایفاءِ عہد اور نہی عَنِ الفسادِ فی الارض پر مبنی کرتے ہیں اور اسی لیے ہم نے عنوان اطاعتِ حاکم کے ذیل میں ایسی آیتیں جمع کر دی ہیں جو ایفاءِ عہد اور نہی عن الفساد فی الارض سے متعلق ہیں۔ ان کے پڑھنے سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے زوردار لفظوں میں ایفاءِ عہد کی تاکید اور فساد کی مناہی ہے۔ تمام جھگڑے تمام خرخشے جو آئے دن لوگوں میں ہوتے رہتے ہیں داخلِ فساد ہیں۔ دنیا کبھی فساد سے خالی نہیں رہی اور خالی رہے گی بھی نہیں۔ آدمی ہے تو آدمی کے ساتھ فسادات بھی ہیں اس لیے کہ آدمی خود فساد کی جڑ ہے اور اسی فساد کی روک تھام کے لیے دنیا میں دین و مذہب چلا تو حکمِ حاکم کو نہ ماننا فساد کی بھڑوں کا جگانا۔ دنیا سے امن و عافیت کا اٹھا دینا اور خدا کے مقدس

---

[1] جیسے کھیتی کہ اس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس نے (غذائے نباتی کو ہوا اور مٹی سے جذب کر کے اپنی) اس (سوئی) کو قوی کیا چناں چہ وہ (رفتہ رفتہ) موٹی ہوئی (یہاں تک کہ آخر کار کھیتی) اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی (اور اپنی سرسبزی سے) لگی کسانوں کو خوش کرنے (خدا نے ان کو روز افزوں ترقی) اس لیے (دی ہے) کہ ان (کی ترقی) سے (دشمنانِ اسلام) کافروں کو جلائے ۱۲۔

[2] یہ اتفاقات وقت ہیں جو ہمارے حکم سے نوبت بہ نوبت (سب) لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں ۱۲

منشار کی مخالفت کرنا ہے۔ اب رہا عہد تو عہد کی دو قسمیں ہیں۔ عہدِ قولی اور عہدِ فعلی۔ عہدِ قولی تو زبانی قول و قرار ہے۔ عہدِ فعلی یہ ہے کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر طریقِ عمل سے پایا جاتا ہے کہ فریقین میں ایک طرح کا ذہنی قرارداد ضرور ہے۔ مثلاً زید نے ہندہ سے نکاح کیا۔ ایجاب و قبول کے وقت اکثر مہر کی صراحت تو کر لی جاتی ہے اور زید ادائے رقم کا عہد کرتا ہے مگر نان نفقے کی نسبت کسی طرح کا تذکرہ درمیان میں نہیں آتا۔ اب زید بیوی کو اپنے گھر لے جا کر رکھے تو اس کو دستور کے مطابق ہندہ کا نان و نفقہ دینا آئے گا۔ اور گھر میں لے جا کر رکھنے سے سمجھا جائے گا کہ زید نے ہندہ کے نان و نفقے کا عہد کر لیا ہے۔ اسی طرح کا معاہدہ ہم میں اور انگریزوں میں ہے۔ جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر مسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کر ان کے ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت۔ انگریز فوج اور پولیس اور عدالت کے ذریعے سے مہما امکن ہمارے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں تو ہم مہما امکن ان کی اطاعت کیوں نہ کریں۔ حکام وقت کی اطاعت پر ایک بڑا ضروری مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ملک کے انتظام اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لیے آپ قوانین وضع کیے ہیں اور چوں کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور انگریزوں کو مساوات کے ساتھ سب ہی کے حقوق کی حفاظت کرنی پڑتی ہے جیسے رعایا ہندو ویسے مسلمان ویسے پارسی ویسے عیسائی۔ ناچار انھوں نے وضعِ قوانین میں محض انصاف کو مدِنظر رکھا اور کسی فرقے کے مذہب کا خیال نہیں کیا حتیٰ کہ اپنے مذہب کا بھی۔ اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے سے کوئی شریعت اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہی۔ از آں جملہ اسلامی شریعت کے بھی بہت سے احکام معطّل ہو گئے۔ کارروائی کا طریقہ بدل گیا اور شریعت کے اعتبار سے ایک نئی طرح کا اسلام چلا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس حالت میں بھی مسلمان ہیں یا نہیں؟۔ جواب یہ ہے کہ پورے سچے اور شریعتِ اسلامی کے جو احکام معطّل ہیں خدا نے حکام وقت کی اطاعت فرض کر کے ان احکام کو ہمارے حق میں خود معطّل فرما دیا ہے اور ہمارے لیے انگریزی قانون ہی اسلامی قانون ہے اور ایسا نہ ہو تو ہندوستان دار الحرب قرار پا کر ہر مسلمان پر ترکِ وطن یعنی ہجرت فرض ہو جاتے اور علمائے اسلام میں سے شیعہ ہوں یا سنّی مقلّد ہوں یا غیر مقلّد صوفی ہوں یا اہلِ حدیث کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ علاوہ بریں احکامِ شریعت سے مقصودِ اصلی ہے اقامتِ امن اور وہ قانونِ انگریزی سے بھی حاصل ہے۔ صرف تدابیر کا فرق ہے۔ ایک قاتل کو قتل کرتا ہے ایک پھانسی دیتا ہے۔ ایک چور کا ہاتھ کاٹتا ہے۔ ایک قید اور بید اور جرمانے کی سزا دیتا ہے۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ رعایا ہونے کی حالت میں قانونِ انگریزی کی اطاعت ایک امرِ اضطراری ہے اور لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کی رو سے خدا نے ہماری مجبوریوں پر نظر کر کے ہمارے حق میں توسیع کر دی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

قومی و ملکی ہمدردی قومی ہمدردی کا اندازہ مولانا کے لکچروں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ علی گڑھ کالج کے درو دیوار انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ لکچر قومی ہمدردیوں کی مستحکم یادگاریں موجود ہیں۔ علی گڑھ کالج میں متعدد بورڈنگ ہاؤس بنوائے جن میں کم سے کم بیس پچیس ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ چندے دیئے جن کی تعداد دس بارہ ہزار روپیہ ہوگی

انجمن حمایتِ اسلام میں بھی بارہا چندے دیئے۔ چندے کے علاوہ کلام مجید کی پانسو جلدیں بھی دیں۔ تعلیمی وظائف بھی دیئے علاوہ اِس کے مولانا کے لکچروں نے قوم کی جیبیں قوم ہی کے لیئے ہمیشہ خالی کرائیں۔ اس کو بھی ہم مولانا کا دنیا ہی سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ایک موقع پر خود مولانا نے بھی اشارہ فرمایا ہی۔ ؎

میں تم میں آ کھڑا ہوتا ہوں جب مجبور کرتے ہو[۱] | کہ گر تشریف لاؤ مہربانی ہو عنایت ہو
تم آ جاؤ اور آ کر اپنا لکچر دو تو جلسے میں | ہجوم وازدحامِ خلق ہو لوگوں کی کثرت ہو
کوئی بھاری سے معتد بہ رقم چندے کی آ جائے | ہماری انجمن کو فخر و استحکام و قوت ہو
کما لیتے ہیں کتنے آدمی میرے ذریعے سے | تمھیں ہو اجر ان کو فائدہ مجکو مسرّت ہو
اگر اپنے لیئے چاہوں تو کتنا کچھ محاصل ہو | بہت کچھ ہو گدائی کی اگر میرے تئیں لت ہو
یہ دلوانا بھی دینے ہی میں داخل ہی اگر سمجھو[۲] | کہ مثلِ خیر ہی گر خیر کے اوپر دلالت ہو

غرض مولانا نے اپنی جیبِ خاص سے بھی چندے دیئے ہیں اور دوسروں سے دلوائے بھی ہیں۔ یہ کس لیئے۔ یہ انھیں انجمنوں کے لیئے انھیں کالجوں کے لیئے وہ معمولی طریقے کے سوا اور مختلف طریقوں سے بھی خوشی وغمی ہیں وظائف سے امداد کرتے رہے ہیں اور اب بھی اس قسم کی امداد کی سوت جاری ہی۔ کبھی کبھی قومی گداگری بھی کی ہی۔ باوجود سے کہ سرسیّد سے بعض عقائدِ مذہبی سے اختلاف تھا تاہم قومی ہمدردی ہی مولانا کو کشاں کشاں لے گئی۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں وہ ہمیشہ مدعو کیئے گئے اور ہمیشہ ان دونوں انجمنوں کی خدمت کی۔ سرسیّد کے بعد نواب محسن الملک بہادر ہمیشہ ان کو گھسیٹ بلاتے تھے۔ علیٰ ہذا لاہور سے مولوی شمس الدین صاحب آ کر دھنی دیتے تھے اور اس طرح مجبور ہو کر مولانا کو جانا پڑتا تھا۔ لکھنؤ کی کانفرنس جو دسمبر ۱۹۰۹ء میں منعقد ہوئی اس کے بعد سے تمام انجمنوں میں جانا چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ شہر کے شہر میں مدرسۂ طبّیہ کے جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کی کانفرنس میں مولانا کے بعض دوستوں نے کفر کے ایک فتوے پر ریمارک کرنے کو کہا۔ اِس کا قصہ یوں ہی کہ جس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن پر ہمارے

---

۱ سرسیّد مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم ہمیشہ مجبور کر کے کانفرنس میں مولانا کو بلایا کرتے تھے یہ انھیں دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ ہی ۱۲

۲ اکثر ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مولانا کے لکچروں کی وجہ سے کالج کے لیئے چندے ہوئے ہیں۔ مثالاً ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہی۔ کہ ہز ہائی نس سر آغا خاں اور جسٹس سید بدرالدین طیب جی یہ دونوں یکے بعد دیگرے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پریزیڈنٹ قرار دیئے گئے ہز ہائی نس دہلی دربار کے زمانے میں اور جسٹس صاحب بمبئی کانفرنس میں دونوں نے پردے کے مخالف اپنا خیال ظاہر کیا۔ بمبئی کے لوگ جسٹس صاحب کی تقریر پر برہم ہوئے مولانا تو اپنی ڈیوٹی ادا کر کے بمبئی سے بہتم چلے گئے۔ بمبئی میں ایک بڑا معزز خاندان ناخدا محمد علی روگے کا ہی۔ ناخدا صاحب تو طبل ہیں مگر ان کے خاندان کی عظمت قائم ہی۔ قال قال پردے کی بحث ناخدا صاحب کی حرم محترم میں پہنچی۔ اور انھوں نے اپنے داماد نواب نصراللہ خاں صاحب کو دوڑایا یہ صاحب مولانا کو بہتم سے واپس لے گئے۔ مولانا نے ناخدا صاحب کی بی بی کے فرمانے سے پردے پر لکچر دیا۔ کوئی سو سے زیادہ لیڈیاں پردے کے اندر بیٹھی مولانا کا لکچر سن رہی تھیں۔ اور مولانا پردے کے پاس مردوں میں لکچر دے رہے تھے۔ لکچر کے تمام ہونے پر ناخدا صاحب کی بی بی نے ایک ہزار۔ ناخدا صاحب کی بہن نے ایک ہزار۔ ناخدا صاحب کی صاحبزادی نے پانسو کل ڈھائی ہزار روپے کے نوٹ مولانا کے حوالے کیئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دیئے تو مجکو مگر نواب محسن الملک گھات میں لگے ہوئے تھے انھوں نے ہ چک لیئے اس روپے سے کالج میں چند شاندار کمرے تیار کرا دیئے گئے ۱۲

مولانا۔ نواب محسن الملک اور مسٹر موریسن وغیرہ اُترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص مسافروں کو اشتہار تقسیم کر رہا ہی ایک اشتہار ہمارے مولانا کو بھی دیا۔ اسی طرح نواب محسن الملک بہادر مرحوم اور اور لوگوں کو بھی۔ یہ اشتہار ایک کفر کا فتویٰ تھا جو علی گڑھ پارٹی کی نسبت وہاں کے بعض متعصّب مولویوں نے دیا تھا۔ فتوے میں ایک مولوی صاحب کی مہر بھی یا معمولی طور پر مع کنیت کے نام تھا یعنی "ابو الغنا مولوی فلاں" مولانا نے یہ دیکھ کر جیب میں رکھ لیا جب یہ لوگ جائے قیام پر پہنچے تو نواب محسن الملک بہادر نے بعض احباب کی معرفت وہ فتویٰ مولانا کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ میں اس لئے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں کہ آپ اس فتوے پر کچھ ریمارک کریں۔ چناں چہ مولانا جب لکچر دینے کھڑے ہوئے تو حسب عادت ایک لطیفہ اِس فتوے کے متعلق یہ بیان کیا کہ ہمارے ہاں کے علماء کی اب یہ کیفیت ہوگئی ہی کہ شرعی پاس و لحاظ بھی اُٹھ گیا ہی۔ چناں چہ ایک مولوی صاحب نے اپنی کنیت ابو الغنا رکھی ہی جیسے میں اپنی کنیت ابو الہار مونیم رکھ لوں۔ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ چناں چہ اِس لطیفے پر لوگ ہنس پڑے۔ لیکن نواب محسن الملک بہادر مرحوم یا دو ایک اور شخصوں نے جو ہمارے مولانا کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے بری طرح سے بر سرِ اسٹیج روکا۔ مولانا کو یہ ناگوار ہوا اور اُس تاریخ سے انجمنوں اور جلسوں میں شریک ہونا ترک کر دیا۔ کچھ بڑھاپے کا بھی قصور ہی کہ اُٹھنے بیٹھنے میں حارج ہوتا ہی۔

ملکی ہمدردی کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ چندے کی نہ سہی مشورے ہی کی سہی۔ قاعدے کی بات ہی کہ کوئی روپے سے مدد کرتا ہی کوئی عقل سے۔ خالی روپے سے کام نہیں چلتا۔ اگر عقل کی مدد نہ ہو اور کوئی نیک صلاح بتانے والا نہ ہو۔ ناظرین کو شاید معلوم نہیں کہ آج کل جو سودیشی سودیشی کی آوازیں چاروں طرف ہندوستان میں گونج رہی ہیں یہ ہمارے مولانا کا بہت پرانا خیال ہی۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر اطاعت و فرماں برداری سے اس نیک صلاح پر اگر ہندوستانی کاربند ہوں تو ہندوستان پھر جنت نشان ہو سکتا ہی اور صرف یہی ایک ایسی چیز ہی کہ ہندوستانی اگر اپنے ملک کی پیداوار کو ترقی دیں۔ تو غیر ملک والے ہندوستان کا روپیہ گھسیٹ کر نہیں لے جا سکتے۔ اور یہ مفلسی اور فلاکت کی گھنگھور گھٹا ٹوپ اندھیری جو اُن پر چھائی ہوئی ہی اُس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے چناں چہ مولانا فرماتے ہیں۔

"(۱) خدا تعالیٰ نے ہر ایک مخلوق کی حالت کے مطابق نہ صرف مایحتاج زندگی بلکہ آسایش کے سامان مہیا فرما دیئے ہیں۔ انتظام الٰہی کے خلاف ہی کہ ہم رہیں ہندوستان میں اور حفظِ صحت کے محتاج ہوں اُن چیزوں کے جو یورپ اور امریکہ میں میسّر آتی ہیں۔ مگر یوں کہو کہ ہم غور نہیں کرتے اور خواہ مخواہ پتلون کے شکنجے میں اپنی ٹانگیں پھنسانی چاہتے ہیں ڈاکٹروں کی طبابت کے بڑے معتقد اکثر وہی لوگ ہیں جن کے سروں میں حسب تقاضائے وقت آزادی کے خیال بڑے اُبل رہے ہیں۔ لیکن اگر آزادی اسی کا نام ہی کہ ادنیٰ اکر اپنی ہر اپنی چیز کو ترک کیا جائے تو جہاں تک یہ آزادی طبابت سے متعلق ہی ہمارے نزدیک ان لوگوں کی وہی کہاوت ہی کہ گڑھے سے نکلے اور کوئے میں گرے۔ سلطنت۔ حکومت۔ دولت۔ دستکاری۔ تجارت سب کچھ جا کر ایک جان بچی تھی وہ بھی دوسروں کے بس میں کر دی۔ تو حقیقت میں دُنیا سے آزاد ہوئے ؎

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل　　کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہی آزاد کا

جو دوائیں اطبائے یونانی تجویز کرتے ہیں سب ہمارے ملک کی پیداوار ہیں اگر یہ دوائیں دوا کے طور پر کام میں نہ لائی جائیں تو دوسرے کسی مصرف کی نہیں پس ملکی خیرخواہی کب جایز رکھ سکتی ہے کہ اتنی ملکی دولت کو ضائع ہونے دیا جائے خصوصاً اس صورت میں کہ ہم ملکی خیرخواہی کا بھی دم بھرتے ہیں۔

(۲) جدھر دیکھو تعلیم تعلیم کا غل ہو رہا ہے اور میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ جس قدر تعلیم اس وقت تک ہو چکی ہے وہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک میرے نزدیک تعلیم کے اصول ہی ٹھیک نہیں ہوئے۔ کچھ اس طرح کا خلط مبحث ہو رہا ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس وقت ساری تعلیم کا ماحصل ہے نوکری۔ دیکھتا ہوں کہ ایک عالم نوکری کے خبط میں گرفتار ہے۔ جن کا پیشہ نوکری ہے وہ اور جن کا پیشہ نوکری نہیں وہ۔ جن کو ضرورت ہے وہ اور جن کو ضرورت نہیں وہ اور جو اہل قلم کے خاندان سے ہیں وہ اور جو اہل قلم کے خاندان سے نہیں وہ۔ جو سوسایٹی میں شریف سمجھے جاتے ہیں وہ اور جو شریف نہیں سمجھے جاتے وہ جس کو دیکھو نوکری کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ الٰہی کیا نوکریاں آسمان سے برسیں گی یا زمین سے اُبلیں گی اور نہیں برسیں گی اور نہیں اُبلیں گی تو یہ اتنی ساری مخلوقات جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اسی ارادے میں صرف کر دیا کیا کرے کھائے گی۔ پس میرے نزدیک تعلیم کی رفتار حد سے زیادہ تیز ہو گئی ہے اس کو ذرا مدہم کیا جائے جو لوگ دوسرے پیشوں سے معاش پیدا کر سکتے ہیں اُن کو تعلیم کی ترغیب دینا ہرگز قرین مصلحت نہیں۔ پھر اس تعلیم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ بس یہی ہے وہ چیز جو ہم کو درکار ہے بڑی مکروہ غلطی ہے۔ انگریزی عملداری میں ایک سخت مشکل درپیش ہے کہ ہم کو بھی چار و ناچار ہاتھیوں کے ساتھ گنّے کھانے پڑتے ہیں۔ اہل یورپ کی ہنرمندی اور صناعی اور ایجاد ہم کو پنپنے نہیں دیتی معاش کے جتنے کسب ہم کو یاد تھے مٹ گئے اور رہے سہے مٹتے چلے جاتے ہیں۔ بس امید میں اتنی جان باقی ہے کہ اہل یورپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کو اُٹھا کر ولایت نہیں لے جا سکتے۔ ان کے ساتھ کمپیٹ (مقابلہ) کرنا تو محال عقل ہے۔ اتنا بھی ہو جائے کہ ہم اُن کی نقل و تقلید کرنے لگیں تو جانو سب پایا۔ یہ ہونی چاہیئے غرض و غایت تعلیم کی۔ تعلیم مروجہ سے تو یہ نتیجہ نہ حاصل ہوا ہے نہ حاصل ہوگا۔ اس کے لئے خاص گروہ لوگ منتخب ہونے چاہئیں جن کی طبیعتوں میں اُن علوم و فنون کے اخذ کرنے کی مناسبت پائی جائے۔ لیکن بہت باتیں بنانے سے کام نہیں نکلتا منصوبے سوچنے والے تو میری طرح سینکڑوں ہیں کوئی کرنے والا بھی ہے؟ جانتے ہو کہ کرنا کیا چیز ہے۔ کرنے کے معنی ہیں کچھ دنیا۔ فنڈ ہوں تو سب کچھ ہو۔ ولایت سے اُستاد بلواؤ۔ کلیں منگواؤ۔ ہونہار نوجوانوں کو ولایت چلتا کرو کہ وہاں سے طرح طرح کے کام سیکھ کر آئیں اور یہاں آکر اُن کاموں کو پھیلائیں تب جانو کہ قوم کے کچھ دن پھرے۔

(۳) سلطنت کے جاتے رہنے کی میں اتنی بھی تو پروا نہیں کرتا جتنی ایک مٹی کے کُلھڑے کے ٹوٹ جانے کی ہوئی ہے۔ جو حلوائی دودھ دہی کے ساتھ مفت دے دیا کرتے ہیں۔ سلطنت کے ساتھ اقتدار ہے تو ویسے ہی اُس کے ساتھ بکھیڑے بھی ہیں۔ دنیا اور دین کی عافیت تو اسی میں ہے کہ نہ سلطنت کے جاتے رہنے کا افسوس ہو نہ اُس کے حاصل ہونے کی آرزو۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ سلطنت خوشی کا صرف ذریعہ نہ تھی تو بڑا ذریعہ ضرور تھی۔ اب علم و ہنر کا دور دورہ ہے۔ اُسی کی سلطنت ہے اُسی کی حکومت۔ اُسی کی دولت۔ اُسی کی خوش حالی۔ اُسی کی عزت و آبرو۔ غرض اُسی کی دنیا اور دین

پکارے کہتا ہوں کہ اسی کا دین۔ اب سلطنت بھی بے علم و ہنر کے نہیں چل سکتی۔ اور نہ صرف سلطنت بلکہ سچ پوچھو تو بے علم و ہنر زندگی حرام ہی۔ اور جیسی زندگی ہم لوگ کر رہے ہیں کہ سوئی اور پچک اور دیو اسلائی یعنی ضرورت کی کل چیزوں کے لئے یورپ کے دست نگر ہیں میں تو اس کو زندگی نہیں سمجھتا۔ جن کو جینے کا سلیقہ نہیں ایسے نا اہلوں کو اول تو سلطنت ملنے ہی کیوں لگی ع دولت نہ ہد خدا کسے را بگزاف۔ اور بفرض محال مل بھی جائے تو جانو کہ ملک کے حصے کی قیامت آگئی۔

(۴) یہ جو یورپ کی صناعیاں ہندوستان کی صنعتوں کو ملیا میٹ کرتی چلی جا رہی ہیں یہ اسی تعلیم کے تو نتیجے ہیں تو جب یہیں کے تعلیم یافتہ اُن کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے یورپ آپ سے آپ دُم دبا کر بھاگے گا۔ ملیلا کے چرٹ۔ سوت۔ موٹا کپڑا۔ ان سب چیزوں کا دار و مدار بھی یورپ پر تھا جب سے ہندوستانیوں نے ان کا بنانا شروع کیا یورپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔

مولانا کی ملکی خیر خواہی کے ہم نے یہ چند نمونے دکھائے ہیں ورنہ اگر تلاش کرنے بیٹھیے تو سیکڑوں ایسے مفید مشورے اُن کی کتابوں اور لکچروں میں ملیں گے جن پر عمل کرنے سے ہندوستانیوں کے دن پھر سکتے ہیں قاعدہ ہے کہ رائے دینے والے رائے دیتے ہیں اور کام کرنے والے کام کرتے ہیں۔

دوستوں کی فہرست اور اُن کے ساتھ راہ و رسم

مولانا کے شناساؤں کی فہرست تو بہت وسیع ہی کیوں کہ ہندوستان میں کون ہی جو بلحاظ علم و فضل اور ایک بے نظیر مصنف اور لکچرار ہونے کے اُن کو نہیں جانتا لیکن دوستوں کی فہرست کا حلقہ البتہ تنگ ہی۔ پرانے دوستوں میں شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب خان بہادر ہیں ان سے مراسم دوستی ابھی تک چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر لکچروں میں بھی ان کا ذکر خیر آجاتا ہی مولوی محمد کریم بخش صاحب اُن کے ایک اور دوست تھے جن کا انتقال ہو گیا۔ یہ صاحب نیل کوڈ کے ترجمے میں شریک تھے۔ ڈپٹی کلکٹر رہنے کی وجہ سے کم و بیش اس زمانے کے جملہ ہم رتبہ عہدہ داروں سے روابط تھے جن میں سے اکثر کو موت نے سمیٹ لیا جو دو چار باقی رہ گئے ہیں وہ بھی پا بر رکاب ہیں۔ تہذیبی دنیا کے ساتھ سرسید سے دوستی پیدا ہوئی مگر یہ بزرگ دوست تھے۔ مولانا اُن کا بہت ہی ادب کیا کرتے تھے۔ مگر مذاق سے باز نہیں آتے تھے۔ سرسید کے مرثیے بھی لکھے ہیں اُن کے ماتم میں اسپیچیں بھی دی ہیں۔ ایک مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

کیا کہیں مشغلہ لکچر کا ابھی چھوٹ گیا	ہم سے اک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر	تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پر تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز	گر قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

خان بہادر سید زین العابدین نواب محسن الملک مرحوم سے بھی خاص قسم کے مراسم تھے جو آج کل کے دوستوں کو نصیب نہیں نواب وقار الملک بہادر سے بھی پرانی ملاقات ہی مگر اس کی تجدید حیدر آباد میں ہوئی۔ جب اور ئی ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو سید آغا صاحب سے بہت خلط ملط تھا آغا صاحب کلکٹری کے سر رشتہ دار تھے ان دونوں صاحبوں کے مکانات بھی قریب قریب تھے۔ گورکھپور میں منشی عبد الستار صاحب وکیل سے بھی خاص محبت تھی بلکہ انہیں کے مکان میں رہا کرتے تھے آن بالکل یکتا

کا برتاؤ تھا۔ وکیل صاحب کے بچے مولنا کو چچا چچا پکارتے تھے اور میاں بشیر بھی وکیل صاحب کو چچا کہتے تھے۔ یہی کیفیت مولوی کریم بخش صاحب سے تھی۔ اِن کو بھی میاں بشیر چچا کہتے تھے۔ اعظم گڑھ میں خواجہ احسن اللہ خاں صاحب رئیس سے بہت ربط و ضبط تھا۔ اکثر ان کے ہاں آمد و رفت تھی۔ ڈپٹی نثار علی صاحب ساکن آگرہ سے بھی دوستانہ تھا۔ خان بہادر منشی غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹی، ذوالقدر میر ناصر علی خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور منشی عظمۃ اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر اور خان بہادر برکت علی خاں صاحب مرحوم بزرگ دوستوں میں تھے۔ شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی۔ اور شمس العلماء مولنا شبلی صاحب نعمانی اور سیکڑوں اور معززین اور قومی بزرگوں بزرگوں سے بہت ربط و ضبط ہے۔

ان کے سوا ایک اور قسم کے بھی دوست ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ "مطلب کے یار" ان کا حلقہ بہت وسیع ہے اور ایسے دوست اکثر مولنا کو گھیرے رہتے ہیں۔ فان القرض مقراض المحبۃ کا صحیح ترجمہ یہی لوگ ہیں۔

از صحبت دوستانِ ایں دور خلاف رمزے گویم اگر نگیری بگزاف

چوں شیشہ ساعت اند پیوستہ بہم دلہا ہمہ پُر غبار و روہا ہمہ صاف

یتیموں کے ساتھ سلوک یتیموں کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے۔ وہ ان کی شکستہ حالی نہیں دیکھ سکتے وہ اُن انجمنوں سے بہت خوش نظر آتے ہیں جو یتیموں کے لئے قایم کی گئی ہیں۔ ہم نے اِن کی سپیچوں میں اکثر مقامات پر پڑھا ہے کہ یتیموں کے ساتھ اس سے بڑھ کر کوئی اور سلوک نہیں کہ ان کو مناسب حال اِس قابل کر دیا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور اگر ان کی تعلیم و تربیت ہو جائے تو یہ سب سے بہتر سلوک ہے۔

اعظم گڑھ کی طرف سے دو قحط زدہ یتیم چھوکریاں اور دکن سے کئی یتیم چھوکرے اور چھوکریاں مولنا کے ہاں آئیں ان کے ساتھ کبھی لونڈی غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ بلکہ اپنے بچوں کی طرح محبت و شفقت سے پالا پرورش کیا۔ یہاں تک کہ شادی بیاہ بھی کیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔ بیوی صاحبہ نے کبھی کسی کو اُنگلی لگائی نہ کسی دوسرے کو لگانے دی ان میں سے صرف اب ایک چھوکرا باقی رہ گیا ہے اس کا نام شاکر ہے اِس کی عمر چار برس کی تھی کہ بیوی صاحبہ نے پالا تھا۔ یہ اعظم گڑھ کا رہنے والا ہے۔ اب ڈاڑھی مونچھوں والا ہو گیا ہے اور میاں بشیر کی خدمت میں رہتا ہے۔ وہ اُسے اپنے دوسرے ملازموں کی طرح رکھتے ہیں۔ حق پرورش کا احسان نہیں جتاتے اِس کو بھی تنخواہ دی جاتی ہے۔ چوں کہ میاں بشیر کی والدہ کا پالا ہوا ہے اِس لئے خرید عنایت کیا کرتے ہیں اور اِس کے جورو بچوں کی بھی خبر گیری رکھتے ہیں۔

طول اور چاندار مولنا نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "تمھارے کان بھی ضرور اِس مصرع سے آشنا ہوں گے "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" طول اور وضع اور تعداد انامل کے اختلاف سے انگلیوں کو اعانت اور استعانت کا عمدہ موقع دیا گیا ہے۔ یعنی انگلیوں کی اختلافی حالت نے ہاتھ کو زیادہ قوی اور بکار آمد بنا رکھا ہے۔ مگر اِس اختلاف کی بھی ایک حد ہے معین جن میں افراط و تفریط کی گنجایش نہیں۔ یہی حال ہے ایک خاندان کے لوگوں کا اگر ان کی حالتیں ایک اندازہ مناسب تک متفاوت ہیں تو یہ اختلاف

۵۷ بیوی صاحبہ ہمارے مولنا کی اہلیہ کا خطاب تھا۔ ہر شخص چھوٹا بڑا یہاں تک کہ خود مولنا اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ ہماری قلم سے بھی اسی باعث بیوی صاحبہ نکل گیا ۱۲۔

مفرداً اُن کے اور مجتمعاً سارے خاندان کے حق میں مفید ہوگا۔ لیکن فرض کرو کہ کسی کے ہاتھ کی ایک انگلی بے موقع بڑھ کر گز بھر کی ہوجائے تو وہ لمبوتڑی انگلی عذاب ہوگی اپنے حق میں اور دوسری انگلیوں کے حق میں اور سارے ہاتھ کے حق میں۔ تمول کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ہاتھ میں وہ لمبوتڑی انگلی میں ہوں نہ آپ خوش رہ سکتا ہوں۔ اور نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہوں" مولانا کے اس خط سے لوگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ سارے خاندان میں کوئی متمول نہیں ہے صاحب المال اگر ہوئے تو مولانا لیکن ہمارے نزدیک مسلمانوں میں فی زماننا تمول نام کو نہیں جو بظاہر رئیس ہیں اُن کا بھی بال بال قرض میں گھرا ہوا ہے بلکہ اب تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قرض مسلمانوں کا تمغہ ہوگیا ہے۔ اب امیر اُس کو کہنا چاہیے کہ جو معمولی طور پر خوش گزران ہو اور کھاتا پیتا ہو اور چار کو کھلا سکے۔ تو اس تعریف میں مولانا اچھی طرح آتے ہیں کروڑپتی تو نہیں مگر لکھ پتی ضرور ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ہو۔ کیونکہ ہم نے اپنی معرفت والوں کی سنی سنائی باتوں پر یہ اٹکل پچو جمع خرچ لگایا ہے۔ بہرحال وہ لکھ پتی ہوں یا کروڑپتی۔ خدا کا شکر ہے کہ خوش حال ہیں۔ چناں چہ اپنے تمول کی نسبت نظم میں بھی کچھ ارشاد فرمایا ہے ؎

خدا کا شکر ہے میں حال میں اپنے بہت خوش ہوں
نہیں ہے یہ کہ مجکو خاص کر کوئی شکایت ہو

مجھے پوری سبکدوشی ہے افکارِ معیشت سے
بڑی دولت ہے جب جس حال میں جس کو قناعت ہو

میں اپنی نیند سوتا ہوں مزے سے پاؤں پھیلا کر
اگرچہ سر پہ میرے شور و غوغائے قیامت ہو

نہ گردن میں مری طوقِ غلامی ہے کسی شہ کا
نہ حاکم ہوں کہ مجکو فکرِ بہبودِ رعیت ہو

نمک خوارِ نظامِ حیدرآبادِ دکن ہوں میں
حسب ایسے کا توسّل ہے تو مجکو کیوں نہ ثروت ہو

مجھے ملتا ہے گھر بیٹھے جو یاں پر مل نہیں سکتا
اگرچہ نوکری میں عمر ساری صرفِ زحمت ہو

شعر تو یہ کہا ہے۔

یہ سُن کر حاسدِ بد نفس مر جائے تو مر جائے
کہ ہم سب کو بھی اطمینان ہے اُس کو بھی راحت ہو

غرض مولانا کے پاس جو کچھ بھی دولت ہے وہ اُن کی قوتِ بازو کی کمائی ہے۔ مولانا "سلف میڈ مین" کی زندہ مثال ہیں اور وہ اس بارے میں میر ناصر علی خاں ذوالقدر مرحوم کے زیادہ احسان مند ہیں کہ انھوں نے مولانا کو پرامیسری نوٹوں کی چاٹ پر لگا کر سمجھا دیا کہ انسان کو کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کرنا چاہیے۔ پس مولانا نے قطرہ قطرہ جمع کیا تو دریا آپ ہوا چاہیے بعض لوگ اس دریا کو سمندر بتاتے ہیں مگر مولانا کی طبیعت اس قسم کی نہیں کہ وہ اپنے سرمائے کو چھپا کر رکھیں اُن کا کل سرمایہ بنک میں جمع ہے اور اس کی تعداد اُن کے اعزّہ کو معلوم ہے اور بعض ملازموں کو بھی۔ اب رہی جائداد۔ اس کی حالت یہ ہے کہ مولانا جب تک ملازم رہے اس وقت تک مکانات اور دوکانات کے سوا تجارت میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ اس کی تصدیق ہم کو بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھتے ہیں "تم اپنی والدہ سے کہدو کہ بڑے مکان کی فکر سے غفلت نہ کریں اور جیسی دکان . . . بیگم کی ہے ویسی ملے تو دو ایک اور ٹھہرائیں سات روپیہ مہینہ برابر ملے چلا جائے، تو نوٹ سے بہتر ہے۔ حلال صریح اور منفعت بھی خاطر خواہ" یا مثلاً ایک دوسرے خط

میں لکھتے ہیں "مرزا حسین بخش کو جواب دو کہ اپنا معاملہ جہاں چاہیں کریں چھ ہزار کا لین دین۔ میرا اطمینان ہونا مشکل ہے اور خصوصاً شاہ زادوں کے معاملات پیچیدہ اور خطرناک ہیں اور دور بیٹھے کافی تحقیقات کون کرے" یا ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ "بیوی صاحب نے کئی مکان لئے۔ لیکن سب جائداد میں دکان مجکو پسند ہے۔ باقی محل اور حویلیاں سب آخور کی بھرتی ہیں۔ غضب ہے کاظم علی والا مکان تیرہ سو کا ہے اور تین روپیہ کرایہ۔ نوٹ کے حساب سے اس کا کرایہ للعہ ہونا چاہیئے مگر کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم نے مکان مفت نہیں پایا بلکہ گٹھری بھر روپیہ دیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم کو پورا نفع نہ ملے۔ مولوی صاحب کے مزاج میں رحم۔ بیوی صاحب کو خیال نہیں۔ تم کو لیاقت نہیں۔ مولوی دعاگو کو قابلیت اور فرصت دونوں نہیں۔ مکان لاوارث سا پڑا ہے اگر کرایہ داروں کو یہ حال معلوم ہو تو دو تین روپے بھی نہ دیں۔ بڑی حویلی ہمیشہ خسارہ دیتی ہے مگر اعمال بد کی طرح بار دوش ہے خدا ہی ہے کہ اس کا بوجھ سر سے ٹلے جب تجربہ کر لیا کہ دہلی اور بجنور دونوں میں کوئی انتظام کرنے والا نہیں تو عاجز آکر نوٹ کا پہلو اختیار کیا ورنہ کوئی کرنے والا ہوتا تو حلال طور پر ایک ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ کماتا اور اصل محفوظ" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "مکان کو بیچ ڈالو۔ مجکو بہت آخور کی بھرتی پسند نہیں۔ مکان لو تو بھلا مولوی ۔ ۔ ۔ ۔ کا سا لو کہ دنیا میں بہشت یاد آئے۔ واہیات جھونپڑے جو تم نے لے رکھے ہیں نہ رہنے کے نہ سہنے کے۔ اب پانچ چھے ہزار سے کم کے مکان پر نظر مت ڈالو ایک عمدہ نفیس مکان مل جائے تو بس کافی ہے"

یہ عام قاعدہ ہے کہ نوکری سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہے۔ بے کاری ستاتی ہے۔ کام کا آدمی بے کار نہیں رہ سکتا۔ لوگوں نے یہی سوچ سمجھ کر مولانا کو صلاح دی کہ آنریری مجسٹریٹی کرلی جائے شہر کے شہر میں حکومت رہے گی۔ لیکن مولانا جو ساری عمر حقیقی مجسٹریٹی کو بھی بار گراں سمجھتے رہے اور خدا خدا کر کے اس اہم ذمہ داری سے چھوٹے وہ اس کرایہ کے ٹٹو کو لے کر کیا کرتے۔ غرض پنجابی کٹڑے کے چند دوستوں کا داؤ چل گیا اور انھوں نے تنا لوسے کے پھیر میں ڈال کر تجارت کے گورکھ دھندے میں پھانس لیا ہے اور ہرگز امید نہیں کہ مرتے دم تک اس سے چھٹکارا نصیب ہو۔

مولانا اپنی تجارت کا حال ایک نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اگرچہ ساز و سامان تکبر جمع ہیں سارے
مگر حاشا کہ مجھ سے بھول کر ایسی حماقت ہو

پر استغنا و خودداری کے ہوتے کیا تعجب ہے
کسی نادان کو مجھ پر گمان عجب و نخوت ہو

فقط ایک مشغلے کے طور پر تھوڑی تجارت ہے
اب اس میں آگے چلکر فائدہ ہو یا خسارت ہو

اگر کچھ فائدہ ہونا ہی ہوگا لاجرم ہوگا
حسد ہو کس لئے اور کیوں کسی کو رشک و غبطت ہو

پونہچتا ہے ہر اک کو جس قدر جس کا مقدر ہے
موافق چاہیئے تقدیر ہو تدبیر یا مت ہو

وگر نقصاں خدا نا خواستہ قسمت میں لکھا ہے
اُسے برداشت کرنے کی الٰہی مجکو ہمت ہو

ولیکن یہ نہ ہو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں
مجھے آجائے مرگ ناگہاں گر ایسی نوبت ہو

مسلمانوں کو بھی توفیق دے یارب کہ گھر گھر میں
تجارت ہو تجارت ہو تجارت ہو تجارت ہو

لیکن نقصان دیکھ کر تجارت کی دلدل میں سے نکلنے کی جتنی کوشش کرتے تھے اور باہر آنے کے لئے جتنے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اُتنے ہی اندر کو اُترتے چلے جاتے تھے۔ تجارت کے تعلق سے مولانا کی داد و ستد کا معاملہ عرصہ دراز تک ایک راز سربستہ رہا یہاں تک کہ اُن کے عزیزوں کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ مگر جب آئے دن کے خسارے معلوم ہوئے تو سارا حال کھل پڑا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک لاکھ کا اس طرح نقصان اوٹھایا ہے اور اب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے سے زیادہ معرضِ خطر میں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ تجارت ایک جداگانہ فن ہے۔ ادیب و فاضل و لکچرار و لیڈر ہونا اور بات ہے اور لوگوں کے پھندوں میں نہ پھنسنا اور بات ہے۔ ع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ پنجابیوں کے لونڈے جن کی گھٹی میں تجارت پڑی ہوئی ہے آج دیکھئے تو دہلی کے چاندنی چوک میں "بکس ہے دیا سلائی کا ایک پیسے کو" پکارتے پھرتے ہیں۔ کل بساطی کی چھوٹی سی دکان لئے بیٹھے ہیں اور برس دو برس نہیں گزرنے پائے کہ پر پرزے جھاڑ کر درست ہو گئے۔ اب دیکھئے تو ایک عالیشان دکان ہے دکان میں ولایتی سامان بھرا پڑا ہے اور ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا ہے جس پر موٹے موٹے حرفوں سے لکھا ہے حاجی فلاں اینڈ کو الغرض خود غرضوں دوستوں نے مولانا کو خوب خوب سبز باغ دکھا کر تجارت کی آڑ میں خوب لوٹا۔ اور وہ اِس طرح کہ ایک صاحب تشریف لائے اور مولانا سے ربط و ضبط بڑھایا تھوڑے دنوں کے بعد تجارت کے نام سے کچھ روپیہ لیا اور اُس کا منافع تجارت دو دو چار چار روپیہ روزانہ لا کر دینا شروع کیا مولانا سمجھے کہ چند سیکڑے پر روزانہ اتنا منافع کہاں مل سکتا ہے۔ اسی لالچ میں ایک شخص کو پچاس ہزار روپیہ دیدیا۔ لینے والے نے کچھ دنوں تک تو منافع کی رقم دی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ٹاٹ اُلٹ دیا اب نالش کرتے پھریئے۔ پکڑوا دیجئے جیل خانے بھجوا دیجئے۔ زر دادن و دردِ سر خریدن۔ یکے نقصان مایہ دیگرے شماتتِ ہمسایہ اسی کا نام ہے۔ ناچار عدالت میں جانا پڑا اور ڈگری کرائی۔ لیکن یہ رقم وصول کہیں کر رہے۔ اپنی کل جائداد تو ٹاٹ اُلٹنے سے پیشتر اپنے اعزہ کے نام لکھوا چکا ہے جب ڈگری کی میعاد گزر گئی تو پھر انہیں کو دیکھئے کہ سر بازار کپڑے بدل کر دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ باوجود ان نقصانات کے تجارت کا سلسلہ ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ ایک دکان سیونگ مشین کی ہے جس کی آڑھتیں جا بجا بڑے بڑے ضلعوں میں ہیں۔ آثار کہتے ہیں کہ اس میں بھی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

تجارت کے ضمن میں ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا نے شمسی پریس قائم کیا ہے جس میں صرف اُنھیں کی مصنّفہ کتابیں طبع ہوتی ہیں اور اگر ایک آدھ اور کسی کی کتاب آ گئی تو وہ بھی سہی۔ تو اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ مولانا اپنے تجارت کے کاروبار کو سمیٹ لیں اور صرف علمی تجارت میں مشغول رہیں۔ ہر کارے و ہر مردے۔ مولانا سے اور تجارت سے کچھ سروکار نہیں ہے جو کچھ روپیہ تجارت میں پھیلا پڑا ہے اُس کو سمیٹ کر بنک میں روپیہ جمع کر دیں ورنہ خوف ہے کہ کہیں بقیہ رقم بھی ضائع نہ جائے۔

ایک مرتبہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میاں بشیر کے بچوں کی تعلیم کے لئے تیس ہزار روپیہ دینے کا ارادہ ہے میں نے عرض کیا کہ ضرور دیجئے اس سے بڑھ کر اور کوئی مصرفِ خیر نہیں۔ اسی ضمن میں اٹاوہ کے ایک دوسرے البشیر کا ذکر آ گیا تو فرمانے لگے کہ مجھے اُس کے غریب اسکول کا بھی خیال ہے اور میرا ارادہ ہے کہ میں اُس کو کچھ دوں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حصۂ پنجم

تصنیف و تالیف و ترجمہ و لکچرز وغیرہ

اس حصّے میں مولٰنا ممدوح کی اُن مصنفات و مؤلفات اور تراجم کا ذکر ہی جن کو جناب ممدوح نے اپنی ذاتی خواہش سے بغیر کسی کی فرمایش کے زیبِ قلم فرمایا ہی۔ حصۂ دوم میں بعض قانونی تراجم کا حال درج کیا گیا ہی لیکن وہ ترجمے چوں کہ فرمایشی تھے اس لئے اُن کو حصۂ ہذا میں شامل نہیں کیا گیا۔

مولٰنا کی تصنیف کی بنیاد سب سے اول اُس وقت پڑی جس وقت وہ ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولٰنا کی اولاد اُس وقت اس قابل ہوگئی تھی کہ تعلیم کے مکتب میں بٹھائی جائے اور تربیت کے سبق اُن کو دیئے جائیں۔ اگر مولٰنا سررشتۂ تعلیم کی ڈپٹی انسپکٹری نہ کئے ہوتے اور ہمارے پُرانے مکتبوں کے بے ترتیب اور بے سروپا اور بے قاعدہ نصاب کا حال معلوم نہ ہوتا تو تعجب نہیں کہ مولٰنا عام لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو بھی مغلق اور غیر ضروری رسائل کے ڈھرّے پر لگا دیتے جن کے سمجھنے کی قابلیت بچوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اپنے بیٹے کو پرانے نصاب کی جگہ مروجہ اسکولوں کی کتابیں جو تھوڑی بہت باقاعدہ بنائی گئی ہیں پڑھاتے۔ لیکن مولٰنا کا یہ خیال تھا کہ ان سب سے الگ مگر دلچسپ اور مفید اور شگفتہ کتابیں تیار کی جائیں۔ جن سے بچوں کو نفرت کی جگہ الفت اور وحشت کی جگہ دلچسپی پیدا ہو اور کتاب کو شوق سے پڑھیں۔ اس قسم کی کتابوں کو پرانے مکتبوں میں ڈھونڈا اور موجودہ سرکاری اسکولوں میں تلاش کیا مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ چناں چہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

"اب میرے سب بچّے دو بیٹیاں جن میں سے بڑی[91] کے جواں مرگ مرنے کا میرے دل پر داغ ہی۔ اور بیٹا[92] خدا اُس کی

---

[91] اس لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ مولوی سید احمد حسن صاحب سے منسوب تھیں۔ عین عالم شباب میں بمقام لنگسور ملک دکن میں ۲۰ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا ۱۲

[92] میاں بشیر یعنی مولوی بشیر الدین احمد صاحب ۱۲

عمر دراز کرے اس قابل ہوئے کہ اُن کو پڑھنا شروع کرایا جائے۔ بیٹے کے بارے میں تو ابھی وہ طفل رضیع ہی تھا تبھی سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح سے میں نے اپنے باپ سے پڑھنا شروع کیا تھا میں اس کو پڑھاؤں گا۔ رہیں بیٹیاں اُن کے لیئے قرآن۔ ترجمۂ قرآن اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل راہ نجات وغیرہ کے سوائے کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور بیٹے کے لیئے بھی سرکاری اسکولوں کی کتابیں تو خاصی تھیں مگر میں اُن سے زیادہ شگفتہ کتابیں چاہتا تھا۔ کہ لڑکے کو پڑھنے سے وحشت نہ ہو اور اُن کو چاؤ سے پڑھے۔ ڈھونڈا تلاش کیا کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالت آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔"

مرآۃ العروس ابھی مولانا نے کسی تصنیف پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ البتہ تراجم کرنے کے اتفاقات پے در پے بڑے نام و نمود کے ساتھ پیش آئے کہ چار دانگ ہندوستان میں شہرت کا ڈنکا بٹ گیا اور جو درحقیقت تصنیف سے زیادہ مشکل اور دماغ سوز کام تھا۔ لیکن اب ضرورت ہوئی اپنے بچوں کی تعلیم کی اور اس طرح کہ شریف خاندانوں کے دستور کے مطابق مولانا کی لڑکیوں نے بھی قرآن مجید اور اُس کے معنی اور اُردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا۔ مولانا دیکھتے تھے کہ مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین اُن کے پیش نظر رہتے ہیں اُن سے اُن کے دل افسردہ اُن کی طبیعتیں منقبض اور اُن کے ذہن کُند ہوتے ہیں یہ دیکھ کر مولانا کو ایسی کتابوں کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے لبریز ہوں اور عورتوں کو جو اپنی زندگی میں معاملات پیش آتے ہیں۔ اُن کی اصلاح کے قابل کتاب تیار ہو۔ اُن کے دماغ میں جو توہمات اور جہالت کے خیالات جمے بیٹھے ہیں اُن کے دور کرنے کے لیئے کوئی کتاب بنائی جائے تاکہ ان میں تہذیب اور سنجیدگی پیدا ہو کتاب کی طرز بیان دل چسپ ہو اُن کا دل نہ اُکتائے۔ اُن کی طبیعت نہ گھبرائے۔ اِس لیئے مولانا نے اِن سب باتوں کا خیال کر کے مرآۃ العروس تصنیف فرمائی۔ تصنیف کا سلسلہ مسلسل نہ تھا کہ از بسم اللہ تا تمت ختم کر کے کتاب حوالے کی گئی ہو۔ بلکہ سبقاً سبقاً یہ کتاب تصنیف کی جاتی تھی۔ یعنی جس وقت ضرورت ہوئی فوراً اپنی بڑی لڑکی کے لیئے آگے کو سبق تصنیف کر دیا گیا۔ وہ بھی قلم برداشتہ جس وقت یہ سبق ختم ہو جاتے تو پھر اسی طرح دو دو چار چار صفحے آگے لکھ دیتے۔ اِن کتابوں کی اُردو معلّٰی ایسی نہ تھی کہ بچوں کو نہ بھاتی اور آب حیات کا کام نہ دیتی۔ مولانا فرماتے ہیں "وہ کتابیں بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیئے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لیئے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔"

غرض مرآۃ العروس اپنی بڑی لڑکی کے لیئے اس طرح تمام کی اور جب اس لڑکی کی شادی ہوئی تو یہی کتاب اُس کے جہیز میں دی۔ اَب ہندوستان میں شاید ہی کوئی شریف گھر ایسا ہوگا جہاں لڑکیاں یہ کتاب نہ پڑھتی ہوں۔ گویا آج تک تمام لڑکیاں ہمارے مولانا کی بڑی لڑکی کے جہیز سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب (مرآۃ العروس) "اصغری اکبری" کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور ایک عجیب بات اور ہے کہ اگرچہ

اِس قصّے میں مفروضہ واقعات درج ہیں لیکن وہ اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ واقعات اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصغری اکبری فرضی نام ہیں۔ ورنہ اصل میں مولانا نے اپنی لڑکیوں کا قصّہ لکھا ہے۔ بعض لوگ دہلی میں اصغری اکبری کا مکان ڈھونڈتے ہوئے آ نکلتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ سچ مچ کوئی اصغری اکبری ہو گزری ہیں۔ تمام شریف خاندانوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے لاکھوں کی تعداد میں اس کے نسخے چھپ چکے ہیں اور برابر چھپتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا خوب بات ہے کہ عورتوں میں مولوی نذیر احمد کی جگہ ہمارے مولانا اکثر "اکبری اصغری والے" پکارے جاتے ہیں۔ یہ خطاب مولانا کو مرآۃ العروس کی وجہ سے ملا ہے۔ ناظرین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اکثر عورتیں مولانا کے نام سے نہیں پہچانتیں۔ اور اگر "وہ اصغری اکبری والے" کہو تو فوراً سمجھ جاتی ہیں کہ مولانا سے مطلب ہے۔

مرآۃ العروس کیوں کر گورنمنٹ تک پہنچی

مولانا ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "دو تین برس ہوئے جب میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلم بند کیا۔ لڑکیوں کو تو اس کا وظیفہ ہو گیا اور ہر روز ختم کتاب کا تقاضا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ برس بعد اصغری کا حال بھی لکھا گیا۔ ہوتے ہوتے اس کتاب کا چرچا محلے میں ہوا اور چند عورتیں اس کے سننے کو آئیں جن نے سنا پسند کی۔ اونچے اونچے گھروں میں یہ کتاب منگوائی گئی۔ نقل[۱] کے ارادے ہوئے۔ جب میں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے اور خوب دل لگا کر پڑھتی ہیں۔ اور جو نہیں پڑھ سکتیں وہ سنتی ہیں تب اس کتاب کو ڈائرکٹر صاحب کے ذریعے سے سرکار میں پیش کیا۔" مصنف کے شان گمان میں بھی نہ تھا کہ مرآۃ العروس ایک عجیب واقعے سے آسمان قدر دانی میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گی۔ اور اس پر ایک ہزار نجوم نچھاور کیے جائیں گے۔ اس واقعے کی حکایت نہایت دل چسپ ہے اور وہ یہ ہے۔

کمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع جالون کے ہیڈکوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ میاں بشیر ٹانگن پر سوار وہ تین آدمی ساتھ لیے اُدھر سے نکلے صاحب کو دیکھ کر ٹانگن پر سے اُتر صاحب کو سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو؟

میاں بشیر:۔ چند پند۔

صاحب:۔ یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

میاں بشیر:۔ یہ کتاب میرے والد نے میرے لیے بنا دی ہے۔

صاحب:۔ کتاب کا مضمون کیا ہے؟

میاں بشیر:۔ بڑی اچھی اچھی نصیحتیں ہیں۔

صاحب:۔ مجکو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

میاں بشیر:۔ میں ابھی گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

---

[۱] کہاں جھانسی کہاں مارہرہ لیکن مرآۃ العروس کی مقبولیت کو دیکھیے کہ چھپنے سے قبل بھی اُس کی نقلیں کہاں کہاں تک پہنچیں ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ایک نسخہ میرے کتاب خانے میں ابھی موجود ہے۔ یہ کتاب اُس وقت تک گورنمنٹ کے ہاتھوں میں بھی نہیں پہنچی تھی۔ مگر لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی تھی ۱۲۔

تھوڑی دور سے پلٹ کر۔

میاں بشیر: ابّی بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں۔ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں بڑے مزے مزے کی باتیں ہیں۔

ابا صاحب: ضرور سب لاؤ۔

میاں بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لاکر صاحب کے حوالے کیا۔ شام کو مولانا جو کچہری سے گھر آئے تو بہن بھائی آپس میں لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ مولانا نے سن کر کہا کیا مضائقہ ہے میں اُن سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔ اگلے دن جو مولانا کمپسن صاحب سے ملے تو شاید انھوں نے ان کتابوں کو کچھ دیکھ بھال لیا ہوگا۔ کہا کہ ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کالپی کو پہنچا دو۔ یہاں مولانا کے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اچھے لکھنے خوش خط اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ مولانا نے شیرازہ توڑا اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آ گئے۔ چلتی ہوئی جلدیں بندھوا کر جما تو پرسوں کہہ گئے تھے۔ مولانا نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مرأۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ ہر اپنی طرز مقبول میں پہلی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے۔ اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ لفٹنٹ گورنر تھے وہی سر ولیم میور جن کی فرمایش سے مولانا نے انکم ٹکس کا ترجمہ کیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے مرأۃ العروس کو آور آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ کی طرف سے سرِ دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی کیمرج کلاک پر مولانا کا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے۔ اس انعام کے لیئے اول تو مولانا اٹاوے بُلائے گئے تھے لیکن بعد کو اطلاع دی کہ آگرے کے دربار میں انعام عطا ہوگا۔ یہ دربار ۲۶ر جنوری ۱۸۶۹ء کو منعقد ہوا تھا۔ بڑے بڑے عہدہ دار ملکی اور فوجی اور بڑے بڑے رئیس بُلائے گئے تھے۔ مرأۃ العروس اور اُس کے مصنف کی نسبت دربار میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ یہ تھا۔

"........ مگر ایک اور بڑی مشکل کی بات یہ ہے کہ اردو اور ہندی زبان میں کتابیں بہت کم ہیں اور بغیر اس کے ممکن نہیں کہ رعایا میں تعلیم و تہذیب اخلاق کا رواج ہو سکے۔ خصوصاً تعلیم نسواں کہ اس کی زیادہ تر حاجت ہے۔ میں ہندوستان کی ترقی اور تہذیب کی طرف سے اس وقت تک ناامید ہوں جب تک کہ اس ملک کی مستورات میں تعلیم نہ ہو۔ پردہ سسٹم کی وجہ سے جہاں اس ملک کی مستورات میں تعلیم کی دقتیں ہیں۔ وہاں ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہندوستانی زبان میں اچھی اچھی کتابیں مطلق نہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے جو کتابیں تصنیف کی جاتی ہیں میں اُن کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ اور اس واسطے میں نے آپ لوگوں کو شہزادے ڈیوک آف اڈنبرا کے تشریف لے جانے کے بعد ٹھہرا رکھا ہے کہ اس دربار میں اس قسم کی تصانیف پر جو قابل انعام ہیں اُن کی عزت اور قدر و منزلت بڑھائی جائے اور اُن پر انعام دیا جائے۔ لیکن ضرور ہے کہ اس امرِ اہم میں اُس بادشاہ اعظم سے جو علم کا سرچشمہ اور دانائی کا بخشنے والا ہے اعانت چاہی جائے۔ اُس کے نزدیک دشوار آسان اور محال ممکن ہے اور اُس کے حکم سے جو دیار تاریکی میں ہیں منور ہو جائیں اور جو قومیں جہالت میں پھنسی ہیں علم و نور کی روشنی حاصل کریں جب وہ مدد کرے تو

کچھ اندیشہ نہیں"

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی اس تقریر کے بعد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے مولنا مولوی نذیر احمد صاحب کو پیش کیا اور جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے پھر یوں خطاب فرمایا۔

"اس شخص (مولنا نذیر احمد صاحب) کے لیئے ایک ہزار روپیہ کا انعام تجویز ہوا ہے کہ اس نے ایک کتاب مرآۃ العروس کے نام سے تصنیف کی۔ جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی راہ و رسم خانہ داری کا ایک بہت خوب قصّہ ہے۔ اس کا لطف یہ ہے کہ دل چسپ ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو باعصمت اور صاحب حیا مستورات کے پڑھنے کے لائق نہ ہو۔ اس کے ہر صفحہ سے عقل و دانش کی اصلاح اور تہذیب اخلاق اور حسن معاشرت کی نصیحت نکلتی ہے۔ محمد نذیر احمد! مجھے نہایت ہی خوشی ہے کہ یہ انعام ہزار روپے کا تمھیں دوں اور اس واسطے کہ تمھاری قدر زیادہ ہو میں اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی[1] دیتا ہوں جس پر عبارت کندہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری تصنیف کی بابت میری کیا رائے ہے۔"

کمپسن صاحب نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کتاب کو مفید سمجھ کر گورنمنٹ میں انعام کے لیئے پیش کیا۔ بلکہ لاٹ صاحب کے ریویو کے ساتھ اپنا ریویو بھی گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔ ہم ان دونوں قدردان اور علم دوست حکّام کے ریویو درج کیئے دیتے ہیں اس سے ہمارا یہ مطلب بھی ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے بالغ نظری سے دیکھا بھی تھا یا نہیں۔

کمپسن صاحب بہادر کا ریویو "مجھ کو اس کتاب کے موصول ہونے سے بہت خوشی حاصل ہوئی اس لیئے کہ سرکار کے ایک ذی لیاقت اور عالم با استعداد ملازم کی تصنیف ہے۔ مشارٌ الیہ اُن تین ہندوستانی اشخاص میں سے ہے جن کو سر جارج ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر سابق نے چند سال ہوئے اُردو زبان میں انڈین پنل کوڈ کا ترجمہ کرنے کے لیئے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس خدمت کے جلدو میں خلعت حاصل کیا اور اس وقت سے سر رشتہ مال میں عمدہ عہدوں پر مامور رہے۔

یہ کتاب نہایت دل چسپ اور اس ملک کے باشندوں کے مناسب حال ہے۔ آج تک اس قسم کی کتاب کوئی نہیں ہوئی۔ عبارت اور طرز بیان کے لحاظ سے زبان اردو کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ کتاب مذکور اس باب میں میرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے اور فی الواقع الف لیلہ اور سید بدرالدین خان دہلوی کی بوستان خیال کی اردو کے ہم پلہ ہے۔ نذیر احمد کی یہ تصنیف روزمرہ کے پڑھنے کے لائق اور عام فہم ہے اور اس کا مطلب صاف اور عمل کرنے کے قابل ہے۔ اس میں مضامین عاشقانہ اور نازک خیالات جن کو اس ملک کے مصنف اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں نہیں ہیں۔ اور مجھ کو اُمید ہے کہ اَور بہت لوگ اس

---

[1] اس گھڑی کے کلاک پر یہ عبارت کندہ تھی Presented to Mohammad Nazir Ahmad for Sir William Muir K.C.S.I. LL.D. Lieutenant Governor N.W.P. 1869 as a private token of approval for his work Mirat-ul-arus.

(ترجمہ) یہ گھڑی ۱۸۶۹ء میں من جانب سر ولیم میور کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی۔ محمد نذیر احمد کو خاص طور پر ان کی قابل پسند تصنیف مرآۃ العروس پر دی گئی" یہ گھڑی بذریعہ ریلوے پارسل بھیجی گئی تھی۔ ریل میں غائب ہو گئی ۱۲۔

Brides Mirror - 1869

اِس مصنّف کی تقلید کرینگے۔ یہ کتاب ظاہرا عورتوں کے فائدے کے لیئے تالیف کی گئی ہے۔ اور اس میں اہلِ اسلام کے ایک شریف خاندان کا ایک فرضی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کل قصہ شرفا کی زبان روزمرّہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہی اس ملک کی اصل اردو ہے نہ وہ جس میں نمایش کے لیئے بڑے بڑے الفاظ اور مضامینِ رنگین بھر دیئے جاتے ہیں۔ حالاتِ واقعی ایسے لکھے ہیں جو ہر ایک عورت کو سسرال میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اور زنان خانے کے وہ طور و طریق بیان کیئے ہیں کہ جو اہل یورپ اس کو پڑھے گا وہ سب سے اول ہندوستان کی عورتوں کے روزمرّہ کے حالات اس کتاب سے حاصل کریگا۔ عورتوں کی زبان اور ان کی رغبت اور نفرت اور بچّوں کا لاڈ پیار اور امورِ خانہ داری میں عورتوں کا اختیار اور ان کی جہالتِ محض اور حسد اور مکر و فریب یہ سب اِس کتاب سے بخوبی عیاں ہوتے ہیں اور بیان سے کوئی علامت مبالغے کی نہیں پائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے اصل حقیقت بیان کی ہے اور قصّے کی نصیحت نفسِ قصّے سے نکلتی ہے۔ مشارٌ الیہ کی لیاقتِ علمی مشہور و معروف ہے لیکن اس نے اِس کتاب میں اس کے اظہار کا قصد نہیں کیا اور جا بجا جو خیالات اس نے لکھے ہیں ان سے صداقت اور طبیعت کی راستی پائی جاتی ہے۔ جن اشخاص کا اس قصّے میں مذکور ہے وہ پڑھنے والے کو ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا ان کی نقل ہو رہی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں کسی ہندوستانی مصنف نے اس سے پہلے بجائے لفّاظی اور مدّاحی کے بات چیت اور گفت و شنید سے اصل حقیقت کو ایسا ادا نہیں کیا۔ جس وقت یہ کتاب مشہور ہوئی سیکڑوں آدمی اس کو شوق سے پڑھیں گے اور ممکن نہیں کہ تعلیمِ نسواں کے لیئے فائدہ مند نہ ہو"

جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کا ریویو بجانب پرائیوٹ سکرٹری

"جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے کتاب مرآۃ العروس کو ملاحظہ فرمایا اور بہت خوش ہوئے یہ کتاب اس رتبے کی ہے کہ نواب ممدوح کے نزدیک اردو میں کوئی کتاب اس کی ثانی نہیں ہے جو تقریظ ڈاکٹر نے لکھی ہے واقع میں یہ کتاب اُس کے لائق ہے۔ حالات بعینہ مثل سرگذشت واقعی کے ہیں اور زبان سلیس اور بلا تصنع ہے۔ اور ہندوستانیوں کی خانہ داری کے معاملات راست راست مطابقِ حقیقت بیان کیئے گئے ہیں اور جن اشخاص کا مذکور اس میں ہے ان میں سے ہر ایک کی طینت کا حال اس سے جدا جدا ظاہر ہوتا ہے اور جا بجا بلا تصنع دل پر موثر ہوتا اور گداز طبیعت پیدا کرتا بھی اس سے پایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک واقعے سے تہذیبِ اخلاق یا حسنِ معاشرت کی ایک نصیحت نکلتی ہے اور یہ بات بھی اِس سے بخوبی روشن ہوتی ہے کہ ہندوستان میں مستورات کو معاملاتِ خانہ داری میں بہت سا دخل ہے اور جب کہ ذہانت اور نیک ذاتی پر اثرِ تعلیم مستزاد ہو تو وہ اختیار نہایت عمدہ نتیجوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ اور یہ ہرگز خیال میں نہیں آتا کہ ہندوستانیوں میں سے کوئی مرد شریف اس کتاب کا مطالعہ کرے اور مستورات کی تعلیم سے جو فوائد بے شمار ہوتے ہیں وہ اس کے دل پر کالنقش فی الحجر نہ ہو جائیں علاوہ بریں اس کتاب میں ایک عجیب صفت یہ ہے کہ ہندوستان کی مستورات کے پڑھنے کے واسطے بہت مناسب ہے۔ ممکن نہیں کہ ان کو مرغوبِ خاطر نہ ہو اور ان کی عقل و دانش کی اصلاح نہ کرے اور کسی شریف ہندوستانی کو اپنے خاندان میں اس کتاب کو پڑھانے میں تامّل نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اس میں ان کا دل بھی لگے گا اور فائدہ علمی بھی حاصل ہوگا۔ تمام کتاب میں کوئی مضمون ایسا نہیں جو پاکیزہ اور پُر از تہذیب نہ ہو یا جس سے کسی ایسے قاعدے اور اصول کی تعلیم نہ ہوتی ہو جو خاص کر اہلِ اسلام کے نزدیک عیب سے بری اور نیکی سے مملو ہے۔ محمد نذیر احمد کی بڑی تعریف اس بات کی ہے کہ اس نے راستی کی

[1] مولانا کی تصانیف پر لفٹنٹ گورنروں یا ڈائرکٹروں کے جتنے ریویو درج ہوئے ہیں وہ اُنہی کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ جن الفاظ اور ترتیب سے اُس کی منتخب عبارتیں بجنسہٖ نقل کر دیئے گئے ہیں۔

جانب ایک نئی راہ نکالی ہے اور سادہ و سلیس عبارت میں تصنیف مفید اور دلچسپ کا نمونہ دوسروں کے واسطے پیدا کر دیا ہے۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کو یقین ہے کہ بہت لوگ جلد اس طرز کی تقلید کریں گے۔ جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو ایک نوع خاص کی خوشنودی محمد نذیر احمد کو پورے ایک ہزار روپے کے انعام کے عطا کرنے میں بلکہ از راہ قدردانی خود اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی جس پر الفاظ مناسب کندہ ہوں گے عطا فرمائیں گے۔ اور امید رکھتے ہیں کہ بہ صلہ محمد نذیر احمد کو کسی مقام پر جو مشارٌ الیہ کے لیے سہولت کی جگہ ہو یعنی شاید اٹاوہ۔ جب کہ نواب محتشم الیہم کا لشکر اس مقام سے ہو کر گزرے سر دربار عنایت فرمائیں۔

حکم دیا جائے کہ سرکار کے واسطے دو ہزار جلدیں پتھر کے چھاپے کی نہایت پسندیدہ طرز کی جلد مطبوع ہوں۔ اور محمد نذیر احمد کو اجازت ہے کہ اس کتاب کا حق تصنیف حاصل کرے اور اپنی طرف سے اس کو چھپوانے کے لیے بھی تدابیر مناسب عمل میں لائے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت شہرت پکڑے گی گو اس کی عبارت سادہ و سلیس دیسی زبانوں کے پڑھنے والوں کی نظر میں اوّل بے زینت اور نئی نئی معلوم ہو۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کی دانست میں مناسب ہے کہ اس کتاب کے لیے صاحبان بورڈ ممتحن کی خدمت میں سفارش کی جائے کہ امتحان میں داخل کرنے کے لائق ہے۔ اس ملک کی عام مروجہ حکایاتِ بے لطف کے مقابل میں کہ وہ اکثر قابلِ اعتراض بھی ہیں اس کتاب کے نہایت عمدہ مضامین پڑھنے والوں کو نہ صرف یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ سلیس اور فصیح زبان روزمرہ سے واقفیت حاصل ہو بلکہ امورِ خانہ داری میں بھی بہت واقفیت پیدا ہو گی اور ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو بوجہ اپنے مناصب کے لوگوں سے کام پڑتا ہے اُن کے لیے پیچیدہ معاملات میں بکار آمد نہ ہو۔"

دونوں صاحبوں کے ریویو کی تنقید

اگرچہ ایک مصنف کی تصنیف پر ایسے بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں کے ریویو ضرور قابلِ فخر ہو سکتے ہیں خاص کر اس صورت میں کہ ایک (لفٹنٹ گورنر بہادر) اُن میں عربی کے بڑے عالم و فاضل اور ادیب ہونے کے علاوہ اُردو بھی جانتے تھے۔ مسلمانوں کے خیالات اور راہ و رسم سے بھی واقف تھے اور دوسرے (ڈائرکٹر صاحب) خیر عربی تو نہیں مگر فارسی اور اُردو میں اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی تقلید و نقل کرتے تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے مرآۃ العروس کو چھپنے کے قبل نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا بھی تھا۔ اور جا بجا دونوں نے نیلی پنسل سے حاشیۂ کتاب پر کچھ یادداشتیں بھی لکھی تھیں۔ جن لوگوں نے اس عمیق نظر سے مرآۃ العروس کو دیکھا ہو اور اُس پر ریویو کیے ہوں تو وہ ریویو ضرور قابلِ قدر ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی۔ مگر ڈائرکٹر صاحب بہادر کے ریویو کے ایک خیال نے ہمارے اُوپر یہ راز بالکل منکشف کر دیا کہ مادری زبان کے سوا کسی اَور زبان کی بیوٹی یا حسن کی دادِ صحیح کوئی شخص نہیں دے سکتا۔ یہ بات ڈائرکٹر صاحب کے اس فقرے سے ہم کو معلوم ہوئی کہ "یہ عبارت اور طرزِ بیان کے لحاظ سے زبانِ اُردو کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ کتاب مذکور (مرآۃ العروس) اس باب میں مرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے۔ اور فی الواقع الف لیلہ اور بدر الدین خاں دہلوی کی بوستانِ خیال کی اُردو کے ہم پلہ ہے۔"

اگر ڈائرکٹر صاحب صرف اُردوئے معلّٰی کا ذکر کر کے چھوڑ دیتے تو بھی کچھ مضایقہ نہ تھا۔ مگر بوستانِ خیال یا الف لیلہ کو مرآۃ العروس کے لٹریچر کا ہم پلہ بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ کمپسن صاحب اردو کی صحیح بیوٹی کو نہیں سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے مقابلے کے لیے غلط کتابیں منتخب کیں۔ اگر بوستانِ خیال اور الف لیلہ کے مصنف زندہ ہوتے تو ہم اُن سے

پوچھتے کہ کہئے کمپسن صاحب کی رائے سے آپ کو اتفاق ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ وہ سنتے ہی برملا کہہ اٹھتے کہ "کمپسن صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ ہماری کتابوں کو مولوی نذیر احمد صاحب کی مرأۃ العروس کے مقابلے میں لائے۔ یہ مانا کہ ہماری زبان بھی ٹکسالی ہے۔ وہ تمام خوبیاں جو ایک زبان میں ہونی چاہئیں وہ ہماری کتابوں میں سب موجود ہیں مگر زمانے اور وقت کا بھی آپ کو لحاظ و پاس کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے وقت کی اُردو اَور تھی اور اب اُس کا پایہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ وہ نہایت تیزی سے ساتھ ترقی کے زینے پر چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری کتابوں میں محاوروں اور تشبیہوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ مضامینِ کتاب بوجھل ہو گئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی اُردو بھی مثل ہماری اُردو کے بامحاورہ ہے مگر اُن کی عبارت میں سادگی اور بے تکلفی بہت ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ دہلی کی چند شریف زادیاں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ آورد کا نام نہیں اور ہمارے ہاں اس کی کمی نہیں۔"

اب رہے مرزا نوشہ اور اُن کی اُردوئے معلّی۔ ہاں اگر لٹریچر کا کوئی کتاب مقابلہ کر سکتی ہے تو بس یہی ایک کتاب ہے مگر افسوس اس کا مقابلہ بھی مرآۃ العروس سے نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک تو اُردوئے معلّی میں بھی آورد ہے۔ اور اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تحریر کے مرزا ہی موجد ہیں۔ موجد کو جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ اُن کو بھی آئیں۔ بعض خطوط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی مرزا نے باتیں بنائی ہیں اور نہایت تکلف اور بناوٹ سے اُن باتوں کو قلم بند کیا ہے لیکن یہ داغ بیل انھیں کی ڈالی ہوئی ہے اور ہمارے مولنا اسی داغ بیل پر لٹریچر کے شگوفے کھلا رہے ہیں۔ بہر کیف مرزا نوشہ بڑے اکھل کھرے مزاج کے آدمی تھے اگر وہ زندہ ہوتے اور اُن سے پوچھا جاتا تو بڑی لتاڑ بتاتے اور بڑے کرارے جواب دیتے اور کہتے کہ "تو کیا بکتا ہے یہ دکھا کہ مجھ سے پہلے یہ روش کس نے اختیار کی۔ کس نے اس کی داغ بیل ڈالی"۔ میں عرض کرتا "حضرت نے"، وہ فرماتے "پھر میری اُردوئے معلّی سے مرأۃ العروس کا کیا مقابلہ کرتا ہے"۔ میں عرض کرتا کہ "گستاخی ہوئی معاف کیجئے۔ لیکن ادباً اتنی عرض ہے کہ آپ نے ضرور داغ بیل ڈالی مگر اُس میں شگوفے مولنا نذیر احمد صاحب ہی نے کھلائے ہیں"۔ وہ یہ سُن کر ذرا کے ذرا چُپ ہو جاتے اور پھر فرماتے۔ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من ست

غرض ڈائرکٹر صاحب اگر مرأۃ العروس کا غلط مقابلہ بوستانِ خیال۔ الف لیلہ۔ اُردوئے معلّی سے نہ کرتے تو ہم اتنی اور قلم فرسائی کیوں کرتے۔ ہمارے نزدیک تو خود مولنا نے بھی ڈائرکٹر صاحب کے اسی خیال پر اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ "میں صاحبِ تصنیف ہوں اگرچہ میں اسے قابلِ فخر نہیں سمجھتا۔ میری کتابوں کے ساتھ سر ولیم میور کی رائے لکھی ہوئی ہے۔ مجھے اِس سے کچھ خوشی نہیں۔ اگر کوئی اونیٰ زبان داں مسلمان بھی میری کتابوں کو پسند کرے تو میں اُس سے زیادہ خوش ہوتا ہوں"۔

کمپسن صاحب اور دوسرے لٹریری مین کی مزید قدر افزائی

غرض کمپسن صاحب نے مرأۃ العروس کو گورنمنٹ میں پہنچایا۔ ایک ہزار روپیہ انعام میں دلوایا۔ دو ہزار جلدیں گورنمنٹ نے خریدیں۔ خود لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی جیبِ خاص سے ایک گھڑی مرحمت کی۔ مصنف کی سرِ دربار عزت افزائی فرمائی۔ یہ سب کمپسن صاحب کی وجہ سے ہوا۔ لیکن صرف انھیں باتوں پر انھوں نے اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مولنا سے درخواست کی

کہ مرآۃ العروس کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ مولانا نے جواب دیا۔ یہ بھی آپ کا۔ مرآۃ العروس بھی آپ کی اور شہرت بھی آپ ہی کی دی ہوئی۔ پھر مجھ سے طلب اجازت فضول۔ شوق سے ترجمہ کیجئے۔ آپ کو اجازت کی ضرورت! ترجمہ کیجئے اور شوق سے ترجمہ کیجئے۔" بہرحال نہ صرف گورنمنٹ نے اور کیمپن صاحب نے انعام دلوا کر اور انگریزی میں ترجمہ کر کے کتاب اور صاحب کتاب کی عزت افزائی کی۔ بلکہ انگریزی کے سوا اور لوگوں نے۔ بنگالی۔ گجراتی۔ بھاشا۔ پنجابی۔ کشمیری۔ زبانوں میں مولانا کی اجازت سے مرآۃ العروس کے ترجمے کئے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ نے رومن میں چھپوایا۔ کیمپن صاحب کے انتقال کے بعد پادری وارڈ صاحب ایم۔ اے کیمبرج یونیورسٹی نے بھی اس کو رومن میں چھپوایا اور جس طرح کیمپن صاحب نے توبۃ النصوح کی شرح لکھی تھی پادری صاحب نے بھی اس کی شرح مع ترجمہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی۔

ترجمہ کرنا اور چھپوانا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ہر زبان کے انشا پردازوں نے مرآۃ العروس کو پسند کیا اور اس کی ضرورت سمجھی۔ اس کے سوا مولانا نے اگرچہ مرآۃ العروس کی باضابطہ رجسٹری کرا دی تھی مگر کتب فروشوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی بلکہ چوری سے بلا اجازت مصنف ہزارہا جلدیں چھاپ ڈالیں اور ابھی تک چھاپتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس خیال سے مولانا خاموش رہے کہ شہرت بجائے خود صلہ عظیم ہے۔

نواب محسن الملک بہادر مرآۃ العروس کی ہنسی اڑاتے ہیں

ہنسی کی تو کوئی بات اس وقت تک سمجھ میں آئی نہیں۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مرحوم اس کتاب پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ ہندوستانی سوسائٹی بہت ہی پستی کی حالت میں دکھائی ہے۔ مثلاً زردے میں زعفران کی جگہ ہارسنگار کی ڈنڈیوں کا استعمال کرنا۔ لیکن یہ کوئی اعتراض میں اعتراض نہیں۔ ہر ملک میں ہر درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہمارے مولانا نے بھی انھیں لوگوں کو لیا ہے۔ ان کے لیے اس سے بہتر نمونہ خوش سلیقگی ہو نہیں سکتا۔ اور اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ مرآۃ العروس سے بہتر آج تک عورتوں سے متعلق ہندوستان میں کوئی کتاب نہیں تصنیف ہوئی۔ نواب صاحب کی ہنسی اڑانے کے متعلق مولانا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "میں نے مولوی مہدی علی کو فی عمری صرف ایک بار آگرے میں دیکھا جن دنوں مجھ کو انعام مرآۃ العروس کا اٹاوے میں ملنے والا تھا مولوی مہدی علی ڈیوک آف اڈنبرا سے ملنے کلکتے گئے۔ وہیں سے مجھ کو بلا تعارف بڑے تپاک کا خط لکھا اور بہت اصرار کیا کہ اٹاوے میں میرے مکان پر ٹھہرنا۔ چنانچہ میں ریل سے اترا۔ مولوی مہدی علی کے رشتہ دار مجھ کو کشاں کشاں اپنے گھر لے گئے اور بہت مدارات کی۔ گو مولوی مہدی علی وہاں نہ تھے۔ لیکن نواب لفٹنٹ گورنر نے مجھ کو اٹاوے سے واپس کیا اور آگرے کے دربار میں بلایا۔ وہاں منشی غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹی کے یہاں میں نے مولوی مہدی علی کو دیکھا۔ ایک صبیح نوجوان ٹھنو چھیل کی سی پوشاک بے باک مرآۃ العروس کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ جوں میں خیمے میں پہنچا۔ منشی غلام غوث نے کہا۔ لیجئے حضرت مرآۃ العروس کے مصنف صاحب بھی تشریف لاتے ہیں منشی غلام غوث کی تقریب سے ہم دونوں سے تو مولوی مہدی علی کشیدہ سے رہے۔ شاید مرآۃ العروس کی ہنسی اڑانے سے جھینپے ہوں۔ مجھ کو حیرت ہوئی

۱۵ مرآۃ العروس چھپنے کے نو برس بعد کیمپن صاحب نے ترجمے کی خواہش کی تھی، ۲۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو لندن سے انھوں نے مولانا کو ایک خط لکھا تھا کہ میں مرآۃ العروس کا ترجمہ کر رہا ہوں اور میری بیٹی مرآۃ العروس- توبۃ النصوح- اور بنات النعش پڑھ رہی ہے ۱۲-

یا الٰہ العالمین یہ وہی مہدی علی ہے جس نے مجکو کس تپاک سے اپنے گھر ٹھیرایا تھا۔ کہ اب بالمشافہہ میری کتاب کی نجاصانہ تنقیح کر رہا ہے"

مولنا جب حیدر آباد تشریف لے گئے تو نواب مکرم الدولہ[2] بہادر کو بھی مراۃ العروس کی ایک جلد دی تھی۔ یہ صاحب[1] صدر المہام مال گزاری تھے سر سالار جنگ مرحوم کے داماد اور بھانجے۔ انھوں نے بھی ایک اعتراض کیا تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کیسی بد مذاق اور مسرف ہے کہ چند جزوں کی کتاب پر ہزار ہا روپے ڈالا چاہئے شعر فہمی عالم بالا معلوم شد۔

سر سید اور مراۃ العروس

شمس العلما مولنا حالی "حیاۃ جاوید" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ "سر سید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیئے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ

اول تو جب سے ان کو مسلمانوں کی سوشل رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے۔ غدر سے چند روز بعد اُن کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اور دہلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی۔ اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھ کر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سُنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی

دوسرے ان کے خاندان کی فیمیل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی۔ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سر سید نے ایجوکیشن کمیشن میں اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اُس کو دیکھ کر سر سید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے"

سر سید نے مراۃ العروس کی نسبت جو خیال قائم کیا تھا اُس کے صحیح و غلط ہونے کے ثبوت میں ہم مولنا حالی کی عبارت کو بالکل کافی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں لکھ سکتے کہ عورتوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ بمقابلہ سر سید کے ہمارے مولنا کو بہت زیادہ تھا۔ اور اگر ہمارا یہ خیال غلط ہے تو ناظرین حیاۃ جاوید کا اقتباس مکرر غور سے پڑھ لیں اور بس

لوگوں کی عادت ہے کہ کوئی نئی بات کی جائے تو اُس پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے لیئے مراۃ العروس سے پہلے اس ڈھنگ کی کوئی اُور دوسری کتاب نہ تھی یہی وجہ

---

[1] نواب محسن الملک مرحوم کے مزاج میں مذاق تو بھرا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کی بولی کی نقل بنا بنا کر اعتراض کر رہے تھے ۱۲

[2] نواب مکرم الدولہ بہادر کی یہ ذاتی رائے ہو گی۔ ورنہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام خود بڑی فیاض اور قدر دان علم ہے جس کی صد ہا مثالیں موجود ہیں شمس العلما مولنا حالی، شمس العلما مولانا شبلی کے علمی وظائف اسی گورنمنٹ سے جاری ہیں۔ اور اسی طرح اَور لوگوں کے بھی۔ خود ہمارے مولنا کو ان سات رسالوں کی وجہ سے جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے واسطے لکھے تھے دو سو روپے ماہوار پنشن میں شامل ہو گئے تھے ۱۲۔

ہے کہ بعض لوگوں کو بعض باتیں ناگوار ہوئیں۔ ابھی دو تین برس ہوئے کہ "تہذیب نسواں" میں سلطانہ بیگم نے ایک مضمون دہلی سے لکھا تھا کہ دہلی مشن اسکول میں پردہ پارٹی دی گئی تھی جس میں مرأۃ العروس کا ایکٹ بھی کیا گیا تھا۔ ایک لڑکی اصغری جیسی سگھڑ بنی تھی اور دوسری اکبری جیسی پھوہڑ۔ اس ایکٹ میں یہ بات ثابت کی گئی تھی کہ مرأۃ العروس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں خانہ داری کی بہت پست حالت ہے اور اُن کی خانہ داری کے اُصول تہذیب سے بہت زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ اور مرأۃ العروس میں ہی مسلمانوں کے گھروں کی ہجو کی گئی ہے۔ اور بہت کچھ خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ اُس میں مسلمانوں کے گھروں کا اس قدر بُرا نمونہ دکھایا گیا ہے جس سے غیر قوموں کی نظروں میں مسلمان عورتیں ذلیل و حقیر دکھائی دیتی ہیں یہ اور دوسری قسم کے اعتراض سے "چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر" کی قسم کے ہیں۔

اِس اعتراض پر جتنا غور کرو اُتنا ہی بودا اور پھسپھسا معلوم ہوتا ہے۔ جب تک نیک و بد کا مقابلہ نہ کیا جائے دونوں میں فرق کیوں کر معلوم ہوگا۔ کالے اور گورے۔ خوب صورت اور بدصورت۔ امیر اور غریب۔ عالم اور جاہل۔ نیک مزاج۔ اور بد مزاج سگھڑ اور پھوہڑ۔ جب تک اِن کو پہلو بہ پہلو نہ دکھایا جائے اور جب تک دونوں کی اصلی حالت نہ دکھائی جائے۔ دونوں کی بھلائی بُرائی میں کیوں کر تمیز ہوسکتی ہے۔ بُرائی کی بُرائی دکھا کر بھلائی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جب تک اکبری کی بدسلیقگی نہ دکھائی جاتی اصغری کا سگھڑاپا کیوں کر قابلِ قدر ہوتا۔ مولانا نے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کی ہمیشہ اخلاقی نمونے اِسی پیرائے میں دکھائے جاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے گھرانوں کی ایسی ردی اور پست حالت دکھائی گئی ہے جس سے اُن کی ذلت ہے۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کون سی قوم ہے جس میں اچھے بُرے نہیں ہوتے۔ آخر اصغری جیسی سگھڑ بھی تو مسلمانوں ہی کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اگر ایک کو اعلیٰ درجے کا سلیقہ مند اور دوسری کو اُس کے خلاف نہ بنایا جاتا تو پھر قصے کا لطف ہی کیا خاک رہتا۔ اور مقصود نصیحت کس طرح حاصل ہوتا۔

مرأۃ العروس کے تتبع میں کتابوں کا لکھا جانا

اہلِ قلم کو جب مرأۃ العروس کے انعام کا حال معلوم ہوا۔ تو بہت کچھ قلم فرسائی کی گئی۔ لیکن اُس کی عزت اور منزلت کو کوئی کتاب نہیں پہنچی۔ مرأۃ النسا۔ مفید النسا۔ زینت العروس۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب مرأۃ العروس کے اتباع میں لکھی گئیں۔ مگر اُن کا حال کیا ہوا ہوگا یہی نا کہ پہلا اڈیشن بھی ابھی تک پڑا سڑ رہا ہوگا اور مرأۃ العروس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ع "ایں تمکین و فضیلت بگذشت از ہمہ چیز" باوجودے کہ مرأۃ العروس کی رجسٹری ہوچکی تھی مگر لوگوں نے بے پوچھے گچھے چھاپ چھاپ کر بیچنا شروع کیا۔ اور آج تک اس کی یہی حالت ہے کہ لوگ چھاپتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔

حیاۃ النذیر کی تالیف کے زمانے میں ہم نے ایک مثنوی دیکھی جس کا نام زینت العروس[1] تھا۔ مثنوی دیکھتے ہی ہم کو یہ بات کھٹکی تھی کہ مصنف مثنوی نے مرأۃ العروس کے جسم سے نثر کا لباس اُتار کر نظم کا زیور پہنایا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب ہوا کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم اڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اس مثنوی پر اپنے اخبار میں ریویو کرتے ہوئے یہ بات ظاہر نہیں کی۔ منشی محمد عبد اللہ عالم مصنف مثنوی نے مثنوی کے دیباچے میں اگرچہ یہ شعر لکھے ہیں۔

---

[1] اس نام کی ایک کتاب اس سے بہت قبل خان بہادر مولوی عبد الحامد خاں صاحب کی چھپی ہوئی موجود ہے ۱۲

جناب نذیر احمد دہلوی ؎	ہیں تصنیف میں جن کی شہرت بڑی	انھیں کا تھا یہ کام وہ کر چکے
بصد حسن اتمام وہ کر چکے	ہیں ذرے سے کم تر وہ ہیں آفتاب	وہ ہیں نور اعلیٰ یہ بندہ حجاب
وہ ہیں علم و فن کے لیئے افتخار	ہیں ہوں علم و فن کے لیئے ننگ عار	مجھے ان سے کوئی بھی نسبت نہیں
تصنع کی بندے کو عادت نہیں	کہی ہے یہ اک جوش میں مثنوی	خدا جانے اچھی لکھی یا بری

مثنوی زینت العروس کے دیباچے میں سے ہم نے یہ چند شعر اس لیئے نقل کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مرآۃ العروس کا اس میں کہیں نام نہیں لیا گیا۔ بلکہ ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرآۃ العروس سے اس مثنوی کو کوئی تعلق نہیں مثنوی میں جن خیالات کو نظم کیا گیا ہے وہ صاحب مثنوی کے ذاتی خیالات ہیں۔ مولانا نے ایک مقام پر بالکل سچ فرمایا ہے کہ لوگ لباس بدل بدل کر میری تصنیفات سے فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ اگر منشی محمد عبد اللہ صاحب علم مولانا سے مرآۃ العروس کے نظم کرنے کی اجازت مانگتے تو مولانا کبھی انکار نفرماتے اور اس طرح ہونے سے زینت العروس کی اور زینت بڑھ جاتی۔ اب ہم منشی محمد عبد اللہ صاحب علم کو تو نہیں مگر منشی رحمت اللہ صاحب رعد کو مشورہ دیتے ہیں کہ مولانا کی اجازت سے مرآۃ العروس با تصویر چھاپیں۔ بشرطیکہ مصوری وہ اپنے ہاتھ سے کریں ؎

نمونہ مرآۃ العروس

بہر حال ہم نے جتنے بھی اعتراض سنے وہ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی گلستاں پر اعتراض کرے کہ ایسی لاجواب کتاب میں باب پنجم در عشق و جوانی کیا۔ اور یہ اعتراض کر کے سعدی کی ہنسی اڑائے ناظرین کو اب ہم مرآۃ العروس کا نمونہ دکھاتے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ منتخب نہیں کیا گیا ہے بلکہ بطور فال کے کتاب کھولی گئی تو ذیل کا مضمون نکلا۔ جب راقم نے حیاۃ النذیر کا مٹیریل جمع کرنا شروع کیا تو یہ بات ذہن میں آئی تھی کہ مولانا کی کل تصانیف میں سے ان کے اسپیسمن انتخاب کر کے کتاب میں درج کر دیئے جائیں۔ لیکن تمام تصانیف کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں کوئی خاص مضمون منتخب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کل تصنیف بجائے خود ایک انتخاب ہے۔ اس لیئے راقم نے فال کا طریقہ اختیار کیا آنکھ بند کر کے کتاب کو کھولا اور اس طرح جو مضمون نکلا وہ درج حیاۃ کر دیا گیا۔ مولانا کی اور تصانیف کے نمونے بھی اگر ضرورت ہوئی تو دکھائے جائیں گے مگر ان کا اقتباس بھی بطور فال کے ہوگا تاکہ لوگوں کو یہ شبہ جاتا رہے کہ خصوصیت کے ساتھ انتخاب کیئے ہوئے نمونے درج کیئے ہیں

بیاہی ہوئی لڑکیوں کے لیئے عمدہ نصیحت

اصغری کے نام شادی ہو جانے کے بعد دور اندیش خاں نے جو خط لکھا دیکھنے کے لائق ہے اتفاق سے ہم کو اس کی نقل ہاتھ آ گئی تھی وہ خط یہ ہے۔

آرام دل و جانم برخوردار اصغری خانم سلمہا اللہ تعالیٰ۔ دعا اور اشتیاق و دیدہ بوسی کے بعد واضح ہو تمھارے بھائی خیر اندیش خاں کے لکھنے سے تمھاری رخصت کا حال معلوم ہوا۔ برسوں سے یہ تمنا دل میں تھی کہ اس فرض کو میں اپنے اہتمام خاص سے ادا کروں۔ مگر حاکم نے رخصت نہ دی مجبور رہا۔ یہ بات تم پر ظاہر ہوئی ہو گی کہ سب بچوں میں تم سے مجھکو ایک خاص طرح کا انس تھا۔ اور میں اس بات کو بطور احسان نہیں لکھتا۔ بلکہ تم نے اپنی خدمت گزاری اور فرماں برداری سے خود میرے اور سب کے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ آٹھ برس کی عمر سے تم نے میرے گھر کا تمام بوجھ اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مجھکو ہمیشہ یہ بات معلوم ہوتی رہی کہ تمھارے سبب بیگم یعنی تمھاری ماں کو بڑی بے فکری حاصل ہے۔ جب کبھی اس اثنا میں مجھکو گھر جانے کا اتفاق ہوا تمھارا انتظام دیکھ کر ہمیشہ

میرا جی خوش ہوا۔ اب تمہاری رخصت ہوجانے سے ایسا نقصان ہوا کہ اس کی تلافی شاید اس عمر میں ہونے کی مجکو امید نہیں ہوسکتی خدا تم کو جزائے خیر دے اور اس خدمت کے صلے میں میری دعاؤں کا اثر تم پر ظاہر ہو۔ خیر اندیش خاں کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے اکبری خانم سے زیادہ جہیز نہیں لینا چاہا۔ اس سے تمہاری بلند نظری اور عالی ہمتی ثابت ہوتی ہے۔ مگر میں اس کا نعم البدل بھیجتا ہوں وہ یہ خط ہے اس کو تم بطور دستور العمل کے اپنے پاس رکھو اور ان نصیحتوں پر عمل کرو ان شاء اللہ تعالیٰ ہر ایک مشکل تم پر آسان ہوگی اور اپنی زندگی آرام و آسایش میں بسر کروگی سمجھنا چاہیئے کہ بیاہ کیا چیز ہے۔ بیاہ صرف یہی بات نہیں ہے کہ رنگین کپڑے پہنے۔ مہمان جمع ہوئے۔ مال و اسباب و زیور پایا۔ بلکہ بیاہ سے نئی دنیا شروع ہوتی ہے نئے لوگوں سے معاملہ کرنا اور نئے گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ جس طرح پہلے پہل بچھڑوں پر جوا رکھا جاتا ہے آدمی کے بچھڑوں کا جوا بیاہ ہے۔ نکاح ہوا۔ لڑکی بی بی بنی۔ لڑکا میاں بنا۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ دونوں کو پکڑ کر دنیا کی گاڑی میں جوت دیا۔ اب یہ گاڑی قبر کی منزل تک ان کو کھینچنی پڑے گی پس بہتر یہ ہے کہ دل کو مضبوط کرکے اس مہم کا سرانجام کیا جائے۔ اور زندگی کے دن جبقدر رہیں عزت آبرو صلح کاری اتفاق سے کاٹ دیئے جائیں۔ ورنہ لڑائی بھڑائی۔ جھگڑے بکھیڑے شور و شر فساد۔ اور واویلا سے دنیا کی مصیبت اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اب تم کو اے میری پیاری بیٹی اصغری خانم سوچنا چاہیئے کہ میاں بی بی میں خدا نے کتنا فرق رکھا ہے۔ مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم بہشت میں اکیلے گھبرایا کرتے تھے۔ ان کے بہلانے کو خدا نے اماں حوا کو جو سب سے پہلی عورت دنیا میں ہو گزری ہیں پیدا کیا۔ پس عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا۔ اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔ افسوس ہے کہ دنیا میں کس قدر کم عورتیں اس فرض کو ادا کرتی ہیں۔ مردوں کا درجہ خدا نے عورتوں پر زیادہ کیا نہ صرف حکم دینے سے بلکہ مردوں کے جسم میں زیادہ قوت اور ان کی عقلوں میں زیادہ روشنی دی ہے۔ دنیا کا بندوبست مردوں کی ذات سے ہوتا ہے۔ مرد کمانے والے اور عورتیں ان کی کمائی کو موقع مناسب پر خرچ کرنے والیاں اور اس کی نگہبان ہیں۔ کنبہ بطور کشتی کے ہے اور مرد اس کے ملاح ہیں۔ اگر ملاح نہ ہو تو کشتی پانی کی موجوں میں ڈوب جائے گی۔ یا کسی کنارے پر ٹکر کھا کر پھٹ پڑے گی کنبے میں اگر مرد منتظم نہیں تو اس میں ہر ایک طرح کی خرابی کا احتمال ہے۔ کبھی نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ دنیا میں خوشی صرف دولت سے حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ دولت اکثر خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ بہت بڑے اونچے گھروں میں لڑائی اور فساد ہم زیادہ پاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صرف دولت سے تو خوشی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے اکثر خانہ داری میں خوشی صرف اتفاق و صلح کاری سے ہوتی ہے غریب آدمیوں کو ہم دیکھتے ہیں جن کی آمدنی بہت مختصر ہے۔ دن کو محنت مزدوری سے معاش پیدا کرتے رات کو سب مل کر دال روٹی سے پیٹ بھر لیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ بےشک یہ لوگ صلح کاری کے سبب دال روٹی اور گاڑھے دھوتر میں زیادہ آرام سے ہیں بہ نسبت نوابوں اور بیگموں کے جن کا تمام عیش آپس کی ناسازگاری سے تلخ رہتا ہے۔ اے میری پیاری بیٹی اصغری خانم اتفاق پیدا کرو اور صلح کاری کو غنیمت جانو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اتفاق کن باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ صرف اس بات سے کہ بی بی اپنے میاں سے محبت کرے بلکہ محبت کے علاوہ اس کو میاں کا ادب کرنا بھی لازم ہے۔ بڑی نادانی ہے اگر بی بی میاں کو برابر کے درجے میں سمجھے۔ بلکہ اس زمانے میں عورتوں نے ایسا خراب دستور اختیار کیا ہے کہ ادب کے بالکل خلاف ہے۔ جب چند سہیلیاں آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں تو اکثر یہ تذکرہ ہوتا ہے کہ فلانی کا میاں اس کے ساتھ کس طرح کا برتاو رکھتا ہے۔ ایک کہتی ہے کہ جو اماں میں نے تو

یہاں تک اُن کو دبایا ہے کیا مجال جو میری بات کو کاٹیں یا اُلٹ کر جواب دیں۔ دوسری فخر کرتی ہے جب تک گھڑیوں خوشامد نہ کریں
میں کھانا نہیں کھاتی۔ تیسری بڑائی مارتی ہے میں تو دس مرتبے پوچھتے ہیں تب ایک جواب مشکل سے دیتی ہوں۔ چوتھی ڈینگ
لیتی ہے چاہے وہ پہروں نیچے بیٹھے رہیں بندی کو پلنگ سے اُترنا قسم ہے۔ پانچویں شیخی بگھارتی ہے جو میری زبان سے نکلتا
ہے پورا کر کے رہتی ہوں۔ شادی بیاہ میں ٹونے ٹوٹکے بھی اسی غرض سے نکلے ہیں کہ میاں مطیع و فرماں بردار رہے۔ کہیں تو
دلہن کی جوتی پر کاجل پاڑ کے میاں کے سُرمہ لگایا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ عمر بھر جوتیاں کھاتا رہے اور چوں نہ کرے۔ کہیں نہاتے
وقت دلہن کے پاؤں کے انگوٹھے کے تلے پیڑا رکھا جاتا ہے اور میاں کو کھلایا جاتا ہے اس کے یہ معنی کہ پیروں پڑتا رہے۔ ان
باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کا درجہ اور اختیار کم کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ تعلیم بہت بری تعلیم ہے اور ہرگز اس کا
نتیجہ قباحت سے خالی نہیں۔ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے اگر دباؤ اور زبردستی سے کوئی اُن کو زیر کرنا چاہے ناممکن ہے بہت آسان
ترکیب ان کو زیر کرنے کی خوشامد اور تابعداری ہے۔ اور جو احمق عورت اپنا دباؤ ڈال کر مرد کو زیر کرنا چاہتی ہے وہ بڑی غلطی میں ہے
وہ شروع سے تخم فساد بوتی ہے اور اس کام کا انجام ضرور فساد ہوگا اگرچہ وہ اس کو بالفعل نہیں سمجھتی۔ اصغری خانم! میری
صلاح یہ ہے کہ تم گفت و گو اور نشست و برخاست میں بھی اپنے میاں کا ادب ملحوظ رکھنا۔ مذہب میں میاں بی بی کے متعلق بہت
احکام ہیں اور چوں کہ تم نے قرآن کا ترجمہ اور اُردو کے بہت سے مذہبی رسالے پڑھے ہیں میں اُمید کرتا ہوں وہ احکام تھوڑے
بہت ضرور تمہارے خیال میں ہوں گے۔ اُن احکام کا مجموعہ خانہ داری کے لئے بڑا دستور العمل ہے مگر افسوس ہے لوگ خدا رسول کے
حکموں کی تعمیل میں توجہ ہی نہیں کرتے اور اسی سے انواع و اقسام کی خرابیاں پیش آتی ہیں۔ میں نے حدیث کی کتاب میں پڑھا
تھا کہ اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو پیغمبر صاحب فرماتے ہیں کہ میں بی بی کو حکم دیتا کہ اپنے میاں کو سجدہ کیا
کرے۔ پس اسی ایک بات سے تم خیال کر سکتی ہو کہ میاں اور بی بی میں کیا نسبت ہے۔ اب اس کے ساتھ ملکی رواج کو ملاؤ کہ بی بی
نہ تو میاں کو چھوڑ سکتی نہ بدل سکتی نہ اس سے کسی وقت اور کسی حال میں بے نیاز ہو سکتی۔ تو سوائے اس کے کہ سچے دل سے آپ
اُس کی ہو رہے اور اطاعت سے خوشامد سے جس طرح ممکن ہو اُس کو اپنا کرے عافیت کی، عزت و آبرو کی، دوسری کوئی تدبیر نہ ہے
اور نہ ہونی ممکن ہے۔ کیا وجہ کہ شادی بیاہ ایسے چاؤ سے ہوتا ہے اور چوتھی کے بعد ہی بہو سے ساس نندوں کا بگاڑ شروع ہو جاتا
ہے یہ مضمون غور کے قابل ہے۔ بیاہ کے پہلے تک لڑکا ماں باپ میں رہا اور صرف انھیں کے ساتھ اُس کو تعلق تھا۔ ماں باپ نے
اُس کو پرورش کیا اور یہ توقع کرتے رہے کہ بڑھاپے میں ہماری خدمت کرے گا۔ بیاہ کے بعد بہو ڈولی سے اُترتے ہی یہ فکر
کرنے لگتی ہے کہ میاں آج ماں باپ کو چھوڑ دیں۔ پس لڑائی ہمیشہ بہوؤں کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ اگر بہو کنبے میں مل کر رہے اور کبھی
ساس کو نہ معلوم ہو کہ بیٹے کو ہم سے چھڑانا چاہتی ہے تو ہرگز فساد نہ پیدا ہو۔ یہ تو سب کوئی جانتا ہے کہ بیاہ کے بعد ماں باپ کے ساتھ تعلق
چند روزہ ہے آخر گھر الگ ہوگا میاں بی بی جدا ہو کر رہیں گے۔ دنیا میں یہی ہوتی آئی ہے۔ لیکن نہیں معلوم کم بخت بہوؤں کو بے صبری
کہاں کی پڑ جاتی ہے کہ جو کچھ ہونا ہو اسی دم ہو جائے۔ بہوؤں میں ایک عیب چغلی کا ہوتا ہے جو بنیاد فساد ہے۔ وہ یہ کہ سسرال کی ذرا ذرا
بات آ کر یہاں سے لگاتی ہیں اور یہاں خود بھی کھود کھود کر پوچھا کرتی ہیں۔ لیکن اس کہنے اور پوچھنے سے سوائے اس کے کہ لڑائیاں
پڑیں اور جھگڑے کھڑے ہوں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بعض بہوویں اس طرح کی مغرور ہوتی ہیں کہ سسرال میں کیسا ہی اچھا کھانا

اور کیسا ہی اچھا کپڑا اُن کو ملے ہمیشہ نظر حقارت سے دیکھتی ہیں ایسی باتوں سے میاں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ صغری اِس کی تم کو بہت احتیاط چاہیے سسرال کی ہر ایک چیز قابل قدر ہے اور تم کو ہمیشہ کھانا اور کپڑا پہن کر بشاشت ظاہر کرنی چاہیے جس سے معلوم ہو کہ تم نے پسند کیا۔ نئی دولہن کو اس کا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے کہ سسرال میں بے دلی سے نہ رہے اگرچہ اُوپری ہونے کے سبب البتہ اجنبی لوگوں میں جی نہیں لگتا لیکن جی کو سمجھانا چاہیے نہ یہ کہ روتے گئے وہاں رہے تو روتے رہے جاتے دیر نہیں ہوئی آنے کا تقاضا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اُنس پیدا کرنے کے واسطے چالوں کا رواج بہت پسندیدہ ہے اس سے زیادہ میکے کا شوق ظاہر کرنا سسرال والوں کو ضرور ناپسند ہوتا ہے گفتگو میں درجۂ اوسط ملحوظ رہے یعنی نہ اتنی بہت کہ خود بخود بک بک نہ اتنی کم کہ غرور سمجھا جائے بہت بکنے کا انجام رنجش ہوتا ہے جو بات دن کی بکو اس کی نہ ہراروں طرح کا تذکرہ ہوگا نہیں معلوم کس کس کرے میں کیا بات مونہ سے نکل جائے نہ اتنی کم گوئی اختیار کرنی چاہیے کہ بولنے کے واسطے لوگ خوشامد اور منت کریں ضد اور اصرار کسی بات پر زیبا نہیں اگر کوئی بات تمھاری مرضی کے خلاف بھی ہو اس وقت ملتوی رکھو پھر کسی دوسرے وقت لطر ز مناسب طے ہو سکتی ہے فرمایش کسی چیز کی نہ کرنی چاہیے فرمایش کرنے سے آدمی نظروں میں گھٹ جاتا اور اُس کی بات ہلکی پڑ جاتی ہے جو کام ساس نندیں کرتی ہیں تم کو اپنے ہاتھوں سے کرنا عار نہ سمجھنا چاہیے چھوٹوں پر مہربانی۔ اور بڑوں کا ادب ہر دل عزیز ہونے کے واسطے بڑی عمدہ تدبیر ہے۔ اپنا کوئی کام دوسروں کے ذمّے نہیں رکھنا چاہیے۔ اور اپنی کسی چیز کو بے خبری سے پڑا نہ رہنے دو کہ دوسرے اُس کو اٹھالیں گے۔ جب دو آدمی چپکے چپکے باتیں کریں اُن سے علیحدہ ہو جانا چاہیے پھر اس کی تفتیش بھی مت کرو کہ یہ آپس میں کیا کہتے تھے اور خواہ مخواہ یہ بھی مت سمجھو کہ کچھ ہمارا ہی تذکرہ تھا۔ اپنا معاملہ شروع سے ادب لحاظ کے ساتھ رکھو۔ جن لوگوں میں بہت جلد نہایت درجے کا اختلاط پیدا ہو جاتا ہے اُسی قدر جلد اُن میں رنجش پیدا ہونے لگتی ہے فقط میں چاہتا ہوں کہ تم ہر روز بلا ضرورت بھی اس خط کو کم سے کم ایک دفعہ پڑھ لیا کرو تاکہ اس کا مطلب پیش نظر رہے۔ والدعا

حررہ دور اندیش خاں۔

منتخب الحکایات یہ وہ کتاب ہے جس کو مولنا نے اپنی چھوٹی صاحبزادی کے لیے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس قسم کی کتابیں اُردو میں اَور بھی ہیں۔ لیکن اُن میں اور اس میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ منتخب الحکایات میں بے معنی اور لا حاصل کہانیاں نہیں ہیں۔ ہر ایک حکایت نہایت دل چسپ ہے۔ بچے اِس سے خوش بھی ہوتے ہیں اور نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اِس کتاب میں مختصر حکایتیں ہیں بعض حکایتیں انیرس فیلز سے بھی لی گئی ہیں۔ کتاب میں نئی اور مفید بات یہ ہے کہ ہر ایک حکایت سے ایک نتیجہ نصیحت نکالا گیا ہے جو تحت حکایت میں حاصل کے عنوان سے درج ہے۔ بعض حکایتیں دل سے بھی گھڑی ہوئی ہیں اور بعض سچی ہیں۔ منتخب الحکایات میں مولنا نے ایک حکایت پنجابی کٹڑے کی مسجد کے ایک طالب علم کی لکھی ہے وہ یہ ہے۔

"ایک طالب علم پنجابی کٹڑے کی مسجد میں بے قدری کے ساتھ رہتا تھا۔ نہ تو لنگر کی روٹیوں میں سے اُس کو حصہ ملتا۔ نہ دعوت میں کوئی اُس کو ساتھ لے جاتا۔ نہ کسی جگہ اُس کا کھانا مقرر تھا۔ پس بے چارہ ہمیشہ بھوکا رہا کرتا۔ ایک روز کوئی بڑا موٹا پنجابی مرا اور اس کا جنازہ نماز کے واسطے مسجد میں لائے۔ اُس طالب علم نے دور سے دیکھ کر پہلے تو جانا کہ روٹیوں کا خوان آیا۔ حصّہ لینے کی اُمید سے دوڑا۔ حوض کے پاس جا کر معلوم ہوا کہ جنازہ ہے۔ بے چارہ نا اُمید ہو کر لوگوں سے پوچھنے لگا کیوں جی کون مر گیا؟ لوگوں نے کہا ارے میاں تم نے نہیں سُنا فلاں سوداگر مر گیا۔ طالب علم نے پوچھا کہ کیا کچھ بیمار تھے؟ لوگوں نے کہا نہیں تو کل تک بھلے چنگے تھے رات خاصی طرح اسی مسجد میں عشا کی نماز پڑھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تخمہ کیا۔ طالب علم نے پوچھا

تخمہ کیا؟ لوگوں نے کہا بدہضمی کا ہیضہ جو بہت کھانا کھا جانے سے ہو جاتا ہے۔ طالب علم نے کہا آہا یہ مرض مبارک ہم کو کبھی نہیں ہوتا

حاصل دنیا کی تکلیفیں آدمی کو موت پر دلیر کر دیتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکایت آپ بیتی ہے یعنی مولانا پر خود ایسا واقعہ گزرا ہے۔ اور یہ صرف اس بنیاد پر بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا پنجابی کٹرے کی مسجد میں رہا کرتے تھے اور کھانے پینے کی طرف سے وہاں ان پر بہت تنگی تھی۔ لیکن اگر یہ واقعہ خود مولانا کی ذات پر گزرتا تو وہ ضرور کہیں نہ کہیں اس کو بیان کر دیتے۔ ہم کو مولانا کے بہت سے واقعات اُن کی تصانیف میں ایسے ملے ہیں جو اُن کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں ان واقعات کو دوبارہ بیان کرتے ہوئے صاف لکھ دیا ہے کہ یہ واقعہ مجھ پر گزرا ہے۔ چنانچہ ہم نے جب تک الحقوق والفرائض کی جلدیں نہیں پڑھیں ہم اسی دھوکے میں تھے کہ ابن الوقت کوئی شخص نہ تھا۔ نوبل صاحب کے ساتھ ابن الوقت نے میز پر چھری کانٹے سے جو کھانا کھایا تھا وہ ایک فرضی واقعہ تھا۔ لیکن الحقوق والفرائض کی جلدوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ابن الوقت خود ہمارے مولانا تھے۔ اُنھوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ یہ میرا ذاتی واقعہ ہے۔ پس اگر اس بھوکے طالب علم کا واقعہ بھی خود انھیں کا ذاتی واقعہ ہوتا تو کہیں نہ کہیں ضرور ذکر کرتے۔ تاہم ہیں کسی کے قیاس میں کیوں دخل دوں۔ کئی مرتبہ دل نے چاہا کہ مولانا سے خود اس واقعے کی تصدیق ہو جاتی تو بہتر تھا۔ مگر اُن سے پوچھتا کون پوچھنے کی جرأت تو اُس وقت ہوتی کہ کبھی مولانا نے اپنی زندگی کے واقعات بنائے ہوتے۔

غرض منتخب الحکایات بچوں کے قابل نہایت عمدہ کتاب ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے اس کتاب پر یہ ریمارک کیا ہے کہ "اس کتاب میں بچوں کے لیے منتخب اور مسلسل کہانیاں ہیں جن کی طرف وہ متوجہ کیے جاتے ہیں اور اُن کی سمجھ میں ترقی ہوتی ہے۔ مصنف نے دیباچے میں اس قسم کی معمولی کہانیوں کی مذمت کی ہے جو عموماً رائج ہیں۔ کہ ایک تھی چڑیا اور ایک تھا چڑا چڑیا لائی چاول کا دانہ اور چڑا لایا دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ بجائے اس قسم کی کہانیوں کے مصنف نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں حکایاتِ لقمان اور دوسرے قصوں سے انتخاب کر کے بچوں کی سمجھ کے موافق لکھی ہیں۔ زبان شستہ اور عمدہ ہے۔ اگرچہ چند غلطیاں کتابت کی نقلنویس نے کی ہیں۔ یہ کتاب ایک آسان اسکول ریڈر اور انعامی ہے اور چھپنے کے قابل ہے۔"

چند پند یہ وہ کتاب ہے جس کو مولانا نے میاں بشیر کے لیے ۱۸۶۹ء میں بمقام اورئی ضلع جالون تصنیف کیا تھا۔ نیز یہ وہ کتاب ہے جس کے پڑھنے سے مرأۃ العروس کا پتہ چلا۔ اور نہ صرف پتا چلا بلکہ چند پند بہت کچھ اُس کے عروج کا باعث ہوئی۔ یہ کتاب بھی بچوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ حرف شناسی اور الفاظ شناسی کے بعد بچوں کو یہ کتاب پڑھائی جائے تو بہت مفید اور مناسب ہے ہمارے نزدیک یہ کتاب بچوں کی تعلیم و تربیت اور عادات و خصائل کی ذمہ دار ہو سکتی ہے اس میں مندرجۂ ذیل مضامین ہیں۔ صفائی سونا۔ کھانا۔ لباس۔ بات چیت۔ ادب۔ صحبت۔ عقل۔ موافقت۔ صحت اور مرض۔ غصہ۔ لالچ۔ تکبر۔ بے حیائی۔ وغیرہ وغیرہ مضامین پر نہایت قریب الفہم اردو میں چھوٹے چھوٹے مگر جامع مضمون لکھے ہیں۔ اور آخر میں مذہب کے متعلق ایک مختصر سا مضمون ہے۔ اس کے بعد حضرت نوحؑ۔ حضرت ابراہیم۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بھی اختصار کے ساتھ درج فرمائے ہیں۔ جا بجا مشکل الفاظ کے معانی فٹ نوٹ میں لکھ دیئے ہیں تاکہ بندی کو فہم مدعا میں سہولت ہو۔ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے اس پر بھی ریمارک کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ یہ کتاب ایک صاف اور شستہ سلسلہ

بچوں کے لیے بکار آمد مضامین کا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر حصے میں مذہبی اور اخلاقی اصول اور مختلف مذاہب جو ہندوستان میں مروّج ہیں اُن کا مختصر بیان ہے جس میں کوئی بات ناپسند یا تنگ دلی کی نہیں ہے۔ اس کا طرز بیان سادہ اور عمدہ ہے۔ یہ کتاب مسلمان بچوں کے لیے بطور ایک انعام کے چھاپنے کے قابل ہے۔"

نمونۂ چند پند ذیل کا مضمون بھی مرآۃ العروس کی طرح بطور فال کے اقتباس کیا گیا ہے۔

ادب

تم کو سمجھنا چاہیے کہ گو آدمی سب ایک طرح کے ہیں۔ دو کان۔ دو ہاتھ۔ دو آنکھیں۔ دو پاؤں۔ ایک ناک۔ ایک سر سب کے برابر ہیں لیکن پھر بھی آدمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کوئی باپ ہے کوئی بیٹا۔ کوئی اُستاد ہے کوئی شاگرد ہے۔ کوئی آقا اور مالک ہے کوئی نوکر اور خادم۔ کوئی مولوی کوئی جاہل۔ کوئی حاکم۔ کوئی طبیب۔ کوئی دکان دار۔ کوئی مزدور۔ پس اگر سب آدمی درجے میں برابر ہوں تو دنیا کا انتظام ٹوٹ جائے اِس واسطے ہر ایک کے واسطے خاص درجے اور خاص رتبے مقرر ہیں۔ بیٹے کو باپ کا اور شاگرد کو اُستاد کا اور نوکر کو مالک کا اور رعایا کو حاکم کا اور بیمار کو طبیب کا حکم ماننا لازم اور واجب ہے۔ عمر اور رشتے اور ذات اور ہنر اور لیاقت اور دولت اور حکومت سے درجہ معلوم ہوتا ہے جس کی عمر زیادہ ہو یا جو رشتے میں بڑا ہو یا جو ذات میں شریف ہو جیسے مسلمانوں میں سیّد اور ہندوؤں میں برہمن یا جس کو لیاقت زیادہ ہو جیسے مولوی اور پنڈت۔ یا جو دولت مند یا حاکم ہو سب قابل ادب ہیں۔

اگر تم ادب کرتے ہو تو مت سمجھو کہ یہ بھی دنیا کی ایک رسم ادا کرتے ہیں اور اگر ادب نہ بھی کریں تب بھی کچھ نقصان نہیں۔ خبردار ایسی بات ذہن میں مت آنے دو ادب نہ کرنے میں سراسر تمھارا زیان ہے جس کا تم نے ادب کیا جھک کر سلام کرنے یا مؤدب ہو کر بیٹھ جانے سے تم نے اُس کو کیا دے دیا۔ لیکن تم نے ایک سلام میں بڑا فائدہ حاصل کیا۔ جس کا تم ادب کرو گے ضرور وہ تم سے خوش ہوگا اور اُس کا جی چاہے گا کہ تم کو کچھ نفع پہنچائے۔ اُستاد کا ادب کرو تو جی لگا کر اور سمجھا کر سبق دے گا۔ جب بھولو گے خوشی سے بتائے گا ماں باپ کا ادب کرو تو دیکھو کیسے کیسے چین تم کو کرتے ہیں۔ جو مانگو سو موجود۔ جو کہو سو حاضر۔ حاکم کا ادب کرو تو عزت سے پاس بٹھائے گا۔ ہر بات میں تمھاری رعایت کرتا رہے گا۔ اب ادب نہ کرنے والوں کی حالت پر نظر کرو۔ بے ادب شاگرد کو اُستاد بے دلی سے پڑھاتا ہے۔ بھولا ہوا پوچھتا ہے تو بتانے میں دریغ کرتا ہے اور کہتا ہے کیوں بے ایک دفعہ کا بتایا ہوا یاد نہیں رکھتا۔ اُٹھ کان پکڑ کر کھڑا ہو۔ بے ادب بیٹا ماں باپ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو ماں کہتی ہے موئے تیرے نام کو جلتا ہوا انگارا۔ جان ہار تو نے خوب جلایا ہے۔ باپ کو آنے دے تو دیکھ کیسا ٹھیک بنواتی ہوں۔ بے ادب جب حاکم کے دربار میں جاتا ہے تو چپراسی الگ دھکے دیتے ہیں۔ نا کوری الگ کان پکڑتے ہیں۔ ادب صرف حکم ماننا نہیں ہے۔ اگر تم باپ کا حکم مانو تو تم نے باپ کا ادب پورا نہیں کیا بلکہ ادب میں حکم ماننے کے علاوہ دل سے اطاعت اور دل سے تعظیم یعنی بڑائی کرنا اور لحاظ ضرور ہے۔ تم پر جس جس کا ادب لازم ہے اُن کو خوب جھک کر سلام کیا کرو۔ جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کرو اُن کے سامنے بدلحاظی کی کوئی بات مت کرو۔ یہاں تک کہ نشست و برخاست میں بھی اتنا خیال کرو کہ اُن کی طرف پشت مت ہونے دو۔ اُن سے اونچے مت بیٹھو۔ اُن کی طرف پاؤں مت کرو۔ اُن سے آگے مت چلو۔ اُن سے بات میں ردّ و کد مت کرو۔ اُن کے سامنے بہت مت بولو۔ اور بہت مت ہنسو۔ اُن سے آنکھ مت ملاؤ۔ اُن کا نام نہ لو۔ ہر چند کوئی پوچھے اور جو ضرورۃً لو بھی تو بہت ادب کے ساتھ۔ نام سے پہلے لفظ جناب اور نام کے بعد

صاحب لگالو۔ جب تم اتنی باتیں کروگے تو ادب والے پیارے بیٹے کہلاؤگے۔ جو لڑکے اپنے بڑوں کا ادب نہیں کرتے دنیا میں ہمیشہ کیواسطے ذلیل اور خوار رہیں گے۔ کیسے کم بخت ہوتے ہیں وہ بیٹے جو ماؤں کو جواب دیتے ہیں۔ اور اُن کی تعظیم نہیں کرتے بہتر تھا کہ بجاے ایسے ناہموار اولاد کے سانپ پیدا ہوتے۔ یا عورت بانجھ ہوتی اور ایسی ناشدنی اولاد دُنیا میں نہ پیدا ہوتی۔ تم ماں باپ کی قدر نہ جانوگے جب تک خود باپ نہ ہوگے اور جب تک وہ وقت آئے تب تک بہت کم اُمید ہے کہ ماں باپ تم سے ادب کرانے کے لئے زندہ رہیں پس اس فرض کے ادا کرنے میں ہرگز وقت ضائع نہ کرو۔"

نصاب خسرو | یہ ایک ۲۸ صفحے کی نظم ہی جو روزمرّہ کی بول چال کے مطابق مبتدی لڑکوں کے لئے ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوئی۔ جب بچوں کو فارسی زبان کی کتابیں شروع کرائی جائیں تو بہت ضروری ہے کہ پہلے اُن کو اُس زبان کے مشہور الفاظ جو کثرت سے استعمال میں آتے ہوں یاد کرا دیئے جائیں تاکہ اُن الفاظ کی مدد سے بچّوں کو کتاب پڑھنے میں آسانی ہو فارسی الفاظ یاد کرا دینے کے واسطے نصاب خسرو کی نظمیں پڑھا دینا بہت مفید ہوگا نظم کے سہارے سے لڑکے سبق جلد یاد کر لیتے ہیں اور دیر تک نہیں بھولتے۔ اصل میں نصاب خسرو مولنا کی خاص کوئی تصنیف نہیں ہی۔ بلکہ خالق باری جو ایک مشہور کتاب ہی وہی پرانے ہندی محاوروں کے لحاظ سے ترمیم شدہ ہے۔ وہ الفاظ اس میں سے چھانٹ دیئے گئے ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا۔ بہت سے اشعار کا اضافہ بھی ہوا ہی۔ آخر میں الفاظ فارسی عربی کی ایک فرہنگ لگادی گئی ہے۔ نصاب خسرو میں ۷۵۸ لفظ ہیں ان میں پورے ڈھائی سو عربی کے ہیں اور ۵۰۸ فارسی کے۔ عربی فارسی کے وہ الفاظ جو اردو کی روزمرّہ میں مستعمل ہیں وہ اس حساب سے خارج ہیں۔ اس کتاب پر بھی ڈائرکٹر صاحب نے ریمارک کیا ہی کہ "نصاب خسرو المعروف خالق باری فارسی زبان کی ابتدائی کتاب کا جو اس ملک میں رائج ہی نیا اڈیشن ہی جس کو ابتدائً امیر خسرو دہلوی نے مرتب کیا تھا یہ کتاب اس اصول پر لکھی گئی ہی کہ بچہ جب کسی زبان کو شروع کرتا ہی تو ضرور ہی کہ اُس کو ایک کافی تعداد کار آمد الفاظ کی مستحفظ ہو اور تاکہ یہ بات آسانی سے حاصل ہو الفاظ کو منظوم کر دیا ہی۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اصلاحات ذیل کی ہیں (۱) الفاظ متروک الاستعمال کو خارج کر دیا ہی۔ (۲) اپنی طرف سے کچھ اشعار بڑھاے ہیں (۳) مشق کے لئے ایک فرہنگ بحساب حروف تہجی لگادی ہے (۴) الفاظ کے نیچے حروف لکھ دیئے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی ہی یا فارسی یا ہندی . . . . . یہ نسخہ پرانے نسخے سے مرجح ہی۔ فوراً طبع ہونا چاہیئے۔"

صرف صغیر | قواعد فارسی کا ایک مختصر رسالہ ہے ۲۴ صفحوں کا۔ یہ بھی ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔ نثر کے سوا جا بجا نظم میں بھی قواعد فارسی کو باندھ دیا ہے اگر یہ قواعد طالب علموں کو مستحفظ کرا دیئے جائیں اور ان قواعد کا استعمال بھی دکھا دیا جائے تو اس طریقے سے مبتدیوں کو ضرور اتنی استعداد ہو جائے گی کہ وہ سلیس فارسی عبارت کا صحیح ترجمہ کرلیں گے۔ بلکہ شاید آسان فارسی بھی صحت کے ساتھ لکھنے لگیں اور یہ بات بھی تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ اگر اچھی طرح تعلیم ہو اور مبتدی کو سمجھا کر پڑھایا جائے تو اتنی استعداد صرف چھے مہینے میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب بہادر نے اس پر بھی ایک ریمارک کیا ہے وہ یہ ہے کہ "یہ ایک ابتدائی رسالہ قواعد فارسی کا ہی جو مبتدیوں کے لئے لکھا گیا ہے مصنف نے زبان فارسی ہندوستان میں اب تک رائج ہونے کے وجوہ اپنے

دیباچے میں بیان کی ہیں۔ اردو کی تکمیل کے لئے فارسی ضروری ہے۔ یہ کتاب اُن طلبہ کے لئے ہے جنہوں نے اُردو میں کافی استعداد حاصل کر لی ہو جو ہمارے طریقۂ تعلیم کے مطابق ہے۔ برخلاف اس ملک کے دستور کے کہ اُردو سے غفلت کی جاتی ہے اور فارسی شروع کرادی جاتی ہے اس بات کے معلوم کرنے سے مجھے خوشی ہوئی کہ اس طریقے کا ناپسند کرنے والا نذیر احمد اپنے وقت کا تجربہ کار اور آزاد خیال عالم ہے۔ یہ رسالہ چھپنے کے قابل ہے اور غالباً جماعتہائے اعلیٰ مدارس تحصیل میں جہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے اس کی ترویج ہوگی"۔ صرف صغیر میں مصنف نے جابجا قواعد بھی نظم کر دیئے ہیں۔ اور وہ صرف اس لئے کہ بچے نظم کو زیادہ خوشی سے پڑھتے ہیں اور اُس میں اُن کا زیادہ دل لگتا ہے۔ نمونے کے طور پر دو مختصر نظمیں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ہیں گنتی میں جان بابا | بتاؤں ماضی کی تم کو قسمیں کہ چھ ہیں
ہے پہلے مطلق جو نونِ مصدر کو حذف کر ڈالو بے محابا | قریب جو پاس کی ہو گزری ہے اُس کے آخر میں اَست ظاہر
بعید گزری ہوئی ہے مدت کی بود ہوتا ہے اُس کا آخر | ہے احتمالی کہ جس میں شک ہو نشان اُس کا ہے لفظ باشد
تمام ہے پانچویں جناں چہ زدن سے کوئی بنائے می زد | چھٹی تمنائی جس کی گردان کلھم تین صیغے آئے
لگائے مطلق میں یائے مجہول جو تمنائی کو بنائے

(۲) لازم کو آپ گر متعدی بنایئے | آخر میں امر کے الف اول لگایئے
اور اُس کے بعد کیجئے نیدن کو مستزاد | یہ ہے طریق تعدیہ ہذا ہو المراد

رسم الخط یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ۳۲ صفحوں کا ہے اس میں املا نویسی کے قواعد درج ہیں۔ نئی زمانہ جو لوگ استعداد فارسی و عربی سے بے بہرہ ہوتے ہیں وہ اُردو کی کتابت میں فاحش غلطیاں کیا کرتے ہیں۔ اُن کی روک تھام رسم الخط سے باحسن الوجوہ ہوتی ہے۔ مولٰنا اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"میری تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوا جب میرے اپنے بچے تعلیم کے قابل ہوئے۔ آخر آپ پڑھا تھا۔ پڑھایا تھا۔ سر رشتۂ تعلیم کی نوکری کے ذریعے سے پڑھنے پڑھانے کی نگرانی کی تھی۔ طریقۂ تعلیم کے خلل اور کتابوں کے نقص مجھ کو ذرا ذرا معلوم تھے۔ آنکھوں دیکھے تو مکھی نگلی نہیں جاتی۔ بیس نے آپ اپنے طور کی کتابیں بنائیں اور آپ ہی پڑھائیں تصنیف و تالیف کا اصلی محرک تو یہ تھا۔ بخت و اتفاق سے کتابیں سرکار میں پیش ہو کر پسند اور لوگوں میں پھیل کر مقبول ہوئیں۔ خدا جانے میں اس بارے میں کیا کچھ کرتا۔ اور کیسے کیسے منصوبے ذہن میں تھے۔ مگر دیکھا تو لوگوں کو علم کا مطلق شوق نہیں اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آج سرکار نوکریوں سے امتحان کی قید اُٹھادے پھر دیکھئے کالجوں اور اسکولوں کی کیسی بُری گت ہوتی ہے۔ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ معاش کا انحصار نہ ہو تو لوگ علم کے نام سے ٹکڑا ابھی نہ توڑیں۔ میں نے علمی کتابیں بھی لکھ کر دیکھیں۔ مگر لوگوں کی بے رغبتی کی وجہ سے کسی کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ میں نے اپنا قاعدہ یہ رکھا ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں اُس کے رواج دینے کی مطلق کوشش نہیں کرتا میں ایسا سمجھتا ہوں کہ میں کتاب کیا تصنیف کرتا ہوں گویا کنکوّے بناتا ہوں۔ اگر اُن میں پرواز کا مادہ ہے خود بخود اُڑیں گی۔ ورنہ میں کہاں اِن کے پیچھے دُم چھلّے کی طرح بندھا بندھا پھروں۔ اس بے اعتنائی پر بلکہ بے اعتنائی کبھی نہیں حمیت اور خود داری پر خدا کے فضل سے میری ساری کتابیں ایسی مقبول ہوئیں والحمد للہ علیٰ ذٰلک کہ دوسری دوسری زبانوں میں

ترجمہ ہوتی اور جگہ جگہ بار بار چھپتی چلی جاتی ہیں۔ مگر علمی کتابیں ہیں کہ جب سے تصنیف ہوئیں اینڈ پڑی ہیں۔ یہ رسالہ رسم الخط بھی
اُن ہی علمی کتابوں میں سا ہے جن کو کسی فقیر کی بد دعا ہے کہ ہندوستانی ان سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ میرے نزدیک یہ رسالہ اس قدر ضروری
ہے کہ کوئی مکتب کوئی اسکول اس سے مستغنی نہیں۔ اہل یورپ جن کو مشرقی زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں کہیں مدتوں میں جاکر زبان تو
ٹوٹی پھوٹی بولنے بھی لگتے ہیں۔ مگر کتابت پر بالکل قادر نہیں ہوتے اُن کو ان قواعد کا سیکھنا نہایت ضروری اور مفید ہے بشرطیکہ
جو منشی اُن کو پڑھاتا ہے ان قواعد کو خود سمجھ کر اُن کو سکھائے۔ بے شک ان قواعد کے بدون بھی کام چل رہا ہے لیکن جیسا صرف و نحو
اور منطق کا ہونا ضرور ہے ویسا ہی ان قواعد کا۔ بلکہ بدرجہ اولیٰ مگر قاعدے ہمیشہ غور طلب ہوتے ہیں کسی قدر یہ بھی ہیں۔ خدا اتنی
زحمت اُٹھانے کی توفیق دے۔ میں تو مدتیں ہوئیں اس رسالے کو رو بیٹھا تھا۔ نذیر حسین تاجر کتب کے اصرار سے مکرر چھپوانے
کی اجازت دیدی ہے۔ ان کو اس کے پھیلنے کی توقع ہے۔ مجھکو نہیں +

اگرچہ اس مفید رسالے پر ڈائرکٹر پبلک آف انسٹرکشن نے یہ چلتا ہوا سا ریمارک کیا ہے کہ "فن املا نویسی میں یہ ایک ابتدائی
رسالہ ہے۔ نیا اور عالمانہ مضمون ہے۔ مدارس میں یہ کارآمد ہوگا" لیکن ہم نے جب اس رسالے کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ رسالہ نہایت
ضروری اور بکار آمد ہے اور مخصوص آج کل تو اس قدر بکار آمد ہے کہ اگر اس کے قاعدوں پر عملدرآمد کیا جائے تو لکھنے والوں اور پڑھنے
والوں دونوں کو بہت آسانی ہوجائے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام صوبجات میں بالخصوص صوبہ پنجاب میں
مولانا کی رسم الخط پر علی العموم بہت لحاظ کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے صوبجات میں بعض رسالے پابندی کرتے ہیں لیکن اور صوبجات
ہند میں کچھ بھی پروا نہیں کی جاتی۔ رسم الخط میں حسب ذیل عنوان ہیں۔

حرفوں کی پوری شکل۔ مرکبات۔ قواعد متعلقہ ترکیب لاحق۔ ترکیب لاحق کی تقطیع۔ قواعد متعلقہ ترکیب سابق۔ قواعد متعلقہ
ترکیب طرفین۔ متفرق قاعدے۔ خاتمہ۔ خاتمے میں مولانا لکھتے ہیں "خوش خطی ایک ہنر ہے جس کی قدر ہر ایک زمانے میں ہوتی
رہی ہے۔ بلکہ ان دنوں میں چوں کہ چھاپے خانے کثرت سے جاری ہیں خوش خطی کی اور بھی زیادہ قدر و منزلت ہے۔ ابتدا میں اگر لڑکے
جی لگا کر اس کا اہتمام کریں تو تھوڑی محنت سے سوادِ خط درست ہوسکتا ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ اس کے واسطے خاص استاد ہو اور تمام
وقت مشق اور اصلاح میں صرف کیا جائے۔ چھپی ہوئی کتابیں ہمیشہ خوش خط لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی کتاب کو دیکھ کر نقل کرنا اور ویسے ہی
کے سے حرف بنانے کی کوشش کرنا خوش خط ہوجانے کے واسطے عمدہ اور سہل تدبیر ہے۔ حرفوں کے جوڑ توڑ۔ نوک۔ پلک کشش۔ دائرہ
مرکز سب جزئیات کو بغور خیال رکھنا اور اپنی کی ہوئی نقل کو اصل سے مقابلہ کرکے فرق و اختلاف پر نظر کرنی چاہیئے۔ اگر اسی طرز پر چند
روز متواتر مشق کی جائے تو آخر کو اصل سے حرف ملنے لگیں گے۔ لڑکوں کا دستور ہے کہ جب اُن کو حرف بنانے آجاتے ہیں تو گھسیٹ کر
چلتے ہیں۔ نام کے دستخط بنانے کا ولولہ اور جلد لکھنے کی ہوس شروع سے اُن کے خط کو بگاڑ چلتی ہے۔ اور خط کا دستور ہے کہ جب ہاتھ بگڑ گیا پھر
درست ہونا مشکل ہوجاتا ہے جیسے گھوڑا کہ جب اُس کو بدرفتاری کی عادت ہوگئی تو اس میں قدم بہت دنوں کی محنت میں نکلتا ہے بس
ابتدا میں ہمیشہ ہاتھ کو روکے قلم کو سنبھالے ہوئے آہستہ لکھنا چاہیئے تاکہ حرفوں کی صورت ٹھیک بنتی جائے۔ اور التزام کے ساتھ آدھ گھنٹہ
مشق کے واسطے خاص کرلینا چاہیئے جب ایک خاص شان پر ہاتھ بیٹھ جائے گا تو بعد کو جلدی میں بھی وہی شان باقی رہے گی
خوش خطی بجائے خود کوئی علم نہیں۔ نہ اس سے عقل کو تیزی حاصل ہوتی ہے۔ نہ اخلاق کو درستی۔ نہ معلومات کو ترقی۔ بلکہ خوش خطی کو صرف

مصوری یا نقاشی کا ایک شعبہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ تو کسی طرح مناسب نہیں کہ انسان تحصیل علم پر اس کو ترجیح دے۔ تاہم یہ عام پسند اور ہر دل عزیز ہنر ایسا بھی نہیں کہ لڑکے اس سے بے بہرہ رہیں۔ کم سے کم اتنا تو ضرور ہے کہ کمال خوش خطی حاصل نہ کریں تو عیب بدخطی بھی اپنے میں پیدا نہ ہونے دیں۔ خط نستعلیق کے علاوہ جس کے قاعدے اس رسالہ میں مذکور ہیں ایک خط رواجی ہے جو سرکاری کچہریوں اور خانگی تحریروں میں مستعمل ہے اس میں نہ قاعدے کا حفظ ہے نہ خود حرفوں کی اصلی صورت کا التزام نہ نقطے کی پروا نہ نشان کی خبر۔ مگر کام اسی خط سے پڑتا ہے اور اکثر لوگ اس خط میں مہارت اور استعداد بہم پہونچانے کو مکتوب جمع کرتے اور سبقاً سبقاً اس کو پڑھتے ہیں۔ بے شک ایسے خطوط پر جس قدر نظر ہوگی اسی قدر پڑھنے میں سہولت ہوگی۔ پس تم کو اس سے بھی غافل نہ رہنا چاہیئے یہ امید مت رکھو کہ ہر جگہ تم کو مطبع مصطفائی کا چھاپہ پڑھنے کو ملے گا۔ لکھنے والے تو وہ وہ غضب کرتے ہیں کہ بڑے بڑے مشاقوں سے بھی دو چار حروف نہیں پڑھے جاتے۔ بے چارہ مبتدی تو بھلا کیا پڑھ سکے گا۔

بنات النعش اس کتاب کو مراۃ العروس کا حصہ دوم کہنا چاہیئے۔ مراۃ العروس کے شائع ہونے کے تیسرے برس ۱۸۷۲ء میں یہ کتاب بھی گورنمنٹ میں پیش کی گئی۔ وہی سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر تھے جن کو مراۃ العروس کے سامنے کوئی کتاب جچتی نہ تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ بنات النعش پر صرف پانسو انعام ملا۔

اس کتاب کی بھی وہی بول ہے۔ وہی طرز تحریر ہے۔ مراۃ العروس سے تعلیم اخلاق اور تربیت خانہ داری مقصود تھی۔ اس سے بھی وہی ہے مگر ضمناً اور معلومات مفیدہ کا اس میں کافی طور پر اضافہ کیا گیا ہے۔

اصغری خانم جن کی سلیقہ شعاری اور سگھڑاپے کا ذکر مراۃ العروس میں ہے وہ شوقیہ لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں اس مکتب میں حسن آرا بیگم نے جو اس کتاب کی ہیروائن ہیں تعلیم پائی ہے۔ حسن آرا کے مزاج کی ابتدا ایسی بُری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔ نہ ماں کا ادب نہ آپا کا وقر۔ نہ باپ کا ڈر۔ نہ بھائیوں کا لحاظ۔ نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں۔ لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔ اس بدسلیقہ لڑکی کی تعلیم و تربیت جس عمدہ طور پر ہوئی ہے وہ قابل دید ہے حسن آرا کی بگڑی ہوئی عادات۔ امیرانہ خیالات۔ لاڈ پیار کی وجہ سے ہٹ اور ضد اور دوسری لڑکیوں کو حقارت سے دیکھنے اور ان پر نام دھرنے اور اسی قسم کے صدہا معائب کی اصلاح نہایت خوش اسلوبی سے اصغری خانم نے کی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اس کے دل میں پیدا کیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں اخلاقی مضامین۔ کام کی باتیں۔ میل جول کے طریقے۔ نیکی اور سچی خیرات۔ ہم جولیوں کا پاس ادب۔ حساب کی دلچسپ باتیں۔ زمین کی کشش۔ وزن مخصوص۔ کشش ثقل۔ مقناطیس۔ زمین کی ہیئت و حرکت۔ خورد بین۔ رنگ۔ متحرک چیزوں میں آنکھوں کا غلطی کرنا۔ زمین کے گول ہونے کی دلیل۔ جسمانی ریاضت۔ زمین کی جسامت اور تقسیم۔ تمدن کی وجہ شہر اور دیہات کی آب و ہوا کا مقابلہ۔ اہل شہر اور دیہاتیوں کا محاکمہ۔ عورتوں کے توہمات۔ عرب کا جغرافیہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ سمجھا بجھا دیا ہے۔ یہ کتاب فی نفسہ ایک عمدہ دستور العمل ہے جنرل نالج یعنی عام معلومات اس سے بہت ہوتی ہے۔ بنات النعش کا ترجمہ بھی گجراتی زبان میں ہوا ہے اور "آشکارا پریس" بمبئی میں چھپا ہے۔

نمونہ بنات النعش راقم نے بنات النعش کو بھی بطور فال کھولا تو "محمودہ کا حسن آرا کو (آنانکہ غنی تراند محتاج تراند) کا مضمون سمجھانا" نکلا۔ اس لئے یہ مضمون تو درج کیا جاتا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "حسن آرا کا مکتب سے رخصت ہونا" بھی درج کیا جائے

کہ یہ دونوں مضمون لازم و ملزوم ہیں۔ ذیل کے دونوں مضمون اپنی طوالت کی وجہ سے ناظرین کو شاید منقبض کریں اس لئے ہم معافی چاہتے ہیں۔ مولانا کی تصانیف کا اقتباس کچھ "حیاۃ النذیر" کا حجم بڑھانے کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اگر لائف میں مضامین کا اقتباس نہ ہوتا تو ہمارے نزدیک یہ کتاب مکمل نہ ہوتی۔

محمودہ کا حسن آرا کو (آنانکہ غنی ترانند محتاج ترانند) کا مضمون سمجھانا

محمودہ۔ محتاج کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر محتاجی اور کیا ہوگی کہ آپ کا ایک دن بھی بے نوکروں کے نہیں کٹ سکتا۔ بھلا میں پوچھتی ہوں۔ ماما نہ ہو تو کھانا کون پکائے۔ لونڈیاں نہ ہوں تو پانی کون پلائے۔ مونھ کون دھلائے پنکھا کون جھلے۔ چیز کون اُٹھا کر دے۔ چارپائی کون بچھائے۔ بچھونے کون کرے۔ گھر میں جھاڑو کون دے۔ یہ تو روزمرّہ کے کام ہیں۔ کھانا۔ کپڑا۔ برتن۔ زیور اور ضرورت کی کل چیزیں چھوٹی یا بڑی یہاں تک کہ پانی پینے کا مٹی کا آبخورہ۔ کنگھی۔ سوئی۔ سلائی۔ کیا آپ نے اپنے ہاتھوں بنائی ہیں یا لوگوں نے آپ کو بنا کر دی ہیں۔ اس پر بھی آپ کہتی ہیں کہ "خدا نہ کرے ہم کسی کے محتاج کیوں ہونے لگے"۔

حسن آرا۔ بے شک ضرورت کی سب چیزیں اور لوگ بناتے اور ٹہل خدمت بھی اور لوگ کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی چیز ہم کو مفت دی جاتی ہے۔ اور کیا بے لئے کوئی ٹہل خدمت کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کے لئے ہم روپیہ خرچ کرتے ہیں روپئے کے لالچ سے لوگ خود بخود چیزیں لئے دوڑے چلے آتے ہیں۔ بے بلائے ٹہل خدمت کرنے کو حاضر ہوتے ہیں۔ روپیہ ہو تو گھر بیٹھے دُنیا بھر کا سامان لے لو۔ اور نوکر تو ایک صبح رکھو ایک شام۔ میں تو جانتی ہوں کہ دولت بڑی چیز ہے جس کے پاس دولت ہے وہ کسی کا محتاج نہیں اور تمام دُنیا اُس کی محتاج ہے۔

محمودہ۔ آپا بیگم صاحب آپ بڑی غلطی کرتی ہیں۔ بھلا لوگ آپ کی دولت کی قدر نہ کریں۔ اور کوئی روپے کا خواہاں نہ ہو تب آپ کیا کیجئے۔ یہ سُن کر حسن آرا چپ ہوئی۔ اور سوچ کر کہا تو یہ کہا کہ ایسی صورت میں سوائے مر رہنے کے اور کیا تدبیر ہے۔ کام کاج ہم سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور فرض کیا کہ اپنے اوپر جبر سہا اور آپ اُٹھ کر پانی پی لیا۔ بچھونا اپنے ہی ہاتھوں کر لیا تب بھی کھانا پکانا تو ممکن نہیں اور مانا کہ کوئی سہج سا کھانا مر گر کر پکا لیا کیوں کہ سُنا ہے کہ اناجان سوئیاں اور خشکہ اُبال لینا جانتی ہیں مگر ضرورت کی اور ہزار چیزیں ہیں۔ کپڑا کون بُنے گا۔ زیور کون گھڑے گا۔ لیکن کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ دولت کی قدر۔ روپے کی خواہش نہ ہو۔؟

محمودہ۔ بیشک ممکن ہے بہت دن ہوئے مجھ کو اُستانی جی نے ایک کتاب پڑھائی تھی۔ اُس میں لکھا تھا کہ ابتدا اُ دُنیا میں بہت مدت تک اشرفی روپئے پیسے کا چلن کچھ بھی نہ تھا۔ اُس زمانے میں لوگ کھیتی کے کام سے بھی اور جس طرح اب ہر طرح کا غلّہ اور انواع و اقسام کی ترکاریاں اور میوے اور پھل پھول لوگ محنت کر کے زمین سے پیدا کرتے ہیں۔ اُن دنوں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ سمندر کی مچھلیاں اور جنگل کے جانور مار لاتے اور اُن ہی کے گوشت سے اپنا پیٹ بھر لیتے یا جنگل میں جو ساگ پات از خود جم اُٹھتا ہے جانوروں کی طرح اُس کو کھا لیتے۔ یہ زرق برق اور تکلف کے کپڑے جو اب اس زمانے میں ایسے سستے ہیں کہ ہر ایک غریب آدمی کو بھی میسّر آجاتے ہیں پہلے ان کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ جانوروں کے چمڑے اور ڈھاک وغیرہ کے پتّوں سے بدن کو ڈھانکتے اور عالی شان محلوں کی جگہ درختوں کی چھاؤں اور پہاڑوں کی کھوؤں میں پانی اور سردی گرمی سے پناہ لیتے۔ جوں جوں دُنیا کی

زیادہ ہوتی گئی آدمی اپنے آرام کے لئے نئے نئے پیشے اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے گئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ ایک آدمی ہر ایک طرح کا کام آپ اکیلا کر لیتا اور ہر طرح کی چیز آپ بنا لیتا۔ اس سبب سے کسی نے ایک کام لیا اور کسی نے دوسرا۔ کوئی کھیتی کرنے لگا کوئی لوہار بنا۔ کوئی سنار۔ کوئی جولاہا۔ کوئی موچی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ کھیتی والا سب کے لئے کھانے کا غلہ پیدا کرے۔ لوہار۔ چاقو مقراض وغیرہ لوہے کی چیزیں بنائے۔ بڑھئی۔ ہل۔ چارپائی۔ چوکی۔ کرسی۔ وغیرہ لکڑی کی چیزیں۔ سنار زیور گھڑا کرے۔ جولاہا ہر قسم کے کپڑے بُنے۔ اور آپس میں ضرورتوں اور چیزوں کا مبادلہ کر لیا کریں۔ چندے اسی طرح بے روپے بے سکے دنیا کا کام چلا۔ مگر آخر کار مشکلیں پیش آنے لگیں جس کو کتاب والے نے یوں لکھا ہے کہ اب فرض کرو کہ مثلاً موچی کو کپڑے کی ضرورت ہوئی اور وہ ایک بہت طرح دار جوتی بنا کر جولاہے کے پاس لے گیا۔ گردن کا دانہ دار چمڑا۔ مڑی ہوئی نوک۔ کھڑی ہوئی ایڑی۔ کمبخت کے پان۔ اونچی دیوار۔ کما یا ہوا تلا۔ بخیے کی دو دو سوت اور کہا دیکھو تو شیخ جی کیا جوتی بنا کر لایا ہوں۔ کیچڑ میں پھرو۔ پکی سڑک پر دوڑو نہ تلا گھسے گا نہ صورت بگڑے گی۔ پھر اُو کا نام نہیں۔ برس روز سے کم چلے تو اُلٹی میرے سر مارنا۔ مگر مجھکو گاڑھے کا ایک تھان چاہیے۔ آٹھ سے نہ ہو تو چھے سے پون گز کا پنہا۔ جولاہا بولا چودھری جوتی تمہاری سرن اور تھان بھی جیسا تم چاہتے ہو موجود۔ سوت بھی گول۔ راچھ بھی پھنے دار ہے۔ خوب ٹھوک ٹھوک کر بنا ہے۔ ناڑی کا نام نہیں۔ مگر وہ پہلی جوتی جو تم نے بنا دی ہے ابھی تک دھری ہے۔

موچی۔ ارے شیخ جی! تین برس کی جوتی اب تک جولاہا۔ کیوں دن بھر تو کارگاہ میں بیٹھا رہتا ہوں آٹھویں دن کبھی پیٹھ میں جانے کا اتفاق ہوا جوتی پر ایسی زد کیا پڑتی ہے۔ دوسرے بھائی میں غریب آدمی ہوں۔ پاؤں بھی ہولے ہولے رکھتا ہوں۔

موچی بیچارہ ناامید ہو کر چلا آیا اور پہنچا سنار کے پاس کہ کیوں لالہ تم کو جوتی کی ضرورت ہے۔ سنار۔ ہاں بھائی اچھے آئے دس دن سے ننگے پاؤں پڑا پھرتا ہوں۔ اور اس کے بدلے زیور بھی وہ بنا کر دوں کہ تمام برادری میں کسی کے یہاں نہ نکلے۔

موچی۔ اجی ساہ جی کہاں ہم اور کہاں زیور مجھ کو دیکھو کہ چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔ گھر میں بچوں کے پاس ٹوپی تک نہیں۔ گھر والی پیوند گانٹھتے گانٹھتے ہار گئی۔ کپڑے کی ضرورت ہے۔ سنار۔ کپڑے کی ضرورت ہے تو شیخ نمازی کے پاس جاؤ۔

موچی۔ گیا تھا اُس کے پاس جوتی موجود ہے۔ سنار۔ چلو دیکھیں شیخ نمازی کو کچھ گہنا بنوانا ہو۔ سنا تھا کہ بیٹی کا بیاہ کرنے والا ہے تو میں اُس کو گہنا بنا دوں گا۔ تم مجھ کو جوتی دینا اور میں اُس سے تھان لے کر تم کو دے دوں گا۔ اب سنار اور موچی دونوں پھر جولاہے کے پاس گئے۔ سنار۔ شیخ جی کہو بیٹی کا بیاہ کب کرو گے؟ جولاہا۔ چودھری وہ بات تو بگڑ گئی۔ سنار۔ کیوں۔ جولاہا۔ وہ لڑکا بڑا خراب نکلا۔ چور۔ جواری۔ بھانگ پیتا ہے۔ سنار۔ کچھ تم کو گہنا بنوانا ہے۔ جولاہا۔ ابھی تو نہیں جب پھر نسبت ناطہ ٹھہرے گا دیکھ لیا جائے گا۔

غرض کہ بیچارے موچی کی جوتی اینڈ رہ گئی۔ جب ہر ایک شخص کو ایسی دقت پیش آنے لگی تو سب نے ملکر یہ تجویز کی کہ چیز کا مبادلہ چیز سے ٹھیک نہیں ایک ایسی چیز ٹھہراؤ کہ ہر کوئی ہر ایک چیز کے بدلے اُس کو لے لیا کرے۔ موچی اپنا بنایا ہوا جوتا اُس کے عوض دیا کرے۔ سنار اپنا گھڑا ہوا زیور۔ جولاہا اپنا بنا ہوا تھان۔ تب سکہ چلا۔ پہلے لوہے کا سکہ تھا اور ایسا بھاری تھا کہ شاید سو روپے کی مالیت کے واسطے چھکڑا بھر بوجھ ہوتا تھا پھر تانبے اور چاندی اور سونے کے سکے چلے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چمڑے کا روپیہ چلا تھا۔ اس میں بھی سونے کی کیل تھی۔ اب انگریزوں نے وہ انتظام بٹھایا ہے کہ کاغذ کا سکہ چلاتے ہیں۔

ایک ورق کاغذ دس۔ سو۔ ہزار۔ لاکھ روپے کا ہوتا ہے۔ جتنا روپیہ کاغذ میں لکھا ہے جہاں چاہو بھنالو۔ نہ بٹہ ہے نہ دستوری۔ پس روپیہ اپنی ذات سے کسی کام کا بھی نہیں نہ اُس کو نان خطائی کی طرح کھاتے نہ اُس کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے ہیں مگر جو چیز چاہو روپے کے بدلے البتہ لے سکتے ہو پس حقیقۃ میں درکار ہوتی ہے وہ چیز اور روپیہ اُس کے حاصل کرنے اور ہم پونہچانے کا ایک ذریعہ ہو جاتا ہے۔ حقیقۃ ہے اُس روپیہ کی جس پر امیروں اور دولتمندوں کو اس قدر ناز ہے حسن آرا۔ کیا ہی اچھی بات آپ نے مجھ کو بتائی مگر یہ تو فرمائیے کہ جب روپیہ ہر ایک چیز کا عوض ہو سکتا ہے تو جس کے پاس روپیہ ہے گویا وہ ہر ایک چیز کا مالک ہے۔ اور ہر ایک چیز اُس کے اختیار میں ہے تو ضرور روپیہ بڑی قدر و منزلت کی چیز ہے اور روپے والوں کو جتنا ناز اور جتنا گھمنڈ ہو سب بجا اور درست ہے محمودہ گھمنڈ کی تو کوئی وجہ نہیں باقی روپیہ بیشک چیز کا بدل ہے مگر خود اُس چیز کا کام نہیں دے سکتا مثلاً فرض کرو کہ ہم کو ایک جوتی کی ضرورت ہے تو اس میں دو باتیں ہیں ایک یہ کہ جوتی درکار تھی اور جوتی موجود ہے۔ اور دوسری یہ کہ جوتی تو موجود نہیں مگر روپیہ ہے جس کے بدلے ہم جوتی مول لے سکتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غور کیجئے ہرگز یکساں نہیں پھر بھی روپے والے کو اتنی حاجت باقی ہے کہ روپیہ لے کر بازار جائے اور جوتی مول لائے۔ فرض کیجئے کہ جوتی نہ ملی یا ملی اور قیمت نہ ٹھیری تو آخر روپئے والا مجبور رہے گا یا نہیں۔ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب روپئے والا جوتی لینے جاتا ہے یہ جوتی کا محتاج ہے مگر جوتی والا حقیقۃ میں روپے کا محتاج نہیں بلکہ وہ اُس چیز کا محتاج ہے جس کے بدلے جوتی کی قیمت خرچ کرے گا۔ غرض کہ روپے والا زیادہ محتاج ہے اور اگر زیادہ نہیں تو جوتی والے کے برابر سہی۔ پھر اس کو گھمنڈ کس بات کا ہے۔ ایک چیز کا یہ خواہش مند ہے یعنی جوتی کا۔ اور دوسری چیز یعنی روپے کا دوسرا۔

حسن آرا۔ لیکن روپے کے بدلے ہر وقت چیز میسّر آسکتی ہے۔ محمودہ۔ یہ غلطی ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیسے کی جگہ دو دینے کو موجود ہیں اور چیز نہیں ملتی۔ میری اماجان کبھی غدر کے حالات بیان کیا کرتی ہیں کہ سب لوگ بھاگ بھاگ کر سلطان جی جا رہے تھے روپے کا سیر بھر آٹا تلاش کرتے تھے اور نہیں ملتا تھا۔ دن بھر مرد روپے لئے لئے پھرتے تھے اور شام کو ہار کر خالی ہاتھ چلے آتے تھے۔ غدر کے سبب رسد کا باہر سے آنا بالکل بند تھا۔ گاؤں والوں کے پاس جو رسد تھی وہ کہتے تھے کہ روپیہ لے کر ہم کیا کریں گے گھر میں تھوڑا بہت اناج رکھا ہے تو بال بچوں کا سہارا تو ہے۔ حسن آرا۔ البتہ اگر ایسا اتفاق پیش آجائے تو روپیہ محض نکما ہے مگر کیا روز غدر ہوتا پڑا ہے۔ یہ بھی خدا جانے کیا بات تھی۔ اب تو جس کے پاس دولت ہے وہی آسودہ ہے۔

حسن آرا کا مکتب سے رخصت ہونا

ہم شروع کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ حسن آرا مکتب میں بیٹھی تو گیارھویں برس میں تھی جب اُس کو خیر سے چودھواں برس لگا تو جھجھر والوں کی طرف سے بیاہ کا تقاضا شروع ہوا۔ اس عرصہ میں حسن آرا نے سارا قرآن مجید پڑھا اور چونکہ دو سیپارے روز تلاوت کا معمول تھا ایسا یاد تھا کہ گویا حفظ ہے۔ اردو بے تکان اور بے تکلف لکھتی پڑھتی تھی۔ سواد خط بھی کچھ برا نہ تھا۔ قرآن کا ترجمہ اور کنز المصلّی۔ قیامت نامہ۔ راہ نجات۔ وفات نامہ۔ قصۂ شاہ روم۔ قصہ سپاہی زادہ۔ معجزۂ شاہ یمن۔ رسالہ مولد شریف مشارق الانوار۔ اتنی تو مذہبی کتابیں اس کی نظر سے گزر گئیں اور ان کے علاوہ حساب ضروری قاعدہ کسر تک اور ہندوستان کا

جغرافیہ۔ ہندوستان کی تاریخ۔ چند پند۔ منتخب الحکایات۔ مرأۃ العروس۔ سب کچھ سیکھ پڑھ کر فارغ ہو گئی۔ اُردو کے اخبار بے تأمل پڑھ کر سمجھ لیا کرتی تھی اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ خانہ داری کے جو ہنر عورتوں کو درکار ہیں سب اُس نے حاصل کئے اور معلوماتِ مفیدہ کا اتنا ذخیرہ اُس نے فراہم کر لیا کہ وہ اُس کو تمام عمر کی آسایش اور مسرت کے لئے کافی تھا۔ کتاب کے ذریعے سے جو کچھ اُس نے سیکھا اُس کا ہزار چند اُستانی اصغری خانم اور مکتب کی لڑکیوں سے باتوں باتوں میں حاصل کیا جب اِس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہنچی تو ہر چند گھر والوں نے اُس کو مکتب جانے سے روکا مگر اُس کو مکتب سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا تھا کہ ایک لمحہ مکتب سے جدا رہنا اُس کو شاق تھا حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک کہ مائیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تب ناچار سلطانہ بیگم خود اُستانی اصغری خانم کے پاس آئیں سلام و دعا اور مزاج پرسی کے بعد سلطانہ بیگم بولیں۔

اُستانی جی! تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی کہ آج جاؤں۔ کل جاؤں لیکن تمھاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں ملتی۔ سیتی میں نہیں۔ پروتی میں نہیں۔ مگر کام ہے کہ سمٹنے میں نہیں آتا۔ آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی۔ سو کام کا ہرج کیا اور میں نے کہا چلوں ذرا کھڑے کھڑے اُستانی جی سے تو مل آؤں۔

اُستانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے۔ آپ نے ناحق تکلیف کی مجھ ہی کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سینے اور مسالا ٹانکنے کو آپ کے یہاں سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ جوڑے ماشاء اللہ بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر جانے والے ہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر نہیں حسن آرا کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور مسالا بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا۔ اُس جوڑی کی گلبدن کے پائجامے میں جو مَیں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گھیر و کھیچ زیادہ گیا ہے۔ بہتیرا شہر بانو کہتی رہی کہ اُستانی جی لاؤ اُدھیڑ کر پھر ٹانک دوں۔ میں نے کہا خیر رہنے بھی دو اُدھیڑنے سے گوکھر و خراب ہو جائے گا۔ آئندہ اِس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا۔ پھڑک گئیں اور کہنے لگیں پھر کہاں مردوں کی چٹکی اور کہاں عورتوں کی۔ میں بولی ارے مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ اے حضور یہ جوڑا میاں علی جان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب کہ عورتوں کا کام کیسا ہی سجل کیوں نہ ہو مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں۔ کہاں کے علی جان اور کیسے مرد یہ جوڑا تو میری اُستانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور اُن ہی نے اس میں مسالا بھی ٹانکا ہے۔ یہ سُن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ ستھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا۔

اُستانی جی۔ خیر اور جوڑوں کی سلائی مجکو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے حسن آرا کے تمام جوڑے یہیں بھیج دیئے ہوتے لڑکیاں تو خوشی خوشی سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم۔ اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا۔ مغلانیوں سے میں نے صرف موٹا کام لیا۔ چاندنیاں ہوئیں گٹھڑیاں ہوئیں۔ دسترخوان ہوئے۔ سوزنیاں ہوئیں۔ موباف۔ غلاف۔ تکیے۔ توشک۔ لحاف۔ اس طرح کی چیزیں البتہ

مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے۔ باقی پہننے کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی اماں کے ہاں
سیئے پروئے گئے۔ استانی جی۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو نصیب ایک یہ ہزاروں اور گھس پس کر پرانے ہوں۔ سلطانہ بیگم
ٹھنڈا سانس بھر کر ہاں استانی جی دعا کیجیے اللہ نصیب اچھے کرے۔ بیٹیوں کا بھی کچھ عجب نازک معاملہ ہے۔ کن کن مصیبتوں سے پالو
پرورش کرو اور پھر دھن پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک
سمدھیانہ کرکے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور کان اینٹھا۔ ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی
باتیں حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی۔ میں نے کہا حاشا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی میں شہر میں اب بیٹی
نہ دونگی۔ کالا منہ ہو ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے۔ سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے ہاتھ
شرم ہے۔ استانی جی۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیے اول تو جھجھر والے خود بڑے رئیس ہیں۔ دوسرے خاک چاٹ کر کہتی
ہوں آپ انشاء اللہ دیکھ لیجیے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں
تو مجھ کو الٹا لٹکا دیجیے گا۔ کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ سلطانہ بیگم۔ فرق تو آپ کی
عنایت سے زمین و آسمان کا ہے۔ آپ کے فیضان تعلیم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرے کو خورشید، پوتھ کو لعل، سفید
حیوان کو آدم، حسنا کو ماشاء اللہ حسن آرا بیگم بنا دیا۔ اس کی خوبی تقدیر کی ایک یہی بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اس کی
استانی ہیں۔ یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منت رہیں گے۔ مگر جب سے
حسنا نے بیاہ کی تیاری ہوتی دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے۔ یوں ہی گھر میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اب اور بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے
نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے۔ ارادہ تھا کہ پورے مہینے بھر مائیوں بٹھاؤں گی۔ اس کی حالت دیکھ کر
میں نے کہا کہ مائیوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے۔ رنگت زرد ہو گئی ہے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ دیکھو اداس
صورت دیکھو غمگین۔ میں کہتی ہوں اس کو اتنا فکر کیوں ہے۔ اس عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی خوشی ہوتی ہے۔
استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں ماشاء اللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے۔ یہی کچھ گھر کے
چھوٹنے کا خیال ہوگا۔ سلطانہ بیگم۔ گھر کی تو اس کو مطلق پروا نہیں۔ البتہ مکتب اس کی جان ہے۔ دیکھیے کیونکر بچی کا دل بہلے گا
استانی جی۔ میں سمجھا دوں گی۔ اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہی ہوتا ہے۔ سلطانہ بیگم۔ اترسوں خیر سے
چھبیسویں تاریخ اور جمعے کا دن ہے اگر آپ اجازت دیں تو حسنا کو مائیوں بٹھا دیا جائے۔ گنبے والے پچھوا پچھوا بھیجتے ہیں اب تک
لڑکی کو مائیوں نہیں بٹھایا۔ استانی جی۔ خدا مبارک کرے۔ تاریخ بھی اچھی۔ دن بھی اچھا۔ اور حسن آرا بیگم کو مائیوں بٹھلانے کی
تو کچھ ضرورت نہ تھی مگر خیر دنیا کی رسم ہے۔ سلطانہ بیگم۔ پھر آپ فرمائیں تو حسنا گھر سے نہ نکلے۔ میں تو کئی دن سے کہہ رہی ہوں مونھ
سے تو کچھ نہیں کہتی آنکھ بچی اور مکتب میں۔ استانی جی۔ کل اور معاف کیجیے پرسوں انشاء اللہ میں حسن آرا بیگم کو مکتب سے رخصت
کر دوں گی۔ لڑکیوں کی خواہش ہے کہ کل دونوں وقت مکتب کی طرف سے حسن آرا بیگم کی دعوت ہو۔ رت جگا کریں۔ پرسوں سویرے
ذرا آپ بھی جمال آرا بیگم کو ساتھ لے کر تشریف لائیے گا۔ اور لڑکیوں کی مائیں بہنیں بھی آئیں گی۔ اس کے بعد سلطانہ بیگم تو رخصت
ہوئیں۔ اگلے دن بڑے تکلف اور بڑی دھوم کے ساتھ حسن آرا بیگم کی دعوت ہوئی۔ مکتب کی لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں

وہ وہ کھانے پکائے کہ کیا کوئی رکاب دار پکائے گا۔ سدا ت کو رت جگا ہوا حسن آرا کے سہاگ اور بدھائیوں کے گیت گائے گئے اور لڑکیوں نے یہ بھی صلاح کی کہ مکتب کی طرف سے چڑھاوے کا جوڑا تو خیر دیا ہی جا سکے گا مانجھے کا جوڑا بھی مکتب ہی کا ہو اور حسن آرا بیگم یہی جوڑا پہن کر مکتب سے رخصت ہوں۔ صبح سویرے اٹھ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو مکتب میں جھاڑ و دلوا سلیقے کے ساتھ دالانوں میں صاف اور ستھرا فرش بچھوا دیا۔ اتنے میں مہمانوں کی ڈولیاں آنی شروع ہوئیں۔ کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ لڑکیوں کی ماں بہنوں میں تو کوئی بھی ایسی نہ تھی کہ نہ آئی ہو محلے کی ساری بیویاں بے بلائے بیکر دیکھنے کو آموجود ہوئیں اور اچھی خاصی شادی رچ گئی۔ بیچ دالان میں جہاں سوزنی کا گاؤ تکیہ بچھا تھا استانی جی بیٹھیں اور سارے مہمان اسی دالان میں آکر بھر گئے۔ جب سب لوگ بیٹھ بٹھا چکے تو اندر کوٹھری سے لڑکیاں حسن آرا بیگم کو مانجھے کا جوڑا پہنا کر باہر لائیں اور استانی جی کے عین سامنے لا بٹھایا تب استانی جی نے حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر یہ تقریر کی۔ کہ لو حسن آرا بیگم! آج میں تم کو اپنے اور اپنی مکتب کی لڑکیوں کی طرف سے رخصت کرتی ہوں۔ آج استادی۔ شاگردی۔ اور ہم مکتبی سب کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ سن کر سارے مہمانوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے اور استانی جی کا بھی دل اس قدر بھر آیا کہ ضبط کرتی تھیں مگر آواز سے رقت ظاہر تھی مگر محبت اخلاص ان شاء اللہ جب تک دم میں دم باقی رہے گا۔ حسن آرا بیگم! میں تم کو مثل اپنی بتول کے اور محمودہ کے چاہتی اور پیار کرتی تھی۔ اور کرتی ہوں اور جب تک دنیا میں ہوں خدا نے چاہا کروں گی۔ مگر استادی شاگردی کا ایسا ناطا ہے کہ مجھ کو اس محبت کا برتاؤ رکاوٹ کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی میں نے تم کو تمہاری غلطیوں پر تنبیہ کیا ہو گا۔ بلکہ شاید کسی بے جا بات پر ملامت بھی کی ہو سو وہ تنبیہ اور ملامت سب تمہارے فائدے تمہاری اصلاح اور تمہاری بہتری کے واسطے تھی۔ جب دو آدمی دنیا میں کسی طرح کا تعلق رکھتے ہیں چاہے وہ تعلق ہمسایہ گی اور ہم وطنی اور انسانیت ہی کا کیوں نہ ہو مگر بہت سے حقوق ایک کے دوسرے پر ہوتے ہیں وہ تعلق جو مجھ کو تمہارے ساتھ تھا میں کہہ چکی ہوں کہ تعلق مادری و فرزندی کے قریب قریب تھا۔ ہر چند میں تمہارے حقوق کے ادا کرنے میں اپنے مقدور بھر کوشش کرتی رہی ہوں۔ لیکن ممکن ہے کہ مجھ سے تمہارے کسی حق کے ادا کرنے میں کچھ فروگزاشت ہوئی ہو سو آج میں اس بھرے مجمع میں تم سے بمنت اس کی معافی چاہتی ہوں۔ اس واسطے کہ میں بھی آدمی ہوں اور آدمی کو کبھی یہ غرور نہیں کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنے فرائض انسانیت کو پورا پورا ادا کیا ہے (ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور رہا مگر اس کے ساتھ رقت بھی تھی) لو حسن آرا بیگم! انسان کا خمیر انس سے ہے دو چار دفعہ کی صاحب سلامت سے آدمی کو آدمی کی محبت پڑ جاتی ہے اور تم سے تو تین برس کامل اس درجے کا اختلاط رہا کہ رات دن پاس رہنے کا اتفاق ہوا پس آج میں تم کو اسی صدمے اسی درد اسی رنج کے ساتھ رخصت کرتی ہوں جس طرح بتول اور محمودہ کو کروں گی۔ اگر خدا کو منظور ہے۔ سب جتنے اس وقت موجود تھے پکار کر رو دیئے۔ (استانی جی تھوڑی دیر ضبط کرنے کے بعد) لو حسن آرا بیگم! میں جدائی اور رخصت کے مضمون کو بار بار کہنا نہیں چاہتی اس واسطے کہ اس سے تم کو اور مجھ کو اور سب سننے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر غور کرو تو تمہارا رخصت ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے دنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور ہے کہ بیاہ ہوا اور ماں باپ سے جدا ہوئیں۔ مجھ کو بھی اپنی ماں سے کبھی ایسا ہی تعلق تھا کہ جیسا تم کو اب بیگم صاحب سے یا مجھ سے ہے۔ تمہاری طرح میں بھی ایک آپا رکھتی تھی تمہاری جیسی سہیلیاں میری بھی تھیں مگر آخر سسرال کی نئی دنیا میں آکر بسی اور کیا میں اکیلی بسی۔ مجھ ایسی ہزاروں لاکھوں تم کو شاید شہر کے باہر بیاہے جانے کا خیال ہوتا ہو گا۔

سو سمجھو کچھ دور نہیں ہے۔ باہر شہر ہی مگر تمھارے واسطے نہیں جن کے لیے ماشاء اللہ ہر طرح کی سواریاں موجود ہیں۔ اگر آنا چاہو تو پھر
نہیں سوا پہر۔ بواحسن آرا بیگم! ایسے کے تعلقات یاد رکھو۔ رفتہ رفتہ خود بخود ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔ پس کیا دکھ اتنا سمجھا لینا
بڑا کام ہے کہ پہلے ہی سے ادھر کے تعلقات کو ضعیف فرض کر لیا جائے۔ حسن آرا بیگم! تمھاری حالت میں جو انقلاب عظیم ہونے والا
ہے مجھ کو امید ہے کہ تم اس سے بے خبر نہیں ہو اور تم کو شکر کرنا چاہیے کہ جس امتحان کے لیے تم بلائی جاتی ہو تم کو اس کے واسطے
طیاری کرنے کی اچھی خاصی فرصت اور فراغت حاصل تھی۔ جو کچھ تم نے پڑھا اور سیکھا اور سنا اب اس امتحان میں تمھاری اصلاح کا
اور مددگار ہوگا۔ جو شخص تمھاری طرح کتابوں کا ذخیرہ پاس رکھتا ہے اگر وہ اپنے تئیں تنہا سمجھے یا وہ اپنے تئیں اپنے پیاروں سے
بچھڑا ہوا خیال کرے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ یہی کتابیں تمھاری تنہائی کی سہیلیاں ہیں۔ اور سہیلی بھی کیسی ماں کی طرح مہربان
استانی کی طرح شفیق۔ مونس۔ غمخوار۔ رفیق۔ غمگسار۔ ناصح۔ دوست دار۔ خیر خواہ۔ وفا شعار۔ بواحسن آرا بیگم! اب تک جو کچھ
تم پڑھتی رہیں تم کو قصے اور کہانیاں معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن وہ کہانی اب تک جگ بیتی تھی اور اب اپنی بیتی ہوگی۔ غنیمت کتابیں
تمھارے پاس ہیں اگرچہ تھوڑی ہیں مگر غور کرنے اور عمل کرنے کو بہت ہیں اور ہیں تمھارے ہی فائدے کی نظر سے۔ یہ آخری
نصیحت تم کو کرتی ہوں کہ تم اسی طرح التزام کے ساتھ ان کو پڑھتی اور دیکھتی رہنا جیسے مکتب کی حالت میں پڑھا اور دیکھا کرتی تھیں
جس روز سے تم مکتب میں داخل ہوئیں میں نے تمھارے حالات قلم بند کرنے شروع کر دیئے تھے اور اب تک جو مباحثے۔ اور
مطارحے تم میں اور لڑکیوں میں واقع ہوئے ہیں سب کو سلسلہ وار لکھتی چلی گئی اب میں دیکھتی ہوں تو ان سے ایک اچھی خاصی
کتاب بن گئی ہے **بنات النعش** میں نے اس کا نام رکھ دیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جو میں تم کو بطور اپنی یادگار کے دیتی ہوں۔
کتاب کی دیکھا بھالی میں دو چار لمحہ سلسلۂ سخن منقطع رہا اور پھر استانی جی نے اپنی تقریر شروع کی۔ بواحسن آرا بیگم! اس کتاب
میں تم اپنی بلکہ مکتب کی سب لڑکیوں کی ہو بہو تصویریں پاؤگی۔ یہ سن کر کل حاضرین جنھوں نے کتاب کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر
دیکھا تھا متعجب ہوئے۔ استانی جی۔ تصویر سے میری یہ مراد ہے کہ تمھارے مزاج۔ تمھاری عادت۔ تمھاری خو بو کا اس میں ایسا
بیان کامل ہے کہ جو تمھارے حالات سے واقف ہے کتاب سے پڑھتے کے ساتھ سمجھ جائے گا کہ تمھارا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب تم کو وہ عادتیں
یاد دلائے گی جن کی اصلاح میں مجھ کو بڑے بڑے اہتمام کرنے پڑے ہیں۔ تم کو اس کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ گویا پھر
وہی تم ہو اور وہی مکتب ہے وہی بات بات پر ضد ہے اور وہی بات بات پر تعجب ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے تم کو معلوم ہوگا کہ مکتب کی
تعلیم نے تم پر کہاں تک اثر کیا۔ کون کون بری عادتیں تھیں کہ چھڑا دیں۔ کون کون سی غلط فہمی تھی کہ اس کی اصلاح کی اور کون کون
سی نیک باتیں ہیں کہ اولاً ان کی بہتری تم سے تسلیم کرا کے پھر تم کو ان کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ ظاہر میں تم آج سے اس مکتب سے
جدا ہوئیں مگر میرے اور مکتب کی لڑکیوں کے دلوں سے ہمیشہ تم نزدیک رہو گی اور وقتاً فوقتاً جو فائدہ تم کو اس مکتب سے پہنچنا
ممکن ہے پہنچتا رہے گا۔ جو نئی کتاب ہم لوگ پائیں گے یا جو عمدہ مضمون سنیں اور دیکھیں گے ضرور تم کو اس کے پڑھنے میں شریک کر لیا
کریں گے۔ بواحسن آرا بیگم! تم جانتی ہو کہ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن خدا کا شکر کرتی ہوں کہ میں اپنی حالت سے رضا مند اور
اپنی حیثیت میں خوش ہوں کیوں کہ بقول ایک بزرگ کے آسمان کو دیکھتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ ضرور کسی نہ کسی دن طائر روح قفس عنصری
سے نکل کر اوج فلک پر پرواز کرتا ہے۔ پھر زمین کو دیکھتی ہوں اور پاتی ہوں کہ جب مردوں کی تو صرف چند بالشت زمین میری ہڈیوں کے لیے

درکار ہوگی پھر غور کرتی ہوں تو دنیا میں نہ کچھ ساتھ لائی اور نہ کچھ ساتھ لے جاؤں گی اور ہزاروں لاکھوں خدا کے بندے ایسے
ہیں کہ اُن کے مقابلے میں ہر طرح اور ہر اعتبار سے میری حالت بدرجہا بہتر ہے۔ ان خیالات نے میرے دل پر یہ اثر کیا ہے کہ دو رخ
شکم بھر لینے کو کچھ دال دلیا اور تن بدن ڈھانک لینے کو کچھ موٹا جھوٹا کپڑا اُس کے سوائے دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا ہونا میں
اپنے واسطے ضروری سمجھوں اُس کے حاصل کرنے کی فکر کروں پھر بھی خدا نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو ضرورت سے زیادہ اور حاجت
سے بڑھ کر بہت کچھ دے رکھا ہے۔ کچھ تھوڑا سا باقتضائے محبت اُس میں سے اور کچھ رقم مکتب سے لے کر میں نے دو سو روپیہ کا
ایک جوڑا تمھارے لیئے بنایا ہے۔ مکتب کی رقم تم جانتی ہو کہ میں اُس کی مالک نہیں ہوں لڑکیوں کی چیز ہے جن کاموں کے دام
سے یہ رقم فراہم کی جاتی ہے پس یہ جوڑا خلعتِ مکتبی ہے جو میں تم کو نہایت خوشی سے دیتی ہوں خدا تم کو اس کا پہننا مبارک کرے
تمھارے جہیز میں اِس سے کہیں زیادہ قیمت کے جوڑے ہوں گے مگر جب دیکھو گی کہ کس چاؤ اور کس شوق اور کس محبت سے
ہم چند غریب آدمیوں نے مل کر یہ جوڑا بنایا ہے تو ہم سب کو اُمید ہے کہ تمھارے قیمتی اور عمدہ اور نفیس جہیز میں اس کا شامل کیا
جانا کچھ بدنما نہ ہوگا۔ یہ سُن کر حسن آرا نے پھر اُسی حالت سے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُستانی جی۔ لو حُسن آرا بیگم! اب دن زیادہ چڑھ
گیا ہے اور لوگوں کے کھانے پکانے کا وقت ہے میں نہیں چاہتی کہ زیادہ دیر تک تم سب کو باتوں میں لگائے رکھوں مگر صرف ایک
بات اَور کہہ لینے دو کہ اگر اُس کو نہ کہوں گی تو گویا تمھارا فرضِ رخصت میرے ذمے رہ جائے گا۔ لڑکیاں جو بیاہ ہوئے پیچھے
ماں باپ۔ بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب سے جدا ہو کر سسرال جاتی ہیں۔ اِس انقلاب حالت میں خدا تعالیٰ ہم عورتوں کو اپنے
فضل سے اس انقلاب کا نمونہ دکھاتا ہے جو ہر بشر کے واسطے مقدر ہے دنیا ہمارا میکا ہے اور عاقبت بجائے سسرال کے ہے کوئی
لڑکی سدا میکے میں نہیں رہتی۔ دیر سویرا ایک نہ ایک دن اُس کو سسرال جانا ہوگا اسی طرح کوئی شخص ہمیشہ دنیا میں نہیں رہے گا
سدا رہے نام اللہ کا۔ جس لڑکی نے میکے میں رہ کر ہنر سیکھا عقل و تمیز حاصل کی سسرال میں بھی ساس سسرے کی لاڈو۔ نند
بھاوجوں کی چہیتی اور اپنے میاں کی پیاری ہوگی۔ اِسی طرح جس نے دنیا میں رہ کر اچھے عمل اور نیک کردار کیئے۔ عاقبت میں اُسی
کی عزت اور اُسی کی توقیر ہے اور ایسے ہی لوگ بہشت کے مالک ہوں گے۔ مگر جس لڑکی نے ماں باپ کی نازبرداریوں میں وقت
کو ضائع کیا اور اپنے مزاج کی اصلاح اور عادات کی درستی اور تحصیل ہنر کا کچھ فکر نہ کیا سسرال میں جائے گی تو میاں کی نظروں میں
ذلیل ساس نندوں کے نزدیک بے وقر۔ بعینہ وہی حال ہوگا اُن کا جو زندگی کے دن غفلت اور بے پروائی میں اکارت کرتے
ہیں قیامت میں رسوا اور ذلیل ہوں گے۔ جس طرح لڑکیاں میکے سے جہیز لے کر جاتی ہیں دنیا کے میکے کا جہیز اپنے اپنے عمل
ہیں جو آدمی کے ساتھ جاتے ہیں۔ حسن آرا بیگم! میں جانتی ہوں کہ ان دنوں تمھارے دل میں عجب عجب طرح کے خیالات گزرتے
ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ مگر اپنے خیالات کو ذرا اونچا کرو اور اپنی نظر کو تھوڑا اور آگے بڑھاؤ۔ سوچنے اور سمجھنے کی بات
ہے تو یہ ہے کہ دنیا کیا چیز ہے کس لیئے ہم یہاں آئے ہیں کیا ہم کر رہے ہیں اور انجام کار کیا ہونا ہے۔ جس طرح تمھارے میکے رہنے
کے دن پورے ہو چکے ہر شخص کے واسطے ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اُس کی مدتِ حیات تمام ہو جائے گی۔ اور سب مل کر اس وقت
خدا کی درگاہ میں دعا کریں کہ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق دے (ہر طرف سے آمین آمین کا شور ہوا) دنیا کے میکے اور سسرال میں
تو چند روزہ ہیں الٰہی اس جہان میں سدا سدا کو رہنا ہے پردہ رکھ لیجیو اور فضیحت مت کیجیو (سب نے پکار کر کہا آمین آمین) الٰہی

یہ تیری کنیز جس کو ہم حسن آرا بیگم کہہ کر پکارتے ہیں منزلِ دنیا جس کو ہم سب تیرے حکم سے طے کر رہے ہیں شروع کرنے والی ہے تیرا فضل و کرم اس کا حافظ۔ تیری توفیق اس کا بدرقہ۔ تیری عنایت و مہربانی اس کی زادِ راہ ہو (سب کو رقت ہوئی اور سب نے کہا آمین) اس کے بعد استانی جی نے اُٹھ کر دیر تک حسن آرا کو گلے لگا کر پیار کیا اور آہستہ آہستہ کوئی دعا پڑھ کر حسن آرا پر دم کی اور دروازے تک ساتھ لے جا کر پالکی میں سوار کرا دیا اور مجلس تمام ہوئی۔"

بنات النعش پر ڈائرکٹر صاحب کا ریمارک

ڈائرکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس کتاب پر ریویو کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجنسہ درج کر دیا جائے "اِس کتاب کو مرآۃ العروس کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس طور سے کہ اُس میں اُس خاندانی لڑکی کی تعلیم کا بیان ہے کہ جس کا نام حسن آرا تھا۔ اور جس کا ذکر کتاب مذکور میں کیا گیا ہے۔ اُس کی تصویر ایک لاڈلی بگاڑی ہوئی لڑکی کی ہے۔ حسن آرا کی خالہ کے صلاح و مشورے سے اصغری (جس کا ذکر مرآۃ العروس میں ہے) کی زیرِ نگرانی حسن آرا نے کتابیں پڑھنا اور تحصیلِ علم شروع کیا جس سے اُس کی حالت سنبھل گئی۔ اصغری کی نند محمودہ نے حسن آرا کی اصلاح میں ایک بھاری حصہ لیا ہے۔ جو سبق اور لکچر شاگردوں کو دیئے گئے ہیں اور اُس کے متعلق اُن کی آپس میں گفتگو ہوئی ہے اس کتاب کا مواد ہے۔ یہ کتاب فی الحقیقت "سینڈ فورڈ اور مرٹن" کے تعلیمی قصوں اور سائنس کے آسان مسائل کے طرز پر ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جو لڑکیوں کے حالات کے مناسب ہوں۔ قصے کے طور پر ایک مختصر بیان قابلِ توجہ ہے جو ایک قابلِ قدر قصہ ہے اور وہ ایک دل چسپ تمثیل سنہ ۱۸۵۷ء کے تشویش ناک واقعات کی ہے۔ کام کاج کی عادتیں اور روزانہ ریاضت کے فائدوں کے بیان محمودہ نے اپنا ذاتی تجربہ ایامِ غدر کا بیان کیا ہے جب کہ دفعتًہ اس کو اپنا مکان دہلی سے چھوڑنا پڑا۔ ایسی حالت میں کہ نقلِ مکان اور سواری کا کچھ انتظام نہ تھا۔ سائنس کے متعلق مضامین عمدگی سے اور فطری طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سبق صرف انگریزی سے ترجمہ نہیں کیے گئے ہیں اور اغلب ہے کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو دل چسپ اور بکار آمد ہوں گے۔ یہ ایک عام پسند مقدمے۔ جغرافیۂ طبعی۔ مقناطیس۔ علمِ ہیئات اور انتظام خانہ داری کے ہیں۔ جو بیانات اِن مضامین پر لکھے گئے ہیں اُن سے میرا خیال آرچ لبنب و سٹلے کی کتاب کے آسان مباحث کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ جن سے ہمارے مدارس و سکول المعاش کے نام سے واقف ہیں۔ مجھے اپنے جانشین کے خیال سے اتفاق ہے کہ زبان صاف اور ستھری ہے۔ اور طرزِ بیان ٹھیک وہی ہے جو ایک ایسی کتاب میں ہونا چاہیئے جو لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے لکھی گئی ہو۔ اور ان اعتبارات سے غالبًا مرآۃ العروس سے کم تر نہیں ہے۔ میں اُس سے زیادہ کہنا چاہتا ہوں اور میری رائے یہ ہے کہ مصنف اپنے نقشِ اولیں پر سبقت لے گیا ہے۔ مصنف نے پھر ایک نمونہ ایسا پیش کیا ہے کہ اُردو تحریر ایک فہمیدہ عالم کے قلم سے بلا نزعیب مبالغہ اور نمایش کے لکھنا ممکن ہے۔ بلکہ یہ نقشِ ثانی نقشِ اولیں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ اِس لیئے کہ اِس میں زیادہ تر مضامین معلوماتِ عامّہ اور علمی مذاق کے ہیں۔ بہ نقص اس کتاب کا جیسا کہ تقریظ سابقہ میں ٹھیک طور پر لکھا گیا ہے یہ ہے کہ اوقاف اور فقرے علی حدہ علی حدہ نہیں ہیں۔ اور اگر بلحاظِ فہرستِ مضامین اِس قسم کی تقسیمِ ابواب پر کر دی جائے[۱] تو اس میں شک نہیں ہے کہ اس کتاب میں ایک بڑی خوبی ہو جائے۔"

[۱] حسبِ ہدایت ڈائرکٹر صاحب بہادر بنات النعش میں ترمیم و اصلاح کر دی گئی۔ اس کتاب پر پہلے کرنفیتھ صاحب بہادر قائم مقام ڈائرکٹر نے ریویو کیا تھا اور گورنمنٹ میں تین سو روپیہ انعام کی سفارش کی تھی مگر ڈائرکٹر مستقبل مسٹر کمپسن نے واپس آ کر دوبارہ ریویو کیا اور پانسو انعام کی سفارش کی اور یہی انعام ملا ۱۲۔

حسب اشتہار گورنمنٹ پانسو روپیہ انعام دیا جاسکتا ہے اور بعد اس کے کہ مصنف اس کتاب کی تصحیح کرلے اور جو اسقام اوپر بتلائے گئے ہیں اُس کو رفع کرلے تو یہ کتاب سررشتۂ تعلیمات اور عام لوگوں کے لیے طبع کی جائے۔ ۵؍ فروری ۱۸۷۲ء

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا ریمارک

آپ نے اِس کتاب کی وقعت کا جو اندازہ فرمایا ہے اُس سے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر متفق ہیں۔ جناب ممدوح مصنف کے لیے پانسو روپیہ کے انعام کی منظوری بہ خوشی عطا فرماتے ہیں اور تعلیم کی یہ ایک بہت بکار آمد اور عام پسند کتاب ہے۔ اور حسب رائے خود سررشتۂ تعلیم اور عام استعمال کے لیے چھپوائی جائے۔ باب وار تقسیم اور مناسب سُرخیاں اول درج کرادی جائیں۔ مورخہ ۲۸ فروری ۱۸۷۲ء

توبۃ النصوح یہ کتاب اعظم گڑھ کی تصنیف ہے۔ اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف اور ترجمے کے اعتبار سے اچھا کام کا زمانہ تھا۔ مولانا نے وہاں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو اُن کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبول ناول ہے۔ دوسرے کولمنر ہیونز کا ترجمہ کیا جس کا تذکرہ حصۂ دوم میں گزر چکا ہے۔ اِس کتاب میں کیا ہے۔ اس کو مولانا سے بہتر کوئی نہیں بیان کرسکتا ع تصنیف را مصنّف نیکو کند بیاں" مولانا فرماتے ہیں: "اِس کتاب میں انسان کے اُس فرض کا تذکرہ ہے جو تربیتِ اولاد کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کتاب کے تصنیف کرنے سے مقصودِ اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً عام لوگوں سے واقع ہو رہی ہے اُس کی اصلاح ہو اور اُن کے ذہن نشین کردیا جائے کہ تربیتِ اولاد صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کردیا۔ روٹی کما کھانے کا کوئی ہنر اُن کو سکھا دیا۔ اُن کا بیاہ برات کردیا۔ بلکہ اُن کے اخلاق کی تہذیب اُن کے مزاج کی اصلاح اُن کی عادات کی درستی۔ اُن کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے۔ افسوس ہے کہ کتنے لوگ اِس فرض سے غافل ہیں۔ کوئی شخص تربیتِ اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کرسکتا تا وقتیکہ وہ خود بھی اپنی شایستگی کا نمونہ اُن کو نہیں دکھاتا اور اولاد کے ساتھ اپنا برتاؤ محتسبانہ طور کا نہیں رکھتا۔ پرلے سرے کی بے وقوفی ہے اولاد کو اپنے کردار ناسزا کی بُری مثالیں دکھاتا اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ یہ لوگ بڑے ہوکر زبانی پند یا کتابی نصیحت پر کاربند ہوکر صالح اور نیک وضع ہوں گے سب لوگ اولاد کے ساتھ غایت درجے کی شیفتگی پیدا کرلیتے ہیں اور بمصداق حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ اُن کو اولاد کے عیوب پر آگہی نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو عیب کو عیب سمجھ کر نہیں مقتضائے عمر یا نتیجۂ ذہانت یا دوسرے طور پر اُس کی تاویل کرکے اُن کی خرابیوں سے درگزرا و چشم پوشی کیا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہ ہو۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرادے گی کہ تربیتِ اولاد ایک فرضِ موقت ہے یعنی لڑکے جب تک کم سن او صغیر ہیں تربیت پذیر ہیں اور بڑے ہوئے پیچھے اُن کی اصلاح مشکل یا متعذر بلکہ محال ہوجاتی ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ بلا تخصیص مذہب تلقینِ حسن معاشرت اور تعلیم نیک کرداری و اخلاق کی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے۔ لیکن نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ اور منفک کرنے کا قصد کرے۔ ادھر تو انضمام مذہب ایک امر ناگزیر ہے اور اُدھر اختلاف مذہب جو اس ملک میں اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ گویا ہر کوٹھی آدمی ایک جدا مذہب رکھتے ہیں۔ آنکھیں دکھا رہا ہے۔ لوگوں ہی میں اِن بلا کا تعصب آگیا ہے کہ کیسی ہی اچھی بات کیوں نہ کہی جائے دوسرے مذہب والے اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ [1] مضمون جس کو میں نے ایک فرضی قصے اور بات چیت کے طرز پر لکھا ہے مذہبی پیرائے سے تو خالی نہیں ۔اور خالی ہونا ممکن نہ تھا لیکن تمام کتاب میں کوئی بات ایسی بھی نہیں جو دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی یا نفرت کا موجب ہو بلکہ جہاں جہاں ضرورۃً مذہبی تذکرہ آ گیا ہے وہ ایسے طور کا ہے کہ دوسرے مذہب والے بھی اسی طرح کے عقیدے رکھتے ہیں صرف اصطلاح و عبارت کا تفرقہ ہے۔ لَا مُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ [2] مثلاً مسلمانوں کی نماز وہی ہندوؤں کی پوجا پاٹ ہے۔ مسلمانوں کا روزہ ہندوؤں کا برت ۔ مسلمانوں کی زکوٰۃ ہندوؤں کا دان پن وقس علیٰ ہذا ۔پس قصہ اگرچہ ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر بتغیر الفاظ ہندو خاندان بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ خاندان جو فرض کیا گیا ہے اس میں دو میاں بی بی ہیں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو بڑی عمر کے ہیں اور بیاہے جا چکے ہیں اور لاجرم ان کی عادتیں راسخ ۔ ان کی خصلتیں کالطبیعۃ ہیں۔ منجھلا بیٹا اگرچہ عمر اس کی بھی کم نہیں لیکن اس نے مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور وہ صرف توجہ کا محتاج ہے جیسے گھوڑا کہ بے راہ چلا جا رہا ہے اس میں رفتار پیدا کرنے کی ضرورت نہیں باگ کا موڑ دینا کافی ہے منجھلی لڑکی کم سن ہے وہ عمر کے اس درجے میں ہے جب کہ بچوں کی قوت تفتیش و تلاش تیز اور نقل کرنے کی امنگ بسرعت ترقی ہوتی ہے۔ وہ بھولے پن سے اس طرح کے سوالات کرتی اور سادہ دلی سے ایسی ایسی باتیں پوچھتی ہے کہ ماں قائل ہو ہو جاتی ہے۔ جس طرح پر اس خاندان کے لوگ زندگی کرتے ہوئے فرض کیے گئے ہیں وہ ایک سچا بلا تصنع نمونہ ہے اس زمانے کے ہر ایک خاندان مدعی شرافت کے طرز ماندو بود کا ۔ایسا فرض کیا گیا ہے کہ رئیس البیت یعنی خاندان کا سرگروہ جس کا نام نصوح ہے ایک وبائی ہیضے میں مبتلا ہوا اور اس کی حالت ردی اس قدر ہو گئی کہ اس کو اپنے مرنے کا تیقن کرنا پڑا اور چوں کہ اسی وبا میں چند روز پہلے اسی گھر کے تین آدمی مر چکے تھے اور شہر میں موت کی گرم بازاری تھی تو ایسی حالت میں نصوح کا اپنی نسبت موت کا تیقن ایک معمولی بلکہ ضروری بات ہے۔ نصوح کو ڈاکٹر نے جو اس کا معالج تھا خواب آور دوا دی تھی وہ سو گیا اور اس کے اگلے پچھلے خیالات ایک خواب بن کر اس کے سامنے آموجود ہوئے۔ خواب جو نصوح نے دیکھا تمام قصے کی جان ہے۔ حشر اور اعمال نامہ اور حساب قبر کی تکلیف اور دوزخ کا عذاب یعنی قیامت کے حالات جن کا وہ اپنے مذہب اسلام کے مطابق معتقد تھا خواب میں اس کو واقعات نفس الامری دکھائی دیے جاگا تو خائف و ہراساں بیدار ہوا تو ترساں و لرزاں ۔ خوف کا نتیجہ اور ہراس کا اثر جو نصوح پر مترتب ہوا قصے کے پڑھنے سے ظاہر ہوگا۔ اس نے نہ صرف اپنے نفس کی اصلاح کی بلکہ سارے خاندان کی اصلاح کو اپنے ذمے فرض و واجب سمجھا۔ چوں کہ خاندان کے چھوٹے بڑے سب اس طرز جدید سے ناآشنا تھے کنفس واحدۃ نصوح کے مقابلے پر کمر بستہ ہو گئے اور اس کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں لیکن چوں کہ نصوح کے ارادے میں استحکام اور اس کے دل کو خدا کا بھروسا تھا وہ غالب آیا مگر مشکل سے اس کو ظفر ہوا مگر دشواری سے ۔کیوں کہ اولاد میں جو جتنا عمر رسیدہ تھا اسی قدر عسیر الانقیاد تھا۔ تربیت اولاد جس کا یہ کتاب لکھی گئی ہے ایک شعبہ ہے اس عام انسانی ہمدردی اور نفع رسانی کا جو ہر فرد بشر پر اس کی استطاعت کے قدر واجب ہے۔ ''

اگرچہ خلاصہ کتاب اس ریویو میں آ گیا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نصوح کا خواب بھی درج کر دیا جائے۔ مگر قبل اس اقتباس کے توبۃ النصوح کے متعلق ہم دو واقعات لکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کے حرفوں میں ایک ایسی بیش

---

[1] کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں ۱۲ [2] اصطلاح مقرر کر لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے اس میں کسی کو کیوں عذر ہونے لگا ۱۲-

قیمت چیز پوشیدہ ہے جس کو ہم ہماری کتاب کی جان کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ کچھ نہیں ہے سوائے اثر کے۔ اثر کی دو نقلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) صوبۂ بہار میں میرے ایک دوست تھے وہ ناقل تھے کہ وہاں کے کسی گورنمنٹ اسکول کے پانچویں کلاس میں ایک طالب علم پڑھتا تھا۔ توبۃ النصوح اُس زمانے میں بنگال و بہار کے انگلش اسکولوں کے کورس میں داخل تھی۔ معلوم نہیں اب ہے کہ نہیں۔ غرض اُس اسکول میں سالانہ تقسیم انعام کا جلسہ ہونے والا تھا جس وقت افسر اسکول کی آمد کی خبر معلوم ہوئی تو ہیڈ ماسٹر نے جو نہایت ہی علم دوست تھا عمائدینِ شہر کو بھی اس جلسے میں مدعو کیا۔ غرض جلسہ منعقد ہوا۔ اسکول کے ہر ایک کلاس سے ایک ایک طالب علم قبل ہی سے اس لیے منتخب کر لیا گیا تھا کہ کورس کی کسی کتاب کا ایک ایک حصہ حاضرین کو سنائے۔ چناں چہ اس طالب علم سے کہا گیا کہ تم توبۃ النصوح پڑھنا۔ اُس نے کہا کہ بہتر۔ حکم کی تعمیل کروں گا۔ مگر آپ مجھے اس کتاب میں سے کوئی حصّہ منتخب کر دیجیے۔ ہیڈ ماسٹر نے فرمایا کہ تم اپنے کلاس ماسٹر سے اس بارے میں مدد لو۔ وہ تمھیں کوئی حصہ منتخب کر دیں گے۔ چناں چہ طالبِ علم مذکور کلاس ماسٹر کے پاس حاضر ہوا اور ہیڈ ماسٹر کا حکم سُنا دیا۔ کلاس ماسٹر نے کہا کہ بھئی تو کل کتاب کو ماسٹر پیس سمجھتا ہوں وہ ہمہ صفت موصوف ہے۔ انتخاب کا کوئی انتخاب کیا کرے۔ جس جگہ سے چاہنا پڑھ دینا۔ اور کہہ دینا کہ کلاس ماسٹر نے یہی ہیں منتخب کیا ہے۔ بہرحال وقتِ مقررہ پر جلسہ منعقد ہوا اور جب اس طالبِ علم کی نوبت آئی تو حاضرینِ جلسہ کے سامنے بُلایا گیا۔ ناظرین کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ افسرِ اسکول کو اُردو زبان سے بے حد شوق تھا۔

افسرِ اسکول (طالبِ علم سے) یہ کون سی کتاب ہے؟

طالب علم:۔ توبۃ النصوح۔

افسرِ اسکول:۔ میں نہایت شوق سے اس کتاب کو سنوں گا۔ اُردو میں یہ ایک لاجواب کتاب ہے۔ اچھا پڑھو۔

چناں چہ طالب علم مذکور نے آغازِ کتاب ہی سے اس طرح پڑھنا شروع کیا۔ "اب سے دور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا[1] کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سنّاٹا اور ویرانی۔ جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدھی آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اُجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف۔ سودے والوں کی پکار بند ملنا جلنا۔ اختلاط و ملاقات۔ آمد و شد۔ بیمار پرسی و عیادت۔ بازدید و زیارت۔ مہمان نوازی و ضیافت۔ کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا مصیبت میں گرفتار۔ زندگی سے مایوس۔ کہنے کو زندہ پر مُردے سے بدتر۔ نہ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں طاقت۔ یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہا۔ یا کسی بیمار کی تیمار داری کی۔ یا کسی عزیز آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگِ مفاجات حقیقت میں ان ہی دنوں کی موت تھی۔ نہ سان نہ گمان اچھے خاصے چلتے پھرتے یکا یک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کلّی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے الا ماشاء اللہ کوئی جزوی بچ گیا تو بچ گیا۔ ورنہ جی کا متلانا اور قضا کے مہرم کا آ جانا۔ پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی۔ ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری دوا دعا جان کنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا۔ غرض

[1] دلی میں قاضی کے حوض کے پاس اب بھی حکیم بقا کا کوچہ موجود ہے اس میں حکیم بقاء اللہ خاں کے پوتے پڑپوتے رہتے اور مطلب کرتے ہیں ۱۲۔

کچھ اس طرح کی عالم گیر وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا پڑا تھا۔ دلّی میں دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں شہر کچھ اُدھیا سا گیا۔ صد ہا عورتیں بیوہ ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم بن گئے جس سے پوچھو شکایت جس سے شکوہ فریاد۔ مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاکی تھا اور وہ اکیلا شکر گزار دنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مدّاح۔ نہ اس سبب سے کہ اس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا خود اس کے گھر میں بھی اکٹھے تین آدمی اسی وبا میں تلف ہوئے۔ اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اٹھے نصوح نماز صبح کی نیت باندھ چکا تھا باپ بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ مسواک کرتے کرتے ابکائی آئی۔ ابھی نصوح دوگانہ فرض ادا نہیں کر چکا تھا۔ سلام پھیر کر دیکھتا ہے کہ باپ نے قضا کی۔ اُن کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالہ تھیں اُن کو جاں بحق پایا۔ تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئیں۔ مگر نصوح کی شکر گزاری کا کچھ اور ہی سبب تھا۔ اس کا مقدمہ یہ تھا کہ ان دنوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ راستی پر آ گئی تھیں۔ دلوں میں رقّت و انکسار کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت سے پیدا ہونی دشوار ہے۔ عیش و عشرت کو ایسا کاری تازیانہ لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے میں سرگرم تھا۔ جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آ موجود ہوتے تھے۔ جنھوں نے بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا اُن کے اشراق و تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتے تھے۔

دنیا کی بے ثباتی تعلقات زندگی کی ناپائداری سب کے دل پر نقش تھی۔ لوگوں کے سینے صلح کاری کے نور سے معمور تھے۔ غرض ان دنوں کی زندگی اس پاکیزہ اور مقدس اور بے لوث زندگی کا نمونہ تھی جو مذہب تعلیم کرتا ہے۔ نصوح یوں بھی دل کا کچا تھا جب اس نے اوّل اوّل ہیضے کی گرم بازاری سنی سرد ہو گیا اور رنگت زرد پڑ گئی۔ با اسباب ظاہر جو تدبیریں انسداد کی تھیں سب کیں۔ مکان میں نئی قلعی پھروا دی۔ پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی۔ گھر کے کونوں میں لوبان کی دھونی دے دی۔ طاقوں میں کافور رکھوا دیا۔ جا بجا کوئلہ ڈلوا دیا۔ باورچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں نمک ذرا تیز رکھا کرے۔ پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے۔ گلاب۔ نارجیل دریائی۔ جدوار۔ تمر ہندی۔ سکنجبین وغیرہ جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کراتے ہیں تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں تاکہ خدا نخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈنی نہ پڑے۔ نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیاں بھی فراہم کیں۔ کالرا کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لے لیں۔ کالرا مکسچر الٰہ آباد میڈیکل ہال سے روپیہ بھیج کر منگوا رکھا۔ آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلوروڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں۔ ایک اخبار میں لکھا دیکھا کہ بنارس میں ایک بنگالی اس بیماری کا حکمی علاج کرتا ہے اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موعود ہے اُس کا دعوی دار ہوا ہے چٹھی لکھ کر اس کی دوا بھی طلب کی۔ نصوح کو ایک وجہ تسلّی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق اسی کے ہمسائے میں رہتا تھا۔ گو روسیاہ ہیضے کے ٹوٹکے

سلہ عام۔ سارے جہان میں پھیلی ہوئی ۱۲ [illegible] آدھا سا رہ گیا ۱۲ [illegible] دو رکعت ۱۲ [illegible] مر گئے ۱۲ [illegible] ادا اور قضا ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے ادائی الٹی ہے ۱۲ [illegible] خدا کو جان سونپ دی ۱۲ [illegible] اس کا کہنا یہ تھا ۱۲ [illegible] نرم دلی ۱۲ [illegible] سماتی محنت جیسے روزے رکھنا ۱۲ [illegible] اثر کرنے والا کوڑا ۱۲ [illegible] آفتاب نکلے پیچھے کی نماز ۱۲ [illegible] آدھی رات کے بعد کی نماز ۱۲ [illegible] بے آمیزش۔ خالص ۱۲ [illegible] ہیضے کو عورتیں نتا (وال کہتی ہیں) یعنی بے نام کی بیماری ۱۲ [illegible] ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے گرم اور سرد [illegible] شادی ۱۲ [illegible] روک ۱۲ [illegible] ناریل ۱۲ [illegible] املی ۱۲ [illegible] ہوشیار۔ تجربہ کار ۱۲

واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا پر نہ بچا۔ باپ کی اجل آئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پونہچی کہ بڑے میاں ہچکیاں[۹۱] لینے لگے۔ وہ رشتے کی خالہ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر[۹۲] تھیں کہ انھوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی غرض دوا اُن کو بھی نصیب ہوئی۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ٹکوسیں مگر اُس کی عمر ہو چکی تھی۔ اوّل اوّل نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ[۹۳] ہوا تھا مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور خود اُسی کے گھر میں تابڑتوڑ[۹۴] ایک چھوڑ تین تین موتیں ہو گئیں ناچار تن بہ تقدیر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا۔ غرض پورا ایک چلّہ[۹۵] شہر پر سختی و مصیبت کا گزرا نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے یہاں تک کہ نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ جنازہ جامع مسجد[۹۶] کے صحن میں رکھا ہے۔ یوں تو ہزارہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃ الملک کی موت سب پر بھاری تھی اوّل تو اُن کی ٹکر کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا دوسرے اُن کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پونہچتا تھا گو اُن کے مرنے کا گھر گھر ماتم تھا لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک[۹۸] ڈالی کیوں کہ معتقداتِ[۹۹] عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کی بھینٹ لیے نہیں جاتی۔ غیر لوگوں نے کچھ سمجھا ہو یوں بھی شورش بہت کچھ فرو ہو چلی[۱۰۰] تھی اور امن و امان ہوتا جاتا تھا لوگوں نے دکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا اُن ہی دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے اب خدا نے اپنا فضل کیا آج زردہ پکواؤ مگر تاکید کرنا کہ چاول کھڑے نہ رہیں شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسبِ عادۃ سو رہے۔ کوئی پہر رات باقی رہی ہو گی کہ دفعۃً نصوح کی آنکھ کھل گئی۔ جاگا تو پیٹ میں آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ اُٹھتے اُٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی اس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا خوب کس کر دونوں بازو باندھے گلے میں توے کی سیاہی تھوپی عطر کا پھویا ناک میں رکھا اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے تھپیڑا ضبط کیا بہتیرا ٹالا آخر بڑے زور سے استفراغ[۱۰۲] ہوا گھر والے سب جاگ اُٹھے نصوح کو اس حالت میں باہر بیٹھا ہوا دیکھ سب کے کلیجے دھک[۱۰۳] سے رہ گئے۔ کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا۔ کوئی الائچی ڈال پان بنا کر پاس آ کھڑا ہوا۔ کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ نصوح کو لا کر چارپائی پر لٹایا اور اب سب لوگ لگے اپنی اپنی تجویزیں کرنے۔ کسی نے کہا خیر یہ ہی غذا تھی۔ کوئی بولا زردے میں گھی بُرا تھا۔ کوئی کہنے لگا گھر چن کا فساد ہے۔ غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے گلاب و سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا۔ نصوح اگرچہ تکان کی وجہ سے مُضمحل[۱۰۴] ہو گیا تھا مگر ہوش و حواس سب خدا کے فضل سے بجا تھے سب کی صلاحیں اور تجویزیں سُنتا تھا اور دوا جو

---

۹۱ ہچکیاں ۱۲ ۹۲ لفظی معنی پیٹ بھری۔ مراد یہ ہے کہ زندگی سے اُکتا گئی تھیں ۱۲ ۹۳ بھروسا ۱۲ ۹۴ اوپر تلے ۱۲ ۹۵ چالیس دن ۱۲ ۹۶ دلی کی بڑی مسجد جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے ۱۲ ۹۷ لوگ اُن مُردوں کے جنازے جامع مسجد میں لے آتے ہیں تاکہ بہت سے نمازی جنازے کی نماز پڑھیں ۱۲ ۹۸ برابر کا۔ مقابلے کا ۱۲ ۹۹ یعنی بیماری کا زور دب گیا ۱۲ ۱۰۰ عام لوگوں کے عقائد ۱۲ ۱۰۱ قربانی ۱۲ ۱۰۲ دب چلی تھی ۱۲ ۱۰۳ قے ۱۲ ۱۰۴ جیسے دفعۃً ڈر سے دل دھک دھک کرنے لگے ۱۲ ۱۰۵ نڈھال ۱۲

لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا۔ لیکن استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اُس نے کہہ دیا تھا کہ لو صاحب خدا حافظ ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔ استفراغ امتلائی مجھ کو بارہا ہوتے ہیں مگر کچھ میرا جی اندر سے بیٹھا جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں میں سنسنی سی چلی آتی ہے اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی اُدھیڑ بُن میں لگ گیا اور سمجھا کہ بس دنیا سے چلا صبح ہوتے ہوتے رداءۃ کے کل آثار پیدا ہو گئے۔ برودِ اطراف۔ تشنج۔ ضعف۔ متلی۔ اسہال۔ تشنگی ہر ایک کیفیت اشتداد پر تھی۔ منہ اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑا گیا۔ حکیم جی خود خفقانی المزاج ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے مگر ہمسائگی مدۃ کی راہ و رسم طوعاً و کرہاً آئے اور کھڑے کھڑے جھٹ اسا اُتار کر چلے گئے بیمار میں تو بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی ایک پہر ہی بھر کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا۔ عورتوں نے پردے میں سے جہاں تک اس گھبراہٹ میں زبان نے یاری دی کہا لیکن حکیم صاحب یہی کہتے چلے گئے کہ برف کے پانی میں نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ۔ تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواروی کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی فوراً آدمی کو شفاخانے دوڑایا اور ڈاکٹر دوا لے صدا کی طرح آموجود ہوا اُوپر تلے چار پڑیاں تو اُس نے اپنے سامنے پلائیں۔ چلتے ہوئے ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلا کر مریض کو علیحدہ مکان میں اکیلا لٹا دینا کوئی آدمی اُس کے پاس نہ رہے تاکہ اُس کو نیند آجائے۔ اگر سو گیا تو جاننا کہ بچ گیا۔ فوراً ہم کو خبر دینا۔ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سُلا کر لوگ اِدھر اُدھر ٹل گئے مگر دبے پاؤں آکر دیکھ دیکھ جاتے تھے۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرت انگیز تھی۔ یہ کچھ تو بیماری کا اشتداد ہوا مگر ہوش و حواس سب بدستور تھے وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا لوگ جانتے تھے کہ غش میں پڑا ہے۔ ابتدا میں تو نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرنے سے گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھے بلکہ جو لوگ اس کی علالت کو سوءِ ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے دل میں اُن کی رائے کی تحسین کرتا تھا۔ لیکن افسوس یہ مسرۃ نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی دم بدم اُس کی حالت ایسی ردی ہوتی جاتی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف تھے۔ آخر چار و ناچار اُس کو سمجھنا پڑا کہ اب میں دنیا میں چند ساعت کا مہمان اور ہوں اوائلِ مرگ کے ساتھ پہلا قلق اُس کو دنیا کی مفارقت کا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہے جس کا انقطاع نہیں۔ وہ جدائی ہے جس کے بعد وصال نہیں۔ وہ گم شدگی ہے جس کی کبھی بازیافت نہیں وہ غشی ہے جس سے افاقہ نہیں وہ بیگانگی ہے جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر رو دیتا اور کبھی ساز و سامانِ دنیا پر نظر کر کے سر کو دھنتا اور کہتا ع

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اُس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا

ف۱ بہت کھا جانے کی وجہ سے جو قے ہو ۱۲ ف۲ بگاڑ ۱۲ ف۳ ہاتھ پاؤں کا ٹھنڈا پڑ جانا ۱۲ ف۴ اینٹھن ۱۲ ف۵ دست ۱۲ ف۶ سنسنی ۱۲ ف۷ ترقی ۱۲ ف۸ چار و ناچار ۱۲ ف۹ اُلاہنا ۱۲ ف۱۰ یوں ہی بے سوچے سمجھے کی ۱۲ ف۱۱ جلد چلاؤ کی ۱۲ ف۱۲ گونج کی آواز جو لوٹ کر آتی ہے ۱۲ ف۱۳ آہستہ کہ پاؤں کی آہٹ نہ ہو ۱۲ ف۱۴ یعنی اُس کے سننے سے ڈر لگتا ہے ۱۲ ف۱۵ بھاگتا تھا۔ بچتا تھا ۱۲ ف۱۶ کہتا تھا کہ انھوں نے ٹھیک سمجھا ۱۲ ف۱۷ بدہضمی ۱۲ ف۱۸ خوشی ۱۲ ف۱۹ موت کا یقین ۱۲ ف۲۰ رنج ۱۲ ف۲۱ جدائی ۱۲ ف۲۲ ہو چکنا ۱۲ ف۲۳ ملنا ۱۲ ف۲۴ کھو کر پا جانا ۱۲ ف۲۵ افسوس پلک جھپکانے میں یار کی صحبت ختم ہو گئی ہم پھول کے منہ کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہیں پائے کہ بہار کا موسم ہو چکا ۱۲

کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی ہے۔ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو، نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل کہ گھر کو سنبھال لے۔ اندوختہ جو ہے سو وہ بھی واجبی ہے، کب تک اکتفا کرے گا، دو ناکدخدا بیٹیاں اس کے آگے ہیں، کچا ساتھ خالی ہاتھ بچوں کی پرورش کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں، کیا ہوگا اور کیونکر یہ پہاڑ زندگی اس کے کاٹے کٹے گی۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جا چکا ہے۔ رہا منجھلا، اس سال انٹرنس پاس کرنے کو تھا اور امید تھی کہ یہ کچھ ہوگا، مگر اب وہ تمام منصوبے بھی غلط ہوا چاہتا ہے۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان۔ یہ دو لڑکیوں کا فرض کیسا، میں اپنی گردن پر سے چلا بڑی لڑکی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھہری تھی اور جب میرے رہتے یہ دقتیں تھیں تو اب ان دو بچیوں کا دیکھیے کیا ہو۔ پیش بینی اور مآل اندیشی کر کے پارسال گاؤں لیا تھا، ابھی تک پٹی داروں سے آپس میں اچھی طرح تسلط نہیں بیٹھنے پایا حال میں جو چالیس پچاس بیگھے سیر کر کے نیل بو لیا تھا وہ سب گیا گزرا ہوا۔ گودام پر جو روپیہ لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا۔ رہنے کے مکان میں کس تنگی سے بسر ہوتی ہے، کوئی مہمان آ نکلتا ہے تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ سال رواں میں والان بنوانے کا ارادہ تھا۔ ڈیوڑھ دون لکڑی کا روپیہ بھیج چکا ہوں، وہ نہیں آئی۔ پزاوے والوں کو اینٹوں کی دادنی دی تھی وہ نہیں پٹی۔ افسوس کہ موت نے مجھ کو مہلت نہ دی، لوگوں کا لینا دینا حساب کتاب بڑے بڑے بکھیڑے ہیں، آج سمجھنے بیٹھوں تو مہینوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔ اجل سر پر آ پہنچی، تمام لینا لہنا ادھر کا ادھر پڑا رہے گا۔ کاش میں کچھ نہیں تو دو ہی بارہ برس ہی اور جی جاتا تو یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کر لیتا۔ بال بچے بھی کچھ اور سیانے ہو جاتے کھانے کمانے لگتے۔ ادھر ان کی شادی بیاہ کر چکتا، گاؤں کا معاملہ بھی برابر ہو جاتا، مکان کو اچھے طور پر بنا لیتا۔ لوگوں کا حساب کتاب سب صاف کر دیتا۔ گھر والی کے واسطے کچھ ذخیرہ وافی فراہم کر جاتا، تب فراغت سے مرتا۔ کیا سمجھے ہیں، مجھ کو کچھ عذر یا خدا نخواستہ کسی طرح کا انکار تھا یا ہے؟ اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دنیا میں آ کر مرنا ضرور ہی مگر ہر چیز ایک وقت مناسب پر ٹھیک ہوتی ہے۔ بھلا کوئی مرنا ہے کہ ہر ایک کام کو ادھورا، ہر ایک انتظام کو ناقص ناتمام چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ایسا بے ہنگام مرنا نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام متعلقین اور وابستگان کے لیے موجب زیاں و باعث نقصان ہے۔ اگرچہ نصوح بظاہر ایک آزاد اور بیگانہ وار زندگی بسر کرتا تھا، نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اس کی خوشی، نہ بال بچوں ہی سے کچھ بہت اختلاط کرنے کی عادت، انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے تقاضے اور اصرار سے بقدر ضرورت کچھ دخل دے دیا تو دیا، ورنہ اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی، اور یہی سبب تھا کہ جب کبھی شفیقہ کا اتفاق ہوتا کہ فلاں شخص نے بڑی حسرت کے ساتھ جان دی تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا

خبر پات کی ذمہ داری کرنیوالا ۱۲ جوڑا ہوا۔ پس انداز ۱۲ کفایت نہیں ۱۲ بیماری ۱۲ چھوٹے بچے کا ساتھ ۱۲ بڑی لمبی بیماری ۱۲ لیس نہیں رہا آوارہ ہو گیا ۱۲ فقیہانہ کے نتیجے میں داخل ہونے کا امتحان ۱۲ آمد کے واقعات کو پیچھے سے دیکھ لینا ۱۲ انجام کار کو سوچنا ۱۲ زمین داری کے حصے دار ۱۲ قبضہ ۱۲ زمین ارکی خود کاشت ۱۲ کوہ ہمالیہ میں ایک ضلع ہے وہاں لکڑی کا بڑا بیوپار ہے، جنگل ہے ۱۲ پیشگی رقم ۱۲ ادا نہیں ہوئی ۱۲ چکیں ۱۲ یعنی گاؤں کے معاملے کا بھی کوئی رستہ نکل آتا ۱۲ اندوختہ ۱۲ کافی ۱۲ جمع ۱۲ بے وقت ۱۲ جو آدمی کے پلے بندھے ہوں یعنی اہل و عیال نقصان کا سبب ۱۲ ان لوگوں کی سی زندگی جن کو گھر سے لگاؤ نہیں ۱۲ ضد ۱۲ افسوس ۱۲

کی شان ہے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دنیا سے نکلنے کو اُن کا جی ہی نہیں چاہتا نہیں معلوم دنیا کی کون سی ادا اُن کو پسند ہوتی ہے ورنہ استغفر اللہ[91] یہ دار المحن[92] انسان کے رہنے کے لائق ہے۔ صد ہا بکھیڑے۔ ہزار ہا مخمصے روز کے جھگڑے آئے دن کی مصیبت۔ سچ ہے خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل[93] حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں ظاہر میں تو موت سب کو بُری معلوم ہوتی ہے اور اس سے لوگ ایسا ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے لیکن غور کر کے دیکھو تو مرنا بھی ایک نعمت ہے۔ انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہے جہاں ایک حالت سالہا سال رہی گو وہ کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو خواہ مخواہ آدمی اُس سے ملول[94] ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی من[95] سلوی کھاتے کھاتے ایسے اُکتائے کہ آخر کو اُن کے دل لہسن اور پیاز پر للچائے۔ اگر دنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر جان دیتے اور حیاۃ دراز[96] کو عذاب مقیم[97] سمجھتے۔ میرے دل کی تو یہ کیفیت ہے کہ مجھ کو یہاں سے چلے جانے کی مطلق پروا نہیں اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اُس کی مفارقت[98] کا قلق[99] ہو۔ لیکن بڑا فرق ہے فرض[100] اور واقعات میں۔ یہی نصوح کے نفس کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو بے ہمہ[101] با ہمہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ دوسروں کو مرتا دیکھتا تھا اپنے تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا لیکن جب خود اپنے سر پر آن بنی تو سب سے زیادہ بودا نکلا وہ اپنے تعلقات سے واقع میں اب تک بے خبر تھا جب موت سامنے آموجود ہوئی اور جانا ٹھہر گیا[102] تو حقیقت کھلی کہ ادھر زن فرزند کا فریفتہ ہے[103] ادھر مال و متاع[104] کا دل دادہ۔ اتنا بڑا سفر تو اُس کو درپیش مگر بار علائق[105] کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اُس کے پاؤں ہزار ہزار من[106] کے ہو رہے تھے ریل کی سیٹی بج چکی تھی مگر یہ ابھی سٹیشن کے باہر اسباب کے سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اگر اسی حالت میں کہ اس کی روح تعلقات دنیوی میں ڈانوا ڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی کہیں خدا نخواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہان سے گیا گزرا ہوا تھا۔ خسر الدنیا و الآخرۃ[107] ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ۔ مگر خدا نے بڑا ہی فضل کیا کہ نا امیدی نے اس کی ہمت بندھائی اور اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب[108] سے حاصل۔ مرتا ہوں تو مردانہ وار کیوں نہ مروں اور استقلال کے ساتھ جان کیوں نہ دوں اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں پر ایک اُداسی سی چھا گئی اب جس چیز کو دیکھتا ہے ہیچ[109] اور بے وقعت نظر آتی ہے یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کو دوا پلا کر تنہا لٹوایا۔ استغنا سے ایک طرح کا اطمینان جو دل کو پہنچا اور ادھر علالت کی اشتداد کا تکان تھا ہی اُوپر سے پہنچی دوا جو بالخاصہ[110] خواب آور تھی اور تیمار داروں[111] کا ہجوم ہو الگ۔ لیٹنا تو نیند کی ایک جھپکی سی آ گئی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئی اُس کے پیش نظر تھے سب اُس کے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب

---

[91] خدا سے معافی چاہتا ہوں۔ نفرۃ کی جگہ بولتے ہیں ۱۲ [92] محنتوں کا گھر ۱۲ [93] کام ۱۲ [94] اُکتا جاتا ہے ۱۲ [95] مَن ایک طرح کی اوس جو جم کر ترنجبین سی ہو جاتی تھی اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا ایک جانور مَن و سلویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو بے زحمت ملتا تھا ۱۲ [96] لمبی زندگی ۱۲ [97] ٹھیرا ہوا عذاب جو ٹلے نہیں ۱۲ [98] جدائی ۱۲ [99] رنج ۱۲ [100] یعنی دل میں ایک بات کا ٹھان لینا اور چیز ہے اور کر کے دکھانا دوسری چیز ۱۲ [101] سب سے الگ اور سب میں شامل ۱۲ [102] رنجیدہ ہوا ۱۲ [103] سامان۔ اسباب ۱۲ [104] فریفتہ کا مرادف ہے ۱۲ [105] تعلقات کا بوجھ ۱۲ [106] پاؤں ہزار ہزار من کے ہوں تو کیا ہلا جائے ۱۲ [107] دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا ۱۲ [108] بے قراری ۱۲ [109] ذلیل ۱۲ [110] بے پروائی ۱۲ [111] یعنی ان دوا میں خدا نے خاصیت ہی یہی رکھی تھی ۱۲ [112] بیمار کے خبر گیر ۱۲

متخیلہ نے اُن کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈ مڈ کر کے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارۃ ہے اور چوں کہ نصوح خود کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اُس کو یہ تصور بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اِس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے مونہ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورۃ بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اِس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے کھرّے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہلِ معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہونچا کر کاربر آری کر سکے۔ اگرچہ انصاف و معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبۃ ادنی اعلی سب پر چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں کیا خفیف کیا سنگین کوئی اس کے رحم سے نا اُمید نہیں۔ اختیارات اُس کے اس قدر وسیع ہیں کہ نہ اُس کے فیصلے کی اپیل ہے نہ اُس کے حکم کا مرافعہ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہ ہو جائیں۔ پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواروی اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا جائے۔ نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے ہر عذر کو رفع ہر حجۃ کو قطع بلکہ خود مجرم کو قائل معقول کر کے اور گنہگار کے مُنہ سے اُس کی خطا تسلیم کرا لینے کے بعد۔ غرض جو تجویز ہے سوچی ہوئی جو فیصلہ ہے مدلل جو رائے ہے حتمی۔ دادرسائی جو حکم ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل ثقہ اور راست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال چشم دید بلکہ مجرم کے رفیق اور ہمنشین کہ اُس کے رازدار اور معین و مددگار رہے ہوں پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً فرد قرار دادِ جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور جتنے الزام اُس پر لگائے گئے ہیں سب کو سمجھتا اور اپنی برأت کے وجوہات کو سوچتا ہے۔ کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علحدہ جگہ میں نظربند ہے۔ جو جیسا مجرم ہے مناسبت حالۃ حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے مگر بہت ہی ہڑاھکا ناہے۔ محنت کڑی مشقۃ سخت۔ جو اُس میں گرفتار ہیں سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار ہیں نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ اِن لوگوں میں ہزار ہا آدمی تو اجنبی تھے لیکن جابجا شہر اور محلے کے آدمی ہی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے نصوح کو یہ سماں دیکھ کر اُسی خواب کی حالۃ میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے۔ کس کی کچہری ہے۔ یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں میرے ہم وطنوں نے

۹۱ خیال باندھنے کی قوۃ ۱۲ ۹۲ ملا جلا کر ۱۲ ۹۳ شکل صورۃ ۱۲ ۹۴ خاموشی ۱۲ ۹۵ سانس کو روکے ہوئے ۱۲ ۹۶ کھرّے یعنی مزاج کے روکھے ۱۲ ۹۷ مقدمے کا مچھ جانا ۱۲ ۹۸ ہر ایک بات کو جان لینا ۱۲ ۹۹ ہلکے ۱۲ ۱۰۰ بھاری ۱۲ ۱۰۱ ہٹا کر۔ اُٹھا کر ۱۲ ۱۰۲ دلیل ۱۲ ۱۰۳ توڑ کر۔ جواب دے کر ۱۲ ۱۰۴ وجہ کے ساتھ ۱۲ ۱۰۵ دلیل کے ساتھ ۱۲ ۱۰۶ یقینی ۱۲ ۱۰۷ یقینی ۱۲ ۱۰۸ نیکوکار ۱۲ ۱۰۹ بھلے مانس ۱۲ ۱۱۰ سچ بولنے والے ۱۲ ۱۱۱ حال سے واقف ۱۲ ۱۱۲ جنھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ۱۲ ۱۱۳ بھیدی ۱۲ ۱۱۴ ہر ایک کو الگ الگ ۱۲ ۱۱۵ فوجداری کی مثل کا ایک کاغذ ہوتا ہے جس میں مجرم کا قصور لکھا رہتا ہے ۱۲ ۱۱۶ صفائی ۱۲ ۱۱۷ استثنائی ۱۲ ۱۱۸ بئس المصیر کا ترجمہ ہے ۱۲ ۱۱۹ آرزومند ۱۲ ۱۲۰ خوفناک ۱۲ ۱۲۱ اوپری ۱۲ ۱۲۲ ان جان ۱۲ ؛

کیا جرم کیا ہی کہ ماخوذ ہیں اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں جواب دہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا
چلا جاتا تھا کہ دور سے اس کو اپنے والد بزرگوار حوالاتیوں میں بیٹھے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہی مگر غور کیا تو
پہچانا کہ نہیں واقع میں وہی ہیں۔ دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ یا حضرۃ ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں آپ یہاں کہاں۔
باپ۔ میں اپنے گناہوں کی جواب دہی میں ماخوذ ہوں۔ یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دار الجزا[2] ہی اور خداوند تعالیٰ جل[3] وعلا شانہ اس
محکمے کا حاکم۔ بیٹا۔ یا حضرۃ آپ تو بڑے متقی پرہیزگار خدا پرست نیکوکار تھے آپ پر اور گناہوں کا الزام۔ باپ۔ گناہ بھی ایک
دو نہیں سیکڑوں ہزاروں۔ دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال کیسی رسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہی اور میں اس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں
کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی براءۃ کی پیش کروں گا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور
اس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرار داد جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرا اٹھا۔ شرک اور کفر اور نافرمانی ناشکری
اور بغاوۃ[4] اور بے ایمانی کبر[5] و نخوۃ۔ دروغ[6] وغیبۃ[7]۔ طمع[8] و حسد[9]۔ مردم آزاری[10]۔ نفاق[11] وریا[12]۔ حب[13] دنیا کوئی الزام نہ تھا کہ اس میں
نہ ہو۔ چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالات دنیوی گونج رہے تھے لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا دفعہ اور ضمن
ڈھونڈنے۔ سو تعزیرات ہند کے دفعات کی عوض قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ متعجب ہو کر باپ سے پوچھا
کہ یا حضرۃ پھر کیا آپ ان تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ باپ۔ سب کا۔ بیٹا۔ کیا آپ حضور حاکم اقرار کر چکے ہیں۔ باپ۔
انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر[14] ہی کہ اگر میں انکار کروں بھی تو پذیرا[15] نہیں ہو سکتا۔ بیٹا۔
جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ باپ۔ اول تو وہ شخص کراماً کاتبین[16] اس بلا کے ہیں کہ میرا
کوئی فعل ان سے مخفی[17] نہیں۔ جتنی باتیں کہتے ہیں سچی کہتے ہیں۔ اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچۂ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو
میں اس کو دیکھتا ہوں حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں دوسرے یہی میرے اعضا ہاتھ پاؤں آنکھ کان وغیرہ
کوئی میرے کہنے کا نہیں یہ کے سب مجھ سے منحرف[18] ہیں سب مجھ سے برگشتہ[19] میری مخالفت پر آمادہ میری تذلیل[20] پر
کمربستہ[21] ہو رہے ہیں۔ بیٹا۔ آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں۔ باپ۔ میں ان کو غلطی سے اخوان و انصار ہمدرد اور
رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس[23] ایزدی تھے انھوں نے وہ وہ سلوک میرے ساتھ کیے کہ [illegible][24] لگا نہیں
رکھا۔ بیٹا۔ پھر آپ کا کیا حال ہی۔ باپ۔ جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں تنہائی سے جی گھبراتا ہی انجام کا معلوم
نہیں شبانہ روز[25] اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر صبح و شام
ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہی۔ دوزخ وہی ہی وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور سن کر ہوش
اڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہی کہ ای کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔ بیٹا۔ پھر ہنوز

[1] بگڑا ہوا ۱۲ [2] بدلا پانے کا گھر ۱۲ [3] اس کی شان بڑی اور اونچی ہی ۱۲ [4] سرکشی ۱۲ [5] غرور ۱۲ [6] جھوٹ ۱۲ [7] کسی کو پیٹھ پیچھے برا کہنا ۱۲ [8] لالچ ۱۲ [9] دوسرے کو دیکھ کر جلنا ۱۲ [10] لوگوں کو ستانا ۱۲ [11] مونھ پر کچھ دل میں کچھ ۱۲ [12] دکھاوا ۱۲ [13] دنیا کو دوست رکھنا ۱۲ [14] بہت ۱۲ [15] قبول ۱۲ [16] نیکی بدی لکھنے والے دو فرشتے جو ہر وقت آدمی کے ساتھ رہتے ہیں ۱۲ [17] پوشیدہ ۱۲ [18] پھر ہوئے ۱۲ [19] پھرے ہوئے ۱۲ [20] ذلیل کرنا ۱۲ [21] کمر باندھے ہوئے یعنی مستعد ۱۲ [22] بدوضع ۱۲ [23] خدا کی طرف سے ٹوہ لینے والا ۱۲ [24] گویا گردن جڑ سے کاٹ کر جدا کر دی ۱۲ [25] رات دن ۱۲

آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ باپ۔ خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے غنیمت ہے۔ اوّل اوّل جب یہیں حوالات
میں آیا تو اعمال نامہ مجھ کو حوالے کر دیا گیا بس اُسی کو دیکھتا اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں۔ نجاۃ کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں
آتی۔ بیٹا۔ بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آسکتے ہیں۔ باپ۔ اگر میرے لیئے عاجزی اور خلوص[91] کے ساتھ دُعا
کرو تو کیا عجب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہمسائے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہے اُس پر بھی بہت سے الزام تھے
مگر یہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجے کا انصاف ہے رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے اُس شخص کے پس ماندوں[92] نے
اُس کے واسطے بہت زار نالی[93] کی تو پرسوں یا اترسوں اُس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب
تجھ پر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے
ہی زن و فرزند ہیں ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا
بیج بویا جا ہم نے تیری خطا معاف کی۔ بیٹا سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہے۔ بیٹا۔
جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدّ و مد[94] کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے
ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے آپ کی عنایتیں آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے
یاد کریں گے۔ رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے مُونہہ پر خوشامد سے کہتے
ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔ دعا کے بارے میں غلط بات کیوں کر عرض کروں اہتمام
نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم[95] و صلوٰۃ[96]
کے بڑے پابند تھے کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے۔ باپ۔ کیوں نہیں یہ اُن ہی اعمال کا طفیل ہے کہ تم مجھ کو اس
حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے۔ مگر یہاں اعمال
میں خلوص نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی کھوٹے روپے۔ نمازیں بے حضور قلب[97]
اکارت گئیں اور روزے چونکہ پابندی رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے کے شمار میں در آئے۔
بیٹا پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں۔ باپ۔ استغفر اللہ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں نفسی نفسی[98] پڑی
ہے ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے دوسرے کی نجاۃ تو کوئی کیا کرائے گا پہلے آپ تو سرخرو ہو لے
بیٹا۔ کیوں جناب معاذ اللہ[99] یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا ہم لوگ تو خیر[100] سارا شہر آپ کے اتقا[101] کا معتقد تھا کیا آپ خدا
کے قائل نہ تھے۔ باپ۔ قائل تو تھا دل سے معتقد نہ تھا۔ بیٹا۔ جناب آپ کے تمام اعمال ظاہر سے مستنبط[102] ہوتا تھا کہ آپ
کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت[103] ہے۔ باپ۔ وہ تمام عقیدہ معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی۔ جب اوّل اوّل میرا

[91] صدق دل ۱۲ [92] پیچھے رہے ہوؤں یعنی وارثوں ۱۲ [93] گڑگڑا کر رونا ۱۲ [94] زور و شور ۱۲ [95] روزہ ۱۲ [96] نماز ۱۲ [97] یعنی دل حاضر نہ تھا ۱۲ [98] اپنی اپنی جان ۱۲ [99] خدا کی پناہ۔ جب کسی نالائق بیہودہ اور بُری چیز کا مذکور کریں تو یہ کلمہ کہہ لیا کرتے ہیں یہاں شرک و کفر کی وجہ سے معاذ اللہ کہا ۱۲ [100] یعنی خیر ہم لوگوں نے سمجھا تو ہم پر آپ کا حق تھا آپ ہمارے بزرگ تھے ۱۲ [101] پرہیزگاری ۱۲ [102] ظاہر ہوتا تھا نکلتا تھا ۱۲ [103] پکا جما ہوا عقیدہ ۱۲

اظہار کیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا کہ تیرا رب کون ہے چونکہ مرتے وقت مجکو ایمان کی تلقین کی گئی تھی
میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ تب اُس پر جرح کیا گیا کہ بھلا جب تو نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور
مُدّة تک خانہ نشین رہا اور جو کچھ کما کر لایا تھا سب صرف ہو گیا اور نانِ شبینہ کو محتاج ہو کر نوکری کی جستجو میں اِدھر
اُدھر پھرتا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا تھا مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لیئے تیرے مدّعا کو حیز التوا میں
ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکم ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا ہمارے ایما سے تیرے پرورش کا
وعدہ کیا مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا یہی تھا
کہ تجھ کو اُس انگریز کے وعدہ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہمارے تحریری تمسک وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا
عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کا اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر و ناظر سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھ کو کیونکر جسارة ہوتی
تھی۔ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے
مٹھی میں نہیں لے لیا مگر تو گناہوں کا نہایة بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو ہمارے فرمانے کا یقین
نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اُس کو دُنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ۔ جو کچھ
عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا کیا تو نے اُس کو ہمیشہ اپنی حُسنِ تدبیر کی طرف
منسوب نہیں کیا جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارا کرتا تھا مگر کیا تو
اُسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش ہزاروں لاکھوں احسان ہیں جو ہم نے
تجھ پر کیئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا مُونہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکرے بے شمار نعمتیں ہیں جو ہم نے تجھ کو عطا
فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا اُتنا ہی تو میری
مخالفة پر کمر بستہ رہا۔ جتنی میں تیری رعایة کرتا رہا اُسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیاةِ بے ثبات پر تجھ کو اتنا
گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرہ
عبودیة سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تجھ کو نیست سے ہست کیا اور خلعةِ انسانیة سے سرفراز بنایا
جو تجھ کو درکار تھا سو دیا جس کا تو حاجة مند تھا سب مہیا کیا ہر حال میں تیرے حافظ۔ ہر کیفیة میں تیرے نگہبان رہے کیا

---

۱ پروردگار ۱۲ ۲ تعلیم۔ جب کوئی آدمی مرنے کو ہوتا ہے تو پاس والے اُس کو دین کی باتیں یاد دلاتے ہیں ۱۲ ۳ اللہ تعالیٰ اکیلا جس کا کوئی ساجھی نہیں ۱۲ ۴ توڑ۔ اعتراض ۱۲ ۵ اتنی روٹی کہ رات کو کھا کر سو رہے ۱۲ ۶ تلاش ۱۲ ۷ بے قرار ۱۲ ۸ یعنی تیرے مطلب کو ڈھیل میں ڈال دیا تھا ۱۲ ۹ اشارہ ۱۲ ۱۰ نوکری دینے سے مراد ہے ۱۲ ۱۱ لکھی ہوئی دستاویز ۱۲ ۱۲ جتنے جاندار زمین پر ہیں اللہ سب کی روزی کا ذمہ دار ہے ۱۲ ۱۳ ہر جگہ موجود ۱۲ ۱۴ سب چیزوں کو دیکھنے والا ۱۲ ۱۵ سب کی سننے والا ۱۲ ۱۶ سب چیزوں کو دیکھنے والا ۱۲ ۱۷ ہر بات پر قدرت رکھنے والا ۱۲ ۱۸ دلیری ۱۲ ۱۹ یعنی بے دھڑک تجھ سے گناہ سرزد ہوتے تھے ۱۲ ۲۰ فائدہ۔ امن چین ۱۲ ۲۱ یعنی اپنی ہی کوشش کا نتیجہ سمجھا ۱۲ ۲۲ مراد ہے کہ آپ اپنا نقصان کرتا تھا ۱۲ ۲۳ جس میں تمام خوبیاں اکٹھی ہوں ۱۲ ۲۴ احسان کو بھول جانے والا ۱۲ ۲۵ ان گنت ۱۲ ۲۶ مستعد طیار ۱۲ ۲۷ بے ادب ۱۲ ۲۸ زندگی ناپائدار ۱۲ ۲۹ غرور ۱۲ ۳۰ تھوڑے دن کی ۱۲ ۳۱ بندگی کا حلقہ ۱۲ ۳۲ کچھ نہ تھا پیدا کر دیا ۱۲ ۳۳ موجود ۱۲

اِس واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ[۹۰۱] کی مسجد ہم سے جدا رکھے جب
تو ایک مضغۂ[۹۰۲] گوشت تھا ضعیف لا یعقل[۹۰۳] نادان وجاہل ضعیف اتنا کہ نقل وحرکت[۹۰۴] پر قادر نہیں نادان ایسا کہ خویش[۹۰۵] و
بیگانے کا امتیاز[۹۰۶] نہیں ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے
یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کیے اور اُن کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ اُنھوں نے
ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا[۹۰۷] اور تو روز بروز چونچال[۹۰۸] اور خوش حال ہوتا گیا پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا
کہ تو اُس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے - دنیا کے چرند و پرند حیوانات[۹۰۹]
نباتات[۹۱۰] - جمادات[۹۱۱] - سب کو تیرا مطیع[۹۱۲] فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے اور اُن میں متصرف[۹۱۳] رہے کیا اِس لیے کہ تو
بہک کر بھی کبھی ہماری طرف رخ نہ کرے اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے - تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود[۹۱۴]
تھی دو ملیے تجھ کو تنفس[۹۱۵] کے لیے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا - ایک رات دن بے آب و دانہ تجھ کو جینا دشوار ہوتا
منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے غلہ انبار کے انبار[۹۱۶] ٹھونس گیا[۹۱۷] اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت -
زندگی بھر کتنی کنوئیں تو نے خالی کیے ہوں گے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں دو دو ایک پانی اور ہوا اور
غلہ و غذا کیا ضرورۃ کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا - ہمارے توشہ خانہ[۹۱۸] عام سے - مگر اِس
پر تیری یہ ہیکڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرض دار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا اُدھار آتا ہے - تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا لیتا تھا اور بھول
بھول جاتا تھا - دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا[۹۱۹] تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ تجاہل[۹۲۰] کرتا تھا - مُنہ
پر آنکھیں تھیں اور اندھا - ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا - زمین - آسمان - چاند سورج - ستارے - جنگل - دریا
میدان - انواع واقسام کے درخت - پھل پھول کھانے کو الوان[۹۲۱] نعمت - پہننے کو رنگا رنگ خلعت - جواہر بیش بہا[۹۲۲]
نقرہ وطلا[۹۲۳] - دنیا بھر کا سامان[۹۲۴] ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کے لیے اِس قدر لوازمہ بہم پہنچایا
ہم کہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف[۹۲۵] ہم کو اِس قدر تیری بزرگ داشت[۹۲۶] ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ ہم
چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ ایسا
تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوۃ - ہم عنایۃ کرتے
تھے اور تو بغاوۃ[۹۲۷] - کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا - کیا یہی تھا صلہ[۹۲۸] جو تجھ سے ہم کو ملا - ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت

---

۹۰۱ محاورہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کی رائے کے خلاف اپنی سمجھ سے علیحدہ ایک کام کرتا ہے ۱۲ ۹۰۲ گوشت کی بوٹی ۱۲ ۹۰۳ بے وقوف ۱۲ ۹۰۴ ہلنے جلنے کی بھی طاقت نہ تھی ۱۲ ۹۰۵ اپنے پرائے ۱۲ ۹۰۶ فرق کرنے کا سلیقہ ۱۲ ۹۰۷ پرورش کیا ۱۲ ۹۰۸ ہشیار ۱۲ ۹۰۹ جاندار ۱۲ ۹۱۰ پھل پھول درخت ۱۲ ۹۱۱ بے جان چیزیں جیسے مٹی پتھر وغیرہ ۱۲ ۹۱۲ حکم کا تابع ۹۱۳ اپنے کام میں لاتے ۱۲ ۹۱۴ بے حقیقت زندگی ۱۲ ۹۱۵ سانس لینے کے لیے ۱۲ ۹۱۶ ڈھیر کے ڈھیر ۱۲ ۹۱۷ کھا گیا نگل گیا ۱۲ ۹۱۸ مراد ہے گودام ۱۲ ۹۱۹ مطلب کو پہنچنے والی ۱۲ ۹۲۰ جان بوجھ کر اپنے تئیں بے خبر بنانا ۱۲ ۹۲۱ رنگ برنگ کے کھانے ۱۲ ۹۲۲ بیش قیمت موتی ۱۲ ۹۲۳ چاندی سونا ۱۲ ۹۲۴ سامان ۱۲ ۹۲۵ برگشتہ پھرا ہوا ۱۲ ۹۲۶ خاطرداری ۱۲ ۹۲۷ سرکشی ۱۲ ۹۲۸ انعام ۱۲

کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر[١] لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے - یہ
میری عمدہ امانۃ اور نفیس ودیعۃ[٢] ہے دیکھ اس کی احتیاط کماینبغی[٣] اور حفاظت کماحقہ[٤] کیجیو جیسا اُجلا شفاف براق روشن
یہاں سے لیئے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا - آج تو نے روسیاہ اس کو لایا ہے پوتھڑے سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر
نجس - ناپاک تیرہ - بے آب - بدرونق - خراب ہم نے تو تجھ سے چلتے چلتے کہہ دیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس
طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر - تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا[٥] کہ قبر میں آکر جاگا تھا تو مسافر
اور بن بیٹھا مقیم - تھا تو سیاح[٦] اور ہو گیا متوطن - کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکّی پکّی عمارتیں اس خیال
سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں اُن میں رہے گا - مسافر کا یہی کام ہے - سیاح کا یہی شیوہ ہے - تو تو جانتا تھا کہ تجھ کو یہاں لوٹ
کر آنا ہے پھر مرنے کے نام سے تجھ کو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سن کر تو جلتا کیوں تھا - اول تو تجھ کو ہماری
عبادۃ کا اتفاق ہی نہیں ہوا لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم[٧] کی وجہ سے مصروف عبادۃ
ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں - کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو[٨] سے خالی تھی - دنیا کی برسوں کی بھولی
بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا - نہ تعدیل[٩] ارکان ٹھیک - نہ قومہ[١٠] درست
نہ قعدہ[١١] صحیح - برس بھر تو دوزخ شکم کو ناپ تناپ بھرتا رہتا تھا برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے
تجھ کو حکم دیا تھا کہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو تجھ کو اپنے ابنائے جنس[١٢] پر جو مبتلائے مصیبۃ ہیں رحم آئے اور
تیری صحۃ بدنی کو بھی نفع پہنچے تیرے مزاج میں فروتنی[١٣] اور انکسار کی صفت محمود کہ ہم کو بہت بھاتی ہے پیدا ہو لیکن
یوں دنیا کے کام دھندے میں تو کچھ دن دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا نہ شکوہ نہ گلہ تازہ دم ہشاش[١٤] بشاش پھر
کھانا تھوڑے کو موجود مگر روزہ چونکہ ہمارے حکم سے تھا دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایۃ اور جو آیا اس سے
ضعف و ناتوانی کی حکایۃ العطش[١٥] اور الجوع[١٦] یہی تیرے دو وظیفے تھے[١٧] روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا
گرا کہ گویا جان نہیں باوجودے کہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھا لیتا تھا پھر بھی اس خوف سے کہ کل پھر
روزہ رکھنا ہے تیری جوع البقر[١٨] کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی - تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی
تاریخ رہائی کا پھر اگر بس چلتا تو ٢٩[١٩] کیا ١٩ کی عید کرتا کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو امیدوار اور اجر کا متوقع ہے - میں نے
تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تاکہ مصیبۃ زدوں کی ہمدردی کرے مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار

١؎ پاکیزہ جوہر ١٢ ٢؎ امانۃ ١٢ ٣؎ جیسی چاہیئے ١٢ ٤؎ جیسا حفاظت کا حق ہو ١٢ ٥؎ محاورہ ہے یعنی خوب پاؤں پھیلا کر سویا ١٢ ٦؎ لفظی
معنی بہت سیر کرنے والا یہاں یہ مراد ہے کہ دنیا میں سیر کرنے کو آیا تھا اور اس طرح جم کر ہو بیٹھا کہ گویا کبھی یہاں سے چلنا ہی نہیں ١٢ ٧؎ رسم ورواج
کی پابندی ١٢ ٨؎ اہل اسلام کے نزدیک نماز میں بعض ارکان کی کمی یا زیادتی سے نماز کے بعد دو سجدے کیئے جاتے ہیں جن سے نماز پوری ہو جاتی ہے ١٢ ٩؎
نماز میں رکوع و سجود وغیرہ کو آہستگی اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا ١٢ ١٠؎ کھڑا ہونا ١٢ ١١؎ بیٹھنا ١٢ ١٢؎ تجھ جیسے لوگ - بنی آدم ١٢ ١٣؎ عاجزی ١٢ ١٤؎
خوش وخرم ١٢ ١٥؎ پیاس ١٢ ١٦؎ بھوک ١٢ ١٧؎ یعنی یہی دو شکایتیں ہر وقت تیری زبان پر جاری تھیں ١٢ ١٨؎ گائے بیل کی سی بھوک
جو کبھی کھانے سے سیر نہیں ہوتے ١٢ ١٩؎ مسلمان ٢٩ کے چاند کی عید سے زیادہ خوش ہوتے ہیں ١٢

دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھ کو باک[91] نہ تھا تیرے ہمسایگی میں ہمارے بندے رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھ کو سوء ہضم[92] کے علاج سے اُن کی پرداخت[93] کی پروا نہ تھی۔ تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں بیچ پاؤں پھیلا کر سوتا۔ نعمت مال و دولت جو ہم نے تجھ کو عطا کی تھی تو نے تکلفات لایعنی[94] اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف[95] کی اور جو لوگ اس کے سخت حاجتمند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے۔ تیری سب شرارتیں[96] تجھ کو معلوم ہیں تو نے درماندگی[97] کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کاربراری کی امید ہوتی تھی تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظام دنیا میں اس کو بھی کچھ دخل ہے مگر ہاں جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا تب تو خدا کو یاد کرتا تھا۔ اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اس کے اُٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان[98] کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام[99] کی بے توقیری[100] کی اور تو نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر بہتیرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سنتا تھا کیا تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک دن تو بھی مرے گا۔ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے۔ لڑکے سے جوان ہوا۔ جوان سے بڈھا ناتوان بال تیرے سفید ہوئے۔ دانت تیرے ٹوٹے۔ کمر تیری جھکی۔ قوتوں میں تیری فتور[101] آیا۔ غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے۔ کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے ہی کروٹ نہ لی ؎

تمامی عمر تو غفلت میں سویا　　　ہمارا کیا گیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری[102] خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر اپنے بندوں پر جن کا مارنا اور جلانا ہمہ وقت ہمارے اختیار میں ہے۔ مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے نہ خر ناشخص[103] کہ ہم تو دیں تو اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت[104] پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً[105] بھلا دیا ہے۔ لیکن توبہ و استغفار[106] ندامت و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے۔ ہماری رحمت حیلہ جُو[107] ہماری رافت[108] بہانہ طلب کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبت عبودیت[109] صحیح رکھتا

---

[91] خوف ۱۲ [92] بدہضمی ۱۲ [93] پرورش [94] بے کار ۱۲ [95] ضائع کی ۱۲ [96] شرارتیں ۱۲ [97] بے بسی یعنی جب تدبیر سے کام نہ چلتا تھا اور تو عاجز ہو جاتا تھا تو اس وقت تجھ کو خدا یاد آتا تھا ۱۲ [98] حکم جس کا تعمیل کرنا ضرور ہو ۱۲ [99] ہمارے احکام جن کی عزت کرنی لازم تھی ۱۲ [100] بے عزتی ۱۲ [101] ضعف آیا ۱۲ [102] سختی کرنا ۱۲ [103] خر گدھا - ناشخص بے ٹھکانے ۱۲ [104] عذر - اہل اسلام کے ہاں لکھا ہے کہ اگر تمام عمر کوئی شخص بُرے کام کرے اور پھر خدا کے سامنے سچائی کے ساتھ عذر کرے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں - گویا گناہوں کا معاف کرنا اپنے اختیار میں ہے ذرا ندامت کا اظہار ہوا اور گناہ معاف ہوا ۱۲ [105] بالکل ۱۲ [106] معافی مانگنا ۱۲ [107] یعنی خدا کی رحمت حیلے اور بہانے ڈھونڈا کرتی ہے ۱۲ [108] شفقت یہ کسی قدر رحمت سے بڑھی ہوئی ہے یہ بھی موقع اور محل کی منتظر رہتی ہے ۱۲

[109] بندگی ۱۲

تو ہم اُس کی لاکھ بُرائیوں پر خاک ڈالتے ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اُس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا عالم اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا سونے کو ہم نے منع نہیں کیا۔ تمتعاتِ[۹۱] دنیوی سے ہم نے باز نہیں رکھا پھر جو تو نے اُن کی بجا آوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی[۹۲] کے اَور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص نجاۃ جس کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہے اے کاش زندگی میں تجھ کو اُس کی اتنی ہی پرواہ ہوتی جیسے اُڑد[۹۳] پر سفیدی۔ دُنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیان تجھ کو مضطر[۹۴] اور بے چین کر دیا کرتے تھے اگرچہ کیا دُنیا اور کیا دنیا کا خسارہ[۹۵] کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا لیکن تباہی دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی اے کاش تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے چولہے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھ کو بہت ہی بڑی ندامت ہے۔ لیکن اس ندامت کا کچھ حاصل[۹۶] نہیں اس واسطے کہ یہ دار الجزا[۹۷] ہے دار العمل[۹۸] نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھ کو مہلت دیتے ہیں جا اپنے نامۂ اعمال[۹۹] کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطے کہ معقول اور قابلِ قبول ہو۔

خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے خاندان کی لاابالی زندگی پر سخت تاسف ہوا اور اُس نے تلافیِ مافات[۱۰۰] کا عہد کر کے فہمیدہ اپنی بی بی سے ماجرائے خواب بیان کیا اور اصلاحِ خاندان کے لیے اُس کو اپنا مددگار بنایا۔

باپ نے جو یہ ام کہانی سنائی بیٹے پر اس طرح کی ہیبت چھائی کہ چونک پڑا۔ جاگا تو پھر وہی دالان تھا اور وہی تیمارداریوں کا سامان بی بی پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی میاں کی آنکھ کھلی ہوئی دیکھ اُس کی جان میں جان آئی ورنہ جس گھڑی سے میاں نے جی بُرا[۱۰۱] کیا تھا سہموں کے مارے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ نصوح آٹھ بجے ڈاکٹر کی دوا پی کر جو پڑا تھا تو اُس وقت کا سویا سو یا اب کہیں دو بجے جا کر ہوشیار ہوا چوں کہ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نیند آ گئی تو جانا کہ بیمار بچ گیا اُس کے سونے سے سب کو تسلی سی ہو گئی تھی مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو عورتیں پھر گھبرانے لگیں کہ نہیں معلوم کم بخت ڈاکٹر کیسی دوا پلا گیا ہے کہ دو پہر پڑے پڑے گزر گئے کروٹ تک نہیں بدلی۔ خدا جانے اندر سے جی کیسا ہے اور دل پر ایسی کیا آن بنی ہے کیوں کر ہوش آئے گا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نصوح بیدار ہوا تو بی بی نے پوچھا کیسی طبیعت ہے اچھے سوئے کہ گھر میں رونا پیٹنا ہو گیا اور ہم کو

۹۱ دنیا کے فائدے ۱۲ ۹۲ بدذاتی ۱۲ ۹۳ محاورہ ہے مراد اس سے مقدار قلیل ہے یعنی ذرا سی بھی پرواہ ہوتی ۱۲ ۹۴ بے قرار ۱۲ ۹۵ گھاٹا۔ نقصان ۱۲ ۹۶ کچھ فائدہ نہیں ۱۲ ۹۷ بدلے کا گھر۔ یعنی جو کچھ دنیا میں کیا ہے یہ وقت اُس کے بدلے کا ہے ۱۲ ۹۸ کام کرنے کا گھر مراد اس سے دنیا ہے ۹۹ وہ نوشتہ جس میں انسان کے تمام بُرے بھلے کام جو اُس نے دنیا میں کیے ہیں لکھے ہوں گے ۱۲ ۱۰۰ جو کام کرنے سے رہ گیا تھا اُس کا عوض یعنی اُس کی تلافی اپنے دل میں عہد کیا کہ میں نے جو غفلت سے اپنا زمانہ برباد کیا ہے کسی طرح اس کی کسر نکال لوں ۱۲ ۱۰۱ عورتوں کا محاورہ ہے قے کرنے کو کہتے ہیں ۱۲

توبہ نہیں۔ بولو بات کرو کہ اوپر والوں کو تسلی[51] ہو۔ کسی بچّے کے مُونہ میں دانہ تک گیا ہو تو حرام۔ چھوٹے بڑے سب کا کل کا کھائے ہوئے ہیں روتے روتے لڑکیوں کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ لڑکے ہیں کہ مضطر اور پریشان پھرتے ہیں۔ بی بی نے ہر چند دل جوئی کی باتیں کیں مگر نصوح کو خواب کا سارا ماجرا پیشِ نظر تھا مطلق جواب نہ دیا بی بی سمجھی کہ بیماری کی وجہ سے بولنے کو جی نہ چاہتا ہوگا مگر وہ خدشہ[52] سب کے دل سے رفع ہوگیا۔ مبارک سلامت ہونے لگی اور گھر بھر نے بے رمضان کے عید منائی گو دیر ہوگئی تھی مگر لوگ بھوکے تھے بازار سے حلوا پوری منگوا کر سب نے تھوڑا بہت کھایا پیا کھانے ہی میں کسی نے یہ بات بھی چھیڑی کہ مریض کا غسل صحت ہو تو ایک رت جگا[53] بڑی دھوم سے کیا جائے اور اچھے ہونے کی شادی کریں۔ یہ لوگ تو شادی اور رت جگے کے ارادے کر رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصور میں غلطاں پیچاں[54] تھا۔ اُس کا دل مان گیا تھا کہ یہ خواب میرے وہم وخیال کا بنایا ہوا تو ہر گز نہیں ہے۔ ہو نہ ہو یہ ایک امر من جانب اللہ ہے خواب کیا ہے رؤیائے[55] صادقہ اور الہامِ الٰہی[56] ہے۔ باپ کا اظہار اس نے ایسی توجہ سے سُنا تھا کہ حرف بحرف نوک زبان یاد تھا جتنے الزام باپ پر لگائے گئے تھے غور کرتا تھا تو سب اپنے میں پاتا تھا بلکہ باپ کی حالت سے اپنی حالت کو مقابلہ کرتا تھا تو کچھ نسبت نہ تھی۔ اُن مرحوم[57] کا یہ حال تھا کہ نماز روزے کے پابند۔ ورد و وظائف کے مقیّد۔ معاملے کے صاف بیوہار کے کھرے۔ لوگوں کے دیکھنے میں محتاط[58]۔ پرہیز گار متقی۔ دین دار۔ اور یہاں نماز بھی تھی تو گنڈے[59] دار۔ عیدین[60] تو ضرور اس واسطے کہ عید سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی تیوہار نہیں اس سے بھاری کوئی میلہ نہیں برس روز میں یہی دو دن تو ساز و سامان کی نمائش کے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنے نئے شان دار کپڑوں میں اکڑ رہا ہے۔ کوئی گھوڑے کو چھیڑ چھیڑ کر کُداتا ہوا قصداً لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی نوکروں کی ہٹو بڑھو سُن کر پھولا ہوا ہے۔ کوئی کرائے یا مانگے کے تانگے پر سوار گاڑی بان سے کہتا ہے چودھری کیسا سڑیل تانگہ نہار کھا ہے گدا ہے تو میلا۔ پوشش[61] ہے تو پھٹی ہوئی۔ نہ بیلوں کے گلے میں گھونگھرو۔ نہ پہیوں میں جھانجھ۔ خیر اب نماز کا وقت قریب ہے اتنا تو کر کہ وہ آگے اِکّہ جا رہا ہے اُس کے برابر لگائے چل۔ مرد آدمی تجھ کو انعام لینے کا بھی سلیقہ نہیں۔ رہا جمعہ اگر کپڑے خوب صاف ہوئے اور دھوپ بھی ایسی سخت نہ ہوئی دن ابر و باد سے پاک ہوا دوست آشناؤں سے ملنے کو جی چاہا تو گئے ورنہ محلے ہی کی مسجد میں ٹرخالی[62] یا دل میں تاویل کر لی کہ شرائطِ جمعہ میں اختلاف ہے۔ پنج وقتی کو تو فرض و واجب کیا مستحب بھی نہیں سمجھا صبح اور ظہر اور عشا تو عمر بھر پڑھی ہی نہیں کیوں کہ عین سونے کے وقت تھے۔ رہی عصر سو ہوا خوری اور سیر بازار اور خرید اور فروخت دوست آشناؤں کی ملاقات دنیا بھر کی ضرورتوں کو بالائے طاق رکھتے تو ایک نماز پڑھتے۔ مغرب کے

---

[51] یعنی تیمارداروں کو۔ گھر کے لوگوں کو تسلی ہو ۱۲ [52] اندیشہ ۱۲ [53] جب کوئی خوشی ہوتی ہے تو عورتیں رات بھر جاگتی اور گیت گاتی ہیں ۱۲ [54] حیران۔ پریشان ۱۲ [55] سچا خواب [56] خدا کی طرف کا اشارہ ۱۲ [57] رحم کیا گیا مسلمانوں میں جب کوئی مر جاتا ہے تو اُس کی طرف اِس لفظ سے اشارہ کیا کرتے ہیں ۱۲ [58] احتیاط والے ۱۲ [59] یعنی کبھی پڑھی کبھی نہ پڑھی ۱۲ [60] دونوں عیدیں یعنی عید۔ بقرعید ۱۲ [61] اوپر ڈالنے کا کپڑا ۱۲ [62] یعنی بے دلی سے ادا کی ۱۲

واسطے تو عذر ظاہر تھا وقت کی تنگی جب تک پھر پھرا کر گھر آئے حمرۂ[51] شفق زائل ہو جاتی تھی۔ یہ تو اس عبادت کا حال تھا۔ جس کو ثواب بے زحمت اور اجر بے تکان کہنا چاہیئے اور جس عبادۃ میں ذراسی تکلیف بھی تھی۔ جیسے روزہ یا زکوٰۃ حتیٰ[52] الوسع کوئی نہ کوئی حیلۂ شرعی اُس سے معاف رہنے کا سوچ لیا جاتا تھا۔ رجب کا مہینا آیا اور روزوں کے ڈر کے مارے ایک عجب طرح کا سہم چڑھا۔ سب سے آسان نسخہ[53] یہ کہ کسی طبیب کے یہاں آنا جانا شروع کیا انھوں نے چند روزہ زندگی کے واسطے وہ وہ بکھیڑے کھڑے کر رکھے ہیں کہ روئے زمین پر اُن کے نزدیک کوئی تن درست ہی نہیں۔ یوں ملنے ملاقات کرنے جاؤ تو پان کی عوض نسخہ حوالے کر دیتے ہیں اور جہاں ایک دفعہ دوا پی اور روگ لگا۔ رمضان کے آتے آتے تو طبیعۃ خاصی محتاجِ مسہل[54] ہو گئی اور حکیم صاحب کی بدولۃ روزوں سے بچ گئے زکوٰۃ[55] کا ٹال دینا تو کچھ بڑی بات نہ تھی۔ نصاب پر حول[57] کا ل کیوں گزرنے دیں کہ زکوٰۃ دینی پڑے۔ جب دیکھا کہ برس پورا ہونے آیا بی بی کے نام زبانی ہبہ[58] کر دیا۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ جب بی بی پر وجوب زکوٰۃ کا وقت آیا پھر اپنے نام ہبہ کرا لیا اور ٹھٹھیرا[59] بدلائی کر کے خدا کو بالا[60] بتایا یا مال کو ایسے پیرایے میں رکھا کہ زکوٰۃ سے بری رہے خاصی طرح دکانیں مول لیں۔ مکان بنوائے اُن میں کرایہ دار بسائے کہ مال نامی[61] آپ نامی زکوٰۃ ندارد غرض جہاں تک نصوح احتساب کرتا تھا۔ اپنے تئیں دین سے بے بہرہ۔ ایمان سے بے نصیب۔ نجاۃ سے دُور ہلاکۃ و تباہی سے قریب پاتا تھا۔"

غرض طالب علم توبۃ النصوح پڑھتا چلا جاتا اور افسر اسکول نہایت دل چسپی کے ساتھ سنتا جاتا تھا چوں کہ وقت میں گنجائش کم تھی۔ اس لیے افسر سکول کو بادلِ ناخواستہ یہ کہتے ہوئے طالب علم کو روکنا پڑا کہ اگرچہ دل نہیں مانتا کہ توبۃ النصوح کو بے ختم کیے ہوئے چھوڑو مگر وقت تنگ ہے جہاں سے چھوڑا ہے نشان کر دو موقع ملے گا تو پھر سنیں گے طالب علم نے کتاب بند کر دی اور افسر اسکول تقسیم انعام میں مصروف ہوئے۔

مایغنیک فی الصرف یہ علم صرف میں ایک مختصر سا سو صفحے کا رسالہ ہے جس کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مبتدی اس کے قواعد کو سمجھ کر مستحفظ کر لے اور اُن کا استعمال بھی کرتا رہے تو علم صرف میں دوسری کتاب کی اُس کو ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ کتاب مولنا نے ۱۸۹۲ء میں تصنیف فرمائی اور ۱۸۹۳ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق خود مولنا دیباچے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

خدا اپنے فضل و کرم سے پورا کرنے تو ارادہ یہ ہے کہ شایقین زبان عربی کے واسطے صرف و نحو کے چھوٹے چھوٹے

---

[51] شفق کی سرخی۔ نماز مغرب کا وقت حمرۂ شفق کے زائل ہونے کے بعد نہیں رہتا ۱۲ [52] جہاں تک ہو سکتا تھا ۱۲ [53] تدبیر ۱۲ [54] جلاب ۱۲ [55] مال کا چالیسواں حصہ جو برس پیچھے خدا کی راہ میں دیا جاتا ہے ۱۲ [56] مال کی وہ مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اقل درجہ چاندی کا دو سو درہم کے برابر ہے اور سونے کا بیس دینار کے برابر۔ درہم ساڑھے تین ماشے کا ہوتا ہے اور دینار ساڑھے چار ماشہ کا ۱۲ [57] پورا سال ۱۲ [58] بخشش بلا عوض ۱۲ [59] ٹھٹھیرے نئے پرانے باسنوں کا بہت رد و بدل کرتے رہتے ہیں ۱۲ [60] ٹال دیا ۱۲ [61] نامی کے دو معنی ہیں اول بہ تبادر یعنی نامیدہ و مشہور اور دوسرے اسم فاعل نمو سے یعنی بالندہ اور روز افزوں۔ مال نامی میں دوسرے معنی مراد ہیں اور آپ نامی میں پہلے ۱۲

دو رسالے ایسے بنا دیجیے کہ اُن کو پڑھ کر عبارت عربی کو صحت کے ساتھ پڑھ لینے پر بخوبی قادر ہو جائیں پہلا رسالہ ہے جس میں صرف کا بیان ہے بے شک اِس کا پڑھنے والا صرف کا علامہ محقق تو نہیں ہو جائیگا مگر امید ہے کہ جتنی باتیں ضروری اور بکار آمد ہیں وہ سب کو جانے سب کو سمجھے اور سب کا برتاؤ کر سکے صرف نحو عربی کا سامان جو کتب مروجہ میں ہے اُس کو کافی وافی کہنا ایک طرح کی بے انصافی ہے وہ کافی سے کہیں زیادہ اور وافی سے کہیں بڑھ کر ہے مختصرات۔ مطولات۔ متون حواشی۔ منہیات۔ شروح۔ تعلیقات ملا کر بجائے خود ایک کتابخانہ ہے جس کو بالاستیعاب دیکھنے کے لیئے اگر تمام عمر طبعی نہیں تو تمام عمر تحصیل بدقت وفا کرے تو کرے مصنفین کی طبع آزمائیوں نے صرف و نحو کو عقبات بنا دیا ہے کوئی ایسا ہی تقدیر کا رستم ہو تو ان سے باہر نکلے سچ ہے لڑکوں کا کھیل مینڈکوں کی موت ہے میں جو مبتدیان عربی خوان کو دیکھتا ہوں تو اُس ستارہ شناس کو یاد کرتا ہوں جس کو منظور تھا کہ اجرام فلکی میں جو صنائع بدائع قدرت مضمر ہیں اُن کو دیکھے مگر وہ دُوربین کے کیل پرزوں کی ساخت میں ایسا محو ہوا کہ آسمان کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکا میں نے اس رسالے کے جمع کرنے میں نہ تو کوئی نیا قاعدہ باندھا نہ کوئی نیا مسئلہ ایجاد کیا۔ پھر کیا تو کیا کیا۔ اتنا کیا کہ ع متاع نیک ہر دوکاں کہ باشد۔ اِدھر سے اُدھر سے جوڑ بٹور کر مطالب کو اپنے طور پر مرتب کر دیا ترتیب جو میں نے اختیار کی ہے میرے گمان میں نئی اور قریب الفہم ہے۔ اول تو میں نے یہ ثابت کیا کہ الفاظ میں گروہ بندی ہے جتنے الفاظ میں چند حروف مشترک ہوں اور اُن کے معانی میں بھی کوئی امر مشترک پایا جائے وہ الفاظ ایک گروہ یا ایک باب ہیں اور حروف مشترک مادہ باب۔ مادہ باب میں جو جو تغیرات جس جس غرض سے کیئے جاتے ہیں اُن کو صرف نے قواعد کے طور پر منضبط کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تغیرات اکثر خاص حروف مادہ باب پر زیادہ کرنے سے ہوتے ہیں اور زوائد تین قسم کے ہیں۔ زوائد نقل باب زوائد اشتقاق۔ زوائد توزین و الحاق۔ زوائد نقل باب سے ابواب ثلاثی و رباعی مزید و مجرد پیدا ہوئے۔ اِس بیان کو بمنزلہ کتاب منشعب کے سمجھو مگر خواص ابواب کا تذکرہ میرے رسالے میں زیادہ ہے۔ پھر زوائد اشتقاق سے ماضی و مضارع وغیرہ کے صیغے جن کا مذکور میزان الصرف میں ہے مگر میزان الصرف میں صرف ثلاثی مجرد کی گردانیں ہیں میں نے جو قواعد اشتقاق لکھے ہیں عام ہیں۔ زوائد توزین چونکہ سماعی ہیں چند مثالیں دیکر اُن کی تصریح سے سکوت کیا۔ اسکے بعد میں نے معتلات کو اِس تمہید سے شروع کیا کہ زوائد اشتقاق و نقل باب وہ تغیرات ہیں جو معانی خاص کی غرض سے کئے جاتے ہیں اور اُن کے علاوہ بعض تغیرات وہ ہیں جن کو وہ حروف جن سے کلمہ مرکب ہے اقتضا کرتے ہیں۔ مہموز و معتلات و مضاعف کے قواعد علی حدہ علی حدہ لکھے ہیں اور ہر ایک کی وافر مثالیں اُس کے قاعدوں کی ذیل میں مع تعلیلات حوالہ قواعد بیان کر دی گئی ہیں آخر میں رسم الخط کا رسالہ لگا دیا ہے اور اُس میں بھی ضروری قاعدے مذکور ہیں غرض اس رسالے کے چار حصے ہیں۔ اول منشعب مع خواص الابواب دوم میزان صحاح سوم معتلات۔ چہارم رسم الخط۔ باایں ہمہ یہ رسالہ جس قدر ہے مختصر ہے اس کے حجم سے ظاہر ہے ایک بات کی کسر رہ گئی ہے وہ یہ کہ آخر میں دو چار ورق تمرین کے بھی ہوتے تو بہتر ہوتا یعنی مثلاً پانسو متداول صیغے واسطے مشق کے لکھدیئے جاتے۔ البتہ میں پسند نہیں کرتا چوا ناموئی کے چیستانی صیغوں کو کہ اُن میں غور کرنا طالب کی پریشانی خاطر کا موجب ہے مگر اتنا (اتنا ذرا سا) کام میں نے معلمین و اساتذہ کے ذمہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی تجویز کے موافق تمرین کی مشق کرا لیں گے۔ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا +

غرض سطور بالا سے ناظرین کو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مائیغنیک فی الصرف اور دوسرے مروجہ صرفی رسالوں میں کیا فرق ہی میرے نزدیک اگر اور صرفی رسائل بھول بھلیاں ہیں تو مائیغنیک فی الصرف اُن میں سے نکلنے کا رستہ۔

مائیغنیک فی الصرف جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہی مولٰنا نے اپنے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے لیئے مرتب کی تھی۔ جب یہ کتاب امتحان میں پوری اُتری اور اُس سے خاطرخواہ فائدہ ہوا تو اُس کو گورنمنٹ میں پیش کیا تاکہ طلبہ کے عربی کورس میں شامل ہو جائے۔ مصنف کو انعام ملے اور طالب علم فائدہ اُٹھائیں۔ مگر افسوس نہ یہ ہوا نہ وہ ہوا۔ اور یہ اس لیئے کہ بدقسمتی سے وہ رسالہ کسی مولوی صاحب کے پنجہ غضب میں جا پڑا یعنی گورنمنٹ نے مائیغنیک فی الصرف کی نسبت کسی مولوی سے رائے طلب کی۔ مولوی صاحب نے جیسی کچھ اس رسالے کی رد ئی ڈھنکی ہو وہ تو کسی کو معلوم نہیں مگر گورنمنٹ نے اس کو یہ کہہ کر واپس دیا کہ عربی خوان طلبہ اپنا پرانا کورس بدلنا پسند نہیں کرتے۔ سچ ہی لکیر کے فقیر سیدھی اور صاف سڑک کو پسند نہیں کرتے۔ مولٰنا کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہی[1] "اس کتاب کو جمع کر کے تو میں عجب پریشانی میں پڑا ہوں۔ چھٹی برس ہوئے کہ میں نے یہ رسالہ اپنے لڑکے کے لیئے لکھا تھا۔ اُن دنوں مجکو سرکاری انعاموں کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ اس رسالے کو بھی سرکار میں پیش کیا وہاں سے خالی پیلی شکریہ کے ساتھ بڑی لمبی چوڑی تعریف لکھ آئی۔ مگر مولویوں کے ڈر سے جو آؤ بداکر ہر نئی بات کی مخالفت کیا کرتے ہیں گورنمنٹ نے اس رسالے کے رواج دینے پر جرأت نہ کی۔ گورنمنٹ کے نامنظور کرنے سے دل کچھ ایسا کھٹا ہوا کہ میں نے بھی پھر کچھ پروا نہ کی۔ لیکن میرا لڑکا بشیر الدین احمد اس کتاب کو مجھ سے پڑھتا رہا۔ اُس کو اس کے مطالعے نے خاطرخواہ نفع دیا"

ہم کو معلوم ہوا ہی کہ جس طرح مولٰنا نے مائیغنیک فی الصرف تالیف فرمائی اسی طرح مائیغنیک فی النحو بھی ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ مگر جب صرف کی طرف سے مایوسی ہوئی تو نحو کی طرف پھر توجہ نہ فرمائی۔ اور جو کچھ اس کا میٹیریل جمع تھا وہ اپنے بڑے بھائی مولوی علی احمد صاحب کو دیدیا۔ جو عربی زبان کے عالم متبحر اور ادیب بے مثل تھے۔ جناب ممدوح مرحوم نے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے لیئے توضیح المرام کے نام سے مائیغنیک فی الصرف کے ڈھنگ کی ایک بسیط کتاب نحو میں تصنیف فرمادی۔ افسوس اس کتاب سے بھی مولوی بشیر الدین احمد کے سوا اور کسی نے ابھی تک فائدہ نہیں اُٹھایا۔ کیوں کہ ابھی تک وہ غیر مطبوعہ ہی۔ بہر حال ہمارے نزدیک مولٰنا کو اس سے بہتر اور کیا انعام ملتا کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے انھیں کتابوں سے وہ فائدہ اُٹھایا کہ اُن کو معقول طریقے سے عربی آگئی۔ اور انھیں رسالوں کی مدد سے وہ طالب علمانہ طور پر اچھی خاصی طرح عبارتِ عربی کے پڑھنے پر قادر ہو گئے۔

مبادی الحکمۃ غالباً ۱۸۷۱ء میں من جانب گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی (حال صوبۂ متحدہ) ایک اشتہار اس مضمون کا جاری ہوا کہ سرکاری مدارس میں مبتدیوں کے لیئے منطق کے ایک رسالے کی ضرورت ہی۔ یہ اشتہار دیکھ کر ملک کے گیارہ مصنفین نے قلم اُٹھائے۔ اُن میں ایک ہمارے مولٰنا بھی تھے۔ اُن رسالوں کا حال ہمیں معلوم نہیں جو انتخاب میں نہیں آئے۔ مگر مولٰنا کی کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ جناب ممدوح نے انگریزی اور عربی منطق کو سمو کر ایک نئی قسم کا رسالہ

[1] ۲۵- جون ۱۸۷۵ء کو مولٰنا نے یہ رائے ظاہر فرمائی تھی ۱۲-

مبادی الحکمۃ تصنیف کرکے گورنمنٹ میں بھیج دیا۔ گورنمنٹ اور اراکین گورنمنٹ اور کمیٹی نے پسند کرکے پانسو روپیے کا انعام مصنّف کو مرحمت کیا۔ یہ کتاب بنگال یونی ورسٹی نے اپنے ہاں کے کورس میں داخل کرلی۔ غالباً ابھی تک وہاں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔

اِس کتاب پر بھی کپتن صاحب بہادر اور نواب سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر بہادر کے ریویو ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب بہادر لکھتے ہیں۔

"مبادی الحکمۃ جو اِس وقت زیرِ نظر ہے اُن سب کتابوں سے بہتر ہے جو اِس وقت تک میرے پاس آئی ہیں۔ اور توقع نہیں کہ حال کی ضرورۃ کے لیے مجھے کوئی کتاب اِس سے بہتر ملے۔ اور مجکو اب کچھ ایسی پروا بھی نہیں رہی۔ مصنّف کی لیاقت اِس درجے کی ہے کہ وہ اِس فن میں کتاب لکھنے پر بخوبی قادر ہے۔ وہ عربی اچھی طرح جانتا ہے اور انگریزی میں بھی ایسی دست گاہ کافی رکھتا ہے کہ علمی کتابوں کو اُن کی اصلی زبان میں پڑھ سکتا ہے۔ علاوہ بریں اُردو میں اُس کا طرزِ تحریر پاکیزہ ہے اور اُس کے بیان میں اتنا زور ہے کہ لفّاظی اور تکریرِ عبارت کے بدون ادائے مطلب کر سکتا ہے۔ اور جس لیاقت و استعداد کے طالب علموں کے لیے اُس نے یہ کتاب لکھی ہے وہ اُن سے ذاتی شناسائی رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ آپ سررشتۂ تعلیم میں نوکری کرچکا ہے .... یہ کتاب رفتہ رفتہ ہمارے تحصیلی اور نارمل مدارس میں جاری ہونی چاہیے اور میں سفارش کرتا ہوں کہ مصنّف کو پانسو روپئے سرکار سے بطور انعام عطا کیے جائیں۔"

نواب سر ولیم میور صاحب بہادر اِس کتاب کے متعلّق ڈائرکٹر صاحب موصوف کو لکھتے ہیں۔

"اِس کتاب (مبادی الحکمۃ) کی نسبت جو آپ خیال فرماتے ہیں کہ زبانِ اُردو میں منطق کی ایسی ایک کتاب کی بہت ضرورت تھی اور غالب ہے کہ یہ رسالہ مبتدیوں کو نافع ہوگا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کی رائے سے متفق ہیں۔ طرزِ ادائے مطلب سلیس اور معقول معلوم ہوتا ہے۔ اور پانسو روپئے کا انعام بھی مصنّف کی لیاقت سے کچھ زیادہ نہیں۔ اِس ضمن میں ایک بات یہ بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ اِس کتاب کی تالیف بے اِس کے تو ہو نہیں سکتی تھی کہ اِس کا مؤلف زبانِ انگریزی سے بخوبی واقف ہو اور فارسی اور عربی میں بھی استعدادِ کامل رکھتا ہو۔ پس مولنا نذیر احمد اِسی طرح کے تعلیم یافتہ عالم کا ایک نمونہ ہے اور جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کے نزدیک سررشتۂ تعلیم کے عمدہ ترین مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ اِس قسم کے مصنّفوں کا ایک گروہ تیّار کرے جیسا کہ مرآۃ العروس اور مبادی الحکمۃ کا مصنف ہے۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر پانسو روپئے کا انعام منظور فرماتے ہیں اور آپ کو اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ سررشتۂ تعلیم کو جس قدر کتابوں کی ضرورت ہو آپ خرید فرمائیں۔"

جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اور جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر نے مبادی الحکمۃ پر جو ریویو لکھے ہیں وہ اِس قدر کافی ہیں کہ اُن پر اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ تاہم میں اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری اُردو زبان کو مولنا ممدوح کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اِس میں منطق جیسے علم کی ایک ایسی شگفتہ اور سلیس کتاب تصنیف فرمائی۔ عام لوگوں کا یہ خیال ہے اور خود مولنا کی بھی یہی رائے ہے کہ اُردو زبان ابھی اِس کی متحمل نہیں کہ اُس میں کوئی علمی تصنیف کی جائے۔ لیکن میرے نزدیک مبادی الحکمۃ دیکھ کر لوگوں کو اپنا خیال واپس لے لینا چاہیے۔ کیوں کہ اوّل تو اُردو زبان میں حسنِ اتّفاق سے اِس قسم

کی قدرت موجود ہی کہ اُس میں ہر طرح کی علمی تصنیف بخوبی ہو سکتی ہی۔ بشرطے کہ مصنف میں تصنیف کی لیاقت ہو اور وہ اُردو زبان پر ایسی ہی قدرت رکھتا ہو جیسی قدرتِ کاملہ مبادی الحکمۃ کے مصنّف کو حاصل ہی۔

اِس قسم کی کتاب کی ضرورۃ کو خود مولانا نے بھی محسوس کیا تھا اور واقعی اُردو زبان میں منطقی رسائل کی اشدّ ضرورۃ تھی۔ چناں چہ ایک جگہ فرماتے ہیں "غرض اب وہ وقت آپہنچا اور وہ زمانہ آگیا کہ مشکل سے مشکل مضمون اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب پر بھی ہم اپنی ہی زبان میں مباحثہ اور مناظرہ کرتے رہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں زبان اُردو منطق کی حاجت مند نہیں۔ نہیں سخت حاجت مند ہی۔ دعوے کا اثبات۔ حق کا مطالبہ۔ استحقاق کی حفاظت۔ دلیل کی استواری۔ مطلب کی تائید۔ اعتراض کی تردید۔ الزام کا دفعیہ۔ فریب کی پردہ دری۔ مغالطے کا افشا۔ حتّی کہ احقاقِ حق و ابطالِ باطل منطق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہی حاجت دیکھ کر میں نے اِس رسالہ اُردو میں ضروری مسائل علمِ منطق جمع کیے۔ باتیں وہی ہیں جو قطبی اور اُس سے فروتر کتابوں میں ہیں۔ طرزِ ادا میرا ہی۔ اور ایک انگریزی رسالہ منطق جناب فضل العلما ایم کیسن صاحب بہادر دام اقبالہم نے عنایت فرمایا تھا کچھ اس سے اخذ کر لیا ہی۔ یوں عربی اور انگریزی مل کر ایک شانِ خاص پیدا ہو گئی ہی۔ خدا کرے کہ ناظرین کو پسند اور سُود مند ہو"

نمونہ مبادی الحکمۃ مولانا کی اَور تصانیف کی طرح ہم نے ارادہ کیا کہ اِس کا نمونہ بھی دکھائیں۔ چناں چہ نمونے کے انتخاب کے لیئے ہم نے دوبارہ مبادی الحکمۃ کو پڑھا۔ مگر اوّل سے آخر تک ہم کو کوئی مضمون ایسا نہیں ملا کہ جس کے مونہ میں دوسرے مضمون کی دُم نہ دبی ہو۔ یعنی ایک مضمون کا سلسلہ اور ربط دوسرے مضمون سے نہ ہو۔ تاہم ہمارا دل نہیں مانتا کہ بغیر اقتباس کے اِس کتاب کو چھوڑ دیں اور وہ صرف اِس لیئے کہ ناظرین کو دکھائیں کہ علمی کتابوں کی تصنیف میں مولانا کا قلم کس قدر شگفتہ ہی۔ چناں چہ مولانا حدِ اوسط کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔

"حدِّ اوسط کی نسبت تھوڑا سا تذکرہ مزید مناسب معلوم ہوتا ہی۔ قیاس کے دُو مقدموں میں حدِ اوسط کا مکرّر ہونا انتاج[1] کے لیئے شرطِ اعظم ہی۔ اِس میں کبھی کبھی مغالطہ بھی واقع ہوا کرتا ہی۔ اور اِس کی وجہ یہ ہوتی ہی کہ بادی النظر میں تو حدِ اوسط مکرر معلوم ہوتی ہی جو لفظ صُغریٰ میں ہی وہی کُبریٰ میں ہی۔ مگر ایک میں اُس لفظ کے حقیقی معنے مراد ہوتے ہیں دوسرے میں مجازی یا ایک میں لغوی دوسرے میں منقول۔ یا یہ کہ وہ لفظ مشترک ہی ایک میں کچھ دوسرے میں کچھ۔ مقولاتِ شعرا تمام تر اِسی طرح کے مغالطات سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً ؎

کن درازانہ سازی طول اندک عرض من بشنو
کہ این را قصرے نامند باید مختصر کردن

کہ شاعر اپنے مخاطب کو تقلیلِ عبارت کی رائے دیتا ہی اور اُس کی دلیل یہ بیان کرتا ہی کہ یہ قصر ہی اور جتنے قصر ہیں اُن کو اختصار لازم۔ نتیجہ یہ ہی کہ اِس عبارت کو اختصار لازم ہی۔ یہاں لفظِ قصر منشا مغالطہ ہی۔ کہ اُس کے معنے لغوی بے شک کم کرنے کے ہیں۔ مسافر کا قصر۔ صلوٰۃ کا قصر۔ بالوں کا قصر۔ بلکہ قصور بمعنے خطا بھی اِسی مادّے سے ہیں لیکن قصر کے دوسرے

[1] انتاج یعنے نتیجہ دینا ۱۲۔

معنے حویلی اور محل کے بھی ہیں - پس لفظِ قصر مشترک ہوا۔ صغریٰ میں ایک معنے مراد لیئے اور کبریٰ میں دوسرے - یا مثلاً ؂

گر اب کے پھرے شیخ جی کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے ٭

پھرنا مراجعت اور واپس آنا - ایک معنی تو یہ ہیں - اور ایک چیز سے بدعقیدہ ہونا دوسرے معنی یہ ہیں اور اللہ کے گھر سے پھرنا مہلکے سے نجات پاکر سلامت نکل آنا تیسرے معنی یہ ہیں - یا مثلاً ؂

ہوس میں کعبے کے کیوں شیخ بت خانے سے گمرہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

اللہ ہی اللہ ہے - دو محاوروں میں مستعمل ہوتا ہے - یا یہ کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں - دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں"

موعظۂ حسنہ یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ مولانا کے خطوط ہیں جو ۱۸۹۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہم کو مولوی سید عبدالغفور صاحب شہباز مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرنی چاہیئے کہ اُن کی وجہ سے یہ خطوط کتاب کی صورت میں آگئے ایک زمانے میں مولوی بشیرالدین احمد صاحب اپنے والدِ بزرگوار سے الگ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ مرحوم شہباز مولوی بشیرالدین احمد صاحب کے بڑے دوست تھے مولانا جو مراسلت کرتے تھے - میاں بشیر اُس کو جمع کرتے جاتے تھے اتفاق سے مرحوم شہباز اپنے دوست سے دہلی ملنے گئے - وہاں دونوں کی صلاح سے یہ بات ٹھہری کہ کیا اچھا ہو کہ یہ خطوط ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دیئے جائیں چناں چہ ذاتی اور نج کی باتیں نکال کر یہ خطوط ایک کتاب کے پیرایہ میں شائع کیئے گئے - اور اِس طرح اِن خطوط کے مجموعے سے ہمارے مولانا کی تصانیف میں ایک بہتر اضافہ ہو گیا شہباز مرحوم موعظۂ حسنہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "جناب مولوی نذیراحمد خاں صاحب سے میری ذاتی شناسائی مطلق نہیں مگر جس تفصیل سے میں اُن کو جانتا ہوں اُن کے دوست آشنا تو خیر اُن کے قریب کے رشتہ دار بھی آتا ہی جانتے ہوں گے - لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً[1] اِس کا سبب یہ ہے کہ مجھ کو الولد سر لابیہ[2] - چھوٹے سکیل کے مولوی نذیراحمد یعنی اُن کے فرزند یگانہ مولوی بشیرالدین احمد صاحب کے ساتھ اِس درجے کی مخالطت رہی ہے کہ ہم دونوں ایک روح دو قالب تھے اور اب سوءِ اتفاق سے مخالطت نہیں ہے تو مستقل اور متواتر مراسلت ہے ایسی کہ المکتوب نصف الملاقات کے حساب سے اب بھی ہم دونوں کسی وقت ایک دوسرے سے جدا نہیں میں نے جناب مولوی نذیراحمد صاحب کی تمام مصنفات کو بالاستیعاب دیکھا ہے نہ ایک دفعہ بلکہ بار بار ع ہی المسک ما کررتہ یتضوع[3] - جب کہ جناب مولوی نذیراحمد صاحب کے مصنفات . . . . گورنمنٹ نے منظور کر کے اُن کو ہزار ہا روپے انعام کے دیئے ہوں - جب کہ جناب مولوی نذیراحمد صاحب کے مصنفات اِس درجہ مقبولِ خلائق ہوں کہ وار نہیں آنے پاتا اور ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ بعض کتابوں کی قریب قریب لاکھ جلدیں چھپ چکی ہیں جب کہ جناب مولوی نذیراحمد صاحب

[1] اگر حجاب اُٹھا دیا جائے جب بھی یقین میں کچھ افزائش نہ ہو - یعنی یقین مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا - یہ قول ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کمالِ عرفان میں

[2] بیٹا اپنے باپ کا بھید ہے یعنی مظہرِ صفاتِ باطنی [3] یہ مشک ہے جتنی دفعہ مکرر سہ کرر دیکھو خوشبو پھوٹتی جاتی ہے ۱۲

کے مصنفات ۔ بھاکا ۔ مرہٹی ۔ گجراتی ۔ بنگالی ۔ کشمیری ۔ اور سب سے بڑھ کر انگریزی میں ترجمہ ہو گئے ہوں اور جب کہ اُن کی
ایک کتاب توبۃ النصوح داخلِ امتحان سول سروس ہو ۔ تو کفیٰ بہ فخراً یعنی جب کہ مولوی نذیر احمد صاحب کی اعلیٰ لیاقت اور
پاکیزگی تحریر اور راستی خیالات پر جمِ غفیر نے اجماع کر لیا ہو تو میں اپنی رائے کا اظہار کرنا تحصیلِ حاصل بلکہ ایک طرح کی شوخی سمجھتا ہوں
.... سابق دکن میں ایک نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم خود مردمیٔ مجسم و مردم شناس تھے اُن کا یہ حال تھا کہ جناب مولوی
مہدی علی صاحب کے نام جو خطوط مولانا کے جاتے بالالتزام اُن کو بار بار مزے لے لے کر پڑھتے اور حسنِ تحریر کی داد دیتے ۔ خیر
نواب سر سالار جنگ بہادر کو تو مولانا کے دماغ پر رشک[1] تھا مجھ کو اُن کی تحریرات سے عشق ہے ۔ جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب
کی کتابیں ۔ ہندو ۔ مسلمان ۔ عیسائی ۔ یہودی ۔ پارسی ۔ ہر قوم و ملت کے لوگوں نے پڑھی ہوں گی مگر یہ میرا ہی حصہ تھا کہ
مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنے والد کے خطوط مجھ کو دکھایا کرتے تھے اور میں اُن کو نقل کر لیتا خطوط میں اکثر خانگی
حالات تھے اور بہت میں مباحثِ علمی جو جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب سبقاً سبقاً لکھ کر بھیجتے تھے ۔ حذف و اسقاط
ضروری کے بعد جو کچھ بچا وہ یہ کتاب ہے جو پیش کش ناظرین کی جاتی ہے ۔ اس کے چھپوانے سے لوگوں کو یہ دکھلانا منظور ہے
کہ ایک لائق باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو کس طرح پر تعلیم و تربیت کرتا ہے ۔ شغف تو اس درجے کا ہے کہ سوتے جاگتے سفر میں
حضر میں ۔ فرصت میں اشتغال میں ہر حال میں بیٹے کا تصور نصب العین ہے گویا دنیا عبارت ہے اِسی ایک وجود سے مگر تعلیم میں
بھی اس بلا کا اہتمام ہے کہ علم ایک لقمہ ہو تو کھلا دیں یا تعویذ ہو تو گھول کر پلا دیں ۔ میں ناظرینِ کتاب کو جناب مولوی نذیر احمد
خاں صاحب کا نمونہ دکھلا کر اولاً نفسِ تعلیم اور ثانیاً اُس خاص طرح کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کا زمانہ حال
مقتضی ہے ۔ مقصدِ اصلی تو یہ ہے اور اگر کوئی طرزِ تحریر اور طریقۂ ادائے مطلب سے استفادہ کرے تو نور و کھن میں ۔ غرۂ جنوری ۱۸۸ ء
اِس کتاب پر دی آنریبل نواب سید محمد خاں بہادر انسپکٹر جنرل رجسٹریشن صوبہ بنگال نے بھی قابلِ ذکر ریویو کیا ہے مگر بخوفِ
طوالت اُسے نظر انداز کیا گیا ۔ البتہ شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا ریویو مختصر ہونے کی وجہ سے
ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

"اُس کتاب کو جو ابھی چھپ کر مشتہر ہوئی ہے میں نے دیکھا ہندوستان کے خاندانوں اور اُن کے نوجوانوں کی سقیم
حالت دیکھ کر ایسی تصنیفات کا پھیلانا جزوِ مصلحت ہے ۔ اِس لیئے قلمِ آزاد پر واجب ہوا کہ اپنا فرض ادا کرے ۔ یہ ایک
فاضل سن رسیدہ مصنف کے خط ہیں جس نے کاروبارِ زمانہ کو ہر حال میں دیکھا اور سمجھ کر دیکھا ۔ برتا اور سمجھ کر برتا ۔ اِن میں عبارت
آرائی یا ترتیبِ انشاء کے لیئے فرضی مطالب کو فقروں میں نہیں ڈھالا ۔ اصلی خط ہیں کہ پیارے باپ نے پیارے فرزند کو سچی ضرورتوں
اور واقعی مواقع پر بے تکلف عبارت میں کھلے دل سے تحریر کیئے ہیں جو کہ وقت بہ وقت اور روز بروز حالتِ عنفوان میں
ہر ایک شریف خاندان کو پیش آتے ہیں ۔ اِس واسطے نوخیز جوانوں کے لیئے نسخہ ہے ۔ تقویتِ دماغ ۔ پرورشِ عقل اور ورزشِ
فکر کا ۔"

فاضل مصنف عالم تجربہ کار طبیب اور زمانہ کا عمدہ نبض شناس ہے ۔ دیکھتا ہوں کہ جس طرح نو رفتار بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتا

[1] ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے فرمایا تھا کہ مجھ کو ساری عمر میں اگر رشک ہوا ہے تو مولوی نذیر احمد کے دماغ پر ۔"

سکھاتے ہیں وہ اپنے نو فہم ناز پروردہ کو مسافتِ فکری میں چلنا سکھا رہا ہی۔ اس میں قدم قدم پر کہیں روکتا ہی مگر حکمتِ عملی کے ساتھ کہیں بڑھاتا ہی مگر ذوق و شوق بڑھا کر۔ کہیں ہٹاتا ہی مگر خوش نما مصلحت دکھا کر اور بچے کو نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی عامل مجھ پر میری خواہش بلحالتِ موجودہ کے مخالف عمل چاہتا ہی۔ یہ ہدایتیں زیادہ تعلیم طریقِ تعلیم۔ سلسلۂ تعلیم یا تضیات اوقات اور کہیں کہیں مسائلِ علمی پر بھی مشتمل ہیں۔ اکثر اعمال و اطوار اخلاق پر موثر ہیں۔ اکثر تدبیر المنزل یعنی گھر والوں کے لیے گھر کے کاروبار میں انتظام اور اصلاحیں ہیں۔ انھیں معمولی لوگوں کی طرح دلیلیں لکھ کر ثابت نہیں کیا۔ فقط طرزِ بیان اور انداز ادا دلوں سے تسلیم اور قبول حاصل کرے گا۔"

نوجوان لڑکے یا بصیرت طالب انسان کو راہِ زندگی میں بہت نشیب و فراز پیش آتے ہیں اور سوچتا رہ جاتا ہی کہ کیا کرے کہیں پھیر کھاتا ہی اور کہیں ٹھوکر کھاتا ہی۔ یہ مجموعہ اُسے مواقعِ مذکورہ سے ہاتھ پکڑ کر نکال لے جائے گا۔ اللہ اللہ ایک دن وہ تھا کہ آزاد۔ بہ مقتضائے سن خود ایسے رہ نما کا محتاج تھا۔ آج سب منزلیں طے ہو گئیں لیکن پھر محتاج کا محتاج ہے۔

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم *	نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش *

دیگر

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسبِ حال *	دیکھے تماشے میں نے جو ملکِ وجود کے *
اک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے	پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے * *
اب حال یہ ہی عالمِ پیری میں اسے ظفر *	باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے *

جامع خطوط نے نظم میں ایک بے نظیر اور جامع تقریظ لکھی ہی۔ ہم بہ طور یادگار وہ نظم یہاں نقل کرتے ہیں ہمارے نزدیک موعظۂ حسنہ وہ ایک قیمتی آئینہ ہی جس میں اس کے خال و خط صاف صاف نظر آتے ہیں۔

ہو جو تصنیف تو ایسی ہو کہ اِک دھوم ہی آج *	ہی سرِ اوج پہ شہرت کا چمکتا ہوا تاج * *
نہیں یہ لوح فصاحت کا ہی چینی ارژنگ	نہیں یہ لوح بلاغت کا ہی رومی دیباج
کیوں نہ ہو اُس کے یہ خط ہیں جیسے فرہنگِ فرنگ	کیوں نہ ہو۔ اُس کے یہ خط ہیں جیسے ہی ملک کی لاج
اُس کے خط ہیں جیسے معلوم علوم اور فنون *	اُس کے خط ہیں جیسے محفوظ رسوم اور رواج
اُس کے خط ہیں جیسے مشرق میں ہی مغرب کی سمجھ	اُس کے خط ہیں جیسے دہلی میں ہو لندن کا مزاج
اُس کے خط ہیں جو ہی امراضِ دماغی کا طبیب	اُس کے خط ہیں جیسے معلوم ہی خاطر کا علاج
اُس کے خط ہیں جیسے ہی کشورِ شہرۃ میں عروج	اُس کے خط ہیں جیسے ہی عالمِ تصنیف میں راج
اُس کے خط ہیں جو ہی اقلیمِ معانی کا امیر	اُس کے خط ہیں جیسے دیتا ہی سخن باج و خراج
اُس کے خط ہیں کہ ہیں سب جس کے سخن کے خواہاں	اُس کے خط ہیں کہ ہیں سب جس کے قلم کے محتاج
اُس کے ہیں خط ہی زباں جس کی بلاغت معجز	اُس کے ہیں خط ہی جیسے عقل کی حاصل معراج
اُس کے خط ہیں جیسے تالیف ہی خرما و ثواب *	اُس کے خط ہیں جیسے تصنیف ہی اک پختہ دو کاج

اُس کے ہیں خط کہ جو ہی بہر دُکی دودہ میں کھانڈ
اُس کے ہیں خط کہ جو ہی بہر غبی کوڑہ میں کھاج

اُس کے خط میں ہی اثر جس کو کبوتر کی جگہ
وہ کبوتر ہی فصاحت جسے شہپر کی جگہ

ہیں یہ خط اُس کے بھلے کو جو ہی پروردۂ ناز +
دانش آموز تھا جب مدرسۂ دہلی میں +
جب کہ بہکاتی تھی نا تجربہ کاری اُس کو +
ہارتی تھی کبھی ہمّت جو طبیعت اُس کی
کبھی انداز سے بڑہتا تھا قدم گر باہر
جُھکتا اسفل کی طرف تھا جو کبھی مرغِ نظر
ساحلِ علم پہ ہوتی تھی اگر تشنہ لبی + +
کبھی شوق اُس کا بڑھا دیتا تھا ذوقِ تسوید
کبھی تھی باغِ مضامیں میں اُسے نزہتِ فارس
کبھی تدبیر میں دنیا کی وہ ہوتا مصروف
کبھی لندن میں وہ کرتا تھا خیالی گل گشت +
کبھی آزادی سے ادیان پہ دیتا تھا وہ رائے +

باپ کا لختِ جگر۔ نورِ نظر۔ عمر دراز +
شفقت تھی اُسے لکھتی یہ خطِ روح نواز
تجربہ بڑھ کے بتاتا تھا نشیب اور فراز
کرتی تنبیہ تھی دروازۂ ناکامی باز + +
ادب آتا تھا بتانے اُسے حسنِ انداز +
عرشِ اعلیٰ کی سُجھاتا تھا خرد کا شہباز +
گھول کر خضر پلا جاتے تھے اِک دفترِ راز +
کبھی ذوق اُس کو بنا دیتا تھا انشا پرداز +
کبھی تھی بیتِ معانی میں اُسے سیرِ حجاز
کبھی تعمیر کو عقبیٰ کی وہ کرتا آغاز +
کبھی دہلی میں وہ کرتا تھا خیالِ شیراز
کبھی دین داری سے مسجد میں وہ پڑھتا تھا نماز

الغرض اس میں بدولت انھیں مکتوبوں کی +
آگئیں آن میں ساری صفتیں خوبوں کی +

جانتے ہیں اُسے جو لوگ کہ ہیں رمز شناس
اِس کی تعلیم ہی تعلیمِ اتالیقِ شفیق + +
اِس کے پڑھ لینے سے جاتی ہی نہیں علم کی بھوک
نہ ہو نزدیک تو کچھ دور نہیں عمر کی قدر +
یہ بڑھائے تو ہمیشہ رہے بڑھتا ہوا دل +
ہی کبھی اجر کی تحریص سے تلقینِ شکیب
اِس سے عادات کی اصلاح ہی بے عدّ و شمار
اِس سے ناداں میں حکیموں کی ہی پیدا خو بُو +
یہ وہ ہی نخلِ عسل ریز ہی نا چیز درخت
نہیں حکمت پہ یہ ہی موجبِ تصحیحِ نظر

نہیں مکتوب یہ ہی دفترِ تعلیم اساس
اِس کی تادیب ادب آموزیوں میں فرسٹ کلاس
اِس کے سُن لینے سے بجھتی ہی نہیں علم کی پیاس
پاس یہ ہو تو بس آسان ہی اوقات کا پاس
یہ بندھائے تو ہمیشہ رہے بندھتی ہوئی آس
کبھی تشویقِ زیادت سے ہی تعلیمِ سپاس
اِس سے اخلاق کی تہذیب ہی بے عدّ و قیاس
اِس سے انساں میں فرشتوں کی ہی ظاہر بُو باس
یہ وہ آہو ہی کہ ہی مشک فشاں سوکھی گھاس
نہیں منطق پہ یہ ہی باعثِ اصلاحِ قیاس

جب کیا ہی کبھی تلخیِ نصیحت نے ترش + گھول دی ہی وہیں شوخیِ عبارت نے مٹھاس
اس کی جتنی ہی نصیحت وہ ہی مصری کی ڈلی + اس کی جتنی ہی نصیحت وہ ہی شربت کا گلاس

پند ہی ایک بھرے اس میں مزے قند کے ہیں
لطف ہر پند میں لقمان کے صد پند کے ہیں

ہی یہی نامۂ و پیغامِ نصیحت فرجام + ہی یہی موعظۂ موردِ تحسینِ انام + +
ضبطِ خوبی سے اسی میں ہیں اصولِ ترغیب + شوق افزائی میں ہر جا ہی اسی کو ابرام +
کہیں بدشوقوں سے یہ یاد کراتی ہی سبق + بدزبانوں کے کبھی موٗنھ میں یہ دیتی ہی لگام
سنگ ریزوں سے مٹاتی ہی کہیں یہ لکنت + لاتی پوڈر[51] سے کہیں ہی یہ شفا کا پیغام +
کہیں کرتی ہی گھڑی بن کے یہ حفظِ اوقات + بن کے عینک یہ دکھاتی ہی کہیں چرخ کا بام
کہیں گفتار کی تلقین میں ہی بلبلِ باغ + کہیں رفتار کی تعلیم میں ہی کبکِ خرام +
کبھی ہی مشغلۂ صرف میں یہ مالینیک[52] + کبھی ہی مرحلۂ نحو میں توضیحِ مرام[53] + +
کبھی ہی دفترِ انگریزی میں یہ حیلۂ رزق + کبھی ہی عسکرِ تازی میں شعارِ اسلام +
آئے جب ذکرِ حدِ علم سر آئزک نیوٹن[54] + لائیں جب اگلے زمانے کے صحف ابن سلام[55]
ہی بیاہوں کے لیئے یہ کہیں شادی کا نباہ + بن بیاہوں کے لیئے ہی کہیں شادی کا پیام
کبھی تقدیر سے دیتی ہی یہ تدبیر کو زک + کبھی تدبیر سے لیتی ہی یہ تقدیر کا کام +
اس کو فرصت میں بھی ہر لمحہ خیالِ اشغال + اس کو محنت میں بھی ہر لحظہ لحاظِ آرام +

گہ حرکت میں ہی سکوں گہ یہ سکوں میں حرکت
گہ سکوں میں ہی سکوں گہ حرکت میں برکت

اب ہم موعظۂ حسنہ میں سے دو چار خط نقل کرکے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو اس امر کا اندازہ ہو کہ ایک لائق باپ اپنے بیٹے کو دور بیٹھے بیٹھے صرف مراسلت کے ذریعے سے کیوں کر اعلیٰ درجے کی تعلیم دے سکتا ہی مولنا نذیر احمد صاحب اعظم گڑھ میں ہیں اور ہمارے دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب دہلی کے مدرسے میں طالبِ علم باپ نے اپنے بیٹے کو جو خط لکھا ہی وہ اس طرح شروع کیا ہی -

---

[51] گوا پوڈر کی طرف اشارہ ہی جس کا بعض مکتوب میں ذکر ہی ۱۲
[52] مالینیک فی الصرف سے مراد ہی ۱۲
[53] توضیح المرام مولوی علی احمد صاحب برادر مولنا نذیر احمد صاحب جس کا ذکر ہو چکا ہی ۱۲
[54] انگلستان کے ایک مشہور متبحر حکیم کا نام ۱۲
[55] عبداللہ بن سلام سے عبارت ہی جو یہود کے بڑے عالم تھے اور مشرف با اسلام ہوئے ۱۲ -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خط نمبر ۱

نورچشما ادام اللہ عمرہ[1] و آتاہ اللہ نصیباً وافراً و حظاً متکاثراً من العلوم الجدیدۃ[2] المفیدۃ +

خدا کا شکر ہے کہ میں بدھ کے دن ۵ - جنوری کو سفر سے پہلے اپنے مقام پر پہنچ گیا[3] - جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ تم وہیں رہ گئے تو عملے اور نوکر اور پیادے اور نذکوری سب کے سب افسردہ خاطر ہوئے - تم سے لوگ بہت مانوس تھے اور تمہارے ساتھ نہ رہنے سے لشکر[4] سُونا[5] معلوم ہوتا ہے - جب غیروں کا یہ حال ہو تو میرے دل کی کیفیت کا خدا کو علم ہے - میں نے نہایت مجبور ہو کر تم کو جدا کیا ہے اس واسطے کہ وقت[6] نکلا جاتا تھا اور تمہاری انگریزی بدون مدرسے کے درست نہیں ہو سکتی تھی - خداوند کریم تمہارا حافظ اور نگہبان ہے -

بشیر! خدا کے لیے اب پورا پورا شوق کرو - دو تین برس کی محنت ہے - بڑا مرحلہ[7] انٹرنس[8] کا ہے - اگر تم اس میں کامیاب ہوئے تو یہ کامیابی اگلے امتحانوں میں تمہاری مددگار ہوگی علم تو سب طرح کے ہیں اور طالب علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ کرے لیکن سب پر مقدم ادب[9] ہے جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں یعنی زبان دانی - کمال زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہو اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان والوں کی عبارتیں یاد ہوں جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرائے میں اہل زبان نے ادا کیا ہے اس کی تقلید[10] اور اس کی نقل کرنی چاہیے - غرض زبان دانی کے لیے یادداشت شرط ہے - محاورات اور امثال[11] و حکایات اور نظم اور جملوں کا استعمال جن کو تم پریپوزیشن[12] کہتے ہو سب پیش نظر رہیں - جس تحقیق سے تم مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادہ اور ماخذ[13] اور صیغہ[14] اور ترکیب[15] کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی یہی تحقیق فارسی اور انگریزی کل زبانوں میں ہے - جب کسی کتاب کا سبق لے کر بیٹھو تو لفظ لفظ پر نظر کرتے جاؤ - جب اس انضباط سے دو چار کتابیں نکلیں اچھی خاصی استعداد ہو جائے گی - زمانِ طالب العلمی میں ادب عربی کے متعلق

---

[1] اس کی عمر دراز ہو اور خدا اس کو مفید نئے علوم سے ایک بہت بڑا حصہ عنایت فرمائے - ضمیر غائب سے مخاطب مراد ہے [2] علوم جدیدہ سے ریاضی کے تمام شعبے ہندسہ - جر ثقیل انجنیرنگ اور علم کیمیا اور علم فلاحت اور علم طبیعات اور علم طبقات الارض اور علم مناظرہ اور علم نباتات اور علم مقناطیس اور علم قوت برقی وغیرہ مراد ہیں جو یورپ میں پورے طور پر پڑھے پڑھائے جاتے ہیں اور یورپ کی تمام ترقی اور تہذیب اور خوش حالی اور ہنرمندی اور صناعی اور ایجاد حتی السلطنۃ ان علوم کی وجہ سے ہے ان کو جدید اس سے کہا جاتا ہے کہ بعض شعبے ڈیڑھ دو سو برس کے اندر اندر ابتداءً اہل یورپ نے دریافت کیے یا دریافت نہیں کیے تو ان میں اس قدر ترقی کی اور کر رہے ہیں کہ گویا علوم جدید ہیں - خط ۹۵ میں بھی علوم جدیدہ سے بحث کی گئی ہے - جن کو خدا نے معاش کی عقل سلیم دی ہے وہ علوم جدیدہ کے ایسے قدرشناس ہیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے خدا سے ان کے حصول کی دعا کرتے ہیں - میں کہتا ہوں آمین - اور خدا دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسی توفیق دے تاکہ مسلمانوں سے نکبتِ افلاس دور ہو [3] مولوی نذیر احمد خاں صاحب ہمیشہ بیٹے کو ساتھ رکھتے تھے اور خود پڑھاتے تھے اب بڑے دن کی چھٹی میں دو روز رہ کر بیٹے کو لے جا کر دہلی کے مدرسے میں داخل کرا آئے [4] جو لوگ کسی حاکم کے ساتھ دورے میں ہوں عملے نوکر چاکر حشم و خدم اہل مقدمات سب کے مجموعے کو لشکر سے تعبیر کیا جاتا ہے [5] بواو معروف اداس [6] یعنی تحصیل علم کا وقت [7] بڑی بھاری منزل [8] انٹرنس یعنی داخلہ کا امتحان جس کے یہ معنی ہیں کہ آدمی یہ امتحان دینے سے زمرۂ طلبگاران علم میں داخل ہو جاتا ہے نہ گروہ علما میں [9] ادب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آداب مجلس میں سے ادب عظیم گویائی ہے [10] پیروی [11] کہاوتیں [12] حروف روابط [13] جہاں سے کوئی لفظ نکلا ہو جیسے مصدر [14] یہ صرف ہے [15] یہ نحو سے متعلق ہے -

مجھ کو دیوانِ متنبی، سبعۂ معلقہ، تاریخ یمینی کے اکثر حصے اور مقاماتِ حریری کے متعدد مقامے اور دیوانِ حماسہ کے بیشتر مقامات اور قرآن کی بہت سورتیں یاد تھیں۔ خلاصہ یہ ہی کہ ہر زبان میں اہلِ زبان کی بولی سند ہی۔ جس کو جتنا یاد ہی اُسی قدر علمِ ادب میں اُس کی استعداد۔ سوائے زبان دانی دوسرا کوئی علم نہیں جس میں آدمی ساری عمر مشغول رہے۔ یہی سبب ادب کی بڑی قدر ہی۔ اگر ادب اچھا ہی تو ممتحن دوسرے علوم کی خامی سے بھی درگزر کر جاتے ہیں۔ پچھلے سال ہائی کورٹ[1] کے امتحان میں ایک بنگالی اول رہا۔ اگرچہ اُس کے قانونی جواب سُنا ہی کہ بہت عمدہ نہ تھے مگر وہ تقریراً تحریراً انگریزی کا بڑا ادیب تھا۔

زبان دانی کی استعداد بے شک کتابوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہی مگر اہلِ زبان سے گفت وگو کرنا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہی اسی واسطے میں نے تم کو مدرسے میں چھوڑا ہی۔ جہاں تک ہو سکے بری بھلی۔ غلط صحیح۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنی چاہیئے۔ تمھاری جماعت[2] میں شاید اکثر کو انگریزی بولنے کی مہارۃ نہ ہو تو تم اونچی کلاس[3] کے لڑکوں سے تعارف پیدا کرو اور ہر روز تین چار گھنٹے انگریزی میں بات چیت کرو تاکہ جھجک اور رکاوٹ دور ہو۔ تمھارے ماسٹر[4] ہندوستانی یا انگریز جو ہوں اُن سے اُردو میں ایک لفظ مت کہو۔ لیین[5] صاحب کی میم سے تجدید تعارف کرو۔ غرض جو ذریعہ انگریزی گفت وگو کا ہو حاصل کرو۔ انگریزی بول چال کے اعتبار سے اوّل یوروپین[6] لیڈی۔ پھر یوروپین[7] جنٹلمین۔ پھر یوریشین[8] لیڈی۔ پھر یوریشین[9] جنٹلمین۔ پھر سب سے آخر میں آخور کی بھرتی[10] ایرے غیرے[11] پنچ کلیان[12] بنگالی بابو اور تمام انگریزی دان نیٹو[13] بشیرا۔ انگریزی گفت وگو کی ضرورۃ اِس درجے کی ہی کہ میں اُس کے ظاہر کرنے کے لیئے الفاظ نہیں پاتا۔ تم سمجھو کہ تمھارے کالج[14] میں داخل ہونے سے مقصودِ اصلی یہی ہی اور بس۔ اگر تم کو انگریزی میں گفت وگو اور اُس کا بے تکلف لکھنا آجائے تو تم گھر بیٹھ کر ام اے تک کا امتحان دے سکتے ہو۔

انگریزی مسودہ[15] ہر روز لکھنا چاہیئے۔ مجھ کو ہمیشہ انگریزی میں خط لکھو اور چوں کہ راز کی باتیں نہیں ہوتی کسی ماسٹر یا کسی اونچی کلاس کے لڑکے یا کسی متعارف سے اُس کو درست کرا لیا کرو۔ ایک کتاب انگریزی کمپوزیشن کی بنا لو جس میں اپنا کمپوزیشن تاریخ وار لکھ کر اُس میں سُرخی سے اصلاح لے لیا کرو اور اصلاح کو بہ نظرِ غور دیکھ کر یاد رکھو کہ پھر ویسی غلطی نہ ہو۔

میں نے سُنا ہی کہ تمھارے مدرسے میں ... ماسٹر ہیں اور وہ انگریزی کے بڑے ادیب ہیں۔ اُن سے تعارف پیدا کرو۔ ادب[16] اور انکسار کافی ذریعہ لوگوں سے تعارف پیدا کرنے کا ہی۔ اگرچہ تم ابھی اجنبی ہو لیکن جب لوگ دیکھیں گے کہ تم پڑھنے کا شوق رکھتے ہو۔ امتحان

---

۱ عدالتِ عالیہ جس سے اونچی ہندوستان میں کوئی عدالت نہیں ۲ جماعۃ ۳ [illegible] ۴ استاد ۵ لیین صاحب ۱۸۵۷ء کے غدر میں علاقہ پرمٹ کے عہدہ دار تھے غالباً اسسٹنٹ سرول ان کی میم غدر سے چند روز پہلے اپنے عزیزوں سے ملنے دہلی آئیں اور گھر گئیں مولوی نذیر احمد صاحب اور ان کی سسرال کے لوگوں نے ان میم صاحب کو بے سابقہ معرفت اپنے گھر میں پناہ دی اور عین شورش غدر میں انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا سرکار نے اس خیر خواہی کی بڑی تحسین اور قدر دانی کی تو مولوی نذیر احمد صاحب بیٹے کو لکھتے ہیں کہ ان میم صاحب کے ساتھ تمھاری اگلی جان پہچان ہی اس کو تازہ کرو تاکہ تم کو انگریزی بولنے کا موقع ملے مسٹر لیین اور ان کی میم دونوں میاں بی بی ہنوز زندہ ہیں ۶ ولایتی میم ۷ ولایتی صاحب ۸ ہندوستانی میم ۹ ہندوستانی صاحب ۱۰ مال روی۔ ۱۱ اسکے دھکے جیسے زبان فارسی میں فلاں بہمان ۱۲ اصل میں وہ گھوڑا جس کے چاروں ہاتھ پاؤں اور ماتھا سفید ہوں جس کو عربی میں اغر محجّل کہتے ہیں یہاں مراد ہی ہر قسم کے لوگ جن میں کسی طرح کی تحقیق نہیں جیسے پنچ کلیان گھوڑے میں سفیدی کے لیئے کسی عضو کی تخصیص نہیں کہ ہاتھ پاؤں ماتھا سبھی جگہ سفیدی موجود ہی ۱۳ ہندوستانی دیسی ۱۴ اعلیٰ درجے کا مدرسہ جس میں غالباً بی۔ اے۔ اور ام۔ اے۔ اور بی ایل کے درجوں تک پڑھائی ہوتی ہی ۱۵ تسوید۔ مسودہ۔ عبارت نویسی ۱۶ یہاں ادب سے اپنے بڑے کی تعظیم مراد ہی ۱۲

تمہارے اچھے ہوتے ہیں اور اُستادوں کا ادب تم کو ملحوظ رہتا ہی۔ کسی سے لڑتے بھڑتے جھگڑتے نہیں۔ اور نالائق لڑکوں سے الگ تھلگ رہتے ہو تو ماسٹر لوگ خود بخود تم پر مہربانی کرنے لگیں گے +

تم کو شروع سے اخیر تک کوئی سکنڈ لینگویج اختیار کرنی پڑے گی یعنی انگریزی کے علاوہ دوسری زبان عربی سنسکرت یا فارسی۔ سو فارسی کلاس[1] کی مشکل نہیں ہی۔ چار و ناچار عربی لینی ہوگی اور تم کو عربی میں اتنا درک ہی اگر تھوڑی توجہ جاری رکھو تو کافی ہو ورنہ چندروز میں جو کچھ پڑھا ہی سب جاتا رہے گا۔ عربی ہمارا شعار[2] قومی ہی میرے نزدیک ہر مسلمان پر عربی کا سیکھنا فرض ہی۔ اگر تمہاری کلاس میں فارسی کا کورس[3] ہی وہ بھی کام کی چیز ہی کیوں کہ تم فارسی مطلق نہیں جانتے۔ اُس کو بھی پڑھو لیکن عربی سے غفلت مت کرو۔ عربی عمدہ چیز ہی اور اُس کا پڑھنا بہت ہی نافع ہی۔ فارسی کورس کو بھی بہ نظرِ تحقیق پڑھنا چاہیئے۔ ہر ہر لفظ میں بال کی کھال نکال لیا کرو۔ مادہ اور صیغہ اور ترکیب اور معنی اور مطلب۔

روز کا کام روز کرنا ضرور ہی۔ جو سبق پڑھا اچھی طرح اُس کو سمجھ کر قابو میں کر لیا۔ غافل لڑکے سبق جمع کرتے جاتے ہیں اور امتحان کے زمانے میں انبار مصیبت ہو جاتا ہی۔ ایک نقشہ اس طرح کا بنالو اور اُس کو خوش خط لکھ کر اپنی میز کے سامنے لگا دو۔ اِس سے تم کو معلوم رہے گا کہ کس وقت کیا کرنا ہی +

دن کا نام	پہلا گھنٹہ	دوسرا گھنٹہ	تیسرا گھنٹہ
شنبہ	عربی	اوقلیدس	فارسی
یک شنبہ	جبر و مقابلہ	حساب	ادب انگریزی

مدرسے کے خالی گھنٹے اور فرصت کے اوقات انگریزی گفت و گو میں صرف کرو۔ تفریح کی تفریح اور فائدے کا فائدہ۔ اِسی طرح اپنے باہر کے اوقات منضبط کر لو کہ فلاں وقت یہ کام کریں گے اور جب اپنے کُل اوقات منضبط کر چکو مجھ کو بھی اطلاع دو۔ اِس انتظام میں اِس کا بڑا خیال رکھو کہ طبیعت پر اتنا بوجھ نہ پڑنے پاسے کہ گھبرا جائے جب تک خوش دلی ہی سب کام اچھا ہوتا ہی۔ بے دلی پیدا ہوئی اور کام بگڑا +

... کے ذریعے سے ... ملو۔ یہ ... کے بیٹے ہیں اور ایف۔ اے کا امتحان دے چکے ہیں۔ اُن سے ملنا تم کو ضرور فائدہ دے گا۔ اِسی طرح تعارف بڑھاتے جاؤ لیکن عمدہ لوگوں سے۔ ایک بد وضعی تمام لیا قت[4] اور تمام آبرو کو ضائع کرتی ہی۔ عادۃ کا اختیار کرنا آسان ہی مگر اختیار کرنے کے بعد چھوڑنا مشکل بلکہ محال ہو جاتا ہی +

[1] اعلیٰ درجے کی زبان [2] شعار اصل میں وہ کپڑا جو بدن سے لگا لپٹا رہی مراد وہ چیز جو کسی قوم کے ساتھ خاص ہو جیسے لباس انگریزی انگریزوں کے ساتھ یا لال پھندنے دار ٹوپی ترکوں کے ساتھ [3] نصاب [4] مولوی نذیر احمد صاحب نے بیٹے کو ابتدا سے عربی شروع کرا دی تھی۔ بس اس سے ایک بڑی عام غلطی کی اصلاح ہوتی ہی کہ لوگ ابتدا کر کے پہلے فارسی پڑھاتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ بدون فارسی کے عربی نہیں آسکتی۔ ہمارے ملک میں پہلے فارسی سیکھنا صرف اس سبب سے لابد ہو رہا ہی کہ صرف و نحوِ عربی کی ابتدائی کتابیں زبان فارسی میں ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے صرف و نحوِ عربی کو اُردو کیا اور بیٹے کو اُردو پڑھا کر ایک دم سے عربی پر لگا دیا اگر عموماً مسلمان تعلیم کا یہ طریقہ اختیار کریں تو نہایت مفید ہو کیونکہ فارسی زبان کا سیکھنا اب چنداں ضروری نہیں رہا اور عربی کلاسکل ہونے کے علاوہ مذہباً مسلمانوں کو سیکھنی ضرور ہی بس فارسی دانی کے انتظار میں بچوں کو عربی سے محروم رکھنا بڑی غلطی ہی

اپنی حالتِ ظاہری کو اپنی وقعت کے مطابق رکھّو - میرا روپیہ جہاں تک تمھاری آسایشِ جائز میں صرف ہو ان شاء اللہ مجھ کو دریغ نہیں مگر فِدا تم کو نام ونمود کا آدمی کرے تو میرا روپیہ اچھے نیک[1] لگا - مجھ کو ایسے خرچ[2] میں ہمیشہ خوشی ہی - تم اپنی والدہ سے بے تکلف خرچ لو اُن کے پاس نہ ہو تو مجھ سے مانگنے میں بھی تامّل مت کرو +

تمھاری سب چیزیں ایک جا کر کے پرسوں یا اترسوں ان شاء اللہ بکسر[3] بھیجوں گا اور کوشش کروں گا کہ تم کو اسباب جلد ملے بشیرا - کتابیں تمھارے پاس بہت ہیں مگر سب رکھنے کو ہیں اگر اِن کتابوں پر نظرِ محققانہ ہو تو آدمی عالم ہو جائے - اب لِللہ توجّہ کرو اور مجھ کو نا امیدی کی مصیبت میں مت ڈالو - اُقلیدس کے دعوے یاد کر چلو - رفتہ رفتہ خیال پر چڑھ جائے گا کہ فلاں مقالے کی فلاں شکل کا کیا دعوے ہی - دوسرا مقالہ اگر تم چھوڑ دوگے بھول جائے گا اور اب اُقلیدس کو بہ دِقّت سمجھنا چاہیے جب دو مقالے اِس طور پر سمجھ لوگے اتنی استعداد ہو جائے گی کہ باقی کتاب خود نکال لوگے - اُقلیدس کے نئے دعوے بہت ضرور ہیں - ہمیشہ امتحان میں کوئی نہ کوئی نیا دعویٰ ضرور ہوتا ہی +

اِس کو پیشِ نظر رکھّو کہ تم کو اسی سال دوسرے کلاس میں ترقّی کر کے جانا ہی - اور امتحانِ سالانہ وہیں دینا ہی پس وہاں کا کورس ابھی سے رفتہ رفتہ اپنے بس میں لانا چاہیے تم مجھ سے وقتاً فوقتاً ہر بات اور ہر مسئلہ پوچھتے رہو - جہاں تک ممکن ہوگا میں یہیں سے تم کو سمجھا دوں[4] گا +

بشیرا اگر تم علی گڑھ جاتے تو تم کو شاید بڑی وحشت ہوتی لیکن اگر معلوم ہو کہ تم دہلی میں فائدۂ علمی حاصل نہیں کر سکتے تو پھر دیکھا جائے گا - اب تم کو اپنا انتظام خود کرنا پڑیگا اِس کو سمجھ لو کہ لوگوں پر ہمارے حقوق کچھ نہیں اور ایسے نفوس قُدسی جو دوسروں کو بے وجہ منفعت پہنچائیں کم ہیں پس اگر کوئی بے اعتنائی کرے تو افسردہ خاطر نہ ہونا چاہیے خوش آمد اور علمِ سیاری سے اپنا کام نکالنا ہوگا - تمھارے پاس گرامر ہی اِس کو یاد کر چلو غرض وقت سے جہاں تک ممکن ہی فائدہ اُٹھاؤ - اپنے حالاتِ جزو و کل سے ہمیشہ مطّلع رکھّو - والدعا ر ۵ - جنوری ۱۸۷۶ع - مقام تحصیل نگرا -

خط نمبر ۲۴

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو یہ بھی ایک دنیا کا دستور قرار پا گیا ہی کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مر جاتا ہی لوگ اُس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں - میں تم کو یہ خط اُس دستور کے مطابق نہیں لکھتا کیوں کہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہی میاں بی بی کا عجیب رشتہ ہی کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں - یہ بات کسی اَور رشتے میں نہیں پائی جاتی - میرا تمھارا مال مشترک - گھر مشترک - کھانا پینا مشترک اولاد مشترک - آبرو مشترک - خوشی مشترک رنج و غم مشترک - اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی - نہیں میری تمھاری دونوں کی - پس اب اگر مر گئی تو کیا تمھاری اکیلی

---

[1] یعنی اچھے کام میں خرچ ہوا + [2] گو حقیقت میں یہ لفظ جیم عربی سے ہے مقابلِ دخل لیکن فارسی اور اُردو کے روزمرے میں جیم فارسی سے مرجّح اور یہی زیادہ فصیح ہی [3] ضلع غازی پور میں ریل کا مشہور سٹیشن ہی گھوڑوں کی خرید و فروخت کا بڑا بھاری میلہ لگتا ہی [4] مولوی بشیر الدین احمد کے پاس اپنے والد کے بہت سے خطوط ہیں جن میں علمی مباحث ہیں یہ تمام خطوط بڑی قدر کی چیز ہیں مگر چونکہ ہر شخص اِن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تھا میں نے ایسے خطوط سب نکال ڈالے صرف نمونے کے طور پر آسان آسان ایک دو خط رہنے دیے [5] قواعدِ زبان یعنی صرف و نحو +

کی بیٹی مری - نہیں - میری تمھاری دونوں کی - پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے بڑا قوی تعلق تھا - لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہو میرا دل خود بخود بے قرار تھا اور میں نے اُسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا تاریخ ملا کر دیکھو - غالب ہو کہ خط کی تاریخ اور اُس کے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ظہیر - نصیر وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کر چکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا - رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہو - میں تم پر الزام نہیں لگاتا اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا - اُس کی قبر میری آنکھوں کے سامنے ہو اور میں سوتا بھی ہوں - ہنستا بولتا بھی ہوں - دُنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹتا - تو جب ظہیر - نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا تو یہ لڑکی بے چاری کے دن کی تھی - آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام - کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہو کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہو کہ احمق رو دھو کر چُپ کرتا ہو اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چُپ ہو رہتا ہو - غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا - پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں - دل کو مضبوط کر آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو - خدا ہمارا مالک ہو - اُس نے دیا - اُس نے لیا - خدا کو ہم سے عداوۃ نہیں بیر نہیں - جو کچھ کرتا ہو ہمارے نفع کے لیئے کرتا ہو - لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم اُن مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں - دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تن درستی - مال - اولاد - حکومت - شرافت - دین داری ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ - ہم کو بھی اُس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہو تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں - اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہو ہم محروم نہیں - اِن کی عمروں میں خدا برکت دے - اِن کو دین و دنیا کی فلاح ہو - کافی ہیں - اب زیادہ اولاد لے کر کیا کرو گی اِن ہی پر اپنی محبت صرف کرو - اِن کے حق میں خدا سے دعائیں مانگو - اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی شاید عاقبت میں اِن ہی مصیبتوں کے طفیل سے ہم پر رحم ہو - کسی اُستاد کا کیا اچھا قطعہ ہو[۱]

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے +	جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا +
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا	غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا +

ای خدا ہم کو صبرِ جمیل کی توفیق دے - آمین - آدمی کو چاہیئے کہ جب اُس پر کوئی مصیبت نازل ہو دوسرے بندگانِ خدا کے حال پر نظر کرے اور وہ پائے گا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں - تم گھر کے گھر میں بے چاری ... کو دیکھو - بڑی ناشکری کی بات ہو کہ ہم کروڑوں احسان اور جھگڑوں سلوک بھول جائیں اور تنکے بھر رنج کی برداشت نہ کریں بشیر بچہ ہو - تم کو روتے دیکھ کر سہا جاتا ہوگا - اُس کے حال پر رحم کرو - اپنے حال پر رحم کرو کہ کیا تمھاری حالت ہو گئی ہو آخر یہ کالبدِ خاکی سدِّ سکندر تو نہیں ہو - اِسی طرح رنجوں کے مارے اس کو تحلیل کر ڈالو گی تو کیا انجام ہوگا + ۴ - جون ۱۸۶۷ء

خط نمبر ۲۹

آج میں ... صاحب کے یہاں بیٹھا تھا - کیا دیکھا کہ ... اور ... مولوی صاحب سے سبق پڑھتے اور ہر وقت اُن کو ... صاحب اپنے رو برو بٹھا کر یاد کراتے - دانا احمق[۲] تھا اگر نہ دیکھا ہو تو ... صاحب کو دیکھو کہ اُس شخص کا قیافہ اور گفت و گو خالی

---

[۱] ایک سے ایک کو بڑھ کر بنایا ہو + [۲] یعنی ظاہر میں دیکھو تو معلوم ہو کہ احمق ہو مگر حقیقت میں بڑا سیانا ۱۲-

از سفاہت و سادہ لوحی نہیں۔ لیکن اپنے معاملات کو یہ شخص بڑے انہماک اور اہتمام سے انجام دیتا ہے۔ رعایا سے تعلقہ کو حسن انتظام سے ایسا سرسبز کیا کہ آج وہ علاقہ رشک نند ہو رہا ہے۔ اب ان بچوں کی تعلیم میں اس بلا کی آمادگی اور تن دہی ہے کہ اگر اس کی کیفیت واقعی لکھی جائے تو مبالغہ معلوم ہو۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ یہ شخص تین بیٹے رکھتا ہے اور جائداد وافر و مستمر کا مالک ہے۔ اگر اس کے لڑکے نہ بھی پڑھیں تاہم کم سے کم ہر متنفس سو سو روپیہ ماہوار آمدنی رکھے گا۔ میرا کیا حال ہے کہ ایک بیٹا اور پیشہ نوکری اور علم میراث خاندانی۔ تو جب . . . صاحب کو اپنے بچوں کی تعلیم میں یہ سرگرمی ہے مجھ کو اس سے ہزار چند ہونی چاہیئے۔ لیکن میں یہاں تم وہاں دور بیٹھے کیا کر سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ خطوط کے ذریعے سے تاکید کیا کروں۔ لیکن پھر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آدمی کے دل کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔ انسان کا بدن قید کیا جا سکتا۔ اس کی آنکھ پر پٹی باندھ سکتے۔ کان میں روئی ٹھونس سکتے۔ منہ پر مہر لگا سکتے۔ پر دل کو قابو میں نہیں لا سکتے۔ پس نہ میں تم پر جبر کرتا نہ تاکید بلکہ بہ عجز والحاح تم سے عرض کرتا ہوں کہ للہ خدا کے لیے لیاقت پیدا کرو۔ میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ تم سے توقعات پیدا کر لوں۔ جب تک تم کو لیاقت حاصل ہو اور اس لیاقت پر کوئی فائدہ مترتب ہو ضرور نہیں کہ میں جیتا رہوں۔ میرے باپ نے میرے پڑھانے میں بڑی جانفشانی کی تھی لیکن افسوس کہ وہ مرحوم و مغفور تَغَمَّدَہُ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ وَاَسْکَنَہٗ بُحْبُوْحَۃَ جَنَّتِہٖ دنیا سے ناکام گئے۔ میرے ڈپٹی کلکٹر ہونے سے ان کو مطلق نفع نہیں پہنچا۔ پس ان کی محنت کا نفع نہ ان کو ملا بلکہ مجھ کو اور تمہاری ماں بہنوں کو اور تم کو اور دوسرے اعزہ و اقارب کو۔ جو معاملہ میرے والد اور میرے ساتھ ہوا کیا میرے اور تمہارے ساتھ ہونا ناممکن ہے۔ اس سے قطع نظر خدا نے مجھ کو ایسی حالت میں رکھا ہے کہ اگر اس کو ثبات ہو تو شاید تا دم مرگ مجھ کو ضرورت نہ ہو گی کہ تم کو تکلیف دوں۔ پس ایسی حالت میں میرا تم پر بار بار مؤکد ہونا بہ خدا صرف تمہارے ذاتی نفع کے لیے ہے جس کو میں مقتضائے شفقتِ پدری اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھتا ہوں ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند	
جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را	؎

نصیحتے کنمت بشنو و بہانہ مگیر	ہر آں چہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر

میں یہ نہیں کہتا کہ تم کو سود و زیاں کا تفرقہ۔ نیک و بد کا امتیاز نہیں۔ لیکن اتنا کہوں گا کہ تم کو بے قراری کا شوق نہیں۔ یہ اگر ہو تو پھر وہی تمہارا استاد ہے وہی تمہارا ساز و سامان۔ آدمی خود ایجاد کرتا ہے کہ کیا کروں کیوں کر کروں تشنگی آزمودی مرآوا تو نشد۔ پس تشنگی پیدا کرو اور وہ نہیں ہے مگر طلب صادق جیسے زر کی بھوک۔ ترشے کی پیاس۔ یہ تصور کہ شاید عربی میں تم کو بہتر پڑھاتا مجھ کو اکثر ایذا دیا کرتا ہے لیکن وہی شوق ہو تو ہر استاد و باپ سے بڑھ کر کام دے ؎

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

اس کہنے سے کیا فائدہ ہو گا کہ تم فلاں چیز فلاں شخص سے پڑھو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے وقت سے پورا پورا فائدہ لو۔ تم بھی نہیں کہہ سکتے کہ

[1] حمق۔ نادانی [2] ہر وقت ایک کام کے پیچھے پڑے رہنا [3] [4] جس کو ہمیشہ کے لیے قیام ہو [5] خدا ان کو اپنے احسان سے ڈھانپے اور اپنی جنتوں کے بیچوں بیچ بسائے ۱۲

؎ یعنی حاجت سے سب باتیں پیدا ہوتی ہیں مثلہ حاجت۔ منز مورثا۔

یہ فراغ جو تم کو ماشاء اللہ اب میسّر ہی کب تک رہے گا۔ پس ان[1] سہل‌انگاری کی صورت میں صرف اس قدر تعطّل جائز ہی جو حفظِ صحت کے لیے ضروری ہی۔ میں کیا صرف تاکید کرنے پر قانع ہوں۔ میرا دلِ کم بخت کب صبر کرتا ہی۔ میں تمھارے فائدے کے لیے پس انداز بھی کرتا جاتا ہوں لیکن سمجھتا ہوں کہ علم سے بڑھ کر دولت نہیں۔ اور اگر دولتِ علم پر میلوہ[2] ختیار رہوتا جو روپے پر ہی تو بنسبت[3] خدا کی قسم میں تم کو زبان تک نہ ہلانے دیتا۔ افسوس اسی کا ہی کہ دولتِ علم بے اپنی محنت کے جمع ہو نہیں سکتی۔ خدا اس کا گواہ ہی[4] وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا[5] کہ میں تم سے روپے کو دریغ نہیں کرتا۔ اگر تم فیس مدرسہ کے علاوہ روپیہ خرچ کرنے سے فائدۂ علمی حاصل کر سکو میں بہ طیبِ خاطر اس خرچ کو گوارا کروں گا چاہے وہ کتاب کے دام ہوں یا معلم کی اجرۃ۔ الغرض میں تمھاری تعلیم میں ہر طرح کی کوشش مالی و دماغی و جسمانی و روحانی کرنے کو موجود تھا اور ہوں اور رہوں گا گو تم نے ابتک کامل شوق نہیں کیا لیکن پھر بھی مجھ کو تم سے امید ہی اور میں باور کرتا ہوں کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور شوق کروگے کیونکہ خدا نے تم کو سمجھ اچھی دی ہی وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ[6]۔ اگر میں تم کو نام ور اور کام یاب زندگانی میں چھوڑ کر دنیا سے اٹھ جاؤں تو ان شاء اللہ تعالیٰ بڑے اطمینان سے جاؤں گا۔ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ[7]۔

۱۹ جون ۱۸۷۶ء

خط نمبر ۳۴

میاں بشیر تمھاری انگریزی نہ میرے پاس ہی اس واسطے کہ میں نے دیکھنے کا قصد بھی نہیں کیا اور دیکھتا تو کیا دیکھتا۔ اگر تم سوچ کر لکھو اور پڑھنے میں طرزِ ادا اور محاورات کا لحاظ کر لیا کرو تو شاید میرے برابر لکھ سکو۔ اور نہ وہ انگریزی ... کے پاس ہی کیوں کہ ان کو اتنا دماغ کہاں۔ البتہ ... بعد گراموں میں اصلاح دے رہے ہیں۔ کیا تم کو اس لڑکے کی افتادِ مزاج معلوم نہیں ایک دو برس کے بعد وہ متقدمین پر بھی ضرور جرح[8] کرے گا۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد	
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد + +	

مولوی ... کو تو کنایتہً میاں جی بد استعداد کہنے لگا۔ تم کو نہ وہ پہلے کچھ سمجھتا تھا نہ اب سمجھتا ہی اور اس کا سبب خود سری کی جہالت اور نادانی ہی۔ پس تم ایسے احمقوں سے کیا معارضہ کرتے ہو کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِہِمْ[9] تم کو خدا نے اس برادری ایسے ہزاروں پر برتری دی ہی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ وَلَا فَخْرَ تم اپنی حالۃ کا موازنہ اپنے ابنائے جنس میں کرو۔ ... اپنے فخرِ خاندان ہیں مگر اس خاندان کو علم و فضل سے کیا مناسبت۔ فارسی کو تو اس نے مدّۃ ہوئی طاقِ بلند پر رکھ دیا بدیں عبارۃ مُوتوا[10] کر چھوڑا ہی۔ عربی میں ہر روز مولوی صاحب سے تو تو میں میں ہوا کرتی ہی۔ انگریزی کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ کسی سے کہتا تھا کہ گرامر ڈپٹی صاحب

---

[1] تذبذب۔ عدمِ تیقّن [2] بے کاری [3] اور خدا کی گواہی بس ہی [4] اور یہ خدا کی دین ہی جس پر چاہے فضل کرے [5] خدایا تو نے مجھ کو ملک دیا (یعنی حکومت) اور باتوں کی تاویل کا سلیقہ سکھایا۔ اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی آخرۃ میں میرا حامی و مددگار رہ۔ اٹھا مجھ کو مسلمان اور ملا مجھ کو نکوکاروں سے [6] اعتراض [7] لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کیا کرو ۱۲

[8] اور اس پر خدا کی ستایش ہی نہ نازش ۱۲

نہیں جانتے۔ لغۃ میں نے کئی پوچھے ان کو نہیں آئے۔ پھر نہیں معلوم انگریزی کیا جانتے ہیں۔ پیراس کا کہنا حق تھا مگر وہ حق جس کو انحق مر[۱] کہا ہو۔ . . کے مزاج میں ابھی کچھ سلامت روی ہو مگر عارضی ع عصمتِ بی بی ست از بے چادری + تم کو کوئی ضرورۃ اِن لوگوں سے بگاڑ کرنے کی نہیں ہو۔ میں بھی اِن لوگوں سے تفرسجًا ملتا ہوں تم بھی ایسا ہی تعلق رکھو۔ دل خوش کُن دو چار باتیں کہیں سُنیں الگ ہوگئے۔ غلطیاں جو تم نے گرفت کیں سب درست ہیں اور بہت غلطیاں تم نے نظر انداز کیں۔

خط لکھا ایسا کہ سر تا پا غلط +　　خود غلط اِملا غلط انشا غلط +

ایک جگہ تم نے زبانِ مقطوع البیان کو زبانِ مقطوع اللسان سمجھ کر تاڑ کی ہو زبانِ مقطوع اللسان یا لسانِ مقطوع اللسان بے شک مہمل ہو۔ مقطوع البیان بھی عبارۃ اچھی نہیں۔ قاصر البیان چاہیئے۔ لیکن کیا . . . نے یہ لفظ اپنی طبیعۃ سے ایجاد کیا ضرور کسی انشا رست لیا ہوگا عجمیوں نے عربی کی ایسی بہت سی مٹی پلید کی ہو۔ کاش اسی کاوش سے انگریزی پر نظر ہو اور اسے کاش یہی کاوش چند سے عربی میں چلی جائے۔ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝

ایک محقق کا مقولہ ہو کہ انگریزی دو قسم کی ہو کتابی اور روزمرہ (کرنٹ انگلش) کہتے ہیں کہ روزمرہ کے واسطے اور توقِ تحریر زیادہ ہونے کے واسطے اور معلوماتِ عامہ کے واسطے مطالعۂ اخبار انگریزی ضرور ہو۔ تم کسی سوسائٹی یا کلب میں جایا کرو یا خود کوئی عمدہ اخبار لیا کرو + بشیرا پڑھنے کے سامنے خرچ کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اگر خدا برکت دے تو یہ خرچ ایسا ہی کہ چند روز میں اضعافاً مضاعفہ اس سے حاصل ہوگا۔ بس یہ خرچ تجارۃ رابحہ ہو

تم نے خط میں ذرا لکھ کر زرا بنایا۔ اصل میں ذرّہ عربی ہو۔ ذرّات جمع۔ تصرفاتِ عجم سے مخفف ہو گیا تو کیا تہ دل درست فقط

خط نمبر ۳۵

میاں بشیر مولوی . . . صاحب تمھارا اسباب لے گئے ہیں۔ تم اپنی ضرورۃ کی چیزوں سے مطلع رکھو کتاب وغیرہ جو کچھ درکار ہو لکھ بھیجو میں روانہ کردوں گا۔ تم جو چاہو فرمائش کرو میری صرف یہی ایک فرمائش ہو کہ تم پڑھو ۝

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند　　تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری +
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار +　　شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری +

تم نے آخر اپنا فارسی خط تو درست کیا کہ ہاتھ سنبھال کر لکھتے ہو تو بھلا معلوم ہوتا ہو۔ ذرا سا لحاظ قاعدوں کا کرلو کہ کس طرح حروف کو ترکیب دیتے ہیں تو اور عمدگی پیدا ہو لیکن انگریزی خط کو تم نے بیٹھ کر بگڑنے دیا۔ خوش خطی کوئی کمال نہیں مگر ہنر ہو اور شروع میں تھوڑا سا اہتمام کرنے سے آدمی خوش خط ہو جاتا ہو اور جب ہاتھ نے ایک روش اختیار کرلی تو کیسا ہی پھر بھی وہی شان باقی رہتی ہو۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ میں ہنر خوشخطی نہیں ہو تو کیا ضرور ہو کہ تم میرے معائب و مناقص

---

[۱] یعنی بات کڑوی ہوتی ہو ۱۲

[۲] جو کچھ خدا نے چاہا۔ اور قوۃ نہیں ہو مگر خدا کی مدد سے اور کافر قریب ہو کہ تجھ کو وعظ سنتے وقت اپنی نظروں سے ٹٹے گادیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو دیوانہ ہو۔ یہ آیۃ دفع نظر کے لیے پڑھتے ہیں [۳] مجلس [۴] انجمن [۵] چند در چند [۶] پر منفعت تجارۃ +

کی تقلید کرو خُذ ما صَفا دَع ما کدِر[1] ۔ اگر مجھ میں کوئی صفت ہے خدا تم میں وہ صفت علیٰ وجہ الکمال پیدا کرے میرے عیوب سے خدا تم کو بچائے آمین ۔ ذرا انگریزی خط پر توجہ کرو ۔ اگر قلم دوات کاغذ علیٰ وفق المراد نہیں یہ چند پیسوں کی چیز ہے اور ہنر اگر ہاتھ میں آگیا تو دولتِ لازوال ہے گو تم کو اپنی والدہ سے عارضی ناخوشی ہو لیکن بشیر تم کو خدا نے عقل دی ہے تم اُن کی پوری اطاعت کرو ۔ ماں میں نمونہ شفقتِ الٰہی کا ہے اور ماں باپ کے جو حقوق شارع نے قرار دیئے ہیں وہ حقیقت میں تلافی ہے اُن احسانوں کی جو ماں باپ اپنی اولاد پر کرتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری والدہ کبھی تم سے بے سبب ناخوش ہوں لیکن ؎

آں راکہ بجائے تست ہر دم کرمے ✦ عذرش بنہ ار کند بہ عمرے ستمے ✦

۲ ۔ جولائی ۱۸۷۶ء

خط نمبر ۴۵

سَلَامٌ کعُوْدِ الھند او کعبیر		علی الولد السَّرِّ الرشیدِ بشیر	

امّا بعد فقد ابطأ علیّ کتابک ۔ فما جوابک ۔ واما الاعتذار بالصوم ۔ فلا یعصمک من اللوم ۔ لانہ وان اختلّ بہ الاوقات ۔ لکنّہ یزید فی الفراغ ویطیل الساعات ۔ سیّما النہار فان لہ طولاً لا یکاد یزول ولو وافقہ الشتاء من بین الفصول ۔ فلا اقل من رقعۃ مرفوعۃ ۔ مرّۃ او مرّتین فی کل اسبوعۃ واما ارسال الحکایات اللقمانیۃ الی راجہ شیو پرشاد فلا بدّ لی من الاطلاع علیہ ۔ قبل ان یاتی غراہم الطلب من لدیہ ۔ ونحن ان شاء اللہ بعد شہرنا ھذا الراحلون الی سکندرپور وللہ عاقبۃ الامور ۔ والسنۃ کما تعلمون لم یبق منہا الا شہران ۔ فاستعدّ والامتحان ۔ ولنعم ما قیل ۔ وقد جری بہ التمثیل ۔ عند الامتحان ۔ یکرم الرجل او یھان ۔ فیا خیبۃ من نسی مافی الکتاب ۔ ولم یحسن الجواب ۔ فضل وذلّ ۔ وصغر فی اعین الناس وقلّ وانا ارجو زیارتکم فی زمان التعطیل ۔ واللہ حسبی ونعم الوکیل ۔ ھذا ۔ ونحن بفضل اللہ فی اطیب حال ۔ وعیش عن المکروہات خال ۔ ونظن بکم کذالک ۔ ھدٰکم اللہ اقوم المسالک ۔ والسلام ۔ وعلیہ ختم الکلام

[1] جو صاف ستھرے ہوئے کو لے لو اور گدلے کو چھوڑ دو ۱۲

سلام صالح اور شایستہ لڑکے بشیر کو عودِ ہندی اور عبیر کا سا سلام ۔ اِس کے بعد معلوم ہو کہ تمہارے خط کے آنے میں دیر ہوئی ۔ اِس دیر کا کیا جواب رکھتے ہو اگر روزوں کا عذر ہو تو یہ الزام سے بچانے کو کافی نہیں کیوں کہ اگرچہ روزے اوقات میں خلل ڈالتے ہیں لیکن فراغ خاطر بڑھاتے ہیں اور اوقات میں وسعت پیدا کر دیتے ہیں خصوصاً دن کہ وہ تو ایسا پہاڑ ہو جاتا ہے ۔ جیسے سر سے ٹلے ہی گا نہیں ۔ اگرچہ موسم جاڑوں ہی کا کیوں نہ ہو ۔ پس مناسب ہے کہ کم سے کم قلم برداشتہ ایک رقعہ ہفتے میں ایک بار یا دو بار لکھ کر بھیج دیا کرو ۔ رہا حکایات لقمانیہ کا راجہ شیو پرشاد صاحب کی خدمت میں بھیجنا اس کے متعلق یہ ہے کہ قبل اِس کے کہ اِن کے پاس سے یاد طلب آئے مجھ کو اُس کی روانگی کی اطلاع ضرور مل جائے ۔ ہم اِس مہینے کے بعد سکندرپور جائیں گے اور انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ سال کے صرف دو مہینے رہ گئے ہیں جیسا کہ معلوم ہے پس امتحان کے لیئے ابھی سے تیاری کر چلو اور کیا خوب کسی نے کہا ہے جو اب ضرب المثل کی طرح زبان زد ہے کہ تعظیم و توہین وقت امتحان کی معتبر ہے ۔ پس اُس وقت کیا خرابی ہے اُس کی جو کتاب کی باتیں بھول گیا اور اچھا جواب نہ دے سکا پس بہکنے لگا اور رسوائی کھینچی اور لوگوں کی نظروں میں ہیٹا ہوا اور گھٹ گیا اور میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگوں سے تعطیل میں ملوں گا اور خدا میرے لیئے کافی ہے اور وہ بھروسا کرنے کے لیئے کیا اچھا ہے ۔ یہ تو ہوا ۔ اور ہم لوگ خدا کے فضل سے بہت اچھے حال میں ہیں اور مکروہات سے پاک زندگی ہے اور گمان کرتے ہیں کہ تم لوگ بھی ایسے ہی ہو گے ۔ خدا تمہیں راہِ راست دکھائے ۔ آگے سلام اور اسی پر ختم کلام

عادۃً یوں پڑگئی ہو کہ شب کو دو اور تین کے بیچ میں اکثر آنکھ کھل جاتی ہو اور کبھی نہیں بھی کھلتی تو طوعاً کرہاً جاگنا پڑتا ہی اور پھر قصد بھی کرتا ہوں تو نیند نہیں آتی - پس سحر کے بعد کچھ کتاب بینی کرتا ہوں - آج شاید گھڑی غلط چلی کہ دیر سے بیٹھا ہوں مگر اسفارِ صبح نہیں ہوا - جی میں آیا کہ تم ہی کو خط لکھوں - عربی کی سطریں میں نے غور سے نہیں لکھیں - امید ہو کہ تم بہ آسانی سمجھوگے - شاید ایک دو جگہ لغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہو - بڑے دن کی تعطیل میں آنا ہوا تو ان شاء اللہ ایک امتحان تمھارا میں لوں گا - اور اگر ثابت ہوگا کہ تم نے دقت سے استفادہ کیا تو تم کو انعام بھی ملے گا۔

۱۳ اکتوبر ۱۸۹۷ء

خط نمبر ۸۷

میاں بشیر! - میاں بی بی میں جو تعلق ہو وہ پیار اور ہیبت کا تعلق ہو یعنی دونوں ایک دوسرے سے محبت رکھیں اور میاں کی وقعت اور ہیبت دو چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں - ایسا شبہہ بے جا ہو - استاد اور شاگرد اور حاکم اور رعایا میں بعینہٖ اسی طرح کا تعلق ہو - عورتیں بہ وجہ نقصانِ عقل و جہل و نادانی کے ممکن نہیں کہ امورِ دنیاداری کی تنہا متکفل ہو سکیں - یہی سبب ہو کہ مردوں کو ان پر غلبہ رکھنا ضرور ہی وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ - جوشِ جوانی میں احمق مرد عورتوں کو اس قدر بے تکلف اور گستاخ کر لیا کرتے ہیں کہ پھر ساری عمر وہ ان کو دبا نہیں سکتے - اور گھر میں دو عملی رہتی ہو - عورت اپنی راہ چلتی ہو اور مرد اپنا رستہ اختیار کرتا ہو - مجھ کو اپنے عزیزوں میں ایک شخص کا حال معلوم ہو کہ وہ ابتدا میں بی بی کی خدمت گاری کرتا تھا اور میاں بی بی میں پیار اخلاص کے واسطے دھول دھپا ہوتا تھا ایک دوسرے کو چٹکیاں لیا کرتا تھا اور گفت و گو میں بھی سخت بے تہذیبی جانبین سے ہوتی تھی انجام یہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے - کیسی ہی کوئی چیز عمدہ ہو ضرور ہو کہ آدمی اس سے ملول اور سیر ہو جائے مثلاً کوئی عمدہ سے عمدہ کھانا اگر روز دو وقت کھانے کو ملے تو شدہ شدہ روکھی روٹی کی طرح بدمزہ معلوم ہونے لگے گا - پس جو لوگ حسنِ ظاہر پر فریفتہ ہوتے ہیں ان کا یہ خیال یقیناً بے ثبات ہو - عورتیں صرف شہوت رانی کے واسطے نہیں ہیں بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق ہیلپ میٹ - پس ان کو امورِ خانہ داری کے انتظام کے واسطے موضوع سمجھ کر اسی کام کے لائق بنانا چاہیے - یہ قاعدہ نہایت صحیح ہو - دیر آمیز دیر گسل زود آمیز زود گسل - ربط جو پیدا کرو رکاوٹ کے ساتھ اور اتحاد کو بڑھاؤ بہ تدریج - ایک ہیبت جسمانی توانائی کی بھی ہوتی ہو وہ تم اپنی بی بی پر قائم نہیں کر سکتے پس ضعفِ جسمانی کی تلافی وقار و متانت سے کرو - عورتوں کو طمع اور چٹورپن سے روکنا ضرور ہو ورنہ گھر میں خیر و برکت رہ نہیں سکتی - تاکید کرو کہ تمھاری بی بی لکھنا سیکھے اور اس کے پڑھنے کی کتابیں جمع کرو اور اس کی مدد کامل طور پر کی جائے - اگر فرمایشوں کی نوبت آئے تو اس کو حقارت کے ساتھ روک دینا کہ ہماری تمھاری حالت پر اس کو نظر ہو اور اس قدر بس کرتا ہو - جو ان کو مناسب معلوم ہوگا خود کریں گی - کچھ تھوڑا سا روپیہ دے کر دیکھو کہ کیا کرتی ہو - اگر وہ روپیہ سلف یا عارضی نمایش کی چیزوں میں اٹھا دے تو جانو کہ احمق اور ناعاقبت اندیش ہو اور اگر زیور یا دوسرے عمدہ مصرف میں لگائے تو البتہ خوشی کی بات ہو تم کو ایک مدت تک بی بی کو تعلیم کرنا پڑے گا - اس کے خصائل اور مزاج پر غور سے نظر کرتے جاؤ - یہ امر اس کے حق میں مفید ہوگا کہ بیوی [illegible] اختیار میں اس طرح رکھی جائے جیسے بیمار طبیب کے اختیار میں - کبھی کچھ پوچھا اور سوال کر دیکھو کہ اس ہنر میں اس کی دستگاہ

لہ تڑکا - پوچھنا سلہ اور مردوں کو عورتوں پر برتری [illegible]

کہاں تک ہی۔ اسی طرح ممکن ہی کہ کسی حیلے سے کھانا پکانے میں بھی اُس کا امتحان لیا جائے اور جس بات میں کوتاہی پائی جائے نرمی اور مہربانی سے اُس کو سمجھا دیا جائے فقط ۱۸۷۹ء

خط نمبر ۱۰۶

میاں بشیر تم مجھ سے انگریزی تعلیم کی بہت مدح سنتے رہے ہو اس لیئے کہ تمھیں انگریزی پڑھوانی منظور تھی۔ اب کہ تم نے اتنی انگریزی پڑھ لی جتنی کوئین امپریس وکٹوریا[1] کی رعایا میں سے ہر بھلے آدمی کو ضرور ہی تو لو اب اُس کی بُرائیاں بھی سنو کیوں کہ ہر چیز میں حُسن و قبح دونوں کے محامل ہوتے ہیں۔ ع نفعِ مے گفتی ضررش نیز بگو ٭

یہ میری اکیلے کی رائے نہیں ہی بلکہ عام لوگوں کی اور خود انگریز بھی اس کے شاکی ہیں کہ ہندوستانی انگریزی پڑھ کر منہ زور اور گستاخ اور خود پسند ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہی کہ جب ایک قوم کو خدا سلطنت دیتا ہی کہ وہ دنیا کی بہشت ہی تو اُس قوم کی سب چیزوں میں شانِ حکومت آ جاتی ہی اور زبان بھی اِس عموم سے مستثنیٰ نہیں۔ انگریزی کی وسعت کا تو یہ حال ہی کہ اگر علمِ فلاحت یا کیمیا یا طب یا تشریح یا نیچرل فلاسفی[4] غرض سائنس کی کسی کتاب کو ترجمے کے ارادے سے لے کر بیٹھو تو سطر پیچھے دو چار لفظ ضرور ایسے ہوں گے کہ اُردو بیچاری کی تو کیا بساط ہی کہ آدمی کو پیر شدی۔ عربی میں جو ہماری کلاسکل لینگویج[5] ہی اُن کے مرادف نہیں ملتے پس بہ مجبوری یا تو نئے الفاظ گھڑو یا بعینہا انگریزی کے الفاظ رہنے دو اور دونوں پیرایے بھونڈے اور اِن ہی دقتوں کی وجہ سے ہم علومِ جدیدہ سے محروم۔ مصر اور قسطنطنیہ کے عربی اور فارسی کے اخبار دیکھو تو تم کو اِس کی تصدیق ہو۔ جو شخص فرنچ[6] اور انگریزی کے مصطلحات نہیں جانتا اِن اخباروں کا ایک آرٹکل بھی نہیں سمجھ سکتا۔ شاہِ ایران کے روزنامچۂ سفر ولایت کا بھی یہی حال ہی اور خود ہماری زبان میں بھی الفاظِ انگریزی برابر داخل ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ ضروری نتیجہ ہی انگریزوں کے غلبۂ قومی یعنی سلطنت کا کہ اِن کی زبان دوسری زبانوں پر غالب آتی چلی جاتی ہی۔ پس وہ جو میں نے کہا تھا کہ جب خدا کسی قوم کو سلطنت دیتا ہی تو اُس کی سب چیزوں میں شانِ حکومت آ جاتی ہی زبانِ انگریزی کی یہ ایک شانِ حکومت ہی۔

دوسری بات یہ ہی کہ انگریزی میں ابتذال اور خوش آمد اور مبالغہ اور جھوٹ نہیں۔ ہمارے یہاں بیسیوں انشائیں صرف القاب آداب معمولی خیر و عافیت رسمی شوق و انتظار کے لیئے پڑھنی پڑتی ہیں پھر اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی؟ طرزِ مراسلت ایسا بگڑا ہی کہ بچپن سے عادتیں پڑی ہوئی ہیں اِس سے احساس نہیں ہوتا ورنہ آدھا جھوٹ اور باقی آدھے میں اپنی تذلیل بے سبب مخاطب کی مدح بلا استحقاق۔ لوگوں کو تعصب اور ہٹ دھرمی سے کفرانِ نعمت کرنے دو۔ اپنا تو مقولہ یہ ہی کہ فارسی لٹریچر نے ہماری تہذیب کو بالکل برباد کر دیا تھا اب اُردو پر انگریزی رنگ آتا چلا ہی۔ زبان مبالغے اور ابتذال کے عیوب سے بہت پاک ہو گئی ہی اور ہوتی جاتی ہی سیدھی اور صاف بات میں لوگوں کو مزہ ملنے لگا ہی۔ کچہری کا ایک ادنے محرر بھی خاص کر مسلمان اپنے تئیں خانہ زاد اور نمک پرورد اور فدوی اور خاکِ پا اور حاکم کو خداوند خدایگان پیر و مرشد قبلۂ عالم نہیں کہنا چاہتا۔ غرض انگریزی نے ہر ایک کے کان میں پھونک دیا ہی کہ وہ بھی آدمی ہی۔ جان اور مال اور عزت رکھتا ہی۔ اُس کے سب حقوق محفوظ ہیں۔ کوئین امپریس وکٹوریا کی رعیت اور ایک حد تک حاکمِ وقت کا محکوم ہی۔ مگر کسی کا زر خرید غلام نہیں

---

[1] ملکہ قیصرہ وکٹوریا فرماں روائے انگلستان و ہندوستان [2] پہلو [3] طبیعیات یا فلسفۂ طبعی [4] طبقۂ اعلیٰ کی زبان [5] زبانِ فرانس ٭

اُس پر اپنے افسر کا ادب لازم ہی نہ پرستش۔ وہ خوشی سے سلام کرتا ہی نہ سجدہ۔ مؤدب الفاظ میں بات کا جواب دیتا ہی لیکن گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ کر نہیں۔ وہ اگر قصوروار ہی ضابطے کی سزا کو خوش دلی سے انگیز کرتا ہی مگر ڈام فول[1] سننے کی اُس کو مطلق برداشت نہیں

اگر انگریزی خوانوں کے غرور کی شکایت انگریزوں ہی سے سُنی گئی ہوتی تو ہم سمجھتے کہ بعض نوجوان۔ تازہ ولایتہ۔ تیز مزاج انگریز یا جی خدمتگاروں میں رہ کر بدزبانی کرنے لگتے ہیں عجیب نہیں کسی غیور[2] سے پالا پڑ گیا ہوا ور اُس نے بات کا بتنگڑ بنا کھڑا کیا ہو۔ مگر انگریزی خوانوں کے غرور کے اور بہت سے شواہد ہیں اور تم خود محتسبانہ اِن کے حالات کی تفتیش کرو گے تو مان لوگے کہ انگریزی خواں کُل نہیں تو اکثر اپنی ہی سوسائٹی کو نظرِ حقارۃ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری سوسائٹی میں کوئی عیب نہیں بے عیب ذات خدا کی۔ مگر ہم کو اپنے ملک کے انگریزی خوانوں سے دو طرح کی گفت وگو ہی۔ اول تو ہم کو اسی میں کلام ہی کہ جس کو انگریزی خواں عیب سمجھتے ہیں فی نفسہ عیب بھی ہی یا نہیں۔ انگریزی پڑھنے سے آدمی ضرور کسی نہ کسی قدر پریجوڈسڈ[3] ہو جاتا ہی یعنی اُس کے ذہن میں انگریزی کی خوبی قدرِ واجب سے زیادہ بیٹھ جاتی ہی۔ یوں تو حکومت کی وجہ سے انگریزوں کی تمام ادائیں تھوڑی بہت سبھی کی نظروں میں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں معلوم ہوں گی پر ہوں گی اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِھِم[4] مگر انگریزی خواں تو گویا انگریزوں کے بھاٹ ہیں۔ ہماری سوسائٹی کے عیوب بے چارے انگریزی خواں ہم سے زیادہ کیا جان سکتے ہیں۔ ہم آپ ہی نہ گنوادیں۔ ہم میں لاکھ عیبوں کا ایک عیب تو ہی مفلسی اور مفلسی بھی لازم کہ اب سے شاید دس نسلوں تک مرفع ہوئی نظر نہیں آتی۔ اِس پر مزید تعصب۔ جہالت۔ بے ہنری۔ بے حمیتی۔ کاہلی۔ ناعاقبت اندیشی۔ خود غرضی۔ باہمی نااتفاقی یعنی تمام لوازم بد اقبالی۔ مگر بڑا رونا تو اِسی کا ہی کہ ہمارے انگریزی داں بھائی جو ہمارے ملک کے گل سرسبد[5] سمجھے جاتے ہیں اِن وجوہ سے ہم کو ذلیل نہیں سمجھتے اور کس منہ سے سمجھیں کہ یہ عیوب بتمامہا مع شئی زائد[6]۔ خود اُن میں موجود ہیں ہماری آنکھ میں ناخنہ ہی تو اُن کی بیم ٹینٹ۔ ہم کانڑے ہیں تو وہ اندھے۔ ہم ہکلے ہیں تو وہ گونگے۔ انگریزی خوانوں میں اگر بلند نظری ہوتی تو بھلے ہی دن نہ ہوتے۔ اِن کو تو ہم میں ایک ہی عیب سوجھتا ہی کہ ہم انگریزوں کی طرح کا طرزِ تمدن کیوں نہیں اختیار کرتے اُن ہی کے سے مکان میں رہیں اُن ہی کے سے کپڑے پہنیں اُن ہی کی طرح کھائیں پئیں اُن ہی کی طرح عورتوں کو آزاد کر دیں کہ ہرٹ دنگیاں باہر پٹی پھریں۔ گویا اِن دانش مندوں کے نزدیک انگریزوں کا دنیاوی عروج اُن کے طرزِ تمدن کی وجہ سے ہی ع فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست ہمارے عقل کے دشمنوں انگریزوں کی وہ صفتیں ہی دوسری ہیں جو اُن کی ترقی کا سبب واقع ہوئی ہیں۔ محنت۔ جفاکشی۔ تفتیش و تلاش۔ استقلال۔ ضبطِ اوقات۔ علومِ جدید میں توغل۔ قومی اتفاق۔

مجھ کو تمام عمر انگریزی سوسائٹی میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ کبھی اِس کی تمنا کی پس مجھ کو انگریزی سوسائٹی کا بہت ہی تھوڑا حال معلوم ہی لیکن جتنا معلوم ہی اُس کی نسبت تو میرا خیال اچھا نہیں۔ بھلا ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں داخل ہونے کی کیا کسی غیر قوم کے آدمی کو رغبت ہوگی جن کے مزاجوں میں اِس قدر اجنبیت ہو کہ ایک ہی قوم کے دو آدمی مدتوں ایک ہوٹل یا جہاز میں رہیں۔ دونوں وقت ایک میز پر کھانا کھائیں اور ایک دوسرے سے معرفت نہ پیدا کر سکیں۔ معلوم ہی کہ انگریزوں میں عورتوں

---

[1] پاجی گدھا [2] غیرت مند [3] اس کا مرجع انگریزی ہی [4] بے تحقیق کیے ہوئے پہلے سے ایک خیال جما لینے والا [5] لوگ اپنے پادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں [6] ڈالی کے سرے پر کے پھول [7] کُل بلکہ کسی قدر زیادہ ہی +

کے پروے کا دستور نہیں۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ مرد ہو یا عورۃ علیٰ رؤس الاشہاد ناچنے کا عیب نہیں۔ اور ناچنا بھی ہمارے ملک کا سا نہیں بلکہ مرد اور عورۃ ایک وضعِ خاص سے بغل گیر ہو کر ناچتے ہیں خیر یہ تو ہر ملکے و ہر رسمے۔ مجھ کو اِس مقام پر اَور ہی بات کہنی منظور ہے کہ اگر ناچنے میں مثلاً جیمس اور میری کا جوڑا لگ جائے تو یہ اختلاط داخل ملاقات نہیں۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے اجنبی کے اجنبی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ لوگ پڑھنے کے لیے ولایت بھیج ہی دیتے ہیں۔ تم نے بھی خیال کیا ہوگا کہ یہ لوگ چاہے اکیلے ہوں مگر اکثر رہیں گے الگ کوٹھی میں۔ اِن باتوں سے ایسا مستنبط ہوتا ہے کہ انگریزوں کی طبیعتیں اُنس پذیر کم ہیں۔ آدھے وحشی تو ہم اب سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کہیں ایسے روکھے مزاج ہمارے ہوتے تو پورے وحشی نہیں بلکہ ڈیوڑھے پون دونے وحشی ہونے میں کیا کسر تھی +۔

رہ گیا طرزِ تمدن۔ اِس میں عورتوں کو بڑا دخل ہے۔ اور کیوں نہ ہو آخر وہ بھی تو سوسائٹی میں داخل ہیں۔ ہم میں اور انگریزوں میں بڑا اختلاف اِن عورتوں کی وجہ سے ہے اب اِس کا محاکمہ کون کرے کہ عورتوں کے ساتھ کون سی سوسائٹی کی مدارات مناسب ہے۔ اِس مقام پر مجھے ایک نقل یاد آئی۔ میرے ایک معزز دوست کہتے تھے کہ ہمارا سارا خاندان کا خاندان شیعہ ہے میں نے بڑے ہو کر سنّی شیعوں کے اختلافات کی تحقیقات کی اور آخر کار میری رائے اِس پر قرار پائی کہ سنّی برسرِ حق ہیں چنانچہ میں سنّی ہو گیا تو خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ مباحثات رہتے تھے اور ہر ایک کو سنّی ہو جانے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ ایک بی بی میری بزرگ تھیں۔ اُن سے بھی میں ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ سنّی ہو جاؤ۔ وہ بی بی میری باتوں کا جواب تو کیا دیتیں سُن کر چُپ ہو رہا کرتی تھیں ایک دن میں نے اِن بی بی سے کہا کہ آخر کچھ بیان تو کرو کہ تم کو سنّی ہو جانے میں تامل کیوں ہے تو اُن بی بی نے فرمایا کہ بیٹا بات یہ ہے کہ مجھ کو اِن موؤں (صحابِ ثلاثہ) کے نام ہی بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ سچ ہے انسان ایسا ہی ضعیف مخلوق ہے کہ اُس کی رائے پر سوسائٹی کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ انگریزی خوانوں کے صرف مُنہ سے کہنے کی باتیں ہیں ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ۔ کہ ہمارا طرزِ تمدن انگریزی ہو جائے۔ دوسرے اختلاط تو درکنار۔ مجمع میں کوئی اِن سے اِن کی جورو کا مزاج شریف پوچھ بیٹھے گا یا اِن کے روبرو اُس کی خوب صورتی کی تعریف کرے گا تو ممکن نہیں کہ سر سے پانو تک میاں کے تن بدن میں پتنگے نہ لگ جائیں؟

ہماری تمام اخلاقی عمارۃ عورتوں کی پردہ داری پر مبنی ہے۔ جس دن عورتوں کی پردہ داری میں ذرا بھی خلل پڑے گا ساری عمارۃ متزلزل ہو جائے گی۔ اگرچہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اِس معاملے میں کسی ہندوستانی یا کسی انگریز کی رائے برسرِ صواب نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہر شخص بہ تصنّع نہیں بلکہ بالطبع اپنی ہی سوسائٹی کی جانب داری کرے گا مگر میں حتی الوسع انصاف کے ساتھ تم پر اپنی بات ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے طرزِ تمدن کی جس قدر بُرائی کی جاتی ہے اُس قدر بُرائی کا وہ سزاوار نہیں کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی عورتیں دائم الحبس ہیں۔ شوہروں کے انتخاب میں اِن کا اختیار واجب زبردستی سلب کر لیا گیا ہے۔ اِن کو ظلماً گھروں کی چاردیواری میں قید رکھ کر جائز تمتعات سے محروم کیا گیا ہے۔ یہ اور اِس قسم کے اَور[1] اعتراضات جو ہندوستانیوں کے نہیں بلکہ مسلمانوں کے پردے کے رواج پر وارد کیے جاتے ہیں انگلش[2] پوائنٹ آف ویو یعنی انگریزوں کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ہمارے وحشی اور بے رحم اور سنگ دل

[1] لوگوں کے سامنے کھلے خزانے [2] وہ اُن کے مُنہ کی (بنائی ہوئی) باتیں ہیں [3] اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عورتوں کا پردہ مسلمانوں سے چلا ورنہ ہندوؤں میں پردہ نہ تھا اور اب جو ہے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی [4] انگریزوں کے زینۂ خیال سے [5] انگریزوں کی آنکھ سے +

ہونے کی بڑی قوی دلیل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جو عورتیں رواجاً پردہ نہیں کرتیں (اور ہندوستان میں خاص کر دیہات میں ایسی قومیں بہ کثرت ہیں) اور خود انگریزوں کی عورتیں بھی میں اپنے پندار میں سب کو مردوں کے اختلاط سے گریزاں پاتا ہوں یعنی پردہ تمام جہان کی نسوان کا تقاضائے طبیعۃ معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر میرا یہ خیال غلط بھی ہو تاہم انگریز تو غیر غیر قوم۔ غیر مذہب۔ اور غیر ملک کے ہیں، یہ تو پردہ دار خاندانوں کا حال کیا جان سکتے ہیں۔ مگر ہم ہی میں کے بگڑے ہوئے مسلمان جن پر انگریزی کی سند وار ہوا اور جو انگریزوں سے بڑھ کر پردے کی برائیوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں ایک تو ہمارے منہ پر کہہ دے کہ اس نے کبھی کسی پردہ دار عورۃ کو پردے کی سختی کا شاکی پایا ہو۔ اس کو بھی جانے دو۔ اس کلیے سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ اَلعَادَۃُ طَبِیعَۃٌ ثَانِیَۃٌ یا انگریزی خوانوں کے یقین دلانے کے لیے انہی کی بولی میں کیوں نہ کہو جس کی وقعت ان کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے ہیبٹ از دی سکنڈ نیچر تو اگر پردہ داری عام صنف نسوان کا تقاضائے طبیعۃ نہ بھی ہو تاہم رواج مستمر نے اس کو طبیعۃ بنا دیا ہے۔ پرنس آف ویلز ہندوستان میں تشریف لائے تو کچھ قیدی رہا کیے گئے۔ ان میں ایک وہ اکیس آغاز جوانی میں قید ہوا تھا۔ رہا کیا گیا تو بوڑھا ہو گیا تھا چند روز بعد اس نے عرضی دی کہ مجھے جیل خانے کے باہر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چالیس پچاس برس کی قید اس شخص کو جیل خانے سے مانوس کر دے اور صدہا برس کی آئین جدیدہ متوارثہ پردہ نشینی کے بعد عورتوں کا دیدہ ہوائی رہے کسی کی عقل اس کو قبول کرے گی! غرض عورتوں کی طرف سے وکالۃً جو پردہ داری کی شکایۃ کی جاتی ہے محض لغو اور بے اصل ہے۔ مجھ کو حقیقۃ میں ہنسی آتی ہے کہ پردے کی وجہ سے مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ عورتوں کی کچھ قدر نہیں کرتے اور میں کہتا ہوں کہ پردہ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ جیسا اپنی عورتوں کو ہم عزیز رکھتے ہیں دنیا میں کوئی قوم نہ رکھتی ہوگی سے

غیرۃ از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم +	گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم + +

جتنے اعتراض عورتوں کے پردے پر وارد کیے جاتے ہیں سب میں یہ اعتراض کسی قدر جان دار ہے کہ شوہروں کے انتخاب میں پردہ دار عورتوں کو آزادی نہیں۔ لیکن ساری دنیا اور خاص کر ہندوستان میں یہ شکل مقدسہ عورتوں کو ایسی ابتدائی عمروں میں پیش آتا ہے جب کہ ناتجربہ کاری اور نقصان عقل کی وجہ سے ان کو اس کے قابل اطمینان فیصلے کی قابلیۃ نہیں ہوتی اور ذوق و شوق کی حالتوں میں آخر عمر کا معمولی غیر معمولی ایسے ایسے عظیم تبدلات واقع ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑے دانشمند پختہ کار کی عقل بھی ان پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس صورۃ میں ایسے سترگ معاملے کا تصفیہ طرفین کے بزرگوں کی تجویز سے ہونا قرین مصلحت ہے۔ اور عورتوں کی کیا تخصیص ہے ہم تو اپنے یہاں کے مردوں کو بھی اس معاملے میں قریب قریب ایسا ہی بے اختیار پاتے ہیں۔ میں اس کو مانتا ہوں کہ انگریزوں کی عورتیں [illegible] بہ طرح بہتر ہیں اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انگریزوں میں بعض صاحب تصانیف ہیں بعض نے مردوں کے ساتھ کمپیٹ کر کے بی اے اور ایم اے کے خطاب اور ڈپلومے پائے ہیں۔ غرض ان عورتوں نے بہ خوبی ثابت کر دیا ہے کہ جسمانی توانائی کو چھوڑ کر کہ وہ ایک قدرتی بات ہے باقی دنیا کے سارے کام جو مرد کر سکتے ہیں عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ مگر خوب سمجھے رہو کہ مجھ کو اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ ہندوستان کی عورتوں کو ان کی حالۃ کے مناسب تعلیم کرنا نہایۃ ضرور ہے مگر ساتھ ہی رواج پردہ کی موقوفی کا میں سخت مخالف ہوں۔ اول تو میں انگریزوں کا کوئی کار نمایاں ایسا نہیں دیکھتا جس کو میں سمجھوں

لہ عادۃ دوسری طبیعۃ ہے لہ مانانی سے پہلی آنے والی لہ مقابلہ بالمسابقہ لہ اسناد ۱۲

کہ پردہ اس میں حارج ہو سکتا ہی - اور اگر ہو بھی تو بے پردگی کے خراب نتیجے اخباروں میں پڑھتے پڑھتے کلیجا پک گیا - ایسے فائدوں کو (آگ لگے) سلام ہی جو سوسائٹی کو گندہ کریں - ہماری بیبیاں بلا سے پھوہڑ ہوں - بے ہنر ہوں - بے سلیقہ ہوں - بے علم ہوں کہ بچوں کا ہاتھ منہ دھلانے - پھٹا اُدھڑا سینے - روٹی دال پکانے کے سوائے اَور کچھ نہ جانتی ہوں - ساری دنیا میں کوئن امپرس وکٹوریا کی جوبلی[1] کا غل ہوا اور ان کو خاک خبر نہ ہو - ٹرانسوال اور بلغاریا اور یہ ہماری کے نام تک ان کو معلوم نہ ہوں - روس کے جھگڑے اور فرانس کے ٹنٹے اِن کے کانوں تک نہ پونچے ہوں - غرض ہماری بیبیاں جانور ہوں پتھر ہوں بلکہ اِن سے بھی بدتر ہوں - ہم کو قبول - خدا نے سر چارلس ڈاکٹ اور مدراس والے راس اور ایک ڈاکٹ اور ایک راس ایسے ایسے بچا س کی فضیحتہ اور رسوائی سے تو بچایا ہی +

اب رہا انگریزی لباس - اِس میں سے عورتوں کی فل ڈرس[2] اگر بہتر ہی تو بلا مبالغہ اِس شعر کا مصداق ہے

تن عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس +		یہ وہ جامہ ہی کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا	

اور فل ڈرس کی بھی ایک ہی کہی ہے برعکس نہند نام زنگی کافور +

غرض فل ڈرس اور اُس کے نام سے انگریزوں کا مذاقِ لباسی معلوم ہوا - زیادہ صراحت کی کیا ضرورت ہی - کیا خوب کہا ہی ے

ہر یکے ناصح برائے دیگراں + +		ناصح خود یافتم کم در جہاں +	

دوسروں کو کیسا منہ بھر بھر کے جانور اور وحشی اور نامہذب کہتے ہیں اور اپنا یہ حال کہ سچ پوچھو تو تن بدن ڈھانکنے تک کا سلیقہ نہیں - اِن لوگوں کے مردانہ لباس میں انضمامِ حکومت سے البتہ ایک شانِ وقعت پیدا ہو گئی ہی ورنہ فی حد ذاتہ مڑھے ہوئے کپڑوں پر ایک چھچھورپن سا برستا ہی - اور خود انگریزوں کو دیکھا ہی کہ گرمی کے موسم میں کوکلا کو کلا اُکتے ہیں - اپنے قومی لباس کے متحمل نہیں ہو سکتے - اور گھروں پر اوقاتِ خاص میں ہماری طرح کے ڈھیلے کپڑے پہنے رہتے ہیں - ہم تو ان کو پابندی رسم و رواج سے آزاد نہیں مانتے - ایک وضع کو موجب راحت سمجھا تھا تو پھر اس کے اختیار کرنے میں جھینپنا کیا معنے +

مَیں سمجھتا ہوں کہ انگریزی لباس ہی نے انگریزوں کو اس بات پر مجبور کر رکھا ہی کہ دن رات کرسی - کوچ پر لدے رہتے ہیں ورنہ اگر ہٹ دھرمی نہ کی جائے تو جو آسائش فرش پر بیٹھنے میں ہی اُس کا عشر عشیر بھی کرسی کوچ میں نہیں - کرسی پر ایک ہی وضع سے آدمی کو بیٹھنا پڑتا ہی - بہت کیا تو ذرا پیٹھ لگالی یا لیٹے ہوئے تو میز پر ٹانگیں سیدھی کر لیں مگر یہ ڈولی ڈنڈے کا طور قابلِ دید ہوتا ہی - اور وہاں ایک وضع اَور بھی ہی - پیروں پر زور دے کر کرسی سمیت پیچھے کو تن گئے - مرکز ثقل جگہ سے بے جگہ ہوا ٹانگیں اوپر اور سر نیچے تیلوں کی قینچی چڑھی ہوئی ہی اور پڑے چلا رہے ہیں کہ آدمی آئے تو اُٹھا کر کھڑا کرے - فرش پر آدمی اِتنی اوضاع کثیرہ سے بیٹھ سکتا ہی کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا اور اندر وئے اصول طب فرش پر بیٹھنا تن درستی کے لئے نہایت مفید ہی مگر حکومت کے آگے آسایش اور طب پر کون عمل کرتا ہی - ایک عالم اِسی خبط میں مبتلا ہی کہ بجا ہو یا بے جا جہاں تک ہو سکے انگریزوں کی تقلید کیجئے - اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر ملک کے لوگ خصائص ملکی کے لحاظ سے ایک خاص طرح پر زندگی بسر کرنے کے خوگر ہیں

[1] پچاسوین سالگرہ کی تقریب [2] پوری پوشاک ۱۲

یعنی اُن کے لیئے آسایش کی وہی ایک خاص طرح ہی۔ اُس کو بے داعیۂ قوی بدلنا ضرور تکلیف دہ ہوگا۔

جو لوگ وضع انگریزی کے گرویدہ ہیں کیوں کر ہو سکتا ہی کہ لباس انگریزی ہو۔ نشست برخاست انگریزی ہو۔ اور کھانا انگریزی نہ ہو۔ انگریزی کھانے کے ایک تو یہ معنی کہ میز کرسی کانٹا چھری ہو یعنی دیسی کھانا انگریزی طور پر کھایا جائے۔ دوسرے یہ کہ کھانا بھی انگریزی ہو۔ ہم میں کے ایک نئے رفارمر[1] بگڑے ہیں۔ اُنھوں نے ہاتھ سے کھانے پر (کہیں یہ مت خیال کر لینا کہ رفارمر صاحب کتّے کی طرح منہ سے یا کوّے کی طرح پاؤں سے کھاتے تھے بلکہ چھری کانٹے سے) ہندوستانیوں کو کیسا کیسا لتاڑا ہی کہ توبہ ہی بھلی مگر ان کی ساری بکواس کا ماحصل اتنا ہی تھا کہ ہاتھ سے کھانا غیر جنٹلمین ہی۔ اس میں شک نہیں کہ ہاتھ سے کھانے میں ہاتھ تو خواہ مخواہ تھوڑا بہت بھرتا ہی ہی مگر پھر ہم کہتے ہیں کہ رغبت اور نفرت عام نہیں بلکہ عادت پر موقوف ہی سارڈین وغیرہ انگریزوں کی بہت چیزیں ہیں کہ ہم کو اُن سے گھن آتی ہی۔ کھانے کے بعد کلی نہ کریں تو ہماری طبیعت مالش کرنے لگتی ہی۔ اور بعض کو تو بے تبدیل ذائقہ چین نہیں پڑتا۔ غرض صفائی اور طہارت کا قومی بلکہ شخصی سٹینڈرڈ[2] مختلف ہی اور کسی کو کسی پر جرح وطعن کا منصب نہیں۔ ایک بار ایک دکان پر ایک خاص طرح کی چائے کی پیالیاں دیکھنے میں آئیں۔ پیالی کے کنارے پر اندر کی طرف کو ایک چھجّا سا نکلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ موچھوں کے بچاؤ کے لیئے یہ تجویز سوچی گئی ہی۔ اُسی وقت مجھ کو قصّوا الشوارب[3] واعفوا اللحی یاد آیا اور خیال ہوا کہ شارع نے کس قدر ہمارے مصالح کا حفظ کیا ہی پھر اس طرف ذہن منتقل ہوا کہ پابندی رواج بھی کیا بُری چیز ہی۔ یہ تکلفات کرتے ہیں اور اتنا نہیں ہو سکتا کہ لبیں لوا ڈالیں۔ ہاتھ سے کھانا انگریزوں کو مکروہ معلوم ہوتا ہوگا مگر اس میں ایک تو مفاد صریح یہ ہی کہ جس خوبی کے ساتھ ہاتھ لقمے کو گرفت کر سکتا ہی ممکن نہیں کہ چھری کانٹا ہاتھ کا کام دے سکے دوسرے اطبّا ہی کے ڈاکٹر قائل ہو چلے ہیں کہ ہاتھ میں ایک قوتِ مقناطیسی ہی اور وہ ہاتھ سے کھانے میں داخل لقمہ ہو کر ممدّ ہضم ہوتی ہی۔ انگریزی کھانوں میں اول تو مزہ ہی کیا خاک دھرا ہی۔ سالنوں میں اُبلا ہوا پھیکا سیٹھا ادھ کچرا گوشت۔ مٹر کی گھنگنیاں۔ اُبلے ہوئے آلو۔ پسایا ہوا خشکہ۔ چپاتی پراٹھوں کی جگہ نان پاؤ۔ ایک پیالی میں نمک دوسری میں سیاہ مرچیں۔ وہ نقل شاید تم نے سُنی ہو کہ ایک شہری کتّے نے ایک دیہاتی کتّے کو مہمان کیا ایک کبابی کی دکان پاس بٹھا دیا۔ جب کبابی دکان بڑھا کر چلا گیا دیہاتی کتّا لگا ہر طرف سونگھنے۔ کہیں مرچوں کا دونا پڑا رہ گیا تھا۔ جوں اُس میں منہ ڈالا مرچیں منغز کو چڑھ گئیں۔ کھانستے کھانستے اور چھینکتے چھینکتے باؤلا ہو گیا۔ شہری دوست سے شکایت کی تو اُس نے کہا یاں انہی چٹخاروں کے لیئے تو ہم شہر میں پڑے ہیں۔ غرض ہم لوگوں بے موہنوں کو تو چٹخارے لگے ہیں۔ انگریزی کھانوں میں کیا مزہ آئے۔ ایک حکایت اور[4] ہنڈرڈ ای انگلش ٹیزرز[5] اور ور۔ غدر سے پہلے اُمرا شاہی میں سے کسی امیر نے دہلی کالج کے پرنسپل[6] کی دعوت کی۔ کھانے کی بھنگیاں بھجوا دیں۔ انگریزی قاعدے سے کھانا میز پر چنا جا چکا تو آدمی نے صاحب کو اطلاع کی۔ ہر قسم کا کھانا میٹھا سلونا شاہی رکابداروں نے پکایا تھا۔ اور دعوت تھی تو بلا شبہہ اہتمام بھی ضرور ہوا ہوگا۔ سبحان اللہ اُس کے ذائقے کا کیا پوچھنا ہی۔ جس وقت سے کھانا آیا ساری کوٹھی مہک اٹھی تھی مگر پیچھے سُنا کہ جوں صاحب نے کھانے کے کمرے کے اندر پاؤں رکھا اور مشک اور زعفران اور گلاب اور کیوڑے کی بھبک آئی اُلٹے پاؤں باہر نکل آئے۔ اور کھانا کیسا اُنھوں نے آنکھ بھر کر کھانے کی طرف کو دیکھا تک بھی تو نہیں۔

[1] کفیل صلاح [2] ایک قسم کی چھلی جو ولایت سے پیک آتی ہی [3] پیمانہ نصاب [4] مونچھیں گھٹاؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ [5] اور انگریزی کھانا تمام ہی [6] مدرسے کا اعلیٰ افسر ۱۲

پس جو لوگ انگریزی تمدّن انگریزی تمدن پکار رہے ہیں اِس تہ کو نہیں پہنچتے کہ مذاقوں کے اختلاف قدرتی باتیں ہیں یہ کسی کے مِٹائے مِٹتی نہیں؟ اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ جس کا جو طرز ہے وہ اُسی کو پسند کرتا ہے۔ اُسی میں اُس کو راحت ملتی ہے۔ اور آخر تک اُس کو اُسی طرز پر چلا جانا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریز اپنی تمام حالتوں میں نمایاں ترقی کر رہے ہیں اور اپنے طرزِ تمدن کی اصلاح سے بھی غافل نہیں۔ با ایں ہمہ یہ فرض کر لینا کہ اِن کا تمدن اعلیٰ درجے کی شائستگی کو پہنچ گیا ہے فرضِ غلط ہے۔ کھانے کپڑے کی تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ ہم کو تو اِن کی سوسائٹی میں بہت سی بڑی بڑی باتیں کھٹکتی ہیں۔ عورتوں کی بے پردگی کا مذکور تو ضمناً اوپر ہو چکا۔ اَور لو بادہ خواری۔ اِس میں تو کسی کو کلام کرنے کی گنجائش ہی نہیں کہ جس طرح کھانسی اُمّ الامراض ہے[1] ام خبیث الاخلاق شراب اُمّ الخبائث۔ اور تمام جہان کے ڈاکٹروں کا اجماع ہے کہ یہ ملعون عرق تن درستی کو بھی سخت مضر ہے۔ باوجود اتنی برائیوں کے جس کثرت سے اِس کا رواج انگریزوں میں ہے شاید روے زمین پر کسی دوسری قوم میں ہو۔ پس اِس خیال نے غضب ڈھا رکھا ہے کہ اعتدال کے ساتھ اِس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر شراب اور اعتدال فکرِ باطل خیالِ محال +

انگریزوں کے طرزِ تمدن میں ایک عیب اَور ہے جس کا نقصان انگریزوں کو شاید کم محسوس ہوتا ہو یا نہ بھی ہوتا ہو لیکن اگر ہم لوگ اِن کی وضع پر رہنا چاہیں تو یقیناً بربادی کا موجب ہے۔ وہ کیا ہے۔ ہائی لائف۔ یعنی اونچی شان دار زندگی جو بڑے مصارف کے بدون ایک دن نہیں نبھ سکتی۔ ظاہر میں دیکھو تو سیدھے سادے موٹے ڈھٹ کپڑے اکیلے کوسوں پیادہ پا چلے جائیں۔ کسی بات کی عار نہیں۔ کسی طرح کی شیخی نہیں مگر سواری اور مکان اور سامان آرایش اور شاگرد پیشہ کے خرچ دیکھو تو عقل دنگ ہو کر رہ جائے۔ اور اگر کہیں میم صاحب کی بلا بھی سر پر مسلط ہوئی تو پھر کچھ ٹھکانا نہیں۔ دو دو تین تین درزی ہیں کہ صبح سے شام تک سوئی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی اور بیڈیم پائل[2] کی تھالی تنخواہ کی قسط علاوہ۔ غرض اِس ارزانی کے ملک میں بال بچے والا انگریز میرے حساب سے ہزار روپئے ماہوار سے کم میں جنٹلمینلی یعنی شریفانہ فارغ البالی اور آسایش سے نہیں رہ سکتا

ہم تو ہندوستانیوں ہی کو ملامت کرتے تھے کہ اِن کو دولت کی نگہ داشت کا سلیقہ نہیں اور اِن کا بہت روپیہ نمود و نمائش میں ضائع ہوتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانیوں پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔ ہندوستانی تو پھر بھی زیوروں اور باسنوں کے پیرایے میں اپنی دولت کا ایک معقول حصہ پس انداز کرتے ہیں۔ اِن کے یہاں کاٹھ اور کانچ اور گلٹ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ قلعی تو اُس وقت کھلتی ہے کہ جب کسی کی بدلی ہوتی ہے اور اسباب نیلام کیا جاتا ہے۔ کسی کے خوش آمدی اونے پونے خرید لیں تو وہ بات ہی دوسری ہے اور وہ حقیقت میں ایک قسم کی رشوت ہے ورنہ نیلام میں روپئے کے آٹھ آنے تو بندھے ہیں +

خیر شاید انگریز تو اِس شان میں رہ بھی سکتا ہے۔ اُس کو روپیہ کمانے کے بہت سے ڈھب یاد ہیں۔ اُس کی ہمت بلند اور اُس کا حوصلہ وسیع ہے۔ اُس کو تمام روے زمین خشکی اور تری جنگل اور پہاڑ آبادی اور اجاڑ اپنا اور بیگانہ سب یکساں ہے۔ نوکری تو اُس کی جوتیوں سے لگی پڑی ہے مگر وہ اِس کا پابند نہیں۔ ایک ذرا سی بات خلافِ مزاج پیش آئی اور وہ فوراً اُس کو لات مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی قوم کا تو ہی ملک خدا تنگ نیست پاے گدا لنگ نیست۔ وہ چل پھر کر کہیں نہ کہیں اپنا ٹھکانا کر کے رہے گا شاید وہ کوئی سکول کھول بیٹھے۔ وکالت کرنے لگے۔ کسی قسم کا کارخانہ جاری کرے۔ سوداگر بن جائے۔ کہیں کسی پھیری کی کان

[1] اخلاق کے اعتبار سے [2] بیڈیم پائل ایک مشہور ٹیلر یعنی درزی ہے جو پیسے سلا کے کپڑے دیتا ہے [3] نقش نگین - دستور العمل

ڈھونڈ نکالے۔ یا کوئی موقع مناسب دیکھ کر کالونی بسانے کا ڈول ڈالے۔ غرض یہ کہ وہ کسی جگہ اور کسی پیشے پر بند نہیں۔ ایسے آدمی کو معاش کی کیا کمی۔ پھر اُس کی سوسائٹی کا یہ دستور نہیں کہ کمانے والا ایک اور کھانے والے بیس۔ کیا مرد کیا عورۃ سب اپنی اپنی جگہ خوش دلی کے ساتھ محنت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ محنت ہی کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں اور محنت ہمارا فرض ہی بھلا ہندوستانی کاہل بے ہنر فاصر الہمت سے کیا اِن کی ریس ہو سکتی ہی اور کرے گا تو مفلس جیئے گا اور قرض دار مرے گا +

انگریزی سوسائٹی کا آخری نقصان دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ لامذہبی ہی۔ جہاں تک مجھ کو اِن لوگوں کے حالات سے آگہی ہی (اگرچہ تھوڑی ہی مگر نمونے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں) میں تو یہی کہتا ہوں کہ اِن لوگوں میں اکثر کی تمام ہمت اصلاح دنیا کی طرف مصروف ہی اور یہ انہماک اِس درجہ سے زیادہ تر قابلِ اعتراض ہی کہ اُس کا منشأ فطری غفلت نہیں ہی۔ جس سے کوئی فرد بشر بری نہیں۔ بلکہ مذہب کا استخفاف مذہب کی بے وقعتی کہ میری نظر میں یہ مکروہ ترین پیرایہ ہی الحاد کا۔ اور ڈر جاے کہ صرف انگریزی تعلیم سے (وہ بھی ادھوری) ہمارے ملک کے انگریزی خواں ابتدائے باڈی لامذہب ہوتے چلے جاتے ہیں ضرور لامذہبی کا رنگ انگریزی سوسائٹی میں بہت گہرا ہونا چاہیے اور افسوس کہ ہی بھی۔

انسان کے تمام افعال معلّل بالاغراض ہوتے ہیں اِس اصول کے مطابق انگریزی طرز تمدن کے اختیار کرنے میں بھی کوئی مفاد منظور ہونا چاہیے اور اب تک جس قدر میں نے لکھا ہی اُس سے تم پر ظاہر ہو جائے گا کہ انگریزی تمدن جس جس چیز سے عبارۃ ہی اُن میں بعض چیزیں تو بے مفاد محض نہیں بلکہ ہمارے حق میں بے مفاد ہیں۔ لیکن لوگ ایک اَور ہی مفاد کی طمع سے انگریزی تمدن کی طرف کو دوڑتے ہیں اِن کو یہ توقع ہی کہ انگریزی تمدن کے اختیار کر لینے سے انگریز ہم کو اپنی سوسائٹی میں لے لیں گے۔ کبھی لے نہ لیں۔ جب تک انگریز وہ ہیں اور ہم ہیں حاکم و محکوم۔ فاتح و مفتوح۔ غالب و مغلوب کے تفرقے باقی ہیں ہماری اِن کی مثال تیل پانی کی ہی۔ نہ ملے ہیں نہ ملیں گے۔

میری یہ تحریر بہت لمبی ہو گئی مگر تم دیکھتے ہو کہ مطلب بھی مہتم بالشان تھا۔ جس طرح بعض جسمانی امراض بعض اوقات کثرۃ سے شائع ہو جاتے ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ یہ زمانہ لامذہبی کے شیوع کا ہی۔ بہت تھوڑے سر انگریزی تقلید کے مالیخولیا سے خالی ہیں۔ میں نے تم کو اپنی سمجھ کے مطابق آگاہ کر دیا ہی وما علینا الا البلاغ۔ فقط

موعظۂ حسنہ میں مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے سوا اَور لوگوں کے نام کے بھی خطوط ہیں۔ کُل خطوط کی تعداد تقریباً ایک سو ہی۔ اِس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ مولانا کی کُل خط و کتابت کا یہی مجموعہ ہی۔ یا باقی اَور خطوط خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہیں ابھی مولانا کے صد ہا خطوط ایسے موجود ہیں کہ اُن کو اگر مجموعے کی صورۃ میں چھپوا دیا جائے تو موعظۂ حسنہ سے زیادہ ضخامت ہو جائے اور یقیناً اُس سے زیادہ دلچسپی اور زیادہ فائدہ ہو ہم نے مکتوب کی صورۃ میں یا انشا کے طور پر اَور لوگوں کے خطوط بھی چھپے ہوئے دیکھے ہیں مگر ہم موعظۂ حسنہ کے مقابل میں اُن کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور اِسی طرح اردوے معلّٰی کے بارے میں ہماری رائے ہی۔ کیوں کہ وہاں لٹریچر کے سوا تفریحِ طبع زیادہ ہی اور یہاں کوئی خط فوائدِ علمیہ سے معرّیٰ نہیں۔ اور لٹریچر کی خوبی اور اخلاق آموزی سے کوئی سطر خالی نہیں۔

[footnote] اللہ آبادی ۱۵۲ آخری گو تبتے ہیں سب سے اخیر نہیں ۱۵۳ من حیث المجموع ۱۵۴ مضمر۔ پوشیدہ ۱۵۵ اور ہمارا کام صرف پونہچا دینا ہی +

ابن الوقت یہ کتاب اُس وقت کی تصنیف ہی جب مولنا حیدرآباد سے پنشن لے کر دہلی تشریف لائے ہندوستان کے اکثر لوگ پنشن کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ اب اِن کو دنیا و دین کے کسی کام سے تعلق نہیں۔ صرف آرام و آسایش سے زندگی بسر کرنا اور دن بھر گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے حقہ گڑگڑانا یہی نتیجہ ہی پنشن لینے کا۔ ممکن تھا کہ ہمارے مولنا بھی انھیں احدیوں کی طرح اطمینان سے گھر بیٹھ کر پنشن کی سائی اُڑایا کرتے۔ مگر انھوں نے اِس زمانے میں بھی اپنا وقت کبھی ضائع نہیں کیا جب کہ وہ تنگ دستی کے زمانے میں ناداری کے پائے لنگ سے سختی کے پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے اور نہ کبھی اُس وقت ضائع کیا جب کہ حکومت کے دامن دولت کے سائے تلے وہ اطمینان اور خوشی کے ساتھ بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے اور نہ اب جب سے کہ پنشن لی ایک لمحے کے لیئے بے کار رہنا پسند کیا۔ ابتدا سے آج تک جہاں اور جس جگہ ہمارے مولنا رہے کہیں بھی علمی شغلے کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ غرض پنشن لینے کے بعد مولنا نے سب سے اول ۱۸۸۸ء میں یہ کتاب تصنیف فرمائی۔

ابن الوقت ایک نہایت دلچسپ ناول ہی۔ اِس میں دکھایا گیا ہی کہ وضع ظاہر لباس اور طرز تمدن میں انگریزوں کی تقلید مسلمانوں کو نقصان پونہچاتی ہی۔ انگریزی وضع اور انگریزی طرز ماند و بود کے متعلق ہندوستان کے اخباروں رسالو اور کلبوں اور پرایوٹ جلسوں میں بہت بحثیں ہو چکی ہیں۔ شروع شروع میں تو اِس پر ایسا غل مچا اور نہ صرف عوام میں بلکہ عوام سے بڑھ کر خواص میں کہ گویا انگریزی کپڑے پہن لینا یا انگریزوں کی طرح یا اُن کے ساتھ میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کفر و ارتداد ہی۔ اور اِس کے فتوے غالباً لکھے ہوئے موجود ہیں۔ لیکن زمانہ جو سب کی عقلوں کو ٹھیک بنا دیتا ہی اِس غلطی کی بھی اصلاح کر رہا ہی اور بہت کچھ کر بھی چکا ہی۔ بہر کیف کفر و ارتداد کو نہ کسی نے مانا اور نہ وہ قابل پذیرائی چیز تھی۔ لیکن بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لوگ بحث کے اصلی مقصد پر آ گئے۔ یعنی یہ کہ ہندوستانیوں کے لیئے یا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیئے انگریزی وضع اور طرز ماند و بود مفید اور زیبا ہی یا نہیں۔ مؤیدین و مخالفین نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں۔ اور بال کی کھال کھینچ کر رکھدی۔ لیکن عقل بار یک بین نے طرف داران وضع انگریزی کے دعوے کو ڈسمس کر دیا مگر اِسی کے ساتھ مدعیان طرز ہندوستانی کو بھی ڈگری نہیں دی بلکہ زمانے کا پاس و لحاظ کر کے یہ فتوی صادر فرمایا کہ انگریزی وضع میں فضول خرچی اور شیخی دونوں عیب شامل ہیں۔ اور ہندوستانی طرز ماند و بود اور وضع میں بدتمیزی اور ستر نا پوشی اور زیادہ بد تہذیبی ہی اِس لیئے دونوں کو ترک کرنا چاہیئے۔ اور ہندوستانی انگریزی اُودا اُود ملکوں کی وضع ظاہر اور طرز ماند و بود سے خذ ما صفا و دع ما کدر کے طور پر کوئی ایسی وضع اختیار کرنی چاہیئے کہ جو نہ بدتمیزی میں شامل ہو اور نہ فضول خرچی کا اُس پر اطلاق ہو سکے۔ لوگوں نے اِس فتوے کو تہِ دل سے منظور تو کر لیا ہی لیکن اِس سمجھنے میں پڑے ہیں کہ زمانے کے موافق کس قسم کی وضع اختیار کی جائے لوگوں نے اگر تھوڑی سی بھی توجہ کی تو اپنے حال کے مناسب وہ ضرور کوئی وضع اختیار کر لیں گے۔ جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے گا۔ ابھی تو لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو رہا ہی۔ غرض ابن الوقت میں وضع ظاہر اور انگریزی طرز ماند و بود کی جو بُرائیاں دکھائی گئی ہیں وہ ضرور بُرائیاں ہیں۔ اِس ناول کے ہیرو ابن الوقت نے انگریزی وضع اختیار کی اور انگریزوں کی طرح ماند و بود کرنے لگا اور اِس کی وجہ سے جو کچھ اُس کو نقصان پونہچے وہ مضامین ذیل سے ظاہر ہیں ✦

ابن الوقت نے انگریزی وضع اختیار کر لی نوبل صاحب نے اس کی دعوۃ کی

نوبل صاحب کے پاس سے اٹھا تو جان نثار ابن الوقت کو سیدھا اس کے بنگلے پر لے گیا اور جاتے کے ساتھ حجامت کروا کر اصطباغ دی یعنی نہلا دھلا موسم اور وقت اور موقع کے لحاظ سے فیشن کے مطابق انگریزی سوٹ[1] پہنا نکٹہ ٹوپی بوزی یعنی برلسٹر ٹائی کالر سب کس کسا کر اس کو اچھا خاصا عین ٹین پوپن جنٹلمین بنا دیا۔ ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ اشبہ پایا بے اختیار تن کر لگا کپڑے بدلنے کے کمرے میں ٹہلنے۔ کھانے کے بعد اس کے کئی گھنٹے کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزرے گرمی کے دن چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں تھرمنٹیڈوٹ[2] سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے ہیں کوچ پر دراز ہونا تھا کہ آنکھ لگ گئی جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل باہر نکل گیا کوئی دو گھڑی رات جاتے جاتے لوٹ کر آیا تو نوبل صاحب کے یہاں جانے کا وقت قریب تھا ڈنر کے لیے تیاری شروع ہوئی کچہری نہیں دربار نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں اس پر بھی دن کے گیارہ بجے سے لے کر اب یہ تیسری بار ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی مقتضی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تو نوبل صاحب کی کوٹھی تھی جب معلوم ہوا کہ اور مہمان آنے شروع ہوئے یہ بھی اپنے بنگلے سے اٹھ جا موجود ہوئے کھانے سے پہلے اور کھانے میں صاحب لوگ اس کو اجنبی سمجھ کر بار بار دیکھتے تھے لیکن چونکہ کسی نے اس کو انٹروڈیوس[3] نہیں کیا تھا کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ تم کون ہو اور نہ یہ کسی سے بات کر سکتا تھا نوبل صاحب مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے تھے ان سے لمحہ دو لمحہ چھٹکارا پاتے تو ابن الوقت سے ایک دو بات کر جاتے ڈنر تھا کہ اچھا خاصا پہر ڈیڑھ پہر جھمیلا تھا جہان کے قصے اور دنیا بھر کی بکواس خیر خدا خدا کر کے ڈنر سے چھٹی پائی ابھی سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں کہ نوبل صاحب نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی صاحبو! - یوں تو آپ صاحبوں سے اکیلے دوکیلے یا مجمع میں ملنا ہمیشہ خوشی کا موجب ہوتا ہے - مگر آج رات کی ملاقات ایک خاص وجہ سے بڑی بہت بڑی خوشی کی بات ہے آپ کو دعوت کے رقعوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ آج کی دعوۃ سے ایک نئے دوست کو آپ کی سوسائٹی میں انٹروڈیوس کرنا منظور تھا چنانچہ اگرچہ میرے اکثر حالات غدر بھی آپ سب صاحبوں نے بار بار میری زبان سے سنے ہیں مگر میرے حق میں وہ ایسے دلچسپ ہیں کہ ہر بار کے بیان کرنے میں مجھ کو ایک نیا مزا ملتا ہے اور اس میں قیاس اور امید بھی کرتا ہوں کہ محل پر ان کا بالتفصیل اعادہ کرنا نہیں بلکہ مختصر طور پر ان کی طرف اشارہ کر دینا کسی صاحب کی طبیعت پر ناگوار نہیں گزرے گا (ہرگز نہیں ہرگز نہیں) یہ ہرگز میرے خیال میں نہیں آیا کہ غدر میں مجھی پر سب سے زیادہ مصیبت پڑی مگر اتنا تو میں ضرور سمجھتا ہوں کہ میرے حصے کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی مجھ کو غدر نے اچانک آ دبایا جب کہ میں بہ عزم ولایت بمبئی جاتے ہوئے علالتِ مزاج کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے مسافرانہ دہلی کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا - میرا جان پہچان یا دوست یا دردمند جو کچھ سمجھو میرا ایک ذاتی ملازم تھا جو اب بھی میرے پاس ہے اور وہ بمبئی تک میرے ساتھ جانے والا تھا - مجھ کو اس شدت کا درد سر تھا کہ تکیے پر سے سر نہیں اٹھا سکتا تھا دفعۃً دین دین اور علی علی کا غل سن پڑا اور ایک منٹ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ شہر کی بازاری خلقت بنگلے میں ٹوٹ پڑی میرا آدمی مجھ کو پیچھے معلوم ہوا میری دوا کے لیے شفاخانے گیا ہوا تھا ان ہی لٹیروں میں سے پانچ چار نے مجھ کو

[1] جوتا ۱۲ [2] چرخ کی طرح کا انگریزی پنکھا ۱۲ [3] تقریب ملاقات ۱۲

کشاں کشاں کشمیری دروازے باغیوں کے گارد میں لے گئے وہاں میں نے دیکھا کہ اور چند انگریز مرد اور عورتیں اور بچے قیدیوں کی طرح زمین پر بیٹھے ہیں مجھ کو بھی اُن ہی میں بٹھا دیا مگر ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ درد سر جو ایک لمحے کے لیے مفارقت نہیں کرتا تھا اور جس نے مجھ کو ولایت جانے پر مجبور کیا تھا اُس وقت بالکل زائل ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آدمی کو دیکھا کہ تماشائیوں میں ملا ہوا مجھ کو دیکھ رہا ہے اُس کا چہرہ اداس تھا اور اُس کی صورت پریشان مگر وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تو وہ مجھے کیا فائدہ پونہچا سکتا تھا۔ لیکن جب جب میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا کسی نہ کسی طرف اُس کو کھڑا ہوا پایا اس سے میں سمجھا کہ وہ میری مصیبت پر متاسف ہے حالات کی مصیبت کا بیان کرنا دیر طلب بات ہے اور میں اُس کے تذکرے سے سکوت کرتا ہوں کیوں کہ مجھ کو کچھ اور بھی کہنا ہے تیسرے دن ہم سب کو گھیر کر میگزین کے میدان میں لے گئے اور جب تک قلعے کے حوالاتی آئے ہم کو کھڑا رکھا پھر سب کو بٹھا کر باڑ مار دی اُس وقت تک بھی میں نے اپنے آدمی کو کالج کے دروازے کے پاس دیکھا شاید میرا دماغ مدتوں کے دردِ سر سے ضعیف ہو رہا تھا کہ باڑ کے صدمے سے یا زخموں کی وجہ سے مجھ کو غش آگیا۔ اس وقت تک جو کچھ میں نے بیان کیا وہ میری ذاتی معلومات ہے اس کے بعد جو میں نے آدھی رات کے بعد آنکھ کھولی اور مجھ کو ہوش آیا تو میں نے اپنے تئیں (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے) ان کے مکان میں پایا جن سے ملنے کو میں نے آپ صاحبوں کو بلایا ہے (چیئرز) میں یہ بات کچھ اس نظر سے نہیں کہتا کہ اپنے وفادار نوکر کی خیر خواہی کو میں اعلیٰ درجے پر نہیں خیال کرتا۔ مگر اُس پر میرے احسانات اور نمک کے حقوق ثابت تھے۔ مگر ان صاحب کو بلکہ ان کے معزز خاندان میں سے کسی کو بھی کسی انگریز سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا۔ انھوں نے چند سال تک دہلی کالج میں مشرقی علوم کی تعلیم پائی اور کالج چھوڑنے کے بعد اپنی موروثی خدمت پر شاہی ملازموں میں جا ملے پس عام ہمدردی اور نیک دلی کے سوائے اور کوئی خیال ان کی میری پناہ دہی کا محرک نہیں ہو سکتا تھا آپ میری شکل و صورت کو دیکھتے ہیں کہ اگر میں بھیس بدل کر ہندوستانیوں میں ملنا چاہتا تو رنگ اور بال اور آنکھیں ہر چیز میرا پردہ فاش کرنے کو موجود تھی اس کے علاوہ ان کا گھر خانقاہ ہے جس کو مجاہدین کا اکھاڑا کہنا چاہیے بہت ہی قریب ہے پس میرا پناہ دینا بڑی ہی خطرناک بات تھی خصوصاً ملازم شاہی کے حق میں پھر مدارات جو انھوں نے کی شروع سے اخیر تک یکساں تھی اور یہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ میری پناہ دہی میں کسی غرضِ دنیاوی کو مدخل نہ تھا میں ان باتوں کو چنداں اپنی احسان مندی ظاہر کرنے کے ارادے سے ذکر نہیں کرتا بلکہ آپ صاحبوں کے ذہن سے اس غلط اور بے اصل خیال کو نکالنا چاہتا ہوں کہ حکومتِ انگریزی کا سب سے بڑا دشمن مذہبِ اسلام ہے بانیِ اسلام نے بالتخصیص عیسائیوں کی نسبت قرآن میں اپنی رضامندی اور خوشنودی صاف طور پر ظاہر کی ہے انھوں نے اپنے معتقدین کے لیے ہمارے ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا جائز قرار دیا ہے اور میں نے قسطنطنیہ اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ بے تامل کھاتے پیتے ہیں اور اُن کا لباس بالکل ہم لوگوں کا سا ہے صرف قرآن کا شعارِ قومی مابہ الامتیاز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا دو بڑے ذریعے اتحاد پیدا کرنے کے ہیں اور ان دونوں باتوں کی اجازت سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کو منظور تھا کہ اُن کے گروہ کے آدمی ہم لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھیں

ــــــــــــــــ

ل نعرۂ تحسین ۱۲ -

اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سوائے اَور ملکوں کے مسلمان اِس حکم کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی صحبت نے بڑے نقصان پہونچائے ہیں ۔ ازانجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہو کہ یہاں کے مسلمان ان ہی کی طرح تنگ اور وہمی ہو گئے ہیں پس جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے ہو ہرگز مذہبی نہیں ہو بلکہ ایک رسم ہو جو اُنھوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہو اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں ہرگز اِس نفرت میں شریک نہیں مجھ کو معلوم ہو کہ دہلی کے مسلمانوں میں جو مستند عالم تھے باغیوں نے ہر چند اُن پر سختی کی مگر اُنھوں نے جہاد کا فتوےٰ دینے سے انکار کیا اور اُن ہی انکار کرنے والوں میں یہ میرے دوست بھی تھے ۔ اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باغیوں میں بہت سے مسلمان بھی ہیں مگر کون مسلمان اکثر عوام الناس یا جی کمینے رذیل جن کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں یا اگر کسی سردار مسلمان نے بغاوت کی ہو تو مذہب کو اُس نے صرف آڑ بنایا ہو اور اصل میں غصہ یا لالچ یا کوئی اَور سبب محرک ہوا ہو جس طرح ہماری قوم ہمیشہ سے بہادری میں نامور رہی ہو اسی طرح ہمارا سچا مذہب بردباری اور درگزر میں اور خدا کی مقدس مرضی نے ہم کو اِن دونوں صفتوں میں آزمانا چاہا ہم بہادری کی آزمائش میں خدا کے فضل سے پورے اُترے اب ہم کو دوسری آزمائش میں پورے اُترنے کی کوشش کرنی چاہیئے جب تک ہم مغلوب تھے ہم نے بہادری سے کام لیا اب ہم کو خدا نے غلبہ دیا ہو تو چاہیئے کہ بردباری اور درگزر سے کام لیں قدرت پا کر معاف کر دینے سے ایشیائی قومیں ہم کو ضعیف سمجھنے کے عوض بہت زیادہ طاقتور خیال کریں گی ۔ سلطنت کی عمارت میں بہادری نے اگر گارے کا کام کر دیا ہو تو بردباری چونے گچ کا کام دے گی (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے) اِنھوں نے مجھ پر اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہو کہ آیندہ ہندوستانیوں یعنی کم سے کم اپنے ہم قوم مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اگر اِنھوں نے ایسا کیا اور مجھ کو پورا بھروسا ہو کہ ضرور کریں گے تو گورنمنٹ کو چاہیئے کہ میری پناہ دہی سے بڑھ کر اِن کی اُس کوشش کی قدر کرے میری پناہ دہی کے صلے میں گورنمنٹ نے اِن کو ڈھائی سو روپیہ ماہوار کے منافع کی زمینداری عطا فرمائی ہو اور اکسٹرا اسسٹنٹی کی خدمت جو ہندوستانی کے لیے اعلیٰ درجے کی نوکری ہو ۔ تمام زمانۂ غدر میں اِن کے پاس رہنے سے مجھ کو اِن کے تفصیلی حالات معلوم ہیں علوم مشرقی کے یہ بڑے عمدہ سکالر ہیں اِنھوں نے دہلی کالج میں جغرافیہ و تاریخ اور پولیٹکل اکانمی اور ریاضی وغیرہ علوم بخوبی پڑھے ہیں اِن کی عام معلومات اونچے درجے کی اور قابل قدر ہیں اِن کو اخبار بینی کا بڑا شوق ہو اِن کے خیالات وسیع اور شگفتہ ہیں غرض آپ لوگ اگر اِن کے ساتھ ارتباط پیدا کرنا چاہیں گے تو مجھکو امید ہو کہ آپ اِن کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ ہوں گے اب شاید آپ صاحبوں کو زیادہ دیر تک باتوں میں لگائے رکھنا موجب تصدیع ہوگا اِس واسطے شکرِ قدوم پر تقریر کو ختم کرتا ہوں ۔

انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ہو

مذہب نام ہو انسان کے خاص طرح کے دلی خیالات کا اور اس لفافے کو خدا نے ایسی مضبوطی کے ساتھ بند کیا ہو کہ ایک کے ضمائر پر دوسرا شخص کسی ڈھب سے مطلع ہو ہی نہیں سکتا علاوہ بریں مذہب ایک معاملہ ہو بندے میں اور خدا میں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں اور ضرورت بھی نہیں کہ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل دے اِن اصول کی بنا پر ہم کو ابن الوقت کے مذہب سے متعرض ہونے[1] کی کوئی وجہ نہ تھی مگر از بس کہ وہ مسلمانوں کی دنیا و دین دونوں کی صلاح کا مدعی تھا ہم کو چار و نا چار دیکھنا پڑا کہ اِس کے

[1] سیاسۃ مدن ۱۲ ۔

مذہبی خیالات کیا تھے ہم اُن لوگوں سے سُنی ہوئی کہتے ہیں جن کو ابن الوقت کے ساتھ رات دن کی نشست برخاست ہمسایگی اور قرابت قریبہ کے تعلقات تھے کہ اٹھارہ بیس برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رہا کہ جیسے بڑے عابد متشرع مسلمان ہوتے ہیں وہ نوافل اور مستحبات کا اس قدر اہتمام رکھتا تھا کہ ایسا اہتمام فرض و واجب کا خدا ہم کو نصیب کرے پانچوں وقت جامع مسجد کی اوّل جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد صلوٰۃ التسبیح منزل قبل دلائل الخیرات حزب البحر اور خدا جانے اور کتنے اوراد و ظائف جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے ایام بیض کے روزے داخل معمولات تھے پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت اُٹھاتا رہا اُن ہی دنوں لوگ خیال کرتے تھے کہ شاید وہ شاہ حقانی صاحب سے بیعت کرنے والا ہے پھر ایک زمانے میں اس کو ہندو جوگیوں اور سناسیوں کی طرف میلان رہا پھر جو سنبھلا تو اہل حدیث میں جا شامل ہوا جن کو لوگ تعنتاً وہابی کہتے ہیں غدر سے چند روز پہلے وہ پادریوں کا ایسا گرویدہ تھا کہ بس کچھ پوچھو ہی نہیں نوبل صاحب کی صحبت میں اُس کے مذہبی خیالات نے دوسرا رنگ پکڑا یہاں تک کہ انگریزوں میں جا ملا۔ اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ اُس کے مذہبی خیالات میں ایک طرح کا تنزل ضرور تھا۔ مگر تبدیل وضع تک ضرور بابت دین میں اُس سے کمی سرزد نہیں ہوئی بلکہ تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے اُس کو مسجد میں جماعت سے تو نہیں بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا یہاں تک کہ شروع شروع جن دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پرچول اٹھی کچہری کے عملے ہندو و مسلمان سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں اور سویر کی تو کہی نہیں جاتی لگر نماز ابھی تک چھوڑی نہیں ہم تو ہر روز پرائیوٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی عصر کی بھی نماز پڑھتے دیکھتے ہیں لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھنا ذرا تھا مشکل کوٹ تو خیر اُتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا کم بخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم ہی نہیں اُتار رہا اور پھر پہننا بھی دقت سے خالی نہ تھا اس سے کہیں زیادہ دقت طہارۃ کی تھی جو نماز کی شرط ضروری ہے پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیوٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آگھیرا ہے اُن کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا کیوں مسٹر ابن الوقت ہوا خوری کو چلتے ہو یا چلو ذرا انٹا کھیلیں یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور نماز کا التزام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے۔ ایک بڑی قباحت یہ تھی کہ اکثر انگریز مطلق پابندی مذہب کو حمق اور سخافت سمجھتے تھے غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی پھر نوافل پھر سنن جا کر نرے فرض رہے وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا پھر قضائے فائتہ پھر بالکل چٹ کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہ تھا ابن الوقت کو انگریزوں کے پرچانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے ابن الوقت نے کون سی بات اُٹھا رکھی تھی کہ وہ شراب خوری کے الزام سے ڈرتا مگر ہم کو تحقیق معلوم ہے کہ وہ شراب سے نہ بپاس مذہب اسلام محترز تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر نے اس کو ڈرایا تھا کہ اگر تم شراب پیو گے تو کوڑھی ہو جاؤ گے اس پر بھی بہت سے انگریزی کھانے ہیں کہ شراب ان کے مسالے میں داخل ہے بہتیری دوائیں ہیں کہ بدون شراب کے نہیں بن سکتیں بلکہ ان لوگوں کی

طب میں شراب خود دوا ہی کیثیر الاستعمال انگریزی تمدن اختیار کرنا اور شراب سے پرہیز رکھنا ایسا ہی کہ کوئی شخص کو ئلوں کی دوکان
میں رہے اور مونھ کالا نہ کرے رہی انگریزی سوسائٹی کے بڑے معزز ممبر کتے کیوں کر ممکن تھا کہ جان نثار جو ابن الوقت کی
تبدیل وضع میں مشاطہ کا کام دے رہا تھا انگریزیت کی شرطِ ضروری کو بھول جاتا اُس نے پہلے ہی سے ابن الوقت کے لیے کئی
قسم کے کتے بہم پونہچا رکھے تھے اِن میں ایسے بھی تھے کہ ہر وقت ہم زاد کی طرح ابن الوقت کے ساتھ لگے رہتے تھے غرض تبدیل
وضع سے ایک ہی مہینے کے اندر اندر ظاہر اسلام کا کوئی اثر ابن الوقت اور اُس کے متعلقات میں باقی نہ تھا اگر کوئی انجان آدمی
ابن الوقت کی کوٹھی میں جا کھڑا ہوتا ہرگز نہ پہچان سکتا کہ اِس میں کوئی انگریز رہتا ہی یا ہندوستانی بھلا آدمی جس کو انگریزی کے خبط
نے گھر سے خاندان سے ابنائے جنس سے شہر سے چھڑا کر تن تنہا جنگل میں لا کر ڈال دیا ہی کسی انسان سے کسی طرح کی غلطی ہونا کچھ
تعجب کی بات نہیں مگر یہ کہ خدا نے اُس کو معصوم پیدا کیا ہو ابن الوقت سے بھی ایک غلطی ہوئی کہ اُس نے تبدیل وضع کو مفید
سمجھا یہاں تک اِس غلطی سے اِس کے یا کسی دوسرے کے حق میں کوئی بڑی قباحت پیدا نہیں ہو سکتی تھی مگر آدمی تھا ذہین کم بخت
لگا اپنے افعال کے جواز و استحسان کی تاویلیں گھڑنے اول تو اصرار خلقۃً اُس کے مزاج میں داخل تھا دوسرے مسلمانوں نے جو اِس
کی تمام حرکات و سکنات کو ارتداد کہنا شروع کیا اِس سے اِس کی ضد اَور بھی بڑھتی گئی اور مسلمانوں کو تو خیر اُس سے کوئی فائدہ پہنچا
ہو یا نہ مگر بابِ تاویل مفتوح کر کے اِس نے مذہبِ اسلام میں تو بڑا بھاری رخنہ ڈال دیا۔ انگریزی تعلیم کی گھُوس عمارت مذہب
کے پیچھے ایسے پنجے جھاڑ کر پڑی ہی کہ کھود کھود کر سارے مذہبوں کی جڑیں کھوکلی کر دیں حتیٰ کہ عیسائیت کی بھی اسلام کے حصے
کی دیمک اَور نکل پڑی قیدِ مذہب سے طبیعتیں تھیں ملول اُکتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا کیا کریں دل تو ہمارا بھی بہت للچایا ہی
کہ چلیں ابن الوقت کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور امر و نواہی کی کشمکش سے نجات ملے مگر کانشنس[1] بھی چین لینے دے۔

ابن الوقت کا انگریزی طرز سے متاذی ہونا

الغرض ابن الوقت کی نسبت لوگوں کے اِس قسم کے خیالات تھے ہندوستانی سوسائٹی میں باستثنار معدودے چند جھوں نے اُس کی وضع کی تقلید کر لی تھی کوئی اُس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ انگریزوں میں اعلیٰ درجے کے انگریز وہ بھی
سب نہیں البتہ اُس کے خیالات کی قدر و قعت کرتے تھے بہر کیف اُس کے مخالف بہت تھے اور یہ بات خود ابن الوقت
کو بھی معلوم تھی اور یہ خیال اُس کو اکثر رنجیدہ رکھتا تھا اُس کے اپنے بی بی بچے تو سب غدر سے پہلے مر کھپ چکے تھے اور
بے تعلقی اگر باعث نہیں ہوئی تو اُس کی آزادی میں مؤید تو ضرور ہوئی تاہم وہ بھائی بھتیجوں اور دوسرے رشتہ داروں
کی مفارقت کے خیال سے بھی متاذی ہوتا تھا رشتہ دار تو رشتہ دار ایسے ہندوستانی سوسائٹی کے چھوٹ جانے کا بھی افسوس تھا
اور ہم نے تحقیق سنا ہی کہ اُس نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہی
مگر میرا یہ حال ہی کہ انگریزی کھانے کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی سچ تو یہ ہی کہ ایک دن مجھے سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں
اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ہی کہ ایک بار اُس
سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی

[1] قلب۔ دل ۱۲

پلاؤ زردہ متنجن بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا دھوئی ماش کی پھریری دال قلمی بڑے کباب امرودوں کے کچالو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔ معلوم ہے کہ ابن الوقت ابتدائے تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا اُس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اُس کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اُس کی زندگی ویسی ہی اداس زندگی تھی جیسے ایک بیچلر[1] کی ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم آقا تھا۔ اُس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی اس لیے کہ اُس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے۔ اور حق بات یہ ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اُس کی اتنی بات بھی بنا رکھی تھی مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لیے بہ مشکل وفا کرتا تھا یہ سچ ہے کہ اُس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نخواہی اُس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اُس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی ہم کو تو کوئی دعوت ایسی یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اُس کے بعد علیل نہ ہوا ہو پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین۔ بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اُٹھتا تھا کہ یہ میں نے کہاں کا کھٹراگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے تو مہمانی کی لذتیں تھیں میزبانی کے ذائقے اِن سے بھی زیادہ تلخ۔ اگر سٹیشن میں کسی انگریز کے یہاں کھانا ہوا اور اُس نے ابن الوقت کی دعوت نہیں کی اور ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا تو اُس کے دل پر ایک صدمہ گزر جاتا تھا اور وہ اُس کو اپنی تذلیل سمجھتا تھا نہ صرف انگریزی سوسائٹی میں بلکہ جی ہی جی میں اپنے نوکروں تک سے کئی کئی دن شرمندہ رہتا تھا اور اگر اُس کا بھی بلاوا ہوا تو صاحب خانہ کے گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کو ان فکروں نے آ گھیرا کہ کسی کی کیسی آؤ بھگت ہوئی کون لیڈی کس صاحب کے پاس بیٹھی اور اگر یہ کھٹکا رہ گیا یا کوئی چیز اپنے یہاں سے بہتر نظر پڑ گئی تو وہ دعوت اُس کے لیئے عداوت ہو جاتی تھی۔ الغرض انگریزی سوسائٹی کے داخل ہونے کے خبط نے اُس کو ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ دن رات میں دو چار منٹ کے لیئے وہ بھی شاید اُس کو خوشی ہوتی ہو تو ہوتی ہو ورنہ جب دیکھو منغص جب دیکھو آزردہ۔ ذرا سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص دنیا میں اس قدر منہمک ہو اُس کو دین داری سے کیا سروکار سچی دین داری کی بڑی شناخت ہے زہد جتنا جس سے ہو سکے اور کجا زہد اور کجا یہ فضول و لایعنی بکھیڑے سو بھی ہم نے ابھی تک سب نہیں بلکہ نمونے کے طور پر بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا ہے ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل در پیش تھی کہ وہ تو کہیے ہاتھ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو کسی طرح جھیلتا رہا دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا اور پھر ساری عمر انگریزی سوسائٹی کا نام نہ لیتا ہاتھیوں کے ساتھ گنّے کھانا ایسا کیا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے۔ ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصا خوش حال تھا قلعے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا ہمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز

[1] مجرد۔ اکیلا

کم وہ تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں نہ سو نہ سوا سو ماشاءاللہ ایک دم سے پانسو اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھانا اچھے سے اچھا پہننا غرض امیرانہ خرچ رکھتا مگر ہندوستانیوں کا سا تو چند سال کے عرصے میں اُسکے پاس معتد بہ سرمایہ ہوجاتا لیکن اُس نے کرنی چاہی انگریزوں کی ریس پورا سال بھر بھی خیریت سے گزرنے نہیں پایا تھا کہ لگا اُدھار کھانے جس وقت اُس کو جان نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی شان دیکھ کر اُس کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپراسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لیئے ہوئے برآمدے تک آیا قاعدے کی مطابق بیرے[۵۱] نے لفافہ کشتی میں رکھ نئے صاحب کے حضور میں پیش کیا کھولا تو جنرل سپلائر کا بل تھا۔ کتنے کا۔ کچھ اُوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواسِ خمسہ مختل ہوجائیں۔ مگر سنگ آمد و سخت آمد چون و چرا کرنے کا موقع نہیں قہرِ درویش برجانِ درویش دینا ہی پڑا مگر کیوں کر ہزار کا توڑا نوبل صاحب کا دیا ہوا سربند رکھا ہوا تھا وہ لیا اور بہ ہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کیے پھر بھی سوا دو ہزار اَور ہوں تو پنڈ چھوٹے بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحب کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑوالوں کا لین دین تھا ڈرتے ڈرتے اُن کو رقعہ لکھا اسامی تھی کھری اور جان وار اُنھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا یوں جنرل سپلائر کا پوت پورا ہوا رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ لیکن ابن الوقت نے تو خرچ کا ڈربا کھول دیا تھا جس نسبت سے اُس کی آمد بڑھی تھی اگر اُسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی پر اُس نے لیٹنے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلا دیئے اول سرے گھر کے تہرے چوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپے مہینے کا بنگلہ پھر فٹن ٹمٹم (ڈینڈم) بروہم۔ پالکی گاڑی چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا پانچ۔ دھوبی۔ سقا۔ چوکیدار۔ فراش مشعلچی۔ باورچی میٹ۔ سائیس۔ گراس کٹ۔ مالی۔ بہرا۔ دو ڈھائی درجن کے قریب لشا کر دو پیشہ۔ اُن کی تنخواہیں اور تنخواہوں کے علاوہ وردی اُسی کی مناسبت سے دوسرے مصارف یا استغنا سبزکہ اُس کا کچھ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مہینے میں اچھے جیّد دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا کچھ بات نہیں۔ ابن الوقت نے شروع شروع میں شاید تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہوگیا ایک چھوڑ دو مہاجن دینے والے جب ضرورت ہوئی جس سے جتنا چاہا منگوا لیا۔ تنخواہ تو اوپر سے اوپر خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑوالوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا ان بچہ کو انگریز بننے کی دُھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پر کتنا قرض لدتا چلا جا رہا ہے تو اپنے ان خیالات میں مست تھا کہ صاحب کمشنر مجھ کو مائی ڈیر[۵۲] ابن الوقت اور اپنے تئیں یور سینسرلی[۵۳] لکھتے ہیں۔ چیف کمشنر نے سالانہ رپورٹ میں میری کارگزاری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ جوڈیشل کمشنر نے ایک فیصلے میں میری نسبت یہ لکھا ہے کہ اس کی طبیعت کو قانون سے فطرۃً مناسبت ہے فنانشل کمشنر نے فلاں سرکلر کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا اُن کی چٹھی موجود ہے اب جو چھپ کر آیا تو میں دیکھتا ہوں ایک لفظ کا رد و بدل نہیں کیا۔ قانونِ شہادت کی فلانی دفعہ میرے اصرار سے بڑھائی گئی یجس لیٹف کونسل کے لیگل ممبر نے مجھ کو چٹھی میں اطلاع دی مگر نہیں معلوم اپنی اسپیچ میں میرا تذکرہ کیوں نہیں کیا یا تو رپورٹر کی فروگزاشت ہے یا ممبر صاحب کو اُس وقت خیال نہ رہا ہوگا۔ فلاں صاحب نے ولایت سے میرا فوٹوگراف منگوایا ہے اور لکھتے ہیں کہ میم صاحب متقاضی ہیں۔ اوہو مس جوزفا جو ہمارے ڈائننگ روم[۵۴] کی تصویروں کو بہت پسند کرتی تھی اور گھنٹوں ہمارے کتوں سے

[۵۱] انگریزوں کا خدمتگار ۱۲ [۵۲] عزیز من ۱۲ [۵۳] تمہارا مخلص ۱۲ [۵۴] کھانے کا کمرہ ۱۲

کھیلا کرتی تھی ابھی ولایت کی ڈاک میں اُس کی ماں کی چٹھی آئی ہے ایک بڑے سوداگر کے ساتھ اُس کی شادی ہونے والی ہے۔ میجر صاحب نے آئیس کریم (ملائی کی برف) جمانے کے لیے ہمارے آدمی کو بلا بھیجا ہے یہاں سے برف ہی جمواکر نہ بھیج دی جائے۔ کرنیل صاحب کا اسباب نیلام ہوگا تو دو گھوڑے ہم ضرور لیں گے کیونکہ ہم نے خوب خیال کر کے دیکھا تو ہمارے دو گھوڑے ہمیشہ صاحب لوگوں کی سواری میں رہتے ہیں اور چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کو تو ہم اُن سے زبانی کہہ چکے ہیں پرسوں کیا اتفاق ہوا کہ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا کپتان صاحب اور اُن کی میم آتے ہوئے ملے بڑے تپاک سے صاحب سلامت ہوئی میم صاحب کے ہاتھ میں ایک پھول تھا اُنھوں نے میری طرف پھینک دیا کپتان صاحب بولے مسٹر ابن الوقت میرے پاس کوئی پھول نہیں کہ میں تم کو دیتا تو میں نے کہا آپ کے پاس تو نہایت خوب صورت گلدستہ ہے میم صاحب نے اس کا بڑا شکریہ ادا کیا اور دونوں میاں بی بی ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ فرنڈ آف انڈیا[1] نے ایک آرٹکل میں مجھ کو مسلمانوں کا مشہور ریفارمر لکھا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی رٹ نہیں لگ جاتی ہیں ابن الوقت کو انگریز بننے کی رٹ تھی شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اُس کی ساری ریفارم اسی میں منحصر ہوگئی تھی کہ انگریزی اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طور چھوٹنے نہ پائے کم بخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اُس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اِس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں میں ملتا جلتا ہے جو بات کسی ہندوستانی عہدہ دار کو نصیب نہیں اُس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع کی ہیبت بھی ہے بس احمقوں کو اتنے موجبات ترغیب کافی تھے مگر ہے یہ کہ انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اُٹھایا اور شاید نقصان نہ بھی اُٹھایا ہو تو کسی کو کسی قسم کا فائدہ تو نہیں ہوا کسی جگہ شروع کتاب میں لکھا جا چکا ہے کہ نوبل صاحب کو ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد سر ہر وقت رہتا تھا اور اُسی کے علاج کے لیے رخصت لے کر ولایت جا رہے تھے کہ غدر کی وجہ سے دلّی میں گھر گئے کیا خدا کی شان ہے کہ نہ دوا نہ درمن سارے غدر اور غدر کے بعد بھی مدتوں تک اب اُس درد کا کہیں پتہ نہ تھا ہر چند اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے اُن کا جی ولایت جانے کو چاہتا تھا مگر دیکھتے تھے کہ سلطنت متزلزل ہو رہی ہے کام کی ہر جگہ کثرت ہے ایسے وقت میں تو اگر صاحب ولایت بھی ہوتے تو اُن سے ایک دن وہاں نہ ٹھیرا جاتا کیسے ہو سکتا تھا کہ اِس حالت میں چلے جائیں چنانچہ اُنھوں نے اپنے گھر لکھ بھیجا تھا کہ جب تک تمام ملک میں انتظام سابق دستور نہ ہو جائے میں قصد نہیں کر سکتا جوں جوں بغاوت فرو ہوتی گئی اُس درد کی کسک اُبھرتی چلی ایک بار اُنھوں نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو چیف کمشنر صاحب نے فرمایا کہ تم جا تو سکتے ہو مگر میں چاہتا تھا کہ تحقیقات بغاوت کا کام تمہارے ہاتھ سے اختتام پاتا۔ خیر یہ پھر چپ ہو رہے لیکن درد سر روز بروز زور پکڑتا جاتا تھا یہاں تک کہ ۱۸۵۸ء کی گرمیوں میں تو یہ حال ہو گیا کہ جس روز گرمی کا اشتداد ہوتا سارے سارے دن اُن سے اُٹھا نہیں جاتا تھا اور ڈاکٹر تو مدتوں سے کہہ رہا تھا اب اُس نے بھی سختی کی کہ اگر تم برسات میں ٹھیرو گے یقیناً ہلاک ہو جاؤ گے میں نے تمہارے درد سر کی نسبت بخوبی تشخیص کر لی ہے کہ سمندر کی ہوا کے سوائے اس کی اَور کوئی دوا نہیں مگر صاحب کا ارادہ تھا

[1] ایک انگریزی اخبار ۱۲

کہ آخری رپورٹ روانہ کروں تب جاؤں کام بھی بہت سمٹ آیا تھا لیکن قاعدہ ہے کہ کام کا پچھا ہی بھاری ہوتا ہے برسات
چلی آرہی تھی اور ابھی رپورٹ کا لکھنا بھی شروع نہیں ہوا تھا مگر کیا استقلال ہے اور کس قدر کام کا درد ہے کہ ڈاکٹر بھی متقاضی تھا
اور دردِ سر بھی برسرِ ترقی تھا نوبل صاحب کا یہ حال تھا کہ دردِ سر نے بہت ستایا پڑ رہے پھر ذرا طبیعت سنبھلی اُٹھ بیٹھے کام کرنے لگے
غرض اس بندۂ خدا نے رخصت کا نام ہی لینا چھوڑ دیا صاحب کمشنر نے اپنے طور پر اس کی اطلاع چیف صاحب کو دی وہاں
سے حکم آیا کہ باقی ماندہ کام صاحب کلکٹر کو دو اور تم رپورٹ کا مواد لے کر فوراً ولایت کو روانہ ہو جاؤ چیف صاحب یقین کرتے
ہیں کہ جہاز میں تمہاری طبیعت درست ہو جائے گی اور تم ولایت جا کر رپورٹ طیار کرنا اور تمہارے سفر اور قیام ولایت کا
زمانہ سروس میں شمار کیا جائے گا اور تم کو پوری تنخواہ دی جائے گی۔

لطیفہ غرض جس وقت یہ ناول شائع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں آیا تو چاروں طرف ایک کہرام مچ گیا جو لوگ پرانی
ہندوستانی وضع پر قائم تھے لگے بغلیں بجانے اور خوشی کرنے بلکہ پابندانِ وضعِ انگریزی پر پھبتیاں اُڑانے اور جو لوگ
انگریزی وضع کے پابند تھے وہ لگے کھچڑی پکانے کہ یہ ہم لوگوں پر آوازہ کسا گیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ آنریبل مسٹر سید محمود
مرحوم نے مولانا سے شکایت کی کہ ابن الوقت آپ نے میرے والد پر لکھی ہے خلافِ توقع۔ مولانا نے کہا کہ انگریزی وضع
کے مقلدوں کو بلاحی گالیاں دی ہیں جو چاہے گالیاں اپنے اوپر لے۔ مسٹر محمود مرحوم کے اس اعتراض کا ایک یہ جواب تو مولانا
نے دیا دوسرا جواب اُن کے پاس یہ ہے کہ سید احمد خاں کو باؤلے کتّے نے کاٹا تھا کہ ناحق بیٹھے بٹھائے اپنے تئیں
انگشت نما کر لیا۔ نہیں نہیں سید احمد خان کے درد کو ہر شخص نہیں پا سکتا اُن میں بڑی صفت یہ ہے کہ ہم میں سب سے پہلے
زمانے کی رفتار کو پہچانتے اور مسلمانوں کو آگاہ کر دیتے اُن کی مثال مسلمانوں کے ساتھ ایسی ہے کہ گرمی کے دنوں میں
ہمارے ہندوستان کے بعض مقامات میں ایسی سخت لو چلتی ہے کہ خدانخواستہ آدمی کو لگ جائے تو پھٹکا نہ کھائے۔ ایسی
ہی جگہ ایک شخص نے مئی جون کی ساری رات لغویات میں بسر کی صبح ہوتے سو رہا۔ دن چڑھتا چلا آتا اور وہ دھوپ میں
کھلی چھت پر غفلت کی نیند میں پڑا سوتا ہے اور لو کوئی دم میں چلی کہ چلی۔ اس کا ایک رفیق دردمند اس کو جھنجھوڑتا اور
چلاتا کہ خدا کے لیے کیا غضب کرتا ہے اُٹھ بھاگ۔ اور یہ شخص ہے کہ اُلٹا اُس رفیق پر جھنجھلاتا کہ کیوں میری نیند خراب کرتا ہے
معلوم ہے کہ دھوپ کی تیزی اُس کو سونے نہیں دے گی۔ اور یہ جاگے اور اس کا اچھا جاگے مگر اس کا بھی تو ڈر ہے کہ کہیں
سونے کا سوتا ہی نہ رہ جائے۔ اسی طرح جو کچھ سید احمد خاں کہتے ہیں مسلمان اگر دنیا میں رہنا چاہیں گے تو کریں گے اور
اس سے بڑھ کر کریں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ اچھی طرح مٹ لیں گے پیٹ بھر کر خراب ہو لیں گے۔ تب کہیں جا کر سمجھیں گے
سمجھیں میں جانتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ سب لوگ کیوں نہیں جانتے کہ سید احمد خان کے دل میں انگریزی وضع کی
ذرا بھی وقعت نہیں اور وہ سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ وضع ہماری ملکی حالت کے بھی مناسب نہیں۔ مگر ان کو اس وضع کے
اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دینے پر مجبور کیا ہے دو چیزوں نے اوّل یہ کہ انگریز ٹھیرے
حکّامِ وقت ان کی نسبت سے ان کی کل چیزوں میں وقار آگیا ہے از انجملہ وضع میں بھی تو وہ مسلمان وہ وقار کیوں پیدا نہ کریں
دوسرے یہ کہ دنیاوی ترقی کے لیے جہاں تک ممکن ہو ہم کو چار و ناچار انگریزوں کے ساتھ سازگاری رکھنی اور اُن کی پیروی کرنی

ضرور ہے اور اس کی جہاں اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہم اُن کے ساتھ اُن ہی کی زبان میں گفت وگو کر سکیں اُن ہی کے طور پر رہیں کہ اس سے اختلاط میں آسانی ہوتی ہے اور ان دو غرضوں کے علاوہ ایک اہم مطلب اور ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے مذہب کو ہندوؤں کے دھرم کی طرح چھوئی موئی بنا رکھا ہے ذرا ٹھیس لگی اور کملایا۔ اور یہ خیال اُن کو پنپنے اور اُبھرنے نہیں دیتا۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ مونھ سے کہتا اور دل سے اس کا عقیدہ رکھتا اور عقیدہ نہ رکھے گا تو اس آزادی کے زمانے میں مونھ سے کہنے ہی کیوں لگا۔ کوٹ پتلون پہنے ہے اور مسلمان ہے میز پر چھری کانٹے سے کھا رہا ہے اور مسلمان ہے۔ انگریزی زبان بول رہا ہے اور مسلمان ہے۔ غرض اس کا سارا ظاہر انگریزوں کا سا ہے اور مسلمان ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے مولانا نے سرسید کے پردے میں ابن الوقت تصنیف نہیں کی۔ صرف وضع انگریزی کی برائیاں ظاہر کی ہیں اور اگر مولانا سرسید کی وضع پر اعتراض کرتے تو ابن الوقت کے پردے میں کیوں کہتے جب کہ خود روبرو سرسید کے مونھ پر بے تکان اعتراض کر بیٹھتے تھے اور سرسید اس کا ذرا برا نہیں مانتے تھے۔ جیسا کہ بارہا لکچروں کے مواقع پر ہوا ہے۔ ابن الوقت اور اُن کے بھائی مولوی حجۃ الاسلام صاحب سے جو مباحث مذہبی ہوئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اُن تین بحثوں میں سے ہم نے صرف ایک مباحثہ نمونۃً ذیل میں درج کیا ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے۔

حجۃ الاسلام اور ابن الوقت کی ملاقات اور مذہبی گفتگو کی ابتدا بحث

نماز کے بعد دونوں بھائی ملے تو ابن الوقت نے کہا بنگلے کو تو آپ دیکھ چکے ہیں اب اپنی آسایش کے موافق اسباب کے جہاں تہاں رکھنے کا حکم دیجئے اور تمام بنگلے پر تصرف کیجئے افسوس ہے کہ کمرے کم ہیں اور چھوٹے ہیں لیکن میں نوبل صاحب کی کوٹھی میں بھی چلا جا سکتا ہوں۔ حجۃ الاسلام۔ میں نے جس وقت دہلی آنے کا ارادہ کیا اُسی وقت یہ بات بھی دل میں ٹھیرا لی تھی کہ تمہارے ہی پاس ٹھیروں گا چنانچہ تم کو لکھ بھی بھیجا تھا اب اگر تم دوسری کوٹھی میں چلے گئے تو میرا یہاں ٹھیرنا بھی بے لطف ہے۔ ابن الوقت۔ لیکن تنگی کے ساتھ رہنے میں اس سے زیادہ بے لطفی ہوگی۔ میں بھی بہ مجبوری اس بنگلے میں پڑا ہوں اس کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنگلہ رہنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔ بلکہ شاید کسی خاص طرح کا آفس یا گودام رہا ہوگا میں شروع سے چھاؤنی میں رہتا تھا وہ بنگلہ اس قدر وسیع تھا کہ کبھی کبھی چار چار صاحب لوگ بھی میرے یہاں مہمان رہے ہیں اتنا بھی تو نہیں معلوم ہوا کہ کدھر پڑے ہیں مدۃ کے قیام میں اس کو میں نے اپنی مرضی کے مطابق درست کر لیا تھا کمروں کی وسعت کے مناسب فرنیچر بہم پہنچایا تھا بڑی محنت سے خانہ باغ آراستہ کیا تھا گرمی کی وجہ سے کچھ یوں ہی سی روارۃ ہوا میں ہوئی کمانڈنگ افسر نے ڈر کے مارے فوجی عہدہ داروں کے علاوہ جتنے لوگ چھاؤنی میں تھے دفعۃً سب کو اٹھا دیا ہر چند تلاش کیا کوئی بنگلہ ڈھب کا نہ ملا ہار کر یہ بنگلہ لیا تو اس میں بھی دو کمرے میں نے اپنی تجویز سے زیادہ کئے ہیں اس پر بھی مطلق گنجایش نہیں اسباب برآمدے میں پڑا پڑا خراب ہو رہا ہے۔ لوکیلٹی چنداں بری نہیں مگر خوف ہے کہ کہیں تنگی کی وجہ سے تن درستی میں خلل نہ آ جائے۔ حجۃ الاسلام۔ سچ ہے انسان بھی عجیب قسم کا مخلوق ہے پھیلنا چاہے تو یہاں تک کہ دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند اور سکڑنے پر آئے تو اتنا کہ دہ درویش در گلیمے بخسپند مجھے تو صرف ایک کمرہ کافی ہے اور میں اپنے گھر بھی ایسے ہی مختصر طور پر رہتا ہوں یوں تو مکان بہتیرا وسیع ہے مگر میرے ذاتی استعمال میں صرف ایک دالان اور ایک حجرہ ہے جن کو لیا

کا مجموعہ تمہارے اس بڑے کمرے کے شاید برابر ہو مگر میں تو سمجھتا ہوں کچھ چھوٹا ہی ہوگا سو دالان اور حجرہ بھی میرے استعمال میں اس طرح پر ہی کہ جاڑے کے دنوں میں تو میں دالان میں کبھی پاؤں بھی نہیں رکھتا حجرے میں میری چارپائی بچھی رہتی ہی چارپائی کے آگے اتنی جگہ ہی کہ فراغت سے پانچ چھ اور ذرا تنگی سے سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں لوگوں سے ملنا جلنا لکھنا پڑھنا کھانا نماز پڑھنا غرض میری اکثر ضرورتوں کے لیئے وہی ایک حجرہ کفایت کرتا ہی اور جب یہ خیال کرتا ہوں کہ اتنی بڑی زمین میں سے آخر کار مجھے چند روز کے لیئے ایک قبر کی جگہ ملے گی نہیں معلوم کہاں اور اس کا بھی پورا یقین نہیں تو بے اختیار حضرت لقمان کا مقولہ یاد آتا ہی ع ان ہذا لمن یموت کثیر[۹۱]۔ ابن الوقت۔ مجھ کو حیرت ہی کہ اس طرح کی زندگی میں آپ کی تندرستی کیوں کر باقی رہتی ہی۔ حجۃ۔ اسی طرح باقی رہتی ہی جس طرح اور لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کی باقی رہتی ہی اور جس طرح اب سے ڈھائی تین برس پہلے خود تمہاری باقی رہتی تھی۔ ابن الوقت کیا خاک باقی رہتی ہی ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے کہ صد ہا آدمی شہر میں ہیضہ کر کے مر چکے ہیں لگا تو ہمارے یہاں بھی لگ چلا تھا شروع شروع میں کچھ آدمی بازار میں مرے پھر بعض صاحب لوگوں کے شاگرد پیشوں میں ہیضہ تو کئی نے کیا مگر شاید صرف دو آدمی ہلاک ہوئے خیر ان لوگوں میں اگر ہیضہ پھیلا تو کچھ تعجب کی بات نہیں کیوں کہ کتنی ہی تاکید کی جائے یہ لوگ صفائی کا اہتمام جیسا چاہیئے نہیں رکھتے پر نہیں رکھتے مگر بارک ماسٹر کے بنگلے میں تین صاحب لوگ آ کر ٹھیرے ہوئے تھے چار گھنٹے میں آگے پیچھے سب نے ہیضہ کیا ایک بچنے تو مرا باقی بچ گئے چھاونی میں اس کا بڑا غل ہوا اور کمانڈنگ افسر نے ڈاکٹر سے کیفیت طلب کی ڈاکٹر صاحب نے بہتیری ہی تحقیقات کی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ بارک ماسٹر کے بنگلے میں ہیضہ کہاں سے آ کودا۔ بنگلہ بڑے اونچے ٹیلے پر واقع اطراف و جوانب میں بنگلے کے شاگرد پیشوں میں کہیں بیماری کا نام نہیں۔ بنگلے کے آس پاس کیا بلکہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے تک تالاب نہیں نالی نہیں خندق نہیں کھیتی نہیں جھاڑ جھنکاڑ نہیں قبرستان نہیں چاروں طرف کف دست میدان بڑا ہی صاف ستھرا آخر سراغ لگاتے لگاتے کیا معلوم ہوا کہ چائے کے لیئے جس گھوسی کے یہاں سے دودھ آتا ہی بھینسوں کو موضع دکھیاری کے تالاب میں لے جا کر پانی پلاتا ہی اور دکھیاری میں اس بیماری کا بڑا ہی زور تھا حجۃ الاسلام یہ سن کر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ واقع میں ڈاکٹر صاحب نے سبب تو خوب گھڑا ہیضہ گانو سے تالاب میں آیا تالاب سے بھینس میں بھینس سے دودھ میں دودھ سے چائے میں چائے سے صاحب لوگوں میں مگر ان ہی ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی پوچھنا چاہیئے تھا کہ دکھیاری میں کہاں سے آیا۔ ابن الوقت۔ عموماً ہندوستانیوں کا اور خصوصاً دیہاتیوں کا اور غربا کا طرز تمدن اس طرح کا واقع ہوا ہی کہ ہندوستان کی سرزمین میں ہر جگہ ہیضے کا بیج موجود ہی گرمی پڑی اور بیج پھوٹا دکھیاری میرا دیکھا ہوا ہی ہوا خوری کی تقریب سے میں کئی بار اس گانو میں ہو کر نکلا ہوں کوئی دو پونے دو سو گھر کی بستی ہی اور ابھی حال میں دس برس کے اندر اندر آباد ہوا ہی معلوم ہوا کہ جس کسی کو گھر بنانا منظور ہوتا ہی ایک جگہ مقرر کر کے وہیں سے مٹی کھود کھود کر دیواریں کھڑی کر لیتا ہی اور یہی سبب ہی کہ کوئی گھر نہیں جس کے پاس گڑھا نہیں گھر کا کوڑا کرکٹ گوبر لاابالان ہی گڑھوں میں ڈالتے رہتے ہیں ہر گڑھا کھاد کا کنواں ہی برسات کے دنوں میں پانی بھر کر سارے برس سڑا کرتا ہی یہ تو بستی کی کیفیت ہی گانو کے قریب ایک تالاب ہی اسی میں عورت مرد نہاتے اور مویشی پانی پیتے ہیں بیچ میں سنگھاڑے بوئے ہیں ایک طرف کو بہت دور تک سن کے انبار پڑے ہیں اور وہیں دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ حجۃ الاسلام

[۹۱]۔ [illegible] یقیناً [illegible] مرنے والا بہت ہے۔

کیا اسی تالاب نے انجنیر صاحب کو مارا ہی - ابن الوقت - نہیں جناب وہ تو سوانے پر کا دوسرا تالاب ہی اور گاؤں کے تالاب سے کسی قدر صاف بھی ہی - حجۃ الاسلام - جو کیفیۃ تم نے دکھیاری کی بیان کی حقیقۃً نفس الامری ہی اور دکھیاری پر کیا موقوف ہی تمام دیہات کا یہی بلکہ صفائی کے اعتبار سے اس سے بدتر حال ہی مگر یہ تو کہو اسی حالۃ میں بعض جو مبتلائے ہیضہ ہوئے اُن میں سے بھی بعض جیتے رہے بلکہ یوں کہو کہ کم مبتلائے ہیضہ ہوئے اور ان میں سے بھی کم مرے تو اگر بارک ماسٹر اور کون اور کون چار انگریزوں کے ہیضہ کرنے کا اور اگر ان میں سے ایک انجنیر کے مرنے کا موضع دکھیاری بہ وسائط چند در چند باعث ہوا ہی تو جو لوگ بالکل ہیضے سے محفوظ رہے اُن کے محفوظ رہنے کا اور جو مبتلائے ہیضہ ہوکر جان بر ہوئے اُن کے جان بر ہونے کا بھی کچھ نہ کچھ سبب تو ضرور ہوگا یعنی اگر مرض اور موت کے لیے سبب درکار ہی تو تن درستی اور زندگی کے لیے بدرجۂ اولی کیوں کہ مرض اور موت کے واقعات کم ہیں اور تن درستی اور زندگی کے کہیں زیادہ - ابن الوقت - میں ایسا سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے مزاج ہیں متفاوت بعض طبائع میں متاثر اور مغلوبِ مرض ہونے کی استعداد قوی ہوتی ہوگی بعض میں ضعیف - حجۃ - تفاوتِ امزجہ سے تمہاری مراد صفراوی بلغمی دموی سوداوی کا اختلاف ہی کیا - ابن الوقت - نہیں نہیں ان تمام مزاجوں کے آدمیوں کو یکساں طور پر مبتلا ہوتے بھی دیکھا اور مرتے بھی دیکھا بلکہ وہ کسی خاص قسم کی کیفیۃ ہوتی ہوگی جو طبیعۃ کو قبولِ مرض کے لیے پہلے سے آمادہ کر رکھتی ہوگی - حجۃ - تو جس کو تم سبب سمجھتے تھے سبب نہ رہا کیوں کہ بدون استعداد طبیعۃ کے اس کا عمل معطل ہی اس کے علاوہ بعض اوقات یورپ کے ایسے مقامات بھی مبتلائے ہیضہ ہوئے ہیں - جن میں صفائی کے بڑے اہتمام ہیں پس تمہارے اصول کے مطابق اُن مقامات میں ہیضے کے پیدا ہونے کا کوئی محل ہو نہیں سکتا مدتوں تک ڈاکٹر اس مرض کو متعدی مانتے رہے بایں شدہ کہ جو شخص بدقسمتی سے اس مرض کی چپیٹ میں آجاتا کوئی اُس کی تیمارداری تک کو کھڑا نہ ہوتا مرے پیچھے اُس کے کپڑے لتے سب جلا ڈالتے مکان میں دھونیاں سلگاتے قلعی پھرواتے مٹی تک کھود کر پھنکوا دیتے اور ابھی تک اکثر بندرگاہوں میں کوارنٹائن (قرنطینہ) کے قواعد کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ مرعی ہی بہرکیف مرض کے متعدی ہونے کی صورۃ میں ممکن ہی کہ ہیضے کا وطنِ اصلی اور اُس کی پیدائش کی جگہ ہمارا ہی ملک ہو اور لوگوں کے اختلاط کی وجہ سے یوروپ میں جا نکلتا ہو مگر اب تو بڑے بڑے ڈاکٹروں کا اجماع اس پر ہی کہ تعدیہ کی کچھ اصل نہیں - بات یہ ہی کہ ہر چند فی زماننا ہذا جہاں بہت سے جدید علوم ایجاد ہوگئے ہیں فنِ طبابۃ میں بھی بڑی نمایاں ترقی ہوئی ہی مگر تاہم ظنی ہی اور انتظام الٰہی مقتضی ہی کہ ظنی رہے - جب لوگ ہیضے کے متعدی ہونے کے معتقد تھے وہ بھی ایک امر مظنون تھا اب اگر عدم تعدیہ کے قائل ہیں تو یہ بھی امر مظنون ہی ڈاکٹر اپنی طرف سے بہتیری ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں مگر اس وقت تک کہیں سے کچھ پتہ نہیں چلا کہ ہیضہ ہی کیا چیز کیوں کر پیدا ہوتا اور ترقی کرتا اور کیوں کر معدوم ہو جاتا ہی اور جس طرح سانپ کے کاٹے کا کوئی تریاق محقق نہیں اسی طرح ہیضے کا کوئی حکمی علاج معلوم نہیں پس بھائی ہم تو اپنے ایمان کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیتے دل میں یہ بات ٹھن گئی ہی کہ اپنی خوشی دنیا میں آ نہیں گئے خدا نے پیدا کیا ہی اُسی نے ہر فرد بشر کی حیاۃ کی ایک مدۃ مقرر کر دی ہی اور اُس مدۃ کی خبر بھی اپنے ہی تک رکھی ہی کسی کو اُس سے آگہی نہیں وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا پھر کیوں گھبرائیں اور وعدہ پورا ہوتے پیچھے کوئی رُک نہیں سکتا تو کس برتے پر اترائیں - اذا جاء اجلہم لایستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون[۱] - ابن الوقت - آہا معلوم ہوتا ہی کہ آپ دنیا کو عالمِ اسباب نہیں جانتے بلکہ شاید عقل و تدبیر کو بھی نہیں مانتے - حجۃ - بس ایسا ہی عالم اسباب مانتا ہوں کہ متصرف فی الامور وہ خود ہی اور کسی مصلحۃ سے اُس نے اسباب کا جال پھیلا رکھا ہی اسباب و نتائج میں جو تعلق ہی اُس کو میں اسرار الٰہی میں سے سمجھتا ہوں فہم بشر سے خارج اسباب کو ایجاد و تکوین میں

[۱] جب لوگوں کی موت کا وقت آ پہنچا ہی تو وہ نہ ایک ساعۃ پیچھے ہٹ سکتے نہ ایک ساعۃ آگے بڑھ سکتے ہیں ۱۲

اتنا بھی تو مدخل نہیں جتنا ایک کاریگر کے اوزار کو اُس کے عمل میں ہوتا ہے کاریگر اوزار کا محتاج ہے اور خدا جل وعلا شانہ کو کوئی سبب درکار نہیں مگر ہاں عادۃ الٰہی یوں ہی جاری ہے الا ماشاء اللہ کہ ہر واقعے کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اسباب نامتناہی ہیں اور ان پر بتمامہا احاطہ کرنا مقدورِ بشر نہیں مگر خدا نے جب جب جتنا مناسب سمجھا انسان پر منکشف کیا وما اوتیتم من العلم الا قلیلا[۱] - اگرچہ عقل انسانی کسی حالت میں خطا سے محفوظ نہیں - مگر اسباب کے بارے میں تو لوگ ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ معاذ اللہ عالم اسباب میں پیدا ہوئے عالم اسباب میں رہے کوئی واقعہ نہیں جس کے لیے ان کو سبب کی تفتیش نہ ہو اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصلی سبب کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تو ادعائی اسباب ٹھیرا لیتے ہیں - نجوم اور جفر اور رمل اور قیافہ وغیرہ بہت سے لغویات ہیں جن کا ماخذ سوائے اسباب ادعائی کے اَور کچھ نہیں اور کبھی سبب تو ہوتا ہے ٹھیک مگر اُس کے شرائط کا خیال نہیں رہتا مثلاً فرض کرو کہ سیسے کی ایک گولی ہو اور اُسی قدر و قامت کی دوسری کوئی روئی کی ہو ہلکی پھلکی اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا کر دونوں گولیوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیں تو ضرور سیسے کی گولی پہلے گرے گی اب یہ ایک واقعہ ہے اور اس کا سبب ہے ثقل مگر اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے کہ لاٹ کی چوٹی سے زمین تک گولیوں کے رستے میں خلا نہ ہو کیوں کہ خلا ہو گی تو گرنے میں ہلکی بھاری دونوں برابر - پھر انسان سبب بھی اپنی مرضی کا ڈھونڈتا ہے یعنی جس قسم کے اسباب سے خوگر ہے مثلاً اگر کوئی مریض کیسی ہی ردی حالت اس کی کیوں نہ ہو اگر کسی دوا سے دفعۃً اچھا ہو جائے اگرچہ وہ دوا جو لیے کی راکھ ہی کیوں نہ ہو تو کسی کو بھی استعجاب نہ ہو کیوں کہ دوا درمن سے اچھا ہونا ایک معمولی بات ہے لیکن فرض کرو کہ بجائے دوا کے کوئی شخص دم کر دینے سے یا نظر بھر کر دیکھ لینے سے سلب مرض کر دے تو سننے والوں میں سے تو شاید سو میں ایک کو بھی یقین آئے اور دیکھنے والے بھی اکثر جادو اور نظر بندی اور مغالطہ وہی پر محمول کریں اور اسی بنا پر فلاسفہ اور دہری معجزات انبیاء پر (علٰی نبینا وعلیہم السلام) بڑے شد و مد کے ساتھ اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں میں نے کسی دہری کی تحریر دیکھی ہے جس میں اس نے لکھا تھا کہ قانونِ فطرۃ یا عادۃ اللہ شہادۃ کے لیے کسوٹی ہے شہادۃ وہیں تک معتبر ہو سکتی ہے کہ قانونِ فطرۃ کے مطابق ہو یعنی اُس کا مقولہ یہ تھا کہ قانونِ فطرۃ کے خلاف ہم کسی شہادت کو نہیں مان سکتے یا بعبارت دیگر مخالفۃ قانونِ فطرۃ شہادۃ کے متہم بالکذب بلکہ مردود کرنے کو کافی ہے - یہ صاف مصادرہ علی المطلوب ہے - جب ایک شخص کہتا کہ فلاں واقعہ خلافِ معمول مستمر واقع ہوا - مثلاً یہ کہ ایک شخص نے ایک ڈول پانی سے ایک لشکر کو سیراب کر دیا تو اب صرف اس وجہ سے کہ یہ واقعہ عجیب و غریب ہے وقوعِ واقعہ سے انکار کرنا ہیکڑی اور ہٹ دھرمی اور کٹھ حجتی نہیں تو کیا ہے -

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتہم تاویلہ کذلک کذب الذین من قبلہم فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین[۲] اسباب کے بارے میں ایک کثیر الوقوع اور خطرناک غلطی یہ ہے کہ نتائج کو اسباب کی طرف اِس طرح منسوب کیا جاتا ہے گویا اسباب ہی فاعل اور مکون اور متصرف ہیں - پانی غلہ اُگاتا ہے - کونین دافعِ تپ ہے - سنکھیا سمِ قاتل ہے - اور یہی ہے مظنہ شرکِ خفی اعاذنا اللہ منہ اور میرے پندار میں وما یومن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون[۳] میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے غرض اسباب کا مسئلہ بڑا نازک اور مشکل اور مزلۃ الاقدام ہے -

ابن الوقت - یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ طب کے احکام مسائلِ ہندسی کی طرح یقینی ہیں مگر اس فن میں اس قدر ترقی ضرور ہوئی ہے کہ یورپ میں عمروں کا اوسط بڑھا ہوا ہے مردم شماری کی افزائش کا پرتہ زیادہ ہے خاص خاص امراض کے ایسے

[۱] اور تم لوگوں کو بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے ۱۲ [۲] بلکہ ان لوگوں نے ایسی چیز کو جس کا ان کو علم نہیں جھٹلایا حالانکہ اُس کی تاویل ابھی تک اُن کے پاس نہیں آئی اِسی طرح اُن لوگوں نے جھٹلایا جو اُن سے پہلے تھے تو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا ہوا ۱۲ [۳] خدا ہم کو اُس سے محفوظ رکھے ۱۲ اور اُن میں سے بہتیرے تو خدا پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ شرک کرتے ہیں ۱۲

طبی علاج دریافت ہوئے ہیں کہ سارے ملک میں کہیں اُن بیماریوں کا نام نہیں بہت سے روگ جو زوال پذیر نہ تھے اب تو اکثر دعوے کے ساتھ اُن کا علاج کرتے ہیں حفظانِ صحت کے قواعد اگرچہ ظنی ہیں مگر یقینیات کے لگ بھگ غرض ۔ اتفاقات سے یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کی تدبیر کو اُس کی تندرستی اور زندگی میں بڑا دخل ہے اور اس سے انکار کرنا گویا بداہت سے انکار کرنا ہے ۔ حجۃ ۔ کیوں کیا ہمارے ملک میں لوگوں کی بڑی عمریں نہیں ہوتیں ۔ ہمارے یہاں بھی لوگ کنبلاً و لاولد ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بہت نکلیں گے جو ہمیشہ یا اکثر تن درست رہتے ہیں اور اُن کو علاج کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ جو زیادہ احتیاط کرتے ہیں وہی زیادہ بیمار ہوتے ہیں ۔ ابن الوقت ۔ میں خلافِ قاعدہ کو داخل اتفاقیات سمجھتا ہوں ۔ حجۃ ۔ تم نے اچھی طرح غور نہیں کیا اول تو سرے سے علمِ طب ہی فی حد ذاتہ مکمل نہیں ۔ ہنوز ناقص ناتمام مجہول جیسا کچھ ہے اگر ساری دنیا کی مردم شماری پر نظر کی جائے تو سو میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ٹھیرے گا جو احکام طب کی پوری پوری پابندی رکھتا ہو بات یہ ہے کہ خداوند کریم نے ہر انسان کی طبیعت کو اُسی کے ساتھ پیدا کیا ہے اُس کی طبیعۃ انسان کی تن درستی پر داخلی اور خارجی بے شمار خطرات ہیں اور اُن میں سے خدا جانے کتنے ہیں جو اس وقت تک مخفی ہیں اور کتنے ہیں جو معلوم ہیں مگر انسان کے بس کے نہیں تو اُن کا جاننا نہ جاننا برابر الغرض کسی کو خبر نہیں کہ کل بلکہ اب سے چند لمحہ بعد کون سی آفۃ اُس کی تن درستی پر آنے والی ہے کہ اُس کی روک تھام کرے ۔ نزولِ آفۃ پر فوراً اُس کی طبیعۃ مرض کی مقاومۃ پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔ طبیعۃ صرف مدبّر و معالج نہیں بلکہ اسی طبیعۃ میں سب طرح کے امراض کی دوا بھی ہے اگر حیاۃ باقی ہوتی ہے طبیعۃ مرض پر غالب آ جاتی ہے ورنہ مغلوبِ مرض ہو کر آدمی ہلاک ہو جاتا ہے رہ گئی دوا وہ صرف طبیعۃ کی تقویۃ ہے بلکہ مجھ سے پوچھو تو صرف طبیعۃ ہی کی نہیں بلکہ بیشتر اُوپر والوں کی ۔ بڑے بڑے حاذق طبیبوں کو دیکھا کہ اُن کے ہاتھوں سے مریض مرتے بھی ہیں اور شفا بھی پاتے ہیں مرے تو کہتے ہیں خدا نے اتنی ہی حیاۃ لکھی تھی ۔ حکیم جی نے اپنی سی بہتیری کی زندگی ہی نہ ہو تو کیا کریں اور اچھے ہوئے تو نہ خدا ہے نہ تقدیر ہے حکیم صاحب ہیں اور اُن کی تشخیص تدبیر ہے ۔ ابن الوقت ۔ آپ تو کچھ ٹھیریوں کی سی باتیں کرتے ہیں آپ کی تقریر کا ماحصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر لا حاصل ہے اور انسان کی تن درستی اور زندگی محض ایک امر تقدیری ہے من جانب اللہ انسان کو اُس میں کسی طرح کا دخل نہیں مگر یہ آپ کی منفرد رائے ہے ایک عالم طب کا معتقد ہے ۔ طب سے میری مراد ہے ہومیوپیتھی یا ایلوپیتھی[۱] یا یونانی یا ویدک[۲] کسی خاص طرح کی طبابت نہیں بلکہ میری غرض اسی قدر ہے کہ ساری دنیا سدا سے اس امر کی معتقد چلی آئی ہے کہ حفظِ صحۃ دفع مرض یا ابقائے حیاۃ جن لفظوں سے چاہیے تعبیر کیجیے تدبیر پذیر ہے اس سے بحث نہیں کہ وہ تدبیر فی نفسہ صحیح ہو یا غلط جادو اور منتر اور ٹونے اور ٹوٹکے اور تعویذ اور گنڈے اور ہر طرح کی دوا اور ہر سب اخل تدبیریں ہیں ۔ الغرض ہر زمانے میں اس بات پر تمام عالم کا اجماع رہا ہے کہ زندگی اور تن درستی میں انسان کی تدبیر کو دخل ہے اور یہ میرا پہلا دعویٰ ہے اور ہر زمانے کے عقلا اور جہلا اور حضری اور بدوی سب کا اجماع اس دعوے کا ایسا قوی ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ قوی کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا آپ اپنے دائرہ باتیں کر کے اس مطلب کو کہاں کم کیے دیتے ہیں میرا دوسرا دعویٰ جو پہلے دعوے پر متفرع ہے یہ ہے کہ جتنی تدبیریں حفظانِ صحۃ کے لیے عمل میں لاتے ہیں سب میں رو پہلا ہے طب انگریزی اور اُس کی متعلقات ہیں اس دعوے کے ثبوت کے لیے میں

[۱] انگریزی طبابت کی دو قسمیں ہیں جن کے اصول مختلف ہیں ۱۲ [۲] ہند کی طب ۱۲

واقعات پیش کرتا ہوں جن کو مردم شماری کے کاغذات سے استنباط کیا گیا ہے۔ ہاں جی ہاں میں تمہارے مطلب کو خوب سمجھتا ہوں تم کو اگر میرے مدعا کے سمجھنے میں کچھ تزلزل لاحق ہوا ہے تو اب پھر سنو۔ صرف اتنی بات ہے کہ ہر زمانے میں لوگ حفظانِ صحت کی تدبیریں عمل میں لاتے رہتے ہیں لازم نہیں آتا کہ انسان کو اپنی تندرستی میں دخل ہے تم نے اتنی ہی بات تاڑ لی کہ لوگوں کو حفظ صحت کی حاجت ہے اور ہر شخص فی زعمہ اس کی کچھ تدبیر کرتا ہے صحیح یا غلط درست یا نادرست اسی طرح ہر شخص کو علم مستقبلات کی حاجت ہے اور ہر زمانے میں لوگ اس کے بھی درپے رہتے ہیں نجوم اور رمل اور جفر اور فال اور شگون اور تعبیر خواب اور قیافہ اور سعد و نحس اور ہاتھ کی لکیریں اور ساعت اور کیا اور کیا سارے پاکھنڈ اسی غرض سے ہیں اور یہ نہ سمجھنا کہ صرف ایشیا کی وحشی قومیں اس خبط میں گرفتار ہیں جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اہل یورپ بھی اس الزام سے بری نہیں۔ غرض فکر مستقبل سے کوئی فرد بشر فارغ نہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسان کو علم غیب میں دخل ہے پھر دخل ایک مشتبہ لفظ ہے اگر اس سے ملابست مراد ہے اگرچہ ادنیٰ درجے ہی کی کیوں نہ ہو یعنی تعلق تو دنیا کا سارا کارخانہ انسان کے لیے ہے اور اس کو موجودات عالم سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہے یا ہو سکتا ہے۔ موجودات عالم میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں اس کو تصرف کا اختیار ہے اگرچہ اس کا اختیار محدود ہے مگر اسی اختیار کی وجہ سے اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض[۵۱] کہا گیا ہے جسمانی توانائی کے اعتبار سے وہ چنداں زبردست مخلوق نہیں مگر عقل کے بل پر وہ آسمان تک اُچک جانے کا ارادہ رکھتا ہے کسی شاعر نے کیا عمدہ طور پر انسان کا حال بیان کیا ہے ؎

خاک کے پتلے نے دیکھو کیا ہی مچایا ہے شور　　فرش سے لے عرش تک کرتا ہے اپنا زور
سینے میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ رہا　　کل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

وہ زمین پر بیٹھا بیٹھا اجرام فلکی پر اور زیادہ دسترس نہیں تو ان کی رفتار سے اپنے اوقات کو منضبط کرتا ہے۔
هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ[۵۲]۔
رہے زمین پر اس نے اپنا ایسا تسلط جما رکھا ہے کہ نہ صرف جمادات اور نباتات میں تصرفات اور عناصر پر حکمرانی کرتا ہے بلکہ بڑے سے بڑے قوی اور وحشی خونخوار جانور اس سے ڈرتے اور اس کی خدمت کرتے ہیں باایں ہمہ انسان کسی کام کا فاعل مستقل اور کسی چیز میں حقیقی مؤثر نہیں اس مطلب کو سورۂ واقعہ میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے
أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ۔ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ لَوْ نَشَاءُ

---

[۵۱] زمین پر خدا کا نائب ۱۲۔

[۵۲] اس نے سورج کو روشنی بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم کو برسوں کی گنتی اور حساب معلوم ہو ۱۲

جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ ۔ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْکِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ ۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے چار چیزوں کو بیان فرمایا ہے ۔ اولاد اور کھیتی اور پانی اور آگ اور ان چاروں میں سے ہر ایک میں جہاں تک انسان کو دخل ہے اُس کی بھی صراحت کی اور پھر تبکیت[لے] کے لیے پوچھا کہ بھلا پھر اولاد کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے اور کھیتی کو تم نے اگایا یا ہم نے اور پانی بادل سے تم نے برسایا یا ہم نے اور آگ کا ایندھن تم نے بنایا یا ہم نے ۔ ہم نے تمہارے لیے موت کا ٹھیراؤ کر دیا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ ہماری پکڑ سے نکل بھاگے ۔ ہم چاہیں تو کھیتی کو ڈانٹ[لہ] بنا دیں کہ اس میں پھل کا کہیں نام نہ ہو ۔ ہم چاہیں تو پانی کو کھاری کر دیں غرض انسان کا اختیار اور اُس کی بے اختیاری دونوں حالتیں دکھا دی گئی ہیں جس کا خلاصہ ہے ۔ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ[۹۵] بین الجبر والاختیار ۔ ابن الوقت ۔ ہمارے آپ کے درمیان لفظی اختلاف ہے انسان کا اختیار آپ بھی مانتے ہیں مگر محدود اور ہم بھی کہتے ہیں کہ انسان کا اختیار ابھی تک محدود رہا ہے مگر اُس کا اختیار اُس کی جہالت کی وجہ سے محدود ہے اب جوں جوں نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی چلی جاتی ہیں تو انسان سمجھتا جاتا ہے کہ اُس کی بھی قدرت ہے کتنی مدت کے بعد اب اُس نے جانا کہ مثلاً سٹیم اور الکٹریسٹی کیا چیز ہے اور میں اُس پر کیا اختیار رکھتا ہوں ۔ اسی طرح اُس نے اپنی تن درستی اور زندگی پر بھی اپنا اختیار جمانا شروع کیا ہے بہت سے امراض کو اُس نے اپنے بس میں کر لیا ہے کہ چاہے تو اُن کو پیدا ہی نہ ہونے دے یا اگر پیدا ہوں بھی تو اُن کو جس وقت چاہے معدوم کر دے اور اگر علوم طب اور کیمیا اور طبیعیات وغیرہ اسی نسبت سے ترقی کرتے رہے جیسے کہ پچھلے سو برس میں تو وہ دن کچھ دور نہیں کہ انسان اپنی تن درستی پر آپ حاکم ہوگا اور کیا عجب ہے کہ اپنی زندگی پر بھی ۔

حجۃ ۔ نعوذ باللہ من ذالک ۔ کیا تمہارے یہ عقائد ہیں تو تم تیقّن اس بات کے منتظر ہو کہ انسان کچھ دنوں میں معاذ اللہ خدا ہونے والا ہے ۔

ابن الوقت ۔ دہریے تو کہتے ہیں خدا کو کس نے دیکھا ہے ۔ یہ بھی لوگوں کا ایک خیال ہے ۔

حجۃ ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ خدا کو دیکھا نہیں تو اُس سے لازم آگیا کہ خدا ہے نہیں ۔ ہم نے روح کو بھی نہیں دیکھا اور نہیں دیکھ سکتے تو روح کے ہونے سے بھی انکار کرو ۔

ابن الوقت ۔ واہ واہ تعریف المجہول بالمجہول وہ روح ہی کو کب مانتے ہیں ۔

حجۃ ۔ تمام فلاسفہ کا اجماع ہے کہ آدمی کو اپنی ذات کا علم حضوری اور بدیہیات اولی میں سے ہے ہر شخص اپنے تئیں لفظ میں سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے میرا دل میرا دماغ میرا جسم یعنی ہر شخص کو جسم کے علاوہ اپنی ہستی کا اذعان ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ہے اور اگر تمہارے نزدیک ہے تو تم کو خبط ہے

[لے] قائل کرنا پھر بات کرنے کا موقع نہ رہا ۱۲

[لہ] ڈنٹھل جس میں دانہ نہ ہو ۱۲

[۹۵] انسان نہ مجبور مطلق ہے نہ مختار مطلق بلکہ ایک اعتبار سے مجبور اور دوسرے اعتبار سے مختار ۱۲

اور تم قابلِ خطاب نہیں مگر تم مسلمان ہونے کا دعوے کرکے اسلام کو کیوں بدنام کرتے ہو اور لوگوں کو کیوں دھوکے میں ڈالتے ہو۔ یہ سچ ہے کہ مجالس میں تحریرات میں تم اسلام کے نام سے فخر اور اُس کی مدح و حمایت کرتے ہو مگر وہ اسلام ادّعائی اسلام ہے جس کو صرف امتیازِ قومی کہنا چاہیے۔ تم جیسے ڈھل مل یقین چند مسلمان میں نے اور بھی دیکھے ہیں اُن کو بھی اسی طرح کے شکوک عارض ہوئے لا مذہبوں اور دہریوں اور عیسائیوں غرض اسلام کے مخالفوں سے کچھ اعتراض سن لئے جواب سوجھے نہیں یا سوجھے اور تسکین نہیں ہوئی اُنہوں نے سہل سمجھ کر یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ لگے اسلام ہی کے اصول میں تاویلات کرنے۔ وہ اپنے پندار میں اسلام کی تائید کرتے ہیں مگر حقیقت میں اسلام کو کسی مخالف سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا اُن کی تاویلات سے اُنھوں نے حدیث کو تو یہ کہہ کر الگ کیا کہ پیغمبر صاحب کے ڈیڑھ سو برس بعد اُس کی تدوین شروع ہوئی۔

حاضری میز پر حجۃ الاسلام۔ لو صاحب مجھ کو اجازت دو مجھے شہر جانا ہے۔

ابن الوقت۔ کیا آپ میرے ساتھ کھانا کھانا یا میرے بنگلے میں رہنا خلافِ انصاف سمجھتے ہیں۔

حجۃ۔ بس مذہبی چھیڑ چھاڑ رہنے دو۔ مذہب ایسی چیز نہیں ہے کہ مباحثے اور مناظرے سے کسی کے دل میں اُتار دیا جائے بلکہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ خداوند تعالیٰ خاص طبیعتیں پیدا کرتا ہے جو مذہبی باتوں سے متاثر اور اُس کو قبول کر لیتی ہیں۔

ابن الوقت۔ پھر آپ جبریوں کی سی باتیں لائے۔ اگر خدا خاص طبائع مناسبِ مذہب پیدا کرتا ہے تو پھر مواخذہ کیسا؟

حجۃ۔ مواخذہ بقدرِ مناسبۃ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ یہ کہہ کر حجۃ الاسلام اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ ابن الوقت بھی اُٹھا اور کہنے لگا کیا واقع میں آپ میرے پاس نہیں رہنا چاہتے۔

حجۃ۔ نہیں بھائی نہیں۔ ابن الوقت۔ آخر کچھ سبب تو بتائیے۔

حجۃ۔ بات یہ ہے کہ میرے یہاں ٹھیرنے سے تم کو بھی تکلیف ہوگی اور مجھ کو آسائش نہیں ملے گی۔

ابن الوقت۔ آپ میری تکلیف کا خیال کیجئے نہیں اور آپ اپنی آسائش کے لئے بے تکلف جس طرح کہئے انتظام کر دیا جائے۔

حجۃ۔ تم کس کس بات کا انتظام کروگے۔ اول تو میری نماز ہی کا ٹھکانا نہیں جس کمرے میں جاؤ تصویر۔ بنگلہ کیا ہے بت خانہ ہے پھر تم نے کتے اس کثرت سے پال رکھے ہیں کہ اذان تک کے دینے کا حکم نہیں اور جب تک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھوں میرا جی نہیں خوش ہوتا میں نے اُترتے کے ساتھ ہی پہلے تمام بنگلے کو اندر باہر سے بالتفصیل دیکھ لیا ہے تم سمجھو تو میں ایک دن بھی ایسے مکان میں گزر نہیں کر سکتا مجھے کسی طرح کا سینا دکھائی نہیں دیتا۔

ابن الوقت۔ اچھا تو کھانا کھا کر جائیے۔ حجۃ۔ بس کھانے سے بھی معاف ہی رکھو میں آپکے باورچی اور کھانے کا سب حال سن چکا ہوں

ابن الوقت۔ کیا ہمارا باورچی ایسے گئے گذرے بھٹیاروں سے بھی گیا گذرا ہے؟ آپ کھانے کی میز کو ایک نظر دیکھئے تو سہی۔

حجۃ۔ بھائی جان ظاہری صفائی تو بلا شبہ تمہارے کھانے میں بہت ہوگی میں نے تم کو نہیں دیکھا اور انگریزوں کو

کھاتے ہوئے دیکھا ہی مگر مجھ کو تمھارے باورچی کی نسبت شبہ ہی۔
ابن الوقت ۔ بے شک مجھ کو معلوم ہی کہ وہ سب کچھ کھاتا پیتا ہی مگر ہمارے کھانے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی کہ آپ اُس سے احتراز کریں
حجۃ ۔ ارے میاں کیا کہتے ہو میں نے خود تمھارے یہاں ایک الماری میں شراب رکھی ہوئی دیکھی ہی۔
ابن الوقت ۔ وہ صاحب لوگوں کے واسطے ہی میں کبھی شراب نہیں پیتا اور اگر پیوں تو ہلاک ہو جاؤں میرا پھیپڑا اس قابل نہیں۔
حجۃ ۔ جب خود تمھارے پاس شراب کا ذخیرہ ہی اور صاحب لوگوں کو پلاتے ہو اور تمھارا باورچی بھی کسی چیز سے احتراز نہیں کرتا تو مجھ کو تمھارے کھانے کی طرف سے اطمینان نہیں۔
ابن الوقت ۔ بوائے[۹۰] ملازم ۔ یس سر[۹۱]۔ ابن الوقت ۔ کک[۹۲] کو بلاؤ ۔ کک حاضر ہوا تو ابن الوقت نے پوچھا آج کھانے میں کیا کیا ہی
باورچی ۔ سوپ[۹۳] ۔ مٹن چاپ[۹۴] ۔ کٹ لس[۹۵] ۔ آسٹن (آکس ٹنگ[۹۶]) بیل ریس ۔ (ڈیوائل ریس[۹۷]) پڈنگ[۹۸]۔
ابن الوقت ۔ ان چیزوں میں سے کسی میں شراب پڑتی ہی۔
باورچی ۔ کسی میں نہیں مگر پڈنگ میں خمیر کے لیئے شراب کا بھپارا دیا ہوتا ہی۔
ابن الوقت ۔ پڈنگ نشہ لاتا ہی۔
باورچی ۔ ذرہ نہیں ۔ باورچی رخصت۔
حجۃ ۔ آپ نے دیکھا۔
ابن الوقت ۔ کیا دیکھا آپ کے سامنے باورچی کہہ نہیں گیا کہ پڈنگ نشہ نہیں لاتا ۔ اسلام میں شراب کے حرام ہونے کی اصل وجہ نشہ ہی جب نشہ نہیں تو پھر کیا حرج ہی اور اگر آپ کے نزدیک حرج ہی تو آپ پڈنگ نہ کھائیے۔
حجۃ ۔ مجھ پر خدانخواستہ ایسی کیا مصیبت پڑی ہی کہ اپنے گھر کا رزق طیب مزید چھوڑ کر تمھارا مشتبہ پھیکا پلا ہندا کھانا کھاؤں۔
ابن الوقت ۔ یہ بلا کی تو گرمی پڑ رہی ہی آپ شہر میں جا کر بے فائدہ اپنی تن درستی کو خطرہ میں ڈالتے ہو۔
حجۃ ۔ میری زندگی ایسی کون سی انوکھی زندگی ہی ۔ آخر اتنا بڑا انبار شہر بستا ہی جو اور سب کا حال وہ میرا حال۔
ابن الوقت ۔ آخر پھر ملاقات کی کیا صورت ہوگی۔
حجۃ ۔ تم تو میرے پاس آنے کا قصد کرنا مت کیوں کہ تمھارے دل میں آب و ہوائے شہر کا پہلے ہی سے ڈر بیٹھا ہوا ہی کل ہی جبتہ مجھ کو فرصت ہونے کی نہیں ۔ پرسوں لوگوں سے ملنا ملانا ہوگا ان شاء اللہ اتوار کو دس بجے ساڑھے دس بجے میں خود آؤں گا اگر کوئی وجہ مانع نہ ہو۔
لطیفہ ۔ مولنا ایک روز ایک مضحک ابن الوقت کے متعلق بیان فرماتے تھے کہ ایک لڑکا جس کی عربی سکینڈ لنگویج ہی ایک روز آیا اور کہنے لگا کہ آپ کی ایک تصنیف میں نے تمام تلاش کی نہیں ملتی ۔ میں نے کہا کون سی کتاب ۔ جتنی کتابیں ہیں سب نذیر حسین کے ہاں موجود ہیں ۔ اُس نے کہا ابن الوقت ۔ میں بھی پہلے

[۹۰] لفظی معنی لڑکا مرادی معنی خدمتگار ۱۲ [۹۱] جی حضور ۱۲ [۹۲] باورچی ۱۲ [۹۳] شوربا ۱۲ [۹۴] انگریزی پسندہ ۱۲ [۹۵] انگریزی قیمہ ۱۲ [۹۶] بیل کی زبان ۱۲ [۹۷] خشکہ ۱۲ [۹۸] انگریزی فیرنی ۱۲

چکرایا۔ مگر پھر فوراً خیال آیا کہ ابن الوقت کے جو یا ہیں۔ ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ پھر جب نذیر حسین آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ بھائی ابن الوقت دیتے کیوں نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ کتاب تو میرے پاس نہیں۔ میں نے کہا کہ ابن الوقت کی خرابی ہے۔

محصنات

اِس ناول میں تعدّدِ ازدواج کے خراب نتیجوں کو ایک دلچسپ قصے کے پیرائے میں دکھایا ہے تصنیف تو یہ بھی ہمارے مولانا ہی کی ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی لیکن ہم لوگوں کو مولانا سے بڑھ کر مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے کیوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کے لکھنے میں مولانا کی اتنی مدد کی ہے کہ فی الواقع شریکِ تصنیف ہوئے اور شریک بھی شریک غالب۔ اس کتاب کی لوح پہ یہ شعر درج ہے

ہم معتقدِ دعوےِ باطل نہیں ہوتے ... سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

مولانا نے سببِ تالیف بطور دیباچہ کے حسبِ ذیل تحریر فرمایا ہے۔ غرض اس کتاب میں مبتلا ایک ہیرو ہے اور وہ اگرچہ ابتدا ہی سے خراب اطوار لے کر اُٹھا تھا لیکن اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ بہت زیادہ خراب ہو گیا۔ اول اوّل ماں کے لاڈ پیار نے اُس کو بگاڑا مکتب میں بٹھایا گیا تو بُرے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہوا۔ یہ آوارگی مرتے دم تک اُس کے ساتھ رہی مکتب میں وہ کیوں بُرا ہوا اُس کا حال اس طرح مولانا فرماتے ہیں۔

مبتلا کا مدرسے میں تعلیم پانا اور بُرے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہونا

مبتلا کے باپ کی تو پہلے ہی سے یہ رائے تھی کہ اس کو شروع سے مدرسے میں بٹھایا جائے مگر عورتوں کو مبتلا کی اتنی مفارقت بھی گوارا نہ ہوئی ناچار پورے چھے برس میاں جی کو نوکر رکھ کر اُس کو گھر ہی پہ تعلیم کرایا۔ اب میاں جی کا بھی سرمایۂ معلومات ہو چکنے پر آیا اور فارسی کی دو ہی متداول کتابیں سب مبتلا کی نظر سے نکل گئیں اور بات صاف تو یہ ہے کہ مبتلا کے سر میں اب اَور ہوا بھری ہوئی تھی اُس کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں یاروں کے جلسے دوستوں کی صحبتیں اور وہ گھر بیٹھے میسر نہ تھیں باپ نے کچھ اَور سوچا مبتلا نے کچھ اَور غرض سب کی صلاح سے مبتلا مدرسے میں داخل ہوا۔ گو مبتلا نے چھے برس مکتب میں تعلیم پائی مگر مکتب کیا تھا برائے نام اُس کا جی بہلنے کے لیئے چار پانچ ریزگی لڑکے اَور بٹھا لیئے گئے تھے یعنی بحسابِ[1] چودہ برس کی عمر تک مبتلا بھونرے میں پلا اور دنیا کی کسی قسم کی ہوا اُس کو نہ لگنے پائی اب جو مدرسے کی عربی جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا لڑکوں کا جنگل کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کی عمر سے لے کر بیس بیس پچیس پچیس برس تک کے اچھے خاصے جوان ہر ذات کے ہر پیشے کے چار ساڑھے چار سو لڑکے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اگرچہ انگریزی عربی فارسی سنسکرت ریاضی کی جماعتیں علٰحدہ ہیں اور ہر جماعت کا کمرا الگ مگر اوقات درس کے علاوہ سب ایک دوسرے سے بلا امتیاز آزادانہ ملتے بات چیت کرتے

[1] یعنی ایک حساب سے ۱۲

اور کھیلتے ہیں۔ مبتلا کو یہ حال دیکھ کر بلا مبالغہ ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی جانور کو قفس سے آزاد کر کے باغ میں چھوڑ دیا
جائے۔ اب تک وہ یہی جانتا تھا کہ میاں جی ہوئے مولوی ہوئے بڈھے ہی ہوتے ہوں گے کیونکہ اس نے اپنے
میاں جی کو دیکھا تھا پلکیں تک سفید۔ یہاں مدرسے میں آکر دیکھا مدرس اکثر جوان کہ اب سے چار چار یا پانچ پانچ
برس پہلے خود طالب العلم تھے امتحان دیا کامیاب ہوئے زمرۂ مدرسین میں داخل کر لیے گئے اس کو یہ دیکھ کر بڑی
حیرت ہوئی کہ بعض مدرس اپنی جماعت کے بعض بعض طالب العلموں سے بھی کم سن ہیں جس جماعت میں مبتلا داخل
ہوا چونکہ عربی کی سب سے چھوٹی جماعت تھی اس میں طالب العلموں کی بڑی کثرت تھی۔ رجسٹر میں تو ستر لڑکوں
کا نام تھا مگر پچاس پچپن ہمیشہ حاضر رہتے تھے ان میں سے ایک تہائی کے قریب مبتلا سے بہت بڑی عمر کے تھے
اس جماعت کو جو مولوی صاحب پڑھاتے تھے جیسے ان کی جماعت سب جماعتوں میں چھوٹی تھی ویسے ہی تمام
مدرسوں میں خود بھی سب سے چھوٹے تھے عمر میں قد و قامت میں وقعت و وجاہت میں یعنی قسمت سے
مدرس بھی ملے تو یار استاد۔ لونڈا تھا کھلا اور طرح دار مدرسے کے احاطے میں پاؤں کا دھرنا تھا کہ یاروں نے مبتلا کو
ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعضے تو ٹکٹکی باندھ باندھ کر ایسی بری طرح گھورتے تھے کہ گویا آنکھوں کے رستے کھائے جاتے
ہیں۔ پہلے ہی سے لڑکوں میں بہت سی ٹولیاں تھیں۔ اب ایک بڑی بھاری اور نئی ٹولی مبتلا کی قائم ہوئی۔
ایک جماعت بندی تو سرکاری تھی کہ جس قدر لڑکے ہم سبق ہوتے سب کے سب وقت واحد میں ایک استاد سے
پڑھتے مگر ایک جماعت بندی لڑکوں نے آپس میں ٹھہرا رکھی تھی جس کو ہم نے ٹولی سے تعبیر کیا۔ جس طرح سرکاری
جماعت بندی کے اوقات مقرر تھے کہ مثلاً جب ریاضی کا گھنٹہ آیا عربی اور فارسی اور سنسکرت کی جماعتوں
سے جو جو ریاضی کا پڑھنے والا تھا ماسٹر صاحب کی خدمت میں آ حاضر ہوا اسی طرح ٹولیوں کے اجتماع کے بھی خاص
خاص اوقات تھے مدرسے کے وقت سے ذرا پہلے لڑکے سویرے مدرسے میں آ پہنچتے یا جب ایک بجے نماز کے
لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی یا مدرسہ برخاست ہونے کے بعد ان تینوں وقتوں میں جو لڑکا جس ٹولی کا تھا اس میں
آ ملتا اور بعض بعض کبھی چپکے چپکے کسی ٹولی میں نہ تھے۔ یہ ٹولیاں ایک مجمع ناجائز تھیں اور ان کی اغراض مشترکہ
تمام تر بیہودہ۔ مدرسے کے سارے انتظام اچھے تھے چیزیں وہ پڑھاتے جو دنیا میں بکار آمد ہوں شوق کے مشتعل کرنے کو امتحان
کا قاعدہ نہایت عمدہ تھا فرداً فرداً ایک ایک لڑکے کو الگ الگ سبق پڑھانے سے جماعت جماعت کو پڑھانے کا نہایت مفید طریقہ
تھا اس سے لڑکوں میں ایک طرح کی منافست پیدا ہوتی تھی کہ ایک پر ایک سبقت لے جانی چاہتا تھا دوسرے ہم سبق ہونے سے ایک ایک
کی مدد کر سکتا تھا تیسرے لڑکوں کی لیاقت کا موازنہ اور مقابلہ بخوبی ہو سکتا تھا۔ لڑکوں کو حاضر باشی کا پابند کرنے کے لیے ترتیب
نشست کا ردوبدل بھی بہت موثر تھا پڑھائی اس قدر تھی کہ لڑکوں کے تمام وقت کو مشغول رکھنے کے لیے بخوبی کافی تھی نوبت بہ نوبت
مختلف مضامین کے پڑھانے سے طبیعت ملول اور کند نہیں ہونے پاتی تھی غرض سبھی انتظام بھلے تھے مگر افسوس لڑکوں کی چال چلن اور اخلاق کی
طرف کسی کو مطلق توجہ نہ تھی ہر مدرس اسی فکر میں رہتا کہ جس چیز کا پڑھانا اس سے متعلق ہے اس چیز کے امتحان میں لڑکے برے نہ رہیں جہاں تک کوئی
لڑکا اس شرط کو پورا کیے جاتا ہے اگرچہ چوری چھپے ناجائز طور پر دوسروں سے مدد لے کر ہی کیوں نہ ہو کسی کو اس کے کردار سے بحث نہیں

چوری کرو جھوٹ بولو سر بازار جوتی پیزار لڑو گالیاں دو اور گالیاں کھاؤ شرافت کو بٹا لگاؤ بدمعاشوں میں رہو
اور بدمعاش بنو۔ گیڑیاں کھیلو پتنگ لڑاؤ اکھاڑتے میں جا کر ڈنڑ پیلو مگدر ہلاؤ گاؤ بجاؤ غرض جو تمہارا جی چاہے سو
کرو مگر جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں امتحان اچھا دو تو اسکالرشپ بھی ہے انعام بھی ہے سُرخ روئی بھی ہے آفرین
اور تحسین بھی ہے واہ واہ بھی ہے چھٹی بھی ہے سرٹیفکیٹ بھی ہے اور آخر کار نوکری بھی ہے۔ مدرس لوگ بہ تقلید صاحب راضی
مبتلا کی افتاد تو روز پیدائش سے بگڑی ہوئی تھی۔ زنان خانے میں پرورش پاتا تھا کہ اُس کے دل میں بدی کا
بیج بویا گیا مکتب میں تھا کہ بیج کا درخت ہوا اب مدرسے میں آکر وہ درخت پھولا اور پھلا۔ گھر میں بچھڑا تھا مکتب
میں بچھڑے کا بیل ہوا اور مدرسے میں بیل کا سانڈ۔ کسی قسم کی آوارگی نہ تھی جو اُس سے بچی ہو اور کسی طرح کی بیہودگی
نہ تھی جو اُس نے نہ کی ہو جس طرح مبتلا مدرسے کے بُرے لڑکوں کی صحبت میں بانکا بنا چھیلا بنا طرح دار بنا مسخرہ
بنا کوچہ گرد بنا ننگ خاندان بنا اور کیا کیا بنا۔ اسی طرح مبتلا تخلص رکھ کر شاعر بنا اور فصیحتیں تو رفتہ رفتہ بھول بسری
ہو گئیں شاعری کی یادگار اُس کا منحوس تخلص رہ گیا۔ ہم کو تو اُس کے نام سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اُس کے
حالات کا دریافت کرنا کیسا سننے کو بھی جی نہیں چاہتا مگر خیر مُونہہ پر بات آ پڑی ترک نہیں سکتی آٹھ برس پیہم بجنسہ مدرسے
میں رہا آخر کچھ نہ کچھ تو پڑھتا ہی ہو گا کہ عربی کی دوسری جماعت تک اُس نے ترقی کی دس روپیہ مہینا وظیفہ پاتا تھا
برس کے برس انعام بھی ملتے رہتے تھے ایک سال سنا کہ ایسا اچھا امتحان دیا کہ تمغا ملا یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اور نہ اس سے
آوارگی کا الزام دفع ہو سکتا ہے ہم کو اس کی ذکاوت کا حال معلوم ہے۔ وہ اس بلا کا ذہین تھا کہ مدرسے کی پڑھائی کی
اُس کے آگے کچھ حقیقت نہ تھی برس میں ایک بار تو امتحان ہوتا تھا اکثر انگریزوں کے بڑے دن سے پہلے پس امتحان
کے مہینے ڈیڑھ مہینے آگے سے وہ تیاری کر لیتا ہو گا۔ لیکن فرض کیا کہ وہ اچھی طرح پڑھتا ہی ہو تو بد وضع کو پڑھنے سے
فائدہ علم سے حاصل اس سے جاہل بمدارج بہتر اَن پڑھ کہیں بھلا۔ مدرسے سے پہر سوا پہر رات گئے کبھی آدھی کبھی پچھلی رات کا
تو اُس کا گھر میں آنے کا معمول شروع سے تھا اور پھر اچھی طرح سورج نہیں نکلا کہ اُس کے شیاطین الانس لگے گھر پر آکر
کُنڈی کھٹکھٹانے دستک دینے اور پکارنے سیٹی بجانے اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ تین تین چار چار دن برابر
غائب ماں کو یہ تمام تفصیلی حالات معلوم تھے مگر اب اس کی محبت کا دوسرا رنگ تھا بیٹے سے اس قدر ڈرتی تھی جیسے
قصائی سے گائے اس کے دل میں آپ سے آپ یہ خوف سما گیا تھا کہ بیٹا ہے ماشاءاللہ جوان ایسا نہ ہو میری بات کا بُرا مان کر
کہیں کو نکل جائے یا اپنے تئیں ہلاک کرے تو پھر میں کدھر کی ہوئی اس ڈر کے مارے بے چاری کبھی چوں نہیں کرتی تھی اور مبتلا نے اپنے تئیں اُس کے
نزدیک ایسا ہوا بنا رکھا تھا کہ جب اُس کی صورت دیکھتی ہکا بکا ہو کر رہ جاتی پہلے سے بھی مبتلا کی شرارتوں کی باپ سے پردہ داری کی جاتی
تھی اب انہیں شرارتوں کی بدولت ایاں ہو گئی تھیں ادھر شرارتوں میں ترقی ہوئی اُدھر پردہ داری میں زیادہ اہتمام ہونے لگا
گو باپ نے دھوپ میں ڈاڑھی سفید نہیں کی تھی بڈھا اُس کی چال ڈھال سے اُس کی گفتگو سے اُس کی آنکھوں سے تاڑ لیتا تھا مگر بی بی کا معتقد
تھا اور خوب جانتا تھا کہ اُس کو بیٹے کے ساتھ بلا کا شغف ہے اور یوں بھی ہر کام میں مسامحت کرنا اُس کی ہمیشہ کی عادت تھی اور انہیں وجوہ سے
اُس نے مبتلا کی اصلاح کی طرف کبھی پوری توجہ نہ کی اب جوان بیٹے کا کیا مونہہ لگتا ایک کہتا تو دس سنتا آخر اُس کے سمجھ گئے اور کچھ نہ سوجھی تو یہی سوجھی کہ جس قدر جلد ہو سکے اس کو پابند کر دیا جائے

مبتلا کے چچا کا حج سے واپس آنا

مبتلا کے حقیقی چچا میر متقی ایک مدۃ سے نواب رام پور کی سرکار میں نوکر تھے اور وہیں ایک شریف خاندان میں اُنھوں نے اپنا نکاح بھی کر لیا تھا۔ مبتلا اُن دنوں مکتب میں پڑھتا تھا کہ میر متقی دلی ہو کر بھائی سے ملتے ہوئے حج کو گئے۔ ارادہ تو صرف حرمین شریفین کی زیارت کا کر کے گئے تھے مگر وہاں پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ سالہا سال کے ارادے میں تو اب بمشکل گھر سے نکلنا ہوا کیا معلوم کہ اب زندگی میں پھر یہاں آنا نصیب ہو یا نہ ہو لاؤ لگتے ہاتھوں جہاں تک ہو سکے زیارتیں تو کر لو۔ پورے تین برس تو زیارتوں میں لگے پھر تین برس تک متواتر ایسا اتفاق پیش آ گیا کہ سب واپسی کا ارادہ کرتے تھے بیمار ہو ہو جاتے تھے۔ غرض ساتویں برس لوٹے تو بمبئی میں پہنچ کر اُنھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بھوپال میں اُستاد سے احمد آباد میں پیر سے اور دہلی میں بھائی سے ملتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ دہلی میں داخل ہوئے تو تھوڑی رات گئی تھی سیدھے بھائی کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ پھاٹک بند اور طبلے کی تھاپ کی آواز اندر سے چلی آ رہی ہے۔ سمجھے کہ ناچ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں بڑے زور کے قہقہے سنائی دیے معلوم ہوا کہ بھانڈ نقلیں کر رہے ہیں۔ میر متقی کو پہلے ذرا سا دھوکا ہوا کہ میں نے گھر کی شناخت میں تو غلطی نہیں کی۔ گلی کے نکڑ تک لوٹ کر گئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر نگاہ کی بے شک سات برس کے عرصے میں تھوڑے بہت تغیرات بھی ہوئے تھے مگر نہ اس قدر کہ آدمی جہاں پیدا ہوا پرورش پائی بڑا ہوا رہا سہا اُس گھر کو نہ پہچانے۔ پھر خیال ہوا کہ شاید بھائی نے اس گھر کو چھوڑ دیا ہو اسی سوچ میں کھڑے تھے کہ ایک شخص گلی کی طرف ٹیکتا ہوا چلا آ رہا تھا جب ان کے برابر آیا اُنھوں نے اُس سے پوچھا کیوں صاحب یہ کونسی گلی ہے وہ یہ کہتا ہوا اپنی دُھن میں چلا گیا کہ اس کو سادات کا کوچہ کہتے ہیں۔ اب ان کو اس کا تو یقین کامل ہو گیا کہ گھر کے پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی اب اتنی بات اور رہ گئی کہ بھائی اُس گھر میں ہیں یا نہیں۔ اس شخص کی جلدی نے ان کو اس کے پوچھنے کی مہلت نہ دی اتنے میں دیکھا کہ ایک بوڑھے سے آدمی بغل میں بچھونا دابے لکڑی ٹیکتے ہوئے اندر گلی سے آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں ان سے تھوڑی دور پیچھے ایک جوان سا آدمی ہے اور وہ ذرا تیز چل رہا ہے یہاں تک کہ جب بڑے میاں کے برابر آیا تو کہنے لگا کہ اے حضرت خیر ہے اس وقت آپ بچھونا لیے ہوئے کہاں جا رہے ہیں۔ لائیے بچھونا مجھ کو دیجیے میں پہنچا دوں۔ بڑے میاں نے کہا نہیں بھائی تم کیوں تکلیف اُٹھاؤ بچھونے میں ایسا کیا بوجھ ہے کیا کریں جب سے بے چارے میر مہذب مرے اُن کا لڑکا خدا اُس کو نیک ہدایت دے بُری صحبت میں پڑ کر ایسا آوارہ ہو رہا ہے کہ سارے سارے دن اور ساری ساری رات گھر میں طبلہ چھڑکا سا کچھ ہی رہتی ہے ہم ٹھیرے دیوار بیچ اُن کے پڑوسی اتنا نہیں بن پڑتا کہ گھر میں دو رکعت نماز اطمینان سے پڑھی جائے ناچار میں تو اس مسجد میں چلا جاتا ہوں۔ متقی بھائی کے مرنے کی خبر سُن کر قریب تھا کہ چکر کھا کر وہاں زمین پر گر پڑے مگر آدمی تھا دیندار اُس نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر ضبط کیا اور اپنے تئیں سنبھالا اور سوچا کہ اگر گھر چل کر دستک دوں پکاروں تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنے گا اور فرض کیا چیخنے چلانے سے دروازہ کھلا بھی تو رات گئی ہے زیادہ سب کو تکلیف ہوگی رونا پیٹنا مچے گا ماتم برپا ہوگا بہتر یہ ہے کہ رات کو کہیں پڑ رہوں پھر خیال کیا کہ پاس کے پاس اس مسجد میں ٹھیر جانا مناسب ہے کہ بڑے میاں سے اور حالات بھی دریافت ہوں گے مسجد میں گیا اور وضو کر کے

نماز پڑھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے بھائی سے اس کو محبت تھی بہت یوں بھی ہمیشہ غائبانہ اس کے حق میں دعائے خیر کیا کرتا تھا
اب جو حضرت موسیٰ کی دعا[1] اس کو یاد آئی اور اُس کے مونھ سے نکلا ربِّ اغفر لی ولاخی وادخلنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین جی بھر آیا
اور بے اختیار اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی جس کے دل کو یکایک اتنا بڑا صدمہ پہنچا ہو اُس کو بھوک کیا لگے اور نیند کیوں کر آئے
ساری رات گزر گئی کہ صحن مسجد میں ننگے سر بیٹھا ہوا کبھی کچھ پڑھ پڑھ کر بھائی کی روح کو بخشتا تھا۔ اور کبھی اُس کی مغفرت کے
لئے خدا کی درگاہ میں زاری کرتا تھا۔ سفیدۂ صبح نمودار ہوتے ہی اول وقت فجر کی نماز پڑھی اور پھر اشراق[2] تک معمولی اوراد
میں مشغول رہا جب نافلۂ اشراق سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ بڑے میاں بھی اپنا بچھونا لپیٹ لپاٹ کر گھر جانے کی تیاری کر
رہے ہیں اُن کو ضعیفی کے سبب ذرا دھندلا بھی نظر آتا تھا متقی نے اُن کو پہچان کر السلام علیک کی اور قریب جا کر اپنے تئیں
پہچنوایا اور رات کا ماجرا کہہ سنایا۔ ملے تو میر مہذب کی صحبتوں کو یاد کر کے بڑے میاں بھی آب دیدہ ہوئے اور متقی تو رات سے
رو رہا تھا سفر کا تکان ساری رات کا فاقہ جاگنا رونا آنکھیں سوج گئیں تھیں مونھ سے آواز نہیں نکلتی تھی ہائے بڑے میاں
نے بہت کچھ سمجھایا اور دنیا کے دستور کے مطابق صبر کی تعلیم کی اور کہا کہ میاں مرحوم تو اللہ کے نیک بندے تھے یہاں بھی
اپنی اچھی گزار گئے اور ان شاء اللہ وہاں بھی اُن کے لئے اچھا ہی اچھا ہو وہ اگر مرے تو اپنی عمر سے مرے اور ایک نہ ایک دن
سبھی کو مرنا ہے بڑا رونا اُن کے فرزند ناخلف کا ہے کہ اپنے کردار ناسزا سے مرحوم کی روح کو ایذا دے رہا ہے اب تم باپ کی جگہ ہو اس کو
سنبھالو اگر ہو سکے اُس کو روکو اگر بن پڑے۔ گھر کے نصیب اچھے ہیں کہ تم آ پہنچے خدا کو کچھ بھلا کرنا منظور ہے کہ تم کو بھیجا ابھی وقت
ہے اگرچہ تنگ ہی موقع ہے گو اخیر ہے اور تم یہاں مسجد میں اکیلے بیٹھ کر کیا کرو گے میرے ساتھ چلو تمہارے بھتیجے صاحب تو کہیں
دوپہر تک اٹھیں گے وہ بھی اٹھانے سے تب تک میرے گھر کچھ ناشتا کر لو ہم بھی کوئی غیر نہیں ہیں تمہارے بھائی صاحب خدا
اُن کو جنت نصیب کرے ہم کو عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے کیا تم کو یاد نہ ہوگا غرض میر متقی بڑے میاں کے ساتھ ساتھ چلے
تو سارے رستے بھائی کا تصور پیش نظر تھا اور قدم قدم پر ایسا خیال ہوتا تھا کہ بھائی سامنے سے چلے آ رہے ہیں پیچھے سے
پکار رہے ہیں اس دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں اُس دوکان والے سے کچھ کہہ رہے ہیں کیوں کہ یہ اتفاقات متقی
کو بھائی کی زندگی میں صدہا بار پیش آ چکے تھے اُن ہی باتوں کی یادداشت اب تازہ ہو گئی متقی رات سے بہتیرا رو بھی چکا تھا
اور اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب اگر رونا آئے گا بھی تو روکوں گا ضبط کروں گا مگر جوں جوں گھر کی طرف پاؤں اٹھتا تھا
دل کی کیفیت متغیر ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ دروازے پر پہنچ کر تو نہ تھم سکا اور بے اختیار پکار کر رو دیا۔ رونے کی
آواز سن کر پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے پھاٹک تو باہر کی طرف سے نہ کھلوا سکے اندر ہی اندر کھڑکی کی راہ پہلے زنان
خانے میں اور پھر مردانے میں خبر پہنچی مبتلا اور اُس کے جلسے کے شرکا ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کھروا[3] دیکھ اور
بھیرویں[4] سن کر سوئے تھے۔ میر متقی کا رونا سن کر نیندیں اچاٹ ہو گئیں اور سب کے ہوش اڑ گئے جو لوگ اب سے دو ڈیڑھ گھنٹے
پہلے بھانڈوں اور رنڈیوں کو نچوا رہے تھے اب لگے آپ ناچ ناچنے بہتیرے پھڑکے چاہتے تھے کہ نکل بھاگیں مگر رستہ کہاں تھا

---

[1] اے پروردگار مجھ کو اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے ۱۲ [2] طلوع آفتاب کے بعد کی نماز نفل ۱۲
[3] کسبیوں کی [illegible] کا ناچ جو بازاری عورتیں مردانی ٹوپی اوڑھ کر ناچتی ہیں ۱۲ [4] صبح کا راگ ۱۲

پھاٹک پر تو خود میر منشی صاحب اور اُن کے ساتھ محلے کے چالیس پچاس آدمی کھڑے ہوئے تھے زنان خانے میں ہو کر جانا چاہتے تو پہلے مہرے پر گھر والی تھی کہ وہ میاں کے سامنے تو لونڈی یا بھیگی بلی جو کچھ تھی سو تھی مگر ان بدذاتوں کے حق میں خاص کر اس وقت شیرنی سے کم نہ تھی اس کے علاوہ زنان خانے سے اگر باہر جانے کا رستہ تھا تو دوسرے لوگوں کے گھروں میں ہو کر اور وہ اُن کا گزرنا کیوں جائز رکھتے غرض وہ سب کا سٹ پٹانا اور ایک کا ایک سے پوچھنا اور ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑنا ایک ایک کے پاؤں پڑنا ایک تماشا تھا قابل سیر ایک کیفیت تھی لائق دید کہ رنڈیاں جو اپنے حسن کے غرور میں کسی کے ساتھ سیدھی بات تک نہیں کرتی تھیں اب ایک ایک کے آگے بچھی جاتی تھیں کہ خدا کے لئے کہیں ہم کو پناہ دو ایک ایک کے پیچھے لپٹتی تھیں کہ للٰلہ ہمیں نکال کر کہیں لے چلو ایک پکارتی تھی میں انعام اکرام سے باز آئی مجھے رستہ بتا دو دوسری چلاتی تھی مجھے مجرے کی کوڑی ست دو مگر کسی ڈھب سے گھر پہنچا دو رات کے جلسے میں ایک طائفہ چلبلا بھانڈ کا بھی تھا ان کم بختوں کو فی الوقت[1] خوب سوجھتی ہے۔ ادھر تو یہ تمام ہل چل مچی ہوئی تھی اور ادھر چلبلا بے طلب بے فرمائش تیار ہو اپنے ساتھیوں کو جمع کر لگا نقل کرنے۔ نقل ایک ادھر سے آ دھمکا اور ادھر سے ادھر دوڑا دوڑا لوگوں کو ہٹاتا ہوا دبا تا ہوا پھرنے لگا کہ کیا ہے کیا ہے کاہے کا غل ہے کیوں شور مچا رکھا ہے دوسرا بولا ابے احمق تو نے نہیں سنا کہ حضرت کے چچا مکے معظمے سے تشریف لائے ہیں۔ پہلا۔ کون چچا۔ ابو جہل یا ابو لہب۔ دوسرا (پہلے کے مونہہ پر زور سے ایک طمانچہ مار کر) چپ مردود کیا کفر بکتا ہے ابے حضرت پیغمبر کے چچا نہیں ہمارے (مبتلا کی طرف اشارہ کر کے) حضرت پیر و مرشد کے چچا۔ پہلا۔ ہاں۔ الحمد للہ۔ پھر ڈرنا کیا ہے آؤ ہم سب مل کر بھی اُن کو چچا بنائیں حج نصیب ہونے اور سلامتی سے واپس آنے کی مبارکباد دیں ناچ دکھائیں گانا سنائیں۔ دوسرا (پہلے کے مونہہ پر ایک طمانچہ مار کر) ابے توبہ کر توبہ کہیں اوپر سے چھت نہ گر پڑے سید آل رسول مولوی حاجی جو ابھی خدا کے گھر سے پھرے ہوئے چلے آ رہے ہیں کہیں ناچ دیکھتے ہیں (ناچ دیکھنا حرام) یا گانا سنتے ہیں (گانا سننا ممنوع) ان کے نزدیک رنڈیاں جہنم کی چھپٹیاں ہیں اور بھانڈ دوزخ کے کندے۔ پہلا ہائے میرے اللہ رنڈیوں نے وہاں بھی بھانڈوں کو نہ چھوڑا پرے کندے ہوتے تو ذرا دیر میں تو جلتے اور کیوں صاحب یہ سب لوگ (مبتلا اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہوں گے۔ دوسرا۔ اِن کو کہتے ہیں کہ بھاڑ میں بھونے اور کڑھائی میں تلے اور بھٹی میں جلائے جائیں گے۔ پہلا (دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھے ہوئے پتھر مار کر اور خوف زدہ آنکھیں بنا کر) الٰہی توبہ الٰہی توبہ۔ خدا دوزخ کی آنچ سے بچائے اور بھانڈوں کو بھوت بنائے آسیب بنائے جو چاہے سو کرے مگر دوزخ کے کندے نہ بنائے۔ پہلا پھر یہ حاجی صاحب چاہتے کیا ہیں۔ دوسرا چاہتے یہ ہیں کہ نمازیں پڑھو روزے رکھو خدا کی بندگی کرو جو روپیہ رنڈیوں اور بھانڈوں کو دیتے ہو غریبوں محتاجوں کو دو۔ پہلا۔ یہ تو بات تو واجبی ہے۔ رنڈیوں کا دینا تو محض فضول ہی رہے بھانڈ ان سے بڑھ کر غریب محتاج اور کون ہوگا۔ یہ کہہ کر عمامہ باندھا پائنچے ٹخنوں سے اونچے کر جہاں کھڑا تھا اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ سوتا ہی مونہہ میں کچھ بڑبڑانے لگا گویا امام بنا اور نماز شروع ہوئی مسخرہ پن تو یہ تھا کہ نیت باندھ چکا ہو اور پیچھے ایک طرف یہ کہہ رہا ہے کہ بس بے تامل پھاٹک کھول دو اور مولوی یا حافظ یا حاجی یا زوار یا واعظ جو ہوں اُن کو آنے دو اور دوسری

---

[1] یعنی وقت پر۔

طرف سب کو اشارہ کر رہا ہو کہ میرے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہو جاؤ اور پھر بڑبڑانے لگا۔ طائفے کے جتنے بھانڈ تھے سب صف بستہ ہو کر مقتدی بنے اور اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے ذرا دیر گزری تھی کہ ایک نے صف میں سے نکل کر امام کی پیٹھ پر ایک دوہتڑ مارا ایسے زور سے کہ تھوڑی دور آگے جا کر اوندھے مونہ گر پڑا اور کہا ابے بدبختی یہ کیسے بے وقت اور بے رحمی جماعت کی نماز پڑھا رہا ہے اگر مولوی اسمٰعیل کے مقلد سُن پائیں تو مارے کفر کے فتووں کے اَلّو کر دیں۔ امام ۔ ابے تو کیا جانے یہ صلوٰۃ الخوف[1] ہے۔ اور پھر اُسی طرح اپنی جگہ جا کھڑا ہوا گویا اتنی حرکت پر بھی نماز باطل نہیں ہوئی۔ تھوڑی سی دیر کے بعد پیچھے کی صف سے پھر ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے امام کا عمامہ اُتار تڑاتڑ آٹھ دس جوتیاں لپتڑے رسید کئے امام سر سہلاتا ہوا یہ کہتا ہوا بھاگا کہ کفر کا فتوی آیا۔ تو یہ لپتڑے مارنے والا کیا کہتا ہے ابے ڈر مت فتوی نہیں تیری عبادت کا صلہ ہے۔ امام بولا عبادت کا صلہ ہے تو اس میں مقتدیوں کا بھی حق ہے۔ پھر تو اس سرے سے اُس سرے تک بلا امتیاز جوتی کاری ہونے لگی اور رنڈیاں اور بھڑوے اور میر محفل اور تماشائی پر بھی آفت آئی۔ کہتے ہیں کہ چلبلا بھانڈ کے طائفے کا بیس روپے روز معمول تھا اور مبتلا اس طائفے کا ایسا گرویدہ تھا کہ اگر خرچ مساعدت کرتا تو ہر رات کا ناچ دیکھتا مگر اس پر بھی کئی سو روپے ان لوگوں کے چڑھ گئے تھے اب مبتلا کے چچا کا آنا سُن کر بھانڈوں کو بالکل نا امیدی ہو گئی اور ایسی نقل کی نقل تو نہایت برجستہ تھی مگر طبیعت کس کی حاضر تھی اور دل کس کا ٹھکانے تھا کہ مزہ لیتا اور داد دیتا۔ مبتلا کی تو ایسی سٹی بھولی کہ ننگے پاؤں کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آتا مگر کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی آخر اُس نے اپنے باپ کے پُرانے نوکر وفادار کو آواز دی یہ بوڑھا آدمی اسم بامسمی مبتلا کو بہت سمجھاتا رہتا تھا مگر نوکر کی بساط کیا جب وفادار نے بار بار کہنا شروع کیا مبتلا نے اُس کو جھڑک جھڑک دیا وفادار نے دل شکستہ ہو کر مبتلا سے کنارہ کشی اختیار کی مردانے میں اُس کے رہنے کی ایک کوٹھڑی تھی رات دن اُسی کوٹھڑی میں پڑا رہتا اندر سے کچھ فرمائش آتی تو اُس کی تعمیل کر دیتا مبتلا کے کسی کام کاج کو ہرگز ہاتھ نہ لگاتا آدمی تھا زمانہ دیدہ سمجھ چکا تھا کہ یہ لیل و نہار اس طرح پر تو سدا چلنے والا نہیں یا تو یہ رسم و راہ نہیں اور رسم و راہ یہ ہے تو بندہ درگاہ نہیں وفادار اکیلا کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا دیکھتا نہیں تھا تو سنتا سب کی تھا اس کو میر متقی کا آنا اور ارباب جلسہ کا گھبرانا معلوم ہو چکا تھا خلاف عادت مبتلا کے بلانے کی آواز سُن کر مطلب تو سمجھا مگر جان بوجھ کر چادر تان لیٹ گیا مبتلا نے ایک بار پکارا دو بار پکارا تین بار پکارا جواب ندارد اگر کبھی پہلے ایسا اتفاق ہوا ہوتا تو وفادار کی مجال تھی کہ مبتلا پکارے اور پہلی آواز پر جواب نہ دے مگر میر متقی کا آنا تھا کہ باہر سے اندر تک سب کا رنگ بدل گیا جو ناچیز تھے وہ اب عزیز تھے جو با اقتدار تھے وہ اب ذلیل و خوار تھے یہاں تک کہ مبتلا نے خود کوٹھڑی کے دروازے پر آ کر پکارا میاں وفادار میاں وفادار جلدی اُٹھو چچا آئے۔ وفادار نے گھبرا کر پوچھا کیا چھوٹے میاں حج سے تشریف لائے۔ مبتلا۔ ہاں۔ وفادار نے میر صاحب مرحوم کو یاد کر کے ایک آہ کی اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور میر متقی کے صحیح و سلامت واپس آنے پر خدا کا شکر کیا اور دروازے کھولنے کے ارادے سے دوڑا مبتلا نے لپک کر روکا کہ ذرا ٹھیرو ذرا ٹھیرو مبتلا نے چچا کو دیکھا تو تھا مگر سات برس میں صورت بھول گیا تھا وفادار سے کہا کہ ذرا کواڑوں کی دراڑ میں سے جھانک کر تو دیکھو وہی ہیں وفادار نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور کہا کہ بے شک وہی ہیں اور اب تو عین مین سرکار[2] معلوم ہوتے ہیں

[1] خوف کے عالم کی نماز جیسے لڑائی کے میدان میں ۱۲ [2] سرکار سے مراد مبتلا کے والد میر مہذب مرحوم ہیں جو میر متقی کے حقیقی بڑے بھائی تھے ۱۲

مگر ڈاڑھی میں تو وہی سفیدی نہیں۔ مبتلا یہ سن کر وفادار کے گلے سے لپٹ گیا اور کہا کہ خدا کے لیے کسی طرح مجھکو اِس فضیحتہ سے بچاؤ میں اِن کم بختوں کو کہاں لے جاؤں اور کس جگہ چھپاؤں وفادار کو مبتلا کا اضطرار دیکھ کر بہت ترس آیا اور اُس نے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کو پاخانے میں کھڑا کر دو بچے چھوٹے میاں آخر اندر جائیں گے اُس وقت اُن کو نکال باہر کریں گے واقع میں اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہ تھی آخر یہی کیا کہ چھپا چھپ ان سب کو پاخانے میں اوپر تلے ٹھونس آگے پیچھے دھکیل کنڈی لگا باہر کا پھاٹک کھول دیا میر متقی نے دوڑ کر بھتیجے کو چھاتی سے لگایا اُس وقت کی کیفیت بھی جس جس نے دیکھی ساری عمر اُس کو نہیں بھول سکتا۔ بوڑھا (پھونس نہیں مگر ادھیڑ) اور جوان فرشتہ اور شیطان۔ یا رحمت اور قہر نیکی اور بدی با اللہ اور رند یا حاجی اور پاجی یا چچا اور بھتیجا دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے کھڑے رو رہے تھے۔ مبتلا تو ڈاڑھیں مار رہا تھا اور میر متقی کی آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور چوں کہ رنج کو بتکلف ضبط کرتے تھے۔ بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی پچاس ساٹھ آدمی حلقہ باندھے ہوئے گرد و پیش تھے اور سب پر رقت طاری تھی۔ کامل پاؤ گھنٹے کے بعد متقی نے مبتلا کو سینے سے جدا کیا اور سب کے ساتھ اس کو لے جا کر دالان میں بیٹھے تھوڑی دیر سب سکوت میں تھے آخر کسی نے میر صاحب مرحوم کا ذکر خیر نکالا پہلے اُن کے محامد[1] اخلاق کا مذکور رہا پھر علالت اور وفات کا آخر فاتحہ پڑھ کر لوگ رخصت ہوئے اور میر متقی زنان خانے میں گئے۔

مبتلا کا ایک عورت کے دام محبت میں مبتلا ہونا

عارف تو یہ کہہ کر اُس وقت رخصت ہو گیا۔ مبتلا کے شیاطین برابر اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے میر متقی کا جانا سنتے ہی سب نے چاروں طرف سے یورش شروع کی۔ مبتلا تو ایک مدت سے اُدھار پر عیاشی کر ہی رہا تھا سیکڑوں روپے اُن لوگوں کے اُس پر چڑھے ہوئے تھے پہلے کے ہلے ہوئے خدا جانے میر متقی کے رہتے بھی اُنھوں نے کیوں کر صبر کیا ہوگا۔ میر متقی کا اگر جانا نہ ہوتا تو آخر ایک نہ ایک دن اِس قرض کا جھگڑا اُن کے روبرو پیش ہوتا پر ہوتا اور اُن کے روبرو پیش ہوتا تو وہ عمدہ طور پر فیصلہ بھی کر دیتے اب وہ نہ ہونے کیسے سوائے ڈیوڑھے کی قسط بندی پر تو قرضے کا چکوتا ہوا اور اُن لوگوں کے پاس اگر بیٹھنے بات کرنے سے مبتلا کی طبیعت جو میر متقی اور عارف کے سمجھانے سے کسی قدر سنبھل چلی تھی پھر بگڑی۔ سامان تو ایسا بندھا تھا کہ مبتلا پھر بدستور سابق آوارہ مزاج ہو جاتے۔ مگر اُدھر تو نصیحت کے خیالات تھے تازہ اور اِدھر ادائے قرض کی وجہ سے مبتلا کو اُن لوگوں سے ہوئی ایک طرح کی ناخوشی اور تو کسی کے پاؤں نہ جمے مگر اب سے کوئی تین چار برس پہلے کا مذکور ہے مبتلا کے والد اُن دنوں زندہ تھے اُسی محلے میں مبتلا کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک عورت کرایہ کے مکان میں آکر رہی وہ تھی تو لکھنؤ کی کوئی خانگی پر اُس نے اپنے تئیں بیگم مشہور کیا باوجودے کہ تھوڑے ہی دنوں کی آئی ہوئی تھی مگر سارے محلے میں اُس کی خوبصورتی اور لیاقت کا غل مچ گیا عیاش مزاجوں میں جو جس ڈھب کا تھا اپنے شوق کی چیزیں بیگم کا مداح تھا۔ شاعر کہتے تھے فی البدیہہ شعر کہتی ہے۔ ستار بجانے والوں میں چرچا تھا کہ بول خوب بجاتی ہے۔ تاش گنجفہ چوسر شطرنج کھیلنے والے ان تمام کھیلوں میں اُس کے کمال کے قائل تھے۔ ضلع جگت پھبتی حاضر جوابی پہیلی مکرنی نسبت میں سب مانتے تھے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُس کی خوب صورتی میں لوگ کچھ کلام کرتے تھے مگر اُس کے جامہ زیب ہونے پر سب کو اتفاق تھا۔ مبتلا تو خود ایسی خبروں کی ٹوہ میں لگا رہتا

[1] بھلی عادتیں ۱۲

تھا اُس کو بیگم کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن باپ کے رہتے محلے کے محلے میں بدلحاظی نہیں کر سکتا تھا نہ جا سکتا تھا باپ کے مرے پیچھے جب مبتلا کھل کھیلا تو جہاں اُس نے اَوْر نالائقیاں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بیگم سے ملا۔ شاعری اور ستار اور شطرنج اور کیا اور کیا یہ تو سب مبالغے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ عورت تھی بڑی گویا اُس کی زبان کہے دیتی تھی کہ خواصی یا مصاحبت یا کسی دوسرے طور پر اُس نے بادشاہی محلات میں ضرور تربیت پائی ہی یا کیا عجب ہی کہ جیسا وہ کہتی تھی خود بیگم رہی ہو۔ لسانی کے علاوہ اُس کا سلیقۂ مجلس بھی بہت ہی دلکش تھا وہ نہایت جلد آدمی کے دل کو ٹٹول لیتی اور ہر ایک کے ساتھ اُس ہی کے مذاق کی باتیں کرتی یہ عمل تھا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی تھی ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے وہ کچھ چنداں قدر کی چیز نہ تھی۔ مبتلا کے ساتھ آنکھیں دوچار ہوتے ہی وہ پہچان گئی کہ یہ کوئی نیا مردوا بنا ہی اُس نے مبتلا کو دور سے کھڑے ہو کر ایسے انداز کے ساتھ سلام کیا جیسے کوئی ہندو آفتاب کو ڈنڈوت کرتا ہی۔ اور گاؤتکیہ جس سے لگی ہوئی بیٹھی تھی چھوڑ اپنی جگہ مبتلا کو بٹھایا اور آپ مؤدب سامنے ہو بیٹھی۔ مبتلا نے چاہا کہ اُس کو اپنی برابر بٹھالے مگر وہ ایاز قدر خود بشناس کہہ کر پہلو پر نہ آئی۔ مبتلا تو تمہید کلام ہی سوچتا رہا کہ اتنے میں وہ آپ ہی بولی ایک مدت سے دلی کی تعریفیں سن سن کر جی پھڑکتا تھا اور دل میں ارمان تھا کہ اگر پر ہوتے تو اڑ کر جاتی اور ایک نظر دلی کو دیکھ آتی بارے سان نہ گمان خود بخود ایسا اتفاق پیش آیا کہ خدا نے دلی میں لا بٹھایا اور جیسا سنا تھا اُس سے ہزار حصے بڑھ کر پایا۔ چشم بد دور لکھنؤ میں دولت کی افراط ہی اور لوگ بھی وہاں کے بڑے زندہ دل ہیں حسن کی جو قدر و منزلت آج ہمارے لکھنؤ میں ہی کسی دوسرے شہر میں کم ہوگی اور یہی سبب ہی کہ ملکوں ملکوں سے حسن کھنچ کر سب لکھنؤ میں سمٹ آیا ہی اور میرا رہنا بھی ایسی ہی جگہ ہوا ہی کہ اُس کو حسن کا اکھاڑا کہنا چاہیے مگر اپنا شہر ہی تو ہونے دو بات تو سچی ہی کہی جائے گی ماشاء اللہ آپ کی صورت کا آدمی بھی میری نظر سے تو نہیں گزرا۔ مبتلا یہ تو سب تمہاری مہربانی ہی چوں کہ تم نظر محبت سے دیکھتی ہو تم کو میری صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہی ہم مردوں کی صورت اگر اچھی ہوئی بھی تو کیا بے مصرف صورتیں تو تم لوگوں کی ہیں کہ ایک عالم تمہاری ان صورتوں ہی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہی۔ میں نے بھی تمہاری صفت و ثنا بہت کچھ سنی تھی اور تمہارے دیکھنے کے لیے دل بے قرار تھا مگر موقع نہیں بن پڑتا تھا۔ اب جو تم کو دیکھا تو معلوم ہوا حقیقت میں لکھنؤ کی تراش خراش اور وضع داری کو دلی والے نہیں پا سکتے مگر یہ کہو کہ گھر تمہارا ٹھیر الکھنؤ یہاں دلی میں تمہارے قیام کا کیا بھروسا۔ بیگم۔ ہم لوگوں کا کم بخت اس طرح کا برا پیشہ ہی کہ قرآن کا جامہ پہن لیں تب بھی تو کوئی اعتبار نہیں کرتا آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں ایک عزت دار خاندان کی بیٹی ہوں خدا جانے یہ بھی کرم میں کیا لکھا تھا کہ ایسے برے احوال سے پردیس میں پڑی ہوں میرا حال اس قطعے کا مصداق ہی قطعہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار	اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں جس وقت لکھنؤ سے نکلی دل میں یہ ٹھان کر نکلی کہ اب اس شہر کو پیٹھ دکھائی ہی جیتے جی منہ نہیں دکھاؤں گی جس حالت میں آپ مجھ کو دیکھتے ہیں جس قدر مجھے اس سے نفرت ہی خدا ہی کو خوب معلوم ہی۔ مگر موت اپنے بس کی نہیں

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن آج اگر کوئی بھلا آدمی خدا اُس کے دل میں رحم ڈالے اور میری دست گیری کرے تو مجھ کو چرخہ کاتنا منظور چکی پیسنی قبول میں اُس کی کفش برداری کو حاضر ہوں مگر آن نہ مان میں تیرا مہمان زبردستی کس کے سر ہو جاؤں آپ سے آپ کس کے ساتھ لگ لوں ہرچند مبتلا کی آوارگی اُن دنوں بڑے زوروں پر تھی مگر اُس کے دل میں کسی عورت کے ساتھ تعلق لازمی پیدا کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا یہ بیگم کی سحر بیانی تھی کہ ابھی اُس کی تقریر پوری نہیں ہونے پائی کہ مبتلا نے اُس کو گھر میں ڈال لینے کا پہلے پہل کچھ یوں ہی سا ارادہ کیا۔ بیگم میں دو باتوں کی کمی تھی ایک تو اُس کی صورت کچھ بہت عمدہ نہ تھی بنانے سنوارنے سے وہ اتنی بھی نظروں میں جنچتی تھی دوسرے گانا ناچنا جس کی اِن دنوں مبتلا کو چاٹ لگی ہوئی تھی اُس کو مطلق نہیں آتا تھا تاہم اُس نے اپنی لسّانی سے مبتلا کو پہلی ہی ملاقات میں اتنا تو گرویدہ کر لیا کہ شام کا گیا گیا ڈیڑھ پہر رات کی توپ اُس کو وہیں بیٹھے بیٹھے چل گئی۔ اِس اثنا میں بیگم نے خوب مزے مزے کی گلوریاں اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر مبتلا کو کھلائیں دو دو دَور چائے اور کافی کے چلے۔ مبتلا اگر ایک جلسے میں مدعو نہ ہوتا تو اُس سے رات کا رہ پڑنا بھی کچھ تعجب نہ تھا بارے مکان پر سے آدمی آیا کہ صاحب جلسہ خود آپ کو لینے آتے ہیں ناچار اُٹھنا پڑا اور جلسے کی سُن کر بیگم کو بھی اصرار کرنے کا کوئی موقع نہ تھا مگر چلتے چلتے بیگم نے اتنا عہد تو لے ہی لیا کہ جلسے کے سوائے اپنے یہاں ہو یا کسی دوست کے یہاں بلا ناغہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی اور میر متقی کے آنے تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اتنے دن میں بیگم نے مبتلا کے دل میں بخوبی اپنی جگہ کر لی۔ میر متقی کی لاحول سے جہاں اور شیطان بھاگ کھڑے ہوئے تھے اُن میں ایک بیگم صاحبہ بھی تھیں۔ میر متقی کے رہتے بھی بیگم نے بہتیرے ڈھب لگائے کہ مبتلا زیادہ نہیں تو کبھی کبھار کھڑے کھڑے صورت دکھا جایا کرے مگر مبتلا خود اِن دنوں ہتّے سے اُکھڑا ہوا تھا آنا جانا تو درکنار زبانی سلام و پیام تک کا بھی تو وہ روادار نہ ہوا۔ مبتلا بے چارے کے حال پر خیال کرکے کس قدر افسوس آتا ہے شعر

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند	دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

قریب تھا کہ بیگم اِس کو صبر کرکے بیٹھ رہے اتنے میں تو میر متقی کو سنا کہ تشریف لے گئے بیگم تو اِس خبر کو سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑی اور اُسی وقت سے لگی مبتلا کے انتظار میں بار بار مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے ایک دن گزرا دو دن گزرے تین دن گزرے مبتلا کا پتہ نہیں سمجھی کہ چچا نے ضرور بھتیجے کو کچھ پٹی پڑھائی آخر جب اپنے اہل برادری کو سنا کہ حساب کتاب کے لئے آنے لگے تو اِس نے بھی کسی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا (رقعہ) جانِ من یا ہاں شوراشوری و یا ایں بے نمکی۔ اِس قدر بے مروتی ایسی بے وفائی۔ کچھ قصور کوئی خطا۔ دل کے ایسے بودے اور ارادے کے اتنے کچے تھے تو اتنا ربط بڑھانا۔ ایسا گھر اختلاط کرنا کیا ضرور تھا۔ از برائے خدا چند لمحے کے لیے تشریف لا کر اواہی حقیقت مجھ کو سناؤ میں خدانخواستہ کوئی بلا نہیں کہ چمٹ جاؤں گی آپ کوئی بچے نہیں کہ پھسلا لوں گی اور اگر آپ کو آنا منظور نہیں تو مجھ سے وہاں پہنچنا کچھ دور نہیں۔ شعر

تم جانو غیر سے جو تمہیں راہ و رسم ہو	ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مبتلا یہ رقعہ پڑھ کر غوطہ میں تھا کہ عارف اُس کے سر پر آ کھڑے ہوئے تھے عارف کے چلے جانے کے بعد مبتلا نے رقعہ کو پھر کئی بار پڑھا وہ اُس وقت جانے میں ہچکچاتا تھا مگر پھر اُس نے سوچا کہ اگر میں نہ گیا تو بیگم خود چلی آئے گی اِس سے تو میرا ہی جانا

بہتر ہی۔ غرض دل کو خوب مضبوط کر کے بیگم کے گھر گیا مگر افسوس ہے کہ کچھ ایسی گھڑی کا گیا کہ بس اُسی کے گھر کا ہو رہا۔ بیگم نے
جو کئی مہینے کے بعد مبتلا کو دیکھا تو نہایت تپاک سے ملی۔ بس اُس کا وہ تپاک ایک جادو تھا کہ مبتلا کی تو کیا حقیقت تھی اُس کے
چچا باوا میر متقی صاحب بھی ہوتے تو پھسلتے نہیں تو لڑکھڑا ضرور جاتے۔ دیر تک آپس میں گلے شکوے ہوتے رہے آخر
مبتلا نے شروع سے آخر تک میر متقی کا آنا اور امور خانہ داری کی اصلاح اور اُن کی نصیحت اور ناظر کی فضیحت اور میر صاحب کا
تشریف لے جانا اور عارف سے معرفت کرانا اور عارف کا سمجھانا اور ارباب نشاط کا حساب کتاب ذرا
ذرا بیان کیا۔ بیگم نے بہت ہی توجہ سے مبتلا کے قصے کو سنا اور کہا کہ اتنے دن برابر جو آپ کا آنا نہ ہوا اس سے مجھے بڑی آزردگی
ہوئی تھی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ سے اخیر دو دو باتیں کر کے ضرور اس محلے سے اُٹھ جاؤں گی مگر اب جو آپ سے ساری
حقیقت معلوم ہوئی میرا جی بہت خوش ہوا اور اگر میں جانتی ہوتی تو ضرور میر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتی سبحان اللہ انھوں کی
اچھی ہی باتیں ہوتی ہیں اُنھوں نے باپ سے بڑھ کر آپ کے ساتھ سلوک کیا اُن کے فرمانے پر چلو تو دنیا اور دین دونوں میں
سرخ رو ہیں تو خود آپ سے کہنے والی تھی کہ ان بیسواؤں سے ملنا اور یوں پیسے کو برباد کرنا اور یہ ہرجائی پن اچھا نہیں۔ مبتلا۔
مشکل یہ آکر پڑی ہے کہ بی بی کی طرف تو مجھ کو رغبت نہیں پھر اب کسی طرح زندگی بسر بھی کروں یا نہ کروں۔ بیگم۔ بیاہتا بی بی سے اگر
مرضی نہیں ملتی تو ایک اپنی مرضی کی بی بی کر لو خدا نخواستہ تم کچھ غریب نہیں ہو کہ دو بیبیوں کا خرچ نہ چلا سکو مردوں پر تو خدا نے تنگی نہیں
کی ایک ایک کو چار نکاح کا حکم ہے۔ مبتلا۔ تم مجھ سے نکاح پڑھانے پر راضی ہو۔ بیگم۔ میں تو خود تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اس حالت میں رہنا
پسند نہیں کرتی میں تو کوئی دن جاتا ہے کسی نہ کسی کا دامن پکڑ کے بیٹھ رہوں گی اور اگر تم میری دست گیری کرو تو زہے قسمت مگر
تم کو بہتیری مجھ سے بہتر ملیں گی۔ نکاح کرو تو ایسی کے ساتھ کرو کہ پھر بی بی کی تمنا باقی نہ رہے بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ [illegible] صحبت بڑھاؤ
چندے کسی کو آزماؤ۔ مبتلا۔ میں تو فکر کرتے کرتے تھک گیا اور سوچتے سوچتے میرا سر دکھنے لگا۔ چچا باوا اور میاں عارف کی تو مرضی
یہ ہے کہ میں ساری عمر رنج و غم میں گھل گھل کر مر جاؤں۔ بیگم۔ نوج دور پار نصیب دشمناں رنج کرے تمہاری بلا اور تم اُٹھاتے تمہارے
باہوش دنیا میں بار بار جنم لینا نہیں اور جوانی کی عمر بھی ڈھلتی چھاؤں ہے جب اپنا ہی جی خوش نہ رہا تو دنیا کو لے کر کیا [illegible] الناس۔
مبتلا۔ دل پر تو قابو نہیں چلتا اس بی بی سے ممکن نہیں کہ مجھ کو اُنس ہو چار و ناچار دوسری بی بی تو کرنی پڑے ہی گی اچھا تو آج سے
آٹھویں دن۔ بیگم۔ بلکہ پندرھویں دن مگر ایک شرط سے کہ بست و نیست جو کچھ کہنا ہو تم خود آکر مجھ سے کہنا ایسا نہ ہو کہ پہلے کی طرح بیٹھ رہو
مبتلا۔ نہیں کچھ ہی کیوں نہ ہو میں ضرور خود آؤں گا بلکہ ہو سکا تو بیچ میں بھی ایک دو پھیرے کروں گا۔ بیگم۔ قسم کھاؤ۔ مبتلا۔
تمھاری جان کی قسم۔ بیگم۔ میری جان تو تم ہو۔ مبتلا۔ اپنے سر کی قسم۔ یہ عہد و پیمان ہو کر مبتلا بیگم سے رخصت ہوا مگر سچ
پوچھو تو آج ہی کا جلسہ جلسۂ نکاح تھا۔ بیگم ایک بلا کی عورت تھی اور اُس کو بشرے سے دلی حالات کے معلوم کر لینے کا بڑا ملکہ
تھا آج کی ملاقات میں اُس کو پورا یقین ہو گیا کہ مبتلا پر اُس کا جادو چل چکا ہے اور اسی بھروسے پر اُس نے آپ جلت کی
ورنہ وہ ایسا ڈھنگ ڈالتی کہ بے نکاح پڑھائے مبتلا جانے کا نام نہ لیتا۔ بیگم کے پاس پھر آج کا جانا مبتلا کے حق میں غضب
ہو گیا اُس کو میر متقی نے ایک حالت پر پایا اور اُنھوں نے اور عارف نے اس کو ٹھیل ٹھیل کر کچھ دور سرکایا آج وہ
پھر اپنی جگہ پر عود کر آیا۔

مبتلا اور عارف کا مباحثہ تعدّدِ نکاح کے بارے میں

عارف نے اس خیال سے کہ اس کو اچھی طرح بطورِ خود غور کر لینے دو ایک ہفتے تک اس کی خبر نہ لی پھر جو ملاقات ہوئی تو مبتلا کا تیور ہی بدلا ہوا تھا پوچھا کیوں صاحب تم نے کچھ سوچا غور کیا- مبتلا- جی ہاں دوسرے نکاح کی ٹھیرائی ہی- عارف- (چونک کر) ایں دوسرا نکاح- سچ کہو- مبتلا- کیا کروں میں بھی آدمی ہوں میرے سینے میں بھی دل اور دل میں خواہش ہی مجھ کو بھی موافق سے راحت اور ناموافق سے ایذا پونہچتی ہی میری زندگانی کا زمانہ بھی محدود ہی اور جوانی کا تو محدود نہیں بلکہ مختصر- میں بھی اتنی بات سوچتا ہوں کہ دنیا سے ایک بار جا کر پھر آنا نہیں ان تمام باتوں پر نظر کر کے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آخر مجھ کو تو آسائش ملے- عارف- بے شک آسائش جائز کو کون منع کر سکتا ہی اور تم پر کیا موقوف ہی تمام آدمی کوشش کرتے ہیں اور سب کی کوششوں کا دینی ہو یا دنیاوی ماحصل ہی آسائش مگر غور طلب یہ بات ہی کہ جس کو تم نے آسائش سمجھا ہی وہ حقیقت میں بھی آسائش ہی یا نہیں- مبتلا- یہ تجویز کرنا میرا کام ہی- عارف- بس یہ غلط ہی- ہم سب ہیں بیمار اور شارع ہی ہمارا طبیب اگر بیمار کو اختیار دیا جائے کہ اپنی آسائش کے لیے آپ تجویز کرے تو بیمار یقیناً اپنے تئیں ہلاک کرے گا- مبتلا آپ اطمینان رکھیے میں نے شرع ہی کے مطابق اپنی آسائش کی تجویز کی ہی کیا میں نے نہیں کہا کہ دوسرے نکاح کی ٹھیرائی ہی اگر بے نکاح کسی عورت کو گھر میں ڈال لینے یا پانچویں نکاح پڑھانے کا نام لیتا تب ہی آپ نے کان کھڑے کیے ہوتے- عارف- جوازِ تعدّدِ نکاح کی نسبت تم نے جس طرح پر اپنا اطمینان کر لیا ہو ذرا مجھ کو بھی تو سناؤ- مبتلا- میں تو آپ کے ادنیٰ شاگردوں کی برابری بھی نہیں کر سکتا میرا کیا مقدور ہی کہ آپ کو سمجھاؤں مگر تعدّدِ نکاح کی سند کو قرآن کی وہی ایک مشہور آیۃ ہی وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ[۵۱] عارف- لیکن اسی کے آگے فرماتے ہیں فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً[۵۲] اور اسی سورت اور اسی پارے میں اور آگے چل کر وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَۃِ[۵۳] - اب ان دونوں باتوں کو ملاؤ کہ برابری نہ کر سکو تو ایک کرو اور تمہارے کیے برابری ہو ہی نہ سکے گی- ایک شخص نے حال میں حرمتِ تعدّدِ نکاح پر ایک کتاب لکھی ہی اس کے نزدیک ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ بس ایک بی بی کرو- مبتلا- ایسی ہی ایسی تفسیریں کر کے تو لوگوں نے دین میں رخنے ڈالے ہیں پیغمبر صاحب اور ان کے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور تمام بزرگانِ دین سب متعدد بی بیاں کرتے چلے آئے ہیں ان کو بھی یہ دونوں آیتیں معلوم تھیں اور قرآن کو بھی سب سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا تدیّن بھی بہت زیادہ تھا مگر کسی نے تعدّدِ نکاح کی ممانعت کا نتیجہ نہیں نکالا اور وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

---

۵۱ اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار جتنی تمہاری خوشی ہو نکاح کر لو ۱۲

۵۲ یعنی اگر تم کو یہ خوف ہو کہ متعدد بی بیوں میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی کرو ۱۲

۵۳ یعنی تم چہتیرا چاہو مگر تم سے یہ ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کر سکو پس سارے کے سارے بھی ایک طرف کو مت جھک جاؤ کہ اس بیچاری کو ادھر میں لٹکتا ہوا چھوڑ دو ۱۲

فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا کَالْمُعَلَّقَةِ ۔ سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ جس برابری کی نسبت ارشاد ہی
کہ تم سے ہو ہی نہیں سکے گی وہ پُوری پُوری برابری ہی یعنی عدلِ حقیقی کیوں کہ مطلق عدل سے قاعدے کے مطابق فردِ کامل مراد
لینی ہوگی اور وہ نہیں ہی مگر عدلِ حقیقی اور اسی لیے فرمایا ہی کہ تم سے عدلِ حقیقی تو ہو نہیں سکے گا تو ایسا بھی تو غضب مت کرو
کہ ایک ہی طرف کے ہو رہو اور دوسری کو لٹکا رکھو کہ وہ بے چاری بیچ میں پڑی جھولا کرے اِس سے معلوم ہوا کہ عدلِ حقیقی کے
علاوہ کہ وہ اعلیٰ درجے کا عدل ہی اور انسان سے اس کا ہونا ممکن نہیں ایک ادنےٰ درجے کا عدلِ مجازی بھی ہی کہ انسان صرف
ایک ہی کا نہ ہو رہے بلکہ دوسری کی بھی خبر گیری کیا رہے چچا باوا کے رہتے میرے دل میں اِس بات کا کھٹکا تھا کہ ایک نہ ایک
دن وہ ضرور مجھ کو ٹوکیں گے تو میں نے مولوی محمد فقیہ سے اس مسئلے کی خوب تحقیق کی تھی میری سمجھ میں تو یوں آتا ہی
کہ پہلی آیۃ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۔ میں عدل سے عدلِ مجازی مراد ہی کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہو کہ
تم ادنےٰ درجے کا عدل بھی نہ کر سکو گے اور بالکل ایک ہی کے ہو رہو گے تو ایسی صورت میں تم کو ایک ہی بی بی کرنی چاہیے اور
اگر تعددِ نکاح میں عدلِ حقیقی مشروط ہو تو فی الواقع جیسا آپ کہتے ہیں ممانعت ہوتی تعلیق المحال اور اگرچہ اِس آیۃ میں بھی مطلق
عدل ہی اور چاہیے کہ یہاں عدلِ حقیقی مراد ہو مگر دوسری آیۃ ما بعد وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا الخ قرینۂ صارف موجود ہی اور اگر خدا
کو تعددِ نکاح کی ممانعت منظور ہوتی تو تعلیق المحال کا پیرایہ اختیار کرنا کیا ضرور تھا صاف صاف کہہ دینا تھا کہ بس ایک ہی بی بی
کرو نہ یہ کہ اگر عدلِ حقیقی نہ کر سکو تو ایک کرو کیوں کہ یہ تو معلوم ہی تھا کہ عدلِ حقیقی مقدورِ بشر نہیں ۔ اگر وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا
تَعْدِلُوْا سے ممانعت تعددِ نکاح مراد ہو تو معاذ اللہ اِس آیۃ کی ایسی مثال ہوگی کہ کوئی پوچھیں ناک کہاں ہی اور جواب میں بائیں کان سے
شروع کر کے گدی کی طرف سے داہنی جانب ہاتھ لا کر بتایا جائے کہ یہ ہی ۔ عارف ۔ اِس میں شک نہیں کہ مولوی محمد فقیہ نے اِس
مسئلے کی اچھی تحقیقات کی اور تم نے جو کچھ سمجھا میرے نزدیک نہایت درست سمجھا مگر پیغمبر صاحب سے جو تم نے استشہاد کیا اُس
کو میں نہیں مانتا یہ دونوں آیتیں عام مسلمانوں کے واسطے ہیں پیغمبر صاحب کے نکاح اِن میں داخل نہیں پیغمبر صاحب کے لیے
سورہ احزاب میں ایک پورا رکوع موجود ہی یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ اللّٰتِیْ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ الخ
پیغمبر صاحب کے لیے چار بیبیوں کی قید نہ تھی اور اگرچہ آنحضرت ازواجِ طاہرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے تھے مگر خدا نے
اُن پر اس کو بھی لازم نہیں کیا تھا چناں چہ اُسی رکوع میں یہ آیۃ ہی تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ
وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکَ ۔ اِسی طرح پیغمبر صاحب کو بلا مہر بھی نکاح کر لینا جائز تھا اور یہ باتیں خصائص
نبوی میں سے ہیں ۔ اور کیا مصلحتیں پیغمبر صاحب کے اِن ذاتی معاملات میں مضمر تھیں اُس کی تفصیل ہی جس کے بیان کرنے کو بڑی
فرصت چاہیے اسی طرح صحابہ وغیرہ سے بھی استشہاد کرنے کو میں درست نہیں سمجھتا ۔ نبلا ۔ اِرہا رے خدا کہیں جلدی سے
فرما بھی چلو کہ تعددِ نکاح کے مؤید ہو یا مخالف ۔ عارف ۔ سخت مخالف ۔ نبلا ۔ مذہباً یا عقلاً ۔ عارف ۔ یہ تو تم نے عجیب
انوکھی بات پوچھی اِس سے تو معلوم ہوتا ہی کہ مذہب اور عقل دو چیزیں ہیں اور ممکن ہی کہ دونوں کی دو راہیں ہوں حالانکہ میرا

ف۱ اے پیغمبر ہم نے تم پر حلال کر دیں تمہاری وہ بیبیاں جن کے تم مہر دے چکے ہو ۱۲

ف۲ یعنی اپنی بیبیوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے جدا رکھو اور جس کو چاہو اپنے پاس جگہ دو اور جس کو چاہو پھر بلا لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ۱۲

عقیدہ تو یہ ہے کہ مذہب مخالفِ عقل باطل۔ عقل مخالفِ مذہب گمراہ۔ مثلاً جس چیز کے جواز کے لیے نصِ قرآنی موجود
ہو اُس سے آپ کو مخالفت کرنے کا سبب۔ عارف۔ بات یہ ہے کہ شارع نے مردوں اور عورتوں کی معاشرت کے قاعدے
ٹھیرا دیئے ہیں نکاح اور مہر اور نفقہ اور طلاق اور خلع اور لعان اور ظہار اور رجعت اور رضاع وغیرہ جتنے معاملات ہیں سب کے
واسطے احکام ہیں۔ اگر ان احکام کی پوری پوری تعمیل ہو تو کسی قوم اور کسی مذہب کے زن و شوہر میں اس سے بہتر معاشرت
ہو نہیں سکتی مگر خرابی کیا آکر پڑی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دو چیزوں کو ملا کر اپنے طرزِ معاشرت
کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنا لیا ہے۔ مثلاً پردے سے چلو بلاشبہ اسلام کا حکم ہے کہ بیبیاں پردہ کریں اور اس میں بھی شک
نہیں کہ ایک پردے سے ہزارہا مفسدوں کا انسداد ہوتا ہے مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے پردے کو لازم کر لیا ہے افراط
ہے حدِ شرع سے متجاوز پردہ نہیں ہے مگر قید اور قید جس قدر سخت اُسی قدر زیادہ۔ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے کہ مرد اور عورت
دونوں کی زندگانی کی کامیابی اور ناکامیابی راحت اور تکلیف خوشی اور ناخوشی اسی پر موقوف ہے۔ معاہدہ تو ایسا مہتم
بالشان اور معاہدہ کرنے والے جن کو اس کا نباہ کرنا ہے اور جن پر اس معاہدے کا اثر مترتب ہوگا اُس سے بے تعلق کیوں
کہ اکثر تو معاہدۂ نکاح ایسی چھوٹی عمروں میں ہو جاتا ہے کہ فریقین میں سے کسی کو بھی اُس کے نتائج کے سمجھنے کی اہلیت
نہیں ہوتی اور اگر شاذ و نادر ہوتی بھی ہے تو اظہارِ رائے کر کے بے شرم اور بے حیا اور بے غیرت اور منہ بولا کون کہلائے
پس معاہدۂ نکاح تو کرتے ہیں مثلاً زید اور ہندہ اور ایجاب و قبول کرتے ہیں اُن کے ولی۔ کھلم کھلا پوری آزادی تو نکاح
کے معاملے میں مرد عورت کسی کو بھی نہیں۔ رہ گئے دبے دبائے اشارے کنائے وہ بھی مردوں کے لیے بدنمائی ہے اور عورتوں
کے لیے فضیحت اور رسوائی۔ سب سے بڑا ظلم جو ہم نے اپنی عورتوں پر کر رکھا ہے یہ ہے کہ بیوہ کو دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے
ہزارہا اللہ کی بندیاں ہیں کہ انھوں نے شوہر کا منہ تک نہیں دیکھا اور نصیبوں پر ایسے پتھر پڑے کہ رانڈ ہو گئیں ہندوؤں
کی طرح ستی ہو کر ایک بار کا جل مرنا ساری عمر کے جلاپے سے ہزار درجے بہتر تھا مگر حرام موت ستی کیوں کر ہوں۔ دنیا میں
ناک کٹتی ہے دوسرا نکاح کس طرح کریں۔ غرض جیتی ہیں تو لطفِ حیات نہیں اور مرتی ہیں تو اپنے اختیار کی بات نہیں
تو اس کا مطلب کیا نکلا کہ شارع نے جو حقوق عورتوں کو دیئے تھے وہ تو پورے پورے ہم نے اُن کو لینے نہ دیئے اور اپنے
حقوق میں سے رتی بھر چھوڑنا نہیں چاہتے تو جو نسبت مرد اور عورت میں شارع کو رکھنی منظور تھی کیوں کر باقی
رہ سکتی ہے اور وہ نسبت کیا تھی اس کے لیے میں تمہارے آگے قرآن کی دو آیتیں پڑھتا ہوں سورۂ بقرہ میں ہے۔
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ[1] پھر سورۂ نساء میں ہے وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا[2] اب فرمایئے کہ تعدد نکاح جائز ہے یا ناجائز۔ مثلاً
میں تو مذہب کا کوئی بڑا محقق نہیں مگر اسی طرح جورویں اگر زبردستی ہمارے گلے مڑھی جائیں گی تو جو حالت آپ نے بیوہ
عورتوں کی بیان کی اُس سے بدتر ہماری ہوگی۔ بیوہ عورت کو تو خیر صبر کرنے کے لیے ایک بات بھی ہے کہ شوہر نہیں ہے

[1] یعنی جیسے عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں ویسی ہی راست معاملگی کے ساتھ اُن کے حقوق بھی ہیں اور مردوں کو عورتوں پر برتری ہے۔

[2] عورتوں سے راست معاملگی کے ساتھ برتاؤ کرو پس اگر وہ تم کو بھلی نہ لگیں تو عجب نہیں تم کو ایک چیز بھلی نہ لگے اور خدا اُس میں بہت سی بہتری کر دے۔

نہ سہی یہ کیا مصیبت ہے کہ ایک عورت کو آنکھ بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا بات کرنے کی طرف طبیعت رغبت نہیں کرتی اور آپ کہتے ہیں کہ زبردستی اُس کے ساتھ عاشقی کرو۔ اگر خدا کے یہاں ایسی ہی ہیکڑی ہے تو اُس کو اختیار ہے دوزخ میں ڈالے جہنم میں جھونکے بندگی و بے چارگی مگر میں تو آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ ایسی مجبورانہ عاشقی مجھ سے ہوئی ہے نہ ہوگی عارف۔ بلاشبہ تم مغلوبِ طبیعت ہو رہے ہو اور جب تک تمہاری یہ حالت رہنے کی حقیقت میں تم سے خلافِ طبیعت کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ مبتلا۔ اسی میں تو میں آپ سے مدد چاہتا تھا کہ طبیعت پر غالب آنے کی کوئی تدبیر بتایئے۔ عارف۔ جو تدبیر مجھ کو معلوم تھی اور معلوم کیا تھی وہی ایک تدبیر ہی ہیں سو تو اُس کے بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ پہر پہر تک تمہارے ساتھ اپنا مغز خالی کیا تم لاجواب ہوئے اور چلتے چلتے تم سے کہتا گیا کہ تم ان تمام باتوں کو فرصت سے سوچنا اور موجباتِ ترغیب کے پاس نہ جانا۔ تم یوں سمجھو کہ حسن پرستی مرض ہے سوچنا دوا اور موجباتِ ترغیب سے دور رہنا پرہیز۔ بھائی مرض جسمانی بھی اگر مزمن ہوتا ہے تو اُس سے جلد صحت نہیں ہوتی اور بعض صورتوں میں برسوں علاج اور ساری عمر کے لیے پرہیز کرنا پڑتا ہے یہی حال ہے امراضِ روحانی کا جن کا دوسرا نام ہے بُری لت۔ بد عادت۔ تمہارا علاج تمہارے ہی ہاتھ میں ہے کرو تو تم اور نہ کرو تو تم۔ مبتلا۔ آپ تو تعددِ نکاح میں چند در چند طرح کے خدشات پیدا کرتے ہیں اور بزرگانِ دین میں کوئی بھی اس سے خالی نہ تھا۔ عارف۔ جب ایک بات کی صراحت ہم کتاب اللہ میں پاتے ہیں تو ہم کو کسی بزرگ کے قول و فعل پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک۔ اور دوسرے یہ معاملات ہیں شخصی جب تک کسی کی طبیعت کیفیت حالت ضرورت کا کچا حال معلوم نہ ہو ہم بھلی یا بُری کوئی رائے ظاہر ہی نہیں کر سکتے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے لیے اِس آزادی کو عمل میں لاتے تھے وہ عورتوں کی آزادی میں بھی مضایقہ نہیں کرتے تھے ہماری طرح اُن کا معاہدۂ نکاح مرنے بھرنے کا معاہدہ نہ تھا ذرا سی ناموافقت ہوئی مرد نے طلاق دے دی یا عورت نے خلع کر لیا۔ تھوڑے تھوڑے پھر ہوتے تھے اُن کو معاہدۂ نکاح کا فسخ کر دینا ایک بات تھی نہ طلاق کا عیب تھا دوسرے نکاح کی عار تو اُن کی آزادی حق بجانب ہم کیا اُن کی ریس کر سکتے ہیں کہ ہماری بی بیاں لونڈیوں سے بڑھ کر بے اختیار و دائم الحبس ناک چوٹی گرفتار اور پھر تعددِ نکاح سے جیسے لطفیاں اور بدمزگیاں خانہ داری میں پیدا ہوتی ہیں ہم دیکھتے ہیں تو بزرگانِ دین کو بھی اس سے نجات نہ تھی اُمہات المومنین یعنی پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات میں باوجودے کہ دنیا کے عیش و آرام کسی کو میسر نہ تھے تاہم فقر و فاقے میں بھی باہم ویسے ہی محاسدات تھے جیسے سوکنوں میں ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں سُنّی شیعہ کا تفرقہ جو تم دیکھتے ہو کہ دونوں گروہوں کا خدا ایک رسول ایک قرآن ایک اور پھر آپس میں اس درجے کی عداوت اگر سچ پوچھو تو متفرع ہے اِن ہی محاسدات پر۔ حضرت پیغمبر صاحب کی سب سے پہلی بی بی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جن کے بطن پاک سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ پیدا ہوئیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے پاس اُن کے پہلے شوہر کا بڑا سرمایہ تھا جس کو انھوں نے تجارت میں لگا رکھا تھا اُن کو ضرورت تھی ایک دیانت دار اور ہوشیار کارندے کی اُنھوں نے بعثت سے بہت پہلے کا ذکر ہے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت امانت راست بازی کا حال سُن کر اُن کو اپنی تجارت کے کام میں لگایا اللہ نے حضرت کی نیک نیتی سے تجارت میں بڑی برکت دی۔ حضرت خدیجہؓ نے حسن کارگزاری سے خوش ہو کر اُن کے ساتھ نکاح پڑھا لیا

اِس نکاح کی وجہ سے جو لوگ نِرے دنیادار تھے البتہ حضرت کی زیادہ وقعت کرنے لگے پھر جب حضرت کا زمانہ بعثت نزدیک آیا تو خوارقِ عادات پیش آنے لگے کبھی آسمان پر فرشتوں کو دیکھتے کبھی درخت اُن کو سلام کرتے کبھی غیب سے آواز آتی اِن واقعات کو دیکھ کر ڈرے اور حضرتِ خدیجہ پر اِس تمام حقیقت کو ظاہر کیا۔ حضرت خدیجہؓ تھیں بڑی باخدا بی بی اور اُن کے گھر میں صُحفِ انبیاء اور توراۃ کی تلاوت کا بڑا چرچا تھا اُنھوں نے سُن کر حضرت کی بڑی تسلّی کی کہ تم خداترس آدمی ہو بیوہ عورتوں اور یتیم بچّوں پر رحم اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرتے ہو ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ خدا تم جیسے آدمی کو ضائع کرے اور حضرت کو اپنے بھائی کے پاس لے گئیں جو توراۃ کے بڑے عالم تھے پیغمبر آخرالزماں کی پیشین گوئیاں تو آسمانی کتابوں میں موجود ہی تھیں اور لوگ دِن گِن رہے تھے اُنھوں نے جو حضرت کو دیکھا اور اُن کی ساری حقیقت سُنی تو پہچان گئے اور صاف کہہ دیا کہ آپ پیغمبر ہونے والے ہیں۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں پیغمبر صاحب نے دوسرے نکاح کا قصد تک بھی تو نہیں کیا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد پیغمبر صاحب نے متعدد بیبیاں کیں جن میں سب سے زیادہ عزیز اور سرآوردہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ تھیں۔ رشتے میں ماں اور عمر میں حضرت فاطمہؓ سے بھی چھوٹی اِس سے انکار کرنا بداہت سے انکار کرنا اور واقعات کا جھٹلانا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا تعزّز تمام ازواج طاہرات پر شاق تھا اور اِسی طرح حضرت فاطمہؓ پر بھی جو اپنے تئیں اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کی جگہ سمجھتی تھیں اور جن کو پیغمبر صاحب کا معاملہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے کانوں کا سُنا اور آنکھوں کا دیکھا سب یاد تھا۔ یہ ہے فی الاصل سُنّی اور شیعہ کی بنیاد جنھوں نے یہ سمجھا کہ پیغمبر صاحب کو دنیا میں حضرت فاطمہؓ کے سوائے کسی کے ساتھ کچھ اُنس نہ تھا وہ شیعہ ہو گئے باقسامہم یعنی تفضیلی اور نصیری اور کیا اور کیا خوارج ٹوٹ کر بیبیوں کی طرفداری کرنے لگے۔ اہلِ سُنت کہتے ہیں کہ بی بی بی بی کی جگہ اور بیٹی بیٹی کی جگہ۔ یہاں تک درست ہے۔ مگر آگے چل کر انکار کرنے لگتے ہیں کہ خاندانِ نبوت میں کسی کو کسی طرح کا ملال نہ تھا بس سُنّیوں کی یہ بات دل کو نہیں لگتی تب بھی سُنّی ہوں۔ مگر میرے نزدیک جھوٹ اور نااتّفاقی بے شک تھی تاہم اِس سے اِن بزرگوں کی مذہبی شان میں کچھ بھی فرق نہیں آتا یہ تقاضائے بشریت ہے اور کیوں کسی کی دینداری میں بشریت سے بٹّا لگنے لگا جب کہ پیغمبر صاحب نے اپنی شان میں فرمایا ہو اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ اِلَيَّ[1]۔ غرض اِس طولِ مقال سے یہ ہے کہ جو بے لطفیاں تعدّدِ نکاح کو لازم ہیں خاندانِ نبوت بھی اُن سے محفوظ نہیں رہا دوسرا کس گنتی میں ہے۔ مبتلا۔ اب بھی مجھ کو کون لطف حاصل ہے۔ عارف۔ تم آگ کے جلے ہوئے کو سینکتے ہو یعنی ایک بے لطفی کو دوسری بے لطفی سے دبانا چاہتے ہو مگر ممکن ہے کہ یہ دوسری بے لطفی آخر میں اِس پہلی بے لطفی سے زیادہ شاق ہو۔ مبتلا۔ اُس وقت جیسا موقع ہوگا دیکھا جائے گا میں ابھی سے فکرِ مستقبل کر کے اپنی زندگی کو کیوں تلخ کروں۔ عارف۔ نواب حقیقت میں میری تمہاری ملاقات لاحاصل ہے مگر میں اِتنا کہے دیتا ہوں کہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کرتے افسوس ہے کہ تم نے مجھ کو جناب میر متّقی صاحب سے شرمندہ کیا یہ کہہ کر عارف بہ کمالِ نارضامندی اُٹھ کر چلا گیا۔

[1] میں بھی تو تم جیسا بشر ہوں فرق صرف اتنا ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے ۱۲

مبتلا کا دوسرا نکاح اور اُس کی دوسری بی بی ہریالی کا ماما بن کر گھر میں داخل ہونا اور نکالا جانا اور پھر داخل ہونا

مبتلا کے سر پر اُن دنوں ایسا جن سوار تھا کہ اُس کی عقل ہی ٹھکانے نہ تھی۔ عارف سے پیچھا چھٹا او وہ پھر بیگم کے گھٹنے سے جا لگا۔ وہ تو پہلے ہی سے اس کے لیے جال پھیلائے بیٹھی تھی جانا تھا کہ اس پر چھا گئی۔ بیگم بالطبع زیادہ تر اس بات کی طرف راغب تھی کہ مبتلا آشنائی کے طور پر اُس کو گھر میں ڈال لے مگر میر متقی اور عارف کی تعلیم کا مبتلا پر اتنا تو اثر ہوا کہ اُس نے بے نکاح بیگم کے ساتھ تعلق رکھنے کو پسند نہ کیا۔ پاس تھی مسجد دو طالب العلموں کو بلا بھیجا نکاح پڑھا جانے لگا مہر میں ہوا اختلاف مبتلا نے چاہا مہر شرعِ محمدی بیگم نے کہا جو غیرت بیگم کا مہر وہ میرا مہر جیسی نکاحی بی بی وہ ویسی نکاحی بی بی میں دیر تک اس میں تکرار ہوتی رہی آخر مولوی صاحب جو نکاح پڑھاتے تھے بولے جانے دو مہرِ مثل رکھو۔ مبتلا تو نیم راضی ہو چلا تھا مگر بیگم مہرِ مثل کے نام سے جھینپتی تھی کیونکہ سارے خاندان میں کبھی کسی کا نکاح ہوا ہو تو مہرِ مثل ہو دادی اور پھوپھیاں ساری عمر خرچیاں کماتی رہیں مہرِ مثل آئے تو کہاں سے آئے ناچار مہرِ شرعِ محمدی ماننا پڑا اور بات یہ بنائی کہ وہ بھی کیا بی بی ہے جو میاں پر مہر کا دباؤ ڈال کر گھر کرے ہم تو بڑا مہر مرد کے دل کو سمجھتے ہیں دل مٹھی میں آیا تو جانو سب کچھ بھر پایا۔ وہ کیا غضب کے داؤ گھات تھے کہ ادھر پڑھے گئے اور اُدھر فکروں نے آگھیرا۔ بیگم نے نکاح کے بعد پہلی بات جو کی وہ یہ تھی کہ یہ مکان جس میں میں رہتی ہوں تم کو معلوم ہے کہ کرائے کا ہے اور جتنا ساز و سامان تم یہاں دیکھتے ہو یہاں تک کہ میرے ہاتھ کان کا گہنا اور گلے کے کپڑے کوئی چیز میری نہیں۔ میری سگی خالہ میرے ساتھ ہیں یہ سب اُن کا مال ہے اُن کی ہرگز مرضی نہ تھی کہ میں نکاح کروں اب جو میں نے اُن کو ناراض کر کے کیا ہے تو اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے خالہ بندی میرے پاس ٹھہرنے والی نہیں اور مجھ کو اس وقت کہیں لے چلتے ہو تو میں تیار ہوں اپنی آبرو کا پاس کر کے گہنا کپڑا تم بہتیرا پہناؤ گے اور میں پہنوں گی مگر لے چلنا ہی تو مجھ کو اپنے یہاں کے کپڑے پہنا کر لے چلو اور دو چار دن کے لیے یہاں ٹھہرانے کی صلاح ہے تو جا کر خالہ سے اجازت لو میں اُن کے سامنے نہیں جا سکتی۔ مبتلا نکاح کے لیے تو بڑا مستعجل تھا مگر احمق نے پہلے سے اتنا بھی تو نہ سوچا کہ کہاں دوسری بی بی کو بیاہ کر رکھوں گا اور کیوں کر اس نئے گھر کا انتظام ہوگا۔ اب جو دفعتاً اُس کو معلوم ہوا کہ بیگم بے سر و سامان محض یک بینی و دو گوش اس کے سر پڑی تو بہت سٹپٹایا اور جتنا انبساط وہ معمولی ملاقاتوں میں کر لیا کرتا تھا طبیعت کو اُس کے لیے بھی حاضر نہ پایا۔ یہ حقیقت تھی اُس خواہش کی جس کے پیچھے مبتلا اس قدر دیوانہ بن رہا تھا کہ دنیا اور دین کچھ اُس کو نہیں سوجھتا تھا اب ایسا ذرا سا تردد پیش آگیا تو کہیں اُس خواہش کا پتا نہ تھا۔ میر متقی اور عارف اُس کو یہی تو سمجھاتے تھے کہ کس فکر میں پڑے ہو فکر کرنے کی باتیں دوسری ہیں عمدہ۔ اچھی اور ضروری اگر ان میں دل لگاؤ تو اس فکرِ بیہودہ سے نجات پاؤ۔ بیگم پر اپنی درماندگی ظاہر کرتے ہوئے تو اُس کو شرم آئی آخر یہ کہہ کر سمجھایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں بند و بست کر کے تم کو لے چلتا ہوں تیار رہو۔ ایک بات یہ بھی اکثر دیکھنے میں آئی کہ آوارہ اور عیاش مزاج لوگ دھوکا دینے میں بڑے چالاک ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خود ہمیشہ تختۂ مشقِ مغالطات رہتے ہیں مبتلا کو بھی عین وقت پر غضب کی سوجھتی تھی جب تک وہ بیگم کے پاس بیٹھا رہا کوئی بات اُس کے ذہن میں نہ تھی اُٹھ کر باہر

آیا تھا کہ اُس نے اپنے دل میں کہا بیگم کو اپنے ہی مکان میں بلکہ زنان خانہ میں بلکہ غیرت بیگم کے ساتھ رکھنا ٹھیک معلوم ہوتا ہی کیونکہ یہ بات چھپنے والی تو ہی نہیں آخر کبھی نہ کبھی کھلے گی ضرور پس جو کچھ ہونا ہی وہ پرسوں کا ہونا کل اور کل کا آج ہو چکے یہ دل میں ٹھان وہ گھر کی طرف چلا آرہا تھا کہ راہ میں اُس کو اپنے گھر کی دو عورتیں ملیں۔ ماما۔ ماما کے ساتھ انّا۔ انّا کی گود میں مبتلا کی دودھ پیتی ہوئی دس گیارہ مہینے کی ننھی بچی۔ چہرہ کی ڈاڑھی میں تنکا مبتلا تو سمجھا کہ غیرت بیگم کو نکاح کی خبر ہو گئی اور سننے کے ساتھ ہی شاید ناظر کے گھر چلی گئیں اور یہ عورتیں پیچھے سے جا رہی ہیں گھبرا کر پوچھا۔ ماما بولی ننھی بچی کا جی دس بارہ دن سے ایسا ماندہ ہو رہا ہی کہ بخار کسی وقت نہیں اُترتا کل شام سے مطلق آنکھ نہیں کھولی۔ اب کے ایسی بھاری نظر ہوئی ہی کہ دو پہر سے دودھ بھی مُنہ میں نہیں لیتیں۔ متوکل شاہ صاحب کے پاس دم کرانے لیئے جاتے ہیں۔ مبتلا سے اور ایک ڈاکٹر سے بہت ملاقات تھی مبتلا لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا اُس نے دیکھ کر کہا بخار بڑے زور کا ہی مگر کچھ گھبرانے کی جگہ نہیں کچلیاں پھول رہی ہیں میں مسوڑھا کھولے دیتا ہوں اور شیشی ایک بیچ دیتا عرق دوں گا گھنٹے گھنٹے بعد ایک ایک چمچہ پلانا پسینا آکر تپ اُتر جائے گی اور دودھ تو خدا نے چاہا لڑکی ابھی پینے لگے گی مسوڑھے کی تکلیف کے مارے مُنہ نہیں چلا سکتی یہ کہہ کر نشتر نکال مسوڑھا کھول دیا انّا نے بیٹھ موڑ کر دودھ لگایا تو غٹ غٹ پینے کی آواز آنے لگی سب لوگ خوشی خوشی گھر واپس آئے جب مردانے میں پہنچے تو مبتلا نے لڑکی کو آپ لے لیا یہ تو خیر لڑکی تھی۔ اس سے بڑا لڑکا معصوم ساڑھے تین برس کا ہول اس بلا کی باتیں جیسے بنگالے کی مینا اور ایسی پیاری صورت کہ کوئی راہ چلتا بھی دیکھتا تو گود میں اُٹھا لیتا مبتلا نے کبھی بھول کر بھی آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف کو نہ دیکھا بلکہ وہ بچہ جب اُس کو دیکھتا ابّا ابّا کہہ کر دوڑتا اور یہ ظالم دور سے اُس کو جھڑک دیتا خلاف عادت بیٹی کو گود میں لیئے ہوئے جو گھر میں گھسا۔ غیرت بیگم تو دیکھتے ہی ریجھ گئی۔ اور بیٹی کو لینے کے لیئے دوڑی اور لگی پوچھنے کہیں نے تو اِس کو دم کروانے کے لیئے بھیجا تھا کیا تم اِس کو اُلٹا پھیر لائے۔ مبتلا۔ تم کو خبر بھی ہی اِس کی کچلیاں نکل رہی ہیں اور کچلیوں کا تو معمول ہی کہ بچے کو کچلا کے بڑی مشکل سے نکلتی ہیں میں اِس کو ڈاکٹر کے پاس لیئے گیا تھا اُس نے نشتر سے اُس کا مسوڑھا کھول دیا ہی اور بخار کے لیئے عرق دینے کو کہا ہی۔ شیشی بھیج دو ماما جا کر عرق لے آئے خدا نے چاہا آج ہی رات کو بخار بھی اُتر جائے گا اور کچلی کو تو سمجھو نکل آئی۔ غیرت بیگم۔ اے ہے ہے کیا مسوڑھے کو چیر لگایا ہی۔ مبتلا۔ کچھ خوف کی بات نہیں انّا سے پوچھو کہ لڑکی کو خبر تک بھی نہیں ہوئی اسی وقت تو اُس نے خاصی طرح دودھ پیا۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ جب دانت نکلنے کو ہوتا ہی تو مسوڑھا پہلے سے مردار پڑ جاتا ہی اِس وجہ سے تکلیف نہیں ہوتی کچھ خدا کو بہتری کرنی تھی کہ عین وقت پہ تدبیر ہو گئی ورنہ آج رات بھر میں معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ غیرت بیگم نے لڑکی کا مُنہ کھول کر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں بخار بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا اور صورت بھی ہوشیار تھی پکارا۔ بتول بتول۔ تو ماں کی آواز پہچان کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھ کر مسکرائی بھی ماں نے پیار کر کے انّا کی گود میں دیا تو پھر دودھ پیا یہ دیکھ کر غیرت بیگم بولی کہ ننھے بچوں کی بھی تو بڑی مصیبت ہی کہ آپ تو مُنہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے اور پروالوں کو کیونکر معلوم ہو کہ اِن کو کس بات کی ایذا ہی۔ آنکھوں کا نہ کھولنا اور ذرا ذرا دیر پر اُچھل اُچھل پڑنا اور ہتھیلیوں میں بسانڈی بسانڈی بُو کا آنا اِن باتوں کو دیکھ کر یہاں تو سب لوگ یہی کہتے تھے کہ نظر ہو گئی ہی۔ مبتلا۔ ڈاکٹر نے دیکھنے سے پہلے زبانی حال سُن کر کہہ دیا تھا کہ کوئی دانت نکل رہا ہو گا پھر جو مُنہ کھول کر دیکھا تو

ہیں دور سے کچھی صاف چھپا کہہ سکی تھی ۔ غیرت بیگم ۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا ہو تو ان باتوں کا دھیان رکھے بچے ذرا ماندے پڑتے
ہیں تو میرے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں رہتے لو اب مغرب کی اذان یا تو ہو چکی ہوگی یا ہو رہی ہوگی لڑکی کے جھگڑے میں کھانے
کا بھی تو کچھ بند وبست نہیں ہوا گوشت کا اب وقت نہیں رہا کہو تو خاگینہ پکوا لوں ۔ ابتلا ۔ جو تمھارے جی میں آئے پکواؤ مگر
خدا کے لیئے کوئی سلیقہ مند عورت ضرور رکھو ۔ غیرت بیگم ماماؤں کا تو ہمارے شہر میں ایسا توڑا ہو کہ دو لاکھ لیئے بھی میسر نہیں
جو عورتیں اس کام کی ہیں مزے میں گھر بیٹھے گوٹے کناریاں ٹنکتی یا سلائی کا سیتی ہیں نوکری پرائی تابعداری کیسے ان کی
بلا اور بن ستے یہ کام ہو نہیں سکتا انھوں نے سر پر ڈالا برقع اور جدھر کو منہ اٹھا یا گھرتی ہوئیں پہر چھٹی گھڑی بھیک
مانگی لدی پھندی گھر لوٹ آئیں ۔ ابتلا ۔ لیکن میرے نزدیک تم کو ماما کی نہیں بلکہ ایسی عورت کی ضرورت ہی جو بال بچوں
کی خبر گیری کرے وقت پر ان کا ہاتھ منہ دھلائے کھانا کھلائے کپڑے پہنائے گھر کی ہیر پھیر بست دھرے اٹھائے ۔ غرض
داروغہ کی طرح گھر کے سارے انتظام کی نگرانی کرکے تم کو آسائش پونہچائے ۔ غیرت بیگم ۔ تم ہی کوئی اس طرح کی عورت ڈھونڈ
کر کہیں لا دیتے ۔ ابتلا ۔ لا دوں تو رکھو گی اور کیا تنخواہ دو گی ۔ غیرت بیگم ۔ ضرور رکھوں گی اور تنخواہ پانچ روپے اور کھانا کپڑا ۔ ابتلا ۔
خیر اتنی ہی تنخواہ دینا مگر خاطر داری سے رکھنا ۔ لکھنؤ کی ایک عورت ہی خدا جانے کس تباہی میں آکر یہاں چلی آئی ہی اگر پھٹا پرانا ایک
جوڑا کپڑا دو تو میں پہنا کر ابھی اس کو لے آؤں ۔ غیرت بیگم نے جلدی سے گٹھڑی کھول ایک جوڑا کپڑا نکال میاں کے حوالے کیا ۔
ابتلا کپڑے لے بیگم پاس پونہچا اور اس کو سمجھا دیا کہ اس طور پر میں نے تمھارے گھر لے چلنے کی راہ نکالی ہی مجھے اپنی بی بی
کا حال معلوم ہی وہ یہی نہیں کہ صورت کی اچھی نہیں بلکہ اس میں عقل کی بھی کوتاہی ہی صورت تو خیر تم خود چل کر دیکھ لوگی مگر عقل کی
کوتاہی اسی سے ظاہر ہی کہ اس نے عورت کے لانے کی فرمائش کی بھی تو مجھ سے پس تم کو چند روز البتہ بے عزتی کا تحمل کرنا پڑے گا
اس کے بعد مجھے کامل یقین ہی کہ تم گھر والی ہو گی اور وہ رہے گی تو تمھاری خدمت کرے گی یا اپنے میکے چلی جائے گی غرض غیرت بیگم کا
اتارن پہن معزز ماما یا داروغہ کا بھیس بنا ابتلا کے گھر جا داخل ہوئی بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کی طرح بی چھمکی سکڑی سمٹی ابتلا
کو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ خود لے جا کر غیرت بیگم سے ملا دیتا ۔ دروازے کے اندر کر اتنا پکار دیا لو صاحب داروغہ جی آتی ہیں اور آپ
مردانے میں جا بیٹھا بیگم نے اپنے تئیں سنبھالا بہت مگر وہ جس قدر اپنے تئیں چھپاتی تھی اسی قدر اس کا بیہودہ فاش ہوتا جاتا تھا ۔ آئی تو نوکری
کے نام سے اور عورتوں میں بیٹھی دلھنوں کی طرح گھونگٹ نکال کر رات کا تھا وقت غیرت بیگم نے کہا ذرا روشنی قریب لاؤ تو ان کی
صورت اچھی طرح نظر آئے جوں غیرت بیگم نے زبردستی اس کا منہ کھولا دیکھتی کیا ہی کہ ایک عورت ہی جوان ناک نقشے پر افشاں چنی
ہوئی پٹیاں جمی ہوئی آگے بل کی چوٹی اور اس میں چنپا کا موباف کانوں میں چنبیلی کی کلیاں آنکھوں میں دھواں دھار
سرمہ مسی کی دھڑی اور دھڑی پر لاکھا ہاتھ پاؤں میں مہندی کوسوں سے خوشبو پٹی مہکا رہی ہی غیرت بیگم نے دیکھتے کے
ساتھ اس طرح ڈر کر پیچھے کو ہٹی کہ جیسے کوئی بچہ ہوا سے بھاگتا ہی اور لگی کہنے اوئی بیوی یہ ماما کس قسم کی یہ تو کوئی نامراد
کسبی ہی ... ہمسایہ تک کی عورتیں گھر میں آ تھمیں اور سب نے مل کر بیگم کا ایسا برا حال کیا کہ کوئی دوپٹا اتارے لیئے
جاتا ... چوٹی گھسیٹ رہا ہے ۔ اگر ذرا بھی بیگم وہاں اور رہے تو لڑکیاں اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں ۔
... ہمت سے اس کا ہاتھ پکڑ باہر ڈیوڑھی میں لے جا کر چھوڑ دیا اور کہا بیوی ... جدھر سے آئی ہو ادھر ہی

کو چلی جاوے تو گھر والی ول کی بڑی نیک ہو کوئی اَور سری کی ہوتی تو بے ناک چوٹی کاٹے نہ رہتی۔ مبتلا ڈیوڑھی کے بازو سے لگا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا کچھ ہنسی کچھ غصہ بیگم کو دیکھتے ہی بولا واہ اچھی اپنی گت کرائی باوجودیکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تم کو نوکری کے حیلے سے لیئے چلتا ہوں پھر تم کو ایسا بن سنور کر آنا اور اتنا لمبا چوڑا پردہ لگانا کیا ضرور تھا سیدھے سبھاؤ چلی آئی ہوتیں نہ کسی کو شبہہ ہوتا اور نہ چراغ لے لے کر کوئی تمہارا منہ دیکھتا۔ خیر اب ذرا کی ذرا یہیں ٹھیرو۔ پھر میں تمہاری ہی پیں بجاتا ہوں مگر دیکھو خبردار کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں کو میرے تمہارے لگاؤ کا شبہہ ہو۔ مبتلا نے گھر کے اندر پاؤں رکھتے ہی پوچھا لڑکی کا کیا حال ہی۔ آنا بولی اب تو اللہ کا فضل ہی دو بار عرق پلایا اس قدر پسینا آیا کہ شام سے تین کرتے بدل چکی ہوں۔ مبتلا۔ بس ان شاء اللہ اب بخار گیا۔ بارے الحمد للہ بچ گئیں (بیوی کی طرف مخاطب ہو کر) لاؤ صاحب کھانا طیار ہو تو منگواؤ۔ دسترخوان بچھا عادت کے مطابق میاں بی بی کھانا کھانے بیٹھے تو مبتلا نے پوچھا کیوں صاحب وہ عورت آئی تھی۔ غیرت بیگم۔ واہ۔ چوری اور سرزوری آج کو بڑے[1] ماموں جان زندہ ہوتے تو اُلٹے اُسترے سے مردار کا سر منڈوا کر بھی بس نہ کرتے اور تم کو تو اپنی لاج کا لحاظ پاس آج کیا برسوں سے نہیں۔ بڑے ماموں جان کی زندگی تک چوری چھپے کرتے تھے وہ مرے تم کھُل کھیلے۔ مردانہ مکان تو مدتوں سے کنچنیوں کا چکلہ ہو رہا ہی ایک زنانہ مکان بچا تھا سو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اس کی تاک میں لگے ہو مگر جب تک میں جیتی بیٹھی ہوں دیکھوں تو کون رستم کی بچی میری ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتی ہی۔ اپنا اُس کا خون ایک کر دوں تو سہی۔ مبتلا۔ بے وجہ بے سبب تم اس قدر کیوں گرم ہوتی ہو بھلا اتنا تو سمجھو اگر وہ کنچنی ہوتی اور فرض کرو کہ مجھے اُس کو بلانا منظور ہوتا تو مردانہ ہوتے ساتے مجھ کو اُس کے گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک۔ اور دوسرے خدا عقل دے تو سمجھنے کے لیئے ایک موٹی بات یہ ہی کہ تمہارے مانگے کے کپڑے پہن کر کیوں آتی۔ غیرت بیگم۔ کپڑا اور گہنا تو بے شک اس کے پاس نہ تھا مگر سر سے پاؤں تک چوتھی کی دُلہن معلوم ہوتی تھی۔

مبتلا۔ تم کو چاہیئے تھا کہ مجھ کو بلا کر پوچھتیں۔ اگر میں تمہاری تشفی نہ کر سکتا تب بھی اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ مجھ پر جتنا چاہتیں خفا ہو لیتیں بات یہ ہی کہ حقیقت میں وہ آج شاموں شام تک پہنچی تھی مگر میں اس کو ایک مدت سے جانتا ہوں ہمیشہ یہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ مجھ کو اس پیشے سے سخت نفرت ہی اگر کہیں میری روٹی کا ٹھکانا لگ جائے تو میں تائب ہو جاؤں جب تم نے نوکر رکھنے کا وعدہ کیا تو میں نے اُس کو زبان دی اور وہ ارادے کی ایسی پکی اور سچی تھی کہ فوراً میرے ساتھ ہو لی اور پھر کس طرح پر کہ گہنا اور پاتا اور کپڑا اور لتا اور ساز و سامان یعنی بھرا بھرایا گھر سب کو لات مار کر جس طرح بیٹھی تھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بے شک جھک مارا اور میرا بال بال خدا کا اور تمہارا گنہ گار ہی۔ مگر جب اُن سے چچا باوا تشریف لائے تم میری کوئی ایک بات بتاؤ اور یوں اگر تمہارے مذہب میں تو یہ کچھ چیز نہیں اور ناحق بدگمان رہو تو تمہاری خوشی بھلا تم نے چندروز تو اس بے چاری غریب کو رکھ کر دیکھا ہوتا جو شخص آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہے اُس کا حال آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور کھُلے گا پر کھُلے گا۔ نوکر سریش نہیں ہی کہ چمٹ جائے مرضی ہوئی رکھا مرضی نہ ہوئی نہ رکھا مگر چوں کہ میرا قدم درمیان میں ہی میں تم سے بات کہوں صاف یوں۔ بے خطا بے قصور تو میں اُس کو اُدھر

[1] مبتلا کے والد میر متہذب ۱۲

میں نہیں چھوڑ سکتا تم ہی بتاؤ کہ اب وہ جائے تو کہاں جائے۔ غیرت بیگم۔ ابھی کچھ ہاں نا کرنے نہیں پائی کہ مبتلا نے کہا جا
ماما جا باہر ہریالی ایک عورت کھڑی ہے اُس کو بلا لا اور کام کاج میں اُس سے مدد لیا کر۔ غرض ہریالی نکالی جا کر پھر آ موجود ہوئی
رات گئی تھی زیادہ لوگ کھانا کھا پی کر اپنی اپنی جگہ سو سلا رہے ہریالی بھی تخت پر بے تکیے بے بچھونے ماماؤں میں سوئی
صبح کو جو اُٹھے تو پھر لوگوں نے ہریالی کو گھورنا شروع کیا مگر اب اُس کا سنگار ہو گیا تھا باسی اور تمام شب کی بدخوابی اور زحمت
کی تکان سے اُس کا جوبن بھی نڈھال ہو رہا تھا لوگوں نے کچھ بہت اُس کا پیچھا نہیں کیا۔ اِس میں شک نہیں کہ گھر میں ایک
منتظم عورت کی سخت ضرورت تھی اور یہی ضرورت ہریالی کے پاؤں جم جانے کا سبب ہوئی۔ ہریالی نے جو صبح سویرے
اُٹھ کر دیکھا تو تمام اسباب مولی گاجر کی طرح سارے گھر میں پھیلا پڑا ہے اُس نے خود کھڑے ہو کر جہاں جہاں فرش اُٹھوا کر دالانوں
میں کوٹھریوں میں صحنچیوں میں دروں میں باورچی خانے میں یہاں تک کہ ڈیوڑھی میں جھاڑو دلوائی تو کروڑوں نہیں چھکڑوں
کوڑا نکلا اور بہت سی گری پڑی چیزیں ملیں جن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ صبر کر کے بیٹھ رہے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ کھوئی گئیں
مٹی کی تہیں جمتے جمتے دریوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اصلی رنگت پہچان نہ پڑتی تھی جھڑوایا تو منوں گرد۔ دروازوں میں جو
چلمنیں اور پردے بندھے تھے اُلٹے سیدھے کا تو کس کو امتیاز تھا کوئی دھر تک بندھا ہے تو کوئی آدھے در میں پڑا لٹک
رہا ہے اور کسی کا پیٹ ایک طرف کو جھک کر نکل پڑا ہے تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اِس کو برابر کر دیں بلکہ کئی پردوں
میں سے تو فاختاؤں اور جنگلی کبوتروں اور گلہریوں کے گھونسلے نکلے گھر میں تخت تو بہتیرے ہیں مگر بیٹھنے کے دالانوں
میں زمین پر بوریے بچھے ہیں بوریوں پر دریاں دریوں پر چاندنیاں لونڈیاں اور مامائیں ہیں کہ بے تکلف مٹی اور کیچڑ کے
ننگے پاؤں چاندنیوں پر لیے پھرتی ہیں اور چاندنیوں کا مارے دھبوں اور چکتوں کے یہ حال ہو رہا ہے کہ آنکھ اُٹھا کر
دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ صبح سے کھڑے کھڑے ہریالی کو دوپہر ہو گئی تب کہیں جا کر اتنا کام ہوا کہ گھر میں جھاڑو دی گئی
دالانوں میں اِس حساب سے تخت بچھوائے کہ بیچ میں فرش اور اِدھر اُدھر ماماؤں اور لونڈیوں کے چلنے پھرنے کی جگہ اب
چاندنیوں اور تکیوں کے غلاف اور پلنگوں کی چادروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ قاعدہ ہے کہ جب چیزوں کا انتظام نہیں ہوتا
تو یہی شناخت ہے کہ چیزوں کی حفاظت بھی نہیں۔ اتنا بڑا گھر اور اِس وقت دھولی ہوئی تین چاندنیاں درکار تھیں
وہ بھی نہیں ملتی تھیں۔ غیرت بیگم نے بہتیرے پتے بتائے ارے کمبختو ابھی ہفتے عشرے کا ذکر ہے دھوبن چاندنیوں کا گٹھر
لائی ہے وہ سب ڈھیر کا ڈھیر کیا ہو گیا۔ لٹھے کی وہ کوری چاندنی جو بیچ کے دالان میں بچھی تھی اور پرسوں اترسوں اُس پر سالن
کی دیگچی مبارک قدم کے ہاتھ سے اُلٹ پڑی تھی اور میں نے صاف کرنے کے لیے اُٹھوا دی تھی کہاں ہے جتنی کوٹھریاں تھیں
ایک ایک کا منہ دیکھتی تھی اور ایک ایک پٹارا ٹٹولتی تھی آخر بڑی مشکل سے دو چاندنیاں اناج کی کوٹھری میں مچان پر پڑی
ملیں اُن میں چوہوں نے کاٹ کاٹ کر گولے سے ڈال دیئے تھے اور ایک میں کسی ماما نے سوکھے ٹکڑے باندھ کر کھونٹی میں
لٹکا رکھے تھے اسی جستجو میں معلوم ہوا کہ کئی چاندنیاں باہر سائیس کے پاس ہیں وہ اوڑھ کر سوتا ہے۔ دو یا تین چاندنیاں
کسی کو مانگے دی تھیں وہ واپس نہیں آئیں۔ میلی چاندنیوں کا ایک ڈھیر غسل خانے میں پڑا ملا۔ غرض اِس وقت تو ہریالی
نے کسی طرح گونتھ گانٹھ کر فرش کو پورا کیا۔ پلنگ سب کے سب جھولا ہو رہے تھے اُن کو کسوا کر اجلی چادریں بچھوا دیں تکیوں

کے خلاف بدلے اُجلا دسترخوان نکلوا دیا اتنے میں معلوم ہوا کہ میاں (مبتلا) کھانے کے لیے آرہے ہیں ہریالی یہ سن کر سامنے
سے ٹل باورچی خانے کی زینت ہوگئی۔ مبتلا نے آکر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں گھر کی صورت بدلی ہوئی تھی سمجھا کہ یہ سب ہریالی
کے تصرفات ہیں۔ دالان میں بیٹھ کر کھانا مانگا تو باورچی خانے سے دو لونڈیاں سالن کی دو دو رکابیاں لے کر چلیں پیچھے
سے ایک ماما ہاتھ میں روٹیوں کی تھئی اُٹھا کر دوڑی۔ ہریالی سے نہ رہا گیا عین وقت پر ہو کیا سکتا تھا مگر خیر ان
ماتیوں کو روک کر جلدی جلدی تھالی جوڑ پانی پینے کی صراحی سینی سلفچی خاص دان اُگال دان سب چیزیں منگوائیں
سینی کے بیچ میں روٹی گرد اگرد سالن کی رکابیاں جما اوپر سے خوان پوش ڈھک ایک لونڈی کے سر پر رکھوا سمجھا دیا
کہ دیکھ خبردار آگے دیکھ کر آہستہ آہستہ چلیو کہیں ٹھوکر نہ لگے۔ اور دوسری لونڈی کو سلفچی آفتابہ اُجلا دسترخوان دے کر اس کے
ساتھ کیا کہ پہلے تخت کے نیچے کھڑی رہ کر میاں بی بی دونوں کے ہاتھ دھلا یو جب ہاتھ دھو چکیں سلفچی آفتابہ الگ
رکھ کر دونوں کے بیچ میں اُجلا دسترخوان بچھائیو اور سینی احتیاط کے ساتھ اُتروا کر روٹیاں بیچ میں رکھیو۔ دو قسم کا
سالن ہے دونوں کے سامنے دونوں قسم کا رکھ دیجیو۔ تھالی جوڑا اور پانی پینے کی صراحی پیچھے سے بھجواتی ہوں جب مانگیں
تو خبردار آدھے کٹورے سے زیادہ بھر کر نہ دینا اور پانی جو پلانا تو جھک کر کٹورا آگے کر دینا کہ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور
تھالی منہ کے نیچے رکھنا کہ پانی کپڑوں پر گرنے نہ پائے۔ گھر میں جتنی اچار مربا سبھی کچھ تھا مگر دسترخوان پر رکھنے کا دستور
نہ تھا جس کسی کو کبھی کسی چیز کا خیال آگیا اور منہ چھوڑ کر مانگی تو مرتبان یا اچاری اُس کے پاس لے جا کر وہی پر ایک
پھانک سا رکھ دی۔ ہریالی نے چار قسم کی چار پیالیاں ایک رکابی میں لگا ابھی کھانا شروع نہیں کرنے پائے تھے کہ
پہنچا دیں۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کو گرم پانی کا آفتابہ اور ایک طشتری میں بیسن۔ کھانے کو خاص دان میں
بھیگی ہوئی صافی سے لپٹی ہوئی گلوریاں پہلے سے تخت پر رکھوا دیں۔ یہ تو ہریالی کے پہلے دن کے بلکہ پہلے دن بھی
نہیں دوپہر کے اور جلدی کے کام تھے۔ مہینے بھر کی محنت میں اُس نے کپڑے کا کھانے کا سامانِ خانہ داری کا اندر
باہر دونوں جگہ کے نوکروں کا بازار کے سودے سلف کا سب انتظام کر دیا۔ سلیقہ بھی عجب چیز ہے اندر باہر عورت
مرد جتنے نوکر تھے آپ سے آپ سب ہریالی کا ادب کرنے لگے۔ معلوم ایسا ہوتا کہ دن رات میں ایک دم کے لیے کو دسے شک
نہیں اُترتا تھا۔ بتول کی کیا بساط تھی کیسی ہی پھڑکتی ہو آواز سنی اور چپکی ہوئی غیرت بیگم کے دل میں اس کی طرف سے
تو تھا مگر ہر چند ٹوہ لگائی کوئی بات نہ پکڑ پائی۔ مبتلا کے گھر میں آنے کے وقت مقرر تھے ہریالی ان وقتوں میں ادھر ادھر
کسی نہ کسی بہانے سے ٹل جاتی تھی اور اگر احیاناً بضرورت سامنے چلی پھری بھی تو ایک دوسرے سے ایسے بےرخ بن جاتے
تھے کہ تعلق کیسا گویا جان پہچان تک بھی نہیں مگر خدا جانے دونوں کو کیا ڈھب یاد تھا کہ اتفاقی اچٹتی ہوئی ایک نگاہ
ان کے حق میں خلوت کا حکم رکھتی تھی نہیں معلوم مبتلا آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کہہ دیا کرتا تھا کہ ہریالی برابر سرگرمی اور
دلسوزی کے ساتھ گھر کے انتظام میں مصروف رہتی تھی۔ سچ ہے غیرت بیگم کے ساتھ مبتلا کے دل کے نہ ملنے کا بڑا سبب
تھا مبتلا کی حسن پرستی اور آوارگی۔ مگر اتنا قصور تو غیرت بیگم کا بھی ضرور تھا کہ اس نے مبتلا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ذرا بھی
کوشش نہیں کی وہ سمجھی جیسا کہ گھر کی بیبیاں اکثر سمجھا کرتی ہیں کہ جب ماں باپ نے میاں کے ہاتھوں میں ہاتھ پکڑا دیا تو

بس مجھے اپنی طرف سے کچھ کرنا نہیں اب میاں کا کام ہو کہ کما کر لائے اور مجھے کھلائے پہنائے میری خاطرداری ومدارات کرے لیکن اُس کو اتنی بات اور سمجھنی چاہیے تھی کہ کھلانا پہنانا خاطرداری ومدارات کرنا سب چیزیں متفرع ہیں رغبت پر۔ رغبت کرنا میاں کا کام ہو اور دلانا بی بی کا رہی یہ بات کہ بی بی کیوں کر میاں کو رغبت دلائے اس کے لیئے ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ ہر جگہ چل سکے کیوں کہ ہر ایک کا مزاج مختلف اور ہر شخص کی رغبت جدا۔ لیکن اگر بی بی چاہے تو اُس کو اپنے میاں کی رغبت کا معلوم کر لینا کیا مشکل ہو۔ مثلاً غیرت بیگم اتنا تو دیکھتی تھی کہ مبتلا کیسی صفائی اور کس شان کے ساتھ رہتا ہو وہ ہر چیز میں حسن چاہتا تھا خیر حسن صورت مبتلا کی پسند کے لائق تو اختیاری بات نہ تھی مگر جس قدر اختیاری تھی غیرت بیگم نے اتنی ہی کر کے دکھائی ہوتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی ساز و سامان کی درستی انتظام کی خوبی یہ چیزیں بھی داخل حسن ہیں اور طبیعت میں سلیقہ ہو تو ہاتھ پاؤں کے اور غیرت بیگم کی تو زبان کے ہلانے سے سب کچھ ہو سکتا تھا مگر اس نے اِن چیزوں کی طرف کبھی بھول کر بھی توجہ نہ کی۔ مردانے مکان میں میاں کی بیٹھک تھی اسی کو دیکھ کر متنبہ ہوئی ہوتی اُس کا اپنا کیا حال تھا کہ میاں کو جو شروع شروع میں اپنی طرف سے بے رُخ پایا تو تین تین چار چار دن سر میں کنگھی ندارد۔ لونڈیوں کے تقاضے سے دسویں پندرھویں سر دھویا ہو تو بالوں میں تیل کی خبر نہیں۔ پھولے پھولے روکھے بال اُن سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کڑک مرغی بیٹھی ہو آنکھوں میں سرمہ نہیں ہاتھ پاؤں میں مہندی نہیں۔ پھول نہیں عطر نہیں گوٹا نہیں کناری نہیں غرض عورتوں کے سنگھار کی کوئی چیز نہیں۔ مبتلا کو پہلے استکراہ تھا غیرت بیگم کی بے تدبیریوں نے استکراہ کو نفرت اور نفرت کو ضد اور ضد کو چڑ بنا دیا۔ صورت شکل میں ہریالی کچھ غیرت بیگم سے زیادہ اچھی نہ تھی اگر چھٹانک بھر حسن ہوتا ہو تو غور پرداخت سے دیکھنے والوں کی نظر میں سیر بھر جچنے لگتا ہو سو غور پرداخت کے عوض غیرت بیگم تو یہ چاہتی تھی کہ اُبٹنے کی جگہ تھوڑی سی کیچڑ ملے تو اُٹھا کر منہ کو مل لوں۔ میاں بی بی میں جب اختلاف مزاج اس درجے کا ہو تو اُن میں صحبت برآر ہونے کی کیا امید۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھاتی پر مونگ دلنے کے لیئے آخر ایک سوکن تو آموجود ہوئی۔ ہریالی کا انتظام دیکھ دیکھ کر غیرت بیگم کا پھوہڑ پن مبتلا کے دل میں اور بھی بیٹھتا چلا جاتا تھا

غیرت بیگم پر اپنی سوکن ہریالی کے راز کا فاش ہونا اور اُس کا سوکن کو مارنا اور آخر کار سید حاضر کا بیچ بچاؤ اور فیصلہ کرنا

معلوم نہیں مبتلا کو کب تک ہریالی کا اس خط پر رکھنا منظور تھا کہ ایک دن گھر میں باہر سے یہ اطلاع پہنچی کہ ایک بوڑھی عورت نوکری کی جستجو میں آئی ہو اگر حکم ہو اندر بھیج دیں۔ انتظام خانہ داری تو سب ہریالی کے ہاتھ میں تھا غیرت بیگم نے ہریالی سے پچھوایا ہریالی کسی کوٹھری میں خدا جانے کس کام میں مصروف تھی۔ اُس نے وہیں سے کہا کیا مضائقہ غرض وہ عورت اندر آکر سیدھی غیرت بیگم کے پاس جا بیٹھی اور لگی کہنے کہ میں تو ہریالی بیگم پاس آئی ہوں جن کو تمھارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں۔ مدت سے میں ان کے یہاں اوپر کے کام پر نوکر تھی بیگم کو تو نکلے ہوئے تین مہینے ہونے آئے ہیں ان کی خالہ کے پاس رہی آج آٹھواں دن ہو کہ وہ بھی لکھنؤ سدھاریں میں نے کہا چلوں اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں اُن کے مزاج سے واقف ہوں وہ مجھ کو جانتی پہچانتی ہیں آن جان جگہ تابعداری

کرتی کیا ضرور کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتیں غیرت بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا کہ تم جن کے پاس آئی ہو وہ سامنے والی کوٹھری میں ہیں وہ عورت اٹھ کر کوٹھری کی طرف چلی دروازے تک پہنچی تھی کہ اتنے میں غیرت بیگم بے خود ہو کر بگولے کی طرح اٹھی اور وہ عورت ابھی ہریالی سے بات بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ اس نے پونچ کرب جاری بڑھیا کو اوندھے منہ ہریالی پر دھکیل دیا اور کہا کہ تم نے دیکھا یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے یہ بی بی ہے یہ میری سوکن ہے میں رانڈ ہوں یہ سہاگن ہے میں لونڈی ہوں یہ بیگم ہے میں چڑیل ہوں یہ حور ہے یہ میاں کی لاڈو ہے یہ میاں کی چہیتی ہے یہ میاں کی کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔ یہ کہتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہزارہا گالیاں اور سینکڑوں کوسنے اور دوہتڑ تھا کہ باری باری سے اس شامت کی ماری بڑھیا اور ہریالی پر اور اپنے آپ پر بھی اس زور سے پڑ رہا تھا کہ گویا مزدور سڑک کوٹ رہے ہیں گھر میں بہتیری لونڈیاں اور مامائیں تھیں مگر سیدانی کا جلال دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑ سکی کہ کوٹھری کی طرف رخ کرے سب کی سب بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئیں ہمسایے کی عورتیں کوئی کھڑکیوں میں سے کوئی دیوار پر سے کھڑی جھانکتی تھیں۔ پر کسی سے اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ گھر کے اندر قدم رکھے مبتلا کو دکھلوایا تو وہ بھی اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے مروانے میں ٹٹروں ٹوں اکیلا وفادار اس کا اور تو کچھ نہ سوجھی گھوڑا تو دروازے پر بندھا ہوا تھا ہی منہ میں لگام دے ننگی پیٹھ سوار ہو بگٹٹ[۱] سیدھا پہنچا کچہری میں سید ناظر کے پاس ناظر اسی گھوڑے پر چڑھ دم کے دم میں آ موجود ہوئے اور اتفاق سے سید حاضر بھی کسی ضرورت سے دو تین دن کے آئے ہوئے تھے کچہری سے اُن کے پاس بھی آدمی دوڑا دیا کہ آپ بھی جلدی آئیے غرض سید حاضر اور مبتلا بھی آگے پیچھے پہنچ گئے غیرت بیگم سید ناظر کے آنے سے پہلے کھڑی اور پڑی اتنا پیٹی اتنا پیٹی کہ آخر اس کو غش آ گیا ناظر جس وقت پہنچا ہے تو وہ بالکل بیہوش پڑی تھی ناظر نے آنے کے ساتھ اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں۔ سید حاضر اور مبتلا دونوں آ لیے ہیں اس کے بہت دیر بعد غیرت بیگم کو ہوش آیا سب سے زیادہ چوٹ غیرت بیگم ہی کو لگی تھی کہ اس نے پیٹ پیٹ کر اپنا سارا بدن چوڑی کی طرح نیلا کر لیا تھا۔ ہریالی کی بھی گندی خوب ہوئی مگر اس کو گجی مار لگی تھی۔ بڑھیا ہریالی اور کوٹھری کی دیوار کے بیچ میں آ کر بچ گئی گر وہی مثل ہو کہ مرغی کو تکلے ہی کا گھاؤ بہت ہوتا ہے ...... وہ تین دو ہتڑ جو اس پر پڑتے ہوئے بیٹھ گئے وہ اتنے ہی میں سسکیاں لینے لگی اگر ناظر نہ ہوتے تو کوتوالی والے کیا اس مقدمے کو بے چالان کیے رہیں توبہ۔ اور اگر حاضر نہ ہوتے تو ناظر اور مبتلا آپس میں کٹ مریں۔ پانچ چھ دن تو بیماروں کی دوا دارو ہوتی رہی باندھنے کے موقع پر آنبا ہلدی کا حلوا پکا کر باندھا سینکنے کی جگہ پرانے روڑا اور ریت سے سینکا۔ پھٹکری کو دودھ میں جوش کر کے پلایا۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا جس کے لیے مبتلا کو ہریالی سے ملنے میں تامل ہوتا۔ حاضر ناظر بہن کی خدمت گزاری میں لگے تھے اور مبتلا کھلم کھلا ہریالی اور اس بڑھیا کی۔ باے جب سب کے ہوش و حواس درست ہوئے تو لگے اپنی اپنی جگہ صلاحیں کرنے۔ مبتلا اور ہریالی کی تو یہ مصلحت تھی کہ اب اسی گھر میں برابری کے دعوے سے رہنا اور جلنتوں کو خوب جلانا۔ اُدھر حاضر ناظر غیرت بیگم کے آپس ہی میں پھوٹ تھی ناظر کہتا تھا کہ ابھی لگتے ہاتھ پہلے تھانے میں اطلاع لکھوا کر ایک دم سے تین نالشیں تو فوجداری میں داغو مداخلت بے جا کی ہریالی پر اور ضرر رسانی اور اپنے اور دونوں بہنوں کے نفقے کی مبتلا پر اور ایک دعویٰ مہر کا کاغذ کامل القیمة

[۱] یعنی ایسے زور سے گھوڑے کو دوڑایا کہ باگ ٹوٹ جانے کی بھی پروا نہیں ۱۲ منہ اندر دنی ۱۲

پر دیوانی میں دائر کرو۔ غیرت بیگم معاملے مقدمے کو تو کچھ سمجھتی بوجھتی نہ تھی وہ اپنی یہی ایک بات پر اڑی ہوئی تھی کہ مجھ کو سید نگر پونہچا دو نہیں تو افیون کھاتی ہوں۔ سید حاضر تھا میر منشی صاحب کے خوشہ چینیوں میں اور بات کے انجام کو سوچتا تھا اُس کی یہ رائے تھی کہ نہ تھانے میں اطلاع لکھواؤ نہ سرکار دربار میں کسی طرح کی نالش فریاد کرو نہ سید نگر جاؤ نہ افیون کھاؤ صبر کرکے چپ چاپ گھر میں بیٹھی رہو سوکن کا آنا تمھاری تقدیر میں تھا سو ہوا اب تمھارے شور و فساد سے بہت ہوگا تو تما اِس گھر سے نکل جائے مگر تم اپنے میاں کو اُس کے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتیں تم جو سید نگر جانے یا افیون کھانے کو کہتی ہو یہ تمھاری نامراد سوکن کی عین مراد ہی ناظر بھائی نے جو تدبیر بتائی اُس کا خلاصہ ہی لڑائی اور لڑائی کا ضروری نتیجہ ہی نقصان اور تردّد اور فضیحت اور رسوائی۔ اب تو سوکن کے آنے سے تم کو صرف ایک خیالی تکلیف پونہچی ہی اور تم افیون کھانے کو موجود ہو لڑائی کی صورت میں بہت سی واقعی تکلیفیں ایسی پیش آئیں گی کہ شاید تمھارے ساتھ مجھ کو اور ناظر بھائی کو بھی افیون کھانی پڑے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوکن کے آنے پر تم اِس قدر آپے سے باہر کیوں ہو کیا سوکن تم پر آج آئی ہی تمھارا تو بیاہ ہوا ہی پیچھے اور سوکنیں تمھارے بیاہ سے بہت پہلے کی آئی ہوئی موجود تھیں کیا تم کو معلوم نہیں تم ہی بتاؤ کہ مبتلا بھائی کس دن بے سوکن کے رہے۔ سارا سید نگر جانتا ہی کہ میں نے تمھاری منگنی کے وقت بہتیرا غُل مچایا مگر میری سنتا کون تھا میں تو تمھارے نصیبوں کو اُسی دن رو چکا جس دن تمھاری بات ٹھہری۔ تمھاری سمجھ کا پھیر ہی ورنہ میں تو حقیقت میں اِس بات کو سن کر بہت خوش ہوا کہ مبتلا بھائی نے نکاح پڑھا لیا اِس سے تو یہ پایا جاتا ہی کہ اُنھوں نے آوارگی سے توبہ کی وہ کوٹھوں کوٹھوں سر بازار خدائی خوار پڑا پھرنا بہتر یا ایک کا ہو رہنا اور اُس کو اپنا کر لینا بہتر تم کیسی مسلمان ہو کہ ایک شخص جب تک خلاف شرع چلتا رہا تم نے ہوں تک نہ کی۔ اُس کا طریقہ شریعت پر آنا تھا کہ تمھارے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی ہم تو بھائی ایسے دین ایمان کے قائل نہیں۔ بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہی کہ مبتلا بھائی نے تمھارا بڑا لحاظ کیا کہ نکاح کو تم سے چھپایا اور تمھاری خاطر سے بی بی کو ماما بنایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم پردہ فاش نہ کرتیں تو مبتلا بھائی اِس عورت کے ساتھ اپنے معاملے کو اِسی طرح دبا دبایا رہنے دیتے مگر تم نے بیٹھے بٹھائے سوتی ہوئی بھڑوں کو جگایا اُن کو حیلہ ہاتھ آیا اب اگر وہ اِس عورت کی اور بڑھیا کی دلجوئی اور خبر گیری نہ کرتے تو سارا گھر تھکا تھکا پھرتا میں نے تو جس وقت آکر بڑھیا کو دیکھا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے تو ہوش اُڑ گئے تھے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف چہرے کی رنگت متغیر میں تو سمجھا خدا جانے کہاں بے موقع صدمہ پونہچا کہ اِس کا سانس پیٹ میں نہیں سماتا پوچھو میاں ناظر سے اخباروں میں کئی بار دیکھنے میں آیا ہی کہ کسی گورے نے ایک قلی کو تھپڑ کھینچ مارا یا ٹھکرا دیا اور قلی فوراً مر گیا۔ غیرت بیگم تم نے یہ بڑی سخت بے جا حرکت کی اور اگر تم اِس طرح دست درازی کروگی تو یقین جانو تم اپنی تو اپنی ایک نہ ایک دن سارے خاندان کی ناک کٹوا دوگی ایسا معلوم ہوتا ہی کہ خدا کے چند بدنصیب بندے یعنی لونڈیاں جو تمھارے اختیار میں ہیں تم حق ناحق اپنا غصہ اُن پر نکالتی رہتی ہو یہ بیچاریاں تمھارا کچھ کر نہیں سکتیں ہاتھ چھوٹا ہوا طبیعت بڑھی ہوئی تم سمجھیں کہ سب جانور ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں سوکن اور بڑھیا دونوں کو اُٹھا کر پیٹ ڈالا گویا وہ تمھاری لونڈی ہی اور یہ تمھاری باندی۔ وہ تو خدا نے اتنی خیر کی کہ بڑھیا مری نہیں اور اِدھر عین وقت پر آ پونہچے میاں ناظر کہ اُن کے ملاحظے سے کوتوالی والوں نے تصویب تھاپ کر دی ورنہ

ساری شیخی کرکری ہو جاتی کہ سادات سید نگر کی بیٹی میر مہذب کی بہو کی ڈولی کوتوالی چبوترے پر دھری ہوتی۔ صد آفرین ہے
تمہاری سوکن پر ہے تو ذات کی کنجنی مگر بڑی ضبط کی آدمی ہے کہ تم سے کہیں زبردست معلوم ہوتی ہے مگر چپکی مار کھا لی اور
الٹ کر اُف تک نہ کی کیوں غیرت بیگم بھلا جیسا تم نے اُس کو مارا تھا اگر وہ بھی برابر سے مارتی تو تمہاری عزت تو دو کوڑی
کی ہو جاتی مگر اتنا فائدہ ضرور ہوتا کہ پھر تمہارا ہاتھ کسی پر نہ اُٹھتا۔ سید حاضر نے ناظر اور غیرت بیگم کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا
کہ دونوں کو کچھ جواب نہ بن پڑا اور دونوں اپنا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے آخر ناظر بولا کہ آپ ہم دونوں سے بڑے ہیں جو کچھ آپ
کے نزدیک مناسب ہو اُس کی تعمیل میں نہ مجھ کو عذر ہے اور نہ آپا کو یہ معاملہ ناموس کا ہے اور بھائی بہنوں کی ناموس کچھ جدا
جدا نہیں ہوتی اِس میں رتی برابر فرق نہیں کہ آپ جو کچھ کریں گے آپا کے حق میں بہتر ہی کریں گے سید حاضر نے کہا بس تو مجھ کو مبتلا
بھائی سے دو دو باتیں کر لینے دو ان شاء اللہ میں کوئی ایسی راہ نکالوں گا کہ دونوں میاں بی بی میں صفائی ہو جائے ایسا ہو قصہ
تاک کر کہ مبتلا مردانے میں اکیلا تھا سید حاضر خود اُس کے پاس گئے۔ جس وقت سے گھر میں یہ واردات ہوئی تھی حاضر اور ناظر
دونوں کی طرف سے بُرے ہی بُرے خیالات مبتلا کے دل میں گزرتے تھے۔ اُس کو ساری عمر کبھی کچہری جانے کا اتفاق نہیں ہوا
بس کچہری کے نام سے اُس کا دم فنا ہوتا تھا اور حاضر ناظر دونوں کو خصوصاً ناظر کو کچہری ایسی تھی جیسے مچھلی کو تالاب مولیشی
کو تھان۔ پرند کو گھونسلا۔ عورت کو میکا۔ باوجودے کہ سراسر قصور غیرت بیگم کا تھا مگر مبتلا الٹا چور کی طرح سہما جاتا تھا کہ دیکھیے
یہ بھائی بہن کئی کئی دن سے کٹیاں کر رہے ہیں کیا فساد کھڑا کرتے ہیں اُس کے دوست آشناؤں میں بھی کسی کسی نے اُس
کو کوتوالی اور فوجداری میں استغاثہ کرنے کی صلاح دی تھی مگر ہر چند اُس کو سر دوا بتاتے تھے کچہری کا نام آیا اور اُس کا رنگ فق
ہوا وہ بگڑ بگڑ کر ایک ایک کی منت کرتا تھا کہ یارو مجھ سے مدعی بننے کی توقع مت کرو کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ اگر یہ لوگ مجھ
پر نالش کریں اور کریں ہی گے تو مجھ کو حاکم کے روبرو نہ جانا پڑے۔ بہتیرا لوگ سمجھاتے تھے کہ اُن کی طرف سے نالش کے ہونے
کی کوئی رُوداد نہیں اور فرض کیا کہ نالش ہو بھی تو تم اپنی طرف سے جواب دہی کے لیے مختار یا وکیل کھڑا کر دینا بلکہ بعضے تو شرط
باندھتے تھے کہ اگر نالش ہو اور خدانخواستہ تم پر کسی طرح کی آنچ آ جائے تو حاکم جو سزا تمہاری تجویز کرے اُس کی چوگنی ہم بھگتنے
کو موجود ہیں چاہو ہم سے لکھوا لو۔ مبتلا کہتا تھا تم ناظر بھائی کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو ارے میاں وہ اِس
بلا کا آدمی ہے کہ چاہا وا بے چارے کسی کے لینے میں نہیں دینے میں نہیں اُس نے دل پر رکھا تو شہر سے نکلوا کر چھوڑا۔ مبتلا
کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ہر بالی اور اُس کی بڑھیا کی مرہم پٹی کی ضرورت سے کھڑے کھڑے گھر میں جاتا تو الٹے پاؤں باہر بھاگا
ہوا آتا کہ دیکھوں کہیں سرکار سے طلبی تو نہیں آئی اتنے دن نہ تو اُس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور نہ پوری نیند سویا اگر کچھ
دن اَور سید حاضر کی طرف سے سبقت نہ ہو تو مبتلا اِس قدر پریشان تھا کہ وہ خود ابتدا کرتا اور اتنے دن بھی وہ اپنے آپ
لیے رہا تو اِن لوگوں کی ناراضمندی کے خیال سے اُس کو جرأت نہیں ہوئی سید حاضر کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہو گیا
مگر اِس وقت تک اُس کے دل میں کھٹکا تھا کہ ان کا آنا خالی از علت نہیں جب سید حاضر نے قریب پہنچ کر معانقے کے لیے
ہاتھ پھیلائے تو اُس کو اطمینان ہوا اور بھائی کے گلے لگ کر غیرت بیگم کی زیادتی اور اپنی مجبوری اور اتنے دن کی پریشانی
کو یاد کر کے خوب رویا سید حاضر کا بھی جی بھر آیا کہ دیکھو خدا کے فضل سے گھر میں سب طرح کی فراغت ہے ایک چھوڑ دو دو

لیتا ہیں بچے ہیں کسی بات کی کمی نہیں مگر ایک بُری لت جو اپنے پیچھے لگالی ہی تو زندگی کیا تلخی سے گزرتی ہی۔ معانقے کے بعد دونوں
بھائی ایک جگہ بیٹھے تو سید حاضر نے کہا مبتلا بھائی یہ نیا رشتہ تمھارے ساتھ کیا ہوا کہ وہ پُرانا رشتہ بھی اُس کے پیچھے گیا گزرا ہوا
دیہات کا کمبخت کیا بُرا دستور ہی کہ ہم تو بہن کے گھر پر بلا ضرورت آ نہیں سکتے اب تمھاری ہی طرف سے ملاقات ہو تو ہو
سید نگر تو بھلا تم کیوں آنے لگے شہر میں بھی تم کہیں نظر نہیں آتے آج آٹھواں دن ہی کہ میں بلاناغہ دونوں وقت یہاں
آتا ہوں تم کو چار بار دیکھا بھی مگر تمھارا رُخ نہ پایا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے کہا لاؤ میں ہی پیش قدمی کر کے تم سے
ملوں۔ مبتلا۔ کیا کہوں میں تو ندامت کی وجہ سے نہیں مل سکا۔ حاضر۔ ندامت کی کیا بات ہی عورتیں ناقصات العقل آپس
میں لڑا جھگڑا کرتی ہیں۔ اگر مرد ایسی ایسی باتوں کا خیال کیا کریں تو دنیا میں کیسے گزر ہو۔ مبتلا۔ آپ پر ثابت تو ہو گیا
ہو گا کہ زیادتی کس کی تھی۔ حاضر۔ اس معاملے میں میرا مُنہ نہ کھلواؤ میں تم سے کیسی ہی سچی بات کیوں نہ کہوں پر تم یہی
سمجھو گے کہ بہن کی طرف داری کرتا ہی۔ مبتلا۔ میں نے آپ کے تدیّن کی تعریف کسی اَور سے بھی نہیں چھپایا واسے سُنی ہی
میں آپ کی نسبت بے انصافی کا خیال کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ حاضر۔ دوسرا نکاح تو تم کر چکے اب اس کی نسبت یہ کہنا کہ تم نے
جلدی کی یا بے جا کیا فضول ہی بلکہ ایک اعتبار سے تو میں کہتا ہوں کہ تم نے بجا کیا مناسب کیا خوب کیا اور ضرور کرنا چاہیے
تھا تمھارا طرزِ زندگی دین کے شرافت کے تجمل ماہست کے عقل کے سب کے خلاف تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہی کہ تم
نے اُس سے توبہ کی خدا کرے کہ تمھاری توبہ پہاڑ کی طرح مستحکم ہو بھاری بھرکم ہو مضبوط ہو اٹل ہو مگر مجھ کو اس بات
کا اندیشہ ہی کہ ایک مگدر کو تو تم اُٹھا نہ سکے جوڑی تم سے کیوں کر ہلائی جائے گی تمھاری وہی مثل ہی کہ تنور سے
بچنے کے لیے بھاڑ میں گرے دو بیویوں کا رکھنا جمع بین النقیضین کچھ آسان کام نہیں تم نے تو ایسی ہنڈیا
پکائی ہی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا اُس کا پہلا اُبال ہی جب کھدبد کی نوبت آئے گی تو اصلی مزہ معلوم ہو گا یقین جانو کہ
میں کچھ بہن کی پاس داری سے نہیں کہتا بلکہ حقیقت نفس الامری بیان کرتا ہوں کہ تم نے غیرت کی قدر و وقعت
کو مطلق نہیں پہچانا۔ غیرت بیگم خدا نخواستہ (شرامت مانا) تمھاری اس بی بی کی طرح گری پڑی بازاری عورت نہیں
وہ ایسے جتھے اور ایسے گروہ اور ایسی برادری اور ایسے خاندان کی بیٹی ہی کہ جہاں اُس کا پسینا گرے آج سید نگر میں کم
سے کم دو سو آدمی ایسے نکلیں گے جو اپنا خون بہانے کو موجود ہو جائیں گے۔ عورتوں کے معاملے عزت اور آبرو اور
ناموس کے معاملے ہیں مال کی تو کیا حقیقت ہی عزت کے آگے شرفا خاص کر دیہات کے خاص کر سادات خاص کر
سادات سید نگر جان کی ذرا پروا نہیں کرتے یاد کرو کتنی منت کس قدر خوشامد کیسی آرزو سے ماموں اور ممانی (خدا ان دونوں
کو جنت نصیب کرے) غیرت بیگم کو بیاہ کر لائے آج کو دونوں یا اُن میں سے ایک بھی زندہ ہوتے تو کیا تمھاری
مجال تھی کہ تم غیرت بیگم پر سوکن لاؤ اور اُسی کی گود میں بٹھاؤ پھر بندۂ خدا تم کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ماں باپ اس کے
نہیں ساس سسرے اس کے نہیں دنیا میں وارث کہو سرپرست کہو شوہر کہو ایک تم سو تم نے جلا جلا کر اس کا یہ حال تو
کر دیا کہ سید نگر کی نسبت اب تنہائی بھی باقی نہیں رہی اور اس پر بھی تم کو صبر نہ آیا سوکن کو لا بٹھایا عورت ہو تو جانو یا
عقل ہو تو پہچانو سوکن کا کیسا داغ ہوتا ہی۔ بیوگی سے بڑھ کر۔ میاں نکھٹو اپاہج ہو بدمزاج ہو روٹی کھانے کو

اولاد بھی بہلانے کو نہ ہو سب مصیبتیں جھیلی جا سکتی ہیں اور نہیں جھیلی جا سکتی تو سوکن کی دنیا کے آگ جلاپے جلاپے ہیں اور سوکن کا جلاپا ۔ سلگاپا ۔ جس شخص پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو وہ اگر افیون کھا لیتی یا کوئیں میں گر پڑتی یا پیٹ میں چھری بھونک لیتی اُس سے کسی بات کا تعجب نہ تھا بلکہ تعجب یہ ہے کہ رونے پیٹنے پر قناعت کی اگر خدانخواستہ اس نے اپنے کو ہلاک کر لیا ہوتا تو تمہارا کیا جاتا تم تو نئی بی بی کے ساتھ چین کرتے گل چھرے اُڑاتے ہم کو بہن کہاں پیدا تھی ۔ مبتلا ۔ اگر آپ نہیں تو میں اس عورت کو چھوڑ دوں ۔ حاضر ۔ میں تو چھوڑنے کو نہیں کہہ سکتا اور تم ایسے چھوڑنے والے ہوتے تو کرتے ہی کیوں ۔ فرض کیا کہ تم نے اُس کو میرے کہنے سے چھوڑ دیا اور پھر وہی سابق کا وتیرہ اختیار کیا تو تم اپنے ساتھ دنیا اور دین دونوں جگہ میرا مونہہ بھی کالا کراؤ ۔ مبتلا ۔ پھر آپ ہی کوئی راہ نکالیے مجھ سے ایک نادانی تو ہوئی اور اپنی طبیعت کو بارہا آزما چکا ہوں میرے قابو کی نہیں آج آپ سے ایک وعدہ کروں اور کل کو جھوٹا ٹھہروں تو پھر آپ کے نزدیک میرا کیا اعتبار رہا اس سے بات کا صاف صاف کہہ دینا اچھا اور اگرچہ آپ سے اس معاملے میں صلاح پوچھنا داخل بے حیائی ہے مگر چچا باوا پہلے چلے فرما گئے ہیں اگر کوئی مشکل آپڑے تو آپ کی رائے پر عمل کرنا اور یوں بھی آپ بڑے بھائی ہیں باپ کی جگہ آپ ہی اگر آڑے ہی پر آڑے نہ آئیں گے تو میں کس کے پاس التجا لے جاؤں بندے سے تو قصور خدا معاف کرتا ہے آپ انہیں کیے خدا میرا ایک قصور معاف کیجیے ۔ حاضر ۔ بات یہ ہے کہ میں تمہاری اس نئی بی بی کے حالات سے بخوبی واقف نہیں میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کس طرح اس کے ساتھ مدارات کرنی مناسب ہے ۔ مبتلا ۔ اس کمبخت کے اور حالات ہی کیا ہیں ۔ بازاری عورت ہے تن تنہا مدت سے تو بیکار رہی تھی میری جو شامت آئی اس کے ساتھ عقد شرعی کر لیا کیونکہ چچا باوا کے سامنے آوارگی سے میں توبہ کر چکا تھا حماقت پر حماقت یہ ہوئی اور اب میں اُس گھڑی کو بہت پچھتاتا ہوں کہ گھر میں لا کر اُو پہ کا کام کاج سپرد کیا دوسری ماماؤں کی طرح رہنے سہنے لگی اگر میں نے اُس کے ساتھ کسی طرح کا سروکار رکھا ہو تو مجھ پر خدا ہی کی مار پڑے یہ تو اس کی پچھلی کیفیت ہے آیندہ کے لیے بھی اگر آپ کی مرضی ہو تو وہی ماماؤں کی طرح رہے گی اور بدستور گھر کی خدمت کرے گی ۔ حاضر ۔ اس کا غیرت بیگم کے پیش نظر رہنا تو میں پسند نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں فسادِ عاجل کا بڑا اندیشہ ہے دو سوکنوں کی مثال تمھیں کس طرح بتاؤں یوں سمجھو کہ دو گلاس ہیں ایک میں سوڈا ہی پانی میں حل کیا ہوا اور دوسرے میں ایسڈ ممکن ہے کہ سوڈا اور ایسڈ ملیں اور اُن میں جوش و خروش پیدا نہ ہو پس دونوں کو ایک جگہ رکھنے کا تو تم کبھی بھول کر بھی ارادہ نہ کرنا ورنہ آج وہ ہتھ چھٹ تھے تو کل جوتیاں ہوں گی اور برسوں چھریاں اس کو تو کسی دوسرے شہر میں یا خیر دوسرے محلے میں یا خیر دوسرے گھر میں تو رکھنا ضرور ہی مگر مشکل یہ ہے کہ تم کہتے ہو وہ ہے اکیلی تن تنہا آدمی زیادہ رکھے جائیں تو تمہاری چادر[۱۵] میں اتنے پاؤں پھیلانے کی گنجائش نہیں بس صرف یہی تدبیر ہے کہ زنانے مکان میں پورب کی طرف جو ایک کھانچا سا نکل گیا ہے اس حصے کی دیوار کھنچوا لو اور ڈیوڑھی میں سے دروازہ پھوڑ کر اتنا گھر الگ کر لو اور حقیقت میں یہ تھا بھی دوسرا گھر ماموں باوا نے مول لے کر باہر گلی کا دروازہ تیغہ کرا کے زنانے مکان میں ملا لیا تھا تیغے کا نشان اب تک موجود ہے اتنا مکان ایک مختصر خانہ داری کے لیے بخوبی کافی ہے ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں دالان دوہرا آگے سائبان دونوں طرف بڑی بڑی دو دو کوٹھڑیاں باورچی خانہ اس کی بغل میں جیسے رکھنے کو لمبی کول کی سامنے

[۱۵] یعنی تم کو اتنا مقدور نہیں ۱۲

ضلع میں سے درہ بس اور چاہیے کیا بڑے گھر کی طرف خدا کے فضل سے آدمی زیادہ ہیں اور خرچ بھی بہت ہی برابری اگر چاہو تو دونوں گھروں میں ممکن نہیں اور ضرور بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں چھوٹے ماموں باوا پینسٹھ روپے کی تنخواہیں اور کرایہ تمہارے نام کرا گئے ہیں اور ساٹھ کی غیرت کے نام - سو اپنے پینسٹھ میں تیس چھوٹی بی بی کو دیا کرو اکیلا دم ہی فراغت سے بسر کر سکتی ہیں پینتیس تم کو بچیں گے اس میں تمہارا کپڑا ہے اور باہر مردانے کا خرچ غیرت بیگم کے ساٹھ کو ہاتھ مت لگاؤ - ایک دن بڑے گھر میں رہو ایک دن چھوٹے میں نہ ہٹر پٹر نہ کھٹر کھٹر اللہ اللہ خیر صلاح - مبتلا تو اپنی جگہ یہ ڈر رہا تھا کہ نہیں معلوم شہر سے نکلوائیں گے یا قید دلوائیں گے یا گھر بار ضبط کرائیں گے سید حاضر کا فیصلہ سننے کے ساتھ اس کے پیروں پر گر پڑا کہ بس اس میں اگر میری طرف سے کبھی سر مو فرق ہو تو جانیئے گا کہ میری اصالت میں فرق ہے - ہریالی بھی اپنی جگہ بہت خوش ہوئی اور سمجھی کہ اب میرا لی لی ہونا سب بچوں نے جانا گھر بٹوایا پایا میاں کے پینتیس بھی میرے اپنے ہی ہیں وہ ملا کر تنخواہوں میں کرایے میں بڑا آدھا میری طرف رہا کہاں غیرت بیگم سیدانی اشرف میاں کی پھوپی زاد بہن صاحب اولاد آٹھ نو برس کی بیاہی ہوئی اور کہاں میں - انصاف کی رو سے تو میں ان کی جوتی کی بھی برابری نہیں کر سکتی قربان جاؤں خدا کے کہ اس نے مجھ گنہگار ناچیز کی توبہ کو ایسا نوازا کہ ان ہی کے سگے بھائی کے ہاتھ سے مجھ کو جتوایا - غیرت بیگم کو تو سوکن کے نام کی جلن تھی اس کو مکان سے تنخواہ سے کچھ بحث ہی نہ تھی ہریالی کو کیسے ہی برے احوال سے رکھتے مگر جب تک غیرت بیگم یہ جانتی تھی کہ یہ میری سوکن ہے کسی طرح وہ راضی ہو ہی نہیں سکتی تھی لیکن بڑے بھائی نے جب ایک فیصلہ کر دیا تو کیا کرتی دل میں پیچ و تاب کھا کر چپکی ہو رہی مبتلا کے ساتھ بولنا بات کرنا پہلے ہی سے کم تھا اب بالکل چھوڑ دیا غرض صحن میں پردے کی دیوار اٹھائی گئی ڈیوڑھی میں دروازہ لگا ہریالی نے الگ گھر کر کے رہنا شروع کیا -

ہریالی کا امید سے ہونا - غیرت بیگم کا اس بات کو جاننا اور اپنی ماما خاتون سے اس کو سنکھیا دلوانا - مقدمے کا کوتوالی میں دائر ہونا - اور آخر کار ناظر کی تدبیر سے دب جانا مگر مبتلا کا دوالہ نکال کر

اتفاق سے ہریالی پڑی بیمار تھا موں شام سر دھو یا سردی کھا لی زکام ہوا بخار آنے لگا چند روز کچھ دھیان نہ کیا بخار تھا کہ جھچھڑ ہو گیا - بلکہ ذرا ذرا کھانسی کی بھی دھسک شروع ہو گئی معمولی طور پر حکیموں کے علاج کیے منضج ہوئے مسہل ہوئے بخار سے کہ جنبش نہیں کھاتا کھانسی کو اتنا آرام ہوا بھو کہ سوکھی سے تر ہو گئی ایک دن بلغم میں کچھ سرخی کی سی جھلک دکھائی دی تو تردد ہوا اور تردد کی بات ہی تھی خیال کیا کہ پان کی سرخی ہو گی مگر پھر ثابت ہوا کہ نہیں خون کی ہے تب تو مبتلا بہت گھبرایا - غیرت بیگم کے ہاتھوں سے تو اس کو ایسی ایسی ایذائیں پہنچی تھیں کہ اس کے نام سے اس کا دل بیزار تھا اس کو تھوڑی یا بہت جو کچھ دل بستگی تھی ہریالی کے ساتھ تھی اب جو اس کو خون تھوکتے دیکھا قریب تھا کہ سودائی ہو جائے - شبہہ تو بہت دنوں سے تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں غیرت بیگم نے کچھ کر کرا دیا ہو کھانسی کے ساتھ خون کا آنا تھا کہ یقین کیسا حق الیقین ہو گیا کہ غیرت بیگم نے پیچھے بٹھائی - خدا نخواستہ ایسا تو برا نہ بخار بھی نہیں کہ سل ہونے کا اندیشہ ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیانے اور بھگت بلائے

آئے سب نے اپنے اپنے جادو چلائے مگر کمبخت یوں کی کچھ اصل جادو کی کچھ حقیقت ہو تو روگ ہیں کمی مرض ہیں خفقہ ہو جیسا کے جادو وہم کی یوں اس کو اتارے کون۔ ہر یالی کا حال بہت پتلا ہوتا چلا آخر کسی نے صلاح دی کہ سب کچھ تو کر چکے ذرا ڈاکٹر چنبیلی کو بھی تو ایک نظر دکھاؤ۔ ڈاکٹر چنبیلی کا نام اصل میں مسی بیلی تھا ولایت سے نئی آئی ہوئی تھی کہ اس نے نواب اقتدار الدولہ بہادر کے محل میں ایک بڑے معرکے کا علاج کیا تب ہی سے شہر میں اس کی بڑی شہرت ہوئی نواب صاحب کی محل سرا میں اس کو چنبیلی چنبیلی پکارتے تھے وہاں کی سنی سنائی اور لوگ بھی چنبیلی کہنے لگے دایہ گری کے فن میں نہایت تجربہ کار اور مشاق تھی اور خود مبتلا کے گھر میں معصوم اور بتول دونوں کے ہونے میں بلائی جا چکی تھی ہر یالی اور ہر یالی کے بیمار دار کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہر یالی کی حالت ڈاکٹر چنبیلی کے علاج کی متقاضی ہے۔ ڈاکٹر چنبیلی کو جب بلوا گیا تو غیرت بیگم سمجھ کر معرفت سابقہ کے لحاظ سے بلا عذر بہت خوشی کے ساتھ فوراً چلی آئی۔ اس کو یہاں آکر معلوم ہوا کہ مبتلا نے دوسری بی بی کی ہے۔ اس نے بیمار کو دیکھا تو سہی مگر مبتلا سے کہا کہ مجھ سے اور غیرت بیگم سے دوستی یا بہناپا تو نہیں ہے پر تم کو معلوم ہے کہ ان کے دو بچوں کے ہونے میں میں نے ان کی خبر گیری کی ہے تو تمھاری اس بی بی کا علاج کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا اس کو میں خلاف مروت سمجھتی ہوں اور میرے علاج کی چنداں ضرورت بھی نہیں جس حکیم کا علاج کرتے ہو ان کو صرف اتنا اشارہ کر دینا کہ دو جانوں کی رعایت سے علاج کریں۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر چنبیلی غیرت بیگم کی طرف گئی معصوم اور بتول دونوں کو گود میں لے کر پیار کیا پھر غیرت بیگم سے بولی کہ اگر میں دوسرے گھر میں نہ بلائی گئی ہوتی تو میں تم سے پوچھتی کہ اس قدر دبلی کیوں ہو ہم لوگوں میں مرد دوسری بی بی نہیں کر سکتے اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تولا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہوا رہے گا۔ پھر بھی مرد اور عورت کا تعلق اس قسم کا ہے کہ بیاہ ہو جانے سے عورت مرد کے بس میں آجاتی ہے یہی سمجھ کر میں نے اپنا بیاہ نہیں کیا اور کرنے کا ارادہ بھی نہیں۔ میں تمھاری حالت پر افسوس کرتی ہوں اور اس سے زیادہ افسوس اس مجبوری کا ہے کہ مدد کرنے کی جگہ نہیں لیکن اگر کبھی میرا کام آپڑے تو ضرور مجھ کو یاد کرنا۔ غیرت بیگم نے اگرچہ دیہات میں پرورش پائی تھی پر وہ اتنی بھی بے تمیز نہ تھی کہ چنبیلی کے آنے کا اس کی محبت کا مروت کا ہمدردی کا شکریہ ادا نہ کرتی مگر سوکن کے جھگڑے میں اس کو کسی چیز کی سدھ نہ تھی چنبیلی اس سے بات کر رہی تھی اور یہ اس فکر میں تھی کہ کب چپ کرے اور میں سوکن کا حال پوچھوں۔ غرض غیرت بیگم نے چھوٹتے ہی پوچھا کہو کیا دیکھا۔ چنبیلی بولی حکیم کو دھوکا ہوا اس نے پہچانا نہیں کہ یہ عورت چار مہینے ہوئے دو جی سے بیٹھی ہے میں نے تمھارے میاں کو جتا تو دیا ہے اب بھی اگر کچھ بوجھ کر علاج ہو گا تو بچے کو تو میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ ادھر تو ہوئے جلاب اور ادھر بخار کی وجہ سے ملیں اور پر تلے ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں بچے کو سردی نے پکڑ لیا مگر احتیاط کی جائے تو میرے نزدیک بچے والی کو ابھی تک کچھ بڑی جوکھوں نہیں ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ آدمی فربہ شود از راہ گوش۔ ہر یالی نے جو سنا تو اس کے دل کو اس قدر تقویت پہنچی کہ کیسی دوا اور کس کا علاج گھڑیوں اس کا مزاج خود بخود بحال ہوتا چلا یہاں تک کہ یا تو آپ سے کروٹ نہیں بدل سکتی تھی یا ایک ہی ہفتے میں چلنے پھرنے لگی۔ یہ تو اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی جگہ اب غیرت بیگم پڑی۔ غیرت بیگم کا سارا غرور سارا گھمنڈ سارا ناز بے جا اولاد کے برتے پر تھا اب جو اس نے دیکھا کہ سوکن نے اس میں بھی آ لڑایا تو حقیقت میں اس کی کمر ٹوٹ گئی اور سمجھی کہ بس اب ہر یالی کے مقابلے میں نہیں پہنچتی اس کو اس بات کی بڑی تسلی

بھی کہ ہر پالی لاکھ میاں کی پیاری کیوں نہ ہو مگر آخر ہی تو ہے اولاد نہ کوئی نام کا لینے والا اللہ پانی کا دینے والا کھائے جتنا اُس
کی تقدیر میں ہے اور پہن لے جس قدر اُس کے نصیب کا ہے پھر میں ہوں تو میں اور نہیں تو اللہ رکھے اور پروان چڑھائے میری اولاد
اس خیال سے کبھی اُس نے سوکن کو سوکن مانا ہی نہیں اب الحمدللہ اس کو سوکن کی حقیقت کھلی اور آدھی اور ساری کا سوچ
پیدا ہوا - چنبیلی ایسا کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے آئی تھی اُس کے گئے پیچھے سے جو غیرت بیگم گھٹنوں میں سر
دے کر بیٹھی تو دوپہر ڈھلتے ڈھل گئی مگر اللہ کی بندی نے گردن اونچی نہ کی - دو تین بار کھانے کی اطلاع ہوئی مگر اس نے یہی
کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں - اس کے گھر میں ایک بہت پرانی نوکر تھی خاتون وہ گھر کی داروغہ تو نہ تھی مگر کبر سنی اور
قدیم الخدمتی اور ہوشیاری اور سلیقے کی وجہ سے گھر کے نوکروں میں سب سر برآوردہ تھی - غیرت بیگم کو اُس سے مانوس ہونے
کا ایک سبب خاص یہ بھی تھا کہ جس طرح مبتلا نے غیرت بیگم پر سوکن کی اسی طرح خاتون پر بھی اُس کے میاں نے سوکن کی
تھی غیرت بیگم کا تو ایسی باتوں میں بہت جی لگتا تھا خاتون گھڑیوں اپنی سوکن کی باتیں کرتی اور غیرت بیگم کرید کرید کر پوچھتی اور
ایک ایک بات کو بار بار کہلواتی - پس خاتون نوکر کی نوکر تھی قصہ خواں کی قصہ خواں اور بیوی کی ہم درد - جب خاتون نے
دیکھا کہ جس گھڑی سے چنبیلی آئی بیوی کچھ ایسی سوچ میں گئی ہیں کہ پان تک نہیں کھایا کھانے کا وقت بھی ٹل گیا تو اُس نے
قریب جا کر پوچھا کہ بیوی آج جو تم اس قدر اُداس بیٹھی ہو اس کا سبب کیا ہے - غیرت بیگم - تم نے نہیں سنا کہ بے غیرت کے یہاں
بال بچہ ہونے والا ہے ابھی اُس نے کیا اُٹھا رکھا ہے بال بچہ ہوئے پیچھے تو مجھ کو اس گھر میں کھڑا پانی بھی نہیں پینے دے گی
خاتون - ہاں بچہ ہونے والا ہوتا تو حکیم کیا ایسے اندھے ہیں جلابوں پر جلاب کیوں دیتے - غیرت بیگم - حکیموں کو دھوکا ہوا
اُنھوں نے جانا ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں دی جا رہی ہیں پیٹ میں بادی بھر گئی ہے اب چنبیلی نے دیکھا تو بتایا - کیوں خاتون
بوا میں تو سنتی تھی کنجنیوں کے اولاد نہیں ہوتی کیا میری ہی تقدیر ایسے پتھر پڑے تھے کہ مجھ پر کنجنی بھی آئی تو آتے ہی دوجی ہو
اور ماں بن جائے - خاتون - نہیں بیوی کون کہتا ہے کہ کنجنیوں کے اولاد نہیں ہوتی - ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی کیا تم بھول
گئیں میری سوکن کون تھی اصل نسل کی کنجنی جب میرا میاں اُس کو لایا تو خدا جانے نامرادیں مردوں کی آنکھوں میں کیا پٹی ڈال
دیتی ہیں وہ جانتا تھا کہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی ہے پیچھے معلوم ہوا کہ چار بچوں کی ماں تو وہ اُس وقت تھی اور ہمارے یہاں تو
کوئی پانچ برس وہ جی میری اتنی روک ٹوک پر سات یا آٹھ دفعہ اُس نے تیاری کی مگر واہ ری چھنیا دائی ہو تو ایسی ہو
کبھی چوتھا نہ گننے دیا - غیرت بیگم - وہ چھنیا اب ہے - خاتون - مدتیں ہوئیں مر کھپ گئی ستر بہتر برس کی تو وہ میری سوکن کے
وقت میں تھی - غیرت بیگم - پھر خاتون کوئی ویسی تدبیر یہاں نہیں کرتیں - خاتون - بیوی تمہارے یہاں تو دوسرے طور کی ہے
ہم تو غریب آدمی اب بھی ہیں اور تب بھی تھے میاں سات روپے مہینے پر ایک عطار کی دوکان پر بیٹھتا تھا ساتھ تھا اُس
بیچارے کا گویا آدھی تھا وہ بھی طرح دار یہ نامراد اس کے سر ہو گئی میں بارہ آنے مہینے کرایہ پر دینا بیگ خاں کے کٹرے میں
ایک بیٹھی تھی ذرا سا مکان میرے اکیلے دم کا اس میں مشکل سے گذر ہوتا تھا سوکن صاحب جو آئیں بس میری گود میں
بیٹھیں - برس دو برس تک اس طرح کا ظلم کہ گالی دے بیٹھنا اُس کے آگے ایک بات اور بات بات میں مکا اور لات اگر وہ
کبھی مجھ کو اور سوکن کو آپس میں لڑتے دیکھ پائے تو دونوں کے ڈنڈے لگائے سو بیوی اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے

نوجوں نہیں کی اور ظاہر میں سوکن سے ایسی گھلی ملی رہی جیسے سگی بہن پر دل سے تو وہ میری جان کی دشمن تھی اور میں اس کی
ایک جگہ کے رہنے سہنے اور ظاہر کے میل ملاپ سے ایک یہ فائدہ تو تھا کہ میں جو چاہتی تھی سو کر گزرتی تھی اور اُس کو یا مرو دے کو شبہہ
نہیں ہونے پاتا تھا - تمہارے یہاں بیوی اوّل دن سے کُھلّم کُھلّا بگاڑ پڑے ہوئے ہیں ایسی جگہ کوئی تدبیر چلنی ذرا مشکل ہو
نہیں تو کیا بڑی بات تھی چھنیا نہیں چھنیا کی بہنیں اور بہتیری اور دائی کا بھی اس میں کیا کام ایک سے ایک دوا مجھ کو ایسی معلوم
ہیں کہ چٹکی بجاتے میں کھڑا چھٹکا نہ کھائے - غیرت بیگم - ارے ہے اچھی میری خاتون ایسی کوئی دوا ہو تو ضرور مجھ کو بتاؤ - خاتون - دوائیں
تو بہت پرکھ رکھے ہیں پینے کے کچھ لیپ ہیں لگانے کے آج کو وہ یہاں بنتی چھنتی ہوتی تو کچھ بھی مشکل نہ تھا دوا تو بتاتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے یہاں کوئی کرے تو کیا کرے - غیرت بیگم - پھر تم ہی کچھ تدبیر نکالو گی تو نکلے گی ورنہ میں تو اپنی جان پر کھیلے
بیٹھی ہوں اور یہی بات اس وقت میں سوچ بھی رہی تھی خدا مجھ کو تو اس دن کے واسطے نہ رکھے ہائے کن آنکھوں سے دیکھوں
گی کہ اس کے بچے کھیلتے پھریں اور کن کانوں سے سنوں گی کہ وہ امّاں پکار رہی جائے تم سے کچھ ہو سکتا ہو تو کرو نہیں تو تم
اکیلی کیا دنیا دیکھ لے گی کہ جلا ہوا دل بہت برا ہوتا ہے اور کسی پر زور نہیں چلتا اپنی جان تو اپنے بس کی ہے جان جائے گی بلا سے
غیرت میرا نام ہے نام کے پیچھے جان دوں تو سہی - خاتون - بیوی خدا کے واسطے تم ایسی ایسی باتیں میرے سامنے تو کرو مت
سن سن کر میرے تو ہوش اُڑے جاتے ہیں جان سی چیز کہاں پایئے تم اپنے ننھے ننھے بچوں کا مونہ کرو - خدا تمہاری سلامتی
میں ان کو پروان چڑھائے الٰہی تم کو ان کی بہاریں دیکھنی نصیب - اور قربان کی وہ نامراد سوکن خدا چاہے گا تو وہی نہ رہے گی
ہراساں ہو تمہاری بلا اور غم کرے تمہاری پاپوش جب خدا نہ کرے تمہاری ہی جان پر آبنے گی تو ہم پندرہ ہیں بندے جو
تمہاری جوتیوں سے لگے ہیں کیا مونہ دیکھنے کے واسطے ہیں پہلے ہم سب تم پر سے تصدق ہو لیں گے تب جو بات سو بات
پر بیوی جو بات تم چاہتی ہو جان جوکھوں کا کام ہے پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو لے تو اس کا بیڑا اٹھائے پھر اس کو
چاہیئے آدمی دل کا پکا پیٹ کا گہرا جگر دے کا پورا کہ خدانخواستہ گل کھلاں کو کچھ ایسی ویسی ہو تو اپنے اوپر جھیل لے جائے اور
مالک کو بال بال بچائے سو تمہارے گھر میں تو میں اس ڈھب کا کسی کو نہیں پاتی چھوکریاں ہیں چھچھوری کہ آدھی بات سُن
پائیں تو ایک کی چار چار دل سے بنائیں اور سارے محلے میں دھوم مچائیں رہ گئیں مامائیں نوکریں تو ہر کسی سے کہتی پھرتی
پھرتی ہیں اور مجھ اکیلی سے سارا سر انجام ہو نہیں سکتا ایک میرا بھانجا ہے جو میرے میاں کی جگہ عطار کی دکان پر نوکر ہے اگر وہ کچھ
جائے تو بس سارے کام آسان ہیں دیکھو میں اُس سے ذکر کروں گی پر بیوی تم اپنی جگہ بھی سمجھ لو میری تو اگر جان بھی تمہارے
کام آجائے تو دریغ نہیں میں نے تمہارا نمک کھایا ہے اور میں اب دنیا میں جی کر بھی کیا کروں گی بہتیرا جی چکی پر میرا بھانجا
بال بچہ دار آدمی ہے عمر بھی کچھ اس کی ایسی بہت نہیں اُس کو تو کچھ ایسا ہی بھاری لالچ دیا جائے گا تو شاید وہ اس کام میں
ہاتھ ڈالے تو ڈالے - غیرت بیگم - مجھ کو تو اگر کوئی کھڑا کر کے بیچ لے تو بھی عذر نہیں پر کسی طرح اس عذاب سے چھٹکارا
ہو - خاتون - بیوی دیکھو خبردار میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کسی کو کانوں کان خبر ہو نہیں تو سارے گھر پر
آفت آجائے گی - غیرت بیگم - خیر خیر مناؤ تم نے کیا مجھ کو ایسا نادان سمجھ لیا ہے میں خوب سمجھتی ہوں کہ بڑے اندیشے کی
بات ہے مجھ کو اپنے دونوں بچوں کی جان کی قسم کیا مجال کہ مونہ تک بات آجائے - خاتون - بس تو بات کو اپنے ہی تک رہنے دو جب

ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو آپ خبر کردوں گی اور میں تم کو یہی صلاح دیتی ہوں کہ مل جاؤ کیوں کہ ملاپ میں خوب کام نکلتا ہے
مگر ملو نہیں تو یہ ہر وقت کا جھگڑا بکھیڑا تو موقوف کردو ورنہ کرے گا کالا چور اور پکڑے جائیں گے تمہارے دشمن بُرا چاہنے والے
خاتون کے سمجھانے بجھانے سے غیرت بیگم نے باوجودے کہ ناوقت ہو گیا تھا منگوا کر کھانا کھایا اور وہ جو سارے سارے
دن ہر یالی کا جھگڑا لگا رہتا تھا وہ بھی بند ہوا۔ آدمی لاکھ چھپائے پر دل کی کپٹ بے ظاہر ہوئے نہیں رہتی لوگ جو چوری
دو سرے جرموں کے مرتکب ہوتے ہیں اپنے پندار میں بڑی بڑی پیش بندیاں کرتے ہیں اور آخر کو وہی پیش بندیاں اُن کو
رسوا اور فضیحت کراتی ہیں۔ یا تو تمام تمام دن دونوں سوکنوں کی لڑائی کا ایک غل پڑا رہتا تھا یا ایک دم سے ہوا سناٹا
تو غیرت بیگم اور خاتون کے سوائے سبھی کو حیرت تھی کہ دلوں میں ایسی کیا نیکی خدا نے ڈالی کہ آپ سے آپ لڑتے لڑتے رُک گئیں۔
باوجودے کہ خاتون نے سمجھا دیا تھا کہ جب سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو خبر کردوں گی مگر غیرت بیگم کو اتنا صبر کہاں
تھا اُس نے تو اگلے ہی دن سے خاتون کی جان کھانی شروع کردی۔ کیوں بی اب کب ہوگا کیا دیر ہے۔ کاہے کا انتظار ہے۔ آگے
پیچھے کبھی ہو بھی چکے گا یا نہیں۔ بس اب خاک ہوگا۔ تم کو نہیں کرنا منظور تھا تو مجھ کو آس کیوں دی تھی۔ سنجی سے سوم بھلا جو
ترنتا[1] دے جواب۔ آخر جب تقاضا حد سے گزر گیا تو ایک دن خاتون نے کہا لو بیوی خدا نے مجھ کو تم سے سُرخ رُو کیا اب کہیں
اتنے دنوں میں جا کر بڑی مشکل سے معاملہ طے ہوا میں تو سمجھتی تھی خدا جانے سرے سے ہامی بھی بھرے یا نہ بھرے اور بھرے
تو دس ہزار مانگے یا پندرہ ہزار مانگے پر ماشاء اللہ قسمت تمہاری بڑی زبردست ہے سستا چک گیا ایک ہزار روپیہ پہلے
اور پھر چُپ چُپاتے خاطر خواہ کام ہوئے پیچھے ایک ہزار اور اور جو خدا نہ کرے کہیں کُھل کھلا پڑے تو دو ہزار۔ غیرت بیگم تو کہہ
ہی چکی تھی اگر مجھ کو کوئی کُھڑا کر کے بیچ ڈالے تو بھی عذر نہیں سنتے کے ساتھ لگی ہاتھوں سے سونے کے ٹھوس کڑوں کی جوڑی
اُتارنے کہ اتنے میں خاتون بولی بیوی کڑے مت دو میرا جی کُڑھتا ہے ننگے ہاتھ بُرے لگیں گے اور لوگوں میں بھی پرچول
پڑے گی بلکہ جتنا گہنا تم پہنے رہتی ہو اس میں سے کچھ بھی مت دو غرض جس جس طرح خاتون کہتی گئی کچھ نقد و جنس ملا کر
ہزار پورے کر اس کے پلّے باندھے۔ ہزار معجّل[2] اور ہزار سوجّل کے بدلے خاتون نے یہ کار نمایاں کیا کہ چوہوں کے بہانے سے
تھوڑی سنکھیا بھانجے سے منگا لائی دونوں گھروں میں دودھ کا راتب بندھا ہوا تھا گھوسن بڑے سویرے آتی اور
سب سے پہلے یہیں کا راتب لاتی۔ خاتون اندھیرے منہ اُٹھ مردانے میں جا بیٹھی جوں گھوسن نے پاؤں اندر رکھا کہ خاتون نے
اُس سے لڑنا شروع کیا کہ ساری دنیا میں حلوائی ہوئے گھوسی ہوئے دودھ میں پانی ملاتے ہیں پر کہیں سے بے چاری انوکھی
گھوسن نکلی کہ پانی میں دودھ ملا کر لاتی ہے برسوں کھیر پکی کسی نے منہ پر نہیں رکھی کل جوں چاہا کہ سویّوں میں ڈالیں نیلا نیلا نسو
پانی۔ بہر روز بیوی کو ہم لوگوں پر خفا کرواتی ہے لا تیری ہنڈیا بیوی کو لے جا کر دکھاؤں تب تو انہیں یقین آئے گا غرض زبردستی
گھوسن کے ہاتھ سے ہنڈیا چھین ڈیوڑھی میں لے گھسی اور سنکھیا کی پڑیا دودھ میں گھول ہنڈیا گھوسن کو پھیر دی کہ بیوی
کہتی ہیں میرے پاس حرام کا پیسا نہیں ہے جا دور ہو اب میرے گھر دودھ نہ لانا۔ برسوں کی لگی ہوئی گھوسن اور روز کا
راتب اِس طرح ملوانی کرتی تو اتنی مدت کیوں کر نبھتی بے چاری رو تھکی اور کھسیانی ہو کر خاتون کا منہ دیکھنے لگی اور جھوٹے

[1] فوراً ۱۲ [2] نقد ۱۲ [3] اُدھار ۱۲

گھر کی ماما کو آواز دے بھری ہنڈیا اُس کے حوالے کی کہ بڑی بی بی نے تو آج کئی برس کے بعد جواب دیا چھوٹی بی بی بھی اگر دو سیری
گھوسن لگا لیں تو میری ہر روز صبح سویرے کی اتنی دور کی رٹر بچے۔ ہریالی نے دیکھا تو دودھ ہر روز جیسا گاڑھا اور چکنا اُس کے
جی میں آگیا کہ میاں کئی بار فیرینی کی فرمائش بھی کر چکے ہیں لاؤ آج قفلیاں جمادیں ساتے کا سارا دودھ لے لیا جب دودھ چڑھ
چکی تب اِس کو خیال آیا کہ آج[1] تو بڑے گھر کی باری ہے ماما سے کہا دیکھو تو کیا مجھ سے بھول ہوئی بڑے گھر کی باری کا خیال نہ رہا
اور فیرینی کے لیے اتنا سارا دودھ لے بیٹھی اب کیا کروں ماما نے کہا مضایقہ کیا ہے جاڑے کے دن ہیں اِس وقت کی جمی ہوئی یہی
قفلیاں تو کل تک ٹھنڈی ٹھنڈی اور بھی مزے کی ہوں گی۔ غرض فیرینی پکا۔ قفلیاں بھر الماری میں رکھ اوپر سے قفل لگا دیا
جن لوگوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے جی بہلانے کو اکثر جانور پال لیا کرتے ہیں۔ ہریالی نے بھی طوطا اور مینا اور بلی اور کبوتر اور
مرغیاں بہت سے جانور پال رکھے تھے اچھا ایک پیالہ بھر کر فیرینی اِن جانوروں کے لیے الگ نکال کر تھوڑی ماما کے لیے
دیگچی میں لگی چھوڑ دی تھی۔ دو سیر دودھ مٹا کر پاؤ بھر چاول برابر کی کھانڈ فیرینی کا ہے کو تھی اچھا خاصہ کھویا کھانا چاہیے
جس نے پائی خوب مزے سے کھائی دو گھنٹے نہیں گزرنے پائے تھے کہ سب سے پہلے میاں مٹھو بیں ہوئے پھر تو باری باری
سے اوپر سوپر کوئی جلدی کوئی دیر مینا سکڑی بلی بولائی کبوتر چکرائے مرغیاں اونگھنے لگیں ماما مارے قے اور دستوں
کے بدحواس ہوگئی ڈولی میں لاد اُس کے گھر پہنچوا دیا۔ اُس کا بیٹا تھانے میں نوکر تھا سنتے کے ساتھ بھاگا ہوا آیا ماں کو
دیکھا تو آدمی کو نہیں پہچانتی تھی نیم جاں کو اُٹھا کر ہسپتال لے گیا ڈاکٹر نے پچکاری سے پیٹ صاف کیا پانی جو پیٹ میں
نکلا تھوڑے سے میں کوئی دوا ڈال کر دیکھا تو سنکھیا تھی آخر ڈاکٹر نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ اِس نے
کتنی سنکھیا کھائی اور ٹھیک کس وقت کھائی لیکن جس قدر اِس کے پیٹ میں سے نکلی ہے اگر اتنی بھی ہضم ہو کر خون میں
مل گئی ہوگی تو قاعدے کی رو سے اِس کو مرنا نہیں چاہیے۔ غرض سنکھیا کے توڑ کا جو تریاق انگریزوں کے یہاں ہوتا ہوگا
اوپر تلے دینا شروع کیا۔ اگلے دن صبح ہوتے ہوتے بیمار کی طبیعت کچھ سنبھلی آخر لوٹ پیٹ کر اچھی تو ہوئی مگر کچھ ایسا روگ
لگ گیا کہ جب تک زندہ رہی مارے دھڑکن کے بے چاری کو ساری ساری رات بیٹھے گزر جاتی تھی۔ اُدھر ہریالی کے یہاں
جس جس جانور نے ذرا سی فیرینی کھائی سبھی کی تو موت آئی ہریالی اپنے اِس کنبے کے سوگ میں تھی کہ کوئی چار گھڑی دن رہتے
رہتے تو کوتوالی کے لوگ مردانے میں آ ابھرے پکڑ دھکڑ ہونے لگی فیرینی کی قفلیاں اور مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں
کوتوالی والوں نے فوراً ہسپتال کو ڈاکٹر کے پاس چلتی کیں اور لگے اپنے دستور کے مطابق ایک ایک کو الگ لے جا کر
پوچھ گچھ کرنے غرض چھ گھڑی رات کی چپ نہیں چلی تھی کہ کوتوالی والوں نے سارا مقدمہ مرتب کر لیا محلے والوں نے اظہار دیے کہ
دونوں گھروں میں ہر وقت کوسم[2] کاٹا رہا کرتی تھی اب ہفتے عشرے سے امن ہے۔ گھوسن نے بیان کیا کہ میں مدت سے دونوں
گھروں میں دودھ کا راتب لاتی ہوں کبھی کسی نے دودھ کو برا نہیں بتایا کل خاتون نے پہلے پہل مجھ سے کہا کہ تیرے دودھ
میں ملونی ہوتی ہے اور ہنڈیا میرے ہاتھ سے لے ڈیوڑھی میں گھس گئی اور پھر اُلٹے پاؤں ہنڈیا لے کر باہر آئی کہ بیوی نہیں
لیتیں میں نے وہی ہنڈیا جوں کی توں چھوٹے گھر میں بھیج دی دونوں گھروں کی ماماؤں نے ایک زبان گواہی دی کہ گھوسن

۱؎ یعنی میاں بڑے گھر میں رہیں گے ۱۲ ۲؎ یعنی مشکل سے ۱۲

نے دودھ کبھی چرا نہیں دیا۔ حکیم[51] عطار نے تصدیق کی کہ میری دکان پر خاتون کا بھانجا بیٹھتا ہے اور جس وقت میں دکان پر
نہیں ہوتا وہی بیچتا کھوچتا ہے اور میری دکان میں سنکھیا بھی رہتی ہے مگر میری سخت تاکید ہے کہ دیکھو سنکھیا۔ کچلا۔ جمال گوٹا۔
شنجرف۔ ہڑتال۔ بچھناگ۔ دھتورا۔ اس قسم کی چیزیں آن جان آدمی کے ہاتھ مت بیچنا ان چیزوں کی فروخت کا
حساب کتاب ہمیں کیا شہر میں کوئی عطار بھی نہیں رکھتا۔ خاتون کے بھانجے کو بلوایا بہتیرا ڈھونڈا اتفاق سے اس وقت نہیں ملا
بلکہ کوتوالی والوں کو شبہہ ہوا کہ کہیں خبر پاکر روپوش تو نہیں ہوگیا۔ بس اسی کے آنے کی کسر رہ گئی ورنہ مقدمہ اسی وقت لکھا پڑھی
ہوکر چالان ہوجاتا۔ گھر کے نوکروں میں خاتون ذرا سب سے زیادہ معزز تھی اور ڈیوڑھی تک بھی بہت ہی کم آتی جاتی تھی کوتوالی
والوں کو ہوا تامل کہ اس کو دوسرے نوکروں کی طرح باہر بلوائیں یا آپ ڈیوڑھی کے پاس جاکر اس سے پوچھ پاچھ کرلیں اتنے
میں تو سید ناظر خبر پاکر آموجود ہوئے اگر ناظر ذری دیر اور نہ آتے تو خاتون کی کیا اصل تھی کوتوالی والے تو اس کے اچھے سے
قبول کروا لیتے بلکہ وہ تو اس فکر میں تھے کہ اپنی طرف سے کسی عورت کو اندر بھیج کر خود بیگم صاحب کی مزاج پرسی کریں۔ ناظر
کا آنا تھا کہ مقدمے کا رنگ بدل گیا کوتوال نے مناسب سمجھا کہ رات گئی ہے زیادہ اس وقت تحقیقات کو ملتوی کیا جائے
فیرینی کی تغاریاں اور مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں یہی دو بڑے ثبوت تھے سو دونوں ہمارے ہاتھ میں ہیں اب
ناظر نہیں ناظر کے باپ بھی قبر سے اٹھ کر آئیں تو کیا کرلیں گے مالک کے پیٹ میں سے سنکھیا نکل چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ
یہ اتنے سارے جانور سب سنکھیا سے مرے اور فیرینی میں سنکھیا موجود اب رہ گئی یہ بات کہ سنکھیا دی تو کس نے وہی سوت
دونوں سوکنوں سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کی عداوت سے۔ زہر خورانی کا مقدمہ اس سے زیادہ اور کیا صاف
ہوگا۔ صاحب مجسٹریٹ کوتوالی کے چالان کیے ہوئے مجرم اکثر چھوڑ دیا کرتے ہیں اور ان کو کوتوالی کے ساتھ خدا واسطے
ایک ضد سی آپڑی ہے لیکن اگر اس مقدمے کو بگاڑا تو علم کی قسم صاحب سپرنٹنڈنٹ کو سمجھا کر صدر کو ایسی رپورٹ کراؤں کہ
جواب دیتے نہ بن پڑے اور میاں ناظر کو بھی وکالت کا بڑا گھمنڈ ہے بڑی مدت میں اونٹ پہاڑ کے تلے آیا ہے۔ دیکھیں تو
اب ہائی کورٹ کی کونسی نظیر پیش کرکے بہن کو بچاتے ہیں۔ غرض کوتوال خاتون کو ناظر کے سپرد کر حوالہ نامہ لکھوا گھوسن
کو ساتھ لے چلتا ہوا اور سیدھا پہنچا صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس اور ان کو مقدمے کی روداد سمجھا کر کہا کہ مقدمہ
ہے سنگین اور مجرم عورتیں پردہ نشین۔ سید ناظر وکیل کا نام حضور نے سنا ہوگا اصل میں ان کی بہن نے سوکن کو زہر
دلوایا مگر وہ اتفاق سے بچ گئی کل حضور بھی موقع واردات تک چلیں ورنہ وکیل صاحب بڑے شورہ پشت اور ثقہ
بدمعاش ہیں ہم لوگوں کے قابو میں آنے والی اسامی نہیں۔ ادھر ناظر بہن پاس گیا تو دیکھا کہ مارے ہول کے دست پر دست
چلے آرہے ہیں دیکھتے کے ساتھ ہوش ہی خطا ہوگئے اور سمجھا سب سے بڑا ثبوت تو خود ان کی حالت ہے آخر بہن سے اتنا کہا کہ
بڑے بھائی نے تم کو اس قدر ڈرا دھمکا دیا تھا مگر تم نے نہ مانا اور دل کی بودی طبیعت کی کچی ہمت کی ہیٹی تھیں تو ایسے
کام پر تم کو جرأت کیونکر ہوئی بس اب تین پہر رات اور ہے صبح ہوئی اور تمہاری ڈولی کوتوالی چلی۔ بھائی کے منہ سے
اتنی بات سن عیرت بیگم کو اور تو کچھ نہ سوجھا بہت دن ہوئے تولہ بھر افیون منگوا کر صندوقچے میں رکھ چھوڑی

[51] حکیم نام ہے ۱۲

تھی دوڑی دوڑی کوٹھری میں جا صندوقچہ کھول افیون کا گولا نکال اُوپر سے بھر کٹورا پانی پی لیا بتول کی انا کو چال معلوم تھا کہ انہوں نے صندوقچے میں
افیون رکھ چھوڑی ہے دالان کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بھائی بہن کی باتیں سُن رہی تھی بیوی کو جو اس طرح گھبرا کر اندھیری کوٹھری میں جاتے
دیکھا جلدی سے بتول کو چارپائی پر لٹا پیچھے ہولی بھاگی کہ ایسے ہی خدا نخواستہ اِس جھگڑے پر لو اب تو دشمنوں کو ٹھنڈک پڑی وہ بیوی نے افیون
کھا لی اتنے میں تو غیرت بیگم بھی کوٹھری سے بہتی ہوئی نکلی کہ بھائی تم کچھ تردد مت کرو میں بُری تھی بُری سے خدا نے
تم سب کا پیچھا چھڑا دیا۔ صبح تک میں ہی نہیں رہوں گی کوتوال کو اختیار ہے میرا مردہ لے جا کر کوتوالی میں دفن کرے
زہر خورانی کا ایک مقدمہ تو قائم تھا ہی اقدام خودکشی کا دوسرا اَور ہوا۔ معصوم اور بتول دونوں بے خبر پڑے
سوتے تھے غیرت بیگم نے سوتوں کو گود میں لے کر پیار کیا اور دونوں کو گلے لگا کر ایسی بلک بلک کر روئی کہ گھر
میں قیامت برپا ہو گئی۔ ناظر نے جو بہن کا پلپلانا دیکھا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ بس یہ بھی دنیا میں تھوڑی دیر کی
مہمان اَور ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں بہن اُس کے سر پر ایسا جنون سوار ہوا کہ نہ پکارا نہ کُنڈی کھڑکھڑائی نہ دستک
دی نہ اجازت لی ہونٹ اٹھا سیدھا چھوٹے گھر میں جا گھسا۔ دونوں میاں بیوی سر جوڑے بیٹھے ہوئے خدا جانے
کیا صلاحیں کر رہے تھے مبتلا نے آہٹ پا کر دور سے ڈانٹا ایں ایں کیا بدتمیزی ہے اندھے ہو تم کو معلوم نہیں
کہ پردہ ہے اُس مرتبہ بہن کو مداخلت بیجا پر آمادہ کرتے تھے اب یہ مداخلت بیجا نہیں ہے۔ ناظر۔ اللہ رے
تیرا پردہ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی یہی نالائق پردے والی ہے تو پردے والی نے افیون کھائی اور دنیا
جہان سے روپوش ہونے کی تیاری کی۔ مبتلا۔ الحمد للہ خس کم جہان پاک مگر ذرا تم چلتے پھرتے تو نظر آؤ سامنے
سے پرے ہٹتے ہو یا میں اٹھ کر تم کو رستہ دکھاؤں۔ مبتلا کا اتنا کہنا تھا کہ ناظر یا تو صحن میں تھا یا مبتلا کی چھاتی
پر۔ پھر تو دونوں میں خوب کشتی ہوئی۔ ناظر دیہات میں پیدا ہوا دیہات میں پلا ہاتھ پاؤں کا ٹھلا۔ گٹھیلا۔ برسوں
اکھاڑے میں لڑا بیسیوں داؤ یاد۔ پچاسوں گھاتیں معلوم۔ سیکڑوں پیچ رواں اور اب تک بھی دو وقتہ ڈنڑ مگدر
کبھی اُس نے ناغہ نہیں ہونے دیئے۔ مبتلا بیچارے نازنیں۔ میر پھوپا مرزا جہین۔ ناظر نے وہ وہ پٹخنیاں
دیں اور ایسا ایسا رگیدا کہ آنکھیں نکل پڑیں اور سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے۔ مبتلا کے پاس پھلکنی پچنی
کل جمع میں تین جیب چٹکیاں لینا نوچنا کاٹنا سو ناظر کی پھرتی کے مقابلے میں ایک بھی کارگر نہ ہوا۔ مبتلا کو اگر
معلوم ہو کہ یہ کم بخت چھوٹا کھوٹا چھپا رستم ایسے غضب کا گُتھا ہوا ہے تو کبھی بھول کر بھی اُس سے دو بدو نہ ہو مگر
اس کی تقدیر میں دو بیبیاں کر کے ہر طرح کی مصیبت اٹھانی تھی چھوٹا سمجھ کر اُس کو ایک ڈانٹ بتائی بیٹھے بٹھائے
آ در اپنی شامت لوائی۔ ہریالی نے جب دیکھا کہ میاں کو ناظر گیند کی طرح اچھالے اچھالے پڑا پھرتا ہے یہاں سے
اُٹھایا وہاں دے مارا اِدھر سے اُچھالا اُدھر لا پٹکا۔ ایسی دہشت دل میں سمائی کہ اُس کا حمل جس کے سبب
اتنا سارا فساد ہوا ساقط ہو گیا۔ ناظر کیا مبتلا کو جیتا چھوڑتا وہ تو خدا کا کرنا عین وقت پہ سید حاضر آ پہنچے دیکھا
تو گھر میں مجموعہ تعزیرات ہند پھیلا پڑا ہے مگر کیا قائم مزاج آدمی تھا آتے کے ساتھ سب سے پہلے تو ناظر اور مبتلا کو چھڑایا پھر پٹکا ڈال پھر پھر لوٹے
گرم پانی غیرت بیگم کو پلانا شروع کیا غیرت بیگم اس طرح کی ضدی عورت تھی کہ گو ساری ہی دنیا ایک طرف ہوتی تو گرم پانی کا کٹورا منہ کو نہ لگا دیتی مگر کچھ تو بڑے بھائی کا لحاظ

اور ادھر چپکے سے کسی نے کان میں جھک کر کہہ دیا کہ مبارک ہو ہریالی کا حمل تو گر گیا۔ بے عذر خوب ڈکڈکا کر پانی پی لیا پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ استفراغ ہوا اور استفراغ کے ساتھ کھٹ سے افیون کا گولا سموچے کا سموچا نکل کر الگ جا پڑا۔ آدھر ہریالی کی خدمت کے لیے دو بہری دائیاں بلوائیں اور پھر مبتلا اور ناظر دونوں کو ساتھ لے جا کر بیٹھا کہ ہر چند تم دونوں کی طبیعتیں اس وقت حاضر نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مزاج میرا بھی ٹھکانے نہیں مگر میں دیکھتا ہوں تو آدھی رات ڈھل چکی ہے صرف سوا پہر کی مہلت ہے سامان تو بدقسمتی سے ایسا جمع ہوا ہے کہ اب آبرو بچتی ہوئی نظر نہیں آتی اور جب آبرو ہی نہیں تو سب سے پہلا شخص جو جان دینے میں دریغ نہ کرے میں ہوں۔ دیکھو تو کتنے آدمی ہم لوگوں کے ملاقاتی ہیں مگر ہمدردی اور مدد تو درکنار مرد عورت کوئی آکر بھی جھانکا۔ سچ کہا ہے گاڑھے پر انسانی کام کی نہیں اور رتی بھر ناطہ کام آتا ہے۔ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ جب ناطے سے کام لینے کا وقت آیا تو تم لوگ آپس ہی میں لڑنے لگے۔ جس طرح پر تم دونوں میں لڑائی شروع ہوئی میں سب سن چکا ہوں تم میں سے کسی کو مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں ایک کو ملزم ٹھیراؤں اور دوسرے کو بری جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اسی طرح لڑائی بھی ایک کے لڑنے سے نہیں لڑی جاتی میں تم دونوں کو برابر الزام دیتا ہوں لیکن رشتہ داروں میں اگر کسی بات پر تیغ بھی ہو جاتی ہے تاہم ان کے خون ملے ہوئے ہیں وہ ظاہر میں جدا ہیں اور باطن میں ایک۔ غیرت بیگم کا افیون کھا لینا سن کر مبتلا بھائی کو منہ سے الحمد للہ کہہ دینا بہت آسان تھا لیکن جب غیرت بیگم کی مدت حیات پوری ہو اور خدا کرے کہ مبتلا بھائی اس کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دیں تو دنیا میں سب سے بڑھ کر رنج کرنے والے بھی یہی ہوں گے گھر کس کا برباد ہو گا ان کا۔ اولاد کس کی بے ماں کے ماری ماری پھرے گی ان کی۔ کنبے والوں کا میل ملاپ کس سے چھوٹ جائے گا ان سے۔ بھلے مانسوں میں جو خانہ داری کی ساکھ ہوتی ہے یعنی تمدنی عزت وہ کس کی جاتی رہے گی ان کی۔ اس میں شک نہیں چھوٹی بھاوج کی وجہ سے دلوں میں بڑے فرق پڑ گئے ہیں اور پڑنے ضرور تھے مگر پھر بھی غیرت بیگم کی ناموس کا پاس ہم کو چھٹانک بھر ہو گا تو مبتلا بھائی کو سیر بھر۔ میں جانتا ہوں کہ مبتلا بھائی بڑے ضبط کے آدمی ہیں منہ سے نہیں کہتے مگر ان کے تلووں سے لگی ہے۔ ناظر کیا کوئی تم سے خیر کی توقع کرے گا جب تم ایسی مصیبت میں مبتلا بھائی کی مدد نہ کرو ہزاروں مقدموں میں تم بے طمع صلہ پیروی کیے ہوا ایک مقدمے میں صلۂ رحم کو صلہ سمجھو اور میری خاطر سے اپنی بہن کی خاطر سے بھانجا بھانجی کی خاطر سے غصے کو تھوک کر بچاؤ کی کوئی صورت نکالو اور تم مبتلا بھائی از برائے خدا رحم کرو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں پر بزرگوں کے نام پر خاندان کی عزت پر۔ تم کو معاملات مقدمات کا کبھی اتفاق نہیں پڑا کوتوالی والے مدت سے تم پر دانت لگائے بیٹھے ہیں خدا جانے کس بلا میں تم کو پھنسا دیں گے ناظر تمھارا خرد ہے اگر اس نے بے تمیزی کی تو بہت برا کیا جھک مارا میں اس کی طرف سے معذرت کرتا اور تمھاری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالتا ہوں جانے دو معاف کرو۔ اس کے بعد ناظر کو پکڑ کر مبتلا کے پیروں پر گرایا اور ناظر اور مبتلا دونوں کو گلے لگوایا وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے مل کر رو دئے حاضر بہن کی تباہی کا تصور کر کے مغموم تو پہلے سے تھا اب ان کو روتا ہوا دیکھ کر آپ بھی رونے لگا۔ جب سب کے دلوں کی بھڑاس نکل چکی تو حاضر نے ناظر سے پوچھا کیوں بھائی اب کرنا کیا چاہیے۔ ناظر۔ جناب! آپ فرماتے ہیں اور آپ کا قدم درمیان میں ہے تو میں اس مقدمے میں ہاتھ ڈالتا ہوں مگر

مبتلا بھائی نے آج اس رنڈی کے سامنے (آپ بُرا مانیں یا بھلا مانیں میں تو اس کو ساری عمر بھاوج کہنے والا نہیں) ایسا ذلیل کیا ہے کہ میں اس رنج کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ جب آپا نے میرے بیٹھے پر افیون کھائی تو میں گھبرا کر اس غرض سے اِن کے پاس دَوڑا ہوا گیا تھا کہ ہم دونوں ہم صلاح ہو کر تدبیر کریں۔ انھوں نے مجھ کو دروازے ہی سے دیکھ کر اس طرح دھتکارا کہ کوئی کتے کو بھی نہیں دھتکارتا مجھ کو رہ رہ کر غصہ آتا ہے کہ انھوں نے تو شرم و حیا سب کو بالائے طاق رکھ دیا اب آپ کے سامنے منہ کھلواتے ہیں کل کی بات ہے کہ یہی نالائق جو آج بڑا لمبا چوڑا پردہ لگا کر بیٹھی ہے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مارے جوتیوں کے بد ذات کے سر پر ایک بال باقی نہ رکھوں) ٹکے ٹکے پر ماری ماری پڑی پھرتی تھی اور کوئی اس پر تھوکتا بھی نہ تھا ان ہی سے پوچھیے کہ کَے بار میرے یہاں اس کا مجرا ہوا جب آتی تھی ڈیوڑھی میں سے فراشی سلام کیا اب اس کو یہ بھاگ لگے ہیں کہ ہمارے سامنے ہونے سے اس کی بے پردگی ہوتی ہے۔ عزت بنانے سے نہیں بنتی بلکہ خداداد چیز ہے آج تو یہ پردہ نشین بنی کل کو سیدانی بن کر چاہے گی کہ ہماری ماں بہنوں کے ساتھ بیوی کی صحنک کھائے پرسوں اس کے بال بچے ہوں گے اور کہے گی کہ سیدوں میں رشتہ ناطہ کرتی ہوں تو کوئی بھلا مانس اس کو جائز رکھے گا۔ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں سب ہماری آپا کا صبر پڑ رہا ہے اور ابھی کیا ہے یہ مظلمہ تو مبتلا بھائی کو ایسے ناچ نچائے گا کہ ہریالی کو ساری عمر ایسا ناچ ناچنے کا اتفاق نہ ہوا ہو گا۔ ناظر تو باتوں باتوں میں گرم ہوتا جاتا تھا اور مبتلا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کہ اگر اب کے پھر کہیں یہ جن لپٹ پڑا تو ہڈی پسلی ایک کر کے رکھدے گا۔ حاضر کے بیٹھنے کی اگر ڈھارس نہ ہو تو قریب تھا کہ مبتلا کی گھگھی بندھ جائے بارے حاضر نے کہا بھائی ناظر یہ تو تم پھر بگاڑ کی سی باتیں کرنے لگے یہ سچ ہے کہ مبتلا بھائی کی نادانی نے سارے گھر کو تہ و بالا کر دیا مگر یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ہم غیروں کی طرح دور کھڑے ہوئے تماشا دیکھیں۔ ناظر۔ یہ تو میں نے وہ حقیقت بیان کی جو میرے دل میں تھی رہ گیا مقدمہ اس سے آپ اطمینان رکھیے۔ مبتلا بھائی کو روپیہ تو بہت خرچ کرنا پڑیگا ایسا کوئی پانچ چھ ہزار مگر خدا نے چاہا تو اِن پر اور اِن کے طفیل میں ہریالی پر کوئی گزند نہیں آنے پائے گا۔ اِس وقت تک مبتلا کو مقدمے کی واقعی روداد اور کوتوالی کی تحقیقات سے اپنی اور ہریالی دونوں کی طرف سے پورا اطمینان تھا اور دونوں اپنی جگہ خوش تھے کہ چاہ کُن را چاہ در پیش سنکھیا دی اسی غرض سے کہ ہم دونوں کھائیں اور مر کر رہ جائیں خدا کی قدرت ہم دونوں کے منہ پر رکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی اور اوپر ہی اوپر ماما کے بیٹے نے جا سرکار میں خبر پہنچائی اب لینے کے دینے پڑے غیرت بیگم کو پھانسی ہو تو پھانسی ورنہ عمر قید میں تو شک ہی نہیں چلو سستے چھوٹے اور روز کا ٹنٹا مٹا۔ ناظر کے منہ سے یہ کلام سن کر کہ پانچ چھ ہزار روپیہ خرچ کرو تو تم پر گزند نہیں آنے پائے گا مبتلا تو حیران ہو کر اُس کا منہ دیکھنے لگا اور بے اختیار بول اُٹھا کیوں صاحب اُلٹا چور کوتوال کو ڈانڈے مجھی کو زہر دیا جائے اور میں ہی گزند سے بچنے کے لیے پانچ چھ ہزار روپیہ بھی خرچ کروں کیا انگریز کی عملداری میں یہی انصاف ہے۔ ناظر۔ ہوش کی بنواؤ تماش بینی اَور شے ہے اور مقدمے کی باریکی کو پہنچنا کچھ اَور چیز ہے تم کو اتنا تو معلوم ہی نہیں کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں اور مقدمہ کس جانور کا نام ہے۔ میں تو نہ ہاں رہ چکا ہوں اور بدعہدی کسی شریف آدمی کا کام نہیں اس لیے چند نکتے کی باتیں تم کو سمجھاتا ہوں۔ کوتوالی کی تحقیقات کو تو عدالت میں کوئی پوچھتا تک نہیں روداد وہی معتبر ہے جو عدالت کی مثل میں ہو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کوتوالی کے لوگ زبانی پوچھ

کچھ کے سوا کسی کا اظہار تک قلم بند کر نہیں سکتے اصل بات یہ ہے کہ پہلے کوتوالی اور فوجداری ایک تھی جب یہ
لوگ لگے اظہارِ کارگزاری کے لیے ہر واردات بے سراغ کے لیے مجرم بنانے اور اصل مجرموں سے سازش کر کے
بے گناہوں کو ناحق پھنسانے تو سرکار نے کوتوالی اور فوجداری کو الگ کر دیا۔ اب تو کوتوالی والوں کا اتنا ہی اختیار ہے کہ
جس کو اپنے نزدیک مجرم سمجھیں حاکم عدالت کے پاس چالان کر دیں۔ حاکم عدالت مدعی اور مدعا علیہ اور گواہوں کے اظہار
قلم بند کرتا ہے اور اپنے یہاں کی رُوداد پر سزا یا رہا کرتا ہے۔ کوتوالی والے اناپ شناپ جس کو پکڑ پاتے ہیں چالان
کر دیتے ہیں عدالت میں گئے اور رہا ہوئے اور ہمارے صاحب مجسٹریٹ کوتوالی سے اس قدر بدظن ہیں۔ کہ
مجسٹریٹی کا اجلاس کرتے ہوئے پورا برس نہیں ہوا اتنے ہی دنوں میں کوتوالی والوں سے جبلتا نہ بھر دیا غرض کوتوال
اور اُن کی تحقیقات کی تو کچھ بھی حقیقت نہیں اب رہ گئی مقدمے کی رُوداد سو اُس کا حال یہ ہے کہ سنکھیا تو حقیقت
میں پکڑی گئی ہریالی کے یہاں پس مدعا علیہ اول ہوئی ہریالی۔ اور پہلے اُسی پر اشتباہ کیا جائے گا کہ اُسی نے فیرینی
میں ڈالی یا ڈلوائی۔ مبتلا۔ بھلا وہ کم بخت بدنصیب کس کو سنکھیا دیتی اُٹھی تھی اپنے تئیں یا مجھ کو یا اپنی ماما کو جو
سالہا سال سے نوکر ہے اور کبھی اُس کو پھٹے منہ تک نہیں کہا یا اپنے پالے ہوئے جانوروں کو جنھیں وہ بچوں کی
طرح عزیز رکھتی ہے۔ ناظر۔ جانوروں کی تو بات الگ ہے۔ لیکن دوسرے احتمالات میں تو کوئی استبعاد[۵] کی بات نہیں۔
ہو سکتا ہے کہ اُس نے خود سنکھیا کھانے کا ارادہ کیا ہو۔ عورتیں اکثر خودکشی کر بیٹھتی ہیں یا تم کو اُس نے زہر دینا چاہا ہو
تو عجب نہیں بازاری خلقت کا بھروسا کیا خدا جانے اُس نے کیا سمجھ کر تم سے نکاح پڑھایا اور اب جو اُس کی مراد بر
نہ آئی تو اُس نے اپنا پنڈ چھڑانے کے لیے یہ تدبیر کی اگر وہ اپنی حالتِ سابقہ پر عود کرنے کی آرزومند ہو تو اُس
سے کچھ دور نہیں۔ ماما تم خود کہتے ہو کہ اُس کے پاس مدت سے ہے تو ضرور اُس کے پچھلے حالات سے بخوبی واقف
ہو گی اور عداوت کے لیے اتنی بات کافی ہے۔ اور سنکھیا کے لیے تمہاری اور ہریالی کی اور ماما کی کیا تخصیص ہے
معصوم سارے سارے دن ہریالی کے یہاں رہتا ہے وہ یقیناً اُس کی جان کی دشمن ہے۔ ان کے علاوہ ایک احتمال
اور ہے اور وہ سب میں زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ آپا کے پھنسانے کے لیے یہ سارا منصوبہ سوچا گیا ہے۔ ورنہ سبب کیا
کہ جانوروں تک کو فیرینی کھلائے اور خود منہ تک نہ لے جائے۔ اور بدذات نے کیا چالاکی اور بے رحمی کی ہے کہ بے زبان
جانوروں کو تو اتنی فیرینی ٹھسائی کہ ایک نہ بچا اور لہو لگا شہیدوں میں داخل۔ ماما کو بھی ذرا سی چٹا دی کہ دو چار دست
آ کر اچھی خاصی کی خاصی۔ مبتلا۔ ہاں لیکن کیا گھوسن کی گواہی پر لحاظ نہ ہو گا۔ ناظر۔ کیا معلوم عدالت تک پہنچتے
پہنچتے گھوسن اپنے بیان پر قائم رہتی ہے یا نہیں اور فرض کرو کہ قائم رہے تو اُس نے تو سنکھیا کا نام تک بھی نہیں
لیا بلکہ میری نظر سے دیکھو تو گھوسن کا بیان ہریالی کے حق میں سمِ قاتل ہے وہ کہتی ہے کہ خاتون نے مجھ کو دودھ کی ہنڈیا
واپس کر دی۔ بہت خوب۔ ہریالی نے جب یہ سن لیا تھا کہ بڑے گھر سے دودھ بُرا سمجھ کر واپس کیا گیا تو اُس نے چپ چپاتے
ضرورت سے زیادہ بھری کی بھری ہنڈیا رکھ کیوں لی۔ بس یہیں تو پانی مرتا ہے اس سے صاف شبہہ ہوتا ہے کہ ہریالی نے گھوسن سے
مل کر اُسی کے گھر دودھ میں سنکھیا گھلوائی اور جب خاتون دھوکے میں نہ آئی تو دوسری چال چلی اور پھر یہ بھی سمجھ لو کہ ہریالی اور تم

[۵] بعید از قیاس ہونا ۱۲

وہ نہیں ہو ہریالی کا کرنا عین تمھارا کرنا ہے اور ابھی خاتون کے بیان کی تو نوبت آنے دو دیکھو تو وہ کیا زہر اُگلتی ہے۔ کوتوالی والوں
کی کارروائی میں فی الواقع ہمیشہ ایک بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تحقیقات سے پہلے مقدمے کو کسی ایک پہلو پر ڈھال لے جاتے ہیں
اور پھر اخیر تک باصرار اُسی پہلو کی تائید میں لگے رہتے ہیں۔ جو باتیں میں نے تم سے سرسری طور پر بیان کی ہیں اُن میں سے
ایک کی طرف بھی کوتوال صاحب کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوگا اور ہم لوگوں کو تو باتیں حاکم کی میز پر سوجھتی ہیں عین وقت
پر کچھ اس طرح کا بہرہ کھل جاتا ہے کہ خود بخود بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ مبتلا کی ساری ہمت تمام عمر رہی معروف
حسن و عشق میں۔ مدعی اور مدعا علیہ بننا تو درکنار اُس کو کبھی گواہی دینے کا بھی اتفاق نہیں پڑا۔ بچپن کا لاڈلا جوانی کا
چھیلا وہ وکیلوں کے چھل فریب کیا سمجھے ناظر نے جو اُلٹی سیدھی باتیں سمجھائیں چھکے ہی تو چھوٹ گئے اور سمجھا کہ بس اب
نہیں بچتا۔ سنکھیا کا غصہ ہریالی کا رنج اپنی چوٹ اگلے پچھلے گلے شکوے سب کچھ بھلا بسرا ناظر کے گلے سے لپٹ گیا
کہ بس اب اپ ہی کے ہاتھ ہوں اور بنے تم چاہو مارو چاہو جلاؤ چاہو ڈبو چاہو بچاؤ۔ ناظر۔ مقدمہ تو میری طرف آ گیا ہوا اور مجھ کو مقدمے
کا ہیں بیمہ لیے چکا خرچ کا بندوبست تم کرو۔ مبتلا۔ خرچ کا بندوبست بھی تم ہی کو کرنا پڑے گا۔ تم کو تو گھر کا ذرا ذرا حال معلوم ہے
ناظر۔ کیا مضائقہ خرچ کا بھی انتظام ہو جائے گا اگر آخر دینا تو تم ہی کو پڑے گا۔ مبتلا۔ کوڑی کوڑی۔ ناظر۔ خیر تو آپ دو رقعے
میرے نام لکھیے ایک تو کل کی تاریخ میں کہ چوہوں کی جیسی کثرت ہے تم کو معلوم ہے اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ کھونٹیوں پر لٹکے
ہوئے کپڑے کاٹ کاٹ کر ٹکڑے کیے ڈالتے ہیں ناچار تھوڑی سنکھیا منگوائی پڑیا چھوٹے گھر کے بیچ والے دالان میں
اِس خیال سے کہ کسی کا ہاتھ نہ پڑے اونچے پر رکھوائی تھی۔ یہ ہو کر کوئی سات یا آٹھ دن پہلے کا ہے۔ کل کیا اتفاق ہوا کہ شام کے وقت
ایک روپے کی کھانڈ کا پڑا آیا اور جیسا دستور ہے پڑے کے ساتھ ٹھو سنکھیا کی پڑیا سنکھیا کا تو خیال نہ تھا کھانڈ کا پڑا اور پڑیا دونوں کو
اُسی طاق میں رکھوا دیا۔ جس میں سنکھیا کی پڑیا تھی آج خود گھر والی نے اپنے ہاتھ سے فیرینی میں کھانڈ ڈالی تو انھوں نے
کہا پڑیا کی کھانڈ بھی کیوں خراب ہو پڑا اور پڑیا دونوں اُتار تی لائیں۔ مگر پڑیا سنکھیا کی تھی باورچی خانے میں کسی دھوئیں
کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا اور چونکہ دل میں کسی طرح کا کھٹکا نہ تھا انھوں نے دیکھا بھی نہیں فیرینی پک کر تیار ہو رہی تو
تھوڑی سی جانوروں کو دی جو گھر والی نے اپنے شوق کے لیے پال رکھے تھے اور جو دیگچی میں لگی رہ گئی تھی ماما نے پونچھ کر کھائی
جانور تو مر گئے ماما کو کچھ دست آئے مگر بچ گئی کوتوالی کے لوگ مقدمے کو طول دینا چاہتے ہیں تم ہمارا کار انداس کی خبر گیری کرو۔ اور
دوسرا رقعہ آج ہی سوا مہینے چند دن پہلے کا لکھا ہو لکھ دو کہ مجھ کو اتنے روپے کی ضرورت ہے ہمارا بن پڑے بندوبست کر دو بس اللہ اللہ خیر صلاح وہ
چلتن پیر پھیلا کر سو رہیں سنکھیا کے رقعے کا مضمون سن کر تو مبتلا کی عقل دنگ ہو گئی اور سمجھا کہ ناظر بھی بڑا زہر کا بجھا ہوا ہے دیکھو تو کیا سر سے بات
اُتاری ہے میں ایسے شخص سے کیا بارے جا سکتا ہوں میرا بچاؤ تو اسی میں ہے کہ جو یہ کہے اس میں ذرا کان نہ ہلاؤں غرض اسی وقت دونوں رقعے
لکھ ناظر کے ہاتھ دیئے اور پوچھا کہ بھلا صاحب اب صبح کو کوتوال صاحب آئیں تو کیا کرنا ہوگا ناظر نے کہا اب یہاں درگا کے بیٹے کوتوال صاحب کیا
آتے ہیں آب آمد تیمم برخاست اور اگر آئے بھی تو کوتوال بن کر نہیں بلکہ بدحال بدحال سر پا جھلال۔ مبتلا۔ اور کیوں صاحب جناب صاحب کی باتوں
معلوم ہوتا تھا کہ اس نے انگریز کو جو کوتوالی کا افسر ہو لا کھڑا کیا۔ ناظر۔ او ہم سگ زرد برادر شغال۔ باوجودے کہ ابھی جھٹ پٹا تھا ناظر تو سوار ہو
سیدھا کوتوال پاس پہنچا کوتوال سمجھا کہ ایسے وقت آئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ضرور کچھ نہ کچھ لو بھی گئے ہیں دور سے ہنس کر بولا آئیے آج تو سویرے ہی سویرے

اچھے سنجی کے درشن ہوئے ہیں تو آپکے یہاں آنے کو وردی پہن کر تیار لیس بیٹھا ہوں صاحب سپرنٹنڈنٹ سے سات بجے کا وعدہ ہی - ناظر - کیا بیمار بیٹھے ہو وہاں تو رات بڑا غضب ہو گیا - کوتوال - کیا کوئی اور صاحب سنکھیا کھا کر شہید ہوئے ناظر - نہیں سنکھیا تو نہیں مگر آپ تو جانتے ہیں مبتلا بھائی کے گھر میں جو وہ دوسری عورت ہی پوسے دنوں سے تھی کل نہیں معلوم آپکے سپاہیوں نے اُس کو کیا کیا ڈرایا دھمکایا طبیعت تو اُس کی آپ کے رہتے ہی بگڑ چلی تھی آپ ادھر آئے شاید کوتوالی بھی نہ پہونچے ہوں گے کہ اُس کا حمل ساقط ہو گیا ساری رات اسی کے تردد میں پلک نہیں جھپکی - خیر حمل تو حمل اب اُسی کے جان کے لالے پڑے ہیں دیکھیے وہ بھی بچتی ہی یا نہیں مبتلا - بھائی کو اُس عورت کے ساتھ اِس درجے کا تعشق ہی کہ جس وقت سے یہ واردات ہوئی ہی سارے گھر میں بولائے بولائے پڑے پھر رہے ہیں - وہ تو ڈاکٹر چنبیلی کو بلاتے تھے میں نے بہزار مشکل روکا کہ انگریزوں کے کان پڑی ہوئی بات پھر اپنے قابو کی نہیں رہتی ایک چھوڑ دو دو دوائیاں بلوا دی ہیں پاسے اب کہیں جا کر کسی قدر طبیعت سنبھلی تو میں آپکے پاس بھاگا ہوا آیا میں تو رقعہ لکھنے کو تھا پھر خیال آیا کہ خدا جانے کس کے ہاتھ پڑے آپ چل کر کہنا چاہیے - یہ کہنا تھا کہ کوتوال کو کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں - گڑگڑا کر بولا آپ کے یہاں ہم تابع داروں کی مجال ہی کہ ڈرائیں دھمکائیں یا کوئی خلاف قاعدہ کارروائی کریں آپ جس وقت تشریف لائے ہیں آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ مردانے میں صرف دو ہی کانسٹبل میرے ساتھ تھے اور وہ دونوں بھی بے چارے الگ اصطبل کے پاس کھڑے تھے میں نے آپ کے آدمی وفادار کے ہاتھ ماماؤں اور لونڈیوں کو بلا بلا کر ہولے سے دو دو باتیں پوچھ لیں اصل حقیقت تو یہ ہی ادھر ہم نے تو جس دن پولیس میں نام لکھوایا اُسی دن سمجھ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور قید ہوں گے یہ ایسی تیسی نوکری اِس قسم کی ہی کو تلوں کی دوکانداری کہ بے کالا منہ ہوئے نہیں رہتا - بڑوں کا کہنا اور آنولے کا کھایا پیچھے مزہ دیتا ہی - لالہ جی[1] بہتیرا سر پٹکتے رہے کہ ہم لوگ ٹھیرے لکھنی جند ہم کو سپاہیوں کا بھیس سزاوار نہیں ہر کارے وہر مردے اُس وقت اُن کی بات کچھ دھیان میں نہ آئی سو اپنے کیے کی سزا پائی - ناظر - ہہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ نے کوئی بے جا کارروائی نہیں کی ہوگی آدمی کا حال چھپا نہیں رہتا سارا شہر آپ کا مداح ہی اور اگر آپ احتیاط نہ کرتے تو اتنے دن کوتوالی کا چلنا بھی محال تھا خصوصاً صاحب مجسٹریٹ حال کے وقت میں مگر عورتیں تو جیسی ڈرپوک اور کچے دل کی ہوتی ہیں آپ خوب جانتے ہیں آپ کا ہی آنا سن کر اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے اور پھر کسی سپاہی نے کوئی ایک آدھ بات بھی کہہ دی ہوگی حالت تو نازک تھی ہی اُٹھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا چھوٹے گھر میں تو خیر ایک واردات بھی ہوئی تھی کہ جانور مرے ماما کو دست آئے فیرنی میں سنکھیا نکلی بڑا گھر جس کو واردات سے کچھ بھی تعلق نہیں وہاں کیا حال تھا جا کر دیکھتا ہوں کہ چولہا تک نہیں سلگا وہ تو جب میں نے سمجھایا کہ یہ کیا اِس سے بڑی بڑی اتفاقی اور ناگہانی وارداتیں ہو جاتی ہیں اور آخر کار مقدمہ داخل دفتر تب سب کو تسلی ہوئی - کوتوال اتفاقی کیسی - تب ناظر نے مبتلا کا رقعہ دیا کہ وہ خونی دروازے میں جو ایک شخص نے اپنی آشنا کو دھتورا کھلا کر مار ڈالا تھا اور شاید آپ ہی نے تو اس مقدمے کی بھی تحقیقات کی تھی کل اُس کی پیشی تھی اور میں مدعا علیہ کا وکیل تھا آپ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی سرکار کی طرف سے پیروی کے لیے موجود تھے بڑے بڑے مباحثے رہے آخر ساڑھے چار بجتے بجتے مدعا علیہ کی رہائی

[1] مراد ہی کوتوال کے باپ کیونکہ کوتوال قوم کا مہندرہ تھا ۱۲

ہوئی۔ ہاں تو یہ رقعہ مجھ کو عین اجلاس پر ملا تھا اور اسی کو دیکھ کر میں کچہری سے سیدھا وہیں چلا گیا کوتوال نے رقعہ پڑھا تو مقدمے کی
طرف سے بھی اُس کی آس ٹوٹ گئی کمر سے کرچ کھول ناظر کے پیروں پر رکھدی کہ نوکری تو یہ حاضر ہے خدا واسطے کو ایک اتنا سلوک
کیجیے کہ عزت پر ہاتھ نہ ڈالیے۔ ناظر نے بہت تسلی کی کہ بھلا اتنا تو سمجھیے کہ اگر میرے دل میں کچھ فساد ہوتا تو میں اس قدر سویرے
اندھیرے منہ آپ کے پاس دوڑا ہوا کیوں آتا جو کچھ ہونا تھا سو ہوا میں جس طرح سے بن پڑے گا مبتلا بھائی کو سمجھاؤں گا کہ
جب انھوں نے دوسری عورت کر لی ہے ذرا تنگ دست رہتے ہیں یہی نا کہ دوا درمن کا خرچ اور اوپر سے سو دو سو روپیہ اُن کو دے دیا جائے گا
وہاں سنکھیا کی منہ میں آپ کچھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کیجیے گا اس میں کچھ ہونا ہوانا بھی نہیں ناظر چلنے لگا تو کوتوال نے کہا پھر اس کرچ کو تو آپ اپنے ہاتھ سے
باندھ دیں تو میں کمر سے لگاؤں گا ورنہ جہاں پڑی ہے پڑی رہے گی۔ ناظر نے جلدی سے کرچ اٹھا بسم اللہ کر کے کوتوال
کی کمر سے باندھی گویا اپنی طرف سے کوتوالی دی کوتوال نے کہا بس اب ہاتھ پکڑے کی لاج آپ کو کرنی ہوگی۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ
کو وہاں ایسا اور ضرورت پیش آگئی کہ کسی انگریز کے یہاں سوڈا واٹر کی ایک دو بھی نہیں اٹھی آدھی درجن خالی بوتلیں چوری
گئیں صاحب نے چٹھی لکھی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب اس کی تحقیقات کو بھاگے گئے کوتوال سے کہلا بھیجا ہمارا آنا نہیں ہو سکتا
پھر کوئی پندرہ بیس دن بعد خود سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی کو خیال آیا تو پوچھا کیوں کوتوال صاحب وہ کس وکیل صاحب
کے یہاں کی زہر خورانی کا آپ نے تذکرہ کیا تھا اُس کا کیا ہوا۔ کوتوال نے کہا حضور فدوی نے تو اگلے ہی دن ۲۲،۳ نمبر کا روزنامچہ
خاص بھیج دیا تھا کہ واردات اتفاقی ہے۔ بات رفت گذشت ہوئی۔ دو چار دن تو مبتلا کو کھٹکا رہا پھر اُس نے دیکھا کہ کوتوالی
والوں میں سے کسی نے اگر بھی نہ جھانکا تو اُس کو یقین ہوا کہ ناظر کو حکام کے مزاج میں کچھ اس طرح کا دخل ہے کہ آج جو چاہے سو
کر گزرے۔ ناظر نے اس مقدمے میں اچھی بُردباری ہزار روپے تو جھپکے سے اُس نے وہ اُگلوائے جو خاتون کٹنی غیرت بیگم
کو بہکا پُھسلا کر لے اُڑی تھی۔ اور رقعے کے بدلے مبتلا سے اُس کے حصے کی دکانوں کا قطعی بیع نامہ اپنے نام کا لکھوا لیا اور
پھر سبد میں سنج رو کا سنج رو۔ اب بے چارے مبتلا کے پاس پینسٹھ روپے ماہوار کی جگہ صرف ستائیس روپے مہینے
کی تنخواہ میں رہ گئیں وہ بھی کس طرح کی کہ کوئی چھٹے مہینے آدھی باد وصول ہوئی تو کوئی برس پیچھے اور کوئی ماری
گئی اور غیرت بیگم کی یہ تاکید کہ بھلا کوئی ایک لوٹا پانی تو اُس کے گھر میں سے مبتلا کو دے دیکھے۔ غیرت بیگم کے یہاں
پہلے ہی مبتلا کی کون سی قدر کی جاتی تھی اب جس دن سے یہ معاملے مقدمے کھڑے ہوئے رہا سہا اور بھی نظروں سے
گر گیا پہلے سے رکھی تھی رفتہ رفتہ بدمزاجی ہوئی بدمزاجی سے بد دماغی کی نوبت پہنچ گئی بلکہ طرزِ مدارات سے ایسا مستنبط
ہونے لگا کہ سید حاضر نے جو ایک دن بیچ کے آنے کا معمول باندھ دیا تھا اب مبتلا کا اتنا آنا بھی گوارا نہیں۔ غیرت بیگم
کو مبتلا سے بات چیت کیے ہوئے برسوں گزر گئے تھے لونڈیاں مامائیں میاں کا اتنا لحاظ کرتی تھیں کہ باری کے دن
بچھونا صاف کر دیا جب تک گھر میں بیٹھے حقے کی خبر رکھی کھانے کو پوچھ لیا اور اب مقدموں کے بعد سے تو ان باتوں
میں بھی مضایقہ ہونے لگا۔ مبتلا لاکھ گیا گزرا تھا مگر آخر تھا تو صاحب خانہ یہ بے وقری دیکھ کر وہ بڑے گھر کی باری
کو تو تپ دلرزہ کی باری سے کم نہیں سمجھتا تھا مگر حاضر ناظر سے اس قدر ڈرتا تھا جیسا مردہ نکیرین سے ناخواستہ دل آتا

ملک دخل ۱۲

اور بخاست خاطر رہنا۔ ایسی ایسی سنگین وارداتیں گھر میں ہو جائیں اور کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹے غیرت بیگم اور بھی بے محابا ہو کر
لگی بادل کی طرح گرجنے اور بجلی کی طرح کڑکنے۔ سقا اور دھوبی اور حلال خور وغیرہ جتنے اہل خدمت تھے اُن تک کی بندش ہو گئی
کہ چھوٹے گھر کا کام نہ کرنے پائیں۔ ناچار گلی کی طرف کا قدیم دروازہ جو مدتوں سے بند تھا تیغا توڑ کر کھولا تب کام چلا۔

مبتلا اور ہریالی کا بگاڑ

جب تک باتوں کا دبالی جیچ وپیچ رہا کہ غیرت بیگم نے اپنے گھر میں کوس کاٹ لیا اور ہریالی نے
اپنی جگہ پکار کر تو پکار کر نہیں تو چپکے سے جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا تب تک اگر سچ پوچھو تو ہریالی
کی جیت تھی کیوں کہ مبتلا اس کے پلے پڑا تھا اور آمدنی کے حساب سے دونوں گھر برابر سرابر تھے
اب جو بیٹھے کے رہ گئے ستائیس تو اس کا ایمان ڈگمگا چلا اور مبتلا سے کہا کیوں صاحب اُدھر اکیلے گھر میں ساٹھ اور ادھر
مردانہ زنانہ دو گھروں میں پینسٹھ۔ گویا پانچ روپے کا تل۔ خدا جانے میں کیا کتر بیونت کرتی تھی کہ خیر گزر ہوتی چلی گئی تم
اپنے ہاتھ میں خرچ رکھتے ہوتے تو حقیقت کھلتی اور میں تمہارے بڑے گھر میں جاتی نہیں تو آخر سنتی تو ہوں کہ آدمیوں کو
آبپائی وال ملتی ہے اور وہ بھی ایک وقت بچوں کو سودا سلف تو درکنار کبھی ادھی کے چنے لے کر ٹھونگنے نصیب نہیں ہو سکتے اب
تم نے پینسٹھ کے ستائیس کرائے ہیں تو تم ہی خرچ کا انتظام بھی کر دیں کوئی اپنی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر تو کھلانے سے رہی
مبتلا۔ پینسٹھ کے ستائیس میں نے کرائے ہیں۔ ہریالی۔ جانے بلا تم نے کرائے ہیں یا اُنھوں نے جو تمہارے کچھ لگتے
ہیں۔ مبتلا۔ تم ہی نے فیر بھی بگا کہ چھٹے بٹھائے سارا فساد برپا کیا اور اُلٹا مجھ کو الاہنا دیتی ہو۔ ہریالی۔ مجھے خبر تھی کہ دشمنوں
نے دودھ میں سنکھیا گھول کر میری جان کے لینے کا سامان کیا ہے۔ مبتلا۔ اسی کا تو پتہ نہ چل سکا کہ کس نے دودھ میں سنکھیا
گھول دی۔ ہریالی۔ تو کیا میں نے گھول لی۔ مبتلا۔ تم نے گھولی تو نہیں مگر تم چپ ہو گئیں۔ ہریالی۔ تم نے چھپوائی تو تھی۔ مبتلا۔
ایک فتنہ و دو شد مچنا میں نے کم کرایا۔ سنکھیا کا الزام بھی میں نے لگایا۔ میں ہی بُرا ہوں تو خدا بچے کو سوتا رہے۔ ہریالی۔ خدا
نہ کرے تم کیوں بُرے ہونے لگے بُری میں ہوں کہ تمہارے کارن گھر چھوڑا، اپنا چھوڑا، آرام چھوڑا، اس کا یہ انعام ملا کہ ایسا
یہاں آ کر کوسنے سُننے گالیاں کھائیں بے عزتی کا کوئی درجہ باقی نہ رہا دو دفعہ جان کا خطرہ اُٹھایا۔ مبتلا۔ تم کو تو معلوم تھا
کہ میرے بی بی بچے ہیں۔ پھر نہ آئی ہوتیں کسی نے زبردستی کی تھی اور اب تمہارا جی چاہے تو اب چلی جاؤ تم سے کسی نے
کچھ چھین تو نہیں لیا۔ ہریالی۔ ہاں ہاں میں کیا کہتی ہوں تمہاری بی بی کو بھی جانتی تھی اور بچوں کا ہونا بھی معلوم تھا
مگر مجھے خبر نہ تھی کہ تم اس طرح کے تیز ہو کہ ناظر کی صورت دیکھنے سے تمہارے ہوش باختہ ہوتے ہیں۔ اور میں اگر جاؤں گی اور
جاؤں گی نہیں تو کیا مفت میں اپنی جان گنواؤں گی تو ناظر کو جو وکالت کے گھمنڈ میں بہت اکڑا ہوا پھیرتا ہے اور اس مکار
حاضر کو جو ہر مرتبہ بڑا مولوی بن کر وعظ کہنے کو آ بیٹھتا ہے اور تیری بہنا کوتوال کی جورو کو اور اس موئے کوتوال کو جس نے رشوتیں
لے لے کر خون کے مقدموں کو ملیا میٹ کیا ہے اور سب کے ساتھ تجھ کو دنیا جہان میں الم نشرح کر کے جاؤں گی میرا جانا کیا ایسا
ہنسی ٹھٹھا ہے۔ میں نے تیرے پیچھے اپنے تئیں خاک میں ملا دیا اور آج تو نے اس کا مجھ کو یہ پھل دیا۔ لے اب دیکھ میرا تماشا
تیرا تو کیا منہ ہے اگر بلا اپنے ساتھیوں کو کہ مجھے جاتی کو روکیں یہ کہہ کر ہریالی کھڑی ہو سیدھی دروازے کی طرف چلی

۱۲ بزدل نامرد ۱۲ ... مراد ہے مشہور ۱۲
... ایک پانچویں بیگم ... اور دوسری بار اس کا عمل ساقط ہو گیا ۱۲

بارے مبتلا نے ساری عمر میں ایک یہ بہادری تو کی کہ اُس کو کوٹھری میں دھکیل جھٹ اُوپر سے کنڈی لگا دی۔
این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مبتلا تو ہریالی کو کوٹھری میں بند کر باہر چلا گیا۔ ہریالی کے پاس جو نوکرانی تھی
وہ بھی ایک طرح کی اُس کی کٹنی اُس نے ہریالی کو سمجھایا بی بی مرد کا مزاج دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ اس کم بخت پر تو آپ
ہی مصیبتیں پڑی ٹوٹ رہی ہیں تم اوپر چلیں گھائیں اوپر سے مرچیں لگانے۔ تھوڑے دنوں صبر کیا ہوتا دو پیسے
نہیں بچتا چوری کرتا کہیں نہ کہیں سے تمہارا بھرنا بھرتا اور اگر تمہاری مرضی جانے کی ہوگی تو اُس کی سو دفعہ ایسی
ڈھنڈورا پیٹنا اور ڈھول بجانا کیا ضرور رہو۔ اُدھر یاں کے بہلانے مبتلا کے پاس گئی اور اُس سے کہا میاں جو کچھ بیتی
کہو سب تم کو پہنچتا ہے پر موئے سمجھ کر یہ کہہ بیٹھنا کہ چلی جا تم ہی انصاف کرو بڑی سخت بات ہے۔ خیر تمہارا حرام ہوتا
ہے۔ میاں بی بی کی لڑائی کیا اور میاں بی بی بھی تم جیسے کہ وہ تمہاری عاشق زار اور تم اُس پر دل و جان سے نثار اٹھو
گھر میں چلو بیوی کی بھی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی اب میں نے اُٹھا کر زبردستی پانی پلایا ہے۔

مبتلا نے تنگ ہوکر دونوں گھروں کا رہنا چھوڑا اور اُس کی حالت بوتا فیوتا ردی ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک دن مر کر رہ گیا

جس شخص کی ہنسی ٹھٹھے کی آمدنی جاکر ستائیس کی رہ جائے اور وہ بھی غیر مستقر اُسی کے دل سے پوچھنا چاہیئے کہ اُس پر کیا گزرتی ہوگی۔ تو اثر و صائب اور ہجوم افکار نے مبتلا کو اس قدر تنگ مزاج کر دیا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز اُس کو بھلی نہیں لگتی تھی اُس کو ہریالی کی لڑائی کا ایک بہانہ مل گیا اور اُس نے دونوں گھروں کا جانا قطعاً موقوف کر دیا سارے دن رات اٹوانٹی
کھٹوانٹی لیے اکیلا مردانے میں پڑا رہتا تھا نہ خود کسی کے پاس جاتا اور نہ اپنے پاس کسی کے آنے کا روادار ہوتا۔ اگر
اتفاق سے کوئی آ نکلتا تو اُس کی طرف مطلق ملتفت نہ ہوتا۔ اس رنج نے اُس کو رہا سہا اور بھی اچھا کر دیا کہ دو دشمن اُس کے
اُور تیار ہوئے۔ ناظر سے بڑھ کر معصوم اور غیرت بیگم سے زیادہ بتول۔ مبتلا اپنی طرف سے بہتیرا دونوں کو لپٹاتا تھا مگر یہ دونوں
اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ ہمارا باپ ہے جب سے ہوش سنبھالا باپ کو بُرا ہی بُرا سنا دونوں کے ذہن میں اُس کی بُرائی
ایسی راسخ ہو گئی تھی کہ ابا یا باوا یا باپ کہنا کیسا دونوں خاص طرح نام لیتے تھے معصوم گالی کے ساتھ اور بتول کوسنے کے ساتھ
مبتلا نے جب دونوں گھروں سے ملول ہو کر مردانے میں رہنا اختیار کیا تو اُس نے یہ خاص تدبیر سوچی تھی کہ اگر ہو سکے تو معصوم
اور بتول دونوں کو ورنہ اکیلے معصوم کو خالی بیٹھا ہوا پڑھاؤں اور اسی طرح اپنا جی بہلاؤں مگر معصوم پتھے پر ہاتھ تو دھرنے
ہی نہیں دیتا تھا۔ مردانے مکان میں رونق تو ہریالی کے ساتھ اُٹھ چلی تھی اب تھوڑے ہی دنوں میں خاک اُڑنے لگی جس مکان میں عمدہ اسباب کے ٹھٹھ کے
ٹھٹھ لگے پڑے تھے اب اُس میں کیا رہ گیا تھا چند چھپرکھٹ ایک کی چول ٹوٹی ہوئی ہے تو دوسرے میں ادوان نہیں کسی کی پٹی لچکی ہوئی ہے تو کسی کے
سیرے میں جان نہیں شاید چھوٹی بڑی ملا کر چار یا پانچ چوکیاں وہ بھی بے جوڑ بوسیدہ بے مصرف نوکروں میں صرف ایک وفادار سو بھی
کس طرح کہ یہاں سے تو اُس کو کھانا تک نہیں ملتا تھا اور ملے کہاں سے دیتے دیں میاں سو میاں بے چارے کے پلے ٹکا نہیں ان کو مزدوری کرنا
اور رات کو میاں کی پائنتی گر پڑ رہنا۔ دنیا کا کوئی کام یا دین کا روزہ نماز ہو تو صبح و شام کا تفرقہ اور دن رات کا امتیاز ہو۔ مبتلا کو سب وقت یکساں تھے اُس کو سونے

جاگنے کھانے پینے کسی بات کا کوئی وقت ہی مقرر نہ تھا جب دیکھو منہ اوندھائے چارپائی پر پڑا ہے معلوم نہیں سوتا ہے یا جاگتا ہے
اپنی تباہی کا خیال ہے کہ کسی وقت دل سے نہیں جاتا جاگتا ہے تو اسی کا سوچ ہے اور سوتا ہے تو اسی کا خواب دیکھ رہا ہے وہ کبھی اپنے
پچھلے وقتوں کو یاد کرتا اور اس کے چہرے پر ایک طرح کی بشاشت آجاتی تھوڑی دیر بعد خود بخود دیکایک چونک کر ادھر ادھر
دیکھنے لگتا اور پھر اس کے منہ پر مُردنی سی چھا جاتی۔ غیرت بیگم اور اس کے علاقہ داروں سے یہاں تک کہ اپنے بچوں سے
تو اس کو مطلق نا امیدی تھی وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ اب کسی حالت میں جیتے جی ان لوگوں سے صفائی کا ہونا ممکن نہیں رہ گیا
قطع تعلق اس کے لیے چاہیے ہمت جرأت اور یہی باتیں اگر مبتلا میں ہوتیں تو یہاں تک نوبت ہی کیوں پونہچتی۔ قاعدہ ہے کہ
جس پر پڑتی ہے اسی کی طبیعت خوب لڑتی ہے رنجوں سے بچنے کا کون سا پہلو تھا جو مبتلا نے نہیں سوچا مگر جدھر جاتا تھا
راہ نجات کو مسدود پاتا تھا۔ مارے غم کے وہ اس قدر نحیف و ناتوان ہو گیا تھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار شاید چھینکنے سے اس کو
غش آتا اور کھانسی کے ساتھ اس کا سانس اکھڑ جاتا۔ اللہ رے غیرت بیگم عورت ذات ہو کر اس قدر سخت دلی اور اس بلا
کا غصہ کہ مبتلا گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گیا اور اس نے بھول کر بھی خبر لی ہریالی تھی تو زرالی پر خیر دکھاوا ظاہرداری جو چاہو
سمجھو بیسیوں بار تو اپنی ماما کو بھیجا اور آخر خود گئی ہر چند منت خوشامد کی مگر مبتلا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا تھا ذرا نہ پتیایا
مبتلا خوب سمجھتا تھا کہ میں اس رنج سے جاں بر نہیں ہو سکتا اختلاج قلب تو اس کو مہینوں سے تھا اب کسی کسی وقت دل میں
ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد بھی اٹھنے لگا تدبیر کچھ ہوئی نہیں دورے متواتر اور شدید ہونے لگے۔ آخر ایک دن ادھر آفتاب
ڈوبتا تھا ادھر یہ بے کس و بے نصیب دل کے درد سے کھرّی چارپائی پر نہ تکیہ نہ بچھونا تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا۔

خاتمہ

ایک حسن پرستی کے پیچھے دنیا میں کیا کیا سختیاں اٹھائیں کہ خدا دشمن کو بھی نہ نصیب کرے اپنا یا بیگانہ
مرنا تو سبھی کا قابل افسوس ہے مگر نہیں ہے تو مبتلا کا اس کا جینا قابل افسوس تھا اور مرنا قابل خوشی کیونکہ
مر کر وہ دنیا کی مصیبتوں سے چھوٹ تو گیا۔ مصیبتیں تو اس کے دم کے ساتھ تھیں نہ مرتا اور مصیبت بھرتا پھر بھی ہم اس کے
حق میں دعا کرتے ہیں کہ دنیاوی ایذائیں اس کے گناہوں کا کفارہ ہوں اور بے چارہ مصیبت کا مارا حسن صورت کا بہت
فریفتہ تھا خدا اس کو جنت میں بہت سی حوریں دے بشرطیکہ غیرت بیگم اور ہریالی کی طرح آپس میں نہ لڑیں عبرت کا مقام
ہے ایک چھوڑ دو دو بیبیاں موجود بیٹا موجود بیٹی موجود بیبیوں کے نوکر چاکر موجود اور مرتے وقت منہ میں پانی ٹپکانے کو مبتلا
کے پاس کوئی نہیں۔ کہیں پہر رات گئے وفادار محنت مزدوری سے فارغ ہو کر آیا اور اس نے پکارا تو میاں کو مرا ہوا پایا چیخ اٹھا
سارے محلے کو خبر ہوئی اور محلے والوں کے ساتھ محل کے لوگوں کو ہریالی کو دیکھا تو وہ اور اس کی ماما اور اسباب سب ندارد
گھر میں جھاڑو دی ہوئی پڑی ہے نہیں معلوم ایسا کون کالا چور اس کو بھگا کر لے گیا کہ پھر اس کا پتہ نہ لگا۔ غیرت بیگم یا تو اس قدر
میاں سے بگڑی رہتی تھی یا میاں کا مرنا سنتے ہی ایسا روئی آنا پیٹی کہ بس جو بیوی میاں کی عاشق زار ہو گی وہ اس سے زیادہ
کیا روئے پیٹے گی۔ اب اس کو معلوم ہوا کہ میاں اس کے ظلم سہنے کے لیے سدا کو بیٹھا رہنے والا نہ تھا وہ میاں کے مرنے پر اتنا
نہیں روتی تھی جتنا اپنے ظلموں پر جن کی تلافی اب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھی۔ روتے روتے دونوں آنکھوں میں ناسور
پڑ گئے تھے اور تھنی جیسا ڈیل ایسا سوکھا تھا کہ جیسے کانٹا۔ مبتلا کی چھ ماہی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ غیرت بیگم اسی رنج میں تمام

ہوئی مرتے مرتے وصیت کی کہ مجھ کو ہتول کے باپ کی پائینتی دفن کرنا تاکہ اگر جیتے جی ہیں اُن کے پاؤں نہ پڑ سکی تو خیر قبر ہیں
اُن کے پاؤں ہوں اور میرا سر

مبتلا کے چچا میر متقی کا اپنی بھانجی یعنی مبتلا کی بی بی کے سامنے تعزیت کے طور پر وعظ کہنا

ماموں کا آنا سُن کر بھانجی کو ماں باپ اور ساس سسر کا مرنا بھائیوں کا ظلم اور سب سے بڑھ کر مبتلا کا اس سے بے تعلق رہنا اپنی بے کسی گھر کی تباہی آئندہ کی ناامیدی غرض ساری داستان مصیبت اول سے آخر تک یاد آگئی اور وہ دل ہی دل میں رونے کی تیاریاں کر چکی تھی جوں ماموں نے اندر قدم رکھا اور بھانجی کے ساتھ نظر دوچار ہوئی اُس نے کسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہو کر سلام تو کر لیا اور پھر تو ایسی بلکی کہ غش کھا کر گر پڑی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے دانت بچی ہو گئے لخلخے سونگھائے موںہ پر گلاب کے چھینٹے دیئے بارے ہوش آیا تو اس نے ایسے بین شروع کیے کہ سُننے والوں کے کلیجے موںہ کو آنے لگے دل دہل گئے۔ آخر متقی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمجھایا کہ مصیبت میں اس قدر رنج کرنا عبودیت کی شان نہیں ہے رنج مصیبت کو نہ ٹال سکتا ہے اور نہ اُس کو ہلکا کر سکتا بلکہ اُلٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے جیسے محبت ماں کو اکلوتے بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے اس سے لاکھوں کروروں درجے بڑھی ہوئی محبت خدا کو اپنے تمام بندوں کے ساتھ ہے اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی کریں ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے بندے بھلے اور بُرے امیر اور غریب قوی اور ضعیف حاکم اور محکوم بادشاہ اور رعیت یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اِس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتّا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے ایک ذرّے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے کسی انسان کا نفع و ضرر نہ خود اُس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے دنیا میں جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے اِس کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے اُس کا فائدہ چاہتا ہے نہ یہ کہ اُس کو فائدہ پونہچاتا ہے یا پونہچا سکتا ہے اسی واسطے دنیا کی ساری محبتیں از براے نام ہیں اور اصلی محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں یہاں تک کہ زندگی اُسی کی دی ہوئی ہے بااین ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پونہچتی ہیں مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے مثلاً طبیب کہ وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہے کبھی اُس کو کڑوی دوا پلاتا ہے اور کبھی اُس کی فصد لیتا ہے اور کبھی بیمار کے زخم کو شگاف دیتا اور کبھی شاید اِس کے کسی عضو کو کاٹ بھی ڈالتا ہے مگر ایسا کرنے سے کیا کوئی شبہہ کر سکتا ہے کہ طبیب اپنے بیمار کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔ اسی طرح جو تکلیفیں ہم کو دنیا میں پونہچتی ہیں اور بلاشبہہ خدا کی مقدس مرضی سے پونہچتی ہیں ظاہر میں تکلیف ہیں اور باطن میں آرام ابتدا میں ایذا ہیں اور انجام میں راحت اول تو اِس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ تکلیف حقیقت میں بھی تکلیف ہے یا نہیں۔ فرض کرو کہ کسی عورت کا شوہر مر جائے ظاہر میں بیوہ کی ایک بڑی مصیبت ہے مگر کیا ممکن نہیں کہ مرد زندہ رہتا اور بیوی پر سوکن لا کر اُس کو زندہ درگور کرتا یا بیوی اُس کا دل ایسا پھیرتا کہ جب تک جیتا اُس کو سخت ایذا دیتا یا ایسے امراض میں مبتلا ہوتا کہ سارے گھر کی زندگی دشوار کر دیتا اور

اسی طرح کے اور بہت سے احتمالات ہیں جن کی وجہ سے ایک عورت اپنی بیوگی کو ترجیح دے سکتی ہے سہاگ پر۔ پس جب تک
انسان کو تمام احتمالات اعنی علم غیب نہ ہو اور وہ اُس کو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا وہ کسی حالت کو جو اُس پر یا کسی پر طاری ہو برا کہہ نہیں سکتا۔ دنیا
کے بہت سے واقعات کو ہم پسند کرتے ہیں مگر جس طرح ہماری معلومات ناتمام ہیں اسی طرح جو نتیجے ہم اپنی معلومات سے نکالتے ہیں
ناقص۔ اور مصیبت ہو وا اور اُس پر فیصلہ ناکافی تحقیقات اور اُس پر تجویز اور مانا کہ جو تکلیف ہم کو پہنچی حقیقت میں تکلیف ہے
تو کیا شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے کو منصف اور رحم دل بادشاہ اپنی عزیز رعیت کو تادیب یا تنبیہ یا اصلاح یا کسی دوسری
مصلحت سے ایذا نہیں پہنچاتا ہمیشہ ایسی ایذائیں پہنچتی رہتی ہیں نہ فریاد نہ شکایت پس اگر خدا کی طرف سے ایک ایذا پہنچ
جائے تو جائے وہ اُس کے بے شمار احسانوں کو اور بھول جاؤ اُس کی نامحصور نعمتوں کو تو بندہ کیوں منہ پھلائے کس لیے
بگڑ بیٹھے سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو پہنچتا ہے یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص عجز و انکسار کی صفت پیدا
کرتی ہے اور خدا کی یاد دلاتی ہے اور حقیقت میں مصیبت کے وقت بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ مصیبت نہیں راحت
ہے لیکن خدا کی یاد کرنے اور اُس کی طرف رجوع کرنے کے معنی نہیں ہیں کہ شکایت کرو اور اُس سے ناراض رہو بلکہ اُس کے
معنی ہیں کہ اُس کی رحمت پر پورا بھروسہ اور اعتماد کیجیے صمیم قلب سے یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا بہتر ہوا مناسب ہوا اور یوں ہی
ہونا چاہیے تھا یہ تو درجہ رضا و تسلیم کا ہے اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کہ جس کا عقیدہ ضعیف اور جس کا دل کم زور
اور جس کی ہمت کوتاہ اور جس کا ارادہ متزلزل ہے اس درجے پر پہنچنا دشوار ہے مگر اعلیٰ علیین پر نہیں پہنچ سکتے تو ایک
سیڑھی دو سیڑھی نیچا ہو سکے جہاں تک تو اپنے کو کسی قدر تو ابھرو کہ اسفل السافلین کفران سے نکلو یوں کہنے کو تو منہ سے سبھی
کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے چند روزہ ہے خواب ہے سراب ہے سایہ ہے حباب ہے برق بے تاب ہے مگر مصیبت کے وقت بخوبی
ظاہر ہو جاتا ہے کہ زبان ہمارے دل کا سچا ترجمان نہیں کیا کوئی ثانی ایک فانی حالت کے لیے اتنا غل مچاتا اور
اس قدر رنج کرتا پیٹتا ہے۔ مصیبت پر جو منفعت ہم نے ہمیشہ مترتب ہوتے دیکھی وہ تو یہ ہے کہ مصیبت آدمی کے مستقبل
کو اُس کی ماضی سے ضرور بہتر کر دیتی ہے یعنی اگر انسان کاہل تھا تو مصیبت کے بعد ضرور چست و چالاک ہو جاتا ہے۔ آرام
طلب تھا تو جفاکش۔ بھولا تھا تو سیانا۔ مسرف تھا تو کفایت شعار۔ بد پرہیز تھا تو محتاط۔ جلد باز تھا تو دھیما۔ آوارہ تھا
تو نیک کردار۔ جس آدمی پر کبھی مصیبت نہیں پڑی نہ اُس کی عقل کا ٹھکانا نہ اُس کی رائے کا بھروسہ نہ اُس کا دین درست
نہ اُس کے اخلاق شائستہ۔ اس کے علاوہ آدمی کا دستور ہے کہ ایک حالت کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر ساری عمر یکسانی کے
ساتھ چلی جائے تو اُس حالت کی عمدگی کا احساس باقی نہیں رہتا بلکہ اکتا کر خود اُس حالت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایک
باورچی کو میں جانتا ہوں جو نمکین اور میٹھے چاول یعنی بریانی متنجن عمدہ پکانے میں کامل اُستاد تھا شہر میں کہیں نہ کہیں شادی یا غمی کی
کوئی نہ کوئی تقریب لگی ہی رہتی تھی جس کسی کے یہاں چاولوں کی پخت ہوتی اسی باورچی سے پکواتا اور اُس کو مزدوری کے علاوہ دستور
کے مطابق چوتھی دار رکابی بھی ملتی وہ ایک رکابی ایسی ہوتی تھی کہ اُس کا سارا گھر اُس کو کھا کر اٹل ہو جاتا۔ پس ان لوگوں کو دونوں
وقت عمدہ سے عمدہ بریانی اور بہتر سے بہتر متنجن کھانے کو ملتا تھا۔ پس یہ ایک حالت تھی کہ اگر کسی غریب آدمی کے سامنے جو
بریانی متنجن کو ترستا ہو بیان کیجیے تو سنتے کے ساتھ ہی رال ٹپک پڑے۔ مگر اس باورچی اور اُس کے اہل و عیال کا کیا حال

تھا کہ قلتیں کر کے بریانی متنجن کی رکابیاں ہمسائے کے لوگوں کو دیتے اور اُن سے روٹی چٹنی مانگ کر کھاتے۔ پس ہم نے تن درستی کی قدر بیماری سے جانی وطن کی پردیس سے تونگری کی مفلسی سے آرام کی دکھ سے راحت کی مصیبت سے تو جو شخص حقیقی راحت کا خواہاں ہے ضرور ہے کہ مصیبت کا بھی مزہ چکھے۔ مصیبت زدہ کے لیئے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ دوسرے مصیبت زدوں پر نظر کرے مثلاً اگر اُس کو صرف بیوگی کی شکایت ہے تو پائے گی کہ اُس جیسی اور اُس سے بدتر لاکھوں بیوہ عورتیں اَور بھی ہیں شاید یہ ایک مدت خانہ داری کرنے کے بعد بیوہ ہوئی ہے اور ہزارہا اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جنھوں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی پس وہ بیوگی کے علاوہ لاولد بھی ہیں اور شاید اُن کو روٹی کا بھی کہیں سے آسرا نہ ہو پس بیوہ اور لاولد کے علاوہ محتاج بھی تنگھری نذری بھی اور شاید دکھیا بیمار بھی اور شاید اندھی اور لولی اور اپاہج بھی کسی کو اگر کھجلی کی ایذا ہے تو وہ دیکھے گا اپنے ہی جیسے آدمی کوڑھی اور کوڑھ میں کیڑے اور کیڑوں کے ساتھ زخم اور زخموں میں سوزش العیاذ باللہ۔ جس کی آنکھ میں ناخنہ ہے کیا اُس کو اس سے تسلی نہیں ہوتی کہ دوسروں کی آنکھ میں ٹینٹ یا دوسرے کانڑے بلکہ اندھے بھی ہیں۔ غرض دنیا کا حال یہی ہے کہ ایک سے ایک بہتر ہے پس کیوں کوئی مغرور ہو اور ایک سے ایک بدتر ہے تو کس لیئے کوئی ناصبور ہو بیٹھی میں یہ نہیں کہتا کہ تم پر مصیبت نہیں پڑی۔ پڑی مگر اس مصیبت پر جو تمھاری حالت ہے شکر کے قابل ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے تن درست ہو۔ عزۃ آبرو کے ساتھ گھر میں بیٹھی ہو تم نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تم نے دروازے بھیک نہیں مانگی تم نے پیٹ کے واسطے کسی کی خدمت نہیں کی ٹہل نہیں کی گو ماں باپ کو خدا نے اُٹھا لیا مگر ابھی تمھارے غم گسار تمھارے خبر گیر تمھارے سرپرست موجود ہیں اور اُن میں سے ایک میں بھی ہوں کہ باپ جتنی نہیں کروں گا تو اس سے پورا اطمینان رکھو کہ ان شاء اللہ اپنے مقدور بھر تمھارے حال کی اصلاح تمھارے معاملات کی درستی میں کسی طرح کی کوتاہی بھی مجھ سے نہ ہو گی۔ لاؤ اسی شہر سے بلکہ اسی محلے سے بلکہ اسی کوچے سے بلکہ تمھارے پڑوس سے جتنی عورتیں کہو میں بُلا لاتا ہوں جن کو دیکھ کر تم ضرور رحم کرو گی اور سمجھو گی کہ یہ مجھ سے زیادہ دکھیا ہیں ایک حکیم کا قول ہے کہ دنیا میں ہر شخص خوش ہے اس واسطے کہ وہ اپنی حالت کو کسی دوسرے کی حالت کے ساتھ بدلنا نہیں چاہتا جس دن پہلے پہل میں نے یہ بات کتاب میں لکھی دیکھی تو میں ذرا اُس پر ٹھٹکا پھر میں نے سوچا کہ اس کو میں اپنے ہی اوپر کیوں نہ آزماؤں تو میں نے اپنی جان پہچان کے پانچ چھے آدمی تجویز کیئے جن کی حالت کو نظر ظاہر میں اپنی حالت سے بہتر سمجھتا تھا لیکن اچھی طور پر جو غور کیا تو ایک لاولد تھے۔ دوسرے بیٹے تو رکھتے تھے مگر ناہموار تیسرے دائم المرض چوتھے شدت سے کنجوس پانچویں بیوی کی بدمزاجی اور بدسلیقگی اور بدزبانی سے عاجز چھٹے لامذہب غرض کسی کو بے داغ نہ پایا تب اُس حکیم کے مقولے کی تصدیق اور میرے دل کی تشفی ہوئی اور پھر ایک بات اَور بھی سوچنے کے قابل ہے کہ غم کیسا ہی سخت اور صدمہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو رفتہ رفتہ خود بخود اُس کا اثر مضمحل ہوتے ہوتے آخر کار محو ہو جاتا ہے کبھی ہمارے باپ بھی مرے تھے ہم بھی اُن کے فراق میں تمھاری طرح بہتیرا روئے دھوئے غمگین اور اُداس رہے آخر بھول بسر گئے غرض انسان کو چار و ناچار صبر تو کرنا پڑتا ہی کیا کرے دیوار سے سر ٹکرا کر کوئیں میں گر کر افیون کھا کر حرام موت مرے ہی مگر اس کو صبر محمود نہیں کہتے صبر محمود وہی صبر ہے کہ نزول مصیبت کے وقت ہو جب کہ رنج دل کو نچوڑتا اور کلیجے کو کھرچتا ہے۔ آنسو ہیں کہ نکلے چلے آتے ہیں اور سانس ہے کہ پیٹ میں نہیں سماتا وہ بندے کے لیئے سخت آزمایش کا وقت ہے معاذ اللہ اگر خدا کی شان میں

شکایت کا کوئی کلمہ اُس کے مونہ سے نکل گیا یا اُس کے دل میں خدا کی نسبت جلّ وعلا شانہ کی بے رحمی یا بے انصافی کا خیال وسوسے کے طور پر بھی آگیا تو بس دنیا خراب عاقبت برباد خسر الدنیا والاخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین متقی نے جو یہ باتیں عقل کی دین کی نصیحت کی بیان کیں تو بھاجی پر ایسا اثر ہوا کہ گویا گرتی ہوئی دیوار کو تھونی لگا دی ڈوبتے ہوئے کو اچھال کر کنارے پہونچایا مرجھائے ہوئے درخت کو پانی دیا۔

مبتلا کا مرثیہ

مولنا نے محصنات کے آخر میں مبتلا کا ایک مرثیہ بھی تصنیف فرمایا ہے وہ اول سے آخر تک نہایت دردناک اور عبرت انگیز ہے۔ یہاں اُس کے وہ چند بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں مبتلا کی تصویر کے نقش و نگار کھینچے گئے ہیں۔

عبرت کی داستان ہے احوالِ مبتلا
آنکھوں کے آگے پھرتی ہے تمثالِ مبتلا۔
اللہ رے جمال خد و خال مبتلا
اور عنفوانِ عمر سن و سالِ مبتلا

جس وقت وہ شرابِ جوانی سے چور تھا
بے شک شبیہ رو کشِ غلمان و حور تھا

لیکن وہ حالت ایسی سریع الزوال تھی
بس دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال تھی
وہ زلف جو کبھی دلِ عاشق کا جال تھی
خود در دِش مبتلا پہ بلا تھی و بال تھی +

دیکھا تو آخرش خورِشِ کرم گور تھا
جس کے جمال و حُسن کا عالم میں شور تھا

وہ مبتلا جو نازو نعیم میں سپلے کبھی
سانچے میں ہاتھ پانوں تھے جس کے ڈھلے کبھی
خنجر چلیں گر ایک قدم بھی چلے کبھی
تیغ ادا سے کٹتے تھے جس کے گلے کبھی

بس جنتری میں قبر کی سب بَل نکل گئے
رکھتے کے ساتھ لحد کے سانچے میں ڈھل گئے

آفت ہے موت خاصۃً مبتلا کی موت
تکلیف درد و محنت و رنج و عنا کی موت
قہر الٰہی و غضب کبریا کی موت
دشمن کو بھی نصیب نہ ہو اس بلا کی موت

انجام کار جو تری مرضی ہو کیجیو
پر ایسی موت بارِ خدایا نہ دیجیو

تھی اُس پر ابتدا سے مسلط بلائے حُسن
طفلی میں تھا وہ آئینۂ رو نمائے حُسن
مضمر ہر ایک وضع میں اُس کی ادائے حُسن
اِک عالم اس کا شیفتہ وہ مبتلائے حُسن

اول سے شوقِ حُسن جو خاطر نشاں ہوا
خواہانِ روئے خوب ہوا جب جواں ہوا

امن و فراغ و عافیت و راحت و قرار حسنِ معاشرت کہ تمدّن کا ہی مدار	نام و نمود و عزت و توقیر و اعتبار اور جس سے بے نیاز نہیں کوئی خانہ دار

سب چیز جا کے فقر ہوا گھر میں جا گزیں
جس چیز کو مکان میں پوچھو نہیں نہیں

جب مبتلا پڑا ہی گیا وقت احتضار یٰسین پڑھ رہے تھے کھڑے پاس غم گسار	سوتہ میں جو انے پانی لگی چشم اشکبار اور دونوں آنکھیں ضعف نے دیں ڈبڈبا کے بار

یوں بے کسانہ ہائے جوانی میں جان دے
جنت میں اُس کو بارِ الٰہا مکان دے

جو لوگ ہیں سعادتِ عظمٰے سے بہرہ مند پرواز کو خیال کے رکھو ذرا بلند	کرتے ہیں بات بات سے وہ اکتساب پند مت ہو لذائذِ حیوانی کے پائے بند

میری سنو اگر نہیں سمع قبول کر
دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر +

ایامیٰ یہ کتاب (۱۹۰) صفحات کی ہی جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت ایک دلچسپ قصے کے پیرایے میں بیان کی گئی ہی۔ نصِ قرآنی وانکحوا الایامیٰ منکم کی طرف خاص کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہی۔ لوح پر یہ موزوں شعر درج ہی۔

برادرانِ بے حجابات ناہنجار شیوہ ہی ۔ بڑی خوف و خطر کی جائے ہی جس گھر میں بیوہ ہی

مذہبًا مسلمانوں میں بیوہ کے نکاح کر دینے کا صاف و صریح حکم ہی اور ملکِ عرب میں اب تک اِس بات میں بہت آزادی سے کام لیا جاتا ہی۔ اور ذرا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اہلِ ہنود کی دیکھا دیکھی یہ بُری رسم اختیار کرلی ہی اور بیوہ کا نکاح کرنا اپنی ذلت اور خاندان کی بدنامی کا باعث سمجھتے ہیں۔ ہندو تو اپنی پُرانی رسموں کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں اُن کے قومی ریفارمر ازدواج بیوگان پر بڑا زور دے رہے ہیں۔ جا بجا مجلسیں قائم ہیں سربرآوردہ اور معزز لوگ بیواؤں کے نکاح برابر کرتے چلے جاتے ہیں مگر مسلمان لکیر کے فقیر ایسے کچھ پاگل ہیں کہ ذرا نہیں اُبھرتے۔ معمولی لوگوں میں تو بیوہ کا نکاح کر بھی دیتے ہیں اور نہ کریں تو بیوہ کو گھٹنے سے لگا کر روٹی کپڑا کون دے اُن کو اپنی ہی جان دوبھر ہی چہ جائیکہ جان جوان لڑکی کو یوں بٹھا رکھیں لیکن وائے برحال بڑے لوگوں کے کہ اُن کا خیال اب تک یہی ہی کہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا ازدواج مکرر سے ذات برادری میں ناک کٹ جاتی ہی۔ مولٰنا حالی کی مناجاتِ بیوہ کے پڑھنے کے بعد وہ کون سا دل ہوگا جو بیواؤں کے حال زار پر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے گا۔ مولانا نے بھی اِس ناول میں ضرورتِ عقدِ بیوگان کو ایک دلچسپ ناول کے پیرایے میں بہت عمدگی سے بیان فرمایا ہی۔ دیباچۃ الکتاب میں مولٰنا حسبِ ذیل تمہید تحریر فرماتے ہیں۔

شہر اور محلے اور خاندان کا کیا ذکر ہو گھر بھی کوئی ایسا اکا دکا ہو گا جس میں بوڑھی یا ادھیڑ یا (افسوس) جوان یا (ہائے ہائے) لڑکی بیوہ نہ ہو۔ اور جب بیاہ سے مرد اور عورت جیتے جی کا تعلق کرتے ہیں تو ہر ایک بیاہ کا ضروری اور لازمی نتیجہ ہو کہ آخر کار مرد رنڈوا ہو یا عورت رانڈ۔ بیاہ سے مرد اور عورت نے ساری عمر ساتھ رہنے کا قول و قرار کیا ہو نہ ساتھ مرنے کا۔ بے شک مردم شماری سے ثابت ہوا ہو کہ جنگلی اور وحشی قومیں چھوڑ کر ہر جگہ عورتوں کا مجموعہ مردوں سے کچھ یوں ہی سا بڑھا ہوا رہتا ہو۔ مگر نہ اتنا کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو رانڈیں ہی رانڈیں نظر پڑیں۔ ہو نہ ہو رانڈوں کی یہ کثرت کچھ تو اس وجہ سے ہو کہ ہر بی بی اوّل تو اکثر عمر میں تھوڑی یا بہت اپنے میاں سے چھوٹی ہوتی ہو۔ مرد کی مدت حیات پہلے ہو چکی عورت بیوہ ہو کر رہ گئی۔ لیکن ایک بڑا سبب اور ہو کہ مرد تجرّد کی مصیبتوں کے برداشت کرنے میں عورتوں سے زیادہ بودے ہیں۔ مرنے والی کا کفن تک میلا ہونے نہیں پاتا کہ ان کا ایمان ڈانواڈول ہونے لگتا ہو۔ اور نہ کیوں ہو۔ مرنے کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔ ؏ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ زندگی کے دن تو کسی نہ کسی طرح بسر کرنے ہی پڑیں گے۔ جان پر عذاب ڈالیں کیوں اور زیست تلخ کریں کس لیے۔ وہ تو کچھ عورتوں ہی کے جگرے ہیں اور جگرے بھی کیا خاک ہیں یوں کہو پرلے درجے کی بدقسمتی ہو کہ بیوگی کی مصیبت مند زندگی جھیلتی ہیں۔ کہتے ہیں قیامت نفسی نفسی کا دن ہو گا کہ کسی کو دوسرے کے دکھ درد کی ذری پروا نہ ہو گی۔ لیکن ہمارے دیکھنے میں تو بیوہ عورتوں کے لیے اب بھی قیامت ہی ہو۔ مونھ سے کہنے کو تو ہر کوئی کہے گا کہ بیوگی بڑی آفت ہو۔ لیکن مونھ سے کہنے کی سند کیا ہو۔ ہم تو بڑی آفت کے اس وقت قائل ہوں جب لوگوں کو آفت رسیدہ کے لیے کوئی تدبیر کرتے ہوئے دیکھیں۔ یہ کہنا کہ کچھ آفت نہیں اور یہ کہنا کہ آفت تو ہو مگر ہم اس کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرنی چاہتے دونوں کا مآل واحد ہو۔ بیوگی اگر آفت ہو تو عجیب طرح کی آفت ہو کہ جس کو دیکھو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہو۔ یہاں تک کہ جو خود مبتلائے آفت ہو رونا بھی ہو پیٹنا بھی ہو۔ رنج کے مارے اندر ہی اندر بڑا گھٹتا بھی ہو مگر چاہے کہ بند غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ فکر کرے بس اس کا کہیں پتہ نہیں۔ ہم نے بھی سیکڑوں ہی بیوؤں کو دیکھا اور بقدر تعلق بعض کی بیکسی پر افسوس بھی کبھی نہیں آیا مگر خدا گواہ ہو وکفی باللہ شہیدا جب تک آزادی بیگم کا حال نہیں سنا ہم نے نہیں جانا کہ بیوہ عورت کے دل پر یہ کچھ صدمہ گذر جاتا ہو۔ شاید خدا کو بیوؤں کے حق میں کچھ بہتری کرنی تھی کہ آزادی بیگم نے مرتے دم بیوگی کی تلخیوں کا زہر اگلا۔ اگر کہیں خدا نخواستہ آزادی بیگم بھی دل میں سیکڑوں ہزاروں حسرتیں اور سودہ میں گنجینیاں بھرے ہوئے دنیا سے ناشاد و نامراد اٹھ گئی ہوتی جیسے لاکھوں کروڑوں خدا کی بندیاں اٹھ گئیں نہ اپنی کہی نہ دوسرے کی سنی تو وہی بیوگی ہوتی وہی جی ہی جی میں گھٹنا ہوتا۔

گر ہوئی صبح دل زار پر آفت آئی   رات آئی تو یہ جانا کہ قیامت آئی

وہی رسمی تعزیت وہی جھوٹی ہمدردی۔ آزادی بیگم کے اس احسان کو کون منکر سکتا ہو مگر وہ بھی خدا اس کی مغفرت کرے اتنی کر ہی گئی کہ کہنے کو تو اس نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی لیکن کر کے کچھ نہ دکھایا۔ اگر خدا اس کو ہمت دیتا اور تراپن بیوگی میں جیسے جیسے خیال اس کے دل میں آتے تھے سب نہیں تو دو چار پر بھی عمل کر گزرتی تو دنیا اچھی طرح

آنکھیں کھول کر دیکھ لیتی کہ بیوہ کے بیٹھے بٹھانے کے کیسے زبون نتیجے ہیں تو وہ بیوہ کے حق میں اُس کے عزیزوں کے حق میں خاندان کے حق میں قوم کے حق میں اور ملک کے حق میں۔

آزادی بیگم کچھ انوکھی بیوہ نہ تھی مگر اُس کو اتفاق سے ایسے ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے وہ اپنی ذات سے انوکھی عورت ضرور تھی۔

تمام کتاب درد انگیز مضامین سے لبریز ہے نمونۃً ہم فصل آخر کو یہاں درج کرتے ہیں جو ساری کتاب کا لبّ لباب ہے۔ آزادی بیگم جو اس کتاب کی ہیروائن ہے اُس نے اپنے مرض الموت میں کہا کہ دنیا میں مجھ کو ایسی کون سی آسائش تھی کہ میں مرنے سے گھبراؤں۔ بلا سے ایک دفعہ مر کر ہر وقت کی ان تکلیفوں سے چھوٹ جاؤں گی۔ رہا وہاں کا فکر تو نہ مہلت ہے نہ طاقت۔ چلتے چلتے بیووں کے بارے میں دو دو باتیں لوگوں سے کہہ لوں شاید خدا قبول کرے اُس کی ذرّہ نوازی سے کچھ بعید نہیں۔ یہ دل میں سوچ ایک دن ٹھیرا پڑوسیوں اور نزدیک کے رشتہ داروں اور جان پہچان والوں میں مردانہ بلاوا بھیج دیا کہ میری علالت کا حال تو آپ کو معلوم ہے اب بہ اسباب ظاہر مجھ کو اپنی طرف سے بالکل ناامیدی ہو گئی ہے اور میں نہیں جانتی کہ کس دن اور کس وقت میرا دم نکل جائے۔ مجھ کو بڑی تمنا ہے کہ ایک بار اس زندگی میں اپنے پیاروں کو آ کر دیکھ لوں اور میں آپ سب صاحبوں کے دنیاوی اور دینی فائدے کے لیے ایک وصیت بھی کرنے والی ہوں اور اسی غرض سے میں نے سب کو ایک ساتھ بلایا ہے مہربانی فرما کر ضرور ضرور تکلیف کرنا ایسا نہ ہو کہ یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہے اور میں رخصت ہو جاؤں۔

جس دن وصیت سننے کے لیے لوگ جمع ہوئے محلے کی مسجد میں نماز کے وقت لوگوں کی یہ کثرت تھی کہ رمضان کے الوداعی جمعے میں بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اچھا معتدل موسم تھا نہ بہت گرمی نہ بہت سردی دن کے آٹھ بجتے بجتے مکان مردانہ ہو گیا اور سب لوگ آ بھرے ایک درے کے آگے چلمن پڑی تھی اُس کے اندر آزادی بیگم تھی اور اُس کے گرداگرد چند عورتیں اور باقی تمام مکان میں مرد ہی مرد پٹے پڑے تھے۔ جب لوگ ٹھکانے سے بیٹھ لیے تو اندر ایک درے میں سے آزادی نے خوب کڑاکے کی آواز سے پکار کر کہا۔

آزادی بیگم کی آخری وصیت اور خاتمہ

بزرگوار بھائیو! عزیزو! السلام علیکم۔ ہندوستان میں اور ہندوستان میں نہیں تو اس شہر میں شاید یہ پہلا اتفاق ہے کہ ایک پردہ نشین عورۃ مردوں سے خطاب کر رہی ہے جن میں بعض اجنبی بھی ہیں۔ عورۃ کسی قوم کسی مذہب کسی ملک کسی عمر اور کسی حالۃ کی کیوں نہ ہو۔ تھوڑا بہت حجاب اُس کی طبیعت میں ضرور ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پردہ از روئے پیدائش عورۃ کے مزاج کے موافق ہے۔ روئے زمین پر صرف مسلمانوں کی ایک قوم ہے جن کے مذہب میں پردے کا حکم ہے تو دوسرے مذہب والے خاص کر عیسائی اس پر بڑے بڑے مُنہ نہ آتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل اُن کی ہٹ دھرمی ہے۔ وہ ہماری حالۃ سے اچھی طرح واقف نہیں اور قیاسی باتوں سے ایسے رواج پر اعتراض کرتے ہیں جو اس وقت تک یقیناً نہایت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ میں انگریزوں کے خانگی حالات سے بالکل ناواقف ہوں مگر جہاں تک کتابوں

اور اخباروں سے معلوم ہوا ہے بے پردگی کے بُرے نتیجے اُن کو بھی جھیلنے پڑتے ہیں۔ لیکن آزادی اور خودسری جو ملکی
رواج کی رُو سے عورتوں کو حاصل ہے چھیننا تو درکنار، اس کا روکنا اور گھٹانا بھی دشوار بلکہ محال ہے۔ مسلمانوں میں بھی چھوٹتے
ہی پردے کا رواج نہیں ہوا۔ بلکہ مدّتوں سب کی بہو بیٹیاں دستورِ قدیم کے مطابق باہر نکلتی اور پھرتی چلتی رہیں یہاں
تک کہ اسلام کی تعلیم سے لوگوں کے سینے خوفِ خدا اور پرہیزگاری اور نیکوکاری سے معمور ہو گئے اور خود اُن ہی کو
بے پردگی سے نفرت پیدا ہوئی اور اُنھوں نے آزادی کو اپنے حق میں زبون اور خطرناک سمجھ کر اپنے تئیں پردے کا پابند کرنا چاہا جب
پردے کا حکم نازل ہوا تو بہت دنوں تک اس میں ایسی آسانی رہی کہ عورتیں مسجدوں میں شریکِ جماعت ہوتیں۔ لڑائیوں
میں جاتیں۔ اور مجاہدین کی جو خدمت بن پڑتی بجا لاتیں۔ جوں جوں پیغمبر صاحب صلعم کا عہدِ بابرکت دُور پڑتا گیا دلوں
کی صفائی خیالات کی پاکیزگی کم ہوتی گئی پردے میں بضرورت تشدّد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اب جو پردے کا رنگ
ہے آپ سب صاحب اُس کو دیکھتے ہیں یہ پردہ قدرِ مشروع سے بہت زیادہ مگر ضرورۃً اور مصلحتِ وقت سے اب بھی کم ہے۔
باوجودیکہ میں بڑی سختی کے ساتھ پردے کی طرف دار ہوں لیکن ایسا ہی قوی سبب آ کر پڑا ہے کہ میں نے اپنی آواز
مردوں کو سنانے پر جُرأت کی۔ اور میری ساری عمر میں یہ پہلا اور خدا نے چاہا آخری اتّفاق ہے کہ میں نے شرعی پردے
کے نہیں بلکہ رواجی پردے کے خلاف کیا ہے۔ رسولِ خدا صلعم کی صاحبزادی حضرۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مہاجرین اور انصار
کو مخاطب کر کے تا بدیر بڑی لمبی تقریر کی اور وہ تقریر ایک خطبے کے پیرائے میں اس وقت تک کتابوں میں لکھی ہوئی موجود
ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ سے لوگ بکثرت مسئلے پوچھنے آتے اور آپ پردے میں سے جواب دیتیں۔ غرض میں
جو یہ گفتگو کر رہی ہوں اس کے جوازِ شرعی کی سندیں بھی رکھتی ہوں۔ علاوہ اس کے میں خود حیران ہوں کہ مجھ میں
اس وقت کہاں کا زور آ گیا ہے۔ کئی برس بعد میری اتنی آواز نکلی ہے ورنہ میری حالت دیکھو تو ناتوانی اور لاغری حدّ
سے بڑھ گئی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں اور انکار کی گنجائش بھی نہیں کہ کسی وقت اور کسی حالت میں زندگی کا بھروسا
نہیں۔ لیکن انکار نہ کرنا اور نہ کر سکنا اَور چیز ہے اور اعمال سے افعال سے ثابت کر دکھانا کہ جیسا ہم مُونہ سے کہتے ہیں واقعی دل
میں بھی ایسا ہی یقینِ واثق رکھتے ہیں بالکل دوسری چیز اور ان دونوں میں بڑا اور بہت بڑا فرق ہے۔ اب چند روز کی میں
کہتی نہیں۔ مگر اس سے پہلے اپنے سے بڑوں کو اپنے دائیں داروں کو اپنے سے چھوٹوں کو بعض کو مدّتوں بیمار رہ کر
اور بعض کو مفاجاۃً مرتے دیکھا اور سُنا ایک دو کو نہیں سیکڑوں کو۔ میں خود دو یا تین بار ایسی ایسی بیمار پڑی کہ مرنے میں کسی طرح
کی کچھ کسر باقی نہیں رہی تھی مگر اس سے پہلے میں کبھی ایک لمحہ کے لیے اپنی زندگی کی طرف سے نامطمئن نہیں ہوئی۔ گویا میرا
خیال یہ تھا کہ میں موت کے حکمِ عام سے مستثنیٰ ہوں یا جیسے خدا نے مجھ کو زبان دی ہے کہ میں سو سوا سو برس کی عمر سے
اِدھر نہیں مروں۔ سوائے خدا کے کسی کو دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں۔ لیکن جہاں تک لوگوں کے برتاؤ سے
سمجھا جا سکتا ہے میں خیال کرتی ہوں کہ تمام آدمی اِلّا ماشاء اللہ ویسی ہی غفلت میں مبتلا ہیں جیسی غفلت میں میں نے اپنی
ساری عمر برباد کی ہے۔ اس وقت نہیں تو کسی دوسرے وقت فرصت سے اپنی جگہ جا کر سوچنا کہ اگر دنیا کے لوگ زندگی پر
وتنا ہی اعتماد کریں جتنا کہ عقل کی رُو سے ہونا چاہیے یعنی رات کو سوئیں اور دل میں یہ خیال ہو کہ دیکھیے جاگنا بھی نصیب

ہوتا ہی یا نہیں۔ صبح کو اُٹھیں اور یہ تصور پیش نظر ہو کہ خدا جانے شام بھی پکڑتے ہیں یا نہیں۔ تو آپ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ دنیا کا یہ رنگ نہیں رہ سکتا۔ کیوں کوئی پکی عمارتیں بنوائے گا۔ کس لیئے کوئی باغ لگائے گا۔ کاہے کو آیندہ کے لیئے کوئی کسی طرح کا انتظام کرے گا۔ توقع نفط ہوگا بے معنی اُمید خیال ہوگا باطل ۵

نسیم غفلت کی چل رہی ہو اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہو

افسوس ہو کہ مجھ کو اپنی غلطی پر وقوف اور غفلت سے تنبّہ ایسے وقت ہوا کہ جبر نقصان میرے اختیار سے خارج اور تلافیِ مافات میری قدرت سے باہر ہو۔ امتدادِ مرض نے میرے جسم کو اور اذعانِ موت نے میرے خیالات کو اس قدر بدل دیا ہو کہ گویا میرا دوسرا جنم ہو۔ جس خیال کو میں ذہن میں جمانا چاہتی تھی اور نہیں جمتا تھا اب وہی خیال ہو کہ کسی وقت دل سے نہیں نکلتا جو باتیں ساری عمر مشتبہ اور مشکل رہیں اب روزِ روشن کی طرح صاف اور بدیہی نظر آتی ہیں۔ جن کو نہ دلیل کی حاجت نہ ثبوت کی ضرورۃ قرآن کی ایک آیۃ کو میں اپنی اس حالۃ سے بہت ہی مطابق پاتی ہوں۔ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ اگر میرے پہلے کے سے یا یوں کیوں نہ کہوں کہ ساری عمر کے سے خیالات ہوتے تو مجھ کو آپ صاحبوں کے ساتھ بات کرنی بھی دشوار ہوتی نہ کہ ایسی بات جس کے لیئے ڈھیر سارا علم درکار ہو۔ لیکن اس خیال نے کہ مجھ کو دنیا میں رہنا نہیں میرے دل کو قوی میری طبیعت کو مضبوط اور میری ہمت کو دلیر کر دیا ہو۔ یہی نا کہ لوگ مجھ کو شوخ اور بے باک کہیں گے لیکن ایک دن ہوگا کہ نہ طعن کرنے والے ہوں گے (اور یہ شاید کسی قدر دیر میں ہو) اور نہ وہ ہوگی جس پر طعن کرتے ہیں (اور یہ بہت جلد ہونے والا ہو) تھوڑی دیر بعد میں آپ صاحبوں سے اُس قسم کی باتیں کہوں گی جن کو سُن کر آپ اس سے بھی زیادہ اچنبھا کریں گے۔ خیر تو جو آیۃ میں نے ابھی پڑھی تھی اس میں روزِ قیامت کا حال ہو کہ خداوند عالم کے روبرو ہر متنفّس اس شان سے حاضر کیا جائے گا کہ ایک تو اُس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا۔ جیسے دنیا میں فوجداری مجرم کے ساتھ سرکاری سپاہی لگا رہتا ہو۔ جو اُس کو کشاں کشاں حاکم کے حضور میں لیئے جا رہا ہو اور ایک گواہ ہوگا جو حجّۃ تمام کرنے کے لیئے اُس کے خلاف پر گواہی دے گا۔ غرض ہر شخص مجرموں کی شکل و صورۃ میں اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ تو خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس حال سے غافل تھا یعنی زندگی میں کچھ خبر نہ لی کہ مجھ کو جوابدہی کے لیئے خدا کے حضور میں جانا ہو اور وہاں سپاہی ہوں گے جن کی پکڑ سے بھاگ نہ سکوں گا اور گواہ ہوں گے جن کو جھٹلا نہ سکوں گا تو تیری آنکھ پر جو پردۂ غفلت پڑا ہوا تھا آج وہ پردہ ہم نے اُٹھا دیا اب تیری نظر اس قدر تیز ہو کہ تمام چیزیں جن کی نسبت تجھ کو شبہہ تھا اب تجکو صاف بچشم سر دکھائی دے رہی ہیں۔ قریب قریب یہی حالت میری ہو۔ میرے والدین کے مذہبی خیالات ایک دوسرے سے اس قدر مخالف تھے کہ دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ مجھ کو ایسی چھوٹی سی عمر سے مذہبی باتوں میں غور کرنے کی ضرورت واقع ہوئی جب کہ میرے ساتھ کی لڑکیوں کو گڑیوں کے سوائے اَور کسی چیز کا خیال نہ تھا۔ باتوں میں تو ہمیشہ ابّا جان دبا لیتے تھے مگر امّاں جان اپنے عقیدے کی ایسی پکّی تھیں کہ بند ہو ہو جاتیں مگر اپنی بات پر جمی رہتیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر اُن

ے اس کا ترجمہ آگے چل کر اسی صفحے میں موجود ہو ۱۲

کے دل میں کچھ شبہہ آگیا نانا ابا پاس گئیں اور کہہ سن کر صاف کر لیا۔ مجھکو مشکل تھی۔ بچپن کی عمر کھیل کود کے دن۔ مذہبی خیالات اور اُن میں بھی اختلاف۔ فیصلہ کرنے کی لیاقت نہیں۔ اناڑی تولنے والے کی تراز و کبھی ادھر کا پلڑا جھک جاتا ہے کبھی اُدھر کا۔ ماں پر نظر کی تو نماز ہے اور روزہ ہے اور تلاوت قرآن ہے اور وعظوں میں جانے کا شوق ہے۔ باپ کی باتوں کا خیال آگیا تو کہاں کی نماز اور کس کا روزہ۔ ہفتوں خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا۔ لیکن میں اتنی بات ضرور کہوں گی کہ ماں کا اثر مجھ پر غالب تھا۔ نماز گنڈے دار پڑھی ہے۔ قضا بھی بہت کی ہے مگر کوئی پورا مہینا نماز سے خالی گزرنے نہیں دیا۔ روزے کھائے بھی اور بے دلی سے رکھے بھی لیکن ایسا نہیں ہوا کہ سارا رمضان سوکھا ٹرخا دیا ہو۔ لیکن اب جو سمجھ آئی (اور آئی بھی تو کب یہی پندرہ بیس دن سے) تو معلوم ہوا کہ ساری عمر کبھی کوئی عبادت اُس خلوص کے ساتھ کرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا جو شرط قبولیت ہے۔ تو ایسی عبادت کی نہ کی برابر۔ اور خلوص ہوتا تو کہاں سے۔ یہاں تو سرے سے دین بھی ماں اور ننھیال والوں کی نقل تھی وہ بھی باپ کی اصلاح دی ہوئی۔ عمر کا اکثر حصہ اس طرح پر گزرا کہ تہِ دل سے کبھی خدا کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور جب خدا سے نہیں چھپا تو بندوں سے چھپا کر کیا ہوگا۔ کتنے کتنے دنوں میں اس میں حیران رہی کہ خدا حقیقت میں کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ اور ہے تو ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اُس نے ہم کو بے درخواست پیدا کیا۔ طرح طرح کی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دیں۔ زندگی کے دن تیر کرنے کے سوائے ہم سے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ اس پر عبادت کی مشقّت۔ مذہب کی پابندی۔ مرنا۔ اور مرنے کے بعد جوابدہی۔ اس کے یہ معنے کہ ہم کو پیدا کر کے بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں لا ڈالا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اور کیسا رحم۔ دنیا میں بھلے بُرے دین دار بے دین سبھی طرح کے لوگ ہیں کسی میں کسی طرح کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی جس سے خدا کی رضامندی اور نارضامندی کا پتہ چل سکے کتنے سارے مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا دوسرے کو گمراہ بتاتا ہے مگر کوئی ایک مذہب کسی ایک بات کا نشان نہیں دے سکتا کہ دنیا میں یہ ترجیح اُسی کو ہے دوسرے کو نہیں۔ جس کو دیکھو عاقبت کا حوالہ۔ یہ معمّا آج تک حل ہوا اور نہ قیامت تک حل ہونے کی امید۔ واقع میں مجھ کو بڑی ہی پریشانی ہوتی تھی۔ جب یہ خیال آتا تھا کہ اس ملک میں ہم مسلمان دوسرے مذہب والوں کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے آٹے میں نمک تو کیا اتنے سارے آدمیوں کو خدا نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ آخر کار ان کو جہنم میں جھونک دے۔ میں کتنی ہندنیوں کو جانتی ہوں اور دو تین میموں سے بھی میری ملاقات ہے اور عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ دوسرے مذہب والوں میں بھی نیکی خداشناسی خداترسی اور خداپرستی ہے اور اگر وہ مسلمان نہیں ہیں تو ناحق کی ضد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس سبب سے کہ ان کو مذہب اسلام کا حال معلوم نہیں یا جس مذہب میں وہ ہیں سچے دل سے اُسی کی حقانیت کے معتقد ہیں اور اُن کے دل اُسی مذہب سے تسلی پاتے ہیں کس قدر مشکل ہے ایسے لوگوں کی نسبت یہ حکم لگا دینا کہ اُن کی نجات نہیں۔ الغرض مذہب کی نسبت میرے کچھ اس قسم کے واہی خیالات تھے پریشان ڈانواڈول۔ کسی کسی وقت میری طبیعت اُلجھتی بھی تھی مگر دین کی کچھ ایسی دھن تو تھی نہیں طبیعت پر ذرا بوجھ پڑا اور اس خیال کو الگ کیا دوسرے کام میں لگ گئی۔ اب مجھ کو دو طرح کا افسوس ہے ایک تو غافل اور بے دین اور جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے کا اور دوسرے ایسی لغو ولاطائل زندگی پر افسوس نہ کرنے کا۔

جب مجھ کو اس کا پورا یقین ہو گیا کہ میں اس بیماری سے جاں بر نہیں ہو سکتی تو خود بخود میری سمجھ کچھ دوسری طرح کی
ہو گئی ہے۔ اب مجھ کو ہر طرف خدا ہی خدا دکھائی دے رہا ہے اور میں کہتی ہوں کہ جب زندگی کا انجام موت ہے تو آدمی
کی گو وہ روئے زمین کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو کچھ بھی حقیقت نہیں۔ سانس نکلنے کی دیر ہے اور پھر تو مٹی کا ڈھیر ہے لیکن یقین
یقین میں بڑا فرق ہے مجھ کو بھی ہمیشہ مرنے کا یقین تھا اور سبھی کو ہوتا ہے لیکن وہ یقین اور طرح کا تھا اور یہ یقین اور طرح کا ہے۔ وہ
نقل یہ اصل۔ وہ مجاز یہ حقیقت۔ کسی بزرگ کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر میں ایک قبر کھود رکھی تھی اور اپنے
اوپر لازم کر لیا تھا کہ ہر روز تھوڑی دیر کے لیے ضرور اس میں جا کر لیٹتے تاکہ موت کی یادگار تازی ہوتی رہے میں نے قبر تو نہیں
کھودی لیکن یہ پورا یقین ہے کہ جس چارپائی پر پڑی ہوں اب اس سے قبر ہی میں جانے کے لیے اتاری جاؤں گی غرض موت
کے اس درجے کے یقین نے میرے سارے شکوک رفع کر دیئے۔ اب مجھ پر اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ میں نہایت عاجز اور ذلیل
مخلوق ہوں۔ اپنی حقیقت کا پہچاننا تھا کہ خدا نظر آنے لگا ساری عمر مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ سنتے اور کتابوں
میں پڑھتے گزر گئی۔ مگر اس کے معنی اب سمجھ میں آئے کہ اپنے تئیں پہچاننے سے خدا یوں پہچانا جاتا ہے پھر میں نے خدا کی عظمت
اور اس کے جلال پر نظر کی تو میری ایسی سٹی بھولی کہ اپنی ہستی کو ہستی کہتے ہوئے شرم آنے لگی۔ اس خیال نے مجھ کو بڑی
راحت پہنچائی۔ کیوں کہ میں ایسے افکار میں مبتلا رہتی تھی جن میں اپنی چھوٹی سی عقل کو دخل دینا بڑے درجے کی بیہودگی
اور گستاخی تھی۔ ادھر خدا کو پہچانا اور ادھر اپنے تئیں۔ تو دیکھا اس کے مجھ پر اس قدر احسانات ہیں جن کی کوئی حد و انتہا
نہیں۔ تو میں نے سوچا کہ ایسے محسن کے احسانات کا معاوضہ نہ کرنا خلاف شیوۂ انسانیت ہے لیکن اس کی ذات تو ہے بے
نیاز یہاں تک کہ اس کو ہماری شکرگزاری اور احسان مندی کی بھی پروا نہیں تو ہو نہ ہو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ
جہاں تک ہو سکے سلوک کرنا ہی اس کا شکر ہے اور یہی اس کی مہربانیوں کا معاوضہ ہے کیوں کہ ہم اس کا برتاو بندوں کے
ساتھ دیکھتے ہیں سب کی پرداخت۔ کل کی پرورش۔ تو اگر ہم اس کے بندوں کے ساتھ لطف و مراعاۃ سے پیش آئیں
تو یہ ضرور اس کی خوشنودی اور رضامندی کا موجب ہو گا۔ لیکن افسوس ہزار افسوس مجھ کو یہ باتیں کب آکر سوجھیں
جب کہ مجھ کو دنیا میں رہنے کی مہلت نہیں۔ اور دن دو دن یا شاید دو پہر یا شاید گھڑی دو گھڑی کی مہلت ہے بھی تو بیماری
سے چین نہیں قرار نہیں۔ مگر پھر بھی جب تک دم میں دم ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔ آخر ایک بات سمجھ میں آئی جس کے لیے
میں نے آپ صاحبوں کو تکلیف دی اور وہ بیوہ عورتوں کی حالت پر نظر کرنا ہے۔ آپ اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے
کہ جو کچھ میں بیوہ عورتوں کے بارے میں کہوں وہ بہت زیادہ قابلِ اعتبار ہو گا بہ نسبت اس کے جو آپ اپنے دل میں
خیال کر رہے ہیں کیوں کہ اول تو میں عورت ہوں اور کوئی مرد گو وہ کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو عورت کے حال سے اس قدر
واقف نہیں ہو سکتا جس قدر ہم جنس ہونے کی وجہ سے میں۔ دوسرے میں بیوگی کی تلخی بخوبی چکھ چکی اور اس کی مصیبت
اچھی طرح جھیل چکی ہوں۔ تیسرے جب میں مرنے کے لیے تیار اور گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں تو جو کچھ کہوں گی
اس میں میری کسی ذاتی غرض کا شمول ہو نہیں سکتا۔ اب میرا وہ وقت آ لگا ہے کہ مجھ کو تمام دنیاوی اغراض سے بالکل قطع
نظر ہے۔ وہ جسم جس کو میں ماں کے پیٹ سے ساتھ لائی تھی اور جس نے ساری عمر میرا ساتھ دیا اسی سے میرا تعلق ٹوٹنے

والا ہی تو دوسرے تعلّقات کیا باقی رہ سکتے ہیں۔ اور اسی خیال نے تو مجکو جراءۃ بھی دلائی کہ لوگوں کو جمع کروں اور اُن کو
بیواؤں کی مصیبتہ سُناؤں ورنہ کتنی خدا کی بندیاں جی ہی جی میں گُھٹ گُھٹ کر اور گُھل گُھل کر دنیا کے پردے سے اُٹھ گئیں
اور کسی نے نہ جانا کہ بیوگی نے اُن کو کیسا کیسا ستایا اور کتنا کتنا رُلایا۔ میں خوب سمجھ چکی ہوں کہ جو میں کر رہی ہوں آج تک
کسی عورت نے نہیں کیا۔ مدتوں اس انوکھی بات کے چرچے رہیں گے۔ لوگ طرح طرح کی بدگمانیاں کریں گے۔ مجکو
کوسیں گے۔ بُرا کہیں گے لیکن میں ایسی جگہ جا رہی ہوں کہ یہاں کی آوازیں وہاں پہنچ نہیں سکتیں۔ میرا معاملہ تو خدا سے
پڑنے والا ہی۔ اور میں بُری یا بھلی جیسی کچھ ہوں اُسی کو معلوم ہی اور وہ دنیا کی طرح کا جج نہیں کہ میرے اور اسکے مرا اور گواہوں کے بدون
اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ پس میں کیا پروا کر سکتی ہوں کہ لوگ میرے مرے بعد میری نسبت کیا کہتے ہیں۔ آپ صاحبوں
میں سے اکثروں کو میرے حالات معلوم ہیں اور میں اُن کے بیان کرنے کی ضرورۃ نہیں دیکھتی۔ پس میں آپ صاحبوں کو
اپنی بیوگی کی داستان سُنا چلتی ہوں میں یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ میری بیوگی کسی خاص طرح کی بیوگی تھی بے شک میں
جوانی میں بیوہ ہوئی مگر بیوگی کسی حالت اور کسی عمر پر موقوف نہیں بڑھیاں۔ جوانیں۔ لڑکیاں۔ اولاد والیاں۔ بے
اولاد۔ امیر۔ غریب۔ شریف۔ رذیل۔ کہیں رانڈوں کی کمی نہیں بلکہ میری حالۃ تو بہتیری رانڈوں کے مقابلے میں بہت
بہتر ہی۔ میرے ساتھ اولاد کا بکھیڑا نہ تھا کہ اُن کے پالنے کی پرورش کرنے لکھانے پڑھانے شادی بیاہ کا تردد کرنا
پڑتا۔ نواب صاحب نے خدا اُن کو جزائے خیر دے میری تنخواہ باندھ دی تھی جس میں بہ فراغت بسر کر سکتی تھی اور
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی کہ اس دم تک بہ فراغت بسر کی۔ میں نے اکثر عورتوں کو کہتے سنا اور شروع شروع میں میرا بھی ایسا ہی
خیال تھا کہ فکرِ معاش سے خدا نے مجکو سبک دوش کر دیا ہی اگر دوسرے نکاح کا ارادہ کروں تو بڑی بے جا اور بدنما اور
ناروا بات ہی۔ لیکن بہت دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ میری رائے بالکل بدل گئی اور میں نے سمجھا کہ اگر تعلّقِ مناکحۃ
کی غرض وغایۃ یہی ہی کہ مرد کمائے اور عورت پہنے اور کھائے تو اس تعلّق میں کچھ بھی مزہ داری نہیں اور نہ یہ تعلّق
کچھ بڑی قدر کی چیز ہی۔ اور ایسا ہوتا تو امیر اپنی بیٹیوں کے بیاہنے کا نام ہی نہ لیتے۔ بلکہ اصلی غرض اس تعلّق سے
مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی صحبت سے متمتّع ہونا ہی اور باقی تمام برکتیں جو خانہ داری سے پیدا ہوتیں اور فائدے
جو ایک دوسرے سے پہنچتے سب فروع ہیں۔ اسی راحت رساں اور مسرت بخش اور تسکین دہ محبّۃ کی۔ آدمی کی رائے کا
بھی کچھ ٹھکانا نہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہی کہ آغازِ بیوگی میں بلکہ بیوگی کے کئی برس بعد تک میرا یہ حال تھا کہ سو نہ چھوڑ کر کہنے
کی تو کس نے مجال پائی تھی اگر کوئی اشارۃً کنایۃً بھی دوسرے نکاح کا نام لیتا تو میں ضرور پکڑ کر اُس کا مُونہ نوچ لیتی۔
اور کبھی مجکو آپ سے بھی خیال آگیا ہی تو میں نے اس کو وسوسہ شیطانی سمجھ کر ادھر آیا اُدھر ٹالا۔ یاد ہی میں ہوں کہ
اب ایسی حالت میں بھی جانتی ہوں کہ بے فائدہ اور لاحاصل محض ہی اور ہو بھی نہیں سکتا مگر میری دلی آرزو یہی ہی
کہ کسی کی نکاحی ہو کر مروں۔ اور میرا حشر بھی نکاحیوں میں ہو۔ ایک حساب سے تو مجھ کو تمام زمانہ بیوگی میں نکاح سے
انکار ہی سا رہا۔ اور انکار نہ ہوتا تو میں کر بھی گزرتی۔ اور کرنے پر آتی تو میں کسی کے روکے سے رُکتی بھی کب۔
لیکن دلی انکار جس کو سچا انکار کہنا چاہیئے وہ تو واقع میں عدّۃ تک تھا کہ اُس وقت تک مولوی صاحب مرحوم کی یادگاری

تھی تازہ اور میں اِس کو پرلے درجے کی بے وفائی اور بے مروّتی سمجھی تھی کہ اُن کی اتنے دنوں کی رفاقت کو اِس قدر جلد بُھلا دوں۔ شرع میں جو عدت کا ایک وقت مقرر ہی اُس میں اَور جو کچھ مصلحتیں ہوں سو ہوں لیکن یہ تو میرا ذاتی تجربہ ہی کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد غم میں بڑا ہی فرق پڑ جاتا ہی کہ اگر بہ تکلف رنج کو تازہ رکھا جائے تو گو یا رنج کی عمرِ طبیعی اِسی قدر ہی خیال تو عدّت کے اندر بھی کیوں نہیں آیا مگر عدت پوری ہوئے پیچھے تو میں نے طبیعت پر زیادہ زور دیا کہ اِدھر یا اُدھر اِس بات کا ضرور کچھ نہ کچھ تصفیہ کرنا چاہیئے۔ میں نے سوچنے اور غور کرنے کا کوئی پہلو اُٹھا نہیں رکھا۔ کیا مذہب کیا عقل۔ کیا میری خاص حالت تمام رُو داد نکاح کی مقتضی تھی اور اکیلا رواج مانع۔ سو رواج بھی ویسا شدّ و مدّ کے ساتھ نہیں جیسا ہندوؤں میں ہی بلکہ اِسی قدر کہ بیوہ جو نکاح کر لیتی ہی اُس کی ویسی اور وتنی عزت باقی نہیں رہتی اور لوگ اُس کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور یوں دنیا میں کون ہی جس کو اُس سے بہتر حالت والا حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن نکاح کرنے سے بیوہ عورت حقیر سمجھی جاتی ہی اُس خاص بات میں جو سب سے زیادہ دل دُکھانے والی ہی۔ اور جس کی حفاظت کے لیئے اُس نے نکاح کیا ہی یعنی ناموس۔ میں ہمیشہ رسم و رواج کو بڑی حقارت کے ساتھ دیکھا کرتی اور جی میں کہتی کہ بھلے بُرے کی شناخت کی دو کسوٹیاں ہیں۔ مذہب اور عقل۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو ایک ہی کسوٹی ہی۔ یعنی مذہب۔ کیوں کہ انسان کی عقل کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایک ہی بات کو ایک آدمی اچھّا سمجھتا ہی اور دوسرا بُرا اور اِسی سے تو دنیا میں اختلاف پڑے ہوئے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ معصوم بچّوں کے مار ڈالنے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ حرکت نہ ہوگی لیکن جن لوگوں میں بیٹیوں کے مار ڈالنے کا دستور رہا جیسے ہمارے مُلک کے راجپوت اُن کا یہ مقولہ ہی کہ کنواری لڑکی کو بٹھا رکھنا یا سُسرا کہلانا اور سالا بننا بڑی بے غیرتی کی بات ہی۔ کوئی فعل اِس سے زیادہ تحسین کے قابل ہو نہیں سکتا کہ جائے جان رہے آن۔ یہ تو میں نے مثال کے طور پر ایک بات بیان کی۔ اِسی طرح سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں جن میں لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ بلکہ آدمی آدمی کا اختلاف تو درکنار ایک ہی آدمی ایک بات کو ایک وقت بُرا سمجھتا ہی اور پھر وہی آدمی اُسی بات کو دوسرے وقت اچھا کہنے لگتا ہی۔ اور یہ تو خود مجھ پر گزری ہی اور خیال کر کے دیکھو تو کوئی فردِ بشر اِس تزلزل سے خالی نہیں۔ بچپن کی باتیں جوانی میں بُری معلوم ہوتی ہیں جوانی کی بڑھاپے میں۔ غرض اچھّا وہی جس کو مذہب اچھّا کہے اور بُرا وہی جس کو مذہب بُرا بتلائے تو میں اپنے دل میں کہتی کہ جب آدمی کی عقل کو نیک و بد کی تمیز کا سلیقہ نہیں یہ رسم و رواج کیا چیز ہی اور بڑے احمق ہیں جو اِس کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن جب مجکو خود رسم و رواج سے مقابلہ کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ خدا کی خدائی میں اِس سے زیادہ کوئی زبردست چیز نہیں۔ جب جب نکاح کا خیال آیا تب تب ارادہ ہوا اور جب جب ارادہ ہوا رسم و رواج نے سب منصوبے غلط کر دیئے۔ میں کہتی تھی کہ یہی لوگ مجھ کو دوخصمی کہیں گے۔ برابر کی بیبیاں مجھے نظرِ حقارت سے دیکھیں گی طعنیں ماریں گی۔ مسکرائیں گی۔ اگلی ڈھکی سب بیوی کی صحنک کھائیں گی۔ اور میں بیٹھی مونہ تکوں گی۔ میرے سبب سے میری نسل انگشت نما ہوگی میں نہیں۔ میں اِس بے عزتی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُس سہاگ کو لگے آگ جس کی وجہ سے آبرو پر حرف آئے لوگوں

کے طعنے سنوائے۔ گالیاں کھلوائے۔ پھر کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ یہ کیا عقل کی بات ہے کہ لوگوں کے تاپنے کے لیے اپنے گھر کو جلنے دیا جائے جو خدا اور رسول سے واقف اور دین و ایمان سے خبردار ہیں وہ دل میں جو چاہیں سو سمجھیں مگر منہ سے تو کوئی کھوٹی بات سامنے یا پیٹھ پیچھے نکال نہیں سکتے اور بلکہ دل میں بھی سمجھیں تو ایمان کا ضرر ہے لیکن ایسے آدمی کم ہیں سو میں مشکل سے ایک۔ تو وہ کس شمار میں ہے۔ اور پھر معاملہ تو عورتوں سے پڑنے والا ہے جو عموماً دین سے بے نصیب۔ ایمان سے بے بہرہ۔ ان بیچاریوں کو شاذ و نادر میاں سے ملاپ ہے تو اپنے بناؤ سنگار سے اور بگاڑ ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ تو رات دن کے جھگڑے اور فساد سے خانہ داری کے انتظام بچوں کی پرورش اس کی غیبت اُس کی بدی تیرے میرے حساب سے کب فرصت ملتی ہے کہ دین کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ تو اس طرح کی حضرۃ ہیں کہ حضرۃ مریم بھی اُن کے گھر رو رہ آ جائیں تو ایک بار اُن پر بھی جھٹک کریں پر کریں۔ لیکن نکاح کروں تو ایسوں سے ملوں ہی کیوں مگر ایک دو ہوں تو چھوڑا بھی جا سکتا ہے یہاں تو خدا کے فضل سے آوے کا آوا خراب کنبے کا کنبہ بھونڈا۔ چار و ناچار یہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ان سے مڈبھیڑ تو ہوتی ہی گی۔ اور مڈبھیڑ ہو گی تو یہ کم بختنیں چھیڑیں گی بھی ضرور اور چھیڑیں گی تو دل کو ایذا ہو گی بھی بلاشبہہ ایسے وقت میں مجھ کو کوئی ہوتا سہارا لگا۔ لیے والا ہمت بندھانے والا تو میرے دوسرے نکاح کو بھی اب پندرہ پندرہ بیس بیس برس ہوتے ہوتے۔ مگر عزیزوں نے رشتہ داروں نے اپنے پیاروں نے اور سب طرح پر تو ہمدردی اور غم خواری کی اس کا کسی نے جھوٹوں بھی نام نہ لیا۔ یہ بھی اُسی رواج سے مجبور تھے جس کے میں معذور تھی۔ اور رواج کے علاوہ ان کو اس کا خیال بھی ہوتا تھا کہ اس کی مرضی دوسرا نکاح کرنے کی نہیں ہے اور آخر ہیں تو یہ ہم ہی میں کی یقیناً نہیں ہوگی تو اس کے آگے اس کا مذکور کرنا بھی گویا زخم پر مرچیں لگانا ہے۔ میری والدہ نے یہاں تک تو کیا کہ میری بیوگی کے خیال سے میاں کے جیتے جی دنیاداری سے تائب ہو گئیں اور گویا ایک طور سے انھوں نے اپنے گھر کو بگاڑ لیا۔ نانا نے صبر کی فضیلتوں کے بیان میں ایسے ایسے وعظ سنائے کہ شوہر تو شوہر ہیں آپ مر گئی ہوتی تو اپنا بھی ماتم نہ کرتی۔ غرض ان سب کی شکر گزار ہوں کسی نے میرے ساتھ کمی نہیں کی۔ بے شک ان کو چاہتا تھا کہ دوسرے نکاح کی تحریک کریں ترغیب دلائیں مگر انھوں نے نہیں کیا۔ مجکو چاہتا تھا کہ دوسرے نکاح کا ارادہ ظاہر کروں میں نے نہیں کیا میں نے بہتیری ہی تدبیریں کیں کہ کسی ایسے شغل میں لگ جاؤں کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آنے۔ پورے ایک برس صوم داؤد رکھ دیکھے کیوں کہ میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ روزہ اور روزہ بھی حضرتِ داؤد علیہ السلام کا سا ایک دن بیچ کا نفس کشی کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ مہینوں سر نہ دھویا ہفتوں بالوں میں کنگھی نہ کی۔ کپڑے نہ بدلے۔ اچھا کھانے کی قسم کھائی۔ اچھا پہننے کا عہد کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ کسی چیز کا قصور نہیں خود میری ہستی نکاح کی متقاضی ہے۔ ایک دن عادت کے مطابق میں اس خیال میں ڈوبی ہوئی تھی پڑے پڑے خیال آیا کہ میں ہی اپنی ذات سے اس قدر بے چین رہتی ہوں یا دوسری بیویوں کا بھی یہی حال ہے۔ تم لوگ تعجب کروگے کہ یہ بھی عجیب دُھن کی عورت ہے مگر میں نے اسی غرض سے باون یعنی دو اُوپر پچاس بیوؤں سے ملاقات کی۔ جس میں میرے کئی برس صرف ہوئے عورتیں وہ بھی عورت میں بھی۔ بیوہ وہ بھی بیوہ میں بھی۔ اس پر اُن کے اصلی

اور دلی خیالات دریافت کرنے میں مجھ کو ایسی ایسی مشکلیں پیش آئیں کہ دوسری تیسری کی ہوتی تو الٹی پیچھے رو پڑتی مجھکو جس کا حال دریافت کرنا منظور ہوا پہلے میں نے اُس سے ربط بڑھایا گھل مل کر اُس کو سہیلی بنایا لیکن میں جس چیز کی ٹوہ میں تھی وہ بات ہی ایسے پردے کی تھی کہ ہم جولی ہم جولی سے کہتی شرمائے۔ سہیلی سہیلی سے چھپائے۔ عورتوں کی تو بہتیری باتیں چھپانے کی ہوتی ہیں اور جو پیٹ کی گہری تھیں انھوں نے چھپایا بھی بہت کچھ۔ میں جو پیچھے پڑی تو کسی کسی نے تھوڑی بہت پوچھ ہی کر ہی۔ ہاں نکاح کا ایسا معاملہ تھا کہ اس کا نام زبان پر آیا نہیں اور سننے والی اپنے سے اکھڑا نہیں۔ آخر ہار کر میں نے تو یہ تدبیر کی کہ جو عیب نہ کرنے تھے اور نہیں کیے تھے وہ سب جھوٹ طوفان اپنے اوپر لیے تب کہیں جا کر وہ عورتیں کھلیں اور انھوں نے اپنے دل کے بھید بتائے۔ اس طرح پر لوگوں کے حالات کی تفتیش بُری بات ہے اور شریعت میں منع ہے اور قرآن میں لا تجسسوا کی ممانعت موجود ہے لیکن خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں میری نیت میں ہرگز یہ بات نہ تھی کہ لوگوں کے پردے فاش کروں یا اُن کو حقیر سمجھوں۔ میں کیا کسی کے عیب ڈھونڈوں گی جب کہ آپ میرا رُواں رُواں خدا اور خدا کے بندوں کا گنہگار ہو اور لوگوں نے اگر گناہ کیے ہیں تو اُن کو ابھی توبہ کی مہلت ہے ممکن ہے کہ خدا اُن کو توبہ کی توفیق دے توبہ قبول ہو اور اُن کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں۔ شامت تو مجھ کم بخت بدنصیب کی ہے کہ توبہ کا وقت بھی باقی نہیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْاٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

توبہ تو اُن کی ہے جنھوں نے نادانستہ کوئی بُرا کام کیا پھر جلدی سے توبہ کر لی تو ایسوں کی توبہ خدا بھی قبول کر لیتا ہے اور خدا تو جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اُن کی توبہ سند نہیں جو بُرے کام کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب موت آ موجود ہوئی تو لگے کہنے اب میں نے توبہ کی اور نہ اُن کی توبہ سند ہے جو کافر مرے۔ ایسوں کے لیے ہم نے عذاب درد ناک طیار کر رکھا ہے۔

تو میں تو حضر احدھم الموت میں ہوں اور مجھ کو اپنی توبہ کے قبول ہونے کا بھی بھروسا نہیں بلکہ لوگوں کے حالات کی تفتیش سے میری غرض اسی قدر تھی کہ دیکھوں مجھی کو بیماری اس قدر لگی ہے یا دوسروں کا بھی یہی حال ہے۔ تو بعض کا حال تو ناگفتہ بہ ہے اُن کی وہی مثل ہے اختار النار علی العار۔ دنیا کی شرم سے مجبور دوزخ میں جانا منظور۔ مگر خدا کا بڑا احسان ہے کہ امیروں کی قوم میں کچھ نہیں متوسط الحال اور غربا کی عورتوں میں اس طرح کے فسادات بہت ہی کم ہیں بلکہ گویا کہ نہیں ہیں۔ اور یہ سب برکتیں ہیں پردے کی۔ اور افسوس ہے کہ آج کل کے انگریزی خواں اسی کے پیچھے پڑے ہیں کہ جس طرح ہو سکے اس کو توڑ دیجیے۔ لیکن اس وقت کی میری بھی ایک بات یاد رکھنا کہ جس قدر پردے میں کمی ہوگی اسی قدر فساد امت میں ضرور زیادتی ہوگی۔ گو یہ کہ خدا تعالیٰ آدمیوں کی جگہ زمین پر فرشتوں کو لا بسائے تو پھر کیا کہا جاتا۔ مجھ کو اس قسم کی کئی عورتیں ملیں جن کو حقیقت میں نکاح سے انکار تھا۔ اگر تفتیش کیا تو اُن کا انکار اسی طور کا تھا کہ ایک لومڑی انگوروں کی بیلوں کے تلے سے ہو کر نکلی انگور کھٹے دیکھ کر اس کا جی للچایا کودی اچھلی بہت مگر انگور تھے اونچے اور یہ پہنچ نہ سکی آخر یہ کہہ کر دم دبا چلتی ہوئی کہ انگور کھٹے ہیں۔ تو جن کو انکار تھا اُن میں بعض کی تو صورت اچھی نہ تھی۔ بعض عمر سے اُتری ہوئی۔ بعض بچے کش کہ پہلے چار چار

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاۗءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اور تم اپنے دل کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا اس کا تم سے حساب لے گا پھر جس کو چاہے معاف کرے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جسم پر میرا بس چلتا تھا اور اس کی میں نے حفاظت کی۔ آنکھ غیر محرم پر نہیں پڑنے پائی۔ زبان کو گناہ کی بات نہیں بولنے دی۔ پاؤں بُری راہ نہیں چلا۔ ہاتھ بیجا نہیں ہلا۔ لیکن دل پر تو میرا اختیار نہ تھا۔ وسوسوں کو کیونکر روکتی۔ خیالات کو کس طرح ٹالتی۔ پس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل نہیں۔ اس کو بے گناہ سمجھتی اور نہ بے گناہ کہتی ہوں۔ بدن تو دنیا کی چیز ہے یہیں تک میرے ساتھ ہے اور میں یہیں اس کو چھوڑ جاؤں گی جس سے خدا کے یہاں بازپرس ہوتی ہے اور افسوس کہ وہ خدا کے سامنے پیش کیے جانے کے قابل نہیں۔ لوگوں کی نظر میں اپنے تئیں بے گناہ ظاہر کرنا مجھ کو کیا فائدہ دے سکتا ہے جبکہ میں خوب جانتی ہوں کہ خدا کی سرکار میں کسی کو دخل نہیں۔ نہ کوئی کسی کو بہشت میں لے جا سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کو دوزخ سے بچا سکتا ہے بلکہ اپنی بے گناہی کا یقین دلانا جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ چلتے چلتے ایک گناہ اور اپنے سر پر لوں۔ مجھ پر ایک وقت گزرا ہے۔ دن نہیں۔ ہفتے نہیں۔ مہینے نہیں۔ بلکہ برس کہ مرد کی آواز میرے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رات کو چوکیدار پکارتا یا دن کو سودے والے صدا لگاتے تو میں کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ تو بے اختیار ہو کر ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی اور پھر مہینوں اپنے تئیں ملامت کرتی رہی۔ بیماری میں لوگوں نے میری ایسی ایسی خدمتیں کی ہیں کہ بس میرا ہی جی جانتا ہے اور میں اُن کے احسانوں کی کسی طرح تلافی نہیں کر سکتی۔ لیکن ویسی تسلی ہی نصیب نہیں ہوئی جو خدا بخشے مولوی صاحب کے سرسری طور پر پوچھ لینے سے ہوتی تھی کہ اب تمہارا مزاج کیسا ہے۔ ایسی بھی بہتیری عورتیں نظر سے گزری ہیں جن کا سرے سے بیاہ ہی نہیں ہوا مجھ کو کبھی اُن کے حال پر ترس نہیں آیا لیکن بیوہ ہو کر بیوگی کی قدر جانی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ جو میرے کہے کا یقین کرے خدا اس کو جزائے خیر دے اور جو نہ کرے اُس کے حق میں اس کے سوائے اور کیا کہوں کہ خدا کرے وہ بھی ہم ہی سری کی عورت بنے خدا کرے اُس کا بھی بیاہ ہو اور خدا کرے وہ بھی بیوہ ہو کر دنیا میں رہے۔ جب مجھ کو یقین ہوا کہ ہزاروں لاکھوں عورتیں بیوگی کی سخت مصیبت میں مبتلا ہیں تو میں نے سوچا کہ اگر میں ان کی کچھ مدد کر سکوں تو اس سے بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں۔ بندی کو چھڑانے غلاموں کو آزاد کرانے کا اجر ہے تو بیوؤں کو نجات دینے کا کیوں نہ ہو گا۔ یہ بھی تو بندۂ خدا ہیں ان کو بھی قیدیوں کی سی تکلیف اور غلاموں کی سی ایذا ہے بلکہ زیادہ۔ ان کو بھی رنج و راحت کا احساس ہے۔ پہلے میرے دل میں آیا کہ عورتوں کو جمع کر کے ان ہی کو مرد بناؤں لیکن دیکھا کہ عورتیں مجبور محض ہیں مردوں نے اپنی ایسی ٹانگ اڑا رکھی ہے کہ ان کو ہلنے ہی نہیں دیتے۔ حقیقت میں مردوں کے کام ہیں اور عورتیں ناحق میں بدنام۔ اسی تردد میں تھی کہ ایک دن قرآن پڑھتے پڑھتے یہ بات ذہن میں آئی کہ جتنے احکام عورتوں کے ساتھ خاص ہیں خدا تعالیٰ نے خود عورتوں کو مخاطب قرار دے کر نازل فرمائے ہیں جیسے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں۔ کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور

يَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ الخ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے لیے

وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ اور اگر وہ (عورتیں) معاف کریں تو اُن کے لیے بہتر ہے۔

اور قرآن میں اس طرح کی اور بہت مثالیں موجود ہیں لیکن بیوہ عورتوں کو اس طرح پر دوسرے نکاح کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ مردوں کو مخاطب قرار دے کر فرمایا ہے وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ضرور اس کا کچھ نہ کچھ سبب ہے اور وہ نہیں ہے مگر وہی مردوں کا اختیار اور اقتدار جو انھوں نے خدا اور رسول کے حکم کے خلاف زبردستی اور ہیکڑی سے عورتوں پر حاصل کر رکھا ہے اب اگر مرد یہ کہیں کہ بیوہ کو چاہیے اپنا نکاح آپ کرے۔ یہ اُس کا کام ہے۔ ایجاب قبول وہ کرے گی نہ ہم۔ بیوی بن کر وہ رہے گی نہ ہم تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا نے ان کو ناحق اَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ کا مخاطب قرار دیا نعوذ باللہ یا تو اُس کو اصلی حال معلوم نہیں یا اُس نے مردوں کے حق میں ظلم کیا کہ جو کام ان کے کرنے کا نہ تھا ان سے کرانا چاہا۔ اگر خدا کوئی چیز ہے اور قرآن اُسی کا کلام ہے تو انكحوا الايامى مردوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کا حکم ہے۔ اول تو اختیار رکھ کر خدا سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور فرض کرو کہیں شاذ و نادر لیے اختیار ہی ہو بھی تو ایسی صورت میں مردوں کو حکم دینے سے خدا کا یہ منشا ہوگا کہ اپنی بیواؤں کو نکاح پر مجبور کر دو لیکن بجائے اس کے کہ میں مردوں کو سمجھاؤں کہ انكحوا الايامى کی تعمیل کس طرح پر کرنی ہوگی۔ اُن کو خود سوچنا اور سمجھنا چاہیے کہ انكحوا الايامى حکم ہے عمل تو نہیں اور عمل نہیں تو اس کا کیا مطلب ہے اور جو کچھ مطلب سمجھا جائے اُس فرض سے سبکدوش ہونے کی کیا سبیل ہے۔ میرا اتنا ہی کام تھا کہ بیواؤں کی واقعی حالت کو سچائی اور نیک نیتی سے مردوں پر ظاہر اور مردوں کو اُن کے فرض سے آگاہ کر دوں شاید ایسا کرنے سے بیواؤں کی مصیبت میں خفت اور مردوں کو عند اللہ جواب ہی میں کمی ہو۔ سو میں نے کیا اور خالصتہً للہ کیا۔ اے خدا جو کچھ میں نے کہا اگر تیری مقدس مرضی کے مطابق ہے تو میری بات میں اثر اور لوگوں کو اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا کر۔ الٰہی دنیا جہان کی بیواؤں کو سکھ ہو اور میری اس ناچیز کوشش کے صلے میں نہیں بلکہ تیرے فضل و کرم سے ان کے طفیل میں مجھ کو دنیا کی اس تکلیف سے جس کو میں اب سہ نہیں سکتی خاتمہ بالخیر کے ساتھ نجاۃ۔

کہتے ہیں اور حدیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ دن رات میں کوئی نہ کوئی گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے کہ آدمی جو کچھ مُونہ سے نکالے وہ ہو کر رہے۔ جس وقت آزادی نے یہ دعا کی وہ ضرور ایسا ہی قبولیت کا وقت رہا ہوگا کہ ادھر جتنے مرد تھے سب اپنے اپنے دل میں ٹھان چکے تھے کہ کوئی بیوہ کے بیٹھنے کا روادار نہ ہوگا (اور ایسا ہی ہوا) اور اُدھر دعا کا خاتمہ ہوتا تھا کہ آزادی نے دفعۃً ایک ہچکی لی اور ہو چکی۔

ہمارے نزدیک آزادی بیگم کا یہ لکچر ہمارے پُرانے خیال کے مولویوں کو ازبر کر لینا چاہیے اور ہم اُن کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بجائے ان خیالات کی اشاعت کرتے پھریں۔ اس لکچر سے اُن مسلمانوں کے دماغ کی قلعی کریں۔ اور تعصب کی اُس پھپھوندی کو دور کریں جس کی وجہ سے وہ عقدِ بیوگان کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو یہ رسم بد چل پڑی ہے اُس کا وبال ہمارے نزدیک ہمارے ہاں کے مولویوں کی گردنوں پر ہے۔ ہم نے اس وقت تک سیکڑوں مولویوں کے وعظ سُنے۔ لیکن ایک مولوی ابو محمد ابراہیم صاحب آروی کے سوا کسی کے مُونہ سے عقدِ بیوگان کے متعلق ایک بات بھی نہیں سُنی۔ جب

سلہ اور اپنی رانڈوں کے نکاح کر دو ۱۲

والد چوکھٹے میں ایک تصویر لیے کھڑے ہیں اور اُس کو دکھا رہے ہیں اور وہ تصویر کسی انگریز کی سی ہے۔ صادقہ نے اجنبی مرد کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار اپنا مُونہ چھپا لیا۔ تو اُس کے والد کہتے ہیں۔ بیٹا یہ تو تصویر ہے اور تصویر بھی ٹھیک نہیں۔ دیکھو اِس کی اصلی صورت یہ ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اُس تصویر کے نیچے سے اور تصویر نکالی تو وہ ایک مسلمان کی تصویر تھی مگر دونوں تصویریں تھیں ایک ہی شخص کی۔ صادقہ کو تو اپنے خوابوں کی تعبیر کی مہارت تھی ہی سمجھ گئی کہ بیاہ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کوئی اور ناداں عورت ہوتی تو مارے خوشی کے اُچھل پڑتی۔ مگر صادقہ کو اُن ذمہ داریوں کا خیال آگیا جو بیاہ کے پیچھے اُس پر عائد ہوں گی اور وہ ابھی سے سوچ میں لگی کہ اِس چہرے مُہرے کا شخص کس مزاج کا ہوگا اور اُس کو رضا مند رکھنے کے لیے مجھکو کیا کیا کرنا پڑے گا۔ دوسری مرتبہ پھر صادقہ نے دیکھا کہ باپ نے وہی دو تصویریں اس کے حوالے کیں کہ تم اپنے پاس رکھو مگر بہت احتیاط سے رکھنا اس کا مطلب بھی صاف تھا۔ تیسری بار کسی کو خواب میں پکار کر کہتے ہوئے سُنا کہ وہ تصویریں تمھارے ہم نام کی ہیں۔ صادقہ نے غور تو کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اِس سے کیا مراد ہے۔ غرض اِس آخری خواب کے بعد اگلے ہی دن کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے ڈاکیئے نے آواز دی کہ رجسٹری خط لے جاؤ۔ دیکھیں تو ایک بڑا سا اعلیٰ عمدہ انگریزی کاغذ کا لفافہ صادقہ کے والد میر خسرو کے نام بنارس سے صادق نامی کسی شخص نے ایسے اہتمام سے بھیجا ہے کہ لفافوں کی درزوں پر ایک ایک انچ کے فاصلے سے لاکھ کی مہریں ہیں۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ انگریزی فارسی دونوں خطوں میں ایسا صاف لکھا ہوا تھا کہ اِس میں کسی طرح کا شک شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لفافہ لینے تو لے لیا مگر یہ معمولی طور کا لفافہ نہ تھا کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے متعارفین میں سے بنارس میں اس نام کا کون شخص ہے۔ اور اُس کو ایسا لفافہ رجسٹری بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی ہوگی۔ سردی کا تھا موسم اور ابھی کچھ ایسا دن بھی نہیں چڑھا تھا۔ سب لوگ ایک ہی دالان میں جمع تھے از آں جملہ صادقہ بھی۔ یہ تو سمجھ گئی کہ ہم نام کی یہ تعبیر ہے۔ میر صاحب نے تھوڑی دیر تامل کر کے آخر لفافہ کھولا۔ اندر سے چند کا جُز ایک خط نکلا۔ چند سطریں بھی پڑھنے نہیں پائے تھے کہ بی بی نے پوچھا آخر کون ہیں۔ کیا لکھتے ہیں۔

میاں۔ ابھی اِس کے پوچھنے کا کیا موقع ہے ذرا پڑھ تو لینے دو۔

بی بی۔ بس میرا بولنا تم کو زہر لگتا ہے۔

میاں۔ تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ رکھی جائے اور نہ اُٹھائی جائے۔ اوّل تو تم کو میری ہر ایک بات کی کُرید ہی کرنی کیا ضرور ہے اور پھر صبر سنگا و کچھ ہی ہو کہ کتاب کی کتاب میرے ہاتھ میں ہے پڑھنا شروع کیا ہے کہ تم نے بیچ میں ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھکو خود معلوم نہیں تو جواب کیا دوں۔ ابھی زردے کا عمل پورا نہیں ہوا اوپر تلے چار پانچ پان کھاؤ گی تو تمھارا مزاج درست ہوگا۔

بی بی۔ آپ سارے دن حقّہ بیٹھے گڑگڑائیں تو کچھ نہیں میرے زردے کا ہر وقت طعنہ۔ لو اب زردہ کھاؤں تو حرام کھاؤں سُؤر وار کھاؤں۔

یہ کہہ کر گلوری جو تھوڑی دیر ہوئے مُونہ میں رکھی تھی اور ابھی اُس کے چبانے کی بھی نوبت نہیں آئی تھی اُگال دان اٹھا تھوک دی۔ میر صاحب بیچارے خط ہاتھ میں لیے دم دبا چلتے ہوئے اور اگر ایک لمحہ بھی بیٹھے رہیں تو دونوں میں ایسی

لڑائی ہوجیسی ہر روز ہوا کرتی تھی۔ باہر مردانے میں جاکر خط پڑھا۔ یہ خط کاہے کو تھا ایک کتاب تھی اور کتاب بھی پڑھنے کے قابل۔ اور نصیحت اور تجربہ کرنے کے لائق ناظرین کی خاطر کا لحاظ کرکے ہم اس خط کو ذیل میں درج کرتے ہیں اور اس کی طوالت کی ذرا پروا نہیں کرتے۔

سید صادق کی طرف سے شادی کا رقعہ کہنے کو رقعہ اور واقع میں کتاب اور اسی میں علی گڈھ کالج کا مختصر حال اور نکاح کے بارے میں لوگوں کی رائیں

جناب من۔ بندے کا نام تو آپ کو لفافے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ میں اس پر اتنا اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ سنہ ۱۸۹۰ء کے بی اے کے امتحان میں جو شخص کلکتہ یونیورسٹی میں اول رہا وہ یہی خاکسار ہے۔ میں نے علی گڈھ کالج میں تعلیم پائی ہے اور اب بھی اسی کالج کی ایم اے کلاس میں پڑھتا ہوں۔ بندے کا وطن آبائی تو فیض آباد ہے مگر شاہزادۂ فلک شکوہ کے توسل کی وجہ سے والد نے بنارس میں رہنا اختیار کیا۔ اور چوں کہ کچھ جایداد از قسم زمینداری وغیرہ بھی پیدا کر لی ہے۔ اب ہم لوگ بنارسی ہوگئے ہیں ہمارا نسب نامہ محفوظ ہے اور میں اس سے آپ کو اپنے سید الطرفین ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔ اور اس کا بھی کہ بزرگوں میں علما اور مشائخ اور حکام اور مشاہیر گزرے ہیں ؏

لیکن نبود وصمت اضافی ہنر ذات

میں آپ پر اپنا معروف ہونا زیادہ پسند نہیں کرتا ہوں۔ مجھ کو آپ کے ایک بڑے دانت کار سے آپ کے ذاتی اور خانگی حالات بالتفصیل سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور اس سے جو خیال میرے دل میں آپ کی طرف سے پیدا ہوا اسی نے مجھ کو اس عریضے کے لکھنے اور پیش کرنے کی جرأت بھی دلائی گو آپ انگریزی نہیں جانتے لیکن مجھ کو تحقیق دریافت ہوا ہے کہ آپ کا مزاج بے تعصب واقع ہوا ہے طبیعت منصف۔ ذہن رسا۔ رائے صائب۔ عقل مصلحت اندیش۔ خیال آزاد۔ افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمارے کالج میں کاہے کی خصوصیت ہے۔ مجھ کو اس بات کے مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں اور چوں کہ سرکار نے تعلیم اپنے اختیار میں رکھی ہے وہ لیاقت کے درجے ٹھیرائی اور ان ہی کے مطابق بی اے وغیرہ علمی خطاب دیتی تو ہم اس میں کوئی رد و بدل کر نہیں سکتے ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم ہم کو کچھ ایسی زیادہ مفید نہیں لیکن تاوقتیکہ گورنمنٹ اپنا کورس نہ بدلے۔ ہم کو چار و ناچار اسی کی پیروی کرنی ہے۔ غرض میں اپنی آپ ہی بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں۔ اور یہ جو نماز روزے کی تاکید اور دینیات کے درس کا چرچا آپ سنتے ہیں۔ یہ تو چند دانے ہیں جو مسلمانوں کو دام تعلیم میں لانے کے لیے بکھیر دیے گئے ہیں۔ پادریوں کا مقصد اصلی ہے اپنے دین کی اشاعت اور بہانا دنیاوی تعلیم۔ وہاں لوگوں کو دین عیسوی سے گریز ہے۔ اور ہمارے ہاں مطلق انگریزی تعلیم سے تو پادریوں نے دفع وحشت کے لیے دنیاوی تعلیم کو آڑ بنایا ہے اور ہم نے دینیات کو ہمارے کالج میں جو خصوصیت ہے صرف دو باتوں کی ہے۔ ایک تو ہمارے ہاں کثرت سے ایسے طالب العلم ہیں جو مدرسے ہی میں

پڑھتے مدرسے ہی میں کھاتے مدرسے ہی میں سوتے۔ مدرسے ہی میں کھیلتے اور رات دن مدرسے ہی میں رہتے اور گھروں کی بے تمیزیاں اور سوسائٹی کی بیہودگیاں۔ بزرگوں کی نازبرداریاں ان کی طبیعتوں پر بُرا اثر نہیں کرنے پاتیں۔ دوسرے پڑھنے کے علاوہ لڑکوں کو دُنیا کے معاملات میں غور کرنا اور دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھلانا یعنی طالب العلموں کو آیندہ کی زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اگر مجکو بالفرض کسی کا چال چلن دریافت کرنے کی ضرورت ہو اور وہ شاید ایک درجن عمدہ سے عمدہ سارٹیفکٹ مجکو دکھا سکے تو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا دل اُس کی طرف سے ہرگز ایسا مطمئن نہیں ہوگا جیسا صرف اتنی بات سے کہ وہ میری طرح علی گڑھ کالج کا بورڈر ہو اگر آپ نے علی گڑھ کالج کے کچھ حالات معلوم کئے ہیں۔ اور آپ جیسے بیدار مغز روشن خیال آدمی سے تعجب ہے کہ نہ کئے ہوں تو آپ نے کالج کی رپورٹوں میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم بورڈر کیونکر اپنے کھانے اور پہننے اور کھیلنے اور کل ضرورتوں کا خود انتظام کرتے آپس میں کیسے مباحثے رہتے۔ اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کس طرح شریک ہوجاتے۔ ہم لوگوں میں کئی طرح کی کمیٹیاں قائم ہیں ازاں جملہ ایک کمیٹی الاصلاح ہے اُس کے تحت میں ایک سب کمیٹی ہے جس میں صرف بیس برس سے زیادہ عمر کا طالب العلم شریک ہوسکتا ہے اور مجکو اس کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی عزت بخشی گئی ہے۔ اس کمیٹی کی کارروائی شب کے وقت دروازے بند کرکے ہوتی ہے اور ممبروں کے سوائے کسی کو کمیٹی میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس سب کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص نکاح کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے اور اُس پر ردّ و قدح ہو تاکہ جو شخص ایسا تعلق کرنا چاہے وہ اُس کے نفع و نقصان اور لوازم و نتائج کو پہلے سے سوچ چکا ہو مدت تک میری یہ رائے رہی کہ میں تجرد میں اپنی زندگی بسر کروں گا جس دن میں نے کمیٹی میں اپنی رائے پیش کی اور وہ مضمون جو لکھ کر لے گیا تھا پڑھ کر سُنایا ممبروں کا ایک گروہ کا گروہ اُس کی تردید کو کھڑا ہوگیا اور مہینوں اس پر بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ بحث ہوتی رہی میں نے جن باتوں پر زور دیا تھا وہ یہ تھیں کہ اس تعلق کا مدار دلی رغبۃ اور محبۃ پر ہے بلکہ رغبۃ اور محبۃ کی جگہ لفظ تعشق استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا اور رغبۃ اور محبۃ کی مثال میرے نزدیک درخت کی سی ہے کہ ایک دم سے سموچے کا سموچا زمین سے نہیں نکل کھڑا ہوتا بلکہ اس کا بیج بویا جاتا ہے۔ پھر وہ جڑ پکڑتا ہے۔ پھر پھوٹتا ہے۔ پھر اُس میں کونپل نکلتی ہے پھر پتے نکلتے ہیں پھر پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ پھر پھولتا اور پھلتا ہے بعینہ یہی حال ہے رغبۃ اور محبۃ کا دو طبیعتوں میں ایک طرح کی خلقی مناسبتہ ہوتی ہے پھر ساتھ رہنے سے اُنس پیدا ہوتا۔ اُنس سے الفت۔ الفت سے رغبۃ اور آخر کار رغبۃ سے محبۃ۔ پھر آگے محبۃ کے مدارج ہیں تو جن دو شخصوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں ایک دوسرے کے پاس نہیں بیٹھے۔ ساتھ نہیں رہے۔ ایک دوسرے سے بات نہیں کی ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت نہیں ہوئے کیونکر ایک کو ایک کی محبۃ ہوسکتی ہے پس ہمارے یہاں کا تعلق زناشوئی ایک طرح کا جوا ہے۔ لوگ جیتتے بھی ہیں اور ہارتے بھی ہیں۔ اور چونکہ محبۃ ایک کے کرنے سے نہیں ہوتی جیتنے کا احتمال ایک ہے تو ہارنے کے دو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر خانہ داریوں میں فساد سُنے جاتے ہیں۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ انسان کیوں یہ مصیبت مول لے۔ ہم مسلمانوں میں سے دولت نکل گئی ہے اور نکلتی چلی جاتی ہے۔ اور دولت کے کمانے کے جو طریقے ہیں اُن سے ہم کو گریز ہے اور مسلمانوں کی طرف سے میں بالکل نااُمید ہوں اور اسی میں اُن کی بہتری سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو اپنے شمار کو بڑھنے نہ دیں کیونکہ شمار کے ساتھ ساتھ مفلسی اور خواری بڑھتی جائے گی

ہوں اور ذلیل ومحتاج ہوں تو ہوں ہی کیوں بے شک میرے اکیلے کی کون سُنتا ہے اور نہ صرف میرے اکیلے کی بل کہ مجھ جیسے سیکڑوں کی ہزاروں کی۔ لیکن مسلمانوں کے فائدے کی جو بات سوجھ پڑے اس کے ظاہر کئے بدوں بھی تو نہیں رہا جاتا تھوڑا سا اثر ہوگا تو بہت ہے اس معاملے میں سب سے زیادہ مشکل ہم لوگوں کی ہے جنھوں نے انگریزی پڑھی ہے یا پڑھ رہے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انگریزی پڑھنے سے معلومات میں وسعت اور خیالات میں آزادی آجاتی ہے اور ایک خاص طرح کا مذاق پیدا ہوجاتا ہے۔ ہندوستانیوں (پُرانے خیالات کے ہندوستانیوں) کے مذاق سے بالکل جدا اور ممتاز بلکہ متباین۔ اختلاف رائے اختلاف وضع اختلاف خیالات کے ہوتے دوسرے تعلقات تو خیر بُری طرح یا بھلی طرح نبھ بھی سکتے ہیں۔ لیکن یہ خاص تعلق یہ تمام تعلقات سے قوی تر تعلق میں نہیں سمجھتا کہ ایک دن بھی خوش اسلوبی سے نبھ سکتا ہے۔ جو شخص اپنے برابر والوں کو بل کہ اپنے سے بڑوں کو صرف پُرانے خیالات کی وجہ سے مُونہ سے نہ بھی کہے تو دل میں ضرور حقیر سمجھے کیوں کر مانوس ہوجائے گا اُس عورت سے جس کو اس کے سے خیالات چھو بھی نہیں گئے کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جب گھر میں آئے پکانے کھانے اور سینے پرونے کے سوائے کوئی بات نہ سُنے۔ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جب دو عورتیں مل کر بیٹھیں۔ اِس کی بدی اُس کی غیبت کے علاوہ اُن میں کوئی مذکور نہ ہو۔ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جن باتوں میں اس کو دل چسپی ہے گھر میں کسی کو اُس سے لگاؤ نہیں۔ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے۔ اس سے کہ جتنی دیر گھر میں رہے اکیلا پڑا ہوا کتاب دیکھا کرے یا اخبار پڑھا کرے۔ اس لئے کہ گھر والی کے ساتھ گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرے تو یہ کوئی مطلب نہیں پاتا کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ خیالات کے اعتبار سے بی بی کو ایک انچ اُبھار نہیں سکتا اور اُس کے پست خیالات میں شریک ہونے کے لئے اپنے تئیں گرا نہیں سکتا۔ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ سارے گھر کی روزی پیدا کرنے کے لئے یہ اکیلا دن بھر مصیبت جھیلے اور رات کو تھکا ماندہ گھر آئے تو کوئی اتنا نہ ہو کہ اِس کو صلاح بتائے یا زبانی سہارا لگائے کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ پردیس میں ہو تو صرف اس وجہ سے کہ بی بی پڑھی لکھی نہیں نہ اپنی کہہ سکے اور نہ اُس کی سُن سکے کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ ماں کی بے تدبیریوں سے اس کے بچے ہلاک ہوں۔ وہ پڑیں بیمار۔ اور دوا کے عوض اِن کو پلائے جائیں تعویذ باندھے جائیں گنڈے۔ اُتارے جائیں ٹونے ٹوٹکے۔ مانیں جائیں منّتیں۔ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ اولاد کی ابتدائی تربیت میں ایسی غلطیاں کی جائیں کہ ساری عمر اُن کی اصلاح نہ ہوسکے الغرض ان وجوہ سے اپنی نسبت اس وقت تک میرا ایسا خیال ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا اور میں اِس کمیٹی کے ممبروں کو بھی یہی رائے دیتا ہوں کیوں کہ آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگرے میسند میں تو اتنا کہہ کر بیٹھ گیا اور پھر جو اس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے مضمون کیا پڑھا بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑ دیا کوئی شخص نہ تھا جس کے مُونہ میں ایک یہ دو اعتراض نہ ہوں اِن میں سے بعض بودے اور پُھسپُھسے بھی تھے لیکن میں نے کمیٹی کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے روداد میں لکھنے کے لئے سب کو یک جا کیا تو مجموعہ ایسا قوی معلوم ہوا کہ مجھکو اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم کو اپنے دوست سید صادق کی رائے سے ہرگز اتفاق نہیں۔ اِن کی رائے مدلّل ہے مگر غلطی اور مبالغے سے خالی نہیں۔ اُنھوں نے اس اصول کے قرار دینے میں بڑی مکروہ غلطی کی ہے کہ تعلّق زناشوئی کا ہونا چاہیئے نتیجہ محبت۔ یعنی طرفین میں

پہلے رابطۂ محبۃ قایم ہولے اُس کے بعد یہ تعلق ہو۔ ہم بالکل اِس کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال یہ ہی کہ محبۃ پیدا ہوتی ہے۔
تعلق زناشوئی کے بعد بے شک دو اجنبی جن میں مطلق سابقۂ معرفت نہیں ایک دوسرے سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اُن میں
خدائے تعالیٰ نے ایک دوسرے کی طرف رغبۃ کرنے کا مادّہ ودیعت رکھا ہی۔ چناں چہ موقع پا کر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رغبۃ
کرتے ہیں جس کو تخمِ محبۃ کہنا چاہیئے۔ اور آخر کار ان میں محبۃ پیدا ہو بھی جاتی ہی اور جتنی خانہ داریاں ہیں سب بنا ہر ہیں اُسی محبۃ
کے ہمارے دوست سید صادق نے محبۃ کے پیچ کو بہت زور سے کس دیا ہی اور وہ اُس موانستہ کو جو تعشق سے کم ہو محبۃ نہیں کہنا
چاہتے۔ یہ بھی اِن کی غلطی ہی۔ تعشق کیا چیز ہی۔ بے قراری کی محبۃ۔ اور اس درجہ کی محبۃ کو عقلاء اور حکماء اور اطباء اور صلحاء ان
میں کسی نے بھی جائز نہیں رکھا۔ ایسی ہی محبۃ یعنی شیفتگی ہی جس کو پیغمبر صاحب صلوات اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین فرماتے
ہیں۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبۃ اعلیٰ درجے کا گناہ ہی) ایسی ہی محبۃ یعنی شیفتگی ہی جس کو اطباء نوع من الجنون (ایک
طرح کی دیوانگی) لکھتے ہیں۔ انتظام دنیا کے لئے ایسی گاڑھی محبۃ جو عشق اور شیفتگی کی حد کو پونہچ گئی ہو درکار بھی نہیں۔ اور
کیوں اُس کو خانہ داریوں میں ڈھونڈا جائے جتنی معمولی طور کی محبۃ سے خانہ داریاں چلتی ہیں۔ اور چل سکتی ہیں عموماً ہر گھر
میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے کہ میاں بی بی کسی وقت کسی بات پر ردّ و کد کر لیتے ہیں نہیں کہہ سکتے کہ ان میں محبۃ نہیں
وہ صبح کو روٹھتے اور شام کو منتے دن کو روٹھتے اور رات کو پیار اخلاص کرتے ہیں۔ ہمارے دوست سید صادق عجب حکمت
سے پردے کی بحث کو اڑا گئے ہیں۔ لیکن جو اُن کا اصل مطلب ہی وہ ان کی تمام تقریروں سے پڑا ٹپک رہا ہی وہ حقیقۃ
میں عورتوں کے پردے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ یہی پردہ ہی جو تعلق نکاح کے بدون مرد اور عورۃ میں اختلاط کا
مانع ہی لیکن بے پردگی سے جو شرم ناک نتیجے یورپ اور امریکا میں پیدا ہوئے ہمیشہ کے لئے ایک غیور اور منصف مزاج آدمی
کی آنکھیں نیچی رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ شاید سَو میں ننانوے ہوں گے جو بے پردگی کی رسم بد کو آج اُٹھا دیں اگر اُن کا بس
چلے علاوہ بریں وہ محبۃ جس کو ہمارے دوست نے اس تعلق کے لئے ضروری سمجھا ہی اور وہ ضروری ہے بھی پردہ داری کی
صورۃ میں زیادہ محفوظ رہ سکتی ہی کیوں کہ عورۃ نہ اجنبی مرد کو دیکھتی اور نہ اُس کی نیۃ ڈانواڈول ہو سکتی۔ [illegible] اُس کو سکھاتا ہی
کہ وہ صرف شوہر کے لئے ہے اور بس۔ پردے کی غرض وغایۃ کیا ہی۔ عورت کی پاک دامنی اور ناموس کی حفاظت لیکن
جن لوگوں میں پردے کا دستور نہیں وہ بھی اپنی عورتوں کی پاک دامنی اور ناموس کی ویسی ہی حفاظت کرنی چاہتے ہیں
جیسی ہم۔ ہم میں اور اُن میں فرق ہی تو اتنا ہی کہ مثلاً ایک شخص نے خزانے کے صندوق پر تالا لگایا دوسرے نے تالا بھی
لگایا اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم پوچھتے ہیں ہم اپنے دوست کے مونہ سے سُننا چاہتے ہیں دونوں میں
خزانے کی طرف سے زیادہ مطمئن کون۔ بے شک وہی جس نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے
ہم اِس کو مانتے ہیں کہ انگریزنیں ہماری عورتوں سے بہت زیادہ لایق ہیں۔ انتظامِ خانہ داری میں شوہروں کے خوش
رکھنے میں اولاد کی تربیت وتعلیم میں بلکہ علمی لیاقت میں بھی۔ لیکن نہ بے پردگی کی وجہ سے بلکہ عام سوسائٹی کی شایستگی
اور تہذیب اور ترقی کی وجہ سے۔ ہم میں بھی لایق مردوں کی ماں بہنیں جوروئیں زیادہ لایق ہوتی ہیں۔ دین داروں

کی دین دار۔ نیک کرداروں کی نیک کردار۔ بھلوں کی بھلی۔ بُروں کی بُری۔ شریفوں کی شریف۔ پاجیوں کی پاجی۔ یوں تو جیسی دو آنکھیں مردوں کی ویسی عورتوں کی۔ جیسے دو کان مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ جیسے قوائے دماغی مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ لیکن پھر بھی خدا نے مرد اور عورت میں بڑا فرق رکھا ہے اور عورتیں کتنے ہی ہاتھ پیر پٹکیں۔ کتنا ہی غُل غپاڑا مچائیں وہ فرق مٹ نہیں سکتا۔ عورت کی حالت کہے دیتی ہے کہ وہ گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے بچوں کے پالنے کے سوائے اور کچھ کر نہیں سکتی۔ اور کرے گی تو کیا۔ کرنا چاہے اور کرنے کا قصد کرے تو ہم سمجھیں گے کہ مردوں کا مونہہ چڑاتی ہے۔ اور ہم مردوں میں اس سے زیادہ اس کی قدر نہیں ہوگی جیسے عورتوں میں ہیجڑے کی۔ شور و شغب تو بہت کچھ سنتے ہیں مگر یورپ اور امریکا میں بھی عورتوں نے آزادی پاکر اس سے زیادہ اور کونسا کمال حاصل کرلیا ہے کہ میڈم آنک گاتی خوب ہے۔ میڈم ڈھمک پیانو کے بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی میڈم فلاں تھیٹر میں سوانگ ایسا بھرتی ہے کہ نقل کو اصل کر دکھاتی ہے یا بڑی فضیلت بپایہ لیاقت دست گاہ ہوئیں تو ناول یعنی قصہ کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں اور قصے کہانی بھی گندے ناپاک ع می ترا و د چہ کنم انچہ درآوند بسن ست۔ کسی نے وزارت کی۔ کوئی سپہ سالار ہوئی۔ یقین نہیں۔ اور یوں سیکڑوں برس میں دو چار نام کی ہو گئیں تو ایسی اذان دینے والی مرغیاں کبھی ہمارے دڑبوں میں سے نکل آتی ہیں۔ اب رہی ہمارے دوست سید صادق کی یہ تجویز کہ مسلمان بے دولت ہیں اور دولت کے کمانے کے ہنر ان کو سیکھنے منظور نہیں۔ اس لئے ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ ان کا شمار بڑھنے نہ پائے تشخیص مرض تو درست ہے مگر علاج غلط اگر ہاتھ میں ایک پھنسی نکلے اور اس کا زہر پھیلتا چلا جائے اور خوف ہو کہ سارا ہاتھ از کار رفتہ ہو جائے گا تو کیا طبیب کا یہ کام ہے کہ پھنسی کا نام سنتے کے ساتھ ہاتھ کے جڑ سے اڑا دینے کا حکم دے یا کسی پھوہڑ عورت کے سر میں جوئیں پڑ جائیں تو اس کو یہی صلاح دینی چاہیئے کہ سر منڈوا ڈال نہ بال ہوں گے نہ جوئیں پڑیں گی۔ نہیں نہیں علاج اس کا نام ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے زخم اچھا ہو جائے اور قطع ید لازم نہ آئے چٹیا بھی رہے۔ اور سر میں لیکھ ڈھونڈی نہ ملے۔ اب ہمارے دوست سید صادق کا صرف ایک اعتراض اور رہ گیا ہے کہ انگریزی پڑھے ہوؤں کو ان کی مرضی کی بی بیاں مل نہیں سکتیں۔ سچ ہے کہ نہیں مل سکتیں جس طرح عورتوں کو ایسے شوہر نہیں مل سکتے جو دایہ گری کا کام بھی جانتے ہوں عورتوں سے وہ توقعات ہی کیوں پیدا کی جاتی ہیں جو ان کے بس کی نہیں۔ اور آخر ایسی ہی عورتوں کے ساتھ لاکھوں کروڑوں آدمی گزارہ کرتے ہیں انگریزی خواں جو خوش نہیں رہ سکتے تو اس وجہ سے کہ انھوں نے انگریزی پڑھ کر اپنے تئیں چھوئی موئی بنا لیا ہے قصور تو اپنا اور الاہنا دوسروں پر۔ سید صادق نے تاہل میں تو بہتیرے کیڑے ڈالے لیکن انھوں نے ان قباحتوں پر بھی نظر کی جو تجرد کو لازم ہیں اگر یہ بیٹھے جیسا کہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنا چاہتے ہیں تو زیادہ نہیں آج سے نو دس برس کے اندر اندر دکھا دیں گے کہ کسی نہ گفتہ بہ بیماری میں گل سڑ کر مر گئے ہوں گے یا پڑے گھل رہے ہوں گے۔ یا قیدیوں کے ساتھ سڑک کاٹتے ہوں گے یا ایسی خراب حالت میں ہوں گے کہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر اور طالب العلم تو رہے اپنی جگہ۔ کالج کے بھنگی کو یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کبھی ہمارے کالج میں تھے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر ہو تو وہ سزا ہوگی ان کی اپنی کرتوت کی انھوں نے قانون قدرت کو توڑا اور پیغمبر اسلام کی سنت سے مونہہ موڑا۔ اے جناب یہ اعتراض سن کر میں لگا بغلیں جھانکنے۔ اور مجھ

سے ایک بات کا بھی جواب دیتے نہ بن پڑا۔ اور میں نے اپنا کان اُمیٹھا اور تجرّد سے توبہ کی اور اب مجکو یہ سوچ پیدا ہوا کہ تامّل کرنا تو ضرور ہی اور میں نے اپنی غلط فہمی سے اُس کی عمر کا ایک حصہ ضائع بھی کر دیا۔ اگر میں زیادہ دن تک بیٹھا رہوں تو لوگ ایسا خیال کریں گے کہ میں اُس غلطی پر جما ہوا ہوں۔ اور کمیٹی ہی کہ اپنے قاعدے کے موافق برابر ہوئے چلی جا رہی ہی جس کے جی میں آتا ہی کوئی رائے پیش کرتا ہی اور اُس پر بحث ہوتی ہی میں تو پہلے ہی دفعہ تجرّد کی حمایت کر کے نکّو سا ہو گیا۔ اب سُنتا سب کی ہوں مگر حوصلہ نہیں پڑتا کہ آپ بھی کچھ کہوں۔ لیکن کمیٹی کی کارروائی جو اب تک ہو چکی ہی میں سمجھتا ہوں کافی اور کافی سے زیادہ ہی اور مجکو کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں۔ میں کمیٹی کے ممبروں کے نام ظاہر نہیں کر سکتا اور نہ کمیٹی کے قواعد کی رو سے کسی کو ایسی اجازت ہی ورنہ جیسی جیسی گفتگو کمیٹی میں ہوئی ہی میں نام بنام بیان کرتا اور چوں کہ کمیٹی میں بعض آپ کے بھی متعارف ہیں آپ کو کسی قدر مزہ بھی ملتا۔ لیکن مجکو جہاں کہیں اس خط میں ضرورت ہوگی میں حرفوں سے کام لوں گا۔ ایک دن۔ الف نامی ایک ممبر کے مونہ سے نکل گیا کہ میں تو انگلش لیڈی لاؤں گا۔ اس پر جو گفتگو ممبروں میں ہوئی اُس کی نقل کرتا ہوں۔

(ب) ارے میاں کہیں خدا کے لئے ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔

(الف) آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنے والد کا اکیلا بیٹا ہوں اور وہ جیسے کفایت شعار ہیں معلوم۔ ان کے پاس اچھا اندوختہ تھا اور ہمیشہ سوچا کرتے تھے کہ اس کو کاہے میں مشغول کروں کوئی صلاح دیتا تجارت میں۔ تو وہ کہتے مجکو آپ تو اس کا سلیقہ نہیں اتنا سرمایہ نہیں کہ اُس سے بڑی تجارت ہو سکے۔ اے ہوئے پچاس ساٹھ ہزار تو اُس کی کیا بساط اور پچاس ساٹھ ہزار بھی میں نے مثال کے طور پر بیان کئے ورنہ میں نے تو اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی اور دیکھتا کہاں سے اس لئے بہیچ ڈپٹی کلکٹری میں تو موقع ہی نہیں وہ موذی کلکٹر چھاتی پر بیٹھا ہوا مونگ دلا کرتا ہی۔ آپ بڑے دن کی ڈالیاں لے مفت کی سواریوں پر لدا لدا پھرے دورے میں دودھ انڈا مرغی کوئلا لکڑی گھاس کسی چیز کے دام۔ قلی بیگار کی مزدوری نہ آپ دے اور نہ اُس کے لشکر والے دیں تو کچھ نہیں عین میز کے تلے عملے کی تقدیر کا مینہ برسا کرے تو خبر نہیں۔ چپراسی اور خانگی ملازم انعام کے لئے کتوں کی طرح لوگوں کو نوچیں کھسوٹیں لوٹیں تو پروا نہیں۔ مگر ڈپٹی صاحب نے خدا جانے اس کا باپ مارا ہی یا آیا بگاڑا ہی۔ جب دیکھو ان ہی کے حال کی تفتیش ان ہی کی خبروں کی کرید۔ بھلا ایسی تاک جھانک میں کس کی شامت آئی ہی کہ رشوت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ یاد ش بخیر تحصیلداری کا خدا بھلا کرے کہ دس بارہ برس نبھ گئی تو ذرا بیر پڑے بھی درست ہو گئے اور ایک خدا نے یہ بھی بڑا ہی کرم کیا کہ جننگی بوٹے بہت نہ ہوئے ساری عمر میں ایک جننا کہ خدا کرے جیتا رہے ورنہ گھر والی کا بھی سلیقہ دھرا ہی رہتا تو ایسی تھوڑی پونجی میں میں کیا تجارت کر سکتا ہوں۔ تحصیلداری ڈپٹی کلکٹری کرنے کے بعد یہ تو مجھ سے ہونے کا نہیں کہ بساطی بنوں یا آٹے دال کی دوکان کھول بیٹھوں۔ چار و ناچار دوسرے کی آڑ میں شکار مارنا ہوگا تو وہ دوسرے ایسے کیا قرآن کا جامہ پہنے ہوں گے کہ جو کمائیں گے میرے ہاتھ پر لا کر دھر دیں گے آٹا لے کر نمک چھوڑ دیں تو غنیمت۔ غرض تجارت میں روپیہ لگانا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا دوسرا کہتا جناب آپ پرامیسری نوٹ خرید لیجئے اس سے مطمئن تر سرمایہ تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ برکت خدا نے سود ہی میں دی ہی کہ بیٹھے بٹھائے سوتے جاگتے چڑھے اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ سے چھنے ماہی ہوئی اور اپنے ٹکے گنوا لئے۔ نہ ہڑ ہڑ نہ کھڑ کھڑ۔ تو والد فرماتے ہیں کہ کہتے تو سچ ہو۔

مگر فائدہ تو دیکھو اونٹ کے مونہہ میں زیرہ کوہ کندن و کاہ برآوردن اپنی چھاتی تلے سے رقم نکال کر دو۔ اور برس بھر بیٹھے سیوا کرواتنی زحمت کے بعد ملا کیا سو پیچھے چار دیکھو تو کیا چالاک قوم ہی۔ یہ کسی کے چھپر پر پھوس نہیں رہنے دے گی۔ بادشاہ ہوکر رعایا سے لیں قرض اور اس کو ریلوں اور نہروں اور فائدے کی چیزوں میں لگائیں۔ اور بیس بیس پچیس پچیس روپے سیکڑا کمائیں اور روپے والوں کو دیں چار۔ کیا کہوں نمک کھایا ہی ان کو خدا کی سنوار۔ اور پھر اس میں سے ٹیکس کی کٹوتی۔ اور کل کو عملداری اٹھ گئی تو کاغذ کو لئے چاٹا کرو۔ اور عمل داری کا کس نے بیمہ لیا ہی۔ روس آہستہ آہستہ بڑھتا ہی چلا آتا ہی امیر کابل کی آڑتھی سو اُس کا یہ حال ہی کہ یہ کہتے ہیں سیدھی اور وہ سمجھتا ہی اُلٹی۔ دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہی۔ ناصاحب نوٹ کی صلاح تو ٹھیک نہیں۔ اس پر وہ صلاح کار بولا تو زمینداری۔

والد۔ ہاں ہاں میں یہی سوچتا ہوں۔ مگر کم بخت زمینداروں کی بھی شامت ہی۔ دیکھتے نہیں آئے دن تھانے اور تحصیل میں کھینچے کھینچے پھرتے ہیں۔ اور اب زمینداری میں رہ ہی کیا گیا ہی۔ گودا گودا تو سرکار نکال لیتی ہی۔ باقی بچی ہڈیاں ان کو زمیندار اور کاشتکار پڑے چچوڑا کریں۔ اول تو زمین میں وہ اگلے وقتوں کی سی پیداوار کہاں۔ اور جو من کی جگہہ پنسیری رہ بھی گیا ہی تو کاشتکار ہی کا پورا نہیں پڑتا زمیندار کو کہاں سے دے۔ اور جب سے سرکار نے کاشتکاروں کے حقوق تسلیم کرلئے ہیں گانوں میں چوکیدار کی وقعت ہی اور نہیں ہی تو زمیندار کی۔ یہ کسی کا کرہی کیا سکتا ہی کہ کوئی اس سے دبے اور اس کا حکم مانے۔ پس زمینداری اب اس کا نام ہی کہ کاشتکاروں سے جو کچھ وقت پر منّت سے خوشامد سے وصول ہو اپنے پاس سے پورا کرکے سرکار میں بھرا اور حق زمینداری میں تحصیل والوں کی جھڑکیاں سنیں دھکے کھائے حوالات میں رہے اللہ اللہ خیر صلاح گانوں میں واردات ہوگئی تو پہلا مجرم زمیندار۔ بہتیری تدبیریں کرتا ہی کہ بھلا کچھ بچے نہیں تو مہاجن کا سود تو پہنچتا رہے مگر برس کے برس دورے کی ٹڈیوں کا پڑاوا ایک تدبیر کو پیش رفت نہیں ہونے دیتا۔

صلاح کار۔ پھر جناب آپ فائدے سے قطع نظر کیجئے اور جو کچھ آپ کے پاس ہی لئے بیٹھے رہیئے۔ مال عرب پیش عرب اول تو آپ کی پنشن ہی اتنی ہوگی کہ آپ اُس میں سے بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کرلیا کریں گے۔ گرہ سے نہ کھانا پڑے تو یہ فائدہ کیا کم ہی۔ اور اگر آپ روپے سے روپیہ لمانا چاہیں گے تو اس میں تھوڑی یا بہت زحمت بھی ہوگی۔ کم یا زیادہ خطر بھی ہوگا۔

والد۔ روپے کے معطّل ڈال رکھنے کو تو طبیعت گوارہ نہیں کرتی۔ دیکھو کوئی علاقہ ہی مول لوں گا۔ ہر چند زمینداری میں چند در چند قباحتیں ہیں پھر بھی میں خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو زمینداری کرنی نہیں آتی ورنہ بہتیری گنجایش نکل سکتی ہی۔ اور جو ناجائز تکلیفیں زمینداروں کو پہنچتی ہیں تو اُن ہی کی ناواقفیت کی وجہ سے اور اگر اُن کو پورے طور پر اپنے حقوق اختیارات اور ذمہ داریاں معلوم ہوں تو اب بھی زمینداری بسا بہتر چیز ہی اور میں جو اس کو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تو اس کی ایک وجہ خاص اور بھی ہی کہ اب میری ہونے والی ہی پنشن یوں تو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے فضل و کرم سے میں کسی طرح کام سے معذور نہیں۔ اب بھی چھ سات گھنٹے قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اور دس کوس پندرہ کوس بے تکان گھوڑے پر چڑھ سکتا ہوں۔ انگریزوں کی طرح پیدل تو دوڑا نہیں جاتا لیکن یوں ہولے ہولے دو تین کوس

چل لینا کچھ بات نہیں۔ غرض کوئی حاکم مہربان ہو تو پچپن سالہ کے قاعدے سے مستثنیٰ ہو سکتا ہوں مگر اب سرکار کا منشا نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کو انگریزی نہیں آتی بڑے عہدوں پر رہیں تو ایسے سر پڑ کر نوکری کرنی کیا ضرور ہے اور سر پڑتا کیسا میں تو بہتیرا پاؤں پڑوں مگر اگلا ہاتھ بھی دھرے تو میں سوچتا ہوں پنشن ہوئے پیچھے کیا کروں گا۔ ساری عمر کام کرتے گزری تو کوئی نہ کوئی مشغلہ ہونا ضرور ہے زمینداری سے بہتر کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خیر وہ تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری تو کہاں تاہم اس میں ایک طرح کی حکومت ہے۔ غرض بلند شہر کا وہ مشہور گانوں خداداد پور جو آپ نے سُنا ہو والد نے خرید لیا داخل خارج میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ آخر کار دیوانی کرنی پڑی اور ہائی کورٹ سے قبضہ دلا ملا اب والد کی پنشن اور گانوں کی آمدنی ملا کر چھ سات سو روپے مہینے کی معقول یافت ہے۔ مگر چوں کہ والد کو ہمیشہ سے چوڑنے کا مرض ہیں اُن کو کبھی خوش نہیں دیکھتا۔ اگرچہ وہ آپ انگریزی نہیں پڑھے اور اُن کے خیالات بھی کچھ ایسے شگفتہ نہیں ہیں مگر آخر ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے۔ اتنی بات اُن کو زمانے نے سکھا دی تھی کہ مجکو انگریزی پڑھانا ضرور ہے جبلی کفایت شعاری کی وجہ سے وہ مجکو انگریزی پڑھواتے رہے۔ مگر کس طرح کہ اُن کے ملاقاتیوں میں سے یا انگریزی دفتر کے کرانیوں میں میں کسی کے پاس چلا گیا۔ یا کسی کو ڈپٹی صاحب کا ایسا ہی پاس و لحاظ ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے اُس نے تکلیف کی۔ میں نے اِس وضع سے پانچ چھ برس انگریزی پڑھی اور جس کے باپ کو انگریزی نہ آتی ہو اُس کو ایسے طور پر پڑھنے سے جتنی اور جیسی انگریزی آنی چاہیئے مجکو آتی بھی تھی اتنے میں تو سُن پڑا کہ کل سید احمد خاں آنے والے ہیں۔ ڈاک بنگلے میں ٹھیریں گے اور اگلے دن علی گڑھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکچر دیں گے۔ سید احمد خاں کا نام تو سُنا ہی تھا میرے دل میں بھی گدگدی ہوئی کہ اُن کو دیکھوں اور لکچر سنوں۔ بارے والد صاحب اُن سے ملنے گئے تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ والد سے اور اُن سے پہلے کی بھی ملاقات تھی مجھے ساتھ دیکھ کر پہچان گئے ہوں گے کہ اِن کا بیٹا ہے۔ غرض میں نے دُور سے بہت ہی جُھک کر سلام کیا اور اُن کے فرمانے سے ایک کُرسی پر مؤدب بیٹھ گیا۔ والد کی طرح لباس میرا بھی ہندوستانی تھا۔ مگر سادہ۔ اِس واسطے کہ بڑھیا پوشاک نہ وہ آپ پہنتے تھے اور نہ مجکو زرق برق کے کپڑے پہننے دیتے تھے والد صاحب اور سید صاحب دونوں باتیں کر رہے ہیں اور میں سر جھکائے سید صاحب کو کبھی کبھی نیچی نظروں سے دیکھتا جاتا ہوں۔ آخر والد صاحب نے کہا دیکھئے آپ کے منشا کے مطابق میں بندہ زادے کو انگریزی پڑھوا رہا ہوں۔

سید صاحب۔ ایسا انگریزی پڑھوانا کیا فائدہ دے سکتا ہے جب تک تم اِس کو جنٹلمین نہ بناؤ اور وہ تمھاری سوسائٹی میں رہ کر ہو نہیں سکتا۔ بڑی انگریزی پڑھ کر بہت کرے گا تو ایک کرانی بننے کے لائق ہو جائے گا اور ایک اسسٹنٹ اس کو ویسا ہی ذلیل سمجھے گا جیسا ہم لوگ کتے کو سمجھتے ہیں۔

والد۔ تو میں کیا اِس کو کسی سکول میں داخل کر دوں۔

سید صاحب۔ اِن سکولوں اور کالجوں سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اِس کو گھر پر پڑھواؤ۔ جیسا پڑھواتے ہو۔

والد۔ پھر آپ جیسا ارشاد فرمائیں۔

سید صاحب۔ ابھی تک آپ میرے ارشاد فرمانے ہی کے منتظر ہیں میں ولایت تک کی خاک چھان آیا کئی برس مجھ کو بھیک مانگتے

ہو گئے۔ اپنے اوپر کفر کے فتوے لکھوائے گالیاں سُنیں۔ بُرا کہلوایا۔ ابھی تک آپ کو معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ارشاد فرماتا ہوں
اے جناب میں آپ کی خدمت میں بمنت التماس کرتا ہوں کہ آپ اس کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میں اس کو لے جا کر علی گڑھ
کالج میں داخل کر دوں۔ ابھی تک آپ نے اس کو پڑھوایا ہی اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہی میرے اور آپ کے سامنے بھیگی
بلی بنا ہوا بیٹھا ہی۔ گویا یہ آدمی نہیں اور نہ یہ سمجھتا ہی کہ میں بھی آدمی ہوں۔ میں اس کو لے جاؤں گا اور آدمی بناؤں گا اس کو
سکھاؤں گا کہ تو کیا ہی اور تجھکو کیا ہونا چاہیئے۔ یہ پہلے اپنی عزت آپ کرے گا اور پھر دوسروں سے طلبگار ہوگا کہ اس کی
عزت کریں اسسٹنٹ جنٹ کلکٹر کیا چیز ہیں۔ اس سے لاٹ صاحب کے آگے بھی ہاتھ نہیں جوڑے جائیں گے ہاتھ
جوڑنے کے عوض یہ اُن سے شیک ہینڈ کرنا چاہے گا اور اُن کو شیک ہینڈ کرنا پڑے گا اور وہ اس کے ساتھ شیک ہینڈ
کرنے سے اتنے خوش ہوں گے جتنے تمھارے ہاتھ جوڑنے سے نہیں ہوتے یہ انگریزوں سے نہیں ملے گا اس طرح
پر جس طرح تم لوگ ملتے ہو کہ احاطے کے باہر سواری سے اُترے اور دبے پاؤں اندر گئے جس کی بڑی رسائی ہوئی شاگرد
پیشوں میں بیٹھا۔ ورنہ ذلّت اور بے عزتی کے ساتھ دُور دُور پڑا پھرا۔ بڑی لمبی چوڑی عزت رکھتا ہی تو گھنٹوں کے
انتظار کے بعد بُلایا گیا۔ کھڑے کھڑے سلام کیا۔ رخصت۔ صاحب کچہری جانے لگے۔ باؤ کشما فراشی آداب بجا لائے
دل میں فرض کر لیا کہ دیکھا اور پہچانا خوشی خوشی واپس آئے اور گھر جا کر شیخی بگھاری۔ یہ انگریزوں سے ملے گا۔
جس طرح ایک جنٹلمین ایک جنٹلمین سے ملتا ہی۔ ملاقات کے اوقات معلوم ہیں۔ عین برآمدے میں سواری لے
گئے۔ کارڈ بھیج دیا صاحب آپ باہر آکر لے گئے۔ یا اُن کو ملاقات کے کمرے میں بٹھایا۔ تیار ہو کر آئے۔ ہاتھ ملایا بٹھایا
جی کھول کر باتیں کیں عزت سے گئے تھے۔ آبرو کے ساتھ رخصت کیا۔ اور ہمارے کالج کے لڑکے اسی طرح اب انگریزوں
سے ملتے ہیں۔ جج اور کلکٹر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور دوستانہ ان کے ساتھ مدارات کرتے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہوا کر اس وقت
ہم دونوں باپ بیٹے رخصت ہو آئے۔ اگلے دن سید صاحب نے مسلمانوں پر لکچر دیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ لکچر تھا یا سحر تھا۔
سید صاحب آپ بھی روئے اور سُننے والوں کو بھی ایسا ایسا رُلایا کہ لوگوں کی ہچکی بندھ بندھ گئی۔ بندے کو ایک بار میر
انیس کے سُننے کا بھی اتفاق ہوا ہی۔ عجب باکمال آدمی تھا۔ رزم پڑھ رہا ہی اور لوگ ہیں کہ اُچھل اُچھل پڑتے ہیں اور ہر
طرف سے واہ واہ اور تحسین کی صدا بلند ہے کہ دفعتہً پکارا صاحبو! اپنے اپنے رومال سنبھالو کہ میں کچھ رقت آمیز بند پڑھنے
کو ہوں۔ اس کے بعد تو مجلس کی یہ کیفیت ہوتی تھی جیسے مرغ بسمل۔ میر انیس اہل بیت نبوی علیہ السلام کے مرثیہ خواں
تھے اور سید احمد خاں مسلمانوں کی قوم کے مرثیہ خواں ہیں۔ وہ اپنے فن میں طاق تھے۔ یہ اپنی شان میں یکتائے روزگار
ہیں۔ اگرچہ میرے سامنے ہی سید احمد خاں صاحب نے والد سے مجھے علی گڑھ بھیج دینے کے لئے کہا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ
والد صاحب اتنا خرچ گوارا نہیں کر سکیں گے۔ دوبارہ والد اکیلے سید احمد خاں سے ملنے گئے۔ خدا جانے کیا سمجھا یا کہ گھر
آتے کے ساتھ میری کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ مجھ کو سید صاحب کے ساتھ کر دیا۔ پہلے ہی مہینے میں دو سو
ساڑھے بارہ روپے کا بل گیا۔ والد تو بہت گھبرائے کہ یہ کیا آفت آئی۔ اور سید صاحب کو لکھا کہ میں ایسی تعلیم سے
باز آیا میرے لڑکے کو اُلٹا بھیج دیجئے۔ مگر اس لکھا پڑھی میں اتنا عرصہ گزرا کہ میرا جی لگ گیا تھا۔ میں نے والد صاحب

کو صاف لکھ دیا کہ میں پڑھوں گا اور علی گڑھ کالج ہی میں پڑھوں گا۔ نوبت بانیجار سید کہ آخر کار والد صاحب خود تشریف لائے اور میرے ٹھاٹھ دیکھ کر بہت ہی ناراض ہوئے۔ اور مارے غصّے کے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا ترقی کی ہے کہ آج میں کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان ہوں۔ جمناسٹک میں ہمیشہ اول رہتا ہوں۔ تین بار رننگ ریس جیت چکا ہوں۔ پڑھنے میں میرا سائنس کمزور ہے مگر تلفظ ایسا اچھا ہے کہ کئی انگریزوں نے میرے مونہ پر تعریف کی ہے۔ تاہم میں امید کرتا ہوں کہ امسال انٹرنس ضرور پاس کر لوں گا۔ میں خانگی جھگڑوں کے بیان کرنے سے آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا خلاصہ یہ کہ والد نے بات کا ایسا تبنگڑ بنایا کہ ناخوش ہو کر شہر میں جا رہے اور سارے کنبے کو جمع کر لیا اور مجھ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالنا چاہا۔ مگر اصل مرغے کی ایک ٹانگ میں نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی ہٹ پر جما رہا۔ اور میں نے سب کو یقین دلا دیا کہ اگر میرے ارادے میں ناکامیابی ہوگی تو میں اپنے تئیں ہلاک کر دوں گا اور چونکہ میں ایک بیٹا ہوں اور سوائے اس کے کہ جنٹلمین کی شان سے رہنا چاہتا ہوں۔ کسی طرح کا الزام میرے ذمّہ عائد نہیں ہو سکتا تھا اور لوگ والد کی کفایت شعاری اور جزرسی سے بے وجہ ناراض بھی تھے۔ سب نے والد ہی کو قائل معقول کیا کہ تمھاری یہ عمر آئی کہ تم گویا قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہو اور تمھارے اندھیرے گھر کا یہی ایک چراغ ہے تم نے اب تک جو کچھ کیا اسی کے لئے کیا اور اب بھی جو کچھ کرتے ہو اسی کے لئے کرتے ہو۔ کیوں اس کو ضد دلاؤ۔ جوان لڑکا ہے ایسا نہ ہو اپنی جان پر کھیل جائے اور اگر خراب کرنے پر آئے گا تو آج نہیں کل تمھارے بعد اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اُس وقت کون اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ ہماری صلاح مانو تو خداداد پور اس کے سر مار دیہ جانے اور اس کا کام جانے۔ جو چاہے سو کرے تم جب تک جیتے ہو پنشن ہے تمھاری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔ اور آخر یہ بھی بڑے نام و نمود کے کالج میں پڑھتا ہے اور سنتے ہیں کہ یہاں لڑکوں کے چال چلن کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ انگریزوں سے ملنا جلنا ہے اور یہ لوگ جیسے منتظم ہوتے ہیں ظاہر ہے کچھ تو ان کی خو بو اس میں بھی آئی ہوگی۔ دودھ پیتا بچہ نہیں اتنا تو سمجھتا ہوگا کہ اگر جایداد کو ضائع کر دوں گا تو یہ اللے تللے کی زندگی کیسے نبھے گی۔ کچھ پس و پیش نہ کرو بسم اللہ کر کے خداداد پور پر اس کا نام چڑھوا دو کہ اسی کے سر پہ بوجھ رہے۔ یہ خداداد پور جس پر اب میں اکیلا قابض و متصرف ہوں مجھے زندگی شروع کرنے کے لئے بہت ہے۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ انٹرنس پاس کیا اور میں ولایت روانہ ہوا۔ خداداد پور پر مجکو پندرہ بیس ہزار روپیہ مل جانا کچھ بات نہیں تین برس میں ولایت رہوں گا۔ بیرسٹری کے لئے قانون پڑھوں گا۔ انگریزی میری اب بھی اچھی ہے۔ ولایت میں اور بھی اچھی ہو جائے گی۔ بیرسٹری کے امتحان میں کسی کو فعل ہوتے سنا نہیں کچھ لکچر ہوتے ہیں کہ وہ سننے پڑتے ہیں۔ بے شک میں اونچے درجے کی سوسائٹی میں ملوں جلوں گا۔ اور کسی نہ کسی مِس کے ساتھ اپنی ٹپس جما لوں گا۔ میں نے تحقیق سنا ہے کہ وہاں شادی کر لینا کچھ بات نہیں عورتوں کو مرد کم ملتے ہیں اور خوش حال آدمی پر مِسیں اس طرح گرتی ہیں جیسے شہد پر مکھیاں جب میں بیرسٹری کا ڈپلومہ اور میم لے کر ہندوستان واپس آؤں گا تو میں سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں گا دنیا میں۔

ب۔ نہیں نہیں۔ تم سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوگے دنیا میں۔

الف ۔ کیا اس وجہ سے کہ میں ولایتی بی بی کا خرچ نہیں چلا سکوں گا ۔ ذری مجکو بیرسٹری کا ڈپلومہ تو لے آنے دیجئے تو دکھا دونگا کہ انگریزی گفتگو کے ذریعے سے کتنا کما سکتا ہوں ۔

ب ۔ میں نے خرچ کے لحاظ سے نہیں کہا ۔ آپ تو ماشاءاللہ بیرسٹری کے بدون بھی اتنا مقدور رکھتے ہیں ۔ بلکہ میں نے اختلافِ صورت اختلافِ مزاج ۔ اختلافِ طبیعت ۔ اختلافِ رسم و عادت ۔ اختلافِ مذاق ۔ اختلافِ وضع ۔ اختلافِ مذہب ۔ اختلافِ حالت کے اعتبار سے کہا کہ اتنے اختلافات کیے ہوتے یہ پیوند محض بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اور میں یقین نہیں کرتا کہ یہ گنگا جمنی رشتہ تم دونوں میں سے کسی کو بھی سازگار رہے ۔

الف ۔ اگر ہم طبیعت اور رسم و عادت اور کیا اور کیا کے ایسے مغلوب ہیں تو ہمارا اس کالج میں رہنا لاحاصل ہے میں اپنے تئیں دیکھتا ہوں کہ بالکل بدل گیا ہوں اور نیٹو سوسائٹی سے مجکو سخت نفرت ہے ۔ اور مجکو ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی اور برسویں دن تعطیل میں بمجبوری گھر جاتا ہوں تو گھر مجھ کو پھاڑے کھاتا ہے ۔ اور یہی سبب ہے کہ میں ولایتی بی بی لانی چاہتا ہوں ۔

ب ۔ یہ تمہارا خدعِ نفس ہے اور میں تمہاری رائے کی تردید میں اتنے واقعات چشم دید پیش کر سکتا ہوں کہ ان کو سننے کے بعد ضرور تم کو اپنی رائے بدلنی ہوگی ۔ میں نہیں کہتا کہ انسان اپنے اختیار سے اپنی کوئی چیز نہیں بدل سکتا ۔ اگر ایسا ہو تو صحبت اور تلقین و تعلیم اور افہام تفہیم سب کو لغو و لاطائل ماننا پڑے گا مگر ہاں یہ ضرور میری رائے ہے کہ بعض باتیں انسان میں ایسی بھی ہیں اور وہ شاید اس کی خاص فطرت میں داخل ہیں کہ وہ ان کو مشق و مہارت سے کم تو کر بھی سکے مگر مطلقاً معدوم نہیں کر سکتا ۔ ازاں جملہ ایک مذاق ہے کہ اس کی جڑ طبیعت سے نہیں نکلتی نہیں نہیں نکلتی ۔ بندے کے والد اصل میں یہاں کے ہیں ۔ اور کوئی دس گیارہ برس کی عمر سے شہر میں آئے اور تب سے برابر شہر ہی میں ہیں مگر میں دیکھتا ہوں تو ان کی طبیعت چنے کے ساگ بتھوے کی بھوجی ۔ جوار کی روٹی ایسی چیزوں کو للچایا کرتی ہے اور باوجودیکہ گھر میں لوگ ان کو چھیڑتے بھی ہیں ۔ مگر وہ مذاق سے مجبور ہیں اور جب کبھی ان کو اپنی مرضی کی کوئی چیز مل جاتی ہے اگرچہ کم ملتی ہے اور مشکل سے ملتی ہے مگر جب کبھی مل جاتی ہے تو ایسے چاؤ سے کھاتے ہیں کہ کبھی پلاؤ زردے کو بھی اس رغبت سے کھاتے نہیں دیکھا اس سے زیادہ عجیب ایک بات سنو کہ مسٹر فلاں کو یہ انگریزی طرز اختیار کیے ہوئے میں جانتا ہوں تیس برس سے بھی زیادہ ہو گئے ہونگے ۔ تیس برس کی عادت کو طبیعتِ ثانیہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں اور چونکہ خدا نے ان کو بہت بڑا مقدور دے رکھا ہے جس قدر تکلف سے رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں ۔ اور یہ سارے نخرے دولت ہی کے ہیں تو ان سے کوئی انگریزی شان چھوٹنے نہیں پائی اور انگریزی ریل اور پولیس کے سٹریل یوروپین نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ولایت زاد ۔ یہ صاحب ایک دفعہ پڑے بیمار ۔ ہلکا سا بخار تھا مگر امیری کے چوچلے ان کے لیے وہ بھی بڑا ہی خطرناک تھا ۔ دن میں گھنٹے گھنٹے بعد ٹمپریچر لیا جاتا تھا انگریز تو بلا کے موجد ہیں ۔ تھرمامیٹر کے قسم کی ایک نلی نکالی ہے اس سے حرارت کا درجہ معلوم ہوتا ہے جو چاہے دیکھ لے ۔ اس نلی کے آگے نبض اور قارورے اور زبان کی رنگت کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی ۔ اس نلی کو پہلے مریض کی بغل میں رکھتے تھے ۔ اب منہ میں رکھنے لگے ہیں ۔ آیندہ دیکھیے کہاں رکھنا تجویز کریں غرض دن میں گھنٹے گھنٹے

بعد ٹمپریچر لیا جاتا اور ایک کتاب میں لکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لے کر باہر آتا اور مریض صاحب کے اعزہ اور احباب
اور خوشامدی اور اہل اغراض اُس کو آ چھٹے اُن لوگوں کو مریض کی حرارت کی اُتار چڑھاؤ کی ایسی لگی رہتی تھی کہ آج کسی چیچ
کے اُتار چڑھاؤ کی بھی کسی کو نہیں لگی رہتی۔ بعض کے تو ایسے مغز چلے ہوئے تھے کہ وہ مریض کا بلٹن نکالنے کی فکر میں تھے
جیسا آئے دن بڈھے گلیڈسٹن کا نکلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بیچارہ ہے کہ جنبش نہیں کھاتا۔ ڈاکٹروں نے اوپر تلے
کونین کی ایسی بھرمار کی کہ اس کی پوست سے مریض کو بھکنا لگ گیا۔ اِس بھکنے میں بیمار کو مہیر کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بیمار
داروں میں کوئی سمجھتا نہ تھا کہ مہیر کیا چیز ہے اور جو اُن کے عزیز سمجھتے تھے وہ مارے شیخی کے بتا نہیں سکتے تھے کہ سوائی
ہوگی۔ مہیر غالباً جوار یا اسی قسم کے کسی اناج کے دلیے کا نام ہے جو دیہات میں چھاچھ کے ساتھ پیا جاتا ہے۔ بیمار نے
کبھی بچپن میں اپنے گھر میں پیا ہوگا اور اُن کی روح مہیر میں ایسی پڑی تھی کہ بھکنے میں مہیر ہی مہیر رٹتے تھے۔ تو جب ایسے
شخص کا مذاق نہ بدلا تو کیونکر باور کر لیا جائے کہ تمھارا یا کسی کا مذاق بدل سکتا ہے۔ اور یہ تو ہم نے مثال کے طور پر بیان
کیا۔ کتنی ایسی باتیں ہیں کہ طبیعت میں جمیں تو جمیں پھر ساری عمر نہیں نکلتیں۔ کیا تم پسند کروگے کہ تمھاری بی بی فل ڈریس
پہنے۔ کیا تم پسند کروگے کہ وہ غیر مردوں کے ساتھ بغل گیر ہو کر بال میں ناچے۔ بشرطیکہ تمھارے تعلق کی وجہ سے
کوئی انگریز اُس کے بال میں بلانے یا آنے کا روادار نہ ہو۔ کیا تم پسند کروگے کہ وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ آمد و شد یا خط
کتابت رکھے اور تم اس سے اتنا بھی نہ پوچھ سکو کہ کہاں جاتی ہو یا اتنی دیر کہاں رہیں یا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے۔ شاید
تم اپنی بات کی پچ پر آکر کہہ دوگے کہ ہاں پسند کروں گا۔ اور بے شک تم اس وقت ایسا ہی خیال کرتے ہوگے۔ مگر بھائی
جان! منہ سے کہہ دینا آسان ہے اور عمل میں لانا مشکل۔ جب تمھاری بی بی کے ساتھ تمھارے دیکھتے کوئی لگاوٹ کی باتیں
کرے اور تم کو بُرا نہ لگے تو جانیں۔ جب تک تمھاری رگوں میں ہندوستان کا بلکہ مجھ کو کہنا چاہیے مسلمان کا خون ہے ممکن
نہیں کہ تم ایسا اختلاط ایسا گاڑھا ربط ضبط ایسی بے تکلفی دیکھو اور بدگمان نہ ہو۔ الرجال قوامون علی النساء[1] کی آواز
اُس وقت سے ہمارے کان میں پھونکی گئی ہے جب ہم صرف اتنا ہی سمجھتے تھے کہ عورت ماں کو کہتے ہیں اور مرد باپ کو یا
عورت بہن کو کہتے ہیں اور مرد بھائی کو۔ اور اگرچہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کی تعمیل میں بہت پہلو تہی کرنے لگے ہیں مگر الرجال
قوامون علی النساء کے قاعدے پر بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ اور ہمارا قومی مزاج اسی قسم کا واقع ہوا
ہے کہ ہم عورتوں پر حکمرانی کرنے کو اپنا حق لازمی سمجھتے ہیں اور ہم نے ہر ایک گھر میں اس قاعدے کو ایسے عام طور پر
برتتے جاتے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں اس کے توڑنے کا نام لیا جاتا ہے وہیں فساد ہوتا ہے۔ جب تم کو شخصی مزاج کے بدلنے
پر پوری قدرت نہیں تو قومی مزاج بدرجۂ اولیٰ تمھارے بس کا نہیں۔ اور یورپ میں بالکل اس کا اُلٹ ہے
النساء قوامات علی الرجال تو تمھارا انگلش لیڈی سے شادی کرنا اور سازگاری کی امید رکھنا اس سے زیادہ امکان
وقوعی نہیں رکھتا جیسے کوئی شخص جون اور دسمبر کو ملا کر ایک معتدل موسم بنانا چاہے۔ میاں بی بی ایک اختلاف
سے دونوں آدمی ہو اور کوئی صفت مشترک نہیں۔ علاوہ اس کے جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا تو کچھ

[1] عورتوں کے کارفرما مرد ۱۲

ٹھیک بات نہیں ۔ ولایت کی بات تو رہی ولایت کے ساتھ اِس ملک میں ہم ہندوستانیوں کو ولایت کی سی آزادی تو نہ
نصیب ہوئی ہو ۔ اور نہ کبھی نصیب ہوگی ۔ ہم میں اور انگریزوں میں فاتح و مفتوح کا تفرقہ ہو ۔ جو نہ مٹا ہو اور نہ مٹ سکتا
ہو ۔ بنگالی پڑھتے ہڑبڑائیں اور سید احمد خانی بلا سے اپنے مونہ میاں مٹھو بنیں ۔ یہاں کے انگریزوں کو کب خوش آتا ہو
کہ ہم اُن کو چھیڑیں اور چڑائیں کوٹ پتلون بُٹ تک کا تو خیر چنداں مضایقہ نہ تھا ۔ بعض کریم النفس انگریز ایسا بُرا
بھی نہیں مانتے ۔ مگر داماد بننا تو ہمارے یہاں بھی کھلی کھلی بے نقط گالی ہو ۔ تو تم انگلش لیڈی لا کر اپنی عزت تو کیا بڑھاؤ
گے اُس بیچاری کو بھی اُس کے ہم وطنوں اور ہم قوموں کی نظر میں ذلیل کردوگے اور اِس گستاخی کا خمیازہ بھگتو گے
سو الگ ۔ انگلش سوسائٹی تم کو اپنے میں لے گی نہیں اور ہندوستانی سوسائٹی سے خود تم کو گریز ہوگا ۔ تو تم دو میاں
بی بی شہر کے باہر اکیلے بنگلے میں پڑے کیا بھلے لگوگے ۔ ازیں سو رانده وزاں سو درمانده ۔ ممکن ہو کہ شروع شروع
میں تم کو میم صاحب کے ساتھ ایسا شغف ہو کہ کسی کا کسی وقت خللِ اندازِ صحبت ہونا تم کو پسند نہ ہو لیکن پھر
سوسائٹی کی تم کو حاجت ہو اور رہو تو انگلش لیڈی کے تمہارے قیدِ نکاح میں آنے سے تم دونوں کو ساری عمر قید
تنہائی میں رہنا ہوگا ۔ اِس کو سمجھ لو ۔

الف ۔ خیر تو میں یوریشین لیڈی کروں گا ۔

ب ۔ ع ۔ بریں عقل و دانش بباید گریست ۔ اے وہ ۔ ۔ ۔ نہیں چھی چھی ۔ بات تو وہی کی وہی رہی ۔ اور اگر تمھاری
قسمت میں یہی مصیبت لکھی ہو تو انگلش لیڈی بمدارج بہتر ۔ دوغلے نہ اُدھر نہ اِدھر یہ بلا کدھر ۔ عیب دیکھو تو چُن
چُن کر دونوں قوموں کے موجود اور ہنر کے نام نہ اُن کے نہ اِن کے ۔ اور ایسی ہی نسل تم بھی چلانی چاہتے ہو کہ خچر کی
طرح پوچھیں باپ کو تو بتا دے ماں کو ۔ اِس پر ایسا قہقہ اُڑا کہ بیچارے الف ہمزہ کے سے بل کھا کر رہ گئے ۔ اِس کے
بعد کمیٹی کے کئی جلسوں میں اس پر بحث رہی کہ اگر آدمی کو اپنے پسند کی بی بی کرنے کا موقع ملے تو اُس کو کون کون
سی صفت کا گرویدہ ہونا چاہیئے اکثر کی یہ رائے تھی کہ حسن صورت کا اِس واسطے کہ یہی حسنِ صورت ہو جو ابتدا مرد
اور عورت میں کٹنی کا کام دیتا ہو ۔ لیکن ہماری کمیٹی کے معزز ممبر ص لسر جن کی رائے پر ان معاملات میں اکثر وں
کا صاد ہوتا ہو کہتے تھے کہ نہیں ۔ میں اُن کی عبارت ہی بلفظہا کیوں نہ نقل کروں جس سے اُن کا مطلب بخوبی
سمجھا جائے اُنھوں نے کہا کہ حسنِ صورت کی مخالفت سے میری یہ غرض نہیں کہ دلوں کو حسن صورت کی طرف سے
پھیر دوں اُس کی پسندیدگی کو میں قریب قریب تقاضائے طبیعت سمجھتا ہوں ۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح
انسان اور بہت سے بے اصل خیالات کیا کرتا ہو اُن میں سے ایک حسنِ صورت بھی ہو ہر ایک ملک کے آدمیوں نے
ایک خاص طرح کے رنگ ایک خاص طرح کے تناسبِ اعضا رکو اچھا سمجھ رکھا ہو اور کوئی پوچھے کہ کیوں تو کچھ
بتا نہیں سکتے ۔ لیکن یہ خیال اب راسخ اور ایسا عام ہو کہ دنیا کے فسادات میں سے ایک تہائی ضرور اِس کی وجہ سے
ہیں چنانچہ لوگ زر ۔ زمین ۔ زن ۔ تین چیزوں کو برابر کے درجے میں فساد کی جڑ کہتے بھی ہیں ۔ کوئی ایسا ہی زبردست
حکیم یا صوفی ہو تو اِس خیال کو مٹائے یا دبائے خدا جانے مزاج کی نفاست ہو یا جنون ہو جس کو دیکھو حسن صورت

پر سفتوں ہی حسنِ صورت بے اصل ہو یا نہ ہو مگر اُس کے بے ثبات ہونے میں تو کچھ شک نہیں تو میرا کہنا یہ ہی کہ اگر صرف حسنِ صورۃ مدارِ تعلق زناشوئی ہو تو دونوں میں کےؑ دن بنیھے گی - ایک طرف خدا کا فرمان ہی کہ آدمی پیدا ہوا ماں کے دودھ سے پرورش پائے پھر جب دودھ کفایت نہ کرسکے تو اُس کو غذا کی چاٹ لگے - اور غذا کے چبانے اور نرم کرنے کے لئے اُس کے دانت نکلیں اور تا کہ ایک حد تک وہ جلد جلد بڑھے - اور اُس کی جسمانی اور دماغی قوتیں ترقی پکڑیں اُس کے اعضا میں پھرتی ہو اور حواس میں تیزی - پھر وہ چند بے ایک حالت پر ٹھیرے اور پھر از خود گھٹنا اور مضمحل اور کمزور ہوتا جائے **قطعہ**

ایک وقت تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے — پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر — باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

اور جیسے ابتدا میں مٹی سے بنا تھا آخر کار مٹی میں جا ملے - مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى

غرض ایک طرف تو خدا چاہتا ہی کہ یہ خاک کا پتلا دنیا کی بھول بھلیاں میں گشت کر کرکے اپنی جگہ پر لوٹ آئے دوسری طرف آدمی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی ہی مسجد بنانے کی فکر میں ہی - وہ بھول بھلیاں میں آکر سب کچھ بھول بسر گیا اور سمجھتا ہی کہ بھول بھلیاں میرا گھر ہے تو میں اس سے نکلوں کیوں اور باہر جاؤں کس لئے یہ قدم قدم پر ٹھٹکتا اور مچلتا ہی - لیکن خدا کی طرف سے ایک نہ ایک سطر اس کے پیچھے لگا ہی وہ اس کو ٹھہرنے نہیں دیتا - یہ رکا اور اس نے آگے کو دھکیلا یہ اڑا اور اُس نے ہانکا - اس کی بیہودہ ہٹ تو دیکھو کہ جوانی تو جوانی پیری تک چاہتا ہی کہ میں بچہ ہی بنا رہوں - ورنہ سٹھیا جانے اور سترے بہترے ہونے کے معنی کیا اِس نے جوانی کا رنگ و روغن باقی رہنے کے لئے پوڈر اور خضاب لگائے ہیں -

باقی ہی شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی — کالا کرے گا مونہہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

کاٹھی کا کساؤ قائم رکھنے کو چست لباس اور لوہے کے تاروں کے شکنجے ایجاد کئے ہیں - دانتوں کے لئے منجنوں اور غراروں کے علاوہ یہ بندش کی ہی کہ ان کو باندھ کر رکھتا ہی - لیکن یہ سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں سہ

گر فتم سال را کردی با موچہ سازی — گر فتم موئے را کردی سیہ با ردچہ سازی

آدمی اپنے جیسے احمقوں کو بہکا سکتا ہی مگر خدا کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی - اگر مرا نہیں تو جو بچہ ہی وہ جوان ہوگا ضرور - جوان بوڑھا ہوگا بے شک - بوڑھا ایک نہ ایک دن مرے گا لاکلام - انسان کو خدا نے عقل دی ہی اور صاحب فہم و شعور بنایا ہی اُس کو زیبا ہی کہ ناداں بچوں کی طرح چند روزہ زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو - اور جو شخص ایسی چیزوں سے متلذذ نہ ہوتا ہو اُس کی حالت اُس شخص سے زیادہ اطمینان کے لائق ہیں کہ ایک دریا ہی عمیق جس کی تھاہ نہیں اور اُس میں ایک جگہ ایسا بھنور پڑتا ہی کہ اُس کا گرا ہوا کبھی اچھلا ہی نہیں اور اُس میں بے شمار مردم خوار ناکے اور گھڑیال مونہہ کھولے پھرتے ہیں - اِس بھنور کے عین کنارے پر وہ شخص کھڑا ہو اور کنارے کی مٹی ایسی بھربھری ہی کہ ہمہ وقت دریا اُس کو کاٹتا رہتا ہی کیا بھروسا ہی کہ یہ شخص کسی وقت غڑاپ سائی بھنور میں جا رہے گا اور کیا معلوم بھنور میں گرتے پیچھے اس کو کوئی جانور نگل لے گا یا پانی کا کھنا و اُس کو نہیں اُچھلنے دے گا - یہی حال حسن بے ثبات کا ہی خدا کسی بھلے مانس کو اس کی چاٹ ہی نہ لگائے - جن لوگوں کو اس کی لت پڑی دیکھی ہی اول تو ان کی نیت کچھ ایسی

ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین ہی میں تم کو لوٹا کر لیا ہیں گے اور اسی سے پھر ایک بار تم کو نکال کھڑا کریں گے - ۱۲

ڈانواڈول ہو جاتی ہی کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور اِن کی رال ٹپکی دوسرے وہ جو کہا ہی
حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَ يُصِمُّ[1] بس ایسی محبت پر صادق آتا ہی۔ لوگوں نے اِس کے پیچھے مال تلف
کیئے۔ آبروئیں کھوئیں اور بہتیروں نے جانیں بھی گنوائیں۔ اور اِس میں مبتلا بھی اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بازاری طور کے ہیں یعنی
آبرو باختہ۔ لوگوں کی نظروں میں سُبک۔ کچھ تو دین نے روک تھام کی اور بہت کر کے لوگ ان خرابیوں کو بھی دیکھ کر ڈرے جو حسن
پرستوں کو آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور پیش آتی ہیں۔ اِس سے یہ ہُڑک بہتوں کو نہیں اُبھرنے پاتی ورنہ ہمارے
یہاں کی شاعری نے تو بچے بچے کو فرہاد و مجنوں بنا ڈالا ہوتا اور پھر دیکھتے اُس کی جان کا دشمن ہیں۔ اور میرے خون کے پیاسے
تم۔ لیکن کان پڑی ہوئی آواز خالی تھوڑی ہی جاتی ہی۔ جن کے مونہہ پر مہر ہی اُن کے دلوں میں بھی دفتر لکھے پڑے ہیں۔ جو آنکھ
بھر کر نظر کرنے کو جائز نہیں رکھتے۔ ساری رات اِسی کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ تقریر سن کر سارے ممبروں میں ایک سناٹا سا گزر گیا۔
اور کسی سے اتنا نہ ہو سکا کہ حسنِ صورت کی تائید میں ایک لفظ تو مونہہ سے نکالتا۔ اِس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ایک صاحب
نے چھوٹتے ہی یہ سوال پیش کیا کہ اگر کسی کو اتفاق سے دولتمند بی بی ملتی ہو تو کمیٹی اُس کو کیا رائے دیتی ہی۔

م۔ دنیا میں اِس سے بدتر کوئی ذریعہ معاش ہو نہیں سکتا۔ اور جن لوگوں کو ایسی دولت مل گئی ہی ہمیشہ حقارت کی نظر
سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور اِس کی مثالیں کثرت سے تو نہیں مگر ہاں موجود ہیں۔

س لیکن لوگوں کو کیا حق ہی کہ ایسے شخص کو ذلیل سمجھیں۔ اُس نے کسی کا مال نہیں مارا۔ چوری نہیں کی امانت میں خیانت نہیں کی
کسی ناجائز طریقے سے روپیہ نہیں کمایا۔ دنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں۔ جن کو خدا بے زحمت دے دیتا ہی۔ لوگوں کو بخت
واتفاق سے کبھی کے دبے گڑے خزانے مل گئے ہیں۔ یا کسی اَور طور پر غیر متوقع فائدے پہنچے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ خدا
دینے پر آتا ہی تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہی۔ نری خیالی بات تو نہیں ہی۔ ایسا ہوا ہی اور ہو رہا ہی اور ہوتا رہے گا۔ سینکڑوں
ہزاروں آدمی ایک ہی ذریعہ سے معاش پیدا کرتے ہیں سب کے سب کی ایک حالت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص بی بی کے
ذریعے سے مالدار بننا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک اِس میں کوئی قباحت نہیں۔ شاید دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا
نہیں نکلے گا جس نے دوسرے کی دولت سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ اور نہیں تو اِس نے بزرگوں ہی سے کچھ نہ کچھ میراث
میں پایا ہوگا تو وہ دوسرا شخص بی بی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ جو آپ نے کہا کہ لوگ نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا
ہوں کہ رشک و حسد اِس کا باعث ہوتا ہوگا۔ جس سے شاید کوئی نفس بشر خالی نہیں۔ لوگ کسی کی دو دوا و چُپڑی نہیں
دیکھ سکتے۔

م۔ تو کیا آپ اسی کو جائز رکھتے ہیں کہ شوہر بی بی کا گنونڈا ہو کر رہے۔

س یہ سوال خارج از بحث ہی۔ اول تو ضرور نہیں کہ ہر ایک مالدار بی بی اپنے مالدار ہونے کی وجہ سے نکتوڑے کرے اور فرض
کیا کہ کرے تو شوہر کو یوں بھی بی بی کی ناز برداری کرنی پڑتی ہی نہ کہ مالدار بی بی ہی کرنی کیا ضرور ہی۔ اور ایسی مثالیں بھی میری

---

[1] کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہی ۱۲

سماعت میں آئی ہیں کہ مالدار بیبیوں نے دفع بدگمانی کے لئے معمول اور توقع سے زیادہ شوہروں کی اطاعت کی ہی۔

م۔ کچھ بھی ہو اپنی حمیت تو تقاضا نہیں کرتی کہ جوروکے دست نگر ہو کر رہیں۔

س۔ آپ شاید کسی بات میں بھی بی بی کا شوہر سے بہتر ہونا پسند نہیں کرتے۔

م۔ بے شک۔

س۔ صورت شکل پر بھی عورت کو ویسا ہی ناز کرنے کا موقع ہی جیسا دولت پر۔

ج۔ ہاں لیکن وہ ناز اَور قسم کا ہی اور یہ ناز اَور قسم کا۔

اس ردّ و کدّ میں کوئی بات طے ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ ص صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ بات یہ ہی کہ ہمارے پاس اِس خاص بارے میں خدا کا فرمودہ موجود ہی جس سے بخوبی اِس مراغ کا فیصلہ ہو جاتا ہی وہ جو میں نے کمیٹی کے کسی جلسے میں قرآن کی ایک آیۃ پڑھی تھی الرجال قوامون علی النساء وہ حقیقت میں پوری آیۃ نہیں بلکہ آیۃ کا ایک جزو ہی اور مجکو اس وقت اسی جزو سے کام لینا تھا۔ اس جز کے ساتھ اتنا اَور بھی ہی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ[1] اِس آیۃ میں خدا نے عورتوں پر مردوں کے قوّام یعنی حکمران ہونے کے دو سبب بیان کیے ہیں۔ ایک مردوں کی فضیلت مطلق عورتوں پر لیکن وجہِ فضیلت بیان نہیں فرمائی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً مرد مطلقاً عورت پر فضیلت اور برتری رکھتا ہی۔ اور یہ فضیلت خلقی ہی اِس قسم کی جیسے انسان کی فضیلت جانوروں پر۔ کہ گھوڑا اگرچہ وہ نجدِ عرب کا ہو اور اگرچہ وہ سکاب کی نسل مستند کا ہو۔ تاہم اس پر فضیلت ہی انسان کو اگرچہ وہ حبشی یا وحشی یا گونڈ یا بھیل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا سبب عورتوں پر مردوں کے حکمران ہونے کا فرمایا ہی۔ وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ[2] کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یعنی مہر دیتے اُن کے نان ونفقے کا بار اُٹھاتے تو جو شخص عورت کا دست نگر ہو کر رہنا چاہے وہ پھر بھی قوّام ہوگا اِس لئے کہ اُس کی خلقت میں فضیلت باقی ہی اُس سے کسی حالت میں جدا نہیں ہو سکتی۔ مگر ادھورا کیونکہ اُس کو وہ دوسری خرچ کرنے کی فضیلت حاصل نہیں اور جو شخص مالدار بی بی ڈھونڈتا ہی آخر کوئی نہ کوئی اُس کی غرض و غایت تو ضرور ہوگی اور وہ سوائے اِس کے کیا ہو سکتی ہی کہ وہ بی بی کے مال سے متمتع ہونا چاہتا ہی۔ اور یہ دلیل ہی اُس کے قصورِ ہمت کی۔ اور افسوس ہی کہ ہمارے کالج کا کوئی طالب العلم ہماری کمیٹی کا کوئی ممبر ایسے پست خیال کو ایک منٹ کے لئے بھی اپنے دل میں آنے دے۔ آخر وِلایت آدمی ہی پیدا کرتے ہیں۔ اور جو دوسرے آدمیوں نے کیا ہی یا دوسرے آدمی کرتے ہیں کیا وجہ کہ ہم نہ کر سکیں اور اگر ہم ہمت ہار دیں گے تو بُرے نمونے ہوں گے اپنے ابنائے جنس کے لئے۔ اور موجب بدنامی ہوں گے اپنے کالج کے حق میں جس رسوائی سے خدا ہم سب کو بچائے۔ اِس پر آمین کے غل سے سارا کمرہ گونج اُٹھا اور جلسہ برخاست ہوا۔ ہماری کمیٹی میں شہری دیہاتی کسی کی خصوصیت تو ہی نہیں۔ مگر اتفاق سے جتنے ممبر ہیں سب شہری دلّی آگرہ لکھنؤ بنارس کے رہنے والے۔ الا ایک صاحب ش ج وہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں۔ یہ صاحب حاضر

[1] مرد عورتوں کے سرِ دھرے ہیں (اس کے دو) سبب (ہیں ایک) یہ کہ (آدمیوں میں) اللہ نے بعض (یعنی مردوں) ۱۲

[2] اور (دوسرا) سبب یہ کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنا مال خرچ کیا ہی ۱۲ م کو بعض (یعنی عورتوں) پر (دل کی مضبوطی اور جسمانی توانائی میں) برتری دی ہی

ہونے والے تو ایسے جیّد ہیں کہ شروع سے لیکر اب تک کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہو جس میں یہ نہ رہے ہوں۔ سنتے تو بڑی توجہ سے رہتے ہیں مگر آپ کچھ دخل نہیں دیتے۔ آخر ایک دن خدا جانے کس نے کہا کہ آپ بھی تو کچھ فرمایا کیجیے تو لگے کہنے کہ مجکو تمھاری کمیٹی کے مباحثوں میں مزہ تو بہت ملتا ہے مگر مجکو اس کمیٹی سے کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لئے کہ میں ٹھہرا دیہات کا رہنے والا۔ ہمارے یہاں بڑی قیدیں ہیں اور وہاں انتخاب کا قاعدہ چل نہیں سکتا۔ عورت تو عورت ہمارے یہاں کا امرد بھی گو وہ کیسا ہی جوان ہوا اپنی بیاہ برات کے معاملے میں بھلی یا بری کوئی بات مونہ سے نہیں نکال سکتا۔ وہ لوگ اس کو پرلے درجے کی بے حیائی سمجھتے ہیں دوسرے ہم ہیں شیخ اور برادری کے لوگ کوئی کتنا ہی امیر ہو یا کیسا ہی پڑھ لکھ جائے اگر اس کو دیہات میں رہنا ہی تو چار و ناچار برادری کے قاعدوں کی پابندی کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کفو کا لحاظ کیا جاتا ہی کہ مثلاً میں شیخ ہوں اول تو ہونے ہی کیوں لگا لیکن اگر بالفرض سیّد بھی مجھے بیٹی دینے پر راضی ہو تو میں نہیں لے سکتا۔ شیخ صاحب تو اتنا کہہ کر چپ ہو گئے اور اس پر بہت سے ممبر گفتگو کرنے پر آمادہ معلوم ہوئے تو جلسے کے پریزیڈنٹ نے کہا شیخ صاحب نے بات تو مختصر کی مگر اس میں دو امر بڑے بحث طلب اغراضِ کمیٹی سے متعلق ہیں ایک شرافت دوسرے شرم میں امید نہیں کرتا کہ آج کے جلسے میں دونوں امر طے ہو سکیں گے تو جن صاحب کو کچھ کہنا ہو شرافت کی نسبت اپنا اپنا خیال ظاہر کریں اور شرم کو اگلے جلسے پر ملتوی رکھا جائے۔

الف۔ میرے نزدیک شرافت یعنی شرافتِ نسب کوئی چیز نہیں۔ ہمارے پاس عقلی شہادت موجود ہی کہ کُل آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ان کی جسمانی بناوٹ ان کی خواہشیں ان کی ضرورتیں سب یکساں ہیں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں یہی وہ خیال ہی جو میرے نزدیک سب سے زیادہ ہم مسلمانوں کے تنزل کا باعث ہوا۔ جو لوگ شریف گنے جاتے ہیں وہ شرافت کی شیخی میں آ کر کسی طرح کا کمال حاصل کرنا نہیں چاہتے اور جو لوگ رذیل سمجھے جاتے ہیں اُن کو لیاقت کے پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

د۔ نہیں نہیں۔ شریف و رذیل کیسے برابر ہو جائیں گے۔ کہنے کو تو آدمی وہ بھی آدمی یہ بھی مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اول تو صورت سے شریف و رذیل الگ پہچان پڑتے ہیں۔ شریفوں کو دیکھو گے اکثر رنگ کے گورے۔ چہرے مہرے کے درست۔ صورت شکل کے پاکیزہ متناسب الاعضا نازک۔ کہ دیکھے سے جی خوش ہوتا ہی۔ اور رذیل ہیں کہ اُن کی صورتیں ہی کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ بگّی پگّی بے ہنگم کرخت بد رنگ۔ اور چونکہ یہ فرق پیدائشی ہی معلوم ہوتا ہی کہ خدا کی مرضی سے ہی۔ جیسے گھوڑا اور گدھا کہ خدا نے دونوں کو یکساں نہیں بنانا چاہا۔ اور نہ وہ یکساں ہیں اور نہ کوئی ان کو یکساں سمجھ سکتا ہی

الف۔ یہ قیاس مع الفارق ہی۔ اگر رذیلوں کی یعنی اُن لوگوں کی جن کو تم رذیل کہتے ہو۔ صورتیں اچھی نہیں تو اس کی وجہ یہ کہ اُن کو معاش پیدا کرنے کے لئے محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں پیر مین اور مرزا پچھویا پنکر نہ خانوں میں رہ نہیں سکتے۔ نہ دھوپ اور مینہہ اور سردی سے بچنے کے لئے اُن کے پاس سامان ہی کہ اُن کا رنگ میلا نہ ہو اور نہ وہ بیکار رہ سکتے ہیں کہ اُن کے اعضا نرم اور پلپلے ہوں اُن کی یہ حالت داغ خود غرضی ہی انسان کے ناصیۂ حال پر جو کسی طرح دھل نہیں سکتا۔ کیا حق رکھتا ہی ایک شخص اتنا کھا جانے کا کہ اُس کے ہضم کرنے کے لئے آنکو چورن کی ضرورت

ہو۔ جب کہ ایسی جیسے ہزاروں بندگانِ خدا مارے بھوک کے انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص قیمتی دوشالہ اوڑھنے کا۔ جب کہ دوسرے آدمی کو کمبل بھی نصیب نہیں۔ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص خدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام نمود میں لٹانے کا جب کہ بہتیرے ایک مٹھی چنوں کے لیئے کوڑی دو کوڑی مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی دنیا میں جس قدر مصیبت ہے صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے جتنے آرام پر جس کا قابو چلا دبا بیٹھا ٹھکی کی جگہ مٹھی مٹھی کی جگہ لپ۔ لپ کی جگہ جھولی۔ جھولی کی جگہ گٹھری۔ ڈھیری۔ ڈھیر۔ پہاڑ۔ مجکو تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ کرتوت تو یہ ہے اور اس پر بعض کو دعوے ہیں ہمدردی کے۔ دینداری کے رحم کے جود و سخا کے۔ بذل و ایثار کے غرض ہیں حضرت انسان بھی عجائب المخلوقات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیئے کیا اور کر رہے ہیں کیا۔

(د) لیکن شریف و رذیل کی عادت اور طبیعت کا فرق بھی تو دیکھیئے۔ انتظام دنیا اسی طرح پر واقع ہوا ہے کہ سب لوگ ایک حالت کے نہ ہوں تو ایک محتاج ہو دوسرا محتاج الیہ۔ ایک آمر ہو دوسرا مامور۔ ایک خادم ہو دوسرا مخدوم۔ اور اگر سب کی ایک ہی حالت ہوتی تو دنیا کا انتظام دگرگوں ہوتا۔ آپ اگر سب کو ایک حالت کا بنانا چاہتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ انتظام الٰہی میں دخل دیتے ہیں۔ آج تو آدمی ہے کل کو آپ جانوروں کی وکالت کریں گے کہ یہ بھی جان رکھتے ہیں۔ ان کو بھی آرام و تکلیف کا احساس ہے آدمی کیوں ان پر سوار ہو کس لیئے ان پر بوجھ لادے۔ ان سے محنت مشقت کے کام لے اور سب سے بڑھ کر کیوں کس واسطے اپنے مزے کے لیئے ان کو جان سے مارے۔ پھر آپ اور ترقی کریں گے تو درختوں کا ترس کھائیں گے کہ ان کی بھی ایک طرح کی زندگی ہے۔ لکڑی نہ کاٹو۔ پتہ نہ توڑو۔ ایندھن نہ جلاؤ۔ خلاصہ یہ کہ دوسروں کی خاطر مر رہو۔ اور جیو تو سراؤگی ہو کر جیو۔

(ص) میرے دونوں دوست الف اور د مجکو معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ دونوں صاحب اصل مطلب سے الگ ہو کر افراط و تفریط کے کناروں پر آ گئے ہیں۔ ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ شرافت نسب کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ میں کہتا ہوں ہے اور دنیا کی تمام قومیں اس کو تسلیم کرتی ہیں بے شک زمانے میں ایسے باکمال لوگ ہوتے آئے ہیں جو ایک صفت یا چند صفتوں میں اپنے ابنائے جنس پر تفوق رکھتے تھے اور جس کو خدا ممتاز کرتا ہے اُس کی نسبت سے اُس کی سب چیزوں میں وقعت آ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ رہنے کے مکان میں۔ پہننے کے کپڑوں میں باندھنے کے ہتیاروں میں سواری کے جانوروں میں۔ لارڈ ٹینس مشہور انگریزی ملک الشعراء حال میں مرا ہے۔ اُس کی بیٹھنے کی کرسی کے لکھنے کی میز کے قلم کے دوات کے لوگ لاکھوں روپیے دینے کو موجود ہیں۔ اُس کے وارث چوں کہ خود مقدور والے ہیں نہیں دیتے اور اس طرح کی مثالیں ڈھونڈھنی چاہو تو ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں کثرت سے ملیں گی کہ نامی نامور لوگوں کی کیسی قدر کی جاتی ہے۔ تو جب ممتاز لوگوں کی نسبت سے اُن کی سب چیزوں میں وقعت آ جاتی ہو تو کیوں اُن کی نسلوں کی وقعت نہ ہو جو اُن کی زندہ یادگار ہیں۔ اور اُن کے ساتھ نسبت بھی قوی اور قریب کی رکھتے ہیں۔ یہ ہے ماخذ شرافت نسب کی قدر کا۔ اب دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ آدمی اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کی مجموعی حالت کے اعتبار سے۔ ورنہ اس کی بہت سی باتیں حیوانوں سے ملتی ہیں کہ اُن ہی کی طرح وہ کھاتا پیتا سوتا۔ چلتا

پھرتا ہی۔ اُس میں کئی خواص نباتات کے ہیں کہ اُس کو بالیدگی ہی پھولنے پھلنے کے عوض اُس کی نسل چلتی ہی۔ درختوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہرایک درخت کے مزاجِ شخصی کے مطابق اُس میں پھل لگتا ہی۔ ہو نہیں سکتا کہ نیم کے درخت میں نیبو پھلیں یا نیبو کے درخت میں نبولیاں جس درخت کے پھل میں ایک خاص ذائقہ ہی اُس سے جتنی نسل چلے گی وہ ذائقہ کم و بیش سب پھلوں میں ہوگا غرض یہ بات نباتات حیوانات اور انسان سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہی کہ نسلیں اپنے بزرگوں کے ساتھ مشابہت اور مماثلت کو باقی رکھتی چلی آتی ہیں اِس کی تصدیق اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ سے ہوتی ہی اور اسی طرح کی ایک کہاوت ہندی میں بھی ہی۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یہ مشابہت نہ صرف جسمانی بناوٹ میں ہوتی ہی۔ بلکہ اخلاق و مزاج میں بھی۔ میرے متعارفین میں ایک صاحب ہیں اُن کی گُدّی میں ایک مسّا ہی وہ اُس کو مُہرِ شرافت کہا کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہی کہ ایسا ہی مسّا اسی جگہ میرے باپ اور دادا کی گردن میں تھا میرے ہوا بیٹا تو اُس کی گردن میں بھی ایک مضمحل سا نشان مسّے کا تھا لیکن گُدّی میں نہیں ٹرے ہو کر وہ مسّا کھسکتے کھسکتے اُسی خاندانی جگہ آرہا۔ ایک نوجوان آدمی کا حال مجکو معلوم ہی کہ وہ شروع سے نہ باپ پاس رہا نہ اُن سے پڑھا لیکن باپ بیٹوں کا سواد خط اِس قدر اَشبہ ہی کہ تمیز نہیں ہو سکتی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ جن کو لوگ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا متبنٰی سمجھ کر زید بن محمد پکارتے تھے گورے چٹے آدمی تھے۔ اور اُسامہ رضی اللہ عنہ اُن کے فرزند تیرہ فام۔ اِس سے لوگ اُن کو چھیڑتے تھے اور باپ بیٹے دونوں کو بُرا لگتا تھا۔ اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اُس خصوصیت کی وجہ سے جو زید کے ساتھ تھی ایذا ہوتی تھی۔ ایک دن کا مذکور ہی کہ زید اور اُسامہ دونوں باپ بیٹے ایک چادر اوڑھے مسجدِ نبوی میں پڑے سوتے تھے اور دونوں کے پانو چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے اُدھر سے کوئی قیافہ شناس ہو کر گزرا۔ اور بے اِس کے کہ پہچانے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہنے لگا واللہ یہ پاؤں ایک دوسرے کی نسل ہیں۔ یہ سُن کر آں حضرت کو بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اور اِس حکایت کو آپ نے کئی آدمیوں کے روبرو نقل کیا۔ ہم خیال نہیں کرتے ورنہ اِس مشابہت کی مثالیں اِس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر فردِ بشر۔ ہر جانور ہر پھل پھول پتّا اِس کی گواہی دے رہا ہی پس شرافتِ نسب کی قدر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی قدر کرتے ہیں جو بانیِ سلسلۂ نسب میں تھیں اور اُن صفتوں کے قابلِ قدر ہونے میں کسی کو گنجائشِ گفتگو نہیں۔ تو قدرِ نسب میں کیوں ہو۔ لیکن ہاں یہ بات بھی خیال کرنے کی ہی کہ تعلیم سے تربیت سے دوسروں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سے بھی آدمی کے مزاج پر اخلاق پر عادت پر بڑا اثر پڑتا ہی۔ اور اچھوں کی اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہی۔ اور یہی حال نباتات کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہی پھر بھی اصالت اپنا رنگ دکھائے بدون نہیں رہتی۔ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں میرا ذاتی خیال تو یہ ہی کہ میں مردوں کی طرف سے ایسا مطمئن نہیں ہوں جیسا عورتوں کی طرف سے کیوں کہ جو چیزیں خارج سے مزاج پر اثر کرتی ہیں۔ عورتیں اُن سے زیادہ محفوظ ہیں اُن کے پاس وہی موروثی اثاثہ ہی جو اُنھوں نے اپنے بڑوں سے پایا اور بس۔ اِس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اُس میں شرم پر گفتگو ہونی چاہتی تھی۔ مگر معلوم ہوا کہ سوائے ع کے اَور کوئی گفتگو کے لیے تیار نہیں تو ع نے کہنا شروع کیا کہ انسان میں بہت سی صفتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ

اشرف المخلوقات کہلایا۔ ان میں سب سے عمدہ سب سے زیادہ بکار آمد شرم ہے اگر ہم شرم کا مطلب دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو شرم ایک طرح کا ڈر ہے کہ میں نے جو یہ بے جا بات کی ہے ایسا نہ ہو کہ کسی پر ظاہر ہو جائے تو وہ میری نسبت کیا خیال کرے گا کہ یہ کیسا نالائق ہے تو اس ڈر کے لیے چاہیئے پہلے برے بھلے کی تمیز اور تمیز کے ساتھ اتنا آؤر کہ یہ بات بری ہے تو مجھکو کرنی زیبا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیا کو جزوِ ایمان ٹھیرا کر فرمایا ہے الحیاءُ من الایمان کہنے کو شرم ایک چیز ہے مگر وہ اکیلے تین کام دیتی ہے۔ وقوع جرم سے پہلے تو اس کو قدرتی پربونتو پولیس کا کانسٹبل یا کوئی اؤر عہدہ دار سمجھو جس کا کام ہے کہ جہاں تک ممکن ہے جرموں کا انسداد کرے دنیا میں کتنے گناہ ہیں جو شرم کی وجہ سے ہونے نہیں پاتے۔ دل میں ارادہ ہوتا ہے لیکن شرم دامن گیر ہو کر باز رکھتی ہے۔ اور بہا، بیشتر ہے شرم مانع آتی ہی رہی اور اس سے قصور سرزد ہو گیا تو شرم ڈیکٹو پولیس کی طرح اُس کو ماخوذ کرتی اور جج بن کر اس کو سزا دیتی اور یہ افسوس کرتا کہ ہائے میں نے کیوں ایسا جھک مارا اور آیندہ کے لیے اس سے مچلکہ مانگتی کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ خیر یہ تو مطلق شرم کی نسبت میں نے چند باتیں بیان کیں اب مجھکو اس شرم کے بارے میں کچھ کہنا چاہیئے جو شادی بیاہ کے معاملات میں کی جاتی ہے۔ عورت تو کوئی رزیل سے رزیل بھی اپنے بیاہ کی صلاح میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں ویسا تو نہیں مگر مردوں کا حال بھی قریب قریب عورتوں ہی کا سا ہے پہلے مجکو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ضرورت جو ہر فرد بشر کے پیچھے لگی ہے اور خدا کی حکمتِ کاملہ اسی کی مقتضی ہوئی کہ اسی ضرورت کو دنیا کے بڑھنے اور باقی رہنے کا ذریعہ قرار دے تو اتنی ساری شرم اس میں کہاں سے آگھسی۔ بہت غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ضرورت طرح طرح کے فسادات اور انواع واقسام کے جھگڑوں کا پھاٹک ہے اگر اس کو سختی کے ساتھ بند نہ رکھا جائے تو دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا پہلا خون جو آدم کی نسل میں ہوا وہ اسی نالائق ضرورت کی وجہ سے ہوا کہ ہابیل نے عورت کے کارن اپنے بھائی قابیل کو مار ڈالا۔ اُس دن سے جو یہ پھاٹک تیغہ ہوا ہے تو آج تک تیغہ چلا جاتا ہے اور اسی طرح روز قیامت تک تیغہ رہے گا ضرورت کے لیے نکاح کی ایک کھڑکی کھلی رکھی گئی ہے سو اس پر بھی جیسی کچھ روک ٹوک ہے آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے۔ یہ روک ٹوک کی گئی تھی کسی مصلحت سے مگر لوگ اس کی سختی کے متحمل نہ ہو سکے جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لگے دیواریں پھاندنے۔ نقب لگانے۔ سرنگیں دوڑانے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ پھاٹک کے چوپٹ کھول دینے سے اتنی خرابیاں نہ ہوتیں جتنی ان ناجائز اور شرمناک رستوں سے ہوئیں اور ہوتی ہیں اور ہوں گی جب پہلے دن ہمارے دوست سید صادق نے بھری کمیٹی میں اپنا ارادہ تجرّد کا ظاہر کیا تو مجکو سخت تعجب ہوا تھا میں سید صادق کو ایسا ضابطہ اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے یہ اُس کو پورا ہی کر اُتاریں لیکن جب اُنھوں نے تجرّد کا نام لیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی برسویں دن ایک مہینے کے رمضان کے روزے تو پہاڑ کی طرح کٹتے ہیں یہ ساری عمر کا روزہ ان سے کیوں کر نبھے گا۔ بارے لوگوں نے اُن کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا اور چوں کہ ہمارے سید صاحب منصف مزاج اور معقول پسند ہیں میں یقین کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اس خیال کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ خدا کی ستاریاں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو مُونہ دکھانے کے قابل ہیں ورنہ ؎

ٹھیرے ہے نہ پروانہ نہ روئے ہے زباں شمع
وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے ؛؛

اخلاق کی کتابوں میں شرم کے تین درجے لکھے ہیں۔ ادنےٰ درجہ یہ ہی کہ آدمی اپنے ابنائے جنس سے شرم کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے شرم کرے اور سمجھے کہ وہ دانائے نہان و آشکارا ہمارے دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہی اور ہم اندھیری رات میں سَتر پردوں کے اندر کوئی کام کریں تو۔ اور روز روشن میں ڈھول بجا کر کوٹھے پر چڑھ کر کریں تو۔ اُس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔ لیکن شرم کا ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہی۔ کہ آدمی اپنے نفس سے شرم کرے اور بُرے کام کرنے سے اُس کو یہ خیال مانع ہو کہ یہ کام میری شان کے لائق نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہی کہ وہ بڑے ہی شرمالو تھے یہاں تک کہ اکیلے مکان میں بھی برہنہ غسل نہیں کرتے تھے بے شک یہ ہی اعلیٰ درجے کی شرم جس کو خدا نصیب کرے میں نے بہت غور کیا کہ ہم لوگوں کی شرم ان تین قسموں میں سے کس قسم کی ہی تو میری سمجھ میں یوں آیا کہ اس کو ایک قسم جداگانہ قرار دینا چاہیئے کہ گانگلوں کے تو نام سے چڑیں اور گڑ پائیں تو بھیلیاں کی بھیلیاں چٹ کر جائیں غرض اس جھوٹی اور منافقانہ اور دکھاوے کی شرم کو شرم کہتے ہوئے مجکو تو بہت ہی شرم آتی ہی۔ ایک بات اور رہی کہ یوں تو وہ شرم سے خارج ہی مگر ہی اُسی کا ضمیمہ۔ چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا دستور ہم مسلمانوں میں تو کم ہی گر جیسی عمروں میں ہمارے یہاں اکثر شادی بیاہ ہوتے ہیں لوگ اس کو بھی جلدی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اُن کا خیال یہ ہی کہ اس سے ہماری نسلیں کمزور ہوتی اور عمریں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض انگریزوں نے نکالا ہی اور دوسرے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں لیکن اگر واقع میں ہماری نسلیں کمزور اور عمریں گھٹتی جاتی ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہی جو قرار دیا جاتا ہی بلکہ اس کا سبب ہی ہمارا طرزِ تمدن کہ ہم لوگوں میں اصولِ صفائی کی مطلق رعایت نہیں گنجان آبادی۔ بند مکان۔ میلا پانی۔ گندی ہوا۔ آپ احادی چلنے کے نہیں پھرنے کے نہیں۔ بل بوتا آئے تو کہاں سے آئے۔ اور دیہات میں یہ خرابیاں کم ہیں تو ویسے ہی وہاں کے لوگ موٹے تازے زبردست مضبوط چونچال جفاکش بھی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نہیں کہ چھینکنے سے ناف ٹلتی اور کھانسنے سے کولا اُترتا۔ ملک کی آب و ہوا کہ یہاں مرد اور عورت جلد جوان ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کی حالت دیکھ کر میں مسلمانوں کو شادی بیاہ میں زیادہ دیر لگانے کی ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ کوارے میری جان کو کوسیں۔ اگر ہمارے ہاں کچھ جلدی ہوتی ہی اور اس سے کچھ قباحت لازم آتی ہی تو وہ اُس قباحت بلکہ اُن قباحتوں کے آگے ہرگز قابلِ لحاظ نہیں جن کا دیر کی صورت میں پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بلا سے آگے کونسل چلے اور مرجیونی ہو اور ہم بھلے مانس ہیں بہتر ہی اس سے کہ چلے ہی نہیں۔ یا چلے اور بعد خرابی بصرہ چلے۔

ہماری کمیٹی کی کتاب رُوداد بہت ضخیم ہو گئی ہی۔ مگر میں نے ضروری مطالب اُس میں سے اخذ کر لیئے ہیں آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو شخص اس کمیٹی کا ممبر ہو اور صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سکرٹری بھی۔ شادی بیاہ کے بارے میں اُس کے کیسے خیالات ہونے چاہئیں۔ چناں چہ اس کمیٹی کی تعلیم کا اثر ہی کہ میں نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ عریضہ لکھا ہی۔ مجکو اس کے بھیجنے میں شرم تو مانع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر ہاں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو آپ بُرا مانیں اور بیٹھے بٹھائے آپ کو یا کسی کو رنج دینا گو وہ رنج بے اصل اور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو میں جائز نہیں رکھتا۔ لیکن آخر میں نے سوچا کہ جب میں نے فیصلہ کر لیا کہ نکاح کروں گا تو کیوں میں اپنی تجویز سے نہ کروں۔ اس کا نتیجہ بھلا یا بُرا تو میں بھگتوں گا۔ میں ننھا بچہ نہیں

کہ اپنے نیک و بد میں تمیز نہ کر سکوں گا - ایسا بڑا ضروری کام جس پر میری آیندہ کی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی خوشی اور ناخوشی موقوف ہوگی دوسروں کے سر ڈال کر میں تماشا دیکھا کروں تو مجھ سا احمق کون - اُن حالات سے جو میں نے سُنے مجھے میں نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں عافیت اور آسایش دیکھی - مجکو اس خط کے بھیجنے سے حقیقت میں اس بات کی ٹٹول منظور ہے کہ میں نے جیسا کچھ آپ کو سمجھا ہے اُس میں غلطی تو نہیں کی - اگر آپ نے میری اِس جسارت کو گستاخی اور بے تمیزی اور بیہودگی اور بے حیائی خیال فرمایا تو میں سمجھوں گا کہ نہ میں آپ کے ڈھب کا اور نہ آپ میرے ڈھب کے لیکن مجکو امید نہیں کہ آپ ایسا خیال فرمائیں کیا ضرورت تھی کہ میں مشاطہ کے ہاتھ رقعہ یا اسم نویسی بھیجتا پھروں - یہ بھی ایک قسم کا رقعہ ہی ہے - مگر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ میں نے اپنے دلی خیالات تک اس میں ظاہر کر دیئے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اپنا حال پوست کندہ بیان کرنے میں کچھ اُٹھا رکھا ہے - میں اپنا فوٹو بھی اس میں ملفوف کرتا ہوں - تاکہ تعلق سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں ہر طرح کی معلومات بہم پہونچانے کا موقع دوں - ابھی آپ کے حالات کی تفتیش جب تک میں نے بخوبی نہیں کر لی اس خط کے لکھنے کے لیئے قلم نہیں اُٹھایا - میں آپ سے اتنی بات بھی کیوں چھپاؤں کہ میں زیادہ تر اُسی صفت کا گرویدہ ہوا ہوں جس سے لوگ بھڑکتے ہیں - عالم ارواح کے ساتھ ایسا قوی تعلق ایک نعمت خداداد ہے اور سخت افسوس کی بات ہوگی اگر کسی ناقدردان کے پلّے پڑے - فقط راقم سید صادق از بنارس

غرض اِس خط پر میاں بی بی میں بہت کچھ لڑائی بھڑائی ہوئی - بی بی کسی طرح سے رضامند ہوتی ہی نہ تھیں کبھی سید صادق کے مذہب پر اعتراض کرتی تھیں - کبھی اُس کے لباس پر - اور حقیقت میں وہ سید صادق کو مسلمان ہی نہیں سمجھتی تھیں لیکن جب صادقہ نے اپنی سہیلی ہمراز کی معرفت اپنی اماں سے کہلا بھیجا کہ "جہاں خدا کو منظور تھا میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے اباجان سے لڑیں جھگڑیں نہیں - اور مذہب کے شُبہے کو بھی دل سے نکال ڈالیں کہ یہ بات ہے بے اصل - جو لوگ ایسی تہمت رکھتے ہیں ناحق ایک مسلمان کا گناہ سمیٹتے ہیں - آدمی کی طبیعت کا بھی عجب حال ہے ذرہ ذرہ میں خوش ذرہ میں آزردہ" صادقہ کی ماں یا تو صادقہ کے بیاہ کی دعائیں مانگتی تھی یا اب جو ہمراز نے صادقہ کا پیام جا کر دیا تو سنتے کے ساتھ مُونہ فق ہی تو ہو گیا - اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اس سے پہلے ایک چھوڑ دو بیٹیاں بیاہ چکی تھی اور وہ خیر بہت آرام میں نہ تھیں تو چنداں تکلیف میں بھی نہ تھیں جیسی رسمی خانہ داریاں ہوتی ہیں اُن کی بھی تھیں - مگر صادقہ کا بیاہ جانا تھا - ماں کو حقیقت میں معلوم نہ تھا کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ اُس کو کیسا تعلق ہے - یہ بیٹی اُس کی بائیس برس کی رفیق تھی کہ ایک دن کو ماں سے جدا نہیں ہوئی - اور رفیق بھی ایسی کہ جب سے ہوش سنبھالا ماں کو پلنگ سے اُترنے نہیں دیا - یہ گری یہ کرے ماما گری یہ کرے مغلانیوں کا کام یہ دے - ہاں بچّوں کو نہلائے دُھلائے کپڑے بدلوائے - ان کی دوا درمن کھلانے پلانے کی خبر رکھے - گری پڑی چیز سینتے اُٹھائے - بیٹی کی بیٹی مصاحب کی مصاحب پھر اُس کے بیاہ کے اٹکاؤ سے ماں کو بڑی بڑی ایذائیں پونہچی تھیں اس کے لیئے ماں کا دل ایسا ہو گیا تھا جیسا پکا پھوڑا ام جاتا ہے - اب جو خدا خدا کر کے پیام بھی آیا تو پردیس کا نہیں معلوم بنارس لے جائے گا یا ساتھ ساتھ لیئے پھرے گا اور انگریزیت کا پہلا الگ - کون جانے کہ دین پر بھی قائم ہے یا نہیں - غرض یہ رُوداد ماں کے رو دینے کو بس کرتی تھی - آخر میر صاحب کو باہر سے بلوایا - بی بی کو روتے دیکھ کر پوچھا

خیریت تو ہی۔

بی بی۔ ہاں خیریت تو ہی۔ مگر میری صادقہ مجھ سے چھٹی۔ یہ بنارس کا جو پیغام آیا ہی اس کے آنے سے پہلے صادقہ اس مردوے کو خواب میں دیکھ چکی ہی اور اس کو اس کا نام تک معلوم ہو گیا ہی اور اس نے یہ بھی خواب میں دیکھا ہی کہ گو اس کا ظاہر انگریزوں کا سا ہی مگر حقیقت میں مسلمان ہیں۔ صرف انگریزی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بس تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

میاں۔ "دیکھو میں تم سے کہتا تھا تم ہی نے شُبہ کیا پھر اپنا دل کیوں تھوڑا کرتی ہو۔ اس دن کے لیئے تو میں نے اور تم نے مدّتوں ناک رگڑی ہی۔ اب خدا نے غیب سے سامان کیا ہی تو ہنسی خوشی اس کو رخصت کر دو" غرض بہزار خرابی بی بی نے سیّد صادق کی درخواست منظور کی بلکہ کہنا چاہیئے کہ صادقہ کے خواب نے زبردستی تسلیم کرائی۔ اور میر خسرو نے سیّد صادق کو لکھ بھیجا کہ "ہم نے آپ کی درخواست بخوشی منظور کی۔ اور اس کے لیئے ہر وقت تیار ہیں" سیّد صادق نے اس خط کا پھر اسی طرح کا جواب دیا طول طویل۔ جس کا خلاصہ مطلب یہ ہی کہ میں پندرھویں دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گا اور شرعی معاہدہ ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ رہ کر تنہا کالج کو واپس آؤں گا اور جب تک امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میرا معاملہ پکا نہ ہو اس انتظام کو جاری رکھوں گا ایسا ہی ہوا کہ روزِ مقررہ پر سیّد صادق اور ان کے دوست ہندوستانی بھلے مانسوں کے لباس میں شام کو آئے نکاح ہوا۔ دونوں دوست اسی رات نو بجے کی گاڑی میں واپس گئے۔ سیّد صادق ایک ہفتے تک ٹھیرے رہے۔ ان میاں بی بی کے حالات بھی شروع سے آخر تک بڑے ہی بکار آمد اور دل چسپ ہیں۔ دونوں اچھی خاصی پکّی عمر میں بیاہے گئے جب کہ دونوں سمجھتے تھے کہ بیاہ ہی کیا چیز۔ صادق کے خیالات اس کی تعلیم کی وجہ سے اور صادقہ کے اس کی جبلّی اُفتادِ مزاج کے سبب ایسے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے تھے کہ وہ جو ایک جان دو قالب کہتے ہیں۔ بس ان دونوں پر صادق آتا تھا۔ دونوں کی غرض و غایت یہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کو خوش رکھے۔ بھلا پھر ان میں سازگاری نہ ہو تو اور کن میں ہو ایسا نہیں ہوا کہ راہ چلتے ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہی۔ بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بقدرِ امکان جانا سمجھا اور جانے سمجھے پیچھے میاں بی بی بننے پر راضی ہوئے۔ پس حقیقت میں ان کا ایجاب و قبول البتّہ ایجاب و قبول تھا۔ وقت پر تو اعلان نہ ہوا مگر چھپانے کی چیز نہ تھی اور چھپاتے ہی کیوں آخر لوگوں کو معلوم ہوا اور معلوم ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا تھا۔

سیّد صادق ایک عقلی مذہب رکھتا تھا۔ جو بات اس سے پوچھی جاتی اپنی رائے سے کچھ نہ کچھ اس کا جواب دیتا اور اس کی پیچ کرتا۔ اسی پر جما رہتا۔ اتنی تو غلطی اس کی بھی تھی کہ اس کو عقل پر زیادہ اعتماد تھا۔ وہ ہر جگہ عقل دوڑانی چاہتا تھا۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اس کو جھٹلانے لگتا۔ اس طور پر اس کا عقل پر اعتماد سچّا تھا کہ انسان جو مکلّف ہوا تو اسی عقل کی وجہ سے ہوا اگر اس میں عقل نہ ہوتی تو یہ بھی اور جانوروں کی طرح ایک جانور تھا۔ عذاب و ثواب دونوں سے بری۔ آدمی کے پیچھے جو عاقبت کا جھگڑا لگا تو اسی سے لگا کہ اس کو عقل دی گئی ہی۔ نیک و بد کی تمیز رکھتا ہی تو جس عقل کی وجہ سے اتنی ساری ذمہ داری گلے پڑی اس کو دین میں معطّل کر کے بٹھا دیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے تو بنایا آدمی

اور ہم رہیں جانور اُس نے تو دیں آنکھیں اور ہم باندھ لیں اوپر سے پٹی۔ پس اس وجہ سے صادق کی مت مسلمانوں کے متعارف فرقوں میں سے کسی فرقے سے ملتی ہی نہ تھی۔ وہ اسلامی فرقوں کی آپس کی کش مکش سے بہت گھبراتا تھا اور اُس کی عقل ٹھکانے نہ تھی۔ آخر کار گھبرا کر ایک وقت اس پر ایسا بھی گزرا کہ وہ سرے سے کسی مذہب ہی کا معتقد نہ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب واقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا اور ساری دنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دنیا جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فردِ بشر اس کی جستجو سے فارغ نہیں اور وہ نہ ملے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اُس چیز کا وجود ہی نہیں اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے۔ یہی نا کہ دنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون ہم ہی آدمی۔ تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی جس نے بنائی وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو منطق کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے تو ٹھیک نہیں اترتی۔ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ اس کی جگہ ہم کو یوں کہنا چاہیئے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ دو ہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعویٰ رہا نہ دلیل اور کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی میں تو خدا بھی آگیا۔ غرض عقلی خیالات میں اُس کی عقل غلطاں پیچاں تھی اور ایک سید صادق کی کیا خدا جھوٹ نہ بلائے ہزار ہا بندگانِ خدا اور میں ڈرول کیوں ہزاروں مسلمانوں کے اس قسم کے خیالات ہیں۔ بعض دل ایسے کمزور ہوتے ہیں کہ جو خیالات اُن کے دل میں مذہبی شکوک لیئے گھومتے رہتے ہیں اُن کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اور بعض ایسے بھڑبھڑیا ہوتے ہیں کہ ادھر دل میں آیا اور اُدھر مونہ سے اُگل دیا۔ مگر بے سمجھے بوجھے نہیں عقل کی کسوٹی پر کس کر۔ یہی حال صادق کا تھا۔ سید صادق پر دین کے اعتبار سے کچھ وقت اُسی طرح کا گزرا جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹکتے پڑے پھرے۔ جتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام تک چلتے آخر کار پھر کے وہیں آکھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے مگر تھا کیا کہ طلب تھی صحیح اور تلاش تھی سچی۔ اس سوچ میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کوئی مبہوت دیکھتا ہے اور نظر نہیں آتا سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ بہتیری کوشش کرتا کہ یہ خیال دل سے دور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیش نظر تھا کسی چیز میں طبیعت نہیں لگتی تھی کسی بات سے جی نہیں بہلتا نیند تو اس کی مدتوں سے اُچٹی ہوئی سی تھی ایک رات آخر شب اسی خیال میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے بے قرار ہو کر دعا کی کہ

اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہلِ مذاہب تجکو مانتے ہیں تو مجکو

اس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال ؛؛

ابھی پورے لفظ بھی اُس کے مونہ سے نہیں نکلے تھے کہ برابر کے پلنگ پر سے صادقہ نے آواز دی کیا تم جاگتے ہو۔

صادق! ہاں جاگتا ہوں۔ کیوں خیر ہے۔

صادقہ۔ میں نے ابھی ایک بڑا لمبا سا خواب دیکھا ہے جیسے تم کسی قیمتی کپڑے کی ایک نہایت سفید شیروانی پہنے ہو ایسی کہ میں نے آج تک ایسا سفید کپڑا دیکھا نہیں۔ جابجا اُس پر سیاہی گری ہوئی ہے اور تم داغوں کے چھڑانے کی فکر میں ہو اور تم کو ایک طرح کا نیج اور رنج کے ساتھ نا امیدی بھی ہے کہ ہائے کیسی عمدہ شیروانی تھی اب اس کے دھبے کیا چھوٹیں گے تم نے

بھنبیرے جھٹن گیئے اور جس نے جو تدبیر بتائی آزمائی دھبّے پھیلتے اور پھیلنے سے زیادہ بدنما ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تم نے انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چاہا کہ شیروانی کو اُتار پھینکوں اتنے میں تو ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ یہ دھبّے مٹّی سے چھوٹیں گے۔ مجکو اس کا طریقہ معلوم ہے میں تمھارے ہی ہاتھوں سے اس کو صاف کرا دوں گا اور شیروانی جیسے اصل میں تھی ویسی ہی نکل آئے گی گھبراؤ نہیں اس کے بعد تو سوتے ہی میں خود بخود خواب کی تعبیر میری سمجھ میں آئی کہ شیروانی تمھارا دل ہے اور سیاہی کے دھبّے تمھارے مذہبی شکوک ہیں۔ اور مٹّی سے مراد ہے خاکساری۔ پھر کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے تم میں اور اُن بزرگ میں اُسی طرح کی مذہبی بحث ہونے لگی جیسی تم لوگوں سے کیا کرتے ہو۔ جوں جوں بحث ہوتی جاتی ہے شیروانی کے دھبّے ہیں کہ گھٹتے اور کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب داغ دور ہو کر شیروانی اچھی خاصی اُجلی نکل آئی۔ گویا اُس پر سیاہی گری ہی نہ تھی اور تم اُس کو پہن کر بہت خوش ہوئے اور کہتے ہو کہ بس اب میں اسی کو پہنے رہوں گا اور جو دیکھتا ہے شیروانی کی تعریف کرتا ہے کہ سبحان اللہ کیا کپڑا ہے اور دھوبی نے کیسا اچھا دھویا ہے وہ بحث جو تم میں اور اُن بزرگ میں ہوئی مجھ کو لفظ بہ لفظ یاد ہے اور میرا قاعدہ ہے کہ چاہوں سمجھوں نہیں مگر خواب کی بات مجکو بھولا نہیں کرتی۔

صادق تو مذہب کے معاملے میں بے چین تھا ہی سُنتے کے ساتھ اُٹھ بیٹھا اور چاہا کہ اُسی وقت سے اپنا زہر اُگل چلے اس پر صادقہ بولی کہ صبح صادق ہو چکی ہے میں نماز پڑھ لوں تم بھی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو لو تو پھر اطمینان سے باتیں کریں اور یہ جھگڑے ایک دن کے تو نہیں ہیں جتنی باتیں میں نے خواب میں دیکھی ہیں کئی ہفتوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔

صادق۔ یہ ہے تو زبانی بیان کرنے سے لکھنا ہی بہتر ہوگا کہ خواب کی تحریری یادداشت بھی رہے گی۔

صادقہ۔ ہاں میں بھی لکھنے ہی کو زیادہ پسند کرتی ہوں تم میرے پاس بیٹھے رہو اور میں تمھارے روبرو لکھتی جاؤں تم ساتھ کے ساتھ دیکھتے جانا۔ میرا لکھنا بیان کی جگہ ہوگا اور تمھارا دیکھنا سننے کی جگہ؛

صادق۔ یہ ٹھیک ہے اور اس کو سوال و جواب کے طور پر لکھو یعنی جو کچھ میں نے کہا ہو سوال اور جو اُن بزرگ نے فرمایا ہو جواب۔

غرض مصنف مدظلہ نے صادقہ کی زبانی سید صادق کے خیالاتِ مذہبی کو درست کرنا شروع کیا ہے۔ جتنے بھی مذہبی شکوک اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے اُن سب کی اصلاح فرمائی ہے؛

سب سے اول خدا اور اُس کی وحدانیت اور صفات کا عقلی ثبوت دیا ہے۔ بعد ازاں عقلِ انسان کی نارسائی انسان کی بے حقیقتی۔ دینی خیالات کا سلسلہ۔ مذہب کی ضرورت۔ عاقبت کا یقین انسان کی فطرت میں ہے مذہب کا خلاصہ۔ عبادت کی لِم شریعت نصفِ دین ہے۔ عاقبت۔ مذہبی مباحثہ بڑی بُری بات ہے۔ دین کا دستور العمل۔ مذہبی شکوک اور اُن کا دفعیہ۔ مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جھگڑے۔ سُنّی شیعوں کا اختلاف۔ فرقۂ صوفیہ۔ نیچری فرقہ۔ دعا۔ وحی اور معجزات۔ کی اصلی حقیقت کو بیان کرکے سید صادق جیسے متزلزل العقیدہ کے خیالات کو عقلِ اسلام کے مطابق بڑی بلاغت و فصاحت کے ساتھ بیان کرکے ثابت کیا ہے

ترجمۃ القرآن

کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ مولانا نے قرآن مجید کے ترجمے کی نسبت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ "امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو فارسی میں قرآن تک کی اجازت دے دی ہے۔ مگر میرے مذہب میں قرآن کا ترجمہ تک گناہ ہے۔ کیوں کہ ترجمے میں معجز بیانی آ نہیں سکتی۔ اُردو فارسی کے ترجمے دیکھے پھیکے بدمزہ بے رونق ان میں اصلی قرآن کی سی چستی اور جستگی اور متانت اور قوت اور فصاحت اور بلاغت اور تاثیر کا کہیں پتا بھی نہیں ملا۔ اور بجائے اس کے کہ کلام الٰہی کی عظمت ذہن نشین ہو ترجموں سے تو بہ توبہ اُلٹی سخافت ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ترجموں کا کچھ قصور نہیں بل کہ ترجمہ ہی فی نفسہٖ امرِ محال ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے ترجمے کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ اگر باب ترجمہ مفتوح ہوا تو قرآن کا بھی وہی انجام ہونا ہے۔ کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے جس دن مسلمان ان لفظوں کو بھول اور بھولنے سے میری مراد ہے نہ سمجھنا۔ بس جان لینا کہ اسلام کی آب و تاب گئی۔"

جس شخص کا ترجمۂ قرآن کی نسبت ایسا سخت خیال ہو اُس کے دماغ میں یکایک اس کے خلاف ترجمے کی تائید کا خیال پیدا ہونا بل کہ عمل کرنا یعنی ترجمہ کرنا ضرور اتفاقیہ کی بات ہے۔ مولانا کے اس خیال نے کیوں پلٹا کھایا اس کی وجہ راقم کے خیال میں سوا اس کے کچھ نہیں کہ مسلمان اُس وقت تک دنیاوی ترقی نہیں کر سکتے جب تک پکے سچے مسلمان نہ بن جائیں۔ جب تک مسلمان اسلام کے طریقے پر سچائی اور راستی سے قائم رہے اُس وقت تک دنیاوی اعزاز۔ دولت اور جاہ و جلال اُن کے مطیع و زیرِ نگین رہے۔ اور جس وقت مسلمان ڈھل مل یقین ہو گئے اور ارکانِ مذہب کی پابندی میں سستی کرنی شروع کی اُسی وقت سے اُن کی دنیوی حالت میں بھی خلل پڑ گیا۔ اور اب جو یہ آئے دن مسلمانوں میں مذہبی معاملات پر بحث و تکرار رہتی ہے اور علما میں روز جوتی پیزار ہوتی ہے۔ اور تکفیر و ارتداد کے فتووں کا گراب بے جا اور نارواتعصب کی توپوں میں چلا کرتا ہے یہ صرف ناواقفیتِ احکامِ مذہب کا سبب ہے۔ بل کہ یہ بیچارے عوام الناس مسلمان جو گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس جاتے ہیں اُن کی گمراہی کا تو بڑا باعث یہی ہے کہ وہ عربی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے قرآنِ مجید کے معنی کو جو اسلام کا منبع اور احکامِ شرعی کا مخزن ہے نہیں سمجھتے۔ بس اس زمانے میں مذہب اسلام کی اور مسلمانانِ ہند کے واسطے سب سے بڑی اور ضروری یہی قومی خدمت ہے کہ اُن کو کلامِ پاک کے معانی و مطالب اُن کی مادری زبان اُردو میں ایسی خوش اسلوبی اور سہولت سے بتائے جائیں کہ جن کے مطالعہ کرنے کے بعد اُن کو اپنے مذہب پر کماحقہٗ واقفیت اور دست رس ہو جائے۔ ان سچے خیالات نے مولانا کی رائے کو بدل دیا ہو گا اور یہی وجہ ہے کہ جناب ممدوح نے ترجمۃ القرآن شائع فرمایا۔ جزاہ اللہ فی الدارین خیرا۔

ترجمے کی ضرورت مترجم کی زبانی

مولانا ممدوح نے چند جگہ ترجمۃ القرآن کی ضرورت کو ظاہر فرمایا ہے۔ لیکن ترجمۂ قرآن کے سلسلے جو ایک مبسوط دیباچہ ہے اُس میں اس کی ضرورت کو نہایت مشرح طور پر ظاہر کیا ہے۔ چوں کہ راقم ترجمے کی ضرورت کو مولانا کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں نہیں بتا سکتا اس لیے تصنیف را مصنف نیکو کند بیان کے لحاظ سے فاضل مترجم کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

"خدا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں مسلمانوں کے حال پر رحم کرے دانا اول المسلمین۔ ان کی بنیادی

حالت جس قدر خستہ و خراب ہو چکی ہے اور روز بروز ہوتی چلی جا رہی ہے ہم اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ سلطنت۔ حکومت۔ دولت عزت۔ سب نعمتیں ان سے چھن گئیں اور اگر یہی حال رہا اور ظاہری سامان تو ایسے ہی نظر آتے ہیں کہ یہی حال رہے گا تو کوئی دن کو یہ یہودیوں کی طرح صفحۂ روزگار سے مٹ جائیں گے یا نہیں بھی مٹیں گے تو اُن کی طرح ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ[سلہ] خدا کو جو معاملہ مسلمانوں کے ساتھ کرنا منظور ہے اُس کو تو وہی بہتر جانتا ہے مگر ہم کو تو عالمِ اسباب میں پیدا کیا ہے جہاں ہر واقعے کا کوئی سبب ہوتا ہے اور ہر سبب کا کوئی نتیجہ۔ عقل دی ہے جس کے ذریعے سے ہم ہر واقعے کا سبب معلوم کر سکتے ہیں اور روے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر ہم کو اختیار بھی دیا ہے کہ اسبابِ مخالف کو رفع اور موافق کو مہیا کر سکتے ہیں پھر ہمارا مذہب بھی ایسا نہیں کہ اُس کو دنیا سے کچھ تعلق نہ ہو بلکہ وہ ایک دستور العمل ہے جامع کہ آدمی طفلی اور جوانی اور پیری اور تجرّد اور تاہّل اور تونگری اور فقیری اور سفر اور حضر کسی حالت میں بھی ہو اُس کے لیے اُس میں کافی ہدایت موجود ہے اور شارع نے ہمارے کھانے پینے۔ چلنے پھرنے جاگنے سونے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ رشتے ناطے۔ میل ملاپ۔ لین دین۔ حرکات سکنات۔ غرض کل معاملات کے لیے قاعدے بنا دیے ہیں کہ اگر ہم اُن قاعدوں پر چلے جائیں تو دنیا کی زندگی بھی اچھی طرح گزار دیں اور آخرت میں بھی خدا سے سرخ رو ہوں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[سلہ] پس جیسا کہ میں اپنی کسی کتاب میں لکھ چکا ہوں ہم مسلمانوں کے لیے دین کو دنیا سے جدا کرنا ایسا ہی جیسا کوئی شخص چاہے کہ عَرَض کو جوہر سے لازم کو ملزوم سے۔ روح کو جان دار سے۔ بُو کو گُل سے۔ نور کو آفتاب سے اور ناخن کو گوشت سے جدا کرے۔ اگر ہم مسلمانوں کی دنیاوی حالت خراب ہے تو ممکن نہیں کہ دنیا کی لپیٹ میں ہمارا دین درست رہا ہو۔ ہم مسلمان بمنزلہ ایک عمارت کے ہیں جو ستونِ دین پر قائم کی گئی۔ اب اگر وہ عمارت گرنے کو ہو رہی ہے تو ضرور ہے کہ ستون بودا پڑ گیا ہے۔ محالِ عقل ہے کہ سببِ واحد سے دو متضاد نتیجے پیدا ہوں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ مذہب ہی ایک وقت ہماری قوت اور توانائی کا باعث ہو جیسا کہ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان اور پھر وہی مذہب دوسرے وقت ہم کو ایسا کمزور اور ناتوان کر دے جیسے کہ ہم اب ہیں۔ پس ہو نہ ہو ضرور وہن اور ضعف اور فتور اور خلل ہمارے دین و مذہب میں بھی آ گیا ہے۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں

سلہ یعنی اُن پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی۔ یہ آیت یہود کے بارے میں اُتری ہے جو اُس مقتدر بادشاہ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل ہیں جنھوں نے ایک نہایت زبردست سلطنت کے لیے جنابِ الٰہی میں یوں دعا کی تھی رب اغفر لی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی (یعنی اے میرے پروردگار میرا قصور معاف فرما اور مجھکو ایسی سلطنت عنایت کر کہ میرے پیچھے کسی کو سزاوار نہ ہو) خداے تعالیٰ نے اُن کی اِس دعا کو قبول فرمایا اور منہ مانگی سلطنت عنایت کی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اُن کی نسل یہود کا یہ حال ہوا کہ متواتر نافرمانیوں اور پیغمبروں کو ایذائیں دینے اور قتل کرنے کی شامت سے بڑی بڑی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے اُن میں وبائیں آئیں۔ برسوں جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے پھرے اور ہلاک ہوئے۔ اُن کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی۔ قید ہوئے غلام بنائے گئے جلا وطن کیے گئے اب ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے ہیں لوگ اُن کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے اور بحر و بر میں کہیں ایک چپہ بھر زمین پر اُن کی شاہانہ حکومت نہیں یہ بھی گورنمنٹ انگریزی کی امن و انصاف سے بھری ہوئی عملداری ہے کہ انگلستان اور ہندوستان میں ان کو امن اور اطمینان کے ساتھ بود و باش کرنے اور تجارت وغیرہ کے ذریعے سے معاش حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے ۱۲ (محمد رحیم بخش عفا اللہ عنہ) سلہ جو شخص نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو ہم (دنیا میں بھی) اُس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے اور اُن کو (آخرت میں بھی) اُن کے (ان) بہترین اعمال کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے ۱۲

سے تو بحث نہیں مگر ہند کے مسلمانوں کی تو ہم کہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر بے اختیار یہ بات مُونھ سے نکل جاتی ہے کہ "مسلمانان
در گور مسلمانی در کتاب"۔ وہ اسلام جس نے اُونٹوں کے چرانے والوں کے ہاتھ میں نکیل کے عوض زمام سلطنت پکڑا دی تھی
اب وہی اسلام ہے کہ شتر بے مہار کی طرح آوارۂ دشت غربت ہے۔ وہ اسلام جس نے اہل عرب کو تہذیب و شائستگی کا اُستاد منوا دیا
تھا اب وہی اسلام ہے کہ جو قومیں بر سر عروج ہیں اُس کو وحشی اور بے تمیز کہتی ہیں۔ وہ اسلام جس نے خدا کی رحمت بن کر دُنیا میں
امن و صلح کاری اور سازگاری اور اُلفت و اتحاد قائم کرنے کے لیے رواج پایا تھا اب وہی اسلام ہے کہ اُس کے پیرو آپس ہی
میں لڑے مرتے ہیں۔ ہندوستان میں ضعف اسلام کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب یعنی قرآن جو
اصل دین ہے۔ زبان عربی میں ہے جو اس مُلک کی بولی نہیں اوّل تو کوئی سی بھی اجنبی زبان ہو اُس کا سیکھنا دقت سے خالی نہیں
ہوتا اور پھر عربی کہ بُعد مسافت کی وجہ سے اہل عرب کے ساتھ اختلاط نہیں اور خود عربی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ہے
بھی مشکل اور اُس کے اشکال کی ایک ادنیٰ سی شناخت یہ ہے کہ مثلاً فارسی میں مذکر اور مؤنث کے فرق سے فعل کا صیغہ نہیں بدلتا
ایک مرد کو بھی کہتے ہیں آمد اور ایک عورت کو بھی کہتے ہیں آمد مگر عربی میں مرد کو جاءَ اور عورت کو جاءَتْ اسی طرح فارسی میں تثنیہ
نہیں دو کو کہتے ہیں آمدند اور دو سے زیادہ کو بھی کہتے ہیں آمدند مگر عربی میں دو کو اگر مرد ہوں تو کہیں گے جاءَا اور عورتیں ہوں
تو جاءَتَا دو سے زیادہ مرد ہوں تو جاءُوا عورتیں ہوں تو جِئْنَ دیکھو اسی ذرا سے تفاوت سے عربی میں فعل کی ہر گردان
کے تیرہ صیغے ہیں اور فارسی میں صرف چھے۔ ہم زبانوں میں تو کوئی محاکمہ کر نہیں سکتے کہ اس بات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان
کریں اور بیان کریں بھی تو بہتوں کی سمجھ میں نہ آئے مگر اسی ایک مثال سے اتنا تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ عربی اور فارسی میں فعلوں
کی گردان کے اعتبار سے تیرہ اور چھے کی نسبت ہے عربی کچھ تو اپنی ذاتی مُوشگافیوں کی وجہ سے مشکل تھی اور رہا سہا اُس کو
مشکل کیا لوگوں کی بے تدبیریوں نے کہ اُنھوں نے صرف و نحو کے قواعد ایسے پیچیدہ اور کثرت سے بنائے کہ اُنھیں
سیکھنے اور سمجھنے میں عمرِ تحصیل تمام اور پھر بھی خامی باقی۔ نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا ہونا بھی کیا تھا کہ صرف و نحو پڑھی تو اس غرض
سے شروع کی کہ اُس کے ذریعے سے عربی عبارت کے پڑھنے سمجھنے کا ملکہ ہو جائے گا مگر صرف و نحو کی بھول بھلیاں سے نکلنا
نصیب نہ ہوا۔ غرض صرف و نحو آلہ اور ذریعہ ہونے کی جگہ خود مقصود بالذات ہو گئی اور اصل مطلب فوت۔ میں نے کسی موقع
پر اس کی مثال بھی بیان کی ہے کہ آج کل کے صرفیوں نحویوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس کو اجرام فلکی میں عجائبات قدرت الٰہی کا
دیکھنا منظور تھا اور اُس نے اُس کے لیے دوربین لگائی مگر وہ دوربین کے کل پرزوں کی بناوٹ اور ترکیب میں ایسا محو
ہوا کہ آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے بھی نہ پایا۔ عربی زبان اجنبی سہی فی نفسہ مشکل سہی اُس کی صرف و نحو کا ایک تنا سہی اور اہل عرب کے
ساتھ بُعد مسافت کی وجہ سے مغایرت بھی سہی مگر یہ سب باتیں اور اتنی ہی اور ایک طرف۔ اور معاش کی ضرورت ایک طرف۔ یعنی
کہیں اگر معاش کا انحصار عربی پر ہوتا تو دیکھتے کہ بنیئے بقال تک حلق میں بول رہے ہیں۔ عربی زبان اجنبی تو ہے مگر از بسکہ مسلمانوں کی
مذہبی زبان ہے اور جیسی فی نفسہ مشکل ہے ویسی ہی فی نفسہ عمدہ اور مزے کی بھی ہے اور سیکڑوں برس مسلمان ہندوستان پر حکمراں رہے
ہیں۔ عربی کے ہزارہا الفاظ اُردو کے روزمرہ میں ایسے داخل ہو گئے ہیں جس طرح کھانے میں نمک کہ وہ نہ ہوں تو اُردو پھیکی
پھیکی بدمزہ لگے۔ اُردو کی تو خبر نہیں مگر ہماری دلّی ہی کے بڑے نامی گرامی شاعر اسد اللہ خاں غالب ایسی فارسی لکھا

فخر کرتے تھے کہ اُس میں عربی کا لفظ نہیں آنے پاتا تھا مگر وہ فارسی اُنھیں کی ایجاد تھی اور اُس کو [illegible] سمجھتے تھے
اگر کوئی غالب کی فارسی کی طرح کی اُردو لکھنا چاہے اور اِس کا التزام کرے کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے تو وہ اُردو
بھی ایسی ہی اُردو ہو گی کہ پشاور سے کلکتے تک اور کشمیر سے بمبئی تک تو اُس کو کوئی سمجھنے کا نہیں [illegible] کے لوگ اُس
کی داد بھی دیں گے ٹھیٹھ اُردو سے ہماری مراد ہے صفحے دو صفحے جس میں تصنّع اور تکلف نہ معلوم ہو [illegible] کوئی
لکھ سکتا ہے پانی پلاؤ ٹھیٹھ اُردو ہے جس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں اور بامحاورہ اور فصیح [illegible]
اُردو کے کسی ادیب کے کلام میں سے کیف ما اتّفق ایک لمبا سا مضمون لو اور اُس کو ٹھیٹھ اُردو میں ادا کرو [illegible]
کے ساتھ ادا کر دو تو جانیں ۔ تو مطلب یہ ہے کہ ہم کو عربی کے سیکھنے میں ایک طرف چند مشکلیں ہیں تو دوسری طرف یہ بہت بڑی
آسانی بھی ہے کہ اُس کے ہزارہا الفاظ ہمارے روزمرّہ میں داخل ہیں ۔ مگر اِس مشکل کا کوئی بھی علاج نہیں کہ عربی پر ہماری معاش کا
انحصار نہیں ۔ ہم انگریزی سے عربی کا مقابلہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ اشکال میں عربی سے کہیں بڑھی ہوئی ہے آپ چند
روز سے انگریزی کے چند الفاظ پوسٹ کارڈ منی آڈر ریلوے اسٹیشن ۔ سکول ۔ کالج وغیرہ اُردو میں داخل ہو گئے ہیں یہ
تو کسی گنتی میں نہیں ۔ یوں اُردو کا سارا کتاب خانہ چھان مارو کہیں انگریزی کا نام و نشان نہ پاؤ گے اِس سے بڑھ کر اجنبیت
کیا ہو گی ۔ اِس کے علاوہ انگریزی ہمارے مخارج پر ثقیل ہے اِس میں کثرت سے ٹے اور ڈال اور ابتدا بسکون ہے ۔ بایں ہمہ چونکہ
انگریزی عملداری کی وجہ سے انگریزی پر معاش کا انحصار ہو گیا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اِس وقت پڑھے لکھوں کی مردم شماری
کی جائے تو مثلاً سو انگریزی داں نکلیں گے تو اُن کے مقابلے میں بہت سے بہت ایک یا دو عربی داں ۔ اور ایک یا دو بھی
نام سننے کو رہتے ہیں ورنہ ایک بھی نہیں آدھا بھی نہیں تہائی بھی نہیں ۔ چوتھائی بھی نہیں ۔ اچھا تو مسلمانوں نے چھ سو
برس اِس ملک میں حکمرانی کی اور گو اُنھوں نے عربی پر زور نہ بھی دیا ہو تاہم عربی کا مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونا ہی کیا کم تھا اور
انگریزی کو تو سلطنت کی طرف سے جو کچھ مدد پہنچی ہے ۱۸۵۷ء کے اِدھر ہی اِدھر پہنچی ہے ۔ تو کہاں چھ سو برس اور کہاں پورے
پچاس بھی نہیں ۔ اِس پر بھی انگریزی اِس قدر جلد ترقی کر گئی اور عربی یوں دیکھتے دیکھتے ہندوستان سے ناپید ہو گئی یہ کیوں ؟
یہ وہی انحصارِ معاش ۔ بیچاری عربی کے پاس سوائے اِس کے کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور کیا ہوتا ہی کیا تھا لوگ
مذہب کو دیکھیں یا روٹیوں کی فکر کریں شعر شب چو عقدِ نماز بر بندم ؛ چہ خورد بامداد فرزندم ؛ زبانی دعووں اور لن ترانیوں
کے تو ہم قائل نہیں ۔ یوں تو ایک ایک مسلمان مونہہ سے ایسا مذہبی جوش ظاہر کرتا ہے کہ گویا وہ اِس چودھویں صدی کا عمر بن
خطابؓ یا خالدؓ بن ولید ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ ہندوستان میں عربی کی روک تھام کرنے والے کون ؟ چار و ناچار ماننا پڑے گا
کہ مسلمان ۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں نے عربی کے ساتھ کیا سلوک کیا ۔ چار و ناچار ماننا پڑے گا کہ اُس کو مٹنے دیا ۔ ناپید ہونے
دیا ۔ دین کا اور معاش کا آ کر پڑا مقابلہ مسلمانوں نے معاش کا پاس کیا اور دین کا نہ کیا ۔ سچ فرمایا ہے كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَ
تَذَرُونَ الْآخِرَةَ ؞ پس عربی کو تو ہندوستان سے رخصت ہوا سمجھو ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ عربی کے ساتھ ساتھ دین بھی رخصت ہوتا
نظر آتا ہے کچھ شک نہیں کہ ہمارے پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم تمام افرادِ بنی آدم کی طرف بھیجے گئے ۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

لــه (ای بنی آدم) ہرگز ایسا نہیں چاہیئے (مگر تم بنی آدم کچھ ایسے ہی جلد باز ہو اسی لیئے دنیا کو (جو سر دست موجود ہے) دوست رکھتے اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو ۱۲

اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ[۱] اور دینِ اسلام تمام افرادِ بنی آدم کا دین ہونا چاہیے عرب کے ہوں یا عجم کے اور ایسا دینِ عام جو کسی قوم اور کسی ملک کا پابند نہیں وہ کسی زبان کا پابند کیوں ہو لیکن خدا کی رحمت اسی کی مقتضی ہوئی۔ اور اُس کا وعدہ بھی تھا کہ اہلِ عرب جن کی حالت بعثت کے وقت تمام اقوامِ روے زمین میں ردی تھی اُنھیں کو سب سے پہلے ٹھیک کیا جائے اور وہ دوسروں کے لیے نیکی اور تہذیب اور شائستگی کا نمونہ بنیں آفتابِ ہدایت عرب سے نکلے اور سارا جہان اُس کے نور سے مستفیض ہو اِس مصلحت سے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا یعنی جو کچھ سکھانا سمجھانا تھا خدا نے اپنے پیغمبر کو اور پیغمبر نے اپنے ملک کے لوگوں کو عربی ہی میں سکھایا سمجھایا۔ دین کی بعض باتوں کی بنیاد ایسے ہی عقائد پر ہے جو عقلِ انسانی کی پوری پوری گرفت سے باہر ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے۔ سو دنیا کے کارخانے پر نظر کرنے سے اتنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ اِس انتظام کے ساتھ اِس عظیم الشان کارخانے کا کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ اور وہ قادرِ مطلق ہے۔ حکیم ہے۔ علیم ہے۔ غرض تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے۔ بس اِس کے سوا نہ کسی فرد بشر نے جانا اور نہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ پھر ہم ہی جیسا ایک آدمی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھکو خدا سے ایک خاص طرح کی خصوصیت ہے اور میں اُس سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھکو اُس نے یہ حکم دے کر تم لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔ ناچار لوگ اُس سے دلیل مانگتے ہیں۔ اور وہ اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کے حکم سے معجزے یعنی اَن ہونی باتیں کر دکھاتا ہے۔ کچھ تو مان کر ایمان لاتے اور کچھ جادو یا نظر بندی بتا کر یا ناحق کی ضد سے انکار پر جمے رہتے ہیں۔ لیکن معجزہ کیسا ہی عجیب کیوں نہ ہو اُنھیں پر اثر ڈال سکتا ہے جنھوں نے اُس کو واقع ہوتے دیکھا اور واقع ہوئے پیچھے یا پیغمبر کے انتقال فرمائے پیچھے ایک تاریخی واقعہ ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد افسانہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ کتنی ہی چھان بین کرو جس کو عین الیقین کہتے ہیں وہ تو شکی طبیعتوں کو ہوتا ہوا تا نہیں۔ یہ فضیلت ہمارے پیغمبر صاحب ہی کے حصے کی تھی کہ اُن کو خدا نے قرآن ایسا زبردست معجزہ دیا جو ابدالآباد تک پُرانا اور مضمحل نہیں ہو سکتا۔ وہ جیسا نزولِ قرآن کے وقت مؤثر تھا ویسا ہی اب ہے۔ اور ویسا ہی ہمیشہ رہے گا۔ ہم جو مسلمانوں میں سے عربی کے اُٹھ جانے کا اتنا افسوس کرتے ہیں تو اسی معجزے کے لحاظ سے۔ عربی جانو تو اِس معجزے کی قدر پہچانو۔ کوئی شخص جو اسلام کے بارے میں منصفانہ رائے قائم کرنی چاہتا ہے۔ اُسکو چاہیے کہ کسی رائے کے قائم کرنے سے پہلے اُن وقتوں کی تاریخ پڑھے۔ خاص کر عرب کی۔ جب اُس کی نظر تاریخ پر احاطہ کر لے تب اسلام کی تعلیم کو دیکھے۔ اگر وہ تحقیقات کا یہ طریق اختیار کرے گا تو میں تو نہیں سمجھتا کہ وہ بے اختیار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نہ بول اُٹھے اور مسلمان نہ ہو جائے بلکہ تاریخ بھی کیوں پڑھے نرا قرآن پڑھے کہ جہاں تک دین و مذہب کو تعلق ہے اِسی میں سب کچھ ہے لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ[۲]۔ مگر ہاں شرط ضروری یہ ہے کہ قرآن پڑھتے وقت خالی الذہن ہو جو کچھ اُس نے اسلام کی نسبت سُن رکھا ہے دل سے نکال دے اور اُس اسلام کو دیکھے جو قرآن میں ہے نہ اُس اسلام کو جو بعض مسلمانوں میں تھا یا ہے (بدنام کنندۂ نکو نامے چند)۔ مگر لوگوں کا تو حال یہ ہے کہ کسی کو دل سے حق کی جستجو نہیں الا ماشاء اللہ اور شاذ و نادر ہے بھی تو مشغلے کے طور پر شور و شغب اور طبع آزمائی کے لیے۔ غیر قومیں کیا قرآن پڑھیں گی جب کہ ہم مسلمان ہی جیسا پڑھنا چاہیے نہیں پڑھتے بہر کیف بعثت کے

---

[۱] اور (اے پیغمبر) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے ۱۲

[۲] خدا کے سوائے کوئی معبود نہیں محمد پیغمبر خدا ہیں ۱۲ [۳] (دنیا کی) تر و خشک (چیزیں سب ہی تو) کتابِ واضح (یعنی لوحِ محفوظ) میں (لکھی ہوئی موجود) ہیں ۱۲

اہلِ عرب میں جہاں ہزاروں عیب تھے اُن میں چند صفتیں بھی تھیں از انجملہ یہ کہ وہ بڑے فصیح تھے لوگوں میں ہر جگہ ایک وقت خاص میں کسی خاص بات کا چرچا ہوا کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک وضع خاص کی عمارتوں کے بنانے پر متوجہ ہوتے۔ کبھی ایک خاص وضع کا لباس اُن میں رواج پاتا۔ کبھی اُن کو دَوڑ دَوڑ کر سن کا شوق ہوتا۔ کبھی اُن میں شعر و سخن کی پھڑک اُبھرتی۔ اسی طرح بعثت کے وقت اہلِ عرب میں زبان آوری کو کمال سمجھا جاتا تھا۔ اور شجاعت۔ سخاوت۔ سیر چشمی۔ مہمان نوازی حسب نسب حسن جمال سب کمالات اُس کے آگے گرد تھے۔ گھر کی لونڈی غلام دِہقانی گنوار برمحل ایسے برجستہ شعر کہتے کہ آج اچھے سے اچھا ادیب اُن کو لگا نہیں کھا سکتا۔ زبان نے دلوں پر اپنا ایسا تسلط بٹھایا تھا کہ شاعر قبیلوں کو قبیلوں سے لڑا مارتے اور ہزاروں کے خون کرا دیتے میلے ٹھیلے مشاعرے کے اکھاڑے ہوا کرتے تھے جن میں بڑے بڑے نامور شاعر اپنے اپنے قصیدے سناتے۔ اور اُن میں سے جو چوٹی کے ہوتے بڑے فخر کے ساتھ خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکائے جاتے چنانچہ سبعہ معلقہ جو ادب عربی کی اعلیٰ درجے کی کتاب ہے وہ بھی سات شاعروں کے سات قصیدے ہیں اور اسی واسطے معلقہ کہلاتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکائے گئے تھے۔ ہم لوگوں کو تو سپہ گری سے کچھ مناسبت ہی نہیں اور یوں ہی ذری ظہور کچھ تھی بھی تو حکام وقت نے ہتھیار لے کر اُس کو بھی سلب کر لیا تو اب کس کی مثال دیں کہ اہلِ عرب کا نقشہ تمہاری نظروں میں پھر جائے۔ ہاں تم نے دیکھے ہوں تو کابل کی طرف کے پٹھان البتہ سپاہی ہیں۔ بس ایسے ہی سپاہی اہلِ عرب بھی تھے۔ کابلیوں سے تن و توش میں کم۔ مگر دلیری و جرأت میں زیادہ وہ سپاہیانہ شیخی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کو نہ صرف اپنی بہادری پر ناز تھا کہ کبھی کسی بادشاہ کی رعیت ہو کر رہے ہی نہیں بلکہ کسی بات میں کسی کو اپنا ہمسر اور مدِ مقابل نہیں گنتے تھے وہ شریف تھے اُن کی نظر میں اَور لوگ کمینے۔ وہ عزت دار تھے اور اُن کی نظر میں اَور لوگ ذلیل۔ وہ زباں آور تھے اور دوسرے لوگ اُن کی نظر میں گونگے بے زبان جن کو بولنا اور بات کرنے تک کا سلیقہ نہیں اور اسی لیے وہ دوسروں کو عجم کہتے تھے جس کے معنی ہی گونگے کے ہیں۔ تو فرماؤ ایسے لوگوں کے روبرو کوئی شخص پیغمبر ہونے کا دعوٰے کرے اور وہ مانگیں معجزہ تو وہ اُن لوگوں کو کس قسم کا معجزہ دکھائے کہ یہ چوں نہ کر سکیں۔ وہ معجزہ نہیں تھا مگر بہادری کا جواب بہادری اور فصاحت کا جواب فصاحت۔ سو بہادری کے متعلق تو پیغمبر صاحب سلام نے کھلے خزانے پکار کر کہہ دیا تھا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا[1] اور اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ[2] اور اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ[3] رہی فصاحت اُس کا جواب دنداں شکن تھا قرآن کہ اُن سے بار بار کہا جاتا تھا کہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ دس سورتیں لاؤ۔ دس نہیں ایک۔ اور تمہاری

[1] (مسلمانو) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے ہیں اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اُس کو اُن کے لیے جما کر رہے گا اور خوف (و خطر) جو اُن کو (لاحق) ہے اس کے بعد (عنقریب ہی) اُن کو (اس کے بدلے میں امن دے گا ۱۲ [2] تو کیا یہ لوگ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ ہم ملک کو چاروں طرف سے دباتے (اور فتح کرتے) چلے آتے ہیں تو (اس صورت میں) کیا یہ لوگ غالب ہیں (یا مسلمان) ۱۲ [3] یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری بڑی قوی جماعت ہے سو کوئی دن جاتا ہے کہ (ان کا) گروہ شکست کھائے گا اور (مسلمانوں کے مقابلے میں) پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگیں گے ۱۲

تو کیا حقیقت ہی اگر دنیا بھر کے جن و انس بھی اِس پر کمربستہ ہوں تو قیامت تک نہ لاسکیں گے۔ الله الله یا وہ دم دعویٰ کہ کسی اور کو بولنا ہی نہیں آتا یا قرآن کو سُن کر ایسی چُپ سادھی کہ گویا کسی کے مُونہہ میں زبان ہی نہ تھی مسلمانوں سے لڑتے اور مسلمانوں کی بیخ کنی کرتے رہے اور آخرکار ذلیل ہوئے خوار ہوئے جلاوطن ہوئے اور بہتیرے جان سے گئے مگر اتنا نہ ہو سکا کہ ایک چھوٹی سی سورت بناکر میدان میں آتے قرآن جیسے کلام کا بنانا مقدورِ بشر ہوتا تو قرآن کو اشتہار پائے تیرہ سو برس ہوئے تو کیا بات ہی اِس عرصے میں کہیں نہ کہیں سے تو مخالف آواز آتی پر آئی۔ اور خیر اب تک نہیں ہوا تو یار ہاتی صحبت باقی آگے کو بھی۔ جو لوگ بڑی بڑی موٹی کتابیں اسلام کی تردید میں لکھتے ہیں وہ اپنی ساری قوت ساری فرصت اسی میں کیوں نہیں صرف کرتے۔ پس ہند کے مسلمانوں نے اپنے تئیں زبانِ عربی سے محروم کرکے اپنے ایمان کو ضعیف کر لیا۔ ان کے پاس بھی معجزے ہیں مگر وہی از قبیلِ واقعاتِ تاریخی جو شکی طبیعتوں کو کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتے اور نہ اپنے ہی گروہ کو تقلید کی پستی سے نکال کر اجتہاد کے عرش پر چڑھا سکتے ہیں۔ اور ممالکِ دور و دراز کی غیر قوموں سے تو اس کی توقع ہی رکھنا فضول ہی ملک چین کے واقعات کی نسبت لی[1] ہنگ چنگ کی شہادت ہماری نظر میں کیا وقعت رکھ سکتی ہی جب کہ ہم اُس شخص کے نام تک سے واقف نہیں کیا یہی حال چینی بودھ مذہب کے معتقد کا نہ ہوگا۔ اگر اُس کے رُوبرو مثلاً عمرؓ کا نام لیا جائے۔ اِس کے علاوہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ ایک ایسا سچا کلیہ ہی کہ انسانی فطرت اُس کی مصدق ہی۔ اسلام میں دیدہ تو یہی ایک قرآنی معجزہ تھا کہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے وہ بھی شنیدہ ہو گیا۔ پس معجزوں کے اعتبار سے دوسرے مذاہب پر اسلام کی فضیلت ہی کیا باقی رہ گئی اور افسوس ہو کہ اسلام کی یہ توہین (اور میں توہین کے سوا اس کو کسی اور لفظ سے تعبیر کر نہیں سکتا) ہم مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی سے ہوئی مگر ہوئی اور اب اُس کی تلافی عقلاً محال نہیں تو عادۃً ضرور محال ہی۔ لیکن عربی کے نہ جاننے سے دین کو جو نقصان پہونچا سو پہونچا۔ یہ کیسی خرابی کی بات ہی کہ مسلمانوں کی دنیاوی حالت بھی اسی کی وجہ سے بگڑ گئی اور بگڑتی چلی جاتی ہی۔ اور بڑا خوف ہی کہ کہیں ان کے دین کو بھی اپنے ساتھ نہ لے ڈوبے۔ اب مسلمانوں کا حال یہ ہی کہ ان کو اصلِ دین کی تو خبر نہیں اور خبر ہو تو کہاں سے ہو۔ دین ٹھیرا قرآن اور وہ عربی اور یہ عربی سے نابلد جو دین دار ہیں اُن کے دین کی بھی بس یہ حقیقت ہی کہ کہیں کسی مولوی سے کچھ سُن سنا لیا اُس کو پلے باندھا اور اُس چوہے کی طرح جو ہلدی کی ایک گرہ پاکر اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا تھا دین دار بن بیٹھے۔ یا بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اگلی بھیڑ کے پیچھے ہو لیے۔ وہ اگلی بھیڑ کنوئیں میں گرے تو اور کسی کے کھیت میں جا پڑے تو۔ وہ تو یوں کہو کہ خدا کو اپنے کرم سے ظلمت کدۂ ہندستان کا نورِ اسلام سے منور کرنا منظور تھا کہ اُس کے ایک خاص الخاص بندے اُس کے مقبول بندے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز دلی میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے اور اُن کے خاندان نے ہند میں اسلام کی قریب قریب ویسی ہی خدمتیں کیں جیسی عرب میں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں نے یعنی اصحاب نے تابعین نے تبع تابعین نے ائمہ مجتہدین نے کی تھیں رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ میرا خیال تو یہ ہی کہ ہندوستان میں اسلام جتنا کچھ بھی ہی اور جیسا کچھ بھی ہی اسی خاندانِ عالی شان کا طفیل ہی ان بزرگوں نے اسلام کی اشاعت میں وہ کیا جو دینِ حق کا دل دادہ قوم کا مصلح ہمدرد خیرخواہ کر سکتا ہی۔ دین کی کتابوں کے درس دیئے ترجمے کیے وعظ کہے تصنیفیں کیں جزاہم اللہ عنا وعن سائر المسلمین جزاءً حسنا

[1] یہ شخص چین میں نفغفور چین کے بعد اول درجے کا آدمی ہی اسلئے خدائے تعالیٰ ان کو ہماری اور تمام مسلمانوں کی طرف سے بہتر دارِ ثبت بدلہ عنایت کرے ۱۲

ہو نہیں سکتا تھا کہ اِن کو ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ زبانِ عربی کا اشکال مسلمانوں کا (اور ذرا خیال کرنے کی بات ہو کہ اب سے سوا سو ڈیڑھ سو برس پہلے کے مسلمانوں کا) قصورِ ہمت۔ اُن کا عربی سے حرمان اُن کو اچھی طرح سے معلوم تھا۔ چنانچہ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ وہ ہی جو سنہ ۱۱۵۰ ہجری میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح نے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بزرگ زمانے کے حالات پر کیسی سیع نظر رکھتے تھے کہ سنہ ۱۱۵۰ھ میں باپ نے فارسی ترجمے کی ضرورت معلوم کی پھر سو نہیں دو سو نہیں صرف پچپن برس بعد اُن کے بیٹے شاہ عبد القادر صاحب رح کو معلوم ہوا کہ عام مسلمان فارسی بھی کم سمجھتے ہیں کہ سنہ ۱۲۰۵ھ میں اُنھوں نے اُردو ترجمہ کیا جو موضح القرآن کے نام سے مشہور ہو اور اُردو کا بہتر سے بہتر ترجمہ سمجھا جاتا ہو اور وہ فی الواقع اپنے وقت میں بہتر سے بہتر تھا بھی۔ اس سے کہ سنہ ۱۱۵۰ میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح نے فارسی ترجمہ کیا اور سنہ ۱۲۰۵ میں مولانا شاہ عبد القادر صاحب رح نے اُردو۔ صاف ظاہر ہو کہ سنہ ۱۲۰۵ھ ہی میں فارسی کا رواج اتنا کم ہو چلا تھا کہ مولانا شاہ عبد القادر صاحب رح کو قرآن کا اُردو ترجمہ کرنا پڑا تو اب سنہ ۱۳۱۲ھ میں فارسی کا کیا حال ہوا ہو گا بے شک عربی کی طرح فارسی معدوم نہیں ہوئی مگر یہ بیچاری بھی مہمانِ چند روزہ ہو۔ اگر با ندشبے ماند شب دیگر نمے ماند۔ الحاصل جس غرض سے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح نے فارسی ترجمہ کیا تھا کہ مسلمان فارسی کثرت سے سمجھتے ہیں اسی ذریعے سے اِن کو قرآن کے مطالب سمجھائے جائیں وہ غرض تو فوت ہو گئی یا عنقریب فوت ہونے والی ہو کہ نہ فارسی دان مسلمان رہیں گے اور نہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح کے ترجمے کو کوئی سمجھے گا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ[۱] لیکن گو زمانے کے انقلاب نے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح کے ترجمے کو بیکار سا کر دیا مگر ترجمہ تو حقیقت میں ایسا مستند ہو کہ جو شخص قرآن کے لفظ لفظ میں تدبر کرے وہی اُس کی قدر جان سکتا ہو فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار ہیں ترجمے سے ثابت ہوتا ہو کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہو کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہو کہ بس اُنھیں کا حصہ تھا۔ اب کوئی ایک عمر صرف کرے تو اُس کو یہ بات نصیب ہو اور وہ بھی شاید۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب اُن کے پیشِ نظر ہیں اور وہ اُن میں جس کو راجح پاتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح کا اور دو اُردو ایک شاہ عبد القادر صاحب رح کا اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب رح کا تو اب ہر ایک کو ترجمے کا حوصلہ ہو گیا مگر خاندان شاہ ولی اللہ صاحب رح کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا وہ ہرگز قرآن کا مترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح اور اُن کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہو کہ اُنھیں ترجموں میں اُس نے کچھ ردّ و بدل تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمے کا نام کر دیا ہو یہی ترجمے در ترجمے ہی کی غلطی اور بے احتیاطی تو تھی جس نے پہلی آسمانی کتابوں کا اعتبار اُٹھا دیا اور دین میں ایسا رخنہ ڈالا کہ قیامت تک بند ہونے والا نہیں ایک شخص نے مجھ سے تذکرۃً بیان کیا کہ فلاں مترجم نے اُردو قرآن کا ترجمہ کیا تھا اُس کی انگریزی بھی ہو گئی ہو۔ میں تو یہ سُن کر کانپ اُٹھا کہ کہیں میرے اِس ترجمے کے ساتھ کوئی صاحب یہ سلوک نہ کر بیٹھیں۔ اور میں اِس تقریب سے سب کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ میں نے اسی ڈر سے اِس ترجمے کی رجسٹری کرائی ہو کہ کوئی صاحب کسی زبان میں اِس ترجمے کا ترجمہ نہ فرمائیں ورنہ دنیا کے علاوہ خدا کے روبرو اُن کو جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ایک زبان کے مطلب کو دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ہو ترجمہ

[۱] ہم تو اللہ ہی کے ہیں (ہم کو جس حال میں چاہے رکھے) اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں (تو وہ ہمارے صبر کا ہم کو اجر دے گا) ۱۲

ترجمے کے معنی بتانے آسان ہیں مگر ترجمہ کرنا مشکل ہے میں بہت پہلے سے ترجمے کے اِشکال سے واقف ہوں اور مجھکو ایک زبان سے
دوسری زبان میں مختلف طور کی کتابوں اور تحریروں کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہی اور ہوتا رہتا ہی۔ کوئی میرے دل سے پوچھے
کہ میں ترجمے کو کیسا خیال کرتا ہوں میں نے کتابیں تصنیف بھی کی ہیں مگر ترجمے سے آدھی زحمت بھی تصنیف میں نہیں اُٹھانی پڑی
مصنّف کو صرف مضمون کی پابندی ہی اور مترجم کو مضمون کی الگ اور ایک چھوڑ دو دو زبانوں کی الگ۔ بیڑی دونوں کے پانوں میں
ہی مگر بیڑی کے علاوہ مترجم کی دونوں مشکیں بھی کسی ہوئی ہیں اور اُس کے گلے میں طوق بھی ہی۔ قرآن کی وہ آیت وَمِنْ اٰیٰتِهٖ[1]
خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ کوئی ہزاروں دفعہ پڑھی ہوگی مگر جب تک میں نے قرآن کا
یہ ترجمہ نہیں کیا مجکو تو اختلافِ اَلسنہ کی قدر کما ینبغی معلوم ہوئی نہیں۔ اختلافِ اَلسنہ یہی نہیں ہی کہ مثلاً اہلِ عرب آسمان کو سماء کہتے
ہیں۔ زمین کو ارض۔ پانی کو ماء۔ آگ کو نار۔ اگر اسی میں اختلافِ اَلسنہ کا انحصار ہو تو یہ کچھ ایسی بڑی بات نہیں لغت کی ایک کتاب یاد کر لینے
سے آدمی دوسری زبان سیکھ لے سکتا ہی۔ نہیں اختلافِ لغت کے علاوہ صیغوں کا اختلاف ہی۔ تذکیر و تانیث کا اختلاف ہی۔ تثنیہ و
جمع کا اختلاف ہی۔ روابط کا اختلاف ہی۔ محاورات کا اختلاف ہی۔ اشتراک کا اختلاف ہی۔ ترتیبِ الفاظ کا اختلاف ہی۔ اِن میں سے بعض
اختلافات ایسے ہیں۔ جن کا رفع کرنا مترجم کے اختیار سے خارج ہی۔ مثلاً محاورات کا اختلاف کہ مترجم زبان کا محکوم ہی نہ حاکم کہ اپنی طرف
سے محاورات تصنیف کرے۔ اشتراک کا اختلاف تھوڑی تشریح کا محتاج ہی۔ اِس سے ہماری مراد یہ ہی کہ ہر ایک زبان میں کوئی کوئی لفظ
کئی کئی معنوں میں مشترک ہوتا ہی اگرچہ کلام میں ایک خاص معنی مراد ہوتے ہیں مگر اشتراک کی وجہ سے دوسرے معنی بھی سننے والے کے خیال
میں آجاتے ہیں اور یہ انتقالِ ذہن ایک خاص لطف پیدا کرتا ہی اور اسی پر شاعری کے بڑے حصے کا مدار ہی۔ تم نے اَن مِلیاں سُنی ہوں گی
اِن سے اشتراک کا مطلب بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا مثلاً پوچھتے ہیں کہ روٹی کیوں جلی۔ گھوڑا کیوں بگڑا۔ اور پان کیوں گلا
اب دیکھو کہ روٹی اور گھوڑا اور پان تین بے جوڑ باتیں ہیں اور اسی لیے اِن باتوں کو اَن مِلی کہتے ہیں کہ اِن میں میل نہیں۔ پوچھنے
والے کا مطلب یہ ہی کہ اس سوال کے جواب میں صرف ایک لفظ ایسا کہو جو روٹی کے جلنے اور گھوڑے کے بگڑنے اور پان کے
گلنے کی وجہ بتلا سکے۔ اِس اَن مِلی کا جواب ہی نہ پھیرنے سے۔ اُردو میں پھیرنا تین قسم کا پھیرنا ہی۔ ایک روٹی کا پھیرنا کہ روٹی توے
پر ڈالی جب وہ دونوں طرف سے کسی قدر پک گئی تو اُس کو توے سے اُتار چولھے کے ایک بازو سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ اور اُس کو
پھیرتے یعنی گھماتے رہے کہ جلنے نہ پائے۔ دوسرا گھوڑے کا پھیرنا کہ اُس کو کاوا دیا جائے یا یہ کہ چابک سوار یا اَور کوئی اُس کو چکّر
دے لائے۔ تیسرا پھیرنا پان کا پھیرنا کہ پنواڑی اُس کو روز اُلٹ پلٹ کرتا رہتا ہی کہ پان پان سے لگ کر گلنے نہ پائے تو یہ تین قسم کا پھیرنا
ہوا جس کے واسطے اُردو میں ایک لفظ ہی کہ وہ اَن مِلی کا جواب ہو سکتا ہی۔ مگر اس کے سوا کسی دوسری زبان میں پھیرنے کے مقابل کوئی
ایک لفظ جامع نہیں۔ غرض یہ ایک مشکل ہی جو مترجم کے لیے کسی طرح رفع نہیں ہو سکتی۔ ہم کو محاورات کے اختلاف کی بھی کچھ تصریح کرنی
چاہیئے مگر دیباچہ ہی کہ بڑھتا چلا جاتا ہی تاہم ترتیبِ الفاظ سے ہم درگزر نہیں کر سکتے یہی تو بڑی وجہ ہی جس نے ہم کو ترجمہ کرنے پر مجبور
کیا ہی۔ لیکن تم اِس کو دو ہی باتوں میں سمجھ لوگے مثلاً عربی میں فارسی کی طرح پہلے مضاف لاتے ہیں اور پھر مضاف الیہ جیسے غُلَامُ زَیْدٍ
یا غلامِ زید مگر اُردو میں بالکل اِس کا اُلٹا ہی زید کا غلام۔ مطلب تو غلام زید کا سے بھی سمجھا جاتا ہی مگر زید کا غلام فصیح اُردو ہی۔ اور غلام زید کا غیر

[1] اور آسمان و زمین کا پیدا کرنا اور تمھاری بولیوں اور تمھاری رنگتوں کا مختلف ہونا (یہ بھی) اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہی ۱۲

اسی طرح عربی میں فعل - فاعل اور مفعول دونوں پر مقدم ہوتا ہی جیسے ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرًا اور اُردو میں فعل کو موخر لانا پڑتا ہی ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرًا کا لفظی ترجمہ ہی مارا زید نے عمرو کو مگر غیر فصیح اور فصیح اُردو ترجمہ زید نے عمرو کو مارا جب تین لفظوں کے جملے میں ترتیب الفاظ کا یہ اختلاف ہی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ بڑے جملے میں جس کے ساتھ متعلقات کا دُم چھلا بھی لگا ہوتا ہی اگر اصل عبارت عربی کی ترتیب کا لحاظ کیا جای تو اُردو کی عبارت کا کیا حال ہوگا - یہ ہی وہ بڑی کمی جو مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رح کے ترجمے میں تو سر تا سر اور مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ کے ترجمے میں بکثرت پائی جاتی ہی اور یوں زبان کے ردّ و بدل کو تو سو برس کی مدت بھی کم نہیں - لوگوں کا عام خیال تو یہ ہی کہ انگریزی عملداری میں زبان اُردو تنزل کر رہی ہی مگر یہ خیال غلط اور ابلہ فریب ہی - عربی فارسی کی نسبت ایسا خیال کیا جائے تو بجا ہی مگر اُردو تو تنزل کی جگہ پہلے سے بہت ترقی کر گئی ہی اور کرتی چلی جا رہی ہی اور اس کی موٹی سی دلیل یہ ہی کہ لوگ عموماً اُردو میں خط و کتابت کرنے لگے ہیں - اسد اللہ خاں غالب جو فارسی کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے وہ تک تو اُردو پر اُتر پڑے تھے - اُن کی اُردو سے معلّیٰ اِس بات کی گواہ ہی جس میں اُن کے وہ خطوط جمع ہیں جو اُنھوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں اور آشناؤں کو از خود بے کسی کی فرمایش کے لکھے تھے صدہا اخبار جاری ہیں اور سب اُردو - ہر علم اور ہر فن کی ہزارہا کتابیں اُردو میں ترجمہ اور تصنیف ہو گئیں اور ہو رہی ہیں سرکاری کچہریوں میں اُردو ہی - قانون اصل میں انگریزی ہو مگر لوگوں کی آگاہی کے لیے اُردو میں مشتہر کیا جاتا ہی - کیا یہ سب باتیں اُردو کی ترقّی کی دلیل نہیں ہاں اُردو کی شاعری کی شان البتہ بدل گئی ہی اس کو کچھ اُردو کا کوئی تنزّل سمجھے تو یہ اس کے اپنے مونھ کی کہن[1] ہی ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ بہرکیف اُردو نے بہت ترقّی کی ہی اور ترقّی کے معنی کیا ہیں کہ وہ وسیع ہوتی جاتی ہی ہر ایک طرح کے خیالات اُس کے ذریعے سے ادا ہو سکتے ہیں وہ پہلے سے بہت زیادہ آراستہ اور شُستہ ہو گئی ہی - مولانا شاہ عبد القادر رح اور مولانا شاہ رفیع الدین رح کے ترجمے زبان کے پُرانے ہونے کی وجہ سے ایسے اُکھڑے اُکھڑے نہیں معلوم ہوتے جیسے بے ترتیبی الفاظ کی وجہ سے یہ نہیں کہ ان بزرگوں کو بے ترتیبی الفاظ کا علم نہیں ہوا یا ان کے وقت میں ایسی بے ترتیب اُردو فصیح سمجھی جاتی تھی - نہیں یہ لوگ بجائے خود اُردو کے لیے سند تھے مگر بات یہ ہی کہ ایک طرف ترتیبِ الفاظِ قرآن کا پاس اور دوسری طرف اُردو کی فصاحت - ان کی دین داری نے اجازت نہ دی کہ ترتیبِ الفاظِ قرآن کے مقابلے میں اُردو کی فصاحت کا پاس کریں - ترتیبِ الفاظِ قرآن کا پاس اپنے اُوپر لازم تو کیا یہاں تک کہ وہ عَلَی السَّمَآءِ کا ترجمہ آسمان پر کی جگہ اوپر آسمان کے اور فِی الْاَرْضِ کا ترجمہ زمین میں کی جگہ بیچ زمین کے کرتے ہیں مگر مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ کا ترجمہ "سے آسمان تک زمین" تو نہیں کر سکتے ترجمہ تو ترجمہ کثرت سے عربی پڑھنے نے اُن کے مذاقِ اُردو پر یہ اثر کیا تھا کہ باوجودیکہ ترجمہ نہیں مگر الفاظ کی بے ترتیبی اُن کی اپنی اُردو میں بھی ہی اِس وقت ہمارے سامنے مطبع فاروقی کا چھپا ہوا ایک قرآنِ مترجم موجود ہی جو ۱۲۹۴ھ میں چھپا تھا اور اُس میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رح اور مولانا شاہ عبد القادر صاحب رح کے تینوں ترجمے بین السطور ہیں - شروع میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رح کے ترجمہ موسومہ فتح الرحمٰن کا دیباچہ ہی اُس کے حاشیے پر مولانا شاہ عبد القادر صاحب رح کے ترجمہ موسومہ موضح القرآن کا دیباچہ ہی ہم مولانا شاہ عبد القادر صاحب رح کے دیباچے کی عبارت اِس جگہ نقل کرتے ہیں کیونکہ انھیں کا ترجمہ بامحاورہ سمجھا جاتا ہی - اور مولانا شاہ رفیع الدین رح کے ترجمے کے مقابلے میں وہ ایسا ہی ہی وہ فرماتے ہیں "آہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویا کی اپنے نام کرا اور دل کو

[1] یہ اُن کے مونھ کی کہن ہی ۱۲

روشنی دی اپنے کلام کرا ور اُمّت میں کیا اپنے رسولِ مقبول کی جو اشرف الانبیا ء اور نبی الرحمۃ جس کی شفاعت سے اُمیدوار ہیں ہم کہ پا دیں دو جہان کی نعمت الٰہی اِس نبی اُمّت پرور کو اپنی رحمتِ کامل سے درجاتِ اعلیٰ نصیب کر جو حد نہ ہو کسی مخلوق کی اور اپنی عنایت اُن پر ہمیشہ افزوں رکھ دُنیا اور آخرت میں" ہم نے یہ عبارت بہت احتیاط سے نقل کی ہے اگر اس میں کوئی لفظ بدل گیا ہے یا آگے پیچھے ہوگیا ہے یا رہ گیا ہے تو ہم پر اس کا الزام نہیں یہ نمونہ ہے مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی آزاد طبع زاد اُردو کا اسی پر قیاس کرنا چاہیئے اِن کے ترجمے کو جس میں چار و ناچار پابندی کرنی پڑتی ہے - اگرچہ ہم دیباچہ کی زبان "گوگویائی" اور "اپنے نام کر" اور "اپنے کلام کر" کی خوبیوں کو نہ سمجھیں مگر با ایں ہمہ ترجمہ اپنے وقت میں اور اپنی شان میں بے نظیر تھا - لیکن اُس کی بے ترتیبی اور اُس کے انقباض نے عوام کو وہ فائدہ نہ ہونے دیا جس کی مترجم نے توقع کی تھی - لوگ اس کو مجبوری پڑھتے ہیں - اس لیئے کہ اس سے بہتر اَور کوئی ترجمہ نہیں مگر جیسا کہ چاہیئے خوش نہیں ہوتے اور اکثر جگہ سے تو سمجھتے بھی نہیں شوق سے پڑھنا شروع کرتے اور اُکتا کر چھوڑ دیتے ہیں مسلمان ایسے کہاں کے کلامِ الٰہی کے دل دادہ تھے وہ جو کہتے ہیں اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ترجمہ ہونا چاہیئے تھا سلیس شگفتہ مطلب خیز - بامحاورہ کہ ایک بار نظر ڈالو تو چھوڑنے کو جی نہ چاہے صفحے کے صفحے اور ورق کے ورق پڑھتے چلے جاؤ اور طبیعت نہ گھبرائے - اصل قرآن کی سی فصاحت کا تو آنا محال ہے مگر مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ [۹۰] - جہاں تک ہو سکے اور جتنا ہو سکے - اب قرآن کی اور موجودہ ترجموں کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک حد درجے کا حسین آدمی ہے - مگر اُس کا لباس اُس کے حسن کے شایاں نہیں - لوگ تو تازل سے اچھے ترجمے کی تلاش میں ہیں مگر کام فی نفسہ ایسا مہتم بالشان ہے کہ اُس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہر ایک کا حوصلہ نہیں پڑتا -

یہ کام حقیقت میں اُن مولویوں کے کرنے کا تھا جنھوں نے اپنا وقتِ عزیز وقفِ خدمتِ دین کر رکھا ہے - دینیات کا درس دیتے وعظ فرماتے اور فتوے لکھتے ہیں - مگر اُن میں سے بعض تو اس کام کے سرانجام کرنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے بعض جن کو لیاقت ہے وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ [۹۱] اپنے مشاغل کے آگے اِس کو ضروری نہیں سمجھتے لیکن تیس[۳۰] تلیس[۳۱] بتیس[۳۲] تینتیس[۳۳] پینتیس[۳۵] برس سے تو ترجمے کے لیئے لوگوں نے میری جان کھا رکھی ہے اور یہ اُنھیں سے پوچھنا چاہیئے کہ کیوں میرے دَرپے ہیں - میرا حال یہ ہے کہ دلی کالج میں اعلیٰ درجے تک عربی کی تعلیم پائی اور جن چیزوں کی کالج میں کمی تھی اُن کو کالج کے باہر اپنے طور پر تمام کیا - پڑھا سب کچھ مگر طبیعت میں زبان کا خلقی مذاق تھا - امتحان ہوتا تو ہندسہ - ریاضی - تاریخ وغیرہ کی کمی کو ادبِ عربی تلافی کرتا رہتا - باوجودیکہ اُن دنوں شہر کے علماء کالج کے طلبہ کو لیاقت کے اعتبار سے وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور لوگوں کو کالج کی طرف سے مذہبی بدگمانی بھی تھی اور والدِ مرحوم کو جو بڑے پکے دین دار تھے مجھے اُن وقتوں کا سا مولوی بنانا منظور تھا تاہم مجھے اب معلوم ہوا کہ کیوں میری طبیعت میں زبان کا مذاق رکھا گیا تھا اور باوجود چند در چند مزاحمتوں کے کیوں میں کالج میں داخل ہوا تھا - بات یہ ہے اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ شَيْئًا هَيَّاَ اَسْبَابَهٗ [۹۲] خدا کو مجھ سے اپنے کلامِ پاک کی خدمت کرانی منظور تھی اور مجکو اُس وقت سے اِس کے لیئے تیار کیا جاتا تھا - جب کہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میں ایسی خدمت کر سکوں گا - یہ خدا ہی کا کام تھا کہ اُس نے زبان کا مذاق میری طبیعت میں رکھا - میرے ہم جماعت جن میں بعض مجھ سے ذہن میں کم تھے - ریاضی کے مسائل کو مجھ سے بہت بہتر سمجھتے تھے اور میرا یہ حال تھا کہ ریاضی کا نام آیا اور مجکو لرزہ چڑھا - اِس کے برخلاف میرے ہم جماعت جن میں سے بعض کا حافظہ مجھ سے قوی تھا اور وہ محنت بھی مجھ سے زیادہ کرتے تھے

[۹۰] جو چیز تمام و کمال حاصل نہ ہو سکے اُس کو بالکل ہی چھوڑ دینا بھی نہیں چاہیئے ۱۲ [۹۱] اور وہ بہت ہی تھوڑے ہیں ۱۲ [۹۲] خدا جب کچھ کرنا چاہتا ہے تو اُس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے ۱۲

اُن کو عربی کی عبارت یاد نہیں ہوتی تھی اور مجھکو سیکڑوں شعر اور نثر کے ورق کے ورق ازبر۔ یہ خدا ہی کا کام تھا کہ میں کالج میں داخل ہوا
نہ کالج میں داخل ہوتا۔ نہ عربی کا مذاق ترقی پکڑتا۔ کیونکہ سلسلۂ نظامی میں ادب کا نام ہی نہ تھا کالج سے نکل کر بہیٹا کے دھندے میں
لگ گیا۔ لیکن اس حالت میں بھی مطالعے سے بے تعلقِ محض نہیں رہا۔ مگر کتاب بھی دیکھتا تو ادب کی یا حدیث کی کہ وہ بھی ادب
کی جان ہی یا شاذ و نادر تاریخ۔ اسی ادبی مذاق کا نتیجہ تھا کہ میں طالب العلمی کے زمانے سے قرآن کا گرویدہ ہوں اُس وقت بھی دینداری
ہی کے تقاضے سے نہیں بلکہ زبانِ عربی کی لذت کی وجہ سے مجھکو قرآن کے رکوع کے رکوع اور سورتیں کی سورتیں زبانی یاد تھیں۔
اور امتحان میں جب کبھی کسی لغت یا محاورے کے لیئے استشہاد کی ضرورت پڑتی مجھے اچھی طرح خیال ہو کہ اکثر مجھکو قرآن کی سند برمحل
یاد آجاتی تھی۔ خیر وہ بھی ایک وقت تھا جس کو گزرے ہوئے مدتیں ہوگئیں۔ یہ اب کوئی پندرہ برس کا مذکور ہو کہ میں حیدرآباد میں تھا
کام کی یہ کثرت کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں اتفاق سے ایک دوست بیمار پڑے اور میں برابر کئی مہینے حیدرآباد میں ٹھیر کر
اُن کی بیمارداری کرتا رہا۔ ایسے اوقات میں طبیعتوں کو رجوع الی اللہ تو ہوتا ہی ہو میں بھی اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتا۔ تلاوت
کرتے کرتے بھولی بسری سورتیں بھی پھر ذہن پر چڑھ گئیں اور کچھ نئی سورتیں یاد کرلیں ان سب کا مجموعہ قرآن کا ایک اچھا خاصہ
حصہ ہوگیا۔ تب خیال آیا کہ لاؤ قرآن کو پورا کرلوں خدا کے فضل سے چھے مہینے سے کم ہی کم میں سارا قرآن حفظ ہوگیا لوگ چھے مہینے
کا نام سن کر تعجب کرتے تھے مگر میں تو اپنے مذاقِ عربی سے واقف تھا میں نے نہ تو کبھی اس مدت پر تعجب کیا اور نہ کبھی اپنے
حافظے کو معمولی سے زیادہ اچھا سمجھا پھر ترکِ خدمت کرکے خانہ نشین ہوا تو کتاب بینی کا شغل بڑھ گیا۔ مگر کتابیں وہی ادب کی یا
حدیث یا شاذ و نادر تاریخ۔ یہاں تک کہ حدیث کی وہ عمدہ کتاب تیسیر الوصول الی جامع الاصول فی احادیث الرسول
دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ صاحبِ کتاب نے صحاحِ ستّہ کے دریا کو اس کتاب کے کوزے میں بند کیا ہی یہ خیال تو دل میں جما ہوا تھا
ہی کہ مسلمانوں کو دینیات کے ترجموں کی سخت ضرورت ہی اور لوگوں نے حدیث کی بعض کتابوں کے متفرق ترجمے کیئے بھی
ہیں مگر اچھے نہیں۔ بے اختیار جی میں آیا کہ لاؤ تیسیر کا ترجمہ کریں کہ اس کا ترجمہ ہوئے پیچھے صحاح کے ترجمے کی ضرورت باقی
نہیں رہے گی۔ چنانچہ ایک ربع کا ترجمہ پورا ہو بھی گیا۔ اگرچہ ہنوز اُس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تیسیر کے پہلے ربع میں واقع ہوئی
کتاب التفسیر اور اُس میں تھیں قرآن کی آیتیں چار و ناچار اُن کا بھی اپنے طور پر ترجمہ کرنا پڑا میں قرآن کے ترجمے کی ضرورت کو
مدتوں سے سمجھا بیٹھا تھا مگر ایسی جرأت کرتے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ خدا کا کلام ہی اور دینِ اسلام کا دارمدار اسی پر ہی اس کے ترجمے کو بڑی
لیاقت اور بڑی معلومات چاہیئے لیکن سوچا کہ لیاقت اور معلومات والے تو اس طرف متوجہ نہیں اور زمانے کا رنگ ایسا اکھڑا ہی کہ اس
قسم کے لوگ روز بروز دنیا کے پردے سے اُٹھتے چلے جاتے ہیں نئی پود تیار نہیں ہوتی اور پرانی کہاں تک وفا کرے جو مرتا ہی
کوئی اس کا جانشین نہیں ہوتا اور وہ دن دکھائی دے رہا ہی کہ جیسی تھوڑی بہت بری بھلی لیاقت اپنے میں ہو اُس کا بھی خاتمہ ہی ہی
تو جب میں نے تیسیر میں سے کتاب التفسیر کا ترجمہ کیا اور اُس کے ضمن میں آیاتِ قرآنی کا۔ تو ایک دم سے میری رائے بدل گئی اور میں نے
کہا آیاتِ قرآنی جیسی حدیث میں ویسے قرآن میں۔ حدیث میں آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کروں اور قرآن کا نہ کروں تو میری وہی مثل ہوگی
کہ گلگلوں سے پرہیز اور گڑ کھاؤں۔ اس خیال نے ایسا اکر دبایا کہ میں نے تیسیر کا ترجمہ تو کیا موقوف اور بسم اللہ کرکے قرآن کا ترجمہ
شروع کردیا۔ اپنی چھاچھ کو کون کھٹا کہا کرتا ہی ہر کس را عقل خود بکمال میں تو اپنے ترجمے کی تعریف کروں ہی گا۔ مگر اپنے مونہ میاں مٹھو

کا طعنہ کون سُنے - میں تو بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ میں نے ترجمے کے عیوب و صواب ترجمے کی مشکلات - کلامِ الٰہی کی عظمت ان سب باتوں کو اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر خالصًا لوجہ اللہ ترجمے کے لیے قلم اُٹھایا - اور وقت اور محنت اور زر کے صرف کرنے میں کسی طرح کا دریغ نہیں کیا - اب جس کا کلام ہے اُس کے کرم کی اُمّید واری ہے کہ اِس خدمت کو محض اپنے فضل سے قبول فرمائے اور اِس کو مجھ نالائق کا عملِ صالح سمجھ کر میرے گناہوں کا جن کی کوئی حد و انتہا نہیں کفارہ کرے آمین ترجمے کے حق میں یہ ایک فالِ نیک تھی کہ حُسنِ اتفاق سے مولوی ابو عبد الرحمٰن[۵۱] محمد صاحب ہاتھ آ گئے اور وہ شروع سے آخر تک میرے شریک بلکہ ایک اعتبار سے شریکِ غالب اور مددگار رہے ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھتے - بیچ میں میز حائل ہوتی - میرے ہاتھ میں قرآن مجید اور کبھی میں نے حفظ پر اعتماد کیا تو قرآن بھی نہ سہی - مولوی محمد صاحب کے گرداگرد تراجم اور تفاسیر اور کتبِ لغت میں ایک جملے یا ایک آیت کا ترجمہ جیسا الفاظِ قرآن سے سمجھتا تھا بولتا اور مولوی محمد صاحب اُس کو قلمبند کرتے اور پھر مجھ میں اور مولوی محمد صاحب میں بحث ہوتی اور اختلاف کی صورت میں تراجم اور تفاسیر اور لغت کی طرف رجوع کیا جاتا - اسی طرح پر سارے قرآن کا ترجمہ کیا گیا - پس یہ ترجمہ براسہ قرآن کا ترجمہ ہے نہ دوسرے ترجموں کی طرح کسی ترجمے کا ترجمہ - اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے - پھر ہم دونوں نے ترجمے پر نظرِ ثانی کی مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور ترجمے کو الفاظِ قرآن سے ملاتا اور پھر ہم دونوں میں پہلے کی طرح بحث ہوتی - اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش بھی ہو جاتی تھی مگر چونکہ دونوں کی نیت بخیر تھی ہم دونوں نے کبھی مناظرے کی حد سے تجاوز نہیں کیا - ابھی اختلاف کر رہے تھے - ابھی متفق ہو گئے - ابھی لڑے - ابھی ملے - ایسی کاوش کے ساتھ ترجمہ اور نظرِ ثانی کرنے پر بھی ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمے کو دیکھیں اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے حامی نہ بھری اور یوں کوئی اُڑتی ہوئی سُن بھاگا اور چلتی ہوئی سی ایک بات کہہ دی تو گو ہم نے اُس کو بھی رد نہیں کیا مگر دل کی ہوس پوری نہ ہوئی - ترجمے کی کاپیاں عام جگہ میں پڑھی اور مقابلہ کی جاتی تھیں اور بہت لوگوں کو معلوم ہوا کہ نیا ترجمہ چھپ رہا ہے مگر کوئی رُخ ہی نہ دے تو کیا کیا جائے اَنُلْزِمُكُمُوهَا[۵۲] وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ صرف سورہ بقرہ اور کچھ سورہ آلِ عمران کے لیے مولوی حافظ عبد الوہاب[۵۳] صاحب کی شمولیت سے جلسے ہوئے اور بڑی تفتیش کے ساتھ ترجمہ دیکھا گیا - مگر مشکل یہ آ کر پڑی کہ مولوی عبد الوہاب صاحب آنکھوں سے معذور اور وہ ایک ایک لفظ کے لیے تمام تفاسیر اور تراجم لفظ لفظ پڑھوا کر سنتے تھے اور آدھے دن کی پوری محنت میں ایک رکوع بھی تمام نہیں ہوتا تھا اگر اسی طرح پر نظرِ ثانی کو چلنے دیا جاتا تو مجھ کو اپنی زندگی میں ترجمے کے تمام ہونے کی توقع نہ تھی مجبوری اس طرز کو موقوف کیا پھر بھی جو ڈھنگ سورہ بقرہ کے ترجمہ کا پڑ گیا تھا اُس کو آخر تک نباہا - ایک مولوی فتح محمد خان[۵۴] صاحب جالندھری نے نئے ترجمے کا نام سنا اور پڑھ کر مجھے

---

[۵۱] مرحوم مولوی ابو عبد الرحمٰن صاحب متوطن پنجاب بڑے لائق اور سمجھ دار عالم تھے حدیث و تفسیر میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے ان کو ادب میں جناب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی مترجم القرآن کی شاگردی کا فخر حاصل تھا ۱۲ (محمد رحیم بخش)

[۵۲] کیا ہم اُس کو زبردستی گلے منڈھ سکتے ہیں اور تم ہو کہ اُس کو ناپسند کیے چلے جاتے ہو ۱۲

[۵۳] حافظ صاحب بھی جناب مترجم کے مستفیدوں کے زمرے میں شامل ہیں ۱۲ (محمد رحیم بخش)

[۵۴] مولوی فتح محمد خان صاحب جالندھری ایک مدت دراز تک ہمارے مولانا شمس العلماء کی لیاقتِ علمی کے غائبانہ معتقد رہے اور اُن کے علوم و زبان سے برسوں مستفید ہوا کیے ابھی بھی یہاں بھی تشریف لائے اور اپنے وطن میں بھی بہت دنوں تک جناب کے لینا کا حق استفادہ ظاہر کرتے اور عقیدتمندانہ تحریروں سے اس کا ثبوت دیتے رہے چنانچہ مولوی فتح محمد خاں صاحب کے ہاں صاحبزادی پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنی اُس قدیم عقیدتمندی کی وجہ سے دختر کا نام مولانا سے تجویز کرایا اور مولانا کے تجویز (بقیہ صفحہ آئندہ)

اور باصرار مسودہ منگوایا میں نے اُن کو لکھا کہ ارادتمندانہ نہیں بلکہ مخاصمانہ اور معترضانہ نظر سے دیکھیں اور اُنھوں نے اسی نظر سے دیکھا اور تمام تر دیکھا اور خوب دیکھا اُس وقت تک ہم نے ترجمے کی عبارت کی خوبی کے پیچھے اصل مطلب کا تو نہیں مگر ترتیب الفاظ کا اور خود الفاظ کا بھی جس قدر خیال کرنا ممکن تھا نہیں کیا تھا مولوی فتح محمد خاں نے ہم کو روکا اور بجا روکا اور ہم نے سارے ترجمے کو پھر تیسری بار دیکھا اس وقت تک ہمارا ترجمہ بطور ایک کتاب کے علیحدہ لکھا ہوا تھا۔ اب کاپی لکھنے کی نوبت آئی تو جہاں جہاں حک و اصلاح کی وجہ سے زیادہ مشکوک ہو گیا تھا مولوی محمد صاحب نے کاتب کے لیے اُس کو نقل کیا۔ نقل کرتے وقت جو اشتباہات واقع ہوتے وہ اُن کو میرے روبرو پیش کرتے اور یہ چوتھی نظر ہوئی مگر بالاستیعاب نہیں اب یہ تجویز در پیش ہوئی کہ ترجمہ کس پیرائے میں چھپے کبھی خیال آیا کہ بمقابل متن کسی نے کہا کہ صفحے کے اعلیٰ حصے میں متن اور اسفل میں ترجمہ لیکن معلوم تھا کہ جو مسلمان پرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ ذرا سی تبدیل و تجدید سے بھی بھاگتے ہیں اور صرف ایسا ترجمہ لینا چاہتے ہیں جو بین السطور ہو۔ چنانچہ نقش اول کے لیے یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔ اور اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اوپر متن اور نیچے ترجمہ ہونے سے اصل و ترجمہ کے الفاظ کی کمی و بیشی کھل پڑی۔ اس نوبت میں حکیم مولوی عبید اللہ صاحب سے بڑی مدد ملی کہ اُن کی طالب العلمی جدید العہد ہے اور الفاظ کی جامعیت و مانعیت پر اُن کی نظر خوب پڑتی ہے۔ ترجمے پر ہماری یہ پانچویں نظر ہوئی اور پچھلی سب نظروں سے اس میں زیادہ کاوش کرنی پڑی۔ پھر ایک چھٹی نظر مختتم پروف کی تھی۔ اس طریق عمل سے ظاہر ہے کہ یوں کہنے کو تو ہم نے ڈھائی برس ترجمہ پر صرف کیے مگر ایک حساب سے رات دن اسی کے پیچھے پڑے رہے۔ تو وہ ڈھائی برس نہیں ہیں بلکہ پانچ یا شاید

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کیے ہوئے نام سے مسماۃ کو فخر اشتہرت بھی دی۔ ہمارے مولانا کی طبیعت چونکہ سپاس اپنا اور فطرۃً رحم دل واقع ہوئی ہے آپ بھی مولوی فتح محمد خاں صاحب کی اس شکر گزاری پر طرح طرح سے اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہے یہاں تک ایک موقع پر جب کہ مولوی فتح محمد خاں صاحب کی ہونہار صاحبزادی نے لکھنا سیکھا اور اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ حرف مولوی فتح محمد خاں صاحب نے مولانا کے پاس بھیجے تو آپ نے خوش ہو کر تبرکاً و انعاماً سونے کی ایک خوبصورت انگوٹھی بھیجی اور پھر مولوی فتح محمد خاں صاحب کی طلب و استدعا پر چار سو یا شاید تین سو روپے قرض حسن دیئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمَحَبَّۃِ۔ روپیہ کا قرض دینا تھا کہ دونوں صاحبوں میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو گیا ایک مدت کے بعد مولانا نے روپے کا مطالبہ کیا مولوی فتح محمد خاں صاحب کانوں میں تیل ڈال کر چپکے بیٹھ گئے۔ اُدھر سے روپے کے ادا کرنے پر پہلو تہی دیکھی گئی تو مولانا نے تقاضے میں سختی کی۔ آخر کار بہزار دقت کچھ روپیہ وصول ہوا اور کچھ باقی رہ گیا جواب تک بھی باقی ہے اس سے مولوی فتح محمد خاں صاحب بالکل ہتھے سے اُکھڑ گئے اور مولانا کے مقابلے میں شاید اس خیال سے کہ مولانا کے ترجمۃ القرآن کی اشاعت میں ضعف پیدا ہو اور اس سے اُن کو کچھ نقصان پہنچے قرآن کا ایک نیا ترجمہ کرکے چھپوا دیا۔ ترجمے کے عیب و صواب پر تو ہم اس وقت ریمارک کرنے بیٹھے نہیں اور نہ اُس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اہل انصاف دونوں ترجموں کو سامنے رکھ کر خود موازنہ کر لیں مگر اتنا کہے بدون تو رہ نہیں سکتے اور یہ بالکل واقعی اور نفس الامری بات ہے کہ ترجمہ جیسا کچھ بھی ہے اور جتنا کچھ بھی ہے یہ ہمارے مولانا ہی کے اُس خرمن علوم کے ایک ذرّے کا کرشمہ ہے جسے مدتوں مولوی فتح محمد خاں صاحب ارادتمندانہ حاصل کرتے رہے اور ہمیں توقع ہے کہ مولوی فتح محمد خاں صاحب کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا ہم اس مقام پر اس نوٹ کے لکھنے کی ضرورت نہ تھی مگر جب ہم نے بعض لوگوں کو کہتے سنا کہ مولوی فتح محمد خاں صاحب مولانا کے دیباچے کی اس عبارت سے استشہاد کرتے ہیں کہ شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کے ترجمۃ القرآن میں ایک خاص طرح کا نقص تھا جس کو میں نے دور کیا اور میرا ترجمہ نقائص سے پاک ہے تو ہم کو لوگوں کے اس وہم کا رفع اور مولانا کی دیانت کا ظاہر کرنا منظور تھا کہ باوجودیکہ ترجمہ ہوتے وقت جس قدر لوگ شریک ترجمہ تھے مولانا کے تلامذہ اور مستفیدین میں تھے مگر مولانا نے حق دیانت ظاہر کرنے کے لیے ہر ایک کی خدمت کا الگ الگ ذکر فرمایا اور بجا فرمایا اس سے مولوی فتح محمد خاں صاحب اپنے دعوے کو مدلل نہیں کر سکتے اور کریں گے تو مانے گا کون ۱۲ (محمد رحیم بخش) ۵ یہ صاحب بھی حضرت مترجم کے تلامذہ میں ہیں ۱۲

اس سے بھی زیادہ اور لوگ تو صرف نظرِ ثانی کو کافی سمجھا کرتے ہیں ہم نے چھ بار ترجمے کو دیکھا اور پرتالا ہے اس پر بھی ترجمے میں اگر کوئی کسر باقی[۵۱]
رہ گئی ہو اور ضرور رہ گئی ہوگی تو میں بھی بندہ بشر ہوں لَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ[۵۲] شعر[۵۳] أَلَا لِيَقُلْ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ إِنَّمَا ⁂ يُلَامُ الْفَتَى فِي مَا
اسْتَطَاعَ مِنَ الْأَمْرِ ✝ اگرچہ یہ ترجمہ میرے نام سے شائع کیا جاتا ہے مگر میں نے تو سارا حال پوست کندہ ظاہر کر دیا ہے حقیقت میں یہ ترجمہ مولویوں
کی ایک جماعت کا ترجمہ ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جتنے آدمی اس ترجمے میں شریک تھے زبانِ اردو کے اعتبار سے میں سب میں پیش
پیش تھا اور کچھ یوں ہی سا ادبِ عربی میں۔ سو ویسی ہی اور لوگوں کی دینی معلومات مجھ سے بڑھی ہوئی تھی۔ یہ لوگ مشاہیر علماء میں سے تو نہیں
ہیں اور مشاہیر میں ہوتے تو ہمارے ہتھے ہی کیسے چڑھتے مگر اس میں شک نہیں کہ سب کے سب بجائے خود عالم ہیں۔ عالموں سے بہتر کام میں
اور عالموں کے سے ناز بے جا نہ کریں۔ مانا کہ ہم میں سے کوئی بھی جید عالم نہیں۔ مگر اس میں نہ مبالغہ ہے نہ خود ستائی کہ ہم سب مل کر ایک ایسے
جید عالم کے قائم مقام ہیں کہ سارے ہندوستان میں اس جامعیت کا کوئی ایک آدھ ہی ہوگا۔ ترجمے کے لیے جتنی معلومات درکار ہے
ہم سب کی مجموعی معلومات جو پہلے سے تھی اور بہت کچھ مطالعہ تفاسیر و احادیث و کتبِ لغت سے فی الوقت بڑھائی گئی کافی ہے۔ اس ترجمے
میں بعض خصوصیتیں بھی ہیں جن سے ترجمے کے پڑھنے والوں کو آگاہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اول تو ہم نے اپنے نزدیک بڑی بات
یہ کی کہ پیغمبروں کی نسبت تو تڑاق یا اُن کی نسبت مفرد ضمیروں کا استعمال گو وہ خدا ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو زبان کے اعتبار سے سماع
پر گراں گزرتا تھا ہم نے اس طریقے کو بدل دیا إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ کا ترجمہ اور لوگ کرتے ہیں "ہم نے تجکو بھیجا" اور ہم نے کیا "ہم نے تم کو
(پیغمبر بنا کر) بھیجا" اسی طرح لفظ قَالَ خدا کی طرف بھی منسوب ہے اور بندوں کی طرف بھی اور فرشتوں کی طرف بھی۔ اور شیطان کی طرف
بھی غرض جو قائل ہو اس کی نسبت عربی میں قَالَ ہی کہا جائے گا ہم نے مناسبِ مقام کہیں فرمایا کہیں عرض کیا کہیں دعا کی ترجمہ کیا دوسرے
ہم نے اپنی طرف سے جا بجا عبارتیں زیادہ کی ہیں اور امتیاز کے لیئے اُن کو خطوطِ ہلالی میں محصور کر دیا ہے مگر ہم نے جو عبارت اپنی طرف
سے زیادہ کی اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے ترجمے کو تفسیر بنا دیا ہے۔ نہیں ترجمہ ترجمہ ہی ہے۔ اور ایسی ہی ضرورت دیکھی ہے تو کہیں توضیحِ مطلب
کے لیئے۔ کہیں محذوف یا مقدر کے اظہار کے لیئے۔ کہیں تسلسلِ کلام کے لیئے۔ کہیں کلامِ سابق و لاحق کا تعلق دکھانے کے لیئے اور
کہیں تحسینِ ترجمہ کے لیئے بھی عبارت بڑھائی ہے اصل غرض یہ ہی ہے کہ ترجمے کا پڑھنے والا قرآن کا نفسِ مطلب بخوبی سمجھ لے اور جہاں
خطوطِ ہلالی سے بھی کام نہیں نکلا تو ہم نے حاشیے پر فائدے لکھے ہیں سمجھنے والا سمجھ گیا ہوگا کہ خطوطِ ہلالی کا التزام کرنے سے ہم نے اپنے
اوپر ایک قید اور بڑھا لی اور ہم کو یہ دیکھنا پڑا کہ خواہ ترجمہ پڑھیں یا خطوطِ ہلالی کی عبارت کو ملا کر پڑھیں دونوں صورتوں میں حتی المقدور عبارت
پایۂ سلاست سے ساقط نہ ہو اور اس کا نباہ کچھ آسان کام نہ تھا۔ سب کچھ تو ہوا مگر اس کا کیا علاج ہے کہ عموماً مسلمان قرآن کے مطلب سمجھنے کا
قصد ہی نہیں کرتے۔ ان میں سے جو قرآن پڑھتے بھی ہیں وہ مُونہ سے الفاظِ قرآن کے ادا کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ
ہے کہ قرآن اسی غرض سے نازل ہوا کہ اس کے الفاظ جس سے جتنی دفعہ ہو سکے طوطے کی طرح کہہ لیئے جائیں اُن کو مفہوم سے کچھ غرض
مطلب ہی نہیں پھر اس خیال کو ترقی کرتے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی موٹے حرفوں کا ضخیم قرآن لیئے ہوئے نمازِ صبح سے فارغ ہو کر
مسجد میں روشنی کا منتظر بیٹھا ہے آخر جب آفتاب نکلنے کو ہوا بالکل آیا اس نے احتیاط سے قرآن کو رحل پر پھیلایا عینک لگائی کچھ آپ

---

[۵۱] خصوصاً زیادہ اصلاح کی وجہ سے چھاپے کی کتابت میں ۱۲ [۵۲] نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں ۱۲ [۵۳] سنو! جو جس کی جی میں آئے
کہے آدمی تو اُسی کام میں ملامت کیا جا سکتا ہے جو اُس کے کرنے کا ہو ۱۲

تنا کچھ رحل کو سرکایا اور جب منظر ٹھیک ہوگیا تو اُس نے قرآن پڑھا جتنا خدا کو اُس سے پڑھوانا منظور تھا پھر اٹک اٹک کر اور لفظوں کو دو ہرا دو ہرا کر مولوی شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمے کے چند رکوع پڑھے مگر سمجھنے کے قصد سے نہیں بلکہ جس ارادت اور عقیدت سے اُس نے قرآن پڑھا تھا اُسی ارادت اور عقیدت سے اُس نے ترجمہ پڑھا اور دعا مانگ، قرآن کو تہ کر بغل میں داب لکڑی ٹیکتا ہوا گھر کا رستہ لیا۔ ایسے لوگوں کو اور افسوس کہ اکثر ایسے ہی ہیں نہ کسی جدید ترجمے کی ضرورت ہے اور نہ وہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمے میں اور اس میں فرق کریں گے۔ اس ترجمے کی خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ترجمہ عربی اور اُردو کے اختلاف کو پورا پورا ظاہر کرتا ہے اور اگر کوئی شخص اُردو کی عربی کرنے کی مہارت کرنی چاہے تو اُس کو چاہیئے کہ ہمارے ترجمے سے مثلاً ایک جملہ لے اور اُس کی عربی کرے اور پھر قرآن کی عربی سے ملائے ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ قرآن کی سی عربی لکھنے پر قادر ہو جائے گا کہ یہ تو محال عقل ہے مگر ہاں اُس کو اتنا سلیقہ آ جائے گا کہ الفاظ اُردو میں کس جگہ رکھے جاتے ہیں اور عربی میں اُن کو کہاں لے جانا پڑتا ہے۔ اور یہی ترجمے کا گُر ہے۔ اس ترجمے کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ ہم نے مضامین قرآن کی ایک فہرست بنائی ہے یہ کام مقدار میں تو کم تھا مگر اشکال میں بہت۔ قرآن ایسا منتظم کلام ہے کہ اُس کا کوئی لفظ بے کار نہیں۔ فہرست نہیں ہے مگر ایک طرح کا خلاصہ، اور خلاصہ بے حذف و زوائد ہو نہیں سکتا۔ اور قرآن میں زوائد کا نام نہیں تاہم زمانے کی ضرورتوں پر نظر کر کے ہم نے ایک فہرست بنائی۔ مجکو تو اس فہرست میں صرف اتنا ہی دخل ہے کہ میں نے اس کا ڈھانچ کھڑا کر دیا۔ اور باقی جو کچھ ہے حافظ مولوی محمد صاحب شاہجہانپوری[51] کے فکر کا نتیجہ ہے۔ جس ربط و ضبط کے ساتھ اُنھوں نے اس فہرست کو بنایا ہے وہ اُنھیں کا حصہ تھا اور اُنھیں سے ہو سکتا تھا۔ مترجم کو اور خاص کر عربی کے مترجم کو اور عربی میں سے بھی کلام الٰہی کے مترجم کو قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں اور سب کو جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک کتاب ضخیم ہے مگر ہم نے اتفاقی طور پر اس کا خیال کرنے سے چند مشکلات کی ایک فہرست بنالی ہے۔ جس کو نمونے کے طور پر اس دیباچے کے ساتھ پیش[52] کیا جاتا ہے۔ لوگوں سے داد پانے کے خیال کو تو میں نے دل میں آنے ہی نہیں دیا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ مگر جو صاحب مترجم کو ملامت کریں کتاب کی ضخامت اور ان مشکلات کے انبار پر نظر کر لیں آیت دو آیت نہیں بلکہ صفحے دو صفحے ورق دو ورق کا ترجمہ کر کے دیکھیں پھر بعد کو بات سو بات۔ ترجمے پر ہماری کوششوں کا خاتمہ نہیں ہو گیا اگر خدا کو منظور ہے اور حیات مستعار باقی ہے تو ہم نے کلام الٰہی کی خدمت کے اور مفید پیرائے بھی سوچ رکھے ہیں اور میرے ایما سے مولوی حافظ محمد شاہجہانپوری نے محنت شاقہ اُٹھا کر اُس کا مواد بھی جمع کیا ہے صرف تکمیل اور ترتیب باقی ہے۔ واللہ الموفق والمستعان وعلیہ الثقۃ والتکلان ٭

بہر حال اس غرض اور اس اہتمام اور اتنی دقتوں سے مولانا نے ترجمۂ قرآن ختم کیا۔ اور چھپوایا۔ چھپنا تھا کہ شہرت لے اُڑی۔ جس اخبار میں دیکھو اس کا ذکر جس مسلمان کو دیکھو اُس کے پاس اسی کا مذکور اول تو کلام خدا اور پھر کلام خدا کا ترجمہ اور ترجمہ بھی کس کا شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کا۔ قلعۂ شاہجہانی کی اُردوئے معلی محاورات دل پسند۔ روزمرہ صاف و ستھرا استعارات شگفتہ غرض ہر قسم کی خوبی سے مملو ترجمے کے ڈنکے کا پٹنا تھا کہ مسلمان پبلک نے ہاتوں ہاتھ ہدیہ لے کر اُس کو سر اور آنکھوں پر رکھنا شروع کیا۔ اور نہ صرف سر پر رکھا بلکہ پڑھا اور سمجھا اور سمجھ کر ثواب حاصل کیا۔ راقم کے تجربے میں ہزار ہا مسلمان مولانا کے ترجمۃ القرآن میں تلاوت کرتے ہیں جس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ترجمے کی اڑتالیس ہزار جلدیں چھپ کر

---

[51] یہ بھی مولانا کے شاگرد ہیں ۱۲ [52] وہ فہرست ہم نے آگے چل کر صفحہ ۳۸۱ و ۳۸۲ میں نقل کی ہے ۱۲ مؤلف

شائع ہو چکی ہیں۔ جتنی شکلوں میں ترجمہ طبع ہو چکا ہے اُس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) ۲۲×۲۹ کی تقطیع پر دو صفحہ چھاپا گیا۔ کاغذ ولایتی نہایت عمدہ صاف اور چکنا اور سفید اور دبیز لگایا گیا ہے۔ متن عربی پر بڑی خوش نمائی کے ساتھ حنا کرائی گئی ہے۔ خط کی شان بالکل عجیب اور عام پسند ہے۔ کاتب قرآن نے اس کے لکھنے میں قلم توڑ دیا ہے اور علاوہ صنعت خوش نویسی کے اس میں یہ صنعت بھی دکھائی گئی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کے عنوان میں جہاں جہاں بسم اللہ آئی ہے اُسے بالکل ایک نئی طرز اور نئی شکل میں بصورت طغریٰ لکھا ہے اس تقطیع کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۲) متوسط قرآن مع ترجمہ جو ۲۲+۲۹ کی تقطیع پر چو صفحہ سفید و حنائی کاغذ پر چھاپا گیا ہے اس سے پہلے بھی فاضل مترجم نے اسی تقطیع کا چو صفحہ قرآن لکھنؤ میں چھپوایا تھا مگر چوں کہ اُس کے نسخ و نستعلیق دونوں خط عمدہ نہ تھے اور خط کی بے رونقی کے علاوہ کاغذ اور تصحیح بھی اچھی نہ تھی فاضل مترجم نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔ اور اگرچہ اُس کے اہتمام میں رقم کثیر خرچ ہو چکی تھی مگر پھر بھی فاضل مترجم کی دیانت نے اس بات کو جائز نہیں رکھا کہ کلام الٰہی غلطیوں کے ساتھ شائع کیا جائے۔ غرض متوسط قرآن کی تقطیع خوب صورت اور موزوں ہے۔ ایک صفحے پر متن قرآن اور دوسرے صفحے پر ترجمہ ہے۔ ترجمے والے صفحے کے حاشیے پر فوائد ہیں۔ متن والے صفحے کے حاشیے پر غرائب القرآن ایک بالکل جدید اور نئی چیز ہے یہ کسی کتاب یا رسالے کا ترجمہ نہیں ہے۔ بل کہ خود مترجم کا استنباط ہے کہ قرآن کے ہر ہر صفحے کے مشکل لفظوں کو جمع کر کے اُن کے متعلق صرفی نحوی۔ لغوی۔ معانی۔ ادبی غرض کہ ہر طرح کی اور ہر شخص کی حالت کے مناسب نہایت جاں کاہی کے ساتھ تحقیق کی ہے اور اس خوبی سے کی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی مذاق کا ہو اپنے مذاق کے مطابق پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن چھپ چکا ہے۔

(۳) جامع المصاحف ۲۲+۲۹ تقطیع کا سفید ولایتی کاغذ پر بین السطور کے ترجمے کے ساتھ حاشیے پر فوائد چڑھائے گئے مولانا نے خود اپنے مطبع شمسی دہلی میں کم استطاعت خواہش مندوں کے لیے چھپوایا ہے اس کا بھی ایک ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

(۴) حمائل کلاں ۱۷+۲۱ کی تقطیع پر آٹھ صفحی چھاپی گئی ہے۔ کاغذ نہایت سفید چکنا اور اصلی ولایتی ہے۔ بین السطور میں ترجمہ اور متن پر نہایت خوش نما حنا کرائی گئی ہے ابتدا میں ایک مختصر تمہید یا دیباچہ اور ۴۰ صفحے کی مفصل فہرست ہے۔ اس کے چار ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اصلاح اور جدید خوبی متزاد ہوتی چلی گئی ہے۔

(۵) سفری حمائل ہے جو ۱۷+۲۷ کی تقطیع پر ہشت صفحی چھاپی گئی ہے۔ فاضل مترجم سے بعض لوگوں کو شکایت تھی کہ ہم بڑی تقطیع کا قرآن و حمائل بوجھ کی وجہ سے سفر میں نہیں لے جا سکتے اور بعض کم استطاعت قیمت کی طرف سے بھی شاکی پائے جاتے تھے۔ مترجم دام فیوضہم نے یہ چھوٹی اور مختصر اور کم قیمت حمائل چھپوا کر دونوں قسم کے حضرات کی شکایت رفع کر دی۔ اس حمائل کے ایک صفحے پر صرف متن قرآن ہے اور اُس کے سامنے والے دوسرے صفحے پر ترجمہ اور حاشیے پر فوائد۔ اس حمائل میں اس بات کا بھی التزام کیا گیا ہے کہ متن کے صفحے کی عبارت جہاں سے شروع ہوئی ہے وہیں سے ترجمہ بھی شروع کیا جائے اور جہاں ختم ہوئی ہے وہیں ترجمہ بھی ٹھیک ختم ہو۔ یہ حمائل مطبع نظامی دہلی میں چھپی ہے۔ اور افسوس کہ جیسے عمدہ اور خوش خط دوسرے نسخے چھپے ہیں یہ حمائل ویسی نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی نکاسی اچھی طرح نہیں ہوئی۔

ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے جس سے ترجمۃ القرآن کے ایڈیشن اور تعداد طبع اور تعداد نکاسی کا حال معلوم ہوگا۔

دفعہ	قرآن یا حمائل	نام مطبع	تعداد	تقطیع	بکاسی
۱	قرآن ترجمہ بین السطور	انصاری	للعہ بارہ ہزار	۲۲-۲۹ دو صفحہ	کل ہدیہ ہوگئے
۲	حمائل ترجمہ بین السطور	انصاری	للعہ بارہ ہزار	۱۷-۲۱ آٹھ صفحہ	کل ہدیہ ہوگئیں
۳	ایضاً	انصاری وفاروقی	مہم اٹھا ہزار	۱۷-۲۱ آٹھ صفحہ	معہ بارہ ہدیہ ہوگئیں
۴	قرآن ترجمہ بین السطور	انصاری وفاروقی	للعہ بارہ ہزار	۲۲-۲۹ دو صفحہ	سمہ ہدیہ ہوئے
۵	قرآن ترجمہ بین السطور	لکھنؤ	للعہ بارہ ہزار	۲۲-۲۹ چو صفحہ	سب ہدیہ ہوگئے
۶	حمائل ترجمہ بالمقابل	نظامی دہلی	للعہ بارہ ہزار	۱۷-۲۶ آٹھ صفحہ	سب ہدیہ ہوگئیں
۷	قرآن ترجمہ بالمقابل	قاسمی دہلی	للعہ بارہ ہزار	۲۲-۲۹ چو صفحہ	ایک ہدیہ ہوئے
۸	قرآن ترجمہ بین السطور	نظامی دہلی	الف ہزار	۲۲-۲۹ دو صفحہ	الف ہدیہ ہوگئے
۹	حمائل ترجمہ بین السطور	"	للعہ بارہ ہزار	۱۷-۲۱ آٹھ صفحہ	سب ہدیہ ہوگئیں
۱۰	قرآن ترجمہ بین السطور	شمسی پریس دہلی	مہم اٹھا ہزار	۲۲-۲۹ چو صفحہ	الف ہزار ہدیہ ہوگئے

ہم نے سنا ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں ان مختلف الاشکال قرآن مع ترجمۃ القرآن کی مجلدات ۴۸ ہزار جلدوں سے متجاوز ہوکر خواص وعوام کے مختلف طبقوں کے ہاتھوں میں گئی ہیں اور لوگوں کا شوق ہے کہ ابھی تک تقاضا کیئے جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ترجمۃ القرآن بڑے شوق اور رغبت سے پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ فی الواقع ہے بھی اسی قابل۔

فاضل مترجم کو ترجمۃ القرآن میں بعض مشکلات کا پیش آنا

جو لوگ ترجمے کی مشکلات سے واقف ہیں وہ بے تامل اس کی تصدیق کریں گے کہ کتاب تو بڑی چیز ہے ایک جملے کے ترجمے میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے یہ دقتیں اور دشواریاں فاضل مترجم کو بھی پیش آئیں۔ مگر خداوند تعالیٰ نے ترجمانِ قرآن کی ذات بابرکات میں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا خاص مادہ اور لیاقت ابتدا ہی سے ودیعت فرما دیا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ فاضل مترجم جب کہ وہ انگریزی زبان پر کچھ ایسے زیادہ قادر نہ تھے اُس وقت بھی پینل کوڈ اور ضابطۂ فوجداری کے ترجمے میں اگرچہ اول اول صاحبِ مترجم تھے مگر اپنی قابلیتِ خداداد کی وجہ سے غالب علی الکل غالب ہوگئے۔ ہمارے اس خیال کو ذرا مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ فاضل مترجم کا ایسی سخت قانونی کتابوں کا ترجمہ کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے قانونِ اسلام کے ترجمے کا کام لینا چاہتا تھا اول اُس نے دنیاوی قانون پر مولانا کے ترجمے کے قلم میں فصاحت کی شاخ کا پیوند لگایا۔ محاورے کے پھول کھلائے اور بلاغت کے ثمر پیدا کیئے اور جب دیکھا کہ ہر کہ ومہ کو اس کا ذائقہ پسند ہے تو مسلمانانِ ہند کے لیئے فاضلِ مترجم کو ترجمۃ القرآن پر آمادہ کیا۔ اس لیئے یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ جس طرح متن قرآن بے نظیر ہے۔ ویسا ہی ترجمہ بھی بے نظیر ہے۔ یعنی جب تک اردو زبان زندہ رہے گی اُس وقت تک ایسا لاجواب اور بے مثل اور متبرک اور فصیح و بلیغ اور بامحاورہ ترجمۃ القرآن پیدا نہیں کر سکے گی غرض فاضل مترجم کو جو مشکلات ترجمے میں پیش آئیں وہ مندرجۂ ذیل قسم کی تھیں جن کو ہم بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں۔

پارہ	سورت	آیت	ترجمہ	کیفیت اشکال
۱۶	طٰہٰ	حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ	اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں	ضمیروں کے لحاظ سے اِس کا ترجمہ اُن کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں چاہیے تھا مگر محاورے کے لحاظ سے ایک ضمیر کا ترجمہ نہیں کیا گیا
〃	〃	لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا	تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے	اِس میں لَنَا کا ترجمہ محاورے کے لحاظ سے نہیں کیا گیا۔
〃	〃	فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ	پھر دریا کا جیسا کچھ ریلا اُن پر آیا سو آیا	محاورے کے لحاظ سے ایک ہُم کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔
〃	〃	لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي	میری ڈاڑھی اور سر (کے بال) تو پکڑو نہیں	اِس میں یَ لا برأسی کی یائے متکلم اور لا کا ترجمہ محاورے کے لحاظ سے نہیں کیا گیا
۱۷	انبیاء	وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنذَرُونَ	اور بہروں کو ڈرایا جائے تو وہ سرے سے کسی کی پکار ہی نہیں سنتے	محاورے کے لحاظ سے اِذا کا ترجمہ نہیں کیا گیا
〃	〃	لَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ	ابراہیم کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی	اِس میں رُشدہ کی ضمیر کا ترجمہ محاورے کے لحاظ سے نہیں کیا گیا۔
〃	〃	أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ	کیا تو ہمارے پاس سچی بات لے کر آیا ہے یا دل لگی کرتا ہے	محاورے کے لحاظ سے انت کا ترجمہ نہیں کیا گیا اور نہ من اللعبین کا ترجمہ (دل لگی کرنے والوں میں سے) کیا گیا

پارہ	سورت	آیت	ترجمہ	کیفیت اشکال
۱۷	انبیاء	عَلَىٰ أَعْيُنِ النَّاسِ	آدمیوں کے سامنے	محاورے کے لحاظ سے اعین کا لفظی ترجمہ نہیں کیا گیا۔
۲۰	نمل	تُكِنُّ صُدُورُهُمْ	لوگوں کے دلوں میں مخفی ہیں	نسبت فاعلیت کو محاورے کے لحاظ سے بدلا ہے۔
〃	〃	وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ	اور جیسے جیسے کام تم (بُرے بھلے) سب لوگ کر رہے ہو (اے پیغمبر) تمہارا پروردگار اُن سے غافل نہیں۔	اِس میں کاف کے مخاطب پیغمبر صاحب ہیں اور تعملون کے مخاطب سب لوگ اور ضمیر واحد اور جمع کا بھی فرق ہے۔ فاضل مترجم نے سب باتوں کو نباہا ہے اگرچہ رعایت الفاظ کی وجہ سے عبارت کی عمدگی نہیں رہی اگر آیت کا ترجمہ فقط خدا کیا جاتا تو نہایت صاف رہتا یعنی لوگو! خدا تمہارے کردار سے بے خبر نہیں۔
〃	عنکبوت	مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ	جن لوگوں نے خدا کے سوا (دوسرے دوسرے) کارساز بنا رکھے ہیں۔ اُن کی مثال مکڑی کی سی ہے	اِس میں دوسری مثل کا ترجمہ اچھی طرح نہیں آ سکتا بعض جگہ مترجم نے کیا بھی ہے۔
۲۱	〃	وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ	اور ہم یہ چند مثالیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے بیان فرماتے ہیں	اِس میں نضربہا کی ضمیر ہا کا ترجمہ اچھی طرح نہیں آ سکتا۔

پارہ	سورت	آیت	ترجمہ	کیفیت اشکال
۲۱	روم	وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ	مگر وہ لوگ (کفر و شرک کرکے) آپ ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے	محاورے کے لحاظ سے ترجمے میں اوپر کا لفظ بڑھانا پڑا۔
〃	〃	فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا	تو (اے پیغمبر تم ایک (خدا) کے ہو کر) اس (کے) دین کی طرف اپنا رخ کیے رہو	محاورے کے لحاظ سے لام ترجمہ طرف کیا گیا۔
〃	سجدہ	لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ ھُدٰھَا	تو (دنیا ہی میں) ہر شخص کو (اس کی) سوجھ عنایت کرتے (کہ وہ سیدھے رستے آجاتا)	ھا کا ترجمہ محاورے کے لحاظ سے نہیں کیا گیا
〃	احزاب	وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰئِیْ تُظٰھِرُوْنَ مِنْھُنَّ اُمَّھٰتِکُمْ	اور نہ تم لوگوں کی بیبیوں کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری ماں بنایا	امہات جمع ہے تو مائیں ترجمہ کرنا چاہیے تھا مگر مائیں بنایا اردو کے محاورے میں اچھا نہیں اس لیے ماں بنایا ترجمہ کیا گیا۔
〃	〃	وَکَفَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ	اور خدا نے (اپنی مدد سے) مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت آنے دی	اس آیت میں لازم معنوں کے سوا لفظی معنے اچھے نہیں بنتے۔
〃	احزاب	لَاٰتَوْھَا	تو (یہ بے تامل) فساد برپا کرتے	اس کا لفظی ترجمہ کسی طرح اچھا نہیں ہو سکتا۔
۲۱	احزاب	وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا	اور اگر بھاگ کر بچ بھی گئے تو بس یہی نا کہ دنیا میں چند روز (اور) رس بس لو گے	اس میں محاورے کے لحاظ سے تمتعون کا ترجمہ صیغہ مجہول کے ساتھ اچھا نہیں ہو سکتا اس لیے بصیغہ معروف کیا گیا۔
〃	〃	قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُکُمْ مِّنَ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَۃً	(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر خدا تمہارے ساتھ برائی (کرنی) چاہے تو کون ایسا (سورما) ہے جو تم کو اس (کی پکڑ) سے بچا سکے یا تم پر (اپنا) فضل کرنا چاہے (تو کون) اس کو روک سکتا ہے	اخیر جملے کو ماقبل سے بے تعلق کرکے اس کی جزا محذوف نکالنے کی ضرورت پڑی کیونکہ یعصمکم کے متعلق نہیں ہو سکتا اس لیے کہ واللہ یعصمک من الناس یعصمنی من الماء وغیرہ محاورے غالباً کسی چیز کے ضرر سے بچانے کے موقع پر بولے گئے ہیں اور اس قسم کے محذوفات قرآن میں بکثرت ہیں۔
۲۲	فاطر	اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ	وہ چاہے تو تم (سب) کو (زمین کے پردے سے اٹھا) لے جائے	ایسے موقع پر حرف شرط اِنْ وغیرہ کا ترجمہ ہمارے محاورے میں اچھا نہیں رہتا۔
۲۸	تحریم	اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا	اپنی عصمت کو محفوظ رکھا	فرج کا ترجمہ تاویلاً عصمت کیا گیا۔

یہ چند مشکلیں جو واقع میں مشتے نمونہ از خروارے ہیں دوسرے مترجموں کو بھی پیش آئی ہیں انھوں نے کہیں مترجم کے مطابق کہیں اپنے طور پر ان کو رفع کیا ہے غرض مترجم اپنی زبان کی پابندی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تصرف کیے بدون اچھا ترجمہ کر نہیں سکتا۔

غرض اس قسم کی دقتیں ہر زبان کے مترجم کو پیش آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مولانا بھی کچھ نہ کچھ تصرف کیے بغیر ترجمے کو مکمل نہ کر سکے

پس لامحالہ مترجم اگر لائق ہے تو وہ اس قسم کا تصرف کرتا ہے کہ ترجمے میں اصل مضمون کا مفہوم ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور بہ خوبی ہاتھ سے

مولانا میں کامل طور پر موجود ہے۔

ایک عصمت مآب خاتون اور ترجمۃ القرآن

ایک مرتبہ فاضلِ مترجم سے ایک عصمت مآب خاتون نے عرض کیا کہ میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب اور مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے پڑھتی رہتی ہوں۔ لیکن ایک بات مجھکو ہمیشہ کھٹکا کرتی ہے وہ یہ کہ اللہ میاں پیغمبر صاحب سے کچھ ناراض سے رہتے تھے۔ فاضلِ مترجم نے ازراہِ تعجب پوچھا کہ ہیں یہ تم نے کیا کہا عصمت مآب خاتون نے کہا کہ جہاں کہیں قرآن میں اللہ میاں پیغمبر صاحب سے کچھ کہتے ہیں تو تُو تڑاق سے کہتے ہیں۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ شاید اللہ میاں پیغمبر صاحب سے کچھ ناراض رہتے ہوں۔ فاضلِ مترجم نے جب سمجھا دیا تو وہ مترجموں کا قصور سمجھیں اور خاموش ہو گئیں۔

ترجمے کی خصوصیات

یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ملک کی زبان میں رسم و رواج کے لحاظ سے بعض الفاظ اُن کے روزمرہ میں اس قسم کے استعمال کیے جاتے ہیں کہ اگر دوسرے ملک والے اُن الفاظ کو استعمال کریں تو وہ گالی سے کم گراں نہیں گزرتے۔ اس کی مثالیں سیکڑوں موجود ہیں۔ انھیں الفاظ میں سے بعض اسم ہیں جو انسان کے جسم سے تعلق رکھتے ہیں کہ برملا ان اعضا کا نام لینا بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں سُنا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں بلا تکلف اگر ضرورت لاحق ہوتی ہے تو نام لینے میں نہیں چوکتے ہر ملک دہر رسمے۔ مگر ہماری اُردو میں اعضائے تناسل کا نام لینا ایک قسم کا اخلاقی گناہ ہے۔ مثلاً وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (پارہ (۲۸) سورۂ تحریم) کے آخری لفظ کا ترجمہ یا اصل لفظ ہماری اُردو زبان میں جیسا افحش الفواحش ہے سب جانتے ہیں۔ لیکن فاضل مترجم کی لیاقت کا اندازہ اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے احصنت فرجھا کا ترجمہ "اپنی فرج کو محفوظ رکھا" نہیں کیا۔ بلکہ "اپنی عصمت کو محفوظ رکھا" کیا ہے۔ اس لاجواب ترجمے سے گالی کی گالی اُتر گئی اور ایسا مؤدب اور صحیح اور فصیح اور بامحاورہ ترجمہ ہو گیا۔ فاضل مترجم کو ایسی ایسی دقتیں سیکڑوں مقام پر پیش آئیں۔ مگر ادیب لاجواب ہونے کے سبب فاضلِ مترجم نے سب دقتوں کو رفع کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ ترجمۃ القرآن کی خوبی کو ہندوستان کے بڑے بڑے علمائے جلیل القدر نے تسلیم کیا ہے۔ اور پبلک نے ہاتوں ہاتھ لے کر اُس کو سر اور آنکھوں پر جگہ دی ہے۔

ترجمۃ القرآن پر اعتراضات

جب فاضلِ مترجم کے ترجمۃ القرآن کی شہرت اور قدردانی آسمان تک پہنچی تو بعض حاسدین کے کوہِ آتش فشاں دماغ میں بغض و حسد کا مادۂ اعتراض اُبل پڑا۔ اُنھیں معترضین میں ایک بزرگ ایسے ہیں

دو د شوند از بدماغے رسند باد شوند از چراغے رسند

اِن بزرگ نے ناحق ناروا اعتراضوں کا ایسا تانتا باندھا کہ خدا کی پناہ۔ بات یہ تھی کہ ان کو اپنی دُکان چلانی مقصود تھی عوام الناس کی فطرۃ ہے کہ وہ معمولی نکتہ چینیوں سے خوش نہیں ہوتے جب تک اُن میں گالیوں کا گرم مسالا نہ ملا ہوا ہو۔ اور چوں کہ اعتراض مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کم زور تھے اس لیے اُن کو مضبوط کرنے کے لیے گالی گلوچ شروع کر دی۔ مگر مولانا ان اعتراضوں کا جواب حضرت سعدی کی زبان میں اِس طرح دیتے تھے۔

دشنام دہد اگر خلیقے چارہ نبود بجز شنیدن

گر پائے کسے سگے گزیدہ — با سگ نتواں عوض گزیدن

جب گالیوں سے بھی دل کا بخار نہ نکلا تو جاہلوں کو بہکانے کے لیئے ایک اَور وطیرہ اختیار کیا۔ یعنی جھونپڑوں میں رہ کر متعصب معترضین نے محلوں کے خواب دیکھنے شروع کیئے۔ چناں چہ ان معترضین میں سے ایک بڑے معترض صاحب لکھتے ہیں۔

"میں نے خدا کو پکارا۔ وہ بولا۔ اُس نے مجھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں اُس سے سرفراز ہوا اور میرے ترجمے کو اُس کے محبوب نے پسند فرمایا۔ اسی وجہ سے قبل از اشاعت مسلمان گروہ گروہ اُس کو ہدیہ لینے کے لیئے دوڑ پڑے۔ تمام میری نکتہ چینیوں کو رسول ابن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا ہے اور ایک عارف[۵] باللہ کے خواب میں آکے آپ نے مجھ ناچیز غلام کی داد دی"

شمس العلماء مولانا حالی نے اپنے دیوان میں ایک قطعہ لکھا ہے کہ جب جھوٹوں کی شہادت راست بازوں نے نہ دی تو خدا و پیغمبرِ خدا کو اپنا گواہ بنانا شروع کیا۔ ہمارے نزدیک مولانا حالی کا وہ قطعہ اِس خواب سے بہت چسپاں ہے اس لیئے نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیبِ گناہ — کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

یہ ہے بعض معترضین کی حقیقت۔ ہاں اِس قسم کے لوگوں کے سوا ممکن ہے کہ بعض نے نیک نیتی سے بھی اعتراض کیئے ہوں۔ لیکن اُن کا حال ہمیں معلوم نہیں۔ کیوں کہ ابھی تک وہ پبلک میں نہیں آئے۔

---

[۵] محمد ادریس صاحب نگرامی کوئی بزرگ ہیں اُنھوں نے ذیل کا خواب دیکھا تھا "البشارۃ العظیمۃ :۔ کنت متفکرا فیما وقع بین میرزا حیرت والفاضل النذیر الدہلی فرایت فی لیلۃ السابع من شہر رمضان سنۃ ۱۳۱۹ھ وانا بین النائم والیقظان ان سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جالس فی موضع مرتفع وانا بین یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم اذ دخل میرزا و فی یدیہ مصحف صغیر وکانہ رجل نحیف البدن خفیف العارضین والفاضل الدہلی حاضر منکس راسہ وھو رجل ضخیم عظیم البطن سمین یعرض میرزا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المصحف الشریف ویقول یا رسول اللہ ھذا فی ھذا واخطا فی کذا وکذا ویشیر الی الفاضل الدہلی فکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصوب رائے میرزا ویتبسم علی وجہہ فقط"

ترجمہ:۔ میرزا حیرت دہلوی اور فاضل نذیر ڈپٹی میں جو اختلاف ہو رہا ہے میں اکثر اس میں غور کیا کرتا تھا۔ پس میں نے رمضان ۱۳۱۹ھ کی ساتویں شب میں ایسے وقت کہ میں کچھ سوتا تھا اور کچھ جاگتا تھا یہ دیکھا کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہیں اور میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اتنے میں میرزا پہنچے اور اُن کے ہاتھ میں ایک چھوٹا قرآن تھا اور شاید وہ ایک کم زور بدن ہلکے رخسارے کے آدمی ہیں اور فاضل ڈپٹی بھی وہاں اپنا سر جھکائے ہوئے حاضر ہیں۔ اور وہ بہت گداز بدن بہت فربہ توندیل آدمی ہیں۔ پھر میرزا نے اُس مصحف شریف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور یہ کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ اس نسخے اِس مصحف (کے ترجمے) میں ایسا بہت لغو بکا ہے اور فلاں فلاں مقام میں غلطی ہے اور (میرزا) فاضل ڈپٹی کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرزا کی رائے پر صاد فرماتے تھے (یعنی تیرے کُل اعتراضات صحیح ہیں) اور آپ (یعنی میرزا سے) مسکرا بھی رہے تھے (دیکھو کرزن گزٹ دہلی مطبوعہ یکم جنوری ۱۹۰۲ء ضمیمہ جات)

تھانہ بھون کے ایک مشہور مولوی اشرف علی صاحب نے بھی فاضل مترجم کے ترجمۃ القرآن پر کچھ اعتراض کر کے ایک رسالہ طبع کرایا ہے۔ اِس رسالے کی تائید بھی مضامین کے لحاظ سے علمائے قرآن و تفسیر نے نہیں کی۔ زبان پر جو کچھ اعتراض کیے ہیں وہ ظاہر ہے کہ ناقابلِ توجہ ہیں۔ جس کا مولانائے موصوف نے اپنے رسالے میں غالباً خود بھی اعتراف کیا ہے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی طرح کوئی بزرگ بنگال میں بھی ہیں جنھوں نے مضامین اور زبان دونوں پر اعتراض کیے ہیں وہ رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا تاہم ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" کی رُو سے اتنا کہنا کوئی گناہ نہیں کہ اِس رسالے کے متعلق ہم نے نہ کسی اخبار میں کچھ دیکھا نہ دو چار آدمیوں میں کبھی اِس کا چرچا سُنا۔ اگر وہ رسالہ دیکھنے کو ملتا تو نیک و بد کوئی رائے قائم کی جاتی۔

اب رہی یہ بات کہ فاضلِ مترجم نے فی الحقیقت ترجمۃ القرآن میں کوئی غلطی کی ہے یا نہیں۔ اِس کا تصفیہ اِس طرح بخوبی ہو سکتا ہے کہ علمائے قرآن و تفسیر کا ایک گروہ دیانت داری کے ساتھ بطور کمیشن بیٹھے اور نیک نیتی سے نکتہ چینی کرے۔ اور مترجم کو سمجھا دے۔ فاضل مترجم اصلاحِ ترجمہ کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں بلکہ مجھ کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہے کہ فاضل مترجم ناحق پر اصرار کرنے کو تکذیبِ قرآن کے برابر سمجھتے ہیں۔ لیکن معترضین اور متعصب حاسد معترضین کی کیفیت ہے کہ اُن میں نیک نیتی نہیں۔ ایمان و انصاف کی روشنی نہیں۔ دنیا میں شترِ بے مُہار کی طرح بے جا آزادی پھیلی ہوئی ہے وہ اِسی آزادی کی آڑ میں اپنی دکان چلانی چاہتے ہیں۔ عوام النّاس اور جاہل مسلمان پُرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ اُن کو گالیوں میں مزہ آتا ہے فاضلِ مترجم کو اول اول اعتراضوں کے ساتھ گالیاں دی گئیں۔ گالیوں سے بھی جب دل ٹھنڈا نہ ہوا تو دوا تیا سے پہ اُتر آئے اور پھر آدم بر سرِ مطلب کے طور پر کسی نے دہلی سے کسی نے جالندھر سے کسی نے کہیں سے کسی نے کہیں سے اپنا اپنا ترجمۃ القرآن شائع کرنا شروع کر دیا۔ ؎

گیرم کہ بوسیلمہ مصحف ساختت ازوے چہ ننگ مصحفِ یزداں را

ہم کو بالتحقیق معلوم ہوا ہے کہ علمائے ندوہ نے ترجمۃ القرآن پر اعتراض کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھایا تھا۔ اور بقدر پانچ پاروں کے اہلِ کمیشن نے ملاحظہ بھی فرمائے تھے۔ اہلِ کمیشن نے اوّل اوّل پچاس اعتراض کیے تھے لیکن چھٹتے چھٹتے صرف ۲۲ رہ گئے اِس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا کہ بائیس قائم رہے یا گھٹتے گھٹتے صفر رہ گیا ندوے کے ایک رُکنِ اعظم نے راقم کو تحریر فرمایا تھا کہ یہ ہاں دعویٰ کیا گیا تھا۔ اِس کو کئی برس ہوئے۔ لیکن مولویوں میں کس کو یہ سلیقہ ہے کچھ کام نہیں ہوا!! بہرحال علمائے ندوہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اعتراضی کمیشن کو پھر زندہ کریں اور جو کچھ معنوی اعتراض ہوں وہ فاضلِ مترجم کے سامنے پیش کریں۔ قوم پر کمیشن اور فاضلِ مترجم کا بڑا احسان ہوگا جب دونوں صاحب متفق ہو کر کوئی فیصلہ صادر فرمائیں گے۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے جب فارسی میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا تو لوگوں نے یہاں تک ستایا کہ اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔ اور مرحوم کو واجب القتل ٹھیرایا۔ بلکہ جان لینے کی غرض سے ایک مرتبہ نرغے میں گھیر لیا۔ قریب تھا کہ بدمعاش اُن کو مار ڈالیں۔ بڑی مشکل سے جان بچی اور لاکھوں پائے۔ بڑی خیر بہت گزری کہ یہاں صرف کفر و ارتداد اور گالیوں ہی پر بس کی۔

ہمارا ارادہ ہوا تھا بلکہ ہم نے تمام اعتراضوں کی ایک فہرست بھی مکمل کر لی تھی اور اُس کے محاذ میں ہر ایک اعتراض کے جواب بھی مرتب کر لیئے تھے تاکہ حیاۃ النذیر میں درج کر دیں اور دروغ گو را تا بدر وازہ رسانید ہو جائے لیکن غور کرنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بحث مباحثے سے کوئی بات طے نہیں ہو سکتی۔ اِس لیئے اِس کالک کی کوٹھڑی سے ہم نکل بھاگے اور مناظرے کو ہم نے پسند نہیں کیا۔

فاضل مترجم کے ترجمۃ القرآن سے قرآن کے اَور ترجموں کا مقابلہ

ہم نے اعتراضوں کا جواب دینا تو پسند نہیں کیا۔ لیکن ناظرین کی خاطر سے فاضل مترجم کے ماقبل اور اُن کی دیکھا دیکھی مابعد ترجموں کے ایک رکوع کا ترجمہ نذرِ ناظرین کرتے ہیں اور ترجمے کے فاضل و مفضول ہونے کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں ہم نے جس رکوع کا ترجمہ موازنے کے لیئے درج کیا ہی وہ رکوع ہمارا منتخبہ نہیں ہی بلکہ وہ انتخاب ہی جناب مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب مفسر تفسیر حقانی کا۔ جناب نے بڑے دعوے کے ساتھ ترجمہ قرآن شروع کیا ہی۔ اور ایک بڑے لمبے چوڑے اشتہار کے ساتھ ولوا تنا پارہ (۸) رکوع ۲ کا ترجمہ پبلک میں پیش کیا ہی۔ قاعدہ یہ کہتا ہی کہ یہ نمونہ اُن کے اَور ترجمے سے بہت بہتر ہوگا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یہ گندم نمائی اور جو فروشی ہی مگر ہم ایسے مولوی کی نسبت بیٹھے بٹھائے کیوں وہم باندھیں جو مفسر تفسیر حقانی ہو۔ بہر حال اسی رکوع کا ترجمہ ہم نے مقابلے کے لیئے مناسب سمجھا تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اپنے ممدوح کے ترجمۃ القرآن کا کچھ پات ترجمہ انتخاب کر کے اَوروں کے ترجموں سے مقابلہ کیا گیا ہی۔ اب ہم ذیل میں علی الترتیب شاہ رفیع الدین صاحب شاہ عبدالقادر صاحب۔ مولوی نذیر احمد صاحب میرزا حیرت صاحب۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب ساکن میرٹھ۔ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری اور مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب مفسر تفسیر حقانی کے ترجمے درج کرتے ہیں۔ عربی کے مقابلے میں مولانا نذیر احمد کا ترجمہ مزید توضیح کے لیئے نقل کیا گیا ہی

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ

(پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے کہ) اے گروہ جن و انس کیا تمھارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور واقع میں دنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکے میں رکھا اور (اب اُنھوں نے آپ ہی) اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بے شک وہ کافر تھے (اے پیغمبر پیغمبروں کو بھیج بھیج کر بندوں پر حجت کا تمام کرنا) یہ اس سبب ہو کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو ظلم (و زبردستی) سے ہلاک کرنے والا نہیں (کہ اِدھر ان کو ہلاک کر مارے) اور (اُدھر) وہاں کے رہنے والے (خدا کی منشا سے) بے خبر ہوں اور جیسے جیسے عمل کیئے ہیں اُن ہی (عملوں)

دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝ إِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ وَّمَآ أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (ولواننا پارہ (۸) رکوع ۲)

کی رُو سے سب (لوگوں) کے درجے ہوں گے اور جو کچھ (لوگ دنیا میں) کر رہے ہیں تمہارا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں۔ اور (نیز) تمہارا پروردگار بے نیاز (اور) رحم والا ہے اگر چاہے تم (سب) کو دُنیا سے اُٹھا لے جائے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہارا جانشین بنائے جیسا کہ دوسرے لوگوں کی نسل میں سے (آخر) تم کو پیدا کر ہی چکا ہے۔ (لوگو!) جس (روزِ قیامت) کا تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے کچھ شک نہیں کہ وہ ضرور آنے والا ہے اور تم (خدا کو اس بات پر) مجبور نہیں کر سکتے (کہ قیامت کو واقع نہ ہونے دے۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ بھائیو! تم اپنی جگہ عمل کرو میں (اپنی جگہ) عمل کر رہا ہوں پھر آگے چل کر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار کس کا انجام بخیر ہو (دیگر ہاں) اس میں تو کچھ بھی شک نہیں کہ ظالم تو کسی طرح فلاح پانے کے نہیں اور یہ کافر خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی (اور اُسی کے پیدا کیے ہوئے) چوپایوں میں اللہ کا بھی ایک حصّہ ٹھیراتے ہیں تو اپنے خیال کے مطابق کہتے (کیا) ہیں کہ اتنا تو خدا کا اور اتنا ہمارے شریکوں کا (یعنی اُن معبودوں کا جن کو ہم نے شریکِ خدائی مان رکھا ہے) پھر (ان کا برتاؤ یہ ہوتا ہے کہ) جو (حصّہ) اُن کے (ٹھیرائے ہوئے) شریکوں کا ہوتا ہے وہ (تو) اللہ کی طرف پہنچتا نہیں اور جو (حصّہ) اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے (ٹھیرائے ہوئے) شریکوں کو پہنچ جاتا ہے (کیا ہی) بُرا حکم (تقسیم) ہے جو یہ لوگ لگاتے ہیں

ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب[1]

اے جماعت جنّوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تمھیں میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اُس دن تمہارے کی سے یہ کہا اُنھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے اور فریب دیا تھا اُن کو زندگانی دنیا کی نے اور گواہی دی اُنھوں نے اُوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر۔ یہ اس واسطے کہ نہیں ہے پروردگار تیرا ہلاک کرنے والا بستیوں کا ساتھ ظلم کے اور لوگ اُس کے غافل ہوں۔ اور واسطے

[1] ان کی نسبت ہمارے مولانا کی جو کچھ رائے ہے وہ ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں ملاحظہ ہو جو اوپر گزر چکا ۱۲

ہر ایک کے درجے ہیں اُس چیز سے کہ کیا ہی اُنھوں نے اور نہیں پروردگار تیرا غافل اُس چیز سے کہ کرتے ہیں اور پروردگار تیرا بے پرواہی مہربانی والا اگر چاہے لے جاوے تم کو اور جگہ پر بٹھائے پیچھے تمھارے جس کو چاہے جیسا پیدا کیا تم کو اولاد قوم اَوروں سے - تحقیق جو کچھ وعدہ دیئے جاتے ہو تم البتہ آنے والا ہی اور نہیں تم عاجز کرنے والے - کہہ اے قوم میری عمل کرو اوپر جگہ اپنی کے تحقیق میں بھی عمل کرنے والا ہوں - پس البتہ جانوگے تم کون شخص ہی کہ ہوگا واسطے اُس کے آخر اس گھر کا - تحقیق نہیں فلاح پاتے کے ظالم - اور کیا اُنھوں نے واسطے اللہ کے اُس چیز سے کہ پیدا کیا ہی کھیتیوں اور چارپاؤں سے ایک حصّہ - پس کہا اُنھوں نے یہ واسطے اللہ کے ہی ساتھ گمان اپنے کے اور یہ واسطے شریکوں ہمارے کے - پس جو کچھ ہو واسطے شریکوں اُن کے کے - پس نہیں پہنچتا طرف اللہ کے اور جو کچھ ہو واسطے اللہ کے پس وہ پہنچتا ہی طرف شریکوں اُن کے کے - بُرا ہی جو کچھ حکم کرتے ہیں -

ترجمہ[۹] مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ

اے جماعت جنّوں اور انسان کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمھارے اندر کے - سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اُس دن کے سامنے آنے سے - بولے ہم نے مانے اپنے گناہ - اور اُن کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے - اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر - یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے اور وہاں کے لوگ بےخبر ہوں اور ہر کسی کو درجے ہیں اپنے عمل کے اور تیرا رب بےخبر نہیں اُن کے کام سے اور تیرا رب بےپرواہی رحم والا - اگر چاہے تم کو لے جاوے اور پیچھے تمھارے قائم کرے جس کو چاہے جیسا کہ تم کو کھڑا کیا اَوروں کی اولاد سے جو تم کو وعدہ دیا سو آنے والا ہی اور تم تھکا نہ سکوگے - تو کہہ لوگو کام کرتے رہو اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں - اب آگے جان لوگے کس کو ہی آخر کا گھر - مقرر بھلا نہ ہوگا بےانصافوں کا - اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اُس کی پیدا کی کھیتی اور مواشی میں ایک حصّہ پھر کہتے ہیں یہ حصّہ اللہ کا ہی اپنے خیال پر اور یہ ہمارے شریکوں کا - سو جو اُن کے شریکوں کا ہی سو نہ پہنچے اللہ کی طرف اور جو اللہ کا ہی سو پہنچے اُن کے شریکوں کی طرف کیا بُرا انصاف کرتے ہیں -

ترجمہ مولانا نذیر احمد صاحب

(پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے کہ) اے گروہ جن وانس کیا تمھارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اُس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں - وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقع میں) دنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکے میں رکھا اور اب اُنھوں نے آپ ہی اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بےشک وہ کافر تھے (اے پیغمبر پیغمبروں کو بھیج بھیج کر حجّت تمام کرنا) اس سبب سے ہی کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو ظلم (و زبردستی) سے ہلاک کرنے والا نہیں - کہ (اِدھر اُن کو ہلاک کر مارے) اور اُدھر وہاں کے رہنے والے (خدا کی منشا سے) بےخبر ہوں اور جیسے جیسے عمل کئے ہیں اُن ہی عملوں کی رُو سے سب لوگوں کے درجے ہوں گے اور جو کچھ (لوگ دنیا میں) کر رہے ہیں

(۹) [illegible] مولانا کے ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں ملاحظہ ہو جو اوپر گزر چکا ۱۲

تمھارا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں۔ اور نیز تمھارا پروردگار بے نیاز اور رحم والا ہے۔ اگر چاہے تم سب کو دنیا سے
اُٹھا لے جائے اور تمھارے بعد جس کو چاہے تمھارا جانشین بنائے جیسا کہ دوسرے لوگوں کی نسل میں (آخر) تم کو پیدا کر
ہی چکا ہے جس روز (قیامت) کا تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے کچھ شک نہیں وہ ضرور آنے والا ہے۔ اور تم (خدا کو اس بات پر مجبور
نہیں کر سکتے (کہ قیامت کو واقع ہونے نہ دے) - اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ بھائیو تم اپنی جگہ عمل کرو میں (اپنی جگہ) عمل
کر رہا ہوں۔ پھر آگے چل کر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار کس کا انجام بخیر ہے (مگر ہاں) اس میں تو کچھ بھی شک نہیں کہ ظالم
تو کسی طرح فلاح پانے کے نہیں۔ اور (یہ کافر) خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی (اور اُس کے پیدا کیے ہوئے) چارپایوں میں اللہ کا بھی
ایک حصہ ٹھیراتے ہیں۔ تو اپنے خیال کے مطابق کہتے (کیا) ہیں کہ اتنا تو خدا کا اور اتنا ہمارے شریکوں کا یعنی اُن معبودوں
کا جن کو ہم نے شریک خدائی مان رکھا ہے۔ پھر (اُن کا برتاؤ یہ ہوتا ہے کہ) جو (حصہ) اُن کے (ٹھیرائے ہوئے) شریکوں کا ہوتا ہے
وہ تو اللہ کی طرف پہونچتا نہیں اور جو (حصہ) اللہ کا ہوتا ہے وہ اُن کے (ٹھیرائے ہوئے) شریکوں کو پہونچ جاتا ہے (کیا ہی) بُرا
حکم (تقسیم) ہے جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔

ترجمہ میرزا حیرت دہلوی[۱]

(پھر اللہ جن وانس سب سے فرمائے گا کہ) اے جن وانس کے گروہ کیا تمھارے پاس
تمھیں میں سے (ہمارے) پیغمبر نہ آئے تھے کہ تمھیں ہمارے احکام (پڑھ کر)
سنائیں۔ اور تمھیں اُس دن کے آنے سے ڈرائیں (تب یہ سب لوگ) کہیں گے (کہ بیشک آئے تھے) ہم اپنے اوپر گواہی
دیتے ہیں (اے نبی ان کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ ہے) کہ ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا اور وہ یہ
نہ سمجھتے تھے کہ ہم کو خدا کے پاس جانا ہے اور قیامت میں تو انھوں نے خود اپنے کافر ہونے کا اقرار کر لیا۔ اور یہ پیغمبروں
کا بھیجنا تو صرف اس لیے ہے کہ تمھارا پروردگار گناہ کے سبب سے شہروں کو برباد نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں کہ وہاں کے
رہنے والے احکام الٰہی سے غافل ہوں۔ (اُس کے یہاں تو صرف انصاف سے کارروائی ہوتی ہے) سب کے لیے اُن
کے اعمال کے لحاظ سے درجے دیئے جاتے ہیں (بُروں کو بُرے اور اچھوں کو اچھے) اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اُس سے
تمھارا پروردگار غافل نہیں ہے۔ (اور تمھارا پروردگار تمھاری عبادتوں کا محتاج نہیں) وہ تو بڑا بے نیاز ہے اور رحم والا
اگر وہ چاہے تو اے کافرو! تمھیں قعر نار میں لے جائے اور تمھارے بعد دنیا میں جن لوگوں کو چاہے تمھارا جانشین کر دے
جیسے تمھیں دوسرے لوگوں کی اولاد سے پیدا کیا۔ (لیکن بمقتضائے رحمت اب تک ایسا نہیں کیا) (مگر اب ہوشیار
ہو جاؤ) بے شک جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے وہ ضرور پیش آنے والی ہے اور تم ہرگز اُس کے لانے سے ہمیں عاجز نہیں کر سکتے
(اے نبی ان کافروں سے کہہ دو) کہ اے میری قوم کے لوگو تم بجائے خود (یہ ناشایستہ) اعمال کرتے رہو۔ بے شک
میں بھی اپنے رب کی عبادت کر رہا ہوں۔ پس عنقریب تم جان لوگے کہ دار آخرت کی خوبی کس کے لیے ہے (میرے لیے یا
تمھارے لیے) یقیناً ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوتے (اور اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا) کہ اُنھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی
اور مویشی میں سے اللہ کا حصہ مقرر کیا۔ اور اپنے خیال کے موافق کچھ حصے کو کہتے ہیں کہ یہ خدا کا ہے اور (کچھ کو کہتے ہیں کہ) ہمارے

[۱] شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب کے بعد مولانا کی دیکھا دیکھی سب سے پہلے انھوں ہی نے قرآن کا ترجمہ کیا ہے ۱۲

شریکوں (یعنی جو ہمارے نزدیک خدائی میں شریک ہیں) اُن کا ہی۔ پھر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو اُن کے شریکوں کا حصّہ ہی وہ تو اللہ کو نہ پونہچے گا اور جو اللہ کا حصّہ ہی تو وہ اُن کے شریکوں کو پونہچ جائے گا کیا بُرا حکم کرتے ہیں۔

ترجمہ مولوی عاشق الٰہی صاحب[۹۱] ساکن میرٹھ

اے گروہ جن و انسان کیا تمھارے پاس نہیں آئے تم ہی میں کے پیغمبر سُناتے تھے تم کو میرے احکام اور ڈراتے تھے اُس دن کے پیش آنے سے وہ کہیں گے کہ ہم مقر ہیں اپنے اوپر اور اُن کو کہ وہ بے شک کافر تھے۔ یہ اس سبب سے کہ تیرا پروردگار ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے اس حال میں کہ وہاں کے رہنے والے بے خبر ہوں اور ہر ایک کے لیئے درجے ہیں اپنے عمل کے۔ اور تیرا رب اُس سے بے خبر نہیں کہ وہ کرتے ہیں اور تیرا رب بے پروا ہی رحم والا۔ وہ اگر چاہے تم کو لے جائے اور جانشین بنائے تمھارے بعد جسے چاہے جیسا تم کو پیدا کر دیا دوسرے لوگوں کی نسل میں سے جس کا تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہی ضرور آنے والا ہی اور تم تھکا نہیں سکتے۔ کہدے کہ لوگو تم عمل کرتے رہو۔ اپنی جگہ میں بھی عمل کر رہا ہوں پھر آگے چل کر تم جان جاؤگے کہ کسے ملتا ہی آخرۃ کا گھر۔ ظالم تو فلاح پائیں گے نہیں اور یہ ٹھیراتے ہیں اللہ کا اُس کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپاؤں میں سے ایک حصّہ پھر کہتے ہیں کہ یہ حصّہ تو اللہ کا ہی اپنے خیال کے مطابق اور یہ حصّہ ہمارے شریکوں کا ہی۔ پھر جو اُن کے شریکوں کا ہوتا ہی وہ تو اللہ کی جانب پونہچتا نہیں اور جو اللہ کا ہی وہ پونہچ جاتا ہی اُن کے شریکوں کی جانب۔ کیا بُرا انصاف کرتے ہیں۔

ترجمہ مولوی فتح محمد صاحب[۹۲] جالندھری

اے جن و انس کی جماعت بھلا تم ہی میں سے (ہمارے بھیجے ہوئے) پیغمبر تمھارے پاس نہیں آئے۔ جو تم کو میرے احکام سناتے اور اُس روز (قیامت) کے آنے سے تم کو ڈراتے تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم خود اپنے اُوپر گواہی دیتے ہیں (کہ پیغمبر آئے تھے) اور (حقیقت یہ ہی کہ) اُن کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا (اور اسی وجہ سے ایمان نہ لائے)۔ اور اب (قیامت میں) اُنھوں نے اقرار کر لیا کہ بلا شبہہ وہ منکر تھے (اور پیغمبروں کے بھیجنے کی اصلی غرض یہ تھی) کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو ظلماً ہلاک نہیں کیا کرتا ایسے موقع پر کہ وہاں کے رہنے والے احکام خداوندی سے بے خبر ہوں۔ اور جس نے جیسے عمل کیئے ہیں اُسی عمل کے لحاظ سے اُس کو درجے دیئے جائیں گے اور (اے پیغمبر) تمھارا پروردگار اُن کے عملوں سے بے خبر نہیں اور تمھارا پروردگار بے پروا (اور) رحم والا ہی۔ اگر وہ چاہے تو (اے منکرو) تم کو مٹا کر تمھارے دوسروں کو تمھارا جانشین کر دے

---

[۹۱] یہ ترجمہ ایسے صاحب کا ہی جنھیں میرٹھ سے باہر جاننے والے بہت ہی کم ہیں۔ ان کی کوئی اَور تصنیف بھی ہماری نظر سے نہیں گزری ۱۲

[۹۲] مولوی فتح محمد صاحب پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ پنجاب اگرچہ اُردو زبان میں سُرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہی مگر مولوی فتح محمد صاحب کی اُردو جیسی کچھ ہی محتاج بیان نہیں۔ مولوی فتح محمد صاحب نے جب کتاب الاسلام لکھی تو خود اُن کو اپنی زبان پر بھروسا نہ تھا۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے ہمارے مولانا سے اُس کی عبارت درست کرائی اور اس امر کا اعتراف مولوی فتح محمد صاحب نے اپنے دیباچۃ الکتاب میں کیا ہی۔ غالباً اُنھوں نے اُردو میں اب غیر معمولی ترقی کی ہی جو اپنا ترجمۃ القرآن شائع کیا ہے۔ کس نیاموخت علم تیر از من ؛ کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد۔ مولوی فتح محمد صاحب کے ترجمے کے متعلق اگر مزید آگہی ناظرین چاہیں تو ہمارے مولانا کے ترجمۃ القرآن کا آخری ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں۔ مولوی رحیم بخش صاحب منیجر شمسی پریس دہلی نے اُن کے ترجمے کے پوست کندہ حالات درج کر دیئے ہیں ۱۲

جس طرح کہ تم کو دوسروں کی اولاد سے پیدا کیا - جس چیز کا تم کو وعدہ دیا جاتا ہی وہ تو ضرور آکر رہے گی اور تم خدا کو عاجز نہیں کر سکوگے (کہ اُسے نہ ہونے دو) (اے پیغمبر) تم (اِن لوگوں سے) کہہ دو کہ تم اپنی جگہ عمل کرو میں اپنی جگہ عمل کرتا ہوں - پھر آگے تم کو یقین ہو جائے گا کہ آخرت کے گھر کی خوبی کس کے لیئے ہی - اِس میں شک نہیں کہ ستم گاروں کو فلاح نصیب نہیں ہوتی اور (یہ کافر لوگ) خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشی میں خدا کا بھی ایک حصّہ ٹھہراتے پھر اپنے خیال کے مطابق کہتے ہیں کہ اِس قدر تو خدا کا حصّہ ہی اور اِس قدر اُن کے شریکوں (یعنی معبودوں) کا تو جو (حصّہ) اُن کے شریکوں کا ہوتا ہی وہ تو خدا کی طرف نہیں پہنچتا اور جو خدا کا (حصّہ) ہوتا ہی تو وہ اُن کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتا ہی - کیا ہی بُرا طریقہ ہی جس کا یہ لوگ حکم لگاتے ہیں -

ترجمۂ مولوی عبدالحق صاحب مفسّر تفسیر حقّانی

اے جنوں اور انسانوں کی جماعت - کیا تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول نہیں آئے - جو تمھیں میری آیتیں سنایا کرتے اور اُس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے - وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں اور اُن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں ڈال رکھا تھا اور وہ آپ ہی اپنے اوپر گواہی دیں گے کہ ہم منکر تھے - یہ اِس لیئے کہ آپ کا رب کسی گاؤں کو (اُن کے) ظلم پر اُن کی بے خبری میں ہلاک کرنے والا نہیں تھا - اور ہر کسی کو اپنے اعمال کے درجے ملیں گے اور آپ کا رب اُن کے کام سے بے خبر نہیں اور آپ کا رب بے پروا رحمت والا ہی اگر چاہے تو تم کو فنا کر دے - اور تمھارے پیچھے جس کو چاہے قائم کرے جس طرح کہ تم کو اَور لوگوں کی نسل سے کر دیا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہی ضرور وہ آنے والا ہی اور تم ہرگز روک نہ سکوگے - اے پیغمبر کہہ دو کہ بھائیو تم اپنی جگہ عمل کرو میں اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں سو تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس کے لیئے دار آخرت کا انجام اچھا ہی - بے شک ظالموں کا تو بھلا ہوگا نہیں - اور اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں سے مشرکین اُس کے لئے حصّہ لگا کر اپنے خیال سے کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہی اور یہ ہمارے معبودوں کا - پھر جو اُن کے معبودوں کا ہو جاتا ہی وہ تو خدا کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ٹھہرتا ہی وہ اُن کے معبودوں کو بھی پہنچ جاتا ہی کیا ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں -

نقل اشتہار ترجمۃ القرآن جناب مفسّر تفسیر حقّانی

مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب مفسّر تفسیر حقّانی کے ترجمے کی نسبت راقم کچھ لکھنا پسند نہیں کرتا - لیکن اُن کے ترجمۃ القرآن کی نسبت جو اشتہار اُن کے صاحبزادے محمد عبدالقیوم صاحب نے مشتہر کیا ہی وہ ضرور اِس قابل ہی کہ درج کیا جائے - اشتہار کے پڑھنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو جائے گی کہ وہ ایک قصیدۂ نشر بے صلہ ہی یا بانگ دُہل . . . .

. . . . غرض وہ اشتہار یہ ہی "اِن دنوں بعض تجارت و ذاتی شہرت بعض الناس نے قرآن مجید کا ترجمہ کر کے اپنی تجارت کو رواج دیا - لیکن اکثر مترجم وہ لوگ ہیں کہ یا تو سرے سے علوم عربیہ سے ناآشنا اور کورے محض ہیں - اور صرف چالاکی طبیعت سے تراجم قدیمہ اور بیشتر تفسیر حقّانی[۵] کی عبارتوں کو الٹ پلٹ کر ایک نیا ترجمہ و تفسیر گھڑ کر

[۵] تفسیر حقّانی کی حقیقت اگر کسی کو دیکھنی منظور ہو تو وہ مولوی ابو المنصور صاحب مرحوم امام فن مناظرہ کا رسالہ جواب تفسیر حقّانی (باقی بر صفحہ آئندہ)

سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے پیش کردی ع چو احمق در جہاں باقی است مفلس کس نمی ماند۔ کے پورے مصداق بن گئے۔ اور ترجمہ و تفسیر میں وہ اغلاط و اسقام پیدا ہوئے کہ مطالب قرآن مجید منشائے الہی کے خلاف ہوگئے۔ یا انھوں نے ابتدائے عمر میں کبھی چند عربی کی کتابیں پڑھی تھیں اور پھر عمر بھر دنیاوی اشغال میں مصروف رہے۔ خدمت سے علیحدہ ہوکر خانہ نشین ہوئے تو ان کو ترجمۂ قرآن کا شوق ہوا۔ لیکن عقائد اور اعمال میں سلف صالحین کے موافق نہیں نہ کسی عالم دینی سے شرف صحبت یا استفادہ و دینیات کے جملہ علوم سے ناواقف محض۔ نہ کبھی سبقاً سبقاً کسی سے پڑھا نہ پڑھایا۔ اس پر دماغ میں خود پسندی اور خودسری البتہ طبیعت کی جولانی اور زمانے کی آزادی کی روشنی میں اس دشت پرخار اور دشوار گزار گھاٹی کو طے کرنا چاہا راستے کی عدم واقفیت کے سبب آخر قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی تھیں کھائیں اور اس کے سوا ہونا ہی کیا تھا۔ اہل کتاب اور زمانۂ حال کے مخالفوں نے کلام الٰہی پر جو ہرزہ سرائی کی ہے اس کا بھی علم نہیں۔ محاورے میں لانے کی غرض سے ترجمے میں بڑے بڑے بریکیٹ دے کر ترجمے کے لقب سے نکلکر تفسیر و تاویل کی سڑک پر پڑ گئے۔ جس سے مخالفوں کو اچھی مدد ملی اور اسی وجہ سے یہ ترجمہ طبقۂ علمائے کرام اور خوش عقیدہ سمجھ دار مسلمانوں میں مقبول نہیں ہوا۔ بنائً علیہ سچے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی مدت سے آرزو تھی کہ کسی عالم باعمل اور فاضل اجل کا بامحاورہ اردو ترجمہ جو الفاظ قرآنیہ کی رعایت کے ساتھ ہو شائع کیا جائے۔ اور نیز مندرجہ ذیل خوبیاں اس میں ملحوظ ہوں۔ اول یہ کہ مترجم عقائد میں سلف صالحین کا پیرو ہو۔ اس کے ظاہری اعمال بھی سنت نبوی کے مطابق ہوں منہیات شرعیہ سے متنفر اور اعلائے کلمۃ اللہ کا دل سے موید ہو۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ تم جس سے دنیا حاصل کرو اس کو دیکھ بھی لیا کرو۔ دوسرے وہ جملہ علوم عربیہ مروجہ سے جن کا قرآن مجید سے تعلق ہے ماہر ہو اور اس کی خدمت کو ملک نے قدردانی اور بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا ہو اور دیگر مذاہب کے اصول و فروع سے بھی واقف ہو۔ مناظرات کے میدان طے کر چکا ہو ضروریات زمانہ کا بھی احساس رکھتا ہو۔ تیسرے ترجمہ الفاظ قرآنیہ کا حتی الوسع تحت میں ہو۔ اس پر محاورے کی پابندی بھی ہو۔ حشو و زوائد سے پاک و مبرا ہو یعنی ترجمے میں سوائے ضمیر مرجع اور محذوفات کے اظہار کے تفسیر کی طرح رطب و یابس نہ ٹھونسا گیا ہو جس سے طالبان قرآن کا واسطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور متعدد احتمالات و مذاہب میں سے صرف ایک احتمال اور ایک مذہب خاص کا قرآن رہ جاتا ہے۔ چوتھے ترجمہ بازاری اور شہدوں کی زبان میں نہ ہو بلکہ متکلم اور مخاطب کی شان کے موافق ترجمے میں شائستہ اور مہذب الفاظ کا استعمال ہو۔ پانچویں حواشی پر حل لغات اور ترکیب نحوی اور قرأت اور ایک طرف آیات کے متعلق فوائد ہوں جن میں مسائل قرآنیہ کی تصریح ہو اور مذاہب ائمہ بھی بیان کیے گئے ہوں اور جہاں توضیح مقصود ہو وہاں توضیح کر دی گئی ہو۔ اور جہاں تاریخی واقعات ہوں وہاں اہل کتاب کی مسلم کتب سے حوالے اور معتبر تاریخی ثبوت اور کسی قدر حسب ضرورت مقامات کا جغرافیہ بھی دیا گیا ہو اور جہاں فلسفہ اور سائنس کے اعتراض

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مشعر افشائے کفریات تفسیر حقانی مطبوعہ نصرت المطابع دہلی ۱۳۰۴ھ ملاحظہ کرے جس کے سرنامے پر یہ تاریخ درج ہے۔

بہ تفسیر حقانی بالیقیں ؛ عیاں شد چو کفر مفسر جنیں
شد الہام تاریخ تفسیر او ؛ وللکفرین عذاب مہین
۱۳۰۴ھ

وارد ہوتے ہوں اُن کے جوابات بھی دیئے گئے ہوں۔ اس طرح یہود۔ نصاریٰ۔ ہنود۔ آریہ اور دہریے نے
جو کچھ بھی ہرزہ سرائی کی ہے اُس کا بھی روک کیا گیا ہے۔ الحمد للہ والمنۃ کہ مذکورۂ بالا رعایتوں کے ساتھ حضرت
مولانا مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب مفسر حقانی و نامی والبیان و عقائد الاسلام وغیرہ کا ترجمۃ القرآن مع فوائد
دو صفحہ نہایت خوش وضع جلی قلم چھاپہ صاف کاغذ ولایتی دبیز تقطیع ۲۰×۱۶ اپر مطبع نے بصرفِ کثیر تیار کیا ہے
المشتہر محمد عبدالقیوم مالکِ مطبع حامی الاسلام دہلی۔

یہ اشتہار دیکھ کر ہمیں ایک حکیم صاحب کی دوا کا اشتہار یاد آگیا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہماری دوا سے ذیل کی
بیماریاں رفو چکر ہو جاتی ہیں۔ ضعفِ دماغ۔ بدہضمی۔ کمزوریِ دل۔ پٹھوں کی کمزوری۔ مادۂ مردی کی خرابی۔
دردِ سر۔ لاغری۔ تپِ دق۔ بچپن کی غلط کاریاں۔ جوانی کی بے اعتدالیاں۔ دائمی قبض۔ ضعفِ معدہ
تاپ تلی۔ دردِ گردہ۔ قولنج۔ وجع مفاصل کی بیماریاں۔ نزلہ۔ زکام۔ عرق النسا۔ کالی کھانسی وغیرہ وغیرہ۔
ہمارے نزدیک عبدالقیوم صاحب کا اشتہار بھی اسی قسم کا ہے کیوں کہ نہ حکیم صاحب کی دوا سے یہ بیماریاں
جاتی ہیں اور نہ مفسرِ تفسیرِ حقانی صاحب اپنے اشتہار کے بموجب ترجمۃ القرآن شائع کر سکے۔ کسی نے ایسے ہی
لوگوں کی نسبت گندم نما اور جو فروش کہا ہے۔ کہنے کو آندھی اور کرنے کو خاک۔

ہم نے سُنا ہے کہ کچھ اَور لوگ بھی ترجمہ کر رہے ہیں۔ جن میں سے بعض کے ترجمے نمونے کے طور پر ہم نے
بھی دیکھے ہیں۔ مگر ابھی وہ آٹھویں پارے تک نہیں پہنچے ورنہ اُن کا بھی مقابلہ ضرور کرتے۔

غرض ہمارے مولانا کے ترجمۃ القرآن کی نسبت ایک فاضل کی یہ رائے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ
وہ نفسِ قرآن کی تعریف و توصیف کے لیئے تو اسی قدر بس کرتا ہے کہ وہ کلام خدا ہے۔ رہا ترجمہ اس کی خوبی اور عمدگی
موقوف ہے اِس پر کہ مترجم اصل زبان عربی اور جس زبان میں ترجمہ کرتا ہے مثلاً فصیح و بلیغ اُردو دونوں پر بوجہ احسن
قادر اور پورے طور سے واقف ہو سو جس ترجمے کی تعریف کی جاتی ہے اُس کی خوبی اور عمدگی کے لیئے دنیا کے نامور و
مشہور فاضل شمس العلماء ایل ایل ڈی جناب مولوی حافظ نذیر احمد صاحب عم فیضہم و دام عظمتہم و جلالہم کا نام کافی
ثبوت ہے کہ اُن کی لیاقتِ عربی اور زبردست اُردو کا سکّہ اُن کی متعدد تصانیف مراۃ العروس۔ توبۃ النصوح۔ بنات النعش
محصنات۔ ابن الوقت۔ ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق والفرائض۔ اجتہاد اور امہات الامہ وغیرہ وغیرہ اور اُن کے
مختلف لکچروں اور علمی خطابات کے ذریعے سے چار دانگِ ہندوستان میں بیٹھ چکا ہے۔ اِن کے ترجمۃ القرآن کے متعلق
محققینِ ہند کے عام فضلا کے متفقہ الفاظ یہ ہیں کہ وہ سلاست و متانت اور اظہارِ مطلب اور فہمِ معنی اور شستگی زبان کے
لحاظ سے اس ترجمے سے بہتر اور عمدہ اور مطلب خیز ترجمہ نہ اب تک ہوا ہے اور نہ آیندہ ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔"
سچ پوچھیے تو اس ترجمے کی شہرت اور مقبولیتِ عام نے خواص و عوام کے مختلف طبقوں میں وہ شوق وہ دلچسپی وہ
رغبت پیدا کر رکھی ہے کہ باوجودیکہ عرصہ بارہ سال کا ہوا بلکہ اس سے کم ہی کم ہیں قریباً ۴۸ ہزار جلدیں مختلف موقعوں
متعدد ایڈیشنوں میں شائع ہوئیں۔ مگر لوگوں کی خواہش ابھی تک ویسی ہی تازہ بلکہ روز افزوں ہے۔ مقبولیتِ عام کا

اس سے بڑھ کر سند اَور کیا ہو سکتی ہی؟ حق یہ ہو کہ اس ترجمے کی نظیر سے ہندوستان کی اتنی بڑی آبادی اِس سرے سے لے کر اُس سرے تک بالکل خالی نظر آتی ہی۔ فاضل مترجم نے اِس کے دل چسپ اور سلیس اور بامحاورہ اور عام فہم اور مستند بنانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہی کہ اِس کے پڑھنے والوں کو قرآن شریف کا مطلب سمجھنے میں نہ تو کسی استاد کی امداد کی ضرورت پڑتی ہو نہ چنداں علم و فضل درکار ہوتا ہی بلکہ معمولی استعداد کا ہر اُردو خواں پڑھا اور اَن پڑھ عالم و عامی حتیٰ کہ معمولی استعداد کی عورتیں بچے بھی اس سے متمتع ہوتے اور پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فاضل مترجم کا ترجمۃ القرآن ایک ایسے شفاف اور جِلا کیے ہوئے تالوں کی خوب صورت عینک ہی جس سے قرآن مجید کے ذاتی انوار اور اصلی جوہر جو لوگوں کے قصورِ استعداد اور ناواقفیتِ زبان کی وجہ سے مکدّر اور دُھندلے پڑ گئے تھے ہر شخص کو اپنی اصلی صورت میں صاف چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ترجمے کے ساتھ نہایت مفید حاشیے اور فائدے بھی جا بجا چڑھائے گئے ہیں جن سے قرآن کا اہم اور مشکل سے مشکل مطلب بھی پانی کی طرح حل ہو گیا ہی۔ مسائل و احکام کی تحقیقات اور محاوراتِ عرب کو اُردو کے روزمرّہ سے منطبق کرنے میں وہ کوشش کی گئی ہی کہ اُس سے زائد اور بہتر ہو نہیں سکتی۔

غرض کہ دنیا کی تمام مروّجہ تفسیروں سے بے پروا کر دینے والا اور کلامِ الٰہی کا اصلی منشا ہر ایک شخص کے خواہ وہ کسی رُتبے کا ہو ذہن نشین کرنے والا صرف ایک یہی ترجمہ ہی جس کی تقریب کی جاتی ہی۔ اگر قرآن شریف کا سمجھ کر پڑھنا شرطِ اسلام ہی تو ہر ایک مسلمان کے گھر میں اس ترجمے کی کم از کم ایک جلد تو ہو۔"

مولانا ممدوح کے ترجمۃ القرآن کی نسبت ایک ہمارا خیال یہ بھی ہی کہ جس طرح قرآن کی اصلی عبارت لاجواب ہی اسی طرح فاضل مترجم کا ترجمۃ القرآن اپنا جواب نہیں رکھتا۔

ناظرین اگر حسنِ عقیدت نہ سمجھیں تو راقم اتنی بات اَور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہی کہ فاضل مترجم کے ترجمۃ القرآن کے لاثانی اور لاجواب اور فصیح و بلیغ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہی کہ اگر اُردو زبان میں کوئی آسمانی کتاب اُترنی ممکن ہی تو اُس کی زبان فاضل مترجم کی زبان ہو سکتی ہی اور بس۔

ترجمۃ القرآن میں وقتاً فوقتاً اصلاح و اضافہ

ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب لیوروِن صاحب نے گولمنز ہیونز کے ترجمے سموات کو مکمل کرنے کے لیے مسٹر سانڈرس ریزیڈنٹ حیدرآباد کی معرفت وہاں کے امیر کبیر کے پاس جو علم ہیأۃ کے بڑے عالم تھے بھیجا اور درخواست کی کہ وہ اُردو ترجمے کی دُرستی فرما دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ اور امیر کبیر نے وہ ترجمہ مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کو دیا کہ وہ اِس کو ملاحظہ فرمائیں تو اُنھوں نے ترجمے کے متعلق ہمارے مولانا کو لکھا کہ "آپ کا ترجمہ مجھکو بہت پسند ہوا ہی۔ مجھکو اُس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں جس نے ترجمے کو اچھا نہیں بتایا۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہی اور اس میں کچھ کسر ہی تو اسی قدر کہ آپ ہی اِس کی نظرِ ثانی کریں اور جہاں ضرورت دیکھیں اصلاح کریں اور میں یہی رائے لکھ کر دوں صاحب

کے پاس بھیج رہا ہوں "۔ بس یہی حال ہمارے مولانا کے ترجمۃ القرآن کا ہے۔ اُس کی خواہ متفرق طور پر نکتہ چینی کی جائے خواہ نکتہ چینی کے لیے کمیشن بیٹھے۔ مگر ہونا وہی ہے جو سماوات کے لیے ہوا۔ یعنی اگر ترجمۃ القرآن میں کوئی کسر رہی تو اُس کو فاضل مترجم ہی نکال سکتے ہیں دوسروں کی مجال نہیں۔ چناں چہ ہم اول سے آخر تک برابر یہی دیکھ رہے ہیں کہ ایک ایڈیشن کے بعد جب دوسرا ایڈیشن ہوتا ہے تو ترجمۃ القرآن میں اضافہ و اصلاح کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا۔ چناں چہ آخری ایڈیشن کے ساتھ ہم نے مولانا کے ماسبق ترجمۃ القرآن کے ایڈیشنوں کا بالاستیعاب مقابلہ کیا ہے اور پایا ہے کہ آخری ایڈیشنوں میں بہت کچھ اصلاح ہوئی ہے۔ مگر نکتہ چینوں کے اعتراضات میں نہیں کیوں کہ وہ اعتراض حقیقی اور واجبی نہ تھے۔ بلکہ فاضل مترجم نے جہاں کہیں اپنے ترجمے میں نقص دیکھا ہے اُس کو رفع فرما دیا ہے۔ یہ بات مولانا کے ترجموں کا مقابلہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔

(۱) ادعیۃ القرآن
(۲) ہفت سورہ
(۳) دہ سورہ

یہ تینوں کتابیں قرآن مجید سے اقتباس کی گئی ہیں۔ (۱) ادعیۃ القرآن اُس قسم کی دعاؤں کی کتاب ہے جیسی دلائل الخیرات اور حصن حصین اور دعائے گنج العرش وغیرہ آج کل مروج ہیں۔ لیکن ان میں اور اُس میں یہ فرق ہے کہ ادعیۃ القرآن میں اُس کی بتائی ہوئی دعائیں ہیں جو دعاؤں کو قبول فرمایا کرتا ہے یعنی خدا۔ ادعونی استجب لکم۔ اور دلائل الخیرات وغیرہ میں اُن لوگوں کی بنائی ہوئی دعائیں ہیں جو محتاج دعا ہیں یعنی بندے۔ پس ناظرین سمجھ لیں کہ کون سی دعائیں بہتر ہو سکتی ہیں۔ ادعیۃ القرآن میں ہر ایک دعا کے ساتھ اُردو ترجمہ موجود ہے اور نیز اُس کی شانِ نزول کہ یہ دعا کس نے کی اور کس غرض سے کی۔ یہ اس لیے کہ دعا مانگنے والا دعا کا مطلب سمجھ کر اپنے مطلب کے موافق جوڑ کر دعا کرے۔ ادعیۃ القرآن تقریباً ایک سو صفحے کا رسالہ ہے۔ اول مختصر دیباچے کے بعد چار باب باندھے ہیں اور اُن میں صرف قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ دعا داخل فطرتِ انسانی ہے۔ یعنی خدا نے آدمی کا دل ہی ایسا بنایا ہے کہ حاجت پڑے پر خدا کو پکارتا ہے۔ دوسرے باب میں قرآن سے ثابت کیا ہے کہ خدا کے سوا دوسروں سے دعا کرنی منع ہے۔ تیسرے باب میں حکم دعا اور وعدۂ قبول دعا کے متعلق آیتیں لکھی ہیں۔ چوتھے باب میں شرائطِ قبول توبہ کا بیان ہے۔ بعد ازاں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت آدمؑ۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت زکریاؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت یونسؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ ملکہ بلقیس۔ حضرت شعیبؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ بنی اسرائیل۔ فرعون کے جادوگروں کی دعائیں جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے۔ بی بی آسیہ کی دعا۔ حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت مریم کی والدہ۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں۔ حضرت لوطؑ۔ انبیائے سابقین کے اصحاب۔ اصحاب کہف اور فرشتوں وغیرہ وغیرہ کی دعائیں قرآن مجید سے مستنبط کر کے درج کر دی ہیں۔ بہر حال ادعیۃ القرآن کی دعائیں اُن تمام دعاؤں سے بہتر ہیں جو آج کل مروج ہیں۔

(۲) ہفت سورہ اور دہ سورہ کے متعلق جناب مولانا فرماتے ہیں "مجھ کو معلوم نہیں پنج سوروں کا رواج کیوں اور کس سے اور کب سے چلا۔ مگر بہت پرانے پنج سورے دیکھنے میں آئے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پنج سوروں کا رواج کم از کم سیکڑوں

برس پہلے سے چلا آتا ہی۔ خیال دوڑانے سے اس کے سوائے کوئی اور وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ سارے قرآن کی تلاوت دیرطلب کام ہی۔ کسی نے اتفاقی طور پر اپنی رائے سے سورۂ یٰسین۔ الرحمٰن۔ تبارک الذی۔ واقعہ۔ مزمل پانچ سورتیں منتخب کرکے اُن کا ورد بنا لیا۔ اور اپنے زعم میں سارے قرآن کی تلاوت سے سبک دوش ہو بیٹھا۔ قرآن فی نفسہٖ کچھ ایسی بڑی ضخیم کتاب نہیں اور نہ شارع کی طرف سے جلدی کی تاکید ہی۔ مگر لوگوں کی ہمتیں دین کے بارے میں ایسی پست ہو گئی ہیں کہ حافظوں کا تو مذکور نہیں جو قرآن پڑھ سکتے ہیں اُن میں بھی جیسا چاہیئے تلاوت کا التزام نہیں۔ پنج سورے کے موجد نے اُنگلی میں لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا چاہا۔ لوگوں کو حیلہ ہاتھ آیا پنج سورے چل پڑے۔ ہم تو سرے سے قرآن ہی کو قابلِ انتخاب نہیں سمجھتے۔ قرآن الحمد سے لے کر والناس تک سارے کا سارا انتخاب ہی مگر لوگوں نے فرمایش کی ہم نے اس خیال سے کہ خیر قرآن کا نام تو ہی۔ متداول پنج سورے میں سورۂ فتح اور نبا دو سورتیں بڑھا کر اول ہفت سورہ چھپوایا اب سورۂ اخلاص یعنی قل ہو اللہ اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تین سورتیں اور زیادہ کرکے **دہ سورہ**۔ اس دہ سورے کے ورد کا مضایقہ نہیں۔ مگر سارے قرآن کی تلاوت کا فرض تو اس سے ساقط ہونے کا نہیں۔

الحقوق والفرائض

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب علم کلام میں فرماتے ہیں کہ "ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہیں کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا **شاہ ولی اللہ** جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ شاہ صاحب نے **علم کلام** کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی۔ اور اس بنا پر اُن کو متکلمین کے زمرے میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں۔ لیکن اُن کی کتاب **حجۃ اللہ البالغہ** جس میں انھوں نے **شریعت** کے حقائق اور اسرار بیان کیے ہیں درحقیقت **علم کلام** کی روح رواں ہی۔ علم کلام درحقیقت اُس کا نام ہی کہ مذہب اسلام کی نسبت یہ ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہی۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہی۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جس نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔"

یہ عبارت دیکھ کر مجھے اول اول نہایت استعجاب ہوا۔ کیوں کہ سُنی سنائی باتوں کے لحاظ سے امام غزالی اور امام رازی کی وقعت خصوصیت کے ساتھ میرے دل پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو سُنی سنائی باتوں کی وجہ سے بمقابلہ امام غزالی اور فخر رازی اگر ایک طفلِ مکتب نہیں تو کم سے کم ان صاحبوں کا خوشہ چین ضرور سمجھتا تھا۔ چناں چہ راقم نے جب اپنے چند بزرگوں پہ علامہ شبلی کا یہ خیال ظاہر کیا تو اُنھوں نے امام غزالی جیسے صاحب جاہ و جلال امام اور علامۂ علم کلام کے مقابلے میں شاہ صاحب کی برتری کو شگفتگی دل سے نہیں سُنا۔ لیکن

دلی زبان سے حق گوئی نے اتنا ضرور اقبال کرایا کہ ہاں شاہ صاحب نے بمقابلۂ امام غزالی اسرارِ دین کے بیان کرنے میں موشگافیاں زیادہ کی ہیں لیکن میرے لیئے یہ بھی سُنی سنائی باتیں تھیں۔ قصورِ استعداد کی وجہ سے نہ میں عربی کی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت دیکھ سکتا تھا اور نہ حجۃ اللہ البالغہ۔ حُسنِ اتّفاق سے حضرت شاہ صاحب کی کتاب کا ترجمہ آیات اللہ الکاملہ[۱] مجھے مل گیا۔ اور میں نے اول سے آخر تک نہایت ذوق و شوق اور غور و خوض سے اُس کو پڑھا لیکن امام صاحب اور شاہ صاحب کے درمیان کسی کو فاضل و مفضول نہ ٹھیرا سکا۔ کیوں کہ اس وقت شاہ صاحب تنہا پیش قاضی تھے تاہم راقم کو اتنی بات ضرور معلوم ہوئی کہ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اسرارِ دین کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہی۔ اس واقعے کے کئی برس بعد الحقوق والفرائض کی جلدیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ ان کی سیر نے حجۃ اللہ البالغہ کے دیکھنے پر راقم کو دوبارہ مجبور کیا۔ اور اب میں نے ان دونوں صاحبوں کی کتابوں کو مقابلۃً بالاستیعاب پڑھنا شروع کیا۔ الحقوق والفرائض کو جتنا پڑھتا جاتا تھا تو مولٰنا نذیر احمد صاحب کے مقابلے میں (گستاخی معاف) شاہ صاحب کی نسبت میری بالکل وہی رائے قائم ہوتی جاتی تھی جو علامہ شبلی نے امام غزالی کی نسبت بمقابلۂ شاہ صاحب قائم کی ہی اور میں نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر "علمِ کلام" کی تصنیف کے قبل الحقوق والفرائض کی جلدیں شائع ہو جاتیں تو علامہ شبلی بھی ہمارے شمس العلما مولٰنا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کو فاضل اور شاہ صاحب کو مفضول ٹھیراتے۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں چند معرکۃ الآرا مضامین حجۃ اللہ البالغہ اور **الحقوق والفرائض** سے نقل کر کے نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔ اور صرف اتنی بات پوچھتے ہیں کہ تسکینِ قلب حضرت شاہ صاحب کے ارشاد سے ہوتی ہی یا ہمارے مولٰنا کے بیان سے۔ کیوں کہ ہمارے نزدیک تسکینِ قلب ہی ایک بڑی چیز ہی۔

توحید۔ از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

نیکی اور اقسامِ نیکی میں اصل الاصول اور نہایت عمدہ حصّہ توحید ہی۔ پروردگارِ عالم کی حضوری میں نیاز و انکسار کا حاصل ہونا اُس کی توحید پر منحصر ہی۔ اور یہ نہایت ہی سعادت جاذب اخلاق میں ایک بڑی چیز ہی۔ یہ تدبیر علمی کی بنیاد ہی جو ان دونوں تدابیرِ مذکورہ میں زیادہ مفید ہی۔ اسی کی وجہ سے آدمی کو غیب کی جانب کامل توجہ ہوتی ہی۔ نہایت مقدس طریقے سے نفس میں غیب کے اتصال کی اسی کی وجہ سے استعداد حاصل ہوتی ہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی عظمت پر تنبیہ کی ہی۔ اور اُس کو تمام اقسامِ نیکی میں بمنزلہ دل کے قرار دیا ہی۔ اگر وہ درست ہی تو سب نیکیاں درست ہیں۔ اور اگر وہ فاسد ہی تو سب نیکیاں فاسد ہیں۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا ہی کہ جو شخص میرے اور خدا کے ساتھ کسی کو کسی امر میں شریک نہ کرتا ہو وہ بے شک جنت میں داخل ہوگا۔ فرمایا ہی کہ اُس پر دوزخ کی آگ حرام یا وہ جنت سے روکا جائے گا۔ اور ایسی ہی ایسی عبارتیں وارد ہوئی ہیں اور خدا کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ جو شخص مجھ سے ملے اور روئے زمین کے برابر اُس کی خطائیں ہوں لیکن کبھی ہرگز میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو میں ویسی ہی اُس کی مغفرت کروں گا۔

---

[۱] مولوی خلیل احمد صاحب بن مولنا مولوی سراج احمد صاحب سرہندی مدرس عربی مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے آیات اللہ الکاملہ کے نام سے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ [illegible]

معلوم کرنا چاہیئے کہ توحید کے چار مرتبے ہیں (۱) صرف خدا تعالیٰ میں ہی صفت وجوب وجود کی ثابت کرنا کوئی دوسرا بجز اُس کے واجب نہ ہو (۲) صرف اُسی کی ذات کو عرش و کرسی آسمان و زمین اور تمام جوہروں کا خالق جاننا کتب الٰہیہ نے ان دونوں مرتبوں سے کچھ بحث نہیں کی ہو مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ نے بھی اس توحید کی مخالفت نہیں کی قرآن عظیم میں صاف مذکور ہو کہ یہ دونوں مقدمات اُن سب کو مسلّم تھے - (۳) تیسرے آسمان و زمین اور تمام اُن چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں ہیں مدبر صرف خدا کو سمجھنا (۴) بجز خدا کے کوئی اَور عبادت کا مستحق نہیں ہو - ان دونوں حصوں میں قدرتی تعلق اور ربط ہو - اس لیئے ایک دوسرے کو لازم ہو اور انھیں میں فرقوں نے اختلاف بھی کیا ہو - مخالفین میں تین فرقے بڑے ہیں

(۱) نجومی ان کا مذہب ہو کہ ستارے پرستش کے مستحق ہیں - اُن کی پرستش سے دنیاوی منفعت حاصل ہوتی ہو اپنی حاجتوں کو اُن کے سامنے پیش کرنا بجا ہو - وہ قائل ہیں کہ ہم کو خوب ثابت ہو گیا ہو کہ روزانہ حوادث میں ستاروں کا بڑا اثر ہو - اُن کو آدمی کی خوش نصیبی اور بد بختی تندرستی اور مرض میں بڑا دخل ہو ستاروں کے نفوس مجرّدہ اور بڑا عاقلہ ہیں - وہی ان کو ان حرکتوں پر آمادہ کرتے ہیں - وہ اپنے پجاریوں سے بے خبر نہیں ہیں - اس لیئے نجومیوں نے ستاروں کے نام پر مورتیں بنائی ہیں اُنھیں کو وہ پوجتے ہیں اور مشرکوں کا وہ فرقہ مسلمانوں کے ساتھ اس امر میں تو موافق ہو کہ بڑے بڑے امور کی تدبیر اور قطعی حکم کرنے کا منصب تو خدا ہی کو ہو اُس نے کسی کو اختیار نہیں دیا ہو لیکن وہ باقی امور میں مسلمانوں کے موافق نہیں ہیں اُن کا مذہب ہو کہ پہلے صلحا نے جو خدا کی خوب عبادت کی ہو اُس سے وہ بارگاہِ الٰہی میں مقرب ہو گئے ہیں خدا نے الوہیت کا مرتبہ اُن کو عطا کر دیا ہو اس واسطے وہ بہ نسبت اَور مخلوقات کے پرستش کے مستحق ہو گئے ہیں جیسے کہ کوئی شخص کسی شہنشاہ کی نہایت خدمت کرتا ہو تب شہنشاہ اُس کو ملکی خلعت عطا کر کے کسی شہر کی حکومت اور انتظام اُس کے متعلق کر دیتا ہو اس لیئے وہ مستحق ہو جاتا ہو کہ اُس شہر کے لوگ اُس کی خدمت اور اطاعت کریں - مشرکین کا قول ہو کہ بغیر اُن کی پرستش شامل کیئے عبادت مقبول نہیں ہوتی بلکہ خدا کا رتبہ نہایت بلند ہو اُس کی عبادت سے تقرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا البتہ اُن لوگوں کی پرستش ضرور ہو تاکہ یہ قرب الٰہی کے لیئے ذریعہ بن جائیں - مشرکین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ سنتے ہیں دیکھتے ہیں اپنے پجاریوں کی شفاعت کرتے ہیں اُن کے امور کا ساز و سامان کرتے ہیں اُن کے معاون رہتے ہیں اسی لیئے مشرکین نے اُن کے نام کے پتھر تراش لیئے ہیں جب وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اُن پتھروں کو اپنی توجہ کا قبلہ کرتے ہیں ان مشرکین کے بعد اَور لوگ پیدا ہوئے اُنھوں نے ان پتھروں میں اور ان لوگوں میں جن کے لیئے یہ پتھر تراش کیئے گئے ہیں کوئی فرق نہیں کیا اور خود انھیں پتھروں کو اصلی معبود قرار دے لیا - اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے مشرکین کے رد میں تنبیہ فرمائی کہ حکومت اور قدرت صرف خدا ہی کا خاصہ ہو اور کبھی بیان فرمایا کہ یہ محض جمادات ہیں

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا - اور غرقہ نصاریٰ کا مذہب ہو کہ حضرت عیسیٰ کو خداوند سے نہایت قرب ہو اور تمام مخلوق سے اُن کا رتبہ زیادہ ہو اس لیئے خدا نے

[۱] کیا ان کے پاؤں ہیں جن کے بل پر وہ چلتے ہیں یا ہاتھ ہیں جن سے وہ کچھ پکڑ سکتے ہیں یا اُن کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھ سکیں یا کان ہیں جن سے کچھ سن سکیں

نہیں ہو کہ ہم اُن کو بندہ کہیں یہ اُن کی شان میں سوءِ ادبی ہو اور اُس قرب کا لحاظ ترک کر دینا ہو جو اُن کو خدا سے حاصل ہو اس لیئے بعض نصاریٰ اِس خصوصیت کے اظہار کے لیئے اُن کا نام ابن اللہ رکھتے ہیں چوں کہ باپ بیٹے پر مہربانی کرتا ہو اور اپنی نظر کے سامنے اُس کی تربیت کرتا ہو اُس کا درجہ غلام سے زیادہ ہوا کرتا ہو۔ اِس واسطے یہی نام مناسب ہو اور بعض نصاریٰ نے حضرت عیسےٰ کا نام خدا ہی رکھ دیا ہو۔ اس خیال سے کہ خدا نے اُن میں حلول کیا ہو۔ اسی لیئے اُن سے ایسے ایسے آثار صادر ہوئے کہ آدمیوں سے وہ صادر نہیں ہوا کرتے۔ مُردوں کو اُنھوں نے زندہ کیا، پرندوں کو پیدا کیا۔ اِس لیئے حضرت عیسیٰ کا کلام بعینہٖ کلام الٰہی ہو اور اُن کی عبادت بالکل خدا کی عبادت ہو اور نصاریٰ جب بعد کو پیدا ہوئے تو اس نام رکھنے کی وجہ کو اُنھوں نے کچھ نہ سمجھا اور وہ بیٹے کے لفظ سے حقیقی ہی معنی کے بیٹے سمجھے یا اُن کو من جمیع الوجوہ واجب خیال کیا اسی واسطے خدا تعالیٰ نے کبھی اُن کے اقوال کو اس طرح رد کیا کہ خدا کے پاس بیوی نہیں اور کبھی اس طرح تردید فرمائی کہ بدیع السموات والارض انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون (خدا آسمانوں اور زمین کا از سرِ نو پیدا کرنے والا ہو اُس کی شان ہو کہ جب وہ کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہو تو کہہ دیتا ہو کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہو) اِن تینوں فرقوں کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں ان میں بکثرت خرافات اور بیہودہ پن بھرا ہوا ہو مثلاً شی پر وہ مخفی نہیں ہیں قرآن عظیم نے اِن دونوں مرتبوں کو خوب بیان کیا ہو اور کافروں کے شبہات کا بالاستیفا رد کیا ہو (آیات اللہ الکاملہ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ)

حقیقتِ شرک
از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

معلوم کرنا چاہیئے کہ عبادت کے معنی ہیں نہایت درجہ عاجزی جب کسی سے لیسے نہایت درجہ کی ذلت اور عاجزی ظاہر ہوگی تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا صوری مثلاً ایک شخص کا کھڑا ہونا۔ ایک کا سجدہ کرنا یا قصد اور نیت سے ہوتی ہو مثلاً سجدے بندوں کی اپنے مولی کے لیئے تعظیم کرنا اور قیام سے رعیت کی بادشاہوں کے لیئے یا شاگردوں کی استاد کے لیئے تعظیم کرنا اور کوئی تیسری صورت تعظیم کی نہیں ہو۔ اور جب ثابت ہو چکا ہو کہ سجدے سے فرشتوں نے حضرت آدمؑ کی اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کی تعظیم کی تھی حال آں کہ سجدے سے زیادہ کوئی اور تعظیم نہیں ہو تو ضرور ہوا کہ نیت سے ہی فرق کیا جائے لیکن ابھی تک پوری تنقیح نہیں ہوئی اس لیئے کہ مولا کے لفظ کے کئی معنی مستعمل ہوتے ہیں اور یہاں اُس سے مراد معبود کی ذات ہو تو وہ گویا عبادت کی تعریف میں ماخوذ ہو۔ پس اُس کے متعلق یوں تنقیح کی جائے گی کہ ذلت و خواری کا اقتضا سے ذلیل میں ناتوانی اور ضعف کا لحاظ کرنا اور دوسری میں قوت اور غلبے کا خیال کرنا ذلیل کی حالت میں ذلت اور پستی اور دوسری میں شرف اور رفعت کو ملحوظ رکھنا اور آدمی جب عقلی بالطبع ہو جائے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ قوت۔ شرف مسخر کرنے وغیرہ امور کے لیئے دو قسم پر اندازہ کرتا ہو ایک اپنی ذات کے لیئے اور اُس کے لیئے جو ذاتی امور ہیں اُن سے مانا جاتا ہو اور ایک اور ذات کے لیئے جو حدوث و امکان کے داغ سے بالکل پاک ہو دوسرے اُن لوگوں کے لیئے جن میں اسی پاکیزہ ذات کی بعض صفتیں منتقل ہو آئی ہوں مثلاً وہ امور غائب کے معلوم کرنے کے لیئے دو درجے قرار دیتا ہو ایک وہ درجہ جو غور و فکر یا مقدمات کے ترتیب دینے یا نبوت دیکھنے یا خواب یا اُن چیزوں سے الہام کو اخذ کرنا جن کے مطالعہ

مردوں پر

آپ کو بالکلیہ نہیں پاتا ہو دوسرے ذاتی علم جو عالم کی ذات کا ہو مقتضا ہو دوسرے سے وہ اُس کو حاصل نہ کرے۔ اور تحصیل کی محنت کا بار نہ برداشت کرے ایسے ہی تاثیر تدبیر تسخیر کے لیئے کوئی سا لفظ ہو دو درجے سمجھتا ہو ایک تو اعضا اور قویٰ کا استعمال کرنا مزاجی کیفیات حرارت برودت وغیرہ سے اعانت لینا اور امور جن کی استعداد قریب یا بعید اُس میں موجود ہو دوسری تاثیر کا درجہ یہ خیال کیا جاتا ہو کہ بغیر کسی کیفیت جاننے اور بغیر کسی امر کے استعمال کیئے کسی شئے کو پیدا کر دینا جس کو خدا فرماتا ہو۔ [1]اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۔ اور ایسے ہی وہ عزت اور شرف کے دو درجے قرار دیتا ہو ایک ایسی عظمت جیسے کہ بادشاہ کی رعیت کے مقابلہ میں ہوتی ہو جس کی انتہا معاونین کی کثرت انعامات داد و دہش کا زیادہ ہونا ہو یا جیسے کسی بڑے توانا اور استاد کی عظمت دوسرے ضعیف القویٰ اور شاگرد کے مقابلے میں ہوتی ہو اور دوسرا درجہ عظمت کا وہ ہو کہ وہ صرف اُس میں ہو جس کی رفعت و شان نہایت اعلیٰ درجے کی ہو اس راز کو مستعدی سے تلاش کرنا چاہیئے تاکہ تجکو یقین ہو جائے کہ جو شخص اِس کا معترف ہو کہ یہ تمام امکان سلسلۂ ذات واجبی پر ختم ہو جاتا ہو دوسرے کی پھر کچھ حاجت نہیں رہتی اس کو ان صفات قابل مدح کے دو درجہ قرار دینے پڑیں گے ایک وہ درجہ جو ذاتِ خداوندی کے لائق ہو دوسرے جو اپنی حالت اور شان کے مناسب ہو اور چوں کہ الفاظ جو دونوں میں استعمال کیئے جاتے ہیں باہم معنی کے لحاظ سے بہت قریب قریب ہوا کرتے ہیں اِس لیئے لوگ شرائعِ الٰہیّہ کے لیئے موقع معنی لگا لیا کرتے ہیں اور اکثر بعض آدمیوں یا فرشتوں وغیرہ کے ایسے ایسے افعال آدمی کو معلوم ہوتے ہیں جن کا صادر ہونا اُن کی ابنائے جنس سے مستبعد ہوا کرتا ہو اس لیئے اُن کی نظر میں حالت مشتبہ ہو جایا کرتی ہو۔ اور اُن کے لیئے وہ قدسی مرتبہ اور الٰہی تاثیر ثابت کرتا ہو لوگ درجۂ بلند کی شناخت میں برابر نہیں ہوتے۔ بعض لوگ اُن انوار کی قوتوں کا احاطہ کر لیا کرتے ہیں۔ جن کے اثر تمام موالید پر غالب و محیط ہوتے ہیں لیکن یہ شخص اُن طاقتوں کو اپنی طاقت جیسی سمجھتے ہیں اور بعضوں کو ایسے احاطہ کرنے کی طاقت نہیں ہوا کرتی ہر انسان کو اُس قدر تکلیف دی گئی ہو جتنی اُس سے ممکن ہو۔ اُس حکایت کے یہ معنی ہیں جس کو کہ سراپا صداقت آنحضرت صلعم نے بیان فرمایا کہ خدا نے اُس شخص کو نجات دی تھی جس نے اپنے اہل کو حکم دیا تھا کہ مجکو جلا دینا اور میری خاکستر کو ہوا میں اُڑا دینا اُس کو خوف تھا کہ مبادا خدا مجکو پھر زندہ کرے اور مجھ پر قابو پالے اُس شخص کو یہ یقین تھا کہ خدا میں کامل درجے کی قدرت ہو۔ لیکن اُس کو قدرت اُن ہی چیزوں میں ہو جو کہ ممکن ہیں ممتنع چیزوں پر اُس کو قدرت نہیں ہو وہ جانتا تھا کہ اُس خاکستر کا جمع کرنا ناممکن ہو جو پراگندہ ہو کر اُس کا نصف حصہ خشکی میں ہو اور نصف دریا میں اِس سے خدا کی ذات میں نقص پیدا نہیں ہوا جتنا اُس کا علم تھا۔ اتنا ہی وہ ماخوذ ہوگا لیکن کافروں میں اُس کا شمار نہ ہوگا تو تشبیہ اور ستاروں اور نیک بندوں کے ساتھ شرک کرنا جن سے خلافِ عادت امور مانند مکاشفہ اور قبولیت دعا کی ظاہر ہوتی رہتی ہیں لوگوں میں موروثی ہو گیا ہو۔ اور جو نبی اپنی قوم میں بھیجا جاتا ہو اُس کو فرض ہو کہ لوگوں کو شرک کی حقیقت خوب سمجھا دے۔ اور دونوں درجوں کی حقیقت ممیز کر کے مقدس درجے کو صرف واجب تعالےٰ ہی میں مانے۔ اگرچہ دونوں درجوں کے الفاظ قریب المعنی ہوں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طبیب سے

[1] کیا ان[illegible] وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہو تو کہہ دیتا ہو ہو جا وہ ہو جاتی ہو ۱۲

فرمایا کہ تو صرف رفیق ہو اور طبیب حقیقت میں خدا ہی ہو اور جیسے کہ آپ نے فرمایا کہ سردار صرف خدا ہی ہو اُن حدیثوں میں طبیب اور سردار کے خاص معنی لیئے ہیں اِس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری اور صحابہ اور اُن کے حاملین دین کا زمانہ ختم ہو گیا اُن کے بعد ایسے ناشدنی لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا اور خواہشوں کی پیروی کی اور مستعمل اور مشتبہ الفاظ کے بے جا معنی بنا لیئے جیسے کہ محبوبیت اور شفاعت کو خدا نے تمام شریعتوں میں بندگانِ خاص کے لیئے ثابت کیا ہو لیکن لوگ اُس کے بجا معنی مراد نہیں لیتے اور ایسے ہی خلاف عادت اور مکاشفات سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ علم آلہی اور غلبۂ الٰہی کی حالت اُس شخص میں منتقل ہو آتی ہو جو ایسے ایسے کام کرتا ہو حال آں کہ یہ امور ناسوتی یا روحانی طاقتوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں ایک خاص وجہ سے تدبیرِ الٰہی کے نازل ہونے کی استعداد آجاتی ہو اُن امور کو ایجادِ آلہی اور اُن امور سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا جو واجب تعالیٰ کے لیئے خاص ہیں اِس مرض میں لوگ کئی طرح سے گرفتار ہوتے ہیں بعضے خدا کی بزرگی کو بالکل بھول جاتے ہیں اور صرف شرکا کی ہی عبادت کرتے ہیں اپنی حاجتوں کو اُنھیں سے مانگتے ہیں خدا کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اگرچہ یقینی دلیل سے یقین کرتے ہیں کہ سلسلۂ وجود خدا ہی پر ختم ہوتا ہو اور بعض لوگوں کا اعتقاد ہوتا ہو کہ سردار اور مدبر تو خدا ہی ہو لیکن وہ کبھی کبھی اپنے بعض بندوں کو بزرگی اور معبودیت کا خلعت پہنا دیتا ہو اور بعض خاص کاموں کا اُن کو اختیار مل جاتا ہو وہ اُن کی سفارش کو قبول کرتا ہو جیسے کوئی شہنشاہ کسی حصۂ ملکی پر کسی بادشاہ کو بھیجتا ہو اور وہ بجز بڑے بڑے کاموں کے اُس ملک کی پوری تدبیر اُس کے سپرد کر دیتا ہو اِس وجہ سے ایسے شخص کے حق میں اُن لوگوں کو بندگانِ خدا کہنے کی جرأت نہیں ہوا کرتی کہ کہیں وہ اَوروں کے برابر نہ ہو جائیں وہ بجائے اِس نام کے اُن کو ابن اللہ اور محبوبِ الٰہی کہتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اُن کا غلام سمجھتے ہیں وہ اپنا نام عبدالمسیح یا عبدالعزار رکھتے ہیں عام یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کو یہ مرض ہوتا ہو اور فی زماننا اسلام میں بھی بعض ایسے غالی منافق موجود ہیں اور چوں کہ شریعت کی بنا اِس پر ہوا کرتی ہو کہ مشتبہ کی چیز کو بجائے اصل کے قرار دیں اِس لیئے وہ محسوس امور جن میں شرک کا گمان تھا کفر شمار کیئے گئے جیسے بتوں کا سجدہ کرنا اُن کے لیئے قربانی کرنا اُن کے نام پر حلف کرنا اور ایسے ہی اَور امور اوّل اوّل مجھ پر یہ علم اِس طرح منکشف ہوا کہ میرے سامنے ایسی ایک قوم پیش کی گئی جو ایک چھوٹی سی زہریلی مگس کے لیئے سجدہ کرتی تھی جو ہمیشہ اپنی دُم اور ہاتھ پاوں ہلاتی رہتی تھی تو میرے دل میں القا ہوا کہ کیا تو اِن میں بھی شرک کی تاریکی پاتا ہو اور جیسی خطا اور بزہ کاری نے بت پرستوں کو گھیر لیا ہو ایسے ہی اِن مگس پرستوں کو بھی گھیر لیا ہو۔ میں نے کہا کہ اِن لوگوں نے مکھی کو اپنا قبلہ قرار دیا ہو۔ لیکن ذلت کے درجے کو عزت کے درجے سے نہیں ملایا ہو اِس واسطے میں اِن لوگوں میں شرک کی تاریکی نہیں پاتا مجھ سے کہا گیا کہ تجھے اصل راز کی رہبری ہو گئی ہو اُس روز سے میرا دل علم توحید سے لبریز ہو گیا اور اُس میں مجھ کو بصیرت حاصل ہو گئی اور توحید و شرک اور اُن چیزوں کی حقیقت جن کو شرع نے توحید و شرک کا موقع قرار دیا ہو بخوبی مجھکو معلوم ہو گئی ہو اور تدبیر کے ساتھ عبادت کے تعلق کو میں خوب سمجھ گیا۔ واللہ اعلم۔

ایمان بالقدر
از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

قضا و قدر پر ایمان لانا بڑے اعلیٰ درجے کی نیکی ہو اِسی سے آدمی کو وہ یکساں تدبیر نظر آسکتی ہو جو تمام عالم کو سمیٹے ہوئے ہو جس شخص کو اِس تدبیر کا ٹھیک اعتقاد ہو گا وہ اُن چیزوں پر

نظر رکھے گا جو خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہیں دنیا اور ما فیہا اُن کا عکس اُسے معلوم ہوگا۔ لوگوں کے اختیارات کو قضائے الٰہی
کے مقابلے میں ایسا سمجھے گا جیسے آئینہ میں صورت کا عکس ہوتا ہے۔ اُس سے اُس شخص میں تدبیر یگانہ کا انکشاف ہوگا۔ اگرچہ
کامل انکشاف عالم معاد ہی میں ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کی تمام قسموں میں اُس کا بلند رتبہ ہونا بتایا ہے کہ
جس شخص کا قدر کی نیکی اور بُرائی پر ایمان نہ ہو تو میں اُس سے جُدا ہوں اور نیز آپ نے فرمایا ہے کہ کسی بندے کا ایمان درست
نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قدر کی نیکی اور بُرائی پر ایمان نہ رکھے اور خوب یقین کرے کہ جو کوئی عمل درست ہو گیا اُس
میں خطا کا دخل نہ تھا اور جو اُس نے خطا کی اُس میں درستی کا احتمال نہ تھا۔

معلوم کرنا چاہیے کہ خدا کا علم ازلی اور ذاتی تمام اُن چیزوں کو محیط ہے جو موجود ہو چکیں یا آیندہ موجود ہوں گی
یہ محال ہے کہ خدا کے علم سے کوئی ایسی چیز موجود ہو جو اُس کے علم میں نہ تھی اگر ایسا ہو تو وہ علم نہ ہوگا بلکہ جہل ہوگا یہ مسئلہ تو
شمولِ علم کا ہے قدر کا مسئلہ یہ نہیں ہے اس میں کسی اسلامی فرقے نے مخالفت نہیں کی ہے جس قدر کا حال مشہور حدیثوں
سے معلوم ہوا ہے اور سلفِ صالح کا وہی عقیدہ رہا اور محققین ہی کو اُس کے سمجھنے کی توفیق ہوئی اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے
کہ یہ تکلیف کو دُور کرتی ہے اور جب یہ حالت ہے تو عمل کرنے کے کیا معنی ہیں وہ قدر وہی ہے جو قبل موجود ہونے کے حادث
اشیا کے وجود کو ضروری قرار دیتی ہے اس کے لازم کرنے سے وہ شے موجود ہوتی ہے نہ کوئی تدبیر اُس کو دفع کر سکتا ہے نہ
کوئی اَور ذریعہ مفید ہے اس قدر کے واقع ہونے کے پانچ مرتبے اور درجے ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ازل میں قرار دیا کہ عالم کو ایک عمدہ صورت میں پیدا کرے حتی الامکان اُس میں سب
خوبیاں ہوں تمام مصلحتوں کا لحاظ ہو اُس کے موجود ہونے کے وقت تمام اضافی خوبیوں کے آثار ہوں خدا کے
علم کی نہایت اِس پر ہوئی کہ اُن کی تمام صورتوں میں سے خاص خاص حد زمین متعین کر دی گئیں۔ اس طرح پر تمام حادث
اشیا کا ایک مرتب سلسلہ قائم ہو گیا جن سب کے وجود کا سبب یہی ہو گئے۔ اُن کے مصداق میں کثرت تھی خداوند عالم کا
جس پر کوئی امر پوشیدہ نہیں ہو سکتا یہ ارادہ کرنا کہ عالم کو موجود کرے یہی معنی رکھتا ہے کہ اُس نے وجود عالم کی صورت کو
نہایت الامر تک خاص کر دیا۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اُس نے ہر چیز کی مقدار اور اندازے کو مقدر کیا۔ روایت کی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تمام
مخلوقات کے مقداروں کو پچاس ہزار برس آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پہلے لکھ دیا تھا یہ اس طرح ہوا کہ عرش کے
وجود میں خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور ہر ایک صورت مقرر کر دی۔ شرایع میں اسی مرتبے کو ذکر سے تعبیر کرتے ہیں۔
مثلاً اُس نے وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت موجود کی اور مقرر کر دیا کہ فلاں وقت میں لوگوں کی طرف مبعوث
ہوں گے۔ لوگوں کو احکام الٰہیہ پر مطلع کریں گے ابولہب اُن کا انکار کرے گا دنیا میں خطا اور گناہ اُس کے دل کو احاطہ
کرے گا اور آخرت میں آتش دوزخ سے اُس پر عذاب ہوگا اسی صورت کی وجہ سے تمام حادث چیزوں کا ظہور اُسی روش
اور طریقے سے ہوتا ہے کہ جیسے وہاں اُن کا اندازہ ہو چکا تھا۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ خدا نے جب آدم علیہ السلام کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ تمام آدمیوں کے باپ ہوں نوعِ انسانی کے مبدا ہوں

تب اُس نے اُن کی اولاد کی صورتیں عالمِ مثال میں پیدا کر دیں اور نور و تاریکی سے اُن کی سعادت اور شقاوت کی صورت مقرر کر دی اُن کی ایسی حالت بنا دی کہ احکامِ الٰہیہ سے مکلف ہونے کے قابل ہوں اُن میں اپنی شناخت اور نیاز مندی کا مادہ پیدا کیا عہدِ قدیم کی جو لوگوں کی فطرت میں مخفی رکھا گیا ہے یہی اصل ہے اِسی کی وجہ سے مواخذہ کیا جاتا ہے اگرچہ وہ واقعہ اُن کو یاد نہ رہا ہو جو لوگ زمین پر پیدا کیے گئے ہیں اور اُنھیں صورتوں کا عکس ہیں جو وہاں موجود ہو چکی ہیں اُن میں وہی امور مضمر ہیں جو وہاں پیدا ہو چکے تھے۔

چوتھا درجہ اِس وقت تقدیر اور اندازے کا ہوتا ہے کہ جب جنین میں روح ڈالی جاتی ہے جب تخم نمو خاص وقت میں کسی زمین میں بویا جاتا ہے۔ اور سب اُس کی خاص خاص تدبیریں ترتیب کے متعلق عمل میں آتی ہیں تو جس شخص کو اُس درخت اور زمین و ہوا کی خاصیتیں معلوم ہوتی ہیں وہ جان جاتا ہے کہ یہ درخت اچھی طرح اُگے گا اُس کی شان دیکھ کر بعض بعض امور کا پتا لگا لیتا ہے ایسے ہی اُس زمانے میں مدبر فرشتوں کو اُس کی عمر اور رزق کی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ شخص اُن لوگوں کے سے عمل کرے گا جن کی ملکی قوت بہیمی پر غالب ہوتی ہے۔ یا اُن لوگوں کے سے جن کی ملکی قوت بہیمی سے مغلوب ہوتی ہے اُس کی سعادت اور شقاوت کے سب ڈھنگ اُن کو معلوم ہو جاتے ہیں کسی واقعے کے پیدا ہونے سے پہلے ہر چیز کا اندازہ کیا جاتا ہے حظیرۃ القدس سے زمین پر ہر ایک کا نزول ہوتا ہے ایک صورت پہلے مثالی زمین کی طرف منتقل ہوتی ہے پھر اُس کے احکام یہاں پھیل جاتے ہیں اِس کو میں نے اکثر مرتبہ مشاہدہ کیا ہے ایک بار چند لوگ باہم مناقشہ کرتے تھے اُن کا رنج بڑھتا جاتا تھا میں نے خدا سے التجا کی کہ یہ مناقشہ اُن میں سے دور ہو اُسی وقت ایک مثالی نورانی نقطہ حظیرۃ القدس سے زمین پر نازل ہوا وہ آہستہ آہستہ پھیلتا گیا تھا وہ پھیلتا تھا اُتنا ہی رنج اُن کے دلوں سے دور ہوتا جاتا تھا۔ ابھی ہم اپنی جگہ سے علیحدہ نہ ہوتے تھے کہ اُن سب میں باہم ایسے ہی میل اور محبت پیدا ہو گئی جیسے پہلے تھی۔ یہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کی عجیب نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ ایسے ہی میرا ایک لڑکا بیمار پڑا تھا۔ میرا دل اُس طرف لگا ہوا تھا اتنے میں نمازِ ظہر پڑھ رہا تھا کہ اُس کی موت کو میں نے نازل ہوتے ہوئے دیکھا تو اُس کا اُسی روز شب میں انتقال ہو گیا۔ حدیثوں میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ زمین پر پیدا ہونے سے پہلے سب حوادث پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس کے بعد اِس عالم میں اُسی طرح پیدا ہو کر ظاہر ہوتے ہیں کہ جیسے پہلے مرتبہ ہو چکے تھے۔ یہ خدا کا قانون اور طریقہ ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو چیزیں وہاں موجود ہو چکی تھیں وہ محو ہو جاتی ہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔ مثلاً کبھی کسی بلا کی کچھ نہ کچھ پیدائش ہو جایا کرتی ہے۔ وہ مصیبت زدہ پر نازل ہونے کو ہوتی ہے کہ دعا اُس کو روک لیتی ہے۔ اور کبھی موت کی پیدائش ہونے کو ہوتی ہے کہ کوئی نیکی اُس کو روک لیتی ہے اِس کا راز یہ ہے کہ یہ نازل ہونے والی شے بھی معمولی اسباب میں سے ایک ایسا ہی سبب ہے۔ جیسے بقائے زندگی کے لیے کھانا اور پینا اور موت کے لیے زہر کھا لینا یا تلوار مارنا۔ اکثر احادیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ ایک عالم ایسا ہے جس میں تمام قائم بالغیر چیزیں مجسم ہوتی اور معانی اُس میں منتقل ہوتے ہیں قبل اِس کے کہ کوئی شے

سلہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اُس کے پاس ام الکتاب ہے ۱۲

زمین میں پیدا ہو جایا کرتی ہے جیسے رحم کا عرش میں معلق ہونا اور فتنے ایسے نازل ہوتے ہیں جیسے قطروں کی بوچھار ہوتی ہے۔ اور نیل و فرات پہلے سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ میں پیدا کیے گئے تھے۔ پھر زمین پر اُن کو اُتار دیا ہے۔ ایسے ہی سورۂ حدید اور انعام کا نازل کرنا۔ مجموعۂ قرآن کا ورلے آسمان پر اُتارنا۔ اور آں حضرت اور دیوار مسجد کے بیچ میں جنت اور دوزخ کا آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح ہو جانا کہ خوشۂ انگور کو توڑ سکیں۔ اور دوزخ کی حرارت کو محسوس کر سکیں اور دعا اور بلا کی باہم کشتی۔ ذریتِ آدم کو پیدا کرنا۔ عقل کا پیدا کرنا وہ سامنے ہوتے اور اُس نے پیٹھ پھیر لی۔ سورۂ بقرہ آل عمران کا پرندوں کی دو صفوں کی صورت میں ظاہر ہونا۔ اعمال کا وزن۔ جنت کا ناگوار چیزوں سے اور دوزخ کا خواہشوں سے بھرا ہونا۔ ایسے ہی اَور امور بھی ہیں جس کو حدیث کا ادنیٰ علم بھی ہوگا وہ اُن امور کو خوب سمجھ سکتا ہے اور اپنے مسببات کے لیئے اسباب کے سبب ہونے کی تقدیر کچھ مزاحم نہیں ہے۔ اُس کا تعلق اُس سلسلے سے ہے جو مجموعی طور پر ایک ہی مرتبہ مرتب ہو گیا ہے۔ جب آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ منتر اور دوا اور پرہیز تقدیرِ الٰہی سے بچا سکتے ہیں آپ نے فرمایا یہ بھی تقدیرِ الٰہی سے ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (نام مقام کے قصے میں فرمایا کیا یہ امر نہیں ہے کہ اگر تم ناقہ کو سبزہ زار میں چراتے تو تقدیر سے ہی چراتے اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار ہے لیکن اِس اختیار میں اُن کا کچھ اختیار نہیں ہے اس لیئے کہ اِس اختیار کے لیئے ضرور ہے کہ مقصود کی صورت اُس کا نفع اور خواہش اور عزم پیدا ہو جائے اور ان سب امور کا علم بھی نہیں ہوا کرتا پھر اُن میں خود مختاری کیسی۔ آں حضرت فرماتے ہیں ان[1] القلوب بین اصبعین من اصابع اللہ یقلبہا کیف یشاء۔ واللہ اعلم۔

نبوت اور اُس کے خواص از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

معلوم کرو کہ انسانی طبقوں میں سب سے اعلیٰ درجے کے لوگ مفہمین ہیں۔ یہ لوگ اہلِ اصطلاح ہوتے ہیں۔ اُن کی ملکی قوت نہایت بلند ہوتی ہے۔ ان لوگوں سے یہ ہو سکتا ہے کہ حقانی خواہش سے کوئی انتظام مقصود قائم کریں۔ ملاءِ اعلیٰ کی جانب سے اُن پر علوم اور الٰہی حالات وارد ہوتے ہیں مفہمین کی سیرت میں یہ امور داخل ہوتے ہیں۔ اُن کے مزاج اور خلقت اور خلق میں اعتدال اور تناسب ہوتا ہے۔ اُن میں جزئی رایوں کی وجہ سے بیتابی نہیں ہوتی اور نہ ایسے پرلے درجے کی ذکاوت ہوتی ہے۔ کہ کلّی سے جزئی کو اور روح سے صورت کو معلوم نہ کر سکیں۔ نہ ایسی غباوت ہوتی ہے کہ جزئی سے کلّی کی طرف اور صورت سے روح کی جانب منتقل نہ ہو سکیں سب لوگوں سے زیادہ وہ جادۂ راست کا پابند ہوتا ہے۔ عبادت میں اُس کی نہایت پسندیدہ شان ہوتی ہے۔ لوگوں کے معاملات میں انصاف پسند ہوتا ہے۔ تدابیرِ کلّی کو ہمیشہ پسند کرتا ہے۔ منفعتِ عام کا ہمیشہ راغب رہتا ہے۔ کسی کو بالطبع ایذا نہیں دیتا۔ ہاں اگر تکلیف اور ایذا پر عام نفع موقوف ہو یا نفع عام کو ایذا لازم ہو تو البتہ اُس سے ایذا پہونچ سکتی ہے۔ عالمِ غیب کی جانب ہمیشہ اُس کا میلان رہتا ہے۔ اثر اُس کی گفتگو میں اُس کے چہرے میں اور اُس کی تمام حالتوں میں محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ اُس کے ہر ایک پہلو سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ غیب سے اُس کو تائید پہونچتی ہے۔ ادنیٰ ریاضت سے اُس کو ایسا قرب اور تسکین حاصل ہوتی ہے جو اَور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ مفہمین کی قسمیں اور استعدادیں

[1] دل خدا کی دو انگشتوں میں ہیں جس طرح چاہتا ہے اُس کو پھیر دیتا ہے ۱۲

مختلف ہوا کرتی ہیں - جس کی اکثر یہ حالت ہو کہ خدا کی جانب سے اُن علوم کو اخذ کرتا رہے جن سے عبادتوں کے ذریعے
سے نفس میں تہذیب پیدا ہوتی ہے - اُس کو کامل کہتے ہیں - اور جو اکثر اخلاقِ کامل اور تدبیرِ منزل کے علوم کو اخذ کرے
اُس کو حکیم کہتے ہیں - اور اکثر انتظاماتِ کلّی کو حاصل کرکے لوگوں میں عدل اور انصاف قائم کرے اور اُن سے اَوروں
کی جور و تعدّی کو دفع کرے اُس کا نام خلیفہ ہے - اور جس کو ملاءِ اعلیٰ کی حضوری ہو یا فرشتے اُس کو تعلیم دیں - اُس سے
خطاب کریں - اُس کو وہ آنکھوں سے نظر آئیں اور مختلف قسم کی کرامتیں اُس سے ظاہر ہوں اُس کا نام مؤیّد
بروح القدس ہے - اور جس کی زبان اور دل پُرنور ہوں لوگوں کو وہ اپنی صحبت اور مواعظ سے نفع پہنچائے اور
پھر وہی تسلی اور نور اُس کے خاص صحابہ اور حواریین میں منتقل ہو - وہ اُس کی برکت سے کمالی درجات تک پہنچ
جائیں - اُس کو اُن کی ہدایت اور رہبری کی نہایت ہی حرص ہو اُس کو ہادی مزکّی کہتے ہیں - اور جس کا بڑا حصہ علمی مذہب
کے قواعد اور مصالح ہوں - وہ اُس کا زیادہ مشتاق ہو کہ اُن علوم کو قائم کرے جو محو ہو گئے ہیں - اُس کو امام کہتے
ہیں - اور جس کے دل میں القا کیا گیا ہو کہ لوگوں کو اُن مصائب اور صدمات کا حال بتا دے جو دنیا میں اُن کے لیے
مقدر ہوں یا کسی قوم کے ملعون اور مردود ہونے کو معلوم کرکے اُن کو اس کی اطلاع دے یا بعض اوقات تجردِ نفس
کی حالت میں اُن واقعات کو اُس نے معلوم کیا جو قبر اور حشر میں لوگوں کو پیش آنے والے ہیں - اور یہ اس قسم کے
حالات اُن کو بتائے اُس کو مُنذِر کہتے ہیں - جب حکمتِ الٰہی کا اقتضا ہوتا ہے کہ کسی مفہم کو لوگوں کی طرف بھیجے - تو خدا تعالیٰ
اُس شخص کے باعث سے لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے بندوں پر خدا کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی زبانوں اور
دلوں سے اُس کے آگے سرِ تسلیم ہوں - ملاءِ اعلیٰ کو اُس کی تاکید ہوتی ہے کہ اُس کے فرمان پذیروں سے خوشنود ہو کر
اُن کے شریک رہیں - اور مخالفوں سے ناخوش ہو کر اُن سے علیٰحدگی کریں - خدا لوگوں کو اُس کی اطلاع کرتا ہے - ان پر
اُس کی اطاعت واجب کرتا ہے - ایسا شخص نبی ہوتا ہے - اور تمام انبیاء میں سب سے زیادہ عزّ و شان والا وہی ہے جس
میں ایک اور ہی قسم کی بعثت ہوتی ہے اس کی نسبت مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ لوگ زندگی کی تیرگیوں سے نکل کر نورانیت اپنے
اندر پیدا کریں - اور اُس کی قوم عام لوگوں کے لیے رہبر بنے اس طرح پر گویا اس نبی کی بعثت میں ایک دوسرے قسم
کی بعثت ہوا کرتی ہے - پہلی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے [۵۱] هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ الخ -
اور دوسری حالت کی طرف خدا کے قول [۵۲] كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ - میں اشارہ ہے - اور آں حضرت صلے اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہے [۵۳] فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ - ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم میں مفہمین کے تمام
کمالات بالاستیعاب جمع تھے - اور دونوں نعمتوں میں سے کامل حصہ آپ کو حاصل تھا - اور جو انبیاء علیہم السلام کہ آپ سے
پیشتر گزرے ہیں اُن کو نبوت میں صرف ایک یا دو فن حاصل تھے - اور معلوم کرنا چاہیے کہ حکمتِ الٰہیہ انبیاء کی بعثت کی
اس لیے مقتضی ہوا کرتی ہے کہ لوگوں کی اضافی اور قابلِ اعتبار بہتری تدابیرِ بعثت ہی میں منحصر ہوا کرتی ہے - اور اس بہتری کی

[۵۱] خدا ہی نے اَن پڑھوں میں اُن میں سے ایک نبی بھیجا ۱۲ [۵۲] تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے ۱۲

[۵۳] تم لوگوں میں آسانیاں بڑھانے کو پیدا ہوئے ہو نہ دشواریاں بڑھانے کو ۱۲

اصلی حقیقت کا علم گو صرف علام الغیوب ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن اتنا ہم بھی یقیناً جانتے ہیں کہ ضرور انبیاء کے مبعوث کرنے کے لئے ایسے ایسے اسباب ہوا کرتے ہیں جو بعثت سے تخلف نہیں کیا کرتے۔ انبیاء کی پیروی لوگوں پر اسی لئے فرض کی جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ کسی قوم کی درستی اور خوبی اس ہی میں ہے کہ وہ خدا کی اطاعت کریں اور اُس کی عبادت کریں۔ لیکن ان لوگوں کے نفوس اس قابل نہیں ہوا کرتے کہ وہ خود علوم الٰہی کو اخذ کریں۔ اُن کے حال کی درستی اُس میں ہوتی ہے کہ وہ نبی کا اتباع کریں۔ اِس لیے خدا حظیرۃ القدس میں فرماتا ہے کہ نبی کا اتباع واجب ہے۔ وہاں اس امر کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے مختلف طریقے ہیں۔ کبھی تو بعثت کا وقت خاص دولت اور قوت کے غلبے کا اور دیگر طاقتوں کے سرنگوں کرنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ ایسے شخص کی بعثت کرتا ہے جو اس دولت اور طاقت والوں کے دین کو درست کرے۔ جیسے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت۔ یا خدا تعالیٰ مقدر کرتا ہے کہ کسی قوم کو باقی رکھے اور لوگوں پر اُن کو برگزیدہ کرے۔ اِس لیے ایسے شخص کو مبعوث کرتا ہے۔ جو اُن کی کجی کو رفع کرے اور اُن کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے جیسے سیدنا حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی بعثت۔ یا اُن امور کا نظم ونسق ہوتا ہے جو کسی قوم کے واسطے مقدر ہوتے ہیں کہ اُن کی دولت یا مذہب جس کی کسی مجدد کے ذریعے سے اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے باقی رکھی جائیں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہم السلام اور انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام کی ایک جماعت کی یہی حالت تھی۔ خدا تعالیٰ نے اِن تمام انبیاء علیہم السلام کے لیے دشمنوں پر ظفرمندی کو مقدر کیا تھا۔ جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ[۱] ۔ ان انبیاء کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو اتمام حجت کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں واللہ اعلم۔

اور جب کوئی نبی مبعوث ہو تو ان لوگوں پر جن کی جانب وہ مبعوث ہوا ہے فرض ہے کہ گو وہ راہ راست ہی پر کیوں نہ ہوں لیکن اُس نبی کا سب اتباع کریں۔ اِس لیے کہ ایسے بلند رتبہ شخص کی سرتابی سے ملاء اعلیٰ کی لعنت اور ذلت ورسوائی پیدا ہوا کرتی ہے۔ نبی کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا کے حضور میں تقرب خود حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسی سرکشی کی حالت میں ان کی تمام کوششیں رائیگاں ہو جایا کرتی ہیں اُن کے مرنے کے بعد چاروں طرف سے اِن کے دلوں کو لعنت گھیر لیتی ہے علی ان هذه صورة مفروضة غير واقعة ۔ تم کو یہود کی حالت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اُنھوں نے دین میں کیسی کیسی زیادتیاں اور کتاب الٰہی میں کیسی تحریف کی تھی۔ اِس لیے سب لوگوں سے زیادہ اُن کے لیے پیغمبر کی بعثت کی ضرورت تھی۔ اور پیغمبروں کے بھیجنے سے خدا کی حجت لوگوں کے مقابلے اِس لیے ثابت ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں کی پیدائش اس قابل نہیں ہوا کرتی کہ وہ بلا واسطہ مفید اور مضر امور کو حاصل کر سکیں۔ بلکہ اُن کی استعداد ضعیف ہوتی ہے۔ انبیاء کے بتانے اور خبر دینے سے اُس کو قوت پہنچتی ہے۔ اور نیز ایسے ایسے خرابیاں اور فاسد امور جمع ہو جاتے ہیں کہ بغیر جبر اور دلیل کے دفع نہیں ہو سکتے۔ لوگ اِس قابل ہو جاتے ہیں کہ دنیا اور آخرت میں اُن کے اعمال کی

[۱] اپنے پیغمبر بندوں کے لیے ہمارا قول پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ہمیشہ فتح مند رہیں گے اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا ۱۲

بازپرس کی جاتے - تب بعض اسباب علوی اور سفلی کے جمع ہونے کے بعد لطفِ خداوندی کا اقتضا ہوتا ہے کہ کسی قوم میں سے نہایت ذکی شخص پر وحی کرے کہ لوگوں کو حق کی جانب ہدایت کرے - اور راہِ راست کی جانب اُن کو بلاتے - اس نبی کا حال رہبری کے بارے میں ایسا ہوتا ہے جیسے کسی مالک کے غلام بیمار ہو جائیں اور وہ مالک اپنے خواص میں سے کسی کو حکم دے کہ ان کو دوا پلا تو خواہ وہ خوشی سے پئیں یا ناگواری اور ناخوشی سے - اس وقت میں اگر یہ شخص ان کو دوا پینے پر مجبور بھی کرے گا - تاہم حق پر ہوگا - لیکن پوری مہربانی اس کی مقتضی ہے کہ اولاً اُن کو بتا دے کہ تم بیمار ہوا اور یہ دوا تم کو نفع دے گی - اور اُن کے سامنے خلافِ عادت ومعمول ایسے افعال بھی ظاہر کرے جن سے اُن کے دلوں میں بخوبی بیٹھ جائے کہ وہ اپنے اقوال میں بالکل سچا ہے - اور نیز اُس کو مناسب ہے کہ اُس دوا میں کوئی شیریں جز بھی ملا دے - ان امور کے بعد وہ اُس کے احکام کی بجا آوری اپنی بصیرت اور رغبت سے کریں گے - اسی وجہ سے معجزات اور قبولیت دعا وغیرہ اصلِ نبوت سے محض خارج اور علیحدہ ہیں - ہاں اکثر حالتوں میں لازم ضرور ہوا کرتے ہیں - اور بڑے بڑے معجزات کا ظہور اکثر تین اسباب سے ہوا کرتا ہے -

(۱) کوئی نبی مفہمین کے رتبے کا ہوتا ہے اس وجہ سے بعض بعض حوادث اُس کو ظاہر ہو جایا کرتے ہیں اور یہ ظہور دعاؤں کی قبولیت اور اُن امور میں موجب برکات ہو جاتا ہے - جس کے لیے برکت کی دعا کی جاتی ہے - اور برکت کے ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں - کبھی کسی شئ کا نفع زیادہ ہو جاتا ہے - مثلاً اعدا کے خیال میں لشکر کی کثرت متمثل ہوتی ہے - اس لیے وہ بزدل ہو جاتے ہیں یا طبیعت غذا کو خلطِ صالح بنا دیتی ہے - اس سے ایسا اثر ہوتا ہے گویا اُس غذا سے دوچند زیادہ تناول کی ہے - اور کبھی خود اصل شئ ہی بڑھ جاتی ہے اس طرح پر کہ کسی صورت کے مادۂ ہوائی میں کوئی قوت مثالی حلول کرتی ہے - اور اُس کو بدل دیتی ہے - ان اسباب کے علاوہ اور بھی اسباب ظہورِ برکات کے ہوتے ہیں - جن کا شمار کرنا دشوار ہے - اور

(۲) سبب ظہورِ معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ متفق ہو کر نبی کے احکام جاری کرنا چاہتے ہیں - اس وجہ سے الہامات اور انتقالات اور تقریبات پیش آتے ہیں جو پہلی حالت کی نسبت محض غیر معمولی ہوتے ہیں - اس لیے نبی کے احباب ظفرمند اور اعدا خوار وخراب ہوتے ہیں - اور حکم الٰہی کا ظہور ہوتا ہے وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ -

(۳) تیسرا سبب معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ اسباب خارجی کی وجہ سے بہت سے حوادث نئے نئے پیدا ہوتے ہیں - نافرمانوں کو سزا دی جاتی ہے - اور عالمِ وجود میں بڑے بڑے امور کا احداث ہوتا ہے یہی امور کسی نہ کسی وجہ سے معجزات ہو جاتے ہیں - نبی یا پہلے سے اُن پر لوگوں کو مطلع کر دیتا ہے یا اُس کی نافرمانی پر لوگوں کی سزا مرتب ہوا کرتی ہے یا جو طریقہ سزا کا نبی نے بتا دیا تھا - وہ حوادث اُسی کے موافق ہوتے ہیں - یا ایسے ہی امور ہوا کرتے ہیں -

انبیاء کے معصوم ہونے کے بھی تین اسباب ہوا کرتے ہیں -

(۱) یہ کہ تمام رذیل خواہشوں اور رغبتوں سے کسی انسان کی فطرت نہایت خالص اور صاف پیدا کی جاتی ہے - خاصۃً اُن امور کی نسبت جو حدودِ شرعی کی حفاظت اور پاسبانی سے متعلق ہوا کرتے ہیں -

(۲) یہ کہ اس کو اچھے کام کی خوبی اور بُرے کام کی بُرائی اور دونوں کا انجام وحیِ الٰہی سے معلوم ہوجایا کرتا ہے۔
(۳) یہ کہ اُس شخص اور اُن رذیل خواہشوں کے مابین خدا حائل ہوجاتا ہے۔

معلوم کرو کہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ ہوتا ہے کہ خدا کی ذات اور صفات میں غور اور فکر کرنے کا حکم نہ کریں۔ عام لوگ ایسے ایسے خوضوں کی طاقت نہیں رکھا کرتے۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تَفَكَّرُوا فِي[51] خَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللّٰهِ۔ اور۔ اِنَّ[52] اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پروردگار کی ذات میں غور کا موقع نہیں ہے۔ انبیاء ہمیشہ یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے انعامات اور اُس کی بزرگ قدرت میں لوگ غور کیا کریں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ امر ہوتا ہے کہ لوگوں سے ایسی ہی گفتگو کیا کرتے ہیں جو اُن کے عقلی اندازے کے مناسب اور اُن کے علوم کے موافق ہو جو اُن کے اندر پیدایشی طور پہ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ نوعِ انسانی کا کہیں وجود ہو اُس کو جبلّی طور پر ایک خاص ادراک عطا کیا گیا ہے۔ جس کا مرتبہ تمام حیوانی ادراک سے زیادہ ہے۔ ہاں اُس کا اصلی مادہ ہی اگر عاصی ہو۔ اور اس قسم کے انسانی ادراک کے قابل نہ ہو تو اَور بات ہے۔ ورنہ انسانی ادراک میں سب افرادِ نوعی شریک ہوتے ہیں۔ اور اس ادراک کے علاوہ انسان کے لیئے اَور زائد علوم سے حصہ دیا جاتا ہے کہ وہ اُس میں معمولی عادت کے خلاف حاصل ہوتے ہیں۔ جیساکہ انبیاء اور اولیائے قدسی نفوس کی حالت ہوا کرتی ہے اور کبھی انسان کو نہایت پُرمشقت ریاضتوں کے استعمال سے بعض ایسے علوم حاصل ہوتے ہیں جو اُس کو ایسے بلند ادراکات کے لیئے طیار کرتے ہیں جن کا اندازہ اُس کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔ اور کبھی مدتِ دراز تک علوم حکمیہ کی اور علمِ کلام اور اصولِ فقہ وغیرہ کی مشق اور محنت سے علوم کا اضافہ ہوجایا کرتا ہے۔ لیکن انبیاء کی گفتگو صرف اُسی سادہ ادراک کے طریقے کے موافق ہوا کرتی ہے۔ جو بلحاظ اصلی پیدایش کے اُن کی طبائع میں موجود ہوا کرتا ہے۔ اُن علوم کی طرف جن کا وجود شاذ و نادر اسباب سے ہوا کرتا ہے اور محض اتفاقی ہوتا ہے اُن کو کچھ التفات نظر نہیں ہوتا۔ اسی واسطے انبیاء لوگوں کو اس پہ مجبور نہیں کرتے کہ وہ خدا کو تجلیات اور مشاہدات کے ذریعے سے یا دلائل اور قیاسات سے معلوم کریں۔ یا وہ خدا کو تمام جہتوں سے منزہ خیال کریں۔ اِس لیئے کہ اس طرح پر معلوم کرنا اُن لوگوں کے لیئے گویا محال ہے کہ جن کو ریاضتوں کے اشتغال نصیب نہیں ہوتے۔ انھوں نے مدتِ دراز تک معقولیوں سے میل جول نہیں رکھا ہے۔ استنباط اور استدلال اور استحسانات کے طریقوں کی جانب اُن کو رہبری نہیں کی گئی ہے۔ اُن مقامات کے ذریعے سے جن کے ماخذ پُردقّت ہیں۔ باہم مشابہ چیزوں سے اُن کو فرق کرنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ اُن کو وہ علمی وقتیں نہ آتی ہوں جن کی وجہ سے اصحاب الرائے اہلِ حدیث پہ ناز کیا کرتے ہیں۔ اور نیز انبیاء کی سیرت میں یہ امر بھی داخل ہے کہ وہ اُن اُمور کی جانب توجہ نہیں کیا کرتے جو تہذیبِ نفس سیاستِ امت سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ وہ اُن اسباب کو بیان نہیں کرتے جو عالمِ جوّ میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً مینہ اور کسوف اور ہالے کی کیفیت۔ عالمِ نباتات اور حیوان کی عجائبات یا آفتاب اور چاند کی رفتار کا اندازہ۔ روزمرہ حوادث کے اسباب۔ انبیاء یا سلاطین یا شہروں وغیرہ

---

[51] خدا کی ذات میں غور مت کرو بلکہ اُس کی مخلوق میں غور کرو ۱۲
[52] تیرے رب کی طرف نہایت ہے ۱۲

کے حالات اور قصّے۔ البتہ کبھی کبھی خدا کے انعامات اور انتقامات بیان کرنے کے لیئے چند لفظوں میں امور بالا کا ذکر بھی بطور تبعیت آجایا کرتا ہے۔ وہ بھی محض اجمالی صورت میں کسی استعارات اور مجازات کے پردے میں آجایا کرتا ہے جس سے لوگوں کو الفت ہوتی ہے۔ اُن کی عقلیں اُس کو قبول کرسکتی ہیں۔ اسی بناء پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا سبب دریافت کیا تھا تو خدا تعالی نے اُس سے اعراض فرماکر صرف مہینوں کے فائدے بیان کردیئے۔ اور فرمادیا [۱] یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ اکثر لوگوں کو تم دیکھوگے کہ اِن فنونِ رسمی کی الفت سے یا اَور وجوہ سے اُن کے ذوق خراب ہوگئے ہوں۔ اس لیئے وہ پیغمبر کے کلام کے بے موقع معنی لگاتے ہیں واللہ اعلم۔

اب ہم اِسی سلسلے سے مولانا کی تصنیف الحقوق والفرائض سے توحید۔ ممانعت شرک۔ ایمان بالقدر۔ حقوقِ پیغمبرؐ اور تمام پیغمبروں کے حقوق۔ نقل کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین مضامین مذکورہ کا مقابلہ کرکے تصفیہ فرمالیں کہ کس نے زیادہ موشگافیاں فرمائی ہیں اور اسرارِ دین کے بیان کرنے میں کس کا قلم چرب ہے۔

توحید

از شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب

دنیا کے اس عظیم الشان کارخانے کا ذرہ ذرہ۔ سمندروں کا قطرہ قطرہ۔ درختوں کا پتا پتا خدا کی ہستی کا گواہ ہے۔ [۲] وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ اس لیئے کہ کوئی چیز بڑی ہو یا چھوٹی زمین میں ہو یا آسمان میں خشکی میں ہو یا تری میں جاندار ہو یا بے جان اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کہ اُس سے بہتر ہونا ممکن نہیں۔ آپسے آپ نہیں بن گئی۔ ضرور کسی کے بنائے سے بنی ہے۔ ہم نے اس بنانے والے کی جستجو کی اور زمین سے لے کر آسمان تک چھان مارا تو کسی کو اس لائق نہ پایا۔ جس کو دیکھا عاجز۔ جس کو ٹٹولا درماندہ۔ روئے زمین پر ہم ہی پیش پیش تھے کہ عقل رکھتے تھے سو ”آیا ز قدرِ خود بشناس“ سُن کر اپنا سا مونھ لے کر رہ گئے۔ ناچار آسمان پر نظر دوڑانی چاہی تو ابراہیم [۳] علیہ السلام کا قصہ

---

[۱] تجھ سے لوگ ہلالوں کا حال دریافت کرتے ہیں کہدو وہ اُن سے لوگوں کا اور حج کا وقت معلوم ہوتا ہے ۱۲ [۲] اور جتنی چیزیں ہیں سب اُس کی حمد (وثنا) کے ساتھ اُس کی تسبیح (وتقدیس) کررہی ہیں مگر تم لوگ اُن کی تسبیح (وتقدیس) کو نہیں سمجھتے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو مخلوق بھی ہے وہ اپنے خالق کی ہستی کی گواہ ہے اور مخلوق کا ہونا عقلاً دلالت کرتا ہے کہ وہ آپ سے آپ موجود نہیں ہوگئی بلکہ کسی نے اُس کو پیدا کیا اور جس نے پیدا کیا وہی خدا ہے ۱۲

[۳] حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ قرآن شریف میں اس طرح مذکور ہے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام ۹۶ پارہ ۷) اور (اے پیغمبر اس وقت کو یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو میں تو تم کو اور تمھاری قوم کو صریح گمراہی میں (مبتلا) پاتا ہوں اور (جس طرح ابراہیم کے دل میں ہم نے یہ خیال پیدا کیا) اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین کا انتظام دکھانے لگے

یاد کرکے خاموش بیٹھ گئے اور سمجھے کہ جس کی جستجو ہی وہ چشم سر سے دیکھنے کی چیز نہیں۔ بنی اسرائیل نے شوخ چشمی کی تو فاخذتہم الصاعقۃ کی سزا پائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے غلبۂ شوق میں آکر حوصلہ کیا تو خرّ موسیٰ صعقا سے شرمندگی اُٹھائی۔ یعنی خدا ہمارے حواسِ ظاہر کی گرفت سے بالاتر ہی اور یہ ہمارے حواس کا قصور ہی ۵

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(ترجمہ متعلقہ صفحہ ۳۸۳) تاکہ وہ (کامل) یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں تو جب اُن پر رات چھا گئی اُن کو ایک ستارہ نظر آیا (اور اُس کو دیکھ کر) لگے کہنے کہ یہی میرا پروردگار ہی پھر جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ غروب ہو جانے والی چیزوں کو تو میں پسند نہیں کرتا (کہ خدا مان لوں) پھر جب چاند کو دیکھا کہ بڑا چمکدار ہی تو لگے کہنے یہی میرا پروردگار ہی پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو بولے اگر مجھکو میرا پروردگار راہِ راست نہیں دکھائے گا تو بے شک میں (بھی) گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں گا پھر جب سورج کو دیکھا کہ بڑا چمکدار ہی تو لگے کہنے یہی میرا پروردگار ہی کہ یہ (سب سے) بڑا (بھی) ہی پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو (اپنی قوم سے مخاطب ہوکر) بولے کہ بھائیو! جن چیزوں کو تم شریکِ (خدا) ٹھہراتے ہو میں تو اُن سے بے تعلق (محض) ہوں میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رخ اُسی (ذاتِ پاک) کی طرف کر لیا ہی جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں ف۱

ف۱ ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں اور چاند اور سورج کو غروب ہوتے دیکھ کر یہ کہنا کہ اِن کا غروب ہونا شانِ خدائی کے خلاف ہی اِس کا مطلب یہ تھا کہ ستارے اور چاند اور سورج مجبور معلوم ہوتے ہیں اور کسی دوسرے کے ارادے کے محکوم اور جب مجبور و محکوم ہیں تو خدا نہیں ہو سکتے ۱۲

ف۵ بنی اسرائیل کی اِس شوخ چشمی اور شرارت کا قصہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مختلف پیرایوں کے ساتھ مذکور ہوا ہی از انجملہ سورۂ بقرہ کی ایک یہ آیت ہی۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یعنی اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے (یعنی تمہارے بڑوں نے) موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے ہیں نہیں (کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہی) اِس پر تم کو بجلی نے آدبوچا اور تم دیکھا کیے پھر تمہارے مرے پیچھے ہم نے تم کو جلا اُٹھایا تاکہ شاید تم شکر کرو۔" از انجملہ سورۂ اعراف کی ایک یہ آیت ہی۔ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ "یعنی اور موسیٰ نے ہمارے وعدے (پر حاضر لانے) کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمی منتخب کیے پھر جب اُن کو زلزلے نے آلیا تو (موسیٰ نے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اگر تو چاہتا تو مجھ سمیت ان لوگوں کو پہلے ہی سے ہلاک کر دیتا ہم میں سے جو لوگ احمق ہیں وہ ایک حرکت کر بیٹھے کیا اُس کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کیے دیتا ہی یہ سب تیرے کرشمے ہیں (ان کرشموں) سے جس کو تو چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے تو ہی ہمارا کارساز ہی تو ہمارے قصور معاف کر اور ہم پر رحم فرما اور تو تمام بخشنے والوں سے بہتر بخشنے والا ہی" ف۲

ف۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام گوسالہ پرستی کی توبہ کرانے کو اپنی قوم کی طرف سے ستر آدمی منتخب کرکے کوہِ طور پر لے گئے وہاں جوان لوگوں نے کلامِ الٰہی سنا تو موسیٰ سے درخواست کی کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں تمہارے کہنے کا اعتبار نہیں کریں گے کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہی اِس گستاخی کی سزا میں اُن پر بجلی آگری اور ہلاک ہو گئے موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ خدایا یہ لوگ کم عقل ہیں اِن پر رحم فرما تو خدا نے اُن کو پھر زندہ کیا۔ اگرچہ اِس میں اختلاف ہی کہ یہ لوگ کیوں لے گئے تھے مگر سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ گوسالہ پرستی کی توبہ کرنے گئے تھے ۱۲

ہاں چشمِ دل سے دیکھا جائے تو دنیا آئینہ خانہ ہے اور در و دیوار خدا کے نور سے پڑے جگمگا رہے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

قطعہ

دوست نزدیک تر از من بمن ست   وین عجب تر کہ من از وے دورم
چہ کنم باکہ تواں گفت کہ او   در کنارِ من و من مہجورم

للمترجم

حبل الورید سے بھی وہ نزدیک ہے تو کیا   آنکھیں نہیں تو کیا نظر آئے قریب سے

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کو شروع ہی سے خدا کے بارے میں یہ غلطی واقع ہوئی ہے اور اب تک بھی اکثر خدا کے بندے

---

۵۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ قرآن کی ان آیتوں میں مفصلاً مذکور ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ اعراف پارہ ۹) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے دس (راتیں اور بڑھا کر ان) سے تیس کو پورا (چالیس) کر دیا اور یوں پروردگار موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا (چلہ) ہو گیا ف ل اور موسیٰ کوہِ طور پر جاتے وقت اپنے بھائی ہارون سے کہنے لگے کہ میری قوم (کے لوگوں) میں میری نیابت کرتے رہنا اور (ان میں میل جول (قائم) رکھنا اور مفسدوں کے رستے نہ چلنا اور جب موسیٰ ہمارے وعدے کے مطابق (کوہِ طور پر) حاضر ہوئے اور ان کا پروردگار ان سے ہمکلام ہوا تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار تو (اپنے تئیں) مجھے دکھا کہ میں تیری طرف ایک نظر دیکھوں (خدا نے) فرمایا تم ہم کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے مگر ہاں (ایسا ہی شوق ہے تو سامنے کے اس) پہاڑ پر نظر کرو (کہ ہم اس پر جلوہ فرما ہوں گے) پس اگر یہ پہاڑ) اپنی جگہ ٹھیرا رہا تو (جاننا کہ) ہم کو (بھی) دیکھ سکو گے پھر جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ فرما ہوا تو اس کو چکنا چور کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو بول اٹھے کہ (اے پروردگار) تیری ذات پاک ہے میں (تجھے دیکھنے کی بے جا درخواست کی تھی) تیری جناب میں (اس سے) توبہ کرتا ہوں اور (تجھ پر) ایمان لانے والوں میں پہلا ایمان لانے والا بندہ میں ہوں"۔

ف ل موسیٰ علیہ السلام سے خدا نے وعدہ کیا تھا کہ تم کوہِ طور پر آکر ایک مہینے تک عبادت (الٰہی) کرو تو ہم تم کو توریت عنایت کریں گے یہ شاید اسی طرح کی خلوت تھی جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے غارِ حرا میں کیا کرتے تھے۔ بہرکیف پھر خدا نے ایک مہینے کا چلہ کر دیا تاکہ موسیٰ اپنا پورا تزکیہ کر لیں چنانچہ چلہ پورا ہوتے ہی ان کو توریت ملی اور خدا سے رخصت ہوئے ۱۲۔

(نوٹ متعلقہ صفحہ ۳۸۴)

اِسی غلطی میں مُبتلا ہیں کہ اُنھوں نے خدا کو اپنے حواسِ ظاہر کے ذریعے سے معلوم کرنا چاہا اور جب اُن کو اس راہ سے
میں کامیابی نہ ہوئی تو مَن مانا خدا فرض کیا۔ اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ[51] اور اُس کو اپنے اوہامِ باطلہ کا تختۂ مشق بنایا یعنی ذلیل
سے ذلیل اور رذیل سے رذیل مخلوقات کو بھی پورا یا ادھورا خدا بنانے یا ماننے میں تامّل نہیں کیا۔ پھر اُلوہیت اور دعوے
کے یہ معنی کہ اپنے زعم میں خدائی کے اختیار خدا سے چھین کر نااہلوں کے حوالے کیے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ
خدا کو منصبِ خدائی سے معزول کر دیا جس جس طرح پر خدا کے بندوں نے خدا کی جناب میں گستاخیاں اور بے
ادبیاں کی ہیں اور کر رہے ہیں ناگفتہ بہ ہیں۔ کوئی تو اُس کی ذات پر حملے کرتا ہے کہ ایک نہیں دو خدا ہیں ایک پیدا کرتا ہے
اور دوسرا مارتا ہے۔ ایک خالقِ خیر ہے اور دوسرا خالقِ شر۔ کوئی کہتا ہے کہ تین خدا ہیں۔ اور پھر وہ ایک بھی ہے۔ کوئی مانتا ہے کہ
ہر چیز بجائے خود خدا ہے کسی کا خیال ہے کہ خدا تو ہے مگر وہ اسباب کا سلسلہ قائم کر کے آپ انتظامِ دنیا سے دست کش ہو بیٹھا
ہے اِن کے نزدیک دنیا ایک طرح کی گھڑی ہے اور خدا گھڑی ساز۔ جس نے اس کو بنا کر کوک دیا ہے اور گھڑی آپ ہی چل رہی
ہے ذات تو ذات خدا کی صفات میں اس سے بڑھ کر بیہودگی کی جاتی ہے غرض بندوں نے اتنے خدا بنا ڈالے کہ ایک
خدا کے حصّے میں پورا ایک بندہ بھی نہیں آتا۔ اور یہ نہ سمجھے کہ خدائے واحد کے سوائے کوئی اَور خدا بھی ہوتا تو دو باسن
ایک جگہ رکھے ہوئے کھٹکھٹا اُٹھتے ہیں ایسا تو کیا ہے کہ دو یا زیادہ خداؤں میں اختلاف نہ ہوا اور اختلاف ہوا تو دنیا ایک
لمحہ نہیں ٹھہر سکتی۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[52] دو بادشاہ آپس میں لڑتے ہیں تو ملک کے ملک تباہ
ہو جاتے ہیں اور خداؤں کی لڑائی تو خدا کی پناہ۔ پس دنیا کا ایک اسلوب پر چلا جانا صاف اس بات کی دلیل ہے کہ تمام
عالم میں ایک خدا کی حکومت ہے۔ اقوامِ روزگار میں دوسری قومیں خدا کے بارے میں جیسے کچھ خیالات رکھتی ہوں وہ
جانیں اور اُن کی عقلیں ہم کو تو بڑا خیال مسلمانوں کا ہے کہ ان کے ہاں بڑا زور توحید پر ہے مگر افسوس انھوں نے مشرکوں
کی کوئی ادا نہ چھوڑی جس کی نقل نہ کی ہو اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ[53] وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ
هُمْ مُّشْرِكُوْنَ[54] اس کو ہر شخص اپنی جگہ سمجھ لے معاملہ خدا کے ساتھ ہے[55] يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ

عذرت ار پیش مے رود با ما   با خداوندِ غیب داں نہ رود

خدا کے بارے میں اسلامی عقیدہ ایسا سیدھا اور صاف ہے کہ اس سے زیادہ سیدھا اور صاف عقیدہ ہو نہیں سکتا
اسلام مخلوقات سے خدا کی ذات و صفات کا پتہ چلاتا ہے۔ اور یہی وہ رستہ ہے جسے موصل الی المطلوب کہہ سکتے ہیں مخلوقات
سے ہم کو اتنی بات کا پتہ چلتا ہے کہ کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہے اور وہ کوئی ان چیزوں میں سے
نہیں جن کو ہم معلوم کر سکتے ہیں بس سوائے اس کے ہم خدا کی ذات کے بارے میں اَور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور
عقلِ انسانی کی رسائی یہیں تک ہے۔

[51] اپنی خواہشِ (نفسانی) کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ۱۲ [52] اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اَور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے ۱۲ [53] مگر جو خدا چاہے۔ اور وہ تھوڑے سے ہیں ۱۲ [54] اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں ۱۲ [55] خدا آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور اُن (بھیدوں) کو (بھی) جو (لوگوں کے) سینوں میں پوشیدہ ہیں ۱۲

اَب رہیں صفات تو کارخانۂ عالم اور اُس کے انتظام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہی کہ اس کا بنانے والا اور اس کے انتظام کا چلانے والا ان صفتوں سے متّصف ہو یعنی اُس میں وہ کمالات ہوں جو اُس کے صفاتی ناموں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا کے ننانویں نام ہیں جو نو۹۹ نام کرکے مشہور ہیں ان میں سے ایک نام اللہ اسم ذات مان لیا گیا ہی۔ اگرچہ معبود ہونے کی حیثیت سے اللہ کو بھی اسمِ صفت کہہ سکتے ہیں۔ مگر آخر اتنے سارے صفاتی نام ہوں تو کوئی اسمِ ذات بھی ہونا چاہیئے اور وہ اللہ ہی باقی رہے اٹھانویں نام وہ کسی نہ کسی صفت پر دلالت کرتے ہیں۔ اسمائے صفاتی کے بارے میں بھی ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفتیں بھی خدا میں ہونی ضرور ہیں۔ بس اس سے زیادہ ہم اُس کے صفات کی توضیح نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا سمیع ہی سب کی سُنتا ہی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو علم ہم بنی آدم کو حاسۂ سمع کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہی وہ علم علیٰ وجہ الکمال خدا کو بھی ہی نہ یہ کہ ہماری طرح کے اُس کے کان ہیں ہمارے سُننے کا تو یہ حال ہی کہ بولنے والا آواز کے ذریعے سے ہوا میں تموّج پیدا کرتا ہی اور وہ تموّج کان کے پردے سے ٹکراتا اور ہم کو آواز کا علم ہو جاتا ہی خدا اس طرح کا علم تو رکھتا ہی مگر وہ بے نیاز کان کا اور ہوا کے تموّج کا محتاج نہیں اور اسی پر قیاس کی دوسری صفتوں کو قیاس کر لو یہ صفتیں ہم نے اپنے اُوپر قیاس کرکے خدا میں مان لی ہیں مگر ہماری صفات ناقص خدا کی کامل و اکمل۔ جیسے ذرّے کی چمک اور آفتاب کی جگمگاہٹ + مزید توضیح کے لیئے اسمائِ حسنیٰ کے تین نقشے درج کتاب ہوتے ہیں

ان نقشوں کے ذریعے سے خدا کے اسماءِ ذاتی و صفاتی معلوم ہوں گے اور یہ بھی کہ خدا کے کون کون اسماء ایسے ہیں جو قرآن میں بعینہا تو مذکور نہیں مگر اُن کے مادّے اور مشتقات مذکور ہیں اور نیز اسماء کے تراجم اُردو بھی معلوم ہوں گے +

نمبر شمار	اسماءِ عربی	ترجمۂ اُردو	کیفیت
۱	اَللّٰہُ	خدا ۔ معبود	اگرچہ لفظ اللہ میں وصفی معنی موجود ہیں اور اس اعتبار سے اس کو بھی اسماءِ صفات میں ہونا تھا مگر سب نے اجماع کرکے اس کو اسمِ ذات قرار دیا ہی ۔
۲	اَلرَّحْمٰنُ	نہایت رحم والا	دونوں مبالغے کے وزن ہیں مگر رحمٰن ابلغ ہی کیونکہ دنیا اور آخرت دونوں کی رحمت کو شامل
۳	اَلرَّحِیْمُ	بہت مہربان	اور صرف خدا کی مقدس ذات کے ساتھ مخصوص ہی ۔
۴	اَلْمَلِکُ	بادشاہ	ملک اخص اور ابلغ ہی مالک سے یعنی دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہی یہی وجہ ہی کہ ہر ملک کو مالک تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر مالک کو ملک نہیں کہہ سکتے
۵	اَلْقُدُّوْسُ	تمام عیبوں سے پاک	
۶	اَلسَّلَامُ	تمام نقصانات سے محفوظ	یہ اصل میں مصدر ہی بمعنی سلامت مگر یہاں سالم کے معنی ہیں یعنی [illegible] کی ذات ہر طرح کے عیب اور نقصان سے سالم اور محفوظ ہی ۔
۷	اَلْمُؤْمِنُ	اپنے وعدے میں سچا یا اپنے فرمانبرداروں کو امن دینے والا	لفظ مؤمن کا ماخذ امن و امان ہی یا ایمان ۔ اگر امن و امان ہی تو [illegible] کے معنی ہوئے امن دینے والا یعنی دنیا میں [illegible] اسباب امن کا مہیا کرنے والا یا عقبیٰ میں نیکوکاروں کو عذاب سے امان میں رکھنے والا اور اگر ماخذ ایمان ہی تو مؤمن کے معنی ۔
۸	اَلْمُهَيْمِنُ	نگہبان ۔ یا گواہ	المہیمن کا لفظ وہی المؤمن ہی ۔ المؤمن باب افعال سے ہی اور المہیمن باب مفاعلہ سے تو المہیمن اصل میں المؤامن تھا دو ہمزے ہمزے میں قاعدۂ تلیین جاری کرکے اسے یے سے بدل لیا اور پہلے ہمزے کو ہے سے معنا المؤمن اور المہیمن ایک ہیں

نمبر شمار	اسماء عربی	ترجمۂ اردو	کیفیت
۹	اَلْعَزِیْزُ	غالب۔ قوی۔ قاہر	اصل میں عزیز اُسے کہتے ہیں جس کی بارگاہ میں بآسانی پہنچنا ممکن نہ ہو
۱۰	اَلْجَبَّارُ	بڑا دباؤ والا	جبار مبالغے کا صیغہ ہے جبر سے مشتق اور جبر کے اصلی معنی ہیں ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا۔ اور کسی کے حال کی اصلاح کرنا اور کسی کو زور و غلبہ سے کسی کام پر آمادہ کرنا۔ پہلی صورت میں یہ اسم جمالی ہوگا اور دوسری میں جلالی
۱۱	اَلْمُتَکَبِّرُ	عظمت و بزرگی والا	تکبر اور استکبار کہتے ہیں گردن کشی کرنے اور بزرگی ظاہر کرنے کو اور ایک لفظ ہے کبریا جس کے معنی ہیں بزرگی۔ یہاں متکبر سے مراد ہے کمال بزرگی والا۔
۱۲	اَلْخَالِقُ	ہر چیز کا پیدا کرنے والا	خالق۔ اور باری اور مصور تینوں مترادف المعنی ہیں یعنی تینوں کے معنی ہیں پیدا کرنا۔ اختراع کرنا مگر باعتبار استعمال ہر ایک کے ساتھ ایک خصوصیت جداگانہ ہے مثلاً خلق مستعمل ہوتا ہے کسی چیز کے وجود میں لانے سے پیشتر اس کے اندازہ کرنے میں اور برأ ایجاد کرنے میں اور تصویر صورت بنانے اور ہیئت بخشنے میں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے وہ محتاج ہوتی ہے۔ اولاً اندازہ کرنے کی۔ ثانیاً پیدا کرنے کی ثالثاً صورت بنانے کی۔
۱۳	اَلْبَارِیُٔ	ہر چیز کا موجد	
۱۴	اَلْمُصَوِّرُ	مخلوقات کی طرح طرح کی صورتیں بنانے والا	
۱۵	اَلْغَفَّارُ	بہت بخشنے والا	مبالغہ ہے غافر کا اور ایک ہے غفور یہ بھی مبالغے کا صیغہ ہے مگر اس میں غفار کی بہ نسبت مبالغہ زیادہ ہے اسی وجہ سے دونوں کو الگ الگ ذکر کیا گیا غفار لیا گیا ہے غفران اور مغفرت سے جس کے معنی ہیں بخشنا مگر بمعنی ستر۔
۱۶	اَلْقَهَّارُ	زبردست یا غلبہ رکھنے والا	[illegible]
۱۷	اَلْوَهَّابُ	بخشش و عطا کرنے والا	وہب اور ہبہ کہتے ہیں بخشنے اور عطا کرنے کو یعنی بہت بخشش۔ وہاب مبالغہ ہے یعنی کثیر الہبہ دائم العطاء۔
۱۸	اَلرَّزَّاقُ	مخلوقات کو روزی پہنچانے والا	یہ بھی رازق کا مبالغہ ہے یعنی خدا تعالیٰ تمام مخلوق کو مناسب حال اور موافق حکمت رزق پہنچاتا ہے۔ رزق کی دو قسمیں ہیں محسوس اور معقول محسوس ابدان کے لیے اور معقول ارواح کے واسطے۔
۱۹	اَلْفَتَّاحُ	مشکل کشا یا بندوں میں حکم کرنے والا	فتح کے معنے کھولنے اور حکم کرنے کے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحمت کے دروازے کھولتا ہے اور وہ خلائق میں حاکم علی الاطلاق ہے۔
۲۰	اَلْعَلِیْمُ	بہت جاننے والا	مبالغہ ہے عالم کا یعنی خدا تعالیٰ ظاہر و پوشیدہ بلکہ خطرات دل تک کا جاننے والا ہے۔
۲۱	اَلْقَابِضُ	بندوں کی روزی تنگ کرنے والا	قبض و بسط دونوں اسم متضاد ہیں قبض کہتے ہیں تنگی و کم کرنے کو اور بسط فراخی و کشائش کو یعنی خدا جس کی روزی چاہتا تنگ کرتا۔ (اور جس کی چاہتا فراخ کرتا ہے)
۲۲	اَلْبَاسِطُ	بندوں کی روزی فراخ کرنے والا	قبض و بسط کے یہ معنی بھی ہیں کہ سوتے میں لوگوں کی روحیں قبض کرتا اور بیداری کے وقت بسط کرتا ہے۔
۲۳	اَلْخَافِضُ	نافرمانوں کو پست کرنے والا	خفض ضد ہے رفع کی۔ کیونکہ خفض کہتے ہیں پست کرنے کو اور رفع بلند کرنے کو۔ خدا کے خافض و رافع ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے فرمانبرداروں کو قرب کی دولت عطا فرما کر انہیں بلند کرتا اور نافرمانوں کو بارگاہ عالی سے دور کر کے پستی میں ڈالتا ہے۔
۲۴	اَلرَّافِعُ	فرمانبرداروں کو بلند کرنے والا	
۲۵	اَلْمُعِزُّ	عزت دینے والا	اعزاز کہتے ہیں عزیز کرنے کو اور اذلال خوار و ذلیل کرنے کو یعنی خدا جسے چاہتا عزیز کرتا دنیا میں توفیق طاعت دے کر اور عقبیٰ میں علو مرتبت اور نعیم جنت عطا فرما کر اور جسے چاہتا ذلیل کرتا دنیا میں توفیق طاعت سلب کر کے اور آخرت میں اسفل سافلین میں داخل کر کے امام غزالی کا قول ہے کہ ان لفظوں کے معنی یہ ہیں کہ خدا جسے چاہتا ملک دیتا اور جس سے چاہتا چھین لیتا ہے۔
۲۶	اَلْمُذِلُّ	ذلیل کرنے والا	
۲۷	اَلسَّمِیْعُ	بہت سننے والا	
۲۸	اَلْبَصِیْرُ	بہت دیکھنے والا	
۲۹	اَلْحَکَمُ	حقیقی حاکم	

نمبر شمار	اسماء عربی	ترجمہ اردو	کیفیت
۳۰	اَلْعَدْلُ	منصف یعنی فیصلے میں ظلم نہ کرنے والا	یہ ضد ہی ظلم کی اور کبھی استقامت اور اعتدال اور ایک چیز کو ایک چیز کے برابر کرنے کے معنی میں بھی آتا ہی اور ظاہر ہی کہ خدا جور و ظلم سے منزہ ہی کیونکہ ملک غیر میں تصرف کرنے کو ظلم کہتے ہیں اور عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ملک سے خارج ہو۔
۳۱	اَللَّطِيْفُ	باریک بین	لطف کہتے ہیں کسی کام میں نرمی کرنے کو اور کبھی نیکی کرنے کے معنے میں بھی آتا ہی۔ لطیف کے معنے باریک بین کے بھی ہیں۔
۳۲	اَلْخَبِيْرُ	آگاہ۔ دانا۔ عالم عارف	مشتق ہی خبر سے اور خبر کے معنی ہیں آگاہی کے خبیر آگاہ اور دانا یعنی ملک و ملکوت میں کوئی چیز متحرک و ساکن نہیں ہوتی اور زمین و آسمان میں کوئی ذرہ مضطرب و مطمئن نہیں ہوتا اور کون و مکان میں کوئی سانس نہیں لیتا مگر خدائے تعالیٰ شانہ
۳۳	اَلْحَلِيْمُ	بردبار	حلم آہستگی اور بردباری۔ حلیم اُسے کہتے ہیں جو مغلوب الغضب نہ ہو اور انتقام لینے میں جلدی نہ کرے بلکہ باوجود اقتدار کے عفو و درگزر سے کام لے خدا کو حلیم اس لیئے کہتے ہیں کہ وہ گنہگار بندوں کی تادیب و تعذیب میں جلدی نہیں کرتا۔
۳۴	اَلْعَظِيْمُ	بزرگ۔ بڑا	عظم و عظمت بزرگ ہونا خواہ کسی اعتبار سے بھی [illegible]
۳۵	اَلْغَفُوْرُ	بہت بخشنے والا	غفار کے معنی میں ہی اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں مگر غفور میں زیادہ مبالغہ ہی یعنی جو بڑے بڑے گناہ بخشے اور اس کی بخشش اتم و اکمل ہو دوسرے معنے یہ ہیں کہ بندوں کے گناہ اعمالناموں سے محو کر دے یعنی حساب کے لیے مواخذہ نہ کرے۔
۳۶	اَلشَّكُوْرُ	بڑا قدر شناس	
۳۷	اَلْعَلِيُّ	بہت اونچا	مشتق ہی علو سے اور علو کہتے ہیں بلندی کو اور جگہ کے بلند ہونے کو اور کبھی بلندی پر چڑھنے اور کسی چیز کے اوپر ہونے کو بھی علو کہتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں حسّی اور عقلی حسّی جیسے ایک جسم کا دوسرے جسم پر ہونا اور عقلی جیسے [illegible]
۳۸	اَلْكَبِيْرُ	بڑا۔ بزرگ	[illegible]
۳۹	اَلْحَفِيْظُ	نگہبان	حفظ کہتے ہیں۔ نگاہ رکھنے کو اور خدا تعالیٰ چونکہ تمام مخلوق کو آفت و بلا سے محفوظ رکھتا ہی اس لیئے اُسے حفیظ کہتے ہیں
۴۰	اَلْمُقِيْتُ	مخلوق کو قوت یعنی روزی پہونچانے والا	ماخوذ ہی قوت سے اور قوت کہتے ہیں اُس خورش کو جو بدن انسان کے قیام کا باعث ہو اور اقاتت کے معنی قوت دینا اور کبھی مقیت توانا اور گواہ اور حاضر اور نگاہ رکھنے والے کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہی۔
۴۱	اَلْحَسِيْبُ	کافی	معنی میں ہی محسب کے اور احساب کہتے ہیں کسی چیز کا کافی ہونا اور کہتے ہیں احسبنی اشیٔ یعنی مجھے یہ چیز کافی ہو گئی اور بعض علماء کہتے ہیں کہ معنی میں ہی محاسب کے جیسے جلیس معنی میں مجالس کے اور ندیم منادم کے یعنی خدا تعالیٰ قیامت کے روز۔۔
۴۲	اَلْجَلِيْلُ	بزرگ قدر	جلال اور جلالت کہتے ہیں بزرگ قدر ہونے اور نیز بزرگی کو۔ پھر اصطلاح قوم میں صفات قہریہ کے ظہور آثار کو جلال کہتے ہیں اور صفات لطفیہ کے ظہور آثار کو جمال اور بولنے میں آتا ہی کہ فلاں اسماء جلالی ہیں اور فلاں جمالی
۴۳	اَلْكَرِيْمُ	بزرگ	اس کے معنی ہیں بزرگ اور عزیز۔ کہتے ہیں کریم وہ ہی کہ قادر ہو تو معاف کر دے وعدہ کرے تو وفا کرے اور دے تو امید سے زیادہ دے اور کوئی اُس کی طرف التجا لے جائے تو اُسے ضائع نہ ہونے دے کبھی مکرم اور جواد کے معنی میں بھی آتا ہی۔
۴۴	اَلرَّقِيْبُ	نگہبان	رقیب نگہبان اور موکل اور نگران کذا فی الصراح۔
۴۵	اَلْمُجِيْبُ	دعا قبول کرنے والا	اجابت کہتے ہیں جواب دینے اور اجابت دعا کرنے کو یعنی جو شخص خدا کو بلاتا ہی وہ اُسے جواب دیتا اور دعا کو قبول کرتا ہی سوال کو رد نہیں کرتا۔
۴۶	اَلْوَاسِعُ	وسیع المعلومات یا وسیع الغنا	ماخوذ ہی سعت سے اور سعت کہتے ہیں فراخی اور فراخ کرنے اور کشادہ ہونے کو پھر اس کی اضافت کبھی تو علم کی طرف ہوتی ہی اور کہتے ہیں خدا کا علم وسیع و محیط ہی معلومات کو اور کبھی احسان کی طرف تو لا کر کہتے ہیں اُس کا احسان وسیع ہی۔
۴۷	اَلْحَكِيْمُ	حقائق اشیاء کا عالم	مشتق ہی حکمت سے اور حکمت عبارت ہی کمال علم اور حسن عمل اور اتقان اور احکام علم و عمل سے بعضے کہتے ہیں حکیم مبالغہ ہی حاکم کا اور حکیم وہ ہی جو حقائق اشیاء کا عالم ہو اور ہر شئے کے دقائق کو خوب جانتا ہی۔
۴۸	اَلْوَدُوْدُ	نیک بندوں کو دوست رکھنے والا	مبالغے کا صیغہ ہی وزن پر فعول کے وُدّ و وِدّ (بضم واو) اور وَدّ (بکسر واو) اور مودت کے معنی ہیں دوست رکھنے کے یعنی خدا تعالیٰ نیک بندوں کو دوست رکھتا ہی۔
۴۹	اَلْمَجِيْدُ	بزرگ۔ شریف	ماجد کا مبالغہ ہی اور ماجد۔ مجد سے لیا گیا ہی۔ مجد بزرگی۔ مجید بزرگ کذا فی الصراح بعضے کہتے ہیں مجید وہ ہی جس کی ذات شریف افعال جمیل عطا جزیل ہی اور جب یہ ہی تو مجید جامع ہی اسم جلیل اور وہاب اور کریم کو۔
۵۰	اَلْبَاعِثُ	مُردوں کو مرنے کے پیچھے اُٹھا کھڑا کرنے والا	بعث کہتے ہیں مُردوں کو قبروں سے اُٹھا کھڑا کرنے کو اور کبھی سوتے کو جگانے اور کسی کو کسی کام کے لیئے بھیجنے کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہی۔

نمبر شمار	اسماء عربی	ترجمہ اُردو	کیفیت
۷۲	اَلْمُؤَخِّرُ	دشمنوں کو اپنے لطف سے پیچھے ہٹانے والا	آگے بڑھانا اور نا قابلوں کو درگاہِ عزت سے دور کرنا اور پیچھے ہٹانا ہی یاد رہے کہ مدارج میں ترقی تو حصول مطالب میں تقدیم و تاخیر امور کے کرنے سے ہوتی ہی۔
۷۳	اَلْأَوَّلُ	سب سے پہلا	اوّل ہو یعنی ازلی ہو کہ اُس کے وجود کی ابتدا و ہستی کا آغاز نہیں اور آخر ہو یعنی دائمی ابدی ہو کہ اُس کی بقا کے لیے نہایت اور دوام کے لیے انقضا نہیں۔
۷۴	اَلْآخِرُ	سب سے پچھلا	
۷۵	اَلظَّاهِرُ	آشکارا ہو بلحاظ قدرت	خدا ظاہر ہو اس کا یہ مطلب ہو کہ اس کا وجود اس کی ہستی اُن آیات و دلائل سے ظاہر ہو جو آسمان و زمین میں ہر صاحب بصیرت کو دکھائی دیتے ہیں اور خدا کے باطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی کنہ ذات حجاب جلال میں محتجب پوشیدہ ہے۔
۷۶	اَلْبَاطِنُ	پوشیدہ ہو باعتبار ذات	
۷۷	اَلْوَالِيُ	تمام امور کا متولی	ولایت بکسر واو تو مشتق ہو جس کے معنے تصرف کرنے اور قادر ہونے کے ہیں اور ایک ہو ولایت بفتح واو جس کے معنی مدد کرنے اور نگرانی کرنے کے ہیں بعضے کہتے ہیں کہ ولایت بفتح واو مصدر ہو اور بکسر اسم۔ والی وہ جو سب کا مالک اور تمام کاموں کا متولی ہو۔
۷۸	اَلْمُتَعَالِي	مخلوقات کی صفات سے منزہ	تمام حکمرانوں اور حالات سے بلند قدر یا تمام نقائص و آفات سے عالیشان۔
۷۹	اَلْبَرُّ	اپنے لطف سے بندوں کے ساتھ نیکی کرنے والا	بَرّ بفتح با اسم فاعل یعنی نیکی کرنے والا [illegible]
۸۰	اَلتَّوَّابُ	گنہگاروں کی توبہ قبول کرنے والا	تواب مبالغہ ہی تائب کا اور تائب ماخوذ ہی توبہ سے۔ توبہ کے اصلی معنی ہیں رجوع کرنے کے پھر جب اس کی نسبت بندوں کی طرف ہوتی ہی تو گناہ سے رجوع کرنا مراد ہوتا ہی اور خدا کی طرف ہوتی ہی تو رحمت کے ساتھ رجوع کرنا یعنی بندے کی توبہ کو قبول کرنا۔
۸۱	اَلْمُنْتَقِمُ	نافرمانوں سے بدلا لینے والا	انتقام کہتے ہیں بدلہ لینے کو یعنی خدا تعالیٰ کافروں سے اپنی نافرمانی کا بدلہ لینے والا۔ اور اُن کے تمرد اور سرکشی کی سزا دینے والا
۸۲	اَلْعَفُوُّ	گناہوں کا مٹانے والا	
۸۳	اَلرَّؤُفُ	بہت شفقت کرنے والا	رأفت کہتے ہیں شدت رحمت کو اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہی جیسے حَذِرٌ اور شَکُورٌ
۸۴	مَالِكُ الْمُلْكِ	ملک کا مالک	
۸۵	ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ	بزرگی و عزت والا	
۸۶	اَلْمُقْسِطُ	عادل و منصف	اس کا مادہ ہی قسط اور قسوط کہتے ہیں جور و ظلم کو لیکن جب اسے باب افعال میں لے گئے تو معنی ہوئے جور و ظلم کے ازالہ کرنے کے اور ازالۂ جور و ظلم کا نام ہی انصاف تو مقسط کے معنی ہوئے منصف۔ عادل۔
۸۷	اَلْجَامِعُ	تمام مخلوقات کو جمع کرنے والا	قیامت میں خدا لوگوں کو جمع کرے گا یا دنیا میں بچھڑے ہوؤں کو جمع کرتا ہی۔
۸۸	اَلْغَنِيُّ	بے پروا	غنی مشتق ہی غنا سے اور غنا کہتے ہیں بے نیاز ہونے کو یعنی خدا تعالیٰ سب سے بے نیاز ہی اور مغنی لیا گیا ہی اغنا سے جس کے معنی ہیں بے نیاز کرنا یعنی وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہی بے نیاز کرتا ہی کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی طرف حاجت نہیں لے جاتا یعنی جو مال وار کے معنی میں مشہور ہی وہ بھی بے نیازی کی ایک شاخ ہی۔
۸۹	اَلْمُغْنِي	لوگوں کو بے پروا کرنے والا	
۹۰	اَلْمُعْطِي	عطا کرنے والا	معطی دینے والا۔ اور مانع روک رکھنے والا۔ یعنی جسے چاہے اور جو چاہے دیتا اور جسے چاہے نہیں دیتا۔
۹۱	اَلْمَانِعُ	اپنے دوستوں سے تکلیف روکنے والا	
۹۲	اَلضَّارُّ	ضرر و شر کا خالق	یعنی خدا خالق خیر و شر اور نفع و ضرر ہی اور درد۔ دوا۔ رنج و شفا۔ گرمی و سردی

نمبر شمار	اسماء عربی	ترجمہ اردو	کیفیت
۹۳	النَّافِعُ	نفع وخیر کا پیدا کرنے والا	خشکی وتری سب پیدا کی ہوئی اُسی کی ہیں۔
۹۴	النُّوْرُ	روشن کرنے والا	عرفِ عام میں نور کہتے ہیں روشنی کو خدا پر نور کا اطلاق اس سے کیا گیا کہ زمین و آسمان میں اُسی کا چاندنا اور اُسی کا ظہور ہے
۹۵	البَدِیْعُ	موجد	بدیع بے مثل اور بے مانند۔ کبھی معنی میں مبدع یعنی موجد کے بھی آتا ہے جو بے نمونہ دیکھے از خود اختراع کرے تو اس معنی کر بھی خدا بدیع ہے کہ اُس نے جہان کے بنانے میں کسی کی تقلید نہیں کی۔
۹۶	البَاقِیْ	باقی رہنے والا	دائم الوجود جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔
۹۷	الوَارِثُ	فنائے موجودات کے بعد باقی رہنے والا	اس سے مراد ہے فنائے موجودات کے بعد باقی رہنے والا گویا تمام مرنے والوں کی میراث اُس کو پہنچتی ہے
۹۸	الرَّشِیْدُ	صاحبِ رُشد	رُشد ضد ہے غی کی اور غی کے معنی ہیں گمراہی تو رشید کے معنی ہوئے صاحبِ رُشد اور خدا کو رشید اس معنی کر کہا گیا کہ طریقِ اسلام اُس کو پسند ہے اور وہی صراطِ مستقیم ہے یا اس اعتبار سے کہ جو صفات کمالیہ خدا میں ہونی چاہئیں وہ اُس میں ہیں۔
۹۹	الصَّبُوْرُ	بڑا صبر کرنے والا	اصل میں صبر کے معنی تحمل اور برداشت کرنے کے ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ بندوں کی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی برداشت کرتا اور انتقام اور مواخذے میں جلدی نہیں کرتا اس لیے اُس کا نام صبور رکھا گیا۔

یہ اسماء صفاتی جنھیں اسماء حسنیٰ بھی کہتے ہیں اکثر تو بجنسہٖ قرآن سے لیے گئے ہیں اور بعض جو بعینہٖ قرآن میں موجود نہیں ہیں اُن کے مادے اور مشتقات قرآن میں مذکور ہیں۔ چنانچہ دونوں قسم کے اسماء کے دو نقشے دیے جاتے ہیں۔ جن سے صاف طور پر معلوم ہوسکے گا کہ کون اسماء بعینہٖ قرآن میں موجود ہیں اور کن کے مشتقات مذکور ہیں۔

اَللّٰہُ اَلرَّحْمٰنُ اَلرَّحِیْمُ .... والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم ..... (بقرہ ع ۲۰)

اَلْمَلِکُ اَلْقُدُّوْسُ اَلسَّلَامُ اَلْمُؤْمِنُ اَلْمُھَیْمِنُ اَلْعَزِیْزُ اَلْجَبَّارُ اَلْمُتَکَبِّرُ ... ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر .... (حشر ع ۳)

اَلْخَالِقُ اَلْبَارِئُ اَلْمُصَوِّرُ .... ھو اللہ الخالق البارئ المصور ..... (حشر ع ۳)

اَلْغَفَّارُ .... ربّ السموات والارض وما بینھما العزیز الغفار ..... (ص ع ۵)

اَلْقَھَّارُ .... قل انما انا منذر وما من الٰہ الا اللہ الواحد القھار .... (ص ع ۵)

اَلْوَھَّابُ ..... ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (ال عمران ع ۱)

اَلرَّزَّاقُ .... ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین .... (ذاریات ع ۳)

اَلْفَتَّاحُ اَلْعَلِیْمُ .... ثم یفتح بیننا بالحق وھو الفتاح العلیم .... (سبا ع ۳)

اَلسَّمِیْعُ .... ولہ ما سکن فی اللیل والنھار وھو السمیع العلیم ..... (انعام ع ۲)

اَلْبَصِیْرُ .... واللہ بصیر بالعباد .... (ال عمران ع ۱)

اَللَّطِیْفُ اَلْخَبِیْرُ ...... وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر .... (انعام ع ۱۳)

اَلْحَلِیْمُ .... یتبعھا اذی واللہ غنی حلیم .... (بقرہ ع ۳۶)

اَلْعَظِیْمُ .... ولا یئودہ حفظھما وھو العلی العظیم .... (بقرہ ع ۳۴)

اَلْغَفُوْرُ الشَّکُوْرُ ...... لیوفیہم اجورہم ویزیدہم من فضلہ انہ غفور شکور .... (فاطر ع۴)

اَلْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ .... قالوا الحق وھو العلی الکبیر .... (سباع۳)

اَلْحَفِیْظُ .... ان ربی علی کل شیٔ حفیظ .... (ھود ع۵)

اَلْمُقِیْتُ .... وکان اللہ علی کل شیٔ مقیتا .... (النساء ع۱۱)

اَلْحَسِیْبُ .... ان اللہ کان علی کل شیٔ حسیبا .... (النساء ع۱۱)

اَلْکَرِیْمُ .... ومن کفر فان ربی غنی کریم .... (النمل ع۳)

اَلرَّقِیْبُ .... ان اللہ کان علیکم رقیبا .... (النساء ع۱)

اَلْمُجِیْبُ .... ان ربی قریب مجیب .... (ھود ع۶)

اَلْوَاسِعُ .... ان ربک واسع المغفرۃ .... (نجم ع۲)

اَلْوَدُوْدُ .... وھو الغفور الودود .... (بروج ع۱)

اَلْمَجِیْدُ .... رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت انہ حمید مجید .... (ھود ع۷)

اَلشَّھِیْدُ .... وانت علی کل شیٔ شھید .... (مائدہ ع۱۶)

اَلْحَقُّ .... ثم ردوا الی اللہ مولٰھم الحق .... (انعام ع۸)

اَلْوَکِیْلُ .... وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل .... (اٰل عمران ع۱۸)

اَلْقَوِیُّ .... اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء وھو القوی العزیز .... (الشوریٰ ع۲)

اَلْمَتِیْنُ .... ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین .... (ذاریات ع۳)

اَلْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ .... وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید .... (شوریٰ ع۳)

اَلْمُحْیِیْ .... ان ذٰلک لمحی الموتٰی وھو علی کل شیٔ قدیر .... (روم ع۵)

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ .... الم۔ اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم .... (اٰل عمران ع۱)

اَلْوَاحِدُ .... وما من الٰہ الا اللہ الواحد القہار .... (صٓ ع۵)

اَلصَّمَدُ .... قل ھو اللہ احد اللہ الصمد .... (اخلاص ع۱)

اَلْقَادِرُ .... قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم .... (انعام ع۸)

اَلْمُقْتَدِرُ .... فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر .... (قمر ع۳)

اَلْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاھِرُ الْبَاطِنُ ...... ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم ...... (حدید ع۱)

اَلْمُتَعَالِیْ .... عالم الغیب والشہادۃ الکبیر المتعال[۵] .... (رعد ع۱۵)

اَلْبَرُّ .... انہ ھو البر الرحیم .... (طور ع۱)

اَلتَّوَّابُ .... انک انت التواب الرحیم .... (بقرہ ع۱۵)

---

[۵] اصل میں المتعالی تھا رعایت سجع کی وجہ سے یے حذف ہوگئی ۱۲

اَلعَفُوُّ .... ان اللہ کان عفوا غفورا .... (النساء ع ۲۲)

اَلرَّؤُوفُ .... ان اللہ بالناس لرؤف رحیم .... (بقرہ ع ۱۷)

مَالِكُ المُلْكِ ... قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء الخ .... (آل عمران ع ۳)

ذُوالجَلَالِ وَالاِكْرَامِ ..... تبارک اسم ربک ذی الجلال والاکرام .... (الرحمٰن ع ۳)

اَلجَامِعُ .... ربنا انک جامع الناس لیوم لا ریب فیہ .... (آل عمران ع ۱)

اَلغَنِیُّ .... واللہ غنی حلیم .... (بقرہ ع ۳۶)

اَلنُّورُ .... اللہ نور السموات والارض .... (النور ع ۵)

اَلحَكِیمُ .... یموسیٰ انہ انا اللہ العزیز الحکیم .... (النمل ع ۱)

اَلوَالِی .... مالہ من دونہ من وال .... (رعد ع ۲)

ذیل کے اسماء بعینہٖ قرآن میں موجود نہیں مگر اُنکے مشتقات مذکور ہیں

اَلقَابِضُ اَلبَاسِطُ ..... واللہ یقبض ویبسط والیہ ترجعون .... (بقرہ ع ۳۲)

اَلرَّافِعُ .... یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات .... (المجادلہ ع ۲)

اَلمُعِزُّ اَلمُذِلُّ ... وتعز من تشاء وتذل من تشاء .... (آل عمران ع ۳)

اَلحَكَمُ .... واللہ یحکم لا معقب لحکمہ .... (رعد ع ۲)

اَلبَاعِثُ .... وان اللہ یبعث من فی القبور .... (حج ع ۱)

اَلمُحصِی .... واحصیٰ کل شئ عددا .... (جن ع ۲)

اَلمُبدِئُ اَلمُعِیدُ .... انہ ھو یبدئ ویعید .... (بروج ع ۱)

اَلمُحیِی المُمِیتُ ..... واللہ یحیی ویمیت .... (آل عمران ع ۱۷)

اَلمُنتَقِمُ .... فانا منہم منتقمون .... (زخرف ع ۴)

اَلمُقسِطُ .... قائما بالقسط .... (آل عمران ع ۲)

اَلمُغنِی .... ان تکونوا فقراء یغنہم اللہ من فضلہ .... (النور ع ۴)

اَلبَاقِی .... ویبقی وجہ ربک ذی الجلال والاکرام .... (الرحمٰن ع ۱)

اَلهَادِی .... واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم .... (انعام ع ۵)

اَلصَّبُورُ .... ان فی ذلک لایت لکل صبار شکور .... (سبا ع ۲)

اَلوَارِثُ .... وانا لنحن نحی ونمیت ونحن الوارثون .... (حجر ع ۲)

ذیل میں جو اسماء مذکور ہوتے ہیں اُن کے مشتقات بھی بعینہٖ قرآن میں نہیں البتہ ان مادّے پائے جاتے ہیں

اَلخَافِضُ اَلعَدلُ اَلجَلِیلُ اَلوَاجِدُ اَلمَاجِدُ اَلمُقَدِّمُ اَلمُؤَخِّرُ اَلمُعطِی اَلمَانِعُ

اَلضَّارُّ اَلنَّافِعُ اَلرَّشِیْدُ ؛

متن المنتخب ترجمہ - جس طرح کارخانۂ عالم خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلالت کرتا ہی اور ہر بڑی چھوٹی چیز سے ثابت ہوتا ہی کہ کسی نے اُس کو بنایا اور پیدا کیا ہی اور اُسی کا نام ہی خدا اسی طرح انتظام دنیا اُن صفتوں پر دلالت کرتا ہی جن کے اعتبار سے اسمارِ صفاتی وضع کیے گئے ہیں یعنی یہ تمام صفتیں نہ ہوں تو کارخانۂ عالم کے انتظام کا چلنا ناممکن ہو جائے غرض یہی دنیا اور اس کا انتظام ہم کو خدا کی ذات وصفات کی طرف رہبری کرتا ہی - ہمارے پاس عقلی شہادۃ خدا کی ہستی کی دلیل ہی اور وہی عقلی شہادت ان صفات کے ساتھ خدا کے متصف ہونے کی - تصرفاتِ عالم پر نظر کرنے سے خدا کے صفاتی نام اَور بھی بنا لیئے جا سکتے ہیں مگر نودؔ و ۹۹ نام حدیث سے ثابت ہوئے ہیں اور اُن میں اتنی جامعیت ہی کہ دوسرے نام بنانے کی ضرورت نہیں بعض اسمار صفاتی ایسے ہیں کہ آدمی اپنے اوپر قیاس کر کے خدا کو اُن ناموں سے پکارتا ہی مگر خدا کے صفات انسانی صفات سے اعلیٰ واکمل ہیں مثلاً خدا کو سمیع وبصیر کہتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کے کان ہیں اور وہ سنتا ہی یا اُس کی آنکھیں ہیں اور وہ دیکھتا ہی بلکہ مطلب یہ ہی کہ جو علم ہم بنی نوع بشر کو سمع وبصر کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہی اُس سے کامل تر خدا کو ہی ایک بات یہ بھی ہی کہ خدا کے اسمارِ صفاتی اکثر صفتِ مشبہہ کے صیغوں میں ہیں اس واسطے کہ صفتِ مشبہہ کا صیغہ ثبات واستمرار پر دلالت کرتا ہی اور اسم فاعل کا حدوث پر سامع اور سمیع قادر اور قدیر میں تجدد اور استمرار حدوث اور ثبات کا تفاوت ملحوظ رکھنا چاہیئے -

آدمی مطلق خدا کا منکر تو ہو نہیں سکتا - اس لیئے کہ خدا نے آدمی کو عقل دی ہی اور وہ زبردستی اس سے منواتی ہی کہ ضرور کوئی زبردست اَور ہی جس نے اس مشین کو بنایا اور وُہی اس مشین کو چلا رہا ہی یہاں تک تو تمام بنی آدم کا اجماع ہی اور اجماع ہی تو ایک امرِ صحیح واقعی یقینی ہی - کاش لوگ مسلمانوں کی طرح اتنے ہی پر قناعت کرتے لیکن وہ لگے بال کی کھال نکالنے اور راہِ راست سے بھٹک گئے -

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ۔۔۔ کہ جاہا سپر باید انداختن

آدمی کو چاہیئے کہ اپنی عقل پر نازاں نہ ہو اور اُسے اُسی کی حد میں رکھے اتنی بات تو ہر ایک کو سوجھ پڑتی ہی کہ آدمی ... احتیاج پیدا ہوا ہی اس کا پیدا ہونا جینا مرنا سب پرائے ہاتھ میں ہی اس کو سراپا احتیاج پیدا کیا ہی تو اس کی حاجت روائی کے سامان بھی مہیا ہیں خدا نے زمین کا ایسا بھرپور توشے خانہ مخلوقات کے لیئے بنا دیا ہی کہ جو چیز جس کو درکار ہوتی ہی وہ اسی توشے خانے سے نکلی چلی آتی ہی - وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ [۱] ... سے ایک آدمی ہی کو لیتے ہیں تو پاتے ہیں کہ جب سے اُس میں جان پڑتی ہی اُس کو غذا درکار ہوتی ہی اور وہیں ماں کے پیٹ ... اس کو اس کی حالت کے مناسب غذا پہنچتی رہتی ہی پھر وہ عرصۂ ہستی میں آتا ہی تو لَبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ [۲] ... پاتا ہی - اور آخر کو غذائے نباتی اور حیوانی سے یعنی جب تک آدمی ضعیف وناتواں ہوتا ہی ویسی ہی اس کو ...

---

[۱] اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے ہاں سب کے خزانے (کے خزانے بھرے پڑے ہیں) مگر ہم ایک اندازۂ معلوم (ومقرر) کے ساتھ اُن کو (مناسب ...) ... بھیجتے ہیں ۱۲ [۲] ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جس کو پینے والے آسانی سے (غٹ غٹ) پی جاتے ہیں ۱۲

قادر ہوئے پیچھے اُس کو پیٹ کے لیئے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر بھی وہ کتنے ہی جتن کیوں نہ کرے۔ خدا کا ہاتھ شروع سے آخر تک اُس کو سہارا لگاتا رہتا ہی فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

غذا کے میسر آئے بعد بھی آدمی کی آخری کوشش یہ ہوتی ہی کہ غذا کو حلق سے اُتار لے مگر اتنے سے تو مقصودِ غذا حاصل نہیں ہوتا۔ اُس کا ہضم کرنا اُس کا خون بنانا۔ خون کو گوشت پوست ہڈی پٹھے بال ناخن وغیرہ میں تبدیل کرنا اور ہر ایک عضو کو تائید پہنچانا ان میں سے کوئی سا کام بھی آدمی کے ارادے سے نہیں ہوتا اور ان کاموں کے بدون جسم کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ ارادہ تو ارادہ آدمی کو تو خبر تک بھی نہیں ہوتی اور اندرونی قوتیں خدا کے حکم سے اپنی اپنی خدمتوں کی بجا آوری کرتی رہتی ہیں۔ یہ تو ایک غذا کا حال ہی کہ قدرتی خدمتگاروں کا مذکور نہیں۔ بونے سے لے کر پیسنے پکانے تک کتنے آدمی کتنے جانور اُس کا سرانجام کرتے ہیں تب کہیں جا کر لقمہ آدمی کے نیک لگتا ہی۔ پھر غذا کے علاوہ اَور کتنی ضرورتیں ہیں جو آدمی کے پیچھے لگی ہیں یا اُس نے خود تکلف آرائش آسایش کے لیئے اپنے پیچھے لگا لی ہیں سو فضول اور لایعنی چیزوں کے لیئے تو آدمی کو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلانے بھی پڑتے ہیں۔ نہایت ضروری چیزیں خدا نے اپنی قدرت سے مہیا کر دی ہیں مثلاً زندگانی کی ضرورتوں میں سب سے زیادہ ضروری چیز ہوا ہی کہ کوئی متنفس دو منٹ بھی سانس لیئے بغیر زندہ نہیں رہتا۔ سو آدمی گھر میں ہو یا بازار میں یا کھلے میدان میں تہ خانہ میں ہو یا پہاڑ پر سانس لینے کے لیئے ہوا ہر جگہ موجود۔ ہوا سے دوسرے درجے میں پانی ہی۔ وہ بھی برس میں دو بار خدا برساتا رہتا ہی۔ جا بجا دریا پڑے بہہ رہے ہیں کہیں بھی زمین کو کھود و پانی نکل آتا ہی۔ کھانے کے لیئے جنگل میں خود رُو پھل پھلاری کی افراط ہی ہاں پانی کی جگہ شربت کیوڑہ پیو۔ اور پلاؤ زردے کھانا چاہو تو خدا سے یہ توقع نہ رکھو کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بنی اسرائیل پر منّ و سلویٰ اُترا کرتا تھا بنا بنایا شربت اور پکا پکایا پلاؤ آسمان سے برسے گا خدا نے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے تمھاری زندگی کا ذمّہ لیا ہی نہ ان تکلفات کا یعنی ضرورت کے لیئے نہیں۔ مگر تکلف کے لیئے کچھ نہ کچھ تکلیف کرنی ہی پڑے گی ؎

اے ذوق تکلّف میں ہی تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہی جو تکلّف نہیں کرتا

غرض کہ خدا تعالیٰ نے آدمی کو ایک خاص طرح کا مخلوقِ حاجتمند پیدا کیا ہی تو اُس کی ضرورتوں کا سامان بھی مہیا کر دیا ہی بہت کچھ اپنی قدرت سے اور کچھ یوں ہی سا برائے نام آدمی کے ابنائے جنس کے ذریعے سے اور اسی لیئے تو

سلہ تو آدمی کو چاہیئے کہ (اَور نہیں تو) اپنے کھانے (ہی) کی طرف نظر کرے کہ ہم (ہی) نے اوپر سے پانی برسایا پھر ہم (ہی) نے (ایک) زمین میں (یہ سب کچھ) اگایا (یعنی) غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا (یہ سب) اس لیئے کہ تم لوگوں کو اور تمھارے چارپایوں کو فائدہ پہنچے ۱۲ سلہ اور جتنے (جاندار) زمین میں چلتے پھرتے ہیں اُن (سب) کی روزی اللہ ہی کے ذمے ہی ۱۲

آدمی اپنی طرح کے آدمیوں میں مل کر رہتا ہی کہ لوگ ضرورتوں کے بہم پہونچانے میں اُس کی مدد کریں اور یہ لوگوں کی بڑے شہروں میں ہزاروں لاکھوں آدمی بستے ہیں۔ اور اُن میں سے بہتیرے ایسے ہیں کہ ظاہر میں ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں۔ مگر حقیقۃً وہ سب ایک دوسرے کا کام کر رہے ہیں بغرض آدمی کے لیئے جو کام ظاہر میں دوسرے آدمی کرتے ہیں وہ بھی خدا ہی اِن سے کراتا ہی کہ اُن کو اِس کی توفیق دی ہی اُن کو اِس قابل کیا ہی۔ اُن کے دل میں یہ بات ڈالی ہی۔ آدمی اِن باتوں کو سوچے سمجھے تو وہ ضرور تسلیم کرے گا کہ آدمی کے تعلقات تو بہت ہیں مگر کوئی تعلق اُس تعلق کو نہیں پاتا۔ جو آدمی کو خدا کے ساتھ ہی۔ آدمی کے دوسرے تعلقات عارضی اور چند روزہ ہیں۔ مگر اِس کا تعلق خدا کے ساتھ ہر وقت کا تعلق ہی اور ابدی ہی اور یہ بات تو دیباچے میں ثابت کردی جا چکی ہی۔ کہ ہر ایک تعلق کے دو پہلو ہوتے ہیں حق کا اور ذمّہ داری کا۔ سو بندوں کا تو کوئی دعویٰ اور کوئی حق خدا پر نہیں۔ ہاں اُس نے از خود بندوں کی روزی کا ذمّہ لیا ہی وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[۵۱] اور مہربانی کا كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ[۵۲] سو خدا اپنی ذمّہ داریوں کو جو اُس نے اپنے اوپر لازم کرلی ہیں بے طلب بے تقاضا باحسن الوجوہ پورا کر رہا ہی۔ رزق کے اعتبار سے وہ خیر الرازقین ہی اور مہربانی کے لحاظ سے ارحم الراحمین۔

رہے اُس کے احسان بندوں پر۔ بندوں کا تو مقدور نہیں کہ اُن کو گن سکیں وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا[۵۳] تو جیسے اُس کے بے شمار احسان ویسے ہی اُس کے بے شمار حقوق اور ویسے ہی اُس کی نعمتوں کے مقابلے میں بندوں کے فرائض هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ[۵۴]۔ دنیا میں اگر کوئی ہم پر احسان کرتا ہی تو ہم ٹہل سے خدمت سے کسی نہ کسی طرح اُس کا بدلہ اُتار بھی سکتے ہیں مگر خدا کی نہ تو ہم سے خدمت ہی ہو سکتی ہی اور نہ وہ ہماری خدمت کی پروا کرتا ہی۔ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ[۵۵]۔ ہاں اُس کے بندوں کی خدمت بھی اُس کی خدمت ہی اور یہی خدا ہم سے چاہتا بھی ہی سہ

دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر ست

اور یہی وجہ ہی کہ جس کو خدا نے اپنی عبادت قرار دیا ہی اُس میں بھی مقصودِ اصلی خلائق کا نفع ہی مگر کتنے آدمی ہیں جو اِس نکتے کو سمجھتے ہیں شاید سو میں ایک دو۔ عبادتیں تین قسم کی ہیں۔ قلبی۔ بدنی۔ مالی۔ قلبی عبادت سے مراد ہی۔ دلی عقیدہ دلی یقین۔ کہ خدا واقع میں ہی۔ اور عالم سارا اُسی کا بنایا اُسی کا پیدا کیا ہوا ہی اُسی کی مخلوقات میں ایک مخلوق ہم بنی آدم بھی ہیں مگر عقل سے سرفراز فرما کر خدا نے ہم کو ایک خاص طرح کی برتری دی ہی وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[۵۶]۔ کہ ہم عقل ہی کے برتے پر دنیا میں چین سے زندگی بسر کرتے ہیں سچ ہی کہ آدمی کو دنیا میں تکلیفیں بھی پہونچتی ہیں۔ بلکہ لوگ

---

۵۱ اور جتنے (جاندار) زمین میں چلتے پھرتے ہیں اُن (سب) کی روزی اللہ ہی کے ذمّے ہی ۱۲ ۵۲ اُس نے (از خود لوگوں پر) مہربانی کرنے کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہی ۱۲ ۵۳ اور اگر خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو اُن کو پورا پورا گن نہ سکو ۱۲ ۵۴ بھلائی کے سوا نیکی کا بدلہ کچھ اَور بھی ہو سکتا ہی ۱۲

۵۵ بے شک اللہ دُنیا جہان سے بے نیاز ہی ۱۲

۵۶ اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہی اُن میں بہتیروں پر اُن کو برتری دی ۱۲

اکثر تکلیفوں کے شاکی پائے جاتے ہیں - چنانچہ ایک شاعر کہتا ہی ؎

در عالم بے وفا کسے خرم نیست | شادی و نشاط در بنی آدم نیست
آنکس کہ دریں زمانہ اوراغم نیست | یا آدم نیست یا درین عالم نیست

تو کیا خدا نے ہم لوگوں کو بے خطا بے قصور گوناگوں تکلیفوں میں مبتلا رہنے کے لیے پیدا کیا ہی - ایسا خیال کرنا معاذ اللہ خدا کو ظالم ٹھیرانا ہی - حال آنکہ واقعی بات تو یہ ہی کہ دنیا کی بناوٹ دنیا کے واقعات سے بے شائبہ اشتباہ ظاہر ہوتا ہی کہ دنیا کے پیدا کرنے کی مصلحتوں کو تو خدا ہی خوب جانتا ہی - مگر اُن میں سب سے بڑی مصلحت اظہار رحمت ہی - میرے سے پیدا کرنا ہی رحمت ہی اور پھر ہر مخلوق کی تمام ضرورتوں کو مہیا کرنا مزید رحمت للمؤلف

جسے جس غرض سے بنایا ہی اُس نے | اُسے اُس کا رستہ دکھایا ہی اُس نے

اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی[1] اچھا پھر یہ تکلیفیں کیسی جن کا ہر فرد بشر شاکی ہی؟ ہاں تو یہ تکلیفیں اے صبا ایں ہمہ آوردہ تست ✤ خود آدمی اپنی نادانی ناعاقبت اندیشی نافرمانی سے مول لیتا ہی - مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ[2] یعنی خدا نے جو زندگی کا دستور العمل ہم لوگوں کے لیے بنا دیا ہی اور وہ کیا ہی قرآن پاک لَّا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِہٖ ؕ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ[3] شامت نفس سے ہم اُس کی ہدایتوں پر عمل نہیں کرتے اِس سے تکلیفیں اُٹھاتے اور مصیبتیں جھیلتے ہیں پس جب تم کو کوئی امر ناملائم پیش آئے یقین کر لو کہ تم سے خدائی دستور العمل کی تعمیل میں ضرور کوئی فروگزاشت ہوئی ہی اور یہ تکلیف اُسی فروگزاشت کا نتیجہ ہی خدائی دستور العمل تم کو نہ صرف تمہاری فروگزاشت بتائے گا بلکہ اُس کی تلافی بھی - غرض کہ خدا تو ہماری ذرا سی تکلیف کا روادار نہیں - خواہ وہ تکلیف روحانی ہو یا جسمانی - داخلی ہو یا خارجی - یعنی ہماری اپنی وجہ سے ہو یا دوسروں کی وجہ سے مگر ہم ہی اُس کا کہنا نہ مانیں تو اس کا کیا علاج - تم کو جو خدشے واقع ہوں بے تامل بیان کرو خدشات کا واقع ہونا عیب نہیں ہی - عیب ہی خدشات کا چھپانا کہ اِس سے بزدلانہ ثابت ہوتا ہی ہمارا دعویٰ تو یہ ہی مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ اِس دعوے کے دو جزو ہیں پہلے جزو کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں کر سکتا - اِس لیے کہ دنیا میں جو کچھ سامان عیش و عشرت آدمی کے لیئے ہی وہ سب خدا کا بنایا خدا کا دیا ہوا ہی آدمی ماں کے پیٹ سے تو لے کر نہیں آیا جو کچھ اس نے کمایا وہ بھی خدا ہی کی دین ہی کہ خدا نے آدمی کو اس قابل کیا اور کمایا بھی تو کیا کمایا - خدا کی بنائی ہوئی خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تصرف کیا اور بس - پس مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ یا مَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ کے بوجھ سے تو آدمی کسی طرح سبکدوش ہو ہی نہیں سکتا - اب رہا مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ

---

[1] جس نے ہر مخلوق کو اُس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر اُس کو اُن اغراض خاص کے پورا کرنے کی راہ دکھائی (جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہی) ۱۲

[2] (اے بندے حقیقت حال تو یہ ہی کہ) تجھ کو کوئی فائدہ پہنچے تو (سمجھ کہ) اللہ کی طرف سے ہی اور تجھ کو کوئی نقصان پہنچے تو (سمجھ کہ) تیرے نفس کی طرف سے ہی ۱۲

[3] جھوٹ نہ تو اُس کے آگے (ہی کی طرف) سے اُس کے پاس پھٹکنے پاتا ہی اور نہ اُس کے پیچھے (کی طرف) سے (کیونکہ) حکمت والے سزاوار حمد (و ثنا یعنی خدا) کی اُتاری ہوئی (کتاب) ہی ۱۲

تو مصیبتیں جو آدمی کو زندگی میں پہنچتی رہتی ہیں بہت تو اسی کی بے احتیاطی کے نتیجے ہیں مثلاً وہ حفظِ صحت کے قاعدوں کی تعمیل نہیں کرتا اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ قاعدوں کے تعمیل نہ کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اُن قاعدوں سے واقف نہیں دوسرے یہ کہ واقف تو ہے مگر اُن پر عمل نہیں کرتا تو جیسے واقف ہو کر عمل نہ کرنا اس کا قصور ہے ویسے ہی ناواقف رہنا بھی اسی کا قصور ہے۔ کیوں نہیں جانتا۔ اور کیوں نہیں واقفیت پیدا کی۔ دریا میں رہنا ہے تو تیرنا سیکھنا ہی پڑے گا اور نہیں سیکھے گا تو ڈوبے گا بھی ضرور۔ اور لوگ اسی کو الاہنا بھی دیں گے ضرور۔ یہ جو کچھ ہم نے کہا امراضِ جسمانی کے متعلق تھا۔ اب اُن تکلیفوں پر نظر کرو جو آدمی کو ابنائے جنس کے ہاتھوں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ بھی تھوڑی نہیں اور بسا اوقات بیماری سے بڑھ کر تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اِن میں بھی اگر آدمی انصاف کے ساتھ دیکھے بہت سی ایسی نکلیں گی۔ جو اس کی اپنی بے تدبیری سے اس کو پہنچی ہیں۔ اِن سب کو حساب سے خارج کر کے دیکھا جائے تو عجب نہیں گنتی کی چند تکلیفیں اضطراری بھی ہوں جن میں اس شخص تکلیف رسیدہ کو کچھ بھی دخل نہیں۔ یا شاید نہ بھی ہوں۔ لیکن فرض کرو کہ ہیں تو بھی خدا کی بے شمار نعمتوں کے مقابلے میں ان کا وزن پاسنگ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور ان کا الزام بھی اس پر نہ ہوگا تو اس کے ابنائے جنس پر ہوگا۔ بس تو یہ بات آ کر ٹھیری کہ آدمی پر خدا کے بے شمار احسان ہیں اور چونکہ آدمی کی طبیعت احسان شناس واقع ہوئی ہے۔ اس کو ہمہ وقت اور ہر حال میں خدا کا احسان ماننا اور اُس کا شکر کرنا چاہیئے۔ بڑی بات تو خدا کا جاننا پہچاننا۔ اور اُس کی ہستی کا یقین کرنا ہے اور اسی پر انسان کی زندگی کی کامیابی کا انحصار ہے۔ کیونکہ آدمی خدا کا یقین کرے گا تو ضرور اُس کے حقوق اور اپنے فرائض کو بھی سمجھے گا اور سمجھے گا تو ضرور تھوڑا بہت عمل بھی کرے گا۔ اور عمل کرے گا تو آپ بھی راضی رہے گا اور اوروں کو بھی راضی رکھے گا اور خدا بھی اُس کی فرماں برداری سے خوش ہوگا اس لیئے کہ خدا نے جو حکم دیئے ہیں خود آدمی اور اُسی کے ابنائے جنس کے فائدے کے لیئے دیئے ہیں خدا کی کوئی ذاتی غرض ان سے متعلق نہیں اور نہ وہ بے نیاز کسی طرح کی غرض رکھتا ہے اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ[1]۔ لیکن یقین یقین میں فرق ہے۔ عام طرح کا یقین تو یہ ہے اور یہ یقین کا ادنیٰ درجہ ہے کہ آپ تو غور و فکر کرنے کی عادت نہیں۔ کسی کو مرتے دیکھا یا آپ مبتلائے مصیبت ہوئے خدا یاد آ گیا۔ بات رفت و گزشت ہوئی۔ یادِ خدا بھی بھولی بسری ہو گئی۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں کسی نے کہا ہے **مصرع** چکنے گھڑے پہ بوند پڑی اور پھسل پڑی ؛ یقین کا اعلےٰ درجہ جو خاصانِ خدا کا حصہ ہے یہ ہے **شعر**

کسانے کہ یزداں پرستی کنند ؛ بآوازِ دولاب مستی کنند

یہ لوگ ذرے میں آفتاب کو۔ مخلوق میں خالق کو یعنی ہر چیز میں خدا کو گویا بچشمِ سر مشاہدہ کرتے ہیں۔

ہرچہ آید در نظر غیرِ تو نیست ؛ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

[1] اگر تم (خدا کی) ناشکری کرو تو اللہ تم سے بے نیاز (مطلق ہے) اور اپنے بندوں کے لیئے ناشکری کو پسند نہیں کرتا (یعنی یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی ناشکری کریں) اور اگر تم (اُس کا) شکر کرو تو وہ تمھاری اس ادا کو پسند کرتا ہے ۱۲

ان اعلیٰ اور اُونے دو درجوں کے درمیان میں یقین کے بے شمار مدارج ہیں مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۞ خدا نے جو عبادت کو اپنا حق اور ہم بندوں کا فرض قرار دیا ہے۔ تو اس کا اصل مطلب اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ہم اُس کے بندے ہیں۔ پھر بندگی کے ظاہر کرنے کے اُس نے طریقے بتا دیئے ہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ان تمام طریقوں سے خلق اللہ کو فائدہ پہونچانا مقصود ہے۔

ع راحت بدل رساں کہ ہمیں مذہب ست وبس ✤

اور جس طریقے سے صاف طور پر یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ تو کم سے کم اتنا تو ہے کہ خدا کا خیال تازہ ہوتا ہے اور عبادت گزار کی بلکہ سارے مسلمانوں کی بلکہ کل عالم کی فلاح دارین اسی خیال پر متفرع ہے ✤

ممانعتِ شرک

از شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب

توحید اور ممانعتِ شرک دونوں کا مطلب ایک ہے۔ توحید کے بارے میں جو آیتیں ہیں وہ حکم کے پیرائے میں ہیں کہ خدا کو اُس کی ذات و صفات میں یگانہ مانو اس سے ممانعتِ شرک مستنبط ہوتی ہے لیکن چونکہ توحید کا معاملہ بڑا اہتمام بالشان ہے اس لیئے نہی کے پیرائے میں بھی ممانعتِ شرک کی بہت سی آیتیں قرآن میں پائی جاتی ہیں۔ دین الٰہی آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر بلا تغییر و تبدیل چلا آتا ہے اور اس کا اصل الاصول توحید ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے مگر دین کے اسی ایک رُکن توحید میں ایسا ضعف آگیا تھا کہ جو لوگ بُت پرست تھے سو تھے اہلِ کتاب بھی توحید میں رخنہ اندازیاں کرنے لگے تھے یعنی یہود عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بعض خدا کا بیٹا اور بعض مستقل خدا ماننے لگے تھے نصاریٰ میں جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کو مستقل خدا مانتے ہیں وہ عجب طرح پر خدا کے بارے میں تثلیث اور توحید دو متناقض باتوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں نہ اس معمے کو خود سمجھتے ہیں اور نہ دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں ظاہر بات ہے کہ انسان کو صرف وجودِ عاقل ہونے کی وجہ سے دین و مذہب کی تکلیف دی گئی ہے پھر بھی عقلِ انسانی محدود عقل ہے بہت سی باتیں ہیں جن کو انسان نہیں سمجھتا۔ مثلاً دُور کیوں جاؤ خود اسی کی روح ہے کہ آج تک کسی نے روح کی حقیقت

---

۹۵ جو شخص دنیا کا طالب ہو تو ہم جسے چاہتے ہیں (اور) جتنا چاہتے ہیں (اسی دنیا میں) سر دست اُس کو دے دیتے ہیں (مگر) پھر (آخر کار) ہم نے اُس کے لیئے دوزخ ٹھیرا رکھی ہے جس میں وہ بُرے حالوں راندۂ (درگاہِ خدا) ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص طالبِ آخرت ہو اور آخرت کے لیئے جیسی کوشش کرنی چاہیئے ویسی اُس کے لیئے کوشش بھی کرے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی محنت (خدا کے ہاں) مقبول ہوگی (اے پیغمبر) وہ (دنیا کے طالب) اور یہ (آخرت کے طالب) سب ہی کو ہم تمہارے پروردگار کی (یعنی اپنی) بخشش سے امداد دیتے ہیں اور تمہارے پروردگار کی بخشش (عام ہے کسی پر) بند نہیں (اے پیغمبر) دیکھو (تو سہی کہ) ہم نے (دنیا میں) بعض لوگوں کو بعض پر کیسی برتری دی اور البتہ آخرت کے درجے کہیں بڑھ کر ہیں اور (ویسے ہی اُس دن کی) برتری (بھی) کہیں بڑھ کر ہے ۱۲ ✤

کو نہیں سمجھا۔ مگر پھر بھی شروع ہی۔ لیکن سمجھ میں نہ آنا اَور بات ہی اور انکارِ عقلی بالکل دوسری بات ہی خدا کی ذات اور اُس کی صفات عقلِ انسانی میں آنے کی باتیں نہیں مگر شرک کہ اُس میں بت پرستی اور عقیدۂ تثلیث سب داخل ہیں ایسی باتیں ہیں کہ عقل ان کو قبول نہیں کرتی نہ یہ کہ سمجھتی نہیں۔ اِس ضعفِ توحید کو دُور کرنے کے لیئے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اسلام اور یہودیت اور نصرانیت میں اَور بھی چند در چند اختلافات ہیں مگر وہ اختلاف فروعی ہیں۔ مثلاً عبادتوں کے طریقے اور اوقات یا بعض جانوروں کی حلت و حرمت یا مثلاً جہتِ قبلہ یا اسی طرح کے اَور بعض مسائل۔ بڑا اختلاف جو اسلام اور اہلِ کتاب کے عقائد میں ہی وہ توحید ہی۔ قرآن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ توحید اصلِ دین ہی اور اسلام اس بارے میں کسی طرح کی توجیہ و تاویل کو بھی جائز نہیں رکھتا۔ ہم نے جو کچھ اس کتاب کے دیباچے اور عنوانِ توحید کے ذیل میں لکھا ہی وہ مخالفتِ شرک کے لیئے بھی بس کرتا ہی۔ خداشناسی کا سیدھا رستہ جو اسلام نے تعلیم کیا ہی یہ ہی کہ کارخانۂ عالم پر نظر کرکے ادنےٰ تامل سے ہمارا دل گواہی دیتا ہی کہ اس کارخانے کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہی اور وہ کوئی ان چیزوں میں سے نہیں ہی۔ جن کو ہم دیکھتے اور دیکھ سکتے ہیں ہم اپنے تئیں عقل و دانش کے اعتبار سے اشرف المخلوقات پاتے ہیں لیکن ہم خود اپنی جگہ درماندہ ہیں۔ مجبور ہوکر ہم کو ایسی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہی جو ہماری اور مخلوقات کی جنس میں سے نہیں ہی۔ بس خدا کے ہونے کی ہمارے پاس ایک یہی دلیل ہی ہمارے دل کی گواہی۔ ہم نے اپنے دل کی گواہی کو جب جب آزمایا صحیح ثابت ہوئی۔ مثلاً ہم صبح کے وقت مشرق کی طرف روشنی ہوتی دیکھتے ہیں اور ہمارا دل گواہی دیتا ہی کہ آفتاب نکلنے والا ہی اور اس گواہی کے صحیح ثابت کرنے کے لیئے واقع میں بھی آفتاب نکلتا ہی۔ یا مثلاً ہم کو دُور سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہی۔ اور ہمارا دل گواہی دیتا ہی کہ یہ دھواں کسی آگ سے پیدا ہوا ہی۔ ہم موقع پر جاکر دیکھتے ہیں تو واقع میں آگ پاتے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو مرتے دیکھا ہی اور ایک شخص خاص کی نسبت ہم حکم لگاتے ہیں کہ یہ بھی مرے گا اور وہ واقع میں اویر سویر مرتا ہی۔ اسی طرح جب ہم ایک بنا ہوا مکان یا ایک چلتی گھڑی دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوتا ہی کہ اس مکان کا بنانے والا کوئی معمار اور گھڑی کا بنانے والا کوئی گھڑی ساز ضرور ہی اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہی کہ واقع میں مکان کا تعمیر کرنے والا معمار اور گھڑی کا بنانے والا گھڑی ساز ہی بھی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دل کی گواہی یا ہماری عقل کا حکم کسی جگہ غلطی نہ کرے اور کرے تو خدا کے بارے میں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مخلوقاتِ عالم کو دیکھ کر جو ہم نے سمجھا ہی کہ ان کا بنانے والا امرئیات اور مشاہدات میں سے نہیں ہی بلکہ ایک ہستی ہی جس کو ہم بچشمِ سر نہیں دیکھ سکتے۔ اور اسی کو ہم لوگ خدا کہتے ہیں ٹھیک ہی۔ جس طرح ہم نے خدا کی ذات کو پہچانا اسی طرح اُس کی صفات کو پہچانا۔ اور جس دلیل سے ہم نے خدا کو مانا اُسی دلیل سے ہم نے اُس کو ایک بھی مانا۔ ایک ہونا خدا کے لیئے شرطِ ضروری ہی اگر اُس کی ذات یا صفات میں کوئی اَور شریک ہو تو ایسا خدا خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شرکت اگر ہوگی تو خود خدا میں کسی طرح کا ضعف ہوگا جس کی تلافی شرک سے کی جاتی ہی اور ضعف کا نام آیا اور خدائی گئی گذری ہوئی جس کے سر میں عقل ہی یعنی جس نے انسانیت کا جامہ پہنا ہی وہ خدا کا منکر تو ہو نہیں سکتا خدا کے خیال کو دل میں جگہ نہ دینا انکار ہی نہیں ہی بلکہ غفلت ہی اور اس سے

کوئی فردِ بشر خالی نہیں الا ماشاء اللہ یہاں تک کہ خود جنابِ رسالت مآب فرماتے ہیں لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ[1] شرک ایک اعتبار سے انکار نہیں ہے۔ مگر دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو وہ بھی داخلِ انکار ہے۔ شرک ایسی بد بلا ہے کہ اُس سے محفوظ رہنا بہت دشوار ہے اس لیئے کہ شرک کی دو قسمیں ہیں شرکِ جلی اور شرکِ خفی۔ بتوں کو پوجنا فرشتوں اور پیغمبروں اور بزرگانِ دین یا سوائے خدا کے کسی چیز میں خدا کی صفتوں میں سے کسی صفت کا ہونا تسلیم کرنا شرکِ جلی ہے۔ اور شرکِ خفی کے بہت سے اقسام ہیں از انجملہ لوگوں کے نام ایسے رکھنا جن سے شرک پیدا ہوتی ہو۔

اصل میں شرک کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) شرک فی الذات۔ (۲) شرک فی الصفات۔ (۳) شرک فی الاسمار۔ شرک فی الذات تو یہ ہے کہ کئی خدا مانے جائیں اور بت کو خدا کہنے کی بھی شرک فی الذات کے ذیل میں ہے۔ شرک فی الصفات یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی دوسرے کو اُن صفات سے متصف مانا جائے جو خدا کے ساتھ خاص ہیں شرک فی الاسمار کو ہم نے شرک کی ثالث قسم قرار دیا ہے مگر از بسکہ اسمار صفاتی ہیں۔ شرک فی الاسمار حقیقت میں شرک فی الصفات ہے۔ شرک فی الاسمار کو قسمِ مستقل قرار دینا ایک آیت کی وجہ سے ہوا ہے جو مع ترجمۂ فائدہ ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (یعنی اور اللہ کے (سب ہی) نام اچھے ہیں تو اُس کے نام لے کر اُس کو (جس نام سے چاہو) پکارو اور جو لوگ اُس کے ناموں میں کفر کرتے ہیں اُن کو (اُن ہی کے حال پر) چھوڑ دو کوئی دن جاتا ہے کہ وہ اپنے کیئے کا بدلہ پائیں گے۔" ف ل

ف ل ناموں میں کفر کرنے کے بہت پیرائے ہیں از انجملہ جو بدنصیبی سے مسلمانوں میں بھی بکثرت شائع ہے یہ کہ خدا کے سوا کسی اور کو اُن صفتوں سے پکارا جائے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے مشکل کشا۔ دستگیر۔ اَن داتا۔ شہنشاہ وغیرہ ۱۲

ایمان بالقدر

از شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب

رہا مسئلہ تقدیر تو یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے کہ عوام تو عوام اکثر خواص بھی اُس کو نہیں سمجھ سکتے سارا اشکال خود آدمی کی خاص طرح کی بناوٹ کا ہے کہ آدمی نہ تو سنگ و پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے جہاں پڑا ہے پڑا ہے کوئی اُس کو جگہ سے ہلائے تو ہلے اور نہ با اختیارِ مطلق ہے کہ جو چاہے کر گزرے۔ آدمی کی اِس حالت کو پیشِ نظر رکھ کر تقدیر کے معنی سمجھنے کے ہیں۔ تقدیر کی نسبت لوگوں کا عام خیال تو یہ ہے کہ آدمی کو بھلا برا جو کچھ پیش آتا ہے۔ اور جو کچھ پیش آنے والا ہے پہلے سے خدا نے اُس کے لیئے ٹھیرا دیا ہے یہاں تک کہ اُس کا جنتی اور دوزخی ہونا بھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے اختیار سے نہیں کرتا اور اِسی لیئے نیکی کی جزا کا مستحق اور بدی کی سزا کا مستوجب بھی نہیں بے شک کہ تقدیر کے لیئے بڑی گنجائش ہے اور اس خیال کی تائید میں بہت سی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے انسان کی مجبوری ظاہر ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ انسانی زندگی کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ انسان کچھ اختیار بھی

[1] یعنی میرے لیئے خدا کے ساتھ ایک وقت خاص ہے جس میں نہ تو مقرب فرشتے کو گنجائش ہوتی ہے نہ نبی مرسل کو ۱۲

رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنا پر وہ دنیا میں اپنے افعال کا جواب دہ سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں یہ قاعدہ جاری ہے تو آخرت میں کیوں نہ ہو۔ دنیا اور آخرت میں نقل اور اصل کی نسبت ہے اور ایک کا دوسرے کے مطابق ہونا ضرور ہے۔ اچھا پھر تقدیر کو کیا سمجھنا چاہیئے تو لفظ تقدیر نکلا قدر سے جس کے معنے اندازے کے ہیں پس تقدیر کے معنے اندازہ ٹھیرا لینے کے ہوئے جو معنے إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ[1] کے ہیں وہی معنی تقدیر کے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے بآسانی سمجھو گے۔ ہم نے ایک درزی کو کپڑے کا تھان دیا کہ اس میں سے جتنے بن سکیں ہمارے کرتے بناوو۔ تو درزی پہلے آگا پیچھا۔ کلیاں چوبغلے آستینیں ہر ایک چیز کا اندازہ کر لیتا ہے تب قطع کرتا ہے لغت کی رو سے اسی کا نام ہے تقدیر۔ معمار تعمیر سے پہلے مکان کا نقشہ بناتا ہے۔ بڑھئی چوکی کے لیئے لکڑی کی تراش کا اندازہ کرتا ہے۔ یہ سب تقدیر ہے۔ اسی طرح خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے اس چیز کی تقدیر ہوئی۔ دوسری مخلوقات کے ساتھ ایک تقدیر انسان کی ہے کہ اس کی دو آنکھیں ہیں دو کان دو ہاتھ دو پاؤں ایک ناک۔ وہ خاص ایک خاندان میں خاص ملک میں خاص زمانے میں پیدا ہوتا اور ایک خاص وقت تک خاص حالت میں زندہ رہ کر آخر کو دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان پر جو حالتیں گزرتی ہیں ان میں سے بہت سی باتیں ہیں جن میں انسان کے ارادے انسان کی رائے انسان کی تدبیر کو کچھ دخل نہیں ایسی ہی باتوں میں اس معنی کر تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے جو لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں بندگی و بیچارگی۔ فطرت اللہ میں نکتہ چینی کرنا فساد عقل اور گمراہی کی دلیل ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کو پرندوں کی طرح پرواز کی قدرت کیوں نہیں دی یا جیسا کہ تیز خوردبین میں دیکھا جاتا ہے کہ مکھی کے چھوٹے سے جثے میں ہزاروں آنکھیں ہیں آدمی کس لیئے اس نعمت سے محروم رکھا گیا۔ پس اس صورت میں تقدیر پر ایمان لانے کے یہ معنے ہیں کہ مخلوقات عالم کو خدا نے جیسا چاہا بنایا اور بہت درست بنایا۔ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ[2]۔ لیکن اس میں تو کچھ جھگڑا نہیں۔ جھگڑے کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے یہی وہ عقیدہ ہے جس میں پانی مرتا ہے۔ اسی عقیدے نے مسلمانوں کی دنیا کو تباہ اور برباد کیا۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان روئے زمین پر کوس لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ بجاتے تھے اور تہذیب اور شائستگی اور فضائل میں کوئی قوم ان کو لگتا نہیں کھاتی تھی یا اب یہ وقت ہے کہ دوسروں کے غلام ہیں اور غلام بھی ہیں تو کیسے کھٹو أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ[3]۔ برائے نام معدودے چند سلطنتیں بھی ہیں تو اگر دو ماندشبے ماندشبے دیگر نمے ماند۔ یہ سب اس لیئے کہ مسلمان تقدیر پر بھروسا کر کے حسب اقتضائے وقت اپنے تئیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے اور عقیدۂ تقدیر نے ان کو مایوس اور اپاہج اور از کار رفتہ کر دیا ہے۔ اگلے مسلمان جو معراج الکمال ترقی پر پہونچ گئے تھے وہ بھی تقدیر کے قائل تھے مگر کوشش کرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ کامیابی ان کی تقدیر میں ہے اور تقدیر ہی

---

[1] ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے ۱۲ [2] ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر اس کو (ان اغراض خاص کے پورا کرنے کی) راہ دکھائی ۱۲ [3] گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگا ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا ۱۲

اُن سے کوشش کرا رہی ہی۔ اِس پر بھی اچھا تھا اگر اُن کی سعی نا مشکور ہوئی تھی۔ تو نا مشکوری سعی محرّک ہوتی تھی سعی مزید کی۔ غرض وہ کسی حالت میں ہمّت نہیں ہارتے تھے اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ اب کے مسلمان پہلے ہی سے آس توڑ بیٹھے اور بے ہاتھ پاؤں ہلائے سمجھے ہوئے ہیں کہ خدا ہی اِن کی بہتری نہیں چاہتا ؎

مزن فالِ بد کاورد حالِ بد　　مبادا کسے کو زند فالِ بد

ہم نے مدّتوں اِس کو سوچا کہ مسلمانوں نے تقدیر کا مجمل غلط کہاں سے لیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن میں ایسی بھی بہت آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ ہدایت اور ضلالت دونوں خدا کی طرف سے ہیں آدمی کے اختیار کی بات نہیں جیسے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اور يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اور فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ اور خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ اسی طرح ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے آدمی کا با اختیار ہونا پایا جاتا ہی جیسے اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ اور وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا اور اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا اور فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ دونوں قسم کی آیتوں کے ملانے سے انسان کی اصلی حالت ظاہر ہوتی ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ انسان فاعلِ با اختیار ہی مجبوری ہی تو یہ ہی کہ نہ وہ اپنے ارادے سے پیدا ہوا اور نہ اُس نے اختیارات کی جیسے کچھ بھی ہیں درخواست کی دوسرے یہ کہ آدمی ارادے کا اختیار رکھتا ہی ارادے کا نافذ کرنا اُس کے بس کی بات نہیں نتیجہ جو وہ چاہتا ہی ہو بھی اور نہ بھی ہو مثلاً آدمی نے چوری کی نیت سے ایک گھر کو تاکا آلاتِ سرقہ لے کر چلا وہاں جا کر دیکھا کہ لوگ جاگ رہے ہیں ناکام واپس آیا۔ حاکم ظاہر اُس کو سزا نہیں دے سکتا کیونکہ چوری نہیں ہوئی۔ مگر وہ چوری کا ارادہ کرنے سے عند اللہ چور ٹھیرا یہ ہیں معنی اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

ف۱ اگر تم کو (اِس لڑائی میں شکست کی) کھٹ پہنچ گئی تو (بے دل مت ہو کیوں کہ جنگ بدر میں) طرفِ ثانی کو بھی اِس طرح کی کھٹ پہنچ چکی ہی اور یہ اتفاقاتِ وقت ہیں جو ہمارے حکم سے نوبت بہ نوبت (سب) لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں ۱۲ ف۲ (اے پیغمبر اپنی خواہش کے مطابق) تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہی ہدایت دیتا ہی ۱۲ ف۳ جس کو چاہتا گمراہ کرتا اور جس کو چاہتا ہدایت دیتا ہی ۱۲ ف۴ جس کو خدا گمراہ کرے اُس کو کون راہِ راست پر لا سکتا ہی ۱۲ ف۵ اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہی ۱۲ ف۶ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور اُن کو (حق بات کے سُننے سے) بہرا اور (راہِ راست کے دیکھنے سے) اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہی ۱۲ ف۷ اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب (کے سب مل کر بھی) خدا کی ناشکری کرو تو خدا کو ذرا بھی پروا نہیں کیوں کہ وہ بے نیاز (اور ہر حال میں) سزاوارِ حمد (وثنا) ہی ۱۲ ف۸ اور انسان کی اور (اُس ذات کی قسم) جس نے اُس کو (ایسا) درست بنایا پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں ۱۲ ف۹ (پھر ہم نے) اُس کو (دین کا) رستہ (بھی) دکھایا (پھر اب دو قسم کے آدمی ہیں) یا تو شکر گزار ہیں (یعنی مسلمان) یا ناشکر (یعنی کافر) ۱۲ ف۱۰ پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے ۱۲ ف۱۱ بلکہ (خود) انسان اپنے مقابلے میں حجت ہی گو وہ (اپنے تئیں بے قصور ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی) بہانے پیش لایا کرے ۱۲

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کے - ایک مشکل خدا کے عالم الغیب ہونے کی ہے کہ وہ اس سے پہلے کہ آدمی عرصۂ ہستی میں آئے ایک ایک فردِ بشر کے جزو کل حالات سے واقف ہے کہ فلاں آدمی فلاں جگہ فلاں خاندان میں فلاں وقت پیدا ہوگا اتنے دن جیئے گا اور اس کو یہ یہ واقعات پیش آئیں گے اور آخر کار قانونِ الٰہی یعنی قرآن کی رو سے جنتی ہوگا - یا دوزخی - یہ تو ظاہر ہے کہ خدا کا علم غلط نہیں ہو سکتا ضرور ہے کہ ایک ایک بات خدا کے علم کے مطابق واقع ہو اس سے بھی لوگ انسان کی مجبوری استنباط کرتے ہیں ایک بھلے تن ہندو نے ایک دوہا کہا ہے کہ ؎

نیاؤ نہ کین کین ٹھکرائی بن کینے لکھ لین بُرائی

لیکن یہ استنباط غلط ہے ایک طبیبِ حاذق بھی ایک مریض کی نسبت جانتا ہے کہ وہ بدپرہیز ہے ضرور بدپرہیزی کرے گا اور مرے گا اور وہ بدپرہیزی کرتا اور مرتا بھی ہے - لیکن طبیب نے اس کو بدپرہیزی کرنے اور مرنے کا حکم نہیں دیا - غرض تقدیر کی بحث ہے بڑی دقیق اور اسی وجہ سے شارع نے اس میں کرید کرنے کی مناہی بھی فرمائی ہے - ہم نے قرآن کا ترجمہ کرتے وقت تین مقام پر تین فائدے بھی لکھے ہیں ان تینوں کو اس جگہ نقل کیے دیتے ہیں شاید فہمِ مطلب میں ان سے کچھ مدد ملے -

پارہ تلک الرسل کے آغاز کی آیہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ کے ذیل میں لکھا ہے "مطلب یہ ہے کہ خدا چاہتا تو تمام بنی آدم کی طبائع ایک ہی طرح کی ہوتیں تو ان میں اختلاف بھی نہ ہوتا لیکن اس نے حق و باطل دو چیزیں بنائیں آدمی کو حق و باطل کی تمیز دی اور تمیز کے علاوہ اختیار کہ حق کا رستہ اختیار کرے یا باطل کا - آدمی کا با اختیار پیدا کرنا خدا کا فعل ہے اور حق و باطل کی تمیز کرنا اور ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑنا آدمی کا"

دوسرا فائدہ پارہ والمحصنت کے آیہ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کے متعلق لکھا ہے اور وہ یہ ہے "اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ (نفع ہو یا نقصان) سب اللہ کی طرف سے ہے اور یہاں فرماتے ہیں کہ فائدہ اللہ کی طرف سے اور نقصان بندے کی طرف سے ظاہر ان دونوں باتوں میں مخالفت سی معلوم ہوتی ہے اور کلامِ الٰہی میں یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک سانس میں کچھ اور دوسرے سانس میں کچھ - چنانچہ تھوڑی دور آگے چل کر فرماتے بھی ہیں وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا سو جو لوگ انسان کو فاعلِ مختار نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ آدمی بُرا یا بھلا جو کچھ بھی کرتا ہے خدا کے کرانے سے کرتا ہے یہ لوگ ان دو مخالف باتوں میں اس طرح وجہ توفیق پیدا کرتے ہیں جیسے حافظ شیراز کہہ گئے ہیں کہ ؎

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

یعنی نفع ہو یا نقصان - ہے تو سب کچھ خدا کی طرف سے مگر ادب کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ نقصان اور گناہ کو اپنی طرف منسوب کرے اور باوجود بے اختیاری کے قصور کا معترف ہو لیکن یہ بات ہمارے دل کو تو لگتی نہیں - ہم تو آدمی کو فاعلِ مختار اور نیک و بد کا ذمہ دار مانتے اور اس قاعدے کو دنیا اور دین دونوں کے انتظام کا مدار سمجھتے ہیں ان دو مخالف

باتوں میں واقعی وجہِ توفیق پوچھو تو یہ ہی کہ خدا نے دنیا کے انتظام کا ایک قاعدہ ٹھیرا دیا ہی ہر چیز اور ہر واقعے کا ایک سبب ہوتا ہی اور ہر سبب کا ایک نتیجہ۔ اور اسی سے یہ جہان عالمِ اسباب کہلاتا ہی جیسے مثلاً حاکم ظاہر نے ایک قانون بنا دیا۔ اور اُس میں چور کی سزا تجویز کر دی۔ آٹھ برس قید۔ زید نے چوری کی اور جیلخانے بھیجا گیا۔ کہنے میں تو یوں آتا ہی کہ حاکم نے قید کیا مگر حقیقت میں زید نے آپ اپنے کو قید کیا نہ چوری کرتا نہ جیلخانے جاتا۔ پس حاکم کا زید کو قید کرنا اور زید کا خود اپنے تئیں قید کرنا اپنی اپنی جگہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں"

تیسرا فائدہ سورۂ انعام کے رکوع ۷ آیۂ قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء لھدٰکم اجمعین کے ذیل میں لکھا ہی "کفارِ مکہ جب دلیل سے عاجز آتے تو مشیتِ الٰہی کی بحث نکال کھڑی کرتے۔ لیکن وہ مرضی اور مشیت میں فرق نہیں کرتے تھے خدا نے اس آیت میں مرضی اور مشیت کا فرق نہایت عمدہ طور پر دکھایا ہی کہ جو خدا کی مرضی تھی وہ پیغمبروں کے ذریعے سے ظاہر کر دی گئی اور لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ نیک راہ اختیار کریں یا بُری راہ چلیں۔ بُروں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور دیدہ و دانستہ بُری راہ اختیار کی تو وہ ملزم ٹھیرے اور خدا کی حجت اُن پر تمام ہوئی مشیتِ الٰہی سے اور اس سے کچھ تعلق نہیں مشیتِ الٰہی بالکل دوسری چیز ہی۔ اس میں شک نہیں کہ خدا چاہتا تو سب راہِ راست پر چلتے۔ مگر اُس نے چاہا کہ لوگ اپنے ارادے سے راہِ راست اختیار کریں تو لوگوں کے افعال سے مشیتِ الٰہی متعلق نہیں ہی بلکہ اُن کی اپنی مشیت متعلق ہی۔ یعنی مشیتِ الٰہی تھی کہ لوگ اپنی مشیت سے بُرا یا بھلا کریں الخ"

اب ان سب باتوں کے اخیر میں ہم ناظرین کو ایک نہایت ضروری بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ایمان اور اسلام دو لفظ ہیں بولنے میں مرادفِ یکدگر بولے جاتے ہیں یعنی ایک ہی معنی میں ان کا استعمال ہوتا ہی مگر جو فرق ایمان و اسلام میں ہی وہ اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہی قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ "عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے پیغمبر اِن سے) کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (ہاں) یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گزر تک بھی نہیں ہوا" اسلام اعمالِ ظاہر سے تعلق رکھتا ہی۔ اور ایمان دل سے پس جو شخص ظاہر میں مسلمانوں کے سے کام کرتا ہی۔ مثلاً ہمارے قبلے کی طرف نماز پڑھتا ہی۔ ہمارا ذبیحہ کھاتا ہی یعنی اُس کا ظاہر مسلمان ہی چاہیئے کہ ہم اُس کو مسلمان سمجھیں یہی مضمون شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے نہایت عمدگی سے اس قطعے میں ادا کیا ہی قطعہ

هر که را جامه پارسا بینی | پارسا دان و نیک مرد انگار
ور ندانی که در نهانش چیست | محتسب را درون خانه چه کار

اور اسی مضمون کی توضیح ہماری اُس تحریر سے بھی ہو سکتی ہی جو ہم نے آیۂ قالت الاعراب اٰمنّا الخ کے فائدے میں کی ہی چنانچہ وہاں لکھا ہی کہ "ایمان دل سے علاقہ رکھتا ہی اور خدا کے سوا دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی اور اسلام افعالِ ظاہر سے تعلق رکھتا ہی ایک شخص مسلمانوں کی سی وضع رکھتا اور مسلمانوں کے ساتھ کھاتا پینا اور اپنے

تئیں مسلمان کہتا ہو شرع جو ظاہر پر حکم کرتی ہے اُس کی رُو سے وہ مسلمان سمجھا جائے گا مگر ممکن ہے کہ اُس کے دل میں ایمان نہ ہو۔ اِس آیت میں اسلام اور ایمان کا فرق جتانا مقصود ہے سخت افسوس ہے کہ آجکل کے مسلمانوں میں یہ فساد کثرت سے شائع ہو گیا ہے کہ بات بات میں مسلمانوں کو کافر بنا دیتے ہیں حالانکہ شریعت کی رُو سے کسی کو حق نہیں کہ مسلمان بھائی کو گروہِ اسلام سے خارج کرے جنابِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر مسلمانوں کے گروہ کے بڑھانے کی تدبیروں میں لگے رہے اور وہ مسلمانوں کے گروہ میں داخل کرنے کے لیئے حیلے ڈھونڈتے تھے اور فرمایا کرتے تھے اُبَاھِی بِکُمُ الْاُمَمَ کہ تمام پیغمبروں میں مَیں ایسا پیغمبر ہوں جس کی اُمّت آخرت میں سب اُمّتوں سے زیادہ ہوگی۔ اِس کے برخلاف اب مسلمانوں کو گروہِ مسلمانوں سے خارج کرنے کے لیئے حیلے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ ع ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا ۔ خدا کے نزدیک مُسلم سے مؤمن کا درجہ بڑا ہے کیونکہ اعمالِ ظاہر کبھی دکھاوے کے لیئے بھی ہوتے ہیں اور ہمارے ان وقتوں میں بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو جتھے اور برادری کے خوف سے مسلمانوں کا سا ظاہر رکھتے ہیں مگر جس کو ایمان کہتے ہیں وہ اُن کے دل میں نہیں۔ اِن کے برخلاف کچھ لوگ ظاہر خراب باطن آباد بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ شریعت ظاہر پر حکم کرتی ہے۔ ہم تو لوگوں کے ظاہر حال ہی پر فیصلہ کر سکتے ہیں اور باطن کی خبر خدا کو ہے جس طرح ایمان اور اسلام دو چیزیں ہیں اسی طرح کفر بھی دو طرح کا ہے کفرِ ظاہر اور کفرِ باطن۔ غرض کسی کے ظاہر کو شعارِ اسلام کے خلاف دیکھ کر اُس کو کافر سمجھنا یا کافر کہہ دینا بڑی خطرناک بات ہے۔

حقوقِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

از شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب

قرآن کی سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ اللہ کسی مثال کے بیان کرنے سے (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اُس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی) سو جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ (مثال بالکل) ٹھیک ہے (اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) اُن کے پروردگار (ہی) کی طرف سے (ہے) اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس (ذلیل) مثال کے بیان کرنے میں خدا کی کون سی غرض (اٹکی پڑی) تھی ایسی ہی مثال سے خدا بہتیروں کو گمراہ کرتا اور ایسی ہی مثال سے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے لیکن اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے (تو) بدکاروں ہی کو جو پکا کیے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن (تعلقات) کے جوڑے رکھنے کو خدا نے فرمایا اُن کو قطع کرتے اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ آخر کار نقصان اُٹھائیں گے" اس کی شانِ نزول مفسروں نے یوں لکھی ہے کہ جب آیہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

---

[1] لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اُس کو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو ایک مکھی (بھی) پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ

دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِاجْتَمَعُوْا لَہٗ وَاِنْ یَّسْلُبْہُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ o مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ - نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہی اونچی دوکان پھیکا پکوان خدائی دعوے اور مکھی جیسی حقیر اور قابل نفرت چیز کا مذکور ہم کو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہی - اس طعن کے جواب میں آیہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ الخ نازل ہوئی جواب کا حاصل یہ ہی کہ ممثّل بہ کیسی ہی ادنےٰ چیز ہو مثال کے نتیجے کو دیکھنا اور اُس سے پند پذیر ہونا چاہیئے -

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ... ور نبشت ست پند بر دیوار

اِس روایت کی بنا پر ہم خدا اور رسول کے باہمی تعلق کو حکّام دنیا کی مثال دے کر سمجھانا چاہتے ہیں ہمارے وقتوں میں ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہی تو انھوں نے کیا کیا ہی کہ جتنے کام بہ تعلّق حکومت کرنے پڑتے ہیں سب کے قسم وار صیغے بنا رکھے ہیں - ایک فوجی صیغہ ہی ایک ملکی پھر ملکی میں مال دیوانی فوجداری پولس تعلیم - ڈاک - آبپاشی - تعمیرات وغیرہ بہت سے صیغے ہیں اور ہر صیغہ ایک محکمہ جداگانہ مثال کی تکمیل کے لیئے ہم ایک محکمہ مال کو لیتے ہیں - جس میں تحصیل خراج کا کام ہوتا ہی - یہ محکمہ تحصیلدار سے شروع ہو کر گورنر جنرل پر جا کر منتہی ہوتا ہی - اس طرح پر کہ پرگنہ کا محصّل تحصیلدار - پھر کئی پرگنوں یعنی ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر پھر کئی ضلعوں یعنی قسمت کا کمشنر پھر کئی قسمتوں یعنی صوبے کا بورڈ یا فنانشل کمشنر غرض کر صوبے کے صیغہ مال کا سب سے بڑا محکمہ بورڈ یا فنانشل کمشنر کا محکمہ ہی یہی حال کام کے ہر ایک صیغے کا ہی - پھر ان سب صیغوں کا جامع صوبے کا گورنر یا لفٹنٹ گورنر یا چیف کمشنر کہلاتا ہی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کے تمام صیغوں کا سب سے بڑا حاکم گورنر جنرل جسے ہندوستانی ریاستوں کے تعلّق سے وائسرائے یعنی شہنشاہ کا نائب بھی کہتے ہیں - انتظام کے اس سلسلے سے ہم دو باتیں استنباط کرتے ہیں ایک یہ کہ وحدت کے بدون کثرت انتظام نہیں پا سکتی اور اسی سے ہم کو خدا کی وحدانیت کا قائل ہونا پڑتا ہی - خیر یہ تو جملہ معترضہ ہی - دوسری بات جو حکّام انگریزی کے انتظام میں دیکھی جاتی ہی یہ ہی کہ یوں تو ہر حاکم کے ہاتھ تلے سررشتہ دار یا اہلکار پیشی ہوتا ہی اور وہی احکام وغیرہ لکھتا پڑھتا ہی مگر کمشنر تک لکھا پڑھی حاکم کے نام سے ہوتی ہی - کمشنر سے اونچے درجے کے حکّام کی خط و کتابت اُن کے علوّ مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرٹری اپنے نام سے کرتا ہی جس کو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتّر کہتے ہیں - سکتّر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سررشتہ دار ہی گو وہ اپنے نام سے خط و کتابت کرے مگر حقیقت میں وہ خط و کتابت اُس کے افسر کی ہی جس کا وہ سکتّر ہی - چونکہ سکتّر اپنے افسر کا مزاج شناس ہوتا ہی کبھی وہ چھوٹی اور معمولی باتوں میں بے پوچھے بھی حکم جاری کرتا ہی اور اُس کا وہ حکم افسر کے حکم کی طرح واجب التعمیل ہوتا ہی - ہم تو دنیا ہی کی باتوں سے دین کی باتوں کا پتہ لگا لیتے ہیں تو ہم نے خدا اور رسول میں ویسا ہی تعلّق سمجھا ہی جیسا مثلاً وائسرائے اور اُس کے سکتّر میں ہوا کرتا ہی اور یوں قرآن اور حدیث دونوں چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے سے بیٹھ گئیں تم نے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

اُس کے (پیدا کرنے کے) لیئے (سب کے سب) اکٹھے (ہی کیوں نہ) ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کچھ چھین لے جائے تو اُس کو اُس سے چھڑا نہیں سکتے (کیسے) بودے ہیں (بُت) جو (مکھی کے) پیچھے پڑیں (اور اُس کو نہ پکڑ سکیں) اور کیسی بودی وہ (بیچاری مکھی) جس کا پیچھا کیا جائے (اور پھر بھی ہاتھ نہ آئے) ۱۲

اس بات سے سمجھ لیا ہوگا کہ رسول کا ادب متفرّع ہے خدا کے ادب پر یعنی رسول کا ادب عین خدا کا ادب ہے مگر خدا کا ادب اظہارِ عبودیت سے ہوتا ہے اور رسول کا اُن کے حکم کی بجا آوری سے - پھر حکم کبھی امر و نہی کے صاف لفظوں میں ہوتا ہے - کبھی حکم پر چلنے والوں کی مدح اور سرتابی کرنے والوں کی مذمّت کے پیرائے میں کبھی اُمَمِ ماضیہ میں سے کسی اُمّت کا حال بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کو ایک حکم دیا گیا اُنھوں نے نہ مانا اُن پر عذاب نازل ہوا کبھی وعدۂ اجر اور وعیدِ عذاب سے اظہارِ امر و نہی کیا جاتا ہے اور حکم کی ایک شان یہ بھی ہے کہ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تقرّبِ رسالت کی وجہ سے خدا کے اداشناس اور مزاج داں اور دوسرے بندوں کی طرح مامور بھی تھے اُن کا قول و فعل بھی خدا ہی کا حکم سمجھا جائے گا گو قرآن میں اُس امرِ خاص کی صراحۃً نہ ہو - مثلاً خدا نے مطلق زکوٰۃ کا حکم دیا نصاب کی تعیین اور مقدارِ زکوٰۃ اور حَولِ کامل کا گزرنا یہ باتیں ہم کو رسولِ خدا کے عمل سے معلوم ہوئیں اور یہی حال ہے ارکانِ نماز اور ارکانِ حج کا - اس اعتبار سے حدیث کو قرآن کا ضمیمہ اور تتمہ ماننا ہوگا - اب پھر دنیا کی چیزوں میں سے مثال ڈھونڈھنی پڑی وہ یہ کہ انگریزوں کے انتظامِ ملکداری میں مثلاً فوجداری کا ایک قانون ہے جس کا نام ہے "مجموعۂ قوانینِ تعزیراتِ ہند" اس قانون میں ہر ایک جُرم کی تعریف ہے - اور اُس کی انتہائی سزا - لیکن اتنے سے کام نہیں چل سکتا تو اجرائے کار کے لیئے ضابطۂ فوجداری بنانا پڑا - اور تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دونوں مل کر فوجداری کا مکمّل قانون بن گیا پس جو نسبت ضابطۂ فوجداری کو تعزیراتِ ہند سے ہے وہی نسبت حدیث کو قرآن سے ہے - اس کو اچھی طرح سمجھ لو کسی نے یوں ہلدی کی چندی کر کے نہ سمجھایا ہوگا - قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی کمپنی نئی سوسائٹی نئی کمیٹی کھڑی کی جاتی ہے تو اُس کے ممبر بڑے جوشیلے ہوا کرتے ہیں اور اگر جوشیلے نہ ہوں تو وہ کمپنی پانی کے بُلبلے کی طرح زیادہ ٹھیر نہیں سکتی یہی حال شروع کے مسلمانوں کا تھا یہ اُسی جوش کا نتیجہ تھا کہ گویا چُٹکی بجانے میں اسلامی سلطنت قائم ہوگئی اور قائم بھی ہوئی تو ایسی مضبوطی کے ساتھ کہ چودہ سو برس گزرے ابھی تک جا بجا "آثار پدید است صنادید عرب را" چونکہ جنابِ رسالت مآب کو خدا نے عقلِ معاد اور رسا اور آخر بین عطا فرمائی تھی اور وہ سنّت اللہ کو خوب سمجھے ہوئے تھے - اسی لیئے وہ عین ترقی کے زمانے میں اَلْاِسْلَامُ بَدَأَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا[ف1] کی پیشین گوئی فرماتے تھے - بہرکیف شروع کے مسلمانوں کے جیسے جوش بڑھے ہوئے تھے ویسے ہی وہ بڑی سختی سے پابندِ مذہب بھی تھے - وہ سُنَن کو فرائض سے بڑھ کر سمجھتے تھے اور مباحات کو منہیات سے بڑھ کر - جنابِ رسالت مآب کے ساتھ اُن کی ارادت اور عقیدت اور محبّت عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی - یہ عشق نہ تھا تو کیا تھا کہ پیغمبر صاحب کے وضو کے پانی کو تبرّکاً مونہوں پر ملتے تھے اور زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے - پیغمبر صاحب سو رہے ہیں اور پسینہ بدن سے سونت کر شیشی میں بھر لیا - اور عطر کی جگہ کام میں لائے - جیتے اسی لیئے تھے کہ موقع ملے تو اپنی جان راہِ خدا میں قربان کر دیں - دنیا کی کوئی چیز اُنھیں پیغمبر صاحب سے زیادہ عزیز نہ تھی - خدا تو نہیں مگر ہاں خدا کے بعد اُن کے لیئے ماں باپ آقا اُستاد جو کچھ کہو پیغمبر صاحب تھے - پیروی کا یہ حال تھا کہ چال ڈھال رفتار گفتار نشست برخاست کل باتوں میں پیغمبر صاحب کی تقلید بہ نظر

ف1 اسلام شروع میں بھی مسافرانہ حالت میں رہا اور عنقریب مسافرانہ حالت ہی کی طرف عود کرے گا ۱۲

رکھتے تھے ۔ اُن کا بڑا اشغلہ یہ تھا کہ بیٹھے پیغمبر صاحب کی صورت دیکھا اور اُن کی باتیں سُنا کریں وہ پیغمبر صاحب کو نہ صرف دین کا ہادی سمجھتے تھے بلکہ اُمورِ خانگی اور ذاتی معاملات میں بھی پیغمبر صاحب کی صلاح پر کاربند ہوتے تھے ۔ اور پیغمبر صاحب بھی کہ "ہمارا بد ہمارا راہ بادشاہ" اِن کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے کہ ان کی اصلاح اور تعلیم اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں فرماتے تھے ۔ پیغمبر صاحب نے اپنا کام ایسے لوگوں میں جاری کیا جن کو بھلمنساہت چھو نہیں گئی تھی اور وہ انسانیت کے درجے سے گر کر درندوں اور وحشی جانوروں کی طرح ہو گئے تھے ۔ ایسے لوگوں کو زیادہ نہیں پچیس تیس برس کی تعلیم میں تہذیب اور شایستگی کے اعلےٰ مرتبے پر پہنچا دینا ہم تو اس کو پیغمبر صاحب کا بڑے سے بڑا معجزہ سمجھتے ہیں ۔ تو یہ کیونکر ہوا کہ پیغمبر صاحب اپنے اصحاب کی ہر ایک بات پر نظر رکھتے ۔ اور ہر وقت اُن کو سکھاتے سمجھاتے رہتے تھے ۔ زبانی افہام و تفہیم کے علاوہ بڑا مؤثر سبق خود جناب رسالت مآب کا اپنا نمونہ تھا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[51] جب جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم خدمت رسالت کو باحسن الوجوہ انجام دے چکے اور خدا کی طرف سے اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[52] اور إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا[53] کے ذریعے سے اختتام رسالت کا اعلان کر دیا گیا تو جناب رسولِ خدا دنیا سے رخصت ہو کر رفیقِ اعلیٰ میں جا ملے ۔ گو بظاہر پیغمبر صاحب دُنیا سے اُٹھ گئے مگر جو منادی وہ کر گئے تھے بدستور آکنافِ عالم میں بڑی گونجا کی اور قیامت تک سُننے والوں کے لیے بڑی گونجا کرے گی ۔ جس شخص نے وہ صحبتیں نہیں دیکھیں وہ اُس مصیبت و رنج کے پہاڑ کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا جو پیغمبر صاحب کی وفات سے اہلِ بیت اور اصحاب پر ٹوٹ پڑا تھا ۔ لکھنے پڑھنے کا چرچا نہ ہونے کی وجہ سے لوگ صرف یادداشت پر اعتماد کرتے تھے اور اسی لیئے اُن کے حافظے بھی قوی ہوتے تھے ۔ پیغمبر صاحب کے انتقال کے بعد جا بجا اُن کے وقت کی باتوں کے تذکرے ہونے لگے جو آخر کار فنِ حدیث کی جڑ بنیاد قرار پائے ۔ حدیث بیش برین نیست کہ ایک خاص قسم کی تاریخ ہے ۔ جس میں زبانی روایتوں سے تتبع کر کے پیغمبر صاحب کے حالات اور مقالات جمع کر دیئے گئے ہیں اگرچہ پیغمبر صاحب کے انتقال سے اِسلام کا شیرازہ بکھرنے کو ہو گیا تھا ۔ مگر اُنھوں نے اپنے فدائیوں میں ایسی رُوح نہیں پھونکی تھی کہ وہ ہمّت ہار بیٹھتے ۔ اُن کے کان وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[54]

---

[51] مسلمانو! تمھارے لیئے (پیروی کرنے کو) رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ تھا ۱۲ [52] اب ہم تمھارے دین کو تمھارے لیئے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمھارے لیئے (اسی دین) اسلام کو پسند کیا ۱۲ [53] (اے پیغمبر) جب کہ خدا کی مدد آپہنچی اور (مکہ) فتح (ہو گیا) اور تم نے لوگوں کو (بچشم خود) دیکھ لیا کہ دینِ خدا (یعنی اسلام) میں جوق جوق داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد (و ثنا) کے ساتھ (اُس کی) تسبیح (و تقدیس) میں مشغول ہو جاؤ اور اُس سے گناہوں کی معافی مانگو بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ۱۲ [54] اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس اِن سے پہلے (اور) بھی رسول ہو گزرے ہیں پس اگر (محمد اپنی موت سے) مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پیروں (کفر کی طرف) پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اپنے اُلٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائے گا وہ خدا کا تو کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا اور جو لوگ (اسلام کی نعمت کا)

اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ کی آوازے پڑے بج رہے تھے - چنانچہ اُنھوں نے عمارتِ اسلام کو جسے پیغمبر صاحب ادھورا چھوڑ گئے تھے اُن ہی کے نقشے کے مطابق بڑی سرگرمی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا۔ سچ پوچھو تو اسلامی سلطنت تو پیغمبر صاحب کی حیاتِ بابرکات ہی میں قائم ہوگئی تھی - مگر وہ چھوٹے پیمانے کی سلطنت تھی اور مسلمانوں کے تعلقات جزیرہ عرب میں محدود تھے - خلفاء کے وقت میں سلطنت نے ایسے پاؤں پھیلائے کہ مسلمانوں نے اِن وقتوں کی دو بڑی زبردست سلطنتیں روم و فارس فتح کرلیں۔ سلطنت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تعلقات وسیع ہوتے گئے اور اُن کو وہ سب کام کرنے پڑے جو ایک جلیل القدر شہنشاہ کو کرنے پڑتے ہیں - فصلِ خصومات - حفظِ امن - تحصیلِ خراج - حمایتِ ثغور - تجہیزِ جیوش وغیرہ وغیرہ - ملک گیری شاید چنداں مشکل نہیں مگر ملکداری بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - فتح کرنے کو تو مولانا اسمٰعیل شہید باوجودیکہ فنونِ حرب سے پورے واقف نہ تھے اور انگریزی رعایا میں سے احامن الرعایا وہ بھی تھے اور کچھ ایسے بڑے مقتدر بھی نہ تھے اُلٹے کابل کی طرف سے سکھوں پر چڑھ دوڑے اور اُنھوں نے کچھ علاقہ سکھوں سے لے بھی لیا - مگر اُس کو سنبھال نہ سکے نتیجہ یہ ہوا اور ہونا ہی تھا کہ وہ اور اُن کے اعوان و انصار میں سے ایک بھی لوٹ کر نہ آیا - خود ملکداری میں کئی طرح کے کام ہیں ازانجملہ وضعِ قانون - ہم انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ دس دس پندرہ پندرہ بڈھے خرانٹ تو جہد بجھکڑ جہاندیدہ - تجربہ کار انگریز اور اب تو چیدہ چیدہ ہندوستانی بھی ان میں شامل ہونے لگے ہیں برسوں ایک قانون میں غور کرتے ہیں - قانون کا مسوّدہ مشتہر کیا جاتا ہے - انگریزی اُردو اخباروں میں اُس پر اعتراض ہوتے ہیں کونسل کے ممبر صبر و سکون کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرتے ہیں - مباحثے ہوتے ہیں - اتنی احتیاط کے بعد قانون جاری کیا جاتا ہے - مگر جاری ہوتے دیر نہیں ہوئی کہ اُس کی اصلاح و ترمیم ہونے لگتی ہے - اور کبھی قانون کو بتمامہ منسوخ کرنا پڑتا ہے اُن مسلمانوں کو کیسی مشکلیں پیش آئی ہوں گی جنھوں نے اوّل اوّل قانون کے لکھنے پر قلم اٹھایا ہوگا مگر ہاں اُن کو اتنی آسانی بھی تھی کہ قرآن جمع ہو چکا تھا - اور اُس میں اصول تو سب تھے اور کسی قدر فروع بھی - ابہام تھا تو عمل و رآمد کا سو عمل و رآمد کی توضیح اور تفصیل تھی حدیث اور لوگوں نے وقتی ضرورت دیکھ کر حدیثیں جمع کرنی شروع بھی کردی تھیں - مسلمانوں کو حدیث سے دین و دنیا میں بڑی مدد ملی ہے - دین میں تو حدیث نے قرآنی احکام کی توضیح کی اور دنیا میں ملک گیری اور ملکداری کے ضوابط کی - حدیث ایک ایسی بکار آمد چیز ہے کہ اُس پر مسلمان جس قدر فخر کریں بجا ہے - اقوام روئے زمین میں مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس اس کا جواب نہیں اور پھر ایک بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں نے جو فنِ تاریخ میں کتابیں لکھی ہیں وہ کسی طرح حدیث کی صداقت کو نہیں پا سکتیں - اِس لئے کہ مسلمانوں نے حدیث کو عبادت سمجھ کر جمع کیا ہے اور اُس کے جمع کرنے میں اِس قدر کاہش اور کاوش اور احتیاط کی کہ کبھی کہیں کی کوئی تاریخ ایسی کاہش اور کاوش اور احتیاط کے ساتھ نہیں لکھی گئی - لیکن از بسکہ حدیث کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۰) شکر کرتے ہیں اُن کو خدا عنقریب جزائے (خیر) دے گا ۱۲

جمع کرنے میں زبانی روایتوں سے ایک بات کا پتہ لگانا تھا حدیث کی معتبر سے معتبر کتاب بھی اختلاف سے محفوظ نہ رہ سکی اور محفوظ رہ بھی نہیں سکتی تھی دشمن جو چاہیں سو کہیں ہم تو اختلافِ احادیث کو جامع احادیث کی کاوش کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

حدیثیں جمع تو کی گئی تھیں مسلمانوں کے فائدے کے لیے اور مسلمانوں کو اُن سے عظیم فائدہ پہنچا بھی اختلافات کی وجہ سے جن کا دور کرنا امکان میں نہ تھا مسلمانوں میں پھوٹ بھی ایسی پڑی کہ یہ رخنہ قیامت تک بند ہوتا نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں نے طریقہ تو ٹھیک اختیار کیا تھا کہ دین یا دنیا کا جو معاملہ پیش آتا پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ قرآن میں حکم نہ پاتے تو حدیث کی طرف۔ حدیث بھی اُن کو رستہ نہ بتاتی تو قرآن و حدیث میں مقیس علیہ کی جستجو کرتے۔ مقیس علیہ کی جستجو میں دوسرا اختلاف پیدا ہوا اس لیے کہ لوگوں کی رائیں مختلف ہوتی ہیں۔ احادیث کے اختلاف کا رفع کرنا حقیقت میں پہلے بھی ممکن نہ تھا اور اب بھی ممکن نہیں اس لیے کہ سب سے پہلے پیغمبر صاحب کے عہد کے ڈیڑھ سو برس بعد احادیث کا جمع کرنا شروع ہوا جبکہ راویوں کی تین تین چار چار پشتیں فنا ہو چکی تھیں اتنی مدت بعد زبانی باتوں کا پتہ لگانا اگر عبادت کے خیال سے نہ ہوتا تو محال تھا۔ اب مرورِ زمانہ کی وجہ سے زیادہ تر محال ہو گیا ہے۔ اختلاف تو جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ اور ہونا ہی تھا۔ مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ ہست و نیست تک کے اختلاف کو بھی توسیع پر محمول کرتے جس نے چاہا ہست پر عمل کیا جس نے چاہا نیست کو معمول بہ ٹھیرایا خرابی یہ آ کر پڑی کہ زور سے زور سے اختلاف میں فریق بنتے گئے اور فریقوں میں مذہبی مغایرت قائم ہوئی اور وہ بڑھتے بڑھتے باہمی میل جول اور تعامل میں داخل ہو گئی۔ سیکڑوں برس کے تجربے نے ثابت کر دکھایا ہے کہ باوجود احادیث اور قیاس و اجتہاد کے اختلافات کے بھی اسلامی قانون کہ شرع اور شریعت عبارۃ اسی سے ہے دنیا میں امن کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے بخوبی کافی ہے کہ یہی خلاصہ اور لُبِّ لُباب ہے دینِ اسلام کا بشرطیکہ طبیعتوں میں سازگاری کی طرف رجحان ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

آداب

آداب جمع ہے ادب کی۔ ادب کا سب سے بہتر ترجمہ جس سے ادب کے ٹھیک مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہو جائے پاس اور لحاظ ہے جس کا ادب کیا جاتا ہے اُس کے تعلق سے ادب حق ہے اور ادب کرنے والے کے تعلق سے فرض۔ آدمی اپنے سے برتر کا ادب کرتا ہے تو برتری کئی طرح کی ہوتی ہے۔ برتری رشتے اور قرابت کی۔ برتری عمر کی۔ برتری علم و ہنر کی۔ برتری اُستادی اور تعلیم و ارشاد کی۔ برتری حکومت کی۔ برتری دولت کی۔ برتری احسان کی۔ برتری دین داری کی اور سب سے بڑھ کر برتری رسالت کی کہ پیغمبر بہت سی برتریوں کا جامع ہوتا ہے۔ پیغمبر صاحب کے ادب کی حد معلوم کرنا چاہو تو ع "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" سے معلوم کر سکتے ہو۔ ادب کے طریقے خود خدا تعالےٰ نے قرآن میں بتا دیئے ہیں اور وہ آیتیں عنوان آداب کے ذیل میں جمع کر دی گئی ہیں ایک سجدہ تو خدا کے سوا کسی کے لیے

جائز نہیں باقی ہر طرح کا ادب ہر طرح کی تعظیم و توقیر سب سے بڑھ کر پیغمبر صاحب کا حق ہی بس اتنی احتیاط رہے کہ وہ ادب عبادت کی حد تک نہ پہنچنے پائے جن کو مرقدِ مبارک کی زیارت نصیب ہو اُن کو اس بات کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے پیغمبر صاحب کے ادب کے اکثر مواقع تو اُن کی وفات اور وہ وقت گئے گزرے ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئے پیغمبر صاحب موجود نہیں کہ وہ بلائیں اور ہم سر کے بل دوڑے جائیں۔ وہ ارشاد فرمائیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر سُنتے رہیں۔ اُن کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہو تو دھیمی آواز سے عرض کریں۔ پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات زندہ نہیں کہ ہم اُنھیں ماں سمجھیں اور اپنی ماؤں سے بڑھ کر اُن کا ادب کریں۔ اب تو یہی ادب ہمارے نصیبوں میں ہی کہ پیغمبر صاحب کی عظمت دل میں ہو اُن کی دلسوزی نصب العین اُن پر درود و سلام بھیجتے رہیں اُن کے ارشادات کی تعمیل میں سعادتِ دارین سمجھیں۔ ایسا تو کوئی بدبخت مسلمان نہ ہوگا کہ پیغمبر صاحب کا ادب اُس کو ملحوظ نہ ہو۔ اگر پیغمبر صاحب کے ادب کے متعلق مسلمانوں سے غلطی ہوتی ہی تو وہ افراطِ ادب ہی کہ پیغمبر صاحب کو خدا اور ادب کو عبادت بنا دیتے ہیں۔ جو شرکِ جلی ہی ایک شاعر کہتا ہی۔

احمد کو ہم نے جان رکھا ہی وہی احد ۔۔۔ مذہب کچھ اور ہوگا کسی بوالفضول کا

اور غضب یہ ہی کہ انا احمد بلا میم و العرب بلا عین ایسے ایسے جھوٹے اور غلط دعوے پیغمبر صاحب کی طرف منسوب کیئے جاتے ہیں سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ [51] بلکہ پیغمبر صاحب تو رہے اپنی جگہ متصوّفوں کے گروہ میں تو بزرگانِ امت کو شریکِ خدائی بنایا جاتا ہی ایسے ہی لوگوں کے حق میں وعیدِ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ [52] نازل ہی حال آں کہ پیغمبر صاحب اور عشرۂ مبشرہ کے علاوہ ہم کو کسی کی عاقبت کا حال معلوم نہیں ہاں اُذْكُرُوا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ [53] کے قاعدے سے ہم سب گزشتگان کے حق میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں بہر کیف توحید کا رستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہی۔ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھنا ہوگا۔

(اتباعِ سنت)

لُغت کی رُو سے تو سُنت کے معنی مطلق طور و طریق کے ہیں مگر محدثین اِس سے مراد لیتے ہیں طور و طریقِ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اصحاب کا۔ تابعین کا۔ سُنت کی اس تعریف میں اصحاب و تابعین اور طور و طریق تین لفظ تشریح طلب ہیں۔ سو اصحاب جمع ہی صحابی کی۔ اور صحابی وہ ہی جو اسلام لایا اور اُس کو شرفِ صحبتِ پیغمبر بھی حاصل ہوا۔ اور عقیدۂ اسلام ہی پر اُس نے وفات پائی صحبت کے لیئے مدت کی قید نہیں۔ تھوڑی ہو یا بہت جو نسبت صحابی کو ہی پیغمبر صاحب سے وہی نسبت تابعی کو ہی صحابی سے یعنی تابعی وہ ہی جس کو کسی صحابی کے ساتھ صحبت رہی ہو اسلام کی شرط بدستور۔ پھر طور و طریق سے مراد ہی قول اور فعل۔ اور تقریر۔ تقریر سے گفتگو مراد نہیں بل کہ تقریر یہ ہی کہ کسی کو کچھ کرتے دیکھا یا کہتے سُنا اور خاموش ہو گئے رد و انکار نہ کیا جس سے سمجھا گیا کہ قول یا فعل کو جائز رکھا پس سُنت نو قسم کی ہوئی (۱) پیغمبر صاحب کا قول (۲) پیغمبر صاحب کا فعل (۳) پیغمبر صاحب کا کسی

[51] حاشا و کلا یہ تو بڑا (بھاری) بہتان ہی ۱۲ [52] اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہی کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں ۱۲

[53] اپنے مُردوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو ۱۲

کے قول یا فعل کو جائز رکھنا۔ اِسی طرح کی تین قسمیں صحابی کے تعلق سے۔ پھر اسی طرح کی تین قسمیں تابعی کے تعلق سے یہ سب نو ہوئیں۔ خود پیغمبر صاحب کی سُنّت کی پیروی کے لیئے تو قرآن ناطق ہی قُلْ[51] اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ صحابہ کے حق میں پیغمبر صاحب فرماتے ہیں۔ اَصْحَابِيْ[52] كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ رہے تابعی ہم اُن کی پیروی حدیث خَيْرُ[53] الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ سے استنباط کرتے ہیں کہ خیر القرون قرنی عہد صحابہ کو بتا رہا ہی پہلا الذین یلونہم تابعین کو اور دوسرا الذین یلونہم تبع تابعین کو بہرکیف ہم کو قرآن کے علاوہ خدا کے حکم سے پیغمبر صاحب کی اور پیغمبر صاحب کے حکم سے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرنی ہی اور پیروی بھی کرنی ہی تو اُن کے فعل کی قول کی تقریر کی۔ جس کے معنی ہم اُوپر لکھ چکے ہیں اور چونکہ قول اور فعل اور تقریر میں کسی قسم کی تصریح اور تخصیص اور تعیین نہیں بلکہ قرآن میں اتبعونی اور حدیث میں اقتدیتم دونوں لفظ عام ہیں تو اس پیروی کا مطلب یہ ٹھیرا کہ ہم ایسے سخت شکنجے میں کسے ہوئے ہیں کہ دائرۂ تقلید سے پاؤں باہر نہیں رکھ سکتے یا یوں کہو کہ ہم کو بالکل اُسی طرح پر زندگی بسر کرنی چاہیئے جس طرح پر اَب سے ہزار برس پہلے قرونِ اُولیٰ کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے ذٰلِكَ[54] هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ایک طرف تو عام پیروی سے یہ زبون نتیجہ نکلتا ہی اور دوسری طرف مَا[55] جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ۔ اور قُلْ[56] مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ سے پایا جاتا ہی کہ دینِ اسلام میں کسی طرح کی تنگی نہیں اور ان دو متضاد باتوں یعنی تنگی اور فراخی دونوں کا ماخذ قرآن۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ جلّ شانہ نے قرآن کے کتابِ آسمانی ہونے کے جہاں اَور بہت سے دلائل قرآن میں بیان فرمائے ہیں اُن میں سے ایک دلیل یہ بھی ہی کہ وَلَوْ[57] كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا یعنی قرآن کی تعلیم میں اختلاف کا نہ ہونا اُس کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل ہی۔ پس ضرور ہوا کہ اِس تنگی اور فراخی کے اختلاف اور اختلاف بھی نہیں تناقض اور تضاد کو رفع کیا جائے تو ہم نے رفعِ اختلاف کا پتہ یوں لگایا کہ جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم مشرکینِ مکہ کی ایذا دہی کی وجہ سے ہجرت فرما کر نئے نئے مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی وہی اسلام کی اشاعت اور لوگوں کے مشرکانہ اور فاسد عقائد کی اصلاح اِن کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ مکّے میں تو زراعت فلاحت کا نہ پہلے ہی کہیں نام و نشان تھا نہ اَب ہی یہاں مدینے میں آ کر دیکھا

---

[51] (اے پیغمبر اِن لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ (بھی) تم کو دوست رکھے اور تم کو تمھارے گناہ معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہی۔ [52] میرے صحابی ستاروں جیسے ہیں تم اُن میں سے جس کی اقتدا کروگے راہ پاؤگے ۱۲ [53] زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ میرا ہی پھر اُن لوگوں کا زمانہ بہتر ہی جو اس عہد کے لوگوں سے نزدیک ہوں گے اور پھر اُن کا جو اُن سے نزدیک ہوں گے ۱۲ [54] صریح گھاٹا یہی کہلاتا ہی

[55] (مسلمانو) دین (کے بارے) میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی (تمھارے لیئے وہی) دین (تجویز کیا جو) تمھارے باپ ابراہیم کا تھا ۱۲

[56] (اے پیغمبر اِن لوگوں سے) کہو کہ اللہ نے جو زینت کے (ساز و سامان) اور کھانے (پینے) کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لیئے پیدا کی ہیں اُن کو کس نے حرام کیا ہی ۱۲ [57] اور اگر (قرآن) خدا کے سوا (کسی اَور) کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اُس میں بہت سے اختلاف پاتے ۱۲

کہ کھیتی کے علاوہ نخلستان کی بڑی کثرت ہے یہاں تک کہ کھجوروں ہی پر گویا ان لوگوں کا گزارہ ہے کھانے بھی ہیں بیچتے بھی ہیں مگر یہ لوگ کھجور کے درختوں میں نر و مادہ کی تفریق کرتے تھے جس طرح ہندوستان میں قلم کا دستور ہے یہ لوگ بار آور ہونے کی غرض سے کھجور کے نر درخت کا گابھا مادہ درختوں میں ملاتے اور اس عمل کو اپنی بولی میں تابیر کہتے تھے۔ پیغمبر صاحب کو نخلستان کی رکھوالی کا کبھی کاہے کو اتفاق ہوا تھا سمجھے کہ یہ بھی ان لوگوں کے زمانہ جاہلیت کے اوہام میں سے ہوگا تابیر کو منع فرمادیا سارا مدینہ پڑتی پڑ گیا لوگوں نے فریاد کی تو فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ یعنی میں نے اپنے خیال کے مطابق تابیر کو منع کر دیا تھا اگر تابیر شرطِ بار آوری ہے تو کرو دنیا کی باتیں تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اس واقعے سے ثابت ہوا کہ امورِ دنیا میں پیغمبر صاحب کی پیروی شرطِ دینداری نہیں اور پیغمبر صاحب کی نہیں تو صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی بدرجۂ اولیٰ نہیں ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگی اور فراخی کا اختلاف جو سنت کی پیروی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا آسانی کے ساتھ رفع ہو گیا مگر نہیں ابھی ایک مشکل درپیش ہے کہ انتم اعلم باُمورِ دُنیاکم نے ہم کو پیروی سنت کی قید سے تو نجات دی مگر امورِ دنیا اور امورِ دین کو..........

ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دکھایا تاکہ جب کبھی کوئی معاملہ پیش آئے ہم سمجھ سکیں کہ یہ امورِ دنیا میں ہے اور اس میں سنت کی پیروی ضرور نہیں۔ ورنہ ہم تو دنیا کو جوہر اور دین کو عرض سمجھے ہوئے ہیں کہ دنیا میں شرعی شان کے ساتھ زندگی کرنے کا نام ہے دین۔ دنیا کو دین سے کیسے الگ سمجھ لیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اکثر اوامر و نواہی دنیا سے متعلق ہیں مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ مال و دولت کو فضول نہ اڑاؤ۔ یہ سب احکام دین ہیں اور پھر ہیں دنیا ہی کی باتیں۔ پس انتم اعلم باُمورِ دنیاکم میں امورِ دنیا سے خاص خاص باتیں مراد ہونی چاہئیں کہ اتباعِ سنت بھی فوت نہ ہو اور اسلامی آزادی و سہولت بھی باقی رہے۔ ہم نے تو دین کی کتابوں سے یہ بات استنباط کی ہے کہ قرآن اسلام کا مکمل دستور العمل ہے اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اس کے مکمل ہونے کا گواہ۔ مسلمانوں کو جو کچھ بھی دنیا اور آخرت کے لیے اس زندگی میں کرنا ہے قرآن میں اس کی بابت ہدایت موجود ہے تو جہاں تک سنت سے احکامِ قرآن کی توضیح و تفسیر ہوتی ہو۔ یا سنت قرآن کے کسی حکم کا طریقِ عمل بتاتی ہو یا سنت کا کوئی مسئلہ قرآن کی کسی اصل پر متفرع ہوتا ہو وہاں تک تو سنت کی پیروی ضرور ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی سنت ہے قرآن کے اتبعونی اور حدیث کے اقتدوا سے خارج مگر تاریخی حیثیت سے قابل قدر۔

جھوٹی بات کو آپ کی طرف نسبت کرنے کی ممانعت

جن چیزوں کے سمجھنے فہم انسان قاصر ہے اور ایسی بہت چیزیں ہیں اور ان میں سے ایک نبوۃ بھی ہے ایک شاعر نے جنابِ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں کیا خوب کہا ہے ؎

ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل　　خواص اس برزخِ کبریٰ میں تھا حرفِ مشدد کا

دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک ادنیٰ رعیت ایک بادشاہ جلیل القدر کے ساتھ ہم کلام ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتا حالانکہ رعیت

اور بادشاہ کچھ بھی ہوں پھر بھی ہم جنس اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ذرّے کو آفتاب سے۔ قطرے کو سمندر سے۔ چیونٹی کو ہاتھی سے یا خلقا مما یکبر فی صدورکم سے پھر بھی ایک طرح کی نسبت ہے اور نہیں ہے تو آدمی کو خدا سے آدمی آدمی ہی ہے اور خدا خدا ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کس طرح ایک بشر سے بلا واسطہ یا بواسطہ ہم کلام ہوتا ہے۔ غرض نبوت ایک مشکل معما ہے جس کا حل کرنا مقدور بشر نہیں باایں ہمہ ہم نبوۃ سے انکار بھی نہیں کرسکتے اُس کے لیئے بہت سے دلائل ہیں ناممکن التردید پس پیغمبر کے بارے میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنا ہے ذرا ٹیڑھی کھیر۔ ہم ایک حکایت نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ لوگ نبوت کے بارے میں کس کس طرح طریق مستقیم سے انحراف کرتے ہیں۔ دو شخص دونوں مسلمان اور دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے بلکہ ایک دوسرے کے رشتہ دار بھی ایک ساتھ حج کو روانہ ہوئے ایک تھا متشدّد غیر مقلّد دوسرا کٹا مقلّد۔ کسی طرح جدہ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جدّے پہنچ کر دونوں رفیق ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ غیر مقلّد سیدھا مکّے پہنچا۔ اور اُس نے ارکان حج اوقات مقررہ پر پورے پورے ادا کیئے۔ مقلّد نے جدّے اُتر کر اُدھر مدینے کی راہ لی۔ غیر مقلّد نے کہا بھی کہ وقت تنگ ہے مدینے ہوکر حج میں شامل نہ ہو سکو گے مقلّد نے اس کی مطلق پروانہ کی حج تو فوت ہو گیا مگر پیغمبر صاحب کے مزار مبارک کی زیارت بافراغت نصیب ہوئی۔ اُدھر غیر مقلّد مدینے نہ جا سکا۔ لوٹتیوں کو پھر دونوں جدّے میں جمع ہوئے تو جس طرح غیر مقلّد کو زیارت مدینہ سے محروم رہنے کا افسوس نہ تھا۔ مقلّد کو حج نہ کرنے کا کچھ ملال نہ تھا۔ یہ ہے وہ افراط و تفریط جس سے ہم مسلمانوں کو آگاہ کیئے دیتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں کہیں تو پیغمبر صاحب کی حالت بشری کا بیان ہے تو وہاں عجز اور مسکنت ہے اور کہیں اُن کے تقرب الٰہی کا تو وہاں محبوبیت ہے فوق البشریت اور اسی لیئے ہم نے ابوہریرہؓ اور انسؓ کی دو حدیثیں پیغمبر صاحب کی فضیلت کے متعلق باب میں داخل کردی ہیں۔

سب رسولوں پر یکساں ایمان لانا

رسولوں پر ایمان لانے کو خدا کا حق سمجھ کر ہم پہلے حصّے میں انبیاء علیہم السلام کی نسبت کچھ لکھ آئے ہیں۔ اس بیان کو اُس کے ساتھ ملاکر پڑھنا چاہیئے۔ مزید آگہی کے لیئے ذیل میں اُن پیغمبروں کی فہرست دی جاتی ہے جن کا ذکر بتصریح نام قرآن میں ہے۔ ان کے علاوہ خدا جانے اور کتنے پیغمبر آئے اور آئے تو کیا حکم خاص یعنی شریعت لیکر کس وقت کن لوگوں کی طرف۔ بات یہ ہے کہ بنی آدم کی حالت کو ثبات نہیں کہ شروع سے تمام روئے زمین آدمیوں کی ایک ہی حالت چلی آئی ہو تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا اور وقتی اور مقامی خصوصیتوں کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی حالتیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں کسی جگہ ایک زمانے میں لڑائی بھڑائی کے چرچے رہے ہیں تو دوسرے وقت شعر شاعری کے۔ بعض لوگ شان دار عمارتوں کے دلدادہ رہے ہیں کتنے حسن پرستی کے چوری رہزنی ڈکیتی کم تولنا۔ کم ناپنا۔ ابھی تک بھی دُنیا ان جرائم سے پاک نہیں۔ غرض حضرت آدم کی اولاد ایسی بے چین اور چلبلی اولاد ہے کہ ان کا کوئی وقت فساد سے محفوظ نہیں رہا ہے ایسی ہی بداعمالیوں کی روک تھام کے لیئے لوگوں کی مناسب حالت خدا وقتاً فوقتاً پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہے۔ آدمی جسم و روح دو چیزوں سے مرکب ہے تو اس کے امراض اور علاج بھی دو طرح کے ہیں۔ طبّ کی کتابیں امراض جسمانی کا علاج کرتی ہیں اور مذہبی کتابیں امراض روحانی کا۔ جالینوس طبیب الابدان ہے۔ تو پیغمبر طبیب الارواح۔ بید اور طبیب یونانی۔ اور ڈاکٹر کا طرز علاج گو مختلف ہو مگر مقصود علاج سب کا متحد ہے۔ اصلاح بدن۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو خدا نے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

تعلیم فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ ہم برابر کے درجے میں تمام پیغمبرانِ خدا کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس سے کہ اسلامی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے پچھلے پیغمبروں کی کسی طرح کی توہین لازم نہیں آتی جیسے اس سے کہ ہم اس وقت ایڈورڈ ہفتم کی رعایا ہیں شاہانِ سلف کی۔ انبیاءِ سابقین علیہم السلام کی تعظیم کا مسئلہ بھی نازک اور احتیاط طلب مسئلہ ہے۔ انبیاءِ سابقین کی اُمتوں نے بعض کے ادب میں افراط کی کہ اُن کو خدا اور خدا کا بیٹا بنایا تو ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ مسلمان اُن کے ادب میں تفریط کرتے ہیں جو لانفرق بین احد من رسلہ کے صریح خلاف ہے۔ پادریوں نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید یعنی توریت اور صحفِ سماوی اور انجیل کی اشاعت میں اتنا مبالغہ کیا کہ ہر ملک اور ہر زبان میں لاکھوں کروڑوں کتابیں چھپوا چھپوا کر مفت تقسیم کرتے پھرتے ہیں بے شک ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ کتابیں منسوخ العمل ہیں اور کہیں کہیں یہودی اور عیسائی ان میں تحریفِ معنوی بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی خدائے پاک کا کلام پاک ہے اور اُس کا ادب واجب۔ مگر مسلمان ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں کہ عطار ان کے اوراق سے پڑیاں بناتے یا شبِ برات میں لوگ ان کو پٹاخوں کے کام میں لاتے یا دوسری طرح پر ان کی بے توقیری کرتے ہیں یہ طریقِ عمل سخت بیہودہ اور موجبِ معصیت ہے۔ اِن کتابوں کی توہین عین انبیاء علیہم السلام کی توہین ہے اور انبیاء کی توہین عین خدا کی[۱] اَعَاذَنَا اللّٰہُ وَسَائِرَ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْہَا فَاِنَّہُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ جس طرح تبرائی شیعوں کی ضد میں گروہ خوارج کھڑا ہوا اسی طرح عیسائیوں کی ضد میں جو مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں کچھ متعصب اور غالی مسلمان کھڑے ہو گئے ہیں جو ولادتِ مسیح علیہ السلام کو گوبر کے کیڑے کی ولادت سے تشبیہ دیتے ہیں اور عیسائیوں کی دعاءِ طلبِ رزق کو انکر الاصوات لصوت الحمیر سے۔ اگر لوگوں نے افراط فی الادب کر کے مسیح علیہ السلام کو خدا بنایا تو اس میں مسیح علیہ السلام کا کیا قصور ہے[۲] وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰہَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ مَا قُلْتُ لَہُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْہِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ مناظرہ جب

---

[۱] خدا ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس بیہودگی سے محفوظ رکھے (اے پیغمبر یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ (یہ) ظالم (حقیقت میں) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں

[۲] اور (قیامت کے دن یہ معاملہ بھی پیش آئے گا کہ) اُس دن اللہ (عیسیٰ سے) پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ خدا کے علاوہ مجھکو اور میری والدہ کو (بھی) دو خدا مانو (عیسیٰ) عرض کریں گے کہ اے پروردگار تیری ذات پاک ہے مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ (میں تیری شان میں) ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو میرا کہنا تجھکو ضرور ہی معلوم ہوا ہوگا کیوں کہ تو (تو) میرے دل (تک) کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا غیب کی باتیں تو تو ہی خوب جانتا ہے تو نے جو مجھکو حکم دیا تھا بس وہی میں نے ان لوگوں کو کہہ سنایا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہارا (سب کا) پروردگار ہے اُسی کی عبادت کرو اور جب تک میں ان لوگوں میں (موجود) رہا میں ان کا نگران (حال) رہا پھر جب تو نے مجھکو (دنیا سے) اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے ۱۲

حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ مجادلہ کہلاتا ہے۔ ان وقتوں کے مسلمانوں کو جو نیک صلاح دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی غیر مذہب کے ساتھ مناظرے کے پہلو پر نہ آئیں۔ اور اگر بضرورۃ آنا پڑے تو مناظرے کو مجادلے کی حد میں نہ آنے دیں اور وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ کی تعلیم مفید کو پیش نظر رکھیں۔ اوّل تو لوگ عموماً دین کی طرف سے غافل ہیں صرف قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کے لالے پڑے ہیں کسی کو کیا پڑی ہے کہ منسوخ کتابوں کا مطالعہ کیا کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص دین کی باتوں میں توغل کرے اور وہ مجتہدانہ پچھلی کتابوں کو دیکھتا پڑھتا رہے تو ہم اس کو کسی طرح کا الزام نہیں دے سکتے۔ یہ خیال کرنا کہ پچھلی کتابوں کے پڑھنے سے آدمی اسلام کی طرف سے متشکّی ہو جائے گا۔ واہمہ بے اصل ہے ہم نے تو عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کو بالاستیعاب انگریزی عربی فارسی اردو چاروں زبانوں میں بار بار پڑھا ہے۔ اور پادری سکاٹ سے انجیل کی تفسیر بھی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے قرآن کی قدر آئی۔ اور جس کو تاریخی مذاق ہے اُس کے حق میں تو پچھلی کتابوں کا دیکھنا از بس ضرور ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اُس کو قرونِ خالیہ کے لوگوں کی حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی اُفتادِ مزاج اور الٰہی تربیت۔

اقتدا قرآن کی چند آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا اصلِ دین ایک تھا اور سب اسی اصلِ دین پر متفق تھے اُن میں اگر اختلاف ہوا ہے تو اصلِ دین میں نہیں بلکہ اُس کے طریقوں میں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اُن پر ایمان لانا اُن کی شریعتوں کو برحق جاننا۔ اُن کی کتابوں کا یقین کرنا۔ اصلِ دین میں اُن کی اقتدا کرنا۔ نفسِ نبوت میں ایک کو اعلیٰ دوسرے کو ادنیٰ ایک کی تعظیم دوسرے کی تنقیص نہ کرنی فرض ہے اور تاوقتیکہ ہم ان باتوں کی پورے طور پر تعمیل نہ کریں مسلمان نہیں۔ اِس امر کی تفصیل کہ انبیاء علیہم السلام کا اتفاق کن کن باتوں میں رہا ہے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب خاتم النبیین محمد صلے اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء و رسل ہو گزرے ہیں۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادت و استعانت صرف خدا کا حق ہے جو باتیں خدا کی بارگاہِ قدس کے نامناسب ہیں اُن سے وہ پاک اور منزّہ ہے۔ بندوں پر خدا کا حق ہے کہ اُس کی انتہا درجے کی تعظیم کریں۔ اپنی جانوں اور دلوں کو خدا کے حوالے کر دیں۔ شعائر اللہ کے ذریعے سے قربِ خداوندی حاصل کریں اور اس بات کا پکّا اعتقاد رکھیں کہ حوادث کے پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا نے حوادث کو مقدر کر دیا تھا۔ فرشتے خدا کے بندے ہیں وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے انھیں جو حکم ملتا ہے اُس کی تعمیل کرتے ہیں اور بڑی سرگرمی سے تعمیل کرتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں میں سے جس کو مستحق اور قابل سمجھتا ہے اُس پر کتاب نازل فرماتا ہے۔ اپنی اطاعت بندوں پر فرض کرتا ہے۔ قیامت کا برپا ہونا مرے پیچھے جی اُٹھنا۔ جنّت و دوزخ کا ہونا سب حق ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تمام انبیاء علیہم السلام۔ اقسامِ طہارت اور نماز۔ روزہ زکوٰۃ۔ حج۔ نوافل۔ طاعت دعا ذکر۔ کتابِ الٰہی کے تلاوت کے ذکر سے خدا کے حضور میں تقرب حاصل کرنے پر متفق ہیں۔ نکاح اور حرمتِ زنا پر متفق ہیں۔ عدل و انصاف قائم کرنے پر متفق ہیں۔ ہر طرح کے ظلم کو حرام بنانے پر متفق ہیں۔ نافرمانوں پر حدود قائم کرنے میں متفق ہیں۔ یہ باتیں اُمورِ دین کی بیخ و بنیاد ہیں۔ اور ان پر تمام انبیاء

علیہم السلام کا ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے۔ ان ان کی صورتوں اور شکلوں میں کچھ کچھ اختلاف ہو گیا۔ مثلاً شریعت موسوی میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف مونہہ کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے پیغمبر کی شریعت میں کعبے کی طرف مونہہ کر کے نماز پڑھنی ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی حد سنگساری تھی۔ ہماری شریعت میں محصن کے لیے رجم اور غیر محصن کے واسطے تازیانے مقرر ہیں اور اسی پر قیاس کر لو اوقات طاعت اور آداب طاعت۔ اور ارکان طاعت کو۔ الغرض ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ انبیا علیہم السلام کے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کر کے اصل شریعت میں ان کی پوری پوری اقتدا کریں۔ اور سب کو خدا کے برگزیدہ اور مقبول بندے جانیں ان میں سے ایک کی فضیلت اور دوسرے کی منقصت کے قائل نہ ہوں۔ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بعض خصوصیات میں تمام انبیا و مرسلین سے افضل ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں درست ہے کہ ان کی فضیلت و برتری اوروں پر ثابت کریں مگر اس کو کیا کریں کہ خود پیغمبر صاحب نے ہمیں اس سے منع کر دیا ہے۔ امام بخاری[1] نے ایک حدیث بایں مضمون نقل کی ہے کہ ایک یہودی اور ایک صحابی میں کچھ تکرار ہو گئی۔ یہودی حضرت موسیٰ کی برتری

[1] بخاری شریف میں یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے اور ہر طریق میں دوسرے طریق کی نسبت بعض الفاظ کی تقدیم و تاخیر اور کمی بیشی بھی ہے اسی لیے حضرت مولف ادام اللہ ظلال فضلہ علینا وعلی سائر المسلمین نے حدیث کا خلاصہ مطلب بیان کرنے پر اکتفا کیا اور الفاظ کی پابندی کے لحاظ سے ترجمہ نہیں فرمایا ہے۔ اس جگہ ان طرق میں سے دو طریقے نقل کر دیا ہوں جس سے حدیث کے الفاظ اور ترجمہ حدیث کی خوبی ناظرین پر واضح ہو جائے گی ۱۲ محمد رحیم بخش عفا اللہ عنہ

پہلا طریق: عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَرَجُلٌ مِنَ الْيَهُودِ فَقَالَ الْمُسْلِمُ وَالَّذِي اصْطَفَى مُحَمَّدًا عَلَى الْعَالَمِينَ فِي قَسَمٍ يُقْسِمُ بِهِ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ وَالَّذِي اصْطَفَى مُوسَى عَلَى الْعَالَمِينَ فَرَفَعَ الْمُسْلِمُ يَدَهُ عِنْدَ ذَلِكَ فَلَطَمَ وَجْهَ الْيَهُودِيِّ فَذَهَبَ الْيَهُودِيُّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ أَمْرِهِ وَأَمْرِ الْمُسْلِمِ فَدَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمَ فَسَأَلَهُ عَنْ ذَلِكَ فَأَخْبَرَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسَى فَإِنَّ النَّاسَ يُصْعَقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَصْعَقُ مَعَهُمْ فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ يُفِيقُ فَإِذَا مُوسَى بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِي أَكَانَ فِيمَنْ صَعِقَ فَأَفَاقَ قَبْلِي أَوْ كَانَ مِمَّنِ اسْتَثْنَى اللّٰهُ فَقَالَ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ۔

دوسرا طریق: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا يَهُودِيٌّ يَعْرِضُ سِلْعَتَهُ أُعْطِيَ بِهَا شَيْئًا كَرِهَهُ فَقَالَ لَا وَالَّذِي اصْطَفَى مُوسَى عَلَى الْبَشَرِ فَسَمِعَهُ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَامَ فَلَطَمَ وَجْهَهُ فَقَالَ تَقُولُ وَالَّذِي اصْطَفَى مُوسَى عَلَى الْبَشَرِ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَذَهَبَ إِلَيْهِ فَقَالَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ إِنَّ لِي ذِمَّةً وَعَهْدًا فَمَا بَالُ فُلَانٍ لَطَمَ وَجْهِي فَقَالَ لِمَ لَطَمْتَ وَجْهَهُ فَذَكَرَهُ فَغَضِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى رُئِيَ فِي وَجْهِهِ ثُمَّ قَالَ لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ فَإِنَّهُ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَيَصْعَقُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ أُخْرَى فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ بُعِثَ فَإِذَا مُوسَى آخِذٌ بِالْعَرْشِ فَلَا أَدْرِي أَحُوسِبَ بِصَعْقَتِهِ يَوْمَ الطُّورِ أَمْ بُعِثَ قَبْلِي وَلَا أَقُولُ إِنَّ أَحَدًا أَفْضَلُ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى ؛

ثابت کرتا تھا اور صحابی پیغمبر صاحب کو حضرت موسیٰ پر ترجیح دیتے تھے۔ آخر کار صحابی کو غصہ آگیا اور اُنھوں نے یہودی کے مونھ پر زور سے طمانچہ مارا۔ وہ آیا پیغمبر صاحب کے پاس۔ آپ نے سارا قصہ سُن کر فرمایا کہ مجھے حضرت موسیٰ پر ترجیح نہ دو کیوں کہ قیامت کے روز جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے اور تمام اوّلین و آخرین بیہوش ہو کر ہوش میں آئیں گے تو موسیٰ عرش کا کونہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی اَور لوگوں جیسے بیہوش ہوں گے یا نہیں۔ بخاری کی ایک اَور روایۃ میں آیا ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو ! تم یونس بن متّٰی پر میری فضیلۃ اور برتری ثابت نہ کرنا۔

سچ کہا ہے کہ الحقوق والفرائض انسانی زندگی خصوصًا اسلامی زندگی کا ایک نہایت جامع اور مکمل دستور العمل ہے جو نہایت محنت نہایت عرق ریزی اور نہایت جانفشانی سے تیار کیا گیا ہے۔ دنیائے اسلام میں اپنی طرز کی یہ پہلی ہی کتاب ہے جو ایک نبض شناس اسلام اور حکیم اُمت اور علامۂ دہر کے قلم سے خاص موقع ضرورت پر لکھی گئی ہے۔ ایسی جامع۔ ایسی مکمل۔ ایسی مفید کتاب آج تک ہم نے تو دیکھی نہیں۔ امام غزالی کی احیاء العلوم۔ کیمیائے سعادت۔ اور جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی احقاق الحقوق بے شک عمدہ و اچھی کتابیں ہیں۔ مگر جو جامعیت۔ جو آراستگی جو ترتیب جو تفصیل و توضیح آپ اس میں دیکھیں گے وہ کسی دوسری کتاب میں نہ پائیں گے۔ مصنف علّام نے انسان کے تمام تعلّقات کو قرآن سے چُن کر انسانی فرائض کو الگ الگ کر کے دکھایا ہے۔

الحقوق والفرائض کا ہر ایک عنوان موٹے حرفوں میں لکھا ہے۔ عنوان کے نیچے جلی اور نہایت خوشنما عربی خط میں قرآن کی آیت لکھی ہے۔ آیت کے مقابلے میں ترجمہ ہے اور فٹ نوٹ میں اُس کا فائدہ یا شان نزول۔ پھر ایک موٹی جدول کھینچ کر آیت کے متعلق معتبر حدیث ہے جس کی ضرورت سمجھی گئی اور جہاں آیت نہیں وہاں نری حدیث ہے۔ آیت اور حدیث کے ذیل میں عنوان کے متعلق بہت سے جزوی مسائل کا بیان ہے۔ اور ان سب کے بعد مصنف نے اپنی طرف سے توضیح کے طور پر نہایت دل چسپ اور شگفتہ پیرائے میں ایسی عمدہ اور جامع تقریر کی ہے جس سے تمام مطالب سابقہ پڑھنے والے کے فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

الحقوق والفرائض کی تینوں جلدیں اسی ترتیب سے لکھی گئی ہیں۔ پہلی جلد میں تین سو اڑتالیس[۳۴۸] مضامین ہیں۔ جو حسب ذیل عنوانوں کے تحت میں درج ہیں۔ تمہید۔ حقوق اللہ۔ ایمان باللہ۔ ایمان بالانبیاء۔ ایمان بالکتب۔ ایمان بالملائکہ۔ ایمان بالیوم الآخر۔ ایمان بالقدر۔ توحید۔ ممانعت شرک۔ رجاء۔ خشیۃ و رہبۃ و تقویٰ۔ اطاعت۔ ایفائے عہد۔ انابت و رجوع۔ تسلیم و رضا۔ توکل۔ استقامت۔ خدا کی عظمت۔ حمد و ثنا۔ تسبیح و تقدیس۔ ذکر اللہ۔ ذکر نعمت۔ شکر۔ دعا۔ توبہ و استغفار۔ استعاذہ استعانت۔ خشوع و خضوع۔ تضرع و عجز۔ نماز کی دعائیں۔ افتراء علی اللہ۔ آیات الٰہی سے استہزاء نہ کرنا۔ صلوٰۃ۔ طہارت۔ نجاستِ حقیقی داخلی کا نقشہ جس سے نجاست کی قسم نجاست کا محل نجاست کے ازالہ کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ نجاستِ حقیقی خارجی کا نقشہ۔ نجاستِ حکمی داخلی کا نقشہ نجاستِ حکمی خارجی کا نقشہ۔ مکروہاتِ داخلی کا نقشہ۔ نقشہ مکروہاتِ خارجی۔ پیشاب پاخانے کے آداب۔ بیانِ حیض

مسائلِ نفاس - حکمِ استحاضہ - غسلِ جنابت - تیمم - وضو - مساجد کا بیان - نماز کے اوقات - جمع بین الصلاتین -
اذان کی فضیلت اور اس کے احکام - نماز کی شرائط وارکان - استقبالِ کعبہ اور ترکیبِ نماز - ستر کا بیان - نمازِ فجر
کی کیفیت - نمازِ ظہر کی کیفیت - نمازِ عصر کی کیفیت - نمازِ مغرب کی کیفیت - نمازِ عشاء کی کیفیت - نماز سے فارغ
ہونے کے بعد کے اوراد - نمازِ جماعت کی فضیلت اور اس کی تاکید - امامت - فوت شدہ نمازوں کی قضا - نمازِ
تہجد و تراویح - نمازِ وتر - ان باتوں کا ذکر جو نماز میں جائز یا ناجائز ہیں - قرآنی آیات کے جوابات - اشراق وچاشت
کی نمازیں - صلوٰۃ التسبیح - نمازِ استخارہ - نمازِ حاجت - نمازِ جمعہ - نمازِ عیدین - نمازِ استسقاء - نمازِ کسوف وخسوف
نمازِ خوف وسفر - سجدۂ سہو - سجدۂ شکر - نمازِ جنازہ - روزہ - زکوٰۃ - مسائلِ زکوٰۃ - حج - حقوقِ قرآن -
خدا کی قدرت کی نشانیوں میں غور کرنا - خدا کی قسم کا ادب - کفارۂ قسم -

الحقوق والفرائض حصۂ دوم میں چھیاسٹھ پانچ مضامین ہیں جو مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت میں درج
ہیں - تمہید یا دیباچہ حصۂ ثانی - حقوقِ پیغمبر - تمام پیغمبروں کے حقوق - حقوق النفس - حقوقِ علماء - حقوقِ معلم
حقوقِ حاکم - حقوقِ رعایا - حقوقِ والدین - حقوقِ اولاد - حقوقِ زوجین - حقوقِ قرابت - حقوقِ ہمسایہ - مہمانوں
کے حقوق - میزبانوں کے حقوق - حقوق السائل - حقوقِ یتامیٰ - لونڈی غلاموں کے حقوق - آقاؤں کے حقوق
فقراء اور مساکین کے حقوق - حقوقِ احباب - حقوقِ دشمن - حقوقِ اہلِ کتاب - حقوقِ نصاریٰ - حقوقِ اہلِ معاملہ -
تجارت کے حقوق - حقوقِ عامۂ عباد - حقوقِ میت -

الحقوق والفرائض حصۂ سوم میں تقریباً پانسو مضامین ہیں جو مندرجۂ ذیل عنوانوں کے ذیل میں درج ہیں - ایک
مفید دیباچے کے بعد - فضائلِ قوتِ غضبیہ - ثبات اور استقلال و استقامت - علوِ ہمت - آہستگی - غصے کو پی جانا -
صبر - حلم وتحمل - صدق و راستی - عفو و درگزر - رفق ونرمی - تواضع اور ملنساری - حفظِ لسان - کم گوئی - رذائل
قوتِ غضبیہ - تعصب - کینہ - سخت دلی اور درشت مزاجی - لوگوں پر آوازے کسنا - برے لقب سے پکارنا -
تمسخر - گالی دینا - مار پیٹ - قتل - ترکِ ملاقات - ظلم - سخن چینی وچغلخوری - غیبت - نفاق و دوروئی - فضائلِ قوتِ
شہویہ - حیا - توکل - صبر و قناعت - جود و سخا - ایثار و کرم - رحم - باہم محبت اور میل جول - امانت - ایفاءِ وعد -
رذائلِ قوتِ شہویہ - کبر و غرور - فخر - دکھاوا اور شہرت - حرص و طمع - حبِ دنیا - حسد - اسراف - خیانت - بہتان -
کتاب الآداب کا دیباچہ - آداب التفقہ والتسمیہ - آداب الاسامی - آداب بیت الخلاء - آداب البول - آداب الحمام -
آداب الغسل - آداب التنفس - آداب العلم والتعلم - آداب المصحف - آداب التلاوۃ - آداب الدعاء - آداب القسم - آداب المساجد -
آداب کعبہ - آداب مکہ و مدینۃ الرسول - آداب عالم و متکلم - آداب خط وکتابت - آداب ملاقات - آداب السلام -
آداب الصحبۃ - آداب المجلس - آداب الجلوس - قیام و تعظیم - آداب النوم - آداب الرؤیا - آداب الیقظہ - آداب المشی -
آداب الطریق - آداب السوق - آداب اکل و شرب - آداب الخلال - حقے پان کے آداب - آداب الضحک - آداب البکاء -
چھینکنے اور جمائی لینے کے آداب - آداب اللباس - انگوٹھی پہننے کے آداب - جوتی پہننے کے آداب - سر اور ڈاڑھی کے

بالوں کے آداب - آداب الطب و الرقی - آداب السفر - آداب اللسان - کان کے آداب - آداب السماع - شکار و ذبح کے آداب - آداب البیع - آداب النکاح - آداب المباشرت - آداب الولیمہ - آداب عیادتِ مریض - قریب الموت کے پاس بیٹھنے والوں کے آداب - میّت کے غسل اور تکفین کے آداب - جنازے کے ساتھ چلنے کے آداب -

بھلا کون نہیں کہہ سکتا ہے کہ الحقوق والفرائض کی تینوں جلدیں اسلامی زندگی کا جامع دستور العمل نہیں ہیں جیسے جیسے معاملات آدمی کو دنیا میں پیش آتے ہیں سب کے بارے میں حکم و ہدایت اس دستور العمل میں موجود ہے اور اس جامعیت کے ساتھ موجود ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی مسئلہ بھی ایسا نہیں جو اس میں نہ ہو - اس کی جامعیت کی ادنیٰ مثال الحقوق والفرائض کے عنوانوں سے اور عنوانوں کے تحت میں جو ہزارہا مضامین درج ہیں اُس سے ظاہر ہے - اور اگر اس جامعیت کی کوئی اَور کتاب ہے تو ناظرین ہم کو بتائیں - ورنہ بقول مصنّف چاہیئے کہ ہر مسلمان جو اسلام کا دم بھرتا ہے اور اُردو پڑھ سمجھ سکتا ہے اس دستور العمل کا ایک نسخہ اُس کے پاس ہو اور ہر مسلمان کے پاس نہ ہو تو گیا گزرا ہر مسلمان خاندان میں تو ہو - ورنہ پھر نہ کہنا کہ ہم کو کسی نے سُنایا سمجھایا نہیں اور کہو گے تو سُنے گا کون وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

تاریخ دربارِ تاج پوشی

مشہور و معروف دربارِ تاج پوشی شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جو یکم جنوری سنہ ۱۹۰۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا - اور جس کے حالات نہایت مشرح طور پر انگریزی زبان میں مسٹر اسٹیفن وھیلر نے حسب الحکم والسرائے و گورنر جنرلِ ہند لکھے تھے - اس کا ترجمہ ہمارے مولانا نے حسب الحکم گورنمنٹ آف انڈیا اُردو زبان میں ایسا نفیس کیا ہے کہ کہیں سے بھی ترجمہ نہیں معلوم ہوتا - بلکہ وہ مستقل اُردو زبان کی ایک کتاب معلوم ہوتی ہے -

گورنمنٹ آف انڈیا نے مبلغ ایکہزار روپیہ حق الترجمہ تجویز کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ رقم آپ کو دی جائے گی لیکن مولانا نے اس رقم کو اس شکریئے کے ساتھ واپس کیا کہ مَیں برٹش گورنمنٹ کی رعایا ہوں - اور وفادار رعایا ہوں اُس نے مجھے پڑھایا - نوکریاں دیں - عزّت و آبرو بڑھائی - بس یہی بہت بڑا اور بہترین حق الترجمہ میرے لیئے ہے کہ مَیں اس کتاب کا ترجمہ کروں - اور وہ چھپے - دربارِ تاج پوشی کے ترجمے کے صفحات قریباً ۵۹۶ ہیں - نمونے کے طور پر لارڈ کرزن کی اسپیچ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے -

دربارِ دہلی میں لارڈ کرزن کی اسپیچ

اے شہزادگانِ والا تبار و روسا رعالی وقار و متوطنانِ مملکتِ ہند پانچ ماہ کا عرصہ ہوا کہ بادشاہِ انگلستان و شہنشاہِ ہند اڈورڈ ہفتم نے لندن میں انگلستان کا تاجِ شاہانہ سر پر رکھا اور عصاءِ حکومت کو دستِ مبارک میں لیا اُس وقت

لے اور جب یہودیوں میں سے بعض لوگوں نے (دوسرے لوگوں سے جو حکم خدا کے مطابق ہفتے کے دن شکار کرنے سے منع کرتے تھے) کہا کہ جن (نافرمان) لوگوں کو خدا ہلاک کرنا یا اُن کو عذابِ سخت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے (بھلا اُن کو) تم (بے فائدہ) کیوں نصیحت کرتے ہو اُنھوں نے جواب دیا کہ (ہم تو) تمھارے پروردگار کی جناب میں (اپنے اوپر سے) الزام اُتارنے کی غرض سے نصیحت کرتے ہیں اور (یہ بھی) خیال ہے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں ۱۲

ممالکِ ہند کے صرف چند ہی وکیل اپنی خوش قسمتی سے حاضر تھے۔ لیکن آج شہنشاہِ معظم نے اپنے الطافِ خسروانہ سے
تمام اہلِ ہند کو یہ موقع دیا ہے کہ ایک ویسی ہی خوشی میں شریک ہوں اور آج یہاں یا ہند کے دیگر حصص میں اس عالیشان
تقریب کی خوشی میں کل رؤسا و امراء و سردار جو عمائدِ سلطنت ہیں اور تمام دیسی و یوروپین حکام جن کے ہاتھ میں
زمامِ حکومت ہے۔ اور جو ایسی دانائی اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں جس کی نظیر نہیں مل سکتی اور کل انگریزی اور
دیسی فوج جو ایسی نہایت اعلیٰ درجے کی بہادری سے سرحد کی حفاظت کرتی ہے اور لڑائیوں میں اپنا خون بہاتی ہے
اور تمام باشندگانِ ہند بلا امتیازِ ملت اپنے رسوم و رواج کے جو باوجود لاکھوں طرح کے جھگڑوں کے سلطنتِ برطانیہ
کی اطاعت کے اظہار میں یک زبان ہیں جمع ہیں صرف اس غرض سے کہ میں اعلیٰ حضرت کی رسوماتِ تاج پوشی کو
ہندوستان میں ادا کروں حضورِ ملکِ معظم نے مجھ کو بحیثیت وائسرائے کے اس دربار کے منعقد کرنے کا حکم دیا
ہے اور صرف اس امر کے اظہار کے لیئے کہ اعلیٰ حضرت کی نظروں میں اس دربار کی بڑی وقعت ہے انھوں نے اپنے
برادرِ حقیقی ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ کو اس جلسے میں شریک ہونے کی غرض سے روانہ فرما کر ہم کو عزت بخشی
ہے۔ چھبیس سال ہوئے کہ آج ہی کے دن اور اسی شہر میں جو ہمیشہ سے شاہانہ جلسوں اور دیگر رسوم کا مرکز رہا ہے
اور اسی مقام پر ملکہ وکٹوریہ مرحومہ مغفورہ کے خطاب قیصرِ ہند اختیار فرمانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس دربار سے ملکۂ
آنجہانی کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ اپنی گہری محبت کا اظہار مقصود تھا اور ساتھ ہی یہ بھی جتلانا تھا کہ اب
سلطنتِ انگریزی کے سایے میں ان کے باہمی نفاق فرو ہو گئے اور وہ سب یکجہت ہیں ہم آج خدا کے فضل سے
ایک چوتھائی صدی کے بعد بھی پہلے سے کہیں زیادہ متفق ہیں یہ شہنشاہ جس کے اظہارِ اطاعت کے لیئے آج ہم
سب جمع ہوئے ہیں اہلِ ہند کی نظروں میں کچھ کم عزیز نہیں ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھا
ہے اور اپنے کانوں سے ان کی آواز سنی ہے وہ آپ اس تخت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں جو صرف شان داری ہی نہیں
بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ دیرپا ہے اور وہ حقیقت میں انگریزی سلطنت ہے جس کی بڑی قوت ہندوستان کی مقبوضات
رعایا کی جان نثاری حضورِ ملکِ معظم کی اطاعت پر مبنی ہے اور جو معترض اس سے منکر ہے وہ بالکل نادان ہے جیسا کہ ہندوستان
اپنے قدیم افسانوں سے مالا مال ہے ویسا ہی وہ اپنی خصلتِ وفاداری پر نازاں ہے جس کو مغرب نے از سرِ نو مشتعل کر دیا ہے
مختلف صدیوں میں ہزارہا لوگوں نے ہند کی خواستگاری کی مگر اس نے اپنے تئیں ایسی سلطنت کے حوالے کیا
جس کو اس کی وفاداری پر پورا اعتماد تھا۔
تماشہ جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دنیا میں ایسا اور کہیں ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا میرا مطلب
اس وقت اس عظیم الشان ازدحام سے نہیں جس کو میں بے نظیر خیال کرتا ہوں۔ بلکہ میری مراد اس مجمع کی غرض اصلی
ہے اور ان اصحاب سے جن کے دلی ولولوں کا یہ اظہار کر رہا ہے ۵۵ سے زیادہ مختلف ریاستوں کے حکمران جن کی
رعایا کی کل آبادی ۶۲ کروڑ سے کم نہیں اور جن کی عملداری کے حدود طول بلد کے ۵۵ درجوں پر پھیلی ہوئی ہیں اس وقت
اپنے ایک بادشاہ کی اطاعت کی توثیق کے لیئے حاضر ہیں ہم ان کے اس وفادارانہ جوش کی جس سے ان کو ہزاروں کوس

سے باوجود بڑے بڑے فاصلوں کے دہلی کھینچ بلایا ہے بڑی قدر کرتے ہیں اور مجھ کو تھوڑی دیر میں بہت فخر حاصل ہوگا جب کہ میں خود اُن کی زبان سے شہنشاہِ ہند کی تہنیت کے پیغام سنوں گا جو فوجی افسر اور سپاہی اس وقت موجود ہیں یہ ہندوستان کی دو لاکھ تیس ہزار فوج سے انتخاب کیے گئے ہیں جنھیں اس بات پر ناز ہے کہ وہ شہنشاہ کی فوج ہیں دیسی امرا عہدہ دار یا غیر عہدہ دار جو اس وقت موجود ہیں وہ ۲۳ کروڑ سے زیادہ آبادی کے قائم مقام ہیں اس حساب سے میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دربار میں دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ بذاتِ خود اور کچھ بذریعہ وکیلوں اور اپنے حکمرانوں کے جمع ہے سب کے دل میں ایک ہی جوش ہے اور سب کے سر بہ تسلیم سریرِ سلطنت کے سامنے خم ہیں اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر کونسی بات ہے جس نے اس جمِ غفیر کو کھینچ بلایا ہے تو جواب دیا جائے گا بادشاہ کے ساتھ وفاداری یعنی اُن کی عطوفت اور انصاف پر اعتماد اور اُن کا یہ بھروسا ایک خیالی بات نہیں بل کہ اِن کے ذاتی تجربے کا نتیجہ ہے اور اِن کے دلی یقین کا اظہار ہے کیوں کہ ملکِ معظم کی گورنمنٹ نے اس وسیع آبادی کے اکثر حصوں کو حملوں اور بدامنی سے آزادی دے دی ہے سیکڑوں کے حقوق کی وہ حفاظت کرتی ہے اور سیکڑوں کے واسطے معزز روزگار کے فراخ راستے کھول دیے ہیں۔ اور تمام کے واسطے یکساں انصاف کرنے ظلم سے بچانے اور تہذیب اور امن کی برکتوں کے پھیلانے میں کوشش کرتی ہے اور ایسی سلطنت پر قابض ہونا اول تو آسان کام نہیں پھر اُس کو ایمانداری اور منصفانہ طور سے چلانا اُس سے بھی مشکل کام ہے۔ اور سب میں اہم یہ امر ہے کہ سب کو برابر سیاست سے شیر و شکر کر دے۔ یہی مقاصد و اغراض مدِ نظر ہیں جس لیے آج یہ دربار کیا گیا ہے اب میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے روبرو حضور ملکِ معظم کا وہ شفقت آمیز پیغام پڑھوں جس کی بابت اعلیٰحضرت نے آپ کو سنانے کے لیے مجھے ارشاد فرمایا ہے۔ وھو ہذا۔

ما بدولت کو اس بات سے نہایت مسرت ہے کہ ہم اپنی ہندوستانی رعایا کو ایسے موقع پر جبکہ وہ ما بدولت کی رسم تاج پوشی کر رہے ہیں پیغامِ تہنیت بھیجیں۔ لندن کی تاج پوشی کے جلسے میں ہندوستانی رؤسا اور قائم مقاموں کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد شریک ہوئی تھی۔ اس لئے ما بدولت نے وائسرائے اور گورنر جنرل کو اس امر کی ہدایت کی کہ دہلی میں ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا جائے تاکہ تمام دیسی رؤسا امرا حکام گورنمنٹ اور اہلِ ہند کو اس مبارک رسم کے ادا کرنے کا موقع ملے جس وقت ما بدولت ۱۸۷۵ء میں ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ اُس زمانے سے ہند اور اہلِ ہند کی محبت ہمارے دل میں جاگزیں ہے۔ ما بدولت کے خاندان اور تاج و تخت کے ساتھ اُن کو جو دلی اور سچی محبت ہے وہ بھی ما بدولت پر خوب روشن ہے۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں ان کی محبت اور جان نثاری کی بہت سی شہادتیں ما بدولت کے سامنے گزر چکی ہیں اور مختلف معرکوں میں ہماری ہندوستانی افواج نے جو کارہائے نمایاں کیے ہیں اُن سے ما بدولت بخوبی واقف ہیں۔ ما بدولت نہایت وثوق سے اُمید کرتے ہیں کہ تھوڑے عرصے میں ہمارے فرزند دلبند شہزادہ ویلز اور اُن کی بیگم صاحبہ پرنس آف ویلز ہندوستان میں رونق افروز ہوں گے اور ایسے ملک سے ذاتی واقفیت حاصل کریں گے جس کی بابت ما بدولت کی یہ تمنا رہی ہے کہ وہ اُس کو جا کر دیکھیں اور خود ان کو بھی [illegible] اگر ما بدولت کا تشریف لانا ہندوستان میں ممکن ہوتا تو نہایت خوشی سے آتے۔ مگر چوں کہ

یہ بات نہ ہو سکی اس لیے ماید ولت اپنے برادر عزیز ڈیوک آف کناٹ کو جن کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے -
روانہ فرماتے ہیں تاکہ جلسۂ تاج پوشی میں شاہی خاندان کے قائم مقام بن کر شریک ہوں -
جب سے کہ ماید ولت اپنی والدہ مکرمہ معظمہ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ مغفورہ اول قیصر ہند کے تخت پر جانشین ہوئے
ہیں ہماری یہ تمنا رہی ہے کہ ہم انصاف اور انسانیت کے وہی اصول برتیں جن سے حکومت کر کے ہماری مادر مشفقہ
نے اپنی رعایا کے قلوب میں اپنی بزرگی اور عزت پیدا کر لی تھی ماید ولت اپنے تمام باج گزاروں اور اہل ہند کے ساتھ
یہ وعدہ پھر تجدید کرتے ہیں کہ اُن کی آزادی کو قائم رکھیں گے اُن کے مراتب اور حقوق کی پاس داری کریں گے
اور اُن کی بہبودی کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑیں گے یہی اصول اور اغراض ماید ولت کے مد نظر ہیں اور
خداوند عالم کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ ان سے قلمرو ہند کو سرسبزی حاصل ہوگی اور ہندوستانی رعایا خوش و خرم رہے
گی اے شہزادگان والا تبار و اے اہل ہند - یہ الفاظ اس ملک معظم کے ہیں جس کی رسم تاج پوشی کے ادا کرنے کے لیے
آج ہم سب جمع ہوئے ہیں اُن کا ہر حرف اُن افسروں کے قلوب میں جو اُن کے خدمت گزار ہیں - محرک یا الہام
کا اثر رکھتا ہے - اور ہر ایک نیا دور عام و بلند حوصلگی اور نیک نیتی کا سبق پڑھاتا ہے - یہ الفاظ اُن صاحبان کے لیے جو میرے
یا میرے شرکار کی طرح شہنشاہ معظم کی گورنمنٹ کے بالاصالۃ آلات ہیں درستی اخلاق اور توسیع مملکت کے رہنما ہیں
ہندوستان کا انتظام ہمیشہ اور نیابتی سے کرنے کا خیال جیسا آجکل عروج پر ہے - ایسا کبھی نہیں ہوا - وہ لوگ جنھوں نے
زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں - وہ حقیقت میں زیادہ مستحق آفرین ہیں اور جنھوں نے زیادہ عمدہ کار نمایاں کیے ہیں -
اُن کے حقوق بھی بہت بڑے ہیں - ہندوستان کے رؤسا نے مملکت کی گزشتہ لڑائیوں میں اپنے سپاہی
اور تلواریں ہمارے نذر کیں اور دیگر مصائب میں بھی - مثلاً قحط و خشک سالی وغیرہ میں اُنھوں نے بڑی اولو العزمی اور
بلند ہمتی ظاہر کی - اب جو کچھ اُن کو حاصل ہے - اس سے زیادہ اور کیا دیا جا سکتا ہے - یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے - کہ جو
امن و عافیت اُن کو حاصل ہے اس میں کبھی کسی طرح کا خلل نہیں آ سکتا تاہم یہ بات ہمارے لیے نہایت باعث مسرت ہے -
کہ سرکار عالیہ اُن قرضوں کا جو ریاستوں کو گزشتہ قحط کے موقع پر دیے گئے ہیں - یا سرکار اُن کی کفیل ہوئی ہے -
تین سال تک کوئی سود نہیں لے گی - اور ہم کو اُمید ہے کہ وہ لوگ جن سے ایسا فیاضی کا سلوک کیا گیا ہے - اس بات کو بخوشی
منظور کریں گے - اس عظیم الشان ملک میں اور جو کثیر التعداد جماعتیں اور فریق ہیں اور جن کی ترقی اور بہبودگی ہماری
دلی تمنا ہے - اُن کو بھی ہم بہت جلد ٹیکس کی کمی کا مژدہ سنائیں گے - سال حالی کے وسط میں اعلان کرنا مناسب نہیں
کیونکہ ایسے موقع پر تخمینہ کرنا نہایت دشوار کام ہے - تاہم اگر موجودہ حالت قائم رہی - اور جیسا کہ ہم اُمید کرتے ہیں ہندوستان
کی مالی بہبودگی کا زمانہ شروع ہو گیا - تو ہم کو اعتقاد کامل ہے کہ اعلیٰحضرت معظم کے عہد سلطنت کے اول ہی زمانے میں سرکار عالیہ
رعایائے ہند کے ساتھ کسی ٹیکس کی تخفیف کر کے ہمدردی اور شفقت کے خیالات ظاہر کرے گی اور جس وقت کہ مجھ کو
اُن کی مصیبت کا زمانہ اور اس موقع پر اُن کا صبر اور اُن کی نمک حلالی یاد آتی ہے - تو تخفیف ٹیکس کی تدابیر سوچنے میں
مجھے نہایت خوشی ہوتی ہے - یہاں اُن رعایتوں اور مہربانیوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں - جن کا دربار

سے خاص تعلق ہے۔ وہ کہیں اَور درج ہیں۔ تاہم فوجی افسروں سے میں اتنا کہنے کا مجاز ہوں کہ آج سے انڈین سٹاف کور کا نام موقوف ہوگیا۔ اور آپ سب ملک معظم کی ہندوستانی افواج سے متعلق ہیں لے اُمرائے عالی وقار و متوطنان ہند جب ہم ہندوستان کے مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں تو بلا خطر خزاں اِس ملک کی ترقی کا باغ سدا بہار نظر آتا ہے ہندوستان کے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں خواہ وہ آبادی کا ہو یا تعلیم کا۔ خواہ محنت کا ہو یا معاش کا جس کو موجودہ تدابیر نے حل نہ کیا ہو بہت سے مسائل کا حل تو اب ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اگر برطانیہ اور ہند کے متعلق افواج سرحد پر مسلسل امن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ہند کے فرمانرواؤں اور رعایا یورپین اور ہندوستانیوں حاکموں اور محکوموں میں اتحاد رہے اور موسم اپنی فیاضی میں مضایقہ نہ کرے تو دیکھیں بھلا ہندوستان کی ترقی کس طرح رُک سکتی ہے۔ ہندوستان بفضلِ کردگار ایک مستقل قحط ناک بدبخت اور نفاق سے بھرا ہوا ہندوستان نہیں ہوگا بلکہ اُس کی تجارت کے چشمے جاری ہو جائیں گے اُس کے باشندوں کی عقلیں بیدار ہو جائیں گی اُس کی بہبود روز افزوں ہوگی اور آرام اور دولت کی ہر طرف ریل پیل ہو جائے گی میں اپنے ضمیر اور اپنے ملک کے مقاصد پر بھروسا کرتا ہوں اور ساتھ ہی مجھ کو اِس ملک کے بے انتہا ترقی کے سامان دیکھ کر یقین ہے۔ کہ ترقی ضرور ہوگی لیکن یہ یاد رہے کہ یہ مستقبل کبھی بصورت حال نہیں ہو سکتا جب تک کہ کسی بے نظیر حکومت کی عظمت نہ تسلیم کر لی جائے۔ اور یہ بات صرف زیرِ سایۂ سلطنتِ برطانیہ ہی ممکن ہے۔

اور اب میں اِس تقریر کو اختتام پر لانا چاہتا ہوں میں اُمید کرتا ہوں۔ اہل ہند کو یہ مجمع عظیم مدّت دراز تک یاد رہے گا اِس اعتبار سے کہ یہاں اِن کو ایک بڑی تقریب کے موقع پر اپنے شہنشاہ کی ذات اور اُن کے خیالات سے معرفت تامہ حاصل ہوئی ہیں اُمید کرتا ہوں کہ لوگ جب جب اِس تقریب کو یاد کریں گے اُن کو فرحت و مسرت ہوگی اور زمانۂ شاہ ایڈورڈ ہفتم کا عہد جس کا آغاز ایسا مسعود ہے تواریخ ہند اور سینۂ اہل ہند میں محفوظ رہے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ فرمانروائے عالم اور قادرِ مطلق کی عنایت سے اُن کی شہنشاہی اور قوت سالہائے دراز تک قائم رہے۔ اُن کی رعایا کی بہبودی روز بروز ترقی کرے اُن کے افسروں کے انتظام پر عقل اور نیکی کی مُہر ثبت ہو۔ اور اُن کی سلطنت کا استحفاظ و بہبود ہمیشہ برقرار رہے۔ خدا کرے ہمارا بادشاہ شہنشاہِ ہند مدّت تک زندہ و سلامت رہے۔

اجتہاد

شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب اُسی قسم کی ہے جیسی کہ رویائے صادقہ ہے اِس میں اُس میں اگر کچھ فرق ہے تو اتنا کہ رویائے صادقہ میں اسلام اور اسلامی فرقوں کے متعلق فاضل مصنف کی جو رائے ہے وہ اُس سے بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ اور اجتہاد سے خالص اسلامی اُصول کو دلائلِ عقلی اور شواہدِ مسلّمہ سے ثابت کیا ہے۔ یہ علم کلام میں بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اسلام کی تائید میں ایسے تشفّی بخش اور یقین دلانے والے اسرار بیان کیے گئے ہیں کہ نوجوان انگریزی خوان جو سائنس اور مذہب کی کشمکش میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے وہ اِس کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں لا مَذہب اِلّا الاسلام مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مقدس اسلام اور اُس کے صاف اور ستھرے ہوئے معتقدات اور اصولِ اعمال سب فطری ہیں۔ علاوہ مصنف نے

ایک طرف اسلام کے پاک عقائد اور مستحکم ارکان کو دینِ فطرۃ ثابت کیا ہے اور دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے معتقدات و اعمال پر ریمارک کرتے ہوئے اُن پر نہایت دیانت اور انصاف سے جائز نکتہ چینیاں کر کے اسلام کی حقانیت کا ایسا زبردست اور لاجواب ثبوت دیا ہے کہ کسی مذہب کا کوئی آدمی جب تک وہ آدمی ہے اور انصاف و راستی کا جوہر رکھتا ہے تسلیم کیے رہ نہیں سکتا۔

اجتہاد میں پانسو چار مضامین مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت میں درج ہیں۔ حمد و نعت کے بعد۔ اسلامی معتقدات۔ خداشناسی۔ توحیدِ باری۔ شرک۔ وجودِ باری۔ دینِ اسلام کی سہولتیں۔ توحید اصل مذہب ہے۔ حسن و قبح کا احساس فطری ہے۔ رسالت۔ پیغمبرِ اسلام کی صداقت۔ معجزات اور پیشین گوئیاں۔ نزولِ قرآن کی اصلی غرض۔ اس زمانے کے مولویوں کو نیک صلاح۔ زہد۔ دیگر مذاہب اور اصولِ اسلام۔ مسلمانوں کی اصلاحِ حالت۔ ختمِ کتاب کے بعد اس میں چند ضمیمے اور لگا دیے گئے ہیں۔ جن کے مضامین یہ ہیں۔ ائمہ اثنا عشر کون کون ہیں۔ امام حسن رضی کے واقعاتِ زندگی۔ امام حسین رضی کے تاریخی حالات۔ امام علی الاصغر زین العابدین۔ امام محمد الباقر۔ امام جعفر الصادق۔ امام موسیٰ کاظم۔ امام علی الرضا۔ امام محمد تقی۔ امام علی نقی۔ امام محمد حسن زکی۔ امام محمد مہدی۔ پیغمبر صاحب اور عشرۂ مبشرہ کا شجرۂ نسب۔ ابوبکر صدیق رضی کے حالات۔ عمر بن الخطاب رضی کے حالات۔ عثمان رضی بن عفان کے حالات۔ علی المرتضیٰ رضی کے حالات۔ حضرت طلحہ رضی کے واقعات۔ حضرت زبیر رضی بن العوام کے حالات۔ عبد الرحمٰن رضی بن عوف کے حالات۔ سعد بن ابی وقاص رضی کے حالات۔ سعید بن زید قریشی رضی کے حالات۔ ابو عبیدہ بن الجراح رضی کے حالات وغیرہ وغیرہ درج ہیں۔

اجتہاد کے ٹائیٹل پیج پر جلی قلم سے "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو" ایک لاکھ روپے کا بلکہ دونوں جہان کی قیمت کے برابر کسی کا یہ مصرع سنہری حرفوں میں لکھا ہے۔ اور اس کے بعد ہلالی شکل میں قرآن مجید کی یہ آیت فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ[1] نہایت خوب صورت حرفوں میں لکھی گئی ہے۔ کتاب ہر مسلمان کے دیکھنے کے قابل ہے مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مقدس اسلام اور اس کے صاف اور ستھرے معتقدات اور اصولِ اعمال سب فطری ہیں۔ یعنی آدمی چاہے وہ جس مذہب کا گرویدہ ہو اگر غور و فکر سے کام لے تو قطعِ نظر کسی دلیلِ خارجی کے صرف اس کی طبیعت کا تقاضا آپ سے آپ اُسے اسلام کی حقانیت بے چون و چرا منوا لے اور اسلامی معتقدات و ارکان کی معقولیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر لینے پر مجبور کرتا ہے ...... علامہ مصنف نے یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے معتقدات و اعمال بیان کرتے ہوئے اُن پر نہایت دیانت اور انصاف سے جائز نکتہ چینیاں کر کے اسلام کی حقانیت کا ایسا زبردست اور لاجواب ثبوت دیا ہے کہ کسی مذہب کا کوئی آدمی جب تک وہ آدمی ہے اور انصاف و راستی کا جوہر رکھتا ہے صداقتِ اسلام کو بے تسلیم کیے رہ نہیں سکتا۔

اُمہات الامہ اس کتاب کا موضوع وہی مشہور مگر بودا اور پھسپھسا تعددِ ازواج پر اعتراض ہے جو دوسری قومیں ابتدا سے اسلام اور بانیِ اسلام پر کرتی آئی ہیں۔ علمائے اسلام بھی ہمیشہ دندان شکن

[1] (اے پیغمبر) تم تو ایک (خدا) کے ہو کر (اس کے) دین کی طرف اپنا رُخ کیے رہو (یہ) خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا یہی دین (کا) سیدھا (رستہ) ہے ۱۲

جواب دیتے رہے ہیں جس طرح وہ پرانے علم کلام کی رو سے اعتراض تھے اُسی طرح پرانے علم کلام کی رو سے اُن کے
جواب ہوتے تھے۔ یعنی اگر معترض ایک شخص پر یہ اعتراض کرتا تھا کہ تیری آنکھ میں ناخنہ ہے تو دوسرا یہ جواب دیتا تھا کہ
تیری آنکھ میں شہتیر ہے۔ اسی طرح اکثر الزامی جواب ہوا کرتے تھے اور بس۔ اب علم کلام کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے
علم کلام کے نئے نئے اصول قائم ہو گئے ہیں۔ استدلال کے طریقے بدل گئے ہیں۔ ابلہ فریبی اور پیچیدہ دلائل کی
اب وقعت نہیں رہی۔ اُمہات الامہ بالکل نئے ڈھنگ اور نئے اصول پر لکھی گئی ہے۔ تعدد ازدواج کے سچے واقعات
اور اصلی وجوہ لکھ کر معترضین کے جواب دیئے گئے ہیں۔ اگر ہم اس کتاب کو مراۃ امہات الامہ کہیں تو بجا ہے۔

موجودہ زمانے میں ایک وسیع اور غیر محدود آزادی یعنی شتر بے مہاری ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ لوگوں کے منہ میں
جو کچھ آتا ہے بے تکلف استفراغ کی طرح اُگل دیتے ہیں جس کی دل آزاری اور زبان درازی اور ہٹ دھرمی اور بے جا
تعصب کا تعفن دماغِ اسلام کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اسی عفونت کو دفع کرنے کے لیے فاضل مصنف نے یہ چورن
تیار کیا ہے

وہ چورن چھانٹ کے بادی تعصب بے باکی وہ چٹنی ترشی مستی کے پندار و غفلت ہو

غرض جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت جو یہ خیال فاسد متعصب دلوں میں جگہ پکڑ گیا ہے اُس
کو دور کرنے کے لیے حکیم امت فاضل مصنف نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے تاکہ معترضین تعدد ازدواج کی اصلیت
کو چشم بصیرت سے دیکھیں۔ اور آئندہ کو کان پکڑیں اور لغو اور بیہودہ اعتراضوں سے زبان اور قلم کو روکیں۔ فاضل
مصنف سے پہلے اَور لوگوں نے بھی اس مضمون پر قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن بالاستقلال کوئی کتاب ہماری نظر سے
نہیں گزری۔ ہاں سر سید مرحوم و مغفور نے مستقل طور پر ایک رسالہ لکھنے کا قصد کیا تھا مگر افسوس وہ رسالہ
پورے طور پر ختم نہیں ہونے پایا کہ سر سید انتقال کر گئے۔

اُمہات الامہ ایک سو چھپن صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ اس میں اتنے عنوان ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اور
اُس کے بعد کے چرچے۔ سوسائٹی۔ سوراج۔ بائی کاٹ کے متعلق پیشین گوئی۔ آزادی۔ سبب تالیف کتاب جس
قوت پر بقائے نوع انسانی موقوف ہے اُس کے فطری ہونے کا ثبوت۔ نر و مادہ اور مرد و زن کی قوت فاعلہ اور قوت منفعلہ
کی تشریح مزید۔ مرد کو وقت واحد میں چار عورتوں کے جمع کرنے کا اختیار کیوں دیا گیا اور عورت کو ایک ہی کی ہو کر رہنے
پر کیوں مجبور کیا گیا۔ تکثیر ازدواج کی مصلحت اور چار کی وجہ تخصیص۔ زناشوئی کے تعلق کی اصلی اغراض۔ اسلامی تکثیر ازدواج
پر مخالفین کا اعتراض اور اعتراض کا جواب۔ اسلام نے عورتوں کی کہاں تک حمایت کی اور یورپ کی سوسائٹی کے آداب
تمدن۔ مرد و عورت کے باہمی تعلقات اور دونوں کے منصبی فرائض۔ قرآن کی دو آیتوں سے تکثیر ازدواج کا ثبوت اور مرد
و عورت کے واجبی حقوق میں محاکمہ۔ تکثیر ازدواج کی حد غایت چار کیوں ہے۔ پیغمبر صاحب کے آغاز نبوت سے سنہ ہجری
تک کے مختصر تاریخی واقعات۔ تکثیر شرعی پر ایک اَور اعتراض کا جواب۔ عیسائی مذہب مجموعہ محالات ہے۔ مردوں کی
تکثیر ازدواج پر عورتوں کی طرف سے زیادتی اور اس پر ایک نہایت دلچسپ اور پُر درد حکایت۔ تعدد ازدواج کے قائل

نہ ہونے سے عیسائیوں کے ایک مذہبی نقص کا ثبوت - عیسائیوں میں طلاق - عدلِ مستطاع کی شرط مرد و عورت دونوں
کے حق میں یکساں مفید ہے اِس پر امام شافعیؒ کا ایک نوٹ اور نوٹ پر اعتراض - اہلِ عرب کے تمدّن پر ایک سرسری نظر
مسلمانوں میں رسمِ ہنود - پیغمبر صاحب کا امتیازِ خاص - پیغمبر صاحب کے نکاحوں کا غالب داعیہ - اشاعتِ اسلام کے
آگے پیغمبر صاحب کی تمام خواہشیں مغلوب تھیں - اِس کا چند تاریخی واقعات سے ثبوت - پیغمبر صاحب کی حیا و تمیز
کسبیہ - پیغمبر صاحب میں لوازم البشریۃ - بشری خواہشیں شانِ پیغمبری کے مخالف نہیں - پیغمبر صاحب کا ازواج میں
عدل - امّہات المؤمنین کی ساری خواہشیں پیغمبر صاحب کی شرفِ ہم بستری کے آگے مغلوب تھیں - پیغمبر صاحب کی
خاندانی شرافت اور شرافت کا معیار - مکارمِ اخلاق دین کی غرض و غایت ہیں - ابراہیمؑ نے کب اور کس طرح کعبہ بنایا اور کتنے
دفعہ اس کی تجدید ہوئی - متولیانِ کعبہ کی خدمات و اقتدارات - تعمیرِ کعبہ کا نقشہ - پیغمبر صاحب کا شجرۂ نسب مع
ازواجِ مطہرات - قریش کی وجہ تسمیہ اور یہ قبیلہ کب سے قریش کہلایا - تولیتِ کعبہ کن کن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی
اور قریش تک کیونکر پہنچی - پیغمبر صاحب کے جدِّ اعلیٰ قصیّ کے کارنامے - عبدالدار و عبدِ مناف کی اولاد میں خاندانی
نزاع اور نزاع کا فیصلہ - ہاشم کے تاریخی واقعات - عبدالمطلب کے حالات - زمزم کی اصلیت - ابوطالب و عبداللہ
کے واقعاتِ زندگی - ہندوستان میں انگریزی سلطنت - واقعاتِ عام الفیل - تعلیمِ مروّجہ کے نقص ۱۸۵۷ء کا
غدر - مشن کالجوں کی تعلیم - پیغمبر صاحب کے بزرگ مذہب کے اعتبار سے کتنے پانی میں تھے -

ان مضامین کے بعد امّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ - امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ - امّ المؤمنین بی بی حفصہؓ - امّ المؤمنین
بی بی زینبؓ امّ المساکین - امّ المؤمنین بی بی امّ سلمہؓ - امّ المؤمنین بی بی زینب بنت جحشؓ - امّ المؤمنین بی بی امّ
حبیبہؓ - امّ المؤمنین بی بی جویریہؓ - امّ المؤمنین بی بی صفیہؓ - امّ المؤمنین بی بی میمونہؓ کے حالات ہیں - ان کے
حالات کے بعد چند اور مضامین ہیں -

دل تو یہ چاہتا تھا کہ ساری کتاب کی کتاب ہم یہاں نقل کر دیں - لیکن طوالت کے ڈر کے مارے صرف ایک
خاص مضمون پر اکتفا کرتے ہیں - کیوں کہ مصنف نے ایک داعیۂ خاص پیغمبر صاحب میں دریافت کیا ہے جو سب
دواعی سے قوی اور سب دواعی پر غالب ہے وہ داعیہ ہے پیغمبر صاحب کی طرف سے شوقِ اشاعتِ اسلام بدرجۂ
غایت اور امّہات المؤمنین کی طرف سے شوقِ ادراکِ شرفِ ہم بستریِ پیغمبر صاحب - مصنف نے ہر ایک امّ المؤمنین کے
حالات میں پیشتر اِس دعوے کو نہایت محققانہ ثابت کر دکھایا ہے اور یہ بات شاید خصائصِ مصنف میں سے ہے -

اشاعتِ اسلام کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام خواہشیں مغلوب تھیں اس کا چند تاریخی واقعات سے ثبوت

دواعیِ نکاح جو ہم نے اوپر گنائے ہیں پیغمبر صاحب میں اشاعتِ
اسلام کا ایک داعیۂ خاص بھی تھا تمام دواعی پر غالب - وہ دینِ توحید
لے کر آئے تمام ادیانِ مروّجہ کے مخالف اور لے کر آئے ایسے
لوگوں میں جن کو مطلق شائستگی چھو نہیں گئی تھی وہ چھوٹتے کے
ساتھ گالی گلوج اور مار کٹائی پر اتر پڑے - صبر و تحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے مگر کرتے کیا ایک طرف خدا کہتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ - اور اسی پر بس نہیں دوسری جگہ فرماتا ہے [۹۲] وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ دوسری طرف جو ہر خون کا پیاسا ہو اور اگر [۹۳] وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ - اور - [۹۴] وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ - کی تقویۃ اور حمایۃ اور حفاظۃ نہ ہوتی تو رسالۃ کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی - مگر صداقۃ کے بھروسے پر پیغمبر صاحب ۱۳ برس دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کیے - یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی - آلہی کیسے دل ہیں کہ یہ سب کچھ سن سمجھ کر بھی اسلام پر نہیں پسیجتے - لوگ بی بیاں کرنے میں جو اعتراض مدِ نظر رکھتے ہوں ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی اسلام کا مفاد مدِ نظر رکھ کر کی - کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حُسن وجمال اور کیسی دولۃ - اُن کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا ہم اس کی ضرورۃ تو سمجھتے نہیں کہ مناکحۃ کو خلافِ شانِ پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدانِ قوۃ کے قائل ہوں - ایسا سمجھنا اُن کے کمالِ انسانیۃ کو بٹا لگاتا ہے - پس سچّی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحۃ میں اِس قوۃ کو بھی دخل ضرور تھا - مگر اسلام کی دُھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں بشری اغراض مغلوب تھیں - ہر نکاح میں اوّل اور اقدم اِسلام اور اسلام کی دُھن میں دوسری اغراض - اور یہی وجہ تکثیرِ ازواج کی بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سُسرالی قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے اور اِسی کی اِسلام کی اشاعۃ کے لیئے بڑی ضرورۃ تھی یہاں تک کہ جب اِسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان وانصار کے بہم پہنچانے کی ضرورت نہ رہی تو [۹۵] لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ - سے تکثیر کو روک دیا - غرض ہم تو پیغمبر صاحب کے نکاحوں میں کسی طرح کی اخلاقی برائی پاتے نہیں - یہ بات کہ اشاعۃِ اسلام کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں مغلوب تھیں اِس کی ہمارے پاس بہت سی دلائل ہیں - ازاں جملہ یہ کہ پیغمبری کے پہلے سے پیغمبر صاحب بالطبع بُت پرستی سے نفور تھے اور اپنی قوم اپنے اہلِ وطن بلکہ تمام لوگوں کو مبتلائے گمراہی دیکھ کر بہت ہی بے چین رہتے تھے - اُن کو اس فکر میں کھانا پینا سونا ملنا جلنا کوئی چیز بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی تھی - بس یہ اُن کے اخلاق کا اصل الاصول ہے - غلبۂ اسلام کے ساتھ اِس فکر کی شان تو بدلی مگر مرتے دم تک رہے اِسی فکر میں منہمک سہ

---

[۹۱] اے پیغمبر جو (احکام) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم وکاست لوگوں کو) پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھا جائے گا کہ) تم نے خدا کا (کوئی) پیغام (بھی لوگوں کو) نہیں پہنچایا ۱۲ [۹۲] اور اگر (پیغمبر زبردستی) کوئی بات ہمارے سر چپکتا تو ہم نے (خونیوں کی طرح) اُس کا دہنا ہاتھ پکڑ کر اُس کی گردن اڑادی ہوتی اور تم میں سے کوئی بھی ہم کو اُس سے روک نہ سکتا ۱۲

[۹۳] اور اللہ تم کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا ۱۲ [۹۴] اور (اے پیغمبر تم مخالفوں کی ایذاؤں پر) صبر کرو اور خدا کی توفیق کے بدون تو تم صبر کر ہی نہیں سکتے اور ان (مخالفوں کے حال) پر افسوس نہ کرو اور یہ لوگ جو (تمہاری مخالفۃ میں) تدبیریں کیا کرتے ہیں اُس سے تنگ دل نہ ہو ۱۲ [۹۵] (اے پیغمبر اِس وقت کے) بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں ۱۲

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　　غم کے جانے کا بہت ماتم رہا

ہم اُس درد کا ٹھیک اندازہ کر نہیں سکتے۔ جوان کو ابنائے جنس کا تھا۔ پیغمبری کے قریب قریب وہ بالکل عزلت پسند ہو گئے تھے۔ اکیلے غارِ حرا میں بیٹھے خدا کا دھیان کرتے بلکہ ایک مرتبہ مایوسی کی حالت میں پہاڑ پر سے گر کر اپنی جان تک گنوا دینے کا ارادہ کیا تھا اسی حالت پر قیاس کر لو کہ جس شخص کے ایسے خیالات ہوں اُس کو نفسانی خواہشیں کہاں تک گُدگُدا سکتی ہیں۔ عرب جیسے گرم ملک کے رہنے والے جہاں مرد اور عورت دونوں سویرے بالغ ہو جاتے ہیں اوّل درجے کے شریف النسب جوان خوش رو نیک نام بہمہ صفت موصوف یہ تو اگر جھوٹوں طلب کرتے تکے کے بڑے سے بڑے رئیس بچوں اپنی بیٹیاں اُن سے بیاہ دیتے۔ مگر اُن کو اپنے مذہبی استغراق میں ایسی باتوں کا خیال ہی نہ تھا۔ پیغمبر صاحب تو یتیم پیدا ہوئے تھے۔ شروع سے دادا عبد المطلب کی کنارِ عاطفت میں پرورش پائی۔ اُن کے انتقال کے بعد چچا ابوطالب کفالت کرتے رہے۔ قریش خانۂ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب کے رئیس تھے اور قبیلۂ قریش کے رئیس کا بڑا عن کابر پیغمبر صاحب کے آبا و اجداد تو باوجود سخت مذہبی مخالفت اور پرخاش کے پہلے عبد المطلب اور عبد المطلب کے بعد ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے پیغمبر صاحب دشمنوں کی دست درازی سے بہت کچھ محفوظ تھے مگر وہ لوگ اِس ٹوہ میں تھے کہ کسی ڈھب سے دادا اور چچا اِن سے دست بردار ہو جائیں تو چھر چٹکی بجاتے میں اِس آئے دن کے جھگڑے کا ٹنٹا پانچا کر دیں۔ یہ دل میں ٹھان کر سردارِ قریش جمع ہو کر ابوطالب پاس گئے اور اُن سے جا کر کہا کہ آپ کو تو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ آپ کے بھتیجے نے ہم سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اُس کو ایک نئے دین کا خبط اُچھلا ہے۔ سر بازار اور گلی کوچوں میں ہمارے مذہب کی توہین بزرگوں کی تحمیق کرتا پھرتا ہے۔ ہم آپ کے لحاظ سے لہو کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ آپ اُس کو ہمارے سامنے بلا کر پوچھیے تو سہی کہ آخر یہ چاہتا کیا ہے اگر ریاست کی ہوس ہے تو ہم سب اِس بھرے مجمع میں اُس کو اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں اگر دولت درکار ہے تو چندا کہہ چندہ جمع کر دیں کہ یہ امیر الامراء ہو جائے۔ اگر خوب صورت عورت چاہیے تو قریش کی عورتیں حسن میں شہرۂ آفاق ہیں جس کو پسند کرے اُس کو اُس سے بیاہ دیں۔ اور اگر اُس کا دل اُلٹ گیا ہے تو طبیب سیانے سے اِس کا علاج کرائیں۔ اور اگر کسی صورت سے راضی نہ ہو تو آپ اپنے دینِ آبائی کی خاطر ہم سب کی خاطر اِس پر سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیں پھر ہم اِس سے سمجھ لیں گے یا یہ ہی نہ ہو گا یا ہم ہی نہ ہوں گے۔ ابوطالب نے پیغمبر صاحب کو سب کے روبرو بلا کر کہا کہ بھتیجے! یہ تمہاری قوم کے بھلے بھلے آدمی تم سے ایک معقول درخواست کرتے ہیں۔ تم سوچ سمجھ کر اِن کو جواب دو پیغمبر صاحب نے چچا کے اِس کہنے سے ایسا خیال کیا کہ شاید چچا مجھکو جواب دیتے ہیں۔ یہ سمجھ کر اُن کو اپنی بے کسی پہ رونا آیا مگر کہا تو یہ کہا کہ یہ لوگ مجھکو کیا لالچ دکھاتے ہیں۔ اگر چاند سورج کو بھی میری گود میں لا بٹھائیں۔ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں۔ یہ حکایت ہم نے اِس غرض سے بیان کی کہ اگر پیغمبر صاحب کو بی بی کی خواہش ہوتی تو اِس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا۔ مگر اُن کو اِس سے بحث ہی نہ تھی۔ اُن کا پہلا نکاح امّ المومنین خدیجۃ الکبریٰ سے ہوا۔ اُن کی خواستگاری سے نہیں بلکہ خدیجۃ الکبریٰ نے خود پیام دیا۔ نکاح کے وقت پیغمبر صاحب کی عمر ۲۵ برس کی تھی۔ اور

خدیجۃ الکبریٰ کی ۴۰ کی۔ علاوہ بریں خدیجہ پیغمبر صاحب کی پہلی بی بی تھیں اور پیغمبر صاحب خدیجہ کے تیسرے شوہر۔ ان کے پہلے شوہر ابو ہالہ اور دوسرے عتیق ان کو بیوہ چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اس حکایت سے کام کی کئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ نفسانی خواہش پیغمبر صاحب کو خدیجہ سے نکاح کرنے کی محرک نہیں ہوئی ورنہ وہ اپنے سے پندرہ برس بڑی بیوہ صاحبِ اولاد کو نہ کرتے بلکہ خدیجہ میں چند در چند خصوصیتیں تھیں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کے مذہبی خیالات تھے۔ ان کے تفصیلی حالات پیغمبر صاحب کی دوسری بی بیوں کی طرح اُن ہی کے بیانِ خاص میں لکھیں گے۔ تو جب عنفوانِ شباب میں پیغمبر صاحب نے نفسانی خواہش کی پروا نہ کی بعد کے نکاحوں میں جب کہ [illegible] عمر رو بانحطاط تھی اور اسلامی تعدّدات روا کر دیا کیوں کر کر سکتے تھے پیغمبر صاحب کے مزاج میں حیا کی بھی افراط بدرجہ غایت تھی اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ[1]۔ اور اس کی وجہ سے وہ تکثیرِ ناروا پر قادر ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ کا مذکور ہے کہ کعبہ آتشِ اتفاقی سے جل کر مسمار ہو گیا تھا۔ قریش نے جمع ہو کر از سرِ نو اُس کو بنانا شروع کیا تو ہر شخص کارِ ثواب سمجھ کر اُس کی تعمیر میں جو جس سے بن پڑتا تھا خدمت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مال مسالا کندھوں پر ڈھو ڈھو کر پہنچا رہے تھے۔ اُن میں پیغمبر صاحب کے چچا عباس بھی تھے۔ اتنے میں پیغمبر صاحب بھی آنکلے اور لگے کندھے پر پتھر ڈھونے۔ اس وقت پیغمبر صاحب کی عمر ۱۳ برس کی رہی ہوگی اور عرب میں اتنی عمر کے لڑکے ستر عورت بہت کم کیا کرتے تھے۔ عباس نے جو ان کو کندھے پر پتھر لاتے دیکھا ان کا تہمد گنڈلی بنا کندھے پر رکھ دیا کہ اس پر پتھر رکھو نہیں کندھا چھل جائے گا تہمد کا کھولنا تھا کہ یہ مارے حیا کے غش کھا کر گر پڑے۔ تہمد بدستور باندھ دیا۔ تب اُن کو ہوش آیا پھر آخر عمر تک یہی حال رہا کہ عورتیں بیعت کرنے آتیں تو اُن کو دور ہی سے کہہ دیتے کہ جاؤ تمہاری بیعت ہو گئی غرض کسی اجنبی عورت کا ہاتھ تک نہیں چھوا۔ ہم نے اب تک پیغمبر صاحب کی تکثیرِ ازواج کے متعلق جو کچھ لکھا پیغمبر صاحب کی طرف سے لکھا کہ اُن کی مناکحۃ میں غرضِ اوّلین پاسداریِ اسلام ہوتی تھی اور اگر علیٰ سبیل التنزّل غرضِ ثانوی کے طور پر اس میں شائبہ خواہشِ نفسانی کا بھی ہو تو چوں کہ خواہشِ نفسانی فطری اور خداداد اور بقائے نوعِ انسان کا سبب ظاہر ہے اور اسی وجہ سے کوئی فردِ بشر اس سے بری نہیں تو پیغمبر صاحب میں اس خواہش کے ہونے سے اُن کی شانِ پیغمبری میں کسی طرح کا ضعف اور فتور نہیں آتا۔ بلکہ اس خواہش کا فقدان نقصانِ بشریت ہے اور پیغمبری کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر نکاح سے تو زن و شوہر دو شخصوں کے حقوق متعلق ہوتے ہیں۔ تو ہم کو اُمّہات المومنین کے لحاظ سے بھی پیغمبر صاحب کے نکاحوں پر نظر کرنی چاہیے کہ کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو۔ تو عرب کے رسم و رواج نے تو عورتوں کے تمام حقوق پامال کر دیے تھے کہ عورت مرد سے کسی حق کا مطالبہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسلام نے لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[2]۔ سے اور تکثیرِ ازواج کی صورت میں عدل کی شرط سے عورتوں کو حق دار ٹھیرایا۔ دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر صاحب اپنی ازواج میں کہاں تک شرطِ عدل کا ایفا کرتے تھے۔ سو سیر کی تمام کتابیں بالاجماع گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر صاحب نے اُمّہات المومنین میں بالمساوات دن تقسیم کر رکھے تھے جس دن جس کی باری ہوتی اُسی کے یہاں شب باش ہوتے۔ سفر میں کسی کو ساتھ

---

[1] حیا ایمان کی ایک شاخ ہے ۱۲ [2] جیسے (مردوں کا حق) عورتوں پر ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا (حق مردوں پر) ۱۲

لے جانا ہوتا تو قرعہ ڈال لیتے۔ غرض سفر میں حضر میں کسی حالت میں مساوات کے قاعدے کا نقض نہیں کیا۔ جس دن مرض الموت میں علیل ہوئے زینب بی بی کی باری تھی۔ اس خیال سے کہ اُمّ المؤمنین عائشہؓ کے گھر میں تیمارداری اچھی طرح ہوگی اور اُن کے والد ابوبکرؓ جو پیغمبر صاحب کے مشیرِ خاص تھے بیٹی کے گھر بے تکلف آمد و شد کر سکیں گے سب بی بیوں کی اجازت سے عائشہؓ کے گھر بیماری کے دن کاٹنے چلے گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امہات المؤمنین کو عام بی بیوں پر قیاس کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ يٰنِسَآءَ[۵۱] النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ بے شک پیغمبر صاحب کی بی بیاں پیغمبر تو نہ تھیں اور کبھی کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔ مگر مردوں میں جو شرف پیغمبر صاحب کو حاصل تھا عورتوں میں شرف ہم بستریٔ پیغمبر کو بھی اُسی کے لگ بھگ سمجھو۔ اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ[۵۲]۔ دنیا کی نظروں میں۔ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ[۵۳] کیا کچھ تھوڑا شرف ہے۔ جس طرح پیغمبر صاحب اسلام کے آگے کسی دنیاوی خواہش کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے یہی حال کُل امہات المؤمنین کا تھا کہ پیغمبر صاحب کی ہم بستری کے آگے اُن کی سب خواہشیں مغلوب تھیں۔ عورتوں کو نان و نفقے کی بڑی طمع ہوتی ہے تو امہات المؤمنین سب کی سب خوش دلی کے ساتھ فقر و فاقے میں بسر کرتی تھیں۔ پیغمبر صاحب نے صاف لفظوں میں ان سب[۵۴] کہہ دیا تھا۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ روایت ہے کہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صاحب نے عائشہؓ کی نوعمری کی وجہ سے اُن سے کہا تھا کہ دو ٹوک جواب دینے سے پہلے تم اپنے باپ سے رائے لے لینا۔ عائشہؓ نے چھوٹتے ہی کہا کہ باپ سے صلاح لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔ میں خدا رسول اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ ...... اسی سے سمجھ لو کہ امہات المؤمنین پیغمبر صاحب کی زوجیت کی کس قدر عظمت کرتی تھیں۔ اُمّ المؤمنین سودہؓ عمر سے اُتری ہوئی تھیں۔ اِن کو از خود خیال ہوا کہ کہیں پیغمبر صاحب مجھ کو چھوڑ نہ دیں۔ انھوں نے خوشی راضی سے عائشہؓ کو اپنی باری دے دی اور پیغمبر صاحب سے کہا کہ مجھ کو اسی قدر بس کرتا ہے کہ میں قیامت میں آپ کی بی بی کہہ کر پکاری جاؤں۔

ہم کوئی ضرورت اس بات کی نہیں دیکھتے کہ پیغمبری تقدس کے لحاظ سے پیغمبر صاحب کے نکاحوں کو دنیوی اغراضِ خسیسہ کے لوث سے بالکل پاک اور بری ثابت کریں۔ ہم پیغمبر صاحب کو تمام لوازمِ ضعفِ بشریہ کے ساتھ بشر مانتے ہیں اور وہ خود اُس کے معترف تھے۔ ہاں جو بات تفتیشِ حالات سے ہم کو ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ پیغمبر صاحب اور امہات المؤمنین فریقین کو نکاح میں مذہبی غرض زیادہ تر مقصود تھی۔ پیغمبر صاحب کو اسلام کی تقویت اور امہات المؤمنین کو شرفِ ہم بستریٔ پیغمبر۔ دنیاوی اعتبار سے بھی کوئی عزت اِس عزت کو پا سکتی ہے کہ پیغمبر صاحب کی بی بیاں ادب اور تعظیم کی نسبت

---

[۵۱] پیغمبر کی بی بیو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں ۱۲ [۵۲] پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہوتی ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ۱۲ [۵۳] اور پیغمبر کی بی بیاں (ادب و تعظیم میں) اُن کی مائیں ہیں ۱۲ [۵۴] کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کے ساز و سامان کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمھیں (کچھ) دے دلا کر خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم خدا اور اُس کے رسول اور آخرت کے گھر کی خواہاں ہو تو تم میں سے جو نیکوکار ہیں اُن کے لیے خدا نے (بڑے) بڑے اجر تیار کر رکھے ہیں ۱۲

تمام اُمّت کی مائیں قرار پائیں۔ کسی اَور عورۃ کو بھی یہ رتبہ حاصل ہی۔ عورتیں بالطبع کھانا پینا خوش حال گھر ڈھونڈا کرتی ہیں سو پیغمبر صاحب کو تو خوش حالی ساری عمر نصیب ہی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی کہاں سے باپ کو تو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہیں۔ دادا نے یتیم پوتے کو پالا۔ تو خیر اِن کے وقت میں خدا نے ننگا بھوکا نہیں رکھا۔ دادا کے مرے پیچھے چچا ابوطالب نے دست گیری کی۔ تو وہ خود قرض دار اور کثیر العیال تھے۔ اُمّ المؤمنین خدیجہؓ کے تعلق سے پیغمبر صاحب کی خوش حالی کا آغاز سمجھو تو مذہبی مخالفۃ کی وجہ سے قریش نے ان کو اور ان کے طرف داروں کو شعب ابی طالب میں نظربند کر دیا۔ برادری سے خارج۔ کھان پان موقوف۔ لین دین بند۔ میل جول متروک۔ تو ایسی حالۃ میں خیالی خوش حالی کیا کام دے سکتی تھی۔ ہجرۃ کے بعد سے خیال ہو سکتا ہی کہ مدینے میں مریدوں سے فتوحات ہونے لگی ہوگی۔ تو فتوحات کا حال یہ ہی کہ زکوٰۃ اور صدقات کو پیغمبر صاحب نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ تمام بنی ہاشم پر حرام کر رکھا تھا۔ اور اُن کو لوگوں کے مال کا میل اور اُن کے لینے کو ذلیل بے غیرتی فرماتے تھے۔ ہاں غنیمۃ کی ایک رقم تھی جس سے خوش حالی کی توقع کی جا سکتی تھی تو عرب کا دستور تھا کہ لڑائی میں جو لوٹ کا مال ہاتھ آتا اُس کا چوتھائی فریقِ غالب کے سردار کا حق ہوتا اور تین چوتھائی لشکر کا۔ پیغمبر صاحب نے چوتھائی کو گھٹا کر پانچواں کر دیا اور پانچواں بھی یکتا نارو صدر بیمار۔ واعلموا انّما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل[۵]۔ ایک دفعہ کا مذکور ہی کہ حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ پیغمبر صاحب کے پاس غنیمۃ میں کچھ لونڈیاں آئی ہیں آپ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو جا خبر دی کہ تم شکایت کیا کرتی ہو کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں اور گھر کے کام کاج سے مجھکو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ بچّوں کی خبر لوں۔ ایسے میں جاکر اپنے والد صاحب سے ایک لونڈی مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ گئیں اور ان کو پیغمبر صاحب کی عادۃ معلوم تھی کہ وہ مہاجر مسلمانوں کی تکلیف کے آگے اپنی اور اپنے قرابت مندوں کی تکلیف کی پروا نہیں کرتے ہچکچاتی ہوئی پیغمبر صاحب کے پاس تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے اُس وقت پیغمبر صاحب گھر تشریف نہیں رکھتے تھے انھوں نے اُمّ المؤمنین بی بی عائشہؓ سے اپنا واقعہ بیان کیا اور چلتے وقت کہتی گئیں کہ پیغمبر صاحب کو میرا آنا اور یہ واقعہ یاد دلا دینا۔ پیغمبر صاحب تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے بی بی فاطمۃ الزہراؓ کے آنے اور آنے کی ضرورۃ بیان کی۔ پیغمبر صاحب بی بی فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور اُس وقت یہ دونوں میاں بیوی سونے ہی کو تھے۔ اُنھوں نے پیغمبر صاحب کی آہٹ پائی تو لگے کھڑے ہونے۔ پیغمبر صاحب نے فرمایا بیٹا! لیٹے رہو۔ چناں چہ آپ بی بی فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے بیچ میں جا بیٹھے اور لگے فرمانے کہ تم نے جس چیز کی مجھ سے درخواست کی ہی میں اس سے بہتر ایک چیز تمھیں بتاتا ہوں وہ یہ کہ جب تم دونوں میاں بیوی سونے کے لیے بچھونے پر آیا کرو تو ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ عمل تمھارے لیے خادم سے بہت بہتر ہی۔ تو یہ نہیں کہ پیغمبر صاحب کو خوش حال ہونے کے مواقع نہ تھے۔ مواقع تو بہتیرے

[۵] اور (مسلمانو) جان رکھو کہ جو چیز تم (لڑائی میں) لوٹ کر لاؤ اُس کا پانچواں حصّہ خدا اور رسول کا اور (رسول کے) قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ۱۲

تھے مگر وہ آپ خوش حال زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے خاندان بھر کے حق میں خدا سے دعا کیا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اجعل رِزقَ اٰلِ محمدٍ کَفَافًا[۱] - پیغمبر صاحب کی بڑی خوش حالی اگر اُس کو خوش حالی سمجھا جائے یہ تھی کہ خیبر بے لڑے بھڑے فتح ہو گیا تھا وہاں کا خراج دستور کے مطابق بالا شرکۃ غیرے خاص پیغمبر صاحب کا حق تھا خیبر سے جو موٹا جھوٹا اناج از قسم جَو وغیرہ برس کے برس آتا وہ امہات المومنین میں علی التسویۃ تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اُس میں تنگی سے گزر اوقات ہوتی تھی تنگی پر مزید تنگی یہ تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ تنگی کی شکایت کرے - ایک دفعہ تنگی رزق سے تنگ آ کر امہات المومنین نے پیغمبر صاحب سے فریاد کی تو پیغمبر صاحب روٹھ کر سب کے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے - وہی مثل ہوئی کہ نماز معاف کرانے گئے روزے گلے پڑے - پیغمبر صاحب کو روٹھا دیکھ ابوبکرؓ نے عائشہؓ کی اور عمرؓ نے حفصہؓ کی باپ ہونے کی حیثیت سے خوب خوب گوشمالی کی - اور تنگی بسر گزر کی صورت یہ تھی کہ کسی نے عائشہؓ سے پوچھا تو انھوں نے کہا کیسا چھاننا پھٹکورنا جیسے جَو آئے پیسے پھوسی پھونک مار کر اُڑا دی آٹا گوندھا پکایا کھا لیا - یہ روٹی ہوتی تھی اور سالن نعم الادام الخلّ[۲] - ان لوگوں کی غالب غذا کھجوریں کھائیں اور پانی سے اُتار لیں - یہ تھی پیغمبر صاحب کی زندگی اُن وقتوں میں جب وہ قریب قریب تمام جزیرۂ عرب کے بادشاہ تھے - اس زہد اور اس ایثار پر بھی اگر وہ سچے پیغمبر نہ تھے تو پیغمبری باتیں ہی باتیں ہیں - پیغمبر صاحب کے حالات عسرت و ضیقِ عیش کہ وہ دوست و دشمن سب کو معلوم تھے - اس پر بھی امہات المومنین نے کیوں پیغمبر صاحب کی زوجیت میں آنا اور رہنا قبول کیا اس کی وجہ شرف پیغمبری کے سوائے اور کچھ سمجھ میں آتی نہیں اور آ سکتی بھی نہیں - سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی معمولی اور ضروری بات ہے اور کٹا چھنی ہوتی ہے تو اغراض دنیوی کی وجہ سے اور چوں کہ امہات المومنین کے حالات میں اس طرح کی بیہودگیوں کا کہیں ذکر تک نہیں یہ بھی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ امہات المومنین کو مذہبی شرف کے آگے دنیوی بتذل اور چھوٹی اغراض پر نظر ہی نہ تھی - ورنہ خانہ داری کے ہمہ وقت کے رگڑے جھگڑے پیغمبر صاحب کو اس قدر پریشان کیے رہتے کہ وہ مقاصد اہم اشاعت اسلام کی طرف توجہ کرنے کی مطلق فرصت نہ پاتے و اذ لیس فلیس -

مصنف امہات الامہ پر کفر کا فتویٰ

امہات الامہ ہم نے ابھی دیکھ کر رکھی ہی تھی کہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں کسی فرخ آبادی کی ایک مراسلت دیکھی جس میں یہ کچھ لکھا تھا کہ دلی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور اُس میں امہات الامہ کے اکثر مضامین پڑھے گئے - آخر متفق اللفظ ہو کر وہاں کے مولویوں نے مصنف امہات الامہ کو کافر قرار دے دیا - اُن کے ساتھ کھان پان سب بند - حقہ پانی ترک - اس کے چند ہی روز بعد چھپے ہوئے اور مہر شدہ فتوے کفر کی بھی زیارت نصیب ہوئی - فتویٰ دیکھ کر راقم کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکلا -

در ہند چو او نہ بود آں ہم کافر   پس در ہمہ ہند یک مسلمان نہ بود

اور اس کے بعد خیال ہوا کہ حکمائے امت پر ہمیشہ اس قسم کی بلا مسلط ہوتی رہی ہے - ہم نے علم کلام میں پڑھا ہے کہ "عوام کا ہر زمانے میں یہ حال رہا کہ جو بات اُن کے فہم اور خیال سے باہر ہوتی تھی اُس کے اظہار پر وہ جان کے دشمن بن جاتے تھے

---

[۱] خداوندا محمد کی اہل و عیال کو اتنی روزی دے جس سے وہ سرکش اور مرتکب گناہ نہ ہوں ۱۲ [۲] عمدہ سالن سرکا ہے ۱۲

سلطنت کی روک تھام سے صرف اس قدر ہو سکتا تھا کہ کسی کی جان کو خطرہ نہ پہونچنے پائے - لیکن صرف اس بندش سے کیا کام چل سکتا تھا عوام جس کو چاہتے تھے مردود عام کر سکتے تھے سب و دشنام دے سکتے تھے - آرام و راحت سے بسر کرنے میں خلل انداز ہو سکتے تھے - اس سے بڑھ کر یہ آفت تھی کہ ظاہر پرست فقہا بھی عوام کے ساتھ ہو جاتے تھے اور کفر کے فتووں سے انسان کا زندہ رہنا مشکل کر دیتے تھے - امام غزالی - آمدی - رازی ابن رشد - شہرستانی - اور ابن تیمیہ کے حالات پڑھو ان میں ایک بھی فقہا کے فتووں کے حملوں سے نہ بچ سکا!! یہ دیکھ کر ہمیں صبر آ گیا اور ہم نے مندرجہ ذیل فتوے کو نہایت خوشی سے پڑھا ع ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں -

نقلِ فتویٰ

ڈپٹی نذیر احمد صاحب بالقابہ کی کتاب امہات الامۃ

کی نسبت

علمائے اسلام کا آخری فیصلہ

ڈپٹی صاحب بالقابہ نے عیسائیوں کو جواب دینے کے پردے میں جو کتاب امہات الامہ لکھی ہے وہ کہنے کو تو عیسائیوں کا جواب ہے لیکن فی الحقیقۃ اسلام اور پیغمبر اسلام اور اصحاب کرام اور اہل بیت عظام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سخت سے سخت حملہ ہے - اس میں ایسے ایسے لفظ استعمال کیے گئے ہیں جو قاطبۃً تمام اہل اسلام کی دل شکنی کا باعث ہوئے - اطراف ہندوستان میں ایک شور مچ گیا - ہر طرف سے اُس کے بارے میں دہلی کے نامور علمار کے پاس تحریریں آنے لگیں کہ دہلی سے یہ کس آفت نے سر اٹھایا - دہلی کے عمائد نے ہر چند کوشش کی اور ڈپٹی صاحب کے پاس پیام بھیجے کہ وہ ان کتابوں کو تلف کر دیں اور ان ناشایستہ الفاظ سے تحریری برات ظاہر کر دیں اور شائع فرما دیں کہ میں اپنے ان مضامین کو واپس لیتا ہوں - مگر باوجود چند ماہ کی کوشش کے اُن کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب حاصل نہیں ہوا جس سے سمجھا گیا کہ ڈپٹی صاحب انھیں مضامین کے معتقد بھی ہیں اور اُس اعتقاد سے ہٹنا نہیں چاہتے اس لیے مجبور ہو کر ۱۹ - اپریل ۱۹۰۹ء کو انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی کے سالانہ جلسے کے مجمع میں - مگر انجمن کے جلسے سے علیحدہ تمام مجمع میں مولنا مولوی فیض الحسن صاحب نے تحریک فرمائی کہ علمار اسلام ڈپٹی صاحب کی کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرما دیں - اور مولنا ابو سراج نظام الدین احمد صاحب نے اس کی تائید کی اس پر عالی جناب فاضل اجل علامہ اکمل مولنا مولوی محمد لطف اللہ صاحب مفتی ریاست رام پور نے علی الاعلان فرمایا کہ کتاب اُمہات الامہ اور اُس کے مصنف کی تمام وہ تصنیفات جو اسی قسم کے مضامین سے مملو ہیں بے شک اس قابل ہیں کہ کوئی مسلمان جو خدائے تعالیٰ اور اُس کے رسول اور دار آخرۃ پر ایمان رکھتا ہے ہرگز ہرگز اُن کو نہ دیکھے اور تمام مسلمانان ہندوستان وغیرہ اس کتاب کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھیں اور اعلان کر دیں کہ کسی غیر مذہب والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں یہ کتاب یا اُس کے مصنف کی دوسری کتابوں کے مضامین پیش کرے - ہمارے نزدیک اس کتاب کا مصنف دائرۂ اسلام سے خارج ہے مسلمانوں کو اُس سے سلام کلام ترک کرنا چاہیے

اور تاوقتیکہ وہ ان مضامین سے توبہ شائع نہ کریں اُن کو مسلمان نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ تعلقات اسلامی اُن کے ساتھ برتے جائیں۔

مفتی صاحب کے اس کلمے سے تمام علماء نے اتفاق کیا اور تمام حاضرین نے ایک پُرجوش لہجہ سے اقرار کیا کہ ضرور ہم ایسا ہی کریں گے۔ وانا علی ذلک من الشاہدین۔ محمد لطف اللہ عفی عنہ

العبد — العبد — العبد

احمد علی عفی عنہ مدرس مدرسہ میرٹھ — یہ سب میرے روبرو اسی طرح ہوا جس طرح کہ اوپر لکھا ہے۔ عبداللہ عفی عنہ کرنالی — محمد فضل الرحمن عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ اسلامی کرنال

العبد — العبد — العبد — العبد

محمد اشفاق تھانوی واعظ انجمن ہدایۃ الاسلام دہلی — سید عبدالواجد مفتی انجمن ہدایت الاسلام دہلی — محمد شفیع اللہ واعظ انجمن ہدایت الاسلام دہلی — فیض الحسن عفی عنہ آنریری جنرل سکریٹری انجمن حمایت بیوگان قصبہ کٹھور ضلع میرٹھ۔

العبد — العبد — العبد

ابو الابرار محمد اسرار الحق سفیر انجمن ہدایت الاسلام دہلی — حبیب احمد عفا عنہ — میں اگرچہ اس جلسے میں موجود نہ تھا مگر کتاب مذکور کے واجب التلف اور مصنف کتاب کے واجب المتارکۃ ہونے میں شک نہیں محمد کفایت اللہ عفا عنہ مولاہ مدرس مدرسہ امینیہ دہلی

العبد

خادم العلماء ابو سراج نظام الدین احمد عفا اللہ عنہ جہجھری وکیل انجمن ہدایت الاسلام دہلی

مطبوعہ حقانی پریس دہلی

امہات الامہ پر جو اعتراض کشف الغمہ میں ہوئے ہیں وہ ہم نے ایک ایک کر کے دیکھے ہیں۔ اُس میں بڑی چالاکی کی گئی ہے کہ اِدھر اُدھر کے فقروں کو ملا کر اعتراض جڑے گئے ہیں۔ جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی تو چاروں طرف سے مانگ شروع ہو گئی۔ حاسدوں نے دیکھا کہ کتاب غیر معمولی طور پر مقبول ہو رہی ہے تو مخالفین دیکھ کر جل گئے۔ دلی جو ہمیشہ سے مذہبی لڑائیوں کا دنگل ہے وہاں ایک بڑے مولوی صاحب نے (جن کا نام لینا ہم پسند نہیں کرتے) امہات الامہ کی تخریب کا بیڑا اٹھایا نہ اس غرض سے کہ فی نفسہ کتاب میں کچھ خرابی تھی بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ اس جنگیہ زرگری میں اپنا نام اور در پردہ اپنا کام ہو۔ عوام الناس کو کھڑا کر دیا اور خود الگ رہے یہ ہے ہمارے متعصب علماء کی راست بیانی اور راست گوئی۔ اس کے بعد کسی صاحب نے ایک رسالہ اعتراضوں کا لکھ مارا جس کا نام کشف الغمہ عن ورقۃ امہات الامہ رکھ کر ایک طالب علم کی طرف سے چھپوا دیا ہے

جنہیں کہ کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں | کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یہ رسالہ دیکھ کر ہمارے ایک دوست نے **کفش الغمہ در ردِّ کشف الغمہ** لکھنے کا ارادہ کیا مگر ہم نے اِن کو اِس تو تو میں میں اور جوتی پیزار سے باز رکھا۔ اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی لکھنے کے قابل ہی کہ ہم سے ایک ہمارے دوست ناقل تھے کہ امہات الامہ کی نسبت میں نے ہندوستان کے ایک مشہور و مستند عالم سے دریافت کیا تو اُنھوں نے صرف اتنا فرمایا کہ الحق حق ہی۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر عربی زبان میں یہ کتاب لکھی جاتی تو سر اور آنکھوں پر یہ کتاب رکھی جاتی اور مصنف سے اور لوگ ترجمے کی اجازت لے کر چھاپتے۔

بہرحال فتوے کے متعلق اب ہم زیادہ لکھنا پسند نہیں کرتے صرف ایک قطعہ لکھ کر ختم کرتے ہیں جو شمس العلما مولانا حالی نے سرسید کے کفر کے متعلق تصنیف فرمایا ہی۔

سید احمد خاں کے اِک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ　　　کس لیئے سید سے صاف ای حضرتِ والا نہیں

کافر و ملحد ہمیشہ اُس کو ٹھیراتے ہیں آپ　　　ثابت اسلام اُس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں

آپ بھی تامہد اہیں تارکِ صوم و صلاۃ　　　اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں

خود نبوت پہ ہنستے ہیں ہم نے ابراو آپ کے　　　اور الوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں

چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہی مشرب یہ ہی　　　پھر یہ سید پہ تبرا آپ کو زیبا نہیں

سُن کے فرمایا - اگر پوچھئے انصاف سے　　　بات یہ ہی سُن لو صاحب تم سے کچھ پردا نہیں

رنج کچھ اس کا نہیں مجکو کہ وہ ایسا ہی کیوں　　　بلکہ ساری کوفت ہی اس کی کہ میں ویسا نہیں

لکچر اور اسپیچ

اسپیچ اور لکچر دینے کا جوہر ہمارے مولنا نذیر احمد صاحب کی ذاتِ مجمع الصفات میں عرصہ دراز تک اس طرح چھپا رہا جیسے زبان میں گویائی کی قوت - ابتدائے سن سے ختمِ ملازمت تک مولانا کو لکچر یا اسپیچ دینے کا موقع کہیں نہیں ملا۔ اس کا بظاہر ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہی کہ اور لوگوں کی طرح جنابِ ممدوح کو مجامعِ عام میں شریک ہونے کی عادت نہیں اور نہ کچھ شوق و رغبت ہی ہی - خیر زمانۂ ملازمت میں تو وہ کثرتِ کار کی وجہ سے عدیم الفرصت ہی رہا کرتے تھے - لیکن پنشن لینے کے بعد مولانا چاہتے تھے کہ اپنی بقیہ زندگی اس طور پر گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر کاٹے و نتیجۂ کس نگو بدا زایں بخیر و آنجا رود۔

ممکن ہی کہ جنابِ ممدوح کو پنشن لینے کے بعد تک اپنی قوتِ گویائی کے جوہر کا علم نہ ہو - لیکن لوگوں نے معلوم نہیں کیوں کر یہ دریافت کر لیا کہ جس طرح اُن کے قلم میں قوتِ تحریر ہی ویسے ہی بلکہ اُس سے زیادہ اُن کی زبان میں بھی قوتِ تقریر ہی۔

یقیناً اکتوبر ۱۸۸۸ء کا ذکر ہی کہ ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین نیشنل کانگرس کے موئیدین نے اپنے خیالات کی تائید میں ایک جلسہ کیا تھا اُسی زمانے میں مسلمانانِ دہلی نے اس جلسے کے خلاف وہیں ایک دوسرا جلسہ منعقد کیا - یہی پہلا موقع تھا کہ مولانا ممدوح کو اُن کے احباب نے اس بات پر باصرار تمام آمادہ بلکہ مجبور کیا کہ نیشنل کانگرس کی نسبت علی رؤس الاشہاد اپنے خیالات ظاہر فرمائیں - چناں چہ لوگوں کی خاطر مولانا کو نقضِ عادت کرنا پڑا اور ٹاؤن ہال دہلی میں

لکچر دیا - مشہور ہی کہ ٹاون ہال میں سامعین کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی - نیشنل کانگرس کے مقاصد کے خلاف یہ لکچر تھا جس کی ابتدا یہ تھی -

ہمارے کان تو تین تین ساڑھے تین تین برس ہوئے کانگرس کے نام سے آشنا ہیں - مگر کیا تمام حاضرین کا یہی حال ہے مجکو توقع نہیں - مسٹر ہیمم جی یا ہیم جی صاحب (کیوں کہ مجکو ان کے نام کی بھی اچھی طرح صحت نہیں) غرض جو کچھ ہوں اُن کے لکچر سے شاید دو یا تین دن پہلے کا مذکور ہی کہ میں اور مولوی محمد کریم بخش صاحب اور ایک صاحب اَور قبل المغرب جامع مسجد کے حوض پر منتظر نماز بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص مسٹر ہیمم جی کا اشتہار دکھا کر پوچھنے لگے کیوں صاحب یہ کیا چیز ہی ؟ چوں کہ اُنھوں نے لفظِ نیشنل کانگرس پر اُنگلی رکھ کر پوچھا معلوم ہوا کہ پڑھے لکھے ہیں - مگر نہ لفظ نیشنل کانگرس اُن کی زبان سے ادا ہوتا ہی نہ اُس کے معنی سمجھے ہیں - ضیق وقت کی وجہ سے اُن کے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کی مہلت تو نہیں ملی - تاہم اُن کے طرزِ استفسار سے ایسا مستنبط ہوتا تھا کہ نیشنل کانگرس کو اندر سبھا کی قسم کا کوئی تماشا سمجھے ہیں - ابھی تھوڑی دیر میں مَیں آپ صاحبوں پر ثابت کر دوں گا کہ اندر سبھا کی قسم کا تو نہیں لیکن نیشنل کانگرس تماشا ضرور ہی - مجکو نیشنل کانگرس کے کسی جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر جہاں تک اخباروں میں پڑھا اور جہاں تک لوگوں سے سنا اس نیشنل کانگرس کی اصل حقیقت میں نے اپنے ذہن میں یوں ٹھیرا رکھی ہی کہ انگریزی تعلیم مدتوں سے چپکے چپکے دلوں میں شورش پیدا کر رہی تھی - لوگ نوکری کے واسطے تیاری کرتے اور نوکری ہی کی امید میں سخت سخت رنجتیں اُٹھاتے تھے سرکار نے تعلیم پر ملکی ضرورتوں سے بہت زیادہ زور دیا جس کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ خواستگارانِ نوکری کا ایک بہت بڑا کثیر الانتفا گروہ پیدا ہو گیا بے شک عقلاً محال تھا کہ سرکار جس کی جُزرسی اور کفایت شعاری بھی مشہور ہی اُس جمِ غفیر کو نوکریاں دے سکے - یوں سلسلہ بسلسلہ بڑھنے سے توقعات توقعات سے حرمان اور حرمان سے نارضامندی پیدا ہوئی جس کا مرادف ہی - نیشنل کانگرس - پس نیشنل کانگرس اِس کے سوائے اَور کچھ نہیں کہ چند ناکام انگریزی خوان اِس پیرایے میں اپنے دلوں کے جلے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں - اِن کے دلوں میں گورنمنٹ کی طرف سے ناحق کے بخارات بھرے ہوئے ہیں - اور اِن کے بخارات نے ان کی چشمِ انصاف کو اس قدر تیرہ و تار کر دیا ہی کہ گورنمنٹ میں سوائے عیب کے اُن کو کچھ نہیں سوجھتا - ایک شاعر عربی نے کیا خوب کہا ہی ؎

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ[۵] ولکنّ عین السخط تبدی المساویا

مولانا کا یہ پہلا لکچر اِس مجمع میں ایسا پھلا پھولا کہ سارے ہندوستان میں اُن کی خوش بیانی کی دھوم مچ گئی - ملک میں تو انجمنوں کی رسم چل پڑی ہی - جب اِس لکچر کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے مولانا کو لکچر دینے کی دعوتیں بھیجی ہیں - یہاں تک کہ تار پر زادِ راہ بھیجے - اور مولانا نے واپس کر کر دیے - اور جب تک وہ لکچر دیتے رہے کوئی مہینا خالی جاتا ہوگا کہ کہیں نہ کہیں سے بُلاوا نہ آتا ہو -

کسی نے کیا اچھی بات لکھی ہی کہ ہمارے مولانا جس طرح پُرانے مولوی اور سنے حافظ ہیں اسی طرح وہ پُرانے مصنف

ف۵ یعنی خوشنودی کی آنکھ عیب کے دیکھنے سے قاصر ہوتی ہی - وہ تو خشمناکی کی آنکھ ہی جس کو برائی ہی برائی سوجھتی ہی ۱۲

اور نئے لکچرار بھی ہیں - اب سے چار برس[۱] پہلے اَور تو اَور خود مولوی نذیر احمد صاحب کو بھی معلوم نہ تھا کہ مجھے لکچر دینے کی بھی قدرت ہی جس طرح ضرور نہیں کہ جو بڑا عالم ہو وہ بڑا مُعلّم بھی ہو - اسی طرح یہ ضرور نہیں کہ جو بڑا انشی یا ادیب ہو وہ بڑا لکچرار بھی ہو - لکچر دینے کے لیے بعض ایسی صفتیں بھی درکار ہیں جو صرف وہبی یعنی خداداد ہو سکتی ہیں نہ اکتسابی کہ جو چاہے محنت و مشقت سے حاصل کر لے - مثلاً لکچرار چاہیے جہیر الصوت ہو کہ جو کچھ کہے حضّارِ مجلس کو گنتی میں کتنے ہی ہوں سُنا سکے - اور سُنا سکے بھی تو اس طرز پر کہ قریب منافی نہ ہوں اور بعید محروم نہ رہیں - مولانا کو دلّی لاہور علی گڑھ میں لکچر دیتے دیکھا - چھچھ چھ سات سات ہزار آدمیوں کا مجمع اور خدا نے عجیب آواز دی ہی کہ سننے میں پاس کے پاس اور دُور کے دُور کے لوگ سب یکساں - پھر لکچرار چاہیئے توی دل کہ حاضرین کیسے ہی ذی رتبہ اور مقتدر اور لائق ہوں وہ کسی سے نہ جھینپے - اچھے اچھوں کو دیکھا ہی کہ دماغ میں بہت کچھ بھرا ہوا ہی - گویائی بھی خاصی ہی - مگر مجمع کو دیکھ کر کچھ ایسی گھگّی گم ہو جاتی ہی کہ ایک بات کہتے نہیں پڑتی اور تکلف کبھی بھی تو پسینے پسینے ہوتے چلے جا رہے ہیں آواز لڑکھڑائی جاتی ہی - ہاتھ پانوں پڑے کانپ رہے ہیں - مگر مولانا لکچر دینے میں اگر مرعوب ہوتے ہیں تو اسی قدر کہ گرمی کے دنوں میں پانی اور جاڑے میں چاہے بار بار پیتے جاتے ہیں - ان سے پوچھا گیا تو کہا چیخ چیخ کر بولنے میں زور بہت پڑتا اور گلا خشک ہوا چلا جاتا ہی - مگر ایسی تو کیا بات ہی کہ آڈینس کا کچھ بھی اثر نہ پڑتا ہو - پھر بھی بڑے ہی بے تکان بولنے والے ہیں اور ایک خاص بات یہ ہی کہ اس عمر پر چار چار پانچ پانچ گھنٹے متصل اُسی کڑاکے سے بولتے رہیں - اور نہ تھکیں اور نہ آواز بھرائے - مولانا اکثر اپنا لکچر لکھ کر ساتھ لایا کرتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے لکچر جو بجائے خود کتاب نہیں تو رسالے تو ضرور ہوتے ہیں مگر وہ جو کچھ لکھ کر لاتے ہیں اُس کو نوٹ سمجھو اُچٹتی ہوئی سی ایک نظر ڈال لی اور ایک پورے مطلب کو حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کر دیا - اور اگر سر جھکائے لکھا ہوا دیکھ دیکھ کر بیان کریں جیسے سررشتہ دار پیش حاکم رپورٹ پڑھتا ہی یا بار بار تحریر کو دیکھتے جائیں تو سننے والوں کو مزہ ہی کیا خاک ملے اگر بیان میں جادو ہی تو کہنے والے کی زبان سے نکل کر سُننے والے کے کان میں اور پھر اُس کے دل میں جگہ کرتا ہی بہت سی باتیں مولانا کو عین وقت پر سوجھتی جاتی ہیں اور وہی اُن کے لکچر کی جان ہوتی ہیں - مولانا نے معدودے چند کے سوا اکثر بڑے بڑے مطوّل لکچر دیئے ہیں اور یہ اُن ہی کی ظرافت اور خوش بیانی کا اثر تھا کہ کبھی کسی کو ملول ہوتے نہ دیکھا - وہ جو ہمارے مولانا کی تحریر خاص ہی اور جو الگ پہچان پڑتی ہی اُس زور سے تو نہیں مگر پھر بھی اُن کے لکچروں سے ٹپکی پڑتی ہی - مولانا کو اُردو فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہی - اور عربی انگریزی کے الفاظ بلکہ جملے کے جملے وہ ایسے بے تکلفی کے ساتھ بولتے چلے جاتے ہیں کہ گویا اُن کی اپنی زبان ہی - قوم اور ملک نے صرف طرزِ بیان اور زورِ بیان ہی کی وجہ سے مولانا کے لکچروں کی قدر نہیں کی بلکہ اُن کے مطالب اور مضامین ایسے ضروری اور مفید ہیں کہ لکچر اِن کی تصنیفات پر فائق اور مرجّح نہیں تو دل چسپ ہونے میں کسی سے ہیٹے بھی نہیں - مولانا نے بہت سے معرکۃ الآرا مضامین پر نہایت آزادی اور متانت اور استواری سے اپنی رائے ظاہر کی ہی اور وہ ایسی محکم اور مدلّل ہی

[۱] یہ اشارہ ہی ۱۸۸۸ء کی طرف ۱۲

کہ چار و ناچار اس سے اتفاق کرنا پڑتا ہے - مذہب اسلام اور تعلیم دونوں ایسے ضروری مضمون ہیں اور مولانا نے اُن پر ایسی موشگافیوں کے ساتھ بحث کی ہے کہ کوئی پہلو بچنے نہیں پایا - اسلام کی تائید میں اُن کے دلائل ایسے تشفی بخش اور یقین دلانے والے ہیں کہ علم کلام کی کسی کتاب میں یہ بات نہیں پائی جاتی - نوجوان انگریزی خوان جو سائنس اور مذہب کی کشمکش میں ثابت قدم رہ نہیں سکتے ان کو دینِ اسلام پر جمے رہنے کے لیے ان لکچروں سے سہارا لینا ضروری ہے -

ہمارے نزدیک لکچر دینے یا اسپیچ کہنے کے چار طریقے مروّج ہیں - ایک یہ کہ لکچرار یا اسپیکر اپنی اسپیچ یا لکچر لکھ کر کسی مجلس میں پڑھ دے - دوسرے یہ کہ اسپیچ کو لکھ کر زبانی یاد کر لے - تیسرے یہ کہ جو بیان کرنا ہو اس کو دل میں سوچ سمجھ کر خیال کر لے - چوتھے یہ کہ صرف نوٹ کر لے اور اپنے خیالات کو نوٹ دیکھ دیکھ کر مجلس کے سامنے بیان کر دے ہمارے نزدیک ان چار قسموں میں سے کوئی بھی فاضل لکچرار نے اختیار نہیں کی - بظاہر لوگ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ لکچر دینے کے پہلے طریقے پر فاضل لکچرار کاربند ہیں - کہ گھر سے لکچر لکھ کر بلکہ چھپوا کر لاتے ہیں اور چوں کہ یہ نہایت سہل اور آسان طریقہ ہے اس لیے لکچرار کی اس میں کچھ تعریف نہیں - لیکن اُن کا یہ گمان بالکل غلط ہے - فاضل لکچرار اس میں کچھ شک نہیں کہ اپنا لکچر لکھ کر اور چھپوا کر لاتے ہیں - مگر لکچر دینے کی سہولت کے لیے نہیں - بلکہ سامعین کی آسانی کے لیے کہ وہ لکچر سننے کے بعد لکچر کو خرید لیں اور گھر لے جا کر اُس کو سبقاً سبقاً استفادہ حاصل کریں - اس کے سوا ہم نے تو یہ دیکھا ہے اور ہزار ہا آدمی اس کا گواہ ہے کہ فاضل لکچرار لکچر کو کتاب کی طرح نہیں پڑھتے - صرف ابتدا میں ایک نظر ڈالی اور لکچر کو بند کر کے میز پر ڈال دیا اور حافظے کے زور پر سارے کا سارا لکچر دے دیا - ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ خاص خاص مواقع پر لکچر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - لیکن اصل میں کچھ کمی نہیں ہوتی -

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں فاضل لکچرار کے لکچر پر کچھ لوگ بحث و مباحثہ کر رہے تھے - ایک صاحب نے یہ فرمایا کہ مولانا میں یہ ایک خاص صفت ہے کہ جو کچھ وہ چھپوا کر لاتے ہیں اُس میں - اور کانفرنس میں جو کچھ بیان کرتے ہیں اس میں ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہوتا - یہاں تک کہ جس ترکیب اور ترتیب سے جو الفاظ اور فقرے چھپے ہوتے ہیں وہی اُن کی زبان پر ہوتے ہیں اور اُس میں سر مو فرق نہیں ہوتا - یہ بات راقم نے نہایت استعجاب سے سُنی - حُسنِ اتفاق سے مولانا کا لکچر اُس وقت تک نہیں ہوا تھا اس لیے تجربہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا - چناں چہ جب فاضل لکچرار اسٹیج پر تشریف لائے تو راقم ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا اور مشکل تمام نہایت کوشش بلیغ سے ذیل کا فقرہ اُس وقت یاد کر لیا جو فاضل لکچرار کی زبان سے اُس وقت سنا تھا جب کہ لکچر کی بند کاپی میز پر پڑی تھی اور فاضل لکچرار آڈیینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لکچر دے رہے تھے غرض وہ فقرہ یہ تھا -

تمہارے سامنے انگریزوں کے نمونے موجود ہیں - ان کے ربط ضبط دیکھو ان کے انتظام دیکھو ان کے ہنر دیکھو ان کے سلیقے دیکھو ان کی صفائی دیکھو ان کی ہمت دیکھو کہ ایک چھٹے جزیرے کے رہنے والے اور جزیرہ بھی ایسا منحوس کہ نیچر نے موسم کے اعتبار سے آب و ہوا کے اعتبار سے پیداوار کے اعتبار سے اُن کے ساتھ نہایت

اصل بات یہ ہے کہ سرسید کے انتقال کے بعد گویا مولانا نے اس شغلے کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اور اب اُن کا دل
نہیں چاہتا تھا کہ وہ کہیں بھی لکچر دیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کیا کہیں شغلۂ لکچر کا ابھی چھوٹ گیا ۔۔۔ ہم سے اک بار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
سید مستند ہوا شفقت ہی ترا ہم سفر ۔۔۔ تم کو کل جاؤ گے پر ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پہنچ کے دکھلاؤں گا اپنی پرواز ۔۔۔ گو قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

ابھی چند روز ہوئے کہ یہاں مدرسۂ طبیہ کے سالانہ جلسے میں لکچر دیتے وقت عذر کیا تھا کہ سید احمد خاں کے مرنے
کی وجہ سے میری طبیعت حاضر نہیں اور جیسے لکچر کی توقع مجھ سے لوگ رکھتے ہیں میں دے نہیں سکتا۔ میں کیا
کروں میرا حال یہ ہو گیا ہے کہ جب کبھی لکچر یا پبلک اسپیچ کا خیال کرتا ہوں سید احمد خاں کی صورت سامنے آ کھڑی ہوتی
ہے۔ اُن کا تصور بندھا اور طبیعت بے قابو ہوئی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ لکچر اور پبلک اسپیچ وغیرہ کی گدگدی ہم لوگوں
میں اُسی مرحوم نے پیدا کی تھی۔ پس خود لکچر دینے کھڑا ہوتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں کسی کو لکچر
دیتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔"

غرض سرسید کے انتقال کے بعد نواب محسن الملک مرحوم بھی فاضل لکچرار کو تکلیف دیا کرتے تھے اور وہ طوعاً
و کرہاً تشریف لاتے تھے۔ لیکن نواب صاحب مرحوم کے بعد کیا بلکہ اُن کی زندگی ہی میں غالباً لکھنؤ کی کانفرنس
کے بعد تو باب لکچر میں مولانا نے چپ کی قسم کا قفل ڈال دیا ہے اور اب امید نہیں کہ فاضل لکچرار اس کو کھولیں۔
سنا گیا ہے کہ مولانا ان دعوت دینے والوں کی کج ادائیوں سے ناراض ہو گئے اور اسی وجہ سے علی گڑھ لاہور اور
دلّی کی تینوں مجلسوں میں جانا چھوڑ دیا۔

راقم حسنِ اتفاق سے مسلم لیگ دہلی کے جلسے میں شریک ہونے کی غرض سے گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے
بعد ندوۃ العلماء کا جلسہ بھی یہیں دلّی میں ہوگا۔ میں نے یہ سن کر مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اور مجلسوں میں
شریک ہونا بالکل چھوڑ دیا ہے اور وہ شاید اس وجہ سے کہ اب آپ دُور دراز سفر کی زحمت نہیں برداشت کر سکتے لیکن
ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تو یہیں ہونے والا ہے اور اس میں آج تک آپ شریک بھی نہیں ہوئے ہیں۔ آپ اس میں
شریک ہو کر کچھ نہ کچھ ضرور ارشاد فرمائیں۔ میری درخواست پر فرمانے لگے کہ ان مجلسوں کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو
گیا ہے۔ اور میں اب کسی جلسے میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ مولوی شبلی صاحب کا بھی خط آیا ہے کہ میں ندوہ میں
شریک ہوں۔ مگر میں نے اُن کو صاف جواب لکھ دیا کہ میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا اور اب میرا دل ان مجلسوں کی طرف
سے بجھ سا گیا ہے۔ یہ فرما کر علامہ شبلی نعمانی کا خط مجھے دیکھنے کو دیا جو ذیل میں درج ہے۔

مخدومی سلامت۔ تسلیم و نیاز۔ آپ کا ابر کرم ہر طرف برس چکا۔ صرف ندوہ تشنہ رہ گیا تھا جس کی وجہ شاید بُعد
مسافت تھی۔ لیکن اب تو ندوہ وہیں آتا ہے کیا گھر آئے کو بھی پھیر دیجئے گا۔ آپ کی رنگین بیانی سے محروم رہے گا۔ مولانا یہ
بڑا خیر کا کام ہے۔ سالانہ جلسہ ندوہ کا وہیں ہے۔ اس میں کچھ ضرور فرمائیے۔ اور مجھ کو اطلاع دیجئے کہ میں اخباروں میں اس کو

شائع کروں۔ امید ہی کہ ایک دیرینہ نیازمند کی درخواست کو آپ ردّ نہ فرمائیں گے۔

شبلی نعمانی ندوہ لکھنؤ ۱۵۔ جنوری ۱۹۱۰ع

ہم نے یہ خط اس لیئے یہاں نقل کر دیا ہی کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے عام و خاص جلسوں میں ہمارے مولانا کی شرکت کی کتنی سخت ضرورت ہی۔ اور ایک اُن کی عدم شرکت کی وجہ سے عامۃ المسلمین کو کتنا نقصان عظیم اُٹھانا پڑتا ہی۔ دوسرے یہ کہ مولانا کی عدم شرکت کی وجہ بھی ناظرین کو معلوم ہو جائے گی۔

لکچروں پر اعتراضات

فاضل لکچرار اور نیز عام لوگوں کو یہ شکایت ہی کہ لکچرار لکچر دیتے دیتے اکثر لائن سے باہر ہو جاتا ہی۔ اگرچہ یہ ہی تو ٹیکنیکل مگر راقم کے نزدیک یہ کوئی اعتراض نہیں عیب نہیں بلکہ غور و تامل سے کوئی شخص فیصلہ کرنے بیٹھے تو مجھے اس امر کی ڈگری دے کہ فاضل لکچرار کا لائن سے باہر ہو جانا اسپیکر اور لکچرار کا ایک اعلیٰ درجے کا ہنر ہی۔ مگر لائن سے باہر ہونا بالکل ایسا ہی ہو جیسا فاضل لکچرار کا۔ مثال کے طور پر مولانا کا لائن سے باہر ہو جانا ذیل میں درج کیا جاتا ہی فرماتے ہیں۔

اُب کے سال ارادہ تھا کہ کوئی شگفتہ سا لکچر دوں گا۔ لیکن ع خوئے بد را بہانۂ بسیار۔ جوں ہی لکچر کا قصد کیا کہ یاد آگئی جنرل عظیم الدین خاں صاحب کی افسوس ناک خوفناک اور بے ہنگام موت۔ میں نے رسم دنیا کے مطابق جنرل عظیم الدین خاں کی موت کو بے ہنگام موت کہا ورنہ کوئی موت بے ہنگام یعنی قبل الوقت یا بعد الوقت ہو ہی نہیں سکتی۔ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ اور اگر کسی موت کو بے ہنگام کہا جا سکتا ہی تو بڑی کثرت سے قبل الوقت موتیں وہ ہیں جو شاید طب یونانی نہیں بلکہ یونانی طبیبوں کے ہاتوں سے ہوتی ہیں اور جن کی تعداد کے گھٹانے بلکہ ہو سکے تو بالکل روک دینے کے لیئے حکیم عبدالمجید خاں صاحب نے اس مدرسے کا ڈول ڈالا ہی۔ بے مشقی بھی کیا بُری چیز ہی دو منٹ بات کرتے نہیں گزرے کہ میں لین سے باہر ہو گیا اور سلسلہ سخن کے لیئے پھر اعادہ کرنا پڑا کہ میں نے اسال کوئی شگفتہ سا لکچر دینے کا ارادہ کیا کہ یاد آگئی جنرل عظیم الدین خاں کی موت الخ

یا مثلاً شاہجہاں پور کے ایک لکچر میں فرماتے ہیں۔

"دنیا اسی ہندوستان یا اسی نارتھ ویسٹرن پراونسز یا اسی شاہ جہاں پور سے تو عبارت نہیں ہی۔ اگرچہ اپنی کوتاہ نظری سے لوگ دنیا کو نہایت محدود خیال کرتے ہیں۔ ایک آدمی چند اخباروں میں اپنا نام یا کسی دوسری طرح پر لوگوں میں اپنا تذکرہ ہوتا ہوا سُن کر اپنے تئیں مشاہیر میں شمار کرتا اور اپنے جی میں خوش ہو لیتا ہی۔ لیکن اگر وہ ذرا اپنی نظر کو وسیع کرے تو اس کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ جس دائرے کو اس نے محیط زمین خیال کر رکھا ہی وہ حقیقت میں ایک نقطے سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا۔ شاید افریقہ کا مذکور ہی کہ وہاں کسی ریاست کا بادشاہ اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا تھا اور اسی ایک بادشاہ پر کیا موقوف ہی بادشاہوں اور رئیسوں اور دولت مندوں بلکہ میں تو کہتا ہوں عموماً کل آدمیوں کے سَر اس عُجب کے خبط سے خالی نہیں ہوتے۔ امیروں کے نام اور اُن کے خطاب دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں کیا

سمجھتے ہیں۔ شروع کے مسلمانوں کے نام سے پتا لگتا ہے کہ اُن کے مزاجوں میں کس درجے کا انکسار تھا، باوجودیکہ دنیاوی اور دینی عظمتوں اور بزرگیوں کے جامع تھے اور عظمتیں اور بزرگیاں بھی اس درجے کی کہ اُس کا پاسنگ بھی کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ باایں ہمہ الفاظ مفردہ میں اپنے نام رکھتے تھے۔ جیسے علی، حسن، حسین وغیرہ لیکن اب کیا مجال ہے چاہے باوا نے نتھو اور بدھو ہی نام کیوں نہ رکھا ہو، پہلا کام جو ہم میں سے ایک آدمی شُدبُد حاصل کر لینے کے بعد کرنا چاہتا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے نام کو شان دار بناتا ہے۔ اے کاش وہ اپنے تئیں لیاقت سے شان دار بنائے۔ وہ مفرد نام کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر ترکیب[۱] پر بھی قانع نہ ہو کر بیٹھتا نہیں بلکہ کبر و نخوۃ اطالت نام کے لیے لفظ تھا تو ضرور ہی اپنے نام کے ساتھ لگا لیتا ہے اور اس کے بعد مذہب یا وطن یا نسبت نسبی میں بھی بہتیری گنجائش ہے۔ اچھے نام رکھنا تو بہت اچھی بات ہے مگر اس داعیے کو دیکھنا چاہیے جس وجہ سے ناموں کو شان دار بنایا جاتا ہے۔ ہاں تو شاید افریقہ کا مذکور ہے کہ وہاں کسی ریاست کا بادشاہ اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اتفاق سے وہاں کسی سیاح انگریز کا گذر ہوا۔ مجھ سے جس شخص نے یہ حکایت نقل کی اس نے مطلق سیاح کہا تھا۔ انگریز کا لفظ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اس لیے کہ اب یہ شوق جو ترقی تجارت بلکہ ملک گیری کی تمہید ہے خدا نے انگریزوں ہی کو دیا ہے کہ یہ لوگ اگر سیر و سیاحت نہیں بھی کر سکتے تو گھر بیٹھے جغرافیے اور تاریخ کا اثر دماغ پر بنائے بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم میں جغرافیے اور تاریخ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ رہے ہم گھر گھسنے ہندوستانی۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ میں نے تو کسی طالب العلم کو جغرافیے اور تاریخ کا شائق نہ پایا جس کو دیکھا رٹنے اور گھوٹنے ہی دیکھا۔ اور میں دوسروں پر کیا الزام دوں کہ جغرافیے اور تاریخ کے نام سے خود مجھ کو نفرت ہے۔ اس سے کہ دو چار آدمی بضرورت ولایت گئے اور بارسٹری کا ڈپلوما اور ولایتی بی اے لے آئے یا حج کی تقریب سے اگر مقلد ہوئے تو مکہ مدینہ اور غیر مقلد ہوئے تو فقط مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے۔ اس سے فریضۂ سیر و سیاحت ادا نہیں ہوتا۔ ہندو اگر ملک کے باہر نہیں جاتا تو وہ معذور ہے کہ اس کا مذہب اس کو اجازت نہیں دیتا کہ کالے پانی سے عبور کرے۔ اور عبور کرنے کے علاوہ دوسرے ملکوں میں کھانے پینے کی احتیاط باقی نہیں رکھ سکتا۔ مگر سر پیٹ لینے کی بات تو یہ ہے کہ جن کا مذہب مانع ترقی ہو وہ ترقی کریں۔ اور جن کا مذہب مانع ترقی ہونا کیا ترقی کے لیے اُلٹا متقاضی ہو اُسی مذہب کا حیلہ بنا کر ترقی معکوس کریں۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ کیوں جی وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ[۲]۔ اور۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ[۳]۔ اور۔ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ[۴]

---

۱ مثلاً ایک مولوی فتوے پر دستخط کرتا ہے حررہ محمد عبد السلام الحنفی الہروی الغزنوی الکابلی اللاہوری الدہلوی الکھاری، یا ولی یا ایک شیخ طریقت شجرۂ بیعت پر عرب شاہ چشتی قادری نقش بندی نظامی باقی باللہی مسکین شاہی وغیرہ وغیرہ ۱۲

۲ ترجمہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے ان سے خدا نے وعدہ کر لیا کہ (ایک دن) ان کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے ان لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ۱۲

۳ ترجمہ ہم زبور میں (پند و نصیحت کے) بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین (کی سلطنت) کے وارث ہوں گے ۱۲

۴ (یہ منافق) کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینے لوٹ کر گئے تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت اللہ کی اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی ہے مگر منافق (اس بات سے) واقف نہیں ۱۲

یہ اور اس طرح کی اور بہت باتیں ہیں جن سے استشہاد کروں تو بات بڑھتی چلی جائے تقاضائے ترقی نہیں تو کیا ہے
اور ہندوؤں کا نام بھی میں نے اس لیے لیا کہ ہم اور وہ ملے جلے ہوئے بستے ہیں۔ شاید اُن کی حالت دیکھ کر مسلمانوں کے
دلوں میں گدگدی پیدا ہو ورنہ یہود اور شرائط اور مزاحمتوں اور رکاوٹوں کے اعتبار سے نصاریٰ کا مذہب تو سب سے
گیا گزرا ہے اور پھر یہ لوگ معراج الکمال ترقی پر چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ ہندوؤں کا مذہب تو سمندر پار ہی جانے
کی مناہی کرتا ہے ان کے یہاں جگہ سے اپنے ملک کی مناہی ہے کیوں کہ کل کے لیے ذخیرہ کرنے ہی کی مناہی ہے اور [illegible]
نہیں تو یوں کہو کہ دنیا میں کوشش کوئی چیز نہیں۔ اٹلی میں گاریبالڈی ایک بڑا مشہور سپہ سالار ہو گزرا ہے جس نے روم
کو پوپ کی سلطنت سے آزاد کرایا ۱۸۷۰ء میں وہ فتح مند اپنی فوج لے کر روم میں داخل ہوا۔ اب سال بسال فتح کے اس دن
کی یادگار میں تمام ملک خوشیاں مناتا ہے اب کے برس اس تقریب میں گاریبالڈی کا ایک بت بھی کھولے جانے کو تھا
اس موقع پر اٹلی کے وزیر اعظم کرسپی صاحب نے اسپیچ دی میں آپ صاحبوں کو انگریزی میں پڑھ کر سناتا ہوں۔ اگر تلفظ
میں غلطی کروں تو معاف فرمانا کیونکہ میں نے انگریزی کبھی اسکول یا کالج میں نہیں پڑھی۔ اور نہ انگریزی داں سوسائٹی میں
رہا اور نہ ساری عمر خدا نے انگریزی کے ذریعے سے مجھ کو معاش دی۔ لیکن با ایں ہمہ میں جو کچھ بھی ہوں اور جیسا کچھ
بھی ہوں ناز انگریزی ہی کی بدولت۔ ورنہ سیکڑوں عربی فارسی پڑھے ہوئے مجھ سے بہتر اس مجمع میں موجود ہوں گے
(اس کے بعد لکچرار نے انگریزی عبارت پڑھی جس کا اردو میں خلاصہ یہ ہے) کرسپی نے کہا کہ مذہب کو ملک داری
اور ملک گیری سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ عیسائی مذہب تو یہ چاہتا ہے کہ تارک الدنیا ہو کر کسی گرجا گھر کے کونے میں
بیٹھ کر یاد الٰہی کیا کرو مگر با ایں ہمہ اہل یورپ عیسائیت کا بھی دم بھرتے ہیں اور ملک بھی فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔
یہ دینداری ہم مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی ہے کہ ملک گیری اور ملک داری کا کیا ذکر ہے یہاں خانہ داری سے
بھی ایمان میں فرق آجاتا ہے۔ اسی سے تو مسلمان اپنی حالت کو درست نہیں کرتے۔ مجھ میں یہ ایک بڑا عیب ہے کہ ایک بات
شروع کرتا ہوں اور پہنچتے کہیں سے کہیں نکل جاتا ہوں اور وہ بات ناتمام رہ جاتی ہے لیکن آپ سب صاحب ذرا
صبر سے بیٹھے رہیں۔ جو جو باتیں ناتمام رہ گئی ہیں مجھ کو معلوم ہیں اور میں ان شاء اللہ سب کو پورا کر کے ایک کا ایک سے جوڑ
لگا کر دکھاؤں گا۔ آخر میں تو یہ بات رہ گئی تھی کہ افریقہ میں کسی ریاست کا بادشاہ حمق سے اپنے تئیں ہفت اقلیم کا بادشاہ
سمجھتا تھا۔

ناظرین نے ان دو مثالوں میں ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ فاضل لکچرار کا لائن سے باہر ہو جانا کوئی آن بان
کی بات ہوتی تھی یا بیکار اور بے نتیجہ ہونے کے علاوہ کالملح فی الطعام۔

مسٹر موریسن کی رائے فاضل لکچرار کی نسبت

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹیں، انجمن حمایت الاسلام اور [illegible]
کی رودادیں فاضل لکچرار کی اسپیچوں اور لکچروں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ جو
دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں مگر ہم یہاں مسٹر موریسن سابق پروفیسر و پرنسپل
مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی رائے کا خلاصہ درج کیے دیتے ہیں۔

مسٹر موریسن جس زمانے میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے تو راقم بھی وہیں لائبریرین تھا۔ مولوی بشیر الدین مینیجر اسلامیہ اسکول اٹاوہ نے ایک سالانہ جلسے میں پروفیسر صاحب موصوف کو جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا۔ چناں چہ اُنھوں نے دعوۃ کو قبول کرلیا۔ اور جانے سے دو روز پیشتر مجھے اپنے بنگلے پر بلایا اُن کو اُردو زبان سے بہت شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے ایک لکچر لکھ کر تیار کیا تھا مجھ سے ارشاد کیا کہ تم بھی میرے ساتھ علی گڑھ سے اٹاوے چلو۔ اور میری طرف سے میرا لکچر وہاں پڑھ دینا۔ مَیں نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا تو کہنے لگے کہ اوّل یہیں لکچر کو میرے سامنے پڑھ کر سناؤ۔ میں نے سنانا شروع کیا۔ تو جابجا مجھے ٹوکا اور کہا کہ یہاں آہستہ پڑھو اور یہاں ذرا زور دے کر یہاں اس قسم کی ٹون بناؤ اور فلاں مقام پر اس طرح پڑھو۔ چناں چہ جب میں پڑھ چکا تو فرمایا کہ تم نے مولانا نذیر احمد صاحب کا بھی لکچر سنا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ انھوں نے کہا تم اُن کی نقل کیوں نہیں اتارتے۔ میں نے کہا اوّل تو میں لکچر دیا نہیں کرتا۔ اس کے سوا اگر ایسا کروں تو لوگ ہنسیں گے۔ اسی تذکرے میں پروفیسر صاحب کہنے لگے کہ مولانا نذیر احمد صاحب مسلمانوں میں ایسے لکچرار ہیں کہ اگر وہ یورپ کی کسی قوم میں پیدا ہوتے تو آج یورپ بھر میں اُن کی تقریروں اور اُن کے لکچروں کا جواب نہیں ہوتا اور جتنا یورپ ایسا لکچرار پیدا نہیں کرسکتا۔ میں نے ایسا پُرجوش اور لاجواب اسپیکر نہیں دیکھا۔

فاضل لکچرار کے لکچروں کی تعداد اس وقت پچاس ساٹھ کے قریب ہے اور وہ کئی جلدات میں طبع ہوچکے ہیں۔ اور تقریباً ہر بڑے کتب فروش کے ہاں ملتے ہیں۔ ہم نے اس وقت تک لکچروں کا نمونہ ناظرین کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس لیے کہ اُن کے لکچر سیکڑوں مرتبہ چھپ چکے ہیں۔ ناظرین میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے مولانا کے لکچروں کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ تاہم ایک معرکۃ الآرا لکچر "فطرۃ اللہ" کو نمونے کے طور پر پیش کش ناظرین کرتے ہیں۔ یہ وہ لکچر ہے جس میں توحید پر بڑی ٹھیک ٹھاک ہی ہے اور جس پر مولوی محرم علی صاحب چشتی نے اپنے اخبار رفیق ہند میں اعتراضوں کا تانتا باندھا تھا۔ اور مولانا نے اُن پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش دائر کی تھی اور آخر میں مولوی محرم علی چشتی نے معذرت چاہی تھی اور مولانا نے اُن کے قصوروں کو معاف کر دیا تھا۔ غرض وہ لکچر قابل دید ہے اس لیے درج کیا جاتا ہے۔

فطرۃ اللہ

اب سے غالباً پینتیس ۳۵ برس پہلے کا مذکور ہے کہ ایسٹ انڈین ریلوے کا وہ حصہ جو الہ آباد اور فتح پور کے درمیان واقع ہے کھولا گیا۔ میں اُن دنوں مدارس الہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اور مجھ کو دورے کی ضرورت سے اکثر ریل پر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ چوں کہ ریل نئی چیز تھی۔ انتظام میں بھی بہت سے نقص تھے اور لوگ ریل کے ضبط اوقات اور اس کی قوت رفتار سے بھی اچھی طرح آگاہ نہ تھے۔ ایکسیڈنٹس (حادثات) اکثر واقع ہوتے رہتے تھے اس وقت کی دو باتیں ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ ایک ہنسی کی اور ایک افسوس کی۔

ہنسی کی بات تو یہ ہے کہ اتفاق سے خبر نہیں کہاں کے، مگر وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کی طرف کے دو صاحب ایک اسٹیشن پر گھنٹوں پہلے سے ریل کے منتظر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اتنے میں گھنٹی ہوئی اور ریل کے کسی

ملازم نے آواز دی کہ پچھم کے جانے والو ٹکٹ لینے چلو۔ ان دونوں نے بھی ٹکٹ لیے اور پھر فراغت سے اپنی جگہ جاکر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ریل آموجود ہوئی۔ اور لوگ گاڑیوں پر سوار ہونے کے لیے دوڑے یہ دونوں بھی ٹکے گز کی چال سے چلے۔ اوّل تو جس تکلف سے انھوں نے اسباب اٹھایا ہے قابل دید تھا دونوں ہاتھ اور بستر اسباب کی گٹھری۔ پان دان حقہ اور اس کے اجزائے ثلاثہ نیچہ و چلم چکموں کی تھیلی۔ ایک کف دست کے برابر ٹوپی جو سر پر اوڑھے تھے یا انہی کے محاورے میں کیوں نہ کہوں سر پر بیٹھے تھے۔ وہ اور شاید ناشتہ بھی۔ اتنی چیزیں سنبھالنے کو۔ اب مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے ان چیزوں کو کیونکر سنبھالا۔ مگر گٹھری کو تو میں دیکھتا تھا۔ الگ سے چٹکی میں پکڑے تھے اور کمر بل کھا کھا جاتی تھی۔

اللہ اللہ کیا اختلافِ اوضاع ہے ایک تو وہ ٹوپی تھی کہ میں نے اس کو کف دست کے برابر بتایا اور ایک تمہارے سامنے ہیں کہ باقی سارا لباس ایک طرف اور ایک سر بند ایک طرف۔ پھر مختلف بندش کی پگڑیاں ہیں۔ اپنے ہاتھ کی باندھی ہوئی۔ دستار بندوں سے بندھوائی ہوئی۔ ایک منی ایچر آو دی پراڈز آو اجپٹ آن دی سالسٹ سکیل یعنی نہایت ننھا اہرامِ مصر کا نمونہ۔ پارسیوں کی پگڑی اگر کہیں نظر پڑی ہو اور ایک منصب داری پگڑی ہمارے حیدر آباد کی ہے ہلکی سبک۔ پگڑی کی پگڑی اور ٹوپی کی ٹوپی۔ عمامے ہیں پھیٹے ہیں۔ ہمارے ہاں کے نیچریوں کی وضع خاص لال پھندنے دار ترکی ٹوپی ہے۔ نیچری تو یہاں بھی بہت ہوں گے مگر لال ٹوپیاں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اور خدا جانے کتنی قسم کی ٹوپیاں ہیں۔ چغہ، سرتی، پوشتینیں۔ اور دی لاسٹ دولوبٹ دی لیسٹ (سب سے آخر مگر سب میں کم نہیں) ایک بنگالی ہے کہ اس کو ٹوپی یا پگڑی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ غرض ہمارا ہندوستان بھی عجیب مختلف الشیون خطہ ہے ہر ایک کی وضع نرالی۔ ہر ایک کی طرح جداگانہ۔ اور جتنا اختلاف ظاہر کا ہے اس سے کہیں زیادہ مذہب کا اعتقادات کا۔ تم کو تعجب ہوتا ہوگا کہ وہ بقدر کف دست ٹوپی سر پر کیسے سنبھلتی ہوگی۔ اگر اوڑھنے کا ارادہ ہو تو تدبیر میں بتا دوں وہ ٹوپی آلپینوں سے بالوں میں اٹکالی جاتی ہے۔ لیکن اب پرانی باتیں چھوٹتی چلی جاتی ہیں۔ الّا یہ ایک عجیب سمجھ میں آتی ہے کہ جو صوبے بعد کو انگریزی عملداری میں آئے وہ جلد جلد انگریزی اثر سے متاثر ہوتے گئے۔

خیر تو وہ ریل کے دو مسافر اپنا سارا بکھیڑا لیے ہوئے سوار ہونے کی غرض سے چلے۔ پلیٹ فارم پر جانے کو ایک ایک کر کے ایک کٹہرے میں سے گزرنا ہوتا تھا۔ کٹہرے کے سرے پر دونوں ٹھٹھکے۔ یہ اس سے کہتا ہے کہ لے قبلہ آپ۔ اور وہ اس سے اصرار کرتا ہے لے قبلہ آپ۔

یہ قبلہ قبلہ بیت المقدس تو نہ تھا کہ حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ کہ اے پیغمبر اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کو پھیر لو اور تم لوگ کہیں بھی ہوا کرو مسجد حرام کی طرف اپنا منہ پھیر لیا کرو اور حکم کے ساتھ سب کے سب کعبہ شریف کو مڑ گئے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تحویل قبلہ کے بعد پہلی نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر گھر جا رہے تھے راہ میں ایک مقام پر بیت المقدس کی طرف کو نماز جماعت سے ہو رہی تھی۔ انھوں نے نمازیوں سے کہا تم کدھر کو نماز پڑھ رہے ہو قبلہ تو بدل گیا اور میں آنحضرت صلعم کے ساتھ ابھی

کی طرف نماز پڑھے چلا آتا ہوں وہ لوگ رکوع میں تھے سنتے ہی کعبہ کو پھر گئے۔
غرض ہمارے اِن لکھنوی دوستوں کا قبلہ قبلۂ بیت المقدس تو نہ تھا کہ ایک حکم میں اُس کی تحویل ہو جاتی بلکہ وہ قبلہ تھا تکلف اور ظاہرداری کا۔ وہ قبلہ تھا دکھاوے کا۔ تپاک کا۔ وہ قبلہ تھا وقتی ضرورت پر نظر نہ کرنے کا۔ وہ نام کو قبلہ تھا اور حقیقت میں قطب از جا نجنبد۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریل نکل گئی اور یہ دونوں افسوس کرتے رہ گئے۔
دوسری حکایت یہ ہے کہ ایک مقام پر ریل کی سڑک دُور تک اُونچا ٹیلہ کاٹ کر نکلی تھی۔ دونوں طرف ٹیلے کی سلامی دیواریں بیچ میں سڑک۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ اُن دنوں کا مذکور ہے کہ ریل نئی نئی جاری ہوئی۔ نہیں معلوم بیلوں کا ایک گلّے کا گلّہ کیوں کر سڑک میں اُتر آیا۔ ڈرائیور نے دیکھ کر دُور سے ڈراؤنی آوازیں نکالنی شروع کیں ہائی اُٹرا یا غُل مچایا۔ بیل کیا سمجھیں۔ یہاں تک کہ ریل اُن دونوں دیواروں کے بیچ میں آ داخل ہوئی۔ دو بیلوں نے عجیب تماشا کیا۔ ایک تو بیچ سڑک میں گردن جھکا کان کھڑے کر پھنکارے مارتا ہوا ریل سے ٹکّر لینے کو تیار ہوا اُس نے ریل کو شاید بھینس سمجھا ہوگا اور دوسرا دُم دبا کر نہیں بل کہ اُٹھا کر ریل کے آگے ہو لیا۔ اور باقی حیران و مبہوت ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کدھر جائیں کدھر نہ جائیں۔ چٹکی بجاتے میں ریل نے اُس کا جو لڑنا چاہتا تھا اور اُس کا جو ریل کے آگے آگے بھاگتا تھا مگر ریل کی تیزی کو کیا پاتا اور اُن کا جو حیران و مبہوت تھے مگر کچھ کرتے نہ تھے غرض سب ہی کا تو قیمہ کر دیا۔ وہ ہاربیل سین (منظرِ خوف ناک) مجھے ابھی تک بھولا نہیں اور بھولے گا بھی نہیں۔
اِن دونوں حکایتوں سے سوچنے اور سمجھنے والے کے لیے بہت بڑی نصیحت نکلتی ہے۔ ریل کو سمجھو کہ وہ زمانے کا نمونہ ہے اور بیلوں کا گلّہ ہم لوگ ہیں۔ اگر ہم زمانے کی قوتِ رفتار سے واقف نہ ہوں تو۔ اور اُس کا مقابلہ کرنا چاہیں تو۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ نہ چل سکیں تو اور کچھ نہ کریں تو زمانے کی ریل ہم میں سے کسی کو بے ضرر کرنے والی (چھوڑنے والی) نہیں۔ یہ وہ چکّی ہے کہ خدا کسی کو اُس کے پاٹوں میں ڈالے ہی نہیں۔ پاٹوں میں آیا اور رہا ہے آٹا ہوا یا گھُن سب کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ یہ وہ درانتی ہے کہ گیہوں یا سرسوں یا السی جو کچھ اُس کے مُونہ پر چڑھ گیا بے کاٹے نہیں چھوڑتی اب یہ تمھارا کام ہے کہ زمانے کی رفتار کو پہچانو۔ اُس کی قوت کو سمجھو۔ اور پھر یہ دیکھو کہ تم کن میں ہو۔ اِن لکھنؤ والوں کی سی گت کی چال چل کر ریل پر سوار ہو لوگے یا زمانے کی ریل کا مقابلہ کروگے یا بھاگ کر اُس کی زد سے بچ جاؤگے یا آنکھوں پر پٹی باندھ کر کانوں میں روئی ٹھونس کر زمانے کی ریل کی آمد سے بے خبر ہو بیٹھوگے۔ تم کھڑے دیکھا کروگے اور ریل اُوپر اُوپر چلی جائے گی۔ ریل کے پہونچنے میں اب کچھ دیر نہ سمجھنا۔ وہ آئی یہ آئی۔ بھاگو بھاگو بچو بچو۔ انا النذیر العریان فالنجا فالنجا۔
یہ عربی سمجھے۔ حدیث شریف ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اہلِ مکہ میں منادی کرائی کہ مجھ کو تم لوگوں سے کچھ ضروری بات کہنی ہے۔ فلاں وقت فلاں مقام پر جمع ہو جاؤ تو جو کچھ مجھ کو کہنا ہے تم کو اُس سے آگاہ کر دوں۔ لوگ جمع ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ بھلا اگر میں تم سے کہوں کہ دشمن کی فوج تم کو لوٹنے مارنے کے ارادے سے اِس پہاڑ کی آڑ میں آ کر چھپی پڑی ہے تو تم میری بات کا یقین کروگے یا نہ کروگے۔ سب بولے کہ ضرور یقین کریں گے کیوں کہ

تم اپنی قوم کے بدخواہ نہیں - جھوٹ بولنا تمہارا شیوہ نہیں - اس پر آپ نے فرمایا کہ تمہاری خرابیاں حد سے گزر گئی ہیں اور نزولِ عذاب کا وقت آگیا - اور میں نے مارے جلدی کے کپڑے بھی نہیں پہنے اور جیسا بیٹھا تھا تم کو ڈرانے کے لیے بھاگا ہوا آیا ہوں -

یہی مضمون قرآن میں بھی ہے مگر دوسرے الفاظ میں فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید بڑے لوگوں کی بڑی باتیں - مگر میں نے جو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مقولے سے تمثل کیا تو صرف اتنی بات پر کہ میرا نام نذیر ہے اور چاہیے یوں سمجھو کہ مجھی کو سوجھی - یا کسی دوسرے کے سمجھانے سے سوجھی - مگر میں تمہارے اس بھرے مجمع میں اقرار کرتا ہوں ولا ابالی کہ دوسرے کے سمجھانے سے نہیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی سوجھی - کہ مسلمان دنیاوی تعزز - دنیاوی تمول کے اعتبار سے تباہ اور برباد ہوتے چلے جاتے ہیں اصل میں غل مچانے والا - سوتوں کو جگانے والا آقا ہے اور میں تو اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوں - وہ بھی اس کی سی دل سوزی نہیں - اس کی سی ایمنگز ائٹی (بیقراری) نہیں - میں تو سمجھا تھا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا گرہ کچھ اترتا چلا ہے - اور جب سر سید احمد نے اہل پنجاب کو زندہ دل کا خطاب دیا تو میں نے ایسا خیال کیا کہ ایسا دور اندیش - ایسا تجربہ کار جس نے مسلمانوں ہی کی دنیاوی اصلاح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور شبانہ روز اسی دھن میں غلطاں پیچاں ہے ایک خطّے کے مسلمانوں کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کرے تو یہاں کے مسلمان ضرور ایسے ہی ہوں گے لیکن سوائے اس ایک انجمن حمایت الاسلام کے پنجاب کے مسلمانوں نے اور کوئی فلاحِ قومی کا کام کیا ہو تو بول اٹھو - کیا اتنے بڑے پنجاب کو پنجاب کے اتنے سارے مسلمانوں کو بس اس ایک انجمن کی اور ایسی انجمن کی حاجت تھی جس کی گزران محض توکل پر ہے شعر

زیادہ ہوگا توکل سے بھی کہیں روزہ — کہ اس میں آئی تو روزی ہے اور نہیں روزہ

یاد تو کیوں نہ ہوگا کہ ایک مہینے سے بھی کم میں رمضان شریف تشریف لانے والے ہیں اگرچہ گزشتہ سالوں کی سی سختی اب کے رمضان میں نہیں ہوگی - مگر آخر روزہ روزہ ہے اس وقت انجمن کی حالت کی تم کو قدر ہوگی اور پھر بھی جیسی قدر ہونی چاہیے نہیں ہوگی - کیوں کہ تمہارے یہاں برس دن بعد رمضان آئے گا اور انجمن میں بارہ مہینے امیر خانی رمضان رہتا ہے -

امیر خانی رمضان کا قصہ یہ ہے کہ امیر خاں پنڈارا ایک لٹیرا آدمی تھا اور اس نے اپنی قسم کے سپاہی جمع کر لیے تھے - ان لوگوں کو کبھی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی - اتفاق سے نقالوں کا ایک طائفہ اس کے لشکر میں پہنچا اور لوگوں کو اپنا تماشا دکھانا چاہا - لوگوں نے عذر کیا کہ ہم کو دانے گھاس کی مشکل پڑی رہتی ہے تم کو انعام و اکرام کہاں سے دیں گے - سرگروہِ طائفہ نے کہا کہ ہمارا تماشا کراؤ تو ایسی نقل کریں گے کہ شاید تمہاری تنخواہیں بھی تقسیم ہو جائیں - چناں چہ ایک شخص بہت بزرگ صورت جیسے ہماری انجمن کے نقیب الاولیا (خان نجم الدین صاحب) موجود ہوئے - طائفے میں سے ایک شخص نے پوچھا - کہ حضرت آپ کون بزرگ ہیں انھوں نے جواب دیا کہ رمضان شریف - اتفاق سے وہ مہینہ شاید ربیع الاول کا تھا تو دوسرے نے حیران ہو کر پوچھا کہ رمضان شریف کے اس مہینے میں آنے کا کون سا موقع ہے انھوں نے جواب دیا کہ تم کو معلوم

ف۱ یہ دونوں پنجاب کے انجمن کے سرگرم ممبر ہیں - لیکچر کے وقت جلسے میں لوگوں کو بھی باترتیب بٹھایا کرتے ۱۲

نہیں میری تعیناتی امیر خاں کے لشکر میں ہے صرف ایک مہینے کی رخصت ملتی ہے اسی میں سارے جہان میں پھر آتا ہوں
اور پھر اپنے ٹھکانے آلگتا ہوں۔ سنا ہے کہ یہ حکایت امیر خاں کے کان تک پہونچی اور اُس نے تنخواہ کے تقسیم کیے جانے کا حکم دیا۔
کیا ہمہ وقت کوئی آدمی تمہارے آگے جھولی پھیلائے کھڑا رہے یا ماہواری رسالے میں تمہارے پاس عرضیاں
بھیجی جایا کریں یا ہر سالانہ جلسے میں تم کو یاد دلایا جائے کہ ایک انجمن ہے اور اُس نے قوم کی امید پر رفاہِ قومی کے بہت سے
کام اُٹھا رکھے ہیں اُس نے ہول پراونس کے یتیموں کو اپنی حفاظت میں لیا ہے او ریتیم آدمی کے بچّے ہیں لاوارث بے کس
اُن کو تمہاری طرح دو وقت بھوک لگتی ہے۔ جاڑوں میں سردی اُن کو رہنے کو مکان۔ ستر عورت کے لیے کپڑا درکار ہے غرض
وہ بھی آدمیوں کی سی ضرورتیں رکھتے ہیں اور سوائے خدا کی ذات کے کوئی اُن کی ضرورتوں پر نظر کرنے والا نہیں۔ یا پہنچے تم۔
اگر خدا تمہارے دل میں رحم ڈالے اور یتیموں کا ترس کھاؤ۔ یا انجمن بیوہ عورتوں کی پرداخت کرتی ہے یا انجمن نے اسکول
جاری کیا اور اب وہ اُس کو کالج کرنے پر مجبور ہوئی۔ اور ان سب باتوں کو چاہیے خرچ۔ انجمن کیمیا بنانی نہیں جانتی اُس کو
دستِ غیب کا عمل نہیں آتا۔ اُس نے کہیں سے دبا گڑا خزانہ نہیں پا لیا۔ انجمن کے ممبر چور نہیں ڈاکو نہیں کہ کسی کا
مال جا کر مار لائیں۔ اُس کا سرمایہ وہی جو تم ہاتھ اُٹھا کر دے دو۔ تم میں سے کون انجمن کی سی بے آس بے سہارے زندگی
پسند کرے گا۔ کون ایسی زندگی کرتا ہے۔ کون ایسی زندگی کر سکتا ہے۔ تم کو شروع میں سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ انجمن کہاں تک
پاؤں پھیلائے گی۔ اور پبلک کی نظر میں۔ غیر قوموں کی نظر میں۔ خدا اور رسول کی نظر میں اُس کے جاری ہونے سے
تم کہاں تک ذمہ دار ٹھیروگے۔ اگر یہ انجمن سسک سسک کر جی جیسی کہ اب تک جی اور اب جی رہی ہے تو سمجھ لو کہ میرے
منہ میں خاک یہ ایک دن مرے گی اور ضرور مرے گی۔ لیکن خدانخواستہ مری تو اکیلی نہیں مرے گی۔ مسلمانوں کی عزت کو
ساتھ لے کر مرے گی مسلمانوں کی غیرت کو ساتھ لے کر مرے گی مسلمانوں کی حمیت کو ساتھ لے کر مرے گی۔ میں انجمن کے اتنے ثبات کو بھی اپنے زمانے کا اسلامی معجزہ سمجھتا ہوں
سرسید پر جنھوں نے ہندوستان میں اس طرح کی نباتتی (کفن کھسوٹی) کو رواج دیا جیسی چاہو بدگمانیاں
کر لو۔ میں سرسید احمد کا بھاٹ نہیں۔ وہ اگر پیر ہوں تو اُن کا مرید نہیں۔ اُستاد ہوں تو اُن کا شاگرد نہیں مرثیہ خوان
ہوں تو اُن کا بسوریا نہیں۔ امیر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ نہیں ہیں۔ لیکن اگر امیر ہوں تو اُن کا دست نگر نہ کبھی تھا نہ
اب ہوں اور نہ ان شاء اللہ مدت العمر ہوں گا۔ مگر ہے کیا۔ آدمی ہوں۔ دوست دشمن میں تمیز کرنے کی، قومی حالت اور قومی ضرورتوں
کی شناخت کی عقل رکھتا ہوں۔ تمہارے اس لاہور میں اور لاہور کیا چیز ہے علیگڈھ میں اور علیگڈھ کے شہر میں بھی نہیں۔
بیچ گڈھ میں یعنی محمڈن کالج میں خود سرسید اور اُن کے حواریین کے رو در رو میں نے اس بات کے کہنے میں مطلق باک
نہیں کیا۔ اور کیوں کرتا کہ میں اُن کے سب نہیں بعض معتقدات کو غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن جیسا مجھ کو اُن کی غلطیوں کا تیقن
ہے اس بات کا بھی تیقن ہے کہ وہ شخص منافق نہیں۔ بزدل نہیں۔ مکّار نہیں اور قومی خیر خواہی سے ایسا سرشار ہے کہ اُس کا
بس چلے تو اپنی تو پہلے ہی سے اُتار رکھی ہے دوسروں کی پگڑی بھی اُتار کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ وہ جو کہتے ہیں حُبُّکَ الشَّیٔ
یُعمِی وَیُصِمُّ (آدمی کو ایک چیز کی محبت اندھا بہرا کر دیتی ہے) سید احمد خاں کو مسلمانوں کی دنیاوی اصلاح کی دھن میں
آگا پیچھا کچھ نہیں سوجھتا۔ افراط تو ہر ایک چیز میں مذموم ہے پس میرے نزدیک سید احمد خاں میں عیب ہے تو یہ ہے۔ میری رائے

سید احمد کی نسبت اگر صحیح ہی تو میں کسی سے اُس کی تائید نہیں چاہتا اور اگر غلط ہی تو اصلاح کے لیئے اس کو کسی کے روبرو پیش
نہیں کرتا۔ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ کسی امر میں مخالفت کی ہو تو سب سے زیادہ مجھی کو اُس کا افسوس ہی۔ اگر مجھ سے
اُس میں کسی طرح کی بے تہذیبی سرزد ہوئی ہو۔ اُن کو خدا نے شرف دیا ہی باعتبار عمر کے۔ شرف دیا ہی باعتبار نسب کے
شرف دیا ہی باعتبار تعززِ دنیاوی کے۔ بہت بڑا شرف دیا ہی باعتبار خیر خواہی قومی کے اور حدیث شریف میں آیا ہی۔
من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا (جو چھوٹے پر مہربانی نہ رکھے اور بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں کا
نہیں) حدیث میں صغیر و کبیر دونوں لفظ مطلق واقع ہیں۔ صغیر سے نہ صرف بیٹا یا چھوٹا بھائی مراد ہی اور کبیر سے نہ صرف
باپ یا رشتے کا کوئی اَور بزرگ اور نہ اس میں مذہب و عقائد کی قید ہی بل کہ جناب رسول خدا صلعم کی خدمت میں کچھ وفود
یعنی ایلچی آئے اور وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے سرگروہ کو آتا ہوا دیکھ کر اصحاب سے جو حاضر
خدمت تھے فرمایا۔ قوموا الیٰ سیدکم (اپنے سردار کو استقبال کر کے لو) غرض من لم یرحم صغیرنا الخ ایسا گولڈن
رول (قاعدۂ زرّیں) ہی کہ اگر مسلمان اِس پر پورا پورا عمل کریں تو اُن کی سوسائٹی سے بہتر شایستہ و مہذّب اور متفق و
یکدل دنیا میں کوئی سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مسلمان اپنے پیغمبر کی بات نہ مانیں اور لوگوں کو زبان و قلم سے ایذائیں
دیں اور اپنے بڑوں کا ادب ملحوظ نہ رکھیں اور یوں مسلمانوں میں رنجشیں اور عداوتیں پھیلیں اور وہ سنار کی سی کھٹ کھٹ کرتا
ہی رہا اور یہ ایک لوہار کی سی جڑ دیں اور یہ سارا نزلہ آخر کار اسلام پر گرے تو اس میں اسلام اور بانیِ اسلام کا کیا قصور ہی۔
مسلمان رسول کی کیا مانیں گے جب وہ خدا کی نہیں مانتے۔ میں اس کی تائید میں قرآن کی چند آیتیں پڑھتا ہوں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ
وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۔ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ
هُمُ الظَّالِمُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ ۔

(اے ایمان والو کوئی گروہ دوسرے گروہ کی ہنسی نہ اُڑائے۔ عجب نہیں جن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہی وہ ہنسی اُڑانے والوں
سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی اُڑائیں عجب نہیں جن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہی وہ ہنسی اُڑانے والیوں سے بہتر
ہوں اور اپنوں کو چھیڑو مت اور نہ بُرے لقبوں سے یاد کرو۔ ایمان لائے پیچھے نافرمانی بڑی بدنامی کی بات ہی اور جو توبہ
نہیں کرے گا تو وہی لوگ ظالم ٹھیریں گے۔ اے ایمان والو اکثر بدگمانیوں سے بچتے رہو کیوں کہ بہت سی بدگمانیاں
داخلِ گناہ ہیں اور لوگوں کے حالات کی ٹوہ میں مت لگے رہو اور ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی
اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کے گوشت کو کھائے۔ اس سے تو تم کو ضرور گھن آتی ہوگی۔ اور ڈرو اللہ سے
بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان ہی)

اور خیر سید احمد خاں سے یہاں بحث بھی کیا ہی۔ وہ اس انجمن کے سکرٹری نہیں ممبر نہیں۔ پیٹرن نہیں بل کہ
من وجہ یہ چاہتے ہوں تو تعجب نہیں کہ انجمن کے فنڈز جو کچھ ہوں لے جا کر علیگڈھ کالج میں ٹھونس دوں کہ نہ ہرا دھو رہے

اور نہ ایک پورا۔ مگر جن کی طبیعتیں نیشن ن واقع ہوئی ہیں وہ ہر ایک گاڑی میں کسی کی بھی ہو بے روڑہ اٹکائے نہیں ہٹتے۔ شعر

و دو شوند ار بد با نیے رسند   یا و شوند ار نیک با نیکے رسند

ان کی مثال خچر کی سی ہے کہ گدھوں کو لادنے لگے تو کہا میں گھوڑا ہوں گھوڑوں پر زین کسنے کی نوبت آئی تو لگا ہینچوں ہینچوں
کرنے ان انکر الاصوات لصوت الحمیر (سب سے بری آواز گدھے کی ہے) اسے ظالم کہیں تو لدّا اور لدے گا نہیں
تو یہ تو بھی پوچھ کیوں کر اٹھے گا۔ یہ لوگ کیسا ہی نیک کام ہو ہمیشہ بُرے پہلو (اغراض) پر ڈھال لے جاتے ہیں۔ شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

اور کوئی جمتی ہوئی پھبتی نہیں سوجھتی تو مذہب کا حیلہ نکال کھڑا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تعدیۂ امراض میں اختلاف کرتے ہیں لیکن
جس میں اختلاف ہے وہ تعدیۂ امراض جسمانی ہے۔ روحی امراض کے متعدی ہونے میں کچھ بھی شبہ نہیں ایک گندہ دل سارے
کمیونٹی کے دلوں کے بگاڑ دینے کو کافی ہے۔ جیسے کہ ایک دیا سلائی ایک شہر کے جلا دینے کو بس کرتی ہے۔ اگر میٹیریل ڈرائی
(چیزیں خشک) اور ہوا موافق ہو۔ فکونوا علی حذر (خبردار رہو) شعر

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نباید داد دست

میں اپنے زعم میں بہت ہی آزادانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ نہ کسی کالج کا بانی ہوں نہ کسی انجمن کا سکرٹری نہ کسی اخبار کا اڈیٹر
لوگوں کی مدح و ذم سے مستغنی۔ تحسین و تحقیق سے بے نیاز۔ میں نے ساری عمر لکچر نہیں دئیے۔ خدمت سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین
ہوا۔ نہیں معلوم لوگوں نے کیوں کر سمجھ لیا کہ میں ہوا کا رُخ پہچانتا ہوں جو کچھ آپ سمجھتا ہوں دوسروں کو سمجھا سکتا ہوں بشرطیکہ
کہ سمجھنا چاہیں اور سمجھ کے پیچھے لاٹھی لیئے نہ پھرتے ہوں دس دفعہ بلایا ایک دفعہ آ کھڑا ہوا اور آ کھڑا ہوا تو کیوں کر ہو سکتا
ہے کہ دل میں ہو کچھ اور کہوں کچھ۔ شعر

راست می گویم و یزداں نہ پسندد جز راست   حرف ناراست سرودن روش اہرمن است

مجھ سے اختلاف ہو تو مجھے جو جی چاہے کہو اور جو جی چاہے سمجھو۔ مگر از برائے خدا یہ نہ کرنا کہ جیسے سید احمد خاں کے ساتھ
مجھ کو سمیٹ لیا۔ میرے ساتھ اس بے چاری انجمن کو سان لو۔
مجھ کو تو نیچری کہلانا عار تھا۔ مگر نیچریت کے اب وہ معنی نہیں رہے جن کی وجہ سے میں نیچریت کو عار سمجھا کرتا تھا اب
نیچریت یہ ہے کہ سید احمد خاں کو علیگڈھ کالج کا بانی کہو۔ نیچری۔ علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا اڈیٹر کہو۔ نیچری۔ سر کہو۔ نیچری
ڈاکٹر کہو۔ نیچری۔ آدمی کہو نیچری۔ تو ایسی نیچریت کا قبول کرنا اس سے زیادہ موجب عار نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسے
دو اور دو کا چار کہنا میرا نیچریت کو تسلیم کرنا اسی قبیل سے ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ان کان رفضا حب آل محمد   فلیشہد الثقلان انی رافضی

(اگر آل محمد کے ساتھ دوستی رکھنا رفض ہے تو دونوں جہان اس پر گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)
میں جو اپنے نفس کا احتساب کرتا ہوں تو میرا صرف ایک ہی خیال ایسا ہے جس کو کوئی معاند نیچریوں سے ملتا ہوا کہہ سکتا
ہے یہ میری رائے ضرور ہے کہ تاویل کرنے سے کسی حکم کی ایسی بے حرمتی نہیں ہوتی جیسے اصرار اور اعلان اور تعمیم کے ساتھ اس کی

تعمیل نہ کرنے سے۔ بات کو صبر و سکون کے ساتھ سنو ہی نہیں تو اس کا کیا علاج ہی مگر سنو گے۔ اور زمانہ۔ ہماری دعا تو یہ ہی کہ تم ہی کو سُنائے
ورنہ تمھاری پہلی نسل نہیں تو دوسری اور دوسری نہیں تو قسم کھانے کی بات ہی کہ تیسری ضرور سُنے گی۔ کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کی
فکر میں پڑے ہو انگریزی ایجوکیشن کو روکو۔ اگر تم سے روکی جائے اور اب تو ایسی جڑ پکڑ گئی ہی کہ بعض انگریز بھی جن کی یہ
بلا لائی ہوئی ہی **مصرع** اے صبا این ہمہ آوردۂ تست ؛ اس کو روکنا چاہتے ہیں اور نہیں رُکتی۔ جن لوگوں نے ایجوکیشن کی قدر و قیمت
کو جانا پہچانا وہ ایسے اس کے گرویدہ ہیں کہ اگر گورنمنٹ اعلےٰ درجہ کی تعلیم سے دست کش ہونا چاہے تو ہمارے اجیٹیشن کے
یہاں سے ولایت تک گورنمنٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ لیکن اگر گورنمنٹ اعلیٰ درجے کی تعلیم سے دست کش ہو بھی جائے تو وہ لوگ
چاہے بھوکے مریں ننگے پھریں بھیک مانگیں مگر ایجوکیشن کا بال بیکا نہ ہونے دیں۔ بنگالی تو بنگالی ہمارے نارتھ ویسٹرن پراونسز
(ممالک مغربی و شمالی) میں گورنمنٹ نے دو کالج بند کر دیئے۔ لوگوں نے چندہ کر کے دونوں کو بدستور قائم رکھا تو جو لوگ اسلام کو
معرض خطر میں سمجھتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ ایجوکیشن کو روکیں اگر اُن سے روکی جائے۔ اور یہ نہ رُکی اور نہیں رُکے گی تو جن
باتوں کا سُننا ناگوار ہی وہ اُن سے بڑھ بڑھ کر تم آپ کہوگے یہ اپنے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں کہ جن باتوں کی اب کوئی مطلق
پروا نہیں کرتا اب سے چالیس برس پہلے ایک ایک بات کفر و زندقہ سمجھی جاتی تھی میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل
نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار۔ صاف کہہ دیا کہ
مجھے اس کا مر جانا منظور۔ اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں میں ایسے مولوی کا شاگرد ہوں جنھوں نے لاٹ صاحب
سے با ستکراہ ہر چہ تمامتر اور بہ مجبوری ہاتھ ملا کر اُس ہاتھ کو مٹی سے رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا تھا۔ انگریزی صابون سے نہیں۔ جنھوں نے
پانی پینے کا مٹکا جو جماعت میں رکھا رہتا تھا تڑوا ڈالا تھا۔ اس واسطے کہ اُس میں سے ایک شامت زدہ انگریزی خوان مسلمان پانی پی
گیا تھا۔ تم کیا دین داری برتو گے دین داریاں یہ تھیں جو ہم نے دیکھیں ہیں اور اب اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں ایک دین داری
یہ ہی جو ہم اور تم سب دیکھ رہے ہیں۔ اِن نینن کا یہی بسیکھ۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ اور ایک دین داری اب سے پچاس برس بعد ہو گی
اگر امام مہدی نہ آگئے۔ تم ایک سر سید کو لیئے پھرتے ہو۔ کچھ خبر بھی ہی زمانہ کتنے سر سید پیدا کر چکا اور کرتا چلا جا رہا ہی۔ جن میں کے
سر سید ہیں اُن کا تو یہ مقولہ ہی **شعر**

اذا مات منا سیدٌ قام سیدٌ قولٌ لما قال الکرام فعولُ

(جب ہم میں سے ایک سردار مر جاتا ہی تو اُس کی جگہ دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہی اور وہ بھی بزرگوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہی اور اُنھیں کے سے کام)
قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ پر جہاں اَور اعتراض ہیں وہاں ایک یہ بھی ہی کہ جو کچھ تمھاری کتاب میں لکھا ہی اُس پر تو عمل کرو
فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صدقین ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ (توراۃ لے آؤ اگر تم سچے ہو تو اُسے
پڑھ کر دیکھو۔ اور جن پر انجیل اُتری ہی اُن کو چاہیئے کہ جو کچھ اللہ نے انجیل میں اُتارا ہی اُس کے مطابق تو حکم دیں) یا اُن وقتوں کی باتیں
رہنے دو۔ احکام عشرہ میں کے یہ احکام کہ کل کے لیئے ذخیرہ مت کرو۔ یا تمھارے داہنے کلے پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا اُس کے
سامنے کر دو۔ ہم نہیں کہتے کہ خدا نے یہ ناممکن التعمیل احکام بھیجے تھے شاید اُس زمانے میں ایسے متوکل ایسے بے نفس لوگ رہے ہوں گے
مگر اب ہمارے وقتوں میں کوئی ایک یہودی کوئی ایک نصرانی یا کوئی ایک آدمی اِن حکموں کی تعمیل کرتا یا کر سکتا ہی۔ تو تم نے اُن ہی کا۔ لا

(قانون) اُن کو کنڈم کر رہا ہے (مجرم قرار دے رہا ہے) اب تم اپنی جگہ آپ احتساب کر لینا کہ مسلمان کسی ایسے الزام کے مورد ہیں یا نہیں - کیوں کہ معاملہ خدا کے ساتھ ہے - شعر

زور ت ار پیش می رود با ما | با خداوندِ غیب داں نہ رود

کوئی نہیں کہتا اور کسی کو کہنا چاہیئے بھی نہیں کہ مذہب سے قطع نظر کرو - مذہب قطع نظر کرنے کی چیز نہیں ہے آدمی کی اور خصوصًا ہم مسلمانوں کی دنیاوی اور دینی فلاح موقوف ہے مذہب ہی پر - ہم اُس گروہ کے لوگ ہیں جن کو مذہب نے کھڑا کیا مذہب نے ہم کو ترقی دی - مذہب نے ہماری حالت درست کی مفلس تھے مذہب کی بدولت امیر ہو گئے - خاک مذلت پر پڑے تھے - مذہب کی بدولت اوجِ عزت پر متمکن ہوئے - محکوم تھے مذہب کی بدولت حاکم بنے - رعیت تھے مذہب کی بدولت بادشاہ بنے - شاہنشاہ بنے - غرض کچھ نہ تھے مذہب کی بدولت سب کچھ ہو گئے - کیا یہ کچھ کم افسوس کی بات ہے کہ اب ہی ہم ہیں اصل ابتدائی حالت سے بھی کمتر فروتر - حالت میں اتنا انقلاب اتنا ردّ و بدل - اس قدر اختلاف - یہ کیوں؟ یہ وہی مذہب کا مسئلہ یعنی مذہبی غلط فہمی ان مذہب کو بُری طرح سے عمل میں لانا - یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے ہر شخص اپنی جگہ اس کا فیصلہ کر لے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری میں اسلام کو دنیاوی عزت - دنیاوی تموّل کے ساتھ جمع کر سکتے ہیں یا نہیں - اگر نہیں کر سکتے تو کچھ بحث نہیں - تکرار نہیں - لڑائی نہیں جھگڑا نہیں - چلو اپنا اپنا بوریا بدھنا باندھ کر ان ظالموں کی عملداری سے نکل بھاگیں - لیکن کتنے آدمی ہیں جو ایسا ارادہ کریں یا چلنے والوں کے ساتھ چل کھڑے ہوں جن سے کہو گے وہی کانوں پر ہاتھ دھرے گا کہ نا بابا ہم ایسا امن - ایسی آسایش ایسی آزادی کہاں پائیں گے - رہا مذہب ہمارے دل کے ساتھ ہے جہاں ہم وہاں مذہب - شعر

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں | میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

یہاں ہم کو کاہے کی روک ٹوک ہے - نماز پڑھنی چاہیں روزہ رکھنا چاہیں - کوئی مانع نہیں - زکوٰۃ دینی چاہیں یعنی انجمن حمایت الاسلام کی مدد کرنی چاہیں - کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں حج کو جانا چاہیں کوئی مزاحم نہیں - ہاں روک سمجھو ٹوک سمجھو تو صرف اتنی کہ دوسرے مذہب والوں کے حقوق میں دست انداز نہ ہوں - لیکن کچھ ایسے بھی نکلیں گے جن کے حق میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ سات سو برس پہلے کہہ مرے ہیں شعر

ترکِ دنیا بہ مردم آموزند | خویشتن سیم و غلّہ اندوزند

اور شاعرِ عربی کہتا ہے - شعر

عجبت من شیخی و من زھدہ | و ذکرہ النار و اھوالھا

یکرہ ان یشرب من فضۃ | و یسرق الفضۃ ان نالھا

(مجھ کو اپنے پیر صاحب اور ان کی پرہیزگاری پر تعجب آتا ہے اور وہ جو دوزخ اور اس کی ہولناک باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اس سے بھی تعجب آتا ہے چاندی کے باسن سے تو پانی پینا مکروہ سمجھتے ہیں اور اگر دسترس ہو تو چاندی چرا کر دب میں کر لیتے ہیں) حافظ شیراز فرماتے ہیں شعر

نقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد | کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

یہ ہیں جو مسلمانوں کو اُبھرنے نہیں دیتے - عام مسلمانوں میں اتنی لیاقت نہیں کہ انجام کار کو سوچیں - بیچارے بہکانے بہک جاتے ہیں - اور یوں مسلمانوں کی مٹی خراب ہو رہی ہے - لیکن یہ رفتار بقدم رِجلاً و یؤخر اخری (ایک پاؤں آگے رکھیں اور

ایک نہ پیچھے) اِس بُعدِ مسافت پر نظر کرتے کچھ بھی نہیں جو ہم کو طے کرنی ہو-کب تک اس تذبذب میں رہو گے بات کو یک سُو کر چلو۔ یا تو کچھ سست کرو کہ اُوپر والوں کو صبر آ جائے اور کرتے ہو تو جی کھول کر کرو- یا مُرغے لڑانے منظور ہیں اور اسی میں کچھ مزہ ملتا ہو تو یہی کہو میں تو اس مرتبہ تم سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں-میری نسبت اگر مذہبی بدگمانی ہو اور میرے عقائد بُرے ہیں تو مجھ کو اُن کا وبال بھگتنے دو-میں تم میں سے کسی سے شفاعت کا خواستگار نہیں **شعر**

حقّا کہ با عقوبتِ دوزخ برابرست   رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

یہ میری کبھی خواہش نہیں ہوئی اور ان شاء اللہ ہو گی بھی نہیں کہ لوگوں کو مذہبی عقائد میں اپنا ہم خیال بناؤں اور اقل الجماعۃ کا بھی لیڈر سمجھا جاؤں-کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے میرے اور لوگوں سے اُن کے افعال و معتقدات کا حساب لیا جائے گا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا) لیکن کہلواتے ہیں تو کہتا ہوں-پوچھتے ہیں تو بتاتا ہوں-سوال کرتے ہیں تو جواب دیتا ہوں کہ میرے نزدیک اسلام لازمۂ انسانیت ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (اللہ کی بناوٹ جس کے مطابق لوگوں کو بنایا اللہ کی خلقت کو کون بدلے-یہی ہے ٹھیک دین لیکن اکثر لوگوں کو معلوم نہیں) کھانے سے-پینے سے-پہننے سے کسی وضع میں رہنے سے کسی زبان کے سیکھنے سے کسی علم کے پڑھنے سے آپ ہوا سے-دنیاوی حکومتوں کے ردّ و بدل سے اس میں فرق نہیں آ سکتا-اگر انسان ایک خدا کا قائل نہیں تو وہ اوج انسانیت سے ساقط ہو کر حضیضِ حیوانیت پر آ گرا ہے اور اگر ایک خدا کا قائل ہے اور بندہ بشر ہے کوئی امر نامشروع بھی اُس سے سرزد ہو جاتا ہے تو وہ ڈسپلن (قواعد) کو توڑتا ہے اور اُس کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ اُس کی ڈبل بول جائے یا اُس کا اینک (درجہ) توڑ دیا جائے یا اُس کا رٹین (مراتب) گھٹا دیا جائے یا اُس کا بھتہ موقوف یا اور کوئی سزا دی جائے مگر فوج سے اُس کا نام نہیں کٹے گا-اُس کو گولی نہیں ماری جائے گی اُس کو پھانسی نہیں لگے گی-ڈیٹس آل (بس ہو چکا) اسلام کی جنرلیٹی (عمومیت) کہ قیامت تک اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ خدا کے رسول ہیں-جن پر نبوت ختم ہو گئی اور ہم نے تم کو کل دُنیا کے سارے لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجا ہے) غرض کیا بلحاظِ زماں اور کیا باعتبارِ مکاں اسلام کی جنرلیٹی پڑی پکار رہی ہے کہ اُس کو کیا ہونا چاہیے اور لوگوں نے اُس کو کیا بنا رکھا ہے-مگر وہ اپنی اصلیت پر آئے گا ضرور آئے گا-اور یہی ایجوکیشن اُس کو اُس کی اصلیت پر لائے گی-لیکن یہ چیزیں لیشر کے کام ہیں-ایجوکیشن اور مذہب یعنی مذہب متعارف میں کسرِ انکسار ہونے کو مدتیں چاہییں-اُس وقت تک پیشین گوئی کے جرم میں جس جس کی قسمت میں گالیاں کھانی لکھی ہیں گالیاں کھا لے اور جس جس کی تقدیر میں لعنتیں بدی ہیں لعنتیں سُن لے-پھر جو ہونا ہے وہ ہو گا

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا امید

ایسا پریکٹیکیبل (ممکن التعمیل) ایسا سمپل (سلیس) ایسا ریزنیبل (معقول) مذہب جیسا کہ حقیقت میں اسلام ہے کوئی شخص جس کو خدا نے کامن سنس (معمولی عقل) دیا ہے اُس کو ریجکٹ (نامنظور) نہیں کر سکتا-وہ صرف تنکے کے اوجھل پہاڑ

ہے۔ ذرا از برائے خدا اس نکتے کو تو سمجھو کہ فطرۃ انسانی اسی طرح سے واقع ہوئی ہے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ مسلمان ہی پیدا ہوتا ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ تمام بنی آدم اصل خلقت کی رو سے مسلمان ہیں یہ وہی بات ہے کہ کسی نے پوچھا ناک کدھر ہوتی ہے۔ ایک نے سامنے سے ناک پر انگلی رکھ کر بتا دیا کہ یہ ناک ہے دوسرے نے گدی کے پیچھے سے ہاتھ لے جا کر بتایا کہ یہ ناک ہے ناک تو جہاں ہے وہیں ہے صرف بتانے کے طریقے مختلف ہیں قرآن سے اس کی سند سن ہی چکے ہو وہی فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا۔ اب لو حدیث ایک بار اس رحمۃ اور شفقۃ کے جوش میں جو پیغمبروں کا خاصہ ہے ہمارے پیغمبر صاحب نے اپنے خادم بلال رضؓ کو حکم دیا کہ اے بلال رضؓ جا مدینے کی گلی کوچے میں میری طرف سے پکار پھر من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ (جو ایک خدا کا قائل ہو وہ جنتی ہے) بلال رضؓ چلے۔ راہ میں ملے عمر رضؓ پوچھا بلال رضؓ کدھر۔ انھوں نے بیان کیا تو عمر رضؓ ان کو آن حضرت کی خدمت میں لوٹا لائے اور عرض کیا اے جناب کہیں ایسا نہ ہو یہ حکم عام سن کر لوگ نیک کاموں کے کرنے سے باز رہیں وہ حکم ایک مصلحت سے اس وقت مشتہر نہ ہوا مگر لکھا ہوا موجود ہے اور پڑھے لکھے اس سے واقف ہیں۔ اگر اسلام کو اس کے اصلی پیرایے میں پیش کیا گیا ہوتا۔ تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اسلام کو لیا ہوتا۔ مگر دنیا کی بدنصیبی سے وہ پیش کیا گیا غارت گری اور خوں ریزی کے پیرائے میں پیش کیا گیا عذاب اور مصیبت کے پیرائے میں اور پیش کرنے والے کون دنیا کے بادشاہ جاہ و ثروت کے فریفتہ ملک گیری کے حریص۔ بس لوگ اسلام کی ڈراؤنی صورت سے لگے بھاگنے۔ اور افسوس ہے کہ اب بھی مسلمانوں کی طرف سے استمالت اور تالیفِ قلوب کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی وہ پشت ہا پشت کے موروثی مسلمانوں کو اسلام سے نکال دینے کی فکر میں لگے ہیں۔ مسلمانوں کو کافر کہہ بیٹھنا۔ مرتد بنا دینا یہ تو ان کی ایک معمولی بات ہے۔ جن طبیبوں کے پاس مرجوعہ زیادہ ہوتا ہے وہ موسمی امراض کے لیے کبھی ایک نسخے کی بہت سی نقلیں کرا رکھتے ہیں۔ نہ نبض دیکھیں نہ حال پوچھیں۔ مریض آیا اور انھوں نے مسالے کے تلے سے نسخہ نکال حوالے کیا ادھر ایک عطار لگا ہوا ہے وہ حکیم صاحب کے دستور سے واقف ہے اس نے پہلے ہی سے پڑیاں باندھ رکھی ہیں اتنا دیکھ لیا کہ نسخہ حکیم صاحب کا ہے۔ دواؤں کے نام اور اوزان پڑھے

لونڈے سے کہا کہ فلاں خانے میں جو پڑیا رکھا ہے ان کو لا کر دیدے۔ لائیے حضرت ساڑھے چار پیسے۔ قریب قریب یہی حال ہے اس زمانے کے کفر کے فتووں کا۔ لیکن اے آریو۔ اے برہمو۔ اے ہندو بھائیو۔ اے عیسائیو۔ اے اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے ماننے والو۔ اے مذہب کی تلاش رکھنے والو۔ ان لوگوں کی بات پر مت جاؤ اگر تم آدمی ہو اور ضرور آدمی ہو اگر تم عقل بھی رکھتے ہو اور ضرور رکھتے ہو۔ تو تم خدا کو مانتے ہو گے اور اس کو ایک بھی جانتے ہو گے۔ اب تم ساری دنیا کو چھان ڈالو دیکھو تو اتنی ہی بات پر کوئی بھی تم پر ہاتھ دھرتا کوئی بھی تم کو نجات ابدی دلا دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ ہاں ایک شخص ہے محمدؐ عربی اسلام کا پیغمبر۔ منکسر۔ متواضع۔ سیدھا سادہ۔ بے تصنّع۔ بے تکلّف۔ بے طمع وہ اطمینان کرتا ہے کہ چلو میں تم کو بخشوا دیتا ہوں بے شک لوگوں نے اس کی برائیاں تم سے کی ہوں گی اور اب بھی کرتے ہوں گے لیکن اگر کوئی تم سے کہہ دے کہ کوا تمھارے کان لے گیا تو کیا سننے کے ساتھ کوے کے پیچھے دوڑے دوڑے پھرو گے کیوں نہیں پاس کے پاس ٹٹول لیتے کہ سر میں کان بھی ہیں یا نہیں۔ اس کی بات کو تو جانچو کہ کہتا کیسے پتے کی ہے۔ ابدی نجات اور ایسی سستی۔ اور اگر نجات کی قدر ہی نہیں اور دوبارے میں مرنا منظور رہے تو پڑو چولھے میں۔ ہم تو اپنا الاہنا اتار چکے۔

سلسلے کی رعایت کی جگہ اور رعایت ہونی چاہیے کیونکہ وہ فرمودۂ رسول ہے تو ان بزرگوں کی نوبت بھی نہ آئے۔ لیکن مسلمانان ورگور مسلمانی ور کتاب۔ معدودے چند مسلمان ہیں جو توحید کا پاس کرتے ہیں سو اُن کو وہابی کہہ کر اس فکر میں لگے ہیں کہ اُن کو باغیِ سرکار ٹھہرا کر بن پڑے تو جلاوطن کرا دیجیے۔ سورۂ مائدہ کا اخیر رکوع جس میں یہ مطلب بہت ہی چسپاں ہو فرماتے ہیں۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ط (اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود قرار دو تو حضرت عیسیٰ بارگاہِ رب العزت میں عرض کریں گے کہ اے خداوند تو عیب شرک سے بری ہے بھلا یہ کہیں مجھ سے ہو سکتا تھا کہ جو بات مجھ کو سزاوار نہیں منہ سے نکالوں۔ اگر میں نے کہی ہوگی تو اے خدا ضرور تجھ کو اس کا علم ہوا ہوگا کیونکہ تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور مجھ کو تیرے اسرارِ قدرت کی کچھ خبر نہیں میرے دل کی باتیں کیا تجھ کو غیب کی ساری باتیں معلوم ہیں۔ مجھ کو جو تو نے ارشاد فرمایا تھا وہی جوں کا توں میں نے اُن لوگوں کو کہہ سنایا تھا اس کے سوا ایک حرف نہیں کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اور جب تک میں اُن کے ساتھ موجود رہا میں اُن کے حالات دیکھتا رہا جب تو نے مجھ کو اپنے پاس بلا لیا تو تو اُن کا نگران حال تھا اور تو ہی ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہے اگر تو اُن کو سزا دینی چاہے تو یہ تیرے بندے ہیں تیرے حکم سے باہر نہیں اور اگر معاف کرے تو تو اختیار رکھتا ہے اور مصلحت شناس ہے اس پر اللہ جل شانہ فرمائے گا آج کا دن وہ دن ہے کہ سچوں کو اُن کا سچ کام آئے گا ان کے لیے باغ ہیں جن کے تلے نہریں پڑی بہہ رہی ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اُن میں رہیں گے اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے خوش یہ ہے بڑی کامیابی ٭)

انبیاء کے بھی مدارج ہیں چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (یہ ہمارے رسول ہیں۔ ان میں ہم نے بعض کو بعض پر مدارج کے اعتبار سے بزرگی دی اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے معجزے دیے اور روح القدس سے مدد دی ٭)

جب تک قرآن یا حدیث میں صراحت نہ ہو ہم کسی پیغمبر کے درجے کی تعیین نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں جو میں نے ابھی پڑھی عیسیٰ علیہ السلام کا بالتخصیص مذکور ہے اور ایک جگہ فرماتے ہیں شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (تمہارے لیے دین کی وہی راہ ڈالی جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور اسی کی وحی ہم نے تمہاری طرف بھیجی اور اسی کی وصیت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی) اور ایک جگہ فرماتے ہیں وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے نوح و ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور اُن کی نسل میں نبوت اور کتاب کو رکھا تو اُن میں سے بعض راہ یاب ہیں اور اکثر اُن میں بدکار ہیں پھر اُنھیں کے قدم بقدم ہم نے اپنے دوسرے رسولوں کو چلایا اور اُن ہی کے قدم بقدم عیسیٰ کو چلایا اور ہم نے اُن کو انجیل دی) ان آیتوں سے

معلوم ہوتا ہی کہ حضرت عیسیٰؑ بھی بڑے درجے کے پیغمبر ہیں اور صاحب کتاب ہونے میں تو کچھ شک ہی نہیں - ایک بات اُن میں خاص ہی کہ دوسرے انبیا کو معجزے دیئے گئے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کو بھی دیئے گئے تھے مگر وہ خود بھی ایک معجزہ تھے کیوں کہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے پھر کیف وہ ایسے کچھ تھے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے غلطی کی - بیجا کیا - بُرا کیا - مگر اُن کو خدا مانا - اچھا خدا مانا تو کیا کیا جو خدا کے ساتھ کرتے ہیں - اُن سے دعائیں مانگیں - اُن سے حاجتیں طلب کیں - اُن کو خدا کی طرح متصرف با اختیار سمجھا - اُن کی وہ تعظیم کی جو خدا کی کی جاتی ہی اُسی کا نام ہی شرک اور یہی وہ بلا ہی جس کی خدا کو چڑ ہی وہ فرماتا ہی اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (شرک بڑی ہی ظلم کی بات ہی) اور فرماتا ہی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (اللہ کے ہاں اُس کی تو مغفرت نہیں جو شرک کرتا ہی لیکن شرک سے کم جو گناہ ہوں وہ جس کو چاہے معاف کر دے) اور واقع میں شرک تو کھلی کھلی بغاوت ہی جب ایک شخص خدا کو خدا ہی نہیں مانتا - پھر اُس سے امیدِ مغفرت کیسی جو تیرا خدا ہو اُس کے پاس جا اور اُسی سے مغفرت مانگ - خیر تو لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اور اُن کی والدہ کو شریکِ خدائی گردانا آدمی سے سب حمق ہو سکتے ہیں مگر نہیں ہو سکتا تو یہ کہ وہ اپنے تئیں خدا سمجھے اور فرعون کا انا ربکم الاعلیٰ سنا ہو تو وہ اُس کی بیہودہ شیخی تھی - اور خوش حالی اور حکومت کے غرّہ میں آکر حضرت موسیٰؑ کی ضد سے اُس نے نالائق بات مُنہ سے بک دی ہی ڈوبنے کا وقت آیا تو اُس کی ساری قلعی کھل گئی - حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (جب لگا ڈوبنے تو بول اُٹھا کہ میں ایمان لایا اِس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مان گیا) اور فرعون پر کیا موقوف ہی تمام آدمیوں کا یہی حال ہی کہ مصیبت کے وقت اُن کو خدا یاد آتا ہی اور خوش حالی میں خدا کی کچھ پروا نہیں کرتے - چناں چہ انسان کی اِس عادت کو خدا تعالیٰ نے اِس طرح پر بیان فرمایا ہی - حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور بادِ موافق اُس کو لے چلتی ہی اور مرضی کے موافق ہوا پا کر خوش ہوتے ہیں تو ہوا کا جھونکا ناؤ کو آ لگتا ہی اور ہر طرف سے موجیں آنے لگتی ہیں اور لوگوں کو خیال ہوتا ہی کہ اب تو ہم گھر گئے تو بڑے خلوص کے ساتھ خدا کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کو اِس بلا سے نجات دے تو ہم تیرے شکر گزار بندے ہو کر رہیں گے جب اُن کو خدا نجات دیتا ہی تو ناحق خشکی میں جا کر بغاوت کرنے لگتے ہیں - لوگو یہ بغاوت تمھارے ہی حق میں مضر ہی دنیا کے جیتے جی کے فائدے ہیں - پھر تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہی اُس وقت ہم تم کو بتا دیں گے کہ تم نے کیسے عمل کیے) مُنہ بھر بھر کر فرعون پر لعنت کرنے کو تو سب ہی ہو جاتے ہیں اور مجھے ایک دن خیال آیا کہ فرعون کی طرح الیس لی مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں اور یہ نہریں میرے محلوں کے تلے پڑی بہ رہی ہیں) ہو اور پھر آدمی انا ربکم الاعلیٰ نہ کہے تو جانیں - وہ شیخی جو مادّہ فرعونیت ہی ہمارے ہاں کے ناموں اور خطابوں میں بڑی جھلکتی ہی آخر غرض یہ ہی کہ حضرت عیسیٰؑ کی شان سے نہایت بعید تھا کہ دعویٰ خدائی کریں اور اپنی پرستش کرانا چاہیں ما کان لبشر

ان یؤتیہ اللّٰہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللّٰہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتٰب وبما کنتم تدرسون ولا یامرکم ان تتخذوا الملٰئکۃ والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون (یہ کسی بشر کا کام نہیں کہ خدا اُس کو کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے لگے کہنے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو بلکہ وہ تو یہ کہے گا کہ خدا پرست بنو کیوں کہ تم کتاب اللہ پڑھتے پڑھاتے رہے ہو اور تم کو ایسا حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم تو اسلام لے آئے اور وہ تم کو کفر کا حکم دے) لیکن حضرت عیسیٰؑ کے معتقدین نے اُن کی پرستش کی اور اُن کو اور اُن کی والدہ کو خدائی کے درجے میں لیا۔ لیکن یہ ایسا اُن کو سیری نہیں (خلافِ قیاس) خیال ہے کہ واقع میں سخت تعجب ہوتا ہے لوگوں نے کیوں اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی دل میں آنے دیا۔ مگر پھر کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ تو پھر بھی بڑے رتبے کے پیغمبر تھے بے باپ کے پیدا ہوئے تھے معجزے کی طاقت سے مردوں کو جلاتے۔ اندھوں کو بینا کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے ان کی نسبت ایسا سمجھ لیا گیا ہو کہ یہی خدا ہیں یا یہ بھی خدا ہیں تو انسان کے ضعف سے کچھ بھی بعید نہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے کہ ہم میں کا ایک جمِ غفیر قریب قریب اسی طرح کی مدارات ہر ایک شخص کے ساتھ کرتا ہے جس کو وہ بزرگ سمجھ لے تو ہم کس مُنہ سے اعتراض کرسکتے ہیں یہود پر نصاریٰ پر مشرکین پر۔

باقی رہی تاویل کہ ہم اُن کی تعظیم کرتے ہیں نہ پرستش ہم اُن سے شفاعت چاہتے ہیں نہ حاجت سو یہ تاویل نئی نہیں بل کہ مشرکین سے لی گئی ہے اور خدا کی جناب سے نامنظور ہوچکی ہے وہ بھی یہ کہتے تھے ھٰؤلآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ (یہ ہیں ہمارے سفارشی اللہ کی سرکار میں) مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (ہم تو ان کی پرستش اسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ کی سرکار میں ہماری رسائی کی تقریب کردیں) کیا انصاف ہے کہ وہ خدا کی نظر میں ایسی ہی شفاعت اور ایسی ہی تقریب کے ہوتے مشرک ٹھیریں اور ہم موحد کے موحد۔ توحید نہ ہوئی بی بی تمیز کا وضو ہوا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں۔ بس ہم نے بنی اسرائیل کی طرح خدا کے ساتھ ایک ادعائی خصوصیت پیدا کر رکھی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے نحن ابناء اللّٰہ واحباؤہ (ہم اللہ کے فرزند ہیں اور اُس کے دوست) لن تمسنا النار الا ایامًا معدودۃ (سوائے چند روز کے ہم کو آتشِ دوزخ چھوئے گی بھی تو نہیں) اُن سے پوچھا جاتا ہے اتخذتم عند اللّٰہ عھدا فلن یخلف اللّٰہ عھدہ ام تقولون علی اللّٰہ ما لا تعلمون (کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ خدا اپنے عہد کے خلاف نہیں کرسکتا یا بے جانے بوجھے خدا پر بہتان بندی کرتے ہو) اگر ہم سے پوچھا جائے تو کیا جواب ہے؟!

لو ٹو اصل مطلب کی طرف دو باتیں متیقن تھیں ایک یہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی اور اپنی والدہ کی پرستش نہیں کرانی چاہی دوسری یہ کہ خدا کو علم تھا کہ اُنھوں نے نہیں کرانی چاہی۔ بااین ہمہ چوں کہ خدا کو شرک سے حد درجہ کی ناراضی ہے۔ خدا نے نہ تو حضرت عیسیٰؑ کے تقرب کا پاس کیا اور نہ اُن کی برارت پر نظر فرمائی اور ہمارے محاورے کے مطابق اُن سے نہ صرف کیفیت دریافت کی بل کہ جواب طلب کیا ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ۔ (کیا تُو نے لوگوں سے کہا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا سمجھو) حضرت عیسیٰؑ کو اپنی برارت معلوم تھی اور یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کو بھی میری برارت معلوم ہے چاہیے تھا کہ ہیکڑی اور بے باکی سے جواب دہی کرتے مگر وہی **شعر**

بہ تہدید گر برکشد تیغ حکم　　بمانند کرّوبیاں صم و بکم

سوال سُن کر تھرّا اُٹھے اور جواب دہی کا وہ پیرایہ اختیار کیا کہ اقراری مجرم بھی نہیں کرتا **بیت**

گناہ اگرچہ نہ بود اختیار ما حافظ — تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

چھوٹتے ہی تو یہ عرض کیا سُبْحٰنَکَ اے پروردگار تیری شان اس سے کہ کوئی تیرا شریک خدائی ہو ارفع و اعلیٰ ہے۔ اے عیسیٰ
تم پر خدا کی رحمت اپنی صفائی ظاہر کرتے ہیں مگر کس خوبی سے تعلیم شرک کا الزام تھا پہلے ہی شرک کی جڑ کاٹ دی۔ اس کے بعد عرض
کیا مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (بھلا میں ایسی بات کہتا جو مجھ کو کہنی سزاوار نہ تھی) میں تو تیری طرف سے رسول
بن کر گیا تھا اگر خدائی کا دعویٰ کرتا تو اپنے تئیں آپ ہی جھٹلاتا۔ اور مجھکو وہ خدائی تھی ہی کب تھی دوسرے لوگوں میں اور مجھ
میں رسالت کے سوائے امتیاز ہی کیا تھا کہ میں خدا بننا چاہتا۔ ساری حاجتیں اور ضرورتیں جو دوسروں کو پیش آتی ہیں مجھ کو بھی
پیش آتی تھیں۔ بے اختیاری اور درماندگی جیسی دوسروں میں ویسی مجھ میں۔ حضرت عیسیٰ چاہتے تو صرف سُبْحٰنَکَ کہہ کر چپ ہو جاتے
یا خیر مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ پر بس کرتے کیوں کہ اتنا کہنے سے وہ اپنی صفائی کر چکے تھے مگر انبیاء تو تقرب کے
بھوکے ہوتے ہیں۔ ان کو خدا سے بات کرنے کا موقع ملے تو ایک منٹ کی جگہ ایک گھنٹہ لگا دیں ؛

جس وقت حضرت موسیٰ کو خلعت پیغمبری عطا ہو رہا تھا تو خدا تعالیٰ نے پوچھا وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یَا مُوْسٰی (موسیٰ
تیرے ہاتھ میں کیا ہے) عرض کیا ھِیَ عَصَایَ۔ ھی کا لفظ بھی زیادہ ہی تھا مگر عصای سے ھی عصای کہنے میں کچھ دیر لگتی ہی ہے۔
پھر موسیٰ تو ھی عصای پر بھی کب بس کرنے والے تھے۔ عرض کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں اَتَوَکَّؤُا عَلَیْہَا وَاَھُشُّ بِہَا عَلٰی
غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْہَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی (میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور درختوں کے پتے جھاڑ کر بکریوں کو کھلاتا ہوں اور اس سے میرے اور بھی مطلب نکلتے ہیں)

یہی حال حضرت عیسیٰ کا ہوا بلکہ ان کو تو اپنی صفائی بھی کرنی تھی جہاں تک زبان نے یاری دی کہتے ہی چلے گئے۔ کہ
میں نے ایسی نالائق بات منہ سے نکالی ہوگی تو تجھ کو ضرور خبر ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ تو تو میرے دل تک کا حال جانتا ہے اور میں تیرے
دل کی بات کیا جانوں۔ کہ تو نے مجھ سے تبلیغ رسالت کے سوائے اور کیا چاہا تھا۔ اور تجھ سے تو غیب کی بھی کوئی بات پوشیدہ نہیں
ابھی حضرت عیسیٰ کیا چپ کر سکتے ہیں ان کو اپنی برأت کا جوش آرہا ہے اور کہے چلے جاتے ہیں کہ مجھ کو تو جو حکم ملا تھا میں نے بے کم و کاست
وہی کا وہی ان کو سنا دیا تھا کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا تمہارا سب کا پروردگار ہے اور جب تک ان کا میرا ساتھ رہا۔ ان کی خبر رکھتا رہا کہ
کہیں توحید سے بھٹک نہ جائیں۔ پھر جب تو نے مجھ کو اپنے پاس بلا لیا تو اے خدا تو آپ ان کا نگران حال تھا۔ تجھ کو خبر ہوگی کہ انہوں
نے میرے بعد کیا کیا۔ ہائے ہائے نبوت کی شان نہیں جاتی۔ امت کی وجہ سے مفت جواب دہی میں پکڑے گئے۔ اپنا قصور نہیں
لگاؤ نہیں۔ مگر امت کے حال پر جو شفقت تھی اس میں کمی نہیں آئی۔ وہ لوگ خدا کے ساتھ شرک کریں ان کو جواب دہی میں کھینچوائیں
اور یہ ان کی سفارش کریں کہ اے خدا اگر تو ان کو سزا دینی چاہے تو تیرے بندے ہیں تیرے حکم سے باہر نہیں جو چاہے سو کر اور
اگر تو ان سے درگزر فرمائے تو کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں کہ تو کیوں ان کو معاف کیے دیتا ہے ؛

اسی طرح میں ایک دن سورہ یوسف پڑھ رہا تھا جب اس مقام پر پہنچا جہاں حضرت یوسف قید ہو چکے ہیں اور ان کے
ساتھ کے دو قیدیوں نے خواب دیکھے ہیں اور ان سے تعبیر پوچھی ہے تو آپ نے فرمایا لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِہٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُکُمَا بِتَاْوِیْلِہٖ
قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ
وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا (حضرت یوسفؑ بے گناہ قید ہو گئے تھے اول تو قید ہی بے حرمتی کی چیز ہے اور پھر ایک جھوٹی تہمت پر ضرور مستعجل ہوں گے کب وہ وقت آئے کہ میں عذاب سے چھوٹوں بارے خدا کا کرنا اذا اراد اللّٰہ شیئا ھیّا اسبابہ (جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کے اسباب مہیّا کر دیتا ہے) کیوں بادشاہی کا بٹلار اور ٹیلر (ساقی) یوسفؑ کے ساتھ قید میں جائیں اور کیوں اُن کو خواب کھائی دیں اور کیوں یوسف سے تعبیر پوچھنے کی ضرورت واقع ہو اور یوں یہ واقعہ قید خانہ سے یوسف کے خلاص پانے کا سبب ہو جائے اُنھوں نے خواب بیان کیے تو یوسف نے کہا گھبراؤ نہیں کھانے کے وقت سے پہلے پہلے میں تم کو تعبیر بتا دوں گا۔ خدا نے مجھ کو اس کا سلیقہ دیا ہے کیونکہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدا کو نہیں مانتے اور آخرت کے منکر ہیں میں اپنے آبائی دین یعنی ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوبؑ کے دین پر ہوں۔ ہم لوگ کسی چیز کو خدا کا شریک نہیں سمجھتے اور یہ اللہ کا احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر و لیکن اکثر لوگوں کا دستور ہے کہ احسان نہیں مانتے) اے یاران محبس بھلا سمجھو تو سہی کہ کئی خدا کا ہونا بہتر یا ایک زبردست خدا کا جو سب پر حکمرانی کرے۔ خدا کے سوائے تم جن کو پوجتے ہو بس اُن کا نام ہی نام ہے خدا کے پاس سے تو اُس کی کوئی سند آئی نہیں اور خدا کے سوائے دوسرے کو حکم دینے کا اختیار نہیں اُس نے تو یہی فرمایا ہے کہ میری ہی پرستش کرو۔ سچا دین یہی ہے مگر بہتیروں کو معلوم نہیں اے یاران محبس تم میں کا ایک) آگے چل کر خوابوں کی تعبیر کا بیان ہے۔ تو مجھ کو یہ خیال آیا کہ حضرت یوسف سے پوچھی تو گئی خواب کی تعبیر وہ دوسرا کھڑا لے بیٹھے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ کھڑا رسالت کا کھڑا تھا جو ہمہ وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے نصب العین تھا۔ ان کی تمام دنیاوی ضرورتوں پر مقدم لن اجد من دونہ ملتحدا الا بلاغا من اللّٰہ ورسالاتہ (مجھے اس کے سوا کہیں پناہ ہی نہیں کہ خدا کا پیغام پہونچا دوں اور حق رسالت ادا کر دوں) میں لائن سے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہوں اور اس کی وجہ ہے میری کم مشقی بے مہارتی۔

جب حضرت عیسیٰؑ اپنا اظہار دے چکے تو اللہ جل شانہ احکم الحاکمین نے یہ حکم اخیر صادر فرمایا کہ آج وہ دن ہے جو سچ بولتا ہے سچ اُس کے کام آئے اور وہ سچ سے فائدہ اُٹھائے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کی کہ تم ٹھیک کہتے ہو تمھاری امت آپ بہکی تم نے کسی کو نہیں بہکایا۔ تم ہمارے بندے تھے اور بندگی کی شان سے رہے اور اب بھی ہمارے مقبول بندے ہو۔ یہ باغ جن میں نہریں دوڑ رہی ہیں تم ہی جیسوں کے لیئے ہیں یہ نہیں کہ دیکھا بھالا اور رخصت بلکہ تم ہی ان باغوں کے مالک ہو اطمینان کے ساتھ ان میں رہو سہو ع چشم ما روشن دل ما شاد۔ اس رکوع کے پڑھنے سے ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے باز پرس کی گئی تو ایسا نہ ہو کہیں ان بزرگوں سے بھی خدا پوچھ بیٹھے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ ہماری قبریں شاندار بناؤ اُن پر قیمتی غلاف اُڑھاؤ پنکھے چڑھاؤ۔ روشنی کرو میلے جماؤ۔ ڈھولک بجواؤ۔ ناچ کراؤ اور ہماری ایسی تعظیم کرو کہ اس میں اور عبادت میں تمیز کرنی مشکل ہو شفاعت کے لیئے ہمارے آگے گڑگڑاؤ اور ہم اپنے لیئے خدا کے آگے نہیں یہ بزرگ تو حضرت عیسیٰؑ کی طرح عذر معذرت کر کے چھوٹ ہی جائیں گے مگر دیکھیے اُمت پر کیا بنتی ہے۔

یہ ہے وہ اسلام جس کو لوگ منوانا اور یورپ و امریکہ میں لے جانا چاہتے ہیں۔ بھلا کوئی شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل اور عقل میں سلامتی ہے ایسے اسلام کو مان سکتا یا ایسے اسلام میں رہ سکتا ہے اور پھر اس زمانے میں۔ وہی تمھارے قادیانی صاحب کی مثل ہوئی۔ مجھ کو تو اُن بزرگ کی خدمت میں نیاز نہیں۔ مگر میں نے اُن کا دہلی تشریف لانا سنا اور یہ بھی سُنا۔ خدا جانے غلط یا صحیح کہ اپنے تئیں مسیح موعود کہتے ہیں میں نے تو سن کر یہ کہا تھا کہ آج کو سچ مچ کے مسیح اُتر آئیں تو یہ ایسا ٹیڑھا اور بُرا وقت ہے کہ اُن کو بھی

اپنا منوانا مشکل ہو۔ ان بے چاروں کو کون پوچھے گا۔ آخر وہی ہوا کہ اب تو اُن کا غل دب دبا سا گیا۔ لیکن میں مسلمانوں کو آگاہ کیئے دیتا ہوں کہ یہ نیچریت کا غل آسانی سے دبنے والا نہیں۔ اس واسطے کہ یہ شورش کسی ایک شخص خاص کی پیدا کی ہوئی نہیں اے کاش یہ شورش سید احمد خاں کی ذات خاص سے پیدا ہوئی ہوتی کہ ایک دن اُنہی کے ساتھ مٹی میں دب جاتی ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ نہیں نہیں۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہے زمانہ کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہے انگریزی عملداری کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہے انگلش ایجوکیشن کی۔ یہ شورش پیدا کی ہوئی ہے لوگوں کے مخمصہ و اضطرار کی۔ سید احمد خاں کو اگر اس سے تعلق ہے تو اسی قدر کہ اُن کو خدا نے گدھ کی سی آنکھ دی کہ جو بلا آنے والی تھی اور آ گئی اُنھوں نے اُس کو پہلے سے دیکھ لیا بھلے سے ہوتے تو دیکھ کر چپ کر رہے ہوتے ع خدا جو بیٹھے بٹھائے اُسے خراب کرے ۔ لگے غل مچانے۔ یہ شورش تو تب دبے کہ خدا انگریزی عملداری کو غارت کرے اور وہی اگلے وقتوں کی سی گھس گھس پھر ہونے لگے نہ ریل ہو نہ تار ہو نہ ڈاک ہو۔ نہ منی آرڈر ہو۔ نہ ویلیو پی ایبل پارسل ہو۔ نہ دیوا سلائی ہو۔ نہ چاقو ہو۔ نہ سوئی ہو۔ نہ انگریزی کپڑے ہوں۔ نہ امن ہو۔ نہ آسائش ہو نہ آزادی ہو نہ حقوق کی حفاظت ہو۔ نہ فریاد کی شنوائی ہو۔ نہ بند و بست ہو۔ نہ انتظام ہو۔ اگر یہ منظور ہے تو میں قرآن کے لفظوں میں کہتا ہوں تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم و نسائنا و نسائکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ (آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم بھی گھر کی بی بیوں کو بلائیں اور تم بھی گھر کی بی بیوں کو بلاؤ۔ اور ہم بھی ہوں اور تم بھی ہو پھر خدا کے آگے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر لعنت کریں) نصاریٰ نجران میں سے چند لوگ آں حضرتؐ کی خدمت میں مباحثہ مذہبی کے لیئے آئے اور جناب رسول خدا صلعم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ تہ دل سے اپنے عقائد کے قائل نہیں ہیں اس پر آپ نے اُن سے مباہلہ یعنی قسما قسمی کو کہا۔ اور آں حضرت نے اپنے ساتھ حضرت علیؓ۔ جناب بتولؓ اور دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ کو لیا اور فرمایا کہ اللھم ھولاء اھل بیتی (اے پروردگار یہ ہیں میرے گھر والے) لیکن نصاریٰ نکل بھاگے اور قسم کھانے پر آمادہ نہ ہوئے +

قرآن میں تو ہے علی الکاذبین ہم کو کہنا چاہیئے علی اھل یوربا یا علی الانگلین تو میں بھی تمہارے ساتھ قسما قسمی کرنے پر راضی ہوں۔ کوئی ایک تو تم میں سے آمین کہو مگر یہ سمجھے رہنا کہ دن رات میں کوئی نہ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ آمین کہنے کے ساتھ لاہور میں سکھ آکر اپنا عمل دخل کر لیں۔ اور حمایت اسلام کے ممبر جو ہوں سکے بلوں میں گھستے پھریں۔ غرض یہ نیچریت کی شورش تو تب دبے کہ انگریزی عملداری اُٹھ جائے یا تب دبے کہ مسلمانوں کو کچھ کرنا نہ پڑے اور اُن کی دنیاوی حالت آپ سے آپ درست ہو جائے مگر یہ تو شیخ چلی کے سے منصوبے ہیں نہ انگریزی عملداری کے اُٹھنے کی کوئی صورت ہے اور نہ اُٹھے گی اور مسلمانوں کو اپنی دنیاوی حالت کے مزاج کو اصلاح پر لانے کے لیئے آج کے آج اور کل کے کل چار و ناچار انگریزی تعلیم کا مسہل لینا پڑے گا علی گڈھ کالج کا مسہل لیں تو اور حمایت الاسلام کا مسہل لیں تو۔ وہ جلپ یا کسٹرائیل کا جلاب ہے۔ اور یہ تمہارا دیسی املتاس۔ اب جس کو جو پچے بہتر ہے کہ یہ املتاس کا جلاب تیار ہے آنکھیں میچ کر پی بھی جاؤ۔ شاباش۔ شاباش۔ وہ پی لیا۔ وہ پی لیا۔ وہ پی لیا۔ اب ذرا طبیعت کو میری باتوں میں مشغول کرو کہ جلاب اچھی طرح اُتر جائے لیکن جن کی دوکان سے جلاب بندھ کر آیا ہے یعنی انجمن حمایت اسلام کے سکرٹری منشی شمس الدین صاحب سر دست جلاب کے دام بھی مانگ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں لکچروں کی اصلی شیر خشت اور نظموں کی ترنجبین قیمتی دوائیں ہیں۔ تو بھائی مانگیں سو دو۔ بلا سے روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے تم اچھے ہو جاؤ گے تو بہتیرا کما لو گے +

مذہب اور معتقداتِ مذہب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے مولنا ممدوح کے مذہب اور معتقداتِ مذہب کا جو باب قایم کیا ہی اُس کی ایک خاص وجہ یہ ہی کہ وہ اگرچہ پشتینی مسلمان ہیں اور دین دار مسلمان کے گھرانے میں جنم لیا ہی۔ چاہیئے تھا کہ اوروں کی طرح اُن کا مذہب بھی تقلیدی مذہب ہوتا۔ مگر نہیں مذہبِ حقّہ کی تلاش میں اُنھوں نے اپنے آبائی مذہب اسلام کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ نہ وہ عیسائی تھے نہ یہودی نہ ہندو اور نہ مسلمان۔ بلکہ کھلے کھلے لامذہب۔ لامذہبی مذاہبِ مروّجہ کی آپس کی کش مکش نے پیدا کر دی تھی۔ خدا ایسی لامذہبی سب کو دے جس کے انجام میں اسلام چمکتا ہوا ظاہر ہو۔ سچ کہا ہی عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد۔ لامذہب ہونے کے بعد مولنا نے تحقیقاتِ مذہب کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھائی اور اس طرح یہ دشوار گزار راہ خس و خاشاک سے پاک کر کے آناً فاناً طے کر لی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد خدا نے اُن کی دست گیری فرمائی۔ بہرحال مولنا نے جس خوبی و خوش اسلوبی سے سائنس اور مذہب کو میزانِ فطرۃ میں تولا ہی اُسے دیکھ کر بے اختیار زبان سے مرحبا نکلتی ہی۔

ہم نے مولنا کے مذہب کی چھان بین صرف اسی غرض سے کی ہی کہ اُن کا تحقیقی مذہب اسلام بالکل عقل اور فطرۃ کے موافق ہی۔ مذہب کے اہم مسائل۔ وجودِ باری تعالیٰ۔ وحدانیۃ اور رسالت وغیرہ وغیرہ کو اس آسانی سے سمجھا ہی اور نیز لوگوں کو سمجھایا ہی کہ سبحان اللہ۔ خدا سب کی عقل میں ایسا نور بخشے۔ انگریزی خواں نوجوان اُن میں خواہ ہندو ہوں یا عیسائی یا مسلمان اگر یہ لوگ مذہب کی طرف سے بھٹکے بھٹکے پھرتے ہوں تو وہ ہمارے مولنا کے تحقیقی مذہب کو پڑھیں۔ خدا کی ذات سے امید ہی کہ اُن کو راہ راست مل جائے گی۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کا نام ہم نے اس لئے لیا کہ اگر وہ اپنے ہندو اور عیسائی مذہب پر ہوں تو بھی دیکھیں۔ اور مذہب اسلام کے سوا اگر اُنھوں نے کوئی اور مذہب اختیار کر لیا ہو تو بھی دیکھیں۔ مسلمانوں کا نام ہم نے اس لئے لیا کہ اگر خدانخواستہ وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہوں اور ہم جانتے ہیں کہ جنھوں نے انگریزی پڑھی ہے

اُن میں کے اکثر بھٹک گئے ہیں وہ بھی ہمارے مولانا کے مذہبِ تحقیقی کو دیکھیں۔ اس پر بھی اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئیں یعنی اسلام قبول نہ کریں تو ہمارا ذمہ۔

اس حصے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ صرف خیالات کی رو سے بلکہ اگر دیکھا جائے تو الفاظ کی رُو سے بھی جو کچھ ہے وہ مولانا ہی کے رشحاتِ قلم کے موتی ہیں۔ راقم نے مولانا کی بعض تصانیف میں سے اِن موتیوں کو چُن چُن کر ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور اس طرح یہ ایک چھوٹا سا صحیفہ بنا یا گیا ہے تاکہ اِذْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا

مسلمانو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول (محمد) پر اُتاری اور اُن کتابوں پر جو (قرآن سے) پہلے (دوسرے پیغمبروں پر) اُتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہوا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور روزِ آخرت کا وہ (راہِ راست سے) بڑی دُور بھٹک گیا۔

ایمانِ مجمل

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْكَامِهٖ وَاَرْكَانِهٖ

میں خدا پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور خوبیوں کے ساتھ موصوف ہے اور میں نے اُس کے سارے احکام اور ارکان تسلیم کر لئے۔

ایمانِ مفصّل

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

میں خدا پر اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور تقدیر کی بھلائی بُرائی پر ایمان لایا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور مری پیچھے جی اُٹھنے پر بھی ایمان لایا۔

تصدیق بالجنان کی تو خدا جانے لیکن ہم نے تو اقرار باللسان اور تحریر بالقلم کے ذریعے سے مولانا کو مسلمان جانا ہے اور ایک طرح سے ہم تصدیق بالجنان بھی کر سکتے ہیں ؏ می طراوہ ز زباں انچہ در آوندِ من است۔ ؏ زباں پر آئے گی جو دل میں ہوگی۔ ؏ انچہ از دل خیزد از زباں می ریزد۔ اگر اِن وجوہ سے مولانا کی زبان اور اُن کے قلم کو ہم اُن کے دل کا ترجمانِ صادق سمجھیں تو بہت بجا اور بہت درست ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا ایک وقت میں تقلیدی مسلمان تھے یعنی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے مسلمانوں کا سا نام رکھا گیا تھا مسلمانوں میں پرورش اور تعلیم پائی تھی مسلمانوں میں رہے سہے لیکن تقلیدی زندگی میں مولانا نے ایک لمحے کے لئے بھی ترکِ تقلید کا خیال نہیں کیا جس طرح اور عام مقلّد مسلمان اسلام پر قانع اور اُس کی طرف سے مطمئن ہیں اسی طرح ہمارے مولانا بھی اُس کی طرف سے مطمئن تھے جس طرح نماز روزہ دوسرے مسلمان کرتے ہیں وہ بھی کر لیا کرتے

تھے۔ یعنی اعمالِ ظاہر کو مولانا صرف ایک رسم کے طور پر ادا کیا کرتے تھے اور اس طرح کون نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک مقلد مسلمان تھے اور بس۔

رکابیہ مذہب اختیار کرنا

دنیا میں سیکڑوں لوگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں اور اب بھی دیکھے جاتے ہیں جو اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے یا دوزخِ شکم میں روٹی کے ٹکڑے ٹھونسنے کے لالچ میں اپنا مذہب بیچتے پھرتے ہیں سنیّوں میں سُنّی۔ شیعوں میں شیعہ۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہے غضب تو یہ ہے کہ عیسائیوں میں عیسائی، مسلمانوں میں مسلمان۔ ہندوؤں میں ہندو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کا مذہب کوئی صلح کل مذہب ہے۔ بلکہ صرف دنیاوی اعزاز کی خاطر حکام وقت کو یہ جتایا دیا جاتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے۔ دین و دنیا میں لڑائی کے بانی ایسے ہی مفسد ہوتے ہیں۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ ایک شخص اَبا عن جَدٍّ ایک اسلامی فرقے میں پیدا ہوا۔ اور اپنے اُسی فرقہ کا معتقد رہا۔ لیکن امیروں میں بیٹھ کر وہ اُن کا مسخرا ہو گیا تھا۔ یہ امرا اس کے خلاف ایک دوسرے اسلامی فرقے کے معتقد تھے۔ لیکن اِس بندۂ شکم مسخرے کی کیا حالت تھی کہ روٹیوں کی خاطر وہ اپنے مذہبی عقاید سے دست کش ہو جاتا تھا۔ اور جب تک اِن امیروں میں بیٹھا رہتا تھا انھیں کے مذہب کے عقاید کی پیروی کرتا تھا اور اِس پیروی کو جب تک وہ وہاں بیٹھا رہتا تھا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہاں سے اُٹھا اور کسی اور مذہبی گروہ میں گیا تو وہاں اُن کے مذہبی عقاید کی تقلید کرنے لگا۔ غرض وہ مذہب کے لحاظ سے تھالی کا بیگن تھا ؏ رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز ؛ تا گنج زراز کہتر و بہتر بستانی ؛ مگر خدانخواستہ ہمارے مولانا کی یہ حالت نہ تھی۔ انھوں نے جس زمانے میں رکابیہ مذہب اختیار کیا تھا وہ ایسا زمانہ تھا کہ اُن کا گزر کسی امیر کے دربار میں نہ تھا بلکہ وہ اُن کا زمانہ طالب علمی تھا۔ اورنگ آبادی مسجد جس میں یہ رہا کرتے تھے وہ مسجد دو مولویوں کے تحت میں تھی۔ ایک مولوی صاحب بدعتی مشہور تھے اور دوسرے مولوی صاحب وہابی کہلاتے تھے۔ وہابی مولوی صاحب جن طالب علموں کا انتظام خور و نوش فرماتے تھے وہ طالب علم وہابی کہلاتے تھے۔ اور بدعتی مولوی صاحب جن طالب علموں کا انتظام خور و نوش کرتے تھے وہ طالب علم بدعتی۔ اگرچہ ہمارے مولانا بظاہر وہابی مولوی صاحب کے گروہ میں تھے مگر کبھی کبھی روٹیوں کی خاطر دوسرے گروہ میں بھی شامل ہو جاتے تھے یعنی مولانا کو جدھر کچھ ملنے کی اُمید ہوئی اُسی طرف ہو گئے اُس زمانے کے بدعتی یا وہابی گروہ میں شامل ہونے کو اگر کوئی شخص رکابیہ مذہب کہہ سکتا ہے تو خیر مولانا بھی رکابیہ مذہب رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ ہم نے رکابیہ مذہب کا ایک عنوان قایم کر دیا۔ ورنہ اُس زمانے میں مولانا کا مذہب کابیہ تھا نہ وہابیہ۔

دہریت اور لامذہبی سے بال بال بچنا

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ہر شخص جس کے سر میں بھیجا اور بھیجے میں عقل ہے اور وہ مذہب تحقیقی اختیار کرنا چاہتا ہے تو اول وہ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اُس کو خوب لتاڑتا ہے۔ پھر اُس کی نیت ڈانوا ڈول ہوتی ہے اور کسی دوسرے مذہب کی تلاش میں پاس پڑوس والوں کے مذہبی خیالات کے اصول و فروع کو دیکھتا ہے۔ پھر کبھی ایک کو پکڑتا ہے اور کبھی ایک کو چھوڑتا ہے۔ اور جب دوسرے مذہبوں کو بھی اپنی عقلی میزان کے پلڑوں میں اونچا نیچا دیکھتا ہے تو وہ گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ مذہب کا روگ اپنے پیچھے نہ لگائے۔ وہ مذہب کی قید سے آزاد ہونے ہی کو بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔ جب وہ مذہبی خیالات کے گورکھ دھندے

سے تنگ ہوتا ہے تو خداوند تعالیٰ کی خدمت میں بڑی بڑی گستاخیاں کرتا ہے یعنی اُس کی حقیقت کو بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور بک اُٹھتا ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں۔ یہ سب خیالی ڈھکوسلے ہیں۔ بس اسی طرح کا نہ سہی لیکن اسی کے قریب قریب ایک واقعہ ہمارے مولانا پر بھی گزرا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "مجکو ٹھیک سنہ یاد نہیں مگر سنہ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ کا مذکور ہے کہ ہمارے دہلی کالج اور نٹیل کلاسز کی ریاضی کے اُستاد ماسٹر رام چندر صاحب اصطباغ لینے کے لیے آمادہ ہوئے۔ ماسٹر اور بدا کر ٹیچر کیا سٹوڈنٹ سب کے ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ مذہبی مناظرے کی وہ پہلی بھنک تھی جو میرے کان میں پڑی اگرچہ میں عربی کی جماعتِ اول میں تھا اور فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ درمختار کورس میں تھی۔ لیکن دیکھتا تھا کہ ماسٹر ہم لوگوں کو بند کر دیتے تھے مجھ کو ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک خصوصیت بھی تھی اور اکثر اُن کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ماسٹر نے تو مجھے گمراہ کر دیا ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہے۔

اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۔ تو تو لگا تھا کہ مجکو گڑھے میں ڈالے اور اگر نہ ہوتا میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا اُن میں جو پکڑے آئے۔

مگر مجکو ادبِ عربی کا تھا شوق۔ میں قرآن کی عبارت پر لٹو تھا۔ اِس تریاق نے مجکو اِس زہر سے بچایا۔ یہاں تک کہ کالج سے اپنا ایمان سلامت لے نکل گیا۔ مگر کیسا ایمان متزلزل۔ متشکک۔ ضعیف۔ مضمحل۔ پھر میں نے علمِ کلام کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔ موافق و مخالف دونوں۔ ماسٹر نے مجھ کو عیسائی بنانا چاہا اور علمِ کلام نے سرے سے لا مذہب"۔ بات یہ ہے کہ جس شخص کو ذرا سی بھی مذہب کی کُرید رہتی ہے اُس کا یہی حال ہوتا ہے بلکہ اُس سے بھی بدتر اور جس کو انگریزی تعلیم چھو تک بھی چھو جائے گی قسم کھانے کی بات ہے کہ اُس کا ایسا ہی حال ہوگا۔ وہ کہے نہ کہے دل کا اگر بودا ہے تو ضرور چھپائے گا۔ اگر دل کا قوی ہے تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہے گا۔ غرض مولانا ایک دین دار گھر میں پیدا ہوئے اور گھر والوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اوائل عمر میں دین دار تھے۔ بشرطیکہ اُس وقت کی اِس طرح کی دین داری کو دینداری کہہ سکیں۔ خیر ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا سرکاری کالج دہلی میں داخل ہوئے باوجودیکہ کالج پادریوں کا نہیں بلکہ سرکاری تھا اور اُس میں دین و مذہب سے کچھ بحث نہ تھی اور مولانا انگریزی نہیں بلکہ عربی پڑھتے تھے۔ تاہم چونکہ ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا مخالف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ مولانا کے مذہبی خیالات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی پھر ندارد۔ اور ع

خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری۔ دو چار دفعہ بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑی اور کبھی بے وضو بھی پڑھ تا دی۔ پھر عیسائیت کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ۔ کی جگہ۔ اشہد ان عیسیٰ ابن اللہ کہنے لگے۔ مگر حضرت عیسیٰ کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں کچھ اچھی طرح جمتا نہ تھا۔ پھر جھجکتے جھجکتے وہی اشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ کہنے لگے۔ مونہہ سے اقرار دل سے انکار غرض مولانا کسی وقت میں عیسائی تھے کسی وقت میں مسلمان کسی وقت کچھ بھی نہیں۔ وہ اِس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ مذہبی خیالات کو سر سے سر میں آنے ہی نہ دیں۔ مگر کوئی نہ کوئی اتفاق پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے

بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنی بے اختیاری دیکھ کر مولنا سہارا ڈھونڈتے تھے بس یہی ایک چیز تھی جو مذہب کے خیالات کو مٹنے نہیں دیتی تھی۔ اسی حیص بیص میں کئی برس گزر گئے۔ مگر کس طرح کہ کبھی گرویدۂ مذہب اور کبھی بالکل ہٹتے سے اُکھڑے ہوئے۔ اسی تردد کی حالت میں مولنا نے علم مناظرے کی پچاسوں کتابیں دیکھ ڈالیں لیکن کسی ایک سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ اور تسلی ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ عیسائی مثلاً مسلمانوں پر ایک اعتراض کرتا ہے مسلمان اُس اعتراض کو تو اُٹھاتا نہیں مگر ویسا ہی یا اُس سے بدتر اعتراض عیسائی پر جڑ دیتا ہے۔ مولنا کی طبیعت میں اس سوال و جواب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دونوں سے بدعقیدہ۔ آخرکار مولنا نے علم مناظرہ کی کتابیں دیکھنے سے توبہ کی کیوں کہ اُن کو العلم حجاب اکبر کا مصداق پایا۔ اب مولنا کو بالکل یقین ہو گیا کہ "میں اسی تذبذب اور تزلزل کی حالت میں مروں گا۔" لیکن اس تصور سے جیسی ایذا مولنا کو ہوتی تھی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ غرض اس جھکولے کے سوا مولنا کے تقلیدی مذہب میں عرصۂ دراز تک کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مگر بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ خود بخود دل نے ازسرنو مذہب حقہ کی تلاش میں آمادگی ظاہر کی۔ مولنا نے کتابیں تو دیکھنی شروع کیں اسلامی فرقوں کی اور وہ اندرونی اور باہمی اختلاف کی وجہ سے جا پھنسے دوسرے مذاہب کے جھگڑوں میں۔ اور اب اُن کا یہ تماشا ہو گیا کہ عقل کی بھول بھلیاں میں بھٹکے بھٹکے پھرتے تھے اور نکلنے کا رستہ نہیں سوجھ پڑتا تھا ؎

با عقل گشتم ہم سفر یک کوچہ رہ از بے خودی　　شدہ پارہ پارہ دامنم از خار استدلالہا

مولنا پر ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ وہ سرے سے کسی مذہب ہی کے معتقد نہ تھے اور دل میں کہتے تھے کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب حق واقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا۔ اور ساری دُنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دُنیا جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فرد بشر اس کی جست و جو سے فارغ نہیں اور وہ نہ ملے! تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اُس چیز کا وجود ہی نہیں دُنیا میں ہزاروں مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا اپنے آپ کو برسرِ حق سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ نیک و بد ہر فرقے میں ہیں۔ کیوں کر مان لیں کہ ایک شخص خدا سے ڈرتا اور غریبوں پر ترس کھاتا اور کسی کو ایذا نہیں دینی چاہتا معاملے کا صاف۔ دیانت دار، امانت گزار، مزاج میں شیخی نہیں، غرور نہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے کہ خاص طور کے عقیدے نہیں رکھتا اور نہیں رکھتا تو اس وجہ سے کہ وہ سچے دل سے اُن کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ کیوں کر مان لیں کہ ایسا شخص جہنمی ہو اور ابدالآباد کے لئے مستوجب عذاب الٰہی۔ اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے۔ یہی نا کہ دُنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون ہم ہی آدمی تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی جس نے بنائی وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی تھی لیکن اُس کو منطق کی کسوٹی پر جب کس کر دیکھا جاتا تھا تو ٹھیک نہیں اُترتی تھی۔ کوئی چیز بِن بنائے نہیں بنتی اس کی جگہ ہم کو یوں کہنا چاہیے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ دو ہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعویٰ رہا نہ دلیل۔ اور کوئی چیز بِن بنائے نہیں بنتی ہے تو خدا بھی آگیا۔ تو گویا ہم ایک ہی سانس میں خدا کو مانتے اور اُس سے مکرتے بھی ہیں۔ جو شخص کسی چیز کے آپ سے آپ ہو جانے پر اچنبھا کرتا ہے بڑا اچنبھا یہ ہے کہ وہ خدا کے ہونے پر اچنبھا کیوں نہیں کرتا۔ اور دُنیا میں اگر مثلاً ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے تو دو سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں ہے ہم ہزاروں

لاکھوں آدمیوں کو مبتلائے مصیبت دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ مصیبت اُن کی کسی بدکرداری کا نتیجہ نہیں ہے۔ جیسے کور مادرزاد۔ یا ایک عام مصیبت موت ہی کی ہے جس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خدا کے نہیں ہیں اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اور فرض کرو کہ خدا ہے تو مجرد خدا کا ہونا چاہتا ہے کہ دین نہ ہو۔ کیوں کہ اگر خدا ہے اور اُس نے جیسا چاہا دُنیا کو بنایا تو وہ دُنیا کے خلاف کیوں چاہنے لگا۔ اور اگر چاہے تو اُس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص گھڑی بنائے اور بنا کر اُس میں کیل ٹھوک دے کہ چل نہ سکے۔ ہم کو بے ہماری درخواست کے پیدا کیا اور چند در چند ضرورتیں اور خواہشیں ہمارے پیچھے لگا دیں پھر ہم کو اُن سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی کیا؟

یہ یا اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مولنا کو تحقیقِ مذہب کے وقت دہریت کی دلدل میں پھانس رہے تھے اور خدا کا فضل دستگیری نہ کرتا تو یہ خیالات اوندھے مونہ دوزخ میں جا گرانے کو بالکل کافی تھے۔ اسی قسم کی چھان بین میں عرصے تک مولنا غلطاں پیچاں رہے۔ یہاں تک کہ آخر کار اسلام کی حقانیت کامل طور پر مولنا کے ذہن نشین ہوگئی جیسے پتھر کی لکیر۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ[1]

غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ سب عقل کی کرہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی عقل سے اُس کی بساط سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے اُس کی نہ دُنیا ٹھیک اور نہ اُس کا دین دُرست ع۔ اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی کسی نے سچ کہا ہے۔ مذہب کا کچھ ایسا خاصہ ہے کہ جتنا چھانو اُتنا ہی کرکرا۔ جتنا نتھارو اُتنا ہی گدلا۔ اور اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ "دین ہے بڑھیوں کا اور مکتب کے مبتدی بچوں کا" یعنی بوڑھی عورتیں اور مکتب کے مبتدی بچے دل کے بھولے اور طبیعت کے صاف ہوتے ہیں جس طرح کورا کپڑا رنگ خوب پکڑتا ہے بھولے دل اور صاف طبیعتیں دین کی باتوں کو جلد قبول کر لیتی ہیں۔ اور العلم حجابُ اکبر جو کہا گیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ بہت سیان پتی بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔ غرض مولنا پر دین کے اعتبار سے کچھ اس طرح کا وقت گزرا جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹک بھٹک پڑے پھرے۔ بہتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام تک چلتے آخر کار پھیر پھار کر وہیں آ کھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ مگر تھا کیا کہ طلب تھی صحیح اور تلاش تھی سچی۔ اس سوچ میں مولنا کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کوئی مبہوت دیکھتے ہیں اور نظر نہیں آتا۔ سُنتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔ بہتیری کوشش کرتے کہ یہ خیال دل سے دُور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیشِ نظر تھا کسی چیز میں طبیعت نہیں لگتی کسی بات سے جی نہیں بہلتا۔ کتاب لے کر بیٹھے ہر چند طبیعت پر زور دیتے ہیں مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں ان کو خبر نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں یہاں تک کہ مولنا کے ستے ضرور یہ میں خلل پڑنے لگا اور چندے خوف رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنون ہو جائے۔ اور سارا پڑھا لکھا غارت ہو۔ ایک رات آخرِ شب اسی خیال میں پڑے کروٹیں بدل رہے تھے کہ اُنھوں نے بے قرار ہو کر دعا کی۔

"اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہل مذاہب تجھکو مانتے ہیں تو
مجھکو اس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال۔"

[1] اور اس پر خدا کی تعریف ہے اے رب ہمارے دل نہ پھیر ہمارے جب ہم کو ہدایت دے چکا اور دے ہم کو اپنے پاس سے مہربانی بے شک تو ہی ہے بہت دینے والا ۱۲

یہ دعا چوں کہ دل سے نکلی تھی ایسی مقبول ہوئی کہ آہستہ آہستہ دہریت اور لامذہبی کے شکوک مولانا کے دل سے سب رفع دفع ہو گئے۔ مگر کھن کھا کر۔ اور وہ اس طرح کہ اُسی تشویش مذہب اور کش مکش کے زمانے میں مولانا کو خیال ہوا کہ مذہب رسم نہیں بلکہ زندگی کی ضرورتوں میں سے بڑی اشد ضرورت ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے آپ ہی آپ ہر ایک چیز کو نظر غایر سے دیکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ جس چیز کو دیکھتے اوپری اور سرسری نظر سے دیکھتے اب ہر چیز کی تہ کو پہنچنے لگے کہ یہ کیا ہے؟ کیوں کر بنی ہے؟ کس غرض سے بنی ہے؟ آپ سے آپ بن گئی ہے یا کسی نے بنائی ہے؟ بنانے والے نے اس کے بنانے میں کیا کاریگری کی ہے؟ بس اسی سوچ بچار کو مولانا نے عمارتِ دین سمجھا اور بجا سمجھا۔ یہ اس طرح کہ شروع شروع میں ایسی چیزوں پر نظر پڑتی تھی جس میں آدمی کے عمل کو بھی تھوڑا بہت دخل ضرور تھا۔ وہ مکانات تعمیر کرتا۔ باغات لگاتا۔ کاشت کاری کرتا۔ ساز و سامانِ خانہ داری بہم پہنچاتا اور بنظرِ ظاہر بنانے والا یعنی خالق خیال کیا جاتا۔ مگر غور سے دیکھا تو وہ ایک حد تک متصرف فی الامور ضرور ہے یعنی چیزوں کی حالت اور ترتیب بدل سکتا ہے لیکن معدوم کو موجود نہیں کر سکتا اور بہتیرے تغیرات اس کے دسترس سے خارج بھی ہیں۔ مثلاً آدمی نے مکان بنایا تو اس کے بنانے کے یہی معنی ہیں کہ اس نے مٹی سے اینٹیں تھاپیں۔ ان کو پکایا۔ درختوں کی لکڑی چیر کر کڑی۔ تختے کواڑ۔ چوکھٹ۔ یہ چیزیں بنائیں۔ اُن کو لوہے کی کیلوں سے جڑا۔ پھر سب چیزوں کو موقع موقع سے ترتیب دے دیا۔ اتنا کرنے سے بانی مکان کہلانے لگا۔ مگر پانی۔ مٹی۔ لکڑی۔ لوہا۔ کوئی چیز بھی آدمی نے پیدا نہیں کی۔ یہ چند باتیں تو مثال کے طور پر بیان کر دی گئی ہیں۔ آدمی خود سوچے۔ سمجھے تو معلوم کر سکتا ہے کہ جس کو اختیار کہنا چاہیے اُس کا تو نام ہی نام ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بہت ٹھیک فرمایا ہے ؎

گرت چشم خدا بینی ببخشند   نہ بینی ہیچ کس عاجز تر از خویش

دور کیوں جاؤ خود آدمی ہی کے حال کو دیکھو کہ پیدا ہونا جینا طفلی اور شباب اور پیری کی منزلیں طے کرنا مرنا ان میں کوئی چیز بھی آدمی کے اختیار میں ہے؟ ہم تو جینے ہی کے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ آدمی منہ کی راہ ماکول و مشروب پیٹ کی کوٹھری میں بھر لیتا ہے۔ جیسے بھڑبھونجا بھاڑ جھونکتا ہے۔ خیر یہاں تک تو آدمی کو جوتنا۔ بونا۔ کاٹنا۔ گاہنا۔ پیسنا۔ پکانا نگلنا۔ کچھ کرنا بھی پڑتا ہے۔ نگلے پیچھے اُس کو خبر بھی تو نہیں ہوتی کہ غذا کیوں کر گوشت پوست۔ ہڈی۔ پٹھے۔ رگ۔ ریشے خون۔ بال۔ ناخن کی طرف مستحیل ہوتی ہے۔ غرض بہت نہیں تھوڑا سا غور کرنے سے مولانا کا دل اس بات کو مان گیا کہ دنیا میں ہمہ وقت انواع و اقسام کے تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور کوئی تغیر بڑا ہو یا چھوٹا بے سبب کے نہیں ہوتا۔ خواہ وہ سبب آدمی ہو یا کوئی اور چیز کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ پتھر جہاں پڑا ہے جب تک کوئی اُس کو جگہ سے نہ ہلائے جنبش نہیں کرتا۔ تخم کے بدون درخت نہیں اُگتا۔ بے بادل پانی نہیں برستا۔ آدمی کو ایک حد تک متصرف فی الامور دیکھ کر مولانا کو دھوکا ہو چلا تھا کہ شاید یہی تغیرات کا باعث ہوتا ہو۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی مشاہدہ کر لیا کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں بے شمار تغیرات ہوتے رہتے ہیں جن میں انسان کو کچھ بھی دخل نہیں۔ بلکہ انسان کو ان کی خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ دخل کیا خاک ہو۔ علاوہ بریں ایک تغیر معدومِ محض کو موجود کرنے کا ہے کہ یہ

کرشمہ نہ کسی فرد بشر نے کیا اور نہ کوئی کر سکے گا۔ مثلاً دنیا کی ہر قسم کی چیزوں کی اصلیت میں غور کرتے کرتے آخر کار یہ دریافت ہوا کہ چار چیزیں تمام چیزوں کی اصل ہیں جن کو عناصر اربعہ کہتے ہیں۔ آب و خاک و باد و آتش یعنی دنیا میں جو چیز بھی ہے بجائے خود ایک مرکب ہے جس میں یہ چار عناصر ملے ہوئے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہر چیز کی ترکیب جدا ہے۔ اور مقدارِ عناصر مختلف۔ اب حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ جن عناصر کو ہم اب تک بسیط سمجھتے رہے وہ بھی مرکب ہیں۔ مثلاً ہوا میں تین قسم کی ہوائیں ملی ہوئی ہیں۔ آکسیجن، نائٹروجن۔ اور ہائڈروجن۔ ایک کا خاصہ ہے آگ کو مشتعل کرنا دوسری کا بجھانا۔ لیکن عناصر بسیط ہوں یا مرکب۔ ہم کو تو اس بحث سے کچھ تعلق نہیں۔ ہمارا مدعا تو اسی قدر ہے کہ دنیا کی چیزیں عناصر کے اختلاط سے بنیں۔ عناصر کا اختلاط بھی ایک طرح کا تغیر ہے اور چوں کہ ہر ایک تغیر کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہوتا ہے۔ اختلاطِ عناصر کا بھی کوئی سبب ہوا ہوگا۔ اور معلوم ہے کہ اختلاطِ عناصر میں آدمی کو کچھ دخل نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور آدمی کو دخل نہیں تو محسوسات ظاہری عالم میں کسی کو نہیں۔ غرض اختلاطِ عناصر کا سبب بھی دریافت طلب ٹھیرا۔ اور اس سے بڑھ کر وجودِ عناصر کا سبب کہ یہ کیوں کر آموجود ہوئے؟ ان کا موجد کون؟ ممکن تھا کہ مولنا اس بارے میں کسی مولوی کسی عالم، کسی واعظ، کسی صوفی یا کسی مشائخ سے مشورہ کرتے اور وجودِ عناصر کا سبب دریافت کرتے مگر اس امر کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں کے موجودہ علماء کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ تو صرف ایک دوسرے مسلمان کو کافر بنانے اور ملحد قرار دینے کے عالم۔ واعظ۔ صوفی اور مشائخ ہیں نہ ان باتوں کے سمجھانے کے لئے۔ یا علم کلام و مناظرہ کا ان لوگوں نے ایک اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ اور اُن میں ایسی گاؤزوری کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس علم کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اپنے اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی ہیں۔ شاید ہی ان میں احقاقِ حق کے لئے کوئی کتاب لکھی گئی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی باطل سے باطل مذہب بھی مغلوب مناظرہ ہو کر معدوم نہیں ہوا۔ اس لئے مولنا کسی مولوی یا مشائخ کے پاس تو بھولے سے بھٹکے نہیں۔ تدبیر یہ کی کہ دل ہی دل میں سوچتے رہے اور برسوں اسی فکر میں پریشان رہے۔ لیکن یہ معمی کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا کہ دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ کہاں سے آموجود ہوا۔ کون اس کو ربط و ضبط کے ساتھ چلا رہا ہے۔ مولنا کی پریشانی یہاں تک بڑھی کہ آخر کار انھوں نے ایک دن دیوان حافظ میں فال کھولی تو قسمت سے یہ شعر نکلا ؎

سخن از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو　　که کس نگشود و نگشاید بحکمت این معمی را

فال نے تو مولنا کی بالکل آس توڑ دی۔ اور ایک مدت تک انھوں نے اس خیال کو پاس نہ آنے دیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے مولنا کو تپ آنے لگی اور سہلوں تک کی نوبت پہنچی۔ علالت کی حالت میں مولنا کو یہ خیال ہوا کہ اگر وہ اسی ڈبدے کی حالت میں مر گئے تو کتے کی موت مرے۔ غرض تن درست ہوتے ہی انھوں نے پھر زور شور کے ساتھ کوشش شروع کی۔ وہ کیا کوشش تھی؟ وہ یہ کوشش تھی کہ انھوں نے سوچا کہ "میں کوئی انوکھا آدمی تو ہوں نہیں مجھ جیسے اور مجھ سے بہتر سوچ سمجھ کے لاکھوں کروڑوں آدمی ہو گزرے ہیں اور اب موجود ہیں اور یہ خیال جو مجھکو پریشان کئے رہتا ہے کوئی ایسا دقیق مضمون نہیں جس کے لئے بڑی عقل درکار ہو بلکہ معمولی ہوش و خرد کا آدمی بھی ایسا خیال کئے بغیر

نہیں رہ سکتا۔ اور اگر آدمی نے ایسی ضروری اور پیش افتادہ بات کا بھی خیال نہ کیا تو حقیقت میں وہ جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔

غرض غور کرنے سے مولانا کو یہ ثابت ہوا کہ یہ خیال آدمی کی فطرت میں داخل ہے۔ آدمی کا دل اس کو اس خیال پر مجبور کرتا ہے اور یہ خیال خود بخود اس کے دل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے اس خیال کا نتیجہ اختلافِ مذاہب ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف اختلافِ مدارجِ عقول۔ اختلافِ تعلیم اختلافِ تربیت۔ اختلافِ آب و ہوا کی وجہ سے ہے۔ چوں کہ مذہب بہت سی باتوں کے مجموعے کا نام ہے اور مذاہب ہیں کہ قریب قریب سبھی باتوں میں مختلف ہیں اس لیے فروعی اختلاف تو چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ بڑا دیکھنا اصولِ اختلاف کا ہے۔ پس تمام اختلافات کی جڑ معرفتِ ذاتِ باری ہے۔ ذاتِ باری میں جو اختلافات ہیں اُن کے لکھنے کی گنجایش نہیں۔ صرف وجہِ اختلاف لکھی جاتی ہے اور وہ وجہ خود انسان کی طبیعت کا خاصّہ کریزی ہے۔ کریزی کے بہت سے معنی ہیں لیکن یہاں معنی ہیں کہ نامعلوم چیزوں کے معلوم کرنے کا شوقِ مُفرط۔ اگرچہ یہ تعریف کی بات ہے۔ یہ نہ ہو تو بابِ ترقی مسدود لیکن چل کر از حد بگزرد رسوا کند [۵]

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ... کہ جاہا سپر باید انداختن

شوق کی ایک حد ہونی چاہیے اور وہ حد یہ ہے کہ "ایاز قدرِ خود بشناس" بات یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس میں غور کرے تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ گو وہ عقل رکھتا ہے اور عقل کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے۔ مگر ہزاروں باتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ کُنہ اور حقیقت تو کسی چیز کی ہم جانتے ہی نہیں۔ مثلاً کوئی ہم سے پوچھے کہ پانی کی حقیقت کیا ہے؟ جواب میں ہم پانی کے خواص تو بہتیرے گنوا دیں گے کہ پانی ایک رقیق اور سیّال چیز ہے۔ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ جس ظرف میں بھرا جائے جوفِ ظرف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جن چیزوں کا وزنِ مخصوص پانی کے وزنِ مخصوص سے ہلکا ہے وہ پانی پر تیرتی رہتی ہیں۔ جیسے لکڑی اور تیل۔ جان داروں کے لیے سرمایۂ زیست ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (اور ہم نے پانی سے تمام جاندار چیزیں بنائیں) بے شک یہ ایسی صفتیں ہیں کہ ان سے ہمارا ذہن بے خطا پانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے مگر ہیں سب عراض۔ اسی طرح

جِسْمٌ نَامٍ حَسَّاسٌ مُتَحَرِّكٌ بِالْإِرَادَةِ بَادِي الْبَشَرَةِ عَرِيضُ الْأَظْفَارِ مُسْتَقِيمُ الْقَامَةِ

بڑھنے والا جسم ہے۔ رنج و راحت کو دریافت کرتا ہے۔ ارادے کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ اس کی جلدِ بدن کھلی ہوئی ہے۔ چوڑے ناخن سیدھا قد

انسان کی صفات اور اعراض ہیں نہ کُنہ و حقیقت۔ خدا نے قرآن میں آدم کی نسبت کہ اس میں بنی آدم بھی داخل ہیں وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (آدم کو سب چیزوں کے نام بتا دیے) فرمایا ہے کہ نام بھی ایک طرح کی صفتِ عارضی ہے۔ نہ عَلَّمَ آدَمَ الْحَقَائِقَ اور ایک مقام پر تو صاف صاف وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ (اور تم لوگوں کو اسرارِ الٰہی میں سے بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے) سے آدمی کی قلعی کھول دی۔ اور دوسری جگہ اس کو جہول [۵] کا خطاب دیا۔ جب انسان کی لاعلمی کا یہ حال ہے

[۵] چنانچہ فرمایا ہے انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال فابين ان يحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه كان ظلوما جهولا یعنی ہم نے ذمہ داری کو (جو انسان پر ہے) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (اور یہ بوجھ اُن پر لادنا چاہا) تو اُنھوں نے بزبانِ حال اُس کے اٹھانے سے انکار کیا

ہیں کہ وہ غور نہ کرنا بھی ایک بڑی غلطی ہے آدمی کو ایک حد تک غور کرنا ضرور ہے۔ آدمی کو عقل اسی لیئے دی گئی ہے غور کرنے سے ہوگا یہ کہ یہی غور انسان کو خداشناسی کی طرف راہ نمائی کرے گا ہاں لیکن غور کرنے کی ایک حد ہے اور وہ حد یہ ہے کہ اس (خدا) کے ہونے کا اعتراف کیا جائے۔ یہی یہ بات کہ وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اسی کو مولانا کہتے ہیں کہ یہی اختلاف مذاہب کی جڑ ہے۔ مولانا تو

ما عرفناك حق معرفتك — ہم نے تجکو ویسا نہیں پہچانا جیسا تیرے پہچاننے کا حق ہے

اور

العجز عن درك الإدراك إدراك — خدا کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز رہنا ہی ایک طرح کا دریافت کرنا ہے

کی تعلیم ہی کی وجہ سے اسلام کے گرویدہ ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب خدا کے ہونے کا اعتراف ہی ادراکِ بشری کی حد ہے آدمی اس سے زیادہ خدا کو جان ہی نہیں سکتا تو پھر یہ صفات جو خدا کے نِنانوے ناموں سے ظاہر ہوتی ہیں کیوں کر معلوم ہوئیں اسلامی عقیدہ تو یہ ہے اور یہی برحق ہے کہ صفاتِ باری عین ذاتِ باری ہیں یعنی فی وقتٍ من الاوقات ایسا نہیں ہوا کہ خدا ان صفات سے معرّیٰ رہا ہو۔ صفاتِ باری ذاتِ باری کو لازم ہیں اُس سے منفک نہیں ہوسکتیں پس مولانا کا یہ فرمانا کہ خدا کے ہونے کا اعتراف ادراکِ بشری کی حد ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ایسے خدا کے ہونے کا اعتراف جو نِنانوے صفات سے متصف ہے ادراکِ بشری کی حد ہے۔ رہی یہ بات کہ مولانا نے خدا کا ان صفات سے متصف ہونا کیوں کر جانا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے خدا کے ہونے کو جانا یعنی کائناتِ عالم سے وہیں سے اُس کے ان صفات سے متصف ہونے کو بھی جانا یعنی اگر خدا ان صفات سے معرّیٰ فرض کیا جائے تو کارخانۂ عالم بزبانِ حال پکارے کہہ رہا ہے کہ ایسا خدا خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ نہ وہ اتنا بڑا عظیم الشان کارخانہ بایں حسن و خوبی پیدا کرسکتا نہ اُس کو سنبھال سکتا۔ نہ اُس کو اس انتظام سے چلا سکتا ہے ممکن ہے کہ ان خیالات کو دیکھ کر کوئی کہے کہ خدا کا وجود خیالی وجود ہے یعنی ہم نے دل میں فرض کر لیا ہے کہ خدا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ خدا کا وجود خیالی وجود تو تب ہوتا کہ عالم کا وجود خیالی ہوتا۔ مگر عالم کو تو ہم موجود فی الخارج دیکھ رہے ہیں تو ضرور ہے کہ خدا بھی پہلے سے موجود ہے۔ اس پر بھی ایک اعتراض یہ وارد ہوسکتا ہے کہ عالم اور چیز اور خدا اور چیز۔ عالم کے وجود کو خدا کے وجود سے تعلق کیا ہے۔ تو ایسی بات کی مثال ہوئی کہ ہم کسی جگہ سے کوئلہ نکلتا ہوا دیکھیں اور اس کو سونے کے ہونے کی دلیل ٹھہرائیں لیکن یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کوئلے کا ہونا سونے کے ہونے کا مستلزم نہیں اور عالم کا ہونا خدا کے ہونے کا مستلزم ہے۔ اس لیئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا عالمِ اسباب ہے کوئی ادنیٰ تغیر بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ خیر دوسرے اعتراض سے قطع نظر یہ تغیر عالم کا عدم سے وجود میں آنا۔ اس کا محرک اس کا باعث اس کا سبب کون ہے [illegible] مولانا نے ہمارا طرف نظر دوڑائی مگر ان کو کہیں دکھائی دیا نہیں اور [illegible] سے [illegible] نے ہماری دستگیری کی اور ہم نے

سمجھا کہ یہ ہمارے فہم کا قصور ہے۔ علم حاصل کرنے کے ذرائع جو ہم کو حاصل ہیں یعنی حواسِ خمسہ ہمارے لیئے عینک ہیں مگر دھندلی مثلاً حواسِ خمسہ میں سے ایک قوتِ باصرہ کو لو کہ چشم دید بڑا قوی ذریعہ یقین کا ہے۔ مگر قوتِ باصرہ میں یہ نقص بھی ہے کہ۔ مثلاً گھڑی میں گھنٹے کی سوئی حرکت تو کرتی ہے ہم کو حرکت سوجھ نہیں پڑتی۔ اسی طرح سایہ حرکت تو کرتا ہے ہم کو حرکت کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ تو ہم نے مثال کے طور پر ایک بات کہی نظر میں اور کئی نقص ہیں جو علم المناظر والمرایا کی کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گھڑی میں گھنٹے کی سوئی یا سایے کی حرکت سوجھ نہ پڑنے سے سوئی اور سایے کو ساکن مانو گے یا قصورِ نظر کے قائل ہو گے۔ کارخانۂ عالم کی ساخت اور اُس کا انتظام متقاضی ہیں کہ اُس کا موجد اُس کا ناظم ایسا اور ایسا ہو۔ اور ایسا اور ایسا ہونا اِس بات کا مستلزم ہے کہ وہ ہمارے ناقص حواس کی گرفت میں نہ آسکے مگر پھر بھی ہم کو اُس کا ہونا ماننا پڑے گا۔ اور وہ ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ان منطقی دلائل کے سوا ہمارے مولنا وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت میں اکثر عام لوگوں کے سمجھانے کے لیئے فرمایا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں اتفاق سے ہاتھی کا گزر ہوا۔ تو سارا گاؤں ہاتھی کے دیکھنے کو نکل پڑا گاؤں میں کچھ اندھے بھی تھے۔ انھوں نے بھی ہاتھی کا آنا سنا اور دیکھنے کو چل دوڑے آنکھیں نہیں کہ سوجھے ہاتھی کو دیکھیں فیل بان نے ترس کھا کر ٹٹول لینے دیا۔ گھر پلٹ کر آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیا دیکھا۔ کسی نے سونڈ ٹٹولی تھی کسی نے کان کسی نے پیٹ۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے دُم۔ جس نے جتنا ٹٹولا اُسی کو ہاتھی سمجھا تھا وہی بیان کر دیا ہر ایک اندھا اپنی جگہ سچا تھا وہ ہاتھی کے مختلف حلیئے بیان کرتے تھے مگر ہاتھی کے ہونے پر متفق تھے۔ یہی حال خدا کا ہے کہ وہ بشری حواس کی گرفت میں آنے کی چیز نہیں مگر آدمی ہے کہ ان ہی ناقص حواس سے اُس کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ پس ع۔ ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد۔ کا مصداق ہے۔ یہ مشرک اور بت پرست بھی خدا کے حلیئے میں غلطی کرتے ہیں ورنہ منکرِ خدا یہ بھی نہیں۔ ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ دہریے خدا کو نہیں مانتے لیکن مولنا کے نزدیک اگر مشرک خاص چیزوں کو شریکِ خدائی کرتے ہیں تو بت پرست خاص چیزوں کو خدا مانتے ہیں۔ اور دہریے ساری خدائی کو۔ حافظ شیرازی نے ٹھیک فرمایا ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

بات یہ ہے کہ خدا کے بارے میں لوگوں کی رایوں کے اختلاف کا اصلی سبب دنیا کا عالمِ اسباب ہونا اور انسان کے ذرائع علم کا نقص ہے۔ انسان بدو شعور سے زندگی بھر دیکھتا ہے کہ ہر ایک تغیّر کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور پھر سبب بھی خود ایک تغیّر ہے اِس کا سبب اور پھر اُس کا سبب وھلم جرّاً۔ مثلاً سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ کی طرف مستحیل ہوتا ہے۔ ہوا بھاپ کو اُبھار کر اُوپر لے جاتی ہے اِس لیئے کہ بھاپ ہوتی ہے ہلکی اور ہوا ہوتی ہے بھاری۔ اور ہلکی چیز کا خاصہ ہے کہ وہ بھاری چیز کے اوپر رہتی ہے۔ جیسے تیل اور پانی۔ پھر یہ بھاپ جو ہم کو بادل کی شکل میں دکھائی دیتی ہے اوپر کی سردی پاکر مینھ بن کر برستی ہے۔ پانی کی بھاپ۔ بھاپ کا پانی یہ آواگون (باہمی ردوبدل) ہمیشہ ہوتا رہتا ہے

اور اس کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ دیگچی میں پانی گرم کیا جائے اُس سے بھاپ پیدا ہو گی۔ کچھ تو ہوا ہو کر اُڑ جائے گی اور کچھ چپنی میں لگ کر بوندیں بن بن کر دیگچی میں ٹپکے گی۔ اس میں پانی کے بھاپ ہونے کا سبب ہے گرمی۔ پھر بھاپ کے پانی ہونے کا سبب سردی۔ مگر یہ دو تغیّر سلسلۂ تغیّرات کی صرف تین کڑیاں ہیں سلسلے کے اوپر کی اور بیچ کی اور نیچے کی کڑیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ورنہ آفتاب کا ہونا اُس کی گرمی اور پانی اور ہوا اور گرمی سردی کی مختلف تاثیرات۔ یہ سب تغیرات سبب کے محتاج ہیں غرض اس سلسلے کی کڑیوں کا کھوج لگانے جایئے۔ آخر کار عاجز آکر ایک سبب ایسا ماننا پڑے گا کہ اُس کو سبب درکار نہیں وہ خود مسبب الاسباب یعنی خدا ہے۔ یہاں تک تو کسی کو اختلاف نہیں اور نہ کوئی اختلاف کر سکتا ہے۔ اختلاف ہے تعیینِ سبب میں اس وجہ سے کہ آدمی ادراکِ بشری کی رسائی تک تعیینِ سبب کر سکتا ہے اور یہاں انتظامِ عالم ایسا سبب چاہتا ہے جس کی مثال مرئیات و مشاہداتِ عالم میں موجود نہیں۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ مثال کا موجود ہونا یگانگی اور یکتائی یعنی وحدانیت کے خلاف اور یکتائی موجدِ عالم یعنی خدا ہونے کے لئے صفتِ لازمی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا کے تمام خیالات کا لبِّ لباب یہ ہے کہ انسان ایک مذہبی مخلوق ہے یعنی مذہب کا تقاضا خود اُس کی طبیعت سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں آکر سب سے پہلی بات جو وہ سیکھتا ہے یہ ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور زندگی بھر اس کو ہر وقت اس کی تصدیق ہوتی رہتی ہے کہ یہاں پتّا تک بھی بے ہلائے نہیں ہلتا۔ ہر چیز کے وجود پر حالات کے وقوع کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہوتا ہے اور کچھ ایسا جال اسباب کا پھیلا ہوا ہے کہ ہر سبب بجائے خود محتاجِ سبب ہے۔ مینہ کا سبب بادل، بادل کا بخارات۔ بخارات کا گرمیِ آفتاب۔ اسی طرح ہر سلسلۂ اسباب عقلاً منتہی ہوتا ہے

وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ　　اور ہر ایک کام (کا دار و مدار) آخر اُسی پر جاکر ٹھیرتا ہے۔

ایک ایسے سبب کی طرف کہ وہ مسبب الاسباب ہے اور اُس کا کوئی سبب نہیں اور اسی کو علیٰ اختلاف الالسنہ کوئی اللہ کہتا ہے کوئی خدا کوئی گاڈ کوئی بھگوان کوئی کچھ کوئی کچھ۔ ؎

ہے مسمّیٰ ذاتِ واحد نام اُس کے مختلف　　گاڈ یا بھگوان اللہ یا خدا کہنے کو ہیں

الغرض مولانا کے نزدیک خداشناسی کا سیدھا رستہ جو عقلِ اسلام نے تعلیم کیا ہے یہ ہے کہ کارخانۂ عالم پر نظر کرکے ادنیٰ تامّل سے ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کارخانے کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہے اور وہ کوئی اُن چیزوں میں سے نہیں ہے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو عقل و دانش کے اعتبار سے اشرف المخلوقات پاتے ہیں لیکن ہم خود اپنی جگہ درماندہ ہیں۔ مجبور ہو کر ہم کو ایسی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے جو ہماری اور مخلوقات کی جنس میں سے نہیں ہے۔ بس خدا کے ہونے کی ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے ہمارے دل کی گواہی۔ ہم نے اپنے دل کی گواہی کو جب جب آزمایا صحیح ثابت ہوئی۔ مثلاً ہم صبح کے وقت مشرق کی طرف روشنی ہوتی دیکھتے ہیں اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ آفتاب نکلنے والا ہے اور اس گواہی کے صحیح ثابت کرنے کے لئے واقع میں بھی آفتاب نکلتا ہے۔ یا مثلاً ہم کو دور سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ دھواں کسی آگ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم موقع پر جاکر دیکھتے ہیں واقع میں آگ پاتے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو مرتے

دیکھا ہے اور ایک شخص خاص کی نسبت ہم حکم لگاتے ہیں کہ یہ بھی مرے گا اور وہ واقع میں مرتا ہے۔ اسی طرح جب ہم ایک بنا ہوا مکان یا ایک چلتی گھڑی دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس مکان کا بنانے والا کوئی معمار اور گھڑی کا بنانے والا کوئی گھڑی ساز ضرور ہے اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقع میں مکان کا تعمیر کرنے والا معمار اور گھڑی کا بنانے والا گھڑی ساز ہی تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دل کی گواہی یا ہماری عقل کا حکم کسی جگہ غلطی نہ کرے اور کرے تو خدا کے بارے میں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مخلوقات عالم کو دیکھ کر جو ہم نے سمجھا ہے کہ ان کا بنانے والا محسوسات میں سے نہیں ہے بلکہ وہ ہستی ہے جس کو ہم چشم سر نہیں دیکھ سکتے۔ اور اسی کو ہم لوگ خدا کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ اور جس طرح ہم نے خدا کی ذات کو پہچانا اسی طرح اس کی صفات کو پہچانا اور جس دلیل سے ہم نے خدا کو مانا اسی دلیل سے ہم نے اس کو ایک جانا

خدا ہاں ولا ایسا شد کہ اللہ تعالیٰ
پہچانا اسے تو نے جیسے دیکھا نہ بھالا

توحید باری تعالیٰ خدا خدا کر کے جب ہمارے مولانا کو معرفت باری تعالیٰ حاصل ہوئی تو جس طرح مولانا نے خدا کو دیکھا نہیں مگر مخلوقات سے خالق کو جانا اسی طرح انتظام دنیا سے اس کی صفات کو پہچانا۔ ازاں جملہ اس کی یکتائی کہ عالم کا سارا صحیفہ قدرت ایک ہی کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہیں دائرے اور کشش اور نقطے اور حرکات اور سکنات اور شوشے اور نوک پلک میں ذرا تفاوت نہیں۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا — اور اگر (قرآن) خدا کے سوا کسی اور کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

یہ تو قرآن کی شان میں مگر صحیفہ قدرت پر بھی منطبق ہے۔ دنیا میں ہزار اقسام کے انتظام ہیں مگر یہ صحیح قوانین ایک ہی منتظم کا بنایا ہوا ہے۔ تمام قاعدوں میں ایک عجیب طرح کا تناسب ہے کہ ایک دوسرے کی تائید کرتا ہے۔

كَالْبُنْيَانِ الْمَرْصُوْصِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا — جیسے سیسہ پلائی ہوئی عمارت کہ اس کا بعض بعض کو مستحکم کرتا ہو۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا — اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو (زمین آسمان) دونوں (کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے۔

کا یہی مطلب ہے اور یہ عقیدہ توحید اسلام کی ایسی خصوصیتوں میں ہے اور اس کی صداقت اور حقانیت کی بڑی مستحکم دلیل ہے اسی کی وجہ سے اسلام نے دوسرے ادیان پر فوقیت حاصل کی ہے

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

اسلام کا سارا زور توحید پر ہے یعنی اس بات پر کہ خدا ایک ہے وحدہ لا شریک لہ۔ اس کی وحدت اس طرح کی وحدت نہیں ہے جیسے کسی صوبے میں ایک لفٹنٹ گورنر یا چیف کمشنر یا کسی ضلع میں ایک کلکٹر یا ایک میر۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ وحدتیں ناقص اور عارضی ہیں۔ اصلی وحدت اس خدائے پاک کی ہے جس کی ذات میں کوئی شریک اور نہ صفات میں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ نہ صرف اس سے نقص توحید ہوتا ہے کہ معاذ اللہ دوسرا خدا مانا جائے۔ بلکہ اس سے کہ معاذ اللہ دوسرا اس کے اختیارات میں دخیل مانا جائے۔ اور اس سے کہ معاذ اللہ دوسرا [illegible]

دنیا کے اس عظیم الشان کارخانے کا ذرہ ذرہ سمندروں کا قطرہ قطرہ درختوں کا پتا پتا خدا کی ہستی کا گواہ اور اس کے وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے کا شاہد عادل ہے

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد (وثنا) کے ساتھ اس کی تسبیح (وتقدیس) کر رہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح (وتقدیس) کو نہیں سمجھتے

ہر گیاہے کہ از زمیں روید — وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اس لئے کہ کوئی چیز بڑی ہو یا چھوٹی زمین میں ہو یا آسمان میں خشکی میں ہو یا تری میں جان دار ہو یا بے جان اپنی خوبی اور عمدگی کے ساتھ کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں آپ سے آپ نہیں بن گئی ضرور کسی کے بنائے سے بنی ہے غرض مولانا نے جب اس بنانے والے کی جستجو کی اور زمین سے لے کر آسمان تک چھان مارا تو کسی کو اس لائق نہ پایا جس کو دیکھا عاجز جس کو ٹٹولا درماندہ۔ روئے زمین پر انسان ہی سب میں پیش پیش تھا کہ عقل رکھتا تھا تو ایاز قدر خود بشناس سے اس کا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ناچار آسمان پر نظر دوڑانی چاہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ[51] یاد کر کے مولانا خاموش بیٹھ گئے اور سمجھے کہ جس کی جستجو ہے وہ چشم سر سے دیکھنے کی چیز نہیں بنی اسرائیل[52] نے شوخ چشمی کی تو فاخذتهم الصاعقة کی سزا پائی موسیٰ علیہ السلام نے غلبہ شوق میں آکر حوصلہ کیا تو خر موسیٰ صعقا[53] سے

---

[51] حضرت ابراہیم کا یہ قصہ قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے واذ قال ابراهيم لابيه سے ... وما انا من المشركين تک (الانعام پارہ (۷))۔
ترجمہ:- اور (اے پیغمبر اس) وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں اور جس طرح ابراہیم کے دل میں ہم نے یہ خیال پیدا کیا اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین کا انتظام دکھانے لگے تاکہ وہ (کامل) یقین کرنے والوں میں ہو جائیں تو جب اُن پر رات چھا گئی اُن کو ایک ستارہ نظر آیا (اُس کو دیکھ کر) کہنے لگے کہ یہی میرا پروردگار ہے پھر جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ غروب ہو جانے والی چیزوں کو تو میں پسند نہیں کرتا (کہ خدا مان لوں) پھر چاند کو دیکھا کہ بڑا چمکتا ہے تو کہنے لگے یہی میرا پروردگار ہے پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو بولے اگر مجھ کو میرا پروردگار راہ راست نہیں دکھائے گا تو بے شک میں (بھی) گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ بڑا چمکتا ہے تو کہنے لگے یہی میرا پروردگار ہے کہ یہ (سب سے) بڑا بھی ہے پھر جب (وہ بھی) غروب ہو گیا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر بولے کہ بھائیو جن چیزوں کو تم شریک (خدا) مانتے ہو میں تو ان سے بے تعلق (محض) ہوں میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رخ اسی (ذات پاک) کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں ۱۲

[52] بنی اسرائیل کی اس شوخ چشمی اور شرارت کا قصہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مختلف پیرایوں کے ساتھ مذکور ہوا ہے ازانجملہ سورۂ بقرہ کی ایک یہ آیت ہے واذ قلتم یموسیٰ لن نؤمن لك حتى نرى الله جهرة فاخذتكم الصاعقة وانتم تنظرون ثم بعثنكم من بعد موتكم لعلكم تشكرون۔ یعنی اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے (یعنی تمہارے بڑوں نے) موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے ہیں نہیں (کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہے) اس پر تم کو بجلی نے آدبوچا اور تم دیکھا کئے پھر تمہارے مرے پیچھے ہم نے تم کو جلا اٹھایا کہ شاید تم شکر کرو ۱۲

[53] حضرت موسیٰ کا یہ واقعہ قرآن کی ان آیتوں میں مفصلاً مذکور ہے وواعدنا موسیٰ ثلثين ليلة سے وانا اول المؤمنين تک (سورۂ اعراف پارہ (۹))
ترجمہ:- اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے دس (راتیں) اور بڑھا کر ان (تیس) کو پورا (چالیس) کر دیا اور یوں پروردگار کا موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا ہو گیا۔ اور موسیٰ (کوہ طور پر جاتے وقت) اپنے بھائی ہارون سے کہنے لگے کہ میری قوم (کے لوگوں) میں میری نیابت (بقیہ صفحہ آئندہ)

شرمندگی اُٹھائی - پس ان باتوں سے مولانا کو معلوم ہوا کہ خدا ہمارے حواس ظاہر کی گرفت سے منزہ اور بالاتر ہے - اور یہ ہمارے حواس کا قصور ہے ؂

اے ز دہ برتر از گمان خیمہ کبریائے را … کے بتو دست میرسد عقل شکستہ پائے را

ہاں چشم دل سے دیکھا جائے تو دنیا آئینہ خانہ ہے - اور در و دیوار خدا کے نور سے پڑے جگمگا رہے ہیں مولانا فرماتے ہیں کہ آدمی کو شروع ہی سے خدا کے بارے میں یہ غلطی واقع ہوئی ہے اور اب تک بھی اکثر خدا کے بندے اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ اُنھوں نے خدا کو اپنے حواس ظاہر کے ذریعے سے معلوم کرنا چاہا اور جب ان کو اس ارادے میں کامیابی نہ ہوئی تو من مانا خدا فرض کیا - اور اُس کو اپنے اوہام باطلہ کا تختۂ مشق بنایا یعنی ذلیل سے ذلیل اور رذیل سے رذیل مخلوقات کو بھی پورا یا ادھورا خدا بنانے یا ماننے میں تامل نہیں کیا - پورا تو پورا ادھورے کے یہ معنی کہ اپنے زعم میں خدائی کے اختیار خدا سے چھین کر ناا ہلوں کے حوالے کیے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خدا کو منصب خدائی سے معزول کر دیا - جس جس طرح پر خدا کے بندوں نے خدا کی جناب میں گستاخیاں اور بے ادبیاں کی ہیں اور کر رہے ہیں ناگفتہ بہ ہیں - کوئی تو اُس کی ذات پر حملے کرتا ہے کہ ایک نہیں دو خدا ہیں ایک پیدا کرتا دوسرا مارتا ہے - ایک خالق خیر ہے اور دوسرا خالق شر - کوئی کہتا ہے تین خدا ہیں اور پھر وہ ایک بھی ہے کوئی مانتا ہے کہ ہر چیز بجائے خود خدا ہے - کسی کا خیال ہے کہ خدا تو ہے مگر وہ اسباب کا سلسلہ قائم کر کے آپ انتظام دنیا سے دستکش ہو بیٹھا ہے ان کے نزدیک دنیا ایک طرح کی گھڑی ہے اور خدا گھڑی ساز - جس نے اس کو بنا کر کوک دیا ہے اور گھڑی پڑی چل رہی ہے - ذات تو ذات خدا کی صفات میں اس سے بڑھ کر بیہودگی کی جاتی ہے - غرض بندوں نے اتنے خدا بنا ڈالے کہ ایک خدا کے حصے میں پورا ایک بندہ بھی نہیں آتا - اور یہ نہ سمجھے کہ خدائے واحد کے سوائے کوئی اور خدا بھی ہوتا تو دو باسن ایک جگہ رکھے ہوئے کھٹکھٹا اُٹھتے ہیں - ایسا تو کیا ہے کہ دو یا زیادہ خداؤں میں اختلاف نہ ہو اور اختلاف ہو تو دنیا ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتی -

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا — اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے -

دو بادشاہ آپس میں لڑتے ہیں تو ملک کے ملک خاک سیاہ ہو جاتے ہیں اور خداؤں کی لڑائی تو خدا کی پناہ پس دنیا کا ایک اسلوب پر چلا جانا صاف اس بات کی دلیل ہے کہ تمام عالم میں ایک خدا کی حکومت ہے - اقوام روزگار میں دوسری

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کرتے رہنا اور (ان میں) میل جول (قائم) رکھنا اور مفسدوں کے رستے نہ چلنا اور جب موسٰی ہمارے وعدے کے مطابق (کوہ طور پر) حاضر ہوئے اور ان کا پروردگار اُن سے ہم کلام ہوا تو (موسٰی نے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار تو (اپنے تئیں) مجھے دکھا کہ میں تیری طرف ایک نظر دیکھوں (خدا نے) فرمایا تم ہم کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے مگر ہاں (ایسا ہی شوق ہے تو سامنے اس) پہاڑ پر نظر کرو (کہ ہم اس پر جلوہ فرما ہوں گے) پس اگر (یہ پہاڑ) اپنی جگہ ٹھیرا رہا تو (جاننا کہ تم ہم کو (بھی) دیکھ سکو گے پھر جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ فرما ہوا تو اُس کو چکنا چور کر دیا اور موسٰی غش کھا کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو بول اُٹھے کہ الٰہی اے میرے پروردگار تیری ذات پاک ہے میں (نے جو دیکھنے کی بے جا درخواست کی تھی تیری جناب میں (اُس سے) توبہ کرتا ہوں اور (تجھ پر) ایمان لانے والوں میں پہلا ایمان لانے والا میں ہوں [۱۳]

قومیں خدا کے بارے میں جیسے کچھ خیالات رکھتی ہوں وہ جانیں اور اُن کی عقلیں۔ مگر مسلمانوں کے ہاں جیسی فلاطر توحید تھی ویسی ہی اُنھوں نے عملاً اُس کو مکدر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک رزق ہی کا معاملہ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ فرماتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا — زمین میں جس قدر جان دار چیزیں ہیں سب کا رزق اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَآءُ وَيَقْدِرُ — جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم۔

تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان دار کے رزق کی تحریری ذمہ داری کر لی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور وثیقہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر سوال ہو سکتا ہے کہ کتنے دل رزق کی طرف سے مطمئن ہیں اس واسطے کہ خدا کا وعدہ ہے شاید لاکھوں میں ایسا ایک کا بھی دل نہیں۔ ہاں اگر ہم میں کوئی نوکری پیشہ ہے وہ رزق کی طرف سے مطمئن ہے۔ اس واسطے کہ اس کی نوکری لگی ہے۔ یا اس واسطے کہ اس نے امتحان پاس کر کے نوکری کے لیے استحقاق ثابت کیا ہے۔ اور کوئی حاکم اس کو زبان دے چکا ہے کہ جب کوئی جگہ خالی ہوگی میں تمھاری پرورش کروں گا۔ یا اس کے پاس دوسرے وسائل ہیں جو اس کو کبھی نہ کبھی نوکری کرا چھوڑیں گے۔ اگر تجارت پیشہ ہے وہ مطمئن ہے کہ اُس کی تجارت چل رہی ہے اور فائدے کی توقع ہے۔ اگر کاشتکار ہے وہ پیداوار کے بھروسے پر اُدھار کھا رہا ہے۔ غرض ہر شخص کو خدا کے وعدے سے قطع نظر کر کے کچھ نہ کچھ وجہ تسلی ضرور ہے۔ بات وہی ہوتی ہے مگر ذرا سا سمجھ کا پھیر آدمی کو خدا سے بے تعلق کر دیتا ہے یعنی ایمان جاتا رہتا ہے۔ نوکری کرو۔ تجارت کرو۔ کاشتکاری کرو جو تمھارے جی میں آئے کرو مگر یہ سمجھو کہ اصل میں رازق وہ ہے وہ چاہے تو بدون ان حیلوں کے بھی دے ؎

انچہ نصیب است بہم مے رسد　　　　ورنہ ستانی بستم مے رسد

خدا چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور وہ نہ چاہے تو ایک نہیں ہزار حیلے کریں پھر بھوکے کے بھوکے ؎

گر زمیں را بآسماں دوزی　　　　نہ دہندت زیادہ از روزی

مگر عادت الٰہی چونکہ یوں ہی ہے کہ ہم کو معاش کے لیے کچھ نہ کچھ حیلہ کرنا ضرور ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم — بلاشبہہ اللہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔

کا خیال ٹھیک رکھنا ہی تو کام رکھتا ہے۔ ورنہ مومن اور کافر بلکہ انسان اور حیوان میں کچھ بھی فرق نہیں۔ اگر ہم تدبیر اور اسباب ظاہر پر اعتماد کلی کر بیٹھیں جیسا کہ افسوس ہے کہ ہم کر بیٹھے ہیں تو اس اعتماد کے سوائے اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے زعم میں خدا سے اُس کے اختیارات چھین کر اُن چیزوں کو دیدیے ہیں جو اُن اختیارات کے اہل نہیں۔ اور ہم نہیں سمجھتے کہ یہ شرک نہیں تو کیا ہے۔ بت پرستی نہیں تو کیا ہے اور کفر نہیں تو کیا ہے مولنا فرماتے ہیں کہ اگر اس بارے میں میری رائے سخت ہے اور تشدد دبے جا کرتا ہوں تو از برائے خدا مجھ کو ان مشائخ کا معاملہ سمجھاؤ۔ اختلافات سنّی و شیعہ

حنفی شافعی وغیرہ وغیرہ سے قطع نظر کرو تو مسلمانوں کے ۲ دو بڑے گروہ ہیں ایک بے چارے ہم لوگ کلمہ گو ارباب ظاہر جو
پیری و مریدی کے سلسلے میں نہیں ہیں ہماری موٹی سمجھ تو یہ ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی معاش و معاد کی اصلاح کے لئے
جو جو ہدایتیں صادر کرنی منظور تھیں وقتاً فوقتاً پیغمبر صاحب پر وحی کے ذریعے نازل ہوتی رہیں۔ جب جب وحی نازل ہوتی
پیغمبر صاحب کمال احتیاط و دیانت کے ساتھ اُس کو قلم بند کراتے جاتے یہاں تک کہ قرآن جیسا اب موجود ہے مدوّن ہو گیا۔
اور خدا نے فرما دیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ جس کے یہ معنی ہوئے کہ فرمانِ شاہنشاہی کو ختم کر کے اُس کے
آخر میں مُہر لگا دی کہ آئندہ کوئی شخص اُس میں کمی و بیشی نہ کر سکے۔ چنانچہ تیرہ سو برس گزر گئے آج تک ایک نقطے کا
فرق تو پڑا نہیں۔ اور پڑے گا بھی نہیں۔ کیوں کہ خدا نے اُس کی حفاظت کا وعدہ کر لیا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ
اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ یہ اُسی وعدے کا ایفا نہیں تو کیا ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں اس کے زبانی یاد رکھنے
کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ ناسخین اور مترجمین کی بھی کیا چل سکتی ہے کہ اس میں تصرف کریں۔ اگر روئے زمین کے سارے
قرآن معدوم ہو جائیں تو ہو جائے دو مسلمانوں کے دلوں میں اباً عن جدٍ اس کا ایک ایک حرف کندہ ہوتا چلا آتا ہے
جس کو نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی دھو سکتا ہے۔ ایک حافظ مرنے نہیں پاتا کہ ایسے ایسے پانچ اور برس کے برس رمضان
میں تراویح کی امامت کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامان ہی ایسا آ کر بندھا ہے کہ یہ آواز الی انقراض دنیا پست ہونے
والی نہیں ہے۔ خیر یہ تو قرآن اصل دین ہے جیسے تنۂ درخت۔ اب رہی حدیث فقہ اور دوسرے علوم دین۔ یہ سب فروعات
ہیں۔ قرآن لا یعنی قانون۔ حدیث پراسیڈیور یعنی ضابطہ کارروائی۔ فقہ۔ نظائر۔ اور اسی طرح دوسرے علوم دین کے
لئے بھی کوئی مابہ المماثلت پیدا کر لیا جا سکتا ہے۔ لا۔ اور پراسیڈیور تو تبدیل پزیر نہیں مگر نظائر کا بدلنا موقوف ہے لوگوں کی
ضرورتوں کے تجدّد پر اور تعجب ہے کہ جب کثرت سے ضرورتوں کے تجدد کا زمانہ آیا نظائر کا سلسلہ لوگوں نے موقوف کر دیا۔
مولانا فرماتے ہیں ابھی دو باتیں اور بھی ہیں کہ پیغمبر صاحب پر جو وحی نازل ہوئی آپ نے بے کم و کاست ہو بہو اُس کو لکھوا دیا۔
سُنا دیا مشتہر کر دیا فرشتے نے کہا کان میں اُنھوں نے کوٹھے پر چڑھ کر پکار دیا۔ دُنیا جہان میں اس کی منادی کر دی۔
ایسی کہ وہی بات ہر ہر مسلمان کے مُونہ میں تھی اور مونہ میں ہے۔ اور قیامت تک مونہ میں رہے گی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب
مامور تھے اور ممکن نہ تھا کہ تبلیغ وحی نہ کریں وہ خود فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا
قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا
قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ
دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ

اے پیغمبر لوگوں کو سنا دو کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کہہ دو کہ میں تمھارے بُرے بھلے کا مالک نہیں۔ کہہ دو کہ مجھ کو اللہ کے (عذاب سے) ہرگز کوئی پناہ نہیں دے گا۔ اور نہ مجکو اُس کے سوائے کوئی ٹھکانا۔ ہاں اس کے پیام پونہچا دینے میں بری ہو سکتا ہوں (ورنہ نہیں)

پیغمبر صاحب کے اس کہنے کو دیکھو کہ میں تم کو نفع و نقصان کچھ بھی نہیں پونہچا سکتا ہمارے زمانے کے مشائخ تو ایسے بنتے ہیں
کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب ان ہی کے ایما سے ہو رہا ہے۔ اُن کے مرید اور معتقد اُن کی تعظیم خلاف شرع کرتے ہیں اور وہ اس

کو جائز رکھتے ہیں۔ اِن سے امیدیں لگائی جاتی ہیں اور وہ کبھی اپنا عجز ظاہر نہیں فرماتے۔ اور دوسری بات ہے عموم اسلام وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ کہ دعوتِ اسلام شامل تھی مرد اور عورت امیر و غریب شہری اور دیہاتی مقیم اور مسافر عالم و جاہل بلا استثنائے احدے سب پر اب اِن سب باتوں کو جمع کرو یعنی تمام وحی کا قرآن میں مدّون ہونا پیغمبر صاحب کا وحی کو اگرچہ وہ ان کی شان کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اخفا نہ کرسکنا۔ اسلام کا عام ہونا نتیجہ کیا نکلے گا کہ مجمع مسلمان بطور ایک کلاس کے تھے اور پیغمبر صاحب اُن کے معلم۔ کہ وہ ساری کلاس کو ایک ہی کتاب اور ایک ہی سبق پڑھاتے تھے تو پھر مشائخوں نے بلا تشبیہ فری میسنوں کی طرح یہ اپنا خاص گروہ کیا بنا رکھا ہے کہ ایک تعلیم ہے سینہ بسینہ اور وہ راز ہے درمیان پیر و مرید کے۔ اگر یہ تعلیم وہی تعلیم ہے جو قرآن و حدیث و فقہ میں ہے تو اس کا اخفا کیا اور اگر اس کے خلاف یا مغایر ہے تو بڑی مشکل پیش آئے گی اور کچھ تاویل نہ کرتے بن پڑے گی اس آیت کی۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ

اے رسول جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اترا ہے سب پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے حق رسالۃ نہ ادا کیا۔

کیا کوئی تعلیم ایسی بھی تھی کہ پیغمبر صاحب نے اپنے عزیزوں میں سے کسی کو یا اپنے حواریوں میں سے کسی کو اُس کے لئے خاص کیا تھا۔ ہم کو تو اس کی کوئی سند ملی نہیں۔ اور عقل بھی اس سے ابا کرتی ہے۔ معلوم ہے کہ بڑے بڑے بزرگان دین طائفہ علیہ صوفیہ میں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجکو ان کے سیکرٹ (راز) میں دخل نہیں۔ اور ایک مجکو کیا دخل نہیں لاکھوں کروڑوں مسلمان میری طرح اس نعمت سے اگر ہو محروم ہیں اور چونکہ اوائل کار میں اشتباہات واقع ہوگئے کبھی ارادہ بھی نہیں ہوا کہ اس راز کو معلوم کیجیے۔ اس خدشے کے سوا جو اوپر بیان ہوا مولانا کو دو باتیں اور بھی کھٹکتی ہیں۔ ایک تو پیروں کی تعظیم میں اس قدر افراط کردی ہے کہ اُس کو ایک طرح کی پرستش کہا جاسکتا ہے فنا فی الشیخ اور تصورِ شیخ افراط فی التعظیم نہیں تو کیا ہے اس سے بہت کم درجے کی تعظیم صحابہ پیغمبر صاحب کی کرنی چاہتے تھے اور پیغمبر صاحب اُس کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے کہ کسی بندے کی تعظیم بڑھاتے بڑھاتے لوگ اُس کو خدا اور خدا کا فرزند ماننے لگیں اور اُس کی قبر کی پرستش نہ کرنے لگیں۔

اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ

اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

اور نہیں تو سدِ باب فتنہ متقاضی ہے کہ یہ شیوہ ترک کیا جائے۔ ظنوا بالمومنین خیراً۔ ہم خواص مسلمانوں کی نسبت بدگمانی نہیں کرتے۔ مگر وہ یہ تو فرمائیں کہ عوام مسلمان کیوں کر محترز رہ سکتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی جو لوگ سمجھدار ہیں بت پرستی کو برا سمجھتے اور تاویل کرتے ہیں کہ بت صرف آثار اور علامات ہیں یاد دہانی اور خیال جمانے کے لئے ممکن ہے کہ خاص خاص آدمیوں کا ایسا ہی خیال ہو مگر عوام میں اتنی بلند پروازی اور ایسا انتقالِ ذہن کیوں ہونے لگا۔ وہ کیا سمجھیں کہ خواص جو اکثر متبوع عوام ہوتے ہیں کس غرض سے بتوں کی تعظیم کرتے ہیں یوں بت پرستی ایسی جڑ پکڑ گئی کہ کسی کے اکھاڑے نہ اکھڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے۔

وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ

مجکو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ اے پروردگار ان

إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ — کے سبب سے بہت لوگ گمراہ ہوگئے۔

پس بتوں کی شکایت اُس وقت بھی تھی اب بھی ہو اور جب سمجھنے والوں کی سمجھ پر پتھر پڑیں تو جب تک دُنیا رہے گی یہ شکایت بھی رہے گی۔ صرف پتھر یا سونے یا چاندی پیتل کی مورتوں کا نام بت نہیں۔ کوئی چیز ماسوی اللہ جس کی ایسی تعظیم کی جائے جو خدا کے ساتھ مختص ہو گو وہ کوئی فرشتہ یا کوئی پیغمبر یا اُستاد یا شیخ یا پیر ہی کیوں نہ ہو اُس کو بھی مولانا بت کہتے ہیں وہ اپنی ذات سے بت نہیں ہو مگر جو اُس کی خدا کی سی تعظیم کرے جو خدا کی طرح اُس کو حاجت روا سمجھے اُس کا وہی بت ہی اگرچہ مولانا کو لوگوں کے احتساب کا کوئی حق نہیں۔ مگر ظاہر حال کیا بتا رہا ہی۔ یہی بتا رہا ہی کہ جو حاجتیں انسان کو لاحق ہوتی ہیں اِن سب کو اُن ہی زندہ یا مردہ فقیروں کے حضور میں پیش کیا جاتا ہی پیش کرنے والوں کے دل میں جو کچھ ہو مگر دیکھنے والا یہی سمجھتا ہی کہ اُن کو حاجت روا نہ سمجھتے تو حاجت لے کر کیوں آتے۔ بعینہٖ دُنیا کے حاکموں کی سی مثال ہی کہ گنوار سے گنوار بھی حاکم اور اُس کے اہل کار پیشی میں فرق کرتا ہی۔ خوب جانتا ہی کہ اہل کار حاکم نہیں اس پر بھی رشوت سے خوشامد سے خدمت سے حاضر باشی سے اہل کار کو رضامند کرنا چاہتا ہی اور اُس کو یقین ہی کہ وہ اہل کار اُس کی کار برآری کرسکتا یا کرا سکتا ہی اگر ایسا اور اتنا خیال بھی خدا کے بارے میں ہو تو مولانا اُس کو بت پرستی کہیں گے۔ خدا حاکمانِ دُنیا کی طرح غافل نہیں بے خبر نہیں۔

لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ — خدا اُونگھتا اور سوتا نہیں

يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ — وہ پناہ دیتا ہی اور کوئی اُس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا

اسلام کے احکام پر ایک اجمالی نظر ڈالئے کہ مسجدیں سادہ نہ اُن میں کوئی تصویر نہ مورت بلکہ زیب و زینت اور نقش و نگار بھی ایجاد مابعد ہی۔ اور دیواروں پر جو کلمہ یا درود یا آیاتِ قرآنی لکھ دیا کرتے ہیں فقہا اِس کو بھی نادرست لکھتے ہیں۔ پھر نماز میں نہ ڈھول ہی نہ ناقوس ہیں نہ گھنٹے ہیں بڑی قرأت وہ بھی لئے نہ ہو گٹکری نہ ہو راگ نہ ہو۔ غرض داخل نماز اور خارج نماز کوئی چیز نہیں کہ صارفِ توجہ ہو۔ یہ ایک شانِ عبادت ہی اور عبادت ایسی ہونی چاہیئے۔ اور ایک شان وہ ہی جو ہم بزرگانِ دین کے مزاروں پر دیکھتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ میں بہت بزرگوں کے عرسوں میں شریک ہوا ہوں تو کیا دیکھا کہ ٹھوس چاندی کے چوبوں پر زربفت کا شامیانہ تنا ہی۔ قبر پر قیمتی اور مکلّف غلاف ہیں۔ تو ٹھو پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ اگر کی بتیاں روشن ہیں۔ بیرونِ گنبد خدام درگاہ مثل چوبدارانِ شاہی صف بستہ کھڑے ہیں۔ مزار شریف کے روبرو مشایخ سرنگوں اور مؤدب بیٹھے ہیں جیسے ارکین سلطنت۔ پائین حلقہ میں رنڈیاں کھڑی مجرا کر رہی ہیں اور کہیں شرع کی زیادہ پابندی ہی تو قوالوں کا طائفہ ہی۔ ایک خوش رو خوش گلو لڑکا غزل گا رہا ہی۔

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں — خلافِ مذہب آناں جمال اِیناں بیں

اتنا۔ اور ٹھمری اور ہولی اور دادرا اور دیس اور بہاگ اور بھیرویں اور سلو جتنے راگ اور راگنیاں ہیں اپنے اپنے وقت پر گائی جا رہی ہیں۔ وجد کی حالت میں کوئی حضرت کھڑے ہو جاتے ہیں تو ساری محفل کو اُن کی تعظیم کے لئے کھڑا رہنا پڑتا ہی۔ اب اِس شان کو اُس سیدھی سادی مہذب باوقار متین شانِ نماز کے ساتھ ملا کر دیکھو اور آپ ہی اپنے دل میں فیصلہ

کرلو۔ یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس کی نسبت پیغمبر صاحب فرما گئے ہیں۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ اَلَا فَزُوْرُوْهَا — میں تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا اور اب اُن کی زیارت کیا کرو کیوں کہ قبروں کی زیارت دُنیا سے بے دلی اور آخرت کی طرف رغبت پیدا کراتی ہی۔

فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ عَنِ الدُّنْيَا وَتُرَغِّبُ فِى الْاٰخِرَةِ

یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس کے اجر و ثواب کی امید کی جاتی ہی؟ یہی وہ زیارتِ قبور ہی جس سے خدا کی عظمت اور بے نیازی، دُنیا کی بے ثباتی انسان کی گو وہ کیسا ہی بندۂ مقرب مقبول کیوں نہ ہو عاجزی اور بے اختیاری کا خیال تازہ ہوتا ہی۔

بدنیا گرکسے پایندہ بودے ابوالقاسم محمد زندہ بودے

یہ تھا وہ فتنہ جو پیغمبر صاحب کو پہلے سے دکھائی دے رہا تھا اور اسی کے انسداد کے لئے فرمایا گئے۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِىْ وَثَنًا يُّعْبَدُ — اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنائیو کہ لوگ اُس کی پرستش کریں۔

اسی کے انسداد کے لئے قبروں کو اونچا کرنے پکّا بنانے کی ممانعت کی تھی۔؟

مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی دُنیا کو اتنا تباہ نہیں کیا جتنا دین کو۔ ہر ایک فرقہ جادۂ استقامت سے منحرف ہوگیا ہی۔ فسادات سب میں ہیں مگر مجکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ اسلام کو کسی فرقے کی خرابی نے اتنا نقصان نہیں پونہچایا جتنا کہ اِس فرقۂ مشائخ کی خرابی نے۔ علماء بھی اِس الزام سے بری نہیں مگر اُنھوں نے اور طرح کی خرابیاں ڈالی ہیں۔ شرائع تو ہمیشہ بدلتی چلی آئی ہیں۔ وہ کچھ بڑی بات نہیں۔ اسلام کا بڑا فخر یہ ہی کہ اُس نے آبِ حیاتِ توحید کو فلٹر (صاف) کرکے اُس میں کسی طرح کی آمیزش نہیں رہنے دی۔ اب دیکھنا یہ ہی کہ فرقۂ مشائخ نے توحید کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انا الحق اور ہمہ اوست وانا العرب بلا عین اور انا احمد بلا میم ؏

احمد کو ہم نے جان رکھا ہی وہی احد مذہب کچھ اور ہوگا کسی بوالفضول کا

من آں وقت کردم خدا را سجود کہ ذات و صفاتِ خدا ہم نبود

یہ اور اس قسم کی بہت آوازیں کہاں سے پیدا ہوئیں۔ اسی فرقۂ مشائخ سے پیشوایانِ مذہب یعنی پیرانِ طریقت کی تعظیم میں اتنی افراط کہ اُس میں اور عبادت میں فرق کرنا مشکل ہی کہاں سے نکلی اِسی فرقۂ مشائخ سے۔ الفاظ کے مداولِ ظاہر کو کس نے بدلا کہ شراب سے مراد ہی شرابِ وحدت۔ ساقی سے شیخ۔ جام سے دل وغیرہ وغیرہ اِسی فرقۂ مشائخ نے۔

غرض غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ مسلمانوں نے عملاً مشرکوں کی کوئی ادا نہ چھوڑی جس کی نقل نہ کی ہو۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ما ہم۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ — اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہی کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں

اس کو ہر شخص اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھ لے اور سمجھ لے معاملہ خدا کے ساتھ ہی۔

غدرت از پیش می رود بابا باخدا و ندِ غیب داں نہ رود

خدا کے بارے میں اسلامی عقیدہ ایسا سیدھا اور صاف ہی کہ اُس سے زیادہ سیدھا اور صاف عقیدہ ہو نہیں سکتا۔

اسلام مخلوقات سے خدا کی ذات و صفات کا پتا چلاتا ہے اور یہی وہ رستہ ہے جسے مُوصِل الی المطلوب کہہ سکتے ہیں مخلوقات سے ہم کو اتنا پتا چلتا ہے کہ کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور سنبھالنے والا کوئی ہے اور وہ کوئی ان چیزوں میں سے نہیں جن کو ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ بس سوائے اس کے ہم خدا کی ذات کے بارے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتے اور عقلِ انسانی کی رسائی یہیں تک ہے۔

پس خدا پر ایمان لانے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کو رہے گا۔ وہ کسی سے نہیں پیدا ہوا اور نہ کوئی اُس سے پیدا ہوا۔ یعنی نہ کوئی اُس کا باپ نہ کوئی اُس کا بیٹا بیٹی۔ کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور سنبھالنے والا وہی ہے۔ اُس کی ذات میں تمام وہ صفاتِ کمال جو اُس کے اسمائے صفاتی سے ظاہر ہوتی ہیں موجود ہیں۔ اور جس طرح اُس کی ذات ازلی ابدی ہے اُس کی صفات بھی ازلی ابدی ہیں۔ کارخانۂ عالم میں جو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے تغیرات ہوتے ہیں وہ اُسی کے علم اور ارادے اور قدرت سے ہوتے ہیں وہ ظاہر اور پوشیدہ سب کچھ جانتا ہے اُس کی کسی صفت میں کسی مخلوق کا ساجھا نہیں وہ اپنی ذات سے اکیلا ہے۔ خدا کے لئے ایک ہونا شرطِ ضروری ہے۔ اگر اُس کی ذات یا صفات میں کوئی اور شریک ہو تو ایسا خدا خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شرکت اگر ہوگی تو خود خدا میں کسی طرح کا ضعف ہوگا جس کی تلافی شرک سے کی جاتی ہے اور ضعف کا نام آیا اور خدائی گئی گزری ہوئی۔

خدایا جہاں بادشاہی تراست — زما خدمت آید خدائی تراست
پناہ بلندی و پستی توئی — ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی
ہمہ آفریدست بالا و پست — توئی آفرینندۂ ہرچہ ہست
توئی برتریں دانش آموز پاک — ز دانش قلم راند بر لوح خاک
چو شد حجت بر خدائی درست — خرد داد بر تو گواہی نخست
خرد را تو روشن بصر کردۂ — چراغ ہدایت تو بر کردۂ
توئی کاسماں را برافراختی — زمیں را گزرگاہ او ساختی
توئی کافریدی ز یک قطرہ آب — گہرہائے روشن تر از آفتاب
تو آوردی از لطف جوہر پدید — بجوہر فروشاں تو دادی کلید
جواہر تو بخشی دل سنگ را — تو بر روئے جوہر کشی زنگ را
نبارد ہوا تا نہ گوئی ببار — زمیں ناورد تا نہ گوئی بیار
جہاں را بدیں خوبی آراستی — بروں ز انکہ یاریگری خواستی
ز گرمی و سردی و از خشک و تر — سرشتی باندازہ در یک دگر
چناں برکشیدی و بستی نگار — کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار

چناں بستی ایں طاق نیلوفری
کہ اندیشہ را نیست زو برتری

مہندس بسے جوید از رازِ شاں
نداند کہ چوں کردی آغازِ شاں

نیاید ز ما جز تفکر گری
وگر خفتنی باز یا خوردنی

زباں تازہ کردن با قرارِ تو
نینگیختن علت از کارِ تو

حسابے کزیں بگزرد گمرہی ست
ز رازِ تو اندیشہ بے آگہی ست

ہر چہ آفریدی و بستی طراز
نیازت نہ اے از ہمہ بے نیاز

چناں آفریدی زمین و زماں
ہماں گردشِ انجم و آسماں

کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند
سر خود بروں ناورد زیں کمند

نبود آفرینش تو بودی خدائے
نباشد ہمہ ہم تو باشی بجائے

نہ خلوت بدی کآفرینش نبود
نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود

ز تنظیم تو بیش تو ہست نیست
اگر باشد و گر نہ باشد یکے ست

نہ پرگندہ تا فراہم شوی
نہ افزودہ نیز تا کم شوی

کواکب تو بربستی افلاک را
بہ مردم تو آراستی خاک را

توئی گوہر آمائے چار آخشیج
مسلسل کن گوہراں در مزیج

حصارِ فلک برکشیدی بلند
درو کردی اندیشہ را شہر بند

خرد تا بد و در نیارد ترا
کہ تابِ خرد بر نتابد ترا

وجودِ تو از حضرتِ تنگ بار
کند پیکِ اندیشہ را سنگسار

خیالِ نظر خالی از راہِ تو
نگردندگی دور درگاہِ تو

سرے کز تو گردد بلندی گرائے
بافگندنِ کس نیفتد ز پائے

کسے را کہ قہرِ تو از سر فگند
بپا مردیِ کس نگردد بلند

ہمہ زیر دستیم و فرماں پذیر
توئی آوری وہ توئی دستگیر

اگر پائے پیل ست و گر پرِّ مور
بہر یک تو دادی ضعیفی و زور

چو نیرو فرستی ز تقدیرِ پاک
ز مورے بہ مارے برآری ہلاک

چو برداری از رہ گزر دود را
خورد پشّہ مغزِ نمرود را

چو در لشکرِ دشمن آری رحیل
بمرغان کشی فیل و اصحابِ فیل

گہ از نطفۂ نیک سنجتے دہی
گہ از استخوانے درختے دہی

گہ آری خلیلے ز بت خانۂ
کنی آشنائے ز بیگانۂ

گوے با چناں گوہرِ خانہ خیز | چو بوطالبے را گنی سنگ ریز
کرا زہرہ آں کہ از بیم تو | کشاید زباں جز بہ تسلیم تو

رسالت کیا شے ہے اور رسولوں کے تشریف لانے کی ضرورت

مولانا فرماتے ہیں کہ رسالت بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کو خدا نے اپنی ذات وصفات کی طرح بنی آدم سے اس قدر مخفی رکھا ہے کہ عقل کے سوا کسی دوسری چیز کو اس میں دخل نہیں۔ کیوں کہ رسالت کا تعلق بھی خدا کی صفات میں جا کر منتہی ہوتا ہے۔ اور جس عقل سے خدا کی صفات پہچانی جاتی ہیں اسی عقل سے رسالت کی تصدیق ہوتی ہے پس خدا کی صفات اور اس کی ذات کی طرح رسالت کی حقیقت کو بھی عقل کی روشنی سے دیکھنا چاہیئے جتنا بھی دیکھا جا سکے جس طرح مخلوقات کو دیکھ کر مولانا نے خالق کو ڈھونڈ نکالا جو صرف ہماری کوتاہ نظری کی وجہ سے مخفی تھا اسی طرح مولانا نے بیرونی علامات اور امارت سے پیغمبروں کو پہچان لیا کہ سچے پیغمبر ہیں امارات اور علامات سے اصل چیز کی شناخت کی طرف ذہن کا منتقل ہونا بھی عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مولانا نے فطرت کو اصلی ثبوت سمجھا اور امارات اور علامات کو ثبوتِ موید۔ پھر ثبوت کا قوی یا ضعیف ہونا موقوف ہے مویدات کی کثرت اور قلت پر۔ رسالت کے ثبوتِ موید تو بہت کچھ ہیں لیکن مولانا کے نزدیک تمام ثبوتوں سے قوی تر اور ضروری تر ثبوت فطرتی ہے اور شاید یہ اکیلا پیغمبروں کی رسالت کے ثابت کرنے کے لئے بس کرتا ہے، اس ثبوت سے مولانا کی مراد ہے پیغمبروں کی تعلیم وتلقین کہ انھوں نے کس رستے پر امت کو چلانا چاہا۔ ہم یہ بات آگے چل کر دکھلائیں گے۔ یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ پیغمبروں کے تشریف لانے یا ان کے مبعوث ہونے کی ضرورت کیوں درپیش ہوئی۔

چوں کہ انسان میں نیک و بد کا شعور بھی فطری ہے یعنی جس چیز سے اس کو ایذا ہوئی آدمی نے اس کو بالطبع اپنے حق میں اور ہمدردی کے قاعدے سے دوسروں کے حق میں بھی برا سمجھا۔ اس نیک و بد کو نیک و بد کہئے یا حسن وقبح پس سیاست جو امن کے قائم رکھنے کے لئے درکار تھی افعال کے حسن وقبح کے فطری احساس سے پوری ہو گئی دنیا میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی امن دیکھنے میں آتا ہے اس کا اکثر حصہ ہمدردی اور احساسِ حسن وقبح افعال کا طفیل ہے توضیح مطلب کے لئے ذیل کی چند سطریں غالباً بالکل کافی ہوں گی۔

آدمی ایک خاص طرح کا مخلوق ہے۔ کثیر العلایق۔ اس کی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ آرایش نہ بھی سہی زندگی کی سیدھی سادی ضرورتیں اپنے بہت سے ہم جنسوں کی مدد کے بغیر بہم نہیں پہنچا سکتا۔ ایک ظریف کا مقولہ ہے کہ جینا تو جینا مرنا بھی بے دوسروں کی مدد کے نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لئے آدمی تھوڑے تھوڑے بہت بہت جمع ہو کر قصبوں اور شہروں میں بستے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور کرتے ہیں۔ موچی جوتا بناتا جولاہا کپڑا بنتا۔ درزی سیتا اور اسی طرح ہر یکے را بہر کارے ساختند۔ جو جس کام میں لگا ہے ابنائے جنس کی کوئی نہ کوئی خدمت کر رہا ہے اور اس اعتبار سے ہر فردِ بشر خادم بھی ہے اور مخدوم بھی ہے۔ مگر چوں کہ سب کو جینا ہے۔ شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن۔ اور جینا ہے تو جینے کے ساتھ ضرورتیں اور حاجتیں بھی سب ہی کے پیچھے لگی ہیں اور چوں کہ سارے آدم زاد ایک ہی طرح کے مخلوق ہیں ضرورتیں اور حاجتیں بھی سب کی قریب قریب ایک ہی طرح کی ہیں تو اکثر ضرورتوں اور حاجتوں کی کشمکش میں آدمی

آپس میں لڑنے جھگڑنے بھی لگتے ہیں اور لڑائی جھگڑا بھی تو تو میں میں تک ہو تو خیر باتوں باتوں میں خون خرابے تک کی نوبت پونہچ جاتی ہے۔ آخر بزرگوں نے دیکھا کہ یہی حالت رہی تو ایک دن یہ سب کٹ مریں گے اور آدم کی نسل معدوم ہو جائے گی ناچار سلطنت کا دستور نکالا۔ اور اپنے میں سے ایک کو سب کا سر دھرا یعنی بادشاہ بنا کر اُس کو خدمت سپرد کی کہ اپنی رعایا میں سے کسی کو دوسرے کے حقوق میں دست اندازی نہ کرنے دے اور لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور طوعاً کرہاً سب اس کا حکم مانیں۔ کچھ شک نہیں کہ اس انتظام سے زور و ظلم کا بہت کچھ انسداد ہوا۔ مگر اس انتظام میں کئی نقص بھی تھے اور ہیں جو امن کو جیسا چاہیئے قائم نہیں ہونے دیتے۔ اول تو وقت کا بادشاہ جو امن قائم رکھنے والا ہے وہ بھی آدمیوں میں کا ایک آدمی ہے اور حرص اور طمع اور خود غرضی اور غصہ کہ اکثر ایسی ہی باتوں سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب بلائیں اس پر مسلط ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود اُسی کی ذات سے امن میں بڑے بڑے رخنے پڑ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہتے ہیں اکیلا شور رہا چنا بھاڑ کو تو نہیں پھوڑ سکتا۔ رعایا میں امن قائم رکھنے کے لیئے بادشاہ کو چاہیئیں اعوان و انصار یعنی عملے فعلے لاؤ لشکر اور پھر بھی وہ آدمی ہوں گے اور اپنی اغراض کو دخل دے کر نئے نئے فساد کھڑے کریں گے اور یہی کچہریوں اور عدالتوں میں ہو رہا ہے۔ غرض اس ظاہری سلطنت کے انتظام سے لوگوں میں کامل امن امان کے قائم رکھنے کی توقع کرنی فضول ہے ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ با ایں ہمہ منصف مزاج اور خدا ترس بادشاہوں نے بہتیرا اچھہ کیا ہے اور اب بھی بہتیرا اچھہ کر رہے ہیں اور اس لیئے وہ ہماری شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام حکام وقت کرتے ہیں اور جرموں کا انسداد جتنا کچھ بھی ہے اُن کے قوانین کی وجہ سے ہے کہ قانون کے ڈر سے کوئی کسی کی طرح کی زیادتی نہیں کرتا۔ اور کرتا ہے تو اُس کو زیادتی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مولٰنا فرماتے ہیں کہ ہم کو بھی اس سے انکار نہیں مگر ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک چھٹانک انتظام حکام وقت کا قانون کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں مَن بھر بلکہ زیادہ قانونِ الٰہی کرتا ہے جس کا دوسرا نام ہے شریعت یا دین یا مذہب۔ اس لیئے کہ اول تو حاکم وقت کا قانون نقل ہے قانونِ الٰہی کی اور نقل بھی ہے ناقص و ناتمام۔ کجا حاکم وقت اور کجا خدائے تعالیٰ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ حاکم وقت کیسا ہی بیدار مغز اور با اقتدار ہو پھر بھی بندہ بشر ہے مرکبٌ من الخطاء والنسیان۔ اور اُس کا اختیار بھی محدود ہے۔ کیا آدمی اور کیا اُس کا قانون۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جرموں کا وقوع اس طرح پر ہوتا ہے کہ مجرم پہلے جرم کا ارادہ کرتا ہے پھر جس فعل کا ارادہ کرتا ہے اُس کو کر گزرتا ہے تو ارادے تک حاکم دنیا اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیئے کہ اس کو لوگوں کے دلی ارادے کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہاں وقوع جرم کے بعد وہ اختیار رکھتا ہے کہ مجرم کو سزا دے۔ غرض جرم کا ارادہ قانونِ دنیا کی رُو سے جرم نہیں۔ لیکن قانونِ الٰہی میں جرم کا ارادہ کرنا بھی جرم ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ — اور (لوگو!) جو تمہارے دلوں میں ہے اگر اُس کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

اور ظاہر ہے کہ ارادہ اصل ہے اور فعل اُس کی فرع تو نتیجہ کیا نکلا کہ قانونِ الٰہی جرموں کو جڑ سے اُکھاڑتا ہے۔ اور حاکم وقت کا قانون

جڑوں کی جڑ پر تو دست رس نہیں رکھتا ٹہنیوں اور پتوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا ہے۔ بدی کی جڑ بدستور قائم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ قانونِ الٰہی باطن اور ظاہر دونوں کی اصلاح کرتا ہے حاکمِ وقت کا قانون فقط ظاہر کی۔ حکامِ وقت کے قانون میں اس کے سوا ایک نقص اور ہے کہ اس قانون میں ثبوتِ جرم کا مدار شہادت پر ہے اور شہادت نہ ہو یا ہو اور کافی نہ ہو تو مجرم سزا سے بچ جاتا ہے اور ایسی صورتیں ہر حاکم کے اجلاس میں روز پیش آتی رہتی ہیں۔ بخلاف اس کے قانونِ الٰہی کا مجرم سزا سے بچ ہی نہیں سکتا۔ نفسِ لوامہ کا مجسٹریٹ مجرم کے دل میں بیٹھا ہوا اُس کو ندامت اور ملامت اور حسرت اور افسوس کی سزا دے رہا ہے جس کی سزا قید اور جرمانے اور تازیانے سے بڑھ کر ہے۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام جہاں تک اُس کو آدمی سے تعلق ہے ہمدردی اور احساس حسن و قبح افعال کو اُس میں بہت بڑا دخل ہے۔ ہمدردی کہنے کو ایک مختصر سا لفظ ہے مگر اس میں دیوانی فوجداری وغیرہ دنیوی فقہ کے تمام ضوابط اور قوانین اور احکام داخل ہیں۔ واضع قانون کیا کرتا ہے کہ مثلاً چوری کی نسبت اُس کو قانون بنانا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ مثلاً زید میرے گھر میں چوری کرے تو اُس کے اس فعل سے مجھے راحت پہنچے گی یا تکلیف۔ اس کا دل اندر بولتا ہے کہ تکلیف۔ اب وہ ہمدردی کی بنا پر خیال کرتا ہے کہ جیسا شخص میں ویسے شخص اگر ڈھمکاں فلاں وہاں سب۔ جیسا احساس تکلیف مجھکو دیسا اُن کو۔ پس وہ چوری کو قیاساً عقلی نفسہٖ جرم قرار دیتا ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ چوری سے امن میں خلل پڑتا ہے۔ اس کا انسداد ہو تو کیونکر ہو۔ پس وہ چوری کی سزا تجویز کرتا ہے کہ چور سزا کے ڈر سے پھر ایسی حرکت نہ کرے۔ اور دوسروں کو بھی عبرت ہو۔ اور یہی حال ہے تمام مسائل فقہی کا۔ اوامر کا۔ نواہی کا۔ تمام افعال منہیہ اور بہ ترتیب عقاب کا ہمدردی اور احساس حسن و قبح افعال کا خیال بقائے روح کے خیال کے ساتھ مل کر ایک بڑے ضروری خیال عاقبت کو ہماری فطرت کی حد میں لے آتا ہے کہ یہ نہ ہو تو دنیا گیا ہے ایک جملہ ہے ناتمام جس میں مبتدا کی خبر نہیں شرط کی جزا نہیں۔

مولانا نے سچ فرمایا ہے کہ علت و معلول اور اسباب و نتائج کا جیسا قاعدہ موجودات میں ویسا آدمی کے افعال میں موجودات میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ نقضِ قاعدہ کبھی نہیں ہوتا۔ آدمی کے افعال میں قاعدے کا عمل درآمد یکسانی کے ساتھ کیوں نہیں۔ ہر بدکرداری۔ ہر نافرمانی۔ ہر سرتابی پر سزائے عاجل اسی زندگی میں کیوں مترتب نہیں ہوتی آدمی جب یہ باتیں سوچتا ہے تو بقائے روح کا خیال اُس کو متنبہ کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ علت و معلول اور اسباب و نتائج کا قاعدہ تو صرف لزوم علت و معلول کو ظاہر کرتا ہے کہ سبب پایا جائے گا تو اُس کا نتیجہ لازمی ضرور ہو کر رہے گا سو یہ ہو تو اور وہ یہ ہو تو۔ اور چونکہ آدمی مرنے سے معدوم نہیں ہوتا اور مرنے کے پیچھے بھی اس کی روح باقی رہتی ہے اور بقائے روح بھی ایک طرح کی زندگی ہے تو گو دنیا کی زندگی میں مجرم کو نتیجہ بد پیش نہ آیا۔ بقائے روح کی زندگی میں پیش آکر رہے گا۔ مگر پیش آکر رہے گا ضرور۔ اور وہاں کا نتیجہ یعنی سزا یا عذاب (خدا اُس سے محفوظ رکھے) دنیا کے نتیجہ بد سے زیادہ موذی ہوگا۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (ع ۱۰)

اور آخرت کا عذاب تو (دنیا کے عذاب سے) کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش (یہ نا سمجھ کافر) سمجھتے ہوتے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھو معمارِ فطرت حسبِ ترتیب ذیل مذہب کی عمارت کو کس طرح درجہ بدرجہ بناتا ہے۔

(۱) معرفتِ الٰہی (۲) عبادت (۳) رضاجوئی (۴) ہمدردی (۵) احساسِ حسن و قبح (۶) جزا سزا (۷) عاقبت۔

انسان کو خدا کا بڑا ہی احسان ماننا چاہیئے کہ اُس نے آدمی کو جب کہ وہ جانوروں جتنی عقل بھی نہیں رکھتا تھا قطعہ

مرغکے ز بیضہ بروں آید و روزی طلبد　　آدمی زادہ ندارد خبر و عقل و تمیز
آں بناگاہ کسے گشت و بہ چیزے نرسید　　ویں بہ تمکین و فضیلت بگذشت از ہمہ چیز

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اور (لوگو!) اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا (اور اُس وقت) تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تم کو کان دیئے اور آنکھیں (دیں) اور دل (دیئے) تاکہ تم (اُس کا) شکر کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جب پیدا ہوتے وقت تم بے شعور تھے تو اسی سے معلوم ہوا کہ تم اپنے ارادے سے نہیں پیدا ہوئے غرض خدا نے محض اپنی مہربانی سے آدمی کو جب کہ وہ جانوروں جتنی عقل بھی نہیں رکھتا تھا تعلیم کے لیے استادِ فطرت کے حوالے کیا۔ فطرت نے اُس کو ایسی مفید اور نافع تعلیم دی جس سے دنیا اور آخرت دونوں میں آدمی کا بیڑا پار ہو گیا۔ اور اُس کو کسی کی منت نہ اُٹھانی پڑی۔ اب ذرا تھوڑی دیر کے لیے پھر عمارت کے ضلع میں آؤ کہ معمارِ فطرت نے مذہب کی عمارت تو بنا کھڑی کی جس میں کسی طرح کی کور کسر نہیں۔ مگر اس نگہداشت کا انتظام بھی ضرور ہے۔ کہتے ہیں کہ جس مکان میں چالیس دن جھاڑو نہ دی جائے رات کے وقت چراغ نہ جلے اُس کی لیپ پوت نہ ہوتی رہے پڑے پڑے کھنڈر ہو جاتا ہے۔ تو خدا جس کو ہر طرح سے انسان کی پرداخت منظور تھی اُس کے مذہب کی عمارت کو درست رکھنے کے لیے پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کے معتقدات خدا کے بارے میں اس قدر بیہودہ ہو گئے تھے کہ اُن کی وجہ سے نظامِ عالم میں فتور واقع ہو چلا تھا۔ ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے خدا نے پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً بھیجا۔ وقتاً فوقتاً سے مطلب یہ ہے کہ جب سے انسان تبھی سے فطرت۔ تبھی سے مذہب۔ تبھی سے پیغمبر۔

تمام انسان اور پیغمبروں کی فطرت جنسیت کے اعتبار سے یکساں ہے مگر نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے

مولانا فرماتے ہیں کہ اگرچہ پیغمبر اِن خدا آدمی تو ہیں مگر ہم جیسے نہیں پیغمبروں کی فطرت دوسری طرح کی ہے ہماری فطرت سے متغایر یعنی جنسیت کے اعتبار سے تو ہماری اور پیغمبروں کی فطرت یکساں ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[۱] مگر نوعیت کے اعتبار سے متفاوت۔ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ[۱]۔ قواعد فطری سب آدمیوں میں بلا استثنائے احدے یکساں ہیں۔ مگر افراط تفریط اور اعتدالِ قوی کی رو سے لوگوں کے مدارج متفاوت ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مبدأ فیاض نے حافظہ سب آدمیوں کے سروں میں لگا ہے۔ مگر کسی کا حافظہ قوی ہے کسی کا ضعیف۔ کسی کا بدرجہ متوسط۔ اور اسی پر دوسرے قویٰ کو قیاس کر لو۔ اِس کو ایک مثال سے خوب سمجھو گے۔

---

[۱] (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ میں (بھی) تم ہی جیسا بشر ہوں ۱۲ [۱] مگر مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس (وہی) ایک معبود ہے ۱۲

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الرعد)

اور زمین میں پاس پاس کئی (کئی) قطعے (ہوتے) ہیں اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت (جن میں بعض) دو شاخے (ہوتے ہیں) اور بعض دو شاخے نہیں (ہوتے) حال آں کہ سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہی اور (پھر بھی) ہم بعض کو بعض پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں۔ بے شک جو لوگ عقل کو کام میں لاتے ہیں اُن کے لیئے اِن باتوں میں (قدرتِ خدا کی بہتیری ہی) نشانیاں (موجود) ہیں۔

ایک درخت میں ایک قسم کے سیکڑوں ہزاروں پھل لگتے ہیں اُن میں سے معدودے چند ہر طرح سے عمدہ ہوتے ہیں۔ کہ کوئی پھل اُن کو نہیں پاتا۔ یہی حال پیغمبروں کا ہی کہ اُن میں بھی سب بشری خواص موجود ہوتے ہیں مگر درجۂ توسط میں اور معتدل اور پیغمبروں کے معصوم ہونے کے بھی یہی معنی ہیں کہ اُن کے قُویٰ میں نہ افراط ہوتی ہی کہ اُن کے زور کو دبایا جائے اور نہ تفریط کہ اُن کو زور دیا جائے یعنی

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُهَا

بہترین امور بیچ کی راس کے کام ہیں

کی رُو سے وہ انسانِ کامل ہوتے ہیں اور اسی اعتدالِ قویٰ کی وجہ سے خدا اُن کو خدمتِ رسالت کے لیئے منتخب فرماتا ہی کہ اپنا نمونہ دکھا کر دوسرے لوگوں کی فطری قوتوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کریں "تاکہ لوگوں میں قویٰ فطری کے افراط و تفریط کی رُو سے کسی طرح کی کش مکش واقع نہ ہو جس سے نقضِ امن لازم آئے۔ یہ ہی پیغمبروں کے بھیجنے کی اصلی غرض۔

صداقتِ پیغمبران

مولنا فرماتے ہیں چوں کہ نورِ فطرت خداداد ہی۔ اور اس میں دونوں طرح کی قابلیت ہی۔ تعلیم و تربیت اور مشق و مہارت سے اس میں زیادہ چمک آ سکتی ہی۔ اور اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے اور اس کی خبر نہ لی جائے تو ماند پڑ جاتا ہی۔ مگر ٹمٹماتا رہتا ہی۔ وعظ و نصیحت کی ہوا لگی اور بھڑک اُٹھا۔ باوجودے کہ اس زمانۂ فساد میں صداقت کا تھرمامیٹر گرا ہوا ہی اور جھوٹ بہت چل پڑا ہی۔ بایں ہمہ عدالتوں میں گواہوں کے حلفی بیان اسی بنا پر مقبول ہوتے ہیں کہ راستی اور حق گوئی انسان کی فطرت ہی۔ اور وہ گواہ کو سچ کے کہنے پر مجبور کرتی ہی۔ یوں شاید ایک گواہ قسم کھا کر جھوٹ بول بھی دے لیکن اگر وہ مسلمان ہی اور اُس سے کہا جائے کہ قرآن ہاتھ میں لے کر یا اولاد کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور ہندو ہی تو گنگا جلی لے کر گواہی دے تو غالب ہی کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ مولنا فرماتے ہیں کہ پیغمبروں کی شناخت میں ہم کو انسان کی اسی فطرت سے مدد لینی چاہیئے۔ خدا نے چاہا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف کھل پڑے گا۔ مولنا نے تو جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی طرف سے اسی طرح اطمینان حاصل کیا اس اجمال کی تفصیل یہ ہی کہ مولنا جب مذہب کی تحقیقات کرنے بیٹھے تو چھوٹتے کے ساتھ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ "مذاہبِ مروّجہ کو ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے طوفانِ اختلاف میں حق کے دریافت کرنے کے لیئے عمرِ نوح اور صبرِ ایوب کہاں سے لاؤں گا یہ تو میرے بس کی بات نہیں۔ نہ مجھ میں اتنی لیاقت نہ مجھکو اتنی فرصت" بس اُنھوں نے اپنی تحقیقات کو صرف اسلام میں محدود رکھا اور کسی

دوسرے مذہب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی تو نہ دیکھا۔ تحقیقات کو اسلام میں محدود رکھنے کے دو سبب ہوئے ایک یہ کہ مولانا حسن اتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ مسلمانوں میں پلے اور بڑے ہوئے۔ اسلام کے قریب قریب کل حالات اُن کو معلوم تھے۔ دوسرے مذاہب مروّجہ کے مقابلے میں اسلام ہی جدید العہد تھا اور یہ بات مولانا کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ پُرانی باتوں میں کچھ نقص ہوتا ہی تو اُس نقص کے رفع کرنے کو نئی بات ایجاد کی جاتی ہی تو انھوں نے خیال کیا کہ تحقیقات کرنے سے اگر میرا دل اسلام کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو بس میں نے حق پا لیا۔ مجکو کسی دوسرے سے پوچھنے کی کچھ ضرورت نہیں میں اپنے حق سے ادا ہوا۔ اس تحقیقات میں یہ بڑی خوبی تھی کہ کسی دوسرے کو اُس میں دخل نہ تھا۔ اور یہ بات تجربے میں آچکی ہی کہ ایک فریق مقدمہ یا اُس کا وکیل اپنی چرب زبانی سے جج کو جادۂ حق سے منحرف کر دیتا ہی۔ غرض مولانا ہی اس تحقیقات میں مدعا علیہ تھے۔ اور اُن کا دل گواہ اور وہ خود ہی جج اور اس طرح پر جو فیصلہ اُنھوں نے کیا میرے نزدیک وہ فیصلہ ناطق ہی۔ جس کا اپیل نہیں۔ اور اپیل کریں تو مولانا اور اُن کو وہ فیصلہ منظور ہی اس کے سوا مولانا ہر جویائے حق کو یہی رائے دیتے ہیں کہ اگر وہ دل سے جویائے حق ہی تو تحقیقات کا یہی طریقہ اختیار کرے جو انھوں نے کیا۔ ان شاء اللہ خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔ مگر تحقیقات کنندہ جس مذہب کے لوگوں میں پیدا ہوا جن میں پلا اور بڑا ہوا وہ اُسی مذہب میں تحقیقات کو محدود نہ رکھے۔ اگرچہ اُس مذہب کے استحسان سے ذہن کو خالی کرنا ہی ذرا ٹیڑھی کھیر۔ مگر چاہے کوئی مولوی ہمارے مولانا پر کُفر کا فتویٰ ہی کیوں نہ لگا دیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں مولانا نے تو دَورانِ تحقیقات میں ایسا ہی کیا تھا۔

غرض بعض پیغمبروں کا مذکور قرآن مجید اور توراۃ اور انجیل اور دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں میں ہی۔ مگر پیغمبروں کا انحصار ہم کو خدا نے نہیں بتایا۔ بلکہ قرآن میں ایک جگہ یہ بھی آیا ہی۔

مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

اُن میں سے (بعض) ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنائے اور اُن میں سے (بعض) ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے۔

بہرکیف پیغمبروں کے ساتھ ایمان لانے کی یہ شکل ہی کہ جو معلوم ہیں وہ اور جو نہیں معلوم وہ سب خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور دعویٰ رسالت میں سچے ہیں۔ اِن کے مدارج خدا ہی کو معلوم ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو فاضل اور مفضول نہیں کہہ سکتے۔ مجرّد پیغمبر کا ہونا ہی شرفِ بشر کے لیئے کافی ہی۔ دوسری بات پیغمبروں پر ایمان لانے کی یہ ہی کہ وہ بھی بندے ہیں مگر مقبول بندے اور بارگاہِ الٰہی کے مقرّب۔ اُن کو خدا کے اختیارات میں بھی کچھ دخل نہیں یہاں تک کہ اُن کا اپنا نفع و ضرر بھی اُن کے اختیار میں نہ تھا۔

قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوٓءُ ۚ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہو کہ میرا اپنا ذاتی نفع و نقصان بھی میرے اختیار میں نہیں۔ (میں) بہتیرا چاہوں) مگر (وہی ہو کر رہتا ہی) جو خدا چاہتا ہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھکو کسی طرح کا گزند (بھی) نہ پہنچتا۔ میں تو اُن لوگوں کو جو ایمان لانا چاہتے ہیں (دوزخ کا) ڈرانے اور (بہشت کی) خوش خبری سنانے والا ہوں اور بس۔

نہ وہ اپنے اختیار سے معجزہ دکھا سکتے تھے اور نہ اپنے اختیار سے وحی اُتار سکتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔

اور کسی رسول کی طاقت نہ تھی کہ بے حکم خدا کوئی معجزہ لا دکھائے ہر ایک وقت (موعود) کے لیئے (ہمارے ہاں) ایک قسم کی تحریر (ہوتی) ہو (پھر اس میں سے) خدا جس کو چاہتا ہو منسوخ کر دیتا ہو اور (جس کو چاہتا ہو) قائم رکھتا ہو اور اس کے پاس اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ موجود) ہو۔

منصب رسالت متوارث نہیں۔ خدا تعالیٰ جس کو اس امانت کے قابل سمجھتا ہو اُس کو منصب رسالت سے سرفراز فرماتا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام کے باپ بت تراش تھے اور ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات سے بڑے پکے موحد اور موحدوں کے پیشوا۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ہونے کی وجہ سے طوفان میں غرق کر دیا گیا اور نوح علیہ السلام نے بتقاضائے شفقت پدری اُس کے حق میں دعا کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔ سوائے اس کے کہ پیغمبروں پر وحی نازل ہوتی ہو اور وہ تبلیغ وحی میں کسی طرح کی خطا نہیں کر سکتے باقی تمام خواص بشری اُن میں موجود ہوتے ہیں اور اس سے اُن کی شان رسالت میں کسی طرح کا ضعف لازم نہیں آتا۔ الغرض رسالت ایک مرتبہ ہو بین العباد و بین اللہ۔ خدا سے فروتر اور تمام بندوں سے برتر یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی۔ کیوں کہ فرشتوں کو خدا نے نقائص بشری سے محفوظ پیدا کیا ہو اور اُن کی طبائع میں تقاضائے بدی فطرۃً نہیں ہوتا۔ خواص بشری رکھ کر بدی پر غالب آنا تعریف کی بات ہو۔ فرشتوں کی معصومیت اضطراری ہو نہ پیغمبروں کی طرح اختیاری۔

غرض پیغمبروں کی تعداد ہم کو نہیں بتائی گئی۔ خدا جانے کتنے پیغمبر آئے اور آئے تو کیا حکم خاص یعنی شریعت لے کر کس وقت اور کن لوگوں کی طرف آئے۔ بات یہ ہو کہ بنی آدم کی حالت کو ثبات نہیں کہ شروع سے تمام روئے زمین کے آدمیوں کی ایک ہی حالت چلی آئی ہو تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ آب و ہوا اور وقتی اور مقامی خصوصیتوں کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی حالتیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں۔ کسی جگہ ایک زمانے میں لڑائی جھگڑائی کے چرچے رہے ہیں تو دوسرے وقت شعر شاعری کے۔ بعض لوگ شان دار عمارتوں کے دل دادہ رہے ہیں کتنے حسن پرستی کے۔ چوری رہزنی ڈکیتی کم تولنا کم ناپنا۔ ابھی تک بھی دنیا اُن جرائم سے پاک نہیں۔ غرض حضرت آدم کی اولاد ایسی بے چین اور چلبلی اولاد ہو کہ اُن کا کوئی وقت فساد سے محفوظ نہیں رہا ہو۔ ایسی ہی بداعمالیوں کی روک تھام کے لیئے لوگوں کی مناسب حالت خدا وقتاً فوقتاً پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہو آدمی جسم و روح دو چیزوں سے مرکب ہو تو اُس کے امراض اور علاج بھی دو طرح کے ہیں طب کی کتابیں امراض جسمانی کا علاج کرتی ہیں اور مذہبی کتابیں امراض روحانی کا۔ جالینوس طبیب الابدان تو پیغمبر طبیب الارواح۔ ان پیغمبروں کے ساتھ ایمان لانے میں ایک بات یہ بھی داخل ہو کہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر تھے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری پیغمبر خاتم النبیین۔

خدا اور رسول کا تعلق مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کی سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہو

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً

اللہ کسی مثال کے بیان کرنے سے (ذرا بھی) نہیں جھجھکتا (چاہے وہ مثال)

فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

مچھر کی ہو یا اُس سے بھی بڑھ کر (کسی اَور حقیر چیز کی) سو جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ (مثال بالکل) ٹھیک ہے (اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) اُن کے پروردگار (ہی) کی طرف سے (ہے) اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس ذلیل مثال کے بیان کرنے سے خدا کی کون سی غرض (اٹکی پڑی تھی ایسی) ہی مثال سے خدا بہتیروں کو گمراہ کرتا اور ایسی ہی مثال سے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے لیکن اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے (تو) بدکاروں ہی کو جو پکا کر لینے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن (تعلقات) کے جوڑے رکھنے کو خدا نے فرمایا اُن کو قطع کرتے اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ آخر کار نقصان اُٹھائیں گے۔

اِس کی شانِ نزول مفسروں نے یوں لکھی ہے کہ جب آیہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْــــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اُس کو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو ایک مکھی (تک) پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اس (پیدا کرنے) کے لیے (سب کے سب) اکٹھے (ہی کیوں نہ) ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کچھ چھین لے جائے تو اُس کو اُس سے چھڑا نہیں سکتے۔ (کیسے) بودے ہیں (بُت) جو (مکھی کے) پیچھے پڑیں (اور اس کو نہ پکڑ سکیں اور) کیسی بودی وہ (بیچاری) مکھی جس کا پیچھا کیا جائے (اور پھر بھی ہاتھ نہ آئے)

نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہے اونچی دوکان پھیکا پکوان خدائی دعویٰ اور مکھی جیسی حقیر اور قابل نفرت چیز کا تذکرہ ہم کو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہے، اس طعن کے جواب میں آیہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ الخ نازل ہوئی جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمثیل کیسی ہی ادنیٰ چیز ہو مثال کے نتیجے کو دیکھنا اور اس سے پند پذیر ہونا چاہیئے۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش   ور نبشت است پند بر دیوار

اِس روایت کی بنا پر مولانا خدا اور رسول کے باہمی تعلق کو حکام دنیا کی مثال دے کر سمجھانا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارے وقتوں میں ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ تو انھوں نے کیا کیا ہے کہ جتنے کام بہ تعلق حکومت کرنے پڑتے ہیں سب کے قسم وار صیغے بنا رکھے ہیں۔ ایک فوجی صیغہ ہے۔ ایک ملکی پھر ملکی میں مال دیوانی فوجداری پولس تعلیم ڈاک آبپاشی تعمیرات وغیرہ بہت سے صیغے ہیں اور ہر صیغہ ایک محکمہ جدا گانہ۔ مثال کی تکمیل کے لیے مولانا ایک محکمہ مال کو لیتے ہیں جس میں تحصیل خراج کا کام ہوتا ہے۔ یہ محکمہ تحصیل دار سے شروع ہو کر گورنر جنرل پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ اس طرح پر کہ پرگنہ کا محصل تحصیلدار پھر کئی پرگنوں یعنی ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر پھر کئی ضلعوں یعنی قسمت کا کمشنر پھر کئی قسمتوں کا یعنی صوبے کا بورڈ یا فنانشل کمشنر غرض کہ یہی حال کام کے ہر ایک صیغے کا ہے۔ پھر اور سب صیغوں

کا جامع صوبے کا گورنر یا لفٹنٹ گورنر یا چیف کمشنر کہلاتا ہی۔ اور ہندوستان کے صوبوں کے تمام صیغوں کا سب سے بڑا حاکم گورنر جنرل جسے ہندوستانی ریاستوں کے تعلّق سے وایسرائے یعنی شہنشاہ کا نائب بھی کہتے ہیں۔ انتظام کے اِس سلسلے سے مولانا دو باتیں استنباط کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ وحدت کے بدون کثرت انتظام نہیں پا سکتی۔ اور اِسی سے اُن کو خدا کی وحدانیت کا قائل ہونا پڑتا ہی خیر یہ تو جملہ معترضہ ہی۔ دوسری بات جو حکّام انگریزی کے انتظام میں دیکھی جاتی ہی یہ ہی کہ یوں تو ہر حاکم کے ہاتھ تلے سررشتہ دار یا اہلکار پیشی ہوتا ہی اور وہی احکام وغیرہ لکھتا پڑھتا ہی مگر کمشنر تک لکھا پڑھی حاکم کے نام سے ہوتی ہی۔ کمشنر سے اونچے درجے کے حکّام کی خط و کتابت اُن کے علوِ مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرٹری اپنے نام سے کرتا ہی جس کو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتّر کہتے ہیں۔ سکتّر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سررشتہ دار ہی گو وہ اپنے نام سے خط و کتابت کرے مگر حقیقت میں وہ خط و کتابت اُس کے افسر کی ہی جس کا وہ سکتّر ہی۔ چوں کہ سکتّر اپنے افسر کا مزاج شناس ہوتا ہی کبھی وہ چھوٹی اور معمولی باتوں میں بے پوچھے بھی حکم جاری کرتا ہی۔ اور اُس کا وہ حکم افسر کے حکم کی طرح واجب التعمیل ہوتا ہی۔ چوں کہ مولانا دنیا ہی کی باتوں سے دین کی باتوں کا پتا لگاتے ہیں اِس لیے خدا و رسول کے تعلّق کو بھی ویسا ہی سمجھا ہی جیسا مثلاً وایسرائے اور اُس کے سکتّر میں ہوا کرتا ہی اور یوں قرآن اور حدیث دونوں چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے سے بیٹھ گئیں۔ آپ نے اس بات سے سمجھ لیا ہوگا کہ رسول کا ادب متفرع ہی خدا کے ادب پر یعنی رسول کا ادب عین خدا کا ادب ہی۔ مگر خدا کا ادب اظہارِ عبودیت سے ہوتا ہی اور رسول کا اُن کے حکم کی بجا آوری سے۔ پھر حکم کبھی امر و نہی کے صاف لفظوں میں ہوتا ہی۔ کبھی حکم پر چلنے والوں کی مدح اور سرتابی کرنے والوں کی مذمت کے پیرائے میں۔ کبھی اُمم ماضیہ میں سے کسی امت کا حال بیان کیا جاتا ہی کہ اُن کو ایک حکم دیا گیا اُنھوں نے نہ مانا اُن پر عذاب نازل ہوا۔ کبھی وعدۂ اجر اور وعیدِ عذاب سے اظہار امر و نہی کیا جاتا ہی اور حکم کی ایک شان یہ بھی ہی کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تقرّبِ رسالت کی وجہ سے خدا کے ادا شناس اور مزاج داں اور دوسرے بندوں کی طرح مامور بھی تھے اُن کا قول و فعل بھی خدا ہی کا حکم سمجھا جائے گا۔ گو قرآن میں اُس امرِ خاص کی صراحت نہ ہو۔ مثلاً خدا نے مطلق زکوٰۃ کا حکم دیا نصاب کی تعیین اور مقدارِ زکوٰۃ اور حولِ کامل کا گزرنا یہ باتیں لوگوں کو رسولِ خدا کے عمل سے معلوم ہوئیں اور یہی حال ہی ارکانِ نماز اور ارکانِ حج کا۔ اِس اعتبار سے حدیث کو قرآن کا ضمیمہ اور تتمّہ ماننا ہوگا۔ اس کی مثال بھی دنیا کی چیزوں میں سے لیجیے۔ وہ یہ کہ انگریزوں کے انتظامِ ملک داری میں مثلاً فوجداری کا ایک قانون ہی جس کا نام ہی مجموعۂ قوانین تعزیراتِ ہند۔ اِس قانون میں ہر ایک جرم کی تعریف ہی اور اُس کی انتہائی سزا لیکن اتنے سے کام نہیں چل سکتا تو اجرائے کار کے لیے ضابطۂ فوجداری بنانا پڑا۔ اور تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دونوں مل کر فوجداری کا مکمّل قانون بن گیا۔ پس جو نسبت ضابطۂ فوجداری کو تعزیراتِ ہند سے ہی ویسی ہی نسبت حدیث کو قرآن سے ہی۔ وجہ یہ ہی کہ جنابِ رسالت مآب کو خدا نے عقلِ صائب اور رسا اور ذہنِ متین عطا فرمائی تھی اور وہ سنت اللہ کو خوب سمجھے ہوئے تھے۔

جنابِ محمد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت

اب ہم کو یہ دکھانا مقصود ہی کہ مولانا نے پیغمبر صاحبِ اسلام کی صداقت کو فطرت کی کسوٹی پر کیوں کر آزمایا۔ وہ اِس طرح آزمایا کہ پیغمبر صاحب کا زمانہ

کچھ ایسا دُور نہیں جیسے اہل کتاب کے اَور پیغمبروں کا۔ اِن کے وقت کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ اگرچہ تاریخیں افراط تفریط سے محفوظ نہیں اور محفوظ ہو بھی نہیں سکتیں تاہم ایسی باتیں بھی ڈھونڈنے سے مل جاتی ہیں جو مجمع علیہ ہیں پھر مولانا نے سوچا کہ جیسا تناسب آدمی کے اعضاء میں ویسا ہی تناسب اُس کے افعال میں یعنی انسان کے اعضاء میں ایک طرح کی نسبت پائی جاتی ہے کہ سر اتنا بڑا ہاتھ پاؤں اس قدر لمبے قد اتنا اونچا علیٰ ہٰذا القیاس ناک گردن انگلیاں سینہ کوئی عضو بے جوڑ نہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ

ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا پھر ہم اُس کو (بوڑھا کر کے) کم تر سے کم تر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل (بھی) کیے (اُن کو تنزلِ پیری سے تنگ دل نہ ہونا چاہیے کیوں کہ) اُن کے لیے (آخرت میں) اجر ہے انتہا تو (اے پیغمبر اب) کون ہے جو (ان سب باتوں کے معلوم کیے) پیچھے (روزِ) جزا کے بارے میں تم کو جھوٹا سمجھے کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم (اور قدرت والا) نہیں ہے (تو منکرین قیامت اُس سے کیوں نہیں ڈرتے)

اِس تناسب کو لوگوں نے خیال کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اتنا تو ہے۔ مثلاً آدمی کا قد تاچنبر گردن اُس کی اپنی بالشت سے آٹھ بالشت اور تا کاسہ سر دس بالشت اور اگر آدمی دونوں ہاتھ پھیلا دے تو ایک ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی سے دوسرے ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی تک کا فاصلہ بھی اُس کی دس بالشت۔ اِسی طرح کا تناسب کُل اعضاء میں ہے۔ کوتہ گردن تنگ پیشانی۔ حرام زادے (شریر مفسد) کی یہی نشانی ہے۔

كُلُّ طَوِيلٍ أَحْمَقُ إِلَّا عُمَرُ
كُلُّ قَصِيرٍ فِتْنَةٌ إِلَّا عَلِيٌّ

عمرؓ کے سوائے جو لمبے قد کا ہوگا بے وقوف ہوگا۔ اور علیؓ کے سوائے جو پست قد ہوگا شریر ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں خصائصِ فطری کے اعتبار سے انگریزوں کی ولایت کے عجائب خانوں میں ظالموں اور خدا پرستوں اور بخیلوں وغیرہ کی بہت سی کھوپریاں جمع ہیں اور کھوپریوں کی ساخت سے نتیجے مستنبط کیے گئے ہیں۔ خیر یہ تو ایک بات ہے جو انگریزی اخباروں میں نظر پڑی ہے۔ اِسی قبیل سے ایک حکایت یہ ہے کہ کابل کی پہلی مہم میں جس میں امیر دوست محمد خاں کو انگریز پکڑ لائے تھے اور اُس کے جواب میں امیر دوست محمد خاں کے فرزند محمد اکبر خاں نے انگریزی فوج کے افسروں اور اُن کی میموں کو قید کر لیا تھا اس مہم میں آگرے کے لالہ جوتی پرشاد محکمہ رسد رسانی کے داروغہ تھے مہم کے ہو چکنے پر مصارفِ جنگ کا حساب کتاب ہونے لگا تو لالہ جوتی پرشاد نے کئی کروڑ روپے کا مطالبہ سرکار کے ذمّے نکالا۔ محاسب سرکار نے اپنی رائے کے مطابق رقموں میں بہت کاٹ چھانٹ کی۔ جوتی پرشاد کو دعویٰ دائر کرنا پڑا۔ تحقیقات کے لیے کمیشن بیٹھا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کو رقم دینی آئی۔ مقدمے میں جوتی پرشاد کی طرف سے ایک اخبار کا اڈیٹر جو بارسٹر بھی تھا وکالت کرتا تھا۔ اُس کو خدا نے اس بلا کا حافظہ دیا تھا کہ ہزار ہا رقمیں تقیہ آنہ پائی اہلِ کمیشن کے روبرو برجستہ بلا تامل بیان کرتا

چلا جاتا تھا جیسے کوئی لکھے ہوئے حساب کو پڑھتا چلا جاتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ اُس نے حساب کو صرف ایک مرتبہ دیکھ لیا تھا اور ایک مرتبہ کے دیکھنے میں اُس کو اس قدر محفوظ ہو گیا تھا کہ کہیں غلطی نہیں کرتا تھا تمام اہلِ یورپ اس کی قوتِ حافظہ پر متعجب تھے اخباروں میں اس پر بڑے بڑے مضمون لکھے جانے لگے۔ آخرکار ڈاکٹروں نے اس کا سر اس شرط سے مول لیا کہ اس کے مرے پیچھے اس کی کھوپری کی تشریح کریں گے کہ خلافِ معمول قوتِ حافظہ کا سبب دریافت کریں۔ اور یہی ہوا کہ اس کا دماغ معمول سے کوئی چھٹا تک سوا چھٹا تک زیادہ نکلا۔ اور کاسۂ سر کی ساخت میں بھی کچھ فرق تھا ایسی ہی خبر سید احمد خاں کی نسبت بھی مشہور ہوئی تھی کہ اُنھوں نے اپنا سر بیچ دیا تھا۔ مگر یہ خبر غلط تھی لیکن اگر واقع میں اُنھوں نے اپنا سر بیچ دیا ہوتا اور اس کی تشریح کی جاتی تو کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور نکلتا پر نکلتا۔ لوگ درازیِ ریش کو بھی حمق کی دلیل بتاتے ہیں اور کسی کتاب میں ایک ہنسی کی بات بھی نظر سے گزری ہے کہ کوئی طویل اللحیہ شب کے وقت چراغ کے آگے بیٹھا ہوا کتاب دیکھ رہا تھا اتفاق سے اس میں لکھا تھا

ریش باید دو سہ موے و زنخداں پوشے | نہ کہ انبوہ دراں بچہ و ہر خرگوشے

اور ایک مُشت ریش فقیہ وَمَا زَادَ عَلٰی ذٰلِكَ فَلِلسَّفِيْهِ اُس شخص کو اپنی ریش کی درازی معلوم تھی۔ اُسی وقت چاہا کہ ڈاڑھی کو ایک مٹھی کی حد میں لے آئے۔ مقراض موجود نہ تھی اس نے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑ مازاد کو چراغ کی لو پر رکھ دیا جب ہاتھ کو پہنچی گرمی اضطراراً مٹھی ہٹالی۔ ڈاڑھی بھک سے اُڑ گئی اس نے کتاب کے حاشیے پر لکھ دیا اِنِّیْ عَلٰی ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ ہمارے ہندوستان میں کبودیِ چشم کو دلیلِ بے وفائی اور تنگیِ چشم کو دلیلِ بخل سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ سر بڑا سردار کا پیر بڑا گنوار کا" یہ سب باتیں علمِ قیافہ کی ہیں۔ ہندو ہاتھ کی لکیروں سے عمر اور اولاد اور بیماریاں بہت سی باتیں بتایا کرتے ہیں علمِ قیافہ آدمی ہی تک محدود نہیں رہا آدمی نے بعض جانوروں کا قیافہ بھی معلوم کیا ہے۔ مثلاً گھوڑے کی بال بھونری۔ کنوتی گامچی۔ رنگت دیکھتے ہیں غرض آدمی کے اعضاء اور افعال میں باہمی تناسب اور تعلق ہے۔ مولانا نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو قیافے اور تناسبِ افعال دونوں پہلوؤں سے جانچا اور تحقیقات کے بعد مولانا کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اس قیافے اور ان اخلاق و عادات کا آدمی محالِ عقل ہے کہ نبوت کا غلط دعویٰ کرے۔ اور خدا پر جھوٹ بولے جس کی عظمت اور جس کا جلال ہمہ وقت اس کے پیشِ نظر ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ

اور اگر (پیغمبر زبردستی) کوئی بات ہمارے سر چپکتا تو ہم نے (خونیوں کی طرح) اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اُس کی گردن اڑا دی ہوتی ف اور تم میں کوئی بھی ہم کو اُس سے روک نہ سکتا۔

اور وہ کسی حالت میں یادِ خدا سے غافل نہ ہو یہاں تک کہ ساری عمر کھا کھلا کر نہ ہنسے۔

له او ایک مٹھی سے زیادہ ہو تو بے وقوف ہے ۱۲ سے بے شک میں اس پر گواہ ہوں ۱۲ ف وتین ایک رگ ہے جو گردن میں ہو کر گزرتی ہے اور وہ سر اور دل کے درمیان ایک رابطہ ہے اگر اس کو کاٹ دیا جائے تو جان نکل جاتی ہے۔ اس آیت کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ "ہم نے اس کی رگِ دل کاٹ دی ہوتی" لیکن محاورے کے لحاظ سے [illegible] اختیار کر لیے ہیں ۱۲ سے جس زمانے میں سید صاحب کو سر کا خطاب ملا تھا تو بعض جاہلوں نے اور بعض مسلمانوں نے اُس کے یہی معنی سمجھے تھے کہ

سے سر ترے سر فروشی کی علامت ہے لیکن یہ ایک مضحکہ تھا جو سر سید کے ساتھ کیا گیا تھا ۱۲

اَلضِّحْكُ يُمِيْتُ الْقَلْبَ
ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

اکثر اوقات خائفانہ آسمان کی طرف دیکھا کرے۔ شدائدِ جان کنی میں اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى[ل۵۱] کے سوا کوئی بات اُس کے مونہہ سے نہ نکلے۔ اُس پر خدا کا خوف اس قدر غالب ہو کہ راتوں کو نماز میں کھڑے کھڑے اُس کے پاؤں سوج سوج جائیں۔ یہاں تک کہ خدا اُس کی حالت پر ترس کھا کر خود

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (اے پیغمبر) ہم نے تم پر قرآن اس لیے تو نازل کیا نہیں کہ تم (اس کی وجہ سے اس قدر) مشقت اُٹھاؤ۔ ف۱

اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ[۵۲] فرمائے اور وہ اَفَلَآ اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا (کیا میں بندہ شکر گزار نہ بنوں) کہہ کر عبادت سے باز نہ آئے۔ جس نے ساری عمر جھوٹ نہ بولا ہو اور لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین اُس کا تکیہ کلام ہو اور وہ اپنی رسالت پر سخت سے سخت قسمیں کھائے اور قسموں کو وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا الخ[۵۳] اور اسی طرح دوسری باتوں سے موکد کرے کسی کی عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ایسا راست باز بھول کر بھی جھوٹ رسالت کے دعوے پر اصرار کر سکتا ہے ایک یہ وَمَنْ اَظْلَمُ سے الیٰ آخرہٖ ایسی بات ہے کہ شقی سے شقی آوارہ سے آوارہ بد وضع سے بد وضع بے باک سے بے باک آدمی کو اس طرح پر قسم دی جائے تو تھرّا اُٹھے اور سوائے سچ کے کچھ کہتے نہ بن پڑے۔

یہ تو تناسبِ افعال سے پیغمبر صاحب کی صداقت پر استدلال ہوا۔ اب قیافے کی رُو سے استدلال کیا جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ خانۂ کعبہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا معبد ہے اور تمام عرب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ قدیم سے سارے عرب خانۂ کعبہ کا ادب کرتے چلے آئے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی سال در سال حج ہوتے تھے زمانۂ جاہلیت میں کچھ بیہودہ رسمیں داخلِ حج ہو گئی تھیں۔ اسلام نے اُن کی اصلاح کر دی پیغمبر صاحب نے دعوتِ اسلام شروع کی۔ تو مدینے کے چند حاجی ابتدا ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغے سے نکل کر مکے سے مدینے ہجرت کر آئے تھے۔ اور انھوں نے حج سے لوٹ کر مدینے میں عام خبر کر دی تھی کہ مکے میں فلاں صاحب نے نبوّت کا

ل۵۱ الٰہی مجھ کو اونچے مرتبہ کے ساتھیوں یعنی انبیاء اور صلحاء میں پہنچا ۱۲ ف۱ پیغمبر صاحب پیغمبر ہوئے پیچھے اپنے نفس پر بڑی مشقت اُٹھاتے تھے۔ راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں سوج سوج جاتے تھے پھر سارا سارا دن لوگوں کے سمجھانے اور وعظ کہنے میں گزر جاتا تھا اور نومسلموں کو کافروں کی ایذاؤں سے بچانا جدا۔ یہ خود بڑا کام تھا۔ غرض منصب نبوت کی ذمہ داری کا ادا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا اور پیغمبر صاحب خدمتِ رسالت کے بجا لانے میں اس قدر زحمت اُٹھاتے تھے جس سے خوف ہوتا تھا کہ ان کی تن درستی میں خلل واقع ہو گا اس لیے خدا نے بنظرِ مزید عنایت آپ کو زحمتِ شاقہ سے روک دیا ۱۲

ل۵۲ لام کا تعلق ظاہر کرنے کے لیے اُس کے ماقبل جملے کو ملاؤ تو مطلب بآسانی سمجھ میں آئے۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللّٰہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہٗ علیک ویھدیک صراطا مستقیما وینصرک اللّٰہ نصرا عزیزا۔ یعنی (اے پیغمبر یہ حدیبیہ کی صلح کیا ہوئی) حقیقت میں ہم نے کھلم کھلا تمہاری فتح کرا دی تاکہ (تم اس فتح سے نڈر ہو کر مدینے میں دینِ حق کی ترقی کے لیے اور زیادہ کوشش کرو اور) خدا (اس کے صلے میں) تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرے اور تم پر اپنے احسانات پورے کرے اور تم کو (دین کے) سیدھے رستے لے چلے (اور کوئی تمہارا مانع و مزاحم نہ ہو) اور خدا تمہاری زبردست مدد کرے ۱۲

ل۵۳ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ بہتان باندھے ۱۲

دعویٰ کیا ہے۔ اور وہ لوگوں کو شرک اور بُت پرستی سے پھیر کر خدائے واحد کی پرستش کی طرف بُلاتے ہیں اور چوں کہ باتیں معقول کہتے ہیں ہم تو اُن پر ایمان لے آئے ہیں اور اہل مکہ اور خود اُن کے قبیلے کے لوگ اُن کو اور ان کے چند اُن کے ہمراہیوں کو ناحق ناروا طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں اور ہم نے اُن سے عہد و پیمان کر لیا ہے کہ اگر آپ مدینے تشریف لے آئیں تو ہم ہر طرح آپ کی حمایت کریں گے۔ چنانچہ وہ صبح و شام آنے ہی والے ہیں۔ غرض آنے سے پہلے مدینے کے لوگ حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے جس دن آنے کو ہوئے سارا مدینہ مسلمان استقبال کے لیے اور نامسلم دیکھنے کے شوق میں باہر نکل کھڑے ہوئے۔ عبداللہ بن سلام جن کی نسبت پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ اِنَّہٗ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ[۱] اور جن کے بارے میں قرآن کی یہ آیت اُتری وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ[۲] روایت کرتے ہیں کہ میں اُس وقت تک اسلام نہیں لایا تھا اور مدینے کے باہر اپنے باغ میں درختوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہیں میں نے پیغمبر صاحب کا آنا سنا میں بھی دیکھنے دوڑا تو پیغمبر صاحب اونٹنی سے اُتر کر ابو ایوب انصاری کے گھر میں بیٹھ چکے تھے میں نے پیغمبر صاحب کو دیر تک بغور دیکھا اور میں اُن کا دعویٰ نبوت تو سُن ہی چکا تھا بے قصد میری زبان سے نکلا وَاللہِ مَا ھٰذَا الْوَجْہُ بِوَجْہِ کَذَّابٍ[۳]

در دلِ ہر قوم کش از حق مزہ است — روے و آوازِ پیمبر معجزہ است

پس مولانا نے اگرچہ عبداللہ بن سلام کی طرح پیغمبر صاحب کو دیکھا نہیں مگر اُن کا حلیہ اُن کا سراپا۔ اُن کی کتابوں میں دیکھا جو شمائل پر لکھی گئی ہیں۔ مزید احتیاط کے لیے مولانا نے پیغمبر صاحب کے سراپا کو قیافے کی کتابوں سے ملایا تو سارا سراپا محاسن اخلاق پر دلالت کرتا تھا۔ اس موقع پر مولانا فرماتے ہیں کہ اے کاش میں نے پیغمبر صاحب کو دیکھا ہوتا مگر ایسے نصیب کہاں تھے۔ یا اب خواب میں ایک نظر دیکھ لوں کیوں کہ حدیث میں آیا ہے۔

مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِیْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ بِیْ (رواہ البخاری)

پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ جس نے مجھ کو (یعنی میرے حلیے اور سراپا کو) خواب میں دیکھا درحقیقت اُس نے مجھ ہی کو دیکھا کیوں کہ شیطان میری صورت بن کر خواب میں نہیں آتا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

تاہم قیافے کی بات کچھ ایسی مہتم بالشان بات نہ تھی کہ مولانا نے اُس کو پیغمبر صاحب کی صداقت کا ثبوت سمجھا ہو بلکہ من جملہ مؤیدات کے ایک مؤید ٹھہری) بات تو تناسبِ افعال ہے کہ فطرتاً افعال میں بے مناسبتی ہونے نہیں دیتی۔ اَلْعَادَۃُ کَالطَّبِیْعَۃِ الثَّانِیَۃِ۔ تو مولانا نے پیغمبر صاحب کے خصائل اور عادات اور اخلاق اُن کی زندگی کے واقعات روزمرہ سے اخذ کیے جیسے بھی کتابوں میں مرقوم ہیں بے شک ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جن پر ایک غیر مذہب والا جو پہلے سے پیغمبر صاحب کی طرف سے بدظن ہو نکتہ چینی کر سکتا ہے مگر پھر بھی مجموعی حالات ایک خالی الذہن آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کہ پیغمبر صاحب معتدل اور سلیم فطرۃ کے فرد اکمل تھے۔

---

[۱] بے شک یہ شخص جنتیوں میں سے ہے ۱۲ [۲] اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے گواہی دی ۱۲ [۳] بخدا یہ شان و صورت جھوٹے منہ کی نہیں ہے ۱۲

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (اے پیغمبر) بے شک تمھارے اخلاق البتہ بڑے (اعلیٰ درجے کے) ہیں

اور اُن میں فطرۃِ سلیم کا ملکہ ایسا راسخ تھا کہ وہ اُس کے خلاف کر نہیں سکتے تھے اور اِسی کو مولانا پیغمبر کہتے ہیں خیر اَور اخلاق کو تو رہنے دیجئے صرف صدق کو لیجئے جس کی اِس وقت بحث ہے مولانا فرماتے ہیں قاعدہ کُلیہ ہے کہ آدمی کے تمام افعال معلّل بالاغراض ہوتے ہیں۔ یعنی آدمی کے ہر ایک فعل کا محرّک اور سبب کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے۔ اور وہ مطلب دو قسم سے خالی نہیں لالچ یا خوف۔ سو لالچ اور خوف دونوں کئی طرح کے ہیں۔ لالچ ہے دولت کا۔ لالچ ہے سلطنت اور لوازمِ سلطنت یعنی حکومت اور برتری اور ترفع اور تفضیل کا۔ لالچ ہے انتقام کا۔ علیٰ ہذا القیاس خوف بھی طرح طرح کے ہوسکتے ہیں منفعت حاصلہ کے فوت ہو جانے کا خوف۔ بدنامی کا خوف۔ با جمل طور پر کہنا چاہو تو لالچ ہے فائدے کا اور خوف ہے نقصان کا۔ چوں کہ ہر ایک آدمی کے خاص اغراض ہوتے ہیں اس لیئے فائدے اور نقصان کی صورتوں اور قسموں کو ہم محصور نہیں کرسکتے۔ لیکن جہاں تک پیغمبر صاحب کی اغراض پر نظر احاطہ کرسکتی ہے اُن کا لالچ اور خوف اگر ہوتا تو اِن ہی صورتوں میں سے کسی صورت میں ہوتا جو مولانا نے گنوائیں۔ لیکن آں حضرت کے حالات پکارے کہہ رہے ہیں کہ اگر بالفرض اُنھوں نے جھوٹ مُوٹ نبوت کا دعویٰ کیا تو کوئی محرّک اُن کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ پس اذا فات الشرط فات المشروط۔ "جب شرط ہی نہیں تو مشروط کہاں" کی رو سے جھوٹ دعویٰ نبوت کرنا غلط یعنی صداقت ثابت۔

ایک تاریخی واقعہ جس سے کسی نے انکار نہیں کیا اور نہ اُس میں انکار کی گنجایش ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخویف و تطمیع دونوں پیغمبر صاحب کے حق میں بے اثر محض تھیں۔ جب پیغمبر صاحب مبعوث ہوئے اور قرآن مجید اُترنا شروع ہوا تو آپ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو تبلیغ کی اور جب دیکھا کہ آپ کے وعظ و نصیحت کا ان پر کچھ اثر نہیں پڑتا تو حرم کعبہ میں تشریف لا کر اُس پتھر پر کھڑے ہوئے جو آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نصب کیا تھا اور بآوازِ بلند فرمایا۔ اے گروہِ قریش میں تم کو خدا کی توحید اور اپنی رسالت کی طرف بلاتا ہوں میری بات مانو اور شرک و بت پرستی ترک کردو۔ ایسا کرو گے تو دین و دنیا کی بادشاہت تمھیں نصیب ہوگی جس کو سُن کر کفار نے ایک بڑا قہقہہ لگایا اور آپس میں لگے کہنے کہ محمد کو جنون ہوگیا ہے۔ پیغمبر صاحب موقع بموقع وعظ فرماتے اور رات دن توحیدِ خداوندی کی منادی کرتے تھے مگر کفار ہر موقع پر آپ سے استہزا کرتے اور توہین و تذلیل میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھتے۔ کچھ دنوں تک آپ نے صرف توحید کے وعظ پر بس کی مگر جب دیکھا کہ منکرین بت پرستی سے باز نہیں آتے اور پتھر مٹی کی بے جان اور عاجز مورتوں کو خدائے تعالیٰ جلّ وعلا کی ذات و صفات میں شریک کیئے جاتے ہیں تو آپ نے اُن کو مشرک کے ذلیل لقب سے خطاب کرنا اور اُن کے دین کو سر تا سر گمراہی و ضلالت بتانا شروع کیا۔ اِس پر جہلائے قریش کو سخت طیش آیا اور اُنھوں نے آپ کے چچا ابوطالب کو کہلا بھیجا کہ اپنے بھتیجے کو روکو کہ وہ ہمارے دین کی سخت ہجو کرتا اور ہمارے آبا و اجداد کو بُرائی سے یاد کرتا ہے۔ لیکن جب ابوطالب پر اُن کے اِس پیام کا کچھ اثر نہ ہوا تو چند روسائے قوم جمع ہو کر خود ابوطالب کے پاس گئے اور کہا اب تک تو ہم آپ کی بزرگی اور جلالت شان کی وجہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ صبر و تحمل کرتے رہے مگر اِس کے آگے ہم سے تحمل نہیں ہوسکتا یا تو محمد کو ان باتوں سے باز رکھیئے یا اُسے اور ہمیں دونوں کو چھوڑ کر آپ

کنارہ کش ہو جایئے تاکہ ہم بھی غارت ہو جائیں یا وہی۔ ابوطالب نے پیغمبر صاحب کو بلا کر قریش کی اس گفتگو سے مطلع کیا اور کہا فرزند من! اپنی جان کو اور اپنی جان کے ساتھ مجھ بوڑھے کی جان کو ہلاکت سے بچالو۔ اور اس قدر بوجھ مجھ پر نہ ڈالو جس کی مجھکو برداشت نہ ہو۔ پیغمبر صاحب نے ابوطالب کی یہ گفتگو سن کر خیال کیا کہ شاید چچا میری حمایت سے دست بردار ہوا چاہتے ہیں۔ آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب میں فرمایا کہ چچا! اگر یہ لوگ اس امید پر کہ میں اس عظیم الشان امر کی بجا آوری سے پہلوتہی کروں گا میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لا رکھیں تو بھی میں اس سے ہرگز دست کش نہ ہوں گا میں اس بات کا بیڑا اٹھا چکا ہوں کہ تاوقتیکہ خدا اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے یا میں اس کوشش سے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ابوطالب پر پیغمبر صاحب کے اس جملے نے وہ اثر کیا کہ بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا اِذْهَبْ يَا ابْنَ اَخِيْ فَقُلْ مَا اَحْبَبْتَ فَوَاللّٰهِ لَا اُسْلِمُكَ لِشَيْءٍ اَبَدًا۔ یعنی میرے بھتیجے! تم جاؤ اور جو بات تم کو پسند ہو بے دھڑک کہہ گزرو خدا کی قسم میں دشمنوں کے ہاتھوں میں تمہیں ہرگز نہ سونپوں گا اور ساتھ ہی ذیل کے اشعار فی البدیہہ پڑھے[۱]

واللہ لن یصلوا الیک بجمعھم   حتی اوسد فی التراب دفینا

فاصدع بامرک ما علیک غضاضۃ   وابشر وقر بذاک منک عیونا

ودعوتنی وزعمت انک ناصحی   ولقد صدقت وکنت ثم امینا

وعرضت دینا لامحالۃ انہ   من خیر ادیان البریۃ دینا

لولا الملامۃ اوحذار مسبۃ   لوجدتنی سمحا بذاک مبینا

قریش کو جب معلوم ہوا کہ ابوطالب پیغمبر صاحب کی حمایت سے پہلوتہی کرنا نہیں چاہتے تو اپنی قوم کے ایک رئیس زادے مغیرہ کے پوتے ولید کے بیٹے عمارہ کو جو نہایت خوبصورت اور خوب صورت ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا ابوطالب کے پاس لے کر حاضر ہوئے اور کہا آپ اسے متبنّٰی کر لیجیے۔ یہ آپکے بڑھاپے میں کام آئے گا۔ اور اس کے عوض اپنے بھتیجے کو جس نے آپ کی قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور آپ کے آباو اجداد کو احمق و بیوقوف بنا تا ہے ہمارے سپرد کر دیجیے تاکہ ہم دنیا سے اُس کا جھگڑا ہی پاک کر دیں۔ ابوطالب نے اس نامعقول درخواست کا نہایت دل شکن جواب دے کر انہیں رخصت کر دیا اور یہ معلوم کر کے کہ کفار پیغمبر صاحب کے قتل پر آمادہ ہیں اپنے قبیلے اور خاندان کے لوگوں کو پیغمبر صاحب کی حمایت و نصرت پر آمادہ کیا۔ ابولہب کے سوا تمام بنی ہاشم پیغمبر صاحب کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے مگر یہ لوگ تھے ہی کتنے ایک قبیلہ یا ایک خاندان ایک شہر کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنا تو ضرور ہوا کہ پیغمبر صاحب بنی ہاشم کی حمایت کی وجہ سے چند روز تک کفار کی ایذاؤں سے محفوظ رہے مگر غریب نو مسلم تو جب تک مکے میں رہے مخالفوں کی ایذاؤں

---

[۱] خدا کی قسم اگر یہ سب لوگ مل کر بھی تمہیں ضرر پہنچانا چاہیں تو جب تک میں زمین میں دفن نہ ہو جاؤں تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ تمہیں جو حکم ہوا ہے اُسے کھول کر سنا دو اس میں تمہاری کچھ ذلت نہیں اور خوش ہو اور اس سے آنکھیں ٹھنڈی کرو تم نے مجھے اسلام کی طرف بلایا اور میں جانتا ہوں کہ تم میرے خیر خواہ ہو اور بس پہلے ہی تم صادق اور امین کے لقب سے پکارے جاتے ہو تم نے مسلمین پیش کیا جو مخلوق کے تمام دینوں سے یقیناً بہتر ہے اگر مجھے ملامت و دشنام ہی کا خوف نہ ہوتا تو تم مجھے اپنا کھلا ہوا مددگار پاتے ۱۲

کے شکار ہی رہے ۔ خلاصہ یہ کہ کفار نو مسلموں کو اور خود پیغمبر صاحب کو تکلیفیں پہنچانے میں حتی الامکان کوئی وقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے ۔ اور جب دیکھتے کہ درشتی اور سختی سے مدّعا حاصل نہیں ہوتا تو نرمی اور ملائمت سے کام نکالنا چاہتے تھے ۔ چناں چہ ایک دن کا ذکر ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جو اپنی قوم میں بڑا رئیس اور ذی وجاہت اور مالدار تھا اپنی قوم کے اشارے سے پیغمبر صاحب کے پاس آیا اور خلافِ معمول نہایت نرمی اور ملائمت اور تسلّی اور دل جوئی کے ساتھ کہا میرے بھتیجے تم صاحب اوصافِ جمیلہ اور عالی خاندان ہو پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے معبودوں کو سب وشتم کے ساتھ یاد کرتے ہو اور اُن کی عبادت و بندگی کی وجہ سے ہمیں بے وقوف اور پاگل بتاتے ہو اور ہماری قوم میں تفرقہ ڈالتے ہو کیا اس سے تمہارا یہ مقصود ہے کہ کسی مال دار حسین وجمیل اور عالی خاندان عورت سے تمہاری شادی ہو جائے ۔؟ اگر یہی غرض ہے تو مکّے بھر میں جس عورت کو تم پسند کرو ہم ابھی اُس سے تمہاری شادی کرادیں اور اگر مال وزر مطلوب ہے تو ہم ابھی تمہارے پاس اس قدر دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر حکومت وسرداری کی تمنّا ہے تو ہم سب لوگ تم کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم تمہاری اطاعت کے آگے اسی طرح سرِ تسلیم خم کیئے رہیں گے اور تمہاری فرماں برداری بالکل اسی طرح کریں گے جس طرح ایک بڑے جلیل القدر جبّار بادشاہ کی کی جاتی ہے ۔ اور اگر کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے یا جنّ پری کا اثر معلوم ہوتا ہے اور تم اُس کے دفعیے سے عاجز ہو تو ہم سے صاف صاف کہدو ہم کسی ایسے حاذق و ماہر معالج کو تمہارے واسطے تلاش کر کے لائیں گے جو تم کو تن درست کر دے گا ۔ جب مغیرہ بن شعبہ یہ کہکر خاموش ہوا تو پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ بس کہہ چکا یا کچھ اور کہنا باقی ہے مغیرہ بولا کہ اتنا ہی کہنا تھا ۔ پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ اچھا بیٹھ جا اور سُن اور آپ نے سورۂ فصّلت[۱] کی چند

---

[۱] حٰمٓ ۝ تنزیلٌ من الرحمٰن الرحیم ۝ کتابٌ فصّلت اٰیاتہٗ قراٰنًا عربیًا لقومٍ یعلمون ۝ الخ تا آخر ترجمہ :- حٰمٓ (یہ فرمان ۔ خدائے) رحمٰن (و) رحیم (کے حضور) سے صادر ہوتا ہے ۔ یہ قرآن کتاب ہے جس کی باتیں زبانِ عربی میں سمجھدار لوگوں کے لیئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں (ماننے والوں کو خوشنودیِ خدا کی) خوش خبری سُناتا اور (منکروں کو عذابِ خدا سے) ڈراتا ہے اس پر (بھی) اُن میں سے اکثروں نے مونھ موڑ لیا اور وہ (اُس کو) سنتے ہی نہیں اور (اے پیغمبر یہ لوگ یہ بھی) کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہمارے دل تو اُس سے پردے میں ہیں (کہ تمہاری بات دل کو نہیں لگتی) اور ہمارے کانوں میں (ایک طرح کی) گرانی ہے (کہ تم جو کہتے ہو سنائی نہیں دیتا) اور ہم میں اور تم میں (ایک طرح کا) پردہ (حائل) ہے (کہ تم ہم پر کسی طرح کا اثر نہیں ڈال سکتے) تو (اس سے بہتر ہے کہ) تم (اپنے طور پر) عمل کیئے جاؤ ہم (اپنے طور پر) عمل کر رہے ہیں (اے پیغمبر تم ان لوگوں سے) کہو کہ میں (بھی) تم ہی جیسا بشر ہوں (مگر) مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس (وہی) ایک معبود ہے پس سیدھے اُسی کی طرف (مونھ کیئے) چلے جاؤ اور اُس سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو اور شرک کرنے والوں پر افسوس ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں البتّہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل (بھی) کیئے اُن کے لیئے (آخرت میں) بڑا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں ۔ (اے پیغمبر تم ان لوگوں سے) کہو کیا تم اُس (قادرِ مطلق کی خدائی) سے انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور تم (دوسروں کو) اُس کا ہم سر بناتے ہو یہی (خدا تو) سارے جہان کا پروردگار ہے اور اُسی نے زمین میں اُس کے اوپر سے (بھاری بھاری) پہاڑ گاڑ دیئے اور اُس میں ہر طرح کی برکت دی اور اُسی میں اُس کی پیداوار کا اندازہ بھی ٹھہرا دیا ۔ اور (یہ سب کچھ) چار دن میں (سب) مانگنے والوں کے لیئے برابر پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (اُس وقت تک) کہر (کی طرح کا) تھا تو اُس (کہر) کو اور زمین کو حکم دیا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے آؤ خواہ زبردستی سے آؤ (اور جو حکم ہم دیتے ہیں اُس پر کاربند رہو) دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے (حکم بجا لانے کو) حاضر ہیں اُس کے بعد دو دن میں اُس (کہر کے طبقات) کے سات آسمان بنا (دیئے) اور ہر ایک آسمان میں (جو انتظام خدا کو کرنا منظور تھا وہ) انتظام (کارکنانِ قضا وقدر کو) بتا دیا اور ورلے آسمان کو ہم نے (ستاروں کی قندیلوں سے) [بقیہ صفحۂ آئندہ]

آیتیں پڑھنی شروع کیں۔ غرض کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر صاحب پر دعویِ نبوت کے بارے میں لالچ اور خوف کا شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ حالات واقعاتِ نفس الامری ہیں جن کو دوست دشمن سب نے مانا ہے کہ پیغمبر صاحب اصل میں جزیرۂ عرب کے شہر مکّہ کے رہنے والے تھے مکّے کی عظمت جو کچھ ہے خانۂ کعبہ کی وجہ سے ہے کہ یہ معبد ابتدا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا بیچ میں کئی بار اس کی تجدید بھی ہوئی ہے۔ چوں کہ تمام عرب ان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور یوں بھی ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں اور اُن کو یہودی اور عیسائی اور مسلمان سب اہلِ کتاب یکساں مانتے ہیں۔ کعبہ قدیم الایّام سے تمام اہلِ عرب کا مقدّس پرستش گاہ رہا ہے۔ جب سے بنا ہر برس اُس کے حج ہوتے رہے ہیں۔ پیغمبر صاحب کے وقت میں بھی جزیرۂ عرب قبائل میں منقسم تھا اب بھی ہے۔ قبائل میں بزرگ ترین قبیلہ قریش کا تھا۔ اس لیے کہ یہی لوگ خانۂ کعبہ کے متولّی اور خدّام اور مجاور تھے یہاں تک اُن لوگوں کا ادب کیا جاتا تھا کہ عرب میں ذیقعدہ۔ ذی الحجہ۔ محرم۔ رجب کے چار مہینے چھوڑ کر باقی آٹھ مہینے عرب کے قبائل خود سر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ لڑائی کے مہینوں میں قریش کے سوائے کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی دوسرے قبیلے کی سرحدوں میں ہو کر گزر جائے مار ڈالتے تھے۔ لوٹ لیتے تھے اور امن کے چار مہینے بھی خانۂ کعبہ کے ادب سے قرار دے رکھے تھے کہ لوگ بے روک ٹوک کعبے کا حج اور عمرہ کریں۔ اور ان مہینوں میں دم لے کر لڑائی کے لیے بھی سانوٹے ہو جائیں۔ لڑائی کے مہینوں میں بھی قریش سے کوئی معترض نہیں ہوتا تھا بلکہ ملوکِ حوالی تک اُن کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے سارا عرب مشرک و بُت پرست تھا۔ خود قریش نے خانۂ کعبہ میں بُت بھر رکھے تھے۔ اور ہندوستان کے پانڈوں کی طرح اُن کی پوجا کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم اپنے جدّ امجد ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں حال آنکہ توحید کا چرچا اور زور و شور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع ہوا تھا

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝	میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رُخ اُسی (ذاتِ پاک) کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمان و زمین کو بنایا اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ شَاکِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (النحل)	بے شک ابراہیم (لوگوں کے) پیشوا ہو گزرے ہیں خدا کے فرماں بردار (بندے) جو ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے خدا کی نعمتوں کے شکر گزار۔ خدا نے اُن کو انتخاب کر لیا تھا اور اُن کو (دین) کا سیدھا رستہ (بھی) دکھا دیا تھا۔

قریش کی اور بھی کئی شاخیں تھیں۔ سب میں شریف تر بنی ہاشم۔ اُن میں شریف تر بنی عبد المطلب جن میں جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے کیوں کہ وہ عبد اللہ کے بیٹے اور عبد المطلب کے پوتے تھے اگر پیغمبر صاحب مذہب کی

{بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ} سجایا اور (سجانے کے علاوہ) حفاظت کے لیے بھی۔ یہ (اندازے) اُس (خدا) کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست (اور) دانا ہے پس اگر (اتنے سمجھانے پر بھی کفارِ مکّہ) سرتابی کریں تو (اے پیغمبر تم ان سے) کہہ دو کہ جیسی کڑک عاد اور ثمود پر ہوئی تھی اُسی طرح کی کڑک سے میں تم کو بھی ڈراتا ہوں ۱۲

چھیڑ چھاڑ نہ نکالیں تو شرافتِ ذاتی کے اعتبار سے تمام قریش کے سرگروہ ہوتے - خیر دین کی چھیڑ چھاڑ تو آگے چل کر شروع ہوگی خدا کو یوں منظور ہوا کہ پیغمبر صاحب ابھی بطنِ مادر ہی میں تھے کہ اُن کے والد نے قضا کی - دادا عبد المطلب متکفل پرورش ہوئے - مگر وہ خود کثیر العیال تھے - بیوہ بہو اور یتیم پوتے کا خرچ اور اُٹھانا پڑا - پیغمبر صاحب سات برس کے تھے کہ دادا کا بھی انتقال ہوگیا تو چچا ابو طالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے والد نے دست گیری کی - اس روداد سے پیغمبر صاحب کی مالی مقدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کی دنیاوی وجاہت کے لیے بڑی سخت ضرورت ہے - اس پر طرہ یہ کہ پیغمبر صاحب کی طبیعت خاص طرح کی واقع ہوئی تھی - شروع سے اُن کو از خود شرک اور بت پرستی کی چڑ تھی اور جن لوگوں میں اُن کو چار و ناچار رہنا تھا اُن کی عادات اُن کی اوضاع اُن کے اطوار یعنی خود اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے نہ اُن کے میلوں تماشوں میں شامل ہوتے نہ ناچ رنگ و شراب خواری اور قمار بازی کی صحبتوں میں شامل ہوتے - یہاں تک کہ زمانۂ طفولیت میں ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے بھی نہ تھے لوگوں کو کیا غرض پڑی تھی کہ بتوں کی صورت سے بھاگیں اور وہ زبردستی اِن کے سر ہوں - مان نہ مان میں تیرا مہمان - عمر کے ساتھ اجنبیت بڑھتی گئی ۲۵ برس کی عمر میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے اُن کا بیاہ بھی ہوگیا - مگر دل برداشتگی بدستور مکے سے تین میل کے فاصلے پر کوہ ابو قبیس میں حِرا نامی ایک غار ہے - گھر سے کئی کئی دن کا کھانا پانی لے جاتے اور غار میں اکیلے بیٹھے خدائے واحد کی عبادت کرتے - نتیجہ یہ ہوا کہ اسی غار میں ان کو پیغمبری ملی اور دینِ حق کی منادی یعنی دعوتِ اسلام کا حکم ہوا - اِس حکم کی تعمیل نے تو ایک دم سے سارے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگا دی اور اپنے بیگانے سب پیغمبر صاحب کے دشمن ہوگئے اس لیے کہ دعوتِ اسلام سے بتوں کی توہین - بزرگوں کی تحمیق ہوتی تھی - مکے کی مرجعیت اور خاص کر قریش کی روزی میں خلل پڑتا تھا - لوگوں نے بھی کوئی بے حرمتی نہ تھی جو پیغمبر صاحب کے ساتھ نہ کی ہو - آخر دعوت کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لے کر مدینے بھاگ جانا پڑا - اس بیان میں بہت سی ضروری باتیں چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ اصل مطلب دور نہ جا پڑے - پیغمبر صاحب کے حالات جو بیان کیے گئے آن کی بیتی - آن کی خاص طرح کی طبیعت - لوگوں سے اُن کی وحشت اور اجنبیت - اُن کی خلوت پسندی یہ سب تاریخی واقعات ہیں زمانے کی پتھر کی تختی پر ایسے گہرے کندہ کیے ہوئے ہیں کہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتے - اور ایسے صاف پڑھے جاتے ہیں کہ جیسے آج کندہ کیے گئے ہیں - اب ناظرین ان حالاتِ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے اور انصاف سے تجویز کریں کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کس مفاد کی توقع کر سکتے تھے - اسی دعوے سے تو اُن کی یہ گت ہوائی تھی اسی دعوے نے اُن کو شہر بدر کرایا سالہا سال پے در پے اس کا تجربہ ہوتے ہوتے پیچھے کوئی احمق سے احمق بھی فکر کرتا ایسے دعوے سے کسی فائدے کی توقع کر سکتا تھا نہ پیغمبر صاحب جیسا زیرک آدمی جس نے حقانیت کے بل پر صرف باتوں سے ایک عالم کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور خالی ہاتھ پانوں سے ایسی زبردست سلطنت قائم کر دی جس کی نظیر اقوامِ روزگار میں سے کسی قوم کی تاریخ میں پائی نہیں جاتی جھوٹ میں یہ قوت کبھی ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے - یہاں ایک بات یہ بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ دوسرے مذاہب والے مثلاً ہنود و نصاریٰ بھی اس استدلال کر سکتے ہیں بلکہ بدرجہ اولیٰ اس واسطے کہ وہ شمار میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہیں - بات یہ ہے کہ ہر ایک مذہب میں کچھ

نہ کچھ صداقت ضرور ہی کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ پس یہ اُن کا استدلال صحیح ہوگا لیکن وہی تھوڑی یا بہت صداقت کی وجہ سے۔

بہرحال یہ بات ثابت ہوگئی کہ پیغمبر صاحب نے کسی عاجل مفاد کی توقع پر پیغمبری کا غلط دعویٰ نہیں کیا لیکن ایک بات اور صاف کرنی چاہیے کہ پیغمبر صاحب بڑے زیرک آدمی تو تھے ہی یہ معلوم کر لیا ہو کہ آخر کار مجھ کو کامیابی ہونی ہی ہے اور اس دور دراز توقع پر پیغمبری کا غلط دعویٰ کر بیٹھے ہوں۔ غرض یہی بات صاف کرنے کے قابل ہے کہ پیغمبر صاحب کو اگر ایسی بے سروسامانی اور سارے جزیرۂ عرب اور خاص کر اہلِ مکہ اور متولیانِ خانۂ کعبہ کی ایسی سخت مخالفت کے ہوتے برسوں پہلے اپنی کامیابی کا علم ہوا تو کیوں کر ہوا۔ اپنی عقل کے زور سے ہوا تو یہ خلافِ فطرت ہے اور خود پیغمبر صاحب علمِ غیب کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔

لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (الاعراف)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو کسی طرح کا گزند (ہی) نہیں پہنچتا میں تو ان لوگوں کو جو ایمان لانا چاہتے ہیں (دوزخ کا) ڈر اور (بہشت کی) خوش خبری سنانے والا ہوں اور بس۔

اور اگر خداوند تعالیٰ کے بتانے سے ہوا

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور)

(مسلمانو) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اُس کو اُن کے لیے جما کر رہے گا اور خوف و خطر جو اُن کو (لاحق) ہے اس کے بعد عن قریب (ہی) ان کو (اس کے) بدلے میں امن دے گا کہ (باطمینان) ہماری عبادت کیا کریں گے (اور) کسی کو ہمارا شریک نہ گردانیں گے اور جو شخص ان تمام (احسانات) کے بعد ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اور وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ [5] تو دعویٰ نبوت جھوٹا نہ ٹھیرا۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ

اُسی کو غیب کی خبر ہے تو وہ اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر (ہاں اپنے) برگزیدہ پیغمبروں پر (مصلحۃً) کوئی بات ظاہر کرنی چاہتا ہے تو وہ (بھی اس احتیاط سے کہ) اُن کے آگے اور اُن کے پیچھے (فرشتوں کا) پہرہ (اُن کے ساتھ) رکھتا ہے تاکہ دیکھ لے کہ پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغام لوگوں کو پہنچا دیے

---

[5] اللہ تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرما چکا ہے کہ تم اُن پر قابض ہوگے تو یہ (خیبر کی غنیمت) تم کو دلوا دی ۱۲

أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (الجن)

ٹھیک پہنچا دیئے اور اُن کے سارے معاملات اُسی کے احاطہ (علم) میں ہیں اور اُس نے تمام چیزوں کی گنتی (تک اپنی نظر میں) کر رکھی ہے۔

ایک دوسری بات یہ رہی کہ خوف نبوت کے غلط دعوے کا محرک ہوا ہو تو یہ الٹی سے زیادہ ہے کیونکہ خوف کے معنی کیا ہیں۔ اُمورِ ناملائم جو آئندہ پیش آنے والے ہوں اُن سے تحرز اور تحفظ کا نام ہے خوف۔ وہ یہاں آئندہ کا کیا مذکور ہے جتنے اُمورِ ناملائم کسی ظالم کے خیال میں آ سکتے ہیں عین دعوے پیغمبری کے وقت سبھی تو پیغمبر صاحب کے ساتھ عمل میں لائے جا رہے تھے۔ مخالف اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے جس کا پیغمبر صاحب کو ڈر ہوتا۔

نکبل دعلم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و جاہ ... ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

غرض یہاں تک مولانا نے پیغمبر صاحب کی رسالت کو فطرت کی دلائل سے ثابت کر دیا۔ لوگ اثباتِ رسالت کے اور اور دلائل پیش کرتے ہیں مگر اُن سے مولانا کا اطمینان پورا پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ایسے کتنے مسلمان ہیں جو حقیقت میں دین دار ہیں۔ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں میں مرد و زن ملا کر مشکل چھ ہی لاکھ۔ اور چھ لاکھ بھی مولانا اس خیال سے کہتے ہیں کہ دوسری قومیں ہم مسلمانوں کو ایسا گیا گزرا نہ سمجھیں۔ خدا کے عفو و درگزر سے کام چل رہا ہے ورنہ ہمارے اعمال تو اس قابل ہیں کہ تختے کا تختہ غرق کر دیا جائے "مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب"۔ پھر چھ لاکھ جن کو مولانا نے دین دار فرض کیا ہے تقلیدی دین دار ہیں اور مذہبی شرائط کو صرف رسم کے طور پر بجا لاتے ہیں۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (الزخرف)

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور اُن ہی کے قدم بہ قدم ہم (بھی اُن کی) پیروی کر رہے ہیں۔

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (البقرہ)

بھلا اُن کے بڑے کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہِ راست پر چلتے رہے ہوں تو بھی (وہ اُن ہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے)۔

اُن کو بھول کر بھی خیال نہیں آتا اور اگر کوئی شامت کا مارا ایسا خیال ظاہر کرے تو وہ شاید اُس کا مونہہ نوچ لیں۔ ہاں بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ جن کی طبیعت حق جو واقع ہوئی ہے مگر وہ اُن خیالات کو جو بچپن سے اُن کے ذہن نشین ہو گئے ہیں دل سے دور نہیں کر سکتے۔ غرض تقلید کا جال ایسا زبردست جال ہے کہ اُس سے نکلنا بہت ہی مشکل ہے۔ اور تقلید اور تحقیق میں ٹھہرا بیر۔ اس سے تمام مذہب والوں میں اور از آں جملہ مسلمانوں میں بھی تحقیق کا دروازہ ایسا بند ہوا ہے کہ کھلنے کا نام نہیں لیتا۔ مگر آپس کی تو تو میں میں جس کا نام لوگوں نے کلام اور مناظرہ رکھ چھوڑا ہے ہر جگہ ہمیشہ ہوتی رہتی ہے تو اُس کو احقاقِ حق سے کچھ واسطہ اور سروکار نہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ... کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

غرض جناب پیغمبر صاحب کی صداقت کو مولانا نے نہایت عمدہ طور پر ثابت کیا ہے۔ حضرت نظامی فرماتے ہیں

فرستادہ خاص پروردگار ... رسانندہ حجت استوار

گراں مایہ تر تاج آزادگاں — گرامی تر از آدمی زادگاں
محمد کازل تا ابد ہر چہ ہست — بآرایش نام او نقش بست
چراغیکہ پروانہ بینش بدوست — فروغِ ہمہ آفرینش بدوست
ضماندارِ عالم سیہ تا سپید — شفاعت کنِ روزِ بیم و امید
درختے سہی سرو در باغِ شرع — زبیخے باصل آسمانے بہ فرع
زیارت گہِ اصلدارانِ پاک — ولی نعمتِ فرع خوارانِ خاک
چراغے کہ تا او نیفروخت نور — زچشم جہاں روشنی بود دور
سیاہی دہِ خالِ عباسیاں — سپیدی کشِ چشم شماسیاں
لب از بادِ عیسیٰ تہ از نوش تر — تن از آبِ حیواں سیہ پوش تر
فلک بر زمیں چار طاق افگنش — زمیں بر فلک پنج نوبت زنش
ستوں شد خرد مند از پشتِ او — دو انگشت کش گشت از انگشتِ او
خراج آورش عالم روم و رَے — خراجش فرستاد کسریٰ و کَے
محیطے چہ گویم چو بارندہ میغ — بیک دست گوہر بیک دست تیغ
بگوہر جہاں را بیار استہ — بہ تیغ از جہاں داد و دیں خواستہ
اگر شحنہ تیغ بر سر برد — ق — سرِ تیغ او تاج و افسر برد
بسر بردنِ خصم چوں پے فشرد — بسر برد تیغے کہ بر سر نبرد
قبائے دو عالم بہم دوختند — وزاں ہر دو یک پیر افروختند
چو گشت آں طرازِ قبا جائے او — بدستے کم آمد ببالائے او
ببالائے او کایزد آراستست — ہم آرائشِ ایزدی خواستست
کلیدِ کرم بود در ہر دو کار — کشادہ بدو قفل چندیں حصار
فراخی بدو دعوتِ تنگ را — گواہی براعجازِ او سنگ را
تہی دست سلطانِ پشمینہ پوش — غلامی خرد پادشاہی فروش
زمعراجِ او در شبِ ترکتاز — سرِ گردنانِ فلک را طراز
شب از چترِ معراجِ او سایہ — وزاں نردباں آسماں پایہ

پیغمبر صاحب کا ادب مولٰنا فرماتے ہیں کہ: آداب جمع ہے ادب کی۔ ادب کا سب سے بہتر ترجمہ جس سے ادب کے ٹھیک مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہو جائے پاس اور لحاظ ہے۔ جس کا ادب کیا جاتا ہے اس کے تعلق سے ادب حق ہے اور ادب کرنے والے کے تعلق سے فرض۔ آدمی اپنے سے برتر کا ادب کرتا ہے تو برتری کئی طرح کی ہوتی ہے:

برتری رشتے اور قرابت کی - برتری عمر کی - برتری علم و ہنر کی - برتری استادی اور تعلیم و ارشاد کی - برتری حکومت کی - برتری دولت کی - برتری احسان کی - برتری دینداری کی اور سب سے بڑھ کر برتری رسالت کی کہ پیغمبر بہت سی برتریوں کا جامع ہوتا ہے - پیغمبر صاحب کے ادب کی حد معلوم کرنا چاہو تو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر سے معلوم کر سکتے ہو ادب کے طریقے خود خدا تعالیٰ نے قرآن میں بتا دیئے ہیں - ایک سجدہ تو خدا کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں باقی ہر طرح کا ادب ہر طرح کی تعظیم و توقیر سب سے بڑھ کر پیغمبر صاحب کا حق ہے - بس اتنی احتیاط چاہیے کہ وہ ادب عبادت کی حد تک نہ پہنچنے پائے جن کو مرقدِ مبارک کی زیارت نصیب ہو اُن کو اس بات کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے پیغمبر صاحب کے ادب کے اکثر مواقع تو اُن کی وفات اور وہ وقت گذرے ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئے پیغمبر صاحب موجود نہیں کہ وہ بلائیں اور ہم سر کے بل دوڑے جائیں - وہ ارشاد فرمائیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہیں - اُن کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہو تو دھیمی آواز سے عرض کریں - پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات زندہ نہیں کہ ہم انہیں ماں سمجھیں اور اپنی ماؤں سے بڑھ کر اُن کا ادب کریں - اب تو یہی ادب ہمارے نصیبوں میں ہے کہ پیغمبر صاحب کی عظمت دل میں ہو اُن کی دل سوزی نصب العین - اُن پر درود و سلام بھیجتے رہیں - اُن کے ارشادات کی تعمیل میں سعادت دارین سمجھیں - ایسا تو کوئی بدبخت مسلمان نہ ہوگا کہ پیغمبر صاحب کا ادب اُس کو ملحوظ نہ ہو - اگر پیغمبر صاحب کے ادب کے متعلق مسلمانوں سے غلطی ہوتی ہے تو وہ افراطِ ادب ہی کہ پیغمبر صاحب کو خدا اور ادب کو عبادت بنا دیتے ہیں جو شرکِ جلی ہے ایک شاعر کہتا ہے -

احمد کو ہم نے جان رکھا ہے وہی احد — مذہب کچھ اور ہوگا کسی بوالفضول کا

اور غضب یہ ہے کہ انا احمد بلا میم والعرب بلا عین ایسے ایسے جھوٹے اور غلط دعوے پیغمبر صاحب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ[1] بلکہ پیغمبر صاحب تو رہے اپنی جگہ متصوفوں کے گروہ میں تو بزرگانِ امت کو شریک خدائی بنایا جاتا ہے ایسے ہی لوگوں کے حق میں وعید وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ[2] نازل ہوا حالانکہ پیغمبر صاحب اور عشرہ مبشرہ کے علاوہ ہم کو کسی کی عاقبت کا حال معلوم نہیں ہاں اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ[3] کے قاعدے سے ہم سب گزشتگان کے حق میں حسن ظن رکھتے ہیں - بہرکیف توحید کا رستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے - بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھنا ہوگا -

اتباعِ سنت مولانا فرماتے ہیں کہ لغت کی رو سے تو سنت کے معنی طور و طریق کے ہیں مگر محدثین اس سے مراد لیتے ہیں طور و طریق جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا - اصحاب کا - تابعین کا - سنت کی اس تعریف میں اصحاب اور تابعین اور طور و طریق یہ تین لفظ تشریح طلب ہیں - سو اصحاب جمع ہے صحابی کی اور صحابی وہ ہے جو اسلام لایا اور اس کو شرفِ صحبت پیغمبر بھی حاصل ہوا اور عقیدۂ اسلام ہی پر اُس نے وفات پائی - صحبت کے لیے مدت کی قید نہیں - تھوڑی ہو یا بہت جو نسبت صحابی کو پیغمبر صاحب سے وہی نسبت تابعی کو صحابی سے یعنی تابعی وہ ہے جس کو کسی صحابی کے ساتھ صحبت رہی ہو اسلام کی شرط بدستور

[1] حاشا و کلا یہ تو بڑا بھاری بہتان ہے ۱۲ [2] اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں ۱۲ [3] اپنے مُردوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو ۱۲

یہ طور و طریق سے مراد ہے قول۔ اور فعل۔ اور تقریر۔ تقریر سے گفت گو مراد نہیں بلکہ تقریر یہ ہے کہ کسی کو کچھ کرتے دیکھا یا کچھ سنا اور خاموش ہو گئے۔ ردّ و انکار نہ کیا جس سے سمجھا گیا کہ قول یا فعل کو جائز رکھا پس سنت تو قسم کی ہوئی۔ (۱) پیغمبر صاحب کا قول۔ (۲) پیغمبر صاحب کا فعل۔ (۳) پیغمبر صاحب کا کسی کے قول یا فعل کو جائز رکھنا۔ اسی طرح کی تین قسمیں صحابی کے تعلق سے پھر اسی طرح کی تین قسمیں تابعی کے تعلق سے۔ یہ سب ہوئیں تو خود پیغمبر صاحب کی سنت کی پیروی کے لیے تو قرآن ناطق ہے۔ [۵۱] اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ صحابہ کے حق میں پیغمبر صاحب فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ۔ رہے تابعی ہم ان کی پیروی حدیث خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ سے استنباط کرتے ہیں کہ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ عہد صحابہ کی بشارت ہے۔ پہلا اَلَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ تابعین کو اور دوسرا اَلَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ تبع تابعین کو۔ بہرکیف ہم کو قرآن کے علاوہ خدا کے حکم سے پیغمبر صاحب کی اور پیغمبر صاحب کے حکم سے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرنی ہے اور پیروی بھی کرنی ہے تو ان کے فعل کی قول کی تقریر کی۔ جس کے معنی ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور چوں کہ قول اور فعل اور تقریر میں کسی قسم کی تصریح اور تخصیص اور تعیین نہیں بلکہ قرآن میں اتَّبِعُوْنِیْ اور حدیث میں اقْتَدَیْتُمْ دونوں لفظاً عام ہیں تو اس پیروی کا مطلب یہ ٹھیرا کہ ہم ایسے سخت شکنجے میں کسے ہوئے ہیں کہ دائرۂ تقلید سے پاؤں باہر نہیں رکھ سکتے۔ یا یوں کہو کہ ہم کو بالکل اسی طرح زندگی بسر کرنی چاہیے جس طرح پر اب سے ہزار برس پہلے قرونِ اولیٰ کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ۔ ایک طرف تو عام پیروی سے یہ زبون نتیجہ نکلتا ہے اور دوسری طرف [۵۵] مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ۔ اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ سے پایا جاتا ہے کہ دین اسلام میں کسی طرح کی تنگی نہیں۔ اور ان دو متضاد باتوں یعنی تنگی اور فراخی دونوں کا ماخذ قرآن حال آنکہ خدائے تعالیٰ جلّ شانہ نے قرآن کے کتابِ آسمانی ہونے کے جہاں اور بہت سی دلائل قرآن میں بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا۔ یعنی قرآن کی تعلیم میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ پس ضرور ہوا کہ اس تنگی اور فراخی کے اختلاف اور اختلاف بھی نہیں تناقض اور تضاد کو رفع کیا جائے۔ تو ہم نے رفع اختلاف کا پتہ یوں لگایا کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین مکّہ کی ایذادہی کی وجہ سے ہجرت فرما کر نئے نئے مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی وہی اسلام کی اشاعت اور لوگوں کے مشرکانہ اور فاسد عقائد کی اصلاح ان کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ مکّے میں تو زراعت فلاحت کا نہ پہلے ہی کہیں نام و نشان تھا نہ اب ہی یہاں

۵۱ (اے پیغمبر لوگوں سے) کہو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ (بھی) تم کو دوست رکھے اور تم کو تمہارے گناہ معاف کردے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۱۲ ۵۲ میرے صحابی ستاروں جیسے ہیں تم ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے راہ پاؤ گے ۱۲ ۵۳ زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ میرا ہے پھر ان لوگوں کا زمانہ بہتر ہے جو اس عہد کے لوگوں سے نزدیک ہوں گے اور پھر ان کا جو ان سے نزدیک ہوں گے ۱۲ ۵۴ صریح گھاٹا یہی کہلاتا ہے ۱۲ ۵۵ (مسلمانو!) دین (کے بارے) میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی (تمہارے لیے وہی) دین (تجویز کیا جو) تمہارے باپ ابراہیم کا تھا ۱۲ ۵۶ (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اللہ نے جو زینت کے (ساز و سامان) اور کھانے (پینے) کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں ان کو کس نے حرام کیا ہے ۱۲ ۵۷ اور اگر قرآن خدا کے سوا (کسی) کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بہت سا اختلاف پاتے

مدینے میں آکر دیکھا کہ کھیتی کے علاوہ نخلستان کی بڑی کثرت ہے یہاں تک کہ کھجوروں ہی پر گویا ان لوگوں کا گزارہ ہے کھاتے بھی ہیں بیچتے بھی ہیں مگر یہ لوگ کھجور کے درختوں میں نر و مادہ کی تفریق کرتے تھے جس طرح ہندوستان میں قلم کا دستور ہے یہ لوگ بار آور ہونے کی غرض سے کھجور کے نر درخت کا گابھا مادہ درختوں میں ملاتے اور اس عمل کو اپنی بولی میں تابیر کہتے تھے۔ پیغمبر صاحب کو نخلستان کی رکھوالی کا کبھی کاہے کو اتفاق ہوا تھا سمجھے کہ یہ بھی ان لوگوں کے زمانہ جاہلیت کے اوہام میں سے ہوگا تابیر کو منع فرما دیا سارا مدینہ ٹوٹی پڑ گیا لوگوں نے فریاد کی تو فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ یعنی میں نے اپنے خیال کے مطابق تابیر کو منع کر دیا تھا۔ اگر تابیر شرط بار آوری ہے تو کرو دنیا کی باتیں تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو پس اس واقعے سے ثابت ہوا کہ امور دنیا میں پیغمبر صاحب کی پیروی شرط دینداری نہیں اور پیغمبر صاحب کی نہیں تو صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی بدرجۂ اولیٰ نہیں۔ ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگی اور فراخی کا اختلاف جو سنت کی پیروی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا آسانی کے ساتھ رفع ہو گیا۔ مگر نہیں ابھی ایک مشکل درپیش ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم نے ہم کو پیروی سنت کی قید سے تو نجات دی مگر امور دنیا اور امور دین کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دکھایا کہ جب کبھی کوئی معاملہ پیش آئے ہم سمجھ سکیں کہ یہ امور دنیا میں ہے اور اس میں سنت کی پیروی ضرور نہیں۔ ورنہ ہم تو دنیا کو کچھ سمجھ اور دین کو غرض سمجھے ہوئے ہیں کہ دنیا میں شرعی شان کے ساتھ زندگی کرنے کا نام ہے دین۔ دنیا کو دین سے کیسے الگ سمجھ لیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اکثر اوامر و نواہی دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو مال و دولت کو فضول نہ اڑاؤ۔ یہ سب احکام دین ہیں اور یہ ہیں دنیا ہی کی باتیں۔ پس انتم اعلم بامور دنیاکم میں امور دنیا سے خاص خاص باتیں مراد ہونی چاہییں کہ اتباع سنت بھی فوت نہ ہو اور اسلامی آزادی و سہولت بھی باقی رہے ہم نے تو دین کی کتابوں سے یہ بات استنباط کی ہے کہ قرآن اسلام کا مکمل دستور العمل ہے اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ اس کے مکمل ہونے کا گواہ۔ مسلمانوں کو جو کچھ بھی دنیا اور آخرت کے لیے اس زندگی میں کرنا ہے قرآن میں اس کی بابت ہدایت موجود ہے۔ تو جہاں تک سنت سے احکام قرآن کی توضیح و تفسیر ہوتی ہو یا سنت قرآن کے کسی حکم کا طریق عمل بتاتی ہو یا سنت کا کوئی مسئلہ قرآن کی کسی اصل پر متفرع ہوتا ہو وہاں تک تو سنت کی پیروی ضرور ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی سنت ہے قرآن کے انتعوفی اور حدیث کے اقتدیم سے خارج مگر تاریخی حیثیت سے قابل قدر ہے۔

ادب میں افراط اور تفریط کا لحاظ ضرور رہنا چاہیے

چناں چہ مولانا فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کے سمجھنے سے فہم انسان قاصر ہے اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں ان میں سے ایک نبوۃ بھی ہے۔ ایک شاعر نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کیا خوب کہا ہے ؎ اُدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل ہو خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ادنیٰ رعیت ایک بادشاہ جلیل القدر کے ساتھ ہم کلام ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتا حالانکہ رعیت اور بادشاہ کچھ بھی ہوں پھر بھی ہم جنس اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ذرے کو آفتاب سے قطرے کو سمندر سے چیونٹی کو ہاتھی سے انما انا بشر مثلکم فی صدد و کم سے پھر بھی ایک طرح کی نسبت ہے اور نہیں ہے تو آدمی کو خدا سے آدمی آدمی ہی ہے اور خدا خدا ہی ہے۔

۵ اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے (اسی) دین اسلام کو پسند فرمایا ۱۲ کوئی اور چیز بھی بن جاتو جو تمہارے خیال میں آ رہی (سنت) ہو ۱۲

سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کس طرح ایک بشر سے بلا واسطہ یا بواسطہ ہم کلام ہوتا ہے۔ غرض نبوت ایک مشکل معما ہے جس کا حل کرنا مقدور بشر نہیں۔ بااین ہمہ ہم نبوت سے انکار بھی نہیں کر سکتے اس کے لیے بہت سے دلائل ہیں ناممکن التردید۔ پس پیغمبر کے بارے میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنا ہی ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم ایک حکایت نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ لوگ نبوت کے بارے میں کس کس طرح طریق مستقیم سے انحراف کرتے ہیں۔ دو شخص (دونوں مسلمان اور دونوں ایک ہی جگہ دلی کے رہنے والے بلکہ ایک دوسرے کے رشتہ دار بھی) ایک ساتھ حج کو روانہ ہوئے۔ ایک تھا متشدد غیر مقلد دوسرا کٹا مقلد۔ کسی طرح جدہ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ جدے پہنچ کر دونوں رفیق ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ غیر مقلد سیدھا مکے پہنچا اور اس نے ارکان حج اوقات مقررہ پر پورے پورے ادا کیے۔ مقلد نے جدے اتر کر پہلے مدینے کی راہ لی غیر مقلد نے کہا بھی کہ وقت تنگ ہے مدینے ہو کر حج میں شامل نہ ہو سکو گے۔ مقلد نے اس کی مطلق پروا نہ کی حج تو فوت ہو گیا مگر پیغمبر صاحب کے مزار مبارک کی زیارت بافراغت نصیب ہوئی۔ ادھر غیر مقلد مدینے نہ جا سکا۔ لوٹتیوں کو پھر دونوں جدے میں جمع ہوئے تو جس طرح غیر مقلد کو زیارت مدینہ سے محروم رہنے کا افسوس نہ تھا مقلد کو حج نہ کرنے کا کچھ ملال نہ تھا۔ یہ ہے وہ افراط و تفریط جس سے ہم مسلمانوں کو آگاہ کیے دیتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں کہیں تو پیغمبر صاحب کی حالت بشری کا بیان ہے تو وہاں عجز اور مسکنت ہے اور کہیں ان کے قرب الٰہی کا تو وہاں محبوبیت ہے فوق البشریت۔

تمام پیغمبروں کے حقوق سب پر یکساں ایمان لانا اور سب کی کتابوں کو برحق ماننا

مولانا فرماتے ہیں ہم مزید آگہی کے لیے ذیل میں ان پیغمبروں کی فہرست دی جاتی ہے جن کا ذکر بتصریح نام قرآن میں ہے۔ ان کے علاوہ خدا جانے اور کتنے پیغمبر آئے اور آئے تو کیا حکم خاص یعنی شریعت لے کر کس وقت کن لوگوں کی طرف۔ بات یہ ہے کہ بنی آدم کی حالت کو ثبات نہیں کہ شروع سے تمام روئے زمین کے آدمیوں کی ایک ہی حالت چلی آئی ہو۔ تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا اور وقتی اور مقامی خصوصیتوں کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی حالتیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں کسی جگہ ایک زمانے میں لڑائی جھگڑائی کے چرچے رہے ہیں تو دوسرے وقت شعر شاعری کے بعض لوگ شان دار عمارتوں کے دل دادہ رہے ہیں۔ کتنے سن بستی کے چوری رہزنی ڈکیتی کم تولنا کم ناپنا۔ ابھی تک بھی دنیا ان جرائم سے پاک نہیں۔ غرض حضرت آدم کی اولاد ایسی بے چین اور چلبلی اولاد ہے کہ ان کا کوئی وقت فساد سے محفوظ نہیں رہا ہے ایسی بداعمالیوں کی روک تھام کے لیے لوگوں کی مناسب حالت خدا وقتاً فوقتاً پیغمبروں کو بھیجتا رہا ہے۔ آدمی جسم و روح دو چیزوں سے مرکب ہے تو اس کے امراض اور علاج بھی دو طرح کے ہیں طب کی کتابیں امراض جسمانی کا علاج کرتی ہیں اور مذہبی کتابیں امراض روحانی کا۔ جالینوس طبیب الابدان ہے تو پیغمبر طبیب الارواح ہے اور طبیب یونانی اور ڈاکٹر کا طرز علاج گو مختلف ہو مگر مقصود علاج سب کا متحد ہے۔ اصلاح بدن۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو خدا نے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ[1] تعلیم فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہر ایک کے درجے بہ تمام پیغمبران خدا کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس سے کہ اسلامی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے پچھلے

[1] ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کو (بھی) جدا نہیں سمجھتے (یعنی سب کو مانتے ہیں)

پیغمبروں کی کسی طرح کی توہین لازم نہیں آتی - جیسے اس سے کہ ہم اس وقت ایڈورڈ ہفتم کی رعایا ہیں شاہان سلف کی - انبیاء سابقین علیہم السلام کی تعظیم کا مسئلہ بھی نازک اور احتیاط طلب مسئلہ ہے - انبیاء سابقین کی امتوں نے بعض کے ادب میں افراط کی کہ اُن کو خدا اور خدا کا بیٹا بنادیا تو ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ مسلمان اُن کے ادب میں تفریط کرتے ہیں جو لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ کے صریح خلاف ہے - پادریوں نے عہد عتیق اور عہد جدید یعنی توراۃ اور صحف سماوی اور انجیل کی اشاعت میں اتنا مبالغہ کیا کہ ہر ملک اور ہر زبان میں لاکھوں کروڑوں کتابیں چھپوا چھپوا کر مفت تقسیم کرتے پھرتے ہیں - بے شک ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ کتابیں منسوخ العمل ہیں اور کہیں کہیں یہودی اور عیسائی ان میں تحریف معنوی بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی خدائے پاک کا کلام پاک ہے اور اُس کا ادب واجب - مگر مسلمان ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں کہ عطار اُن کے اوراق سے پڑیاں بناتے یا شب برات میں لوگ اُن کو پٹاخوں کے کام میں لاتے - یا دوسری طرح پر اُن کی بے توقیری کرتے ہیں - یہ طریق عمل سخت بیہودہ اور موجب معصیت ہے ان کتابوں کی توہین میں انبیاء علیہم السلام کی توہین ہے - اور انبیاء کی توہین عین خدا کی - اعاذنا اللہ وسائر المسلمین منہا فانہم لا یکذبونک ولکن الظالمین بایات اللہ یجحدون - جس طرح تبرائی شیعوں کی ضد میں گروہ خوارج کھڑا ہوا اسی طرح عیسائیوں کی ضد میں جو مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں کچھ متعصب اور غالی مسلمان کھڑے ہوگئے ہیں جو ولادت مسیح علیہ السلام کو گوبر کے کیڑے کی ولادت سے تشبیہ دیتے اور عیسائیوں کی دعاء طلب رزق کو انکر الاصوات لصوت الحمیر سے - اگر لوگوں نے افراط فی الادب کرکے مسیح علیہ السلام کو خدا بنایا تو اس میں مسیح علیہ السلام کا کیا قصور ہے

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰـہَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَہُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْہِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ۝

اور (قیامت کے دن یہ معاملہ بھی پیش آئے گا کہ) اُس دن اللہ (عیسےٰ سے) پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسےٰ کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ خدا کے علاوہ مجھکو اور میری والدہ کو (بھی) دو خدا مانو (عیسےٰ) عرض کریں گے کہ اے پروردگار تیری ذات پاک ہے مجھ سے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ (میں تیری شان میں) ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں - اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو میرا کہنا تجھکو ضرور ہی معلوم ہوا ہوگا کیوں کہ تو (تو) میرے دل (تک) کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا غیب کی باتیں تو تو ہی خوب جانتا ہے تو نے جو مجھکو حکم دیا تھا بس وہی میں نے ان لوگوں کو کہہ سنایا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہارا (سب کا) پروردگار ہے اُسی کی عبادت کرو اور جب تک میں ان لوگوں میں موجود رہا میں ان کا نگران (حال) رہا پھر جب تو نے مجھکو دنیا سے اُٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے

سلہ اس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ۱۲

مناظرہ جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ مجادلہ کہلاتا ہے۔ ان وقتوں کے مسلمانوں کو جو نیک صلاح ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی غیر مذہب کے ساتھ مناظرے کے پہلو پر نہ آئیں۔ اور اگر بضرورت آنا پڑے تو مناظرے کو مجادلے کی حد میں نہ آنے دیں اور

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ

اور (مسلمانو) جو لوگ خدا کے سوا (دوسرے دوسرے معبودوں کو حاجت روائی کے لیے) بلایا (یعنی اُن کی پرستش کیا) کرتے ہیں اُن کو بُرا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) براہِ نادانی ناحق (ناروا) خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے۔

کی تعلیم مفید کو پیشِ نظر رکھیں۔ اوّل تو لوگ عموماً دین کی طرف سے غافل ہیں صرف قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کے لالے پڑے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ منسوخ کتابوں کا مطالعہ کیا کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص دین کی باتوں میں توغّل کرے اور مجتہدانہ پچھلی کتابوں کو دیکھتا پڑھتا رہے تو ہم اس کو کسی طرح کا الزام نہیں دے سکتے یہ خیال کرنا کہ پچھلی کتابوں کے پڑھنے سے آدمی اسلام کی طرف سے متشکّی ہو جائے گا واہمہ بے اصل ہے۔ ہم نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کو بالاستیعاب انگریزی عربی فارسی اُردو چاروں زبانوں میں بار بار پڑھا ہے اور پادری سکاٹن سے انجیل کی تفسیر بھی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے قرآن کی قدر آئی۔ اور جس کو تاریخی مذاق ہے اُس کے حق میں تو پچھلی کتابوں کا دیکھنا از بس ضرور ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اُس کو قرونِ خالیہ کے لوگوں کی حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی افتادِ مزاج اور الٰہی تربیت۔

اقتدائے پیغمبراں

مولانا فرماتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا اصلِ دین ایک تھا اور سب اُسی اصلِ دین پر متفق تھے۔ اُن میں اگر اختلاف ہوا ہے تو اصلِ دین میں نہیں بلکہ اُس کے طریقوں میں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اُن پر ایمان لانا اُن کی شریعتوں کو برحق جاننا۔ اُن کی کتابوں کا یقین کرنا اصلِ دین میں اقتدا کرنا۔ نفسِ نبوت میں ایک کو اعلیٰ دوسرے کو ادنیٰ۔ ایک کی تعظیم دوسرے کی تنقیص نہ کرنی فرض ہے اور تاوقتیکہ ہم ان باتوں کی پورے طور پر تعمیل نہ کریں مسلمان نہیں۔ اس امر کی تفصیل کہ انبیاء علیہم السلام کا اتفاق کن کن باتوں میں رہا ہے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء و رسل ہو گزرے ہیں سب کا اِس پر اتفاق ہے کہ عبادت و استعانت صرف خدا کا حق ہے۔ جو باتیں خدا کی بارگاہِ قدس کے نامناسب ہیں اُن سے وہ پاک و منزہ ہے۔ بندوں پر خدا کا حق ہے کہ اُس کی انتہا درجے کی تعظیم کریں۔ اپنی جانوں اور دلوں کو خدا کے حوالے کر دیں۔ شعائر اللہ کے ذریعے سے قربِ خداوندی حاصل کریں اور اِس بات کا پکّا اعتقاد رکھیں کہ حوادث کے پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا نے حوادث کو مقدّر کر دیا تھا۔ فرشتے خدا کے بندے ہیں۔ وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ انھیں جو حکم ملتا ہے اُس کی تعمیل کرتے ہیں اور بڑی سرگرمی سے تعمیل کرتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں میں سے جس کو مستحق اور قابل سمجھتا ہے اُس پر کتاب نازل فرماتا ہے۔ اپنی اطاعت بندوں پر فرض کرتا ہے۔ قیامت کا برپا ہونا مرے پیچھے جی اُٹھنا۔ جنت و دوزخ کا ہونا سب حق ہے علیٰ ہذا القیاس تمام انبیاء علیہم السلام اقسامِ طہارت اور نماز روزہ زکوٰۃ حج نوافل طاعت دعا ذکر کتابِ الٰہی کی تلاوت کے ذکر سے خدا کے حضور میں تقرب حاصل کرنے پر متفق ہیں۔ نکاح اور حرمتِ زنا پر متفق ہیں۔ عدل و انصاف قائم کرنے پر متفق ہیں۔

ہر طرح کے ظلم کو حرام بتانے پر متفق ہیں، نافرمانوں پر حدود قائم کرنے میں متفق ہیں۔ یہ باتیں امورِ دین کی بیخ و بنیاد ہیں اور ان پر تمام انبیاء علیہم السلام کا ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے۔ ہاں ان کی صورتوں اور شکلوں میں کچھ کچھ اختلاف ہوا کیا مثلاً شریعت موسوی میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف مونہ کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے پیغمبر کی شریعت میں کعبے کی طرف مونہ کرکے نماز پڑھنی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی حد سنگساری تھی۔ ہماری شریعت میں محصن کے لیے رجم اور غیر محصن کے واسطے تازیانے مقرر ہیں اور اسی پر قیاس کرلو اوقاتِ طاعت اور آدابِ طاعت اور ارکانِ طاعت کو۔ الغرض ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کرکے اصلِ شریعت میں اُن کی پوری پوری اقتدا کریں۔ اور سب کو خدا کے برگزیدہ اور مقبول بندے جانیں اُن میں سے ایک کی فضیلت اور دوسرے کی منقصت کے قائل نہ ہوں۔ ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بعض خصوصیات میں تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں درست ہے کہ اُن کی فضیلت و برتری اوروں پر ثابت کریں مگر اس کو کیا کریں کہ خود پیغمبر صاحب نے ہمیں اس سے منع کردیا ہے۔ امام بخاری نے ایک حدیث بایں مضمون نقل کی ہے کہ ایک یہودی اور ایک صحابی میں کچھ تکرار ہوگئی یہودی حضرت موسیٰؑ کی برتری ثابت کرتا تھا اور صحابی پیغمبر صاحب کو حضرت موسیٰؑ پر ترجیح دیتے تھے آخرکار صحابی کو غصہ آگیا اور انھوں نے یہودی کے مونہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ وہ آیا پیغمبر صاحب کے پاس۔ آپ نے سارا قصہ سُن کر فرمایا کہ مجھے حضرت موسیٰ پر ترجیح نہ دو کیوں کہ قیامت کے روز جب دوسری دفعہ صُور پھونکا جائے گا اور تمام اولین و آخرین بے ہوش ہوکر ہوش میں آئیں گے۔ تو موسیٰ عرش کا کونہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی اور لوگوں جیسے بیہوش ہوں گے یا نہیں۔ بخاری کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو تم یونس بن متّیٰ پر میری فضیلت اور برتری ثابت نہ کرنا۔"

ایمان بالکتب

مولانا فرماتے ہیں کہ تیسری چیز جس پر ایمان لانے کا حکم ہے کتابیں ہیں۔ جو خدا نے پیغمبروں پر نازل کی ہیں۔ بڑی کو کتاب اور چھوٹی کو صحیفہ کہتے ہیں۔ اور کبھی بڑائی چھٹائی کا لحاظ نہیں بھی کیا جاتا۔ جس طرح خدا نے پیغمبروں کا شمار ہم کو نہیں بتایا پیغمبروں کی کتابیں اور اُن کے صحیفے بھی محفوظ نہیں۔ یوں کہنے کو چار کتابیں بہت مشہور ہیں زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ اور آخر میں قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ مولانا اگرچہ فرماتے ہیں کہ ہم جناب مسیح علیہ السلام یا اُن کی والدہ یا انجیل کی مذمت کا کوئی کلمہ مونہ سے نکالیں سیدھے جہنم میں چلے جائیں مگر اسی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ مسلمان تو قرآن مجید کے ہوتے زبور اور توراۃ اور انجیل کی طرف التفات نہیں کرتے اور التفات کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ قرآن مجید ہمیشہ کے لیے تمام دینی و دنیاوی ضرورتوں کے لیے کفایت کرتا ہے۔ مگر عیسائیوں اور یہودیوں نے توراۃ کو محفوظ رکھا ہے۔ اس میں توراۃ و زبور کے علاوہ چند پیغمبروں کے صحیفے بھی شامل ہیں۔ مجموعے کو بائبل یعنی عہدِ عتیق کہتے ہیں اور عہدِ عتیق کے مقابلے میں انجیل کو عہدِ جدید۔ عہد کے معنی ہیں وہ معاہدہ جو خدا نے بندوں کے ساتھ کیا۔ ممکن ہے کہ عہدِ عتیق کے علاوہ کچھ صحیفے دوسرے پیغمبروں کے بھی ہوں۔ جو عہدِ عتیق کے مجموعے میں شامل نہیں۔ ہم مسلمان جو عہدِ عتیق اور عہدِ

جدید کی پروا نہیں کرتے - اِس کے یہی معنی ہیں کہ قرآن کے ہوتے ہم کو ان کتابوں کے پڑھنے اور ان کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہیں - اور قرآن کو جو ہم لوگ پچھلی کتابوں کا ناسخ مانتے ہیں وہ بھی اِسی معنی کر ہے - علاوہ بریں ان کتابوں میں تحریف بھی پائی گئی ہے یعنی پیغمبر صاحب آخر الزماں کی پیشین گوئیاں براہِ عداوت نکال ڈالی گئی ہیں اور جو باقی رہ گئی ہیں اُن کے معنی ایسے کرتے ہیں جن سے پیشین گوئیوں کا مصداق کسی اَور کو ٹھیراتے ہیں بایں ہمہ مولٰنا فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو تمام پیغمبروں کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے وہ ایمان بھی اجمالی ایمان ہے یعنی یہ کہ زبور - توراۃ - انجیل اجمالی طور پر ویسی ہی الہامی کتابیں ہیں جیسے قرآن نہ یہ کہ اُن میں کہیں تحریف نہیں ہوئی اور نہ یہ کہ اُن کے احکام اب واجب العمل ہیں قرآن میں جہاں کہیں اہلِ کتاب کا ذکر ہے اُن سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں سب سے پہلا دینِ الٰہی یہودیوں کا ہے پھر اُن سے جدا ہو کر نصاریٰ ہوئے - یہودیوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانا اور نہ اُن کی کتاب انجیل کو - پھر آخر میں ہم مسلمان ہوئے یہود اور نصاریٰ دونوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے قرآن سے انکار کیا اور ہم مسلمان ہیں کہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے بزرگوں اور دونوں کی کتابوں کو بھی مانتے ہیں جیسے نصاریٰ توراۃ کو اور تمام پیغمبروں کو جو عہدِ عتیق میں ہیں - مگر توراۃ میں داؤد اور سلیمان - اور لوط علیہم السلام کو پیغمبر نہیں کہا -

قرآن ہی ایک بہت بڑا معجزۂ اِسلام ہے

مولٰنا فرماتے ہیں کہ بہت سے کیا کُل تقلیدی مسلمان پیغمبر صاحب کی رسالت کی تائید میں معجزے اور پچھلے پیغمبروں کی پیشین گوئیاں پیش کرتے ہیں - مگر ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے مولٰنا چوں کہ فطرۃً فطرت پرست اور فطرت ہی کی وجہ سے وہ مسلمان ہوئے ہیں -

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم)

تو (اے پیغمبر) تم تو ایک (خدا) کے ہو کر (اُس کے) دین کی طرف رُخ کیے رہو (یہ) خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا یہی دین (کا) سیدھا (رستہ) ہے مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے ؛

غرض فطرت مولٰنا کے ساتھ آئی اور فطرۃ ہی اُن کے ساتھ قبر میں جائے گی - نہ فطرت اُن کو چھوڑ سکتی ہے اور نہ وہ فطرت کو چھوڑ سکتے ہیں - ع یہ ناطہ خدا کا لگایا ہوا ہے - یہ کیوں کر چھوٹ سکتا ہے - مذہب کی کوئی سی بات بھی ہو چھوٹی یا بڑی مولٰنا تو فطرت ہی کی کسوٹی پر کس کر اُس کا کھوٹا کھرا پرکھا کرتے ہیں معجزے کے معنی ہی خلافِ فطرت کے ہیں اور اسلام ٹھیرا عین فطرت - وہ دو مخالفوں کو جمع کرنا نہیں چاہتے - لوگ خلافِ فطرت سے خدا کی قدرت کے قائل ہوتے ہیں اور مولٰنا خود فطرت سے - خلافِ فطرت شاذ ہے اور فطرت اکثر - اکثر کو چھوڑ کر سچ ہے کہ وہ شاذ کا سہارا کیوں ڈھونڈیں تاہم وہ باتیں جو لٰنا کو معجزے کا انکار نہیں کرنے دیتیں - ایک خدا کی قدرت کہ وہ چاہے پانی سے جلانے کا کام لے اور آگ سے بجھانے کا دوسرے خدا کے کاموں میں دخل دینا چھوٹا مونہ بڑی بات ہے -

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (الانبیاء)

جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کی باز پُرس اُس سے نہیں کی جا سکتی اور (اُن لوگوں سے (اُن کے کیے کی) باز پُرس ہونی ہے -

ممکن ہے کہ خدا کسی مصلحت سے قانونِ فطرت کسی خاص صورت کے لیئے ملتوی کر دے۔ پس مولانا منکرِ معجزہ نہیں ہیں بلکہ فطرت کے ہوتے اپنے اطمینان کے لیئے معجزے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔ کیوں کہ معجزے کے ثبوت میں ایک کمزوری بھی ہے کہ واقعہ ہمارا چشم دید تو ہے نہیں۔ بلکہ معجزہ ہے اُس کا وقوع سیکڑوں برس پہلے کا ہے اور اُس کا ثبوت مدارِ شہادت اور شہادت بھی اُن ہی وقتوں کی شہادت اور اُن لوگوں کی شہادت جن کا نام ہی نام ہم نے سُنا ہے۔ بھلا ایسی شہادت کو فطرت کی شہادت سے کیا مناسبت۔ حدیثوں میں تو معجزات کا کچھ شمار نہیں۔ مگر قرآن میں کہیں صاف لفظوں میں پیغمبر صاحب کے معجزوں کا مذکور نہیں۔ بلکہ بعض مقامات میں تو معجزے سے صریح انکار کیا گیا ہے جیسے

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (بنی اسرائیل)

اور ہم کو (فرمائشی) معجزوں کے بھیجنے سے (کوئی اور وجہ) مانع نہیں (ہوئی) مگر یہی کہ اگلے لوگوں نے اُن کو جھٹلایا ف۱ چنانچہ ہم نے (قومِ) ثمود کو اونٹنی کا (کھلا ہوا) معجزہ دیا تھا پھر بھی لوگوں نے (نہ مان کر) اُس کو ستایا (یہاں تک کہ اُس کو ہلاک کر دیا) اور (یہ جو) ہم معجزے (بھیجا کرتے ہیں تو) صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجا کرتے ہیں ف۲

اور

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا

اور (اے پیغمبر کفارِ مکہ تم سے) کہتے ہیں کہ ہم تو اُس وقت تک تم پر ایمان لانے والے ہیں نہیں کہ (یا تو) ہمارے لیئے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اُس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی نہریں) جاری کر دکھاؤ۔

ف۱ پیغمبر صاحب سے معجزوں کی فرمائشیں ہوتی تھیں اور وہ ہر انی جتانی باتیں تھیں ایسی درخواستیں منظور نہیں ہوئیں۔ اور وہ منظور ہونے کے قابل بھی نہ تھیں ایسے ہی معجزوں کی نسبت فرمایا ہے کہ ہم نے اگلے لوگوں کی تکذیب کے خیال سے ایسے معجزوں کا بھیجنا بند کر دیا ہے اور مثال بھی فرمائشی معجزے ہی کی دی ہے کہ قوم ثمود نے حضرت صالح سے یہ درخواست کی تھی کہ پہاڑ سے اونٹنی پیدا ہو اُس پر بھی لوگوں نے نہ مانا اور ہمارے پیغمبر صاحب کے زمانے کے لوگ بھی اسی قسم کے تھے کہ فرمائشی معجزے دیکھتے اور نہ مانتے ورنہ دوسرے معجزات سے قطع نظر خود قرآن ایک عظیم الشان جیتا جاگتا معجزہ موجود ہے ۱۲

ف۲ یعنی معجزوں سے اس کے سوا کوئی اور غرض متعلق نہیں۔ قرآن کی تعلیم کا تو خلاصہ یہ ہے کہ لوگ دنیا کے معمولی واقعات آسمان اور زمین اور دن اور رات اور ہوا اور بادل اور مینہ اور بجلی اور موت اور حیات اور چیونٹی اور مچھر وغیرہ سے خدا اور اُس کی قدرتوں کے قائل ہوں۔ پیغمبر صاحب نے بھی معجزے دکھائے مگر اُنھوں نے معجزات پر کبھی زور نہیں دیا۔ اور چوں کہ معجزے کا وقوع ایک وقتِ خاص میں خاص شخصوں کے روبرو ہو سکتا ہے اور اُس میں بھی مخالفین چند در چند شکوک اور احتمال پیدا کرتے رہتے تھے۔ تو معجزہ کوئی ایسی مستحکم دلیل نہیں ہو سکتا ہے جس پر زور دیا جائے معمولی واقعات ایسے معجزات ہیں جو ہمہ وقت واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اور کسی کو اُن میں گنجائشِ انکار نہیں ہو سکتی۔ وہ خاص طبیعتیں ہیں جو معجزے کی محتاج ہیں اور جن کی ایسی طبیعتیں ہوتی ہیں وہ معجزے پر بھی مشکل سے ایمان لاتے ہیں وہ ایک واقعہ غیر معمولی دیکھ کر فی الفور ڈر جاتے مگر ادھر خوف زائل ہوا اُدھر پھر اصلی طبیعت کے شکوک نے عود کیا اور سحر وغیرہ پر محمول کرنے لگے ۱۲

أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل)

خدا یا فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لا کھڑا کر دیا (رہنے کے لیے) کوئی تمھارا طلائی گھر ہو یا آسمان میں چڑھ جاؤ اور جب تک تم ہم پر (خدا کے ہاں سے) ایک کتاب اُتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اُس کو پڑھ (بھی) لیں تب تک ہم تمھارے (آسمان پر) چڑھنے کو (بھی) باور کرنے والے نہیں۔ (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ سبحان اللہ میں کیا چیز ہوں یہی ایک بندہ بشر خدا کا بھیجا ہوا اور بس۔

معراج اور شقِ صدر دو معجزوں کا حوالہ قرآن میں دیا جاتا ہے تو بعض مفسروں نے اِن الفاظ کی ایسی توجیہ کی ہے کہ معجزہ گیا گزرا ہو جاتا ہے اور پھر مولنا فرماتے ہیں کہ معجزہ رسول کے اختیار کا تو نہیں۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد)

اور کسی رسول کی طاقت نہ تھی کہ بے حکم خدا کوئی معجزہ لا دکھائے۔ ہر ایک وقت (موعود) کے لیے (ہمارے ہاں ایک قسم کی) تحریر ہوتی ہے۔

تو معجزے سے رسالت پر استدلال کرنے کے کیا معنی۔ ہاں خدا کی قدرت پر استدلال کرو تو جائے سر بھی ہے۔ معجزات میں ایک قرآن کا معجزہ البتّہ لاجواب ہے۔ جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت بلاغت کا بڑا چرچا تھا قاعدے کی بات ہے کہ جب بہت لوگ مل کر ایک کام پر متوجّہ ہوتے ہیں تو اُس میں ضرور کامیابی ہوتی ہے۔ مثلاً یورپ و امریکا اور جاپان صنعت اور حرفت اور ایجاد میں منہمک ہیں تو اقوامِ روے زمین میں سب پر غالب اور سب سے پیش پیش ہیں۔ اُنھوں نے حکمتِ عملی میں ایک صدی کے اندر ہی اندر ایسی ترقّی کی ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ یہی حال پیغمبر صاحب کے زمانے میں عرب کا تھا کہ اپنی زبان کو معراج الکمال پر پونہچا دیا تھا اور اپنے سوا سب لوگوں کو عجم یعنی گونگے کہتے تھے فصحاے عرب نے قوتِ گویائی سے لوگوں کے دلوں کو مسخّر کر رکھا تھا۔ گویا شعرا ہر ملک میں حکمرانی کر رہے تھے سارے کمالات گویائی اور زبان آوری کے آگے ہیچ تھے۔ ایسے وقت میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ وہی عربی بولی تھی مگر خدا پیغمبر صاحب کی زبان سے بولتا تھا تو اُس کے الفاظ اور اُس کے مضامین کا کیا کہنا۔ اگر کلامِ خدا فصحا کے کلام سے کسی بات میں اُنیس بیس کے فرق سے بھی گرا ہوا ہوتا تو عرب کے لوگ جن کو اپنے حسنِ کلام پر بڑا فخر و ناز تھا اُس کو چٹکیوں میں اُڑاتے مگر باوجودے کہ اَلْحَقُّ مُرٌّ شرک اور بت پرستی کی مذمت ہوتی تھی یا پند و نصیحت کی ناگوار باتیں اور وہ بھی نثر میں مگر پیرایہ کچھ ایسا دل چسپ ہوتا تھا کہ جو سنتا تھا لٹّو ہو جاتا تھا۔ اور سرآمدِ شعرا اپنی جگہ لوہا مان گئے تھے۔ غرض خدا نے اہلِ عرب کو اُسی داو سے پچھاڑا جو اُن کو خوب رواں تھا۔ اِدھر سے بار بار تحدّی ہوتی تھی کہ

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اُتارا ہے اگر تم کو اُس میں شک ہو اور (یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورۃ (تم بھی بنا) لاؤ اور

تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (بقرہ)

اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بُلا لو ف ا پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو (دوزخ کی) آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور وہ) منکروں کے لیئے (دہکی دہکائی) تیار ہے۔

اور

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جنات جمع (ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں) کہ اس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنا لائیں تاہم اس جیسا نہیں (بنا) لاسکتے اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک (کمربستہ) ہو۔

اور اُدھر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا کچھ جواب نہیں۔ کیا معجزے کے سر میں سینگ ہوتے ہیں۔ ؟ اس سے بڑھ کر اَور معجزہ کیا ہو سکتا ہے اور یہ کیسی مزے کی بات ہے کہ اَور معجزے تو اس قسم کے ہیں کہ پیغمبر نے خلافِ فطرت ایک بات واقع کر کے دکھا دی معدودے چند نے دیکھا کسی نے جادو سمجھا کسی نے معجزہ۔ بات گئی گزری ہوئی۔ اب بعد الوقوع معجزہ ایک واقعۂ تاریخی ہو گیا بیٹھے بیٹھے تحقیقات کیا کرو کہ واقع میں ہوا بھی تھا یا وہی پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ قرآن یہ ایک ایسا زندہ معجزہ ہے کہ روزِ نزولِ قرآن سے الیٰ ساعتنا ھذہ برابر فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ اور۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن۔ کی تحدّی ہو رہی ہے اور جب تک قرآن پڑھا پڑھایا جائے گا یعنی روزِ قیامت تک ہوتی رہے گی کسی نے تحدّی کے جواب کی ہامی بھری ؟ کیا عربی زبان روئے زمین پر سے معدوم ہو گئی ؟ یا جن ملکوں میں عربی بولی جاتی ہے مخالفان اسلام نہیں بستے ؟ سوا تیرہ سو برس کے عرصے میں کسی نے تو جواب کی جرأت کی ہوتی غرض مولانا نے فطرت کی دلائل سے پیغمبر صاحب کو پیغمبر مانا۔ اور اُسی کے ساتھ قرآن کو کلام الٰہی تسلیم کیا۔ پیغمبر صاحب کی رسالت اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ایک اَور بدیہی ثبوت

مولانا جب سے قرآن کے سمجھنے پر قادر ہوئے۔ اُس کے استحسان میں کبھی ایک لمحے کے لیئے بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور اُس نے اُن کو وہ کام دیا جو عصا کام دیتی ہے ایک بڈھے مرتعش کو۔ مولانا نے ہر طرف سے مایوس ہو کر خیال کیا کہ میں بڑے بڑے نامی گرامی آنحضرت صلعم کی نظم و نثر دونوں طرح کے کلام پڑھتا ہوں زمانۂ جاہلیت کے مخضرمین کے۔ اسلام کے بعد اور خود آنحضرت صلعم کے جن کے مونہ سے الفاظِ قرآنی نکلے اور آپ کے دوسرے مقالات مجلدات احادیث میں منضبط ہیں مواعظ ہیں۔ خطبات ہیں۔ قصص و حکایات ہیں۔ مراسلات ہیں۔ یہ بات کیا ہے کہ قرآن کی عبارت کو

ف ا پیغمبر صاحب اپنی پیغمبری اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے بہت سے دلائل پیش کرتے تھے اُن میں سے یہ دلیل سب سے زیادہ مستحکم تھی کیوں کہ جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا۔ شعر موزوں کر دینا اُن کے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی لونڈیاں تک مختلف مضامین پر ایسے برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں کہ آج اچھے سے اچھا ادیب اُن کا مثل نہیں کہہ سکتا تو ایک اَن پڑھ پیغمبر کا پکار پکار کر کہنا کہ اس طرح کی ایک ہی سورت بنا لاؤ بڑی وقعت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ تا قیام قیامت مستمر ہے ۱۲ ف ۱ مصنفین ۱۲ ف ۲ جنھوں نے جاہلیۃ و اسلام کے دونوں زمانے پائے ۱۲

کوئی نہیں پاتا۔ دوسرے مصنف اِس پر قادر ہوں تو خیر۔ مگر ایک ہی قائل کیوں کر دو مختلف طرزوں میں اور مختلف بھی اِس درجے کے کہ زمین و آسمان کا تفاوت۔ کلام کرنے کی قدرت پا سکتا ہے۔ یہ تو عادۃً محال ہے۔ مثلاً ہندی شعرا میں سے زیادہ نہیں میر تقی۔ اِنشاء اللہ خاں۔ سودا۔ تین شاعروں کو لو۔ ہر ایک کی طرز جداگانہ ہے۔ اور جو سخن فہم ہیں مضمون اور بندش سے پہچان لیتے ہیں کہ اِن تین میں سے کس کا شعر ہے۔ میر صاحب کے مضامین حسرت آلود ہوتے ہیں اور زبان نہایت درجہ شستہ اور سلیس۔ یہ بات خاص میر صاحب ہی میں دیکھی گئی کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے لفظ کا دب کر نکلنا بھی جائز نہیں رکھتے۔ اِنشاء اللہ خاں پھکڑ ہیں بیان میں شوخی۔ سودا ہر قسم کے مضامین پر قادر ہیں۔ بندش بھی مضبوط ہوتی ہے۔ متاخرین میں مثلاً داغ اور امیر میں تمیز کرنا کیا مشکل ہے۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔ غرض ہر ایک کی اپنی اپنی طرز ہے۔ مولانا کو خود ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بہ ضرورت کسی اخبار میں کوئی مضمون دیا اپنے نام سے نہیں مگر تاڑنے والے تاڑ گئے کہ یہ مولانا کا مضمون ہے۔ پس یہ عقدہ کہ پیغمبر صاحب نے دو طرح کے کلام پر کیوں کر قدرت پائی مولانا نے اِس طرح حل کیا کہ پیغمبر صاحب کی اپنی طرز تو وہی تھی جو احادیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ رہا قرآن وہ پیغمبر صاحب کا کلام ضرور تھا کیوں کہ اُن کے مونھ سے ادا ہوتا تھا۔ مگر نزولِ وحی کے اوقاتِ خاص میں جب کہ وہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتے تھے ؏

چوں کلامِ خدا کلامِ خدا است   از صفاتِ کلامِ بندہ جدا است

ایمان بالملائکہ مولانا فرماتے ہیں کہ فرشتے جن پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ ایک جداگانہ مخلوق ہے از قسم جنّات۔ جو نیک ہیں وہ فرشتے کہلاتے ہیں اور بدوں کو جن کہتے ہیں۔ لوگوں کا مقولہ تو یہ ہے کہ فرشتے نور سے بنے ہیں اور جنّات آگ سے اور دونوں جیسی شکل چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ فرشتوں کی شکل و صورت کے بارے میں قرآن اتنا ہی بتاتا ہے کہ یہ ایک خاص طرح کی مخلوق ہیں اور اُن کے دو دو۔ تین تین۔ چار چار اور زیادہ بھی پَر ہوتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ط

ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے جس نے (محض عدم سے) آسمان اور زمین بنا نکالے (اور) اُسی نے فرشتوں کو (اپنا) قاصد بنایا جن کے دو دو۔ اور تین تین اور چار چار پر ہیں (اپنی مخلوقات کی) بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب کے ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اِس عقیدے پر قرآن میں کئی جگہ بڑی سختی کے ساتھ اعتراض کیا گیا ہے۔ فرشتوں کے شمار کا بھی قرآن سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ مگر حدیث میں آیا ہے کہ سارے آسمان میں ایک چپہ بھر زمین نہیں جہاں فرشتہ سجدے میں پڑا ہوا خدا کی تسبیح و تقدیس نہ کرتا ہو۔ یعنی فرشتوں کی یہ کثرت ہے۔ لقیاس دنیا فرشتے بارگاہِ الٰہی کے چوب دار اور حشم و خدم کی طرح کے ہیں۔ اُن میں سے بہتیروں کو انتظامِ دنیا کی خدمتیں سپرد ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمہ وقت مصروفِ عبادت رہتے ہیں بلکہ نیک بندوں کے لیے طلبِ مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

اور فرشتے (ہیں کہ) اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ (اُس کی) تسبیح (و تقدیس)

يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ — میں لگے ہیں اور جو لوگ زمین میں (رہتے) ہیں اُن (کے گناہوں) کی معافی مانگا کرتے ہیں۔

قرآن سے صرف تین فرشتوں کا نام ملتا ہے۔ اوّل حضرت جبرئیل جن کا خطاب ہے امین۔ یہ حضرت حامل وحی ہیں۔ یعنی پیغمبروں کے پاس حکم الٰہی یہی لاتے رہے ہیں۔ امین اس سے کہلائے کہ پیام الٰہی میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہیں کرسکتے۔ پیام الٰہی امانت ہے اور یہ اُس کے امانت دار۔ دوسرے حضرت میکائیل

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ — جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور (خاص کر) جبرئیل (فرشتے) کا اور میکائیل (فرشتے) کا تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

یہ بندوں کے رزق پر مسلّط ہیں یعنی جہاں حکم ہوتا ہے وہاں پانی برساتے ہیں۔ جس سے بندوں کی روزی پیدا ہوتی ہے تیسرے مالک داروغۂ جہنّم ہیں

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ — اور (دوزخی داروغۂ جہنم کو) آوازیں دیں گے کہ اے مالک (تم ہی کوئی ایسی تدبیر کرو کہ کہیں) تمھارا پروردگار ہمارا کام تمام کر چکے۔

ان کے علاوہ دو اور معزز فرشتے ہیں جن کے نام تو قرآن میں مذکور نہیں ہوئے مگر خدمتوں کا ذکر موجود ہے۔ ایک حضرت عزرائیل۔ یہ حضرت بندوں کی جان قبض کرنے پر مامور ہیں اور ان کی ماتحتی میں فرشتوں کا ایک بڑا گروہ رہتا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — اور فرشتے (اُن کی جان نکالنے کے لیے اُن پر طرح طرح کی) دست درازیاں کر رہے ہیں (اور کہتے جاتے ہیں) کہ اپنی جانیں نکالو۔

دوسرے حضرت اسرافیل جو قیامت کے روز صور پھونکیں گے۔ باقی چند فرشتوں کی خدمتیں معلوم ہیں نام معلوم نہیں۔ اوّل کراماً کاتبین

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ — حال آں کہ تم پر (ہمارے) چوکیدار (تعینات) ہیں (یعنی) کراماً کاتبین (فرشتے) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اُن کو معلوم رہتا ہے۔

لفظ کراماً کاتبین کے معنی ہیں معزز لکھنے والے۔ دو فرشتے ہر شخص کے ساتھ تعینات ہیں۔ ایک اعمالِ صالحہ لکھتا رہتا ہے اور ایک اعمالِ بد۔ قرآن میں ایک آیت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ چند فرشتے محافظ بھی رہتے ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ — (انسان کسی حالت میں بھی ہو) اُس کے آگے اور اُس کے پیچھے باری باری (خدا کے) موکل لگے رہتے ہیں جو بحکم خدا اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔

پھر آٹھ فرشتے قیامت کے دن عرشِ الٰہی کو اُٹھائے ہوں گے۔ اُن کے نام بھی نہیں فرمائے خدمت بتا دی ہے۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ — اور اُس دن تمھارے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اُٹھائے ہوں گے

پھر اُنیس زبانیہ دوزخ ہیں عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ[۱] فرشتوں کا شمار اور اُن کی خدمات یہ سب اسرارِ الٰہی ہیں اُن کے بارے میں

[۱] اُس پر (یعنی دوزخ پر) اُنیس (پاسبان تعینات) ہیں ۱۲

کاوش کے ساتھ پوچھ پاچھ کرنا بے سُود اور بے سود ہونے کے علاوہ حدِ بشریت سے تجاوز کرنا ہے۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کچھ فرشتے دن میں زمین پر رہتے ہیں پھر عصر کے وقت اُن کی بدلی ہو جاتی ہے اور رات کے لیے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ دن کے فرشتے بارگاہِ الٰہی میں بندوں کے حالات عرض کرتے ہیں۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو کئی بار بچشمِ سر دیکھا۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى

اور انھوں نے (یعنی پیغمبر نے) تو (معراج کے وقت) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جبریل کو ایک دفعہ اَور بھی (اصلی صورت پر اپنے پاس آیا ہوا) دیکھا تھا۔

تو فرشتوں کے ساتھ ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ اُن کا ہونا تسلیم کیا جائے اور ہونے کے ساتھ اُن کی خدمات جو بارگاہِ خداوندی سے اُن کے سپرد ہیں اور یہ کہ اُن میں نر و مادہ ہونے کی صلاحیت نہیں نہ اُن میں نافرمانی کا مادّہ ہے۔

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ

خدا جو اُن کو حکم دے اُس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو اُن کو حکم دیا جاتا ہے (بے کم و کاست) اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔

وہ بھی خدا کے بندے ہیں اور خود کسی طرح کا اختیار نہیں رکھتے۔

مولنا فرماتے ہیں کہ نئے مذہبی فرقوں میں ایک فرقہ ہے جو نیچری کہلاتا ہے۔ یہ لوگ اکثر انگریزی خواں ہیں اور اُن کے معتقدات فلسفیوں کے سے ہیں ہر ایک بات میں رائے کو بہت دخل دیتے ہیں۔ باتیں تو بہت ہیں مگر مولنا کو کسی کے ساتھ مناظرہ کرنا نہیں اِس واسطے کہ مناظرہ سے نہ کبھی کوئی بات فیصل ہوئی ہے نہ آیندہ ہو مگر چوں کہ قرآن مجید میں فرشتوں پر ایمان لانا ایمان باللہ کا جز و قرار دیا گیا ہے مولنا کو مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ اپنا خیال ظاہر کرنے کے لیے بیان کرنا ضروری ہے کہ فرشتوں کے بارے میں عام اسلامی عقیدہ تو یہ ہے کہ فرشتے نور کے بنے ہوئے خاص مخلوق ہیں اُن میں نر و مادہ نہیں ہوتے۔ وہ جو جسمانی صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جبریل حاملِ وحی جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آدمی بن کر بھی آتے رہے۔ فرشتوں کی طبیعتوں میں آدمی کی طرح بدی کا تقاضا نہیں۔ وہ نیکی اور خدا کی فرماں برداری پر مجبور ہیں۔ غرض وہ شاہی چوبداروں کی طرح کے ہیں۔ فرشتے اور جن ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ فرشتے نور سے بنے ہیں اور جن آگ سے اور جنوں ہی کا ایک جن شیطان بھی ہے چوں کہ اِس طرح کی مخلوق دیکھنے میں نہیں آئی۔ فلسفی جنوں اور فرشتوں اور شیطان کسی کے قائل نہیں۔ فلاسفہ کے تمام اعتراضات اور اشتباہات پیدا ہوئے اِس سے کہ انھوں نے وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا[۵] پر تو نظر کی نہیں ہر کس را عقلِ خود بکمال و فرزندِ خود بجمال" کے مطابق براہِ خود پسندی اپنی معلومات کو جامع اپنی عقل کو کامل۔ اپنے ذہن کو رسا فرض کر لیا۔ اور جو بات سمجھ میں نہ آئی بجائے اِس کے کہ اپنے قصورِ فہم کے معترف ہوں اور ۵

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن | کہ جاہا سپر باید انداختن

۵ اور تم لوگوں کو اسرارِ الٰہی میں سے بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے ۱۲

پر عمل کریں۔ لگے اُس کو جھٹلانے تاکہ فرمودۂ خدا

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝

یہ لوگ لگے اُس چیز کو جھٹلانے جس کے سمجھنے پر اُن کو دسترس نہ ہوا اور ابھی تک اُس کی تصدیق کا موقع ہی اُن کو پیش نہیں آیا۔ اسی طرح اُن لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو اِن سے پہلے ہو گزرے ہیں (اے پیغمبر) دیکھو (اُن) ظالموں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا۔

پورا ہوا اور وہ پورا ہونا ہی تھا۔ فلسفی نے جو کچھ اپنی معلومات اپنی عقل اپنے ذہن کی نسبت سمجھا غلط سمجھا۔ ایاز قدرِ خود بشناس۔ اِس کی معلومات کا تو یہ حال ہی کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہی انسانی معلومات کا ذخیرہ بڑھتا چلا جا رہا ہی نئی نئی چیزیں دریافت ہوتی جاتی ہیں۔ جو پہلے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ کمالِ عقل اور رسائیِ ذہن کی یہ کیفیت ہی کہ آدمی باوجود پاس اپنی روح کی حقیقت تو تا حدِّ اطمینان دریافت نہیں کر سکا۔ اور دریافت کر بھی نہیں سکے گا اس لیے کہ خدا نے

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي

اور (اے پیغمبر لوگ) تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو (اُن سے) کہہ دو کہ روح (بھی) میرے پروردگار کا حکم ہی۔

فرما کر اُس کو اِس تفتیش سے روک دیا ہی۔ ایسا از خود بے خبر اسرارِ الٰہی میں جن کا شمار نہیں کیا دخل دے سکتا ہی اور دخل دینا چاہے تو یہ اُس کی یاوہ سری ہی۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی ۔۔۔ کہ با آسماں نیز پرداختی

مخلوقاتِ عالم پر نظر کرتے ہیں تو سارا جہان ایک حیرت کدہ دکھائی دیتا ہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عظیم الشان کارخانہ بایں حسن و خوبی کیونکر موجود ہو گیا اور اس ربط و ضبط کے ساتھ کیوں کر چل رہا ہی۔ مُشتے نمونہ از خروارے مثال کے طور پر ایک آدمی کو لیتے ہیں کہ شروع میں مٹی تھا پھر مٹی سے نباتات کی شکل میں آیا۔ پھر حیوان کی۔ پھر آدمی کی۔ بھلا مٹی کو جیتے جاگتے چلتے پھرتے سوچتے سمجھتے آدمی سے کیا مناسبت۔ اسی طرح کوئی سا پھلا پھولا درخت لو عقل نہیں کام کرتی کہ بیج نے یہ رنگ و بو یہ ذائقہ یہ نقش و نگار یہ تن و توش کہاں سے پایا۔ ہمہ وقت ہزارہا واقعات واقع ہوتے رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا بوجھ بجھکّڑ آدمی بھی اُن کی لِمّ نہ آپ سمجھتا ہی اور نہ سمجھا سکتا ہی ایک فارسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہی

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام است

خواجہ حافظِ شیراز فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں۔

سخن از مطرب و می گو و رازِ دہر کم تر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

عربی کا مشہور شاعر متنبّی کہہ گیا ہی۔

كُلُّ مَا لَمْ يَكُنْ مِنَ الصَّعْبِ فِي الْأَنْفُسِ ۔۔۔ سَهْلٌ فِيهَا إِذَا هُوَ كَانَا

اسی طرح کے مضامین ہیں۔ جن کی وجہ سے شعرا کو تلامذۃ الرحمٰن کہا جاتا ہی یہ خیالات دل میں جاگزیں ہوں تو ایک صحیح العقل

سلیم الفطرت آدمی اشتباہ و اعتراض کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ وہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھے گا ایک سے ایک عجیب چیز اسے دکھائی دے گی۔ اور وہ بے اختیار بول اُٹھے گا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے پروردگار تُو نے اس (کارخانہ عالم) کو بے فائدہ (تو) نہیں بنایا تیری ذات (ایسے فعل عبث کے کرنے سے) پاک ہے (اور یہ کارخانہ خبر دے رہا ہے کہ آخرت میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہونی ہے) تو اے ہمارے پروردگار ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔

پھر فلسفی جو ازل اور ابد کے قلابے ملاتے اور ہر ایک چیز میں رائے زنی کرتے ہیں اور اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ لوگ جہان کے بنانے پیدا کرتے وقت خدا کے صلاح کار تھے۔

مَا أَشْهَدْتُهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا

ہم نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت بلکہ خود شیاطین کے پیدا کرتے وقت بھی شیاطین کو (اپنی مدد کے لیئے) نہیں بلایا اور ہم (کچھ گئے گزرے) نہ تھے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا (قوت) بازو بناتے

غرض فلسفی بڑے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ عجائبات دنیا کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے۔

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

ان کو معاملہ تقدیر کی کچھ خبر تو ہے نہیں نری اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔

ہاں اٹکلیں دوڑاتے ہیں کہ مثلاً آدمی کے جدِّ امجد بندر رہے ہوں گے۔ اچھا یوں ہی۔ مگر اس سے زندگی کا معمّا تو حل نہیں ہوتا

رنج دار و مریز ساقی دیر ... مے بین و مکن حوالہ بر غیر
این نقش کہ دانیش نمونہ ... گنہش زدہ نعل و از گونہ

مولانا ایک موٹی سی بات پوچھتے ہیں کہ ایک پہلی مرغی اور انڈے اور درخت اور بیج کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے توالد و تناسل کیوں کر شروع ہوا۔ انڈے اور بیج کو جڑ قرار دو تو مشکل اور مرغی اور درخت کو اصل ٹھیراؤ تو مشکل۔ اس سے ثابت ہے کہ نیچر کے اصول ضرور ازلی نہیں اور ممکن ہے کہ ابدی بھی نہ ہوں۔ کوئی بدعقل جو خدا ہی کا قائل نہیں اس قسم کے اعتراضات اور اشتباہات کرے تو ایک بات بھی ہے بڑا تعجب اور افسوس تو اُس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی خدا کو مان کر کہتا ہے کہ فرشتوں اور جنوں اور شیطان کا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی لیئے مجھے اُن کا ہونا تسلیم نہیں۔ یا میں کسی معجزے کے وقوع کو باور نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعا کا معتقد نہیں کہ وہ حصولِ مدعا کا سبب ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ گناہ نزولِ عذاب کا سبب ہوا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یا جنت اور دوزخ اور قیامت کی وہی حقیقت ہے جو نا ہمی کتابوں میں بیان کی جاتی ہے۔ یا آفرینش کا سلسلہ اسی طرح پر شروع ہوا ہے جیسا آسمانی کتابوں میں لکھا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بات اس کی سمجھ سے باہر ہے اور اسی وجہ سے اُس کو انکار ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ خدا کو اس نے کیوں کر سمجھ لیا اور خدا کو سمجھ لیا تو پھر اس کو کسی چیز کسی بات پہ تعجب اور انکار کا کیا حق باقی رہا۔ مگر کھانوں اور کنگلوں سے پرہیز۔ اُن اس کو اس بات سے اپنا اطمینان کر لینا ہوگا کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ خدا کی آتاری ہوئی کتاب میں بھی ہے یا نہیں۔ خدا کے رسول نے بھی فرمائی ہے یا نہیں۔ اگر خدا کی آتاری ہوئی کتاب میں ہے

یا خدا کے رسول نے فرمائی ہو تو سمجھ میں آئے یا نہ آئے اِس کو بے چون وچرا ماننا پڑے گا اور توجیہ و تاویل کی اجازت نہیں دی جائے گی - نہ یہ کہ سمجھ میں نہ آنے کا عذر کر کے پہلے سے منکر ہو بیٹھے اور فرمودۂ خدا و رسول ہونے کی طرف سے اطمینان کرنے کے اَور بہت سے رستے ہیں -

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

بات یہ ہے کہ دلوں سے دین و مذہب کی وقعت اُٹھ گئی ہے اور دنیا کی چند روزہ زندگی اور خوش حالی نے آدمی کو خدا کی جناب میں مغرور اور گستاخ کر دیا ہے - دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے - قرآن کو ناولوں اور اساطیر الاولین کی طرح بے پروائی اور بے باکی کے ساتھ پڑھتے ہیں اصلِ مطلب کی طرف توجہ نہیں - بات بات میں لایعنی خدشے واقع ہوتے ہیں خدا تعالیٰ جلّ و علا شانہٗ نے قرآن کے حق میں فرمایا ہے -

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

(اے پیغمبر) اگر ہم نے قرآن کسی پہاڑ پر اُتارا ہوتا (اور آدمی کی طرح اُس کو شعور بھی ہوتا) تو تم اُس کو دیکھ لیتے کہ خدا کے ڈر کے مارے جھک گیا (ہوتا اور) پھٹ پڑا ہوتا اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (سمجھیں)

غرض مولانا فرماتے ہیں کہ جس طرح آنکھیں دیکھنے کے لیے ہیں اُسی طرح عقل سوچنے سمجھنے کے لیے تو جس طرح ہم تاریکی میں آنکھوں کو دیکھنے کی تکلیف نہیں دیتے بعینہ اِسی طرح غوامض اَسرارِ حکمتِ الٰہی میں عقل کو غور کرنے کی تکلیف دینی نہیں چاہیئے -

ایمان بالیوم الآخر

مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان کا سلسلہ اِس طرح پر ہے کہ پہلے آدمی خدا کا قائل ہو - پھر اِس کا کہ وہ نیکی سے خوش اور بدی سے ناخوش ہوتا ہے اور نہ صرف یہ کہ خوش اور ناخوش ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ نیکوں کو ثواب اور بدوں کو سزا دیتا ہے - کبھی تو دنیا ہی میں نیکی اور بدی کا نتیجہ مل جاتا ہے اور کبھی خدا اپنی مرضی سے روزِ آخرت پر موقوف رکھتا ہے - جب کہ دنیا کا سارا کارخانہ اُٹھا دیا جائے گا اور نیکی بدی کا حساب ہو کر اخیر فیصلہ کر دیا جائے گا - نیک بندے جنت میں ہوں گے اور نافرمان گنہگار دوزخ میں - مولانا فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ روزِ آخرت کے فیصلے کے بعد جو زندگی ہو گی ہمیشہ کے لیے ہو گی - دنیا میں پھر آنا نہیں - ایک طرف تو قیامت کے ہونے کا یقین ایسا ضروری عقیدہ ہے کہ دین و مذہب کی ساری عمارت اسی ایک ستون پر قائم ہے - قیامت کے خیال کو دل سے نکال دو تو مکڑی کے جالے کی طرح انکار کی ایک پھونک دین و مذہب کی تمام بندشوں کو توڑ تاڑ برابر کر دے - دوسری طرف قیامت اپنی ذات سے ایسا معاملہ ہے کہ اس کے وقوع کا ثبوت رہتی دنیا تک مل ہی نہیں سکتا - جس سے دل کو اطمینان ہو اس لیے کہ ثبوت کسی قسم کا بھی ہو آخر کار معائنے اور مشاہدے پر جا کر منتہی ہوتا ہے اور یہاں معائنے اور مشاہدے کا موقع ہی نہیں - لے دے کر دلیل کہو ثبوت کہو دل کی گواہی کہ ایک عالم سمجھ رہا ہے کہ آدمی مرنے سے فنا نہیں ہوتا - یہی خیال دنیا میں نیکوکاری اور حسنِ معاشرت کا بڑا ضامن ہے - اسی خیال نے بعض شاطر مجرموں سے جن پر تخویف اور تطمیع اور تعذیب کی تدبیریں بے اثر محض ثابت ہوئیں ارتکابِ جرم کا اقرار کرا چھوڑا ہے - اسی خیال پر لوگ مال اور جان جیسی عزیز چیز قربان کر دیتے ہیں -

یہی خیال دردمند کی تسلی ہے۔ اور یہی خیال دنیا میں امن کا باعث ہے۔ اور اسی کا نام ہے فطرۃ جو تمام دلیلوں سے بڑی دلیل اور تمام ثبوتوں سے بڑا ثبوت ہے۔ بے شک سمجھ میں نہیں آتا کہ ہزاروں برس کے مُردے جن میں سے بعض سمندروں میں ڈوبے اور اُن کو مچھلیاں کھا گئیں اور بعض پارسیوں کے دخمے میں رکھ دیئے گئے اور چیلوں اور گدّوں نے اُن کی بوٹیاں نوچ کھائیں اور بعض مدفونِ قبر ہو کر مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ[۱] کے مصداق ہوئے کیسے جلا اُٹھائے جائیں گے اور جلا اٹھایا جانا بھی کیا۔ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ[۲] یہی وہ استبعاد تھا جس کو منکرینِ قیامت یہ کہہ کر ظاہر کرتے تھے

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝

کیا (واقع میں) جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو کر رہ گئے کیا ہم (قیامت میں دوبارہ) اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے۔

جیسا استبعاد تھا ویسا ہی جواب ملتا تھا۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ

کیا ہم اوّل (بار) پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ قیامت میں دوبارہ پیدا نہیں کر سکیں گے نہیں) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ (خلافِ عادت) از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے شک میں (پڑے) ہیں۔

جواب کی تشریح اس طرح پر ہے کہ آدمی شروع میں مٹی تھا مٹی سے نباتات کی جُون میں آیا۔ نباتات سے حیوانات میں جنم لیا۔ نباتات اور حیوانات آدمی کی غذا ہوئی۔ غذا سے نطفہ بنا۔ نطفے سے بہت سے تبدّلات کے بعد آدمی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا ... النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر ہم ہی نے اُس کو حفاظت کی جگہ (یعنی عورت کے رحم میں) نطفہ بنا کر رکھا پھر ہم ہی نے نطفے کا لوتھڑا بنایا پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی بندھی بوٹی بنائی پھر ہم ہی نے بندھی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت مڑھا۔ پھر (آخر کار) ہم ہی نے اُس کو (گویا بالکل) دوسری ہی مخلوق (کی صورت میں) بنا کھڑا کیا تو (سبحان اللہ) خدا بڑا ہی بابرکت ہے جو (سب) بنانے والوں میں بہتر بنانے والا ہے۔ پھر (لوگو!) اس کے بعد تم (سب) کو مرنا ہے۔ پھر قیامت کے دن تم (سب) اُٹھا کھڑے کیے جاؤ گے

عالم کے ذرّے ذرّے میں خدا کی قدرت کے ایسے بہت سے کرشمے ہیں مگر ہم کو اُن کرشموں کے دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے اس وجہ سے ہم ان کا استبعاد نہیں کرتے حشر بعد الموت بھی اسی طرح کا ایک کرشمہ ہے اور ہم کو اس کے استبعاد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور اسی کا نام ہے ایمان بالآخرۃ فرمودۂ خدا کے انضمام سے اور تمام بنی آدم کے تعامل سے اس یقین کو قوت ہوتی ہے۔ اور غفلت اور بے فکری سے کمزوری قیامت کا انکار متفرع ہے اس پر کہ ہم نے روح کی حقیقت کو نہیں جانا۔ روح اور جسد کے تعلق کو نہیں پہچانا۔ خدا کی قدرت کی وسعت کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا۔ چوں کہ آدمی مرنے سے معدوم نہیں ہوتا اور

---

[۱] (لوگو!) اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور (مرے پیچھے) اسی میں تم کو لوٹا کر لائیں گے ۱۲

[۲] بلکہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اُس کی پور پور (اُس کے اصلی ٹھکانے سے بٹھا دیں ۱۲

مرے پیچھے بھی اُس کی روح باقی رہتی ہے اور بقائے روح بھی ایک طرح کی زندگی ہے تو گو دنیا کی زندگی میں مجرم کو نتیجۂ بد پیش نہ آیا بقائے روح کی زندگی میں پیش آکر رہے گا مگر پیش آکر رہے گا ضرور۔

ایمان بالقدر اب رہا مسئلۂ تقدیر تو مولانا فرماتے ہیں کہ یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے کہ عوام تو عوام اکثر خواص بھی اُس کو نہیں سمجھ سکتے۔ سارا اشکال خود آدمی کی خاص بناوٹ کا ہے کہ آدمی نہ تو کنکر پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے جہاں پڑا پڑا ہے کوئی اُس کو جگہ سے ہلائے تو ہلے۔ اور نہ با اختیارِ مطلق ہے کہ جو چاہے کر گزرے۔ آدمی کی اس حالت کو پیش نظر رکھ کر تقدیر کے معنی سمجھنے کے ہیں۔ تقدیر کی نسبت لوگوں کا عام خیال تو یہ ہے کہ آدمی کو بھلا بُرا جو کچھ پیش آتا ہے اور جو کچھ پیش آنے والا ہے پہلے سے خدا نے اُس کے لیے ٹھہرا دیا ہے یہاں تک کہ اُس کا جنتی اور دوزخی ہونا بھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے اختیار سے نہیں کرتا اور اسی لیے نیکی کی جزا کا مستحق اور بدی کی سزا کا مستوجب بھی نہیں۔ بے شک کٹ حجتی کے لیے بڑی گنجایش ہے۔ اور اس خیال کی تائید میں بہت سی باتیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے انسان کی مجبوری ظاہر ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ انسانی زندگی کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ انسان کچھ اختیار بھی رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنا پر وہ دنیا میں اپنے افعال کا جواب دِہ سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں یہ قاعدہ جاری ہے تو آخرت میں کیوں نہ ہو۔ دنیا اور آخرۃ میں نقل اور اصل کی نسبت ہے اور ایک کا دوسرے کے مطابق ہونا ضرور ہے اچھا پھر تقدیر کو کیا سمجھنا چاہیئے تو لفظ تقدیر نکلا قدر سے جس کے معنی اندازے کے ہیں پس تقدیر کے معنی اندازہ ٹھیرا لینے کے ہوئے جو معنی اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ[1] کے ہیں وہی معنی تقدیر کے ہیں۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں ایک مثال سے بآسانی سمجھو گے۔ ہم نے ایک درزی کو کپڑے کا تھان دیا کہ اُس میں سے جتنے بن سکیں ہمارے کُرتے بنا دو۔ تو درزی پہلے آگا پیچھا کلیاں چوبغلے آستینیں ہر ایک چیز کا اندازہ کر لیتا ہے تب قطع کرتا ہے۔ لغت کی رُو سے اسی کا نام ہے تقدیر۔ معمار تعمیر سے پہلے مکان کا نقشہ بناتا ہے۔ بڑھئی چوکی کے لیے لکڑی کی تراش کا اندازہ کرتا ہے۔ یہ سب تقدیر ہے اسی طرح خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی یہی اُس چیز کی تقدیر ہوئی۔ دوسری مخلوقات کے ساتھ ایک تقدیر انسان کی ہے کہ اُس کی دو آنکھیں ہیں دو کان۔ دو ہاتھ۔ دو پانوں۔ ایک ناک۔ وہ خاص ایک خاندان میں۔ خاص ملک میں۔ خاص زمانے میں پیدا ہوتا اور ایک خاص وقت تک خاص حالت میں زندہ رہ کر آخر کو دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ انسان پر جو حالتیں گزرتی ہیں اُن میں سے بہت سی باتیں ہیں جن میں انسان کے ارادے۔ انسان کی رائے انسان کی تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔ ایسی ہی باتوں میں اس معنی کر تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے جو لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں بندگی و بیچارگی۔ فطرت اللہ میں نکتہ چینی کرنا فسادِ عقل اور گستاخی کی دلیل ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کو پرندوں کی طرح پرواز کی قدرت کیوں نہیں دی۔ یا جیسا کہ تیز خوردبین میں دیکھا جاتا ہے کہ مکھی کے چھوٹے سے جُثّے میں ہزاروں آنکھیں ہیں آدمی کس لیے اِس نعمت سے محروم رکھا گیا۔ پس اِس صورت میں تقدیر پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ مخلوقاتِ عالم کو خدا نے جیسا چاہا بنایا اور بہت درست بنایا۔ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی[2]۔ لیکن اس میں تو کچھ جھگڑا نہیں جھگڑے کی بات تو یہ ہے کہ انسان

[1] ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے [2] ہر مخلوق کو اُس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر اُس کو (اُن اغراض خاص کے پورا کرنے کی) راہ دکھائی

اپنی ذات سے کچھ بھی نہیں - جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے یہی وہ عقیدہ ہے جس میں پانی مرتا ہے - اسی عقیدے نے مسلمانوں کی دنیا کو تباہ اور برباد کیا - ایک وقت تھا کہ مسلمان روئے زمین پر کوسِ لمن الملک الیوم بجاتے تھے اور تہذیب اور شائستگی اور فضائل میں کوئی قوم اُن کو لگا نہیں کھاتی تھی یا اب یہ وقت ہے کہ دوسروں کے غلام ہیں اور غلام بھی ہیں تو نکمے نکھٹو -

اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّ هُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوْلٰهُ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ -

گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اُس سے کچھ بھی ٹھیک بن نہیں آتا -

برائے نام معدودے چند سلطنتیں بھی ہیں تو اگر "نام نشانے ماند ست بے وگیر نمی ماند" یہ سب اس لیئے کہ مسلمان تقدیر پر بھروسا کر کے حسب اقتضائے وقت اپنے تئیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے - اور عقیدۂ تقدیر نے اُن کو مایوس اور اپاہج اور از کار رفتہ کر دیا ہے - اگلے مسلمان جو معراج الکمال ترقی پر پہنچ گئے تھے وہ بھی تقدیر کے قائل تھے مگر کوشش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کامیابی اُن کی تقدیر میں ہے اور تقدیر ہی اُن سے کوشش کرا رہی ہے - اس پر بھی احیاناً اگر اُن کی سعی نامشکور ہوتی تھی - تو ناشکوری سعی محرک ہوتی تھی سعیِ مزید کی - غرض وہ کسی حالت میں ہمت نہیں ہارتے تھے -

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ

اگر تم کو (اس لڑائی میں شکست کی) کھٹر پہنچ گئی تو دل مت ہو کیوں کہ (جنگِ بدر میں) طرفِ ثانی کو بھی اس طرح کی کھٹر پہنچ لگ چکی ہے اور یہ اتفاقات وقت ہیں جو ہمارے حکم سے نوبت بہ نوبت (سب) لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں -

اب کے مسلمان پہلے ہی سے آس توڑ بیٹھے اور بے ہاتھ پاؤں ہلائے سمجھے ہوئے ہیں کہ خدا ہی ان کی بہتری نہیں چاہتا ؎

مزن فالِ بد کاورد حالِ بد   مبادا کسے کو زند فالِ بد

مولانا نے مدتوں اس کو سوچا کہ مسلمانوں نے تقدیر کا محملِ غلط کہاں سے لیا تو یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی کہ قرآن میں ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت دونوں خدا کی طرف سے ہیں - آدمی کے اختیار کی بات نہیں جیسے [۵۱] انک لا تهدی من احببت ولکن الله یهدی من یشاء - اور - [۵۲] یضل من یشاء و یهدی من یشاء - اور - [۵۳] فمن یهدیه من اضل الله - اور - [۵۴] ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة - اور - [۵۵] اولئك الذین لعنهم الله فاصمهم واعمی ابصارهم -

اسی طرح ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے آدمی کا با اختیار ہونا پایا جاتا ہے جیسے [۵۶] ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعًا فان الله لغنی حمید - اور - [۵۷] ونفس وما سوّٰها فالهمها فجورها وتقوٰها

۵۱ (اے پیغمبر اپنی خواہش کے مطابق) تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۵۲ جس کو چاہتا گمراہ کرتا اور جس کو چاہتا ہدایت دیتا ہے ۵۳ تو جس کو خدا گمراہ کرے اُس کو کون راہ راست پر لا سکتا ہے ۵۴ اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہے ۵۵ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور اُن کو (حق بات کے سُننے سے) بہرا اور (راہِ راست کے دیکھنے سے) اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے ۵۶ اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب (کے سب) مل کر بھی (خدا کی) ناشکری کرو تو خدا (کو ذرا بھی پروا نہیں کیوں کہ وہ) بے نیاز (اور ہر حال میں) سزاوار حمد (و ثنا) ہے ۵۷ اور انسان کی اور (اُس) ذات کی قسم جس نے اُس کو (ایسا) درست بنایا پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں ۱۲

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے   کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

پابندی آدمی کے لئے شرطِ زیست ہے من جملہ اور پابندیوں کے ایک پابندی تقلید کی بھی ہے۔ اور افعال کی کون کہے تقلید کے بدون بولنا بات کرنا تک بھی تو آدمی کو نہیں آسکتا۔ پس تقلید سے چارہ نہیں جس طرح غذا سے چارہ نہیں مگر جس طرح بہت کھانے سے آدمی ابھر کر مرجاتا ہے افراط تفریط بھی آدمی کو خوار کرتی ہے ؎

لطفِ حق با تو مواسا ہا کند   چوں کہ از حد بگزرد رسوا کند

افراط تقلید کا بدترین نتیجہ تو یہ ہے کہ ترقی کی سدِّ راہ ہے اور آدمی کو اُس شرف سے محروم رکھتی ہے جس کا مادّہ اُس میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ نفسِ تقلید میں تو ہم کو کچھ بھی اعتراض نہیں کیوں کہ تقلید انسان کا ایک فعل اضطراری ہے اور وہ ایک اعتبار سے ترقی کی محرک اور ہادی اور مصلح ہے۔ اعتراض جو کچھ بھی ہے اعمالِ فکر اور اُس نمونے کے انتخاب میں ہے جس کو ہم تقلید کے لئے اختیار کرتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نباید داد دست

سب سے زیادہ مکروہ تقلید جو عام و خاص سب مسلمان کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی متنفس اس سے بچا ہو گا رسم و رواج کی تقلید ہے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک بلکہ مرے پیچھے تک ایسی کون سی حالت ہے جو محکوم مراسم نہیں اور مراسم بھی وہ جن کی اسلامی شریعت میں کہیں اصل نہیں۔ اور اکثر تو خلاف شرع منجر بمعصیت اور داخل اسراف ہیں اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا[۵۱]

شیطان یا ملائکہ

(۵) سرسیّد۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امارہ یا قوت بہیمیّہ ہے وہ مراد ہے۔

(۵) مولانا۔ ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہے تو صرف اتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے سو خدا کرے کہ ابھی نہ دکھائی دیں یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا[۵۲] تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے مناسب مقام کا بلیوں کی طرح کے قوی ہیکل لوگ یا اللہ کے نیک بندے یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنے کی داعی ہوتی ہیں مراد ہیں۔ لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کا مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائے گی۔ کوئی بدعقل جو خدا ہی کا قائل نہیں اس قسم کے اعتراضات اور اشتباہات کرے تو ایک بات بھی ہے بڑا تعجب اور افسوس تو اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی آدمی خدا کو مان کر کہتا ہے کہ فرشتوں اور جنوں اور شیطان کا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی لئے مجھے ان کا ہونا تسلیم نہیں یا میں کسی معجزے کے وقوع کو باور نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعا کا معتقد نہیں کہ وہ حصول مدعا کا سبب ہو سکتی ہے یا یہ کہ گناہ نزول عذاب

---

[۵۱] بے شک دولت کے بے جا اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر ہے ۱۲

[۵۲] جس دن لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اُس دن گنہگاروں کو کوئی خوشی (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو دیکھ کر) کہیں گے کہ دور دفان ۱۲

کا سبب ہوا ہی یا ہو سکتا ہی یا جنت اور دوزخ اور قیامت کی وہی حقیقت ہی جو مذہبی کتابوں میں بیان کی جاتی ہی۔ یا آفرینش کا سلسلہ اُسی طرح پر شروع ہوا ہی جیسا آسمانی کتابوں میں لکھا ہی۔ اگر ان میں سے کوئی بات اُس کی سمجھ سے باہر ہی اور اسی وجہ سے اُس کو انکار ہی تو ہم نہیں سمجھتے کہ خدا کو اُس نے کیوں کر سمجھ لیا اور خدا کو سمجھ لیا تو پھر اُس کو کسی چیز کسی بات پر تعجب اور انکار کا کیا حق باقی رہا۔ گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز

مُنخَنِقَہ

(۶) سر سید۔ طیور منخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہی۔

(۶) مولانا۔ میتت[۵۱]۔ منخنقہ[۵۲]۔ موقوذہ[۵۳]۔ متردیہ[۵۴]۔ نطیحہ[۵۵]۔ پس خوردہ درندہ مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔

وضع ولباس

(۷) سر سید۔ وضع ولباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہی۔

(۷) مولانا۔ ایک حدیث مَن تشبہ بقوم فھو منھم[۵۶] جس پر ان دنوں بڑا غل مچا ہوا ہی لوگوں نے۔ انگرکھہ پائجامہ چھوڑ کر کوٹ پتلون اختیار کر لیا ہی اور ایک کوٹ پتلون پر کیا موقوف ہی تمام تر تمدن انگریزوں کا سا ہو گیا ہی۔ اور ہوتا جاتا ہی۔ اس پر پرانی وضع پرانے خیال کے مسلمان اتنا تشدد کرتے ہیں کہ فھو منھم سے کفر وارتداد کا استنباط کرتے ہیں۔ حالانکہ وضع ظاہر کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔

دوزخ وجنت

(۸) سر سید۔ "قرآن یا احادیث میں معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہی وہ سب بطریق مجاز واستعارہ وتمثیل کے بیان ہوا ہی جیسے بعث ونشر۔ حساب وکتاب۔ میزان۔ صراط۔ جنت۔ دوزخ۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب مجاز پر محمول ہی نہ حقیقت پر۔"

(۸) مولانا۔ نہ جنت کو دیکھا نہ دوزخ کو۔ ہاں اس سے جو پیغمبر صاحب سے سُنا۔ دوزخ کا تو دیکھنا تک بھی گوارہ نہیں۔ جنت کی تمنا ہی۔ سو وہاں جانے کی جو شرائط ہیں ادا نہیں ہوتیں۔ نیچری کہتے ہیں لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنت کے مزے اور دوزخ کی تکلیفیں بیان کر دی ہیں۔ رنج وراحت آخرۃ میں بھی ہی مگر ہم اُس کی کیفیت کے سمجھنے کے لائق نہیں۔ ناک اُسی جگہ ہی سامنے سے بتاؤ تو یا اور گُدّی کے پیچھے ہاتھ لے جا کر بتاؤ تو۔ ہم تو چھوٹتے ہی جواب دیتے ہیں کہ دوزخ ہو یا جنت یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑے گا۔ وحی کے سوائے ہم کو کوئی ذریعہ اُن کی حقیقت دریافت کرنے کا نہیں اور جو کچھ وحی میں ہی ہم اُس سے نہ ایک حرف کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ اور نہ تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت اور زیادہ تفتیش کرنے کو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

---

[۵۱] مرا ہوا جانور ۱۲ [۵۲] گلا گھونٹا ہوا جانور ۱۲ [۵۳] چوٹ سے مرا ہوا جانور ۱۲ [۵۴] اوپر سے گر کر مرا ہوا جانور ۱۲

[۵۵] کسی جانور کا سینگ لگ کر مرا ہوا جانور ۱۲۔

[۵۶] جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اُن ہی میں سے ہی ۱۲۔

آسمان و زمین کا چھے دن میں پیدا کرنا

(۹) سر سید۔ قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اس سے کسی واقعے کی خبر دینی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ اور اسی لئے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وما مسنا من لغوب کیوں کہ شارع کا مقصد حقائق اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے۔ بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

(۹) مولٰنا۔ آسمان کا بھی قرآن میں بہت ہی جگہ مذکور ہے اور جس کی نظر قرآن پر ہے وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قرآن میں چھے دن کی تعیین پر زور نہیں دیا گیا۔ بے شک کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن کا مخاطب بتکلیف یہود کو بنایا جا سکتا ہے مگر ایسی بھی آیتیں ہیں جن کا سیاق و سباق پکار رہا ہے کہ چھ دن پر زور ہے۔ اور مخاطب بلا تخصیص یہود کل افراد بشر ہیں جیسے سورۂ ق میں۔ ولقد خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب۔ وما مسنا من لغوب کا اس کے سوائے اور کیا محمل ہو سکتا ہے کہ قائل کا مطلب چھے دن پر زور دینا ہے۔ غرض اپنی اپنی سمجھ ہے تو ہم کو تو اس تاویل کے تسلیم کرنے سے دنیا کا چھ دن میں پیدا ہونا مان لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

بعض قدیم قوموں پر نافرمانی کی وجہ سے عذاب نازل ہونا۔

(۱۰) سر سید۔ قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب کا نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے کسی کو زلزلے سے کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے۔ اُس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے۔

(۱۰) مولٰنا۔ قرآن میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے حالات بیان کئے گئے ہیں جن پر اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے وقتاً فوقتاً عذاب الٰہی نازل ہوتے رہے۔ گناہ اور عذاب میں جو خدا نے علت و معلول کا تعلق رکھا ہے بہت لوگ اس میں اشتباہات کرتے ہیں سبب یہ کہ انھوں نے اپنے نزدیک علت و معلول کے علاقے کی کوئی وجہ نہ پائی اور لگے شبہہ کرنے۔ حال آنکہ آدمی کوئی سی دو چیزوں میں بھی علاقۂ علیت و معلولیت کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مقناطیسی سوئی کا ایک سرا ضرور شمال کی طرف رہتا ہے جیسا کہ قبلہ نماؤں میں دیکھتے ہو مگر اس کی وجہ کے جاننے سے ہمارا فہم قاصر ہے۔ اور یہی حال علیت اور معلولیت کے تمام علاقوں کا ہے۔ ہر وزنی چیز زمین پر تو گرتی ہے۔ مگر کیوں گرتی ہے؟ نہ ہم اس کی وجہ جانتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ ظاہرا جتنے اشتباہات جو لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی معلومات کو جامع اور اپنی عقل کو

رسا خیال کرتے ہیں۔ ہر کس را عقل خود بکمال اور ما اوتیتم من العلم الا قلیلا کی طرف اُن کا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ بسا اوقات کسی مصلحت سے دُنیا میں گناہ کا نتیجہ واقع نہیں بھی ہوتا اور آخرۃ پر ملتوی رکھا جاتا ہے وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ۔ لیکن گناہ اور عذاب میں جو علاقہ ہے تاخیر عذاب سے اُس علاقے میں کچھ ضعف لازم نہیں آتا۔ دُنیا میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک بدکرداری کا نتیجہ بدکئی کئی پشتوں کے بعد ظاہر ہوا ہے مگر ہوا ہے ضرور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ چھیک قبر تک نکل کر رہتی ہے۔

فصاحت و بلاغت کلام اللہ

(۱۱) سرسید۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معارضے کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عنداللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورۃ یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں صحرا نشیں بدّوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لئے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو بنا لینا تمھاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

(۱۱) مولانا۔ معجزات میں ایک قرآن کا معجزہ البتہ لاجواب ہے جن دنوں قرآن نازل ہوا عرب میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا۔ اُنھوں نے اپنی زبان کو معراج الکمال پر پہنچا دیا تھا۔ اور اپنے سوا سب لوگوں کو عجم یعنے گونگے کہتے تھے۔ فصحائے عرب نے قوت گویائی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رکھا تھا۔ گویا شعرا ملک میں حکمرانی کر رہے تھے۔ سارے کمالات گویائی اور زبان آوری کے آگے ہیچ تھے ایسے وقت میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ وہی عربی بولی تھی مگر خدا پیغمبر صاحب کی زبان سے بولتا تھا تو اُس کے الفاظ اور اُس کے مضامین کا کیا کہنا۔ اگر کلام خدا فصحا کے کلام سے کسی بات میں اُنیس بیس کے فرق سے بھی گرا ہوا ہوتا تو عرب کے لوگ جن کو اپنی حسن کلام پر بڑا فخر و ناز تھا اُس کو چٹکیوں میں اُڑاتے مگر باوجودے کہ الحق مُر شرک اور بت پرستی کی مذمت ہوتی تھی یا پند و نصیحت کی ناگوار باتیں اور وہ بھی نثر میں مگر پیرایہ کچھ ایسا دل حسیب ہوتا تھا کہ جو سنتا تھا لٹو ہو جاتا تھا اور سر آمد شعرا اپنی جگہ لوہا مان گئے تھے۔ غرض خدا نے اہل عرب کو اُسی داؤ سے پچھاڑا جو اُن کو خوب رواں تھا۔ اِدھر سے بار بار تحدّی ہوتی تھی کہ وان کنتم فی ریب مما نزلنا الخ۔ اور قل لئن اجتمعت الانس والجن الخ۔ اور اُدھر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا کچھ جواب نہیں کیا معجزے کے سر میں سینگ ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور معجزہ کیا ہو سکتا ہے۔ قرآن یہ ایک ایسا زندہ معجزہ ہے کہ روز نزول قرآن سے الی ساعتنا ھذہ برابر تحدی ہو رہی ہے اور جب تک قرآن پڑھا پڑھایا جائے گا یعنی روز قیامت تک ہوتی رہے گی کسی نے تحدّی کے جواب کی ہامی بھری ؟ کیا عربی زبان روئے زمین پر سے معدوم ہو گئی ؟ یا جن ملکوں میں عربی بولی جاتی ہے مخالفان اسلام نہیں بستے ؟ سوا تیرہ سو برس کے عرصے میں کسی نے تو جواب کی جرأت کی ہوتی۔

حضرت عیسےٰ ع

(۱۲) سرسید۔ حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

(۱۲) مولانا۔ اس سے بڑھ کر سلف[1] کنسٹیڈ کون ہوگا جو ذری سی عقل کے برتے پر ملکوت السموٰت والارض کے رازمیں دخل دے جیسے گولر کے اندر کا بھنگا فضاے دہر پر معترض ہو۔ یا برساتی تینگا زمانے کے حدوث وقدم میں رائے زنی کرے۔ جو شخص اپنی پیدایش کے بھید کو دریافت نہیں کر سکا جس نے نہیں سمجھا کہ درختان ثمردار کیوں کر نرو مادہ دونوں کا کام دیتے ہیں جو نہیں بتا سکتا کہ ابتدا میں مرغی بے انڈے کے پیدا ہوئی یا انڈا بے مرغی کے اس کو بے مشارکت پدر عیسیٰ کے پیدا ہونے میں چون وچرا کرنے کا کیا حق ہے"

دُعا

(۱۳) سرسید۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ الدعاء هو العبادة۔ پس دعا کے مستجاب ہونے سے اس کا مطلب جس کے لئے دعا کی جاتی ہے حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں

(۱۳) مولانا۔ اب رہا نفس دعا۔ اس کے بارے میں ہمارے ابنائے زمانہ خاص کر جو لوگ انگریزی خواں ہیں بہت سے شکوک کرتے ہیں اُن کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں اسباب کا سلسلہ قایم ہے۔ کوئی نتیجہ بدون سبب کے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اسباب کے سلسلے میں کسی طرح ردو بدل ہو سکتا ہے یعنی دعا کرنا فعل عبث ہے۔ پھر یہ بحث تقدیر میں جا پڑتی ہے کہ خدا نے اچھا برا جو کچھ بھی کسی کی تقدیر میں لکھ دیا ہے ہو کر رہتا ہے۔ اس طرح پر بھی دعا کا کرنا فعل عبث ہوا تیسری بات یہ ہے کہ دعائیں بہتیری قبول بھی نہیں ہوتیں۔ ان باتوں کا ماحصل یہ نکلا کہ دعا ایک فعل عبث ہے اور سلسلۂ اسباب میں دعا کو کچھ دخل نہیں۔ تمام شکوک کا جواب ہم نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ آدمی کی فطرت اسی طرح کی واقع ہوئی ہے کہ جب کبھی اُس کو کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی تدبیر رفع ضرورت کی اُس کو نہیں سوجھتی تو وہ ایسی ہستی کی طرف رجوع کرتا ہے جس کو وہ اپنے ذہن میں سمجھا ہوا ہے۔ کہ اُس کی ضرورت کے دفع کرنے پر قادر ہے یہ بات دوسری ہے کہ جسکو وہ رفع ضرورت پر قادر سمجھا ہے۔ واقع میں بھی رفع ضرورت پر قادر ہے یا نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ وہ حاجتمند خدائے برحق کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یا باطل کی طرف مگر بہرکیف وہ اپنے سے برتر کی طرف رجوع کرتا ہے۔

فطرت انسانی تو یہ ہے اور یہ فطرۃ تمام بنی آدم میں شہری ہوں یا دیہاتی۔ عالم ہوں یا جاہل بچے ہوں یا جوان یا بوڑھے۔ مرد ہوں یا عورت۔ خواندہ ہوں یا ناخواندہ۔ مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے سب میں یکساں پائی جاتی ہے۔

اب رہا دعا کا مقبول و نامقبول ہونا تو بیشک خدا کا فرمودہ ہے ادعونی استجب لکم اول تو قبول کرنے کے وہ معنی نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں بلکہ یہ آیت اُن لوگوں کی رد میں نازل ہوئی معلوم ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بوجہ سن ولوجود مایوس تھے۔ اور ایسا اتفاق ایک بڑے خدا شناس کو پیش آچکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہو گئے تھے توالد وتناسل کی عمر سے متجاوز اور اُن کی بی بی بوڑھی ہونے کے علاوہ بانجھ بھی تھیں۔ اور اس پر حضرت ابراہیم کو اولاد کی تمنا تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ قرآن کی آیتوں میں مذکور ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ بتقاضائے بشریت پیغمبروں تک کو بعض وقت یاس و ناامیدی ہوتی ہے ایسی حالت کی اصلاح کے لئے آیۂ ادعونی استجب لکم نازل ہونا قرین قیاس ہے۔ دوسرے یہ کہ شاید اُن لوگوں کا رد منظور ہو جو حاجت پڑے پر خدا کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں تو آیت قرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم سے دعا کرو کہ ہم دعائیں قبول کرتے ہیں یعنی قبول کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ پھر اگر آیۂ ادعونی استجب لکم کو وعدۂ قبول دعا بھی سمجھا جائے

[1] برخود غلط ۱۲

تو پیرایۂ قبولِ دعا کی صراحت نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی مفلس تونگری کی دعا کرے اور جب خدا اُس کو مال و دولت دے تو وہ تونگری اُس کے حق میں وبالِ جان ہو جائے۔ غرض آدمی علمِ غیب نہ ہونے کی وجہ سے مفاد کی جگہ مضرت کی بھی خواہش کرنے لگتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا[ف۱]۔ تو ایسی صورتوں میں خدا تعالیٰ بتقاضائے رحمت کا ملہ دعائے بد کو قبول نہیں فرماتا۔ لیکن اس کو نامقبولیت نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مصلحت سے دعا قبول نہیں ہوتی تو خدا تعالیٰ دین یا دنیا میں بندے کو اُس کا عوض کر دیتا ہے اور کم سے کم عوض یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ دعا سے دل کو تسکین ہو جاتی ہے الابذکر اللہ تطمئن القلوب (اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوتی ہے۔)

تعدد ازواج

(۱۴) سرسید۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اس کو ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۱۴) مولانا۔ صرف ایک اسلامی شریعت ہے جو اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اُس نے زن و شو کے تعلق کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل مطابق فطرت ہے اور اُس میں دونوں کے حقوق کی واجبی رعایت ہے۔ لیکن مولوی روم نے ٹھیک فرمایا ہے

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد — صد ہزاراں پردہ سوئے دیدہ شد

فیصلہ قرآن کی دو آیتیں ہیں جو ترجمے سمیت ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔

اور اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں (کے بارے) میں انصاف قائم نہ رکھ سکو گے تو اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو[ف۱] لیکن اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) برابری (کے ساتھ برتاؤ) نہ کر سکو گے تو (اس صورۃ میں) ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمھارے قبضے میں ہو اُسی پر قناعت کرنا[ف۲] (نامنصفانہ برتاؤ سے بچنے کے لئے) یہ تدبیر زیادہ تر قرین مصلحت ہے۔

ف۱ اور آدمی جس طرح (اپنے حق میں) بہتری کی دعا مانگتا ہے اسی طرح (دل گیر ہو کر کبھی) برائی کی بھی دعا مانگنے لگتا ہے اور انسان بڑا جلد باز ہے ۱۲

ف۱ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرنے کی صورۃ یہ تھی کہ یتیم لڑکی کسی کی سرپرستی میں ہوتی اور وہ اُس کے مال و جمال کی وجہ سے اُس کے ساتھ نکاح تو کر لیتا لیکن نکاح کے بعد اُس کے حقوق مہر وغیرہ کی چنداں پروا نہ کرتا۔ کیونکہ اُس بےچاری کا کوئی ولی وارث نہ تھا کہ ٹھوک بجا کر اُس کے حقوق لیتا اللہ نے فرمایا کہ جب تم انصاف نہیں کر سکتے تو تم اُن سے نکاح ہی مت کرو کسی اور عورت سے کر لو عورتوں کا دُنیا میں کال نہیں۔ ۱۲

ف۲ شرع کی رُو سے صرف وہ کافر لونڈی غلام ہیں جو جہاد یعنی مذہبی لڑائی میں پکڑے آئیں۔ پھر گرفتار ہوئے پیچھے مالِ منقولہ کی طرح اُن کی خرید و فروخت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک سارے ہندوستان میں کہیں لونڈی غلام نہیں اور حاکمِ وقت کی طرف سے بھی اس کی بڑی سخت مناہی ہے اور یہ جو لوگ قحط میں بچّے پال لیتے یا دوسرے خدمت پیشہ یہ ہم سب کی طرح آزاد ہیں ان کے ساتھ لونڈی غلام کا سا برتاؤ کرنا گناہ ہے خدا کا اور جرم ہے حاکم کا ۱۲

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ

اور تم (اپنی طرف سے) بہتیرا چاہو لیکن یہ تو تم سے ہو نہیں سکے گا کہ (کئی کئی) بیبیوں میں (پوری پوری) برابری کر سکو تو بالکل (ایک ہی کی طرف) مت جھک پڑو کہ دوسری کو (اس طرح) چھوڑ بیٹھو گویا اُدھر میں لٹک رہی ہے۔

ہم نے تو دونوں آیتوں کو ملا کر یہ مطلب سمجھا ہے کہ مسلمان مرد کو وقتِ واحد میں چار بیبیوں تک کے جمع کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ متعدد بیبیوں میں برابری قایم رکھ سکے ورنہ ایک پر قناعت کرے۔ یا لونڈیوں پر۔ برابری میں ایک طرح کا ابہام تھا تو اُس کو آیۃ (۲) سے رفع کر دیا کہ پوری برابری تو تم نہ کر سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ بالکل ایک ہی کے ہو رہو یعنی وہ برابری جس پر تکثیرِ ازواج کی اجازت موقوف ہے اس قدر ہے کہ آدمی ایک ہی بی بی کا نہ ہو رہے۔ کہ دوسری کی بالکل خبر تک نہ لے۔ آیۃ (۱) نے تکثیرِ ازواج پر برابری کی بڑی سخت قید لگا دی تھی اور اس کے ظاہر سے ایسا سمجھا جاتا تھا کہ کامل برابری مراد ہے کہ مرادف ممانعت ہے۔ آیۃ (۲) نے اس قید کو ڈھیلا کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ تکثیرِ ازواج مقدورِ بشری ہے۔ آیۃ (۲) سے تکثیرِ ازواج کا رستہ تو کھلا مگر کہیں اس کی صراحۃ نہیں کہ مردوں کو تکثیرِ ازواج کی کشمکش میں پڑنے کی ضرورۃ ہی کیا ہے۔ مگر جن کو خدا نے ذہن رسا دیا ہے وہ نسآؤکم حرث لکم سے ضرورۃ مستنبط کر سکتے ہیں اور ہم اُس کی تصریح اوپر کر بھی چکے ہیں کہ عورۃ تو تکثیرِ ازواج کی محل ہی نہیں مرد ہے تو مرد تکثیر کا حق دار ٹھیرا۔ عورۃ کا محل نہ ہونا اور مرد کا ہونا یہی مرد عورۃ میں فساد کا موجب ہے۔ عورتیں چاہتی ہیں کہ مرد تکثیر سے مطلقاً تمتع مقید نہ ہوں۔ مرد تکثیرِ نامحدود کے دعویدار ہیں اسلام نے مردوں کو تکثیر محدود کی ڈگری دی۔ اہلِ عرب اسلام سے پہلے تکثیرِ نامحدود ہی پر عمل کرتے تھے اسلام نے تکثیر کو محدود کر کے عورتوں پر احسان کیا۔ اِس پر بھی عورتیں اسلام کے فیصلے سے خوش نہیں۔ اِن کی ناخوشی کی ایک وجہ اور بھی ہے اور معقول ہے کہ مرد کبھی بیبیوں میں سے کسی ایک کے حُسنِ صورۃ یا کسی ادا کے مفتون ہو کر اُسی کے ہو رہتے ہیں یعنی آیۃ (۲) کا ممکن عدل کرنا بھی اُن سے ناممکن ہو جاتا ہے پس اذا فات الشرط فات المشروط کی رو سے مردوں کو تکثیر کی اجازۃ سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں۔

قطع ید

(۵۱) سر سید۔ سارق کے لئے قطع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اس کو مالِ مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی۔

(۵۱) مولانا۔ بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے انسانی فطرۃ کے تمام پہلوؤں پر احاطہ کر لیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فطرت مختلف افراد سے مختلف اوقات میں مختلف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ شارع نے مثال کے طور پر کوئی جزوی صورت لے کر اُس کی نسبت فرما دیا کہ ایسی صورت میں یوں کرنا چاہیئے۔ پس نہ فطرت کا اُسی صورت میں انحصار ہے نہ حکم کا۔ اُس کی توضیح کے لئے میں ایک مثال دیتا ہوں کہ چوری کی سزا چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہے۔ اور مالِ مسروقہ کی مقدار کی کچھ صراحت نہیں جیسی چوری راکھ کی ویسی چوری لاکھ کی۔ تو یہ حکم ویسا ہی ہوا جیسے مولی کے چور کو سولی۔ شارع کا مقصود اصلی تو یہ ہے کہ چوری سے امن و عافیۃ خلائق میں خلل آتا ہے۔ اُس کا انسداد ہو۔ سزا کی سختی اور نرمی موقوف ہے ایک طرف مالِ مسروقہ کی

مقدار پر اور دوسری طرف چور کی حالت پر۔ تھوڑی سی چوری بعض صورتوں میں مسروق منہ کو شاید زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ اور بڑی چوری ممکن ہی کہ مسروق منہ کو تباہ و برباد کر دے۔ اسی طرح بعض چور ایسے ہوں گے جو مجرد انکشاف جرم اور فضیحت سے ڈر کر آگے کو توبہ کریں۔ اور بعض کو شاید چوری کا ایسا لپکا پڑا ہو گا کہ بے ہاتھ کاٹے کسی طرح باز آنے والا نہیں۔ عجب نہیں کہ نزول قرآن کے وقت عرب کے چور ایسے ہی سخت ہوتے ہوں گے کہ بے ہاتھ کاٹے نہ مانتے ہوں گے پھر جیسے جیسے تہذیب اور شائستگی کے ساتھ لوگوں میں غیرت اور حمیت آتی گئی۔ عالموں نے کہ وہی اُن دنوں دیوانی اور فوجداری کے حاکم ہوتے تھے شارع کی اصلی غرض کا خیال کر کے دس درم سے کم میں قطع ید کو جایز نہیں رکھا۔ اور آبرودار چور کو یہ سزا دی کہ اس کو مردود الشہادۃ ٹھیرا دیا۔"

آنحضرت صلعم کا معجزہ قرآن مبین

(۱۶) سرسید۔ قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزے کے صادر ہونے کا ذکر نہیں۔

(۱۶) مولٰنا۔ قرآن میں کہیں صاف لفظوں میں پیغمبر صاحب کے معجزوں کا مذکور نہیں۔ بلکہ بعض مقامات میں تو معجزے سے صریح انکار کیا گیا ہی۔ معراج اور شق صدر دو معجزوں کا حوالہ قرآن میں دیا جاتا ہی تو بعض مفسروں نے اُن کے الفاظ کی ایسی توجیہ کی ہی کہ معجزہ گیا گزرا ہو جاتا ہی۔ اور پھر میں کہتا ہوں کہ معجزہ رسول کے اختیار کا تو نہیں۔

ربا

(۱۷) سرسید۔ جس ربا یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہی اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہی جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا۔ اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور مہٹیوں میں جن کا پیشہ سود خواری ہی پائی جاتی ہی مگر اس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہی ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا جو کسی رفاہ عام کے کام کے لئے چندہ جمع کرے اُس روپیہ کا سود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہ عام کا کام کرنا بھی ربا میں داخل نہیں ہی۔

(۱۷) مولٰنا۔ انسانی فطرۃ اور اسلامی شریعۃ کی سہولت کے ساتھ ممانعت سود کی سختی پر نظر کرتے ہیں تو سوا اس کے اور کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ممانعت سود کی کوئی ایسی توجیہ کریں کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اضطرار اور شرعی ممانعۃ کے دوہرے دوہتڑ سے بچے رہنے کی سب سے آسان تدبیر جو سوجھ پڑتی ہی وہ یہی ہی کہ ہم اپنی خاص حالۃ کی وجہ سے اپنے تئیں حکم ممانعت سود کا ماموریہ اور مخاطب ہی قرار نہ دیں۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہو گا کہ ماموریہ اور مخاطب بن کر بیباکی اور شوخ چشمی کے ساتھ خلاف حکم کریں۔ قرآن میں ایک جگہ تو اضعافاً مضاعفۃ یعنی سود در سود کی مناہی ہی اور دوسری جگہ مطلق سود کی تو جس صورت میں مطلق سود منع تھا سود در سود بدرجۂ اولیٰ منع ہو گا اس کے لئے حکم خاص کی کیا ضرورۃ تھی یہ اشتباہ تو امام رازی کی تفسیر سے رفع ہو جاتا ہی وہ لکھتے ہیں کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سود کا رواج تھا اس سے صاف ثابت ہوتا ہی کہ قرآن میں جہاں مطلق سود کی مناہی ہی وہاں بھی سود سے سود در سود مراد ہی اور چونکہ مطلق سود کو الربوا معروف باللام فرمایا ہی نحو کے قاعدے سے وہی ربوا سمجھا جائے گا معہود فی الذہن جو عرب میں مروّج تھا سود کے معاملہ میں کسی طرح کا اخلاقی گناہ تو سمجھ میں نہیں آتا پھر جو سود کی بارے میں ایسا سخت وعید قرآن میں ہی کیوں ہی ہو نہ ہو وہ وعید سخت سود در سود کی بارے میں ہی کہ سود در سود آخر قرض لینے والے کو تباہ و برباد کر دیتا ہی

ضمیمہ ۱۸ (۲)

اہل وعیال

اگر یہ بات صحیح ہو کہ مرد اور عورۃ دونوں اپنی اپنی جگہ ناقص الخلقۃ ہیں اور جب تک وہ زن وشو کی حیثیت سے آپس میں نہ ملیں پورے اور کامل الخلقۃ انسان یا آدمی نہیں ہو سکتے۔ تو یہ بات بھی صحیح ہو کہ ہمارے مولانا کی لائف بغیر اُن کی اہلیہ کے حالات کے نامکمل اور ناقص اور آدھوری رہ جاتی۔ اگر راقم مرحومہ کے حالات حیاۃ النذیر میں بطور ضمیمے کے شامل نہ کرتا۔

مولانا نے سچ کہا ہو کہ زن وشو کی مثال شربت کی سی ہو کہ اُس کے دو جزو ہیں جداگانہ۔ شکر اور پانی۔ دونوں گھُل مل کر ایک ذات ہو جائیں تو شربت بنتا ہو۔ یہ بات اسی رشتے میں دیکھی جاتی ہو کہ اس کی وجہ سے مال ومتاع۔ اولاد۔ رنج و راحت۔ آب رو۔ ہر چیز اور ہر حالت میں مرد اور عورۃ کی لازمی شرکت قائم ہو جاتی ہو۔ پس یہ بڑی نامناسب بات تھی کہ مرحومہ کے حالات حیاۃ النذیر میں نہ ہوتے۔ اور صرف مولانا ہی کے حالات پر کتاب ختم کر دی جاتی۔ میں اس خصوص میں اپنے مکرم دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا زیادہ احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے اپنی والدۂ ماجدہ کے حالات میں مجھے اتنی مدد دی جتنی کہ ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ پس مجھے اور ناظرین کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا زیادہ شکر گزار ہونا چاہیئے۔

مولانا کی اہلیہ صفیۃ النسا مولوی عبد القادر صاحب مرحوم دہلوی کی اولادِ اکبر تھیں۔ جس طرح یہ سب اولاد میں باعتبار عمر بڑی تھیں۔ اسی طرح لیاقت۔ متانت۔ علم وفضل اخلاق۔ خوش نصیبی۔ تمول اور سربرآوردگی غرض ہر اعتبار سے فخر خاندان تھیں۔ ان کے زمانے میں مستورات کی تعلیم کا چرچا اس قدر نہ تھا کہ جیسا اب ہو۔ بلکہ سچ پوچھیے تو کچھ بھی نہ تھا۔ اب جو ہو وہ بھی کیا ہو برائے نام ہو۔ پھر اس ترقی کو پچاس ساٹھ برس پیچھے ہٹایئے تو صفر ہی رہ جائے گا۔ بالعموم عورتوں کو لکھانا پڑھانا بے ضرورت بلکہ عیب سمجھا جاتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ لکھنا پڑھنا ذریعۂ اکتساب ہو اور پردہ دار عورت کو اس کی کیا ضرورۃ ہو۔ البتہ مولویوں اور مشائخوں کے گھرانوں میں مذہباً اور اعتقاداً قرآن مجید اور چند مذہبی رسائل مثل راہ نجات وغیرہ پڑھا دیے جاتے تھے۔ بس یہی عورتوں کا مبلغ علم تھا۔ اس سے زیادہ تعلیم دینا عورتوں کا دیدہ ہوائی کرنا سمجھا جاتا تھا بہو بیٹیوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر قید رکھنا ہی ایک بڑی اعلیٰ درجے کی تعلیم تھی۔ لکھوانے کا تو قطعاً رواج نہ تھا۔ عورت کا قلم پکڑنا ہی عیب میں داخل تھا۔ چاروں طرف سے انگلیاں اُٹھنے لگتی تھیں۔ خیالات اس قدر پست تھے کہ عورتیں اگر لکھنے لگیں گی تو اُن کی آزادی عصمت وعفت میں ہارج ہو گی۔ اسی وجہ سے مولانا کی اہلیہ بھی اس عموم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ لکھنا تو اُن کو آتا نہ تھا مگر قرآن شریف مع ترجمہ اور اردو کی سب کتابیں بآسانی پڑھ سکتی تھیں۔ بلکہ خط شکست بھی پڑھ لیتی تھیں۔ چوں کہ مولویوں کے گھرانے میں کلام مجید پڑھنے پڑھانے کا ہمیشہ چرچا رہا کرتا تھا اور محلے کی لڑکیاں

سب آکر بڑی اُستانی (مولانا کی ساس) کے پاس پڑھا کرتی تھیں اور ان لڑکیوں میں ہمارے مولانا کی اہلیہ سب سے بڑی تھیں لہذا یہ اس مکتب کی خلیفہ تھیں۔ یہ بھی لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ صدہا لڑکیاں اِن کی شاگرد اب بھی موجود ہیں بہت سے لڑکوں کو بھی پڑھایا تھا۔ رمضان علی اور سبحان بخش کو اتنا پڑھایا کہ اول الذکر داروغہ جیل حیدرآباد ہو کر مر گئے اور ثانی الذکر اب تک زندہ ہیں۔ اور اب یہ مولوی عبدالسبحان پکارے جاتے ہیں۔ اور دہلی میں وعظ و پند کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی تعلیم میں ہمارے مولانا کا بڑا حصہ ہے۔

جس طرح کوئن وکٹوریا ملکہ معظمہ مرحومہ کو بلحاظ اُن کے اوصافِ حمیدہ کے وکٹوریا دی گُڈ کا خطاب پبلک کی طرف سے ملا تھا اسی طرح مولانا کی اہلیہ کو ہر کہ و مہ بیوی صاحب کے لقب سے پکارتا تھا۔ اُن کا اصلی نام کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

عورت کا بڑا فریضہ اطاعتِ شوہر ہے۔ یوں تو ہر عورت کہتی ہے کہ میں اپنے میاں کو اپنا سرتاج سمجھتی ہوں اور اطاعت کرتی ہوں۔ مگر عملاً اکثر جگہ اس کے برعکس نتیجہ نظر آتا ہے۔ مولانا کے مزاج میں فطرتاً تند مزاجی سختی ہے اور وہ جلد برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ اس سختی اور برافروختگی پر بیوی صاحب نے مولانا کی جیسی اطاعت اور فرماں برداری اور رضاجوئی کی اور اُن کے مزاج کی اونچ نیچ کو جس عمدگی سے سنبھالا اُس کی مثال غالباً ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ بڑی باحیا اور شرمیلی بیوی تھیں۔ نہ بہت بک بک کرتی تھیں نہ بالکل گم سُم تھیں۔ طرزِ گفتار نہایت متین تھا۔ کبھی اُن کو ٹھٹا مار کر ہنستے ہوئے کسی نے نہیں سنا۔ شرم اس قدر تھی کہ سر پر سے اُن کا دوپٹہ کبھی کھسکتا نہ تھا۔

اس واقعے سے وہ عورتیں جو دوپٹے کو اپنے گلے میں بتّی بنا کر ڈالے رکھتی ہیں سبق لیں۔ دوپٹے کا کام ستر پوشی ہے وہ تو گیا گزرا ہوا اب تو منجملۂ سامانِ زینت و آرائش اور بناؤ سنگھار کے وہ بھی ایک بانکپن کی چیز ہے۔ لباس اُن کا ہمیشہ صوفیانہ رہتا تھا۔ کبھی شوخ اور چھچھورا رنگ اُنھوں نے استعمال نہیں کیا۔ ہلکے اور نفیس رنگ استعمال کرتی تھیں۔ گوٹا کناری اور مسالے کے جگمگاتے کپڑوں سے ہمیشہ متنفر تھیں۔ اس میں بھی سادگی ملحوظِ خاطر تھی۔ یہ تو جوانی کا حال ہے اور جب سے کہ بڑی لڑکی کا انتقال ہوا اُنھوں نے اپنے کو بالکل خاک میں ملا دیا تھا۔ گویا زندہ درگور تھیں۔ کبھی پلنگ پر بچھونا بچھا کر نہ سوئیں بلکہ کھرّی چارپائی پر بغیر تکیے کے سوتی تھیں۔ رنگین اور ریشمین کپڑے پہننے بالکل چھوڑ دیئے تھے معمولی اور بالکل معمولی لباس استعمال کرتی تھیں۔ نہ اس خیال سے کہ کفایت شعاری ہو بلکہ طبیعت ہی میں کچھ دنیا کی بے ثباتی اور فقر جم گیا تھا۔ دوسروں کو اچھا پہنا کر دوسروں کو اچھا کھلا کر خوش ہوتی تھیں۔ اپنا حال یہ تھا کہ جو بیش قیمت کپڑے تحفے اور سوغات میں آتے کبھی اُس میں سے خود ایک کترن نہ لیتیں۔ بچّوں کو یا دوسروں کو دے دیتیں ہمیشہ یہ کہتیں میں پہن کر کیا کروں گی تم پہنو۔ تمھاری عمر ہے تمھارا پہننا اچھا بھی معلوم ہوگا۔ مجھے دیکھو اور ان کپڑوں کو یہی حال زیور کا تھا۔ بتدریج اُنھوں نے سب بڑھا دیا صرف ہاتھوں میں ایک سونے کا جوڑا مرتے دم تک تھا۔ کہ وہ انتقال کے بعد کاٹ کر نکالا گیا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اُتر نہ سکتا تھا۔ ورنہ وہ اُسے بھی خیرباد کہتیں۔ اپنی زندگی ہی میں بہت سے زیور اُنھوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو دے دلا دیئے تھے۔ جو کچھ بچ رہا وہ اُن کے مرنے کے بعد بطورِ ترکہ اولاد

میں تقسیم نہیں ہوا۔ کیوں کہ اللہ کے فضل سے اُن کی اولاد مستغنی تھی۔ اولاد کی رضامندی سے جوں کا توں مولانا کو دیدیا گیا۔ مولانا نے فروخت کر کے کسی کارِ خیر میں لگا دیا۔

اتنا بڑا کنبہ کہ کئی کئی مامائیں کھانا پکاتی تھیں۔ مگر اُن کی عادت یہ تھی کہ مسالا خود دیتی تھیں کئی کئی دفعہ پتیلی منگوا کر آب و نمک چکھتی تھیں۔ سب سے پہلے مولانا کو کھانا نکال کر دیتی تھیں۔ بعدہٗ بچوں اور نوکروں کو اور سب سے آخر خود کبھی کھانا نہیں بچا یا بچا اور کوئی فقیر آگیا تو اُنھوں نے ویسا ہی اُٹھا دیا۔ اور خود بھوکی رہیں۔ یا یہ کہ پتیلی پونچھ کر ایک آدھ ٹکڑا کھا لیا۔ کہنے کو سب کہتے ہیں لیکن عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنی آسائش کو مقدم رکھتا ہے۔ مگر یہ نیک بی بی دوسروں کی آسایش کو اپنی ذات پر ہمیشہ مقدم رکھتی تھیں۔ بڑی صابر اور بڑی متحمل تھیں۔ یوں تو چھوٹے بڑے ملا کر اُن کے بیس بائیس بچے ہوئے لیکن یکے بعد دیگرے سب آغوشِ لحد میں جا سوئے۔ سب سے آخری صدمہ بڑی لڑکی کے انتقال کا تھا جو مولوی حاجی حافظ سید احمد حسن صاحب دہلوی اول تعلقہ دار کی اہلیہ تھیں۔ حاجی صاحب مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے ارشدِ تلامذہ میں سے ہیں۔ مولوی نذیر حسین صاحب ہی نے یہ نسبت کرائی تھی۔ بیوی صاحب کی بڑی لڑکی کا انتقال زچگی میں یکایک بمقام لنگسگور ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ ایسی حالت میں کہ بیوی صاحب کے سوا کوئی نہ تھا بیوی صاحب ہی نے نہلایا دُھلایا اور غسل دیا۔ کفن پہنایا۔ مگر صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اتنی بات البتہ ہوئی کہ اُن کے مرنے کے بعد ہمیشہ افسردہ خاطر اور مغموم رہنے لگیں۔ اور عجب نہیں کہ اُسی صدمے نے اُن کی زندگی کو قبل از وقت تمام کیا۔ مرحومہ بیوی صاحب صرف دو اولادیں چھوڑ گئی ہیں ایک لڑکی جو خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب (یہ صاحب مولانا شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کے خاندان میں ہیں) مددگار بندوبست دکن سے منسوب ہیں۔ اور ایک لڑکا (مولوی بشیر الدین احمد صاحب) جو ریاستِ نظام میں دوم تعلقہ دار ہیں۔ یوں تو سب مائیں اولاد کی دیوانی ہوتی ہیں۔ مگر ماں ماں میں بھی فرق ہی بعض ایسی سخت مزاج اور درشت ہوتی ہیں کہ بچوں کو گھرکنا جھڑکنا حتیٰ کہ مارنا آئے دن کا شیوہ ہی مگر بیوی صاحب نے اپنی اولاد کو باوجود لاڈ پیار کے بھی بہت اچھا اُٹھایا۔ نہ وہ ضدی اور چڑچڑے اور نافرماں بردار ہوئے نہ ماں نے کبھی ان کو اُنگلی لگائی۔ اولاد تو اولاد وہ کبھی کسی نوکر سے بھی سختی کا برتاؤ نہیں کرتی تھیں۔ نہ اس بات کی روادار تھیں کہ کوئی نوکروں چھوکروں اور چھوکریوں پر سختی کرے۔ مارنے پیٹنے کا تو نام نہ تھا۔ گھرکنے جھڑکنے سے بھی وہ ناراض ہوتی تھیں۔ مخیر حد درجہ کی تھیں۔ خفیہ طور پر خیرات بہت کرتی تھیں۔ جاڑوں میں لحاف گرمیوں میں جوڑے۔ قحط میں اناج ہمیشہ بانٹا کرتی تھیں۔ بہت سی بیواؤں پردہ نشین عورتوں اپاہجوں اور محتاجوں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ جن کی کانوں کان کسی کو خبر نہ تھی۔ نہ کبھی کسی کو دے کر منت اور احسان رکھتی تھیں نہ کبھی اس کا اظہار کرتی تھیں۔ غرض جو کچھ کرتی تھیں خالصۃً لوجہ اللہ۔ بہت سی غیر مستطیع لڑکیوں کی شادیاں کرا دیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ کی مسجد کا حوض اور [illegible] کرا دیا۔ اپنے محلے کی مسجد کی پوری مرمت کرا دی۔ یہاں تک کہ صحن بھی پختہ بنوا دیا۔ علی گڑھ کالج کی مسجد میں بار ہا چندہ دیا [illegible] خیر میں اُن کا ہاتھ ہمیشہ پیش قدمی اور سبقت کرتا تھا۔ لوگوں کو قرض حسنا بہت دیا کرتی تھیں۔ رقیق القلب اور [illegible] پڑھا کرتیں غریب سی غریب بیوی کو اپنے پاس بٹھاتیں۔ اپنی پٹاری میں سے پان بنا کر دیتیں۔ ایک عزیز کو انھوں نے [illegible] روپیہ قرض حسنا

دیئے۔ اُن کے کئی وعدے ٹل گئے۔ مگر یہ جیبیں بجبیں نہ ہوئیں۔ وہی آ آکر عذر معذرت کر جاتے تھے اس طرح کئی برس گزر گئے ایک دفعہ وہ آئے اور دروازے پر بیوی صاحب کو بُلا کر اپنی بے استطاعتی اور وعدہ خلافی اور نادہندی پر پشیمان ہو کر رونے لگے اور اپنے ہاتھ جوڑ کر پردے کے اندر کر دیئے۔ بیوی صاحب یہ دیکھ کر لرز گئیں اور خیال کیا کہ اللہ اکبر ہیں تو ہم اور یہ ایک ہی کنبے کے اور بیویاں پیسے پیسے کو محتاج ناچار اور مجبور خود بھی رونے لگیں اور نہ صرف تمام قرض معاف کر دیا بلکہ ان کو اُوپر کچھ بھی دیا۔

چوں کہ وہ شدت سے نیک مزاج تھیں بعض نالائق کنبہ دار سرزوری کر کے اُن سے لیتے بھی تھے اور اُن کو تکلیف بھی دیتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے کرنے کا کام کیئے ہی جاتی تھیں۔ نیکی کن و بدریا انداز۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک قریب کے عزیز نے جن کے سامنے وہ ہوتی تھیں دو بدو اُن کو سخت دست کہا۔ اور ان الفاظ سے کوسا کاٹا کہ ابھی لیا ہے ایک لڑکی تو جوان مر چکی ابھی اور مرے گی اور نعوذ باللہ بے ایمان کا لفظ بھی کہا جس کو سُن کر دوسرے تا پا کانپ اُٹھیں۔ اور مُونہ سُرخ ہو گیا۔ مگر زبان سے اُف نہ نکالی۔ اور کہا تو یہ کہا کہ ہاں بیٹا تم سچ کہتے ہو۔ میں اُس سے بھی بدتر ہوں جو تم نے کہا۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن وہی صاحب دوڑے دوڑے آئے اور بیوی صاحب کے گلے لگ گئے۔ انھوں نے یہ بھی نہ خیال کیا کہ میں اس شخص کو کیوں کر گلے لگاتی ہوں۔ جو مجھے اس طرح کوس کاٹ گیا ہے نہیں بالکل خالی الذہن جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ انھیں گلے لگا لیا اور کہا کہ بیٹا تم میرے بچے ہو جیسے میاں بشیر۔ بھلا میں کیا تمھاری بات کا بُرا مانتی۔ اور پھر اس طرح صاف ہو گئیں گویا کہ کچھ بات ہی نہ تھی۔ الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس۔ ایسی صدہا مثالیں ہیں کہ جن لوگوں نے اُن کی بدگوئی کی ہے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں۔ اُنھیں سے وہ زیادہ سلوک کرتی تھیں ع دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔

بیوی صاحب کی ایک بھاوج ہیں مولوی حافظ عبدالواجد صاحب کی بیوی وہ بہت طرار اور ہوشیار ہیں۔ عبدالواجد صاحب کے انتقال کے بعد لوگوں نے بیوی صاحب کو بہت کچھ بھڑکایا۔ بیوی صاحب ہمیشہ اُن کی خبر گیری کرتی رہتی تھیں۔ عبدالواجد صاحب اُبالی آدمی تھے۔ بیوی صاحب بھائی سے کہہ کہہ کر بھاوج کو تنخواہ دلواتی تھیں۔ اور ہر طرح ان کی بہی خواہی کرتی تھیں۔ جب متواتر انھوں نے سنا کہ بھاوج نے بھلائی کا بدلا بُرائی سے کیا تو بمقتضائے بشریت بیوی صاحب بھی کشیدہ ہو گئیں۔ ان کا ہاتھ کھینچنا تھا کہ بھاوج صاحب چند ہی روز میں پریشان ہو کر بہت تنگ حال ہو گئیں۔ لوگوں کو مزہ آنے لگا۔ کیوں کہ بیوی صاحب کو برہم کر کے اُنھوں نے اِن بیچاری پر ستم ڈھایا۔ جو کچھ وہ سلوک کرتی تھیں وہ بند ہو گیا۔ اور ان کو اِس کے سوا سہارا ہی کیا تھا۔ بیوی صاحب دل سے چاہتی تھیں کہ کوئی ایسا اللہ کا بندہ درمیان میں آ جائے کہ میرے اُن کے صفائی ہو جائے میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے کوئی رنجیدہ رہے۔ لیکن کسے غرض پڑی تھی کہ میل ملاپ کراتا اسی طرح کئی سال گزر گئے مگر بیوی صاحب ہمیشہ ان کی تکلیف اور عُسرت کا حال سُن کر متاثر ہوتی تھیں۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور خود ڈولی چڑھ اُن کے گھر پہنچیں وہ بیچاری بیوی صاحب کو اچانک آتے دیکھ بدحواس ہو گئیں۔ اور دل میں کہنے لگیں کہ دیکھیے اب کیا نیا گُل کھلاتا ہے۔ لیکن بیوی صاحب نے اُن کی حد سے زیادہ طمانیت کی اور خود اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنا قصور معاف کرایا اور کہا کہ لوگوں نے مجھے تمھاری طرف سے غلط طور پر بدگمان کر دیا تھا۔ تم للہ میرا قصور

معاف کرو۔ وہ بے چاری اس قدر شرمندہ ہوئیں کہ زمین میں گڑ گئیں۔ اول تو بیوی صاحب سارے کنبے میں بڑی اور پھر محسنہ غرض کہ اُن کی زبان سے کچھ نہیں نکلا اور ایسی حالت میں کیا نکل سکتا تھا۔ اِس تاریخ سے بیوی صاحب نے دس روپے ماہوار تنخواہ اُن کی مقرر کر دی۔ لیکن یہ بات اُس وقت تک لوگوں کو نہیں معلوم ہوئی جب تک کہ بیوی صاحب کا انتقال نہیں ہو گیا اُن کے انتقال کے بعد اُن کی بھاوج نے یہ سارا قصہ بیان کیا ایسے ایسے سیکڑوں واقعات ہیں جن کی وجہ سے اُن کے انتقال کے بعد سارے محلے میں کہرام مچ گیا بیسیوں عورتیں صرف اُن کے مرنے کو روتی تھیں بلکہ اپنے ذریعۂ پرورش کے اٹھ جانے سے بے یار و مددگار رہنے کی وجہ سے روتی تھیں۔

مولانا کے مزاج کو دھیما اور ٹھنڈا کرنا۔ موقع پا کر اعزہ و اقربا کی سفارش کرنا۔ ہر شخص کی مالی مدد کرنا یہ اُن کا اہم فریضہ تھا۔ اُن کی زندگی تک بیٹا بیٹی کسی نے علیحدہ گھر نہیں کیا۔ سب کا خرچ بیج انھیں کے ذمّے تھا۔ خود کسی سے ایک حبّہ کسی پہلو سے نہ لیتی تھیں۔ بلکہ ہزار ڈھنگوں سے ان لوگوں کو اُور دیتی رہتی تھیں۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں جب رخصت لیکر جایا کرتا تھا تو اپنا روپیہ پیسہ سب ماں کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اور بالائی خرچ کے لیئے ایک تھیلی میں چند روپے اور پیسے الگ رکھ دیا کرتا تھا۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ باوجود مہینوں رہنے اور سیکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بھی وہ تھیلی والے روپے کم نہ ہوتے تھے جب پوچھو تو وہ یہی جواب دیتی تھیں کہ تو بہ تم کو کیسی بھول ہے۔ بیٹا تمھاری تھیلی الگ رکھی ہے جو تم لیتے ہو میں نکال دیتی ہوں۔ لیکن درحقیقت وہ وقتاً فوقتاً اُس میں اُوپر ملا دیا کرتی تھیں۔ یہ طریقہ اُن کو اس وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا کہ بیٹا نہیں چاہتا تھا کہ ماں پر اپنا بوجھ ڈالے لیکن ماں کی محبت اور مامتا اسی کی مقتضی تھی۔

دیانت دار اور امین ایسی تھیں کہ کسی کی کوڑی ادھر کی اُدھر کرنا وہ گناہ کبیرہ سمجھتی تھیں بعض عورتوں کا خیال ہے کہ خاوند کا روپیہ اپنا روپیہ ہے اور یہ بھی سچ اِس کی چوری چوری نہیں ہے۔ لیکن بیوی صاحب کا معاملہ ہی اُور تھا۔ وہ دوسرے کے روپے کو سانپ بچھو خیال کرتی تھیں۔ خواہ اس میں خاوند کا روپیہ ہو یا بیٹے کا یا بیٹی کا۔ خواہ اور کسی کا۔ چناں چہ خود مولانا ناقل تھے کہ ایک مرتبہ ردی کاغذوں کی ٹوکری میں اُنھوں نے بھُولے سے ردی کاغذات کے ساتھ پانسو روپے کا ایک نوٹ ڈال دیا۔ وہ اتفاق سے بیوی صاحب کے ہاتھ لگ گیا انھوں نے اُٹھا کر رکھ لیا۔ اور کچھ ذکر نہیں کیا۔ چند روز کے بعد جب تلاش کی نوبت ہوئی اور ہل چل مچی تو انھوں نے دے دیا۔ اور کہا کہ تم نے اس طرح ڈال دیا تھا میں نے اُٹھا لیا۔ اور اس خیال سے فوراً ہی نہیں دیا کہ دیکھوں تم کب تک خیال نہیں کرتے۔

اسی طرح کا ذکر ہے کہ ایک دن وہ مولانا کے کپڑوں کا صندوق جھاڑ رہی تھیں اُس میں ایک روپیہ پڑا ملا۔ چوں کہ مولانا کا صندوق تھا اور بظن غالب وہ اُن ہی کا روپیہ ہو گا۔ بیوی صاحب نے لاکر مولانا کو دے دیا۔ مولانا یہ نقل اُن کی غایت درجے کے امین ہونے کی رو کر بیان فرماتے تھے۔

بیوی صاحب مولانا کے ساتھ جہاں جہاں مولانا رہے سب جگہ پھریں۔ لیکن مولانا کے خانہ نشین ہونے کے سال دو سال اول ہی دہلی چلی آئی تھیں اور یہیں مستقلاً رہنے لگی تھیں۔

لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ بیوی صاحب کے ہاتھ میں غیر معمولی برکت ہے۔ اور واقعی تھی بھی یہی بات۔ مولانا جو ماہا

خرچ کو دیتے تھے وہ تو ایسا بہت نہ تھا۔ نہ بیوی صاحب کے مکانات اور جائداد کے کرایے کی آمدنی دو ڈھائی سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تھی۔ تاہم ان کو کبھی خرچ سے تنگ نہ سنا۔ اُن کی زبان سے بھی کبھی اس کی شکایت نہیں سنی۔ بیوی صاحب نے اُس روپے میں سے جو اُن کو خرچ کے لیئے ماہوار ملتا تھا پس انداز کر کے اتنی جائداد پیدا کی جس کا کرایہ ڈھائی سو روپے ماہوار تھا۔ یہ بھی اُن ہی کا کام تھا کہ خرچ بھی چلایا اور پس انداز بھی کیا۔

چوں کہ بیوی صاحب کا ہاتھ متبرک سمجھا جاتا تھا کنبے کے لوگ اپنا روپیہ پیسہ اُن ہی کے پاس جمع کر دیا کرتے تھے۔ برکت تو خیر جو ہو گی وہ ہو گی مگر ظاہرا برکت تو یہ تھی کہ اُن کی مثال اُس صندوقچی کی سی تھی کہ جس میں روپیہ ڈالنے کو تو ڈال دو مگر ایک خاص تعداد پر پہنچے بغیر نکل نہیں سکتا تھا۔ یعنی وہ جمع کرنے کو تو جمع کر لیتی تھیں۔ مگر واپس بہت کم دیتی تھیں اگر احیاناً لینے والوں کو ضرورت پڑ جاتی تو اپنے پاس سے دے دیتی تھیں مگر امانت والی تھیلی میں ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ اُن کا مقولہ تھا کہ بھئی وہ روپیہ تو تم رہنے دو۔ مجھ سے قرض کے طور پر لے لو۔ تو قرض کا بوجھ تم پر رہے گا ادا کر دو گے۔ ورنہ اُسے ہاتھ لگاؤ گے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ پھر تم جمع نہ کر سکو گے۔ چناں چہ اس طرح چھوٹے بڑوں سبھوں کا روپیہ اُن کے پاس جمع تھا۔ لکھنا تو اُن کو آتا نہ تھا۔ نہ کسی کا حساب کتاب اُن کے پاس تھا۔ البتہ ہر شخص کے نام کی تھیلیاں تھیں۔ اُسی میں وہ روپیہ جمع رہتا تھا۔ اور لوگوں کو بھی ایسا اطمینان تھا کہ وہ اُلٹ کر بھی نہیں پوچھتے تھے کہ کس قدر روپیہ جمع ہوا۔ جب کبھی کوئی روپیہ لایا اُس نے اپنی تھیلی میں ڈال دیا۔ اور اطمینان سے گھر چلا گیا۔ لیکن بعض اوقات وہ کہتی تھیں کہ بھئی اپنا اپنا روپیہ گن لو سنبھال لو۔ لکھ کر چٹھی ڈال دو کہ کتنا روپیہ ہوا۔ کیوں کہ زندگی کا ٹھیک نہیں موت کا اعتبار نہیں معلوم نہیں کس وقت زبان بند ہو جائے۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکوں۔ جب بیوی صاحب کا انتقال ہو گیا تو صندوقچے بہی معمولی مٹی کے تیل کے پیپے تھے۔ اور اُن میں اعزہ و اقربا کا روپیہ اُن کے پاس بھرا پڑا تھا۔ کنجیاں اُن کے سرہانے رہا کرتی تھیں۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ صندوق کئی مہینے اسی طرح بند پڑے رہے۔ جب تک کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب حیدر آباد سے آئے۔ ان کو تردد ہوا کہ معلوم نہیں کس کا کس قدر روپیہ ہے۔ نہ کسی کا حساب ہے نہ کتاب نہ رسید نہ پرزہ۔ دیکھیے کیا جھمیلا پڑتا ہے۔ تاہم احتیاطاً اُنھوں نے اپنے ماموں ممانی اور خالاؤں اور جن جن کا روپیہ تھا سب کو جمع کیا اور اُن کے سامنے وہ صندوق کھولے۔ اور جس کی جو تھیلی تھی اُس کے سامنے رکھ دی کیوں کہ تھیلی میں نام کی چٹھی پڑی ہوئی تھی۔ چناں چہ سب نے اپنا اپنا روپیہ سنبھال لیا۔ بعض تھیلیوں میں دونیاں چونیاں اور پیسے تھے۔ غرض بعض کو توقع سے زیادہ روپیہ ملا۔ کیوں کہ وہ بتدریج جمع کرتے تھے اور اُن کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کس قدر روپیہ جمع ہو گیا ہے۔ نہ بیوی صاحب خبر کرتی تھیں کہ زیادہ روپیہ جمع ہونا معلوم ہو گا تو پھر اور جمع نہ کریں گے نہ یہ اُلٹ کر اُن سے پوچھ سکتے تھے۔ اس طرح جمع ہوتے ہوتے بعض کے بیسیوں سے لے کر سیکڑوں اور سیکڑوں سے ہزاروں ہو جاتے تھے۔ چناں چہ اس طرح جمع کرتے کرتے مولوی عبد الحامد صاحب کی لڑکیوں کی شادیوں کے وقت معتدبہ رقم نکلی جس سے مولوی عبد الحامد صاحب کا بہت کچھ بار ہلکا ہو گیا۔ ماہوار سو پچاس روپیہ نکال دینا اُن کو آسان تھا مگر وقت پر تین چار ہزار روپیہ مل جانا بہت مشکل تھا۔ یوں وہ جمع نہ کر سکتے تھے ایک دم

سے اتنا روپیہ نکال سکتے۔

ایک تھیلی میں تین سو روپے کے نوٹ نکلے جن میں کوئی چیٹھی نہ تھی۔ مگر ایک گلے کا طلائی توڑا جو اُن کا ذاتی مال تھا وہ بھی اُسی میں تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ اُن مرحومہ کا ذاتی روپیہ ہے اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنے حج کے روپے علیٰحدہ رکھے ہیں۔ پس یہ وہی روپیہ تھا اور الحمد للہ کہ اُن کی خواہش اور وصیت کے موافق اُس روپے سے اُن کا حج بدل بھی کرا دیا گیا۔ ع این بار گراں بود ادا شد چہ بجا شد۔ غرض روپے کا معاملہ اور پھر اِس کا نہ حساب نہ کتاب مگر اللہ رے امانت داری اور اللہ رے ساکھ کہ ہر شخص کو بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیوی صاحب کسی کی دمڑی اِدھر کی اُدھر نہ ہونے دیں گی۔ کسی نے سونہ سے بھاپ نہ نکالی اور اپنا اپنا روپیہ لے لوا کر چل دیا۔

بعض اوقات اُن کو کسی دوست کو قرض دینے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بھی وہ اُس زرِ جمعہ میں سے اُس وقت تک نہ دیتی تھیں۔ جب تک کہ مالک سے اجازت نہ لے لیتیں۔ اِس لحاظ سے ہماری رائے میں اگر مرحومہ کو صفیہ امینہ کا لقب دیا جاتا تو بہت موزوں تھا۔

مولوی عبد القادر صاحب کے انتقال کے بعد جب ترکہ تقسیم ہوا تو مولوی عبد الحامد صاحب اور تین لڑکیاں وارث تھیں۔ سب نے حصہ بخرہ کر لیا۔ بیوی صاحب کی نسبت کہا کہ وہ تو خود متموّل ہیں۔ اُن کو ترکے میں سے کسی مکان کی کیا ضرورت اَور سب کو مکان اور نقد روپیہ ملا اور ان کو صرف پانسو روپیہ۔ بیوی صاحب کو یہ بھی کچھ ناگوار نہ ہوا۔ بلکہ اُن کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ پاس کے پاس جن کو مکانات مل گئے وہ میرے ہی پاس رہیں گے۔ میں مکان لے کر کیا کروں گی۔ اور مجھے اِس روپے کی بھی سرِ دست ضرورت نہیں۔ بھائی سے کہا کہ تم اپنے پاس رکھو۔ جب ضرورت ہوگی لے لوں گی۔ جب تک وہ زندہ رہیں اُنھوں نے کبھی نام بھی نہ لیا۔ اُن کے مرنے کے بعد بھی وہ روپیہ مولوی عبد الحامد صاحب کے پاس رہا۔ ایک دفعہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے اُنھوں نے کہا کہ بھئی اپنی ماں کا ترکہ لے لو جو میرے پاس امانت ہے۔ میاں بشیر نے کہا کہ جب ہماری ماں نے نہیں لیا تو ہم لے کر کیا کریں گے۔

اِسی طرح محلے میں جب کوئی مکان بکتا خود نہ لیتیں۔ بھائی بہنوں نواسے نواسیوں کو دلوا دیتیں۔ حتّٰی کہ اپنا ایک مکان جس کے ملحق دوسرا مکان تھا اور جس میں اُس کے ملانے سے صحن کشادہ ہوتا تھا اپنی ضرورت پر مولوی برکت اللہ صاحب اپنے ماموں کی ضرورت کو مقدم رکھا۔ ان کو دلوا دیا اور خود نہ لیا۔ ایسے ہی مواقع پر سچّی ہمدردی کا امتحان ہوتا ہے کہ دوسرے کے معاملے میں اپنا نقصان گوارا کر لیں۔

کنبے میں ایک مرتبہ ایک عزیز قریب پر ڈگری ہوئی۔ بہ تعمیلِ ڈگری اُن کو کشاں کشاں جیل جانا پڑا۔ بھلا بیوی صاحب کہاں متحمل ہو سکتی تھیں۔ جھٹ ہزار روپیہ نکال حوالہ کیا اور اُن کو جیل میں نہ جانے دیا۔

ایک مرتبہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے حیدر آباد میں ایک شکرم مع جوڑی نرگا داں چار سو روپے کو خریدی۔ اتفاقاً مرحومہ حیدر آباد میں موجود تھیں۔ اُنھوں نے سنا۔ سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔ فرمانے لگیں میرے ہوتے اور تم اپنے پاس سے سواری لو ہرگز نہیں۔ اور چار سو روپیہ نکال کر حوالے کیا۔ ایسی صدہا مثالیں ہیں جن کا بیان کرنا طولِ عمل ہوگا

بیوی صاحب کے لکھنے پڑھنے کا حال ہم دکھا چکے ہیں کہ پڑھنا خوب جانتی تھیں۔ لکھنا کیوں کر آتا سکھایا ہی نہیں گیا۔ سینے پرونے کاڑھنے میں ان کو دست گاہ کامل تھی۔ ٹانکا ان کا بہت باریک اور سجل تھا۔ اُن کے ہاتھ کا بخیا مشہور تھا۔ اُن کے زمانے میں سیونگ مشین کہاں تھی۔ اب اس مشین نے سینے کی مشق کو بھی بٹھا دیا۔ مختلف قسم کے کشیدے اور کاڑھنا خصوصاً دیکھت بھولی[۵۱] کی کڑھن خوب آتی تھی۔ مولانا کے عمدہ کپڑے وہی سیا کرتی تھیں گلّی کی سلائی اُن کی بہت صاف ہوتی تھی۔ رفو ایسا نفیس کرتی تھیں کہ دہلی کے رفوگر شاید مقابلہ کرسکیں تو کرسکیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ مولانا کے ایک دوشالے میں جابجا کیڑا لگ گیا تھا۔ جب اُنھوں نے دیکھا تو ڈریں کہ ایسا نہ ہو کہ وہ خفا ہوں۔ اس لیے کئی مہینے بیٹھ کر اُنھوں نے اُسے رفو کیا اور ایسا رفو کیا کہ مولانا کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور دیکھنے والا جب تک غور سے نہ دیکھے معلوم نہیں کرسکتا کہ اس میں رفو کیا ہوا ہی۔

کھانے پکانے میں انھیں اِس سے بھی زیادہ دست گاہ تھی۔ اُن کو اِس قدر شوق تھا کہ وہ ہمیشہ مسالا خود دیکھ دیا کرتی تھیں۔ ماما مسالا پیس کر ایک رکابی میں رکھ سامنے لائی اور اُنھوں نے چاقو سے نشان کر دیا کہ اتنا اتنا ڈالو۔ اور خود بھی دو تین پھیرے باورچی خانے کے کرتی تھیں۔ بعض وقت خود سالن بگھار دیتی تھیں۔ بعض وقت خود دو تین دفعہ دیکھ لیتی تھیں۔ جو ماما اُن کے ہاتھ کے نیچے رہتی تھی چند روز میں اول درجے کی مشاق ہو جاتی تھی۔ خود بیوی صاحب کے ہاتھ کا سالن بہت بامزہ اور خوش رنگ ہوتا تھا۔ خصوصاً اُن کے ہاتھ کی اروی اور آلو کہ جس میں جگر تک مسالا پیوست ہو جاتا تھا نہ یہ کہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح آلو اور اروی سفید شوربا الگ اور گوشت جدا۔ پتیلی کا مونہ بند کرکے ایک سالن پکاتی تھیں جو اشٹو کہلاتا تھا۔ وہ تو بس ایسا ہوتا تھا کہ پیٹ بھر جائے مگر نیت نہ بھرے۔ اُنگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ پلاؤ۔ بریانی۔ زردہ۔ شامی کباب۔ سیخ کے کباب۔ کھیر۔ نان خطائیاں۔ حلوا سوہن۔ سب چیزیں اِن کے ہاتھ کی بہت نفیس اور خوش ذائقہ ہوتی تھیں۔ معمولی چپاتیاں بیوی صاحب کے ہاتھ کی بہت بڑی اور گول اور صاف ہوتی تھیں۔ علیٰ ہذا بیسنی روٹی جس کے دونوں پرتوں کے درمیان چنے کی دال بھری جاتی ہی۔ بیسنی روٹی اور پراٹھے یہ سب چیزیں ایک سے ایک بڑھ کر ہوتی تھیں۔ یہ پُرانے زمانے کی بیویاں تھیں جن کو کھانے پکانے سینے پرونے کا اس قدر شوق تھا ورنہ اِس زمانے کی لڑکیاں تو اس کو کسرِ شان سمجھتی ہیں۔ اِن کا مقولہ ہی کہ کون اپنی جان ہلکان کیے اور کون بلا میں پھنسے۔ ماما جانے اور چولھا۔ کون جھینکے۔ جس درزی کی ناک پر ٹکا رکھ دیا وہ اچھے سے اچھا سی دے گا ہم کو کیا غرض جو ہم اپنا پِتّا ماریں۔ ماما موجود اللہ نے باورچی دیا ہماری بلا کو غرض پڑی ہی کہ چولھے میں مونہ اوندھائے جان کو جلائیں۔ آج کل کی لڑکیوں کو اس بات کی کب پروا ہی کہ میاں کا آرام و آسایش سب پر مقدم ہی۔ اُسے عمدہ کھانا کھلانا اور عمدہ کپڑا پہنانا سلیقہ مند بیویوں کا کام ہی اور ایک شوہر ہی کے دم سے ساری بہار ہی۔ بیوی کی سلطنت کا یہی بادشاہ ہی۔ میاں بیوی کے تعلقات ایک ایسا معاملہ ہی کہ اس پر بحث کرنا ہمارے مبحث میں داخل نہیں تاہم اتنا چاہتے ہیں کہ مولانا کی کامیابی میں بیوی صاحب بٹر ہاف[۵۲] کی بدولت

---

[۵۱] یہ ایک قسم کی مشکل کڑھن ہی جس کے خانے ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ اِدھر دیکھا اُدھر بھولے۔ اِسی واسطے اُسے دیکھت بھولی کہتے ہیں ۱۲

[۵۲] انگریزی میں بٹر ہاف یعنی بہترین نصف بی بی کو کہتے ہیں۔ یعنی انسان کے دو حصے ہیں نصف مرد نصف عورت اِس میں بہترین نصف عورت ہی ۱۲

مصداق تھیں۔ کنبہ پروری میں اُن کی نظیر نہیں۔ اطاعت و فرماں برداری میں اُن کا مثل نہیں۔ جب ہی مولانا بہ مصداق قدر مردم بعد مردم اب اُن کو یاد کر کر کے روتے ہیں اور بجا روتے ہیں اور ایک وہ کیا روتے ہیں ہم نے تو بیوی صاحب کے تمام اعقاب کو روتے دیکھا۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو　　ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں
آں چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو　　ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

بڑھاپے میں بیوی کا مرجانا گھر کی تباہی کا باعث ہو وہ ایک تیلیوں کا بندھن تھیں سب یکجا تھے۔ اُن کا مرنا تھا کہ تیلیاں بکھر گئیں۔ جس کے جدھر سینگ سمائے چل دیا۔ اب کوئی پوچھنے والا نہ رہا وہی گھر جس میں اس قدر چہل پہل اور جگمگھٹا رہتا تھا اب بھائیں بھائیں کرتا ہی۔ بلکہ خالی پڑا ہی اور نہ صرف خالی پڑا ہی بلکہ بند ہی جس کی جھاڑو بہارو بھی نہیں ہوتی۔ ع
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

بیوی صاحب پر سوکن

بیوی صاحب کو اپنی زندگی میں موافق و ناموافق سب ہی قسم کے معاملات پیش آئے لیکن سب سے زیادہ صدمہ دنیا میں سوکن کا ہوتا ہی وہ بھی اُن پر آخر حصہ عمر میں گزر گیا۔ کہتے ہیں چون کا شریک بُرا ہوتا ہی۔ اللہ میاں کو بھی شرکت پسند نہیں۔ ایک ریختہ گو نے کیا خوب کہا ہی ؎

یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں　　کروں کیا کہ پتھر کی چھاتی نہیں

ناظرین سے زیادہ بیوی صاحب پر سوکن کا لانا ہم کو تعجب میں ڈالتا ہی۔ اور ہم کو مولانا کا وہ مشہور شعر یاد آجاتا ہی جو انھوں نے مصنفات کے ٹائٹل پیج پر لکھا ہی ؎

میری سنو اگر نہیں سمعِ قبول کر　　دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر

لیکن تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ بجنور والوں کی کاوش سے یہ سب کچھ ہوا۔ اِن لوگوں کو شروع ہی سے کاوش تھی۔ اِن کا خیال تھا کہ دلّی والوں نے بجنور کی دولت کو لوٹ لیا۔ اور ہم ایمان کی بات کیوں کر نگل جائیں یہ بات سچ بھی تھی۔ مولوی عبد القادر صاحب مرحوم کی غلطی تھی کہ انھوں نے پردیسی لڑکے کو بیٹی کیوں دی۔ اِن کو چاہیئے تھا کہ مولانا کی ماں سے مشورہ کرتے۔ لیکن اِسی کے ساتھ یہ بات بھی تو تھی کہ مولانا کی ماں کو بھلا کب گوارا ہوتا کہ بیٹا پردیس میں بیاہا جائے۔ خصوصًا وہ کہ دیہات کی رہنے والی تھیں۔ جہاں شہری تہذیب اور شایستگی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ لیکن منتے کہ بعد از جنگ اب کیا ہو سکتا تھا۔ بیوی صاحب بیچاری کا اِس میں کیا قصور تھا۔ ہمارے ملک میں شادیاں ماں باپ کی مرضی پر ہوتی ہیں۔ جہاں لڑکی کا ہاتھ پکڑا دیا لڑکی وہیں کی ہوگئی۔ لیکن دیہاتیوں کی کوڑھ مغزی اور ہٹ اور پھر تریاہٹ کچھ نہ پوچھیئے۔ بیوی صاحب نے تو سسرال والوں کی وہ آؤ بھگت کی کہ بجنور والی تا حشر نہ کرتی۔ تمام بجنور والوں کی سفارش کر کر کے نوکر رکھوا دیا ہر متنفس سے سلوک کیا۔ چناں چہ مولوی علی احمد صاحب اور ضمیر احمد صاحب اور دوسرے لوگ تو بیوی صاحب کے گرویدہ اور شرمندۂ احسان رہے۔ لیکن مولانا کی والدہ جن کو خدا زندہ رکھے جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا بیوی صاحب کے مرتے دم تک صاف نہیں ہوئیں۔ اور کس طرح ہوتیں کہ دونوں میں سوائے جہان اُخل

کبھی یک جائی بھی نہیں رہی۔ تاہم ساس صاحب جب دہلی آتیں تو مہینوں رہتیں۔ بیوی صاحب غیروں کی خاطر و مدارات کرتی تھیں۔ مہمان نواز تھیں۔ یہ تو ساس تھیں ہر طرح ان کی خاطر تواضع کرتیں مگر ان کے دل سے دہلی اور بجنور کی مغایرت نہ گئی۔ نصف صدی کے قریب کے فصل نے بھی اس ابرِ غلیظ کو نہ پھاڑا۔ کالی گھٹا چھائی تھی سو چھائی رہی۔ آخر وہ ۱۸۸۸ء میں مرسی پر برسی یعنی مولانا کی والدہ نے نہیں معلوم کیا کچھ اُلٹی پٹی پڑھاوی کہ نکاحِ ثانی با ایں پیرانہ سالی کروا ہی دیا۔ اور ہم نے سُنا کہ اُنھوں نے فرمایا کہ بجنور بھی تو کسی طرح آباد ہو۔ لیکن وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ چند ہی روز میں خود بخود قطعِ تعلق ہوگیا۔ لیکن بیوی صاحب نے اِس کی بھی پروا نہیں کی۔ نہ وہ روئیں نہ پیٹیں نہ واویلا کی نہ تو تو میں میں ہوئی۔ بلکہ جب کسی نے کہا بھی تو اُنھوں نے اُنھہ کرکے ٹال دیا وہ دنیا کی ساری نعمت اپنی اولاد کو سمجھتی تھیں۔ اور اُنھیں کو دیکھ دیکھ جیتی تھیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ زن و شو کے تعلقات بڑھاپے میں کم زور ہو جاتے ہیں اور دونوں کی محبت آل اولاد میں آجاتی ہے۔ یہ زمانہ نہ مرد کے لیئے نکاحِ ثانی کا ہے نہ عورت کے لیئے اِس پر تاسف کا۔ وہ تعلقات خود بخود ضعیف ہو جاتے ہیں۔ یہ تو وہ زمانہ ہوتا ہے کہ کنبہ بھرا پرا ہے۔ نانا نانی دادا دادی بلکہ نواسیوں کے بچے ہوگئے۔ دنیا کی آخری بہار ہے۔ جو دن گزرے غنیمت۔ پس اِس فانی زندگی اور یہاں کے فانی رنج و غم کرکے کُڑھنا اور گھٹنا بے سود و لا حاصل ہے۔

غمِ دنیا مخور کہ بیہودہ است ہیچ کس در جہاں نیاسودہ است
غمِ دین خور کہ غم غمِ دین است ہمہ غم ہا فروتر زین است

غرض سنا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیوی صاحب کی سوکن کو طلاق دیدی گئی۔ بیوی صاحب کے دباؤ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ فرمایشی نکاحوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

بہر حال بیوی صاحب بڑی عابدہ زاہدہ اور مرتاضہ تھیں۔ نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ زکوٰۃ بھی دیا کرتی تھیں۔ تہجد گزار بھی تھیں۔ قرآن شریف بالالتزام پڑھا کرتی تھیں۔ اور بہت سی سورتیں اُن کو اَزبر تھیں۔ رمضان بھر شب بیداری کیا کرتی تھیں۔ فرماتی تھیں کہ ایک رات میں نے شبِ قدر بھی دیکھی تھی۔ مگر گھبرا گئیں۔ الٰہی خیر الٰہی خیر ایمان کی سلامتی۔ میرے بچّوں کی خیر۔ اِس کے سوا اَور کوئی لفظ اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔ چوں کہ مذہبی عنصر اُن میں بہت غالب تھا اس لیئے بہت رقیق القلب تھیں۔ کسی کی مصیبت سے جلد متاثر ہو جاتی تھیں۔ خدا سے بہت ڈرا کرتی تھیں۔ ہر وقت ان کو اپنی موت پیشِ نظر تھی۔ ہمیشہ موت کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ اور اکثر روتی رہتی تھیں۔

بیوی صاحب آل اولاد۔ دولت و ثروت۔ عیرت و آبرو۔ خوش اقبالی سب کی زندہ مثال تھیں۔ پھر بھی اُن کو ایک غمِ نہانی تھا۔ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے میاں بشیر کی شادی بڑے ارمان اور چوچلوں سے کی۔ دہلی کے اعلےٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی لائیں۔ یعنی نواب قطب الدین خاں مرحوم کی پڑپوتی۔ صورت شکل کی بہت پر چول تھی وہ چاہتی تھیں کہ بہو بہت ہی خوب صورت لاؤں۔ چناں چہ کئی جگہ باتیں ٹھیریں لیکن جہاں مقدر ہوتا ہے وہاں ہوتا ہے۔ آخر حسبِ منشائے دلی نواب قطب الدین خاں مرحوم کی پڑپوتی سے عقد ہوا۔ وہ دہلی کے رئیس اعظم امیر ابن امیر بڑے بھاری مولوی محدث ادیب و فقیہ تھے۔ لیکن وہیں ہر خندہ آخر گریہ ایست۔ اولاد اُن سے نہ ہوئی۔ دنیا کی خاک چھان ڈالی۔

علاج معالجے۔ گنڈے تعویذ۔ جو جس نے بتایا کیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ اسی طرح اٹھارہ سال گزر گئے۔ تاہم لاولد بہو کو بیٹی سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ اِن کی خاطر عزیز کو میلا نہ ہونے دیتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ قصور سمجھو یا فتور یہ سب ہمارے مقدر کا ہے۔ جب کبھی پوتا یا پوتی کا ذکر آیا تو بیوی صاحب نے ایک آہ سرد بھری۔ مگر زبان سے یہی کہا کہ اے بی یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اُس کی مصلحت وہی خوب جانتا ہے۔ اگر دے ہمارے سر آنکھوں پر۔ نہ دے تو شکایت کیا۔ میرے بچے کو اللہ رکھے جب میں اُسے زندہ چھوڑ کر جاؤں گی جب بات سو بات۔ رہا بشیر کا بچہ اُس کی بشیر کو ہوگی۔ میں تو بے قرار ہو کر دعا بھی نہیں مانگتی۔ نہیں معلوم پاک پروردگار کی کیا مرضی ہے۔

بیوی صاحب کے مزاج میں تھوڑا سا وہم بھی تھا۔ بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت دنوں کے بعد اولاد ہوئی تو ماں باپ پر بھاری ہوتی ہے۔ یہ بھی کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ پوتے تشریف لائیں تو میرا لڑکا ہی نہ چل بسے۔ گو یہ بات اُنھوں نے صاف طور پر نہیں کہی۔ مگر ان کے طرزِ کلام سے مترشح ہوتا تھا۔ جوان لڑکی کے مرنے کا داغ کا دل میں بیٹھ چکا تھا۔ مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چناں چہ اسی قسم کے خیال سے وہ میاں بشیر کے پاس حیدرآباد جا کر نہیں رہیں ورنہ اُن کو اُن سے بڑھ کر کوئی تھا؟ دہلی میں اُن کا کیا دھرا تھا۔ جوان لڑکی کی جدائی کے صدمے سے گُھل گُھل کر مر گئیں۔ اُن کے دل میں یہ داغ کا بیٹھ گیا تھا کہ ایک مرتبہ میں دکن گئی تو بڑی لڑکی گزر گئی۔ ایسا نہ ہو کہ پھر جاؤں تو کوئی بات پیش آئے۔ اسی وہم سے اُنھوں نے دہلی نہ چھوڑی۔ کنبے قبیلے کے لوگ نکاحِ ثانی کے لیے بہت کچھ کہتے رہتے تھے۔ لیکن وہ سُنی کی اَن سُنی کر دیتی تھیں۔ لیکن جب اٹھارہ سال گزر گئے۔ علاج معالجے سے مایوسی ہو گئی ادھر مولانا نے بھی تقاضا کیا اُدھر بیوی صاحب نے بھی اپنی عمر کا آخر دیکھا تب وہ بھی رضی ہو گئیں۔ اور قصہ مختصر میاں بشیر کا دوسرا نکاح بلا کسی قسم کی دھوم دھام کے بادلِ ناخواستہ کرا ئیں۔ یہ نکاح اس قسم سے ہوا کہ بیوی صاحب خود بھی نہیں گئیں۔ لیکن تقادیر دیکھیے تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ اِن سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ اِن کا بھی علاج معالجہ سب ہی کچھ ہوا۔ حکمِ قضا و قدر یہی تھا۔ کہ بیوی صاحب میاں بشیر کی اولاد نہ دیکھیں چناں چہ اس نکاح کے بعد چار پانچ سال بیوی صاحب زندہ رہیں اور میاں بشیر کی اولاد کی حسرت دل کی دل ہی میں لے گئیں ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بیوی صاحب کی وفات کے پانچ سال بعد میاں بشیر کا نخل مراد بار آور ہوا یعنی ۱۷ ستمبر ۱۹۱۲ء کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے ہاں ہزار ہا ارمان اور ہزار ہا آرزو کے بعد پہلا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا کے نام پر منذر احمد رکھا گیا۔ اور اس کے بعد خدا کے فضل سے جس کی نعمتیں بے شمار ہیں ہر سال بال بچہ ہو رہا ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے جب کبھی اس کا ذکر ہوا تو کہنے لگے کہ شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔ اب اللہ کے فضل سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے جن کے نام علی التسلسل یہ ہیں منذر احمد۔ شاہد احمد۔ بشریٰ بیگم۔ سراج الدین احمد۔ الہام فرد

جس گھر میں چوہے کا بچہ نہ تھا وہاں اب یہ نعمت ہے۔ ویرانے کی جگہ آبادی ہے۔ دن عید رات شب برات ہے اگر حسرت ہے تو صرف یہی ہے کہ جو سچی خوش ہونے والی تھیں اُنھوں نے یہ بہار نہ دیکھی۔ اس میں بھی کچھ مصلحتِ الٰہی مضمر تھی۔

مرض الموت بیوی صاحب کی تن درستی کبھی اچھی نہیں ہی۔ جس عورت کے اس قدر بچے ہوں وہ کس طرح تن درست رہ سکتی ہے اور یوں بھی اُن کے قُویٰ کچھ اچھے نہ تھے۔ رہی سہی طاقت بڑی لڑکی کی جوان مرگی نے سلب کر دی۔ وہ غم اُن کو کھا گیا۔ چند روز سے ہلکا ہلکا بخار آتا تھا جو ہڈیوں میں جم گیا تھا۔ ساتھ ہی کھانسی کا بھی کھٹکا تھا۔ علاج کی طرف سے

وہ ہمیشہ بے پروا رہیں۔ اپنی بیماری کو بیماری نہیں سمجھتی تھیں بلکہ کسی پر ظاہر نہ کرتی تھیں۔ بخار آیا تو نہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ اتر گیا اٹھ بیٹھیں اس کو انھوں نے ایک معمولی بات سمجھ رکھا تھا۔ یونانی مسہل لیے تو وہ بگڑ گئے۔ حالت خطرناک ہو گئی۔ جب اپنے پرایوں کی آنکھیں کھلیں۔ مولانا نے میاں بشیر کو خط لکھا کہ تمھاری ماں کی حالت اچھی نہیں۔ بیوی صاحب کو جب اس خط کا حال معلوم ہوا تو بہت بگڑیں کہ اتنی دور بیٹھے ہوئے بچے کو تم نے پریشان کیا۔ فوراً خود خط لکھوایا کہ تمھارے باپ نے جو کچھ لکھا ہے تم پریشان نہ ہونا۔ میں اچھی ہوں معمولی شکایت ہے۔ لیکن حالت روز بروز ردی ہوتی گئی۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب تو نہ پہنچ سکے۔ مگر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ مرنے سے دو تین دن پہلے حیدرآباد سے دلی پہنچ گئیں۔ تو انھوں نے بیٹی اور نواسوں کو پہچانا بات چیت کی۔ پیار کیا دعائیں دیں اور میاں بشیر کو پوچھا کہ وہ کب آئیں گے۔ ان کی تسلی کے لیے کہہ دیا کہ وہ بھی صبح و شام میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ غرض دروازے پر نگاہ تھی۔ جب ان کی بے قراری حد سے بڑھ گئی اور سینے میں دم اٹکنے لگا تو ناچار ان کو ایک خط یہ کہہ کر دیدیا کہ میاں بشیر کا خط آیا ہے وہ انھوں نے دیکھا اور سرھانے رکھ لیا۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد
کشتۂ کہ عشق دارد نگزاردت بدینساں — بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

شام کو ان سے کہہ دیا کہ میاں بشیر آ گئے ہیں ذرا لیٹ گئے ہیں کہیے تو جگا لائیں۔ کہا نہیں۔ اللہ اللہ ماں کی مامتا ذرا سی تکلیف اپنی اولاد کی گوارا نہ ہوئی۔

شروع شروع دلی کے مشہور ڈاکٹر ہیم چندر کا علاج رہا۔ آخر وقت میں حاذق الملک حکیم عبد المجید صاحب معالج تھے۔ قصہ کوتاہ بارھویں اور تیرھویں ذیحجہ ۱۳۱۵ھ کی شب درمیانی کو دو بجے رات کے بعارضہ ذات الجنب بیوی صاحب نے انتقال کیا۔ چھوٹی بہن جو حافظ و قاری ہیں سرھانے کھڑی یٰسین شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک ہچکی آئی روح پرواز کر گئی اور جان خالق حقیقی کے سپرد کی۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

محلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ مولانا نذیر حسین صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور درگاہ حضرت شاہ خواجہ باقی باللہ میں اس گنج شائگان کو تہ خاک کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جس جگہ اب دفن ہیں وہ سردابہ بیوی صاحب کی والدہ ماجدہ نے لے رکھا تھا۔ مگر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو بطور حفظ ماتقدم زمین لیتے ہیں وہ اس میں نہیں جاتے دوسرا ہی کوئی جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی اسی کی عبرت انگیز مثال ہے کہ ماں بیٹھی رہیں اور جوان بیٹی چلی جائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے جو اپنے خاوند کی زندگی میں مرے۔ اس کے سوا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس کی ماں زندہ ہو اس کے لیے در دعائے اجابت کھلا رہتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بیوی صاحب کو نصیب ہوئیں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَھَا وَاَدْخِلْھَا جَنَّۃً مِنَ الْجِنَانِ وَاَفْرِغْ عَلَیْھَا شَآبِیْبَ الرِّضْوَانِ[1] خدا کے فضل و کرم سے بیوی صاحب اولاد در اولاد اور در اولاد تقریباً تمام ممبر اپنی گود پیٹ کے چھوڑ کر جنت کو سدھاریں۔ بیٹے اور بیٹی کی طرف سے انھوں نے ۴ پشتیں دیکھ لیں۔

ایک روز راقم بھی دوران قیام دلی میں بیوی صاحب کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے خواجہ باقی باللہ کے مزار پر گیا تھا۔ بیوی صاحب کی قبر سنگ سرخ کی پکی سلوں کی قبر ہے۔ بیچ میں کچی ہے۔ اور مزار پر یہ قطعہ عربی کا جو مولانا کی تصنیف ہے نہایت خوش خط لگا ہوا ہے۔

ماتت وانجعت القلوب بموتھا — عظم المصاب ویومنا یوم عسر
من للعفاف وللارامل بعدھا — صرعی کما اعجاز نخل منقعر

---

[1] الٰہی ان کو بخش دے اور جنتوں میں سے کسی عمدہ جنت میں لے جا داخل کر اور ان پر اپنی خوشنودی کی بچھاڑیں انڈیل دے ۱۲ ھ مر گئیں اور بہت سے دلوں کو اپنے مرنے سے توڑ کر دیا ان کا مرنا بڑی مصیبت ہے اور ہمارا آج کا دن بڑا مشکل دن ہے ۱۲ ھ ان کے بعد سائلین اور بیوگان کے لئے کون پرداخت کنندہ ہے کہ یہ لوگ ان سے بچھڑے پڑے ہیں جیسے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ۱۲

ولنصبرنّ علی الفراقِ لعلمنا ۔۔۔ ان المماۃ لکل حی قد قدر

وطلبت عام وفاتھا فی جملۃٍ ۔۔۔ فسمعت باکیۃً تقول لھا غفر ۱۳۱۵ھ

مولانا کے سوا ہمارے مرحوم دوست مولوی سید محمد عبدالغفور صاحب شہباز نے بھی بیوی صاحب کے انتقال کی تاریخ کہی ہے۔ اُس کا مادہ بھی یہی ہے مگر ذرا اُلٹ دیا ہے۔ یعنی غفر لہا ۱۳۱۵ھ

بیوی صاحب کو سارے کنبے بلکہ سارے محلے بلکہ سارے شہر میں سب یاد کرتے ہیں۔ جن کے لیئے وہ بظاہر ذریعۂ معاش تھیں وہ بے یار و مددگار ہو گئے۔ غرض ایک فیضِ جاریہ کا چشمہ تھا جو سب کو سیراب کرتا تھا۔ ہر ایک کی اڑی میں کام آتا تھا وہ بند ہو گیا ؎

تمھیں کہتا ہے مُردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو ۔۔۔ تمھاری نیکیاں باقی تمھاری خوبیاں باقی

میاں بیوی کا برتاؤ

مولانا کا مزاج ایک خاص قسم کا واقع ہوا ہے۔ غصّہ غالب ہے۔ لیکن دل کینہ و حسد و بغض سے مثل آئینہ کے صاف۔ اِدھر جوش آیا اُدھر نادارد۔ میاں بیوی کے تعلق بہت نازک ہوتے ہیں۔ جب دو برتن آپس میں کھٹک جاتے ہیں تو یہ تو دو ذی روح ہیں۔ تاہم بہ حیثیتِ مجموعی مولانا نے اپنی اہلیہ سے عمدہ اور بہت عمدہ برتاؤ کیا۔ بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ بیوی اُن بیویوں کی طرح نہ تھیں کہ جہاں بیٹھیں سوائے شوہر کی شکایت کے دوسری حکایت ہی نہ کریں۔ بیوی صاحب کے مونہ سے کبھی مولانا کی بُرائی نہیں سنی گئی۔ علیٰ ہذا مولانا کو بھی بیوی صاحب کا کلمہ پڑھتے پایا۔ خصوصاً بیوی صاحب کے مرنے کے بعد مولانا کو معلوم ہو گیا کہ گھر والی کے جانے کے بعد گھر کی کیا حالت ہوتی ہے۔ گویا ایک سلطنت تھی جس کا بادشاہ نہیں۔ یا ایک فوج تھی جس کا کمانڈر نہیں۔ اکثر عورتوں کو دیکھا ہے کہ وہ شوہروں کی ناشکری کیا کرتی ہیں یہ بات بھی بیوی صاحب میں نہ تھی وہ حد سے زیادہ قانع اور سیر چشم تھیں ذرا سے سلوک کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ شوہر کی از حد مطیع اور فرماں بردار تھیں۔ بیوی صاحب کی نیک بختی فروتنی سلیم الطبعی کی عام شہرت دہلی میں ہے۔ جب کبھی کسی سے بیوی صاحب کا تذکرہ ہوا تو اُس نے تعریف ہی تعریف کی کبھی کوئی عیب نہیں نکالا۔ عیب ہوتا تو کوئی نکالتا۔ غرض جس طرح مولانا اپنے خاندان میں لاجواب نکلے بیوی صاحب اپنے گھرانے میں اسی طرح ایک ہی جوہر تھیں۔

لڑکے لڑکیوں کے مختصر حالات

مولانا کے دو لڑکیاں تھیں سکینہ۔ صغریٰ۔ بڑی لڑکی مولوی سید احمد حسن صاحب کے عقدِ نکاح میں تھیں اُن کا عین عالمِ شباب میں بمقام ننگسگور ملک دکن زچگی کے زمانے میں ۲۰۔ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال ہوا۔ وہ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھوڑ کر مریں۔ ان کے بعد دو لڑکیاں آورا اپنی ماں سے جا ملیں اب ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے دونوں کی شادیاں ہو گئی ہیں لڑکی صاحب اولاد ہے۔ مولانا کی بڑی لڑکی اپنی ماں کی طرح عابدہ زاہدہ اور مخیر تھیں۔ وہ دفعتہً انتقال کر گئیں۔ یہ بھی اپنے حج کے لیئے روپیہ چھوڑ گئی تھیں۔ ان کا حجِ بدل مولوی احمد حسن صاحب نے کروا دیا۔ اب مولانا کی صرف ایک لڑکی زندہ ہے یعنی خان بہادر مولوی شرف الحق صاحب کی اہلیہ۔ یہ بھی عابدہ زاہدہ اور مخیر ہیں۔ انھیں کے دو لڑکے اشرف الحق صاحب اور مشرف الحق صاحب ڈاکٹری پاس کرنے کے لیئے ولایت گئے تھے دونوں کے دونوں پاس کر کے آ گئے۔ بڑے صاحب ریاستِ حیدر آباد میں فوجی ڈاکٹر ہیں۔ خان بہادر صاحب کے دو لڑکیاں اور نواسے نواسیاں اور ایک پوتی ہے دونوں لڑکیاں تعلیم یافتہ اور لکھی پڑھی ہیں سینے پرونے پکانے ریندھنے میں اپنی ماں کے قدم بقدم ہیں۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب

یوں گنتی کو تو مولانا کے تقریباً ایک درجن لڑکے ہوئے لیکن سب چھوٹی ہی عمر میں چل بسے ایک سات برس کا لڑکا ظہیر دہلی میں ہیضے سے چٹ پٹ ہو گیا۔ جس کا عربی مرثیہ مولانا نے لکھا ہے۔ اور جس کو راقم نے مجموعۂ نظم میں بہ تفصیل

لطاہم جائی پرچرد و سبر کر بیگے کیوں کہ ہم کو معلوم ہے کہ ہر زندہ کے لیئے موت مقدر ہے ۱۲ سکل اور میں نے اُن کی وفات کا برس ایک جملہ میں طلب کیا تو میں نے کسی رونے والی کو سنا کہ وہ کہتی تھی لہا غفر۔ ان کی تو مغفرت ہو گئی

ہیں چھپوا بھی دیا ہے۔ دوسرا ابھی ہیضے سے اعظم گڑھ میں چٹ پٹ ہو گیا۔ یہ دونوں بچّے غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ دونوں کی موہنی صورتیں ابھی تک لوگوں کی نظروں میں گھومتی ہیں۔ اُن کی پیاری باتوں کو لوگ ابھی تک یاد کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جان ہار بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم کو مولانا کا ایک خط ملا ہے جس میں اُنھوں نے اپنی اہلیہ صاحبہ کو مضامینِ تعزیتہ لکھے ہیں۔ اس خط سے ہم اولاد کی محبت اور اُن کے مرنے کے غم کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ یہ بھی ایک دُنیا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مر جاتا ہے لوگ اُس کی ماتم پرسی کرتے ہیں۔ میں تم کو یہ خط اُس دستور کے مطابق نہیں لکھتا۔ کیوں کہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے۔ میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی اَور رشتے میں نہیں پائی جاتی۔ میرا تمھارا مال مشترک۔ گھر مشترک۔ کھانا پینا مشترک۔ اولاد مشترک۔ آبرو مشترک۔ خوشی مشترک۔ رنج و غم مشترک۔ اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی نہیں میری تمھاری دونوں کی بس اب اگر مر گئی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی مری۔ نہیں میری تمھاری دونوں کی۔ پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے بڑا قوی تعلق تھا لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے میرا دل خود بخود بے قرار تھا اور میں نے اسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا۔ تاریخ ملا کر دیکھو عجائب ہے کہ خط کی تاریخ اور اس کے مرنے کی تاریخ ایک ہو گی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ظہیر۔ نصیر و بشیر کے مرنے سے تو یہ بخوبی تجربہ کر چکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا۔ رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے۔ میں تم پر الزام نہیں لگاتا اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا۔ اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں سوتا بھی ہوں ہنستا بولتا بھی ہوں۔ دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا۔ تو جب ظہیر۔ نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا تو یہ لڑکی بے چاری کتے دن کی تھی۔ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چپ ہو رہتا ہے۔ غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا۔ پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں۔ دل کو مضبوط کر آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ اُس نے دیا اُس نے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں۔ بَیر نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے ہمارے نفع کے لیے کرتا ہے لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم اُن مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تین رستی۔ مال اولاد حکومت شرافت دین داری ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ ہم کو بھی اُس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہے تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں۔ اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم محروم نہیں اُن کی عمر میں خدا برکت دے۔ اُن کو دین و دنیا کی فلاح ہو۔ کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد لے کر کیا کریں گے۔ انھیں پر اپنی محبت صرف کرو۔ ان کے حق میں خدا سے دعائیں مانگو اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی۔ شاید عاقبت میں انھیں مصیبتوں کے طفیل سے ہم پر رحم ہو۔ کسی استاد کا کیا اچھا قطعہ ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے ۔۔۔ جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا ۔۔۔ غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خدا ہم کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو وہ اَور بندگانِ خدا کے حال پر نظر کرے تو پائے گا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔ تم گھر کے گھر میں بے چاری ..... کو دیکھو۔ بڑی ناشکری کی بات ہے کہ ہم لوگ اُن احسان اور کرم سب کو بھول جائیں اور ذرا سے رنج کی برداشت نہ کریں۔ بشیر بچہ ہے۔ تم کو روتے دیکھ کر سہما جاتا ہو گا۔ اُس کے حال پر رحم کرو کہ کیا تمھاری حالت ہو گئی ہے۔ آخر یہ کالبد خاکی سدِّ سکندر تو نہیں ہے۔ اسی طرح رنجوں کے ہاتھ سے اس کو تحلیل کر ڈالو گی تو کیا انجام ہو گا۔ ۴۰۔ جون سنہ ۱۸۹۶ء۔

غرض لے دے کر اب صرف ایک لڑکا ہی جو عموماً میاں بشیر کے نام سے موسوم ہی۔ اُن کا پورا نام بشیرالدین احمد ہی جو ۴ اگست ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے[1]۔ مولانا نے اُردو فارسی عربی انگریزی سب کچھ خود ہی پڑھایا لکھایا انھیں کے لیئے چند پند اور ما یغنیک فی الصرف تصنیف کی۔ کسی اسکول میں شروع شروع اس واسطے نہیں بٹھایا کہ گھر کی سی نگرانی نہ ہوگی۔ پس مولانا نے اُردو اور قدرے فارسی کے بعد عربی شروع کرا دی۔ کافیہ شرح ملّا تک پڑھا کر ادب کی دو ایک کتابیں پڑھائیں۔ پھر قرآن مجید کے چند جزو سبقاً سبقاً مع معنی و تفسیر و ترکیب صرف و نحو کے پڑھائے۔ اس طرح عقیدے کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی نوشت و خواند بھی جاری رہی۔ صرف دو برس کے لیئے دہلی گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ چوں کہ شروع سے مولانا نے لٹریچر پر زیادہ زور دیا تھا میاں بشیر ہمیشہ انگریزی اور عربی لٹریچر میں سر برآوردہ رہے لیکن اس مناسبت سے وہ ریاضی میں اتنے ہی کم زور تھے۔ اور اسی وجہ سے مدرسہ قبل از وقت چھوڑنا پڑا۔ مدرسہ چھوڑ کر دکن گئے۔ مولانا نے سر سالار جنگ کی خدمت میں عرضی لکھی۔ معاً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ کار آموزی مقرر ہوا۔ اور ایک ہی سال کے بعد دو سو روپیہ ماہوار کے سوم تعلقہ دار ہو گئے۔ اور اب بتدریج پانسو تک پونہچے ہیں۔ ریاست کے ملازموں میں نیک نام ہیں ہم چشموں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن بیٹوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں جن کے پاس نہ ماں کا ادب ہی نہ باپ کا لحاظ۔ ہمارے مولانا اُن کی سعادت مندی۔ فرماں برداری۔ خوش چلنی سے خوش ہیں۔ وہ اب تک باپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں نے موعظۂ حسنہ پڑھی ہی وہ دیکھ چکے ہوں گے کہ میاں بشیر کی زبان میں کس قدر لکنت

[1] مولوی بشیرالدین کی ولادۃ کے متعلق ایک یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہی کہ وہی کنجن صاحب پنڈت جنھوں نے مولانا کا لنسٹ جنم پتر بنایا تھا اور مولانا کو سنسکرت بھی پڑھائی تھی اُنھوں نے ایک وحشت ناک پیشین گوئی بھی کی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مولانا کے دو لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں لڑکے کا ارمان تھا۔ پنڈت جی کو کہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا کے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں لڑکا کوئی نہیں۔ غرض ایک روز مولانا سے پنڈت جی نے اثنائے گفتگو میں پیشین گوئی کی کہ اب کی دفعہ آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ پنڈت جی نے یہ بھی بے پر کی اُڑائی کہ لڑکا باپ پر بھاری ہوگا اور عجب نہیں کہ آپ سال کے اندر اندر رخصت بھی ہو جائیں۔ اگرچہ مولانا ان واہیات باتوں کے قائل نہ تھے۔ مگر ایک شخص اس طرح برملا کہے تو دل پر ضرور اثر ہوتا ہی چناں چہ یہی ہوا کہ اس خبر نے مولانا کی ساری خوشی کو خاک میں ملا دیا۔ اور اس جان فرسا پیشین گوئی سے مولانا کے دل میں ایک دہکا سا بیٹھ گیا پنڈت جی نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ لڑکے کے کان کے پاس ایک مسّہ بھی ہوگا۔ بہر حال ۴۔ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کے ہاں میاں بشیر تشریف لائے۔ غرض اُن کے پیدا ہوتے ہی مسّہ کی تلاش ہونے لگی مسّہ تو واقعی تھا اور اب بھی ہی۔ لیکن اُس وقت چھوٹا سا لال لال بچہ اس میں ذرا سا مسّہ کیوں کر محسوس ہو سکتا تھا۔ دیکھنے والوں نے تو دیکھ لیا مگر مولانا سے کہہ دیا کہ محض غلط ہی کوئی مسّہ وسّہ نہیں ہی۔ یہ اس لیئے کہا گیا کہ مولانا کا وہم دور ہو جائے تاہم پنڈت جی کے کہنے کا [illegible] اثر تو ضرور ہوا کہ تین مہینے کے قریب مولانا سخت علیل اور صاحب فراش رہے اور لوگوں کو [illegible] امر کا خدشہ ضرور رہا کہ کہیں پنڈت جی کی پیشین گوئی صحیح نہ اترے۔ غرض وہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اور اسی وجہ سے مذہب اسلام میں حکم ہی کہ مستقبل کا علم خداوند تعالیٰ کے سوا اَور کسی کو نہیں ہی۔ مگر لوگ ہیں کہ جان بوجھ کر کہنے سننے میں آہی جاتے ہیں ۱۲

ہی۔ جس کو مولٰنا نے تمغائے شرافت سے تعبیر کیا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ یہ لکنت پیدایشی نہیں ہی۔ بلکہ چار سال کے سِن و سال میں بحالتِ تپ شدید سرد پانی پلا دینے سے لکنت پیدا ہو گئی ہی۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہی کہ لکنت وراثۃً ملی ہی۔ کیوں کہ مولوی علی احمد صاحب اور اُن کی صاحبزادی دونوں کی زبان میں لکنت تھی۔ اور اب میاں بشیر کے لڑکے منذر احمد سلمہ میں بھی ہی۔ چار سال پہلے یہ لڑکا بھی صاف صاف بات چیت کرتا تھا۔ چوتھا سال ختم ہوتے ہی اُسے بھی دفعۃً لکنت شروع ہو گئی۔ میاں بشیر کی لکنت گو بچپنے میں زیادہ رہی ہو مگر اب تو بالکل نامعلوم ہی۔ دس پانچ جملوں میں ایک آدھ جگہ اُلجھ جاتے ہیں مگر ایک لمحے کے لیئے اور پھر سلجھ جاتے ہیں۔ اب آج کل مولوی بشیر الدین احمد حیدرآباد دکن کے ضلع لنگسگور میں اول درجے کے دوم تعلقہ دار ہیں۔ حال میں اُنھوں نے دو کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں ایک کا نام اقبال دلہن ہی اور دوسری کا حرزِ طفلاں۔ دونوں کتابیں قابلِ دید ہیں۔ دعا ہی کہ باپ کی طرح یہ بھی نامور ہوں۔

خدا کا شکر ہی کہ پانسو ساٹھ میدانِ صفحات طے کر کے راقم کے قلم سے یہ آخری چند سطریں اور ٹپک رہی ہیں۔ لیکن وہ بے چارہ اِس اُمید و بیم میں پڑا جھول رہا ہی کہ اُس کی سعی مشکور بھی ہوئی یا نہیں۔ خداوندا حیاۃ النذیر کو تاجِ قبولیت عطا فرما کہ مؤلف کو ہم چشموں میں سرنگوں اور شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ آمین ثم آمین۔
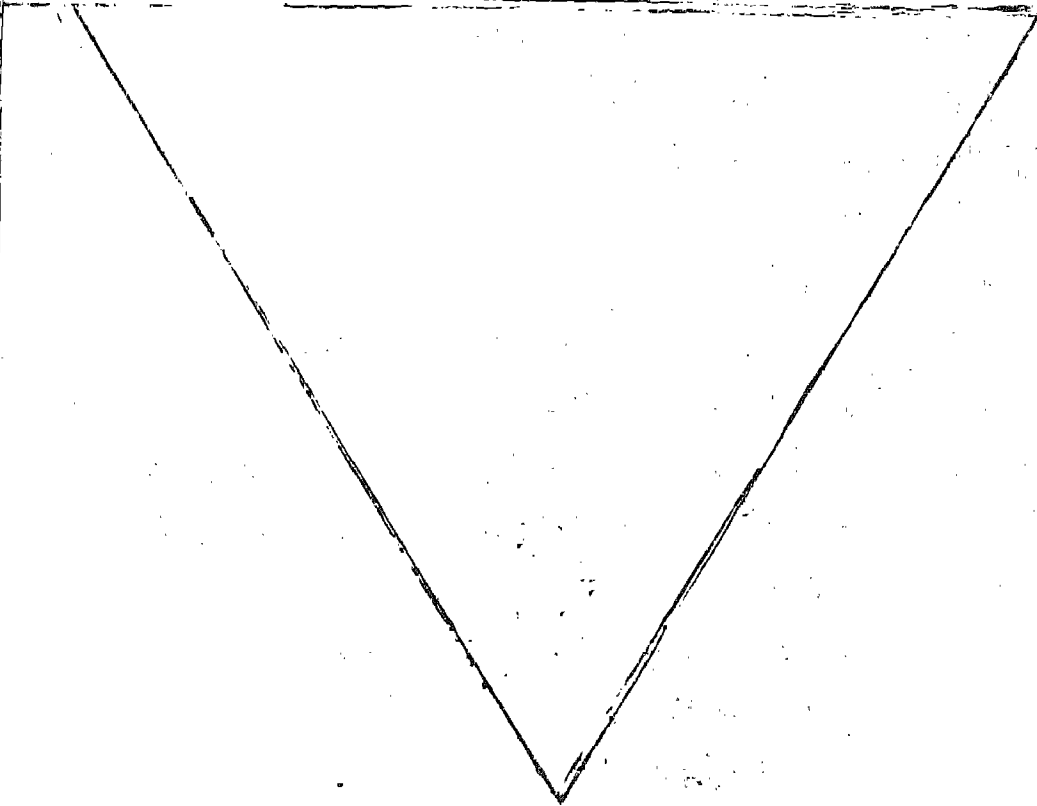
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمۂ آخر نمبر (۳)

کہنے کو کہہ لیجیے کہ حیاۃ النذیر کا یہ آخری ضمیمہ ہے۔ خدا صاحبِ سوانح کی حیات میں برکت دے۔ ان شاء اللہ حیاۃ النذیر کی زنجیر کے ضمیموں میں ہر سال ایک نہ ایک کڑی کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہرحال اِس وقت ہم کو بھی آخری ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ جس میں مولانا کی شاعری اور اُن کے خطاباتِ حرف کا ذکر ہوگا۔

مولانا کی شاعری کے متعلق دورانِ تالیفِ حیاۃ النذیر میں ایک واقعہ گزرا ہے جس کو راقم مجموعۂ نظم بے نظیر[۵۱] میں بطور تمہید کے درج کر چکا ہے۔ وہ اگر تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ یہاں درج کر دیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔

مولانا کی شاعری اور اُس پر ریویو

ایک جلسے میں جناب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کے لٹریچر کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ حاضرین جلسہ جناب ممدوح کی بذلہ سنجیوں کو بیان کر کے لطفِ صحبت میں گرمی پیدا کر رہے تھے کہ اتنے میں وہاں راقم بھی پہنچا۔ یارانِ طریقت کے اصرار پر مولانا کے دو چار لطیفے بیان کیے۔ ایک نے کہا اس وقت مولانا کی کوئی تصنیف منگائیے۔ اُن کی مصنفات کی ہر سطر ایک لطیفہ ہے اور ہر لطیفے میں ایک نصیحت ہے اور ہر نصیحت میں گلستاں کا مزہ آتا ہے۔ اِس فرمائش کی اَور لوگوں نے بھی تائید کی۔ شایقین کو جب راقم نے ہمہ تن اشتیاق دیکھا تو کتاب منگائی۔ منگائی تھی توبۃ النصوح۔ لانے والا مجموعۂ لکچر اُٹھا لایا اور مکین کے حوالے کیا۔

مکین اگرچہ نوجوان تھے مگر بالکل پُرانے خیال کے وہ جس طرح نئے عمدہ خیالات کی نثر کو ناپسند کرتے تھے اُسی طرح بلکہ اُس سے زیادہ نئی شاعری کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے اور اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ بھی شاعر تھے مگر ایشیائی[۵۲] ٹکسال کے۔ حُسنِ اتفاق کہ لانے والے نے انھیں کو مجموعۂ لکچر دے دیا۔ اُنھوں نے اُس کو کھولا مگر پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ مشغلے کے طور پر ورق گردانی کے لیے۔ ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ اُن کا ہاتھ رُکا تو یہ نظم نکلی ؎

نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو ؛؛ خدا غارت کرے اِس اختلافِ دین و مذہب کو

چیکے چیکے اُس کے دو تین شعر پڑھے تو دل میں مزہ پیدا ہوا۔ پہلا تنفر مجرم غلام کی طرح دماغ سے نکل کر الگ کونے

---

[۵۱] مجموعۂ نظم بے نظیر کے نام سے اول اول سرسید نے مولانا کی صرف دو نظمیں بڑے اہتمام سے چھپوائی تھیں۔ راقم نے مولانا کی کُل اُردو اور عربی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظمیں چھپوا کر یہی نام رکھ دیا ۱۲

[۵۲] وہ شاعر جس کا مبالغہ جھوٹ سے زیادہ بڑھ گیا ہو اور صرف گل و بلبل اور وصال و ہجر ہی کو مضمون شعر سمجھتا ہو ۱۲

میں جا کھڑا ہوا۔ شوق و الفت اور دل چسپی نے لپک کر دل و دماغ مکین کو سرفراز کیا۔ چشم انصاف کھل گئی۔ عقل پر جو پردۂ تعصب پڑا تھا اُٹھ گیا۔ پڑھتے پڑھتے زبان سبحان اللہ و ماشاء اللہ و جزاک اللہ کہنے لگی۔

راقم کو حیرت تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کس کی زبان سے ایسے الفاظ سُن رہا ہے۔ کل تک یہ بندۂ تعصبان نئے خیالات والوں کے جہاں اَور عقائد سے متنفر تھا وہاں اُن کے لٹریچر نظم و نثر کی بھی مٹی پلید کیا کرتا تھا۔ یا آج اُس کی زبان سے نعوذ باللہ و استغفر اللہ کی جگہ سبحان اللہ سُن رہا ہے۔

یہ عالم دیکھ کر راقم نے کہا کہ حضرت کتاب مجھے دیجئے یا آپ ہی ذرا بلند آواز سے پڑھیئے کہ حاضرین بھی سُنیں مکین نے یہ سُنتے ہی بے تکلف پڑھنا شروع کر دیا مگر ذرا لئے کے چٹخارے کے ساتھ۔ آدمی تھے خوش گلو تو نظم اَور سونے میں سُہاگا ہو گئی۔ نظم پڑھی گئی تو شوخی کلام پر لوگ اُچھل اُچھل پڑے۔ خوبی بندش پر لوگوں کے دل شگفتہ ہو گئے لطافت معنوی نے دماغ کو منور کر دیا۔

غرض ایک نظم کے بعد دوسری نظم پڑھی جانے لگی۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے۔ راقم اپنی جگہ خاموش بیٹھا ہوا استعجاب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر جو نظمیں پڑھی گئی تھیں وہ یہ ہیں۔

(۱) بچا مارا ہی یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اِس اختلافِ دین و مذہب کو

عجب بد عقل ہے انساں کہ با ایں دعویٔ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو

اگر تعلیم دیں یہ ہے تو آخر کار سُن لینا
کہ خود مکتب کے لڑکوں نے کیا برباد مکتب کو

زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرب کو

خدا محفوظ رکھے اِس کی زد سے یہ وہ گولا ہے
نہ پیادے ہی کو چھوڑے اور نہ راکب کو نہ مرکب کو

یہ وہ آتش ہے عالم سوز جس کی ایک چنگاری
جلا دے ایک دم میں خشک و تر کو دُور و اقرب کو

ڈسا ہو جس کو اِس موذی نے وہ بھٹکا نہیں کھاتا
خدا را تم نہ چھو لینا کہیں اِس نیشِ عقرب کو

مُصیطر کس لیئے بنتے ہو لوگوں کے کہ یہ منصب
نہ حاصل تھا نہ حاصل ہے مقرب سے مقرب کو

نہ اُس آواز کو کانوں میں آنے دینا سُن رکھو
نہ ایسی بات سے زنہار کرنا آشنا لب کو

نظر کچھ مقتضائے وقت پر بھی چاہیئے کرنی
کہ دن کو کام میں مصروف ہو آرام میں شب کو

مگر تم جھونپڑوں میں دیکھتے ہو خواب محلوں کے
ذرا سوچو تو کیا نسبت گئے وقتوں سے ہے اب کو

مزاج اسلام کا ناساز ہے اچھا نہیں لگتا
کسی کا بولنا آواز سے جانِ معذب کو

ولے تم لوگ یوں بیگانہ وار آپس میں لڑ لڑ کر
بالآخر دق بنانا چاہتے ہو عارضی تپ کو

پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑو چھوڑ دو حق پر
وہ خود پہچان لے گا بے ادب کو اور مؤدب کو

(۲) بچایا ڈوبنے سے کشتیِ دینِ محمد کو
الٰہی نوح کی سی عمر دے سر سید احمد کو

مگر ہیں پورے ساڑھے نو سو شمسی سال گن لوگا — کہ کوئی نیچری کچھ کم نہ کر دے وقت ممتد کو

ہمیں احساں شناسی شکر پر مجبور کرتی ہے — وگرنہ ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں خوشامد کو

تعصب ہی ترقی میں مسلمانوں کی حارج تھا — جزاک اللہ کس خوبی سے سرکایا ہے اس سد کو

کسی ڈھب سے انھیں تعلیم کے رستے پہ لا ڈالا — اگر اب بھی نہ سمجھیں یہ تو روئیں قسمت بد کو

کیا تھا پاک اس کے جد امجد نے سنا ہوگا — بتوں کی گندگی سے خانۂ کعبہ کے معبد کو

سو اس نے بھی دلوں سے دھو دیا اوہام باطل کو — کہ اس کا فرض تھا پھر زندہ کرنا سنت جد کو

مسلمانوں نے آپ اسلام کو ایسا بگاڑا تھا — کہ ہم اس کی بدولت آخر آ کو پہنچے ہیں اس حد کو

کہ ہم کو آج دنیا میں ہے وہ رسوائی و ذلت — جو ہونی چاہیے انجام میں کافر کو مرتد کو

جو عالم تھے انھوں نے صرف دستار فضیلت کی — بنا کر دھجیاں اس پاک پیغمبر کی مسند کو

عوام الناس فہم راز دیں سے عاجز و قاصر — لیئے بیٹھے تھے رسم و راہ و تقلید شد آمد کو

خدا ہی جانے کیا اسلام کو لوگوں نے سمجھا تھا — چلے آتے تھے سب تکذیب کو ابطال کو رد کو

ادھر سائنس کا پتھراؤ کہتا تھا کوئی دم میں — کیئے دیتا ہوں چکنا چور اس شیشے کے گنبد کو

سو اس نے اپنے زور عقل سے وہ پائداری دی — کہ اب جنبش نہیں تا حشر اس قصر مشید کو

خدا کی شان ہے وہ اب بچاپر آف اٹس ہرتے ہیں — جو کفر و زندقہ کہتے تھے انگریزی کی ابجد کو

بہت سنتے رہے ہو جزر اسلامی سمندر کے — اب آگے دیکھنا طغیان و جوش و شورش مد کو

یہ کنکوے ہیں ان میں قوت پرواز خلقی ہے — انھیں تعلیم کی دریائی پہنچائے گی فرقد کو

عزیزو یہ عملداری بڑی رحمت خدا کی ہے — غنیمت بس غنیمت جانو اس کے فضل بیحد کو

نہ کچھ تخصیص مذہب کی نہ کچھ تعیین ملت کی — جو اسود کو وہ ابیض کو جو ابیض کو وہ اسود کو

باطمینان اسباب ترقی جمع ہیں سارے — اگر تم کام میں لاؤ طلب کو جہد کو جد کو

علی گڑھ ہو کے سیدھی راہ نکلی ہے ترقی کی — ہمارے ساتھ ہو لو جلد تر پہنچو گے مقصد کو

بچو تکرار سے حتی الوسع وقت ناساعد کی — اٹھایا ہے کسی نے یا اٹھا سکتا ہے اس زد کو

اب آزادی نے اپنا سکہ عالم میں بٹھایا ہے — نکالو مطلقاً فرہنگ سے لفظ مقید کو

کسی کی بات بھی مانا کرو ضد کی بھی اک حد ہے — خدارا چھوڑ دو اس جاہلانہ کاوش و کد کو

اگر اب بھی نہ تم نے قدر و قیمت وقت کی جانی — تو بس پتھر پہ کھدوا رکھنا اس قول مؤکد کو

کہ مٹ جاؤ گے اور برباد ہو جاؤ گے بالآخر — پکڑ پاؤ گے کیا تم ناتواں اس چودھویں صد کو

بس اپنی شاعری موقوف کر بے خود غلط مت ہو — اگرچہ روکنا مشکل ہے مضمونوں کی آمد کو

کہیں اِس شاعری کے خبط میں عادت نہ کر لینا — خلاف وضع وصف خط و خال عارض و خد کو

نظم

کچھ نہ پوچھو آج ہم لکچر میں کیا کہنے کو ہیں — قوم کو خود قوم کے مُونہ پر بُرا کہنے کو ہیں
اُن کو اُن کے عیب اُن کے سقم دکھلانے کو ہیں — اُن سے اُن کی داستانِ ماضی کہنے کو ہیں
الغرض اسلام پر جو کچھ کہ گزرا نیک و بد — اس کو ہم از ابتدا تا انتہا کہنے کو ہیں
مدتوں ہم اِن کو چپکے چپکے سمجھایا کیئے — اب جو کچھ کہنے کو ہیں سو برملا کہنے کو ہیں

ذیل کی دو نظمیں منشی نصیر الدین صاحب خوش نویس مطبع سلطانی بھوپال نے دی ہیں جو مجموعۂ نظم بے نظیر میں چھپنے سے رہ گئیں منشی صاحب موصوف جب دہلی میں تھے تو انھوں نے یہ دونوں نظمیں مولوی نذیر احمد صاحب کی زبان سے سنی تھیں۔ ہم ان دونوں نظموں کو شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۱)
حُسن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا
از خود نہیں کہے سے تو سوچا کرو کبھی — کیا کر رہے ہو چاہ رہا ہے زمانہ کیا
انگریزی شرطِ زیست ہے اور حفظِ زیست فرض — پڑھنے میں اس کے مذہب و دیں کا بہانہ کیا
بے طرح آج گھور رہے ہیں جو مولوی — تکفیر کا بنائیں گے ہم کو نشانہ کیا
بلبل سے کوئی پوچھے کہ جب آئے گی خزاں — رہ جائے گا چمن میں ترا آشیانہ کیا
ایک نوکری ہے وجہ معیشت سو منعدم — دنیا سے اُٹھ گیا ہے مگر آب و دانہ کیا
قل اللہ کو مال و دولتِ دنیا کی کیا خبر — کس کو ذخیرہ کہتے ہیں اور ہے خزانہ کیا
سیری میں سو جھتے ہیں مضامینِ عشق بھی — لکھے گا اب کوئی غزل عاشقانہ کیا
حاجت نہیں ہے گورِ غریباں کو سایہ کی — بہتر ہے آسمان سے بھی شامیانہ کیا
ہوتی ہے انحطاط کی رفتار آپ تیز — مہمیز چاہیئے اُسے کیا تازیانہ کیا
کہتے ہو تم نے دردِ دل اپنا کہا نہ کیوں — کیا کہتے بے کہے ہوئے تم سے سُنا نہ کیا
پوچھیں گے آپ پہلے تقاضائے شوق سے — اپنی روانگی کا کریں خط روانہ کیا

(۲)
عزیزو اک سخن ہم تم سے استفسار کرتے ہیں — کہ واصل خاں کے ہوتے کس لیے بیمار پڑتے ہیں
مگر ہوتے ہیں جرم خودکشی کے مرتکب از خود — جو یاں آتے نہیں الزام ناحق طب پہ دھرتے ہیں
خدا کی نعمتیں بے حصر ہیں پر ہم بنی آدم — غضب ہی جانتے پہچانتے ہیں اور مکرتے ہیں
اگر صحت نہ ہو شیرازۂ مجموعۂ ہستی — نہ ہم پاشیدہ ہو کر آج سب اجزا بکھرتے ہیں
ہے تقلیل غذا تدبیر حسن حفظ صحت کی — نہ کیوں بیمار ہوں جو بکریوں کی طرح چرتے ہیں
جنھیں چٹخلی کی عادت ہے انھیں کب چین پڑتا ہے — عجائب پیٹ ہیں اُن کے نہ کھانے سے اپھرتے ہیں
اگر ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ برحق — تو ہم اپنے ہی کرنے سے بگڑتے اور سنورتے ہیں

خدا جانے وہ کیا حکمت ہے کیا جادو کا پانی ہے ۔۔۔ کہ جس سے بوتلوں کو شہر کے عطّار بھرتے ہیں

حذاقت چار دانگِ ہند میں اُن کی مسلّم ہے ۔۔۔ جو طبّی مدرسے کی جانچ میں پورے اُترتے ہیں

سناتے ہیں اُسی کو لوگ جس سے فیض پاتے ہیں ۔۔۔ جلاتے کس لیئے ہیں شمع کو کیوں گُل کترتے ہیں

ہماری شاعری کس طرح لوگوں کو پسند آئے ۔۔۔ کہ ہم الحق مُرٌّ بے تامل کہہ گزرتے ہیں

لگی لپٹی نہیں رکھتے کسی کے پاسِ خاطر سے ۔۔۔ وہ کوئی اَور ہوتے ہیں جو حق کہنے سے ڈرتے ہیں

مولانا راقم کو معاف فرمائیں گے اگر وہ کہے کہ اس جلسے کے قبل اُس کے دل میں مولانا کی نظموں کی اتنی زیادہ وقعت نہ تھی جتنی کہ نثر کی۔ مگر اُسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے نظموں کو کبھی اس خیال سے پڑھا بھی نہ تھا کہ اُن کی حُسن وخوبی کو دیکھے۔ اب اِس جلسے کے منظر نے اُس کے دل میں گدگدی پیدا کی اور اُس نے بہ نظرِ غائر مولانا کے ہر شعر کو پڑھا تو بے ساختہ زبان سے ان من الشعر لسحرا کی جگہ کل شعر سحرٌ نکلا۔

جلسہ ختم ہوتے ہی ایک نے فرمائش کی کہ فلاں نظم مجھ کو نقل کر دیجئے۔ دوسرے نے کہا کہ مجھے مسدس کی ضرورت ہے تیسرے نے کہا کہ یہ بیچارے کہاں تک نقلیں کریں گے۔ لیکچروں کی جلدیں ہی کیوں نہ منگا لو۔ فرمائشیں سنتے ہی راقم کے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال چمکا کہ تمام متفرق نظموں کو مجموعہ بے نظیر کے نام سے چھپوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ لوگ شوق کے ہاتھوں سے خریدیں گے اور ذوقِ دل سے پڑھیں گے نظموں میں جا بجا نصیحتیں ہیں لوگ اُن کو پندِ پیرانہ سمجھ کر اپنا معمول بنائیں گے۔ لیکن ان نظموں کا چھپنا بغیر مصنف کی اجازت کے مشکل تھا۔ غرض جب اجازت مانگی تو مولانا نے شفقت مہربانی سے استدعا قبول فرمائی۔

ارادہ تو یہ تھا کہ مولانا کی سوانح عمری حیاۃ النذیر میں جہاں شاعری کا تذکرہ کیا جائے وہیں کلام منظوم پر تنقیدی نظر ڈالی جائے مگر حسنِ اتفاق سے حصہ نظم سوانح عمری سے الگ ہو رہا ہے اس لیے مناسب ہے کہ مولانا کی شاعری کے متعلق جو کچھ ریمارک ہو وہ یہیں ہوں۔ حیاۃ النذیر میں اگر ضرورت ہوگی تو دیا جائے گا یا مجموعہ نظم بے نظیر کا حوالہ دے دیا جائے گا۔

پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ شاعری کے متعلق جناب مولانا کے جو کچھ خیالات ہیں اوّل اُن کو اقتباس کر کے لکھا جائے تاکہ ناظرین کو کافی طور پر رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ اب ہم وہ اقتباسات نمبروار ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) فن زبان دانی ہر زمانے میں ہر سرزمین میں ہر دل عزیز رہا ہے۔ اب بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گا لیکن ہر دل عزیز ہونا اَور چیز ہے اور قوم اور ملک کے حق میں مفید ہونا اَور۔ بے شک ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض اوقات شاعروں کو ایک ایک قصیدے پر لاکھ لاکھ روپیہ ملا ہے۔ مگر یہ شخصی فائدے تھے اور وہ بھی شاذ و نادر اور اتفاقی۔ اِن گئے گزرے وقتوں میں بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے پہلے تک دلّی میں ایسے ایسے شاعر موجود تھے کہ ہر شخص اپنی طرز کا استاد تھا۔ مگر بے چارے محتاج مفلس تنگیِ معاش کی وجہ سے پریشان اور جتنے نامی اور مستند شعرائے متقدمین و متاخرین ہندی اور عجمی ہو گزرے ہیں سبھی کے کلام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاعروں کو گویا کسی فقیر کی بددعا ہے کہ ہمیشہ تنگ رہیں۔ ہمارے ملک میں کلب حسین خاں ایک شاعر تھے اُن کے شعر سے

لہ دونوں ارادے پورے ہو گئے۔ سوانح عمری سے الگ بھی شاعری پر لکھا گیا اور اب سوانح عمری میں بھی لکھا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں تمام نظموں کے ساتھ اور یہاں انی گنی چند نظموں کے ساتھ ہے۔ اور اگر کل نظموں پر نظر ہو تو اس کو نقادی کہنا

اِس کی تصدیق ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شعرگوئی نحس ہے　　شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہوگیا

خیر بدو عا توکیا ہوگی مگر اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری کی ایسی بری چاٹ ہے کہ آدمی کو دنیا اور دین دونوں جہان کے کاموں سے معطل کر دیتی ہے۔ ناچار شاعروں کو امیروں کا بھاٹ بننا پڑتا ہے جو ایک طرح کی گداگری ہے بغرض خود شاعروں کے ذاتی فائدے کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو شعر و سخن امیروں کے پیٹ بھرے کا مشغلہ تھا۔ اب پہلے سے امیر رہے نہ اگلی سی فراغتیں ع آن قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ کس توقع پر کوئی خونِ جگر کھائے نتیجہ یہ ہے کہ بعد ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے کوئی نیا شاعر بڑے نام و نمود کا سننے میں نہیں آیا۔ لکھنؤ والوں میں کسی قدر رگ گدی ہے سو وہ بھی یوگا فیوگا گھٹتی چلی جا رہی ہے پرانی تعلیم سے معاش میں مدد نہیں ملتی وہ آپ ہی آپ اس سے دستکش ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے لٹریچر (علم ادب یا انشا پردازی) کی ترقی مسدود ہوگئی۔ آپ صاحبوں میں سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں کہ میں لٹریچر کا نوحہ پڑھ رہا ہوں۔ نہیں نہیں نہیں۔ میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ علوم قدیمہ کو مسلمانوں کی ترقی کا سدِّ راہ جانتا ہوں۔ اور علوم قدیمہ میں سے بھی خاص کر لٹریچر کا سخت مخالف ہوں مسلمانوں میں اپنے تئیں بحیثیت قومی جتنی خرابیاں ہیں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں۔ یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا۔ یہ لٹریچر واقعات اور موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا۔ یہ لٹریچر منوہمات اور مفروضات بے اصل کو فیکٹس (واقعات) بناتا۔ یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا۔ اگر کسی نے اس زہر کو چکھا ہے تو میں نے پیا ہے۔ اگر کسی نے اس سانپ کو کھلایا ہے تو میں نے اپنے تئیں اس سے کٹوایا ہے۔ اگرچہ بڑی عمر میں میں نے بوڑھے طوطوں کی طرح آپ ہی آپ تھوڑی سی انگریزی بھی پڑھ لی تھی لیکن میری طبیعت میں ایشیائی تعلیم کا رنگ رچ چکا تھا۔ انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجکو اپنے ہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر میں وہی کا وہی رہا۔ اب بھی اگر کوئی برجستہ شعر سن پاتا ہوں چاہے اُس میں کتنا ہی مبالغہ خلافِ قیاس کیوں نہ ہو بے اختیار پھڑک اٹھتا ہوں۔ یہ ساری کم بخت بلا فارسی کی پھیلائی ہوئی ہے۔ خیالات اور مضامین کے اعتبار سے تمام دنیا کے لٹریچروں میں اس زبان کے لٹریچر سے بدتر اور کوئی لٹریچر نہیں۔ اس نے قومی مذاق کو ایسا بگاڑا اور اس قدر تباہ کیا کہ ہم لوگوں کو واقعات میں مزا نہیں ملتا۔

(۳) میں نے ساری عمر شعرگوئی کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا۔ یہاں تک کہ ہنوز اپنا کوئی تخلص بھی نہیں رکھا اور طبیعت کے موزوں ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی شعر موزوں کر لیا ہو تو اس کی قسم بھی نہیں کھاتا۔ مگر اتنا کرنے سے میں شاعر نہیں ہوگیا۔ اور نہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اور شاعر نہیں اور شاعری کا دعویٰ نہیں تو مدح کی توقع کیوں ہو ؎ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ نہ مدح و ستائش نہ سہی تاہم یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی عطائی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کلاونت کی حق قدرہ قدر کی جائے گی۔ وتعرف بضدھا تتبین الاشیاء۔

(۴) شاعری ہمیشہ اسلام کی نظر میں مبغوض رہی ہے اور وہ ہے بھی اسی قابل۔ میں بھی اس کو سخت ناپسند کرتا ہوں نہ اس لیے کہ

ک1 ایک شاعر اور کہتا ہے ؎ عمریست کہ تیر چرخ را آماجم - بر تارک افلاس و فلاکت تاجم * یک شمہ ز ماجرائے خود عرض دہم - چنداں کہ خدا غنی است من محتاجم ۱۲ ک2 چیزوں کا حال مقابلہ سے ظاہر ہوتا ہے ۱۲

اس کو اپنے لیئے دون مرتبت سمجھتا ہوں بلکہ اس لیئے اور صرف اس لیئے کہ اس کی چاٹ سریش کی طرح چمٹ جاتی ہی - ع
چھٹتی نہیں ہی موںہ سے یہ کافر لگی ہوئی - اِسی نے تو قومی مذاق کا ستیاناس کیا ہی - پھر بھی جس طرح کڑوی دوا شربت اور خمیرے کے ساتھ دی جاتی ہی لوگوں کو نصیحت بھی نظم کے پیرائے میں کرنی پڑتی ہی - اور نوجوانوں کے حق میں تو میں شاعری کو سم قاتل سمجھتا ہوں - اِس پر بھی فرمایشوں سے مجبور ہوں -

(۴) جو کیفیت اُن بزرگ کی تھی کہ مریدوں کے بھرّے میں آکر نفلیں پڑھانتے چلے جاتے تھے وہی کیفیت میری ہی مگر افسوس صد افسوس عبادت میں نہیں بلکہ شعر کہنے میں کہ میری اتنی عمر ہونے آئی میں نے کبھی شاعری کا شوق نہیں کیا - اور شاعری کا شوق کیا ہوتا تو میں نوکری کر سکتا نہ کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کر سکتا - اور نہ کلام مجید کا ترجمہ کر سکتا - اور نہ لکچر دے سکتا - نہ میرا کوئی تخلص ہی اور نہ مجکو اس لایعنی مشغلے کے لیئے کبھی فرصت ملی اور صاف بات یہ ہی کہ ہمارے ہاں کی شاعری کا مذاق ایسا بگڑا ہی کہ جہاں قومی تنزل کے اَوْر اسباب ہیں اُن میں میرے نزدیک ایک بڑا سبب یہ کم بخت ایشیائی شاعری بھی ہی - اِس میں شک نہیں کہ ہمارے وقتوں میں مولوی حالی نے نظمی مذاق کی بہت کچھ اصلاح کی ہی - مگر اب بھی میں نوجوان لڑکوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں - اور میں نہیں دیکھنا چاہتا کہ اُن میں شاعری کا مذاق پیدا کیا جائے - اِن کو شاعری کی چاٹ لگی اور انھوں نے جان صاحب کا دیوان خریدا اور جان صاحب کا دیوان ہاتھ میں لیا اور خود جان صاحب ہوئے - وہ جان صاحب جن کی نسبت فرمایا ہی والجان[1] خلقناہ من قبل من نار السموم - یہ لوگ جو خلافِ اخلاق شاعری کرتے ہیں - جو دین کا استخفاف کرتے ہیں - جو بزرگانِ دین کی ہنسی اُڑاتے ہیں پورے پورے مصداق ہیں اس آیت کے لیحملوا[2] اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ و من اوزار الذین یضلونھم بغیر علم الا ساء ما یزرون ۝

اب لاؤ اس شاعری کے بیان کو ختم کریں - تو غرض یہ ہی کہ جس طرح وہ شب زندہ دار بزرگ مریدوں کے بھرّے میں آکر ہزار پانسو نفلیں پڑھنے لگے تھے میں بھی لوگوں کے کہنے میں آکر شعر کہنے لگا - مگر جیسی اُن کی نفلیں ہوتی ہوں گی ویسے ہی میرے شعر ہوتے ہیں

(۵) شاعری جس سے زیادہ موثّر کوئی عمل نہیں ایشیائی ملکوں میں مدتوں سے ایسی بُری طرح سے اِس کا استعمال کیا جا رہا ہی کہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں لٹریچر کی خرابی کو ایشیائی قوموں کے تنزّل میں بڑا دخل ہی - جھوٹ اور مبالغے اور بے اصل خیالی باتوں پر تو اس کی بنیاد ہی - اور مضامین جن میں شعرا طبع آزمائی کرتے ہیں اکثر گندے - تو ایسی شاعری قومی اخلاق کو بگاڑا ہی چاہے

حاصلِ کلام یہ کہ شاعری یعنی ایشیائی طور کی شاعری شرعًا مذموم ہی - اُس نے قوم کے اخلاق پر بہت ہی بُرا اثر کیا ہی اور جب شاعری ایسی بربلا ہی کہ مستمع کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہی تو خود شاعر جو مبدا ان تمام خیالات فاسد کا ہی اِس کے اثر بد سے کب محفوظ رہ سکتا ہی - اِس محل پر شاعروں کے دوسرے عیوب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں - شاعر میں کم سے کم عجب اور خود پسندی کا عیب تو ضرور ہی پیدا ہو جاتا ہی - وہ اپنے ہم پیشوں کا حسد کرنے لگتا ہی جس کو ام الذمائم کہنا چاہیئے - اور اگر توقع کی قدر اس کو داد یا صلہ نہ ملے تو وہ ہجو سے لوگوں کی دل آزاری کرتا ہی -

[1] اور جنوں کو ہم نے پیدا کیا لو کی گرمی سے ۱۲ ع (ان کے کہنے کا ضروری) نتیجہ یہ ہی کہ قیامت کے دن اپنے (گناہوں کے) سارے بوجھ اور جن لوگوں کو بے سمجھے بوجھے گمراہ کرتے ہیں - ان کے (گناہوں کے) بوجھ بھی انھیں کو اُٹھانے پڑیں گے دیکھو تو (کیسا) بُرا بوجھ یہ لوگ اپنے اوپر لادے چلے جا رہے ہیں ۱۲

(۶) ایشیائی شاعروں کے وصل و ہجر، گل و بلبل، شوق و انتظار جہاں اَور معمولی مضامین ہیں اُن میں سے ناصح یا شیخ یا زاہد کو بُرا کہنا اور آسمان کو اُلاہنا دینا بھی ہے۔ شیخ و زاہد کو بُرا کہنا دین کے ساتھ استہزا کرنا ہے اور آسمان کو اُلاہنا دینا وعید لاتسبوالدہر میں داخل ہے ؎ از آسمان و زمیں شکوہ می کنی شب و روز۔ چہ دادہ بہ زمیں زاسماں چہ می خواہی +

مولانا نے بعض نظموں میں اپنی شاعری اور اُس کی حقیقت کے متعلق دو دو چار چار شعر بھی کہے ہیں۔ چوں کہ وہ بہت مزے کے ہیں اس لیئے درج کیئے جاتے ہیں۔

(الف) ذرا ٹھیر اے طبیعت کس بلا کی تیری آمد ہے کوئی حد بھی ہے اس باتی کی آخر تا کجا باقی
یہ جو کچھ سُن چکے ہو اب تلک تمہید مطلب تھی ابھی ہے نثر میں کہنے کو اصلِ مدّعا باقی

(ب) اگر لوگوں کے خوش کرنے کی حاجت ہے تو اُن کو ہو کہ جو امیدوارِ بخششِ انعام و خلعت ہو
یہاں تحسین تک اور داد تک کی بھی نہیں پروا سخن بے قدر و کاسد ہے اگر شاباش قیمت ہو
دلوں کو مول لے لیتے ہیں ہم لطفِ مضامین سے مگر دل حق پسند و شیوۂ انصاف طینت ہو

(ج) بس اپنی شاعری موقوف کر بہ خود غلط مستا ہو اگر چہ روکنا مشکل ہے مضمونوں کی آمد کو
کہیں اس شاعری کے خبط میں عادت نہ کر لینا خلافِ وضع وصفِ خط و خالِ عارضِ خد کو

(د) ہر چند ہوں کمال و فضیلت سے بے نصیب پر شکر ہے کہ طبع میں جودت ہے اور اُمنگ
کہنا نہیں مگر مجھے قدرت ہے نظم پر لیکن نہیں ہوں دوسروں کی طرح سے دبنگ
لوہا نہیں ہے ذہن کی تلوار کا خراب ہاں بے مہارتی کے سبب چڑھا ہے زنگ
الماس ہے نتیجۂ فیضانِ تربیت ہے ورنہ اصلِ وضع میں اس کی سرشت سنگ

(ہ) گرچہ ہے شعر و سخن سے مجھے کلّی نفرت اک مصیبت ہے مگر طبع کی موزونیت
اونگھتے کو ہوا کرتا ہے بہانہ جس طرح ٹھیلنے کا۔ یہی حالت یہی ۔۔ کیفیت
اک تقاضائے طبیعت ہے دوم فرمائش محسن الملک کا کہنا نہ کروں کیا طاقت
ہاں میں ہاں جو نہ ملائے وہ ٹرسٹی کیسا نیچری کیا۔ نہ کرے ان کی اگر تبعیت
ایک مشکل ہے بڑی اَور کہ اِس مجمع میں نظم کا نام اگر لوں نہیں پڑتی ہمّت
لکھنؤ ہے یہ اور اس خطّے کے رہنے والے رکھتے ہیں شاعری و حسنِ بیاں میں شہرت
پشتہا پشت سے شغل اُن کا ہے تحسینِ زباں یہی معیارِ فضیلت ہے یہی علمیّت
قابلیت جو تھی سب صرف ہوئی لفظوں میں اور مضامیں کی اگر پوچھو تو بس خیریّت
وہی اک عشق کا رونا ہے ہر اک صورت سے نہ لگائے کسی بندے کو خدا اِس کی لتّ

(و) میں کہاں اور شاعری کا مشغلۂ بے سود محض یہ وہ کرتا ہے جو محفل سے ہو خواہاں داد کا
انجمن کے واسطے میں بھی ہوں خواہاں داد کا دادِ تحسیں کا نہیں داد و دہش کی داد کا

(ن) سنیں جتنا سناؤ پر نہ پونچیں اصل مطلب کو — طبیعت کیا دکھائے خاک پھر اپنی جولانی
تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو و نذیر احمد — کہ اُسکے واسطے موضوع ہیں حالیؔ[۵] و نعمانیؔ

غرض جس شاعر کے ایسے خیالات ہوں اُس کے اشعار میں گل و بلبل کی کھال یا شیریں فرہاد کا قصہ یا وصال کی مسرت یا ہجر کا جھینکنا کوئی کیوں کر دکھا سکتا ہے۔ یہ تو یہ وہاں تو کوئی جھوٹے استعارات کو بھی اشارۃً کنایۃً بندھا ہوا نہیں دکھا سکتا اور نہ کوئی لغو اور بیہودہ تشبیہات کی کوئی مثال ڈھونڈے مل سکتی ہے۔ نہ وہاں اُن معاشیق کی جلوہ گری نظر آئے گی جن کے دہن نہیں۔ دہن ہے تو کمر نہیں اور اگر بالفرض والمحال ہے بھی تو بال سے زیادہ باریک۔ نہ اُن کے اشعار میں زلفِ سیاہ کا وہ سلسلۂ ناتمناہی نظر پڑے گا۔ جس کا سرا اس دنیا میں ہے نہ اُس عالم میں۔ نہ وہاں استخفافِ دین ہی ہے نہ استہزائے بزرگانِ مقدس۔ نہ معاملہ بندیاں ہیں نہ پھبتیاں اور یہی وجہ ہے کہ مصنف ممدوح[۶] الشعراء یتبعہم الغاوٗن الم تر انہم فی کل وادٍ یہیمون وانہم یقولون ما لا یفعلون کے ارشاد کی فہرست سے خارج ہیں۔ بلکہ جناب کا نام نامی الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے رجسٹر میں داخل ہے۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مولانا نے شاعری پر ریمارک کرتے ہوئے جا بجا اس امر کا اقبال کیا ہے کہ نہ وہ شاعر ہیں اور نہ انھیں شاعری کا دعویٰ نہ اُن کا کوئی تخلص اور نہ اس لایعنی مشغلے کے لیے کبھی اُنھیں فرصت ملی

ان فقروں کو دیکھ کر بعض نادان اور ناسمجھ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ مولانا شاعر نہیں بلکہ ناظم ہیں۔ اور اس کی تائید میں ایک بات یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اُن کی نظموں میں کوئی غزل نہیں اور جب غزل نہیں تو شاعر نہیں گویا معترض کے نزدیک صرف وہی شاعر ہو سکتا ہے جو غزل گو ہو اور غزل میں بھی وہی سخن با زناں گفتن ہو اور اس نے کوئی اپنا تخلص بھی مقرر کیا ہو۔ پس مولانا کی طرف سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور راقم کی طرف سے اس کا یہ جواب ہے کہ اگر شاعر کے یہی معنی ہیں تو وہ پکارے کہتا ہے کہ مولانا ہرگز شاعر نہیں اور اگر شاعر کی یہ تعریف ہے کہ وہ صادق البیان ہو۔ اُس کی نظم کا سوز آہ و بکا پیدا کرے۔ دلوں میں اُس کے اشعار کا اثر بیٹھ جائے۔ اشعار کا جذب دل کو پکڑ کر کھینچ لے اور دل میں درد پیدا کرے۔ اُن میں جو نصیحت ہو کارگر ہو۔ واقعاتِ نفس الامری اُن سے معلوم ہوں۔ احساساتِ شعری مشاہدات کا کام دیں تو کس کی مجال ہے کہ مولانا کو زمرۂ شعرا سے خارج کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ راقم کے نزدیک تو جس شاعر کے کلام میں جھوٹا ہجر اور جھوٹا وصل۔ جھوٹی مے اور جھوٹا پینا۔ جھوٹا معشوق اور جھوٹا عاشق۔ جھوٹا گل اور جھوٹا بلبل۔ جھوٹی بہار اور جھوٹی خزاں۔ جھوٹا کرشمہ اور جھوٹا حُسن۔ جھوٹا جنوں اور جھوٹا سودا۔ جھوٹی شوخی اور جھوٹی عیاری۔ بیہودہ جھوٹ اور بیہودہ مبالغے کے خس و خاشاک کے انبار اور غیر مفید مزخرفات مضامین ہوں وہ بھی شاعر ہے۔ اور وہ بھی شاعر ہے

[۵] شمس العلماء مولانا حالی سے مراد ہے [۶] شمس العلماء علامہ شبلی سے مراد ہے ۱۲ [۷] اور شعراء کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ شاعر نہیں کہ کیا شاعر (خود گمراہ ہوتے ہیں اور گمراہی کی تعلیم کرتے ہیں اور اُن کی پیروی (بھی) گمراہ (ہی) کرتے ہیں (اے مخاطب) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ یہ شاعر لوگ تمام باتوں کے) ہر ایک میدان میں سرگردان پڑے پھرا کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہا کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے ۱۲

جس کے کلام میں راست گوئی کے ساتھ نصیحتیں حکمتِ الٰہی اور مسائل عرفان اور موعظت اور ترغیب نیکیا ور واقعات اور قصصِ بزرگانِ دین وغیرہ ہوں۔

لیکن ان دونوں قسموں کے شعراہیں سے ایک قسم ملک اور قوم اور مذہب اور لٹریچر اور دیگر تمام باتوں کے لیئے از حد مفید ہی جیسے ہمارے مولانا کی قسم۔ اور دوسری قسم کا شاعر ملک اور قوم اور مذہب اور لٹریچر اور تمام باتوں کے لئے نامفید ہی نہیں بلکہ مضر ہو۔ جیسے کس کس کا نام لیا جائے

پس مولانا ممدوح کی شاعری چوں کہ مبالغے۔ جھوٹ۔ دُور از قیاس اشعاروں اور گندے خیالوں اور لغو قیاسوں اور فتنہ انگیز شورشوں سے پاک ہی اس لیئے ضرور وہ اِس قابل ہی کہ ہر کہ ومہ اُس سے فائدہ اُٹھا سکے باپ اپنے بیٹے کو سُنائے اور بیٹا اپنے باپ کو۔ بڑوں سے سُن کر چھوٹے فائدہ اُٹھائیں اور چھوٹوں سے بڑے۔

اب رہی یہ بات کہ مولانا کی نظمیں شاعری کے شکنجے میں بھی ٹھیک کسی ہوئی ہیں یا نہیں۔ زبان کے لحاظ سے وہ ٹکسالی اور کھرا سکّہ ہی بازرِ ملتبس۔ طرز بندش میں فصاحت و بلاغت کے موتیوں کی لڑیاں ہیں یا کنکر پتھر اِس کا جواب یہ ہی کہ راقم نے جب اُن کی نظموں کو تنقیدی نظر سے دیکھا تو اُن میں بعض غلطیاں ضرور نظر پڑیں۔ مثلاً مناجات میں آنحضرت صلعم کو مخاطب کرکے ایک شعر لکھا ہی ؎

تم کو سب اختیار حاصل ہی   آپ کو سہل مجھکو مشکل ہی

نثر کی ایک سطر یا نظم کے ایک شعر میں کہیں مخاطب کو آپ اور کہیں تم کہیں تو یا متکلم کو کہیں ہم کہیں میں لکھنا عیب ہی جس کو شتر گربہ کہتے ہیں۔ استادانِ سخن کہتے ہیں کہ نوآموز بچوں سے ابتدا میں اسی قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مولانا نے اپنے زمانۂ طفولیت میں یہ مناجات لکھی ہی اور اسی وجہ سے اُس میں اِس قسم کی غلطیاں واقع ہوگئی ہیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مولانا کی حمد و نعت اور مناجات کے اشعار خود اپنی زبان سے بیان کر رہے ہیں کہ وہ اگرچہ مولانا کے زمانۂ طفولیت کے اشعار نہیں ہیں۔ مگر ابجدِ سخن یا مشق اوّل کے ہونے میں کلام نہیں۔ کیوں کہ نعت و مناجات کے اشعار کی بندشیں اور ترکیبیں سُست اور ڈھیلی واقع ہوئی ہیں۔ اور مخصوص مناجات کی بات یہ ہی کہ فریاد اور جذبے اور گریہ و بکا کے وقت انسان پر ایک دوسری قسم کی حالت طاری ہوتی ہی۔ جوش کی حالت میں جب دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہی تو فصاحت و بلاغت اور زبان کی ترکیبیں اکثر مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اِس لیئے اِس قسم کی نظموں پر اعتراض کے ہیچ کو زیادہ کسنا نہیں چاہیے ؎

فریاد کی کوئی لئے نہیں ہی   نالہ پابندِ نَے نہیں ہی

یا مثلاً مولانا کی ایک نظم کا مطلع ہی ؎

عزت نہیں ہنر نہیں پلّے ٹکا نہیں   دنیا میں اب تو جینے کا مطلق مزا نہیں

اِس نظم میں ایک شعر ہی ؎

ہاں اک سبیل ہی کہ علی گڈھ چلے چلو   اس وقت اِس سے ہند میں بڑھ کر جگہ نہیں

ہوا-سزا- قبا کا قافیہ جگہ نہیں ہو سکتا- جگہ میں ہائے مظہرہ ہے- جگہ کو جگہا پورب کے بعض اضلاع میں بولتے ہیں- جہاں مولانا اکثر رہے ہیں- کچھ عجب نہیں کہ وہیں کا تلفظ یا لب و لہجہ اُن کی زبان پر چڑھ گیا ہو-

مندرجۂ ذیل اشعار پر بھی لوگوں کے اعتراض ہو سکتے ہیں-

یہ طامات و دعوے ہیں دھوکے کی ٹٹی — اگر زہد ہے بھی تو زہد مزوّر
گر علم کی طلب ہو صادق تو جانیں — ورنہ نمائشی یہ سب جوش و ولولے ہیں
ہم بھی کبھی با سرو سامان تھے — ہم بھی کسی وقت میں انسان تھے
دولت مدارِ رونقِ باغِ جہان ہے — زر ہو- بلا سے رنگ نہ ہو گل میں بو نہ ہو
وگرنہ دین داری بس حقیقت اس کی اتنی ہے — کہ ہم جیسے گنہ گاروں کا ہے پردا ڈھکا باقی

اشعار مذکورۂ بالا میں بعض لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ طامات و دعوے- جوش و ولولے- با سرو سامان- رونقِ باغِ جہان- دین داری- کی جگہ طامات و دعوی- جوش و ولولہ ہونا چاہیئے- اور با سرو سامان رونقِ باغ جہان اور دین داری میں اظہار نون ناجائز ہے-

لیکن راقم کے نزدیک اردو زبان میں فارسی کے ایسے قواعد جاری کرنا جن کی وجہ سے زبان میں تنگی پیدا ہو بالکل بے جا ہے- یہ عجیب بات ہے کہ نثر کو ان قیود سے پاک دیکھا جاتا ہے- مثلاً معترض کے نزدیک "اصولِ آئین منضبط تھے" "اجتماعِ النقیضین ہو گیا" "حضراتِ سامعین سُنیئے" کے نونوں کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ فارسی ترکیب میں اظہار نون جائز نہیں- لیکن معترض اگر ان فقروں کو اُردو میں استعمال کرے گا تو بغیر اظہار نون کے چارہ نہ ہوگا اور اگر ضد کے مارے اظہار نون نہیں کرے گا تو لوگ اُس پر ہنسیں گے- اسی طرح اگر "سبزہ و لالے پہ نسیمِ سحری ناچ رہی تھی" "تشبیہ و استعارے سے کلام میں وسعت اور زور پیدا ہو جاتا ہے" وغیرہ وغیرہ میں ایک اہلِ زبان سے کبھی لالہ اور استعارہ نہیں نکل سکتا- وہ جب بولے گا تو اس موقع پر لالے اور استعارے ہی بولے گا- خواہ اُس کا بولنا فارسی ترکیب سے غلط ہو- مگر اُردو کا فصیح لہجہ تو یہی ہے- اگر نظم میں کہیں ایسی ترکیبیں آ جاتی ہیں تو لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں- ہمارے نزدیک تو یہ دونوں ترکیبیں درست ہیں- بعض مواقع پر اظہار نون بُرا معلوم ہوتا ہے اور بعض جگہ بغیر اعلانِ نون کے بولنے میں فصاحت و روانی نہیں رہتی- پس جہاں جیسا موقع ہو وہاں ویسا ہی بولنا چاہیئے-

مندرجۂ ذیل اشعار پر جو اعتراض ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ان میں بعض متروک الاستعمال الفاظ باندھ دیئے گئے ہیں- مثلاً

دیا اُس کے ہاں بھی کوئی کونسل ہے — تم اُس کونسل کے آراکین و ممبر
گاتے تھے چند لڑکے منظمِ نذیر احمد — اِن ہاس یا الہی ارگن ہیں باگلے ہیں
دکھاتا ہے قدرت کے اپنے نمونے — مگر بھید پایا نہ اُس کا کسو نے
مسلمان کہتے ہیں ہانکے پکارے — کہ تعلیم کے نام جلتے انگارے

مندرجۂ بالا اشعار میں اگرچہ دیا- اِن ہاس- کسو- انگارے بلا تشدید بالکل متروک الاستعمال الفاظ ہیں- جو یوں پڑھنے

ہیں تو فی الواقع اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر مولانا کی زبان سے سننے کی حالت میں خدا معلوم کیوں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہ جناب موصوف کے پڑھنے کا اثر ہوگا کہ ایسے الفاظ اُن کی زبان سے اَور بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

پُرانی اُردو میں بہت ایسے الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو اب متروک ہیں۔ مثلاً جاتی کی جگہ جاتیاں اور اُٹھنی کی جگہ اُٹھتیاں وغیرہ وغیرہ بولتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہی کہ داغ مرحوم حیدر آباد میں ایک مرتبہ کسی قصور پر اپنی چھوکریوں پر خفا ہونے لگے اُس غصے کے عالم میں ایک فقرہ اُن کی زبان سے یہ بھی نکلا تھا کہ "حرام زادیاں دن بھر مفت کی روٹیاں ٹھونستیاں رہتیاں ہیں اور کام کاج کے لیئے جگہ سے ہلنیاں نہیں ہیں" یہ ظاہر ہی کہ اہل زبان ایسے الفاظ کو متروک کر چکے ہیں۔ اور اب کانوں کو اچھے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ مگر جس وقت داغ کے لب و لہجے میں یہ فقرہ میرے خیال میں آتا ہی تو جتنا مزہ اُن کی زبان سے سُن کر آیا تھا اُتنا ہی اچھا اس وقت معلوم ہوتا ہی۔

یہ سب کچھ تو ہوا مگر جب شاعری کے متعلق مولانا کی رائے کو ہم غور سے پڑھتے ہیں تو ہمارا دل چاہتا ہی کہ اپنے اعتراض واپس لے لیں۔ اور ایک حرف بھی مونہ سے نہ نکالیں۔ مگر چوں کہ یہ اصول سوانح نگاری کے خلاف تھا اس لیئے صرف خانہ پُری کی گئی ہی۔ ورنہ ہمارا تو یہ خیال ہی کہ ع نہ بر حرفِ او جائے انگشت کس۔

خطابات

گورنمنٹ ہند نے اپنے اصولِ سلطنت میں ایک امر یہ بھی ملحوظ خاطر رکھا ہی کہ جب کوئی شخص ملک اور قوم کے لیئے کوئی دیرپا فائدہ رساں کام کرتا ہی یا اپنے ملک اور وطن کی بہبودی میں سرگرم ہو کر فائدہ پونہچاتا ہی یا علوم کی روشنی پھیلاتا ہی یا اَور کوئی جواں مردی اور دلیری کا کام کرتا ہی تو وہ خطابات و خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہی۔ لیکن تجربے سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہی کہ بعض لوگ صرف نام و نمود کی خاطر زر کثیر خرچ کر کے بلا استحقاق خطابات حاصل کرتے ہیں۔ ایسے خطاب یافتہ ہندوستان میں بہت ہوں گے۔ لیکن مولانا نذیر احمد صاحب کو جتنے بھی خطابات ملے ہیں وہ سب کے سب بلا خواہش اور با استحقاق ملے ہیں۔ نہ اُن خطابوں کے حاصل کرنے کے لیئے انھوں نے کبھی حکّام کی خوشامدیں کیں نہ ڈالیاں پیش کیں۔ نہ پہاڑوں پر دوڑ دوڑ کر گئے اور نہ کبھی ایک پیسہ خرچ کیا خدا نے اُن کے دل و دماغ کو علم و فضل کی روشنی سے ایسا منور کیا ہی کہ گھر بیٹھے وہ ملک اور قوم کی بہبودی میں مستغرق رہتے ہیں۔ اور اُن کے انوار کی شعاعیں ہندوستان کے چاروں کھونٹ میں پھیل کر روشنی پونہچاتی رہتی ہیں۔ اور لوگ اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

شمس العلماء سب سے پہلے جناب ممدوح کو گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ر جون ۱۸۹۷ء مطابق ۱۲ر محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جس وقت شمس العلماء کا خطاب و خلعت کپتان ڈیوس صاحب ڈپٹی کمشنر دہلی کے ہاتھ سے ملا تو مولانا نے اُس جلسے میں یہ اشعار پڑھے تھے۔

کیوں کر کہیں کس سے کہیں ہم کون ہیں کیا ہیں ۔۔۔ اِک ذرہ ہیں اور نام کے شمس العلماء ہیں

انسان کو کہتے ہیں کہ بندۂ احساں　یعنی کہ ہم آوازۂ گنبد کی صدا ہیں
گر شاہ کرے لطف و عنایت تو رعایا　تسلیم و اطاعت میں غلاموں سے سوا ہیں
خود تم کو نہیں مال و زر و سیم کی پروا　اور ہم بھی ادھر مفلس بے برگ و نوا ہیں
لیکن دل و جاں رکھتے ہیں اور دونوں کے دونوں　سچ مانئیو قربان ہیں اور تم پر سے فدا ہیں
کیا ہو سکے احسان گورنمنٹ کا بدلا　بس جہد مقل یہ ہے کہ مصروف دعا ہیں
جس عہد میں ہم امن سے بیٹھے ہیں الٰہی　قائم رہے جس وقت تلک ارض و سما ہیں
ڈیوس کو خدا لاٹ کرے سب کہو آمین　اس کشتی طوفاں زدہ کے ناؤ خدا ہیں

ایل ایل ڈی ۳ را پریل ۱۹۰۲ء کو ایل ایل ڈی کی سند عطا ہوئی۔ ۱۱ را پریل ۱۹۰۲ء کو ایڈنبرا یونی ورسٹی میں باقاعدہ طور پر عطائے ڈگری کی تقریب منعقد ہوئی۔ مولانا نے سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر کو قرآن مجید کا ترجمہ بھیجا تھا۔ غالباً ترجمۂ قرآن مجید نے سر ولیم میور سے اس ڈگری کی سفارش کی ہوگی۔

ڈی۔ او۔ ایل ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب آبزرور میں اس ڈگری کے متعلق ایک نوٹ چھپا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پینتیسویں کانووکیشن پنجاب یونی ورسٹی کا اجلاس بروز جمعہ ہوا۔ چینسلر (لفٹنٹ گورنر پنجاب) صاحب صدر نشین جلسہ تھے۔ اس جلسے میں بہت سی ڈگریاں تقسیم ہوئی تھیں منجملہ ان کے شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی گئی۔ ڈگری دیتے ہوئے جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے ارشاد فرمایا۔

"بتعمیل ریزولیشن سینٹ جو ابھی پڑھا گیا ہے اور نیز اُن اختیارات کی رو سے جو بحیثیت چینسلر یونی ورسٹی مجھے حاصل ہیں میں مولوی حافظ نذیر احمد خاں۔ شمس العلماء۔ ایل ایل ڈی کو ڈگری آف اورینٹل لرننگ میں شامل کرتا ہوں۔ اور جس کے لیے میں حکم دیتا ہوں کہ یہ سند صاحب موصوف کو دی جائے۔ اور میں صاحب موصوف کو مجاز کرتا ہوں کہ اس ڈگری کے متعلق جو لباس مقرر ہے اُس کو زیب تن کریں۔ ہز آنر نے یہ بھی ارشاد کیا کہ میرے لیے یہ وقت خاص امتنان کا ہے کہ میں ایسے موقع پر بہ حیثیت ایک چینسلر کے صدر نشین ہوں۔ جب کہ یونی ورسٹی کی تاریخ میں ایک تھوڑا سا جدید طرز عمل اختیار کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ کی اعزازی ڈگری ایک ایسے شخص کو دی گئی ہے جو نہ یونی ورسٹی کا ممبر ہے نہ وہ اس یونی ورسٹی کا کوئی بڑا عہدہ دار ہے۔ باایں ہمہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کانووکیشن اس امر پر بالکل متفق ہوگی کہ اس سے بہتر اور کوئی انتخاب اس معزز ڈگری کے عطا کرنے کا مولوی صاحب موصوف کے سوا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ زبان اُردو کی ترقی میں مولوی صاحب موصوف کے سوا کسی اور شخص نے اتنی کوشش کی ہو۔ ان کی تصانیف کا حال آپ سب لوگوں کو معلوم ہے اور مجھے یقین ہے کہ بالائی حصۂ ہند میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ وہ بہترین کتابیں ہیں جو زبان اُردو میں لکھی گئی ہیں۔ مجھے بہت مسرت ہے کہ یہ عزت ایسے وقت دی جا رہی ہے جب کہ میں چینسلر ہوں۔ اگر مجھے افسوس ہے تو صرف اس امر کا ہے کہ مولوی صاحب موصوف بہ نفس نفیس ڈپلوما لینے کے لیے خود تشریف نہ لا سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمۂ بعد الوفات

ہم نے ضمیمۂ ماقبل کو اس فقرے سے شروع کیا تھا ''کہ کہنے کو کہہ دیجئے کہ حیاۃ النذیر کا یہ آخری ضمیمہ ہے خدا صاحب سوانح کی حیات میں برکت دے ان شاء اللہ حیاۃ النذیر کے ضمیموں کی زنجیر میں ہر سال ایک نہ ایک کڑی کا اضافہ ہوتا رہے گا'' مگر ہم کو کیا کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ حیاۃ النذیر کے ضمیموں کی زنجیر میں صرف ایک وفات کی آخری کڑی اَور باقی ہے۔

جس وقت مولانا کی بیماری کی حالت ہم نے اخباروں میں پڑھی تو ہمارا دل اُسی وقت کھٹکا تھا اور خیال گزرا تھا کہ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند کے آثار ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ یہ موذی فالج مولانا کو ہرگز جاں بر نہ ہونے دے گا۔ ایک مرتبہ خود مولانا نے بھی اپنی موت کی نسبت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ نذیر احمد اگر مرے گا تو فالج سے مرے گا۔ آخر وہی ہوا یعنی ۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء کی شب کو بارہ بجے مولانا استنجا کرنے کے لیئے اُٹھے تو یکایک فالج نے آ دبوچا۔ فالج نے گرتے گرتے مرحوم کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں بالکل بے کار کر دیا اور وہ زمین پر گر پڑے خدمت گار کو آواز دی۔ دو آوازیں تو ذرا بلند تھیں مگر تیسری آواز بالکل ڈوبی ہوئی کنوئیں کی سی آواز تھی۔ غرض یہ آواز سُن کر چاروں طرف سے اعزّہ اقربا جو اِس وقت وہاں موجود تھے پریشان ہو کر جمع ہو گئے۔ مرحوم کو زمین سے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ زبان اُسی وقت موٹی پڑ گئی تھی۔ بولنے میں مرحوم کو جو ایذا ہوتی ہو گی اُس کا اندازہ مرحوم ہی کو ہوا ہو گا۔ مگر بعض اعزہ مرحوم سے زیادہ پریشان نظر آتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ وصیت فرمائیں مگر افسوس زبان نے یاری نہ دی صبح ہوتے ہی علاج شروع ہو گیا۔ یونانی اور ڈاکٹری دونوں قسم کا علاج ہوا مگر موت کی دوا کسی کے پاس نہ تھی۔ بالآخر جمعے کے دن رات کو آٹھ بجے کے قریب مرحوم نے انتقال کیا۔ اُسی رات کو غسلِ میّت اور کفن وغیرہ سے لوگ فارغ ہو گئے۔ مگر کنبے قبیلے کے بزرگوں نے کہا کہ میاں بشیر ابھی حیدرآباد سے نہیں آئے ہیں۔ اُن کو تار دیا گیا ہے آتے ہی ہوں گے۔ اُن کے آنے کے بعد دفنانا چاہیئے۔ جب صبح تک بھی وہ نہیں آئے تو لوگوں کی رائے ہوئی کہ اب میّت کے دفنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ چناں چہ ہفتے کے روز صبح سے لوگ جوق جوق جمع ہونے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد نئے بانس کے محلّے میں سے ہو کر حضرت خواجہ باقی باللہ میں جنازہ پونہچایا گیا۔ اور ایک درخت کے سایے میں رکھ کر مولوی عبدالسلام صاحب نبیرۂ شمس العلماء مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور گورستانِ خواجہ باقی باللہ میں اُس آفتابِ علم و فضل کو سپردِ خاک کر کے لوگوں نے دعائے مغفرۃ کی۔ اور بصد اندوہ و حرمان اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ثم انا للہ

وانا الیہ راجعون ثم انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی وفات کی خبر تمام انگریزی اور اردو اخباروں میں گشت کرگئی۔ ایڈیٹروں نے بڑے بڑے ماتمی لیڈنگ لکھے۔ نامہ نگاروں نے تعزیتی مضمون بھیجے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ماتمی جلسے ہوئے تعزیتی رزولیوشن پاس کرکے اُن کے سارے خاندان اور مخصوص میاں بشیر کے ساتھ ہم دردی کی گئی۔ انگریزی حکام کے سوا ہندوستان کے ہر صوبے سے میاں بشیر کے نام تعزیۃ اور ہم دردی کے خطوط اور تاروں کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور ابھی تک کوئی دن ایسا خالی نہیں جاتا جو ہم دردی کے خطوط نہ آتے ہوں۔

اِس بات پر تمام ملک کے اخبار اور تعزیتی جلسے متفق ہیں اور بجا متفق ہیں کہ مولانا کی وفات اُن کے خاندان کے لیئے اگر ایک مصیبت ہے تو تمام مسلمانوں کے لیئے ایک غیر معمولی اور ناقابلِ تلافی مصیبت ہے۔ کیوں کہ ایسے جامع کمالات کا دنیا سے اُٹھ جانا اگرچہ اُس زمانے میں بھی مسلمانوں کے لیئے ایک حادثۂ عظیم ہوتا جب کہ ارباب فضل وکمال کی کثرت تھی۔ مگر ایسے زمانۂ قحط الرجال میں جب کہ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا نظر آتا ہی ایک حادثۂ اعظم الاعظم ہے مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ ؎

هرگز نمیرد آن که دلش زنده شد بعلم ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

بے شک اُن کی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی بے شک اُن کا جسد فنا ہوگیا۔ بے شک عناصر اربع جو مرحوم کو ایک صورت وشکل میں قائم کیئے ہوئے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر منتشر ہوگئے۔ بے شک مرحوم کی آنکھیں بند ہوگئیں بے شک اُن کے ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ بے شک اُن کی زبان بند ہوگئی۔ بے شک نہ اب وہ ایک حرف بول سکتے ہیں نہ ایک حرف لکھ سکتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے علم وفضل کا چشمۂ شیریں چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ قوم اور ملک کی تشنگی کو بجھاتا رہے گا۔ اور لوگ اُس سے سیراب ہوتے رہیں گے۔ اِس لحاظ سے اگر ہم مرحوم کو ایک حد تک غیر فانی کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

راقم کی آخری چند ملاقاتیں گزشتہ دہلی دربار کے زمانے میں ہوئی تھیں۔ انھیں ملاقاتوں میں ایک دفعہ مرحوم کے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کا نام نہیں جانتا۔ مگر باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دہلی یا نواح دہلی کے کوئی غیر معروف حکیم صاحب ہیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے وہ مرحوم کو علاج معالجے کی لاگ پر لگانا چاہتے تھے۔ بات بات میں وہ یہی کہتے تھے کہ میرے پاس آپ کے امراض کے لیئے ایسے ایسے نسخے ہیں کہ حاذق الملک اور شفاء الملک کو اُن کی ہوا تک نہیں لگی۔ مولانا مرحوم اس کے جواب میں یہ ارشاد فرماتے کہ حکیم صاحب کیسی بیماری اور کیسی دوا۔ مجھے تو آپ کوئی ایسا نسخہ مرحمت کیجئے کہ احتضار یعنی جاں کنی کے وقت میری روح آسانی سے پرواز کر جائے۔ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے جان نکل جائے۔ میری بیماری سے میرے عزیزوں کو تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے اور اُسی درد آمیز آواز میں ایک جوش کی حالت میں پڑھنے لگے۔

يا رسول الإله خذ بيدي ما لعجزي سواك مستندي

یا من اشکلت مصیبتہ واحاطت بہ خطیئتہ

بار بار ان اشعار کو پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ اور کہتے جاتے تھے کہ اگر
اعمال پر نظر کرتے ہوئے اس کی امید نہیں مگر خدا کی رحمت پر نظر کرتے ہوئے کیا بعید ہے کہ وہ مجھ پر رحم فرما
اس کے بعد مندرجۂ ذیل اشعار پڑھے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و رند و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہِ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

الٰہی بحقِ بنی فاطمہ — کہ بر قولِ ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول — من و دستِ و دامانِ آلِ رسول

بہرحال اب رونے پیٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ ہم کو رضینا برضاء اللہ رہنا چاہیئے۔ اگر
ہم مرحوم و مغفور کے حق میں کچھ کرسکتے ہیں تو صرف اتنا ہی کرسکتے ہیں کہ خدا کی درگاہ میں نہایت عجز و انکسار
کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگیں۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ
واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما نقیت
الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرًا من دارہ واھلاً خیرًا من اھلہ
وزوجًا خیرًا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار یعنی
الٰہی اس کے گناہ بخش دے اور اس پر رحمت کر اور اسے نجات دے اور اس کی خطا معاف فرما اور اس کا
ٹھکانا عمدہ بنا اور اس کی قبر کشادہ کر اور اس کو پانی اور برف اور اولے سے پاک صاف کردے جیسا کہ تو کپڑے
کو میل کچیل سے صاف کر دیتا ہے۔ اور اس کو دنیا کے گھر سے بہتر گھر اور اہل سے بہتر اہل اور دنیا کی بی بی سے
اچھی بی بی بدل دے اور اسے بہشت میں لے جا داخل کر اور عذابِ قبر اور عذابِ دوزخ سے بچا لے۔ آمین۔

ضمیمہ آخر

نوشتۂ خاکسار بشیر الدین احمد خلف جناب مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور

حیات النذیر یہ کتاب مولوی سید افتخار عالم صاحب مارہروی نے کئی برس ہوئے کہ لکھنی شروع کی تھی جب مجھے خبر لگی تو میں خود مارہرہ گیا اور چند دن وہاں رہ کر بہت کچھ مواد سید صاحب کو دیا۔ کتاب کئی برس پیشتر مکمل ہو گئی تھی اور اگر اہتمام کیا جاتا تو مرحوم کی زندگی میں نکل کر شائع ہو کر اب تک پرانی بھی ہو جاتی مگر کُل امر مرہون باوقاتہا مشیت الٰہی یوں تھی کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد نکلے سو وہ ہو کر رہا مصنف صاحب کی عدم توجہی مطبع والوں کی ڈھیل دونوں باتیں مل ملا کر کتاب کھٹائی میں پڑ گئی +

یہ کتاب تو قریب قریب مکمل کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں چھپ چکی تھی۔ ہاتھی نکل گیا تھا مگر دُم اٹک رہی تھی۔ دیباچہ۔ خاتمہ۔ فہرست مضامین باقی رہ گئے تھے۔ پھر مصنف صاحب نے تصاویر ڈیڈیکیشن کو ضمیمہ جات اور اسی طرح مصنف صاحب تک برابر کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے میری لی خواہش اور خیال تھا کہ مرحوم کی وفات سے تین مہینے کے اندر کتاب پبلک کے سامنے پیش کر دی جائے گی لیکن کچھ ایسے جھمیلے پڑ گئے کہ اب تک کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس میں جس کسی کا بھی قصور ہو مگر یہ تاخیر ضرور حد الزام تک پونہچتی ہے اور میں اس کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر میرا تقاضا اور میری لگاتار کوشش نہ ہوتی اور میں اپنی ذات سے سیکڑوں روپیہ اس میں نہ لگاتا تو کبھی ممکن نہ تھا کہ یہ کتاب اب بھی نکلتی +

مرض الموت والد مرحوم کے قُویٰ بہت اچھے تھے وہ کھانے پینے میں از حد احتیاط کرتے تھے مشی بھی روز کرتے تھے غسل بھی روزانہ کرتے تھے۔ غرض اپنی عمر کے اعتبار سے ہر طرح اچھے تھے سب سے پہلے اُن کو ہاضمے کی شکایت ہوئی۔ نہ بھوک لگتی تھی نہ غذا برابر ہضم ہوتی تھی نشست و برخاست میں تکلف ہونے لگا۔ باہر آنے جانے میں دوسرے کی مدد کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ دانت سب گر گئے تھے پان برسوں ہوئے کہ چھوڑ دیا تھا ہاں حقہ آخر دم تک جاری تھا۔ اب غذا گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گئی تھی۔ باہر آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر پلنگ پر پڑے رہتے تھے ضعف بصارت بھی ہو گیا تھا آدمی کو اچھی طرح پہچانتے نہ تھے ثقل سماعت بھی تھا جس دن سے بصارت میں کمی ہوئی جب سے اُن کی حالت روز بروز زردی ہوتی گئی۔ کیوں کہ بڑا مشغلہ اُن کا پڑھنا لکھنا تھا۔ رعشے کے سبب سے خود تو بہت کم لکھتے تھے ہاں بول کر لکھواتے تھے البتہ پڑھنا برابر جاری تھا سو آنکھوں کا جواب دینا کیا تھا گویا زندگی نے خیرباد کہی۔ پڑھنا ہی اُن کی زندگی کا سہارا تھا جب وہ ہی نہ رہا تو اب کون سا مشغلہ باقی رہا۔

دن بھر بے کار پڑے پڑے گھبراتے تھے ہمیشہ موت کی تمنا ظاہر کیا کرتے تھے کہ اب میرے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے واللہ اعلم اس میں خداوند تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے کہ بیماری میں مطلق علاج نہ کرتے تھے۔ ہم لوگ جب مصر ہوتے تو کہتے۔ بیٹا! تم کیا دوا دارو کرتے ہو یہ عمارت کہنہ ہو گئی ہے جا بجا سے گر گئی ہے بھلا کہیں ایسے پرانے گھر اڑواڑ لگانے سے رک سکتے ہیں ایک دن خود بخود بیٹھ جائے گی۔ ہر وقت چشم پُر آب رہتی تھی۔ موت کو بار بار یاد کرتے اور روتے تھے۔ زبان پر ہر لحظہ کلام مجید کی آیات جاری تھیں۔ بعض وقت ہوش و حواس میں بھی فرق آجاتا تھا۔ پہچاننے والے سے بھی کسی کو نہیں پہچانتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر میں سنبھل جاتے تھے اور اچھی خاصی طرح باتیں کرنے لگتے تھے۔ ۲ر جنوری ۱۹۱۲ء کو میں دہلی سے حیدر آباد روانہ ہوا جب تک کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مجھے گلے لگا کر بہت روئے ایسا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ کہتے تھے کہ تم اب نہ جاؤ پنشن لے کر یہیں رہو کہ میرا آخری وقت ہے لیکن دنیا بہ امید قائم ہم پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا تھا ہم یہی سمجھتے تھے کہ باپ ابھی بہت دنوں جئیں گے۔ ۲۹ر اپریل کو دس بجے دن کے حیدر آباد میں میرے پاس تار آیا کہ شب گزشتہ خفیف سا شکوہ فالج کا ہوا ہے لیکن کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تار پڑھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے سمجھا کہ اس پیرانہ سالی میں فالج کا شکوہ بچنا محال ہے میں نے فوراً تار سے پوچھا کہ کس جانب فالج ہوا ہے معلوم ہوا کہ داہنی جانب۔ خود ہمارے گھرانے میں میرے خالو اور ماموں دونوں فالج میں مبتلا ہیں اور سالہا سال سے زندہ ہیں ممکن تھا کہ یہ بھی جاں بر ہو جاتے۔ پھر تو دن میں کئی کئی تار آتے تھے آخر کار میں ۲ر مئی کو ۹ بجے شب کے دہلی روانہ ہوا ۳ر کو پانچ بجے شام کے منماڑ پہنچا پنجاب میل کے آنے میں چھ گھنٹے کا وقفہ تھا دل بے قرار تھا ارجنٹ تار دیا سرِ مغرب جواب ملا کہ حالت بہت خطرناک ہے میرا دل وہیں بیٹھ گیا اور میں سمجھا کہ کام تمام ہو گیا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۳ر مئی یوم جمعہ کو پونے آٹھ بجے شب کے روح پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پنجاب میل بدقسمتی سے ۳ گھنٹہ لیٹ تھی میں ۴ر مئی کو دو بجے شب کے پہنچا اور اسی دن دوپہر کو وہ درگاہِ حضرت خواجہ باقی باللہ میں سپردِ خاک ہو چکے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ مجھ بدنصیب کو آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ ۲۷ و ۲۸۔ اپریل کے شب درمیانی میں پچھلی رات کو رفع حاجت کو اٹھے لیکن وہیں گر پڑے اٹھ نہ سکے۔ خدا بخش ملازم کو آواز دی وہ کوٹھے پر گیا اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے کہ غسل خانے یا پاخانے میں بیٹھ کر اٹھ نہ سکے یہی خیال اس وقت بھی ہوا فالج کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ صبح کو حسبِ معمول اٹھے ناشتہ سامنے آیا پراٹھے کا نوالہ توڑنا چاہا تو توڑا نہ گیا کیوں کہ ہاتھ میں رعشہ پہلے ہی تھا۔ آدمی نے منہ میں بنا کر نوالہ دیا کھایا نہ گیا حلق میں پھنس گیا۔ ناشتہ چھوڑ دیا مگر بات چیت اچھی طرح کرتے رہے۔ زبان میں لغزش تھی زبان موٹی پڑ گئی تھی۔ میری بہن سنتے ہی دوڑی گئیں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں خود فرمایا کہ گھبرانے کی کیا بات ہے کیا صغریٰ! تم اب تک یہی دعا کیے جاتی ہو کہ باپ جی جائے۔ بیٹا! دنیا میں سدا کسی کے ماں باپ نہیں جیتے۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ جلد میری مشکل آسان کرے اور مجھے کسی کا محتاج کر کے نہ جلائے۔ علاج کے واسطے پوچھا کہ یونانی علاج ہو گا یا ڈاکٹری تو ہنس کر کہا کہ مردہ بدست زندہ حکیم شفاء الملک رضی الدین خاں صاحب کا علاج ہوا۔ پھر ڈاکٹری۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ باتیں کرتے تھے مگر بہ تکلف۔ بات صاف سمجھ میں نہ آتی تھی۔ زبان کو یارائے گفتگو نہ تھا۔ داہنا ہاتھ اور داہنی ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی یکم مئی کو زبان بند ہو گئی مطلق بات نہ کر سکتے تھے۔ زبان کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کلّوں پر گھونسے مارتے تھے۔ اشاروں سے کچھ بات کرنی چاہتے تھے مگر سمجھ میں

نہ آئی تھی - ۲ مئی کو تنفس اِس شدت کا شروع ہوا کہ گھر کے باہر آواز آتی تھی اور بیہوشی طاری تھی کہ اُسی حالت میں ۳ مئی کو پونے آٹھ بجے دہلی کا آفتابِ علم غروب ہو گیا - رات کو ہی نہلا دُھلا دیا - دس بجے دن کے جنازہ روانہ ہوا - کسی کو خبر ہوئی کسی کو نہیں کچہری کا وقت تھا لوگ پونہچ نہ سکے بریں ہم ہزار آدمی کے قریب جنازے کے ساتھ تھے بعد دوپہر دفن ہوا -

حالات بعد الممات مرحوم کے مرنے کی خبر تمام ہندوستان میں بجلی کی طرح کوند گئی - عمر کے اعتبار سے وہ پکے پان تھے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے لیکن مسلمانوں میں قحط الرجال ہی جو مرتا ہی اُس کا کوئی بدل نہیں صدہا تار ہزارہا خط آنے شروع ہو گئے - اُردو - انگریزی کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس میں مرحوم کی وفات کا لیڈنگ آرٹکل نہ ہو +

(۱) عالیجناب سر لوئی ڈین صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب

(۲) مسٹر مرٹیتھ صاحب بہادر کمشنر دہلی

(۳) میجر ہیڈن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی

(۴) ریوانڈ اینڈ روز پرنسپل سینٹ سٹیفنز کالج دہلی کے تعزیتی خطوط خاکسار کے نام آئے - جن میں مرحوم کی وفات کو ایک قومی مصیبت تحریر فرمایا تھا اور بہت کچھ حوصلہ افزا کلمات تھے - اور قریب دو سو تاروں کے مختلف سوسائٹیوں انجمنوں اور احباب کے آئے جن کی فہرست درج کرنا باعثِ طوالت ہی +

رزولیوشن در باب وفات حسرت آیات فاضل اجل شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم ۳ مئی ۱۲ء

ہم جملہ مدرسین وطلاب عربک سکول کو خبر وحشت اثر انتقال پُرملال جناب فاضل اجل کامل اکمل شمس العلماء مولوی حافظ ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے سخت صدمہ پونہچا ہی واقعی ایسے قابل ولائق شخص کا مرنا جو قومی لیڈر ہو قوم کا مرنا ہی اس لیے عقلاً ہر انسان کا فرض ہی کہ ایسے وقت متاثر ہو - ہم مرحوم مبرور کے لیے دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ اُنھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کے ساتھ اس جانکاہ غم میں شریک وہمدرد ہیں نیز اُن کے لیے درگاہِ ایزدی سے صبرِ جمیل کے داعی ہیں ہم اُس قومی الم کو محسوس کر کے اپنے مدرسہ کو اسوقت بند کرتے ہیں +

آپ کا نیازمند
محمد فضل الدین ہیڈ ماسٹر

عربک سکول دہلی کے جلسۂ غیر معمولی منعقدہ ۹ مئی ۱۲ء کی رُوداد

یہ جلسہ شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی (ایڈنبرا) ڈی او ایل (پنجاب) کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہی اور اُن کی قومی وعلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی رحلت کو قوم کے لیے بڑی مصیبت تصور کرتا ہی اور اُن کے پس ماندگان بالخصوص اُن کے فرزند ارجمند مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار حیدر آباد دکن سے ہمدردی ظاہر کرتا ہی اور دعا کرتا ہی کہ خداوند تعالےٰ مولانا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے اور اُن کے لائق صاحبزادے کو اپنے پدر بزرگوار کا سچا جانشین ثابت ہونے کی توفیق عطا فرمائے +

از دفتر ینگ محمڈنز ڈیبیٹنگ سوسائٹی حیدرآباد دکن مورخہ ۹ مئی ۱۲ء

اراکین "ینگ محمڈنز سوسائٹی" نہایت افسوس کے ساتھ فخر قوم حامیٔ اسلام شمس العلماء جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کے وفات حسرت آیات پر اظہار رنج و ملال کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تبارک و تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کے ساتھ نہایت خلوص سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں +

از انجمن تادیب الاسلام گورداسپور مورخہ ۸ مئی ۱۲ء

جناب کے والد بزرگوار کی وفات حسرت آیات کا احوال پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ اس بزرگ قوم نے جو خدمات قوم کی کی ہیں ان سے کوئی شخص بھی جو اپنے جسم میں ایک منصف دل رکھتا ہے انکار نہیں کر سکتا۔ اس وقت ملک کے مسلمانوں کے سر سے ایک اعلیٰ چراغ گل ہو گیا چنانچہ اظہار افسوس کے لیئے انجمن تادیب الاسلام گورداسپور کا عام جلسہ بہ صدارت شیخ نبی بخش صاحب وکیل ہوا جس میں عام مسلمانان شہر رونق افروز تھے اس میں جو رزولیوشن پاس ہوئے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ جناب کی خدمت میں عرض کی جائے کہ صبر و استقلال سے کام لیویں۔ اس وفات سے نہ صرف آپ کو رنج پہنچا ہے بلکہ تمامی مسلمانان نالاں اور نوحہ کناں ہیں۔ اس کی کاپی اسلامی اخباروں میں بھیج دی گئی +

ترجمہ رزولیوشن جلسہ تعزیت منعقدہ ۶ مئی از جانب سینٹ سٹیفنز کالج دہلی

ایک جلسہ تمامی اسٹاف اور طلباء کا منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبد الرحمن نے ایک رزولیوشن اظہار غم و الم و تعزیت کا پیش کیا اور صاحب موصوف نے حالات زندگی ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد شمس العلماء۔ ایل ایل ڈی۔ ڈی او ال اور اُن کے کیرکٹر اور ہمارے کالج کے ساتھ جو اُن کے تعلقات و ستائد تھے اُن پر ایک مفصل تقریر کی۔ پروفیسر رگھو بردیال نے رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے خاص کر ڈاکٹر مرحوم کی اُن کارروائیوں کا تذکرہ کیا جو سوشل رفارم اور قومی ترقی کی ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ پروفیسر مکرجی اور ایون جیکب (طالب العلم سکنڈ ایر) نے بھی تقریریں کیں اور اس کے بعد قائم مقام پرنسپل نے جو صدر نشین تھے چند ریمارک کیے۔ رزولیوشن میٹنگ میں پیش کیا گیا اور سب نے کھڑے ہو کر اُسے عالم سکوت اور خاموشی میں منظور کیا +

رزولیوشن جو شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل کی وفات حسرت آیات کے جلسۂ تعزیت میں بزم اُردو نے بتاریخ ۱۰ مئی پاس کیا

اوّل۔ انجمن بزم اُردو لاہور کا یہ جلسۂ عام شمس العلماء مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل۔ کی وفات حسرت آیات پر دلی افسوس اور حسرت کا اظہار کرتا ہے اور بوجہ اُن بیش قیمت علمی اور ادبی خدمات کے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم مدت العمر انجام دیتے رہے ہیں اُن کے انتقال کو ملک اور قوم کے لیئے صدمۂ عظیم تصور کرتا ہے +

دوم - کہ بزم اردو لاہور کی طرف سے اس صدمۂ روح فرسا میں مولانا مرحوم کے خلفِ اکبر مولوی بشیر الدین صاحب تعلقہ دارِ دکن اور دیگر متعلقین کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا جائے اور رزولیوشن اول کی نقل صاحبِ موصوف کے پاس اور ملک کے نامی اخباروں میں ارسال کی جائے +

رزولیوشن پاس کردۂ انجمنِ کشمیری مسلمانانِ لاہور

انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور نے نہایت رنج و اندوہ سے مولانا حافظ نذیر احمد صاحب شمس العلماء ایل ایل ڈی کے انتقال کی دردناک خبر کو سنا ہے - اور اس وفات کو ایک قومی صدمہ اور اس ماتم کو ایک قومی ماتم تصور کیا ہے اس لیئے انجمن نے ۹ مئی کی منعقدہ مینجنگ کمیٹی میں جو رزولیوشن اظہارِ افسوس کا پاس کیا ہے اس کی نقل انجمن کی ہدایت کے مطابق آپ کی خدمت میں ارسال ہے - وہو ہذا

انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کی حسرتناک وفات کو ایک قومی ماتم تصور کرتی اور اُن کی بے نظیر اسلامی خدمات کا اعتراف کرتی ہوئی دعا کرتی ہے - کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت الماویٰ میں جگہ عطا کرے اور آپ کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے +

رزولیوشن پاس کردۂ انجمنِ ہدایت الاسلام مالیگاؤں مورخہ ۱۰ مئی ۱۲ء

کمال رنج و قلق سے سنا گیا ہے کہ آنجناب کے پدرِ بزرگوار عالیجناب شمس العلماء مولانا مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی دہلوی نے - دنیائے فانی سے انتقال فرمایا ہے -

مدرسۂ انجمنِ ہدایت اسلام مالیگاؤں کی طرف سے آج کی مجلسِ تعزیت فاتحہ خوانی کے ساتھ افسوس ظاہر کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ خداوند جلیل آنجناب کو اور کل متعلقین کو صبرِ جمیل اور ثواب جزیل عطا فرما دے اور مرحوم کو جوار رحمت و باغ جنت مرحمت کرے آمین ثم آمین +

آبزرور لاہور ۸ مئی ۱۲ء

اخباروں کے اقتباس ۳ و ۴ ماہ حال کی شب درمیانی میں شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی ڈی او ایل کی وفات کی خبر جو دہلی میں واقع ہوئی ہم کمال افسوس سے درج کرتے ہیں - اس وفات سے ایک ایسا مشہور شخص صفحۂ دنیا سے گزر جاتا ہے جس کی علمی قابلیتوں پر ایک تفوق تھا تو صرف اُن ہی کی فصیح البیانی کو اور جن کی تصانیف زبانِ اردو کے لیے ایک بیش قیمت قومی متروکہ ہے جب سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا بگل پھونکا تو اُن کو حافظ نذیر احمد کے جیسا قابل نائب ملا جنھوں نے جی توڑ کر کوشش کی کہ جس تحریک کے بانی سرسید تھے وہ مقبولِ عام ہو - اپنے پیش رو کے نقشِ قدم پر چل کر مرحوم نے اپنی قوم کی معرکۃ الآرا خدمات کی ہیں - وہ نثرِ اردو میں ایک نئے طرز کے موجد تھے جس کی دل آویزی اور سادگی اور دل پر اثر ڈالنے والے طرز کی نقل کرنا اُن کے ہم عصر کے لیئے کوئی آسان کام نہ تھا - مرحوم کچھ عرصے سے گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن اُن کی موت

کا ماتم ہر جگہ ہوگا جہاں کہیں کہ اردو شرٹ پڑھی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے اور اُن کے کلام کے شیدائیوں میں اُن کی وفات کا سخت رنج والم ہوگا۔ مرحوم کی عمر ۷۰ سال کی تھی +

کامریڈ کلکتہ مطبوعہ امئی ۱۲ء

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کے اُٹھ جانے سے اردو لٹریچر کا ایک ایسا رکن رکین گزر جاتا ہے جنھوں نے اپنی بڑی دانشمندانہ جانفشانیوں سے پُرانے اور نئے سلسلہ ادب باہم میں ایک رشتہ تعلق پیدا کر دیا تھا۔ پیدا اور پرورش پائی ایسی سوسائٹی میں جن کے توقعات اور خدشات عقلی اور اخلاقی معیار سب کے سب لامحالہ پُرانے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ بڑے ہوئے تو اپنے سامنے ہی اس پولیٹکل طاقت کے آخری زوال کو بھی دیکھا اور دنیا نے جو لٹریچر۔ بالعکس خیالات اور تمدنی حالات میں دفعۃً پلٹی کھائی اُس کو بھی دیکھا ان دو متضاد حالتوں کی ٹکر سے بہت سے انقلابات واقع ہوتے ہیں۔ جو لوگ اسی لیل و نہار میں پیدا ہوئے ہوں اُن کے طرزِ ماندو بود اور عقل پر بڑا زور پڑتا ہے اور ایک بہت سخت امتحان میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں اور اُن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا لیکن جو لوگ اچھے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور جن کی قوائے عقلی وسیع اور جو راسخ الاعتقاد ہوتے ہیں وہ فوراً زمانے کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور طوفان خیز تلاطم کا خوب مقابلہ کرتے ہیں۔ دہلی جس میں پُرانی طرزِ زندگی نے نشو ونما پایا تھا وہی اُس کے کھانے کی جگہ بھی تھی یعنی ابتدا انتہا دونوں وہیں ہوئیں اور دلّی والوں نے اسے خوب نبھایا۔ سرسید کا قومی پیغام سات کروڑ مسلمانوں کے لیئے ایک امید افزا پیغام تھا جن لوگوں نے سرسید کے پیغام کو دور و نزدیک پھیلایا بڑے لوگ اور امیروں غریبوں اور کم مقدرتوں کے کانوں تک اُس صدا کو پہنچایا اُن میں نذیر احمد ہی سب کے آگے تھے۔ قدرت نے اُن کو عجیب غیر معمولی دل و دماغ دیا تھا۔ اُن کا تبحر علمی۔ ظرافت۔ وسیع قوت زباں دانی۔ سُلجھے ہوئے خیالات اور طرزِ ادا جس طرح مشہور تھے۔ اُسی طرح اُن کا طرز بیان جس میں وہ مضامین ڈھالتے تھے وہ بھی مشہور تھا اور زبان پر جو قدرتِ کاملہ اُن کو حاصل تھی اُسی کی بدولت وہ ہمیشہ عام مجالس میں سربرآوردہ رہتے تھے۔ جب کبھی اُن کو غصہ آجاتا تھا تو پھر لتاڑ کی کچھ کمی نہ تھی اور مخالفین کو اُن کے مذاق اور طنز اور چبھتے ہوئے فقروں کا ڈر ہی لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد طرزِ جدید کے صرف واعظ اور لکچرار ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک بڑے پایئے کے شاعر بھی تھے لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک بڑے پایئے کے مصنف تھے جن کی تصانیف آج اردو کی مستند کتابیں مانی جاتی ہیں جتنے اُردو خواں ہیں اُنھوں نے ایک دفعہ نہیں بارہا توبۃ النصوح۔ بنات النعش۔ مرأۃ العروس۔ رویائے صادقہ وغیرہ کو پڑھا ہوگا اور جب پڑھا ہوگا تو پسندیدگی کے علاوہ اُن کو مسرت بھی ہوئی ہوگی۔ ان کتابوں نے زبانِ اُردو میں ایک نیا طرز اختیار کیا ہے اور ہر کتاب کا مضمون اور بندش ایک نیا مضمون بتلاتی ہے اور پُرانے خیالات سے نکال کر نئی امیدوں اور کوشش کے میدان میں لاتی ہے۔ یہ کتابیں اس زمانے کے ناول نہیں ہیں کیوں کہ اُن کا مقصود خود ظاہر ہے بلکہ ان کتابوں سے اردو فسانہ نگاری کی بُنیاد پڑی ہے جو طرز افسوس ہے کہ اب تک ایک جداگانہ فن میں داخل نہیں ہوا۔ ان کتابوں کی بدولت مصنف کو نہ صرف اُردو لٹریچر میں بلکہ ہندوستانی مستورات کے دلوں میں بھی ایک بلند پایہ مستقل جگہ ملی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے گروہ مسلماناں کے لیے ایک بڑا بھاری کام کیا جو خصوصیت قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ اُردو میں کر دیا۔ ترجمے میں کچھ نقص طرزِ بیان کا ہے بعض جگہ ترجمہ اصلی برتری کلام سے گرا ہوا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ

بڑا بکار آمد کام ہوا کہ کلام الٰہی آسان زبان میں ہندوستانی مسلمانوں تک جو عربی نہیں جانتے تھے پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ کالج کے سب سے پرانے ٹرسٹی تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ابتدائی کامیابی اور تعلیم کے مفید ہونے کے لیے اُن کی بہت زیر بار احسان ہے۔ پنجاب میں اُن کا نام بہت چمک گیا تھا اور اُن کا نام بطور تبرک کے لیا جاتا تھا۔ سر سید کے بہادر گروہ کے چند باقی ماندہ اشخاص میں وہ بھی ایک تھے جن کے کان میں سر سید کا منتر پڑا ہوا تھا اور جنھوں نے اپنی ساری زندگی اپنی قوم کی خدمت گزاری میں تمام کی۔ مرحوم زمانۂ سابق اور حال کے مابین ایک بہت ذی عقل واسطہ تھے۔ اُن کی زندگی ایک نمونہ تھی۔ دنیا سے وہ ایسے وقت میں رخصت ہوئے کہ جس طرح وہ اعزازوں سے لدے ہوئے تھے اُسی طرح وہ عمر میں بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اُن کا انتقال اُردو علم ادب اور ذی علم اشخاص کے لیے ایک نقصانِ عظیم ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے گروہ بلکہ درحقیقت تمام ملک کا ایک نقصانِ عظیم ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام عمر میدانِ جد و جہد میں صرف کی اور اپنی قابلیتوں کا پورا استعمال کیا گو اُنھوں نے خود کوئی نئی بات نہ نکالی ہو لیکن اُنھوں نے سر سید کے مرکوزات میں جان تو ضرور ڈال دی۔ ہم مرحوم کے خاندان کے ساتھ دلی تعزیت کرتے ہیں۔

علالت کی خبر اخبار پیسہ ہفتہ وار مورخہ ۹ مئی سنہ ۱۹۱۲ء میں

ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب | افسوس کے ساتھ دہلی سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا مولوی ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل ڈی شمس العلماء پر ایک ہفتے سے دائیں طرف فالج گرا ہے جس سے اُن کی زبان بند ہو گئی ہے۔ حکیم شفاء الملک صاحب کا یونانی علاج اور تجربہ کار اشخاص کا ڈاکٹری علاج شروع ہے۔ خداوند تعالیٰ فضل کرے۔

مجوزہ اسلامی کالج دہلی | شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی شدید و خطرناک علالت نہ صرف اس وجہ سے ملک کے تعلیمی و لٹریری حلقوں میں رنج و تشویش کی نظر سے دیکھی جائے گی کہ مولانائے ممدوح نے ادبِ اُردو کی شاندار و لاثانی خدمت انجام دی ہے اور تعلیم کے ضروری مقصد کو آپ سے قیمتی مدد ملی ہے۔ بلکہ ایک خاص وجہ آپ کی ناسازیِ مزاج کو اس وقت جملہ ہمدردانِ قوم کے لیے عموماً اور مسلمانانِ دہلی کے لیے خصوصاً سخت رنج دہ و حسرت انگیز بنانے والی یہ ہے کہ اینگلو عربک ہائی سکول دہلی کو کالج کے درجہ تک ترقی دینے کی جو تحریک سب سے پہلے پیسہ اخبار میں شروع ہوئی تھی۔ وہ اب بفضلِ خدا بحث کی منزل سے گزر کر عملی کوشش کے میدان میں آگئی ہے۔ اور وہاں کے معزز و با اثر اصحاب مجوزہ اسلامیہ کالج کے قیام سے نئے دار السلطنت کا سر آغاز کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کو کئی سمتوں سے امداد کے وعدے ملے ہیں اور سب سے زیادہ گراں قدر عطیہ کی امید جناب مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی طرف سے بندھی ہے۔ جس کی تکمیل بظاہر مولانائے ممدوح کی صحت یابی پر منحصر ہو گی۔ لہٰذا جملہ ہمدردانِ قوم حامیانِ تعلیم کو بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہونا چاہیے کہ وہ مولانا نذیر احمد صاحب کو شفائے عاجل و صحتِ کامل عطا کرے اور مجوزہ اسلامیہ کالج دہلی کو آپ کی فیاضی سے مستفید ہونے کا موقعہ ملے۔

مرحوم کی نسبت اخبار پیسہ و زمانہ کی رائے مطبوعہ ۸ مئی سنہ ۱۲ء

مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مغفور | افسوس ہے کہ جناب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی

(اڈیٹر ا)ڈی اوابل (پنجاب) نے چھ روز تک مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۳ مئی کی رات کو اپنے وطن مالوف دہلی میں انتقال فرمایا۔ مولانا مرحوم فارسی و عربی کے ایک جلیل القدر فاضل اور زبانِ اردو کے لاثانی و زبردست ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی میں بھی اچھی مہارت اور علوم قدیمہ و جدیدہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور ابتدائے سن تمیز سے اپنا وقت ہمیشہ علوم و ابنائے جنس کی خدمت و اعانت میں صرف کرتے تھے۔ رسالہ انتخاب لاجواب ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کے پرچے میں بہ سلسلۂ مشاہیر عہد آپ کے جو حالات شائع کیے تھے بیان میں مندرج ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب مغفور نے گو قدیم دار السلطنت دہلی میں ہوش سنبھالا اور سابق دہلی کالج میں اُس زمانے کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی۔ اور اب آپ کا جسم بھی وہیں پیوند خاک ہوا۔ لیکن آپ کا آبائی وطن ضلع بجنور ہے جہاں موضع رہٹر میں آپ کی ننھیال کے کچھ لوگ اس وقت تک موجود ہیں۔ مولانا کی ولادت کا زمانہ بظن غالب ستمبر سنہ ۱۸۳۱ء ہے اور آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے مولوی نذیر احمد ابن مولوی سعادت علی ابن سید نجابت علی۔ ابن سید فیض اللہ ابن مفتی نصر اللہ ابن شیخ ابو الفضل ملقب بہ پیر فضل ابن شاہ حاتم ابن شاہ مبارک ابن شاہ ابو اسحٰق ابن شاہ عبد الغفور اعظم پوری۔ شاہ عبد الغفور کی نسبت شاہ عبد الحق صاحب نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عبد القدوس صاحب گنگوہی کے خلفاء میں سے ایک بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے اعظم پور ضلع بجنور ہی کا ایک موضع ہے۔ اور وہاں سے خاص بجنور کو آپ کے نقل مکان کرنے کی یہ وجہ ہوئی کہ قاضی عبد الغنی بجنوری نے اپنی اکلوتی بیٹی کی حضرت شاہ حاتم سے شادی کر دی تھی اور اپنے نواسے شیخ ابو الفضل کو اپنا جانشین بنا دیا تھا چونکہ شیخ ابو الفضل پیری مریدی کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ خود پیر فضل اور اُن کے بیٹے پیرزادے کہلائے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے نانا قاضی غلام شاہ بڑے آسودہ حال اور خوش گزران تھے۔ اور مولوی سعادت علی کو موضع رہٹر میں خانہ داماد بنا کر رکھا تھا۔ قاضی غلام شاہ کے بعد جائداد کے اوپر خاندان میں نزاع ہو گیا۔ اور مولوی نذیر احمد صاحب کے والد کو پھر بجنور آنا پڑا۔ اگرچہ مولانائے مغفور کے ددھیال میں سلطنت دہلی کی طرف سے بڑی بڑی معافیاں تھیں۔ مگر وہ سب سنہ ۱۸۴۳ء کے آئین نہم کی رو سے ضبط ہو گئیں۔ مولوی صاحب اپنے والد کے منجھلے بیٹے ہیں ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی اپنے والد ہی سے جو اوسط درجے کی استعداد رکھتے تھے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور جنھیں مولوی صاحب کے خاندان سے خاص اُلفت تھی۔ مولوی صاحب کو تعلیم دینے لگے۔ مولوی نصر اللہ کے بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہونے پر بھی وہ ان ہی کے ساتھ رہے مگر ابھی تعلیم پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ان کے والد نے انھیں دہلی بلا لیا۔ یہاں جن مولوی صاحب کے درس میں یہ شامل ہوئے وہ انھیں زیادہ تر گھر کے کام کاج میں لگائے رکھتے تھے اور بہت مفلسی میں گزران کرتے تھے۔ اس لیے عمر کا اتنا حصہ مفت میں ضائع ہوا۔ اور مجبوراً دہلی کے اورینٹل کالج میں داخل ہونا پڑا ان کو علوم ادب سے خاص مناسبت تھی کالج میں انھیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے پڑھنے لکھنے کی طرف خاص طور پر توجہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور سر رچرڈ ٹمپل نے گجرات (پنجاب) میں سلسلۂ تعلیم قائم کرنے کے لیے جن چھ لوگوں کو منتخب کیا تھا ان میں ایک مولانا نذیر احمد صاحب بھی تھے۔ یہاں سے ایک سو روپے کی تنخواہ پر آپ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہو کر کانپور چلے گئے۔ پھر سنہ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں آپ نے کچھ انگریزوں کو پناہ دی جس کے صلے میں آپ انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ غدر کے بعد الہ آباد میں انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کا شوق ہوا۔ اور ذاتی محنت سے خوب ترقی کی۔ اگرچہ اس وقت انگریزی کی استعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ مگر چونکہ افسروں کو ان کی جانب حسن ظن تھا اس لیے تعزیرات ہند کے ترجمے میں انھیں بھی شریک

کر دیا گیا۔ اور انھوں نے اس کام کو ایسی خوبی سے انجام دیا۔ کہ بطور انعام ایک قیمتی گھڑی حاصل کرنے کے علاوہ ڈپٹی کلکٹری کے لیے بھی
نامزد ہو گئے۔ اول تحصیلدار ہوئے۔ اور اس زمانہ میں ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کرکے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر پہنچ گئے۔ بورڈ آف ریونیو
کے حکم سے قانونِ انکم ٹیکس اور قانونِ اسٹامپ کا بھی ترجمہ کیا۔ ملازمت ہی کے زمانے سے تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔
اور اپنی اولاد کی تعلیم انھوں نے اپنی ہی تصانیف سے شروع کی متعدد کتابوں پر آپ کو گورنمنٹ سے بیش قرار انعامات ملے اور ملک
میں ان کو ایسی مقبولیت و ہردل عزیزی حاصل ہوئی جس کی مثال بہت ہی کم ملتی ہے۔ آپ کی تصنیف کردہ بڑی بڑی کتابوں
کے نام یہ ہیں (۱) تعلیم امور خانہ داری۔ مرآۃ العروس (۲) عورتوں کے لیے دلچسپ معلومات عامہ۔ بنات النعش (۳) خدا ترسی
اور اصلاحِ خاندان۔ توبۃ النصوح (۴) منطق۔ مبادی الحکمت (۵) علم ہیئت۔ سموات۔ یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں (۶) صرف عربی
مایغنیک فی الصرف (۷) نصائح۔ چند پند۔ (۸) اخلاق منتخب الحکایات (۹) صرف فارسی۔ صرف صغیر۔ (۱۰) قبائح کثرتِ ازدواج۔
محصنات (۱۱) قبائح وضعِ انگریزی ابن الوقت (۱۲) تطبیق فطرت و اسلام۔ رویائے صادقہ (۱۳) قواعد املا۔ رسم الخط (۱۴) مسلمانوں
کی تباہی کا مرثیہ۔ اتمام حجت۔ علاوہ ازیں حقوق و الفرائض اور امہات الامہ بھی آپ نے لکھی جس میں سے آخری کتاب پادری شائق
صاحب کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں تھی۔ مگر خود مولانائے مرحوم کی طرف سے اس میں بعض ایسی آرا کا اظہار کیا گیا۔ اور دیگر علما
کو وجہ شکایت و اختلاف پیدا ہوئی اور ان کی حجت و اصرار پر آخر کار مولانا مرحوم نے کتاب مذکور کی ساری جلدیں علمائے دہلی کے
حوالہ کر دیں۔ جو شاید تلف کر ڈالی گئیں۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کا بامحاورہ اردو ترجمۂ قرآن بے حد
مقبول ہوا۔ اور اس کے مختلف سائز و مختلف ہدیوں کے متعدد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ یہ احسان مولانائے مرحوم کا زبان
اردو کے علاوہ مسلمانانِ ہندوستان کی موجودہ و آئندہ نسلوں پر اتنا بڑا ہے جس کے شکریے سے وہ کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے
سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر بڑی نیک نامی حاصل کرنے کے بعد مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم سر سالار جنگ
اعظم کے آخری زمانے میں ریاست حیدرآباد بھی گئے۔ اور وہاں صدر تعلقہ داری و صوبہ داری کمشنری کے منصب تک آپ نے
ترقی پائی۔ اور آخر میں حسنِ خدمت کا پنشن قرار وظیفہ لے کر ریٹائر ہوئے۔ جو مرتے دم تک آپ کو ملتا رہا۔ زمانۂ قیام حیدرآباد
ہی میں آپ کو کلام مجید حفظ کرنے کا خیال آیا۔ اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ جس کی خاطر آپ کو ہر وقت دورے میں رہنا
پڑتا تھا صرف ایک ششماہی میں آپ نے سارا کلام مجید حفظ کر لیا۔ اور ایسا زبردست استحضار اس میں بہم پہنچا دیا کہ تقریر کے
وقت بڑے بڑے علما اظہارِ حیرت کرتے تھے۔ مولانائے مرحوم سرسید مغفور کے ابتدائی اور گہرے دوستوں میں تھے۔ جنھوں نے
آپ کو شروع ہی میں علیگڈھ کالج کا ٹرسٹی بنایا۔ اور مولانائے موصوف عمر بھر محمڈن کالج۔ محمڈن کانفرنس اور تعلیمی تحریک کے
حامی رہے۔ اور کانفرنس و انجمن حمایت اسلام لاہور کو آپ کے لکچروں سے بہت ہی قیمتی مدد ملی۔ کیونکہ مولانائے مرحوم کو تقریر پر
غضب کی قدرت حاصل تھی۔ اور آپ کے لکچر دلچسپی کا ایسا پہلو لیے ہوئے ہوتے تھے۔ کہ کانفرنس و انجمن کے پنڈال و مکان میں
تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔ آپ کے لکچروں کا ایک مجموعہ چھپا ہوا موجود ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص بھی محاسنِ مذہب
اسلام اور خوبیٔ زبان کے پہلو سے ان کا مطالعہ کرکے فائدہ اٹھائیں گے۔ لکچروں کے علاوہ مولانا صاحب علی گڈھ کالج۔ کانفرنس
و انجمن کو وقتاً فوقتاً مالی مدد بھی دیتے رہے اور مسلمان طلبا کے ساتھ پرائیویٹ طور پر بھی سلوک کرتے رہے۔ ایک بڑا وصف

مولانا نذیر احمد صاحب ہیں جس کی طرف اہل اسلام کو خصوصیت سے مائل ہونا چاہیے۔ یہ تھا کہ آپ نے کفایت شعاری سے روپیہ پس انداز کیا اور پھر تجارت وغیرہ میں لگا کر اس کو بڑھایا یہاں تک کہ وفات کے وقت لوگ آپ کو دس بارہ لاکھ روپیہ کا آدمی سمجھتے تھے۔

مولانا صاحب کی اولاد میں ایک صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب ریاست حیدر آباد دکن میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز ہیں اور ایک صاحب زادی مولوی شرف الحق صاحب دہلوی اعلےٰ افسر مال ریاست حیدر آباد سے منسوب ہوئی ہیں جن کے ایک صاحب زادے ڈاکٹر مشرف الحق صاحب ایم ایل ڈی ڈھاکہ کالج میں پروفیسر اور دوسرے مسٹر اشرف الحق صاحب بی۔اے ایم۔ڈی ریاست حیدر آباد میں میڈیکل افسر ہیں۔ مولانائے مغفور کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب علوم شرقیہ وغربیہ میں کافی دستگاہ رکھنے کے علاوہ تحریر اردو میں بھی ایک خاص مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مضامین وقتاً فوقتاً فرنٹ پیسہ اخبار اور بعض صحائف دکن میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی قوی امید بندھتی ہے کہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کی دماغی کوششوں کے گراں قدر نتائج آپ کے ہاتھوں میں بخوبی محفوظ رہیں گے اور ملک کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملیگا +

مشیر دکن روزانہ حیدر آباد دکن مطبوعہ ۵ مئی میں خبر وفات کی اشاعت

لوکل دو تین روز ہوئے مولوی بشیر الدین احمد صاحب جوڈیشل مددگار معتمد مال گزاری اپنے والد شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب پر فالج گرنے کی خبر سُن کر تین ہفتہ کی رخصت لے کر دہلی تشریف لے گئے ہیں +

کل خان بہادر مولوی شمس الحق صاحب کے پاس دلی سے شمس العلماء حافظ مولوی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے انتقال کا تار موصول ہوا مولوی صاحب ممدوح کے انتقال کی خبر تمام ملک میں نہایت رنج و افسوس کے ساتھ میں سُنی جائے گی کیونکہ آپ بڑے پایہ کے مصنف تھے۔ آپ کی کتابیں مرآۃ العروس۔ بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ اردو داں لوگوں سے آپ کا پورے طور پر تعارف کرا چکی ہیں۔ چند سال ہوئے آپ نے بامحاورہ اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کر کے اردو داں مسلمانوں پر جو احسان کیا تھا اُس کی احسان مندی مسلمانوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگی۔ غرض باعتبار علم و فضل اور بلحاظ زبان دانی آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ کوئی تیس سال سے آپ کو سرکار عالی سے وظیفہ حسن خدمت مل رہا تھا۔ سر سالار جنگ اول کے وقت میں آپ صدر تعلقہ داری اور مجلس مال گزاری کی رکنیت پر کار فرما رہ چکے تھے سر سالار جنگ اول آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ غرض بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور آپ کے اکلوتے فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب اور دیگر اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے +

۷ مئی کے البشیر میں مرحوم کے حالات

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ہم نے دلی رنج اور افسوس کے ساتھ سُنا کہ جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے پچھلے جمعہ کو بوقت شب اپنے وطن دہلی میں انتقال فرمایا +

مولانا ممدوح اس زمانے کے مشاہیر اور اکابر قوم کے طبقۂ اولیٰ میں تھے۔ ان کی وفات سے قوم کو اور اردو زبان کو سخت صدمہ پونہچا ہے۔ اگرچہ ان کی عمر اسّی برس کے قریب تھی اور اس زمانے کی عمروں کو اگر دیکھا جائے تو وہ عمر طبعی کو پونہچ چکے تھے لیکن افسوس اس

امر کا ہی کہ اُن کی وفات پر جو جگہ خالی ہوئی ہی اُس کو حاصل کرنے والا کوئی دوسرا شخص قوم میں موجود نہیں ہی۔

مولانا نذیر احمد صاحب اُن بزرگوں میں تھے جنھوں نے خاص اپنی کوشش اور قابلیت سے یہ درجہ حاصل کیا تھا اُن کا اصلی وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن اُن کی ننہال دہلی میں تھی۔ انھوں نے دہلی میں تعلیم پائی اور اپنی ننہال میں اُن کی شادی ہوئی ان کی ننہال میں دہلی کے نامور علما تھے۔ علاوہ اس کے کہ انھوں نے اپنی ننہال میں سلسلۂ نظامیہ کے درس کی تکمیل کی۔ انھوں نے عربی علم ادب فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم عربی کالج دہلی میں پائی تھی۔ اُس زمانے میں یہ کالج نہایت اعلےٰ درجے کا تھا اس کے تعلیم یافتہ عموماً نہایت لائق اور نامور گذرے ہیں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کی ملازمت سررشتۂ تعلیم ممالکِ متحدہ میں جس کا نام اُس زمانے میں ممالک مغربی وشمالی تھا شروع ہوئی۔ یہ ضلع وزیٹر تھے۔ جس کو اس زمانے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کہتے ہیں اسی زمانے میں ان کو تعزیراتِ ہند کے ترجمہ کرنے کی خدمت سپرد ہوئی منشی عظمت اللہ صاحب جو اُس زمانے میں بریلی کالج میں پروفیسر تھے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے تھے اور یہ اُس ترجمے کو فصیح اُردو میں لکھتے تھے جس زمانے میں تعزیراتِ مرتب ہوئی ہی اور جو اصطلاحات تعزیراتِ ہند میں مقرر ہوئی ہیں اُردو میں اُن کا وجود نہ تھا۔ یہ مولوی نذیر احمد صاحب کی قابلیت تھی۔ کہ انھوں نے اُردو میں قانونی اصطلاحات خود تجویز کیں اور وہ اس قدر مقبول ہوئیں کہ آج بھی اُن سے بہتر اصطلاحات تجویز نہیں ہوسکتیں۔ ایک لیکچر میں خود مولوی نذیر احمد صاحب نے بیان کیا تھا کہ تعزیراتِ ہند کے ترجمے کی صحت کا گورنمنٹ کو اس قدر خیال تھا کہ ترجمہ کو پہلے مسٹر کمپسن صاحب ایم۔ اے۔ جو اُس زمانے میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم تھے۔ اور عربی وفارسی کے عالم تھے۔ خود دیکھتے اُس کے بعد ترجمے کو سر ولیم میور صاحب لفٹنٹ گورنر جانچتے۔ سر ولیم میور بھی فارسی اور عربی زبان کے فاضل تھے۔ جب خود سر ولیم میور ترجمے کو پسند کر لیتے تو ترجمہ طبع ہوتا تھا۔

تعزیراتِ ہند کے ترجمہ کرنے کے صلے میں ان کو پہلے تحصیل داری ملی اور چند دن کے بعد ڈپٹی کلکٹری۔ پہلے یہ بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ اُس کے بعد ضلع کے ڈپٹی کلکٹری سے یہ ریاست نظام میں بلائے گئے۔ اور بندوبست کا کام ان کی سپرد ہوا وہاں پر اگرچہ بندوبست کا کام ان کے سپرد ہوا تھا لیکن جس وقت سر سالار جنگ کو میر محبوب علی خاں صاحب سابق نظام کی تعلیم کے لیے سلسلۂ درس کی اچھی کتابوں کی تلاش ہوئی تو مولوی نذیر احمد صاحب کو حضور نظام کے لیے نصاب کی کتب تصنیف کرنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ جب یہ ضلع وزیٹر تھے اُس زمانے میں انھوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے ایک کتاب حکایات کی لکھی اُس کے بعد اُردو میں ایک رسالہ منطق کا لکھا۔ جب اپنے صاحب زادے بشیر الدین احمد کی تعلیم شروع کی تو عربی صرف ونحو کی ایک کتاب لکھی۔

بندوبست کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں انھوں نے مراۃ العروس لکھی جو گورنمنٹ میں بھی مقبول ہوئی اور پبلک میں بھی۔ گورنمنٹ نے ایک ہزار جلدیں کتاب مذکور کی خریدیں۔ ایک ہزار روپیہ نقد انعام کا دیا سر ولیم میور صاحب نے ایک سونے کی گھڑی اپنے پاس سے انعام میں دی۔ اس کتاب نے نہایت مقبولیت حاصل کی ان کو اُس زمانے میں کتابوں کے خود چھاپنے اور اُن کو فروخت کرکے اُن سے نفع اُٹھانے کا خیال نہ تھا۔ لہٰذا مختلف مطابع نے اس کتاب کو بطور خود چھاپ کر فروخت کیا۔ اس امر کا اندازہ کرنا مشکل ہی کہ کتنی مرتبہ یہ کتاب طبع ہوئی اور کتنی تعداد میں فروخت ہوئی۔ لیکن اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہی کہ کم سے کم مسلمان شرفا میں کوئی گھر ایسا نہیں

جہاں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ جس زمانے میں یہ کتاب پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رواج کم تھا لیکن یہ حالت تھی کہ کتاب گھر گھر منگوائی جاتی تھی بے پڑھی مستورات یا تو خواندہ بی بیوں سے ورنہ لڑکوں سے کتاب پڑھوا کر سنتی تھیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اور سوائے مرآۃ العروس کے ہندوستان کی کسی ایسی زبان کی کتاب کو یہ قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی۔ دوسری کتاب انھوں نے بنات النعش لکھی۔ اس کتاب میں اگرچہ خاص خوبی یہ تھی کہ علمی مسائل کو عام فہم اردو زبان میں لکھا گیا تھا یہ کتاب اگرچہ مرآۃ العروس سے زیادہ مفید اور زیادہ قابلِ قدر تھی۔ لیکن بوجہ علمی مضامین ہونے کے زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ تاہم گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی انعام دیا۔

اس کے بعد انھوں نے توبۃ النصوح لکھی اس کتاب پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ اور اس نے بھی قبولیت عام کا درجہ حاصل کیا خصوصاً النصوح کا خواب جس زوردار عبارت میں لکھا گیا ہے۔ غالباً اردو نثر میں کوئی دوسری تحریر ایسا اس قدر پُرزور اور اس قدر مؤثر اب تک نہیں لکھی گئی۔ النصوح کے خواب کو خواہ جتنی مرتبہ پڑھا جائے لیکن ناممکن ہے کہ اس کو پڑھ کر انسان کا دل نہ بھر آوے اور آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہو جاویں۔ حیدرآباد کے قیام میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بالکل بند رہا۔ جو کتابیں حضور نظام کی تعلیم کی غرض سے تصنیف کی تھیں وہ بھی مصلحت سے شائع نہیں ہوئیں۔ حیدرآباد میں چونکہ پولیٹکل انقلاب ہمیشہ رہے لہٰذا وہاں کے انقلاب کی وجہ سے یہ پنشن لے کر دہلی واپس آگئے۔ وہاں سے آنے کے بعد انھوں نے ابن الوقت لکھی جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ ہندوستانیوں کے لیے انگریزی تمدن میں کس قدر دشواریاں ہیں۔ کتاب کے دیکھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ جو پلاٹ کتاب کا تجویز کیا گیا ہے۔ وہ سرسید احمد خاں کی نسبت تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مولوی نذیر احمد صاحب شروع سے محمڈن کالج کے حامی تھے۔ انھوں نے کالج کے لیے ابتدا زمانے سے مختلف مدوں میں وقتاً فوقتاً اس کتاب کے لکھے جانے سے قبل چندہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد سے جو خطوط انھوں نے اپنے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام وقتاً فوقتاً لکھے انھوں نے ایک خط میں سرسید کی بہت کچھ تعریف لکھی ہے اور سرسید کے مخالفین کی نسبت بُرے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ایک موقع پر صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ لوگوں نے سرسید کو نہیں پہچانا کہ وہ کس شان اور کس مرتبے کا شخص ہے۔ بہرحال ابن الوقت کی تصنیف کے بعد ایامیٰ فسانۂ مبتلا وغیرہ کتابیں لکھیں اور سب کی سب مقبول ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۸ء سے قبل مولوی نذیر احمد صاحب صرف تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہے تھے۔ پبلک اسٹیج پر وہ بحیثیت لکچرار یا واعظ کے کبھی نہیں آئے تھے۔ سب سے پہلے وہ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں بمقام لاہور پبلک اسٹیج پر رونق افروز ہوئے۔ باوجودے کہ پہلی مرتبہ اسٹیج پر تشریف لائے لیکن اس شان سے آئے کہ لوگ حیرت میں رہ گئے۔ عرصے تک ان کی یہ حالت رہی کہ اپنے لکچر میں اُسی وقت لوگوں کو ہنساتے تھے اور اسی وقت رُلا دیتے تھے۔ آواز قدرتی طور پر بلند تھی۔ جلسے کو اپنے قابو میں رکھتے تھے اور بڑے سے بڑے شخص پر اُن کا اثر پڑتا تھا اس کے بعد سوائے الٰہ آباد اور مدراس کے اجلاس کانفرنس کے لکھنؤ کے اجلاس سنہ ۱۹۰ء تک وہ برابر ہر ایک اجلاس کانفرنس میں شریک ہوتے رہے۔ لکھنؤ کے اجلاس میں چونکہ بعض باتیں اُن کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ظہور میں آئیں۔ لہٰذا انھوں نے اسٹیج پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔ ورنہ کانفرنس کے علاوہ وہ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے اجلاس میں اور مدرسۂ طبیہ دہلی کے سالانہ اجلاس

ئیں اور دہلی کے خاص خاص جلسوں میں وہ برابر لیکچر دیتے تھے۔ اُن کے لیکچر سُننے کے سب لوگ مشتاق رہتے تھے۔ جب وہ اسٹیج پر آتے وہ شاعر نہ تھے جس کو اُنھوں نے مختلف موقعوں پر ظاہر بھی کیا ہے حتیٰ کہ اُنھوں نے کبھی اپنا تخلص بھی نہیں رکھا اور کسی نظم میں اُنھوں نے کوئی تخلص باندھا اور شاید سب سے پہلی اُن کی نظم وہ مسدس ہے جو فسانۂ مبتلا کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع ہوا ہے لیکن علیگڈھ کے اجلاس چہارم محمڈن کانفرنس سے انھوں نے اپنا یہ طریقہ بھی اختیار کر رکھا تھا۔ کہ لیکچر سے قبل وہ ایک نظم لکھتے تھے نظم بامحاورہ اور سلیس ہوتی تھی اور اُن کے نظم پڑھنے کا انداز اس قدر اعلےٰ ہوتا تھا کہ نظم کی خوبی اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ جو شخص یہ چاہتے ہیں کہ مثل مولوی نذیر احمد صاحب کے وہ بھی اعلےٰ درجے کے لیکچرار بنیں۔ ہم صرف اُن کے نفع کے خیال سے یہ لکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ لیکچر تیار کرنے کے بعد اُس کو متواتر پڑھتے رہتے تھے کہ لیکچر تمام و کمال قریب حفظ کے اُن کو یاد ہو جاتا تھا۔ جہاں اُن کو زور دینا ہوتا یا ہاتھوں کے اشارے سے سماں ظاہر کرنا ہوتا۔ اُس موقع پر ہاتھ کا اشارہ بھی کرتے رہتے اور جب تک کہ اُن کا لیکچر ختم نہ ہو جاتا وہ برابر اُس کو پیش نظر رکھتے تھے +

ہم کو کانفرنس کے چند اجلاسوں میں اُن کے ساتھ ہم سفر ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور ہم نے خود اُن کی اس حالت کو دیکھا ہے جس شخص کی آواز مولوی نذیر احمد صاحب کے مثل بڑی ہو اور وہ اُن کی طرح لیکچر کے تیار کرنے اور اُس کو حفظ یاد کرنے کی تکلیف اور محنت گوارا کرے وہ اُن کی مثل اعلیٰ درجے کا لیکچرار ہو سکتا ہے +

مولوی نذیر احمد صاحب کی زندگی کے کاموں میں سب سے زیادہ مہتم بالشان کام جو عرصۂ دراز تک زندہ رہے گا اور جس کا اُن کو قیامت تک اجر ملتا رہے گا۔ وہ ترجمہ قرآن شریف کا ہے۔ بوجہ زبان کے تبدیل ہو جانے کے شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ پڑھنے کا رواج نہ تھا لیکن مولوی نذیر احمد صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ جس قابلیت کے ساتھ کیا وہ خاص اُن کا حصہ تھا اس ترجمہ ہونے کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور شریف مستورات میں قرآن شریف کو باترجمہ پڑھنے کا رواج بہت کچھ ہو گیا ہے اور روز بروز زیادہ بڑھتا جاتا ہے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ دہلی کے اجلاس کانفرنس سنہ ۱۸۹۱ء میں سب سے پہلے میں نے اُن کو اس نیک کام کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ بعض ایسے اشخاص نے جن کو عربی کی کچھ بھی قابلیت نہ تھی۔ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب کے ترجموں کو سامنے رکھ کر اُن کو بامحاورہ اُردو میں لکھ کر چھاپنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ کام چونکہ ناقابل ہاتھوں سے ہو رہا تھا اس وجہ سے قرآن شریف کے ترجمے کے نام سے ایسا ترجمہ ہو رہا تھا کہ جس کو ترجمۂ قرآن شریف سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس قسم کے ترجموں کو دیکھ کر مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن شریف کا انجام بھی کہیں توریت اور انجیل کے ترجموں جیسا نہ ہو لہٰذا میں نے مولوی نذیر احمد صاحب سے یہ کہا کہ خدا نے آپ کو عربی علم ادب سے مناسبت عطا کی ہے۔ عربی کی قابلیت بھی آپ کی اعلےٰ درجے کی ہے اور زبان دانی میں بھی آپ کے ہم پلہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ اس وقت اگر آپ نے ترجمہ قرآن شریف کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لیا تو غلط ترجموں کی اشاعت سے جو نقصان اسلام کو پہنچے گا اُن کے مواخذہ دار آپ ہوں گے۔ میری گفتگو پر اُنھوں نے وعدہ کیا کہ میں قرآن شریف کے ترجمہ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھوں گا۔ چنانچہ اجلاس کے بعد وہ اس نیک کام میں مصروف ہو گئے اور سنہ ۱۸۹۶ء کے اجلاس کانفرنس کے زمانے میں ترجمہ کا پہلا اڈیشن شائع ہو گیا۔ قرآن شریف کا ترجمہ جس خوبی سے اُنھوں نے کیا ہے اُس پر ریویو کرنے کی اس وقت ضرورت نہیں ہے لیکن جگہ بجگہ اُنھوں نے ترجمے میں بریکٹ کے اندر معنی لکھ کر مطلب

کو صاف اور واضح کرنے کے لیے جو عبارت لکھی ہے یا فائدہ کر کے حاشیہ پر جو نوٹ لکھے ہیں اُن میں اکثر اُن کے معتقدات کے خلاف ہیں بلکہ انھوں نے فوائد جو کچھ لکھے ہیں وہ جمہور اہل اسلام کے عقائد کے موافق لکھے ہیں۔ چونکہ میں مولوی صاحب کی خدمت میں زیادہ گستاخ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے یہ کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے آزاد خیال بزرگ نے بعض بعض جگہ اپنے معتقدات کے خلاف ترجمہ کیا ہے یا بلا ضرورت آپ نے اپنے معتقدات کے خلاف حواشی لکھے ہیں جس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے تجارتی اصول کو مدِنظر رکھا ہے جو آپ کے لیڈری اور ریفارمری کی شان میں بٹہ لگانے والا ہے یہ سُن کر انھوں نے جواب دیا کہ تم ابھی ناتجربہ کار ہو چند اخلاقی مسائل کی وجہ سے جمہور اہل اسلام کو بھڑکانا کہ وہ ترجمہ قرآن شریف کا نہ پڑھیں اور جو فائدہ ترجمے کے پڑھنے سے ہوگا اُس سے محروم رہیں سخت غلطی ہے مسلمانوں میں تمام خرابی اس کی ہے کہ وہ ترجمہ قرآن شریف کا نہیں پڑھتے اگر وہ ترجمہ پڑھنے لگیں تو خود بہ خود اُن کی اصلاح ہو سکتی ہے چند اخلاقی مسائل کو اگر وہ اُسی طرح مانتے رہیں جس طرح اب تک مانتے رہے ہیں تو اُس میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ دو سال ہوئے جب میں نے اُن سے یہ کہا تھا کہ آپ ایک ایڈیشن جدید خیال کے مسلمانوں کے معتقدات کے موافق بھی نکال دیجیے کیونکہ اب جدید خیالات کی روز بروز زیادہ اشاعت ہو رہی ہے اگر اُن کے ہاتھ میں آپ کا موجودہ ترجمہ جاوے گا تو اُن کے خیالات کی اصلاح نہ ہوگی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا خیال کروں گا۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے اس کام کو شروع کیا تھا یا نہیں مولوی نذیر احمد صاحب نے جس طرح اپنی تعلیم میں ترقی کی اس زمانے کے نوجوانوں کو اُس سے سبق حاصل کرنا چاہیے انھوں نے خود ایک لیکچر میں بیان کیا تھا کہ میں نے مسجدوں میں رہ کر اور خیرات کی روٹیاں کھا کر تعلیم پائی ہے میں نے اپنے اُستاد کا مصالحہ پیسا ہے انھوں نے جوانی میں بہ حالتِ ملازمت قرآن شریف کو حفظ یاد کیا۔ انھوں نے جوانی میں بہ حالتِ ملازمت انگریزی پڑھی۔ اُن کی انگریزی پڑھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ الٰہ آباد میں جب وہ ضلع وزیٹر تھے اُن کا اسسٹنٹ ایک ہندو انگریزی تعلیم یافتہ تھا کسی موقع پر جب کہ انسپکٹر سررشتۂ تعلیم دفتر کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُس نے مولوی صاحب سے کچھ دریافت کیا قبل اس کے کہ مولوی صاحب انسپکٹر کو جواب دیں ان کے اسسٹنٹ نے انگریزی میں جواب دیا۔ انسپکٹر صاحب اُس سے مخاطب ہو گئے۔ یہ امر ان کو نہایت ناگوار گزرا اور اسی وقت انھوں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ میری موجودگی میں تم کو گفتگو کرنے کا کیا مجاز ہے کیا تم کو اپنی انگریزی دانی کا زعم ہے۔ اب انگریزی ملازمت کرنا اُس وقت تک مجھ پر حرام ہے جب تک کہ میں انگریزی نہ پڑھ لوں اور اُسی وقت ۶ ماہ کی رخصت کی درخواست دی۔ انسپکٹر صاحب نے بہت کچھ سمجھایا کہ غلطی ہوئی۔ آپ معاف کریں لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور رخصت لے کر رات دن انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ۶ ماہ میں معمولی انگریزی بولنے اور لکھنے لگے اُس کے بعد برابر انگریزی تعلیم کی تحصیل میں مصروف رہے اور آخر عمر میں ان کی انگریزی کی قابلیت ایسی اعلیٰ درجہ کی ہو گئی تھی کہ انگریزی علمِ ادب کی مشکل سے مشکل کتاب بہ خوبی سمجھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی انگریزی تعلیم یافتہ نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کو انگریزی کس قدر آتی ہے انھوں نے جواب دیا کہ جتنی تم کو اُردو آتی ہے اُس سے زیادہ میں انگریزی جانتا ہوں عربی علمِ ادب سے ان کو خاص شوق تھا۔ علمِ ادب کے شوق کی وجہ سے انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا جس کو انھوں نے اپنے ایک لیکچر میں خود بھی بیان کیا تھا علمِ ادب کا شوق تھا کہ جس کی وجہ سے قرآن شریف کی تلاوت نہایت کثرت سے کرتے تھے قرآن شریف پر ان کو اس قدر عبور تھا کہ کوئی لفظ جو قرآن شریف کا آتا جس جس آیت میں جس جس حدیث میں اور عربی شعرا کے کلام میں جہاں کہیں وہ لفظ آتا وہ برابر قرآن شریف کی وہ آیتیں اور وہ حدیثیں جہاں وہ لفظ آتا اور

وہ اشعار پڑھنے لگتے۔ قرآن شریف کی تلاوت کا ایک خاص وقت مقرر تھا۔ قرآن شریف کی تلاوت کے بعد ان کی طبیعت میں خاص قسم کی ترقی پیدا ہو جاتی تھی اور اُس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ بعد تلاوت قرآن شریف کے ان سے جو بات کہی جاتی اُسے منظور کر لیتے تھے۔ یہ بنک اور پرامیسری نوٹوں کے سود کو ہمیشہ سے جائز سمجھتے تھے لیکن ایک مرتبہ انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ اگرچہ میں پرامیسری نوٹ کے اور بنک کے سود کو جائز سمجھتا ہوں لیکن اکثر اوقات میری طبیعت میں ایک قسم کی خلش پیدا ہوتی ہے اور اس شک میں پڑ جاتا ہوں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز اسی وجہ سے میں نے اپنا روپیہ تجارت میں زیادہ تر لگا دیا ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ سرمایہ جو تجارت میں لگایا ہے محفوظ حالت میں رہے گا یا نہیں۔ کیوں کہ جن لوگوں کو تجارت پر روپیہ دیا ہے اُن سے بے ایمانی کا اندیشہ ہے۔ یہ ابتدا ہی سے نہایت کفایت شعار تھے وضع نہایت سادہ رکھتے تھے۔ جزرسی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی حیدر آباد کی ریاست میں جہاں فیشن اور اسراف گویا لازمۂ شرافت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ جب تک حیدر آباد میں رہے وہاں بھی ان کی زندگی ہمیشہ سادہ رہی۔ قومی کاموں میں بھی یہ ہمیشہ امداد کرتے تھے۔ علی گڈھ کالج میں مختلف چندے انھوں نے دیئے اور جب سر سید کے زمانے میں غبن ہوا ہے تو سب سے پہلے انھوں نے ایک ہزار روپیہ خود دے کر اس بات کی تحریک کی کہ کالج پر بنک کا جو سترہ ہزار روپیہ ہو گیا ہے وہ خاص چندے سے ادا کر دیا جائے۔ وہ ہمیشہ اسلامیہ اسکول کی امداد بھی کرتے تھے پچھلے سال انھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ میرا ارادہ ایک کثیر رقم کو کسی نیک کام میں وقف کرنے کا ہے لیکن ابھی تک میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کس جگہ اس روپیہ کو دوں جو کام میں نے اپنے ذہن میں تجویز کیے ہیں اُن میں ایک اسلامیہ اسکول اٹاوہ بھی ہے معلوم نہیں کہ انھوں نے آخر وقت تک اس روپے کو علحدہ کر دیا تھا یا نہیں اور کسی خاص کام کے لیے اس روپے کو صرف کرنے کی بابت کوئی وصیت کر دی تھی یا نہیں ان کی تحریریں بلاغت اور ایک عالمانہ شان پائی جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد افسوس ہے کہ ہماری قوم میں اس قدر بلیغ اور عالمانہ شان کی فصیح اور بامحاورہ اُردو لکھنے والا کوئی شخص باقی نہیں رہا۔ ان کی تحریر کا خاص انداز تھا جو ان کی ذات سے مخصوص تھا اور افسوس ہے کہ جو ان کی ذات کے ساتھ ختم ہوا۔ ان کے مزاج میں ظرافت اور شوخی بھی زیادہ تھی۔ یہ رنگ ان کی تحریریں میں بھی تھا لکچروں میں بھی تھا اور زیادہ بات چیت میں بھی لیکن جب اس قسم کی شوخی علما کی شان میں یا کسی مذہبی معاملے میں ان سے ظاہر ہوتی تو لوگوں کو اعتراض کا موقع ملتا۔ بعض اوقات یہ شوخی اس قدر بڑھ جاتی کہ جو ان کی شان کے خلاف ہوتی تھی چنانچہ کلکتے کے اجلاس کانفرنس میں جو نقل انھوں نے سانڈ کی کی تھی۔ اُس کا اثر وہاں کے لوگوں پر اچھا نہ پڑا تھا چنانچہ جسٹس سید امیر علی صاحب جج اجلاس کے پریسیڈنٹ تھے۔ سانڈ کی نقل کے بعد کرسی صدارت چھوڑ کر جلسے سے چلے گئے تھے۔ لکھنؤ کے اجلاس کانفرنس ۱۹۰۴ء میں جو پھبتیاں انھوں نے اُن علما کی اُڑائی تھیں۔ جنھوں نے کانفرنس کی تکفیر کی تھی اُس سے لکھنؤ کے اُن عمائدین کو بھی رنج ہوا تھا جو کانفرنس کے ہمدرد تھے اور اسی وجہ سے نواب محسن الملک اور آنریبل صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو ان کی تردید میں تقریر کرنے کی ضرورت ہوئی اگرچہ ان کے مزاج میں دوستوں کی قدر تھی لیکن طبیعت زود رنج واقع ہوئی تھی جو اُن کی شان لیڈری کے خلاف تھی۔ اور جب کسی دوست سے ان کو رنج پہنچتا تو مشکل سے رفع ہوتا تھا۔ بہرحال چند انسانی کمزوریوں سے اگر قطع نظر کر کے ان کی اعلیٰ قابلیت ان کی قومی خدمات ان کی تصنیف و تالیف پر جس وقت نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر شخص اس نتیجے پر پہنچنے کو مجبور ہوگا کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے انتقال سے ہماری قوم سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا ہے جس کا نعم البدل

سُننے کی کوئی امید نہیں ہو زمانے کا جو رُخ ہے اور جس فہم کے آدمی زمانہ پیدا کر رہا ہے وہ ایک دوسرا رُخ ہے افسوس ہے کہ اس سے مولوی نذیر احمد صاحب جیسے برگزیدہ بزرگ پیدا نہیں ہو سکتے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے نام نامی کو زندہ رکھنے ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب کی یادگار میں اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ میں ایک کمرہ تعمیر کریں گے ہم کو خدا اس ارادے میں کامیابی عطا کرے +

وطن روزانہ ۷ مئی ۱۹۱۲ء

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر حامیانِ تعلیم کے حلقے میں خصوصاً اور جملہ مسلمانانِ عالم میں عموماً نہایت حسرت و افسوس و دلی قلق و رنج کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ آج بتاریخ ۴ مئی ۱۹۱۲ء بہ وقت صبح شمس العلما جناب مولانا مولوی ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایم او ایل نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قوم کی بدقسمتی ہے کہ اس کے سرپرست و حقیقی راہ نما یکے بعد دیگرے اس سے ہمیشہ کے واسطے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں یوں تو ایک عرصۂ دراز سے اہل اسلام پر زمانہ نازک اور وقت تنگ ہو رہا ہے مگر ان دو ماہ میں چند اور مخدوم صفت خادمانِ ملت کے بعد اب مولوی حافظ نذیر احمد صاحب جیسے بزرگ کا قوم کی راہ نمائی کرنے سے ہمیشہ کے واسطے علیحدہ ہو جانا قوم کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے ارحم الراحمین مولانا صاحب مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے ہم کو مولانا صاحب مرحوم و مغفور کے اعزہ و اقربا سے اس صدمۂ جانکاہ و واقعۂ جگر خراش میں دلی ہمدردی ہے۔ مفتظر رشید الدین احمد منیجر اسلامیہ بک ڈپو اخبار ایجنسی بازار بلی ماراں دہلی ۴ مئی ۱۹۱۲ء۔

افضل الاخبار دہلی مطبوعہ ۸ مئی ۱۹۱۲ء

۴ مئی کو شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب جو دہلی کے مشہور عالم و فاضل اور لیکچرار تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ آپ کا خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا۔ مرحوم کو ۰۰ ۷ روپے ماہوار حیدرآباد دکن سے وظیفہ ملتا تھا افسوس اب ایسے عالم و فاضل جو تبرک سمجھے جاتے ہیں دنیا میں مشکل سے پیدا ہوں گے۔ آپ نے اپنی عمر کو تالیف و تصنیف میں وقف کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ کی تصنیفات بہت ہیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری سے مشرف تھے۔ یقین ہے کہ آپ کے بڑے صاحب زادے مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر اُن کے نام کو روشن رکھیں گے۔ خداوند کریم مغفور کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے +

کرزن گزٹ دہلی مطبوعہ ۸ مئی ۱۹۱۲ء

لوکل

ہائے ڈپٹی نذیر احمد

دہلی بھر میں علم و فضل کا ایک آفتاب رہ گیا تھا وہ بھی ۳۔ ماہ حال پونے آٹھ بجے شب کے ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا یعنی شمس العلما حافظ مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی بالقابہ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی عمر اگرچہ اٹھتر سال کی تھی مگر قویٰ بہت مضبوط تھے۔ آواز میں وہی کڑاکا تھا۔ معاملات کو برابر خوش اسلوبی سے کرتے تھے علاوہ عالم و فاضل ہونے کے آپ ایک بہت بڑے بزنس مین یعنی کاروباری آدمی تھے اور لاکھوں روپے کا کام کرتے تھے۔ یہ بات عجیب ترین تھی۔ عرصے سے آپ خانہ نشین ہو گئے تھے گاڑی میں سوار ہونے سے نفرت تھی اور پیدل چلنے کا شوق تھا مگر جب چلنے میں تکلف ہونے لگا تو قطعاً بند کر دیا۔ آپ جیسے فاضل تھے اُسی قدر زندہ دل اور با مذاق تھے۔ گفتگو میں علاوہ متانت کے لطافت اور مذاقِ علم و حکمت

کے ساتھ بھرا ہوا تھا۔ اخیر میں کانوں سے اونچا سننے لگے تھے۔ اور بصارت میں بھی فرق آگیا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ تو ایک عرصۂ دراز سے تھا۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا دَور کیا کرتے تھے۔ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ وہ ایک نیک دل مسلمان تھے لیکن ملایانِ زمانہ نے اُن پر کفر کا فتویٰ اسی طرح لگا دیا تھا جیسے اور ائمہ مسلمین پر ان کے زمانے کے ملاؤں نے۔

پبلک سے مرحوم کی تصانیف کا تعارف کرانا یا لیکچروں کا ذکر کرنا یا آپ کی آتش زبانی کا نقشہ کھینچنا محض فضول ہے کیونکہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ ان سب باتوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمیں تو صرف آپ کی زندگی کا کچھ مختصر سا بیان کرنا ہے جو امید ہے کہ شوق سے پڑھا جائے گا۔

آپ وقتاً فوقتاً مریض تو برابر رہتے تھے مگر اچھے ہو جاتے تھے۔ یہ مرض جس میں آپ کا انتقال ہوا ۲۷۔ اپریل ہفتہ کے دن اور اتوار کی شب کو بارہ بجے لاحق ہوا۔ آپ پیشاب کرنے کے لیے اُٹھے کہ یکایک فالج گرا جس نے ایک ہاتھ اور ایک پیر بیکار کر دیا۔ مگر گرتے ہی اپنے اسی کڑاکے کے لہجے میں دو بار ملازم کو آواز دی تیسری آواز ایسی ڈوب گئی گویا کوئی کوئیں میں بول رہا ہے۔ گھر میں آپ کی صاحبزادی تھیں انھیں کھٹکا ہوا کہ یہ اتنی کمزور آواز کیوں نکلی۔ غرض آدمی دوڑ پڑے آپ کو اُٹھایا اور پلنگ پر لا کے لٹایا۔ زبان اسی وقت موٹی پڑ گئی تھی اور وہ اچھی طرح گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ زبان کے بند ہونے سے بہت ہی گھبراتے تھے۔ ہوش اخیر تک قریب قریب باقی رہا۔ حکیم بھی ہوا ڈاکٹر بھی آئے مگر چارۂ کار کچھ نہ ہو سکا۔ ہفتہ کے دن مبتلائے مرض ہوئے۔ اور جمعہ کے دن انتقال کر گئے۔

آپ پرانی وضع کے ایک مستقل مزاج بزرگ تھے۔ ایک سال جب اس محلے میں زیادہ طاعون پھیلا اور لوگ محلہ چھوڑ چھوڑ کے جانے لگے تو آپ کے رفقا اور رشتہ داروں نے آپ سے بھی کہا کہ چند روز کے لیے باہر چلے چلیے آپ نے انقطاعی لہجے میں جواب دیا نذیر احمد تو اس مکان سے ایک ہی بار باقی باللہ کے گورستان میں جائے گا۔ اور یہی ہوا بھی سب سے زیادہ یہ تعجب کی بات ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ نذیر احمد جب مریگا فالج سے مریگا اور کسی مرض میں اس کی موت نہیں آنے کی۔ وفات کے وقت مشرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی اور بھال پوتے موجود تھے۔ اور ایک آپ کے داماد مولوی احمد حسین صاحب۔ عورتوں میں ایک آپ کی صاحبزادی پروفیسر مسعود صاحب کی والدہ اور آپ کی نواسیاں موجود تھیں۔ آپ کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو حیدر آباد تار دیا گیا مگر وہ وقت پر نہ پہونچ سکے جو تار اُن کے پاس سے آیا اُس سے معلوم ہوا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے شب کی گاڑی میں پہونچیں گے۔ اول یہ کہا گیا کہ ان کی آمد کا انتظار کیا جائے مگر کثرتِ رائے اس طرف ہوئی کہ یہ انتظار میت کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ غسل میت اور کفن سے تو اسی وقت فارغ ہو گئے تھے۔ مجھے شب کو دس بجے اس جانکاہ سانحہ کی اطلاع ہو چکی تھی۔ خود مشرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی نے کالاں محل میں آ کے مجھے اطلاع کر دی تھی۔ میں حسب وعدہ صبح کو نو بجے کے قریب وہاں پہونچ گیا تھا تاکہ اس فاضل اجل کو اس کی دائمی منزل تک پہونچا دوں لوگ جوق جوق جمع ہونے شروع ہو گئے۔ شہر میں پوری خبر آپ کی وفات کی نہیں ہوئی تھی اور دفتر کا وقت تھا ورنہ آدمی اور بھی زیادہ ہو جاتے۔ سینکڑوں آدمی آرزو ہی میں رہ گئے۔ دس بجے کے بعد جنازہ اٹھا جنازے پر سفید چادر چڑھا دی گیا تھا۔ تعداد ساتھ والوں کی معقول تھی۔ جنازہ محلہ بانس سے ہو کے لاہوری دروازے سے شاہ باقی باللہ پہونچایا گیا۔ دھوپ بڑی شدت کی تھی۔ اخیر باقی باللہ کے پائیں میں ایک درخت کے سایہ میں رکھا گیا اور مولوی عبد السلام صاحب شیروانی شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد

اذنِ عام دیدیا گیا چند آدمی تو بیشک اذنِ عام سُن کے واپس چلے آئے باقی سب وہیں رہے اور اُس علم و فضل کے آفتاب کو دفن کر کے
اور مٹی دے کر واپس پھرے ۔

دہلی کی بدقسمتی ہے کہ قضا چُن چُن کے اُن لوگوں پر ہاتھ صاف کر رہی ہے جو اپنا ثانی ہندوستان بھر میں نہیں رکھتے۔ اب ان کا سچا جانشین
کوئی نہیں ہے۔ آپ دہلی کالج کے پرانے طلبہ میں سے تھے۔ گورنمنٹ سے اور حیدرآباد سے آپ کو بیش قرار پنشن ملا کرتی تھی۔ آپ ہمیشہ
اعلےٰ عہدوں پر ممتاز رہے مگر تالیف و تصنیف کا شوق زمانہ ملازمت میں بھی برابر جاری رکھا۔ آپ کی معاشرت اس قدر سادی تھی
کہ دیکھ کے پرانے علماء کی طرزِ زندگی کا نقشہ آنکھوں میں کھچ جاتا تھا ایک حجرے میں جو بالاخانہ پر بنا ہوا تھا آپ بیٹھے رہتے تھے جاڑوں
میں ایک روئی دار فرغل اور گرمیوں میں لٹھے یا نین سکھ کا پاجامہ کرتا ۔ نہ کسی قسم کا اثاث البیت اور نہ کسی قسم کا تکلف کچھ بھی نہیں
یہ آرائش کی چیزیں کچھ اُن ہی لوگوں کو زیبا بھی ہیں جو دنیاوی زیب و زینت کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آپ اتنے
دولت مند تھے کہ قیمتی سے قیمتی اثاث البیت اور عمدہ سے عمدہ مکان میں رہ سکتے تھے۔ مگر علمی مذاق اور تعلیم و تعلّم نے کبھی آپ کو
اس طرف نہیں رجوع ہونے دیا کچھ عرصے سے تعلیمی سلسلہ بند تھا اور نہ فارغ التحصیل طلبہ برابر آپ سے عربی ادب کی تعلیم لینے آیا کرتے
تھے اور آپ اپنا عزیز وقت بلا معاوضہ طلبہ کو تعلیم دینے میں صرف کرتے تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد موجود ہیں اور وہ شاگرد جو اس
زمانے کے جید علماء میں شمار ہوسکتے ہیں۔ آپ صاف گو اور صاف باطن تھے۔ کہنے میں لگی لپٹی مطلق نہیں رکھتے تھے۔ عربی کے
صدہا اشعار حفظ یاد تھے ادبیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس پایہ کا آدمی آج ہندوستان میں نہیں ہے۔ مجھ سے ابتدا میں قرآن
مجید کے ترجمے میں اختلاف ہوگیا مگر بعد میں باہم ایسی صفائی ہوگئی تھی اور ہم دونوں اس طرح گلے مل لیئے تھے کہ گزشتہ باتوں کو
بالکل بھلا دیا تھا۔ آپ کو کرزن گزٹ پڑھنے کا بہت شوق تھا اگر اتفاق سے کبھی نہیں پہونچتا تھا تو شکایت کہلا بھیجتے تھے
حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں ایک مرحوم ہی تھا جو کرزن گزٹ کے مضامینِ علمی کی داد دے سکتا تھا۔ میں نے شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری
لکھی مگر کوئی موزوں نام مجھے نہ مل سکا ڈپٹی صاحب سے کہا حضرت کتاب تو لکھ لی ہے مگر نام کی تلاش میں دم ناک میں ہوگیا ہے۔ اس مشکل
اڑی کو آپ ہی نکال سکتے ہیں آپ بے اختیار ہنسنے اور کہا اچھا گھبراؤ نہیں میں نام تجویز کردیتا ہوں آپ نے فوراً حیاتِ طیبہ بتایا
کہ یہ نام رکھ لو۔ میں سنتے ہی باغ باغ ہوگیا اور میں نے کہا کہ یہ لاکھوں روپے کا نام ہے اس سے بہتر نہیں ہوسکتا آپ نہ صرف تعلیم
ہی دیتے تھے بلکہ ہزاروں روپے خرچ کرکے مسلمان لڑکوں کو پڑھاتے بھی تھے چنانچہ اس کا نمونہ شیخ عبدالرحمٰن صاحب بی۔ اے بی ایل
موجود ہیں۔ قومی چندوں کی فہرستیں بھی آپکے نام سے خالی نہیں ہیں۔ آپنے حال میں مشن اسکول کے طلبہ کو پانسو روپے دیئے تھے اور
یہ بھی سنا ہے کہ دہلی کالج میں بھی ایک معقول رقم دینے کا ارادہ تھا۔ عام طور پر تو یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ جو شخص دولت مند ہے وہ
عالم نہیں ہے اور جو عالم ہے وہ دولت مند نہیں ہے مگر خداوند تعالےٰ نے مرحوم میں دونوں دولتیں جمع کردی تھیں۔ ہندو مسلمان اور عیسائی
غرض آپکے علم اور صاف گوئی کی وجہ سے برابر آپ کی عزت کرتے تھے۔ بڑے بڑے حکام کو آپ کی خاطر منظور تھی۔ سوائے ملایان
[illegible] کوئی آپ کا مخالف نہ تھا کیونکہ آپ ایک بافیض انسان تھے روپے اور علم سے ہر ایک کی خدمات کرتے رہتے تھے۔ اور اخیر
[illegible] پر قائم رہے لباس جیسا سادہ تھا کہ [illegible] ویسا ہی تھا [illegible] سے بہت رغبت تھی [illegible] جاری تھا تو
جلسوں اور دعوتوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور جب [illegible] آنا جانا بند کردیا تھا طبیعت میں بہت ہی

بھولپن تھا۔ آپ دیکھ لیتے تھے کہ فلاں شخص دل سے مجھے چاہتا ہے اس پر پورا بھروسا کر لیتے تھے اور ہزاروں روپے کے کام اس کے سپرد کردیتے تھے۔ ایک بار کسی حاکم ضلع کی طرف سے آپ کو آنریری مجسٹریٹی کی خدمت پیش ہوئی تو آپ نے جواب دیا مجھے گورنمنٹ سے اپنی خدمات کا ہمیشہ معاوضہ ملا ہے اور اب تک ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد پنشن مل رہی ہے خبر نہیں بلا معاوضہ لوگ کیونکر کام کرتے ہوں گے اس کے علاوہ یہ میرے تعلیم و تعلّم اور تالیف و تصنیف کے اوقات ہیں ایسا اعزاز نہیں چاہتا جس سے میرے ان بیش بہا کاموں میں فرق پڑے لہٰذا شکریے کے ساتھ میں اس اعزاز کو واپس کرتا ہوں آپ کی عمر تو پوری ہوگئی تھی مگر دل گوارا نہیں کرتا تھا کہ یہ فاضل ہم میں سے اتنی جلدی عالم جاودانی کا کوچ کر جائے۔ قضا و قدر کا کوئی علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ سچے سچ اپنے شہر کی بدقسمتی پر ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہیے۔ یہ لوگ نہ صرف دہلی کی بلکہ ہندوستان کی ناک تھے۔ ابھی ہم منشی ذکاء اللہ کو رو چکے تھے۔ ڈپٹی مولوی ضیاء الدین ایل ایل ڈی پر ماتم کر چکے تھے کہ یکایک قدرت نے ہم سے ایسا فاضل چھین لیا جس کے مرتبے کو عام آدمی نہیں پہچان سکتے ہو بوڑھے تھے۔ مگر اولو العزمی جوانوں کی سی رکھتے تھے۔ آواز میں اخیر دم تک کڑاکا موجود تھا تین تین گھنٹے تک بڑے کڑاکے کی آواز میں لیکچر کہا کرتے تھے مگر ذرا نہ تھکتے تھے اسی طرح دلیر بھی بہت بڑے تھے۔ حال ہی میں جسے دو تین سال کا عرصہ ہوا ایک جدید تالیف پر جب ملایانِ زمانہ بگڑے تھے تو آپ کے پاس گمنام خطوں کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ لکھا جاتا تھا کہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے اور تمھیں سر بازار پیٹا جائے گا۔ مگر آپ نے ان گمنام تخویفی تحریروں کا مطلق خیال نہ کیا اور اپنے قاعدے میں مطلق فرق نہیں آنے دیا۔ آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ نمازِ عصر کے بعد چاندنی چوک میں شمس العارفین کی دکان پر روزمرہ آکے بیٹھ جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز پڑھ کے گھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہ نشست و برخاست عرصے تک جاری رہی پھر آپ بجائے اس دکان کے سراج الدین کی دکان پر بیٹھنے لگے۔ ٹھیک وقت پر آنا اور ٹھیک وقت پر جانا۔ آندھی جائے مینہ جائے اس میں فرق نہ پڑتا تھا۔ پرانے باوضع لوگ ایسے ہی ہوتے تھے۔ مگر جب چلنے پھرنے سے عاجز آگئے۔ اور رفتار میں تکلف ہونے لگا تو آپ نے آنا جانا بالکل بند کر دیا ہمیں محمد شرف الحق صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی سے کامل امید ہے کہ اپنے پُرشان نانا کی سوانح عمری ضرور قلم بند کریں گے۔ کیونکہ آپ سے بہتر لائف اس فاضل اجل کی اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ادھر آپ کے قابل صاحب زادے محمد بشیر الدین احمد صاحب سے امید ہے کہ وہ مرحوم کی کوئی یادگار دہلی میں ضرور قائم کریں گے ہمارے خیال میں اس سے بہتر یادگار نہیں ہو سکتی کہ دہلی کالج کے قائم کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے دے دیئے جائیں جو مرحوم کے دلی منشا کے مطابق ہے۔ کوئی بت بنا کے کھڑا کرنا یا کوئی عمارت بنانا کالج کے قیام میں مدد دینے سے زیادہ مستحسن نہیں ہو سکتا۔ مرحوم اتنا روپیہ چھوڑ گئے ہیں کہ اگر اس میں سے ایک لاکھ نکل جائے گا تو ایک کونہ بھی خالی نہ ہوگا۔ خیر جو کچھ خدا کو منظور ہوگا وہ ہوگا۔ اس وقت تو ہمیں آپ کا ماتم کرنا ہے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔

آہ ایں چہ سیل بود کہ یاراز سر گزشت　　تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گزشت

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
۸ مئی ۱۹۱۲ء

افسوس مولانا نذیر احمد:- نہایت افسوس ہے کہ ۳ر مئی ۱۹۱۲ء کو شب کے آٹھ بجے شمس العلماء مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایم۔ او۔ ایل۔ کا بعارضہ فالج دہلی میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ہمیشہ [illegible] اور نہایت قابل فخر فرد قوم تھے۔ اور آپ کے انتقال سے اسلامی جماعت کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مولانا [illegible] قوم کی اور ملک کی مختلف طریقوں سے گراں قدر خدمات انجام [illegible]

آپ علی گڑھ کالج کے ابتدا ہی سے حامی اور اب سے چند سال پیشتر تک ٹرسٹی بھی تھے اور آپ کی شخصیت سے کالج کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے تھے۔ آپ اُردو زبان کے نہایت مقبول مصنف اور نثرِ اُردو میں گویا ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ چند سال سے آپ پبلک لائف سے بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے اور صرف کلام مجید کے ترجمے کے اہتمام ہی میں مصروف رہتے تھے جس کے کئی ایڈیشن پیشتر ہی شائع ہو چکے تھے۔ اور جو اُردو زبان میں کلام پاک کا بہترین ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے اور اُن کے فرزند جناب مولانا محمد بشیر الدین احمد صاحب اور دیگر اعزہ کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں +

زمیندار روزانہ لاہور
۸ مئی ۱۲ء

شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد دہلوی کا انتقال پُرملال

ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر کمال اندوہ و قلق سے پڑھی جائے گی۔ کہ ۳ مئی کی صبح کو شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی مصنف کتب متعددہ و مترجم القرآن نے طویل علالت کے بعد آخر میں بعارضہ فالج ہو کر اس دارِ فانی سے ملکِ جاودانی کو رحلت فرمائی۔ دہلی کی خاک پاک سے جو ذرّے شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ اُن میں مولوی نذیر احمد کا نام بھی خصوصیت سے ذکر کیے جانے کے قابل ہے۔ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد قریب قریب ہم سن۔ ہم رتبہ و ہم مکتب تھے۔ چاروں آفتاب مشرقِ دہلی سے اُٹھے اور نصف النہار پر اپنے علم و کمال کا جلوہ دکھا کر یکے بعد دیگرے غروب ہو گئے۔ مسلمانوں میں قحط الرجال کا یہ حال ہے کہ چرخ کمال سے جو ستارہ ایک مرتبہ ٹوٹ جاتا ہے پھر اُس کی جگہ پر نہیں ہوتی۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صرف مصنف و مؤلف ہی نہ تھے۔ بلکہ اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے تھے جس میں قوم کا درد تھا۔ اور وہ اس سے متاثر ہو کر قومی انجمنوں کو وقتاً فوقتاً معقول مالی مدد دیتے رہتے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں اُن کے لیکچر کے وقت ہجوم خلائق کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جلسے کے صحن میں تل رکھنے کو جگہ نہ ملا کرتی تھی۔ مولانا کے جسم میں جب تک جان و توانائی باقی رہی۔ انجمن کے سالانہ جلسے میں برابر تشریف لاتے رہے۔ گزشتہ چند سال سے بوجہ اضمحلال و ضعفِ پیری اُنھوں نے قومی جلسوں میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ مگر وہ لاہور میں متواتر کئی سال تک آتے رہے۔ اور اس لیے پنجاب کے علاقے میں شاید کوئی لکھا پڑھا شخص ایسا نہ ہوگا جس نے مولانا کا لیکچر نہ سنا ہو یا جو اُن کا روشناس نہ ہوا ہو۔ مولوی نذیر احمد مغفور نے ہندوستان میں زنانہ لٹریچر کی طرف سب سے پہلے توجہ کی اور معاملاتِ خانہ داری پر متعدد کتابیں لکھ کر گورنمنٹ سے انعام و خلعت اور عوام الناس سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ مولانا نذیر احمد کی طرزِ تحریر میں یہ خاص خوبی تھی کہ وہ عربی الفاظ کو اُردو میں اس عمدگی و سلیقے سے استعمال کرتے تھے کہ گویا ”کسی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے“۔ اس کے بعد اُن کو قرآن مجید کے اُردو ترجمے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کام میں انھیں اُمید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ آخر زمانۂ عمر میں اُنھوں نے الحقوق والفرائض کے عنوان سے ایک وسیع کتاب لکھی۔ مگر افسوس ہے کہ کتاب امہات الامہ کی تصنیف نے اُنھیں اکثر مسلمانوں کی نگاہوں سے گرا دیا تھا۔ خدا اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اُنھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ بخشے۔ ہمیں اس صدمۂ روح فرسا میں مولانا کے خلفِ اکبر مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار لنگسگور دکن سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا اُنھیں صبر عطا کرے۔ اور اپنے نامور والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلائے۔ تاکہ ملک و قوم کو علمی و مالی فائدہ پہنچتا رہے۔ سُنا گیا ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب مجوزہ اسلامیہ کالج دہلی کے [illegible] عطیہ دینے والے تھے کیا اب قوم کو مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے۔ نہیں رکھنی چاہیے

کیونکہ مشہور مقولہ ہے ؎ اگر پدر نتواند پسر تمام کند +

روزانہ پیسہ اخبار
۸ رمئی ۱۹۱۲ء

مولانا نذیر احمد صاحب کا انتقال پُر ملال۔ حیف احیف!! کہ علوم شرقیہ وادب اُردو کے آسمان کا ایک اور آفتاب ۳ رمئی کی شام کو شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی ایل۔ ایل۔ ڈی (اڈنبرا) ڈی۔ او۔ ایل (پنجاب) کے رحلت فرمانے سے غروب ہو گیا۔ وہ آفتاب جو اپنے چمکنے اور چمکانے کے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے نیرو منیرِ اعظم کے لقب کا پورا استحقاق رکھتا تھا اور نہ صرف اقطاع وجوانب میں قریباً نصف صدی سے بذریعہ تحریر و تقریر علم و اخلاق کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ بلکہ اپنی شعاعیں ہزار ہا میل سمندر کے پار یورپ و برطانیہ تک پہونچا رہا تھا۔ سرزمین دہلی کی قسمت بھی عجیب و غریب ہے کہ ہر ایک طرف اس نے اعلیٰ حضرت ملکِ معظم قیصر جارج پنجم کے دل عشرت منزل میں گھر کر کے اپنی قدیم سیاسی عظمت کو واپس پایا ہے۔ اور امپیریل گورنمنٹ کا صدر مقام کلکتہ سے وہاں لایا جا رہا ہے اور دوسری جانب اس کے اربابِ کمال جو اپنے اعلیٰ اوصاف ذہن و دماغ کی مدد سے ایامِ زوال میں بھی اس کو ملک کی تمدنی مجلسی اور لٹریری کوششوں کا مرکز بنائے رکھنے میں کامیاب ہوئے تھے اور اس طرح اس کی سیاسی عظمت کے بحال ہونے کی مضبوط بنیاد ڈال گئے تھے۔ ایک ایک کر کے اس سے رخصت ہو رہے ہیں اور خان بہادر شمس العلماء مولانا ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب دہلوی ایل۔ ایل۔ ڈی شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی۔ خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی اور شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ قریباً سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال کے فصل سے یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں جس کا دہلی و اہل دہلی کے علاوہ قدر دانانِ اُردو و ہمدردانِ قوم کو جتنا بھی رنج و قلق ہو کم ہے۔ مذکورۂ بالا چاروں حضرات بمعیت جناب شمس العلماء ملک الشعراء مولانا الطاف حسین صاحب حالی مدظلہم العالی (جن کو خدائے قادر و قیوم صد ہی سال تک سلامت رکھے) گویا ہندوستان میں علوم شرقیہ و زبانِ مشترکہ کی افشار پردازی کے لیے حواس خمسہ کا حکم رکھتے تھے اور بالخصوص آخر الذکر تین صاحبانے اردو زبان اور اسلامی تہذیب ہندوستان کی ایسی بیش بہا و عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں۔ جن کے شکریہ احسان سے حامیانِ اردو و مسلمانانِ ہندوستان کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے اس لحاظ سے مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی وفات ایک شدید قومی حادثہ ہے جس کا ملک کے تعلیمی و ادبی حلقوں میں عموماً اور اسلامی ہند میں خصوصاً بہت سخت ماتم کیا جائے گا +

مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مغفور کے حالات سے جو آج کے پرچے میں کسی دوسری جگہ اُن کی تصویر سمیت شائع کیے جاتے ہیں ظاہر ہوگا کہ نہ صرف مولانائے مغفور نے اپنی دماغی محنت کے شاندار و گراں قدر نتائج سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچایا اور اردو لٹریچر کے ذخیرے میں جو ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے نہایت مختصر ہے ایک مستقل و مفید اضافہ کیا۔ بلکہ اُن کی ساری زندگی اہل ملک کے لیے سبق آموز بھی اور سیلف ہلپ و کفایت شعاری سے اعلیٰ مدارج پر پہونچنے اور دولت مند بننے کی ایک ایسی شاندار و موثر مثال انھوں نے دکھائی جس پر تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے اور ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص خود مولانائے مرحوم کی مدد سے اس پر کاربند ہو کر بہت بڑا فائدہ اُٹھا چکے ہیں +

ابتدائی عمر ہی میں مولانا صاحب کی روشن خیالی و عاقبت اندیشی کا زبردست ثبوت اس سے ملتا ہے کہ پیرزادوں اور مولویوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھنے اور ریگولیشن ۱۸۳ء کے ماتحت اپنی ددھیال کی بہت بڑی جاگیر کے ضبط ہو جانے کا صدمہ اُٹھانے

کے باوجود فتنۂ ۱۸۵۷ء کے نازک موقعے پر ان کا پائے ثبوت جادۂ صدق و وفا سے نہ ڈگمگایا اور نہ صرف انھوں نے سپاہیوں
کی شورش میں حصہ لینے سے خود کو الگ رکھا بلکہ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک انگریزی خاتون کو ہلاکت
سے بچایا اور مہینوں انھیں اپنے گھر میں پناہ دے کر بعد میں بحفاظت تمام برٹش کیمپ میں پہونچایا جس پر منجانب گورنمنٹ
خوشنودی کا اظہار ہوا۔ اور ان کو تمغہ و انعام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی طرح اپنی مصلحت اندیشی و اخلاقی جرأت سے انھوں نے
ایسے وقت میں سرسید مغفور کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کا ساتھ دیا جب ہر طرف سے تکفیر کی آوازیں ان کے حق میں بلند ہو رہی تھیں
اور ان کے مؤیدین کو وراثت و دیگر سوشل حقوق سے محروم کیا جا رہا تھا۔ مگر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم نے اس مخالفت کی پروا نہ کی
اور علی گڈھ کالج و محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بہ حیثیت ایک ٹرسٹی کے برابر قلمے۔ قدمے۔ دامے۔ درمے مدد دیتے رہے اور
اس امداد میں انھوں نے گورنمنٹ کی خوشنودی یا دوستوں کی رضامندی کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ بلکہ جب صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ
نے علی گڈھ کالج میں تعلیم عربی کی سکیم شروع کرنے سے بعض اصحاب کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت
کو ضعف پہونچے گا۔ تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے خود السنۂ شرقیہ کے ایک جلیل القدر فاضل ہونے کے باوجود اس سرکاری
تجویز کی بہت زور سے مخالفت کی اور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ناراضی اٹھائی۔ اسی طرح جب بعض علمائے فرنگی محل نے
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گزشتہ اجلاس لکھنؤ کو صدمہ پہونچانے کی کوشش کی اور لوگوں کو اس سے باز رہنے کی ترغیب دی
تو مولانائے مرحوم آگ بگولہ ہو گئے اور اپنے لیکچر میں ان عالموں کی خبر لیتے ہوئے انھوں نے متانت و اعتدال کی ضروری حدود کو
بھی ملحوظ نہ رکھا جس پر نواب محسن الملک مرحوم کو کانفرنس کے جلسے میں اظہار افسوس کرنا پڑا +

مولانا نذیر احمد صاحب کو مبدء فیاض سے عقل سلیم و فہم مستقیم کے علاوہ غیر معمولی جودت ذہن عطا ہوئی تھی اور ان کی قوت استحضار
بہت کچھ بڑھی ہوئی تھی چنانچہ غدر کے بعد جب انھیں انگریزی دانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے زیادہ تر سیلف سٹڈی
سے اپنی استعداد بہت کچھ بڑھا لی اور ریاست حیدرآباد کی ملازمت کے دوران میں کلام مجید حفظ کرنے کا خیال آیا۔ تو بحیثیت افسر
مال مسلسل دورے کی زحمت اٹھانے کے ساتھ چھ مہینے میں کلام مجید حفظ کر لیا اور اس کے مضامین پر ایسا قابو حاصل کیا کہ دوران
گفتگو میں وہ ایک ہی مطلب کی مختلف آیات فی الفور سنا دیتے تھے اور ان کی تشریح و تفصیل میں بیسیوں حدیثیں پڑھ دیتے
تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیکچروں میں پرانے علماء کے وعظ اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کی اسپیچ کا ملا جلا لطف آتا تھا اور مولانائے
مرحوم کے پرمذاق چلتے ہوئے فقرے ان میں ایسی غضب کی دلچسپی پیدا کر دیتے تھے کہ کانفرنس یا انجمن کے پنڈال میں آپ کے
لیکچر کے وقت تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی اور اتنا بڑا مجمع گویا آپ کے دلاویز بیان کا مسحور نظر آتا تھا۔ مولانائے مرحوم کی اس
سحر بیانی سے محمڈن کانفرنس، [illegible] اور خاص کر انجمن حمایت الاسلام لاہور کو اپنی بنیاد لوگوں کے دلوں میں مستحکم کرنے
کے متعلق بڑی تقویت [illegible] انجمن اور اہل پنجاب کبھی [illegible] نہیں ہو سکتے !

علاوہ ازیں مولانائے مغفور کی [illegible] اردو کے لیے انھوں نے ایک بے بہا
و قابل رشک [illegible] بہم پہونچایا ہے جس کو [illegible] کی کوشش کرتی ہیں چنانچہ مرآۃ العروس
و توبۃ النصوح کا انگریزی فرانسیسی [illegible] ان کتابوں کو اپنے نصاب

ہیں رکھا ہے مگر ان سب سے بڑھ کر اور ان کی دماغی کوششوں کا گل سرسبد مولانا کا بامحاورہ اردو ترجمۂ قرآن مجید ہے جس کا صلہ بارگاہ ایزدی ہی سے مولانا کو مل سکتا ہے اور مسلمان کسی طرح اس کا حق شکریہ ادا نہیں کر سکتے +

مخبر دکن مدراس ۸ مئی ۱۲ء

افسوس ناک وفات: ـ ہم نہایت رنج و قلق کے ساتھ یہ خبر درج کرتے ہیں کہ شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں بہادر ایل۔ ایل۔ ڈی۔ سابق صدر تعلقہ دار از علاقہ سرکار عالی نے دہلی میں بعارضۂ فالج انتقال فرمایا۔ مولانا مرحوم ان معدودے بزرگوں میں تھے جنھیں قوم کا عطر مجموعہ کہا جاتا تھا۔ حدیث و تفسیر و فقہ میں توغل رکھنے کے علاوہ آپ عربی زبان کے بہت اچھے ادیب اور اردو میں طرز جدید کے زبردست انشاء پرداز تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخلاق و ادب میں آپ ہندوستان کے معنوی استاد تھے۔ نہایت افسوس ہے کہ سرسید کی انجمن کے روشن چراغ یکے بعد دیگرے بجھ رہے ہیں اور ان کے جانشینوں کی روشنی نظر نہیں آتی۔ اس ہمدرد قوم اور جان نثار اسلام کی وفات مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ کی سچی مصداق ہے۔ خداوند کریم مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے اکیلے صاحب زادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب انڈر سکرٹری معتمد مال گزاری سرکار عالی و متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے +

وطن روزانہ ۱۱ مئی ۱۲ء

انتقال: ـ پر ملال شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی پر اظہار افسوس کے لیے ۸ مئی ۱۲ء کو جامع مسجد گورداسپور میں بعد ادائے نماز مغرب انجمن تادیب الاسلام گورداسپور کا عام جلسہ بصدارت واجب التعظیم بزرگ شیخ نبی بخش صاحب وکیل چیف کورٹ ہوا جس میں صاحب صدر جلسہ اور منشی حسین بخش صاحب کسمل بٹالوی نے مناسب موقع تقریریں کیں۔ اخیر میں منشی محمد رشید صاحب سکرٹیری انجمن تادیب الاسلام نے تحریک کی کہ ایک ہمدردی کی چٹھی پس ماندگان مولوی صاحب کو برائے صبر جمیل لکھی جائے +

تہذیب نسواں لاہور ۱۱ مئی ۱۲ء

یہ خبر بے انتہا رنج و قلق اور اندوہ و غم کے ساتھ سنی جائے گی۔ کہ شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد خاں۔ ایل۔ ایل۔ ڈی نے عارضۂ فالج سے ۳ مئی ۱۲ء کو بوقت مغرب دہلی میں انتقال فرمایا

انا للہ و انا الیہ راجعون +

مولانا مرحوم کیا بلحاظ رئیس شہر ہونے کے کیا بہ لحاظ معزز عہدے دار سرکاری ہونے کے اور کیا بہ لحاظ مشہور و نامور مصنف ہونے کے۔ تمام ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی شہرت و عزت رکھتے تھے۔ مگر زمرۂ مصنفین میں تو وہ سچ مچ آفتاب علم بن کر چمک رہے تھے مولانا مرحوم کے انتقال سے علمی ہندوستان اپنا ایک گوہر نایاب کھو بیٹھا ہے۔ مولانا کی قابلیت اور جامعیت کا سا فاضل تمام ہندوستان میں ایک نظر نہیں آتا۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے علوم کے لیے یہ بے انتہا عظیم نقصان ہے۔ ہمیں اس حادثۂ جانکاہ اور سانحۂ جانگزا پر اپنے معزز دوست مولوی بشیر الدین احمد صاحب معتمد مال گزاری حیدر آباد دکن کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور ہم بخوبی احساس کرتے ہیں کہ ایسے قابل۔ ایسے نامور۔ اور ایسے جلیل القدر باپ کی موت نے کیسا پہاڑ غم کا ان کے دل پر گرایا ہے۔ ہماری دعا ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ مولانا مرحوم و مغفور کو اپنی جوار رحمت میں مدارج عالیہ عطا فرمائے۔ اور ان کے جملہ عزیزوں کو اس صدمۂ عظیم کے برداشت کی طاقت بخشے۔ ہم عاجز گنہگار اس دعا کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں +

راقم آثم ممتاز علی

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء

مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم: گزشتہ ہفتے میں ہم شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی افسوس ناک وفات کی خبر لکھ چکے ہیں۔ چوں کہ اُن کی زندگی کئی پہلو سے نہایت پُر سبق تھی۔ اس لیے اپنے ناظرین کی اطلاع کے لیے ہم مختصراً اس کے متعلق بعض واقعات درج کرتے ہیں۔

مرحوم کا آبائی وطن ضلع بجنور (صوبجات متحدہ) تھا۔ آپ کی پیدائش تقریباً ۱۸۳۱ء میں ہوئی تھی۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا جن کے وہ منجھلے بیٹے تھے۔ جب اُن کے خاندان کی معافی جو سلطنت دہلی کی جانب سے چلی آتی تھی کسی وجہ سے ضبط ہو گئی تو اُن کے والدین دہلی چلے گئے جہاں مولانا کی ننہال تھی۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ خود آپ کے والد مرحوم نے شروع کر دیا تھا جو اُس کے بعد غیر منضبط طریقے سے جاری رہا۔ مگر جب وہ دہلی چلے آئے تو اُن کی باقاعدہ تعلیم اورینٹل کالج (حال عربک اسکول) دہلی میں شروع ہوئی۔ چوں کہ اُن کے سرپرست کچھ ایسے ذی استطاعت لوگ نہ تھے۔ اس لیے مرحوم کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کالج سے وظیفہ ملتا تھا جس کی مقدار بہت ہی قلیل تھی۔ اس طرح مولانا نے تعلیم نہایت مصیبت اور جفاکشی کے ساتھ حاصل کی تھی۔ ان واقعات کو مولانا نے اپنے متعدد لیکچروں میں نہایت فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں ایک معقول عہدہ مل گیا۔ پھر وہاں سے ممالکِ مغربی و شمالی (حال صوبۂ آگرہ) کے سررشتۂ تعلیم میں آپ کی خدمات منتقل ہو گئیں اور یہاں کانپور میں ضلع و ڈپٹی انسپکٹر (حال ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مقرر ہوئے۔ اسی عرصے میں غدر کا ہولناک ہنگامہ پیش آیا۔ اس زمانے میں آپ نے سرکاری جو خدمات انجام دیں اُن کے صلہ میں آپ کو انعام کے علاوہ انسپکٹری مدارس پر ترقی دی گئی۔ یہ بات غالباً چند ہی لوگوں کو معلوم ہو گی کہ اس وقت [illegible] جو تعزیرات ہند مروج ہے اُس کے ترجمے کی خوبی مولانا ہی کی قابلیت کی رہینِ منت ہے۔ اس کے علاوہ ضابطۂ فوجداری اور قانون [illegible] کے ترجموں میں بھی آپ سے مدد لی گئی تھی۔ ان خدمات کے صلے میں آپ کو تحصیلداری۔ پھر ڈپٹی کلکٹری بندوبست اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹری ضلع کے درجے تک ترقی دی گئی۔ یہاں سے آپ کی خدمات ریاست حیدرآباد دکن کو منتقل ہو گئیں۔ جہاں آپ بندوبست کے کام پر متعین ہوئے۔ لیکن جب سر سالار جنگ اعظم مرحوم کو حضور نظام خلد مقام کی تعلیم کے لیے ایک خاص سلسلۂ درس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی تالیف و ترتیب کا کام مولانا ہی کے سپرد ہوا۔ آپ کی متعدد دیگر تصانیف کا سلسلہ بھی اسی طرح شروع ہوا کہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ابتدائی کتابیں خود مرتب کر کے اُن کو پڑھائیں۔ اُن کی تصانیف میں سے حسبِ ذیل کتابیں بہت مشہور و مقبول ہیں:

(۱) مرأۃ العروس جس میں امورِ خانہ داری کی تعلیم کی گئی ہے۔ یہ کتاب آپ نے خاص کر اپنی صاحبزادی کی تعلیم کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب کی کئی صوبوں کی گورنمنٹوں نے نہایت قدر کی۔ ممالکِ مغربی و شمالی کی گورنمنٹ نے اس کی ایک [illegible] خریدیں اور ایک ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمایا اور اس زمانے کے لفٹنٹ گورنر [illegible] نے [illegible] کی گھڑی عطا کی تھی۔

(۲) بنات النعش۔ کی تصنیف کی بھی یہی غرض تھی۔ اس کتاب میں [illegible] کو نہایت سلیس عبارت میں اور عام فہم طریقے سے سمجھایا ہے۔ (۳) توبۃ النصوح۔ اس کتاب [illegible] کی اصلاح اور [illegible] پرستی کی [illegible] مقصود تھی۔

(۴) مبادی الحکمت علمِ منطق کے ابتدائی اصول۔ (۵) [illegible] (۶) [illegible] ۔ [illegible] خطوط جو اپنے [illegible] صاحب [illegible] کے زمانے میں لکھے (۷) منتخب الحکایات

بچوں کے لیے دلچسپ حکایات (۸) صرف صغیر صرف فارسی (۹) محصنات - قبائح کثرت ازدواج - (۱۰) ابن الوقت - ہندوستانیوں کے لیے یورپین طرز معاشرت اختیار کرنے کے بد نتائج (۱۱) رویائے صادقہ - تطبیق فطرت و اسلام (۱۲) فسانہ مبتلا (۱۳) الحقوق والفرائض - ۱۸۹۵ء سے آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ شروع کیا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا - اس کے بعد سے آپ کی توجہ برابر اس کار خیر کی جانب مائل رہی - یہ ترجمہ نہایت مقبول ہوا اور مختلف شکلوں میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہوتے رہے ہیں - آپ کو تعلیم سے خاص دلچسپی تھی - اور مدت العمر تعلم و تعلیم کا سلسلہ جاری رہا - باقاعدہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کے زمانے میں آپ نے کلام اللہ کے حفظ کرنے کا ارادہ کیا اور چھ ماہ میں پورا قرآن اعلیٰ درجے کے استحضار کے ساتھ یاد کر لیا - یہی طرح انگریزی کی جانب توجہ کی - اور اس میں یہاں تک دستگاہ بہم پہونچائی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی لٹریچر میں مستعد سے مستعد گریجوایٹ سے بھی پالا لینے کے لیے تیار ہوں - علمی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ سے "شمس العلما" - کا خطاب اور ولایت سے "ایل ایل ڈی" کی ڈگری حاصل ہوئی تھی سر سید کے نہایت گہرے دوست تھے - اور علی گڈھ کالج کے ابتدا ہی سے حامی رہے تھے اور بہت قریب زمانے تک اُس کے ٹرسٹی بھی تھے - علی گڈھ کالج کے علاوہ دیگر قومی درسگاہوں کی بھی آپ بالواسطہ اور بلا واسطہ امداد کیا کرتے تھے - اور پرائیویٹ طور پر بھی طلبہ کے وظائف جاری کر رکھے تھے ۱۹۰۱ء تک کانفرنس کا کوئی اجلاس بمشکل ایسا ہوگا جس میں آپ شریک نہ ہوئے ہوں - تقاریر ایسے تھے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں حاضرین کی طبیعتوں کو گویا بالکل مٹھی میں کر لیتے تھے - اگرچہ شاعری کا دعویٰ نہیں کرتے تھے اور زیادہ شعر کہتے بھی نہ تھے - مگر جو کچھ اور جب کبھی کہتے تھے اچھا کہتے تھے آخر میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ لکچر سے پہلے کوئی نظم ضرور ہوتی تھی - اور اس طریقے کی وجہ یہ بیان کیا کرتے تھے کہ نظم سے طبیعت کھل جاتی ہے - اول لکچر لکھ کر اُس کو یاد کر لیا کرتے تھے - آپ کی تحریر و تقریر میں ایک خاص قسم کی شوخی تھی جو افسوس ہے کہ بعض اوقات حد سے متجاوز ہو کر ناگوار نتائج پیدا کر دیتی تھی اپنی عادات و روش میں آپ شروع ہی سے نہایت سادہ اور بے تکلف تھے - کفایت شعار بھی اعلیٰ درجے کے تھے - اور یہی وجہ تھی کہ باوجود اس کے کہ آپ کی ملازمتیں بہت زیادہ بڑی نہ تھیں - لیکن اُن ہی کے پس انداز سے آپ نے اس قدر سرمایہ اندوختہ کر لیا کہ خانہ نشینی کے بعد تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور اس وقت آپ کا شمار لکھ پتیوں میں ہوتا تھا - آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کی مغفرت کرے - اور قوم کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے - آمین +

مسلم گزٹ لکھنؤ ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء	شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم :- گزشتہ پرچہ جس وقت زیر طبع تھا ہمیں دہلی سے مولوی صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر موصول ہوئی - جسے خبر کے طور پر ہم نے درج اخبار بھی کر دیا تھا - یہاں پر ہم مختصراً اُن کی لائف

درج اخبار کرتے ہیں +

مولانا کی عمر اس وقت غالباً (۸۰) سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور کہیں آنے جانے سے معذور تھے - چنانچہ ایک عرصے سے لکچر و سپیچ کا سلسلہ بہت دنوں تک مولانا کا دلچسپ مشغلہ تھا چھوٹ گیا تھا - پھر بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جیسا کہ مختلف لوگوں کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی جاری تھا +

مولانا کی لٹریری قابلیت ہندوستان کیا دور دور مسلم تھی اور اسی کے صلے میں انھیں ایڈنبرا اور پنجاب دو یونیورسٹیوں سے "ڈاکٹری" کے خطاب مل چکے تھے - مولانا نے جس طرح ایک معمولی حالت سے ترقی کر کے اس زینے تک رفتہ رفتہ اپنے کو پہونچایا وہ آجکل کے طلبا کے لیے

بہت زیادہ سبق آموز ہے +

مولانا کا وطنِ آبائی ضلع بجنور تھا۔ جہاں آپکے بزرگوں کو سلاطینِ مغلیہ کی طرف سے کچھ معافی بھی ملی ہوئی تھی سنہ ۱۲۳۰ ہ میں یہ معافی معرض ضبطی میں آگئی اور مجبوراً آپکے والد ماجد مولوی سعادت علی کو تلاشِ روزگار میں دہلی آنا پڑا +

مولانا نے ابتدائی تعلیم کچھ تو اپنے والد سے حاصل کی اور کچھ مولوی نصر اللہ صاحب سے جو بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور مولانا کے خاندان سے خاص الفت رکھتے تھے۔ بالآخر مولانا مستقل طور پر دہلی گئے اور دہلی کالج میں داخل ہوگئے وہاں سے تکمیلِ تعلیم کے بعد سر جارڈ ٹیل نے آپ کو ایک سو روپیہ ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کرکے گجرات میں مقرر کیا +

سنہ ۵۷ء کے غدر کے بعد سرکاری خیرخواہی کے صلے میں انعامات کے علاوہ آپ انسپکٹر مدارس کرکے الہ آباد بھیجے گئے۔ اس وقت آپنے کوشش کرکے تھوڑی بہت انگریزی میں بھی استعداد حاصل کرلی۔ مگر مولانا کی اصلی قابلیت کے جوہر اُس وقت ظاہر ہونا شروع ہوئے جب آپکے سپرد تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری کا کام کیا گیا۔ جن لوگوں نے انگریزی اصل اور اُس کے ترجمے کو بالمقابل رکھ کر غور کیا ہوگا وہ بخوبی اس کا اندازہ کرسکیں گے کہ مولانا کی علمی قابلیت اُسی زمانے میں کس پائے تک پہونچی ہوئی تھی +

اس خدمت کے صلے میں علاوہ انعام کے آپ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور کیے گئے اور اُس وقت سے اب تک مختلف عنوانوں پر آپ کی کتابیں نکل چکی ہیں جن میں سے بعض بعض بہت ہی زیادہ مقبول ہوئیں +

مولانا کی تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:- (۱) مراۃ العروس (۲) بنات النعش (۳) توبۃ النصوح (۴) محصنات (۵) ابن الوقت (۶) رویائے صادقہ (۷) الحقوق والفرائض (۸) اجتہاد (۹) امہات الامہ۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل کتابیں بھی مولانا کی تصنیف سے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف علوم پر مولانا نے لکھی ہیں۔ (۱) منطق میں مبادی الحکمت (۲) ہیئت میں سماوات جو انگریزی کتاب "دی ہیونز" کا ترجمہ ہے اور ابھی چھپی نہیں ہے (۳) قواعد میں۔ مالابد منہ فی الصرف، اور صرفِ صغیر (۴) اخلاق میں موعظۂ حسنہ منتخب الحکایات اور چند پند (۵) قواعدِ املا میں رسم الخط +

علاوہ ان کتابوں کے مولانا کی اسپیچیں اور نظمیں جو مختلف اوقات میں ایجوکیشنل کانفرنس حمایتِ اسلام یا دوسرے جلسوں کے موقعوں پر پڑھی گئی ہیں۔ بطورِ خود ایک جداگانہ سیریز ہیں جن سے مولانا کے ہر زمانے کے خیالات بخوبی ظاہر ہو سکتے ہیں +

مولانا کی جن (۹) تصنیفات کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے یہ کم و بیش اُسی ترتیب میں واقع ہیں جیسے وہ یہاں درج ہیں۔ ان کتابوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و اصلاح کا خیال جو شروع میں اُمورِ خانہ داری کے متعلق مولانا کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی رنگ اختیار کرتا گیا اور بالآخر مذہبی تحقیقات میں غلو کے باعث اُن میں وہ استغنا اور خود اعتمادی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی جو کمالِ فن کا نتیجہ ہوتی ہے +

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجتہاد تک لوگوں نے مولانا کی تصنیفات کو قریباً یکساں قدر کی نظر سے دیکھا البتہ امہات الامہ جو مولانا کی آخری شدہ تصنیف میں غالباً سب سے آخر کتاب تھی ملک میں ایک ہلچل ڈال دینے والی تھی اور جس حالت میں مولانا نے جس خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ اس کی تمام مطبوعہ جلدیں تلف کر ڈالنے کے لیے علمائے دہلی کے سپرد کردیں وہ بے شک قابلِ ستائش ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ تمام عمر کی کفایت شعاری کے باعث نقصان اٹھانے کے عادی نہ ہونے کے علاوہ

مولانا کو اس کا بھی یقین تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا تھا ذہ ہبا رہا اور تاریخاً صحیح ہے +

مذہبی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ہم مولانا کے ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو بہت زیادہ ہندوستان میں مقبول ہو چکا ہے۔ اگرچہ قرآن پاک کے ترجمے اس سے تقریباً ایک صدی پہلے زبانِ اُردو میں ہو چکے تھے مگر وہ ترجمے ایسی بامحاورہ اور ٹھیٹھ زبان میں نہ تھے اور نہ اس قدر عام فہم تھے جیسا مولانا نے اُسے بنانے کی کوشش کی۔ مولانا کی تمام تصنیفات کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہوئے ہم کو ہرگز اس کے اقرار کرنے میں تامل نہیں ہے کہ "مولانا کے احسانات زبانِ اُردو پر ایسے ہیں جن سے ہماری موجودہ اور آیندہ نسلیں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتیں +

مولانا کی پبلک لائف سے قطع نظر کر کے اُن کی پرائیویٹ زندگی کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے۔ یوں تو مولانا کے دیکھنے اور جاننے والے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں گے جن سے اُن کی روزمرہ کی زندگی کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر خود اُن کے خطوط جو اُنھوں نے اپنے صاحبزادے کے نام لکھے ہیں اور جو ایک مجموعے کی صورت میں "مواعظِ حسنہ" کے نام سے طبع ہوئے ہیں بہت زیادہ اُن کی زندگی کے اُس پہلو کو روشن کرتے ہیں جس میں اُن کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے محنت و جفاکشی۔ کفایت شعاری اور وقت کی قدر۔ استقلال اور ہمت یہ تمام عمدہ اوصاف مولانا میں موجود تھے +

ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد مولانا نے کچھ دنوں سر سالار جنگ اعظم کے زمانے میں ریاست حیدر آباد کی ملازمت کی جہاں اُن کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد اب بھی ایک عہدے پر ممتاز ہیں۔ حیدر آباد سے واپسی کے بعد کچھ دنوں پبلک کی خدمت کرتے رہے اور ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت الاسلام کو خصوصاً اپنے بیش بہا لکچروں سے وقتاً فوقتاً فائدہ پہونچاتے رہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ کانفرنس کے موقعے پر نواب محسن الملک مرحوم سے کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث ایک عرصے تک وہ علی گڈھ کالج سے ناخوش رہے جس کے ساتھ اُن کا تعلق ابتدائی قیام سے اب تک بہت مربیانہ رہا تھا +

سنہ ۱۹۰۵ء کے اسٹریکلب کے موقعے پر مولانا سب سے آخر مرتبہ کالج میں تشریف لائے تھے۔ گزشتہ کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہونے کے سبب امید کی جاتی تھی کہ شاید مولانا پھر ایک مرتبہ اُس میں شریک ہو کر اپنی فصاحت سے حاضرین کو محظوظ کریں گے۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ علی گڈھ کالج اور اُس کے متعلقات سے بالکل قطعِ تعلق کر چکے تھے +

اب ہم کو حسبِ ذیل چند الفاظ اُن کی خصوصیات کے متعلق لکھنے باقی رہے ہیں (۱) اُن کو لکچر دینے میں خاص ملکہ تھا۔ اگرچہ اُن کا لکچر ایک مرکز پر قائم نہ رہتا تھا تاہم اُس کے تمام حصے دل چسپ اور ظرافت آمیز ہوتے تھے اور باوجود اس کے کہ اُس میں عربی اور انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی سامعین کی توجہ اس کی طرف سے نہیں ہٹتی تھی۔ وہ پوری توجہ اور شوق سے اُس کو آخر تک سُنتے رہتے تھے جب یہ بات مشتہر ہوتی تھی کہ فلاں وقت اُن کا لکچر ہو گا تو وقت سے پہلے مقام لکچر میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ تِل دھرنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ اُن کا لکچر اُن کی زبان سے سُننے میں خاص لُطف آتا تھا۔ مگر مطبوعہ لکچر کو پڑھنے میں وہ لطف نہیں آتا تھا۔ (۲) قرآن شریف کا ترجمہ جب اُنھوں نے شروع کیا تو احتیاطاً چند مولوی ملازم رکھے جو مختلف تفسیریں نظر کے سامنے رکھتے تھے۔ جب مولانا کسی آیت کا ترجمہ لکھواتے تھے تو یہ مولوی تفسیروں سے اُس ترجمے کی مطابقت کرتے تھے۔ اور ترجمے کی دُرستی اور نادرستی پر بحث کرتے تھے۔ غرض کہ اس احتیاط اور غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد ترجمہ تیار ہوا

مگر سنا گیا ہے کہ ترجمہ شائع ہونے کے بعد بھی جب کبھی کسی شخص نے اُن کو کسی آیت کے ترجمے میں کوئی غلطی جتائی تو انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں اُس کی اصلاح کر دی (۳) کفایت شعاری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ جمع کیا تھا اور اسی عادت کے ذریعے سے اُنھوں نے روپے کو بچانا چاہا۔ تاہم قومی کاموں میں وہ روپے کی کثیر مقدار بے دریغ دے ڈالتے تھے اور غریب مسلمان طلبہ کی خفیہ امداد کرتے رہتے تھے (۴) معاملات کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ہر شخص کی نسبت جو اُن سے قرضہ طلب کرے۔ یا اُن کے ساتھ کسی تجارت میں شریک ہو بے تکلف اعتبار کر لیتے تھے۔ اس عادت کے سبب اُنھوں نے بارہا ہزاروں روپے کا نقصان اُٹھایا۔ (۵) عربی ادب میں وہ خاص قابلیت رکھتے تھے اور اس لحاظ سے اُن کا شمار ہندوستان کے نامور ادیبوں میں تھا۔ حدیث اور تفسیر میں بھی اُن کو خاص دستگاہ تھی۔ اکثر طلبا اُن کے مکان پر آتے اور اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ بعض علمی مسائل میں وہ اپنی خاص رائے بھی رکھتے تھے اور اُس کو طلبا کے سامنے بے تکلف بیان کر دیتے تھے۔ (۶) سنا گیا ہے کہ آخر میں وہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ مگر جب تک بینائی روشن رہی وہ کتاب اور اخبار کے مطالعے اور مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے سے باز نہیں آئے (۷) باوجود دولت مند ہونے کے اُن کا طریقۂ زندگی بہت سادہ اور طالب علمانہ تھا کوئی شخص اُن کے لباس یا طرز ماندو بود سے یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دولت مند ہیں۔ (۸) مذہبا وہ آزاد خیال تھے۔ مگر اُن کی آزاد خیالی ان لوگوں کی سی آزاد خیالی نہ تھی جو بدات خود مذہب کے اصول و فروع سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر مسائل مذہبی کے متعلق نہایت جرأت اور دلیری سے بحث کرتے ہیں۔ غرض کہ مرحوم خاص عادات و خیالات رکھتے تھے اور اُن کا وجود مسلمانوں کی قوم کے لیے قابل فخر تھا۔ افسوس ہے کہ اب وہ وجودِ گرامی ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ جب تک اُردو زبان میں اُن کے لکچر موجود ہیں جب تک اُن کا ترجمۂ قرآن موجود ہے جو نہایت فصیح اور سلیس اُردو میں ہے۔ جب تک اُن کی وہ قصہ آمیز کتابیں موجود ہیں جو عورتوں کی اصلاح اور تعلیم کے لیے لکھی گئی ہیں اُن کی یاد کبھی دلوں سے فراموش نہیں ہوگی۔ مرحوم بلاشبہ نامور مشاہیر ہند میں سے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اخبارِ عام لاہور مطبوعہ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء

مولوی نذیر احمد شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب دہلی کے حکیم اجمل خاں صاحب کے زیر معالجہ رہ کر منگل کے روز فوت ہو گئے۔ جنازے کے ساتھ بے شمار لوگ تھے۔ اسلامی حلقے میں اس موت پر سخت افسوس کیا جاتا ہے لاہور میں خبر ہونے پر جمعرات کے روز اسلامیہ ہائی سکول اور کالج بند رہے +

چودھویں صدی راول پنڈی مطبوعہ ۱۵ مئی ۱۹۱۲ء

مولانا شمس العلما ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کے انتقال سے مسلمانوں کے درمیان سے ایک ایسی صورت اُٹھ گئی ہے جس کا عکس مسلمانوں کی موجودہ نسل کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگا۔ وہ ایک ایسی عظیم الشان شخصیت تھی جس کا نظیر صدیوں میں مشکل سے پیدا ہوگا اور وہ زندگی ایک ایسی زندگی تھی جس پر مسلمانوں کی قوم تمام دنیا کے سامنے فخر سے یہ کہہ سکتی ہے کہ اُن میں مولوی نذیر احمد مرحوم جیسا شخص پیدا ہوا تھا۔ مرحوم و مغفور مولوی صاحب کی ذات اس قدر کمالات کی جامع تھی کہ وہم تخئیل کو بھی اس کا تصور کرنے میں ایک طویل وقت درکار ہوگا اور وہ زندگی ایک مسلمان کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی کہ کوئی مسلمان اُس سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں کر سکتا کہ اُس کو ویسی ہی زندگی نصیب ہو اور کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر قومی خدمت اور بھلائی کا کوئی کام نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم کی ایک مفصل اور بسیط سوانح عمری تیار کر دے۔ خداوند کریم اُن کو مغفرت عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے +

افضل الاخبار دہلی ۱۶ مئی سنہ ۱۹۱۲ء

(مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ۔ڈی (اڈنبرا) ڈی ۔ او ۔ ایل (پنجاب) کے انتقال پرملال کی خبر مختصر طور سے پیوستہ اشاعت میں لکھی جا چکی ہے۔ اب مفصل طور سے افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ مرحوم کی موت کا باعث فالج ہوا تھا جس نے چھ ہی روز میں کام تمام کر دیا ✦

مولانائے مرحوم فارسی اور عربی کے ایک جلیل القدر فاضل ۔ اور زبانِ اردو کے لاثانی اور زبردست ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی میں بھی اچھی مہارت اور علوم قدیمہ و جدیدہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اور ابتدائے سن تمیز سے اپنا وقت ہمیشہ علوم و ابنائے جنس کی خدمت اور اعانت میں صرف کرتے تھے ✦

مولانا سید احمد صاحب دہلوی مؤلفِ فرہنگ آصفیہ کے خیالات مطبوعہ پیسہ اخبار روزانہ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۱۲ء

شمس العلماء مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی رحلت :۔ (نوشتہ جناب مولانا سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ) ہائے افسوس ۔ ہائے افسوس ۔ آج دہلی کا آفتاب علوم کیا تمام ہند کا آفتاب جہاں تاب رات کے ۸ بجے غروب ہو گیا ۔ آسمانی آفتاب شام ہی سے چھپ جاتا ہے ۔ مگر دین و دنیا کے روشن کرنے والے سورج نے آسمانی سورج سے کہیں زیادہ اپنی درخشانی دکھائی اور چمکتی ہوئی شعاعوں سے ادب اردو کی دنیا کو روشنی پہونچائی ۔ یہ کون سا آفتاب تھا جس کے جہان سے اٹھتے ہی علمی دنیا میں اندھیرا چھا گیا ۔ یہ جناب شمس العلماء مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ۔ ایل ۔ ڈی ۔ وغیرہ کا دم قدم تھا ✦ ہمارا یہ کہنا غلط اور سرتاسر غلط ہے ۔ کہ وہ آفتاب نورافشاں دنیا سے اٹھ گیا ۔ نہیں نہیں اس کی علمی شعاعیں علمی فیض رسانیاں اس ظلمت کدہ کو اب بھی اپنی نورانی جھلک دکھاتی رہیں گی ۔ یہ شخص اپنے وقت کا مسیحا تھا ۔ جس نے کبھی عورتوں کے مردہ دلوں کو انوکھی اور لاجواب کتابیں لکھ کر جلایا ۔ اور ان میں شوقِ علم کی روح پھونکی ۔ کبھی نوجوانوں کو اپنی عبرت انگیز تصنیفات سے نیک اور پارسا بنایا ۔ کبھی اپنے لکچروں سے لوگوں کو قومی خدمت پر مائل کیا ۔ کوئی مشکل سے مشکل علم ایسا نہ تھا جسے حضرت ممدوح نے پانی نہ کر دیا ہو ۔ اخلاقی اور دینی مسائل انھوں نے اس خوبی سے بیان کیے کہ دل میں کھب گئے ۔ قرآن شریف کے ترجمے نے ہزاروں بلکہ لاکھوں علوم عربیہ کے ناواقف مسلمانوں کو کلام الٰہی کا لطف ۔ اس کی خوبیاں اس کی باریکیاں ۔ اس کے لاینحل عقدوں کو حل کر کے اس طرح دلوں میں بٹھائیں ۔ کہ پڑھنے والوں کو مزہ آنے لگا ۔ اور سننے والوں کے دل ہرے ہو گئے ✦

حضرت موصوف کی ذات میں صرف علمی فیاضی ہی نے جنم نہیں لیا تھا ۔ بلکہ بیش قرار نقدی کے عطیات نے بھی ان کو حاتم وقت ثابت کر دیا تھا آپ نے سینکڑوں بے روزگاروں کو روپیہ دے کر روزگار سے لگایا ۔ بیکاروں کو گرہ سے روپے دے دے کر کماؤ پوت بنایا ۔ نادار طالب علموں کو خود بھی پڑھایا اور ان کے اخراجات اپنے ذمے لے کر انگریزی تعلیم سے بھی محروم نہ رکھا ✦

آپ کے لکچر غضب کے ہوتے تھے ۔ جس جگہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا لکچر ہوگا وہاں مخلوق ٹوٹی پڑتی تھی ۔ قدم رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی لوگ وقت مقررہ سے گھنٹوں پہلے آ جمتے تھے ۔ جس وقت حضرت تشریف لاتے تھے خوشی کے نعروں سے سارا مکان گونج اٹھتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا ۔ کہ ایک شیرِ دل شیوہ بیان اپنے کلام سے دلوں کو ہلا دینے کے لیے آ رہا ہے ہنگام تقریر آپ کی

انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہادر شیر دہاڑ رہا ہے۔ جس بیان کو یا ظرافت سے، متانت سے، طرزِ بیان سے اس کا رُوپ بدل دیا۔ چاہا روتوں کو ہنسا دیا۔ اور چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ گویا تمام حاضرینِ جلسہ ایک کٹھ پتلی تھے جن کا تار آپ کے ہاتھ میں تھا جس طرف ہاتھ اُٹھا یا تلوار کے بغیر ذبح کرتے چلے گئے۔ جس طرف نظرِ لطف اُٹھائی گویا سیکڑوں کو دولتِ عظیم بخش دی۔ کسی موقعے پر عاشقانہ نیاز کسی موقعے پر معشوقانہ انداز عجیب سماں باندھ دیتا تھا۔ اگر کسی انجمن کے واسطے چندہ مانگا۔ تو لوگوں کے دلوں پر یہ سحر چھایا کہ اپنی جیبیں خالی کرکے یار دوستوں کی جیبیں قرضِ حسنہ کے لیے ٹٹولنے لگے۔ کوئی عالم اپنے زمانے میں بغیر کوشش کے اس قدر اعزاز کا مستحق نہ ہوا جس قدر مولوی نذیر احمد صاحب۔ باوجود استغنا اعلےٰ ترین اعزازی ڈگریاں حاصل کیں اور بیش قرار انعامات لیے۔ ایسے بے کپٹ، بے کینہ، صاف دل، صاف گو آدمی اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے سے دو چار برس پیشتر حاسدوں نے اُمہات الامہ کی آڑ پکڑ کر آپ کے دل کو از حد صدمہ پہونچایا۔ جس کا اثر مرتے دم تک باقی رہا۔ اس صدمے نے آپ کی عمر کے آخری برسوں میں تعلیم و تعلم کا دروازہ بند کرادیا۔ اور مولوی صاحب کو گوشہ نشین بنادیا گو کتاب مذکور میں بعض الفاظ بظاہر نازیبا تھے اور مولوی صاحب ان کو بدلنے پر بھی راضی تھے۔ مگر چوں کہ خود غرضوں کا مطلب اس سے نہیں نکل سکتا تھا اس وجہ سے انھوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا۔ اور آخر کتاب کو ناپید کرادیا۔ یہ پادری احمد شاہ صاحب شائق کی کتاب امہات المومنین کا جواب تھا۔ اور ایسا دندان شکن جواب تھا۔ کہ معترضین کے دانت کھٹے کر دیتا۔ مگر افسوس کہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کتاب کی آڑ میں کفر و الحاد کے فتوے مولانا نذیر احمد کے برخلاف لکھوائے گئے۔ مگر ان فتووں سے نہ مولوی صاحب کافر بنے اور نہ کفر کی کوئی شرط بدلائل ثابت ہوئی۔ البتہ اُن کی تصانیف اور علمی فیض کا دروازہ بند کرانا تھا۔ سو کرادیا۔ اصل بات کو نہ سمجھے۔ مولوی صاحب کی طرزِ تحریر کو مدِ نظر رکھا۔ کہ وہ ہمیشہ ناولانہ رنگ میں لکھتے تھے۔ اور اس رَو میں حسبِ موقع جو الفاظ مناسب معلوم ہوتے ان کو نہیں چھوڑتے تھے۔ مثلاً چترائی اور چالتر ہم معنی الفاظ ہیں مگر لفظ چالتر نے جو عاشقانہ فسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے وفایانہ عیاری کے واسطے مختص کر لیا تھا یہ غضب ڈھایا۔ کہ ایک بہت بڑے فاضل کا دل دُکھا دیا۔ اگر چالتر کی بجائے چترائی لکھا جاتا تو یہ اعتراض بھی اُڑ جاتا اور ان کا دل نہ دُکھتا۔ لیکن یہ دل دُکھانا خود غرضوں کے حق میں اچھا اور ہمارے حق میں بُرا ہوا۔ کیوں کہ اس نے بہت سے بیش قیمت لعل و جواہر کو ان کی معدنِ طبیعت سے باہر نہ آنے دیا۔ ورنہ اس تین چار برس کے عرصے میں خدا جانے کون کون سے گلِ ناشگفتہ کھلتے اور کیا کیا بہار دکھاتے۔ یہ منصفانہ رائے شاید ہمارے واسطے بھی ایسا فتوے لیے کھڑی ہو۔

مولوی صاحب کا سن ۷۰ برس سے کم نہ تھا۔ گویا وہ اپنی عمرِ طبیعی کو پہونچ چکے تھے۔ مگر ان کا ایک ایک سانس غنیمت تھا ہائے مولوی صاحب اب تم کہاں اور ہم کہاں۔ وہ درس و تدریس کا دار العلوم بند ہو گیا۔ اگرچہ آپ کی تصانیف نے آپ کو زندہ دِلوں اور ذی حیات اصحاب میں ہر وقت شمار ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔ آپ کی صحبت ہر وقت میسر ہے۔ مگر وہ لب ولہجہ کہاں۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کہاں وہ اخلاق سے بھرے ہوئے الفاظ کہاں کہ بات بات میں مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

ہم آپ کو نہیں روتے اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ جھیتیرا آنسوؤں سے دھوتے ہیں مگر ہمارے چہروں کی اُداسی ماتمی رنگت میں فرق نہیں آتا۔

ہم سے زیادہ قلق مولوی بشیر الدین احمد صاحب آپ کے فرزند رشید کو ہے جن کے سر سے ایسا بابرکت سایہ اور بے نظیر باپ اُٹھ گیا دیگر لواحق بھی اس کہرام سے باہر نہیں مگر مرضی مولا جو خدا تعالےٰ کو منظور تھا وہ ہوا۔ ایسے شخص کا نعم البدل ناممکن ہے۔ صبر و شکر کے سوا چارہ نہیں۔ اگرچہ وہ اپنے نیک اعمال کے باعث دعائے مغفرت کے ضرورت مند نہیں مگر ہماری محبت اور ہمارے دل نہیں مانتے کہ ہم اُن کی روح پاک کو درود و فاتحہ کا ثواب نہ پہونچائیں اور ان کے عزیزوں کے ساتھ دلی ہمدردی نہ کریں آپکے ارتحال پُرملال کی دو ہجری تاریخیں پیش نظر ہیں اگرچہ بعض لوگ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے مگر ہم تو ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے ایک افتخار دین دوسری چراغ دین نبی۔ دوسری تاریخ اُن کے حسب حال ہے کہ آپ نے جو دینی کام کیے انھوں نے آپ کو دین نبی کا چراغ ثابت کر دیا اور گمراہوں کو سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔

پھول لاہور ۱۸ مئی سنہ ۱۲ع

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب نے فالج کی بیماری سے ۳ مئی کو دہلی میں انتقال کیا۔ ہندوستان کو اس موت سے سخت نقصان پہونچا۔

تہذیب نسواں لاہور ۸ جون سنہ ۱۲ع

شمس العلماء مولانا نذیر احمد مرحوم

نذیر احمد کی مرگ پُرالم کا واقعہ سُن کے　　ہوا سکتہ۔ نہ دل میرا رہا اپنے ٹھکانے میں

گراتا رہتا ہے۔ ہر روز بجلی آسمان ظالم　　مزا ملتا ہے اس کو قوم کی کھیتی جلانے میں

سدا روتی ہیں آنکھیں قوم کی قحط الرجالی کو　　ہے دل ٹکڑے مصیبت پر مصیبت کے اُٹھانے میں

کمی میں اک اضافہ ہو گیا پھر بدنصیبی سے　　بڑھا اک باب نوحۂ مصیبت کے فسانے میں

نذیر احمد ہماری قوم میں فرد یگانہ تھا　　ذرا تاخیر تو کرتا یہاں سے اُٹھ کے جانے میں

اندھیرا قوم میں پھیلا ہے۔ اُس کی موت سے ہر سو　　وہ سورج تھا ہماری قوم کے روشن بنانے میں

ادیب و نکتہ داں اُس سا ملے۔ ہرگز نہیں ممکن　　نہ پاؤ گے تو لے کر شمع کو ڈھونڈو زمانے میں

ہوئی ہے مرثیہ خواں فخرِ ملت کی زباں میری　　سعادت مل گئی مجھ کو اسی رونے رُلانے میں

خاکسار بنت حفیظ اللہ امرتسر

مولانا نذیر احمد کی سوانح عمری پیسہ اخبار لاہور ۲۳ مئی سنہ ۱۲ع

مولانا نذیر احمد کی سوانح عمری مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف الرشید جناب شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی اپنے ایک نامہ گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ پیسہ اخبار میں میرے والد مرحوم کے حالات جو آپ نے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں مولانا مرحوم کی سوانح عمری اُن کی زندگی ہی میں لکھی جا چکی ہے۔ اور چھپ بھی گئی ہے صرف تھوڑی سی تکمیل باقی ہے ذرا ہماری پریشانی اور تکلیف رفع ہو تو ان شاء اللہ یہ کتاب عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ مولوی بشیر الدین احمد

صاحب کو جلد اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع ملے اور لوگوں کو طویل انتظار کی وہ زحمت نہ اٹھانی پڑے جو شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم اور خان بہادر شمس العلما منشی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی مغفور کی سوانح عمریوں کے معاملے میں پیش آئی ہے جن کا ان کے ورثا کی طرف سے اسی طرح وعدہ کیا گیا تھا اور اب تک وہ پورا نہیں ہوا۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے گرامی نامے کے ساتھ وہ مطبوعہ گشتی چٹھی بھی ارسال کی ہے جو اپنے والد مغفور کی تعزیت کے پیاسوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے انہوں نے مختلف اصحاب کے نام بھیجی ہے۔ مولوی صاحب کو اس امر سے بہت تسلی ہے کہ اس حادثۂ روح فرسا میں ایک بڑا گروہ ان کے غم کو بٹانے والا ہے۔ "آپ کو زیادہ تر افسوس اس امر کا ہے کہ اُن کی جگہ کسی طرح پر نہیں کی جا سکتی۔" مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ اسلام اور قوم کی جو عظیم الشان خدمتیں اُن سے ظہور میں آئی ہیں وہ قیامت تک اُن کو مرنے نہ دیں گی لیکن ملک و قوم مولوی صاحب موصوف سے اس امر کے متوقع ہیں کہ نہ صرف وہ اپنے والد مرحوم کی سوانح عمری حسب وعدہ جلد شائع کر دیں بلکہ اُن کی اور جو تصانیف نظم یا نثر مکمل یا نامکمل صورت میں ان کے پاس موجود ہوں ان کو بھی چھپوا دیں کیوں کہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ادب اردو کے لیے ایک قیمتی چیز ہے۔

قطعات تاریخ نوشتۂ شمس العلما خان بہادر نواب عزیز جنگ المتخلص بہ وِلا

فجع الوریٰ موت الادیب الفاضل ۔۔۔ وھو المحقق للخفی و للجلی

قال الولا تاریخہ بیداھۃ ۔۔۔ وضع النذیر بلحد وھو العلی

۱۳

قطعۂ تاریخ نوشتۂ مولوی فضل ستار صاحب المتخلص بہ لاابالی امروہوی

چو اندر وی نذیر احمد کہ در دہ ۔۔۔ رئیس نام ور فاضل ادیبے

زمانہ کرد بر ما قہر ۔۔۔ گویم ۔۔۔ نوائے ۔۔۔ سن فوتش ۔۔۔ لاابالی

نذیر احمد برفت از دہر گویم

۱۹

تاریخ وفات نوشتۂ مولوی محمد عبد الخالق صاحب مدرس نارمل سکول حیدر آباد دکن

چوں حافظِ مصحفِ الٰہی ۔۔۔ کو بس رحلت ازیں جہاں زد

گفتند ۔۔۔ آہ گریند ۔۔۔ واپس ز جہاں نذیر احمد

تاریخ وفات مصنفۂ مولوی عبد الجلیل صاحب متخلص بہ طوفان سابق ڈپٹی کلکٹر رئیس مارہرہ ضلع ایٹہ

شد مسند علم و فضل خالی ۔۔۔ چوں ۔۔۔ ز جہاں نذیر

تاریخ ۔۔۔ طوفان ۔۔۔ واپس ز جہاں نذیر احمد

اقتباسات از رسائل

از عصمت دہلی

بابتہ مئی ۱۹۱۲ء

غم مغفور و اُستاد مرحوم

بے نظیر تھیں اور لاجواب بے مثل تھیں اور نایاب " وہ پاک اور صاف روحیں " جو عالم حیات میں " ہشّاش بشّاس آئیں شاد اور شادماں ہیں " اور شگفتہ و خنداں رخصت ہوئیں دنیا اُن کے فراق ابدی پر خون روئی۔ آسمان و زمین اُن کی موت پر بیتاب ہوئے زندوں نے اُن کا ماتم اور مردوں نے ان کا غم کیا۔ اپنوں نے سر پیٹے۔ غیروں نے آہ اور سُننے والوں نے واہ کی +
اُن کی رخصت عزیزوں کی بربادی۔ اُن کا کوچ۔ دوستوں کی بدنصیبی اور اُن کی موت قوم کی موت تھی +
یہ متبرک روحیں کیا تھیں؟ کیا ہوئیں اور کیا کر گئیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقۂ انسانی تا دم بقا ان کے نام سر آنکھوں پر رکھے گا۔ جن کی تقریریں بے ہوشوں کو ہشیار جن کی تحریریں بے خبروں کو خبردار کر گئیں۔ ہنستوں کو رُلانے اور سوتوں کو جگانے والے۔ آج خود موت سر لپیٹے جنگل بیابان میں پڑے ہیں +
مئی ۱۹۱۲ء کی تیسری رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے عم مغفور و اُستاد مرحوم شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کا جنازہ وسط صحن میں رکھا ہوا ہے غسل و کفن ہو چکا صبح کا انتظار اور دفن کی دیر ہے کہ یہ نورانی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو زیر زمین ہو جائے۔ رات اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ آسمان تاروں سے پٹا پڑا ہے۔ اور وہ گھر جس میں ہر وقت شیر دھاڑ رہا تھا سنسان پڑا ہوا ہے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کے نعرے لگا رہے ہیں اور راشد بدنصیب اُس مُنہ کو تک رہا ہے جس سے پھول جھڑتے اور اُن آنکھوں کو دیکھ رہا ہے جن کو ظالم موت ہمیشہ کو بند کر گئی +
جسد خاکی سے رخصت ہونے والی روح! اپنے ادنےٰ خادم کا آخری سلام قبول کر۔ کیسی کیسی مقدس روحیں تیرے استقبال کو آئی ہیں محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور اصلی گھر سدھار جا +
آج نواب مرزا کا کوچہ فردوس بریں کا نمونہ ہے عالم ارواح کے وہ مکین جن کے نام صفحۂ دُنیا پر چمک رہے ہیں اس سنگین مکان میں جمع ہیں اور جھوم جھوم کر اُس شعر کو ادا کر رہے ہیں جو آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے مولانائے مرحوم نے سرسید کی شان

میں کہا تھا۔

اسے روئے گی سر پہ ہاتھ رکھ کر قوم بدقسمت ۔۔۔ اور اس کو دیکھنے کا جو کوئی بیتاب رہا باقی

(۱) عالم خیال استادِ مرحوم کے طفیل آج ان مقدس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ اہل قلم کی بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالم ارواح سے چل کر اس پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی قومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے لقار دوام کے مہکتے ہوئے پھول ان کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملأ اعلیٰ کے بسنے والے بآواز بلند قومی موت کے نعرے لگا رہے ہیں ✦

(۲) موت یا فراقِ ابدی امیر۔ غریب۔ بڈھے۔ جوان۔ ہندو مسلمان۔ ہر ایک کا قابل افسوس ہے۔ مگر شمس العلما مولوی نذیر احمد کی موت ہم سے ایک ایسے بزرگ کو جدا کر گئی جس کی نظیر آنے والی دنیا اب مشکل سے پیدا کرے گی۔ مولانائے مرحوم کب پیدا ہوئے کہاں ہوئے کیا سیکھا کس سے سیکھا۔ یہ پھر سہی اس وقت تو رونا یہ ہے کہ عمر بزرگوار کی موت کیا کر گئی ✦

ابھی تو مونہہ سے یہ لفظ نکالنے کو جی نہیں چاہتا خدا نہ کرے کہ مقدس استاد کا سایہ سر سے اٹھے مگر كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ راقم اور راقم کے ساتھ تمدن دونوں یتیم ہو گئے ✦

جو آنکھیں مولانائے مرحوم کی تحریر کا لطف اٹھا چکی ہیں اور جو کان مولانائے مغفور کی تقریر کا مزا لوٹ چکے ہیں وہ شاہد ہیں اس امر کے کہ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نظیر کامل ایک صدی میں بھی زمانہ پیدا نہ کر سکا۔ زندہ ہیں وہ سال دیکھنے والی آنکھیں کہ مولانائے مرحوم کی تقریر پر تن ہے کبھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور کبھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ✦

استاد مرحوم کا وطن گو ضلع بجنور تھا اور دلّی میں جس وقت تشریف لائے تو سن پندرہ سولہ سال کے قریب تھا زبان کو جو کچھ ماں کی گود سے لینا تھا لے چکی تھی مگر مولانائے مرحوم نے دلّی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اردوئے معلّیٰ کا مزہ آ گیا سرزمین شاہجہان آباد اس بان پر مدۃ العمر ناز کرے گی جو مغفور کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی ✦

اور سچ تو یہ ہے کہ قوم شمس العلما مولوی نذیر احمد پر حسرت کے آنسو بہائے گا اور قوم ہمیشہ مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات کی ممنون رہے گی ✦

پنجابی کٹرہ جو دلّی نے ریلوے سٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اس کا نام و نشان تک نہیں میرے آباؤ اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹڑے کی وہ مسجد جس میں میرے جد امجد مولوی محمد عبد الخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے طلبا کا دار القیام ۔۔۔ یا اس کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ علامہ موصوف تحصیل علوم کی غرض سے اس مسجد میں داخل ہوئے گو اقبال کا ستارہ پیشانی پر چمک رہا تھا مگر افلاس کی مصیبت سر پر ٹوٹ رہی تھی تاہم شوقِ علم پائے ثبات اکھڑنے نہ دیتا تھا ✦

ان ہی دنوں میں میری بڑی پھوپی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی۔ اگلے لوگوں کی باتیں ان ہی لوگوں کو سزاوار تھیں بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں اور ارمان تھا کہ مولوی زادی کی پالکی دروازے پر اتر والیں مولانائے مرحوم کی طرف کیا عزیز و اقارب اور کیا دوست آشنا کسی کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ امیروں۔ رئیسوں۔ عالموں۔ فاضلوں کے ہوتے ساتھ ایک پردیسی طالب علم کو کون پوچھتا مختصر یہ کہ مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم کے سامنے سب نام پیش کیے گئے

اللہ غنی کس دل گردے کے لوگ اور کیسے صابر و شاکر بندے تھے مولوی صاحب مرحوم کیا فرماتے ہیں جس شخص میں تین صفتیں ہوں اُس سے کر ناز کا پابند معاملے کا اچھا اور زبان کا سچا۔ امیدواروں میں تو ایک بھی اس کسوٹی پر پورا نہ اُترا تلاش کے دائرے کو وسیع کیا تو نگاہ مولانائے مغفور پر جا کر ٹھٹکی۔ آج مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب مغفور دونوں اس دُنیا میں نہیں ہیں مگر مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم جیسے جید عالم کی پوتی کا بیاہ لینا جس کے عقد کی شرطیں یہ کچھ کڑی ہوں اُستاد مرحوم ہی کا کام تھا۔ خدا غریق رحمت کرے میری بڑی پھوپی کو اس شادی کا ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا ہے تو دولھا کو ہم سب نے بھی دیکھا کرتا۔ پاجامہ سفید تھا ٹوپی بھی خاصی تھی مگر جوتی کے کنّے نکلے ہوئے تھے اماں نے ایک عورت کے ہاتھ چپکے سے ایک روپیہ بھیجا کر جوتی پہن لو۔ تھوڑی دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس لائی اور کہا سوا بارہ آنے کی جوتی آئی ہے +

یہ تعلق مولانائے مرحوم کے واسطے کوئی مابہ الامتیاز شے نہ تھی مدرسے کا سلوک اُن سے وہی تھا جو ہمیشہ رہا اور جو سب طالب علموں سے تھا۔ شام ہوتے ہی تھوڑی سی روئی اور تیل سب کو مل گیا اپنے ہاتھ سے بتّیاں بٹو اور جلاؤ جس کا تیل زیادہ خرچ ہو وہی شاباش کا مستحق ہے مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور اگلے زمانے کے لوگ انتظام اتنا معقول کہ تیل کی ایک بوند بھی ضائع نہ ہو اور شوق ایسا بڑھا ہوا کہ چراغ ٹمٹما رہا ہے تیل ختم ہو گیا رات کہیں کی کہیں پہونچی مگر سبق یاد کیے بغیر سونے کو جی نہیں چاہتا مولانائے مرحوم اکثر فرماتے تھے مدرسے میں سناٹا ہوتا تھا سب پڑے سوتے تھے اور میں چراغ کے آگے اپنا سبق یاد کرتا ہوتا تھا +

یہ تھا وہ ذوق و شوقِ تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت جس نے مولانائے مرحوم کو انسانیت کے پورے جواہرات سے مزیّن کرنے کے بعد اُن کا اسمِ گرامی آسمانِ ادب پر قمرِ چہار دہم کی طرح چمکا دیا +

مجھے اس وقت اُستاد مرحوم کی قابلیت ملازمت احسانات خدمات کسی سے بحث نہیں البتہ کچھ کہنا ہے اُس کتاب کے متعلق جو اُمہات الامہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس پر بحث کرتے ہوئے بارہ مئی کے روزانہ پیسہ اخبار میں مولوی سید احمد صاحب نے اُن لوگوں کو جنھوں نے محض اغراضِ نفسانی کی وجہ سے اس کتاب کی مخالفت کی نہایت معقولیت سے جواب دیا ہے +

مولانائے مرحوم قبر میں جا پہونچے اور مجھ کو پہونچنا ہے مگر میں شاہد ہوں اس امر کا کہ گزشتہ دس سال میں مرحوم کی زبان سے کلامِ ربانی کی کبھی کوئی آیت اس طرح نہ نکلی کہ آنکھ سے آنسو نہ گر رہا ہو +

ناظرینِ تمدن کو وہ مضمون یاد ہوگا جو مئی ١٩١١ء کے پرچے میں "انسان فرشتے کی عینک سے" کے عنوان سے شائع ہوا یہ مضمون جب مولانائے مرحوم نے سُنا چہرہ سُرخ ہو گیا بدن کانپ رہا تھا۔ ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک مختصر سا لکچر شروع کیا وہ وقت میری آنکھ کے سامنے ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی اُن کی حالت بگڑ گئی زار و قطار رونے لگے اور مجھ سے فرمایا اگر اجرائے تمدن کا مقصد اسلام کی تضحیک ہے تو آئندہ مجھ کو صورت نہ دکھانا +

وہ شخص جو اسلام اور بانیِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایسا شیدا تھا کیا اِس حملے کا مستحق تھا کہ علمائے اسلام یہ فتوے دیں کہ اس کے جنازے کی نماز درست نہیں +

سلہ مئی کے دوسرے ہفتے کی کوئی سی تاریخ ١٢

حق الامر یہ ہی کہ امہات الامّہ وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہی نہ آیندہ برسوں نظر آنے کی امید ہی کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کرجائے اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیا کردے جو امہات الامّہ میں ہی +

قوم کی بدقسمتی ہی کہ علامہ بلگرامی نے امہات الامّہ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور یقیناً دریا سو میں اجازت حاصل کرلیتا مگر علامہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی +

بعض اخباروں کی رائے کہ مولانا نے مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ علمائے اسلام اس پر معترض ہیں تو کتاب اُن کے حوالے کردی قطعی غلط ہی جس طرح یہ کتاب حاصل کی گئی اور جو اس کا حشر ہوا اس کا خیال تکلیف دہ ہی۔ انتقال سے چند روز پہلے جب میں نے امہات الامّہ کی اشاعت کے واسطے عرض کیا تو خاموش ہوگئے مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ صورت چند روز کی مہمان ہی اصرار کیا مجبور کیا ضد کی بگڑا منت کی خوشامد کی آخر مولوی رحیم بخش کو بلا کر کہا کہ کوئی جلد مل سکتی ہی انھوں نے جواب دے دیا تو فرمانے لگے کہ "بیٹا جانے دو" ایسے نازبردار بزرگ ایسے شفیق اُستاد اب کہاں میری التجا حد سے بڑھ گئی تو چاروں طرف کتاب تلاش کی آخر ایک جگہ سے بمشکل تمام دس روز کے واسطے ایک خاص شرط پر مل سکی۔ رات کا وقت تھا کہ مجھ کو طلب فرمایا کتاب دی اور حکم دیا کہ اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کرلو اور تکمیل کے بعد مجھ کو سنا دو ڈھائی سو روپے تک کے خریدار ایک ایک جلد کے موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب تلف ہوجائے میں نے بار بار کتاب نقل کی لکھ کر حاضر ہوا سنا سب ترمیم اور تغیر و تبدل کے بعد وہ مبیّض بہا اوراق اب میرے پاس ہیں لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین جو داخل شدہ ضمانت ہی کے واسطے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہی مخالفین کا کیا مقابلہ کرسکتا ہی البتہ کتاب میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہی اور اگر اس کی اشاعت میرے ہاتھوں ہوگئی تو یہ کہوں گا +

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اُستاد مرحوم کے مفصل حالات جو کچھ لکھ سکتا ہوں آیندہ پرچوں میں لکھوں گا۔ سردست وہ چند الفاظ امہات الامّہ کے دیباچے سے نقل کرتا ہوں جو بتاتے ہیں کہ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کتاب کیوں لکھی۔ باقی آیندہ "راشد الخیری"

"دو کئی برس ہوئے کہ ڈنگا نوے کے ایک پادری صاحب مذہبی مناظرے کے پیرائے میں حدّ اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادی عمل میں لائے کہ اپنے ایک رسالے میں پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اُن کی بی بیوں کے بارے میں بڑی زبان درازی کی جس سے جمہور مسلمین کی دل آزاری ہوئی مسلمان جابجا استغاثہ فوجداری کی تیاریاں کرنے لگے اور جگھوں کا حال تو معلوم نہیں دلّی سے کچھ لوگ فریاد لے کر شملے گئے بارے پادری صاحب کی کتاب کی اشاعت حکماً بند کردی گئی۔ اسی اثنا میں سر سید احمد خاں مرحوم مغفور بھی پادری صاحب کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے۔ وہ پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ سید صاحب انتقال فرما گئے۔ ہم نے نہ تو پادری صاحب کی کتاب دیکھی نہ سید صاحب کا ادھورا جواب مگر اتنی بات پہلے سے معلوم ہی کہ پادری صاحب نے سخت زبانی کے سوائے اعتراض میں کوئی نئی بات اپنی طبیعت سے تو ایجاد کی نہ ہوگی۔ اعتراض تو نہیں مگر جواب خود قرآن میں موجود ہی

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً۔ جواب کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت بھی پیغمبر صاحب کی زندگی میں بعض لوگ زن و فرزند کے تعلقات کو خلافِ شانِ پیغمبر سمجھتے اور ان ہی تعلقات کی وجہ سے جناب رسالت مآب کی رسالت کے منکر تھے غرض پرانا اعتراض ہے اور علمائے اسلام نے اس کے دندان شکن جواب بھی دیئے ہیں مگر مسلمان ہو کر اپنے پیغمبر کے تقدس کی اپنے مقدور بھر اور اپنے طور پر واجبی حمایت کیئے بدون ہم سے نہیں رہا جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ اعتراض کسی مسلمان کے کان میں پڑے اور اس کو جواب نہ آتا ہو اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت خیالِ فاسد موہم سوءِ ادب دل میں بیٹھ جائے تو ایمان کے جاتے رہنے کا خوف ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ (ماخوذ از امہات الامہ)

از نظام المشائخ دہلی
جمادی الاخری ۱۳۳۰ھ

وفات مسلمانوں علی الخصوص اہل حلقے کے لیئے یہ خبر الم انگیز ہے کہ دہلی کے شہرۂ آفاق بزرگ مولوی حافظ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے گزشتہ ہفتے میں وفات پائی۔ مرنے والا کون تھا؟ سر سید احمد خان کا قوتِ بازو۔ اردو زبان کا فروغ دہندہ۔ دورِ جدید میں سب سے عمدہ آزادی و بے باکی سے لکچر دینے والا۔ اگلے وقت کے مسلمانوں کی چلتی پھرتی نشانی۔ مگر یہ امور ظاہرداری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اربابِ باطن جن چیزوں کے قدردان ہیں وہ مرحوم کا اردو ترجمۃ القرآن اور کتاب "الحقوق والفرائض" وغیرہ ہیں۔ نیز زندگی کا وہ آخری حصہ ہے جس میں مرحوم دنیاوی تعلقات ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ ایام ہمارے عقیدے میں اُن کی عمر کے بہترین ایام تھے۔ گھر کا چپ چاپ گوشہ۔ تلاوتِ قرآن۔ نماز۔ ذکرِ خدا۔ ذکر اولیاء اللہ۔ اُن کے مونس و دمساز تھے۔ راقم الحروف سے اکثر تخلیے کی صحبتیں رہتی تھیں جن میں خدا والوں کی باتیں ہوتیں۔ اور مرحوم کو زار زار رلواتیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کے روکھے خشک مزاج وجود میں گریہ و بکا جیسا درویشی وصف ہونا ممکن تھا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے جو راقم کو بارہا پیش آیا +

عجیب اتفاق ہے۔ خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ۔ اور شمس العلماء حافظ نذیر احمد نئے زمانے کے اُن لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کو لذتِ دین سے ناآشنا سمجھا جاتا ہے مگر دونوں کا انجام کار درویشانہ ہوا +

مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے مرنے سے چند روز پہلے چشتیہ طریق کے تمام خاص اوراد ذوقِ دلی سے حاصل کیئے۔ اور اُن میں ایسے منہمک ہوئے کہ آخری سانس تک پاسِ انفاس جاری تھا۔ نیز وصیت کر کے ایک نظامیہ بزرگ کے پہلو میں مرقد بنوایا +

ڈپٹی صاحب پر اپنے یارِ غار کی مثال کا گہرا اثر پڑا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ میاں حلقہ قائم کیا ہے تو اُس کی کوئی اندرونی کڑی میرے دل میں بھی ڈال دو۔ حلقے کے جلسوں میں شرکت کے ہمیشہ آرزومند رہے۔ لیکن چونکہ جلسے رات کو ہوتے ہیں علالت کی وجہ سے کبھی شرکت کا موقع نہ ملا۔ القصہ مرحوم کی وفات ہم سب خدام الحلقہ کے لیئے موجبِ تاسف ہے۔ حضرات مشائخ سے التماس ہے کہ وہ مرحوم کے واسطے دعائے مغفرت کریں +

از الناظر (لکھنؤ)
جون ۱۹۱۲ء

مسلمانوں کی قومی کشتی طوفان زدہ تو ایک مدت سے تھی مگر اب بالکل ہی گرداب میں پھنسی نظر آتی ہے۔ ناخدایان خواب آلود بظاہر جگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہنوز مستِ مئے غفلت ہیں اور غضب یہ ہے کہ جو بیدار و ہشیار تھے بلکہ اوروں کو جگاتے اور ہوش میں لاتے تھے وہ ایک ایک کر کے اُٹھتے

جاتے ہیں۔ یہ سال ہمارے قومی رہنماؤں کے حق میں نہایت مہلک ثابت ہوا۔ ابھی ایڈیٹر وکیل اور مولوی عزیز مرزا کی بے وقت موت پر مسلمانوں کے اشکِ غم خشک نہ ہوئے تھے کہ خان بہادر آنریبل شیخ غلام صادق کے سے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے بزرگ قوم نے انتقال کیا۔ اور ابھی شیخ صاحب موصوف کے گل ہائے مزار مرجھانے نہ پائے تھے کہ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر سرسید کو مسلمانوں کے قومی آسمان کا آفتاب کہا جائے تو مولانا نذیر احمد اس آسمان کے ماہ تاب کہے جا سکتے تھے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اس بڑے مصلح کے ساتھ مل کر جن بزرگانِ قوم نے ہماری قومی کشتی کو منزلِ مقصود پر پہونچانے میں جد و جہد کی ہے اُن کے گروہ میں مولانا ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم پر کسی شخص کی آمد آمد کا وہ غلغلہ نہیں ہوتا تھا جو مولانا کے لیکچر کے وقت ہوا کرتا تھا اور پبلک کا یہ غیر معمولی رجحان اور بھٹکے ہوئے قافلے کا اس شد و مد کے ساتھ مولانا کی بانگ درا پر دوڑنا اس بات کا پورا اور کافی ثبوت ہے کہ مولانا کی اعلیٰ قابلیتوں نے دلوں پر نہایت گہرا اثر کیا تھا۔ اور جس قبول مولانا کی سچی عظمت اور اصلی منزلت کو بہت بلند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی انشا پردازی ہماری زبان کی سب سے قیمتی ملک ہے۔ غالب و آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد کا بھی ایک خاص رنگ ہے اور چونکہ یہ رنگ قوم کے اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کے اہم ترین مباحث پر چڑھایا گیا ہے اس لیے بلا شبہ اُس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ مولانا کی شاعری سے عام طور پر لوگوں کو زیادہ واقفیت نہیں ہے جس کی وجہ اصلی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ملک کے سامنے بحیثیت شاعر کے کبھی پیش نہیں کیا۔ جو نظمیں انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں وہ کسی نہ کسی قومی مجلس میں پڑھی گئیں اور اُس کے باہر لوگوں کو اُن سے واقف ہونے کا موقع نہیں ملا۔ مگر ہمارے کرم فرما مولوی افتخار عالم مارہروی نے حال ہی میں اُن کی تمام نظموں کا مجموعہ "مجموعۂ نظم بے نظیر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اور یہ گراں بہا جواہرات کا گنجینہ صرف مرتبِ الناظر سے مل سکتا ہے۔ آیندہ کسی موقع پر ہم اس مجموعے پر تفصیلی ریویو کر کے ناظرینِ الناظر کو مولانا کی شاعرانہ حیثیت سے پوری طرح روشناس کرائیں گے۔ ہمیں مولانا کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔

از ادیب (الٰہ آباد) بابتہ جون ۱۹۱۲ء

مولانا نذیر احمد مرحوم (ولادت غالباً ۱۸۳۶ء۔ وفات ۳ مئی ۱۹۱۲ء) اتنی بات ہر شخص جانتا ہے۔ کہ موت و زندگی فنا و وجود میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس علم کے باوجود بھی ہمارے اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دنیا اپنے مناظرِ عبرت کے پیش کرنے میں ہمہ وقت مشغول ہے۔ فنا و موت کے مؤثرات ہر پہر لمحے جاری ہیں۔ بڑے بڑے تاج دار و کج کلاہ دفعتہً تو دۂ ریگ بن جاتے ہیں۔ بسترِ گل و فرشِ مخملیں پر استراحت کرنے والے چشم زدن میں پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ اور اگر خبر ہو بھی۔ تو اثر نہیں۔ تاہم ان ہی موتوں میں سے بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہم جیسے مدہوشوں تک کو چونکا دیتی ہیں۔ اور جن سے دو ایک۔ سو پچاس۔ افراد متاثر نہیں ہوتے۔ بلکہ جن سے ساری جماعت میں صفِ ماتم قائم ہو جاتی ہے۔ سارے ملک کے عشرت کدوں میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور ساری قوم کے شبستانِ عیش بے چراغ ہو جاتے ہیں۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ کی وفات بھی اسی قسم کی ایک موت ہے۔ وہ کوئی انفرادی سانحہ۔ کوئی شخصی واقعہ۔ نہیں۔ بلکہ ایسا عالم گیر حادثہ ہے جس کا احساس ہزار ہا دوستانِ اردو کے لیے ناگزیر ہے۔ مرحوم موجودہ لوگوں میں ادبِ اردو کے سب سے بڑے محسن تھے اور

اس بنا پر ادیب جس کا مقصد اولین ادب اُردو کی خدمت گزاری ہے۔ اُس کا فرض ہے۔ کہ مرحوم کی وفات پر اشک حسرت بہلائے۔ اور اُن کی میت پر تعزیت کے پھول چڑھائے ✦

موجودہ دور نے سنجیدہ مضامین کے جو چند گران پایہ مصنفین اُردو پیدا کیئے۔ اُن کے بہترین افراد یہ ہیں۔ سر سید۔ آزاد۔ نذیر احمد حالی۔ اور شبلی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اور اس میں کمال کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس لیئے ان میں سے کسی ایک کو قطعیت کے ساتھ۔ دوسرے پر ترجیح دینا ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ تاہم بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر علانیہ تفوق حاصل ہے مثلاً موجودہ سلیس اور عام فہم طرز تحریر کو علمی التصانیف میں رواج دینے کا فخر سر سید کو حاصل ہے[1]۔ سوانح عمریاں لکھنے کی بنیاد حالی کے ہاتھوں پڑی۔ انگریزی مذاق کی مناسبت سے اُردو میں ایک خالص انشاء پردازانہ طرز اور اکی ایجاد کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ دقیق علمی مباحث و نیز تاریخی واقعات کے بیان میں شگفتگی و دلآویزی پیدا کر دینے سے اعزاز کا مستحق شبلی ہے۔ غرض اپنے اپنے امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے ہر مصنف اپنی جگہ یگانۂ فن نظر آتا ہے۔ تاہم ایک شے ایسی ہے جس میں اُردو کا کوئی مصنف نذیر احمد کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور وہ اُس کی وسعتِ اثر ہے۔ اُردو کے بہتر سے بہتر اہل قلم کا بھی حلقۂ اثر محدود ہے۔ اُس کی تصنیفات کے مطالعہ کرنے والے خاص خاص طبقات ہیں۔ لیکن نذیر احمد کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ نیم تعلیم یافتہ مرد جو آزاد و شبلی کا ایک صفحہ سمجھنے کی بھی استعداد نہیں رکھتے۔ نذیر احمد کی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ اور مزے مزے لے کر پڑھتے ہیں خواندہ مستورات جنھیں سر سید۔ حالی۔ و ذکاء اللہ کی خشک تحریروں سے وحشت ہوتی ہے نذیر احمد کے نام پر سر دھنتی ہیں۔ عام افراد جو عربی و فارسی سے مطلق بے بہرہ ہیں۔ نذیر احمد کے وضع کردہ الفاظ و اصطلاحات کو روزمرہ گفتگو میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ یہ قبولِ عام یہ وسعتِ اثر بلا وجہ نہیں۔ اِس کے اسباب ہیں جنھیں ہم نذیر احمد کی انشاء پردازی کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ذیل میں نمبروار الگ الگ دکھاتے ہیں ✦

(۱) ترجمۂ تعزیراتِ ہند۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ دُنیا کی معمولی زندگی اور روزانہ کاروبار میں ہم جن الفاظ کا سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق حاکمِ وقت کے قوانین سے ہوتا ہے۔ حکام عدالت۔ اہل عملہ۔ وکلاء و پیروکار۔ فریقینِ مقدمہ ملازمانِ پولیس ان سب کی مجموعی تعداد بجائے خود۔ آبادیِ ملک کا بہت بڑا حصہ ہوتی ہے۔ پھر عام باشندوں میں بھی شاذ و نادر افراد ایسے ہوتے ہیں جنھیں عدالتی کارروائیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ قانونی اصطلاحات لٹریچر کا نہایت اہم جزو ہوں۔ چنانچہ مولانا نذیر احمد کی ادبی اہمیت کا اصلی راز یہ ہے۔ کہ انھوں نے قانون فوجداری کی قاموسِ اعظم مجموعۂ قوانینِ تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کیا۔ اور انگریزی الفاظ۔ اصطلاحات و طرزِ تحریر کو اس خوبی کے ساتھ اُردو کے قالب میں بدلا۔ کہ اگر خود اُردو میں اصلِ کتاب تصنیف کی جاتی تو امید نہیں۔ کہ اس ترجمے سے بہتر ہو سکتی۔ قانونی اصطلاحات کے وضع کرنے میں انتہائی احتیاط۔ دُور اندیشی۔ نکتہ سنجی۔ اور زباں دانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ معنی میں ذرا سا گھٹ بڑھ ہوا۔ کہ قانون کا سارا منشا فوت ہو گیا۔ لیکن مولانا نذیر احمد نے اس خدمت کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کہ خلاف کے لیئے اس میں اصلاح کی گنجائش نہ رہی۔ اور ان کے وضع کردہ اصطلاحات تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئے۔ استحصالِ بالجبر۔ خیانتِ مجرمانہ۔ ازالۂ حیثیتِ عرفی۔ اقدامِ جرم۔ ارتکابِ جرم۔ قتل مستوجب سزا۔ خلافِ قانون۔

[1] علمی التصانیف کی قید اس لیئے ہے کہ نثر کے خطوط وغیرہ میں اس طرز تحریر کا اصل بانی غالب تھا ۱۲

استحقاقِ حفاظتِ خود اختیاری جسے بیجا سکر تکلیف، مداخلتِ بیجا، جرا انخلاف وضع فطری جبس بیجا، ام اجبور دریائے شور وغیرہ منجملہ اُن صدہا الفاظ کے ہیں جن کو آج جاہل سا جاہل شخص بھی بلا تکلف استعمال کرتا ہے۔ اکثر تعلیم یافتہ افراد تک یہ سمجھتے ہیں کہ یہ الفاظ اُردو کی عام ارتقائی رفتار کے ساتھ ساتھ وجود میں آگئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو میں ان کو روشناس کرنے کا فخر صرف ایک فردِ واحد یعنی نذیر احمد کو حاصل ہے۔ ان الفاظ کی پیدایش کو ایک قرن سے زائد گزر چکا لیکن انصاف سے کہو کہ ان مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے ان سے بہتر کوئی الفاظ آج بھی کسی کے ذہن میں آتے ہیں؟ اور صرف تعزیراتِ ہند ہی نہیں بلکہ ضابطۂ فوجداری۔ قانونِ اسٹامپ۔ قانونِ انکم ٹیکس بھی مولانا ہی کے ترجمہ ہیں +

(۲) ترجمۂ قرآن۔ جس طرح اجتماعی زندگی میں ہمیں قانونی و سرکاری معاملات سے ہر وقت سابقہ رہتا ہے۔ اسی طرح حیاتِ منزلی پر عموماً سب سے زیادہ گہرا اثر مذہب کا ہے۔ اہلِ اسلام کی خانگی زندگی بھی مذہب کے اثر میں اس قدر محیط ہے۔ کہ روا جاان کے یہاں ہر فرد پر قرآن کی روزانہ تلاوت کرنا فرض ہے۔ اس بنا پر اس کی سخت ضرورت تھی کہ ان کی الہامی کتاب کا ترجمہ ملکی زبان میں موجود رہے۔ چنانچہ جب سے اُردو زبان ہندوستان میں عام طور پر رائج ہوئی۔ اُس وقت سے اب تک قرآن کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ لیکن آج سے تیس سال قبل جتنے اُردو ترجمے موجود تھے۔ ان کی عبارت بجائے خود چیستان تھی۔ اور عربی زبان سے معتدبہ واقفیت رکھنے والے ہندوستانی مسلمان کے لیے یہ فیصلہ دشوار تھا کہ قرآن کے اصلِ متن اور اُس کے اردو ترجمے میں اُس کے لیے زیادہ قریب الفہم کون ہے۔ شمس العلما نذیر احمد نے ادب اُردو کے خزانے کی اس کمیابی کو رفع کر دیا اور اگرچہ ان کا ترجمہ بھی نقائص سے خالی نہیں۔ تاہم یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ اردو میں کوئی ترجمۂ قرآن اس سے بہتر کیا۔ بلکہ اس کے برابر بھی اب تک موجود نہیں +

عام ترجموں کے برخلاف الہامی کتابوں کے مترجم کے لیے صرف زبان دانی و انشا پردازی کافی نہیں۔ بلکہ اُن کے ترجمے کے لیے یہ ضرور ہے کہ جو زورِ کلام اور واعظانہ طرزِ ادا اصلِ کتاب میں ہو وہی اس میں بھی قائم رہے۔ اور متن کے مطالعہ کرنے والے جس خشوع و خضوع کی کیفیت اور ایک فوق البشر قوت کے احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت و اثر ترجمے خواں پر بھی پڑے۔ بائبل کے مترجمین نے اس نکتے کو خوب سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ذہن ایک ہی قسم کے احساسات سے متاثر ہوتا ہے۔ مولانا نذیر احمد نے بھی اس کی کوشش کی اور گو اس میں پوری کامیابی تو انھیں حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اس معرکے میں بھی وہ ایک بڑی حد تک فتح مند ثابت ہوئے۔ ذیل میں ہم بائبل اور قرآن کے ایک مشترک قصے کا ترجمہ بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کو یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ مولانا نذیر احمد اور مترجمین بائبل اپنی اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ قصۂ ذیل کا خاکہ یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیم کے پاس کچھ فرشتے انسان کی شکل میں آکر مہمان ہوئے ہیں جنھوں نے سارہ کو ولادتِ فرزند کی خوش خبری دی ہے۔ اور اس کے بعد جا کر قومِ لوط کو برباد کیا ہے +

ترجمۂ بائبل

پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اُسے یعنی ابرہام کو نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ اور

ترجمۂ قرآن

اور (دیکھو) ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے (تو) انھوں نے (ابراہیم کو) سلام کیا۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا

اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھا کہ تین مرد اُس کے پاس کھڑے ہیں۔ وہ انھیں دیکھ کر خیمے کے دروازے سے اُن کے ملنے کو دوڑا۔ اور زمین تک اُن کے آگے جُھکا۔ اور بولا کہ اے خداوند اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو اپنے بندے کے پاس سے چلے نہ جائیے کہ تھوڑا سا پانی لایا جاوے۔ اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت کے نیچے آرام کیجیے۔ میں تھوڑی روٹی لاتا ہوں۔ تازے دم ہو جیے بعد اس کے آگے جائیے۔ کیونکہ آپ اسی لیے اپنے بندے کے یہاں آئے ہیں۔ تب انھوں نے کہا یوں ہی کر جیسا تُو نے کہا۔ اور ابراہام خیمے میں سرہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا تین پیمانے آٹا لے کر جلد گوندھ کے پھلکے پکا۔ اور ابراہام گلّے کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اور اُس نے جلد اُسے تیار کیا۔ پھر اُس نے گھی اور دودھ اور اُس بچھڑے کو جو اُس نے پکوایا تھا لے کے اُن کے سامنے رکھا اور آپ اُن کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور اُنھوں نے کھایا۔ تب اُنھوں نے اس سے کہا کہ تیری جورو سرہ کہاں ہے؟ وہ بولا دیکھو خیمے میں ہے اور اس نے کہا میں زندگی کے حساب سے وقت معین پر تیرے پاس پھر آؤں گا۔ اور دیکھ تیری جورو سرہ کو بیٹا ہو گا۔ اس کے پیچھے خیمے کے دروازے میں سرہ اُس کی سُنتی تھی اور ابراہام اور سرہ بوڑھے اور بہت دن کے تھے اور سرہ سے عورتوں کی معمولی عادت موقوف ہو گئی تھی۔ تب سرہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کہ بعد اس کے کہ میں ضعیف ہو گئی اور میرا خداوند بھی بوڑھا ہو گیا مجھ کو خوشی ہو گی؟ پھر خداوند نے ابراہام سے کہا کہ سرہ کیوں کر ہنس کر بولی کہ کیا میں جو ایسی بڑھیا ہو گئی۔ سچ مچ جنوں گی؟ کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے؟ میں معین وقت پر تجھ پاس پھر آؤں گا اور سرہ کو بیٹا ہو گا۔ تب سرہ نے انکار کر کے کہا کہ میں نہیں ہنسی۔ کیوں کہ وہ ڈرتی تھی۔ پھر اُس نے کہا نہیں تُو البتہ ہنسی ✤

تب وے مرد وہاں سے اُٹھ کر سدوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ابراہام انھیں رخصت کرنے کو ان کے ساتھ چلا۔ اور خداوند نے کہا کہ جو میں

پھر ابراہیم نے بلا توقف بچھڑا (یعنی اُس کا بُھنا ہوا گوشت اُن کے سامنے) لا موجود کیا۔ پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ تو کھانے کی طرف اُٹھتے ہی نہیں تو اُن سے بدگمان ہوئے اور جی ہی جی میں اُن سے ڈرے۔ وہ بولے (کہ آپ کسی طرح کا) خوف نہ کیجیے ہم تو (فرشتے ہیں اور) قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ اُن کو اُن کی بدکرداریوں کی سزا دیں) اور (اس گفتگو کے وقت) ابراہیم کی بی بی (سارہ) بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ (فرشتوں کے اطمینان کر دینے سے) خوش ہو گئیں تو ہم نے اُن کو (اُن ہی فرشتوں کے ذریعے سے پہلے) اسحٰق (بیٹے) اور اسحٰق کے بعد یعقوب (پوتے کے پیدا ہونے) کی خوش خبری دی۔ وہ لگیں کہنے ہائے میری کم بختی کیا (اس عمر میں) میرے اولاد ہو گی اور میں تو بڑھیا ہوں اور یہ (جو) میرے شوہر ہیں (یہ بھی) بوڑھے (ہیں) ایسے میں ہمارے ہاں اولاد کا ہونا بے شک (بڑی) عجیب بات ہے۔ فرشتے بولے کیا تم کو خدا کی قدرت سے (یہ امر کچھ) عجیب معلوم ہوتا ہے اے اہل بیت (نبوت) تم پر خدا کی رحمت اور اُس کی برکتیں (نازل ہوں) بے شک خدا سزاوار حمد (و ثنا اور اپنے بندوں پر) بڑا (ہی کرم کرنے والا) ہے۔ پھر جب ابراہیم (کے دل) سے خوف دُور ہوا اور اُن کو (اولاد کی) خوش خبری بھی مل لگے قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے۔ بے شک ابراہیم بڑے بُردبار بڑے نرم دل (ہر بات میں خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے (ہم نے فرمایا کہ) ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دو۔ تمھارے پروردگار کا (جو) حکم (تھا وہ) آ پہنچا اور ان لوگوں پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو (کسی طرح) ٹل نہیں سکتا۔ اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو اُن کا آنا اُن کو بُرا لگا اور (اُن کے آنے) کی وجہ سے تنگ دل ہوئے اور لگے کہنے کہ یہ (آج کا دن) تو بڑی مصیبت کا دن ہے۔ اور لوط کی قوم کے لوگ (لڑکوں کا آنا سُن کر ارادہ بد سے) دوڑے دوڑے لوط کے پاس آئے اور یہ لوگ پہلے سے بُرے کام تو کیا ہی کرتے تھے

جو کرتا ہوں کیا ابرہام سے چھپاؤں ابرہام تو یقیناً ایک بزرگ اور بڑی
قوم ہوگا اور زمین کی سب قومیں اُس سے برکت پائیں گی کیونکہ
میں اُس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے
کو حکم کرے گا اور وے خداوند کی راہ کی نگہبانی کرکے عدل اور
انصاف کریں گے تاکہ خداوند ابرہام کے واسطے جو کچھ کہ اُس نے
اُس کے حق میں کہا ہے پورا کرے۔ پھر خداوند نے کہا اس لیے کہ
سدوم اور عمورہ کا چلّانا بلند ہوا اور اُن کا جرم نہایت سنگین
ہوگیا ہے۔ میں اب اُتر کر دیکھوں گا کہ اُنھوں نے سراسر اُس چلّانے
کے مطابق جو مجھ تک پہونچا کیا ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو میں
دریافت کروں گا تب وے مرد وہاں سے اپنا مونہ پھیر کے سدوم
کی طرف چلے۔ پر ابرہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا +
اور وے دو فرشتے شام کو سدوم میں آئے اور لوط سدوم کے پھاٹک
پر بیٹھا تھا اور لوط انھیں دیکھ کر ان کے استقبال کے لیے اُٹھا اور
اُن سے پہلے کہ وے لیٹے شہر کے مردوں یعنی سدوم کے مردوں نے جوان
سے لے کے بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اُس گھر کو گھیر لیا اور
اُنھوں نے لوط کو پکار کرکے اُس سے کہا کہ ای مرد جو تیرے یہاں آج
کی رات آئے کہاں ہیں؟ انھیں ہمارے پاس باہر لا تاکہ
ہم ان سے صحبت کریں۔ تب لوط دروازے سے اُن پاس باہر گیا اور
کواڑ اپنے پیچھے بند کیا۔ اور کہا کہ اے بھائیو ایسا بُرا کام نہ کیجیو
اب دیکھو میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں۔ مرضی ہو
تو اُن کو تمھارے پاس نکال لاؤں اور جو تمھاری نظر میں پسند ہو
اُن سے کرو مگر ان مردوں سے کچھ کام نہ رکھیو کیونکہ وے اسی واسطے میری چھت کے سائے میں آئے تب اُنھوں نے کہا کہ ہٹ جا پھر
اُنھوں نے کہا کہ یہ ایک شخص یہاں گزران کرنے آیا سو حاکم کیا چاہتا ہے۔ اب ہم تیرے ساتھ اُن سے زیادہ بدسلوکی کریں گے
تب وے اُس مرد یعنی لوط پر حملہ کرکے آئے اور کواڑ توڑنے کو لپکے۔ تب اُن مردوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لوط کو اپنے پاس گھر میں
کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور اُن مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے کیا چھوٹے کیا بڑے اندھا کر دیا سو وے دروازے ڈھونڈتے ڈھونڈتے
ڈھونڈتے تھک گئے۔ تب اُن مردوں نے لوط سے کہا کیا یہاں تیرا اور کوئی ہے؟ داماد یا بیٹے یا بیٹیاں اور جو کوئی تیرا اس شہر
میں ہے تو اسے لے کر اس مقام سے نکل جا کیونکہ ہم اس مقام کو غارت کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا چلّانا خدا کے حضور بہت بلند ہوا

لوط نے جوان لڑکوں کو آتے دیکھا تو) لگے کہنے کہ بھائیو! یہ میری
بیٹیاں (موجود) ہیں (ان سے نکاح کر لو) یہ تمھارے لیے
(حلال اور) پاکیزہ تر ہیں تو (ان لڑکوں کی طرف نظر نہ کرو اور)
خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبرو ریزی
نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ اُنھوں نے جواب
دیا کہ تم کو تو معلوم ہے کہ ہم کو تمھاری بیٹیوں سے کسی طرح کا
سروکار ہے نہیں اور ہمارے ارادے سے بھی تم بخوبی واقف
ہو (لوط) بولے ای کاش (آج) مجھ کو تمھارے مقابلے کی قوت
ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا (فرشتے)
بولے کہ لوط! ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ
ہرگز تم تک نہیں پہونچ پائیں گے تو تم اپنے اہل (و عیال) کو
لے کر کچھ رات (رہے) سے نکل بھاگو اور (پھر) تم میں سے کوئی
مُڑ کر (بھی اُدھر کو) نہ دیکھے مگر تمھاری بی بی کہ (وہ نہ دیکھے
نہیں رہنے کی اور) جو (عذاب) ان لوگوں پر نازل ہونے والا
ہے وہ اُس پر بھی ضرور نازل ہوگا ان (کے عذاب) کا وقت مقرر
صبح ہے کیا صبح قریب نہیں؟ پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہونچا
تو (ای پیغمبر) ہم نے (اُلٹ کر) اُس (بستی) کے اوپر کے حصّے
کو اُس کے نیچے کا حصّہ کر دیا اور (اُوپر سے) اُس پر برسائے جھے
ہوئے کھڑنجے کے پتھر جن پر تمھارے پروردگار کے ہاں نشان
کیا ہوا تھا (کہ یہ اُس قوم پر برسیں گے) +

{سورۂ ہود رکوع ۷}

اور خداوند نے اُس کے غارت کرنے کو ہمیں بھیجا اور ایسا ہوا کہ جب وہ اُن کو باہر نکال لائے تو اُس نے کہا کہ اپنی جان لے کر بھاگ۔ پیچھے پیچھے مت دیکھ اور میدان میں کہیں مت ٹھیر اور جس وقت لوط ضغر میں داخل ہوا سورج کی روشنی زمین پر پھیلی تب خداوند نے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ خداوند کی طرف سے آسمان پر سے برسائی۔ اور اُس نے ان شہروں کو اور اس سارے میدان کو اور ان شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا نیست کیا۔ مگر اُس کی جورو نے اُس کے پیچھے سے پھر کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی (پیدائش باب ۱۸ و ۱۹) +

اقتباساتِ بالا میں جزئی اختلافات کے ساتھ ایک ہی واقعے کا بیان ہے مگر طرزِ بیان کے فرق سے دیکھیے کہ ذہن پر دونوں کا کتنا مختلف اثر پڑتا ہے مترجمین توریت نے لفظ کے بالمقابل لفظ رکھنے کا التزام کیا۔ اور اس لیے اُن کی تحریر میں وہ عظمت و متانت نمایاں طور پر موجود ہے جو کلامِ ربانی کے لیے ضروری ہے اور جس سے مولانا نذیر احمد کا ترجمہ خالی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ چونکہ مترجمین توریت زبانِ اردو کے ماہر نہ تھے۔ اس لیے توریت اُردو کا ادبی حیثیت سے کوئی پایہ نہیں بلکہ بعض جگہ اُس کی عبارت معمّا بن گئی ہے چنانچہ اسی اقتباساتِ بالا میں ایک سے زیادہ ایسی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں جن کا مرجع متعین کرنا آسان نہیں۔ برخلاف اس کے مولانا کا ترجمۂ قرآن معانیِ کلام، شستگیِ بیان، ہمواریِ عبارت کے لحاظ سے اُردو انشا پردازی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ جسے شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اور کسی ایک مقام پر بھی نہ پیچیدگیِ مفہوم کی وجہ سے اٹکنا پڑے گا۔ نہ تعقید و ناہمواری کی کوئی مثال ملے گی۔ بلکہ ان کے ترجمے کا غالب حصہ تو ترجمہ معلوم ہونے کی بجائے خود انھیں کی تصنیف کا کوئی جزو نظر آتا ہے۔ غرض اگر مولانا اس ترجمے میں کسی قدر زیادہ متانت و سنجیدگی کو کام میں لاتے۔ تو یہ ترجمہ بے عیب ہوتا اور اب بھی قرآن کے موجودہ ترجموں میں کوئی اُس کے لگ بھگ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۹۶ء سے پہلے قرآن کا ترجمہ پڑھنے والے لوگ خال خال تھے۔ لیکن اب جس کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ محتاجِ ذکر نہیں +

(۳) مولانا کی تعمیمِ اثر کا تیسرا عنصر اُن کی وہ تصنیفات ہیں جو انھوں نے تعلیمِ نسواں کے لیے تیار کی تھیں۔ دُنیا کی کوئی تحریک صحیح معنی میں اُس وقت تک عالمگیر و پائدار نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ طبقۂ اناث اُس سے متاثر نہ ہو اس لیے کہ آیندہ نسل کے افراد میں کسی عقیدے یا خیال کو جزوِ فطرت بنا دینے والی تعلیم گاہ۔ کالجوں کے لکچر ہال۔ اور یونیورسٹیوں کے محل نہیں بلکہ آغوشِ مادر ہے۔ آج جدید تعلیم یافتہ گروہ تعلیم و حریتِ نسواں کے نعرے لگاتے لگاتے تقریباً تھک چکا ہے۔ لیکن اس کی کوششوں کی مناسبت سے اب تک جو اس تحریک کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا خاص سبب یہی ہے کہ خود ہماری مستورات میں ابھی اپنی اصلاحِ حالت کا پورا احساس نہیں پیدا ہوا اور اس الزام کا داغ جدید گروہ کی پیشانی سے کسی طرح نہیں مٹ سکتا کہ باایں ادعا و بالاخوانی اس کے کسی فرد سے یہ آج تک نہ ہو سکا کہ لڑکیوں کے لیے کوئی اعلیٰ نصاب تعلیم تیار کرے شمس العلما مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے آج سے کوئی چالیس سال پیشتر مراۃ العروس تیار کی یہ کتاب ایک قصے کی صورت میں ہے جس میں اکبری و اصغری دو سگی بہنوں کے واقعاتِ زندگی کے پردے میں حیاتِ منزلی اور خانہ داری کی تقریباً تمام مسائل کی تعلیم دی ہے۔ زبان اس قدر صاف و سلیس ہے کہ سواد خواں لڑکیاں نہایت آسانی سے سمجھ جاتی ہیں۔ ابتدا قصے کا اس قدر دلچسپ اور مذاقِ نسواں کے مطابق ہے کہ گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں جو خود نہیں پڑھ سکتیں اپنی خواندہ بیٹیوں

دنیا کے اس عظیم الشان کارخانے کا ذرہ ذرہ، سمندروں کا قطرہ قطرہ، درختوں کا پتّا پتّا خدا کی ہستی کا گواہ ہے۔ اس لیے کہ کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی زمین میں ہو یا آسمان میں، خشکی میں ہو یا تری میں، جان دار ہو یا بے جان اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں۔ آپ سے آپ نہیں بن گئی ضرور کسی کے بنائے سے بنی ہے۔ ہم نے اُس بنانے والے کی جستجو کی اور زمین سے لے کر آسمان تک چھان مارا تو کسی کو اس لائق نہ پایا جس کو دیکھا عاجز۔ جن کو ٹٹولا در ماندہ روئے زمین پر ہم ہی سب میں پیش پیش تھے کہ عقل رکھتے تھے۔ سو اپنا زقد رخود ناشناس، سُن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ناچار آسمان پر نظر دوڑانی چاہی تو ابراہیم علیہ السلام کا قصہ یاد کر کے خاموش بیٹھ گئے۔ اور سمجھے کہ جس کی جستجو ہے وہ چشم سر سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ بنی اسرائیل نے شوخ چشمی کی۔ تو فاخذتھم الصاعقۃ کی سزا پائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے غلبہ شوق میں آ کر حوصلہ کیا تو خود بیہوش ہو گئے اور ندامت شرمندگی اُٹھائی۔ یعنی خدا ہمارے حواس ظاہری کی گرفت سے بالاتر ہے۔ اور یہ ہمارے حواس کا قصور ہے + ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ہاں چشم دل سے دیکھا جائے تو دنیا آئینہ خانہ ہے۔ اور در و دیوار خدا کے نور سے جگمگا رہے ہیں ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اسی سلسلے میں پیغمبر محمود صاحب نے مذہبی معتقدات کو مختصراً ذکر کر کے لکھتے ہیں +

بعض ہندوؤں نے اتنے خدا بنا ڈالے۔ کہ ایک خدا کے حصے میں پورا ایک بندہ بھی نہیں آتا۔ اور یہ نہ سمجھے کہ خدا کے واحد کے سوا کوئی اور خدا بھی ہوتا تو دو پاسن ایک جگہ رکھے ہوئے کھٹکھٹا اُٹھتے ہیں ایسا تو کیا ہے کہ دو یا زیادہ خداؤں میں اختلاف نہ ہو اور اختلاف ہو تو دنیا ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتی۔ دو بادشاہ آپس میں لڑتے ہیں تو ملک کے ملک خاک سیاہ ہو جاتے ہیں اور خداؤں کی لڑائی تو خدا کی پناہ پس دنیا کا ایک اسلوب پر چلا جانا صاف اس بات کی دلیل ہے کہ تمام عالم میں ایک خدا کی حکومت ہے (جلد ۱ صفحہ ۱۳) +

ابوطالب کی وفات کے بعد پیغمبر اسلام کے واقعات زندگی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں +

ابوطالب کا مرنا تھا کہ دشمنوں نے بڑا زور باندھا۔ اور نوبت یہ پہنچی کہ پیغمبر صاحب کے رستے میں کانٹے بچھاتے، کہ خانہ کعبہ کو جاتے ہوئے پاؤں میں چبھیں۔ ایک بار سجدے میں تھے کسی موذی نے اونٹ کا بوجھ لا کر گردن پر ڈال دیا۔ کہ اُٹھ نہ سکیں۔ بیہودے سر پر خاک ڈالتے پیٹ پڑتے اور گلا گھونٹا۔ نومسلموں میں سے جس کو پکڑ پاتے بُری طرح ستاتے۔ آخر پیغمبر صاحب نے نومسلموں کو اجازت دی کہ حبش چلے جاؤ اور خود طائف تشریف لے گئے کہ وہاں کے رئیسوں سے امداد کی توقع تھی وہاں بھی معاملہ بالعکس پیش آیا اور اوباشوں نے پتھر مارے اور نکال دیا۔ ناچار مکے واپس آئے یہاں دشمنوں نے ملنا جلنا، کھانا پینا تک بند کر دیا۔ طرح طرح کے لالچ دیے۔ ڈراوے دکھائے۔ جب دیکھا کہ یہ شخص کسی طرح باز نہیں آتا۔ اور جو کوئی ایک دفعہ اس کا کلمہ پڑھ لیتا ہے پھر اپنے قول سے نہیں پھرتا۔ تو صلاح یہ ٹھہری کہ ہنگامہ کر کے اسے مار ڈالو۔ بہت ہنگامہ ہو گا تو دیت بھری جائے گی سب بانٹ کر کے بھر دیں گے۔ یہ منصوبہ باندھ کر ایک رات

گھبرا گئیں۔ پیغمبر صاحب کو خبر ہوئی۔ تو اپنی جگہ علی کو لٹا اور ابوبکر کو ساتھ لے چپکے سے گئے ۔ تین میل کے فاصلے پر غار ثور میں جا چھپے ۔ دشمن جو نرغہ کیے گھر کو گھیرے پڑے تھے۔ اُن کو خبر نہیں۔ صبح ہوئی تو دیکھا پیغمبر صاحب کا پتہ نہیں علی ہیں اُن کی چادر اوڑھے پڑے ہیں۔ چھپنے کی بھڑوں کی طرح جستجو کے لیے نکل پڑے۔ خدا کی قدرت غار پر ہو کر گزرے اور سوجھ نہ پڑا۔ (جلد ۲ صفحہ ۳۹) +

یہ نمونہ اُن کے عام انداز تحریر کا ہے جس سے اُن کی کوئی کتاب مستثنےٰ نہیں۔ مبادی الحکمت کے عنوان سے انھوں نے ۱۹۰۰ء میں منطق پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس میں بھی جہاں منطقی اصطلاحات آگئے ہیں۔ وہاں تو مجبوری ہے۔ ورنہ عموماً یہی شگفتہ طرز ادا قائم ہے۔ سررشتۂ تعلیم نے اس رسالے کی کافی سرپرستی کی۔ اور گورنمنٹ نے پانچ سو روپے انعام دیا۔ یہ رسالہ گو مختصر ہے۔ تاہم اردو میں کوئی دوسری کتاب اب تک اس کے مساوی درجے کی نہیں شائع ہوئی۔ مولانا کی جو دیگر قابلِ ذکر تصنیفات ہیں۔ مثلاً ابن الوقت رویائے صادقہ۔ فسانۂ مبتلا۔ ان سب کا یہی طرز تحریر ہے۔ یہ کتابیں افسانے کی صورت میں ہیں۔ جن میں سے آخر الذکر میں تعدد ازواج وغیرہ کی معاشرتی خرابیاں دکھائی گئی ہیں۔ اور مقدم الذکر ہر دو کتب میں جدید مذاق والے مذہب پر جو اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن الوقت زبان و پیرایہ کے لحاظ سے ان سب میں بہتر ہے۔ اس کو تصنیف کیے ہوئے تقریباً پچیس سال ہو چکے ہیں لیکن مولانا نے ۱۸۸۸ء میں ہمارے فیشن پرستوں اور ان کے اور انگریزوں کے باہمی تعلقات کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ خفیف تغیر کے ساتھ اس وقت تک بالکل صحیح و مطابق واقعہ ہے۔ ان کتابوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے۔ اور نہ مختلف مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس لیے انھیں ناول تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ یہ قدیم مذاق کے مطابق جن و پری کے مافوق الفطرت افسانے بھی نہیں۔ ان میں روزمرہ کے واقعاتِ زندگی کا عکس اُتارا گیا ہے جس میں اور اصل صورت میں خط و خال تک کا فرق نہیں۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے ابنائے زمانہ کی کتنی صحیح نبض پہچانی تھی +

(۵) لیکن مولانا کی فصاحتِ کلام و سلاست سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ کہ ان کے رنگِ انشا پردازی کا تتبع آسان ہے۔ یا یہ کہ وہ خود بغیر غور و فکر کے برجستگی کے ساتھ تصنیف و تالیف کیا کرتے تھے[۱]۔ بلکہ برعکس اس کے واقعہ یہ ہے کہ بجز آزاد کے ان کے رنگ کا تتبع سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ان کی تقلید کرنے والے کے لیے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ اردو زبان کے محاورات و ضرب الامثال اگر کل کے کل نہ یاد ہوں۔ تو کم از کم ان کا جزوِ غالب تو ضرور نوکِ زبان ہو۔ اسی کے ساتھ شاعری کا عنصر بھی اتنا قوی ہو۔ کہ ہر دعویٰ۔ ہر واقعے کی تمثیل عام و معمولی مثالوں کے ذریعے سے دے سکے۔ اس کے علاوہ عربی و فارسی زبان میں نہ صرف کافی مہارت رکھتا ہو۔ بلکہ اُن کے لٹریچر پر اسے اس قدر عبور حاصل ہو۔ کہ اُن کے مقولہ جات اشعار۔ ضرب الامثال۔ تلمیحات۔ قصص طلب حوالجات۔ حسب موقع جہاں چاہے۔ بلاتکلف اُردو میں کھپا سکے۔ آخری۔ اور نہایت دشوار شرط یہ ہے کہ اتنا ذوق اس قدر صحیح رکھتا ہو کہ ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرے کہ ہر جگہ آمد ہی آمد قائم رہے آورد کی کہیں جھلک تک نہ آنے پائے۔ ظاہر ہے کہ ان شرائط میں سے بعض فطری ہیں اور بعض کسبی۔ اور جب تک کوئی شخص ان کا جامع نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ شوقِ تکلف کا بھی حصہ دار نہ ہو۔ نذیر احمد کا کامیاب متبع نہیں ہو سکتا۔ سر سید اور شبلی کی تصانیف سمجھنے کے لیے اردو زبان کے معمولی لغات سے واقفیت کافی ہے اور ساتھ ہی

[۱] یہ خیال جس قدر عام ہے۔ اسی قدر غلط ہے۔ اپنے طرزِ تصنیف کا حال مولانا خود بیان کرتے ہیں "ہم نے بھی اپنی عمر کا معتدبہ حصہ اسی شغل (تصنیف و تالیف) میں گزارا ہے تو اطمینان سے برسوں میں مسودے کیے ہیں۔ برسوں مسودے زیرِ نظر رہے ہیں۔ اور اس پر بھی آخری پروف تک ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہے تب کہیں جا کر کتاب کو صلۂ قبول حاصل ہوا ہے" (الحقوق جلد ۱ صفحہ ۲۸) مولانا کے جاننے والوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے لیکچروں کی تیاری میں اسی قدر محنت کرتے تھے ۱۲

ملک کے اُردو خوان باشندے اُن سے بہ آسانی متمتّع ہو سکتے ہیں لیکن نذیر احمد کی انشا پردازی کی داد دینے کے لیے ہندوستان کے رسم و رواج ملکی و قومی روایات مسلمانوں کے مذہبی احساسات وغیرہ سے واقف ہونا بھی ناگزیر ہی۔ اس حیثیت سے ہم مولانا کی مثال انگلستان کے مصنفین میں پروفیسر ہکسلے سے پاتے ہیں۔ ہکسلے ایک نامی گرامی سائینس داں ہونے کے ساتھ انگریزی ادب کا بھی ایک مسلّم اُستاد سمجھا جاتا ہی لیکن اِن کی تحریر میں لاطینی و یونانی حوالے انجیل کے متعلق تلمیحات۔ انگریزی خصائل و عادات کی طرف اشارات اس کثرت سے آتے ہیں کہ بقولِ بعض ناقدین کے اُس کی انشا پردازی کی داد صرف اُس کے تعلیم یافتہ ہم وطن دے سکتے ہیں +

(۶) مولانا کے ان کمالات کے اعتراف کے ساتھ ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہی کہ محاورات کی افراط اور صفائیِ زبان کے جوش میں اُن کی تحریر اکثر پایۂ متانت سے گر جاتی تھی اور اس میں بعض نہایت سخیف الفاظ و جملے اُن کے قلم سے نکل جاتے تھے۔ مثلاً "دوھنا سیٹھ" بُوجھ بجھکیا۔ ناکرا۔ دُم دبا کر بھاگے۔ ہِراتی جاتی۔ من مانی گھر جاتی۔ ہتّے پر سے اُکھڑ جانا۔ کھسیانی بلّی کھمبا نوچ کر کھاتی ہی۔ وغیرہ یہ ایسے الفاظ و امثال ہیں جو اُن کی تصانیف میں جابجا پائے جاتے ہیں اور جن میں سے بعض اُن کے ترجمۂ قرآن تک میں موجود ہیں بعض مقامات پر اُن کی تشبیہات بھی بہت بھدّی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں کہ "بدزبانی" دیگِ غضب کا پہلا اُبال ہی"۔ اور ایک نقص، جو اُن کی تصانیف میں تو نہیں۔ مگر ان کے بعض لکچروں اور خطوط میں پایا جاتا ہی۔ وہ انگریزی الفاظ کا بلا ضرورت استعمال ہی۔ مثلاً اپنے ایک لکچر میں انھوں نے۔ آڈینس۔ اسٹینڈرڈ۔ ویکر سکس۔ وغیرہ ایسے انگریزی الفاظ کا بیجا استعمال کیا ہی جن سے خالص اُردو داں جماعت نامانوس ہی لیکن اس قسم کی جزئی فروگذاشتوں سے اُن کے مسلّم الثبوت ادبی تبحّر اور علم و فضل پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ماہتاب میں گو داغ ہیں لیکن اُس کے نورِ عالم افروز سے کون انکار کر سکتا ہی +

یہاں تک ہم نے مولانا کی انشا پردازی کے اندرونی خصوصیات بتائے۔ ان کے علاوہ دو خارجی اسباب کا بھی اُن کے طرزِ تحریر و عنواناتِ تصنیف پر خاص اثر پڑا۔ ایک یہ کہ مولانا شروع ہی سے معقول عہدوں پر فائز رہے۔ اس لیے انھوں نے تصنیف و تالیف کو مدارِ معاش نہیں بنایا۔ اور اسی لیے ان کی تحریروں میں معتقداتِ عام کی خوشامد اور مذاقِ عوام کی پاسداری نہیں بلکہ اس کے بجائے آزادیِ رائے کا جوہر موجود ہی۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے معاصرین کے برخلاف انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ آزاد حالی۔ و شبلی کو انگریزی زبان کی ناواقفیت کے باعث بہت سی باتوں میں پیچھے جانا پڑا۔ لیکن نذیر احمد کے متعلق مسٹر کیمسن سابق ڈائرکٹر تعلیمات شہادت دیتے ہیں۔ کہ وہ (یعنی مؤلف مبادی الحکمت) انگریزی میں بھی ایسی دستگاہ کافی رکھتا ہی۔ کہ علمی کتابوں کو اُن کی اصلی زبان میں پڑھ سکتا ہی (دیباچۂ کتاب مذکور)

مولانا کی تصانیف موسومۂ بالا کی فہرست پڑھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہی۔ کہ وہ سخت مذہبی آدمی تھے۔ بے شُبہہ، اگر مذہبی شخص کے یہ معنی ہیں کہ آدمی اپنے مذہب کے متعلق عقیدۂ راسخ رکھتا ہو۔ تو مولانا سخت مذہبی تھے لیکن اگر اس کے مفہوم میں تعصّب و تنگ خیالی بھی داخل ہیں۔ تو مولانا اس سے کوسوں دُور تھے۔ مرحوم درحقیقت اپنی روشن خیالی۔ رواداری۔ اور بے تعصّبی کے لحاظ سے دیگر علمائے مذہب کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونے تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ مذہبی فسادات و رنجشوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ اپنے ترجمۂ قرآن اور نیز دیگر مذہبی کتب کے ذریعے سے انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو غیر مذہب والوں سے دوستانے قائم رکھنے کی صلاح دی + یہاں تک کہ اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر جو مضمون انھوں نے لکھا (اور غالباً یہی اُن کا آخری مضمون ہی) اُس کا عنوان مسلمان

اور عیسائی ہے اور اس میں مذہبی دلائل سے دونوں قوموں کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ اسی مضمون کی تمہید میں مولانا ہندو مسلمان کے تعلقات کے بارے میں فرماتے ہیں:۔ (رسالہ تمدن بابت اکتوبر ۱۹۱۲ء)

ہندو مسلمانوں میں تو مثل مشہور ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کی ایک کے بدون گزر نہیں ہو سکتی اور حکومت بھی دونوں کو سازگاری اور صلح کاری پر مجبور کرتی ہے۔ فریقین کے ناعاقبت اندیش تنگ حوصلوں نے رسم و راہ کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مخالفت کا رنگ دے کر دونوں میں ایک طرح کی منافرت پیدا کر دی ہے۔ مگر ہم اس کو دیرپا منافرت نہیں سمجھتے۔ اگر شبے مانند شبے دیگر نیست مانند۔ اور سمجھ دار لوگوں نے اس کا تدارک بھی شروع کر دیا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ بعض اخبار جو اس آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں خود بخود بجھ جائیں گے۔

مولانا کی ادبی زندگی پر ایک اجمالی نظر ہم اوپر کے صفحات میں کر چکنے کے بعد اس تعزیت نامے کو ختم کرتے ہیں۔ اور مسٹر راشد الخیری ایڈیٹر تمدن کی خدمت میں اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ہم ان سے اس شخص کے سوانح زندگی اور علمی کارناموں کی تفصیل شائع کرنے کی درخواست کرتے ہیں جو قرابت نسبی کے لحاظ سے ان کا نانا اور قرابت علمی کے لحاظ سے ان کا محترم پیشرو ہوا ہے۔

مرحوم گو اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ تاہم اردو زبان کی ضروریات پر نظر کرتے ہوئے ان کی موت بالکل قبل از وقت واقع ہوئی ہے۔ اردو کا شمار ابھی مہذب زبانوں میں نہیں اور نہ اس وقت تک ہو سکتا ہے جب تک کہ اس میں علمی تصانیف نہایت کثرت سے موجود ہوں۔ لیکن اس کے لیے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اردو میں علمی اصطلاحات کا ایک کافی ذخیرہ موجود ہو۔ اور یہی وضع اصطلاحات کی وہ اہم ترین و عظیم الشان خدمت ہے جس کا پورا کرنے والا نذیر احمد کے بعد بظاہر اور کوئی نظر نہیں آتا۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب ۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

از سینٹ اسٹیفنز کالج میگزین دہلی نومبر ۱۹۱۲ء

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم:۔ افسوس ہے کہ دہلی کی مایۂ ناز ہستی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد شمس العلماء ایل ایل ڈی، ڈی او ایل، دہلوی ۲۷ اپریل سے کوئی ایک ہفتے تک بعارضہ فالج بیمار رہ کر تقریباً اسی برس کی عمر میں دار فانی سے عالم بقا ہوئے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دنیا ایک آمد و شد کی جگہ ہے۔ کون ہے جسے یہاں مرنا نہیں ہے اور بظاہر جانے والے سب برابر ہیں لیکن نہیں۔ اوصاف کے لحاظ سے ایک ایک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ جن کی ہستی اور سعی و عمل کا تعلق اپنی ذات اور آس پاس کے تنگ دائرے تک محدود ہو ہمیشہ اور ہر زمانے میں بہت اور بکثرت ہوتے ہیں لیکن وہ جن کے وجود اور اعمال و اوصاف کا اثر دور دور تک پڑا ہو ہمیشہ کم ہوئے اور کم تر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم ایک حد تک ایسے ہی بڑے اور خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی اور زندگی کے کاموں کا اثر ان کی ذات اور آس پاس کے حلقے سے تجاوز کر کے دور دور تک پڑتا رہا۔ ان کا وجود ایک بافیض وجود تھا۔ اور ان کی جد و جہد کامیاب سعی و عمل کا ایک اچھا نمونہ۔ وہ اپنی جوانمردی سے آپ بڑھے۔ اپنے علمی مشاغل سے خود کامیاب ہوئے اور دوسرے مستفید۔ چونکہ ایسے لوگوں کے حالات زندگی دوسروں کے لیے بھی بہت کچھ سبق آموز۔ اور ان کے کچھ نہ کچھ حقوق اپنوں سے گزر کر غیروں تک پہنچے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ان صفحات میں ڈاکٹر

نذیر احمد مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کریں جو غالباً بے سُود نہ ہوں گے +

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کا آبائی وطن بجنور تھا۔ لیکن ننھیال دہلی میں تھی۔ اسی تعلق سے اُن کے والد مولوی سعادت علی بجنور سے آکر دہلی رہنے لگے۔ یہ ایک مسجد میں رہا کرتے تھے اور مسجد کی خدمت ہی اِن کی وجہِ معاش تھی۔ ڈاکٹر مرحوم خود فرمایا کرتے تھے۔ میں مسجد کی روٹیوں سے پلا ہوں۔ اور بڑی فلاکت میں پڑھا ہوں +

تعلیم

مرحوم ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیئے عربی اور مذہبی تعلیم پانی ضروری تھی۔ عرصے تک یہ اپنی ننھیال کے بعض علماء سے پڑھتے رہے۔ جب تقریباً مستعد ہو گئے تو آرزو ہوئی کہ کوئی اعلےٰ سبق مولوی مملوک علی صاحب کے یہاں شروع ہو جائے جو اُس وقت شہر میں بڑے پائے کے عالم تھے۔ اور گورنمنٹ کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر بھی۔ خود کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب کو فرصت نہ تھی۔ مَیں نے باصرار التجا کی تو فرمایا۔ اچھا۔ جس وقت ہم مدرسے جایا کرتے ہیں آجایا کرو۔ رستے میں چلتے چلتے جو پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے۔ اُس زمانے کی طالب علمی ایسی ہی کٹھن تھی۔ مرحوم نے اسی کو غنیمت جانا۔ مولوی مملوک علی پینس میں سوار ہو کر کالج کو چلتے۔ یہ کتاب کو لے کر ساتھ ہو لیتے۔ پینس کے ساتھ دوڑتے۔ ٹھوکریں کھاتے۔ گرتے۔ مگر واہ رے شوق! اس پر بھی سبق ہو جانے کو دولت سمجھتے۔ مولوی مملوک علی کی ہم رکابی میں کالج کا راستہ دیکھ کر کچھ دنوں کے بعد اِن کے دل میں بھی خیال آیا کہ آؤ کالج میں داخل ہو جائیں۔ باصرارِ تمام والد کی طرف سے اجازت ملی اور یہ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہ وہی کالج تھا جس کی معنوی بُنیادوں پر ہمارے کالج کی عمارت قائم ہے۔ اور جس نے عربی۔ فارسی۔ اور انگریزی کے متعدد نامبردار پیدا کیئے تھے +

ڈاکٹر مرحوم کالج میں داخل ہوئے تو غالباً ٹیلر صاحب کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ ان کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ایک دن کہنے لگے۔ "نذیر احمد تم انگریزی کیوں نہیں پڑھتے؟ دیکھو اب تک تم پڑھ لکھ کر فارغ ہو گے اور دنیا میں قدم رکھو گے انگریزی کی ضرورت بڑھ جائے گی۔ ڈاکٹر مرحوم نے کہا۔ آپ والد سے فرمائیں؟ اگر وہ اجازت دے دیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مولوی سعادت علی اکثر کالج آیا جایا کرتے تھے ایک دن ٹیلر صاحب نے اُن سے بھی وہی کہا۔ اس وقت مسلمانوں کو انگریزی سے کچھ ایسی نفرت تھی کہ مولوی سعادت علی نے ٹیلر صاحب کی یہ ہمدردی و دلسوزی کی باتیں سُن کر کہا تو یہ کہا۔ خدایا! اگر اس لڑکے کو انگریزی سے روزی کمانا ہے تو ابھی مرجائے۔ مَیں اس کی زندگی کا روادار نہیں + بیچارے ٹیلر صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور یہ بدستور عربی کے درجوں میں ادب۔ فلسفہ۔ و ریاضی وغیرہ پڑھتے رہے اور آخر کالج کے تمام درجے طے کر کے سندِ تکمیل حاصل کر لی۔ آجکل کی طرح یہ نہ سمجھنا کہ مدرسے کے ساتھ ہی اُن کے پڑھنے لکھنے اور علمی ذوق و شوق کا خاتمہ ہو گیا۔ نہیں وہ عمر بھر پڑھتے رہے اور کبھی سیر نہ ہوئے۔ جیسا کہ اُن کی آیندہ زندگی کے حالات سے معلوم ہو گا +

دَورِ ملازمت اور علمی مشاغل

ڈاکٹر مرحوم اوّل اوّل کونی ہیں میں پچیس روپے ماہوار کے مدرس ہوئے۔ چوں کہ قابلیت کا جوہر رکھتے تھے اور حکام قدرداں اور جوہر شناس تھے اور زمانہ بھی وہ تھا کہ سررشتہ تعلیم میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی یہ جلدی ہی ترقی کر کے ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ہو گئے جن دنوں یہ الٰہ آباد میں تھے صاحب انسپکٹر اِن کے دفتر کا معائنہ کرنے آئے۔ یہ انگریزی سے نابلد تھے۔ مگر ان کا اسسٹنٹ انگریزی داں

جہاں ڈاکٹر مرحوم اس کی زبان اور اصطلاحات پر نظر ڈالتے بعد ازاں بعد سر ولیم میور کو سنایا جاتا۔ کہتے تھے اتفاقاً ایک دن ڈاک نہ پہونچی اور مجھے یہ فکر ہوئی کہ کل کیا سناؤں گا۔ جی میں آیا آؤ خود زور آزمائی کروں۔ اصل کتاب اور ڈکشنری لے کر بیٹھ گیا شدنی بات تھی روزانہ چار پانچ پیرگراف ترجمہ ہو کر آیا کرتے تھے میں نے گیارہ پیرگراف کر لیے۔ ترجمے کو بار بار پڑھا۔ لفظ لفظ پر اطمینان کیا۔ اور عبارت وغیرہ درست کیے اور دوسرے دن پیش جا کی۔ سر ولیم سُن کر اور پیرگراف گن کر کہنے لگے آج ترجمہ زیادہ ہے کیا بات ہے۔ اور دن چار پانچ پیرگراف ہوتے تھے۔ آج گیارہ کیوں ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ کل ڈاک نہیں آئی میں خود کتاب لے کر بیٹھ گیا جو ترجمہ ہو گیا حضور کے سامنے پیش کر دیا سر ولیم سُن کر بولے۔ ہوں تو یہ ترجمہ تم نے کیا ہے۔ اچھا جاؤ تم بھی مولوی عظمت اللہ کے ساتھ شریک ہو کر کام کرو۔ اور مناقشہ ترجمہ کرو۔ اصطلاحات کا ذرا زیادہ خیال رکھنا۔ اب یہ بھی ترجمے میں آ کر شریک ہو گئے اور اصطلاحات کے گویا مالک بن بیٹھے۔ جو اصطلاحات کی تلاش و تجویز کی مشکلات کو جانتے ہیں وہی اس کا خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر مرحوم کو اس خصوص میں کیا کچھ کاوش و کوشش کرنی پڑی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ مرحوم کا یہ کام اُن کی قابلیت و کوشش کی ایک زبردست سند ہے۔ انھوں نے اُردو میں اُس وقت قانونی اصطلاحات پیدا کیں جبکہ زبان میں ان کا کہیں وجود نہ تھا اور پھر وہ ایسی مقبولِ عام ہوئیں کہ آج تک اُن میں تغیر ہوا۔ اور نہ اس وقت تک ہی اُن سے بہتر اصطلاحات متعین ہو سکی ہیں

جب یہ ترجمہ ختم ہوا اور تمام و کمال مترجمین کی طرف سے ایک مکلف خریطے میں بحضور سر ولیم پیش کیا گیا تو سر موصوف نے دونوں مترجموں کو ایک ایک گھڑی سو روپے کی سنہری گھڑی عنایت کی۔ اور ڈپٹی کلکٹری کا وعدہ کر کے اُن کے نام اوّلین امیدواروں میں درج کرا دیئے۔ اور مرحوم تھوڑے دنوں میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست ہو گئے اور پھر ضلع میں آ گئے۔ مسجد کے حجرے میں رہنے والا لڑکا۔ مولوی عبدالخالق کی پنسیں کے ساتھ دو روٹی والا طالب علم۔ ضلع کا کلکٹر ہے جسے باپ نے انگریزی پڑھنے سے باز رکھا تھا وہ زمانے کی رہنمائی سے بقدر ضرورت انگریزی پڑھ چکا ہے۔ کافی شہرت اور عزت حاصل کر لی ہے۔ دُکھ سہنے کے دن گزر چکے ہیں۔ آسودگی اور حکومت دونوں حاصل ہیں اب اور کیا چاہیے۔ مگر کیا وہ علمی ذوق و شوق سے جس کی بدولت یہ سب کچھ حاصل ہوا ہے دست بردار ہو گیا؟ نہیں۔ انگریزی کا شغل جاری ہے۔ اور جادو نگار قلم اُردو لٹریچر میں جان ڈال رہی ہے۔ آخر یہ عقدہ کیوں ہے؟ دیت کچھ مل گیا۔ ترقی کی شاہراہ تک رسائی ہو گئی۔ ہاں یہ سب کچھ سچ ہے مگر علم کا ذوق اور کام کا شوق پڑ گیا آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اور کیا جس علم کی بدولت سب کچھ ملا ہو۔ جو عزت تھا۔ شہرت۔ آسودگی کا موجب ہوا ہو اُس کے تمام احسانات فراموش کر کے منہ موڑ خواب بن جانا روا ہو سکتا ہے؟ کسی کو یہ گوارا ہو تو ہو مگر مرحوم کو نہ تھا۔

مرحوم ابھی ڈپٹی کلکٹری تھے کہ گورنمنٹ سے [illegible] (ہندوستان) [illegible] کی کتاب ریڈ ٹیکسٹ بک لکھی جو کسی وقت شائع ہو کر ڈاکٹر مرحوم سے کچھ پڑھی گئی تھے۔ کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی انھوں نے اس کے اُردو ترجمے کا بھی اعلان کیا اور بہترین ترجمہ کے لیے ایک ہزار روپیہ انعام کا اشتہار دیا۔ مولوی صاحب کو بھی ترجمے کی اطلاع تھی۔ ان کی نگاہ سے ترجمے کا اعلان پہنچنے سے گزر چکا تھا اور ارادہ تھے۔ غرض ترجمہ کیا اور بھی متعدد ترجمے پہنچے۔ [illegible] ایک کمیٹی [illegible] بھی شریک تھے کمیٹی نے تمام ترجمے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ بہترین ترجمہ ڈپٹی کلکٹر نذیر احمد کا ہے مگر اس کے ساتھ ہی بعض ممبروں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ یہ ترجمہ موجودہ ترجموں میں سب سے بہتر ہے لیکن معیار اعلیٰ [illegible] نہیں ہے۔ اس لیے انعام بجائے ایک ہزار کے پانسو

ترجم کو ملنا چاہیے رزیڈنٹ موصوف نے پانسو ڈاکٹر مرحوم کے پاس بھیج دیے اور ان کا ترجمہ رزیڈنٹ حیدرآباد کی معرفت سرسالار جنگ اول کو روانہ کیا کہ نظام سابق کے نانا امیر کبیر سے درست کرا دیں جو علم ہیئت کے یگانہ ماہر تھے۔ ترجمہ امیر کبیر نے دیکھا اور یہ کہکر واپس کر دیا کہ اس ترجمے کی اصلاح اور نظرِ ثانی بھی وہی شخص خوب کر سکتا ہی جس نے ترجمہ کیا ہی۔ ترجمہ جن ہاتھوں میں ہو کر امیر کبیر کے پاس پونہچا تھا اُنھیں ہاتھوں سے رزیڈنٹ کو واپس ہو گیا۔ اور پھر پھرا کر پھر مرحوم کے پاس آیا۔ یہ جزوی رد و بدل کے بعد باقی پانسو کے دعوے دار ہوئے۔ ابھی نامہ و پیام جاری ہی تھا کہ رزیڈنٹ کشمیر کا انتقال ہو گیا تاہم ان کا روپیہ رزیڈنٹ موصوف کی میم صاحب نے بھیج دیا اور انہیں پورا ایک ہزار روپیہ ترجمے کے انعام کا مل گیا مگر رزیڈنٹ صاحب کی ناگہانی موت کی وجہ سے وہ ترجمہ نہ چھپ سکا۔ ڈاکٹر مرحوم اس وقت غالباً پانسو کے گریڈ میں تھے۔ کیا ایک ہزار کے بھوکے تھے کہ ترجمے کی زحمت گوارا کی۔ آنکھوں کا تیل نچوڑا۔ دماغ سوزی کی چھٹیوں کے دن غارت کیے۔ راتوں کو بیٹھے مگر ترجمہ کرکے رہے۔ اب بھی بہت سے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ایم۔ اے۔ بی۔ اے ہیں اکثر مولوی اور پنڈت بھی کہلاتے ہیں کوئی بھی اُن میں ایسا علمی شغلہ رکھتا ہی اور ڈاکٹر مرحوم کی طرح لکھتا پڑھتا ہی۔ بعض لوگ کہیں گے کہ مرحوم لالچی تھے روپے کی امید میں محنت کرتے رہے۔ بجا ہی مرزیڈنٹ کشمیر اور امیر کبیر بھی شاید بڑے زر پرست ہی تھے کہ تالیف و تصنیف اور حصولِ کمال کے لیے عرق ریزیاں کرتے رہے اگر وہ علم کا صحیح ذوق رکھتے تھے تو کیوں ڈاکٹر مرحوم کے اِن مشاغل کو علم دوستی پر محمول نہ کیا جائے۔ بات یہ ہی کہ نہ کرنے والے ہمیشہ کرنے والوں کے کاموں کو ذلیل اغراض سے وابستہ دکھا کر اپنے کرتے کا اظہار کیا کرتے ہیں لیکن کام کی عزت باتوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اور کسی کے خاک ڈالنے سے آفتاب پر خاک نہیں پڑ سکتی۔

خدا کی شان دیکھو۔ دہلی کی کمیٹی ڈاکٹر مرحوم کے ترجمے کو بہترین ترجمہ قرار دینے کے باوجود بھی ان ریمارک ایبل کہتی اور نیز کلیہ ناقص ٹھیراتی ہی مگر اُس کی یہ ہی عیب چینی اور خوردہ گیری ڈاکٹر مرحوم کی ترقی کا باعث بنتی ہی۔ ترجمہ سرسالار جنگ کے ہاتھوں امیر کبیر کے پاس پونہچتا ہی اور اُس ماہر یگانہ کا منصفانہ ریمارک سرسالار جنگ کے گوش گزار ہوتا ہی جو ہمیشہ لائق لوگوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے اور اُن کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہی کہ ڈپٹی کلکٹر نذیر احمد کو حیدرآباد بلانا چاہیے۔ وہ گورنمنٹ سے ڈاکٹر مرحوم کی خدمات کچھ عرصے کے لیے مستعار لیتے ہیں اور ڈاکٹر مرحوم سرکار گورنمنٹ سے پانسو کے گریڈ سے آٹھ سو ماہوار کی تنخواہ پر حیدرآباد پونہچتے ہیں اور بندوبست پر مامور ہوتے ہیں جب میعاد ختم ہوتی ہی تو ڈاکٹر مرحوم اپنا استعفا پیش کرتے ہیں اور واپسی کی اجازت چاہتے ہیں سرسالار جنگ کہتے ہیں نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ یہ اپنوں کے لیے مراعات کے خواستگار ہوتے ہیں۔ سرسالار جنگ ڈاکٹر مرحوم کے نابالغ فرزند کا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور ان کے متعدد لواحقین کو حیدرآباد میں معقول اسامیاں دیتے ہیں اور ڈاکٹر مرحوم یوں بعزت و احترام حیدرآباد دکن میں رہ جاتے ہیں اور گورنمنٹ کی ملازمت سے قطع تعلق ہو جاتا ہی +

ڈاکٹر مرحوم حیدرآباد میں مستقل طور پر ریاست کے ملازم ہونے کے بعد اپنے حسن عمل کے صلے میں برابر ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ آخر ان کو ۱۷ سو ماہوار تنخواہ ملنے لگی اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے جسے یہاں کے فنانشل کمشنر کی برابر سمجھنا چاہیے محنت و جاں فشانی اِن کا شیوہ تھا اور عزت و قدر افزائی سرسالار کا آئین۔ یہ سب کچھ تھا مگر یہاں آکر عرصے تک یہ اپنے علمی

مشاغل جاری نہ رکھ سکے جس کا ان کو افسوس رہا کرتا تھا۔ مگر حسن اتفاق دیکھیے کہ سرسالار جنگ کو خیال ہوا کہ نظام (سابق) کی تعلیم کے لیے اُن کے شایانِ شان ایک نصاب مرتب کرایا جائے۔ یہ کام ان کے سپرد ہوا۔ اور انھیں پھر علمی مشغلہ مل گیا۔ جب وہ نصاب مرتب ہو گیا تو اہلِ نظر نے دیکھا اور پسند کیا۔ مگر کتاب ہیئت کے ترجمے کی طرح یہ بھی مطبوع نہیں ہوا۔ اور بعض مصلحتوں کی وجہ سے خاص رکھا گیا۔ اِس نصاب کی ترتیب میں ڈاکٹر مرحوم نے کیا کچھ کوشش و کاوش نہ کی ہوگی۔ مگر افسوس وہ نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اگر چھپ جاتا تو بالیقین ڈاکٹر مرحوم کی اعلےٰ قابلیت کا ایک بڑا ثبوت ہوتا اور بہتوں کو اُس سے فائدہ پونہچتا +

حیدر آباد میں ڈاکٹر مرحوم کو جس قدر زیادہ دن ہوتے گئے اُسی قدر اُن کی عزت بڑھتی گئی اور اُن کی علمی ذی مائگی کا اعتراف زیادہ ہوتا گیا خصوصاً سرسالار جنگ ان کے بہت ہی معتقد ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو جو بعد میں سرسالار ثانی ہوئے ان کی شاگردی میں دیا۔ اور وہ خود ان کے گھر آ کر پڑھنے لگے۔ راجہ سرکشن پرشاد ان کے ہم جولی تھے۔ یہ بھی ساتھ آتے۔ اور دونوں باادب بیٹھ کر ڈاکٹر مرحوم سے پڑھا کرتے۔ عرصے تک یہی وتیرہ رہا یہاں تک کہ لائق علی خاں جوان ہو گئے۔ اور سرسالار اول کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سرسالار جنگ ثانی کے خطاب سے باپ کے جانشین اور حیدر آباد کے وزیر ہوئے۔ ڈاکٹر مرحوم کی پہلے ہی کچھ کم قدر و منزلت نہ تھی۔ مگر اب ان کو خیال ہوا اور بجا ہوا کہ سعادت مند شاگرد وزیر ہوا ہے۔ اقبال کا ستارہ اَور چمکے گا۔ یہ خبر نہ تھی کہ عروج کی انتہا ہو چکی ہے۔ وقتِ زوال قریب آ لگا ہے اور یہ شدنی شاگرد ہی کے ہاتھ سے ہونی ہے +

نئے سرسالار جنگ نوجوان تھے اور حوالی و حواشی ان کے مزاج میں در خور رکھتے تھے ڈاکٹر مرحوم جانتے تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے۔ جب ملتے مشکورانہ انداز سے ملتے اور جو کہنا سُننا ہوتا کہہ سُن کر چلے آتے۔ اور کبھی زیادہ نہ بیٹھتے جو لوگ سرسالار کے مزاج میں در خور رکھتے تھے وہ ان کی طرف سے صاف نہ تھے کھٹکتے رہتے تھے کہ مبادا اُستادی کے پردے میں ہاتھ صاف کر جائیں۔ خود کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو یہ اندیشہ تھا اور مجھے حاشا کہ اس کا خیال بھی نہ تھا۔ مگر شدنی ہو کر رہتی ہے۔ ایک دن سرسالار کے پاس گئے اور صحبت طویل ہو گئی جب شاگرد کی طرف سے زیادہ بے تکلفی ہوئی تو بعض کلماتِ نصیحت ان کی زبان سے بھی نکل گئے مگر غضب یہ ہوا کہ حریفوں کے کان میں اِس کی بھنک پڑ گئی۔ کان بھر دیئے گئے۔ سرسالار کا رُخ بدلا۔ اور ڈاکٹر مرحوم نے بھی یہی مصلحت دیکھی کہ پنشن لے کر حیدر آباد چھوڑ دیں۔ چنانچہ پنشن لی اور دہلی چلے آئے +

تالیف و تصنیف میں سرگرمی و پبلک لائف

اس وقت سے پہلے پہلے مرحوم صرف تحریر کے دَھنی تھے اور لوگوں نے ان کے قلم ہی کی جولانیاں دیکھی تھیں۔ ازبانِ گویا کے جوہر ابھی نہ کھلے تھے۔ مگر اب دہلی آ جانے کے بعد جہاں ایک طرف مرحوم نے تالیف و تصنیف کے پُرانے مشغلے کو چمکایا اور بڑھایا۔ دوسری طرف اُس خداداد طلاقتِ لسانی اور زورِ تقریر سے جس کی شاید اُن کو بھی اب تک خبر نہ تھی بڑے بڑے پبلک جلسوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ اور پہلے ہی دن سے وہ دھاک بندھی کہ زبان زبان سے نذیر احمد۔ نذیر احمد سُنا جانے لگا +

مرحوم کا دستور تھا کہ جب کبھی کسی بڑے جلسے میں کسی خاص موضوع پر لکچر دینا ہوتا تو اُسے پہلے سے قلم بند کر لیتے۔ معلوم نہیں

کے بعد یہ سرگرمی اور بھی زیادہ ہو گئی۔ مذہبی اور مذہبی رنگ کی تراجم و تالیفات کے انبار سے قطع نظر کرنے پر بھی اُن کی عام ادبی
دلچسپی تصانیف کچھ کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس صنف میں بالخصوص نہایت خوش تصنیف اور خوش نصیب مصنف تھے
خوش تصنیف اس لیے کہ اُن کی یہ کتابیں مقبول ہوئیں۔ بار بار چھپیں اور کئی کئی مطبعوں میں چھپیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہو گئیں اور ہو رہی ہیں۔ جب تک انھوں نے خود اپنی کتابوں کے چھپوانے کا انتظام نہیں کیا بہت سے مطبع اُن کی کتابوں
سے مالا مال ہوئے۔ بہت سے تاجر سیٹھ بن گئے۔ اور اب بھی کم و بیش فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کی بعض کتابوں نے وہ
قبول عام پایا کہ انگریزی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستان میں جو زبانیں ذرا بھی لٹریری حیثیت رکھتی ہیں اُن میں ان کا ترجمہ
ہوا۔ گزشتہ صدی کیا مدتہائے دراز سے کم از کم ہندوستان میں کسی مصنف کی تصانیف کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہوا۔ وہ
اپنی تصنیف کی بدولت جہاں اُستاد ہو گئے۔ اُن کی کتابوں سے بلا قید ملت و مشرب ہندو مسلمان کرسچن سب نے استفادہ کیا۔ ہندوؤں
نے ان کی یہ کتابیں تقریباً پڑھیں مسلمانوں نے ان کو سر آنکھوں پر رکھا۔ یورپین نے بھی ان کو اپنا راہ نما بنایا اور ان سے
اردو حاصل کی۔ جہاں جہاں اُردو مکاتب و مدارس ہیں ہر جگہ اُردو کے کورسوں میں ان کتابوں کا انتخاب موجود ہے اور استاد
و طالب علم دونوں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ غرض کہ ڈاکٹر مرحوم اگرچہ ایک مسلمان مصنف تھے لیکن اُن کی اس صنف کی
تصانیف سے فیض عام کا چشمہ جاری ہوا جو مدت ہائے دراز تک جاری رہے گا اور آنے والی نسلوں کو مرحوم کی یاد دلاتا رہے گا
وہ خوش نصیب مصنف تھے اس لیے کہ اُن کے جیتے جی اُن کی کتابیں مقبول ہو گئیں۔ یہ بات اچھے اچھے مصنفوں میں
سے کم ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ انھیں اپنی تصنیف سے نہ صرف شہرت و عزت حاصل ہوئی بلکہ دولت بھی۔ انھیں اکثر
کتابوں کی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں سرکار سے بیش قرار انعام ملے۔ اور جب مرحوم نے اپنی کتابوں کے چھاپنے کا
آپ انتظام کر لیا تو اُن سے لاکھوں روپیہ کمایا اور گھر بیٹھ کر زمانۂ ملازمت سے زیادہ دولت جمع کی۔ ان باتوں سے بڑھ کر
مصنف کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر مرحوم پنشن لے کر دہلی آئے اور قومی معاملات میں شریک ہونے کے بعد سے
زیادہ تر قومی اور مذہبی رنگ کی کتابیں لکھتے رہے۔ مگر بعض اخلاقی نتیجہ خیز۔ عام دلچسپی کی کتابیں بھی اپنے خاص رنگ
میں لکھیں اور عمومیت کے پہلو کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حضور نظام کے دربار تاجپوشی کے متعلق گورنمنٹ کی طرف سے جو کتاب
انگریزی میں تیار ہوئی تھی گورنمنٹ کے حکم سے اُس کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمے میں اگرچہ دوسروں کا بھی ہاتھ تھا لیکن مدار
کار زیادہ تر فرض خود ڈاکٹر مرحوم ہی نے ادا کیا۔ اس لیے اس کی کریڈٹ کے خود ہی مستحق ہوئے۔

اُن کی تالیف اور ترجمے کا سلسلہ تقریباً موت کے وقت تک جاری رہا۔ اگرچہ کچھ دنوں سے آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں۔
نظر بہت کم آتا تھا۔ رعشہ بڑھ گیا تھا اور لکھنے سے معذور تھے۔ مگر لکھنے پڑھنے کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ ہاتھ اور آنکھوں سے مجبور
تھے تو دوسروں سے کام لیتے تھے۔ ترجمہ یا اور کچھ چاہتے دوسروں سے لکھوا لیتے۔ اور پھر اصل اور ترجمے کا فقرہ فقرہ سنتے
اور اپنے انداز پر منواتے جاتے۔ اور یوں وہ اچھی تحریر اُن کی تحریر ہو جاتی۔

اُن کی تحریر کا انداز خاص تھا۔ الفاظ کی شوکت عبارت کی متانت۔ طرز ادا کی بلاغت ان کے قلم کی خاص اور
مابہ الامتیاز صفت تھی۔ بعض اعتراض کے پیرائے میں شاکی ہیں کہ مولانا مغلق الفاظ لکھتے ہیں اور غیر مانوس لغت لاتے ہیں

یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا لیکن اُن کے اِس انداز سے زبان کو وسعت ہوئی۔ بہت سے نئے الفاظ جو مقبولِ عام ہو گئے اُن کی بدولت زبان میں داخل ہوئے اِس لیے اُن کا یہ انداز قابلِ ستایش ہی۔ نہ لائقِ ملامت۔ ایسے ہی مصنفوں کی بدولت زبان وسعت پایا کرتی ہی۔ نہ لکیر کے فقیروں سے۔ اُن کا اسلوب بیان بھی نرالا تھا۔ محاورے کو وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ مگر عام اسلوب کی شاہِ راہ پر چلنا اُن کو پسند نہ تھا۔ جہاں عام طرزِ ادا ابتذال پاتے خود اکثر رفعت و متانت اختیار کرتے اگر کسی باب میں عام روش ثقاہت و متانت کے دوش بدوش ہوتی اور اُس کا بدلنا دشوار ہوتا تو خود بلندی سے پستی کی طرف آجاتے۔ متانت در زرانت چھوڑ کر سبکی اختیار کر لیتے مگر عام پامال راستے پر نہ چلتے۔ اسی لیے اب کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے دماغ زیادہ غور و فکر کا متحمل نہ رہا تھا جیسے آخر میں سمندِ بیان توسنی کرنے لگا تھا۔ ادہم قلم بھی کبھی کبھی سکندری کر جاتا تھا۔ اور اُن کی بعض بعض تحریریں تعجب کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی تھیں +

ڈاکٹر مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا کام اُن کی تصنیف و تالیف ہی جس کی تنقید کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ لہٰذا ہم اس سے مطلق تعرض نہیں کرتے اور اسی وجہ سے ہم نے اپنے اس مضمون میں اُن کی کسی تصنیف و تالیف کا نام تک نہیں لیا۔ لیکن چوں کہ ہماری غرض اس مضمون سے زیادہ تر یہ ہی کہ ڈاکٹر مرحوم کی لائف کے وہ خاص خاص نمایاں خد و خال دکھائیں جو عبرت انگیز اور سبق آموز ہو سکیں اس لیے اتنا ہمیں کہنا ہی چاہیے ڈاکٹر مرحوم نے غالباً سب سے پہلی کتاب "چند پند سودمند" لکھی۔ جو اپنی تحریر کے لحاظ سے ایک معمولی کتاب ہی۔ اس کو پڑھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہی کہ اُس کے مصنف کو تصنیف کا شوق ہی۔ اور زبان کے کثیر الفاظ پر عبور و استحضار رکھتا ہی اور بس۔ مگر جس قلم سے یہ کتاب نکلی تھی آگے بڑھ کر وہی اعجاز نگار ہو گئی اور اسی سے مرآۃ العروس۔ توبۃ النصوح۔ بنات النعش۔ ابن الوقت جیسی بلند پایہ کتابیں نکلیں جنھوں نے مصنف کو آسمانِ شہرت کا تارہ بنا کر چمکا دیا۔ اور اُس کے نام کو چار چاند لگا دیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ آدمی اگر کچھ بھی طبیعت اور سلیقہ رکھتا ہو تو کرتے کرتے بہت کچھ ہو جاتا ہی۔ ایک خوبی ڈاکٹر مرحوم کی بعض عام تصانیف میں یہ بھی ہی کہ اُنھوں نے علمی مسائل کے ساتھ بہت سے مغربی خیالات اور اہلِ یورپ کی بعض اخلاقی خوبیاں نہایت عمدگی کے ساتھ اُردو لٹریچر میں جذب کیں۔ اور جو انگریزی پڑھی تھی اُس سے استفادہ کیا۔ اِس طریق پر مشرق و مغرب کو باہم قریب کرنے کی جو کم و بیش مشکور کوشش ان کی طرف سے عمل میں آئی وہ بھی کسی طرح نظر انداز نہ ہونی چاہیے بلکہ دوسروں کو اُس سے سبق آموز ہونا مناسب ہی +

علمی خطابات

ڈاکٹر مرحوم عرصے سے شمس العلما اور ایل ایل۔ ڈی تھے۔ پہلا خطاب اُن کو گورنمنٹ سے ملا تھا اور دوسرا ایڈنبرا یونیورسٹی سے۔ سر ولیم میور ہندوستان سے واپس ہونے کے بعد ایک زمانے میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے ڈین ہو گئے تھے۔ اُن ہی دنوں میں ڈاکٹر مرحوم کے کسی انگریز دوست نے سر ولیم میور سے ان کا تذکرہ کیا اُن کو ابھی کچھ کچھ یاد تھے تحقیق کے بعد کہ یہ وہی نذیر احمد ہیں جنھوں نے تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کیا تھا انھیں ایل ایل ڈی بنا دیا یوں ڈاکٹر مرحوم سمندر پار کی ایک نامور یونیورسٹی سے علمی خطاب کا اعزاز پا چکے تھے مگر ہندوستانی یونیورسٹیوں میں پاسے چراغ تاریک کی مصداق ابھی اندھیرا ہی تھا کہ آخر پنجاب یونیورسٹی میں ایک حق گو۔ دوست نواز آواز بلند ہوئی اور ڈاکٹر مرحوم کوئی دو ڈھائی برس ہوئے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔ او۔ ایل بنائے گئے +

تعلیمی مشغلہ

ڈاکٹر مرحوم کو تالیف و تصنیف کے علاوہ پڑھانے کا بھی شوق تھا جب سے وہ دہلی آئے ایک نہ ایک سبق اُن کے ہاں جاری رہا۔ عربی علم ادب میں چوں کہ ان کو زیادہ توغل تھا لہٰذا ادب نہایت شوق و خوبی کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ باقی چیزوں کو چوں کہ چھوڑے ہوئے عرصہ ہوگیا تھا اور اب طبیعت کاوش کی متحمل نہیں رہی تھی اس لیے اگر کوئی کچھ اَور پڑھنا چاہتا تو بلا تکلف معذوری کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے کالج کے آنریری عربک پروفیسر بھی تھے اور جب کبھی ضرورت یا کام کی کثرت ہوتی وہ نہایت شوق سے مدد دیتے۔ اور ہمیشہ کہا کرتے۔ مَیں حاضر ہوں۔ اس کے علاوہ مرحوم کو کالج اور کالج اسٹاف سے خاص اُنس اور تعلق تھا۔ اخلاقی مدد سے گزر کر اُنھوں نے کالج کی مال سے بھی مدد کی۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ بورڈنگ توسیع کی مد میں پانسو روپیہ دیا تھا۔ اور مزید عطیہ کا ارادہ رکھتے تھے +

کیریکٹر

ڈاکٹر مرحوم کا نمایاں کیریکٹر یہی تھا کہ وہ علم دوست تھے اگرچہ تمام عمر پڑھنے میں گزری تھی مگر اس پیرانہ سالی میں بھی پڑھنے سے سیر نہیں ہوتے تھے مطالعہ ان کا برابر جاری رہتا تھا۔ اور نئی نئی باتوں کے حصول کا شوق۔ کوئی تین چار برس ہوئے کہ ایک پنڈت جی سے سنسکرت شروع کی تھی۔ مگر جب آنکھوں نے جواب دے دیا تو مجبور ہو گئے۔ ابتدا سے کفایت شعار تھے اسی کی بدولت وہ دولت مند ہوئے۔ عمر کے ساتھ اُن کی جزرسی بڑھتی گئی۔ پیسے پیسے پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اسی لیے لوگ آخر میں کنجوس کہنے لگے تھے۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہ تھی "حساب جو جو بخشش سو سو" ۔ اُن کا اصول تھا۔ انھوں نے قومی کاموں میں ہزاروں روپیہ دیا۔ جن کو مدد کا مستحق سمجھا اُن کی مدد کی اور فراخ حوصلگی سے مدد کی۔ چوں کہ اُن کا بہت سا روپیہ مارا گیا تھا اور آخر میں وہ محتاط ہو گئے تھے لوگ سمجھتے تھے کہ زر پرست ہو گئے ہیں۔ وہ سادہ مزاج تھے ہمیشہ سادگی سے رہے اور سادہ لباس پہنا حتیٰ کہ حیدرآباد میں بھی جہاں نمائش و طمطراق لازمۂ شرافت و لیاقت ہے۔ یہ سادگی میں بسر کرتے اور اسی میں معزز و محترم رہے۔ سچ ہے لباس سے کوئی آدمی نہیں بن جاتا۔ اُن کے مزاج میں ظرافت و متانت دونوں تھیں لیکن بعض اوقات دونوں حد سے بڑھ جاتی تھیں۔ اُن کے شناسا بہت تھے لیکن جہاں تک مَیں جانتا ہوں وہ کثیر الاحباب نہ تھے۔ دوستوں کی اُن کی نگاہوں میں قدر تھی۔ لیکن طبیعت نازک اور ذرا زود رنج تھی اور جلدی صاف نہ ہوتے تھے اسی نازک مزاجی کی وجہ سے اُنھوں نے پبلک لائف کو خیرباد کہا۔ اور اسی کی بدولت بعض گو مگو وجوہات کی بنا پر وہ اہلِ وطن سے برگشتہ ہوئے اور اہلِ وطن نے اُن کی طرف سے سرد مہری اختیار کر لی تھی +

آخری وقت کے خیالات

اگرچہ ڈاکٹر مرحوم ایک عرصے سے پبلک لائف چھوڑ چکے اور اس کی دلچسپیوں سے مُنہ موڑ چکے تھے لیکن جو کام سالہا سال کیا ہو اُس کا بالکل دل سے فراموش ہو جانا کوئی آسان بات نہیں ہوتی اسی لیے اب انھیں رہ رہ کر پبلک یاد آنے لگی تھی اور چوں کہ زبان و قلم میں پہلی سی طاقت اور توانائی نہیں رہی تھی اور اللہ نے اُن کو دولت دی تھی اور علم اور علمی مشاغل اُس دولت و ثروت کا موجب ہوئے تھے اس لیے اُن کا عزم بالجزم تھا کہ اب مال سے پبلک کی تعلیمی خدمات انجام دیں اور بقائے نام کا کام کر جائیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر مرحوم ایک لاکھ سے متجاوز رقم گورنمنٹ کی معرفت تعلیمی امداد کے لیے عطا کرنے والے تھے اور چوں کہ مرحوم کو ہمارے کالج سے خاص تعلق تھا وہ دو ایک بیش قرار دائمی وظیفوں کی رقم کالج کو بھی دینا چاہتے تھے۔ مرحوم کا یہ ارادہ کچھ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ جو اُن سے ملتے جلتے تھے وہ سب اس سے باخبر تھے بعض تو یہاں تک کہہ چکے تھے کہ ع در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست + مسٹر انڈروز اور مسٹر رودرا سے

اس کا نہ صرف مذکور آچکا تھا بلکہ یہ بھی طے پا لیا تھا کہ آپ کے ولایت سے واپس آنے پر آپ اور دو ایک اَور آدمیوں کے ہاتھوں ہی سے یہ کام سرانجام ہوں گے۔ مگر افسوس موت نے مہلت نہ دی اور یہ تمام ارادے یوں ہی ناتمام رہ گئے۔ ہاں مرحوم کے نامبردار فرزند جو بفضلہ تعالےٰ خود بھی دولت مند ہیں چاہیں تو مرحوم کی مُردہ آرزوؤں کو زندہ کر کے نہ صرف باپ کی روح کو خوش کر سکتے ہیں بلکہ خود بھی نام و ثواب دونوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں +

صاحبو! مناسب کو ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کی موت کوئی انوکھی بات نہیں وہ تقریباً عمرِ طبعی کو پہنچ چکے اور بہت کچھ کر چکے تھے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جس قابلیت اور جس وضع کا آدمی اُٹھ گیا ہے نہ اُس کا کوئی صحیح جانشین موجود ہے اور نہ پیدا ہونے کی توقع۔ کیوں کہ جس قالب میں یہ پُرانے لوگ ڈھلے تھے مدت ہوئی کہ وہ ٹوٹ چکا زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ اور قابلیت کی کایا پلٹ گئی ہے لائق و قابل ہوں گے مگر نذیر احمد سے کہاں ہوں گے اور کیوں کر ہو سکتے ہیں الا کل شئی ما خلا اللہ باطل ... از سینٹ سٹیفنز کالج میگزین دہلی

آخری حالات

انتقال سے کوئی تین مہینے پیشتر سے گھر سے نکلنا مطلقاً چھوڑ دیا تھا۔ مزاج میں چڑچڑاپن اور غصہ زیادہ ہو گیا تھا۔ دُنیا کو فی الواقع ترک کر دیا تھا۔ کسی سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتے تھے گو جانتے تھے کہ موت قریب ہے لیکن پھر بھی معاملات کے سُلجھانے اور سمیٹنے کی کوشش نہ کی۔ نہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو دخل دیا۔ وصیت مرحوم نے زبانی یا تحریری کسی قسم کی نہیں کی نہ اپنی جائداد کی تقسیم کی۔ جو کچھ معاملات اور جتنی بھی جائداد تھی بہ استثنائے معدودے چند سب خاکسار کے نام تھی۔ خود بطور میرے مختارِ عام کے کاروبار کرتے تھے۔ اگر اپنے جیتے جی جائداد کو بانٹ جاتے یا وصیت کر جاتے تو کوئی جھگڑا بکھیڑا بعد میں نہ پڑتا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد خوب جوتیوں میں دال بٹے گی اور ضرور ایسا ہی ہوتا لیکن خاکسار نے سب پر خاک ڈال دی۔ پس ماندوں میں صرف دو ہی تھے مَیں اور میری بہن۔ لوگوں نے بہت کچھ اُلجھاؤ ڈالے اور کوئی دقیقہ ہم دونوں کو لڑوا دینے کا اُٹھا نہ رکھا مگر خدا کا شکر ہے کہ آپس ہی میں سب کچھ طے ہو گیا کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ چوں کہ خاکسار کے نام بیشتر حصہ جائداد و غیر منقولہ کا تھا اس لیے قانوناً اور شرعاً میں اُس کا مالک تھا مگر میری ہمشیرہ صاحبہ کی یہ خواہش ہوئی کہ علاوہ اُس جائداد کے جو خاص مرحوم کے نام تھی اِس میں بھی حصۂ شرعی دو۔ مَیں نے سوچا کہ عدالت کے جھگڑوں میں کون پھنسے بہتر یہی ہے کہ جو وہ مانگیں آنکھ بند کر کے دے دوں اور مَیں نے ایسا ہی کیا کہ بلا امتیاز کسی امر کے کہ وہ جائداد میرے نام ہے یا والد مرحوم کے نام ہر قسم کے متروکہ میں بلا چون و چرا اپنی بہن کو حصہ دے دیا اور اُن کی خوشنودی کے مقابلے میں مالی نقصان کی کچھ پروا نہ کی۔ ع۔ این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر +

شکریہ

میرے والد کی وفات حسرت آیات پر ہندوستان کے ہر حصے سے صدائے ہمدردی بلند ہوئی۔ والد مرحوم کے دوستوں نے جو میرے بھی بزرگ تھے اور میرے دوستوں نے میرے غم کو بہت کچھ ہلکا کر دیا۔ جب مَیں دیکھتا ہوں کہ میری اس مصیبت میں سارا ہندوستان شریک ہے تو ضرور میرے دل کو تسلی ہوتی ہے کہ میرے باپ کو لوگ کیسی اچھی طرح یاد کرتے ہیں اور میرے دل کے ساتھ کتنے دل غمگین ہیں۔ چنانچہ خاکسار نے متعدد اخباروں میں شکریے کی تحریر بھی چھپوا دی ہے اور اب پھر اُن تمامی ہمدردانِ قوم اور احباب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری اس مصیبت میں میری دلی ہمدردی کی۔ اَللّٰھم افرغ علینا صبراً وثبت اقدامنا +

آخری نا تمام تصنیف

مرحوم کے زیرِ تصنیف "مطالب القرآن" نامی ایک مبسوط کتاب تھی۔ قرآن شریف کے تمام مضامین باتوا(؟) انھوں نے چھپوا لیے تھے اور ہر ہر مضمون پر اپنی طرف سے ایک جامع اور بسیط مضمون لکھتے چلے جاتے تھے اور جتنا لکھتے تھے اُتنا ہی چھپ بھی جاتا تھا چنانچہ ربع کتاب چھپ کر تیار ہے باقی سہ ربع نہ تصنیف ہوئی نہ چھپنے کی مہلت ملی کہ پیغامِ اجل آگیا۔ جتنا اُن کے مرنے کا افسوس مجھے ہے اُتنی قدر اس کتاب کے ادھورے رہ جانے کا بھی ہے۔ کیوں کہ بقول منشی محبوب عالم صاحب کے اُن کی تصنیف کا ایک ایک جملہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور حیف کہ وہ چشمۂ فیض بند ہو گیا۔ لوگ زیادہ تر اُن کے کلام کے خواہش مند ہیں خاکسار کا ارادہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُس کی تکمیل خود کر دے لیکن یہ بات اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ میں ملازمت میں پھنسا ہوا ہوں۔ پھر میری بیوی کی مرگِ مفاجات چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اُن کا اُٹھ جانا۔ یہ سب باتیں انسان کے ہوش و حواس منتشر کر دینے کو کافی ہیں اگر حیاتِ مستعار باقی ہے تو میں پنشن لے کر جب گھر بیٹھوں گا جسے کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہے یا یہ کہ اسی درمیان میں اگر مجھے اطمینانِ قلب ہوا اور تفکرات و مکروہاتِ زمانہ سے بہ افضالِ الٰہی تھوڑی سی بھی مہلت مل گئی تو پھر میں ابھی اس کام کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا۔ گو میں اس کتاب کی تکمیل اُس خوبی سے نہ کر سکوں گا جیسی کہ مرحوم نے ابتدا کی تھی اور میرا لکھا ہوا اُس میں اسی طرح صاف الگ تھلگ معلوم ہو گا جیسے تلخ گنج کی مرمت چغلی کھاتی ہے لیکن بھلا بُرا جیسا کچھ مجھ سے بن پڑے اُس کی تکمیل کر دینا میرا فرض ہے خدا اس فرض سے ادا کرے"۔

مرحوم کے تجارتی کاروبار

یہ بات مخفی نہیں ہے کہ باکار آدمی سے بے کار نہیں بیٹھا جاتا۔ مرحوم جب تک سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں رہے سلسلہ تصانیف کا جاری رہا جب دکن میں گئے کلام مجید حفظ کیا تلنگی زبان پڑھتے رہے غرض کوئی وقت اُن کا سرکاری کام یا کتب بینی سے خالی نہ رہتا تھا۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ اقلیدس کی شکلوں کے دعوے اس وقت تک نوکِ زبان تھے۔ ریاضی سے بھی اُن کو کافی دلچسپی تھی مشکل سے مشکل سوال دقیق سے دقیق اقلیدس کے مسائل کو بہ آسانی حل کرتے تھے۔ ہزارہا اشعار اُردو فارسی عربی کے اَز بر تھے۔

جب والد مرحوم حیدر آباد کی ملازمت سے دست کش ہو کر پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے تو ایک ایسے شخص کے لیے جو مدت العمر مشاغل میں منہمک رہا ہو خالی بیٹھے رہنا ایک مصیبت تھی۔ دہلی میں بھی انھوں نے تعلیم و تعلّم کا مشغلہ جاری رکھا تھا صبح سویرے حدیث اور علم ادب کا درس دیا کرتے تھے منتخب لوگ اُن سے پڑھنے آتے تھے۔ اور خود بھی سنسکرت پڑھا کرتے تھے تصنیف و تالیف کا مشغلہ پھر تازہ ہوا لیکن تصنیف و تالیف پہلے زمانے کی طرح نہ تھی بلکہ مذہبی کتابوں کا سلسلہ تھا چنانچہ ترجمہ کلام مجید اور الحقوق و الفرائض۔ اجتہاد۔ اُمہات الاُمہ وغیرہ اسی خانہ نشینی کے زمانے کے مشاغل ہیں پنجاب یونیورسٹی اور حیدر آباد کے اعلیٰ امتحانات کے وہ ممتحن تھے۔ کسی معمولی شخص کے لیے یہ مشاغل مصروفیت کے لیے بالکل کافی تھے لیکن اُن کی بے چین طبیعت کو جب بھی کافی مشغلہ نہ تھا اُن کے لنگوٹیا یاروں میں احسان اللہ پنجابی ایک شخص تھے (جو چند سال ہوئے کہ مر گئے) ان کی دکان حبش خاں کے پھاٹک میں تھی وہاں کثرت سے جایا کرتے تھے۔ بھلا ان کو ایسی سونے کی چڑیا کہاں ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ تجارت کی چاٹ ڈال دی۔ کچھ روپیہ ان کا شامل کیا اور فرضی منافعہ بتلا کر کئی سالوں کے بعد ان کو ایک معتدبہ نقصان دے کر علیحدہ ہوئے جس کا خمیازہ اب تک بھگتنا جا رہا ہے۔ اسی طرح دلّی کے سیکڑوں شخص ان کو لپٹ گئے

اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ ان کا گھسیٹ لیا۔ شروع شروع میں فرضی نفع کی طمع دلائی آگے چل کر اصل سرمایہ بھی غارت کیا۔ مانا کہ مرحوم ایک بڑے ذی علم و تجربے کار شخص تھے لیکن ضرور نہیں ہے کہ ہر ذی علم ایک بڑا تاجر بھی ہو۔ یہ فن ہی دوسرا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ لاکھوں روپیہ برباد کیا لیکن کچھ ایسے ننانوے کے پھیر میں پھنسا دیا تھا کہ نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن سانپ کی چھچھوندر تھی کہ نہ اگلی جائے نہ نگلی جائے۔ نقصان پر نقصان اٹھاتے تھے۔ لوگوں کی بدمعاملگی سے تنگ آگئے تھے۔ آئے دن کی مقدمے بازی سے متنفر تھے۔ لیکن پھر بھی شہد کی مکھی کی طرح اور لت پت ہوتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ مرتے دم تک یہ مجلہ نہ چھوٹا پر نہ چھوٹا + دنیا بھر کے لچے اور آزاد ان کے پاس بھیگی بلی بن کر آتے تھے۔ چند دن میل ملاپ بڑھاتے خوشامد درآمد کرتے۔ بگلا بھگت بن کر ان پر داؤ ڈالتے تھے اور اچھی طرح مالا مال ہو جاتے تھے۔ مرحوم اپنی طرح سب کو ایمان دار سمجھتے تھے اور ان کی چکنی چپڑی باتوں اور دامِ تزویر میں اس طرح پھنس جاتے تھے کہ معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ اس کو قدرتِ الٰہی کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کون یقین کرے گا کہ ایسا فریس ایسا باخبر شخص یوں اپنی دولت کو لٹا رہا ہے۔ زر دادن و دردِ سر خریدن سنتے تھے یہاں تو اپنی آنکھوں دیکھ لیا بعض لوگ ان کے ایسے منہ چڑھے تھے اور اس درجے ان پر اعتماد بڑھا ہوا تھا کہ ان کے مقابلے میں اپنا بیٹا بھی ہیچ تھا۔ گو مرحوم کو ایسے ہی لوگوں سے لاکھوں روپے کے نقصان پہنچے لیکن پھر بھی ایک معتبر بیٹا اور دوسرا اس سے بڑھ کر پیدا ہوا اسی طرح بہت سے لوگ بن گئے اور ہماری دولت مفت میں غارت ہوئی۔ غیروں پر اعتماد اور بھروسا اس درجے بڑھا ہوا تھا کہ خود کبھی کسی کاروبار یا حساب کو دیکھتے ہی نہ تھے جو جس نے کہہ دیا آمنا و صدقنا اگر کسی نے سچی ہمدردی یا دلی خیر خواہی سے کچھ مخالفت کی تو اسے جھڑک دیا۔ جائداد اور املاک کا یہ حال تھا کہ کبھی انھوں نے کسی جائداد کو دیکھا بھی نہیں کہ کدھر ہے کیسی ہے کیا کرایہ آتا ہے مرمت میں کیا صرف ہوا۔ جو کارپردازوں نے کہہ دیا پتھر کی لکیر ہو گیا۔ ہزار ہا روپے کی جائدادیں رہن تھیں لیکن یہ خبر نہیں کہ جس قدر روپیہ دیا ہے آیا اس کی مساوی جائداد بھی مکفول ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ ہزار ایک صاحب لے گئے دلال اور قبالے نویس سے مل ملا کر انھوں نے ہزار دو ہزار کا کھنڈر مکفول کر دیا۔ جب نالش ہوئی تو اور گرہ سے ہزار پانسو خرچ ہوا ملا کیا پانچ چھ ہزار کی جگہ چھ سات سو یا بعض اوقات وہ بھی نہیں۔ ایسی ایک مثال نہیں صدہا مثالیں موجود ہیں۔ اقرار نامہ۔ تمسک۔ دستاویز سب بالائے طاق جو معاملہ دیکھو زبانی نہ لکھا نہ پڑھی نہ گواہ نہ شاہد بہت ہوا تو ایک ہینڈ نوٹ لکھوا لیا۔ اب ان ہینڈ نوٹوں کو شہد لگا کر چاٹا کرو۔ ہینڈ نوٹ اسی کا بکار آمد ہے جس کے پلے کچھ ہو اور جس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں اس کا ہینڈ نوٹ ردی کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ صبح سے شام تک ایک سلسلہ لگا رہتا تھا جن کو سارے شہر میں دمڑی نہ مل سکتی تھی وہ یہاں سے جھولی بھر کے روپے لے جاتے تھے جن کو مرحوم بڑا ایمان دار سمجھتے تھے وہی بڑے بے ایمان تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے آخری دنوں میں انھیں خود اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ قریب چار پانچ لاکھ روپے کے ان کا نقصان ان کے حدِ علم میں ہو چکا تھا اور روز بروز ہوتا جاتا تھا مگر کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی اور ان کے حواریین ان کو بڑھاوے چڑھاوے دیتے تھے کہ فلاں سلسلے میں اگر پانچ ہزار اور ڈال دیئے جائیں تو سب روپیہ تر جائے گا اور وہاں کا یہ حال تھا کہ ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ جب لگ

ان کو خوب لوٹ کھسوٹ چکے تو آخر دہر الٹی بھی بے ایمانی کے نکالے کہ اُلٹی مرحوم پر نالشیں کر دیں۔ روپیہ بھی کھایا اور اُلٹا دعویٰ بھی کیا یہ نتیجہ تھا اُس غیر معمولی بھروسے کا جو یہ خود غرضوں پر کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ روپیہ ان کا اور دست دکان کا نام سب غیر شخص کا بھلا ایسا شخص گھر آئی ہوئی دولت پر کیوں لات مارنے لگا رفتہ رفتہ وہ سب لے کر بیٹھ گئے۔ اب نوبت اس حد تک پہنچی تھی کہ اپنے معتبرین کے ہاتھ میں چیک بکس حوالے کر دی تھیں وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے جس قدر رقم چاہتے تھے بنک سے نکالتے تھے اور جس کو چاہتے تھے دیتے تھے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ایک ایک شخص کو ایک ہی معاملت کے دو دو چک دیتے میں نے خود دیکھا ہے کہ دیے گئے۔ مگر کہے کون۔ بُرا کون بنے مفت کی دشمنا گی کون لے۔ اگر بہت دل جلا اور کبھی کہا بھی تو ٹکڑا توڑ کے یہ جواب ملا کہ میری دولت ہے میں لٹاتا ہوں مجھے اختیار ہے کسی کو کیا۔ تم لوگ میرا مرنا چاہتے ہو۔ فلاں شخص پر بدگمانی کی کیا وجہ ہے محض حسد اور جلن سے ایسا کہتے ہو انھیں پر مجھ کو ایسا بھروسہ ہے کہ اگر بشیر میرے ساتھ بے ایمانی کرے گا تو وہ بھی کرے گا۔ میں نے ان ہی وجوہ سے بالکل دخل دینا چھوڑ دیا میری کنارہ کشی نے خود غرضوں کو اور موقع دیا۔ ایک سوانگ مشین ہی کا معاملہ قابل غور ہے کہ جو شخص اپنے پلنگ پر سے ہل نہ سکتا ہو وہ لاکھوں روپے کا معاملہ کرے اور سنگر کے مقابلے پر کھڑا ہو جائے جو آج سوانگ مشینوں کا بادشاہ ہے دیکھنے کو جا بجا ایجنسیاں کھلی ہیں ولایت سے مال پر مال آرہا ہے مگر کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ہو کیا رہا ہے مرحوم کی حیات ہی میں ساٹھ ہزار روپے کا یکشت نقصان صرف اسی معاملے میں ہو چکا تھا جس کو انھوں نے سُن کر کہا اُونھ! مجھے کیا پروا ہے میں اس نقصان کو ایسا سمجھتا ہوں جیسا ایک مچھر کو مار کر پھینک دیا۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ بلا میرے گلے پڑی اور چار و ناچار مجھے اس معاملے کو سنبھالنا پڑا۔ دیکھتا ہوں تو ایک طوفان بے تمیزی ہے حساب کتاب کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ مال جو پڑا ہے وہ بکتا نہیں اور چھتیس ہزار کی مشینیں ولایت سے چلی آرہی ہیں چنانچہ نو ہزار روپے تو مجھے دینے ہی پڑے باقی ہزار منت سے ڈھائی ہزار روپے تاوان دے کر معاملہ منسوخ کرایا لیکن یہ معاملہ جو بیس سال سے چل رہا ہے اور جا بجا اس کی ایجنسیاں ہیں اور ہزار ہا درزیوں سے اس کا معاملہ ہے سمیٹے نہیں سمٹتا ہر طرح کوشش اس بات کی کی جا رہی ہے کہ کسی طرح خواہ وہ نقصان ہی سے کیوں نہ ہو یہ معاملہ سمٹ جائے۔ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے کہ اس جھنجھٹ سے نجات ہو۔ یہ ایک مثال کے طور پر میں نے بیان کیا ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں۔ عبدالرزاق سُوت والے کارخانہ کھول کر ولایت کی سیر کو بھی تشریف لے گئے روپیہ کیسی کا ولایت کی سیر کرے کون۔ گئے کیوں؟ مشینری جو آئی تھی اُس کو یہاں کوئی فٹ نہیں کر سکتا تھا اس واسطے بنفس نفیس ولایت گئے تھے وہاں سے آئے نتیجہ یہ ہوا کہ نالش نالشی کی نوبت پہنچی اُس میں ہزار ہا روپیہ خرچ ہوا عبدالرزاق صاحب دیوالیے بن کر سستے چھوٹ گئے پچیس ہزار کی مشینری نو سو میں نیلام ہوئی اور پچاس ہزار روپیہ جو اس معاملے میں پھنسا وہ جاتا رہا کے تین ہزار روپیہ جھاڑ لیا وہ بھی میں نے والد مرحوم کو تو یہ بھی نہ ملتا کبھی معاملے کو یہ لوگ سمیٹنے دیتے۔ احسان اللہ کی شراکت میں پچاس ہزار روپے کا نقصان ہوا سُنا کہ ٹمباکو کا جہاز جل گیا۔ ہر بلا کز آسماں آید بخانۂ انوری کجا باشد۔ حاجی سراج الدین صاحب جو عقل کُل تھے چالیس ہزار کی دھول وہ لگا گئے۔

ہزار ہا روپے کی ہنڈیاں لوگوں کے محض اعتبار پر سکار دیں اور کچھ خبر نہ لی کہ اس کا انجام کیا ہوگا جب چالیس ہزار پر نوبت پہنچی تو ایجنٹ الہ آباد بنک نے خود اپنے منیجر کو بھیجا کہ مولوی صاحب سے کہو کہ آپ ہنڈیاں کیسی سکار رہے ہیں یہ

لوگ معتبر نہیں ہیں ہم تو آپ کے اعتبار پر رقم برابر دیے رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر کچھ جھمیلا پڑے جب آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ایک دم چالیس ہزار کی رقم ہنڈیوں کی بابتہ ہاتھ سے نکل گئی اُن میں سے دو چار لوگوں پر نالش بھی کی گئی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور رقم بھرنی پڑی - مرزا لطیف اللہ بیگ نامی ایک صاحب ہیں اُن کو دیکھیے اور سترہ ہزار روپے اُن کے پلے باندھے کوئی تو اُن کا سترہ روپے کا اعتبار بھی نہ کرتا - اِسی طرح ولایت علی - قمر الدین تاجران لمپ و کرامت علی وغیرہ نے ہزار ہا روپے کا نقصان دیا آخر کو دونوں نے دیوالہ نکال دیا اور اب کرامت علی صاحب نے اُلٹا دعویٰ کیا ہے +

مرزا لطیف اللہ بیگ صاحب سے جو نقصان پہنچا وہ پہنچا بایں ہمہ اُن کے صاحب زادے کو بھی تین ہزار روپے دے دیے کہ لو بیٹا خالی ہاتھ بیٹھے کیا کرتے ہو کچھ بیوپار کرو مرزا صاحب کا بیٹا بیٹھا ہی چاہتا ہی اُنھوں نے منع بھی کیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا اُنھوں نے کیا بیوپار کیا یہ تو اُن کو معلوم ہی مگر ہمارے پاس چک کا کوپن ہی اور اُن کے پاس یہ بھی نہ رہا جیسے بے مشقت روپیہ ملا تھا خوب گلچھرے اُڑائے مرنے سے چند ہی ہفتے پہلے پھر اُسی شیشے والے کو پانچ ہزار روپے دیے دستاویز تمسک صرف ایک ہینڈ نوٹ پر - لوگوں نے منع بھی کیا کہ یہ شخص دو دفعہ دیوالہ بھی نکال چکا ہی اسے روپیہ نہ دیجیے - کہنے والا اتفاقاً میں بُرا بنا مہر الٰہی سے اُنھوں نے کہہ دیا کہ بھئی میں تو تم کو روپیہ دینے کو طیار ہوں روپیہ دھرا ہی لے جاؤ مگر فلاں شخص منع کرتے ہیں - غرض اُن کی قسمت کا روپیہ تھا لیا اور لیتے ہی اپنے لڑکے کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی چند روز بعد مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا اُن کے انتقال کے ساتھ ہی مہر الٰہی صاحب نے گودام میں سے سارا مال باہر کر خالی گودام کو قفل لگا دیا اور اب مزے سے چین کرتے ہیں دینے لینے کو ٹکا پاس نہیں نالش سے وہ ڈرتے نہیں البتہ ہم ڈرتے ہیں کہ اَور ہزار پانسو روپے نالش میں خرچ ہوں گے اور پھر ڈگری لے کر اُن کے پاس کیا دھرا ہی جو تعمیل کرائیں گے +

دو لڑکے کشمیری کے تھے اُن کو خود پڑھایا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ بہت سلوک کرتے تھے جب وہ جوان ہو گئے تو ہزار روپے اُن کو بھی دے دیے کہ اس سے بیوپار کرو بیوپار تو وہ کیا خاک کرتے کچھ پتنگ بازی میں اُڑا یا کچھ تماش بینی میں اب قلاش بنے پڑے پھرتے ہیں - ایسی صدہا مثالیں ہیں کہاں تک دُہراؤں - جن پر بڑی عنایت ہو گئی تھی سہ پہر کو اُس کی دُکان پر خود جا کر بیٹھا کرتے تھے - چند دن شمس العارفین صاحب کی دُکان پر نشست رہی - مدتوں حاجی سراج الدین صاحب جوتے والے کی دکان پر بیٹھتے رہے جن کے صاحب زادے عبدالرحمٰن صاحب کو پڑھا لکھا کر بی - اے - ایل - بی کرا دیا - شکر خدا کا کہ جوتے کی دُکان تو چھوٹی جب وہ مر گئے تو باہر کا آنا جانا بند کر دیا اب انتقال سے چند دن پیشتر مہر الٰہی صاحب نے شیشے میں اُتار لیا تھا تیسرے پہر کا وقت آیا آندھی جائے مینہ جائے اور وہ مع اپنے صاحب زادے صالحین کے موجود مرحوم اب بلا مدد کے چل پھر نہ سکتے تھے دونوں باپ بیٹے آتے تھے اور اس سونے کی چڑیا کو اپنی دکان پر لے جا کر بٹھاتے تھے جس نے پانچ ہزار کا سونے کا انڈا اِن کو دیا اور اگر زندگی وفا کرتی تو نہیں معلوم ایسے کتنے پانچ ہزار لیتے - جب کبھی میں چھٹی پر دہلی جاتا تھا یہ تماشا دیکھا کرتا تھا کہ لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں اور مالا مال ہو کر جاتے ہیں مگر میری کیا مجال تھی کہ میں کچھ عرض کر سکتا - لقمان کو حکمت کون سکھا سکتا تھا - قدرت خدا کا تماشہ دیکھتا تھا اور چُپ رہتا تھا - اب خود بھی ان نقصانات کو محسوس کرتے تھے مگر ہم لوگوں سے چھپاتے تھے کہ نقصان مایہ و شماتت

ہمسایہ۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ مجھ سے کہنے لگے کہ یہ حافظ اشفاق علی چھ ہزار روپے میرے کھا گیا۔ میں نے اشفاق علی سے پوچھا اُنھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ حاشا للہ میں نے ایک حبّہ بھی نہیں کھایا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں دس نہیں بیس نہیں ہزاروں روپیہ کھا گیا اور یہ بالکل نالوٹ۔ میں خود ان معاملات سے کوسوں دُور بھاگتا تھا جب کئی دفعہ سُنا تو مجھ سے نہ رہا گیا میں نے عرض کیا آپ یوں فرماتے ہیں اور حافظ جی بالکل مُنکر ہیں کہ میں نے ایک دمڑی بھی نہیں کھائی آخر میں بھی عمر بھر یہی معاملے مقدمے کرتا رہا ہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح کھا گئے اور یہ رقم تھوڑی نہیں جو یوں ہضم ہو جائے نہ ایک دم کھائی ہوگی بلکہ بدفعات تو کوئی سا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے کہ میں تحقیقات کروں اور دیکھوں کہ اصلیت کیا ہے۔ فرمانے لگے ہاں بیٹا ضرور دیکھو۔ مولوی رحیم بخش کو حکم ہوا کہ میاں بشیر کو بتلاؤ اُنھوں نے ایک معاملہ جس میں ڈھائی سو روپے غبن کئے تھے مجھے بتلایا کاغذات متعلقہ میں نے دیکھے حافظ جی صاحب جن کو اتنا لمبا چوڑا اور اس شدّ ومدّ سے دعویٰ تھا اُن کو میں نے پکڑا حافظ صاحب نے کہا کہ ہاں بے شک ہوئی تو مجھ سے غلطی میں نے کہا کہ تم کو جرم کا اقبال ہے تو کہنے لگے ہاں میں نے کہا لکھ دو۔ اُنھوں نے اپنا اقبال بیان لکھ دیا۔ میں سامنے گیا اور عرض کیا کہ ایک مقدمہ تو ان پر ثابت ہے۔ کہنے لگے بلاؤ اشفاق علی کو (یہ صاحب ہمارے عزیز بھی ہیں) اُن سے پُوچھا اُن کو سوائے اقرار کے انکار کا مقرّ نہ تھا۔ ہنس کر کہنے لگے بیٹا! ہم نے تم کو معاف کیا نہ دنیا میں ہمارا کا سبہ ہے نہ دین میں مواخذہ۔ بات رفت گزشت ہوئی وہ بغلیں بجاتے چل دیئے میں مُفت میں نکّو بن گیا۔ پھر کئی دن کے بعد ارشاد ہوا کہ میاں بشیر تم نے اشفاق علی کے مقدمات طے نہ کیے میں نے عرض کیا کہ ایک مقدمہ اُن پر ثابت ہوا تھا تو اُس کا کیا نتیجہ ہوا جو اَور کروں آپ نے تو اُن کو معاف فرما دیا بس خاموش ہو گئے۔ ایسا معاملہ متعدد لوگوں سے پیش آیا جن کے ہزار ہا روپے کے ہینڈ نوٹ موجود ہیں جو سیکڑوں اور ہزاروں تو کیا ایک پوسٹ کارڈ کی قیمت کے بھی نہیں جب غیر اس دھڑلّے سے دن دہاڑے لُوٹتے تھے تو اپنے بھلا کیوں نہ مونڈتے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ بھائی میں نے کمایا اور میں نے ہی گنوایا۔ انسان سے غلطی بھی ہو جایا کرتی ہے میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کہتے تھے کہ جس طرح کسی کو جوئے اور شراب کی لت پڑ جاتی ہے۔ اور چھوڑے سے نہیں چھوٹتی اسی طرح مجھے تجارت کی لت ہے۔ میری زندگی تک ممکن نہیں ہے کہ یہ کاروبار بند ہو۔ دلّال دن بھر پھرتے رہتے تھے اور ساری دلّی میں اُنھوں نے چھانٹ چھانٹ کر نادہندوں ناداروں مفلسوں۔ بدمعاشوں میں روپیہ پھنسوا دیا۔ خدا اُن کا بھلا کرے۔ اس طرح میرے خیال میں کم سے کم چھ لاکھ روپیہ خالصے لگ گیا۔ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ دوسروں کی آمدنی کا اندازہ بہت فراخ دلی سے لگاتے ہیں۔ مرحوم کی ساکھ اور بھرم کے اعتبار سے چاروں طرف سے اخباروں میں اُودھم مچ گئی تھی کہ بارہ لاکھ روپیہ نقد چھوڑ مرے میں بھی خیال کرتا ہوں کہ اگر اس طرح اُن کا روپیہ نوچا کھسوٹا نہ جاتا تو دس لاکھ کا سرمایہ ہونے میں کوئی شک نہ تھا کیوں کہ ڈھائی لاکھ روپیہ تو صرف اُن کی پنشن ہی کا ہوا مگر جس طرح اُن کی دولت کو گھونسیں لگ گئی تھیں اور دیمک چاٹ رہی تھی تو خزانۂ قارون بھی خالی ہو جاتا۔ اب ڈوبا ہوا روپیہ چھوڑ کر دیکھا جائے تو اب بھی مرحوم کا ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ مہذّب ثقہ لوگوں میں پھنسا ہوا ہے جن سے بجز چکنی چپڑی باتوں کے ایک خرمہرہ وصول ہونے کی امید نہیں۔ نالش اُن پر کرنا فضول کیوں کہ وہ کچّی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں پہلے ہی سے اپنی جائداد اِدھر اُدھر منتقل کر کے بےفکر ہو گئے ہیں

اب اُن پر نالش کرکے کیا لیں گے کوہ کندن و کاہ برآوردن پہلے نالش پر مُٹھی مٹھی گرہ سے روپیہ لگائیں دوا دوش کریں۔ جب کہیں برسوں میں ڈگری ہو تو وہاں ڈھاک کے تین پات ڈگری کو شہد لگا کر چاٹا کریں۔ کئی شخصوں نے پہلے ہی دیوالہ نکال دیا ہے پھر ایک جگہ معاملہ نہیں کلکتہ۔ لاہور۔ رانی کھیت۔ بھوپال۔ جھانسی۔ ساگر۔ کانپور۔ لکھنؤ۔ علی گڈھ۔ گوالیار وغیرہ چو طرف روپیہ بکھرا پڑا ہے۔ مجھ کو دیکھیے ملازمت کے دھندے میں گرفتار۔ کدھر حیدرآباد کہاں دہلی۔ یک سر و ہزار سودا مجھ سے یہ جھگڑا کہاں ہو سکتا ہے۔ مگر مثل مشہور ہے بندہ صاحب مار رکھتا ہے۔ وہ مجھ پر صادق آ گئی۔ بینک کا بڑا بھرم تھا وہاں صرف پچاس ہزار روپے نکلے جو ان خون چوسنے والوں کی دست برد سے اس وجہ سے محفوظ رہے تھے کہ وہ روپیہ نہ ہوتا تو آئے دن ولایت سے مال کا چالان کیسے آتا ہُنڈیاں کیسے سکاری جاتیں۔ تجارت اور لین دین کا پھیلاؤ کیسے ہوتا۔ بنک اسی کی طمانیت پر روپیہ دیتا تھا جب کام چلتا تھا ورنہ گھر میں تو دس روپے بھی نقد نہ تھے۔ اس کے علاوہ کل جائداد ساکڑ ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگی۔ بارہ لاکھ کی جگہ ہمارے جو پلے پڑا وہ تو یہ ہے بشرطیکہ یہ بھی محفوظ رہ سکے۔ آئندہ کے جھمیلے۔ آئے دن کے مقدمے۔ انواع و اقسام کی ذمہ داریاں اگر چین لینے دیں تو بھی غنیمت ہے۔ مرحوم کے معاملات تجارتی کو میں نے حتی المقدور بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے ورنہ یہ معاملات ایک طلسم ہوش رُبا ہیں اور خدا کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہیں۔ وہ شخص جو اول درجے کا محتاط ہو جس نے اپنی گاڑھی کمائی سے بہ ہزار دقت روپیہ جمع کیا ہو جو اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا گوارا نہ کرتا ہو اور جسے لوگ کنجوس بھی کہتے ہوں (گو وہ کنجوس نہ تھے البتہ مُسرف بھی نہ تھے) وہ ایک طرف تو ایسا تنگ دست ہو اور دوسری طرف ایسا لکھ لٹ ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار +

شرح ایں قصۂ دل سوز نہ گفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

مطبع

مثل مشہور ہے کہ آپ کام مہا کام دوسروں کے بھروسے پر جو کام کیا جائے گا وہ ضرور خسارت دے گا۔ رہن۔ بیع۔ داد و ستد کے معاملے کچھ کم نہ تھے جو ایک مطبع کی پخ بھی اپنے پیچھے لگا لی۔ خود نگرانی کر نہیں سکتے تھے دوسروں کو دخل نہ تھا اور جن کو دخل تھا وہ خود غرض پھر کام چلے تو کیسے۔ مرحوم کی کتابوں کی جیسی قدر ہوئی اور جس قدر مانگ تھی اُس سے ہزار ہا تاجر بن گئے خدا جانے مرحوم نے خود سوچا یا کسی نے سُجھایا کہ اپنی کتابیں خود اپنے اہتمام سے چھپوائیں تو کتابیں بھی اچھی چھپیں گی اور منفعت بھی ہوگی چنانچہ مطبع انصاری اور نذیر حسین تاجر کتب کے ذریعے سے کام چلنے لگا چند سال کے بعد اپنا ایک مطبع کھڑا کیا جس کا نام شمسی پریس رکھا اور اپنی کتابیں اور ترجمۂ کلام مجید مختلف تقطیع کا اور حمائلیں چھپنے لگیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لین ایسی تھی کہ اگر احتیاط سے باقاعدہ طور پر چلائی جاتی تو لاکھوں روپے کے وارے نیارے تھے لیکن اس میں بھی ناکامیابی اور نقصان ہی رہا +

نکاسی کا کوئی باقاعدہ طریقہ نہ تھا۔ اشتہار کبھی دیا ہی نہیں گیا قیمت میں رعایت کسی سے کی نہیں پھر نکاسی ہو تو کیسے۔ حالت یہ تھی کہ ہزار ہا کلام مجید اور ہزار ہا حمائلیں چھپی جاتی تھیں اور تہ خانے میں اٹم کے اٹم لگے ہوئے تھے۔ تہ خانے کی سیل سے دیمک نے بڑے بڑے ذخیرے کو تباہ کیا کیوں کہ چھاپنے اور رکھ دینے کے بعد دیکھتا کون تھا۔ یہاں تو بس یہ دھن تھی

کرجاپے جاؤ اور اس خیال سے مگن تھے کہ وہ لاکھ کا سٹاک ہے تجارت کے بڑے اصول کم منافعہ اور جلد نکاسی کے سراسر خلاف یہاں عمل تھا مطبع دس بارہ برس رہا مگر حساب ایک دن نہ ہوا کہ کیا صرف ہوا اور کیا آمد ہوئی - کوئیں کی مٹی کوئیں ہی کو لگ گئی - مرحوم اسے غنیمت سمجھتے تھے کہ گرہ سے کچھ دینا نہیں پڑتا حساب دیکھنے کی اُن کو عادت نہ تھی - والد کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس مطبع کو بند کیا کرکھا تا دھن تھا اور بچے ہوئے سٹاک کو دیکھا تو کاغذ معمولی کی طرح پڑا تھا جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس برس سے اُس کی تہذیب ہو رہی ہے اور اب تک ہو رہی ہے قیمت بھی میں نے نصف سے بھی کم کر دی لاگت پر ہر لگا کر بہت سا سٹاک نکال ڈالا کیوں کہ جھے گلا نا سڑانا منظور نہ تھا اب جو سٹاک ہے اور بہت کچھ ہے اُس کے نکالنے کی فکر میں ہوں - مطبع کا حساب آج تک دیکھا نہیں گیا تھا اب دیکھا گیا تو زیادہ کیا لکھوں اور لکھنے سے نتیجہ ہی کیا - اپنا مال کھوٹا تو پرکھنے والے کا کیا دوش - اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریئے بارہ سو روپے جھے گرہ سے دینے پڑے جب خدا خدا کرکے گلو خلاصی ہوئی اب اسے منافع سمجھیے یا جو چاہیے سمجھیے میں اسے ہی غنیمت سمجھا کہ بارہ سو دے کر میرے گلے کی پھانسی نکلی - نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز ؛

مولانائے مرحوم کی یادگار

جناب مولوی نذیر احمد صاحب نے باوجودیکہ عمرِ طبعی کو پہنچ کر اور دنیا کی ساری بہاریں لوٹ کر انتقال کیا تھا تاہم اُن کی وفات پر سارے ہندوستان میں اس سرے سے لے کر اُس سرے تک ایک ہل چل مچ گئی - کوئی جگہ کوئی جگہ - ہر برآوردہ مسلمانوں کا کوئی گھر بھی ایسا نہ تھا جہاں اُن کا ماتم نہ ہوا ہو - ایسی موت نے اُس خاص گھر پر کیا اثر کیا ہوگا جس سے یہ نعمتِ عظمیٰ انتزاع ہو گئی محتاجِ بیان نہیں نہ اس کا اندازہ کرنا کوئی آسان کام ہے - جن کے دلوں پر اس کا صدمہ ہے وہ زندہ در گور ہیں - مرحوم کثیر الاولاد نہ تھے اُن کی اولاد میں صرف میں اور میری بہنیں ہیں - بہن اپنے گھر کی ہیں شادی بیاہ کے بعد یوں بھی لڑکیوں کے تعلقات میکے سے ضعیف ہو جاتے ہیں لے دے کے ایک خستہ جان میں ہی رہ گیا - صرف باپ کے مرنے کا صدمہ بیٹے کے لیے کیا کم مصیبت ہو سکتی ہے چہ جائیکہ ایسا باپ جو کہیں کا بہت بڑا رئیس تھا نہ جاگیردار نہ منصب دار نہ کروڑپتی دولت مند مگر خداوند تعالیٰ نے اُن کا نام چار دانگ عالم میں بلحاظ علم و فضل ایسا مشہور کیا تھا کہ اُن کی موت نے تمامی ہندوستان کو ایسا صدمہ پہنچایا اور اُن کی موت سے ہر ہر طرف ایسی درد انگیز صدائیں بلند ہوئیں کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے رئیس کے واسطے بھی اگر ہوتیں تو اتنی ہی ہوتیں نہ کہ اس سے زیادہ - مجھ پر صدمات کا ایسا ہجوم تھا کہ ہوش و حواس بجا نہ تھے اور نہ اب تک ہیں - مجھے چاروں طرف دنیا اندھیر نظر آتی ہے - یادگار کے قائم کرنے کا خیال تو دل میں ضرور تھا مگر اُس پر کچھ غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ سب سے پہلے ۳۰ مئی ۱۹۱۲ء کے ہفتہ وار "ریاست اخبار" میں "مولانا نذیر احمد کی یادگار" پر مضمون نکلا - ہم عصر ایڈیٹر لکھنؤ اور بعض دیگر اخبارات زور دے رہے ہیں کہ اہلِ اسلام کو شمس العلما مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم ایل ایل - ڈی - ڈی - او - ایل - کی کوئی شاندار یادگار قائم کرنی چاہیے - اس ضرورت پر سب سے پہلے جس اخبار کے ایڈیٹر کا اس میں نوٹس لیا جا چکا ہے اور مولانائے مرحوم کے [illegible] مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو اس امر [illegible] جا چکی کہ گو مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مشہور کیا [illegible] قرآن اور [illegible] اُن کی [illegible] یادگار [illegible] مستند اور قابلِ قدر کتابوں میں [illegible] رہیں گی [illegible] معرکے کی علمی اور ادبی [illegible] مولانا [illegible]

مغفور نے بہیوں کو اُن کے علاوہ دوسری لائنوں میں بھی قوم کی شان دار خدمات انجام دی ہیں اور اپنے ہمّا خیز تحریروں سے مسلمانوں کی قومی
مرکز تعلیم علی گڑھ کالج ایجوکیشنل کانفرنس انجمن حمایت اسلام مدرسہ طبیہ دہلی وغیرہ کو بہت بڑے فائدے پہنچائے ہیں اور وقتاً فوقتاً
بیش قرار نقد عطایا بھی دیتے رہے ہیں اس لیے مسلمانوں کی عقیدت مندی اس امر کی مقتضی ہے کہ اول تو ان تمام انسٹیٹیوشنوں وغیرہ
کو اور خاص کر علی گڑھ کالج میں جس کے مولانا مرحوم ابتدا سے ٹرسٹی رہے ہیں اور اس طویل زمانہ تعلق میں۔ دامے۔ درمے۔ قلمے۔ قدمے
اُس کو بہت فائدہ پہنچا چکے ہیں۔ ان کی کوئی موزوں یادگار کسی مفید صیغے کی صورت میں قائم کی جائے اور اس کے لیے مسلمان
پبلک سے چندہ لیا جائے جو ان شاء اللہ بہت جلد معقول مقدار میں جمع ہو جائے گا۔ میرے لیے اس تحریر نے ایک تازیانے کا کام دیا
اور جیسا کیا چاہیے ہو وا آنکھیں جب میں نے دیکھا کہ قوم اس بات پر آمادہ ہے تو اگر میں قدم نہ بڑھاتا تو مجھ سے زیادہ نالائق کوئی شخص نہیں ہو
سکتا تھا مجھے کامل الیقین تھا کہ اگر علی گڑھ کالج میں میری جانب سے سلسلہ جنبانی ہو گی تو بہت جلد یہ کارروائی عملی صورت اختیار کرے گی۔
میرے باپ نے جو سلوک علی گڑھ کالج سے کیا اور میرے والد کے وہ تعلقات جو سرسید اور نواب محسن الملک اور وقار الملک بہادر سے میں اپنے
بچپنے سے دیکھتا چلا آتا تھا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں کسی قسم کا مخالفانہ خطرہ نہ ڈال سکتے تھے بلکہ ان ہی خیالات نے مجھے
آمادہ کیا اور میں نے سب سے پہلے نواب وقار الملک بہادر کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ اگر علی گڑھ کالج کوئی یادگار میرے والد کی قائم کرنا چاہتا
ہے تو میں اس میں ایک معقول چندہ دوں گا اور دل میں سمجھ لیا تھا کہ ہم خرما و ہم ثواب ضرور وہاں سے میری استدعا کے موافق جواب آئے گا
لیکن من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال۔ وہاں سے مجھ پر ایک بم کا گولہ پھینکا گیا اور ٹکا سا جواب مل گیا کہ علی گڑھ کالج کی طرف سے کوئی
یادگار قائم نہیں کی جا سکتی۔ بے شک یہ فیصلہ کالج کا میرے والد کے حق میں ایک صریح بے انصافانہ فیصلہ تھا اور بہ حیثیت ان کے فرزند
ہونے کے میرا پہلا فرض تھا کہ میں اس کو پبلک کے سامنے لاؤں چنانچہ میں نے تہذیب نسواں اور وطن میں اپنی تحریر چھپوائی جس
کی تردید علی گڑھ گزٹ نے کی وہ تردید مصداق عذر گناہ بدتر از گناہ تھی یعنی مرے پر سو درّے۔ مرحوم کے سارے احسانات طاق نسیاں کر دینے
سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ مرحوم پر ایک غلط الزام بھی لگایا کہ اُنھوں نے آخر عمر میں امہات الامہ لکھ کر مسلمانوں کا دل دکھایا اس
واسطے ہم نے یادگار قائم کرنے سے انکار کیا۔ اس امر کا فیصلہ کہ علی گڑھ کالج کی یہ رائے کس حد تک واجبی تھی مجھے کرنے کی ضرورت نہیں
کہ خود پبلک نے اچھی طرح خبر لی ہے اور ساری قلعی کھول دی ہے لہٰذا اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں اُن تحریرات کو من و عن چھاپ دوں تاکہ ناظرین
خود فیصلہ فرمالیں کہ حق کس کی جانب ہے

علی گڑھ کالج کی ہمدردی انتخاب
از تہذیب نسواں مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء

دُنیا جہان کو معلوم ہے کہ میرے والد مرحوم جناب مولوی نذیر احمد صاحب نے علی گڑھ کالج کے ساتھ کیا کیا۔ سرسید مرحوم خود ان کی امداد کے معترف تھے۔ جا بجا ان کے ساتھ پھرے دُور دراز مقامات کانفرنس میں گئے
اپنے بیش بہا لیکچروں کے ذریعے سے ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ چندہ دلوایا۔ خود بھی ہزار ہا روپیہ چندہ دیا۔ بورڈنگ بنوائے
جب حیدرآباد میں تھے۔ اور سرسید تشریف لائے تھے۔ تو ایک کثیر رقم چندہ کی فراہم کی غرض سخنے۔ قدمے۔ درمے۔ ہر طرح مدد کر
رہے۔ نہ صرف سرسید کی حیات تک بلکہ اُن کے بعد بھی باوجود پیرانہ سالی زحمت شاقہ گوارا کر کے دور دور مقامات پر گئے لیکن جب
ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ اور ضعیفی نے آن دبایا۔ تو نقل و حرکت سے مجبور ہو گئے۔ اور ایسے مجبور ہو گئے۔ کہ گھر سے نکلنا چھوڑ دیا

علی کر باوجود کہ دعوت دی گئی تھی۔ مگر پھر بھی کارونیشن دربار میں نہ جا سکے۔ ایسی حالت میں انھوں نے خوشی سے نہیں مجبوری سے خانہ نشینی اختیار کی۔ اور صرف علی گڈھ کالج کی خدمت سے دست کش ہوئے۔ بلکہ مدرسہ طبیہ دہلی، اور انجمن حمایت الاسلام لاہور سے بھی انھوں نے کنارہ کشی کی +

میرے کرم دوست منشی محبوب عالم صاحب نے پیسہ اخبار میں والد مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی پُر زور تحریک کی تھی۔ اور اس توقع کا اظہار کیا تھا۔ کہ قوم کی طرف سے وافر چندہ فراہم ہو جائے گا۔ یادگار کی نسبت یہ بھی لکھا تھا۔ کہ علی گڈھ بنائے۔ یا انجمن حمایتِ اسلام۔ یا مدرسۂ طبیہ۔ اور اُن کا یہ خیال اسی وجہ سے تھا۔ کہ مرحوم نے اُن کے پیسہ مدت العمر اپنی جان چھڑکی۔ میں نے منشی صاحب موصوف کو لکھ دیا تھا۔ کہ مدرسۂ طبیہ سے تو مجھے امید نہیں۔ کیوں کہ گھر کی مُرغی دال برابر۔ دہلی والوں کو کفر کے فتاوے سے اتنی فرصت کہاں۔ جو کسی کی یادگار بنائیں؟ اب اگر نگاہ پڑتی ہے۔ تو پہلے علی گڈھ کالج پر اور پھر انجمن حمایتِ اسلام لاہور پر۔ چنانچہ میں نے اسی بنا پر سکرٹری صاحب علی گڈھ کالج کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا۔ کہ اگر قوم کی طرف سے مرحوم کی کوئی یادگار بنانا تجویز کیا جائے۔ تو میں سب سے پہلے ایک معقول رقم چندے کی دوں گا۔ مجھے توقع تھی کہ اس کا جواب بجز منظوری کے دوسرا نہ آئے گا۔ لیکن افسوس صد افسوس میری کیا بلکہ ساری قوم کی خلاف توقع مجھے یہ رزولیوشن ملا +

نقل رزولیوشن نمبر ۱۹

اجلاس سنڈیکیٹ علی گڈھ مورخہ ۲۳ جون ۱۹۱۲ء دربارۂ یادگار مولانا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم +

"چوں کہ مولانا مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا۔ لہٰذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہے" +

جس کو پڑھ کر میں سنّاٹے میں آ گیا۔ کیا میرے والد جو بوجہ کہولت کے نشست و برخاست سے معذور ہو گئے تھے۔ جب بھی وہ علی گڈھ کالج سے علٰحدہ نہ ہوتے؟ کیا وہ برائے نام ٹرسٹی رہتے۔ اور کیا یہ بات خلافِ دیانت نہ تھی۔ کہ وہ ٹرسٹی تو رہتے اور کچھ کام نہ کرتے؟ چنانچہ ان ہی وجوہ سے نواب وقار الملک نے سکرٹری شپ سے استعفا دے دیا۔ پس کیا بہ حالتِ مجبوری ایسا کرنے سے اُن کے تمام احسانات جو علی گڈھ کالج پر مدت العمر کرتے رہے چشم زدن میں مٹ گئے؟ اور کیا ان محنتوں اور کوششوں اور جاں فشانیوں پر ایک دم پانی پھر گیا۔ افسوس صد افسوس۔ یہ اُس جگہ کا رزولیوشن ہے جس کا اوڑھنا بچھونا قومی ہمدردی ہے۔ اب تبلایئے۔ کہ کون شخص اُن سے کیا توقع رکھ سکتا ہے۔ مرحوم کی یادگار قائم کرنے میں سراسر کالج ہی کا فائدہ تھا۔ اگر کالج کی طرف سے کوئی یادگار قائم نہیں کی جاتی۔ تو کالج کی بے رُخی اور بے اعتنائی اور احسان فراموشی خود ایک ایسی یادگار قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جو کبھی ہٹ نہ سکے گی۔ اور لوگ دیکھ لیں گے۔ کہ مولوی نذیر احمد صاحب جیسے شخص کے ساتھ کالج نے ایسا سلوک کیا۔ کہ اُن کے ماتم میں ایک دن کالج بھی بند نہ کیا یادگار قائم کرنا تو کارے دارد۔ تو دوسروں کو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ اُن کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُن کا نام کوئی بھلائی سے بھی لے گا مرحوم کی یادگار گو علی گڈھ کالج قائم نہ کرے۔ مگر کالج کے بورڈنگ جو اُن کے نام پر کھڑے ہیں۔ سٹریچی ہال کے کتبے۔ کالج کے رجسٹر کانفرنس کی رپورٹیں۔ مرحوم کے متعدد لکچر اُن کو صفحۂ دُنیا سے کیسے مٹا سکتے ہیں؟ مرنے والے مر گئے۔ مگر قوم کے دلوں پر اُن کا سکہ بیٹھا ہوا ہے جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سہ کرئیے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ + تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں جب علی گڈھ جیسی باوقعت مسلم سوسائٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تو اب انجمن حمایت اسلام سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

خاکسار رولفگار بشیر حیدر آباد۔ ۱۳ / جولائی ۱۹۱۲ء

اس عہد میں کیا گیا۔ جب کہ اس کشتی قوم کے ناخدا خدا کے فضل و کرم سے عالی جناب نواب **وقار الملک** ہیں۔ ممکن ہے کہ باوجود کوشش کے وہ اپنے جلیسوں کو اپنا ہم رائے بنانے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں مگر قوم کے اطمینان کے لیے اس بات کا ظاہر کر دینا نہایت ضرور ہے کہ مولانا مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے باب میں خود جناب نواب ممدوح کی کیا رائے تھی۔

ہمارے اخبار کی سب معاون خواتین اپنے اوپر مولانا مرحوم کے بے شمار احسانات سمجھتی ہیں۔ اور انھیں ہندوستان میں زنانہ لٹریچر اور تعلیم کا بانی جانتے ہیں۔ انھیں کارکنان قوم کی اس بے مروتی سے بے انتہا رنج ہوگا کہ ان کو کالج کے احاطہ میں اس بزرگ مرحوم کے نام پر مفت عمارت بنوانی بھی منظور نہیں۔ کیا حقیقت میں نذیر احمد ایسا ہی برا آدمی تھا کہ مرنے کے بعد بھی علی طور پر ان کے ذکر خیر کیے جانے پر اس قدر کراہت۔ حقارت اور رنج اور غصے کا اظہار کیا جائے۔ (خاکسار سید ممتاز علی)

ٹرسٹیان کالج کا شکوہ
علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
۳۱ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء

اخبار تہذیب نسواں مطبوعہ ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک خط جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف الصدق جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور کا شتہر ہوا ہے جس میں وہ اس بات پر اپنی نارضامندی کا اظہار کرتے ہیں کہ ٹرسٹیوں نے علی گڈھ کالج میں جناب مرحوم و مغفور کی یادگار قائم کرنے سے انکار کیا۔ اور اس انکار کی بنیاد پر وہ ٹرسٹیوں کو ایک ناشکر گزار جماعت قرار دیتے ہیں۔ ٹرسٹیوں کے اجلاس سنڈیکیٹ مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۹۱۲ء کا وہ رزولیوشن نمبر ۱۹ حسب ذیل ہے۔

"چونکہ مولانا مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا۔ لہٰذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہوگا"

جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے جن الفاظ میں ٹرسٹیوں کی شکایت پبلک کے سامنے پیش کی ہے اُس کے لحاظ سے اگر واقعات کا اظہار کچھ نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ پبلک کو اس معاملے میں سخت غلط فہمی واقع ہوگی۔ اور اب چونکہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے خود اس مسئلے کو پبلک کے سامنے پیش کیا ہے تو جو کچھ اس مسئلے پر مزید روشنی پڑے اُس کی ذمہ داری خود موصوف ہی پر ہوگی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے جس وقت یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا تو اُس وقت سنڈیکیٹ کے سامنے سخت مشکل پیش تھی کہ جناب مرحوم نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ پیشتر جو ایک کتاب "امہات الامہ" کے نام سے تصنیف فرمائی تھی اُس سے مسلمان بہت ہی برہم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں ان کی جان کی طرف سے اندیشہ کیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے منتظمان مدرسۂ طبیہ دہلی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اپنے ایک بہت ضروری جلسے میں جو اسی زمانہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر (پنجاب) بالقابہ نے فرمائی تھی۔ جناب مرحوم و مغفور کو تشریف لانے کی تکلیف دیں۔ جناب مرحوم و مغفور کے دوستوں نے اگرچہ بہت کوشش کی اور اُس کتاب کو تلف بھی کرا دیا۔ لیکن درحقیقت جو صدمہ کہ اُس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں کو پہنچ چکا تھا وہ پوری طرح آخر تک رفع دفع نہیں ہوا۔ مگر سنڈیکیٹ نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس قسم کا کوئی ذکر اپنے رزولیوشن میں کرے اور انھوں نے وہ سادہ سادہ رزولیوشن پاس کر دیا جو اوپر درج ہے۔

پھر مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے کچھ اپنے ہی صرف سے اپنے والد ماجد کی یادگار کالج میں قائم کرنی نہیں چاہی تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کالج اپنی طرف سے فراہمی چندہ کی اپیل قوم سے کرے۔ جس میں وہ خود بھی ایک معقول شرکت کریں گے۔ یہ یادگار قائم کرنے کی ذمہ داری خود کالج کے منتظموں پر آجاتی تھی اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی اپیل ٹرسٹیان کالج کی طرف سے پبلک میں شائع ہوتا تو یقیناً اس پر راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو برہمی پیدا ہوتی اور وہ کالج پر لے دے کرتے۔ اور اس وقت کالج کی طرف سے پبلک کے برہم ہونے کا اس سے زیادہ خطرہ ہوتا جتنا کہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے عنایت نامے کے اخبار میں مشتہر کرنے سے اس کا اندازہ کیا ہوگا۔

ہم کو یہ بھی یقین ہے کہ جناب مرحوم و موصوف جیسے لائق اور قابل شخص نے کسی نہ کسی وقت ضرور اپنی اس غلطی پر خدا سے (جو غافر الذنب وقابل التوب ہے) توبہ کی ہوگی۔ اور ہم لوگوں کو اب بموجب "اذکروا موتکم بالخیر" اُن کی نسبت نیک گمان کے سوا اور کچھ گمان نہ رکھنا چاہیے۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰے جناب مرحوم و مغفور کی (جن کی بہت سی خدمات اسلام کے واسطے ہو چکی ہیں) مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب ہم کو معاف کریں کہ کالج کو ناواجب نقصان سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ہم نے اصل واقعہ پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی جرأت کی ہے۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدا سب مسلمانوں کا خاتمہ بخیر کرے۔ آمین۔

علی گڈھ کی قومی ہمدردی کی ایک بے نظیر مثال

وطن۔ ۲۹ جولائی ۱۹۱۲ء

اے اجل گر تن بے جاں تہ خاکش ببری

نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری ؎

میرے والد ماجد جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل کے انتقال سے سارے ہندوستان میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ تمام نامور اردو کے اخبارات نے اُن کے انتقال پر اظہار افسوس کیا۔ افسوس ہے کہ علمی دنیا اُن کے چشمۂ فیض سے محروم ہو گئی۔ اُن کا مرنا قوم کے لیے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا کیوں کہ چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ جو اٹھ جاتا ہے اس زمانۂ قحط الرجال میں اُس کا بدل نہیں مل سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے اُن کی یادگار کے قائم کرنے کی صدا علی گڈھ سے اُٹھے گی۔ جو قومی مرکز تعلیم ہے۔ اور علی گڈھ کالج پر مرحوم کا بڑا حق تھا۔ خود معتد بہ رقم چندوں میں وقتاً فوقتاً دی۔ لکچروں کے ذریعے سے ہزارہا روپے دلوائے۔ سر سید اور محسن الملک بہادر کے ساتھ در بدر پھرے۔ جو ابھی کل کی بات ہے۔ مگر جب بوڑھے ہو گئے تو ٹرسٹی شپ سے درخواست سے علٰحدہ ہو گئے۔ دور دراز مقامات کے سفر کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ ناچار ٹرسٹی شپ چھوڑ دی اور چونکہ زمانہ ایسا تھا کہ راست بازی اور دیانت کا یہ مقتضا نہ تھا کہ برائے نام ٹرسٹی رہیں اور کام نہ کر سکیں۔ اگر یہ وجہ معقول نہ تھی تو جیسے نواب وقار الملک کا سکرٹری شپ سے علٰحدہ ہونا بھی عذر لنگ ہوگا۔

میرے والد کی یہ حالت تھی کہ وہ دہلی۔ وہاں کی ڈگری لینے لاہور نہ جا سکے۔ جب پنجاب لفٹننٹ گورنر نے افسوس کا اظہار کیا۔ اور مرحوم سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔ سکار ونش دربار کی دعوت آئی اسی مجبوری سے

نہ جاسکے۔ کیا اس صراحت کے بعد بھی اُن کا علی گڈھ کالج کے جلسوں میں شریک نہ ہونا کوئی بہانہ یا گریز سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کی موت پر علی گڈھ کالج نے کان تک نہ ہلایا۔ سب سے پہلے پیسہ اخبار نے یادگار کی صدا بلند کی اور لکھا کہ علی گڈھ کالج۔ انجمن حمایت الاسلام۔ مدرسہ طبیہ دہلی سے یادگار قائم کی جائے جس کے لیے قوم تیار ہے معتد بہ چندہ فراہم ہوسکے گا۔ میں نے علی گڈھ لکھا۔ امید تھی کہ ضرور وہاں یہ تحریک منظور ہوگی۔ کیوں کہ ہم خرما وہم ثواب۔ علی گڈھ کالج کی اس پیرایے میں بھی امداد ہوگی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہاں تو بہرے ہوئے بیٹھے تھے۔ سوکھا سا جواب یہ ملا۔

ریزولیوشن نمبر ۱۹۔ باجلاس سنڈیکیٹ ۲۳ جون ۱۹۱۲ء " دربارۂ یادگار مولنا ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم۔ چوں کہ مولنا مرحوم نے عرصے سے علی گڈھ کالج سے اپنا تعلق قطع کرلیا تھا۔ لہذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہے"

ہم پبلک کے سامنے اس جواب کو پیش کرکے عرض کرتے ہیں کہ یہی صلہ مرحوم کی جاں فشانی کا قوم کی طرف سے ملا ہے۔ مرحوم کی یادگاریں علی گڈھ کالج میں سر بفلک کھڑی ہیں۔ اُن کے لکچر علی گڈھ کالج کے تائیدی مضامین میں بھرے پڑے ہیں۔ کیا اس پر بھی کوئی واقعات سے انکار کرسکتا ہے۔ ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں۔ یہ فتویٰ اُس خطے کا ہے۔ جہاں قومی ہمدردی کی تخم ریزی کی جاتی ہے۔ اگر قومی ہمدردی اسی کا نام ہے کہ کسی کے مرتے ہی اُس کے حقوق سب ملیامیٹ ہوجائیں تو ایسی قومی ہمدردی کو ہمارا سلام ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کوئی یادگار قائم کرنا تجویز ہو تو میں معقول چندہ دوں گا۔ مگر وہاں تو سرے سے انکار ہی انکار ہے۔

ع ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا

مانا کہ کئی برس ہوئے کہ مرحوم نے ٹرسٹی شپ چھوڑدی تھی لیکن اس سے کیا اُن کے تمام مساعیٔ جمیلہ یک قلم کالعدم ہوگئے۔ حاشا وکلا۔ جب علی گڈھ جیسے مہذب مقام سے یہ جواب ملا ہے۔ تو اب انجمن حمایت الاسلام اور مدرسہ طبیہ سے کیا توقع کی جاسکتی ہے ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انجمن حمایت الاسلام پر بھی مرحوم کے کم احسانات نہیں ہیں۔ سالہا سال تک وہ سالانہ جلسوں میں لاہور جاتے رہے اور اُن کے لکچروں کی بدولت ہزارہا روپیہ چندہ ملا۔ کم وبیش یہی حال مدرسہ طبیہ دہلی کا ہے۔ لیکن دہلی کی سرزمین میں سوائے مذہبی مخالفتوں اور کفر کے فتوے سہنے کے اب باقی کیا رہا ہے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ وہاں سے مجھے پہلے ہی امید نہ تھی ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ　　تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

اب لے دے کے انجمن حمایت الاسلام لاہور رہ گئی۔ اگر کچھ کریں گے تو زندہ دلانِ پنجاب ہی کریں گے ورنہ ما بخیر و شما بسلامت۔ آخر میں اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ مرنے والے مر گئے۔ خدا اُن کو غریق رحمت کرے لیکن

علی گڈھ کالج کی یہ سرد مہری خود ایک ایسی یادگار ہے جو مدۃ العمر قائم رہے گی۔ مولانا مرحوم کے علمی کارنامے دُنیا میں ایسے پھیلے ہوئے ہیں کہ اُن کا نام مٹنے نہ دیں گے۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اَور اور دکھانے کے اَور۔ مسلمانوں میں اب بھی قومی سپرٹ باقی نہیں ہے۔ احسان مندی اور شکرگزاری کے عمدہ صفات سے قوم اب بھی محروم ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ والسلام

(بشیرالدین احمد مددگار مہتمم مالگذاری سیٹلمنٹ روڈ حیدرآباد دکن)

ایک ناشکر گزار جماعت
البشیر ۶ اگست ۱۹۱۲ء

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے صاحبزادے نے کوئی درخواست ٹرسٹیان محمڈن کالج کو بھیجی تھی جس میں انھوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ٹرسٹیان کالج شمس العلماء موصوف کی کوئی یادگار کالج میں قائم کریں قوم سے اپیل کی جاوے اور وہ خود بھی معقول امداد اس یادگار کے قیام میں دیں گے

جس وقت یہ درخواست سنڈیکیٹ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ اُس وقت سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ جون میں یادگار قائم کرنے کی تجویز سے انکار کیا۔ اور صرف یہ رزولیوشن پاس کیا کہ "چونکہ مولانا مرحوم نے عرصے سے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا۔ لہٰذا کالج کی طرف سے کسی ایسی کارروائی کا موقع نہیں ہے"

اس رزولیوشن کے پاس ہونے پر شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اخبارات میں کوئی مضمون شائع کرایا جس میں ٹرسٹیوں کی اس کارروائی پر اظہار ناراضی کیا گیا ہے۔ اور ٹرسٹیوں کو ایک ناشکرگزار جماعت کا خطاب دیا ہے۔ اس مضمون کے جواب میں کالج کے ارگن علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک لیڈنگ آرٹیکل شائع ہوا ہے اور اس آرٹیکل کے شائع کرنے کی ضرورت یہ بیان کی گئی ہے کہ پبلک میں غلط فہمی پیدا نہ ہونے پاوے۔ سنڈیکیٹ کے رزولیوشن شائع ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے "جس وقت یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا۔ تو اس وقت سنڈیکیٹ کے سامنے سخت مشکل پیش تھی" الخ تحریر علی گڈھ گزٹ شائع ہو چکی ہے۔ جو مضمون کہ کالج کے ذمہ دار اخبار میں شائع ہوا ہے اگر یہ مضمون شائع نہ ہوتا تو بہت زیادہ بہتر تھا اور جس طرح تمام دوسری کارروائیاں صیغہ راز میں رہتی ہیں اگر سنڈیکیٹ کی یہ عقلمندی بھی ڈھکی چھپی رہتی تو ہم زیادہ شکرگزار ہوتے۔ رزولیوشن جن الفاظ میں پاس کیا گیا ہے مضمون مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو اس میں صداقت کا پہلو نظر آتا ہے اور نہ اخلاقی جرأت کا اگر یہ وجہ صحیح ہے جو مضمون مذکور میں لکھی گئی ہے تو سنڈیکیٹ کی تاریخ میں ایک [illegible] سے غلط بیانی اور بزدلی دونوں کا ثبوت ملتا ہے اور [illegible] صداقت ہے اور [illegible] اخلاقی جرأت!!! کاش سنڈیکیٹ [illegible] یادگار [illegible] [illegible] مولانا [illegible] صاحب مرحوم

مغفور بھی بہت عرصے تک کالج سے بالکل علحدہ رہے۔ پھر اُن کی یادگار قائم کرنے کی اپیل کیوں کی گئی۔ اگر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب
کی یادگار قائم نہ کرنے کی اصلی وجہ وہی ہی جو اس مضمون میں لکھی گئی ہی تو صداقت اور اخلاقی جرأت سے کام لے کر رزولیوشن
اُن ہی الفاظ میں پاس کرنا مناسب تھا تاہم ہمارے نزدیک جب کہ مولانا کی اُس کتاب کو کسی نے نہیں دیکھا تو صرف دہلی کے
چند عوام اشخاص کی مخالفت کی وجہ سے مولانا کی تمام عمر کی قومی اور مذہبی خدمات پر خاک ڈالنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔
مولانا مرحوم کی نیکی اور صداقت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہی کہ اُنھوں نے کتاب کی تمام جلدیں تلف کرنے کی
غرض سے بلا عذر حوالے کر دیں۔ اگر اُس کتاب میں کلماتِ کفر تھے تو مولانا کا کتاب کو بغرض تلف کرنے کے حوالے کر دینا خود
اِس بات کا ثبوت ہی کہ مولانا مرحوم نے اُن عقائد سے توبہ کر لی تھی۔ علاوہ ازیں کالج کے معاملات میں عقائد سے بحث
کرنا کبھی جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اگر یہ کارروائی جائز ہو تو بہت سے ٹرسٹی آج ایسے ہیں کہ جن کے عقائد نہ صرف جمہور اہلِ
اسلام بلکہ سر سید کے عقائد کے بھی خلاف ہیں کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہی کہ لارڈ میکڈانل جیسے مسلمانوں کے دشمن
کی یادگار قائم ہو لیکن مولانا نذیر احمد صاحب جیسے لیڈر کی یادگار کی تحریک کرنے سے محض اِس بنیاد پر انکار کیا جائے
کہ دہلی کے چند عوام الناس مخالف ہو جاویں گے۔ جن اشخاص کی بدولت مولانا نذیر احمد صاحب کے خلاف فتنہ برپا ہوا
وہ سر سید کی بھی سخت مخالفت کر چکے ہیں اور کبھی اُنھوں نے کالج کی امداد نہیں کی۔ ایسے اشخاص کی مخالفت سے خوف زدہ
ہونا سخت افسوس ناک ہی۔ ہماری قوم میں کیوں ایثار پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں ہماری قوم میں آریوں اور ہندوؤں کی طرح
ایثارِ نفس کرنے والے اور قومی خدمت کرنے والے پیدا نہیں ہوتے۔ اِس کی وجہ صرف یہ ہی کہ ہمارے قومی کالج میں پبلک
اور عوام الناس کا خوف روز بروز بڑھتا جاتا ہی۔ قومی خدمات کرنے والوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ لیکن جن لوگوں سے
مالی نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہی یا کسی مضرت کے پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہی۔ اُن کو ٹرسٹی بنایا جاتا ہی۔ اسٹیج پر اُن کی
تعریف ہوتی ہی۔ اُن کی ہر قسم کی آؤ بھگت ہوتی ہی قومی دشمنوں کے شکریے کے رزولیوشن پاس کیے جاتے ہیں۔ خواہ
کوئی شخص کالج کا اور سر سید کا کیسا ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جاتا ہی کہ اُس کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے سے
ایک بڑی جماعت ہماری معین و مددگار ہو جاوے گی۔ تو اُس کی آؤ بھگت کی جاتی ہی۔ ایسے بکثرت واقعات ہماری نظروں
کے سامنے ہیں اور ہمارا دل اُن واقعات کو دیکھ کر بیٹھا جاتا ہی اور ہم کو قومی ترقی کی طرف سے روز بروز سخت مایوسی
ہوتی جاتی ہی۔ لیکن مولانا نذیر احمد صاحب کے ساتھ اُن کے مرنے کے بعد جو سلوک کیا گیا اُس سے ہم کو اِس قدر صدمہ
پہنچا ہی کہ جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو ہم کو قومی ترقی کی طرف سے بالکل نا امید ہو جانا چاہیے
کیوں کہ دنیا کی تاریخ میں ہم کو کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ کسی ملک کسی قوم اور کسی فرقے یا جماعت نے ترقی کی ہو جس میں اُس
ملک اُس قوم اُس فرقے اور اُس جماعت کے ہمدردوں اور جان نثاروں کے ساتھ سرد مہری اور ذلت کا برتاؤ کیا گیا
ہو اور عزت کی گئی ہو صرف دولت اثر اور قوت کی بنیاد پر۔ فرگسن کالج پونا اور دیانند کالج لاہور کو دیکھیے کہ وہاں کس
طرح والیانِ ملک امرا اور رؤسا سے زیادہ عزت کی جاتی ہی اُن لوگوں کی جو افلاس و مصیبت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے
ہیں اور جن کی ظاہری حالت نہایت ذلیل ہی اور اُس کے مقابلے میں کوئی ایک نظیر پیش کر دو اپنے قومی کالج میں۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمارا کالج آج تک کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا نہ کر سکا جس کو ہم دیانند کالج اور فرگسن کالج کے پروفیسروں کے مقابلے میں پیش کر سکیں ۔!!!

علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۳۱ ر جولائی بہ وطن کی رائے مطبوعہ ۷ اگست ۱۹۱۲ء

وطن اِس بحث میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنے باپ کی نیک نامی کو محفوظ رکھنے کے لیئے کافی سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ البتہ وہ اتنا لکھ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ کتاب امہاۃ الامۃ کا ذکر کرنے سے علی گڈھی ہم عصر نے بلاشبہہ ایک محض بے محل و بے موقع چوٹ کی ہے۔ تمام قوم میں اب تک شاید ہی کسی شخص کے دل میں اس کتاب کی یاد باقی رہی ہوگی جسے خواہ مخواہ محض ایک بہانہ گھڑلے کے لیئے پھر تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی ہی محض دلجوئی اگر مانع ہوتی تو ان مسلمانوں کی پاس خاطر سے منتظمان علی گڈھ کالج کو مدت سے اپنے نظم و نسق اور خاص کر مالی انتظام میں معقول قطع و برید کر دینی چاہیئے تھی۔ یادگار قائم کرنے سے ایسی ترش روئی کے ساتھ انکار کر دینا اگرچہ بعض افرادِ قوم کو جو مرحوم کی بیش قدر خدمات اور خاص کر ترجمۂ قرآن کریم کے احسان گراں بار کا خاص اعتراف کرتے تھے بہت کچھ شاق گزرا لیکن اس کی تہ میں انھیں بھی کسی خاص امر کے نہ ہونے کا مطلق گمان نہ گزرا۔ مگر اب یہ عذر لنگ غالباً انھیں بھی یہ قیاس کرنے پر مجبور کر دے گا کہ اس انکار کی تہ میں ضرور کوئی اَور معاملہ ہے۔ چناں چہ بعض علانیہ اسے مولوی صاحب مرحوم اور نواب وقار الملک کے ذاتی تعلقات کی نامعلوم غیر خوش آہنگی کی طرف منسوب کر رہے ہیں نواب محسن الملک کی وفات پر جب مولوی مشتاق حسین صاحب وقار الملک کا نام تجویز ہوا تو مرحوم نے اس کی تائید کرنا پسند نہ فرمایا۔ بلکہ اپنی مشہور صاف گوئی سے کام لے کر یہ کہنے سے بھی نہ ٹلے کہ میں امروہہ کے حق میں کبھی رائے نہیں دے سکتا۔ اور گو انھوں نے بعض لنگوٹیے دوستوں کے ٹکسالی اصرار پر آخر منظوری پر دستخط کر دیئے مگر اس انتخاب کو اپنی رائے میں قوم اور کالج کے حق میں ایسا مضر سمجھا کہ اس دن سے معاملات کالج میں دخل دینا چھوڑ دیا چناں چہ بقولہ بالا معترض کی رائے میں اس انکار سے اس کا بدلہ لیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ ہم عصر علی گڈھ گزٹ اس پہلو سے بھی اس معاملے پر روشنی ڈالنا منظور کرے گا۔ رہا کتاب امہاۃ الامۃ کا معاملہ۔ اس پر فقط شہر دہلی کے چند علماء نے عام لوگوں میں ایک تموج پیدا کیا تھا۔ سب راسخ الاعتقاد مسلمان ان سے متفق الرائے نہ ہوئے تھے نہ دہلی کی حدود سے باہر کوئی مخالف تحریک پھیلی تھی پیرایۂ بیان بے شک اکثر نے تقاضائے مضمون کے حسب حال قرار نہ دیا تھا مگر مصنف کی نیک نیتی اور اخلاص پر شبہہ کرنے والے وہی ہو سکتے تھے جو مرحوم کی ساٹھ سالہ دینی و قومی خدمات سے بے خبر تھے یا بے خبر رہنا چاہتے تھے۔

ٹرسٹیانِ کالج علی گڈھ و یادگار مولانا نذیر احمد مرحوم

مضمون ... شوال مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۱۲ء

... بشیر الدین احمد

ٹرسٹیانِ کالج علی گڈھ و یادگار مولانا نذیر احمد خاں مرحوم

۲۷ - جولائی کے تہذیب میں مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا ایک خط اس شکایت کا شائع ہوا تھا کہ ٹرسٹیوں نے علی گڈھ کالج میں اُن کے والد ماجد شمس العلماء مولوی نذیر احمد خاں مرحوم

کی یادگار اس بنا پر قائم کرنے سے انکار کیا کہ مولانا مرحوم نے کالج سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ صاحب علی گڈھ گزٹ نے اس تحریر کے جواب میں تین باتیں لکھی ہیں۔ تینوں نہایت لطیف ہیں۔

اوّل تو یہ کہ کالج سے قطع تعلق کا تو یوں ہی بہانہ تھا۔ اس کا اصلی سبب کچھ اور ہی تھا۔

دوم مولانا مرحوم نے جو ایک کتاب امہاۃ الامہ (عیسائیوں کی کتاب کی تردید میں لکھی تھی) اس سے بعض لوگ بہت برہم ہو گئے تھے۔ اس لیئے ٹرسٹیوں کو یادگار بنانے کی جرأت نہ ہوئی مبادا لوگ اُن سے بھی برہم ہو جائیں

سوم۔ خیر ٹرسٹی یادگار بنا بھی دیتے اور لوگوں سے نٹ لیتے بشرطے کہ مولوی بشیر الدین یادگار کے لیئے بہت سا روپیہ انھیں دے دیتے۔ مگر مشکل تو یہ ہوئی کہ مولوی بشیر الدین سارا روپیہ نہ دیتے تھے۔ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ کالج پبلک سے بھی چندہ وصول کرنے کی دردسری کرے۔

ہم موٹی عقل کے آدمی اِن باریک نکتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف اتنا کہنا جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی مخالفت تو دہلی کے صرف چند لوگوں ہی نے کی تھی۔ لیکن علی گڈھ میں ایسے لوگوں کی یادگاریں منظور ہوئی ہیں جن کو ہندوستان بھر ہی نہیں بلکہ مکّے و مدینے کے علما رنے کافر و مرتد کہا۔ مگر ٹرسٹیانِ کالج نے اُن کی بیش بہا خدمات قومی کی قدر کے آگے حرمین شریفین کے فتووں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ نیز اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غیر خواہی کالج کے اعزاز میں کالج غیر مسلموں کی موت پر بھی بند کیا گیا ہی۔ مگر اس مرحوم عالم دین و مترجم کلام رب العالمین کا رتبہ ٹرسٹیانِ کالج کے نزدیک غیر مسلموں کا سا بھی نہ ہوا۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے اب ایک اور تحریر شائع کرنے کے لیئے بھیجی ہی جو ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ مگر آیندہ یہ سلسلہ جاری رکھنا فضول ہی کس کی شکایت اور کس سے شکایت ہ؟ از ماست کہ بر ماست۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

خاکسار سید ممتاز علی

اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ

علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۱۳ جولائی میں جو وجہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور کی یادگار تیار نہ کرنے کی لکھی ہی کہ اُن کی انجیر تصنیف امہاۃ الامہ سے مسلمان بھڑک گئے تھے۔ اُس کے متعلق مجھے تھوڑی سی توضیح کرنا ضرور ہی۔ ٹرسٹیانِ کالج نے جس بنا پر یادگار کا بنانا نامنظور کیا ہی۔ اوّل تو اُسے کالج سے رتی برابر تعلق نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر چند مسلمانوں نے شورش برپا کی تو وہ کل قوم کی بددلی پر محمول نہیں ہو سکتی۔ امہاۃ الامہ کی نسبت جب ایسی خلاف واقع شہرت خاص اسباب سے چند اشخاص نے پسِ پردہ کردی۔ تو مرحوم کو اس کا اس قدر قلق ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد سے پھر سلسلۂ تصنیف اور تالیف کو قطعًا بند کر دیا۔ اور کتاب کو جلوا دیا کہ کسی طرح مخالفین کے دلوں میں ٹھنڈک پڑے۔ اِس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ نفسِ کتاب کے حُسن و قبح پر میں بحث کرنا فضول سمجھتا ہوں اس لیئے کہ جب وہ کتاب صفحۂ دُنیا سے مٹا دی گئی اور مصنف بھی مٹ گئے تو مُردوں کی ہڈیاں اُکھیڑنے سے کچھ فائدہ

نہیں لیکن صرف دو اقتباس اس کتاب کے متعلق میں یہاں درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ کتاب کس سلوک کی مستحق تھی۔ اور اس سے کیا سلوک کیا گیا۔ پہلی تحریر مولوی سید احمد صاحب مصنف فرہنگ آصفیہ کی ہے جو پیسہ اخبار میں شائع ہو چکی ہے۔ اور دوسری مولوی عبدالراشد صاحب الخیری ایڈیٹر رسالہ تمدن و عصمت کی ہے۔ ناظرین اس پر سے خود فیصلہ فرمالیں۔ اور یہ دونوں تحریریں اُن کی وفات کے بعد کی ہیں۔

۱ "مرنے سے دو چار برس پیشتر حاسدوں نے امہات الامہ کی آڑ پکڑ کے آپ کے دل کو ایسا صدمہ پہنچایا جس کا اثر مرتے دم تک باقی رہا۔ اس صدمے نے آپ کی عمر کے آخری برسوں میں تعلیم و تعلم کا دروازہ بند کردیا اور مولوی صاحب کو گوشہ نشین بنادیا۔ گو کتاب مذکور میں بعض الفاظ ذرا سبک تھے۔ اور مولوی صاحب اُن کے بدلنے پر بھی راضی تھے اگرچہ خود غرضوں کا مطلب اس سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور آخر کتاب کو ناپید کرادیا۔ یہ پادری احمد شاہ صاحب شائق کی کتاب امہات المومنین کا جواب تھا اور ایسا دنداں شکن جواب تھا کہ معترضین کے دانت کھٹے کردیتا۔ مگر افسوس کہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کتاب کی آڑ میں کفر و الحاد کے فتوے مولانا نذیر احمد کے برخلاف لکھوائے گئے۔ مگر ان فتووں سے نہ مولوی صاحب کافر بنے اور نہ کفر کی کوئی شرط بدلائل ثابت ہوئی۔ البتہ اُن کی تصانیف اور علمی فیض کا دروازہ بند کرانا تھا سو کرادیا۔ اصل بات کو نہ سمجھے۔ مولوی صاحب کی طرزِ تحریر [illegible] کہ وہ ہمیشہ ناولانہ رنگ میں لکھتے تھے۔ اور اس رَو میں جو ان سے الفاظ نامناسب ہوتے اُن کو نہیں چھوڑتے تھے۔ مثلاً چھڑائی اور چاپڑ ہم معنی الفاظ ہیں مگر لفظ چاپڑ نے جو فسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے وفایانہ عیاری کے واسطے مختص کر لیا تھا۔ یہ غضب ڈھایا کہ بہت بڑے فاضل کا دل دکھادیا۔ اگر چاپڑ کی بجائے چھڑائی لکھا جاتا تو یہ اعتراض بھی اُٹھ جاتا۔ اور اُن کا دل نہ دکھتا۔ لیکن دل کا دکھانا خود غرضوں کے حق میں اچھا اور ہمارے حق میں بُرا ہوا کیونکہ اس نے [illegible] جیسی قیمتی لعل و جواہر کو اُن کی معدن طبیعت سے باہر نہ نکلنے دیا۔ [illegible] تین چار برس اور جیتے تو خدا جانے کون کون سے گل ناشگفتہ کھلتے۔ اور کیا کیا بہار دکھاتے۔ یہ [illegible] شاید ہمارے واسطے بھی ایسا فتویٰ کوئی تیار کرے۔"

۲ - "حق الامر یہ ہے کہ امہات الامہ وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے نہ آئندہ برسوں نظر آنے کی امید ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر جائے۔ اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیا کردے۔ جو امہات الامہ میں ہے۔ قوم کی بدقسمتی تھی کہ علامہ بلگرامی نے امہات الامہ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یقیناً وہ دیر یا سویر میں اجازت حاصل کرلیتے۔ مگر علامہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی۔ بعض اخباروں کی رائے کہ مولانا نے مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ علما [illegible] معترض ہیں۔ تو کتاب اُن کے حوالے کردی قطعی غلط ہے جس طرح یہ کتاب حاصل کی گئی۔ وہ [illegible] اس کا خیال تکلیف دہ ہے۔ جس نے بار بار کتاب نقل کی۔ لکھ کر حاضر ہوا۔ نامناسب ترمیم اور [illegible] اب میرے پاس ہیں۔ لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین [illegible] کے واسطے [illegible] قوم رکھ رہی ہے مخالفین کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے البتہ کتاب

میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہے۔ اور اگر اس کی اشاعت میرے ہاتھوں ہوگئی تو یہ کہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

صرف ان ہی دو تحریروں سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ پر کا کوا بنا دیا گیا۔ در پردہ اس کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ جو دل جلوں نے بدلہ لیا۔ اب اس کا اعادہ فضول ہے۔ کفر کا فتویٰ بھی چند فتح پوری کی مسجد کے طالب علموں نے دے دیا۔ لیکن ایسا فتویٰ کس پر نہیں ہوا۔ جتنے بڑے علمار گزرے ہیں سب کے ساتھ کم و بیش یہی سلوک کیا گیا یہ بھی ایک پروانہ بخشائش ہے۔ کیا سر سید اس سے محفوظ تھے۔ یا کون سا بڑا عالم اس سے بچ گیا۔

قیل ان الالہ ذو ولد قیل ان الرسول قد کہنا

ما نجی اللہ والرسول معًا من لسان الوریٰ فکیف انا

اگر اس قسم کے چند خود غرضوں کی مخالفت مانع قیام یادگار ہے۔ تو اس سے زیادہ مخالفت سر سید کی تھی وہ نیچری بھی تھے۔ اور کافر بھی۔ پھر ان کی یادگار کیوں بنائی گئی؟ آخر سب مخالف دب دبا گئے۔ اور آج ان ہی کا کام سراہا جا رہا ہے۔ کیا سر سید کی تفسیر پر کم شورش مچی تھی؟ یادگار کی صدائیں نے بلند نہیں کی۔ کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ ان کی یادگار صفحہ دنیا پر آن مٹ طریقہ پر قائم ہے۔ یہ تو سب سے پہلے منشی محبوب عالم صاحب کی تحریک تھی تعجب ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی کل اخباروں نے جو قوم کی آواز کہلاتے ہیں۔ مرحوم کی وفات پر بڑے بڑے آرٹکل لکھے۔ سارے ہندوستان کی انجمنوں اور سوسائیٹیوں نے تعزیت کے رزولیوشن پاس کیئے۔ صد ہا تار بھیجے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان مرحوم سے برہم تھے۔ اس واسطے ہم یادگار قائم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تو یا تو یہ بیان غلط ہے۔ یا یہ سب لیڈر اور رزولیوشن لغو۔ بہر حال اہانۃ الائمہ پر اگر اُبال تھا بھی تو وہ گیا گزرا ہوا۔ آج اسے تازہ کرنا۔ اور اس کی آڑ میں یادگار نہ قائم کرنے کی توجیہ کرنا جیسی وقیع بات ہے وہ خود دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں۔ اب میں اس بحث مباحثے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اتنا بھی اس وجہ سے لکھنا پڑا کہ مرحوم کی ذات پر ایک غیر واقع الزام کا اتہام تھا۔

(خاکسار ولفگار بشیر)

شمس العلما مولانا مولوی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم اور ٹرسٹیان علی گڈھ کالج۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۴۔ اگست ۱۹۱۲ء

اتنی سب مراسلت جل جلا کر اور اتنے بڑے شور و شغب کے بعد

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا

مولوی آفتاب احمد صاحب کا خط قابل ملاحظہ ہے۔ علی گڈھ کالج کا راز فریمسنوں کا سا راز ہے۔ جو آج تک کسی کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔ وہاں خود یہ حالت ہے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ خدا بھلا کرے آفتاب احمد خاں صاحب کا کہ انھوں نے بھڑکتی آگ پر ایک سرد پانی کا چھینٹا تو دیا۔ خیر کسی طرف سے تو صدائے خوش گوار آئی۔

اڈیٹر صاحب علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ! تسلیم۔ آج کل ہمارے قومی اخبارات میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ ٹرسٹیان علی گڈھ کالج نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی یادگار کے متعلق جو رزولیوشن پاس کیا وہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔

پبلک میں ٹرسٹیان کی اس کارروائی پر نہایت سخت الفاظ میں نکتہ چینی ہو رہی ہے اور اُن کو ناشکر گزار جماعت کا لقب دیا جا رہا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جماعتِ ٹرسٹیاں کے سامنے یہ مسئلہ کبھی پیش نہیں ہوا۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ اگر جماعتِ ٹرسٹیان کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوتا۔ تو بہت سے ٹرسٹی ہرگز اس رائے سے اتفاق نہ کرتے جو ٹرسٹیانِ موجودہ کا اجلاس سنڈیکیٹ نے قرار دی۔

میری ناچیز رائے میں شمس العلماء مرحوم کی علمی اور مذہبی خدمات کوئی منصف مزاج شخص فراموش کر نہیں سکتا۔ اور نہ وہ کسی عارضی اعتراف کی محتاج ہیں۔ اُردو لٹریچر کی جو خدمت اُنھوں نے کی وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ متعدد علمی اور اخلاقی تصانیف کے ذریعے سے قوم میں علمی مذاق کے پھیلانے اور اصلاحِ خیالات میں جو حصّہ اُنھوں نے لیا اُس کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور اِن سب سے بڑھ کر کلام پاک کے مقدس مطالب کو عام فہم اُردو میں ترجمہ کر کے اسلام کی جو خدمت اِس مُلک میں مرحوم نے کی وہ اُن کی مغفرت اور دائمی یادگار کے لیۓ بالکل کافی ہے۔

پس جماعتِ ٹرسٹیان اِس نکتہ چینی کی مستوجب نہیں ہے جو پبلک میں اُن پر کی جا رہی ہے۔ (خاکسار آفتاب احمد)

(جناب آنریبل صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب)

بزرگانِ علی گڈھ کالج کا عذر یادگارِ مولانا نذیر احمد خاں قائم نہ کرنے کا از مولانا حسن نظامی

تہذیبِ نسواں مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۱۲ء

بزرگانِ علی گڈھ کالج کا عذر یادگارِ مولانا نذیر احمد خاں قائم نہ کرنے کا

منیجر صاحب تہذیبِ نسواں۔ السلام علیکم۔ آج میں نے آپ کے پرچے میں مولانا بشیر الدین صاحب کی وہ دردناک تحریر دیکھی جس میں مولانا نذیر احمد صاحب کی یادگار اور علی گڈھ کالج کے انکار کا ذکر تھا افسوس ہے کہ مجھ کو آج تک اس قصّے کی خبر نہ ہوئی۔ کون کہتا ہے کہ دہلی کے علماء نے مرحوم کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا؟ سب جھوٹ ہے۔ چند حریص اور خود غرض لوگوں نے شورش برپا کی تھی۔ مگر معقول اہلِ علم اس شورش سے علیحدہ اور بیزار تھے۔ جو لوگ اِس مخالفت کے بانی تھے۔ میں جب کبھی اُن کے ہاں گیا۔ سوائے جوڑ توڑ اور غیبت و بدگوئی کی باتوں کے کبھی ذکرِ خدا رسول اُن کے ہاں نہ سنا۔ مگر مولانا نذیر احمد سے مرتے دم تک جب ملنا ہوا۔ ہمیشہ خدا اور خدا والوں کا چرچا رہتا تھا اور اب آخرِ وقت میں تو اُن کی خدا ترسی اور رقیق القلبی کا یہ عالم تھا کہ ایک آیت سُناتے اور بے اختیار روتے۔ ایسے سچے خدا پرست کو کافر کہنے والے میرے عقیدے میں

دوزخ کے کُندے ہیں۔

میں آپ کو رسالہ نظام المشائخ کا وہ پرچہ بھیجتا ہوں جس میں مرحوم کی وفات کے زمانے میں اظہارِ الم کیا گ
ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ درویشی طبقہ میں اُن کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

مولانا بشیر الدین احمد صاحب سے میرا تعارف نہیں اور نہ میری عادت کہ آج کل کے مصنوعی ہمدردی کرنے والو
کی طرح رزولیوشن بازی کرتا۔ لیکن آج اُن کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو لکھتا ہوں۔

رہا علیحدگیِ کالج والا قصہ۔ اِس کی حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس میں جب مولانا کی تقریر سے کچھ بدمزگی ہوئی
میں اُس وقت موجود تھا۔ مجھ کو بھی وہ تقریر ناگوار ہوئی تھی۔ اِس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے ایک پرائیویٹ خط
مجھ کو لکھا۔ کہ مولانا سے صفائی کی بات چیت کروں۔ جس میں نواب صاحب نے خود دہلی آکر معافی مانگنے کی آمادگی ظاہر کی تھی
میں مولانا مرحوم سے ملا۔ اور اُس خط کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے فرمایا۔ منشی ذکاء اللہ صاحب کے پاس بھی اِس قسم
کا خط آیا ہے۔ مگر میں کسی رنجش کے سبب نہیں۔ بلکہ خلوت پسندی کے تقاضے سے اب پبلک زندگی کا ترک ہی کرنا اچھا
سمجھتا ہوں۔ لیکن کالج کی بہتری و بہبودی کا خواستگار مدت سے ہوں۔ اور آخر تک رہوں گا۔ اِس کو اس سے کیا مطلب کا

یہ ہے اِن دونوں الزاموں کی حقیقت۔ اب مولانا بشیر الدین احمد سے خطاب ہے کہ وہ کیوں یادگار بازی کے قصے
اور نمائشی کاموں کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل میں مرحوم کی شاندار یادگار موجود
ہے۔ اور رہے گی۔ علی گڈھ کالج کی یادگار پتلیوں کا تماشا ہے۔ پتلی والے کے تار اور ہاتھ کے اشارے پر یادگاریں بنتی
بگڑتی رہتی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔

(حسن نظامی)

تبصرہ - یہ بالکل سچ ہے کہ مولانا نذیر احمد خاں کی بزرگی اور جلالتِ قدر اس سے بالا اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ علی گڈھ کالج
میں اُن کی یادگار اینٹ پتھر کی بنے۔ لیکن اس عالی شان اسلامی دار العلوم کی یادگاریں پتلیوں کے تماشے کا درجہ حاصل
کریں۔ کیا یہ رونے کا مقام نہیں؟ کیا بزرگانِ کالج کو چند حریص۔ خود غرض۔ شورش پسند لوگوں کے ساتھ اتفاق کرنا مناسب تھا

مولانا مرحوم کی یادگار کے متعلق مخبرِ دکن مدراس کی رائے مطبوعہ ۴ ستمبر سنہ ۱۹۱۲ عیسوی

یادگار شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

علی گڈھ کالج میں قیامِ یادگار شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کے متعلق آجکل اسلامی صحائف میں حرف زنی ہو رہی ہے مولانا موصوف کے خلف الرشید جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب
کی تمنا ہے کہ قومی مرکزِ علم میں اپنے لائق باپ کی یادگار قائم ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذمہ دارانِ کالج کی طرف سے اس معاملے میں
اطمینان بخش دلچسپی ظاہر نہیں ہوئی۔ جب اس سرد مہری کے متعلق شکایت ہونے لگی تو نواب وقار الملک بہادر نے
اس کی یہ وجہ پیش کی کہ مولانائے مرحوم نے کالج کی جانب سے اپنی عنانِ توجہ پھیر لی تھی اور اُن کی ذات سے کالج
کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ علاوہ بریں مرحوم نے آخر عمر میں ایک کتاب موسوم بہ امہات الامہ لکھی تھی جس سے مسلمانو

سخت دل شکنی ہوئی اس کے ساتھ بعض اصحاب کو یہ شکایت بھی ہی کہ مولنائے مرحوم نے اپنے رئیسانہ تمول سے قومی
کاموں کی جیسے کہ چاہیئے تائید نہیں فرمائی۔ گو نواب صاحب کا ڈفنس اور دوسرے حضرات کے عذر بجائے خود درست
ہوں، مگر معاملے کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ کالج سے مرحوم کو عرصۂ دراز تک خاص تعلق رہا۔ آپ سر سید
احمد خاں مرحوم کے زبردست معاون سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں اگر آپ کو ویسا اُنس نہ رہا تو اس کی بھی کوئی وجہ ہو
بعضوں کا خیال ہی کہ نواب محسن الملک بہادر سکرٹری کالج سے مرحوم کو کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی اور ایسی صورت میں
کا معاملاتِ کالج سے دستکش ہونا ہی مناسب تھا رہا یہ امر کہ آپ نے ایک ایسی کتاب لکھی تھی جو موجب دل شکنی قوم
ہوئی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مولنا نے مسلمانوں کے دل دُکھانے کے خیال سے کتاب مذکور لکھی تھی بلکہ اس کو
یوں خیال کیا جائے کہ جو کچھ اُن کے پاس محقق ہوا حوالۂ قلم کیا گیا۔ زمانۂ سلف میں کئی فضلا نے ایسی ایسی کتابیں لکھی
ہیں جن پر تکفیر کے فتوے جاری ہو گئے۔ لیکن امہات الامہ کا معاملہ ہی جداگانہ ہی یعنی جب مصنف علام کو معلوم
ہو گیا کہ اس کی وجہ سے اپنے بھائیوں کی دل شکنی ہوتی ہی تو فوراً اپنی کل مطبوعہ جلدیں علما کے ذریعے تلف کروا دیں
جس نے اپنی عزیز تصنیف کو اپنے ہم قوموں کی دل داری کے خیال سے تلف کروا دیا ہو کیوں کر مستحق ستایش نہ ہو
مرحوم کی نسبت قومی معاملات میں دل چسپی نہ لینے کی شکایت بھی قابلِ تسلیم نہیں۔ کیوں کہ آپ کو کارہائے ندوۃ
و انجمن حمایت الاسلام لاہور وغیرہ سے گہری دل چسپی رہی ہی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس آپ کے پُر اثر لکچروں سے
محروم نہ رہا۔ ایک مصنف کی حیثیت سے تو آپ کا پایہ نہایت بلند ہی۔ آپ نے اپنی قومی زبان اُردو کی وہ خدمت
کی ہی کہ شاید ہی دوسرے شخص نے اس سے بڑھ کر کی ہو۔ آج اُردو کی تائید میں انجمنوں پر انجمنیں قائم ہو رہی
ہیں اور عمدہ کتابوں کی تصنیف کے لیے انعامات عطا کرنے کی تجویزیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی حسب دل خواہ کامیابی نہیں ہوتی

مولنائے مرحوم نے ترجمۂ قرآن شریف سے بھی قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہی جس سے فہم مطالب قرآنی میں بڑی
مدد ملتی ہی۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہی کہ بعد موت سب چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں مگر اعمال صالحہ خیر
جاریہ و اولاد صالح۔ ان میں سے اگر ایک بات بھی کسی کو حاصل ہو تو اس کو خوش نصیب خیال کرنا چاہیئے۔ اور اگر
تینوں محاسن کا جامع ہو تو پھر کیا کہنا۔ اگر کسی کی اولاد صالح ہو تو ہمارے پاس بمنزلہ تینوں خوبیوں کے ہی کیوں کہ
وہ خود [illegible] کا مظہر ہی اور اس کی ذات سے خیرات جاریہ کی بھی امید بندھتی ہی۔ مثال کے لیے مولوی بشیر الدین
صاحب کو دیکھئے۔ اور دیکھئے کہ وہ اپنے والد مرحوم کے بقائے نام اور ثواب جاریہ کے لیے کیسی فکر کر رہے ہیں
انھیں [illegible] کوششوں میں [illegible] امید کرتے ہیں کہ بزرگان علی گڑھ
[illegible] ان کے سعادت مند فرزند کی ہمت افزائی
[illegible] بلکہ سعادت مند اولاد کی
[illegible] دینی اور دنیاوی امور انجام دیتے ہو
[illegible] لوگوں کو [illegible] کی [illegible]

مرحوم کے توسّل سے قومی کاموں کو معتدبہ حصہ مل سکا انھیں اطمینان سے متوقع رہنا چاہیے کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب جیسے اولادِ صالح کی نگرانی میں املاکِ مرحوم بالکل محفوظ و سرسبز ہیں جس فیاضی کی مولانا سے مرحوم سے تمنا کی جاتی تھی اس بات کی توقع اُن کے خلفِ اصدق سے بھی کی جا سکتی ہے۔ آنریبل صاحب زادے آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی ایک مراسلت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بورڈ آف ٹرسٹیان کالج کے رو برو یہ مسئلہ پیش ہوتا تو ہرگز مسترد نہ ہوتا۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ بزرگانِ کالج یادگار مولانا مرحوم قائم کرنے میں مرحوم شناسی و قدر دانی اکابرینِ قوم کا ضرور ثبوت دیں گے۔ ہم یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب اپنی تجویز یادگار پبلک کے آگے پیش فرمائیں تو مناسب ہو تاکہ اس بات پر غور ہو سکے کہ اس میں پبلک کو کیا حصہ لینا چاہیے اور مولوی صاحب کو اُس کے کامیاب بنانے میں کس قدر حوصلہ مندی کا اظہار کرنا ہوگا۔

یادگار کے متعلق آخری فیصلہ

مرحوم کے تعلقات زیادہ تر علی گڑھ کالج۔ انجمن حمایت الاسلام۔ مدرسہ طبیہ دہلی سے تھے۔ سر سید کے انتقال کے بعد اس میں شک نہیں کہ مرحوم کو علی گڑھ کالج سے وہ شغف نہ رہا تھا۔ پھر بھی نواب محسن الملک کی حیات تک کچھ نہ کچھ سلسلہ چلا ہی جاتا تھا۔ نواب وقار الملک کے عہد میں وہ رہا سہا تعلق بھی جاتا رہا۔ دلوں کی خبر خدا جانے کہ اندرونی معاملہ کیا تھا مگر جہاں تک مجھے علم ہے مرحوم کئی کئی سال سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ نشست و برخاست سے بھی معذور تھے اور اب تو ثقلِ سماعت اور ضعفِ بصارت نے بھی دبا لیا تھا۔ کہاں جاتے اور کیسے جاتے۔ برسوں سے باہر نکلنا۔ ملنا جلنا۔ لکچر دینا سب چھوڑ چھاڑ دیا تھا۔ اور یہ حالت اُن کی کسی ناخوشی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ مجبوری سے تھی۔ جب سے بصارت میں فرق آیا اکثر یہ کہتے رہتے تھے کہ میرا شغل پڑھنے کا گیا۔ اب میرا جینا بالکل عبث ہے۔ ہمیشہ اُن کی دعا تھی کہ میں اپاہج ہو کر نہ جیوں کہ دوسروں پر بار ہوں۔ سو خدا نے اُن کی دعا اسی طرح قبول فرمائی۔ انھوں نے مرض الموت میں کسی سے خدمت نہ لی آناً فاناً ختم ہو گئے۔ علی گڑھ کالج نے تو یادگار کے متعلق سر سے جوا ہی ڈال دیا۔ انجمن حمایت الاسلام نے کان تک نہ ہلایا۔ شاید اُن کو خبر بھی نہ ہو کہ یہ مر گیا۔ مدرسہ طبیہ کے تعلقات حکیم عبد المجید خاں صاحب کے انتقال کے بعد ضعیف ہو گئے تھے تو حکیم اجمل خاں صاحب آیا جایا کرتے تھے لیکن پہلی سی بات نہ تھی۔ امہات الامہ کے معاملہ نے مرحوم کو ایسا سخت صدمہ دیا تھا کہ وہ پبلک لیف میں آنا نہیں چاہتے تھے اسی وجہ سے مدرسہ طبیہ کے سالانہ لکچروں کو بھی خیرباد کہا۔ جب علی گڑھ کالج نے سالہا سال کی محنت پر پانی پھیر دیا اور انجمن حمایت الاسلام نے رُخ تک نہ دیا تو مدرسہ طبیہ تو تیسرے درجے پر تھا۔ اُس سے نہ توقع تھی نہ شکایت۔ غرض ادھر سے یادگار کا خاتمہ ہوا۔ مرحوم کی وفات کے بعد گو ایک تار تعزیت کا علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کی طرف سے خاکسار کے پاس آیا تھا۔ لیکن مدرسہ ایک منٹ کو بھی بند نہ ہوا۔ نہ کوئی تعزیتی جلسہ ہوا۔ حالانکہ ندوۃ العلماء کا مدرسہ جس سے مرحوم کو کوئی تعلق نہ تھا بند کیا گیا اور دوسرے مدارس حتیٰ کہ عربک اسکول۔ سینٹ اسٹیفن مشن کالج دہلی بند ہوا اور یہ ہوا تو مسلمانوں کا قومی کالج! میں اپنی طرف سے یادگار قائم

کرنے کے متعلق نا امید ہو چکا ہوں۔

آزار دجراحت بیگانگان رسید — مرہم منہ کہ زخم دل از آشنا رسید

میرے باپ کی یادگار میرے دل میں ہے اور جب تک میں زندہ ہوں۔ میں خود اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی یادگار ہوں۔ خدا کے فضل سے اُن کے پوتے بھی موجود ہیں اور یوں بھی اُن کی تصانیف ایک دوامی یادگار ہے جو حوادث کے مٹائے سے بھی نہیں مٹ سکتی۔ ایک امہات الامۃ نہیں۔ اس امہات الامۃ کی آڑ بیچ میں۔ مسلمانوں میں یا تو قدرت نہیں اور قدرت کے علاوہ ہمت بھی نہیں اور ہمت کے سوائے صفائی قلوب بھی نہیں کہ اپنے بزرگوں کی یادگار قائم کریں۔ ہاں البتہ کفر کے فتوے دینے کے لیے جس وقت کہو طیار ہیں۔ اب صرف ایک ضعیف سی امید مجھ کو مشن کالج دہلی سے ہے کیوں کہ پادری اینڈرو صاحب جو مرحوم کے بڑے دوست تھے وہ مجھے لکھ چکے ہیں کہ اُن کا ارادہ کالج میں یادگار قائم کرنے کا ہے اور اگر وہ اپنی آمادگی ظاہر کریں گے میں اُن کے ساتھ ہوں۔ مشن کالج میں یادگار قائم ہونے سے مجھے افسوس اور خوشی دونوں ہوں گی۔ افسوس اس بات کا ہوگا کہ مسلمانوں کا کام عیسائیوں سے ہوا اور خوشی اس بات کی ہوگی کہ میرے والد کی یادگار نے عملی صورت اختیار کی۔ ایں ہم غنیمت است۔

امہات الامۃ کا اخیر فیصلہ

جس عذر لنگ پر علی گڈھ کالج نے یادگار بنانے سے انکار کیا وہ امہات الامۃ تصنیف تھی جس سے بیان کیا جاتا ہے کہ مرحوم کا مقصود مسلمانوں کا دل دکھانا اُن کو آزار پہنچانا تھا۔ مسلمانوں کو اس کتاب سے دُکھ پہنچا یا نہیں اس کا علم تو مجھ کو نہیں ہے کیوں کہ میں نے سوا چند دہلی کے مسلمانوں کے جو بانی مبانی اس تمام شورش کے تھے اور کسی کو شاکی نہ پایا۔ نفس کتاب میں سوا اس کے کہ بعض جگہ شوخی طبع سے کوئی فقرہ رَو میں نکل گیا ہو کوئی ایسی بات پائی جس سے اسلام کی توہین یا مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو۔ نہ مرحوم جیسے شخص سے اس کی توقع ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ نہایت خشوع و خضوع سے نماز پنج گانہ ادا کرتے تھے۔ خود حافظ کلام الٰہی تھے۔ اکثر اوقات کلام اللہ پڑھا کرتے تھے۔ مدتوں سے اُن کو حالتِ وجد تھی۔ ہر وقت کلام مجید کی آیتیں عربی کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ زار و قطار روتے تھے۔ خدا کا ڈر تو اُن کے دل میں ایسا تھا کہ شاید کسی کے دل میں ہو۔ ہمدردی انسانی اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کنبہ پروری۔ غربا سے سلوک۔ پوشیدہ امداد اور خیرات یہ سب باتیں اُن میں لاجواب تھیں۔ تکبر اور غرور اور نخوت اُن کو چھو نہیں گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی غریبی اور طالب العلمی کی حالت کو فخریہ بیان کیا کرتے تھے۔ ایسا شخص جس نے ساری عمر مذہبی زندگی بسر کی ہو جس نے کلام مجید کا بے نظیر ترجمہ لکھا ہو جس نے عمدہ سے عمدہ کتابیں اخلاق کی لکھی ہوں۔ جو طلبہ کو علم ادب اور کتب احادیث حسبۃً للہ پڑھاتا ہو جس کے لکچر سر سے پاؤں تک نصائح اور اخلاق کا مجموعہ ہوں جو بات بات پر قرآن مجید کی آیات اور احادیث سے استناد کرتا ہو جو کفر و الحاد سے کوسوں دور ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص اپنی آخری عمر میں ایک ایسی کتاب لکھ دے جس سے مسلمانوں کے دل کیا دکھیں گے

ہ دواس کی حالت خواب ہو۔ ایسی حرکت سوائے اس کے کہ کوئی شخص مجنون ہو کسی ذی شعور سے ہو نہیں سکتی۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ مرتے دم تک اُن کے ہوش وحواس بجا تھے۔ ابہات الامہ وہی مثل ہوئی کہ بار وئی ایک نقطہ لگا کر دس کیا۔ اپنا دلی غبار اس پہلو سے نکالا۔ او شا کو کیا معلوم کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ عوام نے ثقہ بادھوں سے سنا سچ سمجھ گئے۔ دلی کی سرزمین میں مذہبی مباحث کے نشو ونما کی خیب نیز ہے شمس العلما مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی پر کب کفر کا فتویٰ نہیں ہوا جو ان پر نہ ہوتا۔ اگر ان پر کفر کا فتویٰ نہ ہوتا تو یا ملے میں ان کی ناک کٹتی۔ ان کی عظمت ان کی شہرت میں ایک بڑا نقص رہ جاتا کفر کا فتویٰ بھی بادشاہ پر نہیں ہوتا بھی یا ں ہی پر ہوتا ہے جن سے لوگ جلتے ہیں اور جلے پھپھولے پھوڑتے ہیں جس زمانے میں امہات الامہ کی شورش برپا تھی میں نے بچشم خود ہزار ناجیہ ہندوستان سے معززین و علما کے صدہا خطوط والد کے نام دیکھے ہیں کہ آپ ہرگز اس کتاب کی اشاعت کو بند نہ کیجیے بیچے ساتھ ہیں۔ بیسیوں بیرسٹروں اور صدہا وکلا نے لکھا کہ اگر عدالت تک یہ مقدمہ پہونچے گا تو ہم آپ کی طرف سے بلا معاوضہ پیروی کو موجود ہیں۔ حکام نے بھی اس شورش کو جاہلانہ ولولہ خیال کیا اور مرحوم کی حوصلہ افزائی کی لیکن مرحوم کو شر و فساد بڑھانا منظور نہ تھا انھوں نے چھپے چھپائے کتابیں حکیم اجمل خاں صاحب کے سپرد کر دیں، اور انھوں نے جلوا دیں مگر پھر بھی لوگوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے داب یادگار قائم کرتے وقت مُردہ ہڈیوں کو اکھیڑا گیا۔ امہات الامہ پر سرسید کی تفسیر سے زیادہ لے دے ہوئی ہے۔ امہات الامہ کا تو آج تک کوئی مفصل جواب بھی کسی نے نہیں لکھا۔ سرسید کی تفسیر کی تو دھجیاں بکھیری گئیں۔ سرسید کی دل آزاری (اگر مصلحانہ خیالات دل آزاری سے تعبیر کیے جاسکیں) تو مرحوم کی دل آزاری سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھی اور کفر کے فتوے میں دونوں برابر تھے مگر بہت سی باتوں میں ان پر بھی تفوق رکھتے تھے کہ دوزخ بہشت۔ وجود ملائکہ۔ وجود شیطان کے قائل نہ تھے معجزات سے صریح انکار تھا لیکن اُن کی یادگار علی گڈھ کالج میں قائم کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور مرحوم سرسید کی خدمات قومی کی صحیح قدر اب ہو رہی ہے کہ مخالفین بھی اُن کو علیہ الرحمۃ سے یاد کرتے ہیں۔ قدر مردم بعد مردم۔ یہی حال ان شاء اللہ مرحوم کا ہوگا کہ آگے چل کر یہ لوگ پچھتائیں گے اور ان ہی کو عمدگی سے یاد کریں گے اور اپنی قوم کی حالت پر سر پہ ہاتھ دھر کر روئیں گے کہ افسوس اب کوئی ایسا بھی نہ رہا۔

امہات الامہ دنیا کے پردے پر سے ناپید ہوگئی لیکن پھر بھی ہزارہا اُس کے خواہش مند موجود ہیں۔ مخالفین کی شورش نے اُس کی قدر بڑھائی۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ مولوی سید علی بلگرامی اگر زندہ رہتے تو لوگ دیکھ لیتے کہ اس امہات الامہ کا انگلش ایڈیشن کیسے خزانے نکلتا مگر ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔ میں نے سمجھا تھا کہ مرحوم کے ساتھ امہات الامہ بھی خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوگئی لیکن اب جو میں ملی گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو دھڑلے سے تمدن میں چھپ رہی ہے اور میرے ماموں زاد بھائی مولوی عبدالراشد صاحب الخیری اُسے چھپوا رہے ہیں۔ مجھے اُن کی اس جرأت پر تعجب ہوا۔ ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جب دہلی میں سر دیا تو دھاکوں کا کیا ڈر۔ شورش ان پر بہت کچھ ہوئی۔ دھمکیاں بھی دیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب تک دوڑے۔ داویلا کی مگر ایک نہ چلی اور چلتی کیسے جب اُس میں کچھ دم بھی ہوتا یہ کہ کتاب بلا غل وغش نکل رہی ہے اور مخالفین ہو نہ دیکھ رہے ہیں مجال نہیں کہ کان ہلائیں۔ یا عبدالراشد صاحب سے یہ پوچھیں کہ میاں تمھارے منہ میں کے دانت ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ میں نے خود جماعت مخالفین کے ایک بڑے رکن سے پوچھا کہ کہیے حضرت یہ کیا معاملہ ہے۔ یا وہی شور اشوری یا یہ بے نمکی۔ والد مرحوم کے وقت میں آپ نے آگ لگا دی تھی اور کتاب کو آگ لگا کر ہی چھوڑا اب آپ کس خواب خرگوش میں ہیں تو انھوں نے ہنس کے جواب دیا ”ارے میاں وہ تو مولوی نذیر احمد سے مقابلہ تھا۔ خاک از تودۂ کلاں بردار۔ یہ غریب تو چپ“